حضرت عمر فاروقؓ

کی

اجتہادی بصیرت اور عصر حاضر

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ

رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

نومبر ۲۰۰۲ء

مقالہ نگار

ممتاز احمد سالک

اسسٹنٹ پروفیسر

ادارہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب

نگران تحقیق

پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت

ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سنٹر

جامعہ پنجاب

ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور پاکستان
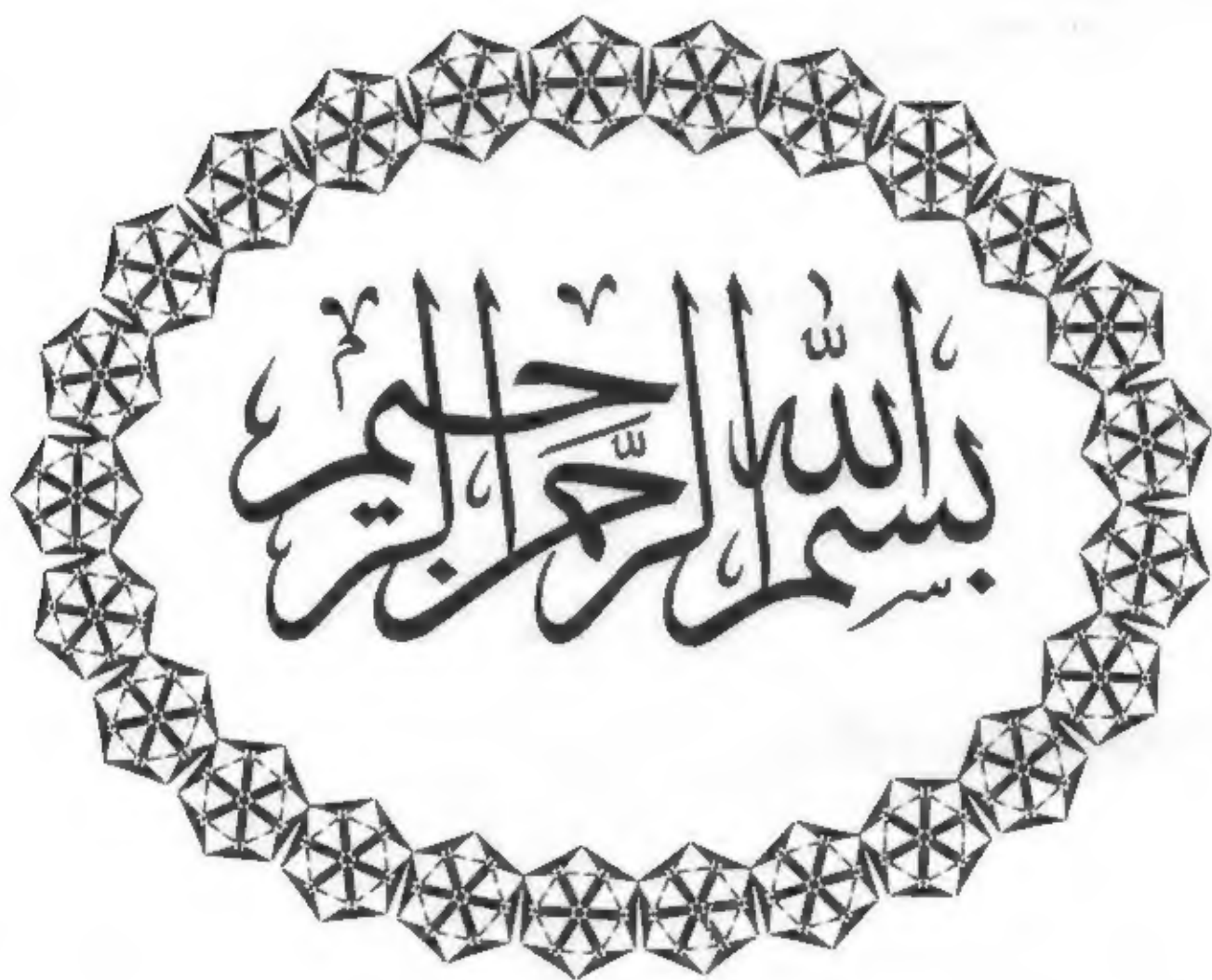
انتساب

عصر حاضر کے نام!

جو

اپنے متعدد، متفرق اور متنوع مسائل

کے

اسلامی حل کیلئے

بصیرت عمرؓ کی راہ دیکھ رہا ہے

فہرست موضوعات

باب اول: عہد جاہلیت ــــ بصیرت عمر کا آغاز و اظہار

باب دوم: عہد نبویؐ ---- بصیرت عمرؓ کی تربیت وارتقاء

باب سوم: عہد صدیقی ----بصیرت عمرؓ کی جولانیاں

باب چہارم: بصیرت عمرؓ اور قرآن حکیم

باب پنجم: بصیرت عمرؓ اور احادیث نبویؐ

باب ششم: بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے سیاسی مسائل

باب ہفتم: بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے انتظامی مسائل

باب ہشتم: بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے معاشی مسائل

اظہار تشکر

زندگی کے اس اہم مرحلے پر جبکہ میں کئی سالوں کی چلہ کشی و ریاضت کے بعد میں اپنے تحقیقی کام کو ایک کنارے لگا رہا ہوں۔ جس کی صورتحال منیر نیازی کے اس شعر کے مطابق رہی۔

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
اک اور دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

آج میرے جذبات و احساسات کے اندر ایک عجیب تلاطم برپا ہے کہ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ نہ یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ اس موقع پر کیا لکھوں؟ اپنے جذبات کے اظہار کیلئے کیا پیرایہ بیان اختیار کروں؟ کس بات کا تذکرہ کروں اور اپنے محسنین میں سے کس کس کا شکریہ ادا کروں؟ کیونکر؟ کتنا؟ کیسے؟

سب سے پہلے شکر ہے سارے جہانوں کے خالق و مالک اور حاکم و قادر کا جس نے مجھے مفلسی کے عالم میں حصول علم کیلئے رواں دواں رکھا۔ غیبی مدد سے تمام مشکلوں سے نکالتے ہوئے ایم اے کی تکمیل کرائی اور پھر پنجاب یونیورسٹی جیسے منفرد اعلی تعلیمی ادارے میں معلم بنایا جو ہر طرح کی فرقہ وارانہ اور مسلکی سوچ سے ماورا ہو کر اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت میں ہمہ وقت منہمک ہے۔ یہی میرے دل و ضمیر کی آواز تھی۔ اس میں میں اسی طرح شاداں و فرحاں ہوں جیسے مچھلی صاف و شفاف پانی میں ہو۔ مجھے روزگار کے لیے ایک ایسا پیشہ عطا فرمایا جو پیغمبرانہ مقاصد کی تعمیل و تکمیل کا نہایت اہم ذریعہ بھی ہے اور باعزت و باوقار بھی۔ پھر تحقیقی کام کے لیے ایسے عنوان پر کام کرنے کا موقع، توفیق اور ہمت دی جو عصر حاضر کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ باری تعالیٰ نے مجھے اتنی نعمتیں دی ہیں جن کا شمار نہیں۔ میں اس کے حضور سجدۂ شکر بجالاتا ہوں اس کی عملی صورت یہ ہے کہ یہ عہد کروں

"ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین"

اسی سے دعا ہے کہ اسے مرتے دم تک وفا کرنے کی توفیق دے' آمین!

بعد ازاں میں ممنون ہوں اپنی نگران مقالہ محترمہ ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ کا جو رحمدل بہن بھی ہیں اور مشفق سرپرست بھی۔ جن کا دفتر "دار العلم" کہ فیض علم ہر وقت ہر مرد و عورت 'چھوٹے و بڑے' عامی و عالم کے لیے جاری و ساری' ہر مکتب فکر کے جید و معتبر علماء اور دانشوروں سے ان کا رابطہ' ان کا مشن تحقیق و تجسس کہ رات دن تحقیقی کتب اور مجلوں کی اشاعت' تحقیقی کام کی ترویج و سرپرستی کے لیے مصروف۔ ان کا گھر "دار المساکین" جس وقت جائیں کچھ نہ کچھ میسر اگر نہ جا سکیں' تو گھروں میں کچھ نہ کچھ پہنچا دیں۔ ان سے اتفاق کرنے میں بھی مزا اور اختلاف کرنے میں بھی ان کے ساتھ کام کرنے میں بھی لطف اور دور رہنے میں بھی۔ خلوص' محبت' شفقت ہر حال میں قائم اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور ان کا سایہ تادیر قائم رکھے۔

میں محترم استاذ ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس موضوع کے انتخاب میں میری مدد کی اور ابتدائی مرحلے میں بھرپور رہنمائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت سے نوازے۔

اسی طرح مرحوم محترم بزرگ ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی کا تذکرہ کرنا احسان فراموشی ہوگی جنہوں نے بطور چیئرمین اس ادارے میں میرا انتخاب کیا اور ہر معاملے اور مرحلے میں مخلصانہ رہنمائی و سرپرستی فرمائی۔ اپنی مشفقانہ طبیعت کی وجہ سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی ادارے کے احباب کی عقیدت کا محور ہیں۔

میں اس موقع پر اپنے نہایت محترم و مشفق استاد جناب ڈاکٹر یوسف فاروقی صاحب کو بھی فراموش نہیں کر سکتا جنہوں نے سب سے پہلے میری انگلی پکڑی اور گلستاں تحقیق میں لے گئے جو خود بھی فاروقی ہیں اور "فاروق اعظم" سے نئے انداز میں مجھے متعارف کرانے والے بھی۔ جو بیس سال قبل میں نے انہی کی زیر سرپرستی ایم اے اسلامیات میں مقالہ بعنوان "فاروق اعظم بحیثیت مجتہد اعظم" لکھا تھا۔ پی ایچ ڈی کا کام مکمل کرنے کی مسلسل ترغیب دیتے رہے۔ گزشتہ ماہ ادارے میں تشریف لائے تو میں نے گھر آنے کی دعوت دی تو فرمایا "میں اس وقت تک آپ کے گھر نہیں آؤں گا جب تک آپ ڈاکٹر نہیں بن جاتے۔" اللہ تعالیٰ ان کی محبت و شفقت قائم رکھے آمین!

محترم جناب ڈاکٹر ظہور احمد صاحب کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے ایم اے عربی کے مقالے میں جس کا عنوان تھا "مناقب خلفائے راشدینؓ صحاح ستہ کی روشنی میں۔" سرپرستی فرمائی۔ مزید برآں میرے محسنوں اور کرم فرماؤں میں پروفیسر سید سلیم (مرحوم) اور پروفیسر نصیر الدین ہمایوں کا نام بھی سرفہرست ہے جنہوں نے رہنمائی، حوصلہ افزائی اور دعاؤں میں کبھی کمی نہیں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے ان سارے اساتذہ و مہربانوں کو جزائے خیر دے۔

اپنے عزیز بھائی، مخلص دوست اور باوفا رفیق ڈاکٹر شبیر احمد منصوری کا احسان کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا جنہوں نے ہر مرحلے اور ہر قدم و ہر معاملے میں اس قدر ساتھ دیا ہے کہ میری ذات و شخصیت کا آدھے سے زیادہ حصہ ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ اکثر موقعوں پر ہمارا نام اکٹھے لیا جاتا ہے۔ انہوں نے میری معاونت میں نہ دن دیکھا نہ رات۔ بعض عربی عبارات کے ترجمے اور تفہیم کا مسئلہ ہو یا مقالے کی پروف ریڈنگ جیسے مشکل اور فنی کام کا انہوں نے ساری سرگرمیوں کو معطل کر کے مدد کی اور ضرورت پڑی تو اپنے اہل خانہ کو بھی ساتھ لگا لیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے کثیر سے نوازے۔ (آمین!)

برادرم پروفیسر ظفر حجازی صاحب ظفر مہدی کے اس سفر میں ایسے مرحلے میں سفینے پر سوار ہوئے کہ اگر اپنا چپو نہ لگاتے تو یہ ساحل مراد سے بھی بہت دور ہوتا۔ انہوں نے مقالے کا ورق ورق کھنگال کر شخصیات و مقالات کا اشاریہ تیار کیا اور کالج سے چھٹیاں لے کر بیٹھ گئے۔ اللہ ان کی اس معاونت و کاوش کو قبول فرمائے۔ اسی طرح میرے عزیز شاگرد اور قوم کے استاد ایوب طاہر اور اسرار حسین معاویہ نے بھی مقالے کے ابتدائی دنوں میں معاونت کی، اللہ انہیں جزا دے۔

اپنے پیارے بھائی روزنامہ انصاف کے چیف ایڈیٹر جنید سلیم کا تذکرہ نہ کروں تو اظہار تشکر ادھورا رہے گا۔ جنہوں نے اخبار کے بہترین کمپوزر محمد عظیم کی خدمات میرے حوالے کر دیں کمپیوٹر اور پرنٹر بھی دسترس میں دے دیا۔ آخری دنوں میں میں نے جب ان سے عظیم کے بارے میں کہا کہ انہیں کہہ دیں اب اخبار کے کام کی بجائے دفتری اوقات میں بھی صرف میرا کام کریں تو انہوں نے اپنے جذبات و احساسات اور محبت و اپنائیت کے سارے خزانوں کو ایک جملے میں سمو کر جواب دیا "سالک بھائی! آپ کہیں تو اخبار بھی بند کر دیتے ہیں۔"

عظیم صاحب نے بھی نہایت توجہ، دانشمندی اور محنت و مہارت سے رات دن لگا کر یہ کام کیا ہے اور انتہائی کم غلطیاں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے۔

میرے محترم و مکرم سسر ڈاکٹر محمد سلیم صاحب نے حقیقی والد کی طرح پیار و شفقت سے نوازا، مجھے والد کی کمی کا کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔ شادی کے دن نکاح کے بعد مجھے گلے لگا کر فرمایا "آپ میرے بیٹے ہیں۔" میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ انہوں نے مجھے ساتواں بیٹا بنایا اور دوسرے چھ بیٹوں سے بڑھ کر محبت و عزت دی۔ ان کی یہ شدید خواہش رہی ہے کہ میں پی ایچ ڈی کا کام جلد مکمل کروں۔ اس کے لیے انہوں نے ہر طرح کا تعاون بھی کیا اور دعائیں بھی دیں۔ مجھے آج بہت بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ ان کے اور پی ساس محترمہ کے سامنے سرخرو ہو رہا ہوں جو خلوص، محبت، شفقت اور ملامت کا شاہکار ہیں۔ جن کی بے حد و حساب دعائیں آج رنگ لے آئی ہیں۔ اللہ ان کا سایہ تادیر تک قائم رکھے آمین!

میری والدہ محترمہ حسن بی بچپن کی دوریاں اسلامی واقعات کا ہر وقت سناتے رہنا تاریخی واقعات اور اسلام کے کارناموں پر بھی کتب لا لا کر پڑھوانا اور ان کی تشریح و وضاحت ساتھ ساتھ کرتے جانا۔ ہر موقع پر اسلامی طرز عمل اختیار کرنے کی نصیحت کرنا اور رات کے آخری لمحوں میں نوافل کے بعد دعائیں دے کر پھونکنا میری ہر کامیابی و ترقی اور سعادت و بھلائی کی بنیاد ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت مجھے راہ راست سے بھٹکنے نہیں دیتی۔ اللہ ان کی محبت کا سائبان دیر تک قائم رکھے آمین'

میری ساری تعلیم کے پیچھے حقیقت میں میری پیاری بہن مسعود اظہر کا ہاتھ ہے جو خود تو سکول میں معلمہ ہیں لیکن اپنی بے پناہ محنت اور ہر طرح کی معاونت کے ذریعے مجھے یونیورسٹی تک پہنچا دیا۔ اس موقع پر مجھے اپنے والد محترم (مرحوم) شدت سے یاد آ رہے ہیں جنہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی ترقی کی آرزو میں طویل بیماری و مشکلات کا عرصہ کاٹا۔ آرزو پوری ہوئی تو مہلت زندگی ختم ہو گئی۔ اللہ ان کی نیکیاں قبول فرمائے خطائیں معاف فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین')

ادارے کے چیئرمین ڈاکٹر محمود اختر جن سے تعاونوا علی البر والتقویٰ کی بنیاد پر ۲۳ سالہ رفاقت کا خوبصورت رشتہ ہے ان کا خاص طور پر اور دیگر تمام رفقائے کار جو گھر کے افراد کی طرح ہر قدم پر معاون و ساتھی رہتے ہیں کا بہت ممنون ہوں اور دیگر عملہ اور خاص کر لائبریری سٹاف اور دیگر رشتہ دار و احباب جنہوں نے کسی بھی طرح کی معاونت کی ہے یا نیک خواہشات اور دعاؤں کے ذریعے حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ سے بہتر جزا کا طلب گار ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آخر میں اپنی رفیقہ حیات تنزیلہ جنہیں میں پیار سے ''بیلو'' کہتا ہوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بس میں انہیں یہ مقالہ تحفے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ انہوں نے اس کام کو سر انجام دینے کے لیے سب سے زیادہ ترغیب دی سب سے زیادہ قلم بند ہونے پر مجبور کیا اور سستی و تاخیر پر سب سے زیادہ احتساب کیا اور اس کام میں مصروفیت کی وجہ سے سب سے زیادہ زحمت اٹھائی۔ کبھی تنگ آ کر یہ کہتی تھیں کہ ''حضرت عمر فاروقؓ نے ان کاموں کے کرنے میں اتنا وقت نہیں لگایا ہو گا جتنا آپ ان کے بارے میں لکھنے پر صرف کر رہے ہیں۔'' کبھی کہتیں ''اگر حضرت عمرؓ زندہ ہو جائیں تو ہاتھ جوڑ کر کہیں گے اب بس کریں۔''

آج مجھ سے زیادہ انہیں مسرت ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بچوں ارقم اروی اور اشعم جو اس عرصے میں میری مکمل توجہ سے محروم رہے کے ساتھ ہی خوش و خرم رکھے اور اب تک میری اس مصروفیت کی وجہ سے انہوں نے جتنی زحمتیں اور تکلیفیں اٹھائی ہیں مجھے ان کا ازالہ کرنے کی توفیق و ہمت دے اور ہمیں مرتے دم تک معیاری و مثالی ہم سفر بنائے رکھے اور رفاقت کا یہ سلسلہ جنت میں بھی قائم رہے (آمین ثم آمین')

مقدمہ

علم و حکمت اور بصیرت و فراست کے سارے خزانے اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس کی ان گنت نعمتوں میں سے سب سے بڑی خیر کسی کو اگر نصیب ہوتی ہے تو اس کی شکل یہی ہے۔ یؤتی الحکمة من یشاء ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا ط وما یذکر الا اولوالباب (1)۔ "حضرت عمر فاروقؓ وہ خوش نصیب انسان ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے یہ خیر کثیر نہایت فراوانی سے نوازی۔ آپ پوری طرح اس حدیث نبویؐ کے مصداق تھے "من یرد اللہ به خیرا یفقهه فی الدین" آپ حکمت و تفقہ کے ہر معنی و مفہوم کا عملی پیکر تھے۔ دینی اعتقادات کی جزئیات کے شعور سے لے کر عبادات کے ہر پہلو کا فہم اور معاملات کے تمام دائروں کے ادراک تک احکام شرعیہ کو بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں رکھ کر فیصلہ کرنے کی قوت سے لے کر ان کے قیام کو نتیجہ خیز بنانے کیلئے جامع حکمت عملی کے تعین و نفاذ تک ہر چیز آپ کی اجتہادی بصیرت کی دسترس میں تھی۔

☆ حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت و مقام:

گلدستہ نبویؐ کے اندر ہے ہر پھول کا اپنا رنگ، اپنی خوشبو، اپنی ساخت و شناخت اور اپنی حیثیت و اہمیت ہے۔ آپؐ کے لائے ہوئے انقلاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپؐ نے مختلف ذوق و مزاج، استعداد و صلاحیت، ذہنی سطح و عمر، قبیلہ و خاندان اور زبان و علاقہ رکھنے والے لوگوں کو عالی نصب العین کی بنیاد پر اس قدر متحد و منظم کہ تاریخ انسانی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان نفوس قدسیہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو نہایت منفرد اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ تاریخی واقعات سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جب آپ کے احوال و آثار سے گزرتا ہے تو آپ کی سیرت میں کھو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ کا فہم و فراست، جرأت و غیرت، امانت و دیانت، زہد و تقویٰ، تدبر و حکمت، سیاست و معاشرت، عدل و انصاف اور غصہ و رقت کے حسین امتزاج نے آپ کی شخصیت کو ہمہ پہلو اور نہایت پرکشش بنا دیا ہے۔ بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "حضرت عمرؓ ایک دکان کی طرح ہیں جس کے ہر دروازے پر ایک صاحب کمال بیٹھا ہوا ہے۔"

رسول کریمؐ نے آپ کے ایمان کیلئے دعا فرمائی کہ "اے اللہ! عمرؓ کے ذریعے اسلام کو عزت دے۔" آپ کو فاروق کے لقب سے نوازا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اطلاع دی کہ "اے محمد ﷺ آسمان والے عمرؓ کے اسلام سے نہایت خوش ہوئے ہیں۔" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ "عمرؓ کا اسلام فتح، ہجرت نصرت اور امارت رحمت تھی۔" جب شہادت کے بعد حضرت عمرؓ کو غسل دے کر کفن پہنا دیا گیا تو حضرت علیؓ نے پاس کھڑے ہو کر حمد و ثناء کے بعد فرمایا "واللہ مجھے اس چادر میں ڈھکے ہوئے انسان سے زیادہ روئے زمین پر کوئی پسند نہیں کہ اس کے نامہ اعمال کے ساتھ اللہ سے ملوں۔" علیٰ ہذا القیاس آپ کے مناقب پر بے شمار احادیث اور بے شمار صحابہ کرامؓ کے بے شمار اقوال تاریخ و حدیث کی کتب میں محفوظ ہیں۔ ہر زمانے کے مسلم و غیر مسلم مفکرین آپ کی عبقریت اور بے پناہ صلاحیتوں کے معترف رہے ہیں۔

☆ آپؓ کی اجتہادی بصیرت:

آپ کی علمی صلاحیتوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور قابل قدر آپ کی اجتہادی بصیرت ہے۔ اس میں آپ کا کوئی اور ثانی نہیں تھا۔ آپ نے دین حق کو اس کے ظاہری

(1) البقرہ، ۲۶۹/۲ (۲) حوالوں کیلئے ملاحظہ ہو مقالہ ھذا صفحہ نمبر ۱۷

حسن و اس کے حاملین کے کردار سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ اس کے مقاصد کو سمجھ کر اور اس کے اصولوں کو دیگر مروجہ ادیان کے تقابلی تجزیے کے بعد قبول کیا اور رفتہ رفتہ اس کی روح و مزاج کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتے چلے گئے۔ ارشاد نبویؐ ہے کہ "جتنے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں ان سب کی امت میں ایک ایک محدث ضرور ہوا ہے۔ اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمرؓ ہیں۔" صحابہ کرامؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! محدث کون ہوتا ہے؟" فرمایا "جس کی زبان سے فرشتے گفتگو کریں۔"

کبار صحابہؓ سے عظیم مفسر و فقیہہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "بے شک عمرؓ ہم سب سے زیادہ اللہ کے علوم کے جاننے والے اللہ کی کتاب کے قاری اور اللہ کے دین کی سمجھ رکھنے والے تھے۔" حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ارشاد ہے کہ "جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا جس میں لوگوں کی کوئی اور رائے ہوتی اور عمرؓ کی کوئی اور تو قرآن عمرؓ کی رائے کے مطابق نازل ہوتا۔" حضرت علیؓ کے بقول "قرآن میں بکثرت حضرت عمرؓ کی آراء موجود ہیں۔" آپ نئے پیش آنے والے واقعے کو اپنی اسی دینی فراست اور اجتہادی بصیرت کے ذریعے دیکھتے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصی طور پر ودیعت کی تھی، جس کی بناء پر آپ کی رائے وحی الٰہی سے ہم آہنگ ہو جاتی۔ (۱)

حدیث و تاریخ کی کتب میں ہمیں ایسے پندرہ اہم مسائل ملتے ہیں جن میں وحی الٰہی نے حضرت عمر فاروقؓ کے موقف کی تائید کی ہے۔ یہ موافقات عمرؓ کے نام سے معروف ہیں۔ آپ کی اجتہادی بصیرت اس قدر معروف ہو گئی کہ بقول حضرت طارق بن شہاب "ہم اکثر باتیں کیا کرتے تھے کہ حضرت عمرؓ کی زبان پر فرشتہ بولتا ہے۔" ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "اے عمرؓ! تمہارا غصہ عزت ہے اور رضامندی حکم۔" ایک مرتبہ فرمایا "اللہ تعالیٰ نے حق عمرؓ کی زبان پر جاری کر دیا ہے، وہ ہمیشہ حق کہا کرتے ہیں۔" فرمایا "میرے بعد حق اسی طرف ہو گا جس طرف عمرؓ ہوں گے۔" ایک اور ارشاد ہے کہ "میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے۔" آپ کی اجتہادی بصیرت کے مستند و معتبر ہونے میں موافقات قرآنی، ارشادات نبویؐ، صحابہ کرامؓ کی متعدد آراء سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے آپ کے فیصلوں اور فقہی آراء کو فقہ و اصول فقہ کی تدوین میں بطور دلیل پیش کیا ہے اور بے شمار مسائل کا استنباط کیا ہے۔

☆ آپ کی اجتہادی بصیرت اور عصری مسائل:

آپ کے عہد مبارک میں قیصر و کسریٰ کی عالمی طاقتیں سرنگوں ہو گئیں۔ اسلامی سلطنت کی سرحدیں خطہ حجاز سے پھیل کر مشرق میں ہند، چین، روس اور مغرب میں مصر، سوڈان اور لیبیا کے علاقوں تک پہنچ گئیں اور اس کا کل رقبہ تقریباً بائیس لاکھ اکیاون ہزار تیس (۲۲،۵۱،۰۳۰) مربع میل تک پہنچ گیا۔ اس میں جدید عالم اسلام کے بیشتر ممالک آ جاتے ہیں۔ فتوحات کی اس وسعت نے مسائل و مشکلات کو بھی وسیع کر دیا۔ اسلام کا واسطہ اب صرف عرب کی سادہ اور بدویانہ زندگی سے نہیں تھا بلکہ ایسی اقوام سے تھا جو مختلف مذاہب کے زیر اثر تھیں جو صدیوں سے متفرق تہذیبوں کے زیر سایہ رہ چکی تھیں۔ جن کی نسل، زبانیں، رنگ، اقدار و روایات، عقائد و نظریات، فکر و شعور، طرز زندگی، ثقافت و تمدن، سیاسی و معاشی انداز اور تاریخی و جغرافیائی پس منظر بالکل مختلف تھا۔ ان میں سے مسلمان ہونے والوں کو ایک امت کے رشتے میں پرونے اور ان کی فکری، علمی، عملی تربیت کرنے میں جو خلیفہ ہیں ان سے کئے گئے معاہدوں کو پورا کرنے اور جو رہ گئیں ہیں ان کے مسائل کو حل کرنے اور سارے علاقے کو ایک منظم و مستحکم اسلامی و فلاحی ریاست میں ڈھالنے کی ضرورت تھی، جو صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی ریاست کا نقشہ پیش کرے۔ اس عظیم کام کو سنبھالنے کا وہی شخص اہل ہو سکتا تھا جو حالات کی تبدیلیوں، معاملات کی نیرنگیوں، مسائل کی پیچیدگیوں اور وقت

(۱) حوالوں کیلئے ملاحظہ ہو مقالہ ھذا صفحہ نمبر ۱۳۵

کے تقاضوں کو بھی سمجھتا ہو، وہ ایسی دینی فراست اور اجتہادی بصیرت بھی رکھتا ہو کہ انہیں نصوص کی روح و مقاصد کے مطابق حل کر سکے۔ شریعت کے احکام کو وسیع تناظر میں دیکھنے کا عادی ہو اور عصری امور پر ان کے اطلاق کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مشیت ایزدی نے فاروق اعظمؓ کو اسی مقصد کیلئے تیار کیا تھا۔ آپ اجتہادی بصیرت کے ساتھ ساتھ بھرپور انتظامی صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔ آپ نے اللہ کے پیغمبر کی دیگر پیش گوئیوں کی طرح اپنی ذات کے بارے میں ان پیش گوئیوں کو بھی سچ کر دکھایا۔ "اگر تم (حکومت کیلئے) عمرؓ کی طرف رخ کرو گے تو انہیں اپنے نفس میں بھی قوی پاؤ گے اور امر الٰہی میں بھی" یا پھر یہ کہ "میری امت میں فتنوں کا دروازہ اس وقت تک مکمل طور پر بند رہے گا جب تک ان میں عمرؓ زندہ ہیں۔" حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ "عمرؓ کیسے آدمی تھے؟" انہوں نے جواب دیا "وہ ایک ہوشیار پرندے کی مانند تھے جو ہر جانب یوں نگاہ دوڑائے رکھتے جیسے اس کیلئے ہر قدم پر ایک جال بچھا دیا گیا ہو۔" حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی اجتہادی بصیرت کے ذریعے اپنے دور کے تمام مذہبی، سیاسی، سماجی، عدالتی، قانونی، انتظامی اور معاشی، تعلیمی، عسکری اور بین الاقوامی مسائل کو اسلام کی جامع تعلیمات کی روشنی میں حل کیا۔ آپ نے مختلف اداروں کے نئے ڈھانچے وضع کئے جو عہد حاضر کی تعمیر و ترقی کیلئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دور جدید میں مذکورہ مسائل بھی نوعیت کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں جیسے عہد فاروقی میں تھے۔ قدیم و جدید کی بحث محض نظری ہے۔ بقول اقبالؒ۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

ہم مکمل اسلامی نظام کے قیام، ایک جدید اسلامی وفاقی ریاست کی تشکیل و تعمیر اور اسلامی ورلڈ آرڈر کے خواب کی عملی تعبیر کیلئے کتاب و سنت کے احکامات کو فاروق اعظمؓ کی اجتہادی بصیرت ہی کی روشنی میں نافذ کرنے کے محتاج ہیں۔ آپ کی زیادہ تر ریاستی پالیسیوں کو اجماعی حیثیت حاصل ہے کیونکہ وہ کھلے مذاکروں اور بے لوث مشوروں اور بحث و تمحیص کی چھلنیوں سے گزر کر وضع کی گئیں۔ آپ نے شورائی اجتہاد کی بنیاد ڈالی اور اسے رواج دیا۔ ہم اس طریق کار کو اپنا کر اپنے ہر قسم کے مسائل کا حل دریافت کر سکتے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق بصیرت عمرؓ ایک ایسی شاہ کلید ہے جو ہمارے لئے ہر بند دروازے کو کھول سکتی ہے۔

☆ اب تک کے کام کا مختصر جائزہ:

حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت سے متعلق مواد تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ، مغازی، انساب العرب، اسماء الرجال کی تمام بنیادی کتابوں میں موجود ہے۔ اسلامی معاشیات کی ابتدائی کتب مثلاً امام ابو عبید کی کتاب الاموال، امام ابو یوسف کی کتاب الخراج، یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج، اسلامی سیاست کی ابتدائی کتب مثلاً ابو یعلیٰ کی احکام السلطانیہ، ابن قتیبہ کی الامامہ والسیاسۃ، ابن تیمیہ کی سیاسۃ الٰہیہ اور سیاست شرعیہ میں اہم مواد موجود ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت و خصائص پر ایک مستقل اور قدیم کتاب جو میری نظر سے گزری ہے وہ ابن جوزی کی سیرت عمرؓ ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں غالباً سب سے پہلے آپ کی فقہی آراء کو جمع کیا۔ جدید دور کے عرب مفکرین میں سے محمد حسین ہیکل، عباس محمود العقاد، طنطاوی، طہٰ حسین اور عمر تلمسانی نے حضرت عمرؓ پر کتب لکھی ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی فقہ پر عربی میں جو گرانقدر جدید کام ہوا ہے وہ ڈاکٹر رواس قلعہ جی کی "موسوعۃ فقہ عمر" جو ۱۹۸۱ء میں کویت سے شائع ہوئی ہے اور دوسری کتاب ڈاکٹر رویعی بن راجح کی کتاب "فقہ عمر بن خطاب موازنا بفقه اشهر المجتهدين" ہے جو ۱۹۸۲ء میں بیروت سے شائع ہوئی ہے۔ اردو کتب میں سے اہم کتب علامہ شبلی نعمانی کی "الفاروق" ہے جو آج سے ایک سو سال قبل لکھی گئی تھی۔ پرویز نے بھی شاہکار رسالت کے نام سے اپنے انداز میں حضرت عمرؓ پر کتاب لکھی ہے۔ علاوہ ازیں پورے عالم اسلام

میں دورِ جدید کے وہ تمام مفکرین جو اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات کے طور پر پیش کر رہے ہیں اور اسلام کے مختلف پہلوؤں کو عصری تقاضوں کے مطابق اجاگر کرنے کے خواہش مند ہیں حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت و کردار اور آپ کے اجتہادی فیصلوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں ان سب کتب سے استفادے کے بعد فاروقِ اعظمؓ کی اجتہادی بصیرت کی روشنی میں جدید ترین سیاسی انتظامی اور معاشی مسائل کا جائزہ لینے کی اور اس کے حل میں رہنمائی لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆ مقالے کے اہداف:

۱۔ فاروقِ اعظمؓ کی اجتہادی بصیرت کا علمی و تحقیقی تجزیہ۔

۲۔ آپ کے تصورِ دین اور فراست و حکمت کی اصل روح اور مقاصد کی تلاش۔

۳۔ عصری مسائل کے حل کے لیے آپ کی اجتہادی بصیرت سے رہنمائی لینے کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کرنا۔

۴۔ آپ کی اجتہادی بصیرت کی روشنی میں امتِ مسلمہ کے نمایاں سیاسی، معاشی اور انتظامی مسائل کا حل نکالنا۔

۵۔ آپ کی اجتہادی بصیرت کی روشنی میں ایک ایسی ترقی یافتہ فلاحی اور بین الاقوامی اسلامی ریاست کے خدوخال واضح کرنا، جس کا دارومدار کتاب و سنت پر ہو اور وہ اپنے تمام معاملات میں دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق پالیسیاں وضع کر سکے۔

☆ طریق تحقیق:

۱۔ جو روایات پیش کی گئی ہیں وہ احادیث و تاریخ کی مستند کتب سے ماخوذ ہیں۔ ان کی سند اور طرق پر کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ جیسی تھیں ویسے ہی درج کر دی گئی ہیں۔

۲۔ درج کی گئی روایات کے متن اور موضوع پر حسبِ ضرورت بحث بھی کی گئی ہے اور مقالہ نگار کے نزدیک اس سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ بھی کھول کر بیان کیے گئے ہیں۔

۳۔ مختلف روایات میں زیادہ تر تطبیق کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت کم مواقع پر ترجیح دینے کی ضرورت پیش آئی ہے۔

۴۔ ایک ہی روایت اگر مختلف کتب میں موجود ہے، تو ان سب کے حوالے درج کر دیے گئے ہیں۔ زیادہ تر مصنفین کی زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۵۔ روایات میں اگر کوئی لفظی اختلاف تھا، تو ان میں سے جو سب سے زیادہ مفید مطلب تھی اسے لے لیا گیا ہے اور پہلا حوالہ اسی کتاب کا دیا گیا ہے۔ مفہوم کی یکسانیت کی وجہ سے لفظی اختلاف کی تفصیل بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔

۶۔ جن کتب کے اردو تراجم موجود ہیں ان سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے اگر روایت کا تعلق محض واقعاتی بیان سے تھا، تو ویسے ہی لے لیا گیا ہے لیکن جہاں کہیں اہم تصور یا ضابطہ و اصول بیان ہوا ہے اس کے ترجمے کو اصل عربی متن کے ساتھ رکھ کر چیک کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ایسا ترجمہ کیا جائے جو عبارت کے مفہوم کو زیادہ بہتر انداز میں واضح کر سکے۔

۷۔ بنیادی مآخذ کے تمام حوالے عربی کتب سے دیے گئے ہیں۔ جو ایڈیشن استعمال کیا گیا ہے اس کی وضاحت مآخذ و مراجع میں موجود ہے۔

۸۔ چند روایات میں جن کی اصل کتاب تک رسائی نہیں ہو سکی قابلِ اعتماد ثانوی مآخذ کا حوالہ بھی موجود ہے۔

۹۔ چونکہ حوالے بہت زیادہ تھے اس لیے مصنف کا اختصاری مختصر نام استعمال کر کے صفحات درج کر دیے گئے ہیں۔ اگر کسی کی ایک سے زیادہ کتب تھیں تو ان کا نمبر I,II,III دے کر آگے متعلقہ کتاب کا صفحہ دیا گیا ہے۔ ان اشارات و علامتوں کی تفصیل مقالے کے آغاز میں "مفتاح المصادر" کے عنوان کے تحت دے دی گئی ہے۔

ابواب کی ترتیب و نوعیت:

پہلا باب:

اس باب کے ابتدائی حصے میں فاروق اعظمؓ کے عہد جاہلیت کی بے انداز میں تصویر کشی کی کوشش کی گئی ہے جس سے ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں اور ذوق و رجحانات اور مشاغل و دلچسپیوں کے ذریعے بصیرت و فراست کی بنیادوں کا سراغ لگایا جاسکے۔

دوسرے حصے میں قبول اسلام پر بحث کی گئی ہے اور اسلام و جاہلیت کی کشمکش کے دور میں آپ کی مخالفت و رد عمل کے نفسیاتی و سماجی اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے اور ان مرحلوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو بتدریج آپ کو اسلام کی طرف کھینچتے رہے اور آخر کار آپ کے قبول اسلام کا باعث بنے۔

تیسرے حصے میں آپ کے سوانحی خاکے کی زمانی ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے براہ راست واقعہ شہادت پر بحث کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی عہد نبویؐ، عہد صدیقیؓ اور عہد خلافت کی تمام اہم سرگرمیاں جن کا تعلق اس مقالے کے اصل موضوع سے ہے نہایت تفصیل کے ساتھ اپنے اپنے مقامات پر آچکی ہیں۔ ان کا بیان کرنا بے جا طوالت کا باعث بھی ہوتا اور غیر متعلق بھی۔

آخر میں واقعہ شہادت پر سیر حاصل بحث کر کے اس کے محرکات و اسباب اور گہری سازش کا سراغ لگایا گیا ہے اور اس میں ملوث چار افراد نے جو کردار ادا کیا اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم:

دوسرے باب میں عہد نبویؐ میں آپ کے مقام و مرتبے اور اہم سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا۔ ابتدائی حصے میں اس والہانہ تعلق کا تذکرہ ہے جو آپ کو اپنے قائد و مربی نبی محترم ﷺ سے فکری، جذباتی اور عملی اعتبار سے تھا۔ اس تعلق نے آپ کی اجتہادی بصیرت کی تربیت و ارتقاء میں مہمیز کا کام کیا اور آپ کی مجموعی شخصیت کا نمایاں وصف بن گیا۔ اس حصے میں ایسے ارشادات نبویؐ بھی پیش کئے گئے ہیں جو بطور خاص اس وصف کے بارے میں ہیں۔

علاوہ ازیں اس دور باسعادت میں آپ کی ساری سرگرمیوں کو چار مختلف حصوں میں پیش کیا گیا ہے۔ سرور کونینؐ کے رفیق کار کی حیثیت سے آپ کے کردار کو "مخلص رفیق" کے عنوان سے جمع کیا گیا ہے۔ اجتماعی مسائل اور ریاستی و حکومتی معاملات کے حل کیلئے جو مشورے آپ نے دیئے انہیں "دانشمند مشیر" کی ذیل میں درج کیا گیا ہے۔ آپ نے ہادی برحق ﷺ کی فرمانبرداری و اطاعت کا جو مثالی نمونہ پیش کیا اس کے واقعات کو "بے لوث مطیع" کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ معلم انسانیتؐ سے آپ نے کن طریقوں سے فیض علم حاصل کیا؟ اس دوران معلمؐ و متعلم میں تربیتی رشتے کی کیا کیا صورتیں سامنے آئیں؟ یہ سب کچھ "سعادت مند شاگرد" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم:

یہ باب "عہد صدیقیؓ: بصیرت عمرؓ کی جولانیاں" کے عنوان سے ہے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بصیرت عمرؓ نے کس طرح "خلافت علی منہاج النبوۃ" کے اس اہم دور ابتدائی مرحلے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ ابتدائی حصے میں رسول اکرم ﷺ کے ان دونوں معتمد ساتھیوں، رفیقوں اور مشیروں کے مشترک مناقب بیان کئے گئے ہیں۔ بعد میں ان دونوں کے ساتھیوں سے باہمی مثالی تعلق کے واقعات سامنے لائے گئے ہیں، پھر ان کے طرز استدلال و اجتہاد کے الگ الگ پیرایوں کے حوالے سے فکر و نگاہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے طرز استدلال و عمل کو واضح کیا گیا ہے اور واقعاتی شہادتوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دینی ملت کے فروغ و استحکام میں دونوں کے اتصال کا

اہم کردار ہے۔ عہد صدیقی میں آپ کی حیثیت مشیر اعلیٰ اور قاضی کی تھی۔ ان دونوں ذمہ داریوں کو آپ نے کس طرح دانشمندی و دیانت سے نبھایا۔ آپ کی بصیرت نے کس طرح اپنا اثر دکھایا؟ اور پھر حضرت ابو بکرؓ کے انتخاب کے موقع پر آپ نے کس طرح بروقت ایسا طریقہ اختیار کیا کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا؟ یہ سب کچھ اس باب میں ہے۔ آخر میں فاروق اعظمؓ کے انتخاب کی تفصیل بھی موجود ہے۔

باب چہارم:

"بصیرت عمرؓ اور قرآن حکیم" کے نام سے یہ باب اس مقالے میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں آپ کی الہامی طبیعت کے بارے میں کتاب و سنت اور آثار صحابہؓ سے ایسے ٹھوس دلائل و شواہد پیش کئے گئے ہیں جو کسی اور صحابی کے حصے میں نہیں آسکے۔ اس میں بارہ ایسی موافقات کی تفصیل دی گئی ہے جس میں وحی الٰہی نے آپ کے مشوروں، دعاؤں، اقوال اور اعمال کی تائید کی۔ اس سے آپ کی اجتہادی بصیرت کے نہایت صحیح، قابل اعتماد اور قابل عمل ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہم عصر حاضر میں پوری یکسوئی اور اطمینان سے آپ کی بصیرت و فراست کو شاہ کلید (Master Key) کے طور پر استعمال کرتے ہوئے تمام اجتماعی مسائل کے اقفال کھول سکتے ہیں۔

اسی باب میں قرآن حکیم سے آپ کے صفاتی، فطری اور جذباتی تعلق کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ آپ کے تفسیری ذوق و شوق کی متعدد مثالیں دی گئی ہیں۔ نمونے کے طور پر بہت سی ایسی آیات بھی پیش کی گئی ہیں جن کی آپ نے تفسیر کی۔ اس سے آپ کے تفسیری رجحان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ آپ آیات قرآنیہ کو عملی مسائل پر کیسے منطبق کرتے تھے؟ اس باب میں اس کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ مزید برآں قرآنی علوم کی ترویج و اشاعت اور ان کی صحیح تفہیم و تدریس احکامات قرآنی کو عملی جامہ پہنانے کیلئے آپ کے اقدامات کو اس میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ جو ایک طرف علماء و محققین کیلئے اور دوسری طرف امت مسلمہ کے اجتماعی معاملات کے ذمہ دار حکومتی اہلکاروں کیلئے عہد حاضر میں رہنمائی کا بہترین منبع ہیں۔

باب پنجم:

اس باب کا عنوان "بصیرت عمرؓ اور احادیث نبویؐ" رکھا گیا ہے۔ اسلام میں حدیث کی تشریعی و تشریحی حیثیت کی وجہ سے صرف آپ ہی کے عہد ہی میں نہیں، بلکہ دور جدید میں بھی ان کا معاملہ نہایت نازک بھی ہے اور اہم بھی۔ ایک طرف تو اس کی قدر ترویج و اشاعت کی ضرورت ہے کہ امت مسلمہ کا بچہ بچہ ان سے آگاہ ہو تاکہ اس کی سوچ اور عمل سنت نبویؐ کے مطابق ہو اور دوسری طرف اتنے حزم و احتیاط کی ضرورت ہے کہ کوئی غلط قول و عمل حدیث و سنت کے نام سے رواج پا کر ہدایت کے بجائے ضلالت، خیر کے بجائے شر اور ثواب کے بجائے عذاب کا باعث نہ بن جائے۔ بصیرت عمرؓ نے اس مسئلے کی نزاکت کو کس طرح سمجھا اور اسے حل کرنے کیلئے کیا طریقہ اختیار کیا؟ اس باب میں اس کی تفصیل ہے۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہم عصر حاضر میں بہتر حکمت عملی وضع کر سکتے ہیں۔

باب ششم

"بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے سیاسی مسائل" کے عنوان سے موجود اس باب میں سیاسی پس منظر کے ساتھ ہی وہ احادیث نبویؐ درج کی گئی ہیں، جن میں آپؓ کے عہد میں اسلام کے غلبے، سیاسی امن و استحکام اور ترقی کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ پھر اس سیاسی منشور کا جائزہ لیا گیا ہے، جو آپ نے اپنے پہلے خطبے میں پیش کیا۔ آپ کی پوری خلافت حسن کا مرقع رہی ہے، پھر آپ نے بعض روایات کو جو سیاسی نوعیت کی ہیں سیاسی اجتہادات کے طور پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان کے اثرات و نتائج کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد کی فصلوں میں دور جدید کے سیاسی مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کے ضابطہ اخلاق، سیاسی اصول اس وقت کے حالات کے مطابق سیاسی استحکام کیلئے آپ کے اقدامات، قبائلی سیاست کے معاملات اور ریاست کے اندر موجود یہود و نصاریٰ کے معاملات کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ہم آپ کی بصیرت و حکمت اور سیاسی مدارات و مہارت

اور طریق کار سے ہم عصر حاضر میں رہنما خطوط بھی وضع کر سکیں اور پھر عملی رہنمائی بھی لے سکیں۔ آخر میں آپ نے انتخابی شوریٰ کا تقرر کر کے جو نیا طرز انتخاب متعارف کرایا اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

باب ہفتم:

اس باب کا عنوان "بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے انتظامی مسائل" ہے۔ اگر راقم یہ باب شامل نہ کرتا تو دو سال قبل مقالہ جمع کر سکتا تھا۔ یہ اس طویل عرصے کی محنت کا ثمر ہے اس پر اتنی زیادہ توجہ دینے کی وجہ دور جدید میں نظمیہ عامہ یا پبلک ایڈمنسٹریشن کی مرکزی حیثیت ہے جو مقامی حکومتوں سے لے کر صوبائی و ملکی معاملات تک یہاں تک کہ بین الاقوامی تعلقات تک اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے مسائل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسے سیاست سے الگ کر کے ایک وسیع ادارے کی حیثیت سے اس کے پیشہ ورانہ اور انتظامی کردار کو زیر بحث لایا گیا ہے اور فاروق اعظمؓ کے فکر و عمل کو عصر حاضر کے تناظر اور جدید اصطلاحات و سانچوں میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مقالہ نگار نے جو مواد اکٹھا کیا ہے افسوس ہے کہ پی ایچ ڈی کے تقاضے، وقت کی تنگی دامان اور کام کی طوالت سے بچنے کیلئے صرف اس کا ایک تہائی پیش کرنے کے قابل ہو سکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگر زندگی، ہمت اور توفیق دوقت سے نوازا تو اس کے مختلف پہلوؤں، تحقیقی مضامین اور الگ کتاب کی شکل میں پیش کیا جائے گا۔ ابتداء میں پبلک ایڈمنسٹریشن کے جدید تصورات کا مختصر تعارف ہے، بعد ازاں فاروق اعظمؓ کا فلسفہ نظمیہ عامہ تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ پھر آپ کی انتظامی حکمت عملی کا جدید تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں نظمیہ عامہ کے ضابطہ اخلاق اور شرعی فرائض کو آپ ہی کے دور کے مستند تاریخی دلائل سے واضح کیا گیا ہے۔

باب ہشتم:

عصر حاضر کے بے شمار معاشی مسائل کو فاروق اعظمؓ کی اجتہادی بصیرت کی روشنی میں حل کرنے کیلئے اس آخری باب کا عنوان "بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے معاشی مسائل" رکھا گیا ہے۔ ان مسائل کی نوعیت و وسعت اور ان سب کے اسلامی حل کی ضرورت و اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ پی ایچ ڈی کی سطح کے الگ مقالے کی متقاضی ہے۔ یہ مقالہ نگار کے ذاتی ذوق و دلچسپی اور طالب علمانہ پیاس کا خاص میدان ہے، لیکن دل بہت رنجیدہ ہے کہ اس پر بھی مکمل کر اور تفصیل سے بحث کرنے کا شوق پورا نہیں ہو سکا۔ بے شمار حوالے اور مسودہ ہونے کے باوجود بروقت مقالہ جمع کرانے کیلئے اسے تحریری شکل میں لا کر شامل نہیں کیا جا سکا۔

جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ کلی معاشیات(Macro Economics) کے طرز تحقیق اور زاویہ نگاہ اور اطلاقی معاشیات(Applied Economics) کے انداز کے مطابق ہے۔ فاروق اعظمؓ کی معاشی فکر اور حکمت عملی کا اسی پہلو سے جائزہ لیا گیا ہے۔ آپ کے عہد میں جو معاشی مسائل تھے انہیں حل کرنے کیلئے جو آپ نے عملی اقدامات کیے ان کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کیا گیا ہے۔ ابتدائی فصل میں اسلامی ریاست کے معاشی کردار کو بصیرت عمرؓ کی روشنی میں پیش کیا گیا۔ بعد ازاں ایسے اجتماعی مسائل پر بحث کی گئی ہے جو جدید ریاست کی معاشی کارکردگی اور پالیسیوں کے عوامی و فلاحی ہونے کا معیار سمجھے جاتے ہیں۔ جن سے ریاست کے ہر شہری کا براہ راست تعلق ہوتا ہے ان میں کفالت عامہ، معاشی ترقی، نظام ٹیکس اور نظام وظائف شامل ہیں۔

آخری بات:

مجھے اپنی کم علمی و کم مائیگی کا پورا احساس ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایک طویل عرصے کی ریاضت کے بعد جو کچھ میں نے پیش کیا ہے وہ ایسا معیاری و مثالی کام ہے کہ اس سے بہتر پیش ہونا ممکن نہیں تھا۔ یقیناً یہ کام اگر مجھ سے زیادہ علم، استعداد اور صلاحیت رکھنے والا کوئی شخص کرتا تو وہ علمی و تحقیقاتی دنیا میں بہت بڑا کارنامہ سر انجام دے سکتا تھا۔ میری یہ طالب علمانہ کاوش ہے۔ ہاں البتہ میرے لئے اطمینان کا پہلو صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جتنی کچھ صلاحیتیں دی ہیں انہیں پورے خلوص اور مستعدی

سے لکھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اگر کوئی چیز بہتر و مفید ہے تو اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کی وجہ سے ہے جس نے اسے میرے ذہن میں ڈالا اور میرے ہاتھ سے تحریر کرایا۔ لیکن اگر کسی معاملے کو جاننے، سمجھنے، پرکھنے، بیان کرنے اور اس سے کوئی نتیجہ نکالنے میں کوئی کوتاہی و کمی ہوئی ہے تو وہ میری اپنی کمزوریوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا خواستگار ہوں اور اپنے لئے اور اس مقالے کے تمام قاریوں کیلئے اس کے منفی اثرات سے محفوظ رہنے کی دعا کرتا ہوں۔

جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے میں نے اس میں نہ تو کسی کی نقالی کی ہے اور نہ ہی کسی قسم کے تکلف و تصنع سے کام لیا ہے۔ جو کچھ میرے ذہن میں تھا اسے میں اپنے فطری مزاج و انداز کے مطابق ضبط تحریر میں لاتا گیا ہوں اس میں میرے جذبات خود بخود شامل ہوتے گئے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ فنی و تحقیقی اعتبار سے اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس لئے کہ جذبات کی اپنی زبان ہوتی ہے جو ٹوٹی پھوٹی، بے ربط اور توتلی بھی ہو سکتی ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس مقالے کا کوئی ایک جملہ بھی حالت وضو میں ہوئے بغیر تحریر کیا ہو یا تحقیقی مقصد سے کتب کا مطالعہ کرتے وقت اس کا اہتمام نہ کیا ہو۔ اسے مقدس کام سمجھ کر خلوص، ذمہ داری اور دیانت سے سرانجام دینے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے میرے لئے اجر اور دوسروں کیلئے خیر و برکت کا ذریعہ بنائے گا۔

اس مقالے کی ضخامت سے کئی گنا زیادہ مواد مستند حوالوں کے ساتھ میری فائلوں میں موجود ہے جس سے حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت و شخصیت اور کارناموں کو نئے مقاصد، نئے زاویے اور نئے انداز میں مرتب کرنے کی گنجائش موجود ہے اور عصری ضروریات و تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کی اجتہادی بصیرت سے استفادے کی نئی شکلیں اور نئی راہیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے یہ ہمت و توفیق دے کہ بقیہ زندگی میں اپنی بساط کے مطابق اس کام کو سرانجام دے سکوں (آمین ثم آمین!)

مفتاحُ المصادر

القرآن الحکیم	
الف	
آلوسی، علامہ آلوسی	روح المعانی
اثیر، ابن اثیر	(i) الکامل فی التاریخ
	(ii) اسد الغابہ
اثیر، مبارک بن محمد	(iii) جامع الاصول
اسد، ابن اسد	الباب فی التھذیب الانساب
اصفہانی، امام راغب	المفردات
اصلاحی، امین احسن	(i) تدبر قرآن
	(ii) اسلامی ریاست
	(iii) تزکیۂ نفس
اعثم، ابن اعثم	الفتوح
اقبال، علامہ اقبال	(i) بال جبریل
	(ii) ضرب کلیم
امینی، محمد تقی	(i) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر
	(ii) احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت
	(iii) اسلام کا زرعی نظام
ب	
بخاری، امام بخاری	(i) جامع الصحیح
	(ii) تاریخ بخاری
بدر، بدر عالم	ترجمان السنہ
بر...... ابن عبدالبر	(i) الاستیعاب
	(ii) الدرر
بغوی	مصابیح السنہ
بلاذری	(i) فتوح البلدان
	(ii) الانساب الاشراف
بیضاوی	(i) تفسیر بیضاوی
	(ii) منہاج الوصول
ت	
ترمذی	السنن
تقی عثمانی	علوم القرآن
تلمسانی، عمر تلمسانی	عمر بن خطابؓ
تیمیہ، ابن تیمیہ	(i) سیاست الٰہیہ
	(ii) سیاست شرعیہ
	(iii) فتاویٰ
	(iv) منہاج السنہ
	(v) مجموعۃ الرسائل
	(vi) الصارم المسلول
ج	
جاحظ	(i) البیان والتبیین
	(ii) کتاب الحیوان
جزی، ابن جزی	قوانین الفقہ
جصاص	احکام القرآن
جوزی، ابن جوزی	(i) سیرت عمرؓ
	(ii) صفۃ الصفوۃ
	(iii) الوفا

مصنف	کتاب
■	
حاکم نیشاپوری	المستدرک
حامد، حامد الانصاری	اسلام کا نظام حکومت
حبان، ابن حبان	صحیح ابن حبان
حزم	(i) الملل والنحل
	(ii) الاحکام
	(iii) المحلیٰ
حجر، ابن حجر عسقلانی	(i) الاصابہ
	(ii) تہذیب التہذیب
	(iii) الدرر الکامنہ
	(iv) فتح الباری
	(v) لسان المیزان
حسن، ابراہیم حسن	النظم الاسلامیہ
حموی، یاقوت	معجم البلدان
حمید اللہ، ڈاکٹر	(i) سیاسی وثیقہ جات
	(ii) عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی
حنبل، امام احمد	المسند
خ	
خالد، محمد خالد	خلفاء الرسول
خالد علوی	حفاظت حدیث
خزیمہ، ابن خزیمہ	الصحیح
خضری، خضری بک	(i) سیرت الخلفاء
	(ii) تاریخ التشریع الاسلامی
خلدون، ابن خلدون	(i) المقدمہ
	(ii) تاریخ ابن خلدون
خلکان	وفیات الاعیان
خورشید، خورشید فاروق	حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط
■	
داؤد، ابو داؤد	السنن
دارمی	السنن
ذ	
ذہبی	(i) تذکرۃ الحفاظ
	(ii) میزان الاعتدال
ر	
رازی، فخر الدین	التفسیر الکبیر
رشد، ابن رشد	بدایۃ المجتہد
رضا، رشید رضا	تفسیر المنار
رواس، قلعہ جی	موسوعۃ فقہ عمرؓ
رویعی، ابن راجح	فقہ عمرؓ بن خطاب
ز	
زرقانی	مناہل العرفان
زرکشی، بدر الدین	البرہان
زرکلی	الاعلام
زمخشری	الکشاف
س	
السبکی	طبقات الشافعیہ
سرخسی	المبسوط
سعد، ابن سعد	الطبقات الکبریٰ
سہیلی	الروض الانف
سید، سید الناس	عیون الاثر

مصنف	کتاب
سیوطی	(i) تاریخ الخلفاء
	(ii) الاشباہ والنظائر
	(iii) شرح المؤطا
	(iv) تدریب الراوی
ش	
شاہ ولی اللہ	(i) ازالۃ الخفاء
	(ii) حجۃ البالغہ
	(iii) البلاغ المبین
	(iv) عقدالجید
الشاطبی	(i) الموافقات
	(ii) الاعتصام
الشافعی	(i) کتاب الام
	(ii) الرسالۃ
شبلی	(i) سیرت النبیؐ
	(ii) الفاروقؓ
شفیع' مفتی محمد شفیع	معارف القرآن
شہرستانی	الملل والنحل
شوکانی	(i) نیل الاوطار
	(ii) القول المفید
	(iii) فتح القدیر
شیبانی	(i) الجامع الصغیر
	(ii) الجامع الکبیر
	(iii) کتاب الآثار
شیبہ' ابن ابی شیبہ	المصنف
شیرازی	(i) طبقات الفقہاء
	(ii) المہذب

مصنف	کتاب
ط	
طبرانی	المعجم الصغیر
طبرسی	مجمع البیان
طبری	(i) جامع البیان
	(ii) تاریخ الرسل والملوک
طہا	تاریخ الدول الاسلامیہ
طنطاوی	عمر بن خطابؓ
ع	
عابدین' ابن عابدین	ردالمحتار
عاصم' ابن عاصم	تحفۃ الاحکام
عبد ربہ' محمد بن عبد ربہ	العقد الفرید
عبدالرزاق	المصنف عبدالرزاق
عبید' ابو عبیدالقاسم	کتاب الاموال
عثمانی' فہیم عثمانی	حفاظت و حجیت حدیث
عربی' ابن العربی	احکام القرآن
عروہ' عروہ بن زبیر	مغازی رسولؐ اللہ
عساکر' ابن عساکر	تاریخ دمشق
عقاد' عباس محمود	العبقریات الاسلامیہ
عماد' ابن عماد	شذرات الذہب
عودہ	التشریع الجنائی الاسلامی
عینی	عمدۃ القاری
غ	
الغزالی	احیاء علوم الدین
غفاری' نور محمد	(i) اسلام کا قانون محاصل
	(ii) نبی کریم کی معاشی زندگی
	(iii) اسلام کا معاشی نظام

ق

مصنف	کتاب
قاضی	فتاویٰ خانیہ
قتیبہ، ابن قتیبہ	(i) عیون الاخبار
	(ii) الامامۃ والسیاسۃ
قدامہ، ابن قدامہ	(i) المغنی
	(ii) الشرح الکبیر
قرافی	الاحکام فی تمیز الفتاویٰ
قرضاوی	(i) فقہ زکوٰۃ
	(ii) الحلال و الحرام فی الاسلام
قرطبی	احکام القرآن
قسطلانی	ارشاد الساری
قطب، سید قطب	(i) فی ظلال القرآن
	(ii) معالم فی الطریق
قیم، ابن قیم	زادالمعاد

ک

مصنف	کتاب
کاسانی	بدائع الصنائع
الکتبی	فوات الوفیات
کثیر، ابن کثیر	(i) تفسیر القرآن العظیم
	(ii) البدایہ والنہایہ
کحالہ، عمر رضا	معجم المؤلفین
کلینی	الاصول من الکافی

م

مصنف	کتاب
مالک، انس بن مالک	المؤطا
ماجہ	السنن
ماوردی	الاحکام السلطانیہ
مبارک، صفی الرحمٰن	الرحیق المختوم
محمصانی ـــ ڈاکٹر صبحی	فلسفۂ شریعت اسلام
مراغی	تفسیر المراغی
مرغینانی	الہدایۃ
مسعودی	(i) مروج الذہب
	(ii) تنبیہ والاشراف
مسلم	الجامع الصحیح
مقدسی	البدء والتاریخ
مقریزی	کتاب السلوک
مناظر، مناظر احسن گیلانی	تدوین حدیث
منذری	الترغیب والترہیب
مناوی	کنوز الحقائق
مودودی	(i) تفہیم القرآن
	(ii) سیرت سرور عالمؐ
	(iii) سنت کی آئینی حیثیت
	(iv) خلافت ملوکیت
	(v) اسلامی ریاست
	(vi) معاشیات اسلام
	(vii) رسائل و مسائل
	(viii) تفہیمات
موصلی	المختار

ن

مصنف	کتاب
نجات، نجات اللہ صدیقی	(i) اسلام کا نظریۂ ملکیت
	(ii) شرکت و مضاربت کے شرعی اصول
نجیم، ابن نجیم	الاشباہ والنظائر

مصنف	کتاب
ندوی، شاہ معین	خلفائے راشدین
ندیم، ابن ندیم	الفہرست
نسائی	سنن نسائی
نعمانی، محمد منظور	معارف الحدیث
نووی	شرح صحیح مسلم
و	
واقدی	کتاب المغازی
ہ	
ہشام	سیرۃ النبویۃ
ہیکل	عمر ابن خطابؓ
ی	
یعقوبی	تاریخ یعقوبی
یعلیٰ، ابو یعلیٰ	احکام السلطانیہ
یوسف، امام ابو یوسف	کتاب الخراج

نوٹ: انگریزی ماخذ کیلئے ملاحظہ ہو ماخذ و مراجع صفحہ ۵۰۹

باب اول

عہد جاہلیت ---- بصیرت عمر کا آغاز و اظہار

☆۔ بچپن و جوانی
☆۔ قبول اسلام
☆۔ شہادت
☆۔ شجرۂ نسب

/

حالات زندگی

۔۔ نام و لقب:

آپ کا نام عمرؓ اور کنیت "ابو حفص" یا ابوالاسد جس کے معنی ہیں شیر کا باپ[1]۔ آپ کا اپنا قول ہے کہ سب سے پہلے مجھے یہ کنیت نبی کریم ﷺ نے عطا فرمائی۔ فرمایا "ابا حفص انقتل عم نبیک؟" میں نے عرض کیا آپ اگر حکم دیں گے تو یہ بھی کر گزروں گا۔ فرمایا "لوگ چہ میگوئیاں کریں گے کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کراتا ہوں۔" اس طرح مجھے ابو حفص کی کنیت ملی[2]۔ جو رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمائی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ بدر کے روز رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ بنی ہاشم اور کچھ دیگر لوگوں کو زبردستی (جنگ کیلئے) باہر نکالا گیا ہے۔ انہیں ہمارے ساتھ جنگ کرنے سے کوئی سروکار نہیں۔ اس لئے تم میں سے کوئی شخص بنی ہاشم کے کسی شخص سے ملے تو اسے قتل نہ کرے اور جو ابوالبختری بن ہشام سے ملے تو اسے قتل نہ کرے اور جو رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس بن عبدالمطلب سے ملے تو انہیں قتل نہ کرے کیونکہ وہ زبردستی نکالے گئے ہیں۔ اس پر حضرت ابو حذیفہؓ نے کہا کہ ہم اپنے باپ دادا بیٹوں پوتوں بھائیوں اور اپنے خاندان کے لوگوں کو تو قتل کریں اور عباس کو چھوڑ دیں واللہ اگر میں ان سے ملوں گا تو ضرور تلوار کا نوالہ بناؤں گا۔ یہ خبر رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا "یا ابا حفص. ایضرب وجه عم رسول الله ﷺ بالسیف" حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ پہلا روز تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ابو حفص کی کنیت سے خطاب فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیجئے کہ اس کی گردن تلوار سے اڑا دوں واللہ وہ منافق ہو گیا ہے[3]۔

آپ کا لقب "الفاروق" ہے۔ یہ عظیم الشان لقب آپ کو کیسے ملا؟ اس بارے میں مختلف روایات مذکور ہیں۔ نزال بن سبرہ الہلالی سے مروی ہے کہ ایک دن ہم حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر تھے۔ ہم نے کہا اے امیر المومنین! ہمیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ بتائیے۔ فرمایا۔ "ذالک امرؤ سماء الله. الفاروق' فرق بين الحق و الباطل' سمعت رسول الله ﷺ يقول: اللهم اعز الاسلام بعمر"[4]۔

بعض اور روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لقب رسول اکرم ﷺ کا عطا کردہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں۔ میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ آپ کا لقب فاروق کس طرح پڑ گیا تو آپؓ نے اپنے قبول اسلام کے واقعے کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں ہم ضرور حق پر ہیں۔ میں نے عرض کیا تو پھر ہم چھپتے کیوں ہیں؟ تو پھر ہم دو صفیں بنا کر نکلے۔ ایک میں حضرت حمزہؓ تھے اور دوسری میں میں تھا' حتی کہ ہم مسجد حرام میں داخل ہوئے۔ قریش نے جب مجھے اور حمزہؓ کو دیکھا تو انہیں بہت شدید صدمہ پہنچا اس روز مجھے رسول اللہ ﷺ نے "فاروق" کا خطاب بخش دیا کیونکہ اسلام ظاہر ہو گیا اور حق و باطل کے درمیان فرق پیدا ہو گیا[5]۔ اسی طرح حضرت ایوبؓ بن موسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ان الله جعل الحق على لسان عمرؓ و قلبه وهو الفاروق' فرق الله به بين الحق و الباطل"[6]۔

ابو عمرو ذکوانؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حضرت عمرؓ کا نام فاروق کس نے رکھا؟ جواب دیا "رسول اللہ ﷺ نے"[7]۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کو پہلے یہ لقب اہل کتاب نے دیا' پھر مسلمانوں کو بھی پسند آ گیا اور انہوں نے بھی اختیار کر لیا۔ چنانچہ ابن شہاب کہتے ہیں۔

---

(۱) سعد ۳ ۲۷۱٬ ۲۷۱' جوزی ۳۰' مسعودی ۲۹۲/۱ (۲) جوزی ۳۰ (۳) ہشام ۲۸۱/۲ (۴) جوزی ۱۴ (۵) سیوطی ۱۱۴-۱۱۳ جوزی ۱۳

(۶) سعد ۳ ۲۷ بر ۵۷٫۲ جوزی ۱۴ طبقی ۱۱ ۵۷۹ (۷) سعد ۳ ۲۷۰ صدی ۴ ۱۹۵ جوزی ۱۴ الیر ۵۷/۲' کثیر ۷ ۱۲۷۔

"بلغنا ان اھل الکتاب کانوا اول من قال لعمر الفاروق وکان المسلمون یا ثرون ذلک من قولھم[۱]"۔ اس کی تائید ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے کہ فتح بیت المقدس کے موقع پر جب آپؓ مقدس مقامات کی زیارت کر رہے تھے تو اس مقام پر پہنچے جہاں بنی اسرائیل کے زمانے میں رومیوں نے بیت المقدس کو ہندسہ بنایا تھا۔ اتنے میں اچانک نعرۂ تکبیر کی آواز سنی۔ آپؓ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ بتایا گیا کہ حضرت کعبؓ اور ان کے ساتھ کچھ اور لوگوں نے تکبیر بلند کی ہے۔ آپؓ نے فرمایا اسے میرے پاس لاؤ۔ وہ آئے اور عرض کیا "اے امیر المومنینؓ آج جو کچھ میں نے کہا ہے اس کے بارے میں پانچ سو سال پہلے یک نبی نے پیشین گوئی کی تھی۔" آپؓ نے پوچھا وہ کیسے؟ وہ بولے "نبی نے کہا تھا اے اورو شلم تمہیں خوشخبری کہ تمہارے پاس "فاروق" آئے گا جو تمہیں پاک صاف کرے گا۔ ربیعہ الشامی نے بھی اسی قسم کی روایت کی ہے جس میں یہ الفاظ زائد ہیں۔ "تیرے پاس ایک فاروق میرے فرمانبردار لشکر کو لے کر آئے گا اور اہل روم سے تیرا انتقام لے گا[۲]۔"

حضرت عمرؓ کا ایک اور لقب "الاصلع" یا "الاصیلع" بھی ہے جس کے معنی ہیں ایسا شخص جس کے سر کے اگلے حصے کے بال نہ ہوں[۳] لیکن یہ زیادہ مشہور نہیں ہوا۔ اس لئے تاریخ کی کسی کتاب میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تعریف و مدح کا پہلو نہیں پایا جاتا۔ اس بارے میں بس ایک ہی روایت موجود ہے۔ عبداللہ بن سرجس کہتے ہیں کہ "رایت الاصلع یعنی عمرؓ (فی روایۃ المقدمی وابی کامل "الاصیلع") یقبل الحجر و یقول واللہ انی لاقبلک وانی اعلم انک حجر وانک لاتضر ولا تنفع ولولا انی رایت رسول اللہ ﷺ قبلک ماقبلتک[۴]۔" بہر حال اس روایت سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے عہد خلافت میں یہ لقب اس قدر معروف ضرور تھا۔ کہنے اور سننے والے اس سے آپؓ کی ذات گرامی مراد لے سکیں۔

O..... حلیہ:

بے حد قوی و مضبوط[۵] اور بھاری و خوبصورت جسم[۶] چمکتا ہوا سفید رنگ اس پر سرخی غالب[۷] آنکھوں میں سرخ ڈورے[۸] پیشانی سے اڑے ہوئے[۹] مگر کنگھی سے سنورے ہوئے سنہرے بال[۱۰] ذرا سے پچکے ہوئے گال[۱۱] سفید و خوبصورت دانت[۱۲] بڑی اور گھنی مونچھیں[۱۳] زردی مائل داڑھی[۱۴] عمر رسیدہ پن سے مجتنب پر وقار اور متین چہرہ جس سے ہیبت و جلال چھلکے[۱۵] گرجدار آواز[۱۶] سب سے نمایاں اور ممتاز کرنے والا لمبا قد[۱۷] کندھوں میں آگے کی طرف خفیف سا جھکاؤ[۱۸] بازوؤں پر سرخی مائل گھنے بالوں کی کثرت[۱۹] دونوں ہاتھوں سے یکساں کام لینے کی صلاحیت[۲۰] زمین پر پڑنے والے جمے ہوئے قدم[۲۱] اور چلتے وقت دونوں پاؤں میں کشادگی[۲۲] رفتار میں ایسی تیزی اور وقار جیسے کسی گھوڑے پر سوار ہوں اور لوگ آگے سے ہٹتے جائیں[۲۳]۔

یہ ہے فاروق اعظمؓ کا سراپا۔ آخری عمر میں بالوں میں خضاب بھی لگاتے تھے[۲۴]۔ پیشانی کے بال آخری عمر میں جھڑنا شروع ہوئے[۲۵] عہد خلافت میں شدید قحط خشک سالی کے دنوں میں گھی اور گوشت سے مکمل اجتناب کرنے کی وجہ سے رنگ کچھ گندمی سا ہو گیا[۲۶]۔

---

(۱) سعد ۲۷۰/۳' طبری ॥ ۱۹۵/٤' جوزی ؛ ۱٤' اثیر ॥ ۵۷/٤ (۲) طبری ॥ ۶۱۱/۳ (۳) مطور ٤۰۸' لویس ۲۳۲ (٤) مسلم ۶۷/٤' حنبل ۱ ۲۵۷ (۵) جوزی ؛ ٤ (۶) جوزی ؛ ٤' سعد ۳/۳۲۵ (۷) سعد ۳/۳۲۵' طبری ٤/۱۹۶' اثیر ॥ ۷۸/٤ سیوطی ؛ ۱۳۰' کثیر ॥ ۱۳۸/۷ (۸) جوزی ؛ ٤' بر ؛ ٤ ۱۱٤۶ کثیر ॥ ۱۳۸/۷ (۹) سعد ۳/۳۲۵' اثیر ॥ ۷۸/٤ سیوطی ؛ ۱۳۰ (۱۰) سعد ۳/۳۲۵' یعقوبی ۲/۱۶۱ (۱۱) سیوطی ؛ ۱۳۰ (۱۲) کثیر ॥ ۱۳۸/۷ (۱۳) سیوطی ؛ ۱۳۰' (۱٤) اثیر ॥ ۷۸/٤ (۱۵) مسعودی ۲/۳۱۳' جوزی ؛ ٤ (۱۶) جوزی ؛ ٤ (۱۷) سعد ۳/۳۲۵' بر ؛ ٤/۱۱٤۶' جوزی ؛ ٤' اثیر ॥ ٤ ۷۸ (۱۸) جوزی ؛ ٤ بر ؛ ٤/۱۱٤۶ (۱۹) ایضاً (۲۰) سعد ۳/۳۲۵' یعقوبی ۲/۱۶۱ اثیر ॥ ۷۸/٤ (۲۱) جوزی ؛ ٤ (۲۲) سعد ۳ ۳۲۵ (۲۳) طبری ٤ ۱۹۶ جوزی ؛ ٤ اثیر ॥ ۷۸/٤ (۲٤) یعقوبی ۲/۱۶۱ جوزی ؛ ٤ (۲۵) سعد ۳/۳۲۵' طبری ٤ ۱۹۶ (۲۶) سعد ۳ ۳۲۵ اثیر ٤ ۷۸ سیوطی ؛ ۱۳۰

٥..... خاندان:

آپ خاندان بنو عدی کے چشم و چراغ ہیں[۱]۔ آپ کا سلسلۂ نسبت آٹھویں پشت پر نبی آخر الزماں ﷺ کے ساتھ مل جاتا ہے[۲]۔ آپ کا خاندان جبل عاقر کے دامن میں سکونت پذیر تھا۔ عہد جاہلیت میں آپ کا مکان اسی جگہ پر تھا اس لئے بعد میں اس پہاڑ کا نام "جبل عمر" مشہور ہو گیا[۳]۔ قبیلہ بنو عدی قریش کے دس نامور قبیلوں میں سے ایک تھا۔ عہد جاہلیت میں قریش نے انتظامی امور کو مختلف قبیلوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں سے سفارت و مناظرہ منصب انہیں حاصل تھا جسے سالہا سال سے انہوں نے بطریق احسن سنبھال رکھا تھا۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کے جد امجد عبدالمطلب اور حرب بن امیہ کے درمیان سفر حبشہ کے دوران مناظرہ کی ٹھہری تو انہوں نے پہلے نجاشی کو حکم قرار دیا لیکن اس نے بیچ میں پڑنے اور فیصلہ دینے سے انکار کر دیا (غالباً اس کی وجہ یہی ہوگی کہ حسب و نسب شناسی نسب دانی جرأت اور ترجیح دلائل کی ضرورت ہوتی ہے نجاشی اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے عربوں کے معاملات میں مداخلت کو قرین مصلحت نہ سمجھا ہو) چنانچہ حتمی فیصلے کیلئے انہوں نے بالآخر حضرت عمر فاروقؓ کے دادا نفیل بن عبدالعزیٰ کی طرف رجوع کیا۔ وہ چونکہ دونوں کے حالات و معاملات سے اچھی طرح باخبر تھے۔ انہوں نے بڑے بلیغ انداز میں فیصلہ دیتے ہوئے حرب سے مخاطب ہوئے

"یا ابا عمرو اتنافر رجلا هو اطول منك قامة واعظم منك هامة واوسم منك سامة واقل منك لامة واكثر منك ولدا واجزل منك صفدا واطول منك مذودا"[۴] کیا تو اس سے منافرہ کرتا ہے جو تجھ سے زیادہ بلند و بالا ہے، تجھ سے زیادہ بڑے سر والا ہے، تجھ سے زیادہ وجیہ ہے، موجبات ملامت میں تجھ سے بہت کم ہے، تجھ سے زیادہ کثیر الاولاد ہے، تجھ سے زیادہ وہ جزیل العطاء و کریم و جواد ہے اور تجھ سے زیادہ لمبی زبان والا (فصیح اللسان) ہے۔ اور اس کے بارے میں کہا "وانه لبعيد الغضب رفيع الصوت في العرب جلد المريرة لحبل العشيرة ولكنك نافرت منفرا"[۵]۔ اس طرح دونوں کا تقابل کرنے کے بعد جب عبدالمطلب کے حق میں فیصلہ دے دیا تو وہ ناراض ہو گیا اور عبدالمطلب کو چھوڑ کر عبداللہ بن جدعان کی رفاقت و ہم نشینی اختیار کر لی[۶]۔ اس طرح ان کے پاس مختلف فیصلے آتے رہتے تھے۔ اس لئے مؤرخین نے یہ لکھا ہے "كان يتحاكم اليه قريش"[۷] اور "قضاة العرب في الجاهلية كانت تتحاكم اليه في خصوماتها ومنافراتها"[۸]۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو یہی عظیم منصب اہل قریش نے آپ کے حوالے کر دیا۔ روایت میں آتا ہے "وكان عمر بن الخطاب رضي الله عنه من أشراف قريش، واليه كانت السفارة في الجاهلية، وذلك ان قريشا كانت إذا وقعت بينهم حرب او بين غيرهم بعثوه سفيرا وإن نافرهم منافر او فاخرهم مفاخر رضوا به بعثوه منافرا و مفاخرا"[۹]۔ "یعنی آپ اشراف قریش میں سے تھے اور جاہلیت کے زمانہ میں آپ کے ساتھ سفارت متعلق تھی یعنی جب قریش کی آپس میں لڑائی ہوتی تھی یا کسی دوسرے ملک سے جنگ ہوتی تھی تو قریش آپ کو ہی سفیر بنا کر بھیجا کرتے تھے یا کبھی اگر آپس میں فخر نسب کے اظہار کی ضرورت لاحق ہوتی تھی تو آپ ہی اس کام کیلئے روانہ کئے جاتے تھے۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ عہد جاہلیت میں جب کہ ابھی نوجوان تھے، قوت فیصلہ، فہم و فراست، حکمت و بصیرت، انتظام و تدبر کی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے اور انہی کی بدولت آپ قریش میں معروف بھی تھے اور ممتاز بھی۔ آپ کی قیادت پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ خطاب قریش کے ممتاز آدمیوں میں سے تھے۔ طبیعت کے اعتبار سے نہایت سخت گیر تھے۔ مشرکانہ عقائد میں بڑے پختہ، مروجہ نظام کے پرجوش حامی و محافظ اور کٹر قوم پرست راہنما تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کا دین چھوڑ کر

---

(۱) سعد ۳/۲۶۵ سیوطی ا/۱۰۸ (۲) سعد ۳/۲۶۵ زبیری ۱۰/۳۴۷ (۳) سعد ۳/۲۶۶ (٤) سعد ۸۷ اثیر ۱/۹۰ (٥) اثیر ۱/۹۰ (٦) سعد ۸۷/۱ اثیر ۲ (۷) زبیری ۱۰/۳۴۷ بلاذری ۱۰/۸۳ (۸) زرکلی ۱۸/۹ (۹) طبرا ۱۱۴۵ جوزی ا/۹۲ سیوطی ا/۸

توحید پرستی اختیار کرنے کے جرم میں اپنے بھتیجے زید بن عمرو کو سخت تکلیفیں دیتے رہے[۱]۔ ان کی بیوی صفیہ کے ذریعے سرگرمیوں کی اطلاع حاصل کرتے۔ بالآخر شہر بدر کر دیا اور انہیں حرا میں پناہ لینی پڑی۔ اس پر بھی ان کی تسلی نہ ہوئی انہوں نے قریش کے اوباش نوجوانوں اور جاہلوں کو ان کے پیچھے لگا دیا اور یہ کہہ دیا کہ اسے مکہ میں داخل نہ ہونے دو۔ جب کبھی وہ چوری چھپے مکہ میں داخل ہوتے تو وہ لوگ خطاب کو اطلاع دیتے پھر سب مل کر انہیں تکلیفیں دیتے اور وہاں سے نکال باہر کرتے[۲]۔ اس کا سبب بروایت ابن ہشام یہ تھا "کراهية ان يفسد عليهم دينهم و ان يتابعه احد منهم على فراقه[۳]"۔ کہ کہیں ان کا دین نہ بگاڑ دیں اور ان میں سے کوئی الگ ہو کر کہیں ان کا پیروکار نہ بن جائے۔ آخر تنگ آ کر وہ شام کی طرف چلے گئے۔ ان واقعات سے بعض مورخین کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خطابؓ ایک غیر معروف آدمی تھے۔ اپنے آبائی دین کے تحفظ و دفاع کیلئے یہ منظم کاوشیں اور تاریخ میں ان کا محفوظ ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ وہ بااثر اور نمایاں افراد میں سے تھے۔

خطابؓ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی اسماءؓ بنت وہب جس سے زیدؓ بن خطابؓ پیدا ہوئے[۴]۔ حضرت عمر فاروقؓ سے بڑے تھے ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے۔ ان کی شہادت کی تمنا جنگ یمامہ کے موقع پر پوری ہوئی۔ حضرت عمرؓ ان سے بہت شدید محبت کرتے تھے اس لئے بچھڑنے پر بہت ملول ہوئے۔ کہا کرتے تھے "ماهبت الصبا الا انسني بريح زيد" اور فرماتے تھے "رحم الله اخي زيداً فانه سبقني الى الحسنيين اسلم قبلي و رزق الشهادة قبلي[۵]" دوسری شادی حنتمہ بنت ہاشم سے کی جن سے حضرت عمر فاروقؓ اور ان کی دو بہنیں صفیہ اور امیمہ (فاطمہ ؟)[۶] پیدا ہوئیں۔ حضرت عمرؓ کی والدہ حنتمہ بنت ہاشم بنو مخزوم سے تھیں اور نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد ہشام عرب کے سرداروں اور بنی مخزوم کے رئیسوں میں سے تھے[۷]۔ ان کے دادا مغیرہ اس پائے کے آدمی تھے کہ جب قریش کسی قبیلہ سے نبرد آزمائی کیلئے جاتے تھے تو فوج کا اہتمام انہی کے سپرد ہوتا تھا[۸]۔ وہ خالد بن ولیدؓ اور ابو جہل کی چچا زاد بہن تھیں[۹]۔ آپ کی والدہ کا سلسلہ نسب ساتویں پشت پر رسول اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے[۱۰]۔ حضرت عمر فاروقؓ واقعہ فیل کے ۱۳ سال بعد[۱۱] اور حرب فجار اعظم سے چار سال قبل پیدا ہوئے۔ ان کا اپنا قول ہے کہ "ولدت قبل الفجار الاعظم الآخر باربع سنين[۱۲]"۔

نرینہ اولاد کی فطری خواہش اہل عرب کے ہاں محض کفالت و معاونت کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ فخر و مباہات کی بنیاد ہونے کی وجہ سے بھی حد سے زیادہ پائی جاتی تھی۔ عام طور پر اسی بنا پر زیادہ شادیاں کرنے کا رواج تھا۔ ان کے والد کے ہاں اولاد کی کمی تھی اس لئے ان کی پیدائش پر غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا گیا۔ حضرت عمروؓ بن عاص اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ایک جلسہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً ایک غل تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ خطابؓ کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے[۱۳]۔ انہی کے حوالے سے ایک روایت یہ بھی منقول ہے۔ "رايت مصباحا في مرن الخطاب فسئلت عنه فقيل لي ولد الليلة للخطاب غلام فكان عمر بن الخطاب رضي الله عنه[۱۴]"۔

O ..... مشاغل:

معلوم یہ ہوتا ہے کہ آپ کے والد نے بچپن ہی سے آپ کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ اس لئے آپ کے مزاج، طبیعت اور عقائد و افکار پر اپنے والد کا گہرا اثر ہوا۔ جب حضرت عمرؓ سن رشد تک پہنچے تو ان کے والد نے انہیں اپنے کاموں میں ساتھ ملا لیا اور عرب کے دیگر معزز گھرانوں کے بچوں کی طرح انہوں نے بھی

---

(۱) وصیر ۱ ۳٦٨ (۲) هشام ۲٤٤-۲٤٤ مسعودی ا ۱ ٧ کثیر II ۲ ۲۳٨ (۳) هشام ۱ ۲٤٦ (٤) بیوت ۳٤٧ (٥) بعد (٦) بعد (٧) کثیر ۸۸/۹ (۸) سبی II ۵۰ (۹) عسیرا ٤٤ ثیرII ٤ ۵۳ مسعودی ا ۲ ۳۲۲ (۱۰) ملاحظہ ہو نقشہ نسب (۱۱) سیوطی II ۸ (۱۲) سعد ۳ ۲٦٩ طبری ۱۹۷/٤ جوزی II ۳ عسقلانی ا ٤/٥۳ (۱۳) شبلی II ۵۰ (۱٤) جوزی ا ۳۰

بکریاں اور اونٹ چرانے شروع کردیے[۱]۔ ان کے والد کچھ تو اپنے مزاج کی درشتی اور کچھ انہیں سخت کوشی اور محنت کا عادی بنانے کیلئے ان پر جبر کرتے اور سارا دن ان کو مشغول رکھتے۔ اس کے پیچھے معاشی مقاصد بھی کارفرما تھے کیونکہ اہل عرب کیلئے تجارت کے علاوہ آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کی پرورش تھی۔ ان کے والد معاشی اعتبار سے زیادہ خوشحال نہیں تھے اور نرینہ اولاد کی بھی قلت تھی اس لئے ان کی یہ ضرورت تھی کہ زیادہ وقت انہیں کام میں لگا کر اپنا معاشی سہارا بنائیں۔ حضرت عمرؓ اپنی یہ خدمت وادی ضجنان میں عام طور پر سرانجام دیا کرتے تھے جو مکہ سے ۱۵ میل کے فاصلے پر تھی[۲]۔ اپنے عہد خلافت میں آخری حج کے موقع پر اسی وادی سے گزر ہوا تو اپنا بچپن یاد آ گیا اور فرمایا "بعدها الحمدلله ولا اله الا الله' يعطى من يشاء مايشاء' لقد كنت بهذا الوادى يعنى ضجنان ارعى ابلا للخطاب' وكان فظا غليظا يتعبنى اذا عملت' و يضربنى اذا قصرت' وقد اصبحت وامسيت وليس بينى و بين الله احد اخشاه "اس کے بعد انہوں نے چند عبرت آموز اشعار پڑھے جن میں دنیا کی بے ثباتی اور بڑے بڑے بادشاہوں کے ختم ہو جانے کا تذکرہ ہے[۳]۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروقؓ کو بچپن ہی سے بھرپور خوداعتمادی سے نوازا۔ اسی وجہ سے اپنے ہم عمر بچوں کی قیادت کرتے۔ اپنے سے بڑے لوگوں سے محض عمر کی وجہ سے مرعوب نہیں ہوتے تھے اور دوسرے بچوں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔ ایک مرتبہ اپنے بھائی اور چچا زاد بھائی کو مخاطب کر کے کہا "نحن صبيان احداث' لاتحقروا انفسكم بحداثة اسنانكم[۴]۔" اپنے آپ کو اس لئے کمتر نہ سمجھو کہ تمہارا سن کم ہے اور کم عمر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دل میں بچوں کی عزت اور اہمیت ہمیشہ موجود رہی۔ بقول ابن جوزی "حضرت عمرؓ مشکل مسائل کے بارے میں چھوٹی عمر کے بچوں تک سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی عقلوں کی تروتازگی سے فائدہ اٹھائیں[۵]۔ اس میں ایک حکمت یہ بھی نظر آتی ہے کہ ان کو دینی معاملات اور عملی مسائل کی طرف راغب کیا جائے تاکہ ان میں فہم و فراست' دین کی سمجھ اور اجتہادی بصیرت پیدا ہو۔ اس لئے کہ اسلام کا مستقبل انہی سے وابستہ تھا۔

آپؓ نے ان تمام جسمانی مشاغل میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو ان کے عہد کے جوانوں میں مقبول و مروج تھے۔ ان میں ایک پہلوانی و کشتی ہے۔ شعبی سے روایت ہے کہ بچپن میں حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمرؓ فاروق کشتی لڑا کرتے تھے (وہ ان کے ماموں کے بیٹے تھے) حضرت خالدؓ نے ایک مرتبہ ان کی پنڈلی توڑ دی۔ علاج کرانے کے بعد ٹھیک ہو گئی[۶]۔ اس کے باوجود انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا کہ حوصلہ ہارنا ان کی طبیعت ہی میں نہیں تھا۔ بالآخر اس شوق نے انہیں درجہ کمال تک پہنچا دیا اور میدان عکاظ میں بھی اپنی مہارت و طاقت کا لوہا منوا لیا جو نخلہ و طائف کے مابین واقع تھا۔ عہد جاہلیت میں یہاں ہر سال اہل عرب اکٹھے ہوتے اور ایک عظیم میلہ لگتا۔ مختلف قبائل کے جوانوں کے مابین مقابلے ہوتے اور فخر و مباہات کے دعووں کی آزمائش ہوتی اور تمام مروجہ فنون کے ماہرین کے درمیان فیصلے ہوتے[۷]۔

پہلوانی نے انہیں صحرائے عرب میں اس قدر مشہور کر دیا کہ چرواہوں تک ان کے نام سے شناسا تھے۔ ان کے عزم و ہمت اور قوت ارادی سے بھی آگاہ تھے کہ جس کام کے علمبردار بنتے ہیں اسے سربلند کر کے چھوڑتے ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم تھا ہر فن مولا ہیں۔ ابوالتیاح کہتے ہیں کہ میں ایک چرواہے سے ملا اور سے کہا "اشعرت ان ذاك الا عسر الا يسر اسلم؟" کیا تو جانتا ہے کہ وہ شخص جو اپنے ہاتھ سے ہر کام کرنے والا ہے مسلمان ہو گیا ہے؟ اس نے پوچھا "الذى كان يصارع فى سوق عكاظ؟" جو بازار عکاظ میں کشتی لڑا کرتا تھا؟ کہا: ہاں! اس پر اس چرواہے نے کہا "اما والله ليو سعنهم خيراً اوليو سعنهم شراً"

---

(۱) سعد ۳: ۲۶۶ (۲) یاقوت ۱۲: ۴۵۳ (۳) سعد ۳: ۲۶۶ طبری ۱۱: ۴ ۲۱۹ ... ۱۱۵۷ (۴) جوزی: ۱۸۹ ... (۵) ... ۸۹

(۶) کثیر ۱۱: ۱۱۵/۷ (۷) یاقوت ۱۴۲/۱۴ ... اثیر ۱: ۲۶۰

خدا کی قسم یہ تو وہ ان کے خیر کو وسعت دے گا یہ شر کو[1]۔ دوسرا بڑا شوق جس میں ان کا کمال مسلم تھا وہ شہسواری ہے۔ اس میں ان کی مہارت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بغیر رکاب کے اپنے ہاتھوں سے گھوڑے کے کانوں کو پکڑ کر اس کی پشت پر کود کر بیٹھ جاتے تھے[2]۔ ان کا یہ شوق آخری عمر تک قائم رہا۔ ان کے عہد خلافت کا ایک واقعہ "ابی مسعود انصاری سے مروی ہے کہ ہم لوگ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص گھوڑے پر سوار سامنے آیا جو اسے ایڑ مارتا ہوا اچل رہا تھا۔ قریب تھا کہ ہمیں کچل دے۔ ہم اس سے ڈر کے کھڑے ہو گئے۔ دیکھا تو وہ عمرؓ بن الخطاب تھے۔ ہم نے کہا کہ یا امیر المومنین آپ کے بعد کون ہے' فرمایا تمہیں نئی بات کیا معلوم ہوئی' مجھے طبیعت میں فرحت معلوم ہوئی تو میں نے گھوڑا لیا اور اس پر سوار ہوا[3]۔ اس شوق کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے عہد خلافت میں گھوڑوں کی افزائش و حفاظت کے خصوصی انتظامات کیلئے ان کیلئے چراگاہیں مختص کیں۔ اصطبل بنائے نگرانوں کا تقرر کیا۔ صرف کوفہ میں ناگہانی واقعات کیلئے چار ہزار گھوڑے محفوظ تھے' جن کی ذمہ داری سلمان بن ربیعہ باہلی کے سپرد تھی جو کوفہ کے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر ان کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے تھے ہر سال گھوڑ دوڑ بھی کرائی جاتی تھی۔ کل آٹھ شہروں میں اسی قدر تعداد کیلئے ایسے ہی انتظامات کئے گئے تھے[4]۔ گھوڑوں کی تربیت کی طرف بھی خصوصی توجہ دیتے تھے اور اپنے تجربے سے جو چند اصول اخذ کئے ان کی طرف لوگوں کو راغب کرتے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بقول ابو امامہ آپ نے ارشاد فرمایا "ادبوا الخیل' وتسوکوا' وانتضلوا' واقعدوا فی الشمس[5]۔ "اپنے گھوڑوں کی تربیت کرو' انہیں سیر کرواؤ' انہیں خوب تھکا مارو اور انہیں دھوپ میں رکھو۔ ایک مرتبہ اپنے غلام یرفا سے پوچھا تم ہر گھوڑے کو کتنا چارہ کھلاتے ہو؟ اس نے کہا تین سیر کے قریب (ثلثین مدیا صالح) فرمایا "ان کان ھذا المکان اھل بیت من العرب[6]۔ ہر گھوڑے عربوں کیلئے ان کے اہل بیت و خاندان کا درجہ رکھتے ہیں۔

○.....علمی و ادبی ذوق:

ان مشاغل کے ساتھ ساتھ حضرت عمر فاروق اعلیٰ علمی و ادبی ذوق بھی رکھتے تھے اور عرب کے تمام مروجہ علوم و فنون سے نہیں خصوصی شغف تھا۔ بچپن ہی سے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ ان کا شمار قریش کے ان ۱۷ آدمیوں میں ہوتا تھا جو بعثت نبویؐ کے وقت لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آپ تورات کا مطالعہ براہ راست کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ کے پاس تورات کا نسخہ لے آئے اور کہا یہ تورات ہے پھر اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ آنحضور ﷺ کا چہرہ مبارک متغیر ہونا شروع ہو گیا تو حضرت ابو بکرؓ نے کہا تمہیں کھونے والیاں کھوئیں رسولؐ اللہ کا چہرہ نہیں دیکھتے؟ حضرت عمرؓ نے اوپر نظر اٹھائی اور کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے غضب سے۔ ہم راضی ہوئے اللہ کے رب ہونے اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر[7]۔ اسی سلسلے میں ان کا اپنا بیان ہے کہ "زانی رسول اللہ وانا امسک مصحفاً قد تشرفت حواشیہ' فقال ماھذا' قلت جزء من التوراۃ فغضب وقال' واللہ لو کان موسی حیا ماوسعہ الا اتباعی[8]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے عبرانی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ حضرت عمرؓ عہد جاہلیت ہی سے علمی ذوق و شوق سے سرشار تھے۔ اس لئے جب مسلمان ہوئے تو اسلام کی برپا کردہ علمی تحریک سے فطری طور پر دوسروں کی نسبت زیادہ متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ علم و فضل کے کمال تک پہنچ گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے "بینا انا نائم شربت یعنی اللبن حتی انظر الی الری یجری فی ظفری او فی اظفاری ثم ناولت عمر فقالو فما اولتہ قال العلم[9]۔ "نبی ﷺ نے فرمایا "ایک بار میں سو رہا تھا سوتے میں میں نے دودھ پیا اتنا کہ میں دودھ کی تازگی دیکھنے لگا۔ میرے ناخون یا ناخنوں پر بہہ رہی ہے پھر میں نے (اپنا بچا ہوا دودھ) عمر کو دے دیا۔ "صحابہؓ نے پوچھا اس کی تعبیر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "علم۔ "حضرت عمرؓ کے اس علمی فضل و تشخص کے سب معترف تھے اور اس کا کھل کر اظہار کرتے تھے۔ ان کے جذبات و احساسات کا اندازہ ابن

(۱) سعد ۳ ۳۲۵ (۲) سعد ۳ ۲۹۳ ابن جوزی II ۱۶ سیوطی IV ۱۳ (۳) سعد ۳ ۳۲۰ (٤) طبری ٤ ۵۲ (۵) جوزی I ۹۳ (٦) جوزی I ۷٦

(۷) دارمی: ۱/۱۱۵ (۸) ابن طبری: ۱/۲۳ (۹) بخاری: ۱۹۸/٤ مسلم: ۱۱۲/۷ ترمذی: ۲۸۲/۵ اثیر II ٤ ۲۰ حنبل ۲ ۸۳ حاکم ۳ ۸۳ دارمی ۲ ۱۲۸

وائل کی اس روایت سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فرمایا کہ عمرؓ کا علم اگر ترازو کے ایک پلہ میں رکھا جائے اور تمام آدمیوں کا علم دوسرے پلہ میں تو عمرؓ کا علم بھاری ہو گا۔ میں نے جب اس کا ذکر ابراہیم سے کیا تو انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم عبداللہؓ بن مسعود نے اس سے بڑھ کر کہا ہے۔ میں نے پوچھا کیا کہا ہے۔ جواب دیا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ جب عمرؓ کی وفات ہو گئی تو علم کے دس حصوں میں سے نو حصے جاتے رہے [1]۔ عمرو بن میمون نے ایک مرتبہ فرمایا "عمر ایک تہائی علم کے ساتھ وفات پا گئے۔" جب یہی بات ابراہیم کے سامنے بیان کی گئی تو انہوں نے فرمایا علم کے دس میں سے نو حصوں کے ساتھ چلے گئے [2]۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ تمام دنیا کا علم حضرت عمر فاروقؓ کی گود میں چھپا ہوا ہے [3]۔ روایت میں آتا ہے کہ ابن عباسؓ نے تین آدمیوں سے علم سیکھا حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ [4]۔ جن علوم و فنون میں انہیں خصوصی مہارت حاصل تھی ان میں ایک نسب دانی ہے یہ اہل عرب کا شعار تھا۔ ان کے والد اور دادا بھی بہت بڑے نساب تھے۔ سفارت کا موروثی منصب جو انہیں حاصل ہوا اس کا بھی یہ تقاضا تھا کہ اس فن میں انہیں مہارت حاصل ہو۔ چنانچہ انہیں عربوں کے نسبوں کی تفصیل کا ملکہ حاصل تھا [5]۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص سے دریافت کیا کہ تم کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو۔ اس نے بتایا تو پوچھا کیا تمہارے نسب کا تعلق نجران سے بھی ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تعلق ہے اس نے کہا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کوئی شخص اگر نجران سے اس کے سلسلۂ نسب سے واقف ہو تو میں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ ضرور خبر دے۔ ایک شخص نے کہا اے امیر المؤمنینؓ میں جانتا ہوں اس کو اہل نجران کی ایک عورت نے جنا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ٹھیک ہے ہم آثار دیکھ کر قیافہ لگاتے ہیں [6]۔ نسب کے بارے میں بہت متشدد تھے۔ حضرت صہیبؓ کو فرمایا کہ "اگر تمہارے اندر تین خامیاں نہ ہوتیں تو تم پر کسی کو مقدم نہ ٹھہراتا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ تم اپنا نسب عربی بتاتے ہو [7]۔" اس اہتمام کی وجہ انہوں خود بیان فرمائی کہ ہم قرآن میں پڑھا کرتے تھے کہ "لا ترغبوا عن ابائکم فانه کفر بکم" کہ اپنے آباء سے منہ نہ موڑو کہ یہ تمہارا کفر ہے یا یہ کہ "ان کفراً بکم ان ترغبوا عن ابائکم [8]۔" کہ تمہارا کفر یہ ہے کہ تم اپنے آباء سے منہ موڑو۔

نسب بہت سے سماجی و معاشی مسائل کی بنیاد ہے اور اس پر بہت سے شرعی احکام کا مدار ہے لہٰذا حضرت عمرؓ یہ حکم دیتے تھے "تعلموا من الانساب ما تواصلون بها [9]۔" علم الانساب سیکھو کہ جس کے سبب تم آپس میں ملتے ہو۔ بھی فرماتے "تعلموا انسابکم لتصلوا ارحامکم [10]۔" خاندانی رشتوں سے واقف رہو تا کہ صلہ رحمی کر سکو۔ علم الانساب سے اسی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے وظائف کیلئے رجسٹروں کا اہتمام نسب کی بنیاد پر کیا اور اس کام کیلئے قریش کے مشہور نسابوں کی خدمات حاصل کیں۔ ان میں عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم شامل تھے [11]۔ اس کام کی انہوں نے اپنی اس مہارت کی بناء پر خود نگرانی کی اور جہاں جھول دیکھا اس کی اصلاح کی۔ چنانچہ جب ناموں کی فہرست پیش کی گئی تو اس میں بنو ہاشم کے بعد بنو تیم اور اس کے بعد بنو عدی درج تھا چنانچہ فرمایا عمرؓ کو اس کے مقام پر رکھو۔ شروع ان سے کرو جو رسول اللہ ﷺ سے قریب تر ہوں [12]۔ نسب کا یہ اہتمام کسی تفاخر و تعصب کی بنا پر نہیں تھا بلکہ خالص تمدنی و شرعی ضرورتوں کی بنا پر کیا۔ اس لئے یہ واضح کر دیا کہ "فلا ینظر رجل الی القرابة و یعمل لما عند الله فان من قصر به عمله لا یسرع به نسبه [13]۔" کوئی شخص قرابت کو نہ دیکھے اور جو (نعمت) اللہ کے پاس ہے اس کیلئے عمل کرے کیونکہ جس کے عمل نے اس کے ساتھ کمی کی اسے اس کا نسب پورا نہیں کر سکے گا۔

---

(۱) اثیر II ۶۰/۴، سیوطی I ۱۲۰ (۲) دارمی ۱۰۱/۱ (۳) سیوطی I ۱۲ (٤) جوزیہ ۱۸۹ (٥) روس ۶۳۶ (٦) سعد ۳ ۲۹۰ (۷) حزم III ۸ ۲۹۷

(۸) عبدالرزاق ۹ ۵ (۹) جوزی I ۱۹۶، قسطنی ۱۰ ۲۷۳ (۱۰) جوزی I ۱۹۶ (۱۱) سعد ۳ ۲۹۵، سیوطی IV ۱۲۳ (۱۲) سعد ۳ ۲۹۵ (۱۳) سعد ۳ ۲۹۶

حضرت عمرؓ کی مہارت کا ایک اور پہلو زبان دانی بھی تھا۔ عربی زبان پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ اعلیٰ علمی و ادبی ذوق نے انہیں عربی زبان میں بھی بصیرت عطا کی۔ زبان کی باریکیوں سے خوب واقف تھے۔ ان کے خطبات، اقوال اور خطوط اس کا بین ثبوت ہیں۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی نے ایک شخص کو قرآن کی یہ آیت یوں پڑھاتے سنا "ان اللہ بریءٌ من المشرکین و رسولِہ"[1] یعنی رسولہ کے لام کے نیچے زیر تو کہا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر یہ نازل نہیں کیا۔ جھگڑا ہوا اور اس کے گلے میں کپڑا ڈال کر کہا میرے اور تمہارے درمیان عمرؓ بن خطاب ہیں۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو فرمایا "صدق الاعرابی انما ھی، و رسولُہ"[2]۔ حضرت عمرؓ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ عربی کتاب و سنت کی زبان ہے۔ لوگ جس قدر زیادہ سیکھیں گے اتنا زیادہ ان کی فکر و نظر اور اخلاق و عادات کی اصلاح ہوگی۔ تفقہ فی الدین اور عبادات کے ساتھ تفہیم عربی پر بھی زور دیتے تھے، فرمایا "علیکم بالفقہ فی الدین، و حسن العبادۃ، والتفھم فی العربیۃ"[3]۔ "ان کے نزدیک یہ عقل میں ثبات اور حوصلہ مندی میں اضافے کا بہترین ذریعہ تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوا "تعلموا العربیۃ فانھا تثبت العقول و تزید فی المروۃ"[4]۔ "تعلیم و تعلم کا سلسلہ اگرچہ ذاتی ذوق سے ہی استوار ہوتا ہے، لیکن اس کو پروان چڑھانا حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو اس کا احساس تھا اس لئے انہوں نے اپنے ایک گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا "من قبلک یتعلم العربیۃ فانھا تدل علی صواب الکلام"[5]۔ "ان کا اپنا یہ طریقہ تھا کہ اگر کوئی زبان کی غلطی کرتا تو اسے سمجھاتے بجھاتے اور اس کی اصلاح کرتے لیکن اگر کوئی لحن و اعراب کی غلطی کرتا تو اسے درے سے سزا دیتے کیونکہ اس طرح جملے کے معنی بھی تبدیل ہو جاتے۔ ابی عکرمہ کے بقول "کان عمر بن الخطاب اذا سمع رجلاً یخطئ فتح علیہ، واذا اصابہ بلحن ضربہ بالقوۃ"[6]۔"

ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے کاتب نے حضرت عمرؓ کے نام ایک خط بھیجا اور اس میں لکھا "من ابو موسی اشعری" حضرت عمرؓ فاروق نے اسے درہ مارنے اور برطرف کرنے کا حکم دیا۔ اپنے خط میں لکھا "اذا اتاک کتابی ھذا فاضرب کاتبک سوطاً واعزلہ عن عملک"[7]۔ "حضرت عمر فاروقؓ کی دلچسپی و مہارت کا ایک اور پہلو خطابت و مقرری ہے۔ اس کی افادیت ہر دور میں مسلمہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن اہل عرب کے ہاں ابلاغ کا واحد موثر ذریعہ یہی تھا۔ حضرت عمرؓ کو اس فن میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان کے مختلف خطبات جو کتب تاریخ میں محفوظ ہیں۔ یہی ثابت کرتے ہیں کہ وہ اس فن کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ تھے۔ وہ انتہائی بلیغ البیان اور فصیح الکلام تھے۔ موقع محل کی مناسبت سے بچی تلی بات کرتے۔ مثلاً سقیفہ بنی ساعدہ میں جب خلافت کے مسئلے پر انصارؓ و مہاجرینؓ میں گرما گرم بحث و تمحیص ہو رہی تھی تو حضرت عمرؓ مجمع کی نوعیت اور کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے پہلے سے ہی تقریر تیار کر کے گئے۔ گفتگو کی ابتدا کرنی چاہی تو حضرت ابو بکرؓ نے روک دیا۔ اس پہل کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی "قد ھیأت کلاماً قد اعجبنی"[8]، پھر درمیان میں ایک تقریر کی[9] وہ اتنا اثر پذیر تھی کہ لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ پر اتفاق کر لیا۔ ایک اچھا مقرر وہ ہوتا ہے جس کی تقریر میں اس کے جذبات و احساسات کی اس قدر آمیزش ہو کہ جو کچھ وہ کہے اس کا پورا سراپا اس کی جھلک پیش کر رہا ہو۔ اس کی بات میں دلیل بھی ہو زور بھی ہو جوش بھی ہو اور اعتماد بھی۔ وہ مجمع کے جذبات کو اپنے جذبات کے ساتھ لے کر چل رہا ہو۔ جس نتیجے تک پہنچنا چاہتا ہے اس کو محسوس حقیقت کے طور پر جلوہ گر کر دے۔ وفات نبوی ﷺ کے موقع پر حضرت عمرؓ کی تقریر[10] میں یہ سب خوبیاں شامل تھیں وہ ان کی جذباتیت کا نقطہ عروج تھا۔ انہوں نے ہر سامع کے دل و ذہن میں یہ بات اتار دی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا انتقال نہیں ہوا[11]۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابو بکرؓ نے دلائل سے جب یہ ثابت کر دیا کہ رسول اکرم ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں تو لوگوں کو پہلی مرتبہ حقیقت کا احساس ہوا اور پھوٹ پھوٹ

---

(۱) التوبۃ ۹: ۳ (۲) المغنی: ۲۰۱/۱ (۳) جوزی: ۱۹۷ (٤) ایضاً (۵) المغنی ۳۰۰/۱۰ (٦) ایضاً (۷) بلاذری ۲/۱ ٤٢٤ (۸) بخاری ۱۹٤۰٤ (۹) سعد ۱۷۹/۳، بلاذری ۵۸۰/۱-۲ (۱۰) بخاری: ۱۹٤/٤، سعد، طبری: ۲۰۰/۳ (۱۱) طبری: ۲۰۲/۳، بلاذری ۵٦۷/۱-۱

کررونے لگے اور حضرت عمرؓ خود گر کر بے ہوش ہو گئے[1]۔ تاثیر و نتائج کے اعتبار سے دونوں کے خطبات نفع بخش ثابت ہوئے اور حضرت عمرؓ نے سر عام جو دھمکی دی تھی کہ "جو لوگ یہ سمجھیں گے کہ رسول اللہ وفات پا گئے ہیں آپ واپس آئیں گے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں گے[2]۔ بقول حضرت عائشہ صدیقہؓ "فما کانت من خطبهما من خطبة الا نفع الله بها لقد خوف عمرؓ و ان فيهم لنفاقاً فردهم الله بذلك[3]۔"

حضرت عمرؓ کی خطابت کا ایک اور مظہر ان کا وہ خطبہ ہے جو انہوں نے خلیفہ بنتے ہی دیا تھا[4]۔ اس میں انہوں نے اپنے آئندہ کے لائحہ عمل اور سیاسی پالیسی کا اعلان کیا۔ اس میں انکساری بھی ہے اور عزم بھی کمزور اور خوفزدہ لوگوں کو حوصلہ دیا اور زیادتی کرنے والوں کو ڈرایا۔ اس کا ہر جملہ حکمت و فراست پر مبنی ہے۔ اس کی جامعیت و صداقت کا یہ عالم ہے کہ راوی کے بقول "فوالله ما راد على ذالك حتى فارق الدنيا[5]"۔ "علاوہ ازیں انہوں نے اپنے عہد خلافت میں بے شمار خطبے دیئے جو ہمیشہ موقع محل کی مناسبت سے ہوتے[6] تھے۔ ان میں دعوتی بھی تھے اور ترغیبی بھی، سیاسی بھی اور انتظامی بھی۔ ہمیشہ حمد و ثنا سے آغاز کرتے اور سرور کونین ﷺ نے جامعیت و اختصار کی جو روایت چھوڑی تھی اس پر پوری طرح عمل پیرا رہے۔ بقول زرکلی "وله كلمات و خطب و رسائل غاية في البلاغة[7]۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے خطابت کا آغاز کب کیا؟ اس بارے میں تاریخ خاموش ہے لیکن اغلب یہی ہے کہ خطابت کا فن انہوں نے عہد جاہلیت ہی سے سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی نعمانی نے ان کے منصب سفارت کو دلیل بنا کر یہ صحیح نتیجہ نکالا ہے کہ یہ منصب صرف اسی شخص کو مل سکتا تھا جو قوت تقریر اور معاملہ فہمی میں کمال رکھتا تھا[8]۔ ان تمام دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ کا مذاق شاعری بھی نہایت شستہ اور بلند تھا۔ عہد جاہلیت میں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان محفلوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ عکاظ اور اس کے علاوہ دوسرے مقامات پر شاعروں کا کلام سنتے اور جو شعر پسند آتے انہیں اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے اور مناسب موقعوں پر مزے لے لے کر پڑھتے[9]۔ اصمعی کہتے ہیں "ما قطع عمرؓ امراً الا تمثل ببيت من الشعر[10]"۔ "ایک دن نابغہ جعدی سے فرمایا "مجھے اپنے وہ اشعار سناؤ جو اللہ کے نزدیک جائز ہیں۔" اس نے چند اشعار سنائے تو آپ نے پوچھا "یہ تمہی نے کہے ہیں؟" بولا "ہاں!" فرمایا "خطاب کے اونٹ چراتے ہوئے میں نے مدتوں یہ شعر پڑھے ہیں[11]"۔ "روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد جاہلیت کے بڑے بڑے شعراء اور ان کے کلام سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ تنقیدی جائزہ لے کر ان میں ترجیحات بھی قائم کرتے تھے۔ امرؤالقیس کے بارے میں کہا "سابق الشعراء و خسف لهم عين الشعر[12]"۔" بقول اخطل آپ نے نابغہ ذبیانی کو متعدد مرتبہ کئی شعراء پر فضیلت دی[13]۔ ان میں سے آپ کے عہد میں جب شام فتح ہوا تو وہاں تشریف لے گئے۔ غوطہ دمشق کو دیکھا۔ شہر، محلات اور باغات پر نظریں ڈالیں اور یہ آیت پڑھی "كم تركوا من جنات و عيون و زروع و مقام كريم و نعمة كانوا فيه فاكهين كذالك و اورثناها قوماً آخرين[14]۔ "بعد ازاں اسی مناسبت سے نابغہ کے دو اشعار پڑھے[15]۔ آپ کا پسندیدہ شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ تھا۔ اس کے اشعار انہیں سب سے زیادہ یاد تھے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کے وقت دوران سفر مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا کیا تمہیں سب سے بڑے شاعر کا کوئی شعر یاد ہے؟ میں نے پوچھا وہ کون ہے؟ فرمایا جس نے یہ شعر کہا ہے ولو ان حمداً يخلد الناس اخلدوا ولكن حمد الناس ليس بمخلد۔"

(۱) طبری، ۳/۲۰۱، بلاذری II ۵۶۶/۱ (۲) بخاری، ۱۹۴/٤، طبری ۳/۰۲، بلاذری II ۱/۵۶۶ (۳) بخاری، ٤/۱۹٤ (٤) سعد ۳/۲۷۵ طبری ٤/٤/۲ سیوطی I ۱٤۳ (۵) سعد ۳/۲۷۵ (٦) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو طبری ۵/٤/۲۱٤، طنطاوی (۷) زرکلی ۵/٤/۲ (۸) شبلی II ۵۲ (۹) ہیکل ۱/۳۳ (۱۰) جرجی I ۱۸٦ (۱۱) ہیکل ۱/۳۳ (۱۲) قتیبہ IV ۱/٦۸ (۱۳) قتیبہ IV ۱/۹۲ (۱٤) ایضاً (۱۵) کثیر VII ۷/٤

میں نے کہا یہ زہیر کا شعر ہے۔ فرمایا "فذاك شاعر الشعراء۔" میں نے کہا وہ کیوں؟ فرمایا "لانه كان لا يعاظل في الكلام' و كان يتجنب وحشى الكلام' ولا يمدح احدًا الا بمافيه[1]۔" "وہ مغلق کلام نہیں لاتا نامانوس الفاظ واشعار سے بچتا ہے اور کسی کی اس وقت تک تعریف نہیں کرتا جب تک اس میں وہ وصف نہ ہو۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں پھر انہوں نے مجھے کہا کہ مجھے اس کے اشعار سناؤ۔ میں نے سنائے اتنے میں صبح ہو گئی تو فرمایا سورہ واقعہ کی تلاوت کرو۔ میں نے تلاوت کی پھر اپنی سواری سے اترے اور صبح کی نماز ادا کی اور اس میں سورہ واقعہ ہی کی تلاوت فرمائی[2]۔

چلتے پھرتے مختلف اشعار ان کی زبان پر جاری رہتے۔ ایک مرتبہ وادی ضجنان سے گزر ہوا تو بچپن کا وہ وقت یاد آ گیا جب یہاں اونٹ چرایا کرتے تھے اور تمثیلاً اشعار پڑھے(۳)۔ ایک مرتبہ مکہ کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے کا ساتھی انتقال کر گیا۔ اس کی وجہ سے راستے میں رک کے دفن کیا اور اس کے بارے میں اشعار کہے(۴)۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے "ان شرح الشباب والشعر الا سود مالم يعاص كان جنونا۔" سفر جابیہ کے موقع پر ساری رات وقفے وقفے سے اشعار پڑھتے رہے[5]۔ اسی طرح اپنی تقاریر میں بھی اشعار استعمال کرتے تھے[6]۔ کتب تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ایسے اشعار جن کے شاعر کا انہیں علم نہ ہوتا تھا تو وہ لوگوں سے دریافت کرتے[7]۔ انہیں اپنے زمانے کا سب سے بڑا شعر شناس سمجھا جاتا تھا۔ شبلی نے علامہ ابن رشیق القیروانی کی کتاب العمدہ کے قلمی نسخے سے ان کا قول نقل کیا ہے "و كان من انقد اهل زمانه للشعر وانقد هم فيه معرفة[8]۔" آپ شعر کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا اہل عرب کا بہترین فن اشعار ہیں کہ انسان اپنی ضروریات میں اس سے کام لیتا ہے' سخی کو مائل کرتا ہے اور بخیل کو مہربان بنالیتا ہے[9]۔ "اچھے اشعار کو یاد کرنے کی ترغیب دیتے اور عمال کو بھی یہ حکم دیتے تھے کہ اس کا اہتمام کریں۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا "مرهم بروايت اشعر فانه يدل على معالى الاخلاق[10]۔"

کتب تاریخ میں متعدد ایسے واقعات موجود ہیں کہ آپ کے اس ذوق سخن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ضرورت مند اپنی حاجات اشعار کے ذریعے پیش کرتے اور آپ انہیں پورا کرتے۔ ایک اعرابی نے شعر کے ذریعے سوال کیا۔ اتنا متاثر ہوئے کہ خادم سے کہا کہ میرا یہ کرتہ اس کے حوالے کر دو۔ پھر فرمایا بخدا اس قمیص کے ماسوا میرے پاس اور کوئی قمیص نہیں[11]۔ عہد عمرؓ میں عورتوں میں ذوق شاعری موجود تھا۔ ایک دن مدینہ کی گلیوں میں گشت کرتے ہوئے ایک خیمے کے پاس سے گزرے وہاں سے ہلکی سی آواز آ رہی تھی۔ کان لگا کر سنا تو ایک بڑھیا نعتیہ اشعار گا رہی تھی سن کر ایسی رقت طاری ہوئی کہ رو پڑے۔ پھر اسلام علیکم کہا اس نے اندر بلایا تو فرمائش کر کے دوبارہ وہ اشعار سنے[12]۔ حضرت عمرؓ کی اپنی بیویوں میں سے عاتکہ بہت معروف شاعرہ تھیں۔ انہوں نے آپؓ کی وفات پر بھی مرثیہ لکھا[13]۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک شعر کی حیثیت ابدی اور دوامی ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے کسی کی تعریف و توصیف مال و دولت کے انباروں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ زہیر نے ہرم بن سنان کی مدح میں کچھ اشعار کہے' جس سے خوش ہو کر اس نے زہیر کو انعام واکرام سے نوازا۔ ہرم کی اولاد میں سے کسی سے حضرت عمرؓ کی ملاقات ہوئی تو فرمایا وہ اشعار سناؤ۔ سننے کے بعد کہا "لقد كان يقول فيكم فيحسن۔" اس نے کہا "ياامير المؤمنين انا كنا نعطيه فنجزل۔" آپؓ نے فرمایا "ذهب ما اعطيتموه وبقى ما اعطاكم[14]۔" اسی طرح زہیر کے بیٹے سے ملاقات ہوئی تو پوچھا اس حلے کا کیا بنا جو ہرم نے

---

(۱) قتیبہ iv ۷۶/۱' واصل ۳: ۱۲۳۰ (۲) طبری ۲۲۲/٤' جوزی ii ۱۹۰' قتیبہ iv ۸۱/۱ (۳) سعد ۲۶۷/۳' طبری ٤: ۲۱۹ جوزی ۱۸۵ (٤) جوزی ۱۸۵

(۵) طبری ۲۲۳/٤ (٦) ایضاً (۷) قتیبہ iv ۹۳/۱ (۸) شبلی ۳٦٦ (۹) طنطاوی ٤٤٣ (۱۰) المتقی ۱/ ۲ (۱۱) جوزی ۱۹ اثیر ii ٤: ٦٦ (۱۲)

جوزی ۸۱ (۱۳) زبیری ۳٦٥/۱۰' زرکلی ۷/٤' کثیر iii ۱٤۰/۷' سیوطی ۱٤٦ (۱٤) قتیبہ iv ۸۲/۱' واصل ۱۲۲۷/۳۔

تمہارے والد کو دیا تھا؟ اس نے جواب دیا اسے زمانے نے بوسیدہ کر دیا ہے۔ آپؓ نے فرمایا "لکن الحلل التی کساھا ابوک ھرما لم یبلھا الدھر"[1]۔

حضرت عمرؓ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ جہاں اچھے اشعار اچھائی کو پھیلانے کا بہترین ذریعہ ہوتے ہیں، وہاں برے اشعار برائیوں کے فروغ کا سبب بنتے ہیں، اس لئے وہ ان پر خوب گرفت کرتے تھے۔ میسان کے عامل نعمان بن عدی نے ایسے اشعار کہے جن میں شراب کا ذکر تھا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو معزول کر دیا[2]۔ حطیہ نے زبرقان کی ہجو کی۔ حضرت عمرؓ کے سامنے شکایت کی گئی، تو انہوں نے وہ اشعار سنے۔ حضرت حسانؓ بن ثابت اور لبید بن ربیعہ سے پوچھا کہ کیا یہ ہجو ہے؟ انہوں نے تصدیق کی تو اسے قید کر دیا[3]۔ وہ اشعار کے ذریعے رحم کی اپیل کرتا رہا، لیکن حضرت عمرؓ نے توجہ نہ دی۔ آخر اس نے یہ اشعار پیش کئے۔

ماذا اردت لافراخ بذی مرخ

حمر الحواصل لا ماء ولا شجر

القیت کاسبھم فی قعر مظلمة

فاغفر علیک سلام اللہ یا عمر[4]

آپ کا ان چھوٹے چھوٹے چوزوں کے بارے میں کیا ارادہ ہے جو ذی مرخ میں پڑے ہوئے ہیں جہاں نہ تو پانی ہے نہ درخت۔ آپؓ نے ان کے کمانے والے کو تاریک گڑھے میں ڈال دیا ہے۔ اے عمرؓ معاف کر دے تجھ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ ان اشعار نے حضرت عمرؓ کو رلا دیا اور اس سے آئندہ باز رہنے کا وعدہ لے کر چھوڑ دیا[5]۔ اشعار آپ کے بہت سے اہم اقدامات کی بنیاد بنتے رہے۔ اس کی ایک مثال رات کو گشت کے دوران ایک عورت کی آواز سنی جو اپنے شوہر کے فراق میں اشعار پڑھ رہی تھی۔ اس سے پوچھا، تو نے کہیں برے کام کا ارادہ تو نہیں کیا؟ اس نے کہا معاذ اللہ، آپؓ نے فرمایا اپنے نفس کو قابو میں رکھ صبح ہی اسے بلاتا ہوں چنانچہ صبح ہوئی تو قاصد روانہ کر دیا۔ بعد ازاں حضرت حفصہؓ کے مشورے سے یہ حکم جاری کیا کہ چار ماہ سے زیادہ میدان جنگ میں کسی لشکر کو نہ روکا جائے[6]۔ اسی طرح بعض تعزیرات بھی اشعار کی بنیاد پر جاری فرمائیں، مثلاً ایک عورت کو نصر بن حجاج سلمی کے بارے میں شعر پڑھتے سنا، اسے بلوایا وہ بہت خوبصورت تھا۔ اس کے بال کاٹنے کا حکم دیا اس کا حسن اور بڑھ گیا۔ آخر اسے بصرہ کی جانب جلاوطن کر دیا[7]۔ اسی طرح بنو سلیم کے ایک اور شخص ابوذئب کے بارے میں عورتوں کو گفتگو کرتے سنا کہ مدینہ کا سب سے خوبصورت فرد ہے۔ اسے صبح بلا کر کہا "انت واللہ ذئبھن" اسے بھی بصرہ روانہ کر دیا[8]۔ ایک کاغذ پر جعدہ کے بارے میں چند اشعار پڑھے، جس سے انہیں معلوم ہوا کہ جعدہ اسی عورتوں کی تاک میں لگا رہتا ہے، جن کے خاوند جنگ پر گئے ہوئے ہوں۔ اسے بلا کر سو تازیانے لگائے اور ان عورتوں کے پاس جانے سے روک دیا[9]۔ عہد صدیقی میں مانعین زکوٰۃ کے خلاف حضرت خالدؓ کی فوج کے مقابلے میں جو گروہ لڑے ان میں بنی سلیم کا ایک گروہ بھی تھا جس کا سردار ابو شجرہ تھا وہ بعد میں مسلمان ہو گیا۔ حضرت عمرؓ کے پاس آیا، وہ اس وقت مساکین کو عطیے دے رہے تھے۔ اس نے بھی کچھ مانگا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تو نے یہ شعر نہیں کہا ہے "و رویت رمحی من کتیبة خالد انی لارجو بعدھا ان اعمر۔" (میں نے خالد کے لشکر سے اپنے نیزے کی پیاس بجھائی۔ اب میں امید کرتا ہوں کہ میری عمر دراز ہو جائے گی۔" حضرت عمرؓ نے یہ شعر پڑھ کر اسے درہ مارا۔ اس نے کہا اے امیر المومنین اس کو تو اسلام نے محو کر دیا[10]۔

(۱) واصل ۳/۱۲۳۷ (۲) زبیری ۳۸ بلاذری ۱/۲۱۷ (۳) قتیبہ ۲۴۵، واصل ۱/۲۲۳ (٤) قتیبہ ۱۷، ۲۴۵ (۵) ایضاً (٦) سیوطی ۱۴۱، جوزی ۸۱ (۷) سعد ۳/۲۸۵ (۸) ایضاً (۹) ایضاً (۱۰) بلاذری ۱/۱۱۷

آپ مسجد میں شعر پڑھنے کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہوئے' حضرت حسانؓ شعر پڑھ رہے تھے' ان کی طرف (گھور کر) دیکھا تو حضرت حسانؓ نے کہا' میں تو اس وقت یہاں شعر پڑھا کرتا تھا جب آپؓ سے بہتر شخص (رسول اللہ ﷺ) یہاں موجود ہوتے تھے[۱] یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ بقول ابوہریرہؓ وہ اس بات سے ڈرے کہ اگر منع کیا تو رسول اللہ ﷺ کی اجازت کی دلیل لے آئیں گے[۲]۔ اب رہی یہ بات کہ آپ خود بھی شاعر تھے یا نہیں' امام شعبی سے منقول ہے "کان عمر شاعراً"[۳]۔ "وفات نبوی ﷺ پر حسب ذیل مرثیہ کہا۔

مازلت مذ وضع الفراش لجنبه

وثوی' مریضاً خائفاً اتوقع

شفقاً علیه ان یزول مکانه!!

عنا فیبقی بعده المضجع

فلیبکه اهل المدینة کلهم!!

والمسلمون لکل ارض تجزع

نفسی فداؤک من لنا فی امرنا!!

ام من نشاوره اذا نتوجع[۴]

ان اشعار کے علاوہ حضرت عمرؓ کے ذاتی اشعار کی تفصیل ہمیں کہیں نہیں ملتی۔ البتہ اپنی گفتگو' خطبات اور شعر و سخن کی محافل میں جو شعر وہ پڑھتے تھے ان میں سے بہت سے ایسے ہیں' جن کے شعراء کا ہمیں علم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض ان کے اپنے کہے ہوئے ہوں اور انہوں نے اس کی صراحت کرنا پسند نہ کیا ہو' لیکن یہ بات ثابت شدہ ہے کہ وہ باقاعدہ شاعر نہیں تھے اور نہ ہی شاعر کے طور پر معروف تھے۔ اس بات پر خود ان کا اپنا قول دلالت کرتا ہے۔ متمم بن نویرہ سے ان کی ملاقات ہوئی تو فرمایا "اپنے بھائی مالک بن نویرہ کے بارے میں وہ اشعار سناؤ جو تم نے کہے ہیں۔" جب سن لئے تو فرمایا "لو کنت احسن الشعر' لقلت فی اخی زید مثل الذی قلت فی اخیک[۵]"۔ شعر و سخن سے اس قدر گہرے تعلق کے باوجود آپ کے علمی و ادبی ذوق کی تسکین کا اصل سرچشمہ کلام الٰہی تھا جس کے سامنے علم و فن کی تمام وسعتیں سمٹ گئیں۔ شعر و ادب کی جولانیاں ختم گئیں اور فصاحت و بلاغت کی تمام چوٹیاں سرنگوں ہو گئیں۔ لبید بن ربیعہ سے کہا کہ اپنے شعر سناؤ۔ انہوں نے سورۃ البقرہ کی تلاوت کی اور فرمایا "ماکنت لا قول شعراً بعد اذا علمنی اللہ البقرہ و ال عمران." حضرت عمرؓ نے یہ جواب سن کر ان کے وظیفے میں پانچ سو درہم کا اضافہ کر دیا[۶]۔

○......معاشی سرگرمیاں:

آپ نے عہد جاہلیت میں تمام مروجہ علوم و فنون میں بھرپور حصہ لیا اور ان میں قابل ذکر مہارت حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ فکر معاش سے بھی غافل نہیں رہے۔ جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھتے ہی اہل قریش کا سب سے محبوب اور معزز مشغلہ تجارت اختیار کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے شام و عراق کے بہت سے سفر کئے۔ یہ سفر اگرچہ کاروباری نوعیت کے ہوتے تھے' لیکن آپ کے ذوق تجسس' طلب علم اور سفارتی ذمہ داریوں کے احساس نے انہیں کثیر المقاصد بنا دیا۔

---

(۱) بخاری ۷۹/٤ ' داود ٤/٤١٥ (۲) داود ٤/٤١٥ (۳) جوزیہ ۱۸۵' سیوطی ۱۸۳ (٤) بلاذری ۱/ ٥۹۲ (۵) بیری ۱/ ۲٤۸' قتیبہ ۲٥٥ بلاذری ۱/ ۱۱۸ (٦) قتیبہ ۱/ ۱۹٥

اس دوران وہ عراق وشام کے بااثر لوگوں اور حکمرانوں سے ملاقاتیں بھی کرتے تھے۔بقول مسعودی "ولعمر بن الخطاب رضی الله عنه اخبار كثيرة في اسفاره في الجاهلية الى الشام والعراق مع كثير من ملوك العرب والعجم"[۱]۔ مسعودی کہتے ہیں کہ میں نے ان سفروں کی تفصیل اپنی کتب اخبار الزمان اور کتاب الاوسط میں دی ہے' لیکن افسوس ہے کہ آج یہ کتب ناپید ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ وہ شام وحجاز کے مابین تجارت کیا کرتے تھے[۲]۔ان سفروں میں سے ایک عجیب وغریب واقعہ دمشق کا ہے۔ آپ قریشی تجار کے ساتھ دمشق آئے اور جب وہ باہر چلے گئے' تو حضرت عمرؓ ایک کام کیلئے پیچھے رہ گئے ورابھی آپ شہر ہی میں تھے کہ ایک جرنیل نے اچانک آپ کو گردن سے پکڑ لیا اور وہ آپ سے جھگڑتا چلا گیا' مگر وہ آپ کی برابری نہ کرسکا۔پس اس نے آپ کو ایک گھر میں داخل کردیا جس میں مٹی' کلہاڑا' بیلچہ اور زنبیل پڑی تھی اور اس نے آپ سے کہا کہ اس کو یہاں سے ہٹا کر یہاں تک لے جاؤ اور آپ پر دروازہ بند کردیا اور واپس چلا گیا اور دوپہر کو آیا۔ حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں' میں سوچ بچار کرتا ہوا بیٹھ گیا اور اس نے جو مجھے کہا تھا میں نے اس میں سے کچھ بھی نہ کیا۔جب وہ آیا تو کہنے لگا کیا وجہ ہے کہ تم نے کام نہیں کیا؟ اور اس نے اپنے ہاتھ سے میرے سر پر مکہ مارا۔ حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کلہاڑا پکڑ کر اسے مار اور اسے قتل کردیا اور سیدھا باہر نکل گیا اور شام کی تاریکی میں ایک راہب کی خانقاہ کے پاس آکر بیٹھ گیا' راہب نے مجھے دیکھا تو اتر کر مجھے خانقاہ کے اندر لے گیا اور مجھے کھلایا پلایا اور اس نے مجھے تحفہ بھی دیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا اور اس نے میرے معاملے کے متعلق بھی مجھ سے دریافت کیا۔ میں نے کہا' میں اپنے اصحاب کو کھو چکا ہوں۔ اس نے کہا تو خوف زدہ آنکھ سے دیکھ رہا ہے اور وہ مجھے پہچاننے لگا۔ پھر اس نے کہا "عیسائیوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں ان کی کتاب کو سب سے بہتر جانتا ہوں اور میں تجھے وہ شخص پاتا ہوں' جو ہمیں اپنے اس ملک سے نکال دے گا۔ کیا آپ مجھے میری اس خانقاہ کے متعلق پروانہ امان لکھ کر دے سکتے ہیں؟" میں نے کہا "ارے آپ تو اور طرف چلے گئے ہیں اور وہ مسلسل مجھ سے اصرار کرتا رہا' حتی کہ میں نے اس کا مطلوبہ پروانہ اسے لکھ دیا اور جب واپسی کا وقت آیا تو اس نے مجھے ایک گدھی عطا کی اور کہا اس پر سوار ہو جاؤ اور جب آپ اپنے اصحاب کے پاس پہنچ جائیں تو اسے اکیلی میرے پاس بھیج دینا بلاشبہ یہ جس خانقاہ کے پاس سے گزرے گی' وہ اس کا اکرام کریں گے۔ میں نے اس کے حکم کے مطابق عمل کیا اور جب حضرت عمرؓ بیت المقدس کو فتح کرنے آئے تو یہ راہب آپ کے پاس آیا اور وہ اس پروانے کے ساتھ جابیہ میں مقیم تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کیلئے اسے نافذ کردیا اور اس پر شرط عائد کی کہ جو مسلمان اس کے پاس سے گزرے اس کی ضیافت کرے اور انہیں راستہ بتائے[۳]۔ تجارت کی غرض سے کئے گئے انہی سفروں میں سے آپ نے ظہور اسلام سے قبل اپنے شام کے ایک سفر کا بھی ذکر کیا ہے۔اس سفر میں کسی غول بیابانی نے آپ کو راستے سے بھٹکانے کی کوشش کی تھی' لیکن آپ نے اپنی تلوار میان سے نکال کر اسے ٹھکانے لگا دیا[۴]۔ عہد رسالت میں بھی تجارت ہی آپ کا ذریعہ معاش رہا۔چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے جب حدیث استیذان پیش کی' تو فرمایا کہ گواہی لاؤ۔جب صحابہ کرامؓ نے گواہی دے دی تو بقول ابو سعید خدری آپ نے فرمایا "خفي علي من امر رسول الله ﷺ الهاني الصفق بالاسواق' يعني الخروج الى تجارة"[۵]۔ "رسول اللہ ﷺ کا ایک حکم مجھ سے مخفی رہا' افسوس کہ بازاروں کی خرید وفروخت نے مجھے غافل کردیا' آپ کی مرو تجارت تھی۔ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کیلئے استبرق کا ایک جبہ لے کر گئے جو بازار میں بک رہا تھا اور عرض کیا اسے خرید لیجئے عید اور وفود کی پذیرائی کیلئے پہنا کیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "یہ تو اس کا لباس ہے جس کا آخرت میں حصہ نہیں[۶]۔ "قرآن کا یہ فرمان آپ پر صادق آتا ہے "رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله"[۷]۔ "بخاری نے اسی باب کے ذیل میں یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضور ﷺ ایک مرتبہ

---

(۱) مسعودی:۲/۳۲۹ (۲) زرکلی ۵/۲۰۳ (۳) کبیر:۷/۵۹ (۴) مسعودی:۲/۱۵۶ (۵) بخاری:۳/۶' مسلم ۶/۱۷۹ (۶) ابوداؤد ٤/٤٦٩ بخاری ۲۳۷
مسلم ۶/۱۳۷' مالک:۹۱۷ (۷) سورة النور ۲٤/۳۷

نماز جمعہ کیلئے مسجد میں موجود تھے۔ خطبہ کیلئے کھڑے ہوئے کہ باہر اونٹوں کا ایک (تجارتی) قافلہ آیا۔ سوائے بارہ آدمیوں کے سب لوگ ادھر چلے گئے۔ چنانچہ آیت اتری[1] "واذا رأوا تجارۃ او لهوا انفضوا الیها و ترکوک قائما[2]۔" ترمذی کی روایت میں یہ صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس رہ جانے والے صحابہ کرامؓ میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے[3]۔

یہی سلسلہ عہد خلافت میں بھی جاری رہا۔ نخعی کے بقول حضرت عمرؓ زمانہ خلافت میں تجارت کرتے تھے[4]۔ یہ تجارت اپنے ذاتی مال سے ہوتی تھی[5] مگر کبھی کاروباری مقصد کیلئے رقم کی ضرورت پیش آتی تو ذاتی طور پر کسی سے قرض لے لیتے۔ ابراہیم سے مروی ہے کہ عمرؓ بن الخطاب تجارت کرتے تھے حالانکہ وہ خلیفہ تھے (بروایت یحییٰ) انہوں نے شام کیلئے ایک تجارتی قافلہ تیار کیا اور عبدالرحمن بن عوف کے پاس (اور بروایت فضل) نبی ﷺ کے کسی صحابیؓ کے پاس (بروایت یحییٰ و فضل) چار ہزار درہم قرض مانگنے کو بھیجا۔ انہوں نے قاصد سے کہا کہ ان سے کہو کہ وہ بیت المال سے لے لیں پھر اسے ادا کر دیں۔ قاصد ان کے پاس آیا اور ان کے جواب کی خبر دی تو یہ انہیں ناگوار ہوا۔ پھر ان سے عمرؓ ملے اور کہا کہ تم کہتے ہو بیت المال سے لے لیں۔ اگر میں اس (مال) کے آنے سے پہلے مر جاؤں تو تم لوگ کہو گے کہ اسے امیر المؤمنین نے لیا ہے، اور تم مجھی کو چھوڑ دو اور قیامت میں مجھ سے اس کا مواخذہ ہو۔ نہیں! (میں اس سے باز آیا) میں چاہتا ہوں کہ میں تمہارے جیسے حریص اور لالچی سے لوں کہ اگر میں مر جاؤں تو وہ اس مال کو (بروایت یحییٰ) میری میراث سے (بروایت فضل) میرے مال سے لے لے[6]۔ آپ کی ان تجارتی سرگرمیوں کے کئی واقعات کتب تاریخ میں موجود ہیں۔ خلافت کے ساتھ ساتھ انہیں جاری رکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ قیمتوں کی سطح، اشیاء کی قلت و کثرت اور لوگوں کی ضروریات سے براہ راست آگہی حاصل کرتے۔ لوگوں کے کاروباری معاملات کی اصلاح کرتے، ان کی مشکلات کے ازالے کا بروقت انتظام کرتے اور عوام سے قریبی تعلق قائم رکھتے۔ حسب ذیل روایت سے آپ کی ان سرگرمیوں اور ان کے مختلف پہلوؤں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اصبغ بن نباتہ کا بیان ہے کہ میں اور میرے والد زرود سے روانہ ہوئے صبح ہوتے ہی مدینے جا پہنچے۔ صبح صادق کا عمل تھا لوگ فجر ادا کر رہے تھے، نماز ہو چکی تو لوگ اپنے اپنے دھندوں پر نکل کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر میں ہم نے دیکھا کہ ایک شخص ہاتھ میں درہ لئے ہوئے ہمارے سر پر تھا۔ یہ شخص یہ کہتا ہوا سنا گیا "اعرابی! اسے بیچو گے" اور اس کے بعد جس قیمت پر وہ خریدنا چاہتا تھا اس پر اعرابی (یعنی میرے والد) کو راضی کر لیا۔ معلوم ہوا یہ مول تول کرنے والا شخص خود فاروق اعظمؓ تھے۔ اس کے بعد عمرؓ بازار کا چکر لگانے لگے اور دکانداروں اور اہل کاروبار کو معاملات اور لین دین میں اللہ سے ڈرنے کی ہدایت فرمانے لگے۔ عمرؓ بھی بازار کے ایک سرے تک جاتے کبھی دوسرے سرے تک۔ ایک دفعہ وہ میرے والد کے قریب سے گزرے تو بولے "مجھے رقم ابھی تک نہیں ملی۔" میرے والد نے پھر کہا "یہی وعدہ تھا آپ کا؟" ایک چکر اور لگایا گیا اور فاروقؓ کا اور میرے والد کا ایک بار پھر آمنا سامنا ہوا۔ اس بار میرے والد نے وہی بے صبری کے الفاظ پھر دہرائے۔ جواب دیا گیا "میں جب تک تمہارا مطالبہ نہ دے دوں گا جاؤں گا نہیں۔" تیسری بار عمرؓ جب پھر اسی جگہ سے گزرے جہاں میرے والد کھڑے تھے تو عالم غیظ و غضب میں وہاں پر جھپٹ پڑے اور ان کا گریبان تھام لیا اور کہا "تم مجھ سے جھوٹ بولے، تم نے میرے ساتھ زیادتی کی۔" یہ کہا اور ان سے دست و گریباں ہو گئے۔ یہ منظر دیکھ کر بہت سے مسلمان میرے والد پر ٹوٹ پڑے اور کہا "او خدا کے دشمن! تو نے امیر المؤمنین سے یہ جسارت کی ہے؟"

عمرؓ نے میرے والد کا گریبان اس مضبوطی سے تھام لیا کہ وہ بالکل بے بس ہو گئے۔ عمر تھے بھی بے حد شدید اور قوی۔ پھر وہ انہیں لئے لئے ایک قصاب کی دکان پر پہنچے۔ فرمایا "میں نے تم کو قسم دلائی تھی کہ اس شخص کو اس کا حق دے دینا اور مجھے میرا منافع۔"

---

(۱) بخاری، ۳: ۶ ترمذی ۵: ۸۷ (۲) سورہ جمعہ ۶۲: ۱۱ (۳) ترمذی ۵: ۸۷ (۴) سیوطی ا: ۲۹ (۵) سعد ۳: ۲۰۸ (۶) سعد ۳: ۲۷۸۔

قصاب نے کہا "امیر المؤمنین! میں نے ابھی تک ایسا نہیں کیا لیکن میں اس شخص کو اس کا حق دیتا ہوں اور آپ کو آپ کا منافع۔" قصہ یہ تھا کہ عمرؓ نے میرے والد سے قصاب کیلئے جانور خرید کئے تھے' تو میرے والد کو جانور کی قیمت اور عمرؓ کو اس کا منافع ملنا تھا۔ چنانچہ جب میرے والد کو ان کا مطالبہ مل گیا' تو عمرؓ نے فرمایا "تمہیں تمہارا مطالبہ مل گیا۔" انہوں نے کہا "ہاں۔" فرمایا "لیکن ہمارا مطالبہ تم پر اب تک باقی ہے۔ تم نے مجھے زدوکوب کیا اور کوڑے رسید کئے اور میں نے جوابی کارروائی کو اللہ کی خاطر ترک کردیا۔"

اصبغ کہتے ہیں "وہ منظر اب تک میری نظروں میں ہے۔" عمرؓ نے اپنے منافع کی ایک ران ایک ہاتھ میں لٹکا رکھی ہے اور دائیں ہاتھ میں ان کا درہ ہے۔ وہ پورے بازار سے اسی عالم میں گزر گئے اور اپنے اونٹ پر جا بیٹھے[۱]۔

تجارتی معاملات میں مہارت کے ساتھ ساتھ آپ کی امانت و دیانت کا یہ نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت بھی آپ کے شامل حال رہتی ہے اور آپ کے کم سرمائے میں بھی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ برکت شامل ہوتی۔ حضرت عبداللہؓ بن عمر کہتے ہیں کہ "میں جلولا کی مہم میں شریک تھا اور میرے حصہ میں اتنا مال غنیمت آیا تھا کہ میں نے اسے چالیس ہزار درہم میں فروخت کردیا۔ اس خطیر رقم کو لے کر میں مدینہ آگیا اور اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ والد نے مجھ سے پوچھا: "یہ کیسی رقم ہے؟"

میں نے کہا: "میں نے اپنے حصہ کا مال غنیمت فروخت کیا ہے۔"

کہنے لگے "عبداللہ! اگر یہ رقم مجھے دوزخ کی آگ کی طرف لے گئی تو پھر تمہیں اس کا فدیہ دینا پڑے گا۔"

عبداللہ نے کہا "میرے پاس جتنا مال ہے وہ سب کا سب میں بطور فدیہ دینے کیلئے تیار ہوں (یعنی غیر مشتبہ ہے)

امیر المؤمنین اس پر بھی مطمئن نہ ہوئے اور کہا "میرا خیال ہے کہ اتنی رقم تم کو اس لئے مل گئی کہ لوگوں نے سوچا ہوگا کہ تم رسول اللہ ﷺ کے صحابیؓ اور ان کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے والے اور امیر المؤمنین کے بیٹے اور ان کے خاندان کے سب سے معزز رکن ہو۔ اس لئے تمہارے معاملے میں رعایت ہونی چاہئے۔ تم سے ترجیحی سلوک کیا گیا ہے۔ مجھے یہ منظور ہے کہ بجائے اس کے کہ تم سے ایک درہم کی بھی رعایت کی جائے تم سے ایک درہم زیادہ ہی وصول کیا جائے۔" پھر مجھ سے یہ تمام مال لے کر فرمایا "اب میں تم کو اتنا منافع دلواؤں گا جو اس منافع سے زیادہ ہوگا جو عام حالات میں کسی اہل قریش کو ملا کرتا۔" بعد ازاں امیر المؤمنین صفیہ بنت ابی عبید کے یہاں گئے اور ان سے جس قدر رقم بھی وہ دے سکتی تھیں اس کا مطالبہ کیا' صفیہ نے یہ رقم بخوشی دے دی۔ اب امیر المؤمنین ایک ہفتہ تک بالکل مجھ سے الگ تھلگ رہے۔ پھر تاجروں کو بلوایا اور اس قلیل مدت میں انہوں نے جو مال حاصل کر لیا تھا اس کا معاملہ تاجروں سے کرلیا گیا تھا۔ در اصل انہیں چار لاکھ کی رقم ملی۔ اس رقم میں انہوں نے اسی ہزار درہم مجھے دیئے اور تین سو بیس ہزار درہم سعدؓ کے پاس بھیج دیئے۔ سعد کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اس رقم کو غازیان معرکہ میں تقسیم کردیں اور جو لوگ اس معرکہ میں جام شہادت نوش کر چکے ہیں' ان کے حصے کی رقوم ان کے وارثوں میں تقسیم کردی جائیں[۲]۔

آپ کو معلوم تھا کہ معاشی سرگرمیوں میں مقابلہ و مسابقت ہی سے جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے لوگوں میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش فرماتے۔ ابن سیرین کہتے ہیں "ایک مرتبہ میں نے نماز مغرب حضرت عمرؓ کے پیچھے پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ میری طرف آئے۔ میرے پاس ایک گٹھڑی تھی۔" پوچھا "یہ کیا ہے؟" میں نے جواب دیا "یہ گٹھڑی ہے' میں اسے لے کر بازار میں کھڑا ہو جاتا ہوں اور اپنا کاروبار کرتا ہوں۔" آپ اہل قریش کی ایک جماعت کی طرف

---

(۱) جوری ۱۵۷ (۲) جوری ۱۵۹

متوجہ ہوئے اور فرمایا "اے اہل قریش دیکھو یہ اور اس کے ساتھی تجارت میں تم پر غالب نہ ہونے پائیں (بازی نہ لے جائیں) کیونکہ یہ ایک ثلث سلطنت ہے۔" ایک اور روایت کے مطابق فرمایا "فان التجارة ثلث الا مارة(۱)۔" آپ کا ارشاد ہے "لامال لمن لا رفق له(۲)۔" وہ مال ہی نہیں جو ہمیں نفع نہ دے۔ چنانچہ اس کا اصول یہ بتایا کہ "اگر کوئی شخص تین مرتبہ کسی شے کی تجارت کرے لیکن اسے کچھ بھی حاصل نہ ہو تو اسے چاہئے کہ کاروبار بدل لے(۳)۔ آپ کے اس حکیمانہ قول میں تاجروں کیلئے اعتدال و توازن کا ایک لازوال درس پنہاں ہے کہ نہ تو انہیں اس قدر جلد باز ہونا چاہئے کہ بار بار کاروبار بدلتے رہیں کہ کسی پر بھی انہیں دلجمعی اور یکسوئی حاصل نہ ہو۔ کیونکہ اس میں کسی بہت بڑے اور غیر متوقع نقصان کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں اس قدر لکیر کا فقیر ہونا چاہئے کہ کچھ حاصل ہو نہ ہو ایک ہی کام سے چمٹے رہیں۔ آپ کے عہد خلافت میں سلطنت اسلامیہ مسلسل وسعت پذیر رہی۔ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہے' ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھتا رہا' جس کے نتیجے میں تجارتی سرگرمیاں ماند پڑتے پڑتے ختم ہو گئیں۔ ایک ایسا تاجر جو ادیب بھی ہے' وہ اس کیفیت میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اس سے بڑھ کر اور کس پیرائے میں بیان کر سکتا ہے۔ جو تجارت و ادب کے حسین امتزاج کا مرقع بھی ہو "لو کنت تاجراً ما اخترت علی العطر شیا ان فاتنی ربحه لم یفتنی ریحه(۴)۔"

---

(۱) جوری ا:۱۹۰ (۲) جوری ا:۱۹۰ (۳) ایضاً (٤) ایضاً

قبول اسلام

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبول اسلام میں ایک نمایاں اہمیت و مقام کا حامل ہے۔ یہ محض ایک فرد کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ حالات اور تاریخ کے رخ کی تبدیلی کا عمل تھا۔ مظلومیت کے گڑھے میں گرے ہوئے حق پرستوں کا قافلہ عزت و وقار کی شاہراہ پر گامزن ہو گیا۔ بقول حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ما زلنا اعزۃ منذ اسلم عمر[1] مسلمانوں میں ایک نیا اعتماد اور ولولہ پیدا ہوا۔ مایوسیوں کے بادل چھٹ گئے اور باطل کے سامنے سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئے۔ صدیوں سے مشرکوں کے نجس و ناپاک جسموں اور رسموں سے آلودہ رہنے والے خانہ خدا میں توحید پرستوں کے مقدس حلقے کا آغاز ہوا اور جبر و استبداد کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ نمودار ہوا۔ حضرت صہیبؓ اس کا نقشہ کچھ یوں کھینچتے ہیں۔ لما اسلم عمر رضی اللہ عنہ اظھر الاسلام و دعا علیہ الیہ علانیۃ و جلسنا حول البیت حلقا' وطفنا بالبیت' و انتصفنا ممن غلظ علینا' ورددنا علیہ بعض ما یاتی بہ[2] اس کی خوشیاں آسمانوں میں منائی گئیں اور جبریل امین نے ہادی برحق ﷺ کو اطلاع دی یا محمد' لقد استبشر اھل السماء باسلام عمر[3] تو ادھر اہل باطل کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا اور پکار اٹھے کہ آج مسلمانوں نے ہم سے اپنا سارا بدلہ چکا دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے لما اسلم عمر قال المشرکون قد انتصف القوم الیوم منا[4] اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی[5] یا ایھا النبی حسبک اللہ و من اتبعک من المؤمنین[6] حق و باطل کی کشمکش نئے مرحلے میں داخل ہو گئی۔ اب کھل کر ایک دوسرے کے مد مقابل آ گئے اور اس طرح حضرت عمرؓ ہی کے ایمان کے قبول پر اہل عالم کے سامنے دونوں کا فرق واضح ہو گیا۔ سرورِ کونین ﷺ نے انہیں فاروق کے لقب سے نوازا۔ ارشاد ہوا ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر و قلبہ' وھو الفاروق فرق اللہ بہ بین الحق والباطل[7] قبول اسلام کی اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کا تحقیقی جائزہ لیا جائے۔ اس کے پس منظر' محرکات' عوامل اور اثرات و نتائج کو واضح کیا جائے۔ پھر یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کا جس قدر کھوج لگایا جائے' آپ کی سیرت و شخصیت کے مختلف گوشے اتنا زیادہ نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ آپ کی فہم و فراست' جرأت و ہمت' غصہ و رقت' محبت و نفرت' اخلاص و غیرت' علیٰ ہذا القیاس آپ کی ہر صلاحیت کر بھرپور عکس ہمارے سامنے آپ کے عہد جاہلیت کا مکمل سراپا کھڑا کرتا ہے۔

آپ کسی شخصیت سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کا بھی ان پر کوئی اثر نہ پڑا۔ آخری لمحے تک شدید دشمن رہے۔ آپ قرابت داری اور تعلقات کی بناء پر بھی ہرگز مسلمان نہیں ہوئے۔ حالانکہ آپ کے قبیلے کے بہت سے مرد اور عورتیں یہاں تک کہ آپ کے اکلوتے بھائی اور دونوں بہنیں اور بہنوئی اسلام قبول کر چکے تھے۔ وہ انہیں اسلام کے قریب تو کیا لاتے آپ کے تشدد کے خوف سے چھپتے پھر رہے ہوتے۔ کسی کی یہ ہمت نہیں تھی کہ ان کے سامنے اسلام کی حمایت میں کوئی ایسا جملہ بھی کہہ سکے۔ آپ اپنے مزاج اور اپنی سیرت کے اعتبار سے بھی اس قدر پاکباز اور شریف النفس نہیں تھے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور تقدس سے فطری طور پر قریب ہو جاتے۔ آپ مروجہ نظام سے بیزار اور اس کے باغی بھی نہیں تھے کہ اس کے خلاف رد عمل کی وجہ سے اسلام کا علم تھام لیتے۔ اس کے برعکس آپ مشرکانہ نظام کے علمبردار اور پرجوش حامی تھے۔ تو پھر آپ کیسے مسلمان ہوئے؟ بس اس کا

---

(۱) بخاری ۴/۲۴۲' سعد ۳/۲۷۰' حاکم ۳/۸۳' کثیر ۳:II/۷۹ (۲) سعد ۳/۲۶۹ سیوطی ۱:۱۱۵ (۳) سعد ۳/۱۲۹' حاکم ۳/۸۴' حبان ۹/۱۸ سیوطی ۱:۱۱۴ ماجہ ۱/۳۱ (٤) حاکم ۳/۸۵' اثیر ٤:II/۵۷' سیوطی ۱:۱۱٤ (٥) سیوطی ۱:۱۱٤ (٦) سورہ انفال ٦٤:٨ (۷) سعد ۳/۲۸ اثیر ۳:II/۵۷ سیوطی ۱:۱۱٤' المتقی II:٥٧٤۔

جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ آپ کسی واقعے سے اچانک اس قدر متاثر ہو گئے کہ خلاف توقع کلمہ شہادت پڑھ لیا اور مسلمان ہو گئے۔ اس سلسلے میں کتب تاریخ میں مجموعی طور پر پانچ مختلف روایتیں ہمیں ملتی ہیں اور ہر روایت کو قبول اسلام کے واقعے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے نہ تو کسی کو مکمل طور پر رد کرنا ممکن ہے اور نہ ہی بیک وقت سب کو تسلیم کرنا۔ ان میں بس ایک بات مشترک ہے' وہ یہ کہ آپ کو صرف اور صرف قرآن حکیم کے اعجاز اور انقلابی دعوت نے بدل دیا۔ ہمارے نزدیک یہ روایتیں بس اسی چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ آپ نے قرآن مجید کئی مرتبہ سنا اور ہر مرتبہ متاثر ہوئے۔ اس کے نتیجے میں آپ کے اندر ایک کشمکش برپا ہو گئی' جو بالآخر اسلام پر منتج ہوئی۔ ہم نے آپ کے اندر کے اس تدریجی عمل کو واقعاتی شہادتوں اور حوالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے مذکورہ روایات میں بھی اسی اعتبار سے ترجیح قائم کی ہے۔ اسلام کی طرف آپ کا یہ ذہنی اور نفسیاتی سفر چھ مرحلوں میں مکمل ہوا۔

○...... پہلا مرحلہ:

حضرت عمرؓ نے ایک مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ایک مرتبہ میں بتوں کے قریب سویا ہوا تھا۔ ایک شخص ایک بچھڑا لایا اور بت پر اسے ذبح کر دیا۔ اس پر کسی چیخنے والے نے اتنی زور سے چیخ کر کہا کہ میں نے ایسی شدید چیخ کبھی نہیں سنی تھی۔ اس نے یاجلیح امر محیح رجل فصیح یقول لا الہ الا انت کہا۔ اے چست و چالاک شخص! کامیابی کی طرف لے جانے والا ایک امر ظاہر ہونے والا ہے۔ ایک فصیح شخص کہے گا کہ "تیرے سوا (اے اللہ) کوئی معبود نہیں۔" تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے' میں نے کہا اب میں یہ معلوم کئے بغیر نہ رہوں گا کہ اس کے پیچھے کیا چیز ہے۔ اتنے میں پھر وہی آواز آئی۔ اے چست چالاک شخص! کامیابی کی طرف لے جانے والا امر ظاہر ہونے والا ہے۔ ایک فصیح شخص کہے گا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور میں بھی کھڑا ہو گیا' کچھ ہی دن گزرے تھے کہ کہا جانے لگا نبی مبعوث ہو گئے ہیں[1]۔

ابن ہشام کی روایت ہے کہ فرمایا ہم اس ذبح کئے ہوئے بچھڑے کی تقسیم کا انتظار کر رہے تھے کہ یکایک یہ آواز آئی۔ یہ واقعہ ظہور اسلام سے کچھ ہی دنوں پہلے کا ہے ایک مہینہ یا کچھ دن کم۔ "اسی طرح یا جلیح کے بجائے یا ذریح" کے الفاظ ہیں۔ ابن ہشام نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ بعض روایتوں میں "رجل بصیح بلسان فصیح" بھی آیا ہے[2]۔ ابن سعد کی روایت میں مذکورہ جملے حضرت مجاہد سے نقل کئے گئے ہیں اور اس میں یہ وضاحت بھی ہے کہ وہ بچھڑا بنی غفار کا تھا۔ بعد میں جب حساب لگایا گیا' تو معلوم ہوا کہ عین اسی وقت بعثت نبوی ﷺ ہوئی[3]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت ہی آپ کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ تاہم اس کی یہ گونج آپ کے شعور میں جگہ نہ پا سکی۔ اس لئے کہ مروجہ عقائد و نظریات پر غیر متزلزل اعتقاد و یقین نے اسے دھکیل کر لاشعور میں منتقل کر دیا۔ آپ کسی صورت میں بھی اس کی طرف توجہ دینے کیلئے تیار نہ تھے۔ اس لئے کہ کسی بات کو جانچے اور پرکھے بغیر جذباتی طور پر مان لینا آپ کی طبیعت کے خلاف تھا۔ آپ کے عین عالم جوانی میں اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا تھا۔ یہ ہمہ گیر دعوت انقلاب ابتدائی تین سال خفیہ طور پر سعید روحوں میں نفوذ کرتی رہی۔ آپ نے بھی دیگر اہل قریش کی طرح نظر انداز کیا' لیکن جب اس کا اعلانیہ اظہار ہوا اور ان کے بتوں کا ذکر آیا اور ان کے عیوب سامنے آنے لگے' تو سب مخالفت و دشمنی میں متحد ہو گئے[4]۔

کیونکہ اس سے ان کے اس بنیادی عقیدے اور نظریے پر براہ راست ضرب لگی' جس پر پورا مشرکانہ نظام قائم تھا۔ اسلام کا حلقہ اثر وسیع ہوتا گیا اور اس سے ایک سرد جنگ کا آغاز ہوا' جس کا دائرہ گھروں' محلوں' گلیوں' بازاروں اور ہر قسم کی سماجی و مذہبی تقریبوں تک پھیل گیا۔ بالآخر یہ کشمکش اہل جاہلیت کی پر تشدد یورش میں بدل گئی اور انہوں نے "سرور کونین ﷺ پر اور آپؐ پر ایمان لانے والے ہر شخص پر ظلم و جور کی انتہا کر دی۔ جبر و استبداد میں جو لوگ سب سے نمایاں تھے ان میں

---

(۱) بخاری ۱: ۲۴۳، ھشام ۱: ۲۲۲، بیہقی ۲: ۲۰۱، کنز ۲: ۳۳۳ (۲) ھشام ۱: ۲۲۲ (۳) سعد ۱: ۱۵۸ (٤) ھ ... ۱: ۲۸۲۔

ایک حضرت عمر بن خطاب بھی تھے۔ اس لئے تاریخ میں یہ صراحت ہے لما بعث اللہ محمداً ﷺ کان عمر شدیدا علیه و علی المسلمین [۱]۔ آپ کا اپنا قول یہ ہے کہ میں رسول اکرم ﷺ پر تمام لوگوں سے زیادہ سخت تھا کنت اشد الناس علیٰ رسول اللہ [۲]۔ ایک شب جب نبی محترم ﷺ کا پیچھا کر رہے تھے انہوں نے تنگ آکر فرمایا: "یاعمر ماتر کتنی لیلاً و نھارا" [۳]۔

رسول خدا سے دشمنی کی وجہ وہ پر اثر دعوت تھی جو جاہلیت کو فکر و نظر، علم و عمل اور عقیدہ و اخلاق کے ہر میدان میں چیلنج کر رہی تھی لہٰذا جو بھی اس کو قبول کر لیتا' وہی آپ کا نشانہ ہوتا اور جس کسی پر جتنا بس چلتا تشدد میں کوئی کسر نہ چھوڑتے اس کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ظلم سہنے والوں میں بنی اسرائیل میں بنی المؤمل کی ایک خادمہ لبینہ تھیں' جو حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہو گئیں۔ انہیں اذیت دیتے دیتے جب تھک جاتے' تو کہتے میں معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں صرف تھکاوٹ کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ وہ کہتیں "اگر تم اسلام نہ لائے تو اللہ تمہیں بھی اسی طرح عذاب دے گا" [۴]۔ "حضرت حسان بن ثابتؓ کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ عمرہ کرنے کیلئے مکہ آیا تو اس وقت نبی ﷺ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے اور آپ کے اصحاب کو عذاب و ایذا دیا جا رہا تھا۔ میں عمرؓ کے پاس ٹھہرا' وہ بنی مؤمل کی باندی کو ازار سے باندھے گلا دبا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ان کے ہاتھوں میں لٹک جاتی تو میں کہتا کہ مر گئی ہے۔ پھر وہ اسے چھوڑ دیتے اور زنیرہ پر ٹوٹ پڑتے اور اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرتے [۵]۔ اس سلسلے میں اس قدر حساس تھے کہ اپنے قریبی رشتے داروں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے' چنانچہ آپ کے بہنوئی سعید بن زید کہتے ہیں "لو رائتنی موثقی عمر علیٰ الاسلام انا واختہ وما اسلم" [۶]۔ "قبول اسلام والے دن اپنی بہن اور بہنوئی کو اس قدر مارا کہ لہولہان کر دیا۔ اپنی بہن کا تو سر پھاڑ دیا اور اس قدر خون بہا کہ خود اپنے رویے پر پچھتائے' لیکن ان کی طرف سے یہی جواب تھا "قد اسلمنا وامنا باللہ و رسولہ فاصنع ما بدالک" [۷]۔ "اس دن دراصل اس نیت سے گھر سے نکلے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیں" [۸]۔ آپ کی یہ اسلام دشمنی محض جہل و تعصب کی بناء پر نہیں تھی' بلکہ پورے شعور و ادراک کے ساتھ تھی۔ اس کے پیچھے گہری سوچ بچار تھی۔ وہ عام آدمیوں کے برعکس اس دعوت کے اثرات کو خطہ عرب کے وسیع پس منظر میں دیکھ رہے تھے۔ سفارت جیسے اہم منصب نے انہیں یہ بات سوچنے پر مجبور کر دیا کہ نظریے اور عقیدے کے اتفاق نے قبائل عرب کو چھوٹے موٹے اختلافات کے باوجود جس طرح مربوط کر رکھا ہے' یہ نئی دعوت اس کا شیرازہ بکھیر دے گی۔ وہ سارے اہل دانش کہ جن کا اس نظام کے استحکام میں اہم کردار ہے اور معاشرے کے معزز ہیں ان کی قیادت و سیاست پر اعتماد ختم ہو جائے گا اور وہ سارے معبود کہ جو قریش کی حاجت روائی کر رہے ہیں' جن کے دم قدم سے ساری رونقیں ہیں۔ ان پر یقین و ایمان متزلزل ہو جائے گا اور وہ دین مٹ جائے گا' جس نے زندگی کے ہر شعبے کو اپنے سانچے میں ڈھال کر ایک مکمل سماجی نظام کی شکل اختیار کر رکھی ہے' تو پھر کون سی چیز باقی رہے گی جو عرب کو متحد رکھ سکے؟ اس پر جتنا غور کرتے اتنا زیادہ انہیں محمد عربی ﷺ اور ان کے پیروکاروں پر غصہ آتا اور وہ آپے سے باہر ہو جاتے۔ ان محرکات کا اندازہ ان کے قبول اسلام کی روایت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نعیم بن عبداللہ نے انہیں تلوار حمائل کئے ہوئے اور تیور بدلے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ جواب دیا "ارید محمداً ھذا الصابی الذی فرق امر قریش' وسفہ احلامھا' وعاب دینھا' و سب آلھتھا فاقتلہ" [۹]۔ "حضرت عمرؓ کے پر تشدد رویے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے چچازاد بھائی زید بن عمرو بن نفیل نے بھی توحید کا علم بلند کیا تھا اور بت پرستی ترک کر دی تھی اور دین ابراہیمی کو اختیار کر لیا تھا" [۱۰]۔

---

(۱) کثیر ۵۳,٤:۱۱' حصر ۵۱۱/۲' (۲) جوزی:۷' کثیر ۵٤/٤:۱۱ (۳) جوزی:۱۰ (٤) ہشام ۱/۳٤۱' بلاذری ۱۹۵:۱ (۵) بلاذری ۱۹۵:۱ ابن ہشام کے بقول یہ نور زنیرہ دونوں لونڈیاں تھیں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا ۱/۳٤ (۶) معارف ۲٤۳ (۷) ہشام ۱/۳۶۹ (۸) جوزی:۱۰ (۹) جوزی:۱۰ (۱۰) ہشام ۲٤ سعد ۳/۱۸۱ کثیر ۲۳۷۔

اور یہ اعلان کیا کہ میں ہزاروں کے مقابلے میں ایک رب کی عبادت کرتا ہوں۔ "اربا واحداً ام الف رب ادین اذا تقسمت الامور[۱]"۔ کبھی یہ شعر پڑھتے کہ میں نے اپنی گردن اس ذات کے آگے جھکا دی جس کے آگے بھاری چٹانوں کو اٹھانے والی زمین نے سر خم کیا۔ "واسلمت وجهی لمن اسلمت له الارض تحمل صخراً ثقالا[۲]"۔ "علاوہ ازیں دیگر تمام جاہلانہ رسموں سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی[۳]۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یاتی یوم القیامة وحدة[۴]"۔" حضرت عمرؓ کے والد خطاب ان پر ظلم کرتے تھے، مکے کے غنڈوں کو ان پر مسلط کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پہاڑی علاقے میں قیام کرتے، رات کو چھپ کر کے آتے آخر وہ تنگ آکر شام کی طرف چلے گئے اور وہیں پر قتل کر دیئے گئے[۵]۔ یہ سب کچھ حضرت عمرؓ کے سامنے ہوا۔ اس طرح توحید کے خلاف نفرت ان کے شعور میں پیوست ہو گئی۔ یہ خطاب ہی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ آپ اپنے آبائی دین کے ساتھ اس قدر جڑ گئے کہ وہ اس میں کسی قسم کا رخنہ برداشت نہیں کر سکتے تھے، خواہ خونی رشتوں کو منقطع کیوں نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ توحید کی وہی دعوت اس سے کہیں زیادہ پرزور، بلیغ اور واضح انداز میں دوبارہ سنی تو دل میں وہ چھپی نفرت دوبارہ جاگ اٹھی اور پھر اسے مٹانے کے درپے ہو گئے۔

ابتداء میں ان کا خیال تھا کہ اس نئی آواز کو بھی اپنی سختیوں اور کارروائیوں سے دبانے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن انہیں شدید مایوسی ہوئی جب انہوں نے دیکھا کہ اس میں دن بدن توانائی پیدا ہو رہی ہے، اس کے نہ تو مٹنے کا امکان ہے نہ پسپا ہونے کا۔ اس کی حلاوت کی طرف کان متوجہ ہو رہے ہیں اور اس کی صداقت و حقانیت دلوں میں اتر رہی ہے۔ ایک شخص کی ذات سے نکل کر جماعت کی شکل اختیار کر رہی ہے تو تڑپ اٹھتے، انہیں کچھ سمجھ نہ آتا کہ کیا کریں۔ ان کے پاس اسے روکنے کیلئے صرف ایک ہی ہتھیار تھا تشدد، مگر یہ کتنا ناکارہ اور بے اثر تھا کہ اس کے ذریعے کسی ایک مسلمان کو بھی واپس اپنے دین کی طرف پلٹنے پر مجبور نہ کر سکے۔ اس موقع پر لاشعور میں دبی ہوئی ہالہ کی غیبی آواز نے شعور کے تاروں کو چھیڑنا شروع کر دیا۔

O...... دوسرا مرحلہ:

مکہ کی سرزمین پیروان محمد ﷺ کیلئے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ قرآن کی اثر انگیزی نے ایک تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ ہر قبیلے سے مرد اور عورتیں اس پر ایمان لانے لگے[۶] تو عرب کے سرداروں نے یہ فیصلہ کیا "لاتسمعوا لهذا القرآن والغوا فيه لعلكم تغلبون[۷]" اور دوسری طرف ان کا اپنا یہ عالم تھا کہ راتوں کو چھپ چھپ کر رسول اللہ ﷺ کی تلاوت سنا کرتے تھے (۸)۔ انہیں راتوں میں سے ایک مبارک رات وہ بھی تھی جب حضرت عمر فاروقؓ کو پہلی مرتبہ براہ راست قرآن سننے کا اتفاق ہوا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آپ کا یہ بیان نقل کیا ہے "میری ہمشیرہ درد زہ میں مبتلا تھی اس سلسلے میں مجھے گھر سے باہر آنا پڑا اور رات کی تاریکی میں خانہ کعبہ میں داخل ہوا۔ اتنی دیر میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے جوتے ہاتھ میں اٹھائے حجر اسود کی جانب گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر باہر تشریف لائے تو میں نے صدائے دل انگیز سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ آپؐ باہر نکلے تو میں بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔ آپؐ نے پوچھا کون ہے، میں نے کہا عمر! آپؐ نے کہا اے عمر تم دن رات میرے تعاقب میں لگے رہتے ہو۔ میں ڈرا کہ کہیں آپؐ بددعا نہ دے دیں اور کہا "اشهد ان لا اله الا الله وانك رسول الله۔" آپؐ نے ارشاد فرمایا، سے چھپاؤ۔ میں نے عرض کیا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا میں سے اسی طرح سر عام ظاہر کروں گا جس طرح شرک کو کرتا تھا[۹]۔" اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنا کام بھول کر اسے زیادہ سے زیادہ سننے کیلئے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی

---

(۱) ھشام ۱: ۲۴۱ کبیر ۲: ۲۴۲ (۲) ھشام ۱: ۲۴۶ کبیر ۲: ۲۴۲ (۳) واصل ۱: ۳۷ کبیر ۲: ۲۳۹ ھشام (۴) مسعودی ۱: ۷ کبیر ۲: ۲۳۸ ۲۴ سعد ۳: ۳۸۱
ھشام ۱: ۲۴۶ (۵) ھشام ۱: ۲۴۷ کبیر ۲: ۲۴۳ (۶) ھشام ۱: ۲۸۷ (۷) سورہ حم السجدۃ ۴۱: ۲۶ (۸) ھشام ۱: ۳۳۷ (۹) سیرۃ ۲: ۳۱۹ جو رحلۃ، حجرۃ ۲: ۵

ہے کہ مخالفت کی شدت کی وجہ سے اسے جاننے کا تجسس بھی شدید ہو گیا۔ آپ سمجھنا چاہتے ہوں گے کہ آخر وہ کون سی بات ہے جو لوگوں کو دین اور قبیلے سے جدا کر دیتی ہے۔ لیکن کیا اس موقع پر ہی اسلام بھی قبول کر لیا؟ یہ ناممکن ہے کیونکہ اگر پہلی ہی مرتبہ قرآن سننے سے فوری طور پر مسلمان ہونے والے ہوتے تو پھر ابتدائی چند مسلمانوں میں ان کا شمار ہوتا' پھر یہ آپ کی اپنی ہی بیان کردہ دیگر روایتوں کے بھی خلاف ہے۔ اس کا آخری حصہ جس میں اسلام کا کھل کر اعلان کرنے کا عزم ہے' وہ دار ارقم کے موقع پر بھی آپ نے کیا تھا بعد میں اس پر عمل بھی کر کے دکھایا۔ ہمارے نزدیک اس واقعے کا آپ کے ذہنی سفر میں اہم رول ہے۔

○ .... تیسرا مرحلہ:

حق و باطل کی سرد جنگ زوروں پر تھی دلائل کے میدان میں مسلسل شکست کھا رہے تھے۔ ایک طرف بقول ابن اسحاق انہوں نے غنڈوں کو اکسا کر جھلانے اور جسمانی اذیتیں دینا شروع کر دیں اور دوسری طرف رسول خدا ﷺ کے خلاف شاعری' جادوگری' کہانت اور جنون کا پروپیگنڈا شروع کر دیا' لیکن اس کے باوجود آپ کچھ چھپائے بغیر احکام خداوندی کا کھل کر اظہار فرماتے رہے۔ ان کے دین کی برائیوں اور ناپسندیدہ باتوں کو خوب واضح کرتے اور ان کے بتوں سے بیزاری اور حالت کفر سے علیحدگی کا اعلان کرتے[۱]۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی آپ کو ستانے کا وطیرہ اپنا لیا تھا۔ ایک روز اسی غرض سے نکلے ذہن میں تہمت طرازیوں کا اثر تھا' مگر انہیں کیا خبر تھی کہ اس پیش قدمی سے اسلام کی طرف کچھ اور مسافت طے ہو جائے گی۔ خود ہی بیان کرتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے ایک روز میں رسول اللہ ﷺ کو ستانے کیلئے گھر سے نکلا' مگر آپ مجھ سے پہلے حرم میں داخل ہو چکے تھے۔ میں پہنچا تو آپ نماز میں سورہ الحاقہ پڑھ رہے تھے۔ میں آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور سننے لگا۔ قرآن کی شان کلام پر میں حیران ہو رہا تھا کہ میرے دل میں یکایک یہ خیال آیا کہ یہ شخص ضرور شاعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ فوراً ہی حضور ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ "انه لقول رسول كريم وما هو بقول شاعر قليلاً ما تؤمنون"[۲]۔ "یہ ایک رسول کریم کا قول ہے کسی شاعر کا قول نہیں ہے تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔ میں نے اپنے دل میں کہا شاعر نہیں تو پھر کاہن ہے۔ اسی وقت زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے "ولا بقول كاهن قليلاً ما تذكّرون" "اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو" تنزيل من رب العالمين[۳]۔ "یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ یہ سن کر اسلام میرے دل میں گھر اتر گیا"[۴]۔

○ .... چوتھا مرحلہ:

جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے کہ آپ نے مسلمانوں پر بہت زیادہ مظالم ڈھائے' مگر وہ بے نتیجہ ثابت ہوئے آخر کار تنگ آ کر انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کا پروگرام بنایا۔ ان میں آپ کے اپنے عزیز و اقارب بھی شامل تھے جو اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ رہے تھے' مگر کس جرم پر؟ یہی سوال حضرت عمرؓ کیلئے ضمیر کی خلش بن گیا۔ اس نے انہیں جھنجھوڑ کر اسلام کے مزید قریب کر دیا۔ اس تاثر کو مؤرخین نے حضرت لیلیٰ بنت ابی حثمہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کی قریبی رشتہ دار تھیں اور اپنے شوہر حضرت عامر بن ربيعة العنزی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کیلئے اپنا سامان باندھ رہی تھی اور میرے شوہر عامرؓ بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمرؓ آئے' جبکہ وہ اپنے شرک پر قائم تھے اور ہم ان کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اٹھا چکے تھے' مگر اس وقت وہ کھڑے ہو کر میری مشغولیت دیکھتے رہے۔ پھر کہنے لگے "عبداللہ کی ماں' کیا بس اب روانگی ہے؟" میں نے کہا "ہاں! جب تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا اور ہم پر ظلم کیا' تو اب ہم خدا کی زمین میں کہیں نکل جائیں گے' جہاں خدا ہمارے لئے اس مصیبت سے نکلنے کی کوئی راہ نکال دے۔" اس پر عمرؓ نے

---

(۱) ھشام ۱/۳۰۸ (۲) سورۃ الحاقۃ ۶۹: ۴۰-۴۱ (۳) ایضاً ۴۲-۴۳ (۴) حنبل ۱/۱۷ جوزی ۱۱ سہیلی ۲/۲۷۷ الرالقہ ۵۳ سیوطی ۱۰۱

کہا "اللہ تمہارے ساتھ ہو۔" اس وقت میں نے ان پر وہ رقت دیکھی جو کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہمارے وطن چھوڑنے پر وہ غمگین ہو کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد جب عامرؓ ہمارا مطلوبہ سامان لے کر واپس آئے تو میں نے کہا "عبداللہ کے ابا! کاش تم اس وقت عمرؓ کو اور ہمارے حال پر ان کی رقت اور رنج کو دیکھتے۔ ابھی ابھی وہ یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔" عامرؓ نے کہا کیا تمہیں اس کے مسلمان ہونے کی امید ہو گئی ہے؟ میں نے کہا ہاں! انہوں نے کہا کہ جس شخص کو تم نے ابھی دیکھا ہے وہ اس وقت تک مسلمان نہ ہو گا جب تک خطاب کا گدھا مسلمان نہ ہو جائے۔ ام عبداللہ نے کہا "یہ بات انہوں (عامر) نے اس لئے کہی کہ وہ عمرؓ سے ناامید تھے کیونکہ اسلام کے متعلق عمرؓ کی سختی اور شدت مدت سے دیکھتے آ رہے تھے"[1]۔ آپ اپنے عقیدے میں اس قدر پختہ تھے کہ مسلمان یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ اسے ترک کرنے کیلئے کبھی آمادہ بھی ہو سکیں گے۔

○ پانچواں مرحلہ:

آپ مروجہ نظام کے پرجوش حامی تھے۔ محض اپنی ذاتی تعلق داریوں، محبتوں اور عقیدتوں کی خاطر اس قدر جلد شکست کھا جانا آپ کی طبیعت و مزاج کے خلاف تھا، لہٰذا اپنے موقف پر جمے رہے، لیکن اسلام کو جاننے کا تجسس بڑھ گیا۔ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اور زور بیان اور ادب کی چاشنی انہیں بار بار اپنی طرف کھینچتی اور اسے سن کر لطف اندوز ہونے کے حیلے تلاش کرتے۔ پھر انہیں مذہب سے بھی بہت لگاؤ تھا، منتیں اور نذریں بھی مانا کرتے تھے۔ اسی دور کی ایک اعتکاف کی نذر کو آنحضور ﷺ نے عہد اسلام میں پورا کرنے کا حکم دیا۔ عرض کیا "كنت نذرت في الجاهلية ان اعتكف ليلة في المسجد الحرام قال اوف بنذرك"[2]۔ "اسی طرح آپ راتوں کو بھی جا جا کر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اسی ذوق نے اسلام سے ان کے فاصلے کو مزید سمیٹ دیا۔ ابن اسحاق نے کہا "مجھ سے عبداللہ بن ابی نجیح مکی نے اپنے رفیقوں عطاء اور مجاہد اور راویوں سے حضرت عمرؓ کے اسلام کا حال خود ان کی زبانی یوں بیان کیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے میں اسلام سے بہت دور بھاگنے والا تھا اور جاہلیت کے زمانے میں شراب پیا کرتا تھا، اس کا بڑا شوقین اور خوب پینے والا تھا۔ ہماری ایک مجلس حزورہ (بازار مکہ) میں عمر بن عبد (بن عمران المخزومی) کے کنبہ والوں کے پاس تھی، جس میں قریش جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک رات میں ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کے پاس جانے کے ارادے سے اس مجلس کی طرف چلا اور وہاں پہنچا تو ساتھیوں میں سے کسی کو بھی نہ پایا۔ میں نے سوچا کہ مجھے فلاں شراب فروش کے پاس جو کہ مکہ میں شراب بیچا کرتا تھا، جانا چاہئے۔ شاید وہاں سے شراب مل جائے اور میں کچھ پی سکوں۔ پھر میں چلا اور اس کے پاس پہنچا، تو اسے بھی نہ پایا۔ پھر میں نے سوچا بہتر ہو میں کعبۃ اللہ جاؤں اور اس کے سات یا ستر چکر لگاؤں۔ پھر میں مسجد میں آیا کہ کعبۃ اللہ کا طواف کروں تو رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ جب نماز پڑھا کرتے، تو شام کی جانب منہ کرتے اور کعبۃ اللہ کو اپنے اور شام کے درمیان رکھتے۔ آپ کا نماز پڑھنے کا مقام رکن اسود اور رکن یمانی دونوں کے درمیان تھا۔ کہا، جب میں نے آپ کو دیکھا تو دل میں کہا "واللہ آج رات محمد (ﷺ) کی طرف توجہ کروں اور سنوں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟" پھر میں نے کہا "اگر میں سننے کیلئے ان سے نزدیک ہوا تو وہ ڈر جائیں گے۔ اس لئے میں حجر (حطیم) کی جانب سے آیا اور کعبۃ اللہ کے غلاف کے اندر ہو گیا آہستہ آہستہ قریب تر ہونے لگا۔ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے نماز پڑھتے اور قرآن کی تلاوت فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ میں آپ کے قبلے کی سمت میں آپ کے مقابل ہو گیا۔ آپؐ کے اور میرے درمیان غلاف کعبہ کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ کہا "جب میں نے قرآن سنا تو اس سے میرے دل میں رقت پیدا ہوئی۔ میں رو پڑا اور مجھ پر اسلام اثر کر گیا۔ غرض میں اسی جگہ کھڑا رہا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پوری کر لی اور لوٹ گئے۔" آپ جب واپس تشریف لے جایا کرتے تو ابن ابی حسین کے گھر سے ہو کر تشریف لے

---

(۱) ہشام ۱/۳۶۷، طبری، کثیر ۳/۷۹ (۲) بخاری ۲/۶۰، مسلم ۵/۸۰، ترمذی ۳/۴۸

جاتے تھے اور یہی آپ کا راستہ تھا۔ اس کے بعد آپ مقام سعی سے گزرتے۔ عباس بن عبدالمطلب، ابن ازہر بن عبد عوف الزہری کے گھروں کے درمیان سے الاخنس بن شریق کے گھر کے پاس سے ہوتے ہوئے اپنے گھر تشریف لے جاتے۔ آنحضرت ﷺ کے رہنے کا مقام الدار الرقطاء میں تھا، جو معاویہ بن ابی سفیان کے قبضے میں تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کے بعد میں آپ کے پیچھے ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب آپؐ عباس اور ابن ازہر کے گھروں کے درمیان پہنچے، تو میں آپ کے پاس پہنچ گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے میری آہٹ سنی تو مجھے پہچان لیا۔ آپؐ نے خیال فرمایا کہ میں نے صرف آپ کو ستانے کیلئے آپ کا پیچھا کیا ہے، چنانچہ مجھے ڈانٹا اور فرمایا "ماجاء بك يا ابن الخطاب هذه الساعة" "اے خطاب کے بیٹے! تجھے اس وقت کون سی چیز یہاں لائی ہے؟

عرض کی "اللہ، اس کے رسولؐ اور اس چیز پر ایمان لانے کیلئے آیا ہوں جو وہ اللہ کے پاس سے لایا ہے۔" کہا "پھر تو رسول اللہ ﷺ نے اللہ کا شکر کیا" اور فرمایا "قد هداك الله يا عمر" "اے عمر اللہ نے تجھے سیدھی راہ دکھا دی۔ پھر آپؐ نے میرے سینے پر دست مبارک پھیرا اور میرے لئے ثابت قدمی کی دعا فرمائی۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے لوٹ آیا اور آپ اپنے دولت کدے میں تشریف لے گئے"[1]۔ یہ روایت ایک طرف عہد جاہلیت و جوانی میں آپ کی ذاتی سرگرمیوں اور رنگین محفلوں کی دلچسپیوں کی ہلکی سی جھلک پیش کرتی ہے۔ دوسری طرف مذہب سے آپ کے قلبی، ذہنی تعلق کو اجاگر کرتی ہے اور تیسری طرف اسلام کو جاننے اور سمجھنے کیلئے ایک تجسس اور ایک تڑپ کی نشاندہی کرتی ہے، جس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ آپ کا ذوق لطیف قرآن کے آگے سرنگوں ہو گیا۔ آپ کی سخت مزاجی جب قرآن کی زد میں آئی تو رقت قلبی میں ڈھل گئی اور پھر بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، مگر یہ آنسو کس چیز کے تھے ندامت کے یا احساس شکست کے؟ کیا اس کے فوراً بعد آپ نے ہتھیار ڈال دیئے؟ میرے نزدیک یہ آنسو دراصل آپ کی نفسیاتی بے چارگی و بے بسی کی ایک علامت تھے کہ جس کی بنا پر کسی حتمی نتیجے تک پہنچنا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ کربناک کشمکش ان کا سبب تھی، جو آپ کے عقیدے اور ضمیر کے مابین اور فکر اور جذبات کے مابین برپا تھی۔ دو متضاد نظریات اور نظاموں کا تصادم ان کے اپنے اندر اب عروج تک پہنچ چکا تھا۔ ان کی اپنی شخصیت اب اندرونی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ جس خطرے سے معاشرے کو بچانا چاہتے تھے، اس کی زد میں ان کا اپنا قبیلہ اور خاندان آیا تو غیظ و غضب میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ اب ان کی اپنی ذات اس کی زد میں آئی تو بے چین ہو گئے۔ رات کی نیند اور دن کا چین لٹ گیا۔ قرآن سے متاثر ہونے کے باوجود ابھی تک اپنے مؤقف پر اڑے ہوئے تھے اور ہار ماننے کیلئے تیار نہ تھے۔ بقول سید مودودیؒ "ذہنی کشمکش نے آخر کار ایک روز انہیں اس بات پر آمادہ کر دیا کہ جا کر رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیں، تاکہ یہ قضیہ ہی ختم ہو جائے جس نے ان کو الجھن میں ڈال رکھا ہے[2]۔"

جہاں تک اس روایت کے اس جملے کا تعلق ہے کہ آنحضور ﷺ سے کہا کہ میں ایمان لانے کیلئے آیا ہوں محل نظر ہے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ ان کے اپنے ہی بیان کے خلاف ہے، جو انھوں نے بہت سے لوگوں کے سامنے دیا۔ اپنے لقب فاروق کی وجہ تسمیہ میں قبول اسلام کے واقعے کی بھی تفصیل بتائی کہ اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر میں مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا۔ اسے ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے[3]۔ دوسرا یہ کہ وہ مشہور واقعہ زیادہ قابل اعتماد ہے جو دار ارقم میں پیش آیا کیونکہ وہ چالیس پینتالیس مسلمانوں کے سامنے پیش آیا۔ تیسرا یہ کہ حضرت عمرؓ کا مجموعی مزاج بھی اتنا بڑا فیصلہ اور اقدام چھپ کر کرنے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ چوتھا یہ کہ ہشام نے اسے ابن عباسؓ کے حوالے سے رقم کیا ہے اور دوسرے نمبر پر رکھا ہے اور ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے "والله اعلم اى ذلك كان"[4]۔ "اسی طرح ابن سعد اور دیگر معروف مؤرخین نے دار ارقم کے واقعے کو ترجیح دی ہے[5]۔

(۱) ھشام ۱: ۳۷۱، کثیر ۳: ۸۰ (۲) مودودی ۲: ۳۰۸ (۳) کثیر ۳: ۵۰۲؛ سیوطی ۱: ۱۱۴ (۴) ھشام ۱: ۳۷۲ (۵) سعد ۳: ۲۶۸؛ کثیر ۳: ۷۹، حلبیہ ۲: [illegible]

○ آخری مرحلہ:

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اہل اسلام پر سختیوں کی شدت کا یہ عالم ہو گیا کہ بقول ابن عباسؓ مشرکوں نے ان صحابیوںؓ پر جنہوں نے اسلام اختیار کیا اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی اختیار کی' ظلم و ستم ڈھائے اور ہر قبیلے نے اپنے تعلق دار مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ انہیں قید کرتے' مارتے' بھوکے پیاسے رکھتے' تپتی ہوئی زمین پر لٹا کر تکلیفیں دیتے اور بعض تو شدید آفتوں کی تاب نہ لا سکے اور فتنے میں الجھ گئے اور بعض ان کے مقابلے میں سختیاں برداشت کر گئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا[۱] اس پر آنحضور ﷺ نے فرمایا "تم روئے زمین میں منتشر ہو جاؤ"[۲]۔ چنانچہ ہجرت حبشہ کا عمل شروع ہوا اور مجموعی طور پر تقریباً 83 مسلمان گھر بار چھوڑ کر روانہ ہو گئے[۳]۔ قریش نے ایک طرف ان کی بازیابی کی کوششیں شروع کر دیں اور دوسری طرف باقی ماندہ مسلمانوں پر جبر میں اضافہ کر دیا۔ ایک دن حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ ﷺ سے اجازت لے کر خانہ کعبہ میں تقریر کرنے لگے' تو قریش نے حملہ کر دیا۔ اس قدر ضربیں لگائیں کہ بے ہوش ہو گئے' چہرے اس قدر مسخ ہو گیا کہ پہچاننا مشکل ہو گیا۔ قریش نے مردہ سمجھ کر چھوڑا' جب دار ارقم انہیں لے جایا گیا' تو حالت دیکھ کر دوسرے لوگوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ بھی آبدیدہ ہو گئے' بلکہ زار و قطار رونے لگے۔ اسی روز حضرت حمزہؓ بھی مسلمان ہوئے اور رسول اللہ ﷺ نے اسی روز حضرت عمرؓ یا ابو جہل میں سے کسی ایک کے مسلمان ہونے کی دعا فرمائی[۴]۔ اس کی وجہ وہ بلند مقام ہے' جو آپ کو اس معاشرے میں حاصل تھا' بے پناہ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ بقول طبری آپ نہایت زبردست' طاقتور اور جری آدمی تھے[۵]۔ آپ کی غیرت عرب کے دیگر جوانوں سے ممتاز تھی۔ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔ کسی قسم کا خوف و خطر حصول مقصد کی راہ میں ان کے آگے رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ ان کے اوصاف پورے معاشرے میں نمایاں تھے۔ رسول مقبول ﷺ کو بھی معلوم تھا کہ اس طرح کی صلاحیتیں رکھنے والا نوجوان جاہلیت کو چھوڑ کر اگر اسلام کا علمبردار بن جائے' تو اسلامی تحریک کو بام عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ چنانچہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی "اللهم اعز الاسلام باحب هذين الرجلين اليك بابي جهل او بعمر ابن الخطاب"[۶]۔ "اے اللہ تو اسلام کو ابو جہل اور عمرؓ بن خطاب میں سے کسی ایک کے ذریعے غلبہ و عزت دے' جو تجھے زیادہ محبوب ہو۔" قال و كان احبهما اليه عمر۔" راوی کہتے ہیں کہ ان دونوں میں سے اللہ کو محبوب حضرت عمرؓ تھے۔ ایک اور حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بقول ابن عباسؓ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی "اللهم اعز الاسلام بابي جهل بن هشام او بعمر بن الخطاب قال فاصبح فغدا عمر على رسول الله ﷺ"[۷]۔ "اے اللہ تو اسلام کو ابو جہل بن ہشام' عمر بن الخطاب کے ذریعے عطا فرما۔ چنانچہ صبح ہوئی تو حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔

تحریکوں کو باصلاحیت افراد کی اشد ضرورت ہوتی ہے کیونکہ انہیں کی بدولت یہ پروان چڑھتی ہیں۔ انہیں کے ذریعہ غلبہ حاصل کرتی ہیں اور یہی اسے قائم رکھنے کا مادی واسطہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ ابو جہل بھی باصلاحیت تھا مگر یہ سعادت حضرت عمر فاروقؓ کے حصے میں آئی کہ انہوں نے دولت ایمان سے مالا مال ہو کر دنیا و آخرت دونوں میں بلند مقام حاصل کیا۔ بعض حدیثوں میں تو صرف حضرت عمر فاروقؓ ہی کے بارے میں دعا ملتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللهم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب خاصة"[۸]۔ "یا اللہ خاص حضرت عمرؓ بن خطاب سے اسلام کو عزت دے۔ بعض روایات میں

---

(۱) ہشام ۱/ ۳۳۹' کنز ۱۱/۳۲ ۷۹ (۲) سعد ۱/ ۲۰۳ (۳) ہشام ۱/ ۳۵۳' سعد ۱/ ۲۰۷' کنز ۱۱/۳۲ ۶۹ (۴) کنز ۱۱/۳۲ ۳۱' ۳۰ (۵) طبری ۲/ ۳۳۵ (۶) ترمذی ۵/ ۶۷۹' سعد ۳/ ۲۶۷' حیاۃ ۱/ ۱۷۹' حاکم ۳/ ۸۳ (۷) ہشام ۱/ ۳۷' ترمذی ۵/ ۳۸ (۸) سعد ۱/ ۳۱' حیاۃ ۱/ ۱۷۹' حاکم ۳/ ۸۳' حجر ۲/ ۵۱۲

"اید الاسلام بعمر" بھی ہے۔ بعض میں ہے کہ آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا "للھم اشدد الدین بعمر"[1]۔ "بقول حاکم رسول اکرم ﷺ کی دعا کو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کے سلسلے میں قبول فرمایا اور ان کے ذریعے اسلام کے غلبے کو استوار فرمایا اور بتوں کو توڑ ڈالا[2]۔ آخرکار وہ وقت آن پہنچا کہ جس دین کی شدت سے مخالفت کرتے رہے اللہ تعالیٰ کی مشیت سے اسی کے علمبردار بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آپ کی بہن فاطمہؓ بنت الخطاب سعیدؓ بن زید (بن عمرو بن نفیل) کے نکاح میں تھیں۔ انہوں نے اور ان کے شوہر سعیدؓ بن زید نے اسلام اختیار کر لیا تھا لیکن عمرؓ سے وہ اپنے اسلام کو چھپاتے تھے۔ نعیم بن عبداللہ النحام مکہ کا ایک شخص انہیں کی قوم یعنی بنی عدی بن کعب کا تھا۔ اس نے بھی اسلام اختیار کر لیا تھا اور اسلام کو قوم کے ڈر سے چھپاتا تھا۔ خبابؓ بن الارت فاطمہؓ بنت الخطاب کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور انہیں قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز عمرؓ اپنی تلوار حمائل کئے ہوئے رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کی ایک جماعت کے پاس جانے کے ارادے سے نکلے، جن کے متعلق انہیں معلوم ہوا تھا کہ کوہ صفا کے پاس ایک گھر میں جمع ہیں اور مردوں، عورتوں کو ملا کر ان کی تعداد تقریباً چالیس ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس آپ کے چچا حمزہؓ بن عبدالمطلب، ابوبکر صدیقؓ بن قحافہ، علیؓ بن ابی طالب اور دوسرے وہ مسلمان بھی تھے، جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ میں رہ گئے تھے۔ سرزمین حبشہ کی جانب جو لوگ چلے گئے تھے، ان کے ساتھ یہ لوگ نہیں گئے تھے اللہ ان سے راضی ہو۔ آخر نعیم بن عبداللہ عمرؓ سے ملے، تو انہوں نے ان سے کہا "عمرؓ! کہاں کا ارادہ ہے؟" عمرؓ نے کہا "اس بے دین شخص محمد (ﷺ) کی جانب جس نے قریش میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ ان کے عقلمندوں کو بیوقوف بنا رکھا ہے، ان کے دین میں عیب نکالے ہیں اور ان کے معبودوں کو گالیاں دی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اسے قتل کر دوں۔ نعیم نے ان سے کہا "اے عمر! واللہ! تمہارے نفس نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو محمد ﷺ کو تم نے قتل کر دیا تو بنی عبد مناف تمہیں چھوڑ دیں گے کہ تم زمین پر چل بھی سکو؟ تم اپنے گھر والوں کی جانب کیوں نہیں لوٹتے کہ پہلے ان کی اصلاح کرو۔" انہوں نے کہا "میرے گھر والوں میں ایسا کون ہے؟" انہوں نے کہا "تمہارا بہنوئی اور تمہارا چچیرا بھائی سعیدؓ بن زید (بن عمرو) اور تمہاری بہن فاطمہؓ بنت الخطاب۔ "واللہ! ان دونوں نے اسلام اختیار کر لیا اور محمد ﷺ کے پیرو ہو گئے ہیں، تم پر ان کی دیکھ بھال لازم ہے۔

راوی نے کہا "پھر تو عمرؓ اپنی بہن اور بہنوئی کی طرف کا ارادہ کر کے لوٹے اور ان دونوں کے پاس خبابؓ بن الارت موجود تھے۔ ان کے پاس ایک کتاب تھی، جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی اور وہ سورۂ طٰہٰ پڑھا رہے تھے۔ جب ان لوگوں نے عمرؓ کی آہٹ سنی تو خبابؓ گھر کے کسی حصے یا حجرے کے اندرونی حصے میں چھپ گئے اور فاطمہؓ بنت الخطاب نے اس کتاب کو اپنی ران کے نیچے رکھ لیا، حالانکہ عمرؓ جب گھر کے نزدیک آئے تھے، تو انہوں نے خبابؓ کی قرأت سن لی تھی۔ جب وہ اندر آئے، تو کہا "یہ کس کے گنگنانے کی آواز تھی جو میں نے سنی؟" بہن بہنوئی دونوں نے کہا نہیں، تم نے کچھ نہیں سنا۔ عمرؓ نے کہا "کیوں نہیں، واللہ! میں نے سنا ہے اور مجھے یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ تم دونوں نے محمد (ﷺ) کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے۔" اپنے بہنوئی سعیدؓ بن زید کو پکڑ لیا، تو فاطمہؓ بن الخطاب عمرؓ کی بہن انھیں کہ اپنے شوہر سے روکیں۔ عمرؓ نے فاطمہؓ کو ایسا مارا کہ ان کا سر زخمی کر دیا۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو ان کی بہن اور ان کے بہنوئی نے کہا "ہاں! ہم نے اسلام اختیار کر لیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ہم ایمان لا چکے ہیں تم جو چاہو کرو۔"

جب عمرؓ نے اپنی بہن کا خون دیکھا تو اپنے کئے پر پچھتائے۔ مارنے سے رک گئے اور اس سے کہا "اچھا مجھے وہ کتاب تو دو جو تم لوگ پڑھ رہے تھے اور میں نے ابھی ابھی تمہیں پڑھتے سنا ہے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کیا چیز ہے جو محمد (ﷺ) لائے ہیں؟ عمرؓ لکھے پڑھے شخص تھے۔ جب انہوں نے یہ کہا تو بہن نے کہا "ہمیں اس

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو حجر ۵۱۷/۲، حاکم ۸۳/۳ (۲) حاکم ۸۳/۳

کے متعلق تم سے ڈر لگتا ہے۔" عمرؓ نے کہا "ڈرو نہیں اور ان کے آگے اپنے معبودوں کی قسمیں کھائیں کہ اسے پڑھ کر ضرور واپس کر دوں گا۔ یہ سنا تو ان کے اسلام کی امید پیدا ہوئی اور کہا "بھائی جان! آپ تو اپنے شرک کی نجاست میں ہیں اور اس کتاب کو تو پاک شخص کے سوا دوسرا چھو نہیں سکتا۔ عمرؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور غسل کیا۔ بہن نے انہیں وہ کتاب دی اس میں سورہ طٰہٰ تھی اسے پڑھا۔ جب اس کا ابتدائی حصہ پڑھا تو کہا "یہ کلام کس قدر اچھا اور کس قدر عظمت والا ہے۔"

جب خبابؓ نے یہ بات سنی تو ان کے سامنے باہر نکل آئے اور کہا "اے عمرؓ! بخدا مجھے امید ہو گئی کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کی دعا سے تمہیں منتخب کر لیا کیونکہ میں نے کل آپ کو یہ دعا کرتے سنا ہے "اللھم اید الاسلام بابی الحکم بن ھشام او بعمر بن الخطاب۔" یا اللہ! ابوالحکم بن ہشام یا عمرؓ بن الخطاب سے اسلام کی تائید فرما لہٰذا اے عمرؓ اللہ سے ڈرو۔ عمرؓ نے اس وقت ان سے کہا "اے خبابؓ! مجھے محمد ﷺ کے پاس لے چلو کہ میں وہاں پہنچ کر اسلام اختیار کروں۔" خبابؓ نے ان سے کہا "رسول اللہ ﷺ کوہ صفا کے پاس ایک گھر میں ہیں جس میں آپؐ کے ساتھ اصحابؓ بھی ہیں۔"

عمرؓ نے تلوار لی اسے حمائل کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی طرف قصد کیا وہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب ان کی آواز سنی تو رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ میں سے ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور دروازے کی دراڑوں میں سے انہیں دیکھا کہ تلوار حمائل کیے ہوئے ہیں۔ وہ گھبرائے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس لوٹے عرض کی "عمرؓ بن الخطاب ہیں اور تلوار حمائل کیے ہوئے ہیں۔ حمزہؓ بن عبدالمطلب نے کہا "اسے آنے کی اجازت دیجئے۔ اگر وہ بھلائی کے ارادے سے آیا ہے تو ہم اس کے ساتھ بھلائی ہی کا سلوک کریں گے اور اگر وہ کسی برائی کے ارادے سے آیا ہے تو اسی کی تلوار سے قتل کر ڈالیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ لہ" انہیں آنے دو۔ اس شخص نے آنے کی اجازت سنائی۔ رسول اللہ ﷺ ان کی جانب خود کھڑے ہوئے۔ حجرے میں ملاقات کی ان کی کمر یا مجمع الرداء کو پکڑ لیا اور انہیں خوب کھینچ کر فرمایا "ماجاء بك يا ابن الخطاب فوالله ماأرى ان تنتهى حتى ينزل الله بك قارعة" اے خطاب کے بیٹے! تجھے کون سی چیز لائی ہے؟ واللہ! میں نہیں سمجھتا کہ تو باز آئے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کوئی آفت تجھ پر نازل فرمائے۔

عمرؓ نے عرض کی "اے اللہ کے رسول ﷺ! میں آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اللہ اس کے رسول ﷺ اور اس چیز پر ایمان لاؤں جو اللہ کے پاس سے آپ لائے ہیں۔" راوی نے کہا "پھر تو رسول اللہ ﷺ نے اس زور سے تکبیر کہی کہ جو صحابہؓ گھر میں موجود تھے جان گئے کہ عمرؓ مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ جب اس مقام سے ادھر ادھر نکلے تو اپنے آپ کو غالب محسوس کرنے لگے۔ اس وجہ سے کہ حمزہؓ کے اسلام کے ساتھ ساتھ عمرؓ نے بھی اسلام اختیار کر لیا تھا۔ وہ اس بات کو سمجھ گئے کہ یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کریں گے اور مسلمان ان دونوں کی بدولت دشمنوں سے بدلہ لے سکیں گے۔ یہ عمرؓ بن الخطاب کے اسلام کے متعلق مدینے والے راویوں کی روایت ہے[1]۔"

گزشتہ تمام واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ آپ ایک طویل کشمکش کے بعد مسلمان ہوئے' یہ بیک وقت بیرونی طور پر بھی برپا رہی اور اندرونی طور پر بھی۔ بیرونی طور پر بازار' گلیاں اور گھروں کے آنگن اس کی آماجگاہ تھے اور اندرونی طور پر آپ کا ذہن اور ضمیر اس کا میدان عمل تھے۔ بیرونی کشمکش کے واقعات سے تاریخیں بھری ہوئی ہیں' لیکن اندرونی کشمکش کے ارتقاء کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم آپ کی مجموعی شخصیت کو اس دور کے حالات کی منجدھار میں رکھ کر دیکھیں تو حالات آپ کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کو نکھار کر ہمارے سامنے لاتے ہیں اور آپ کی شخصیت سے حالات کے رخ کو سمجھنے اور اس کے تشنہ گوشوں تک رسائی حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ آپ نے اسلام کو دلائل کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کیا۔ اس کے عقائد و نظریات کا جاہلیت سے مسلسل موازنہ اور تقابل کرتے رہے'

---

(۱) ھشام ۱/۳۶۷' سعد ۳/۲۶۸' جوزی' اثیر ۴/۵۹' کثیر ۳/۷۹' سیوطی ۱۱۰' حلبوں ۲/۳۲۳۔

لیکن یہ سب کچھ لاشعور میں ہوتا رہا، اس لئے شعوری فیصلے تک اپنے سابقہ موقف پر ڈٹے رہے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن میں ابھرنے والے حسب ذیل سوالات نے آپ کے جاہلیت پر قائم رہنے کے جواز کو چیلنج کیا اور رفتہ رفتہ اسلام کے قریب کر دیا۔

☆......یہ نئی دعوت فی الواقع کیا ہے؟

☆......اس کے دلائل کیا ہیں اور اس کا مطالبہ کیا ہے؟

☆......یہ کس طرح کے لوگوں کو متاثر کر رہی ہے اور کیوں؟

☆......اس کے قبول کرنے والے واپس کیوں نہیں پلٹتے؟

☆......اس کی شدید دشمنی کا کیا فائدہ ہے؟

☆......اس کے پیش کرنے والے کا اپنا قول و فعل کیسا ہے؟

☆......اس کو پیش کرنے اور پھیلانے میں اس کا کیا مقصد ہے اور اسے کیا حاصل ہو رہا ہے؟

☆......جن عقائد اور رسومات پر اس نے تنقید کی ہے کیا وہ صحیح ہیں؟

☆......کیا مروجہ نظام واقعی عدل اور سچائی پر مبنی ہے؟

☆......کیا جس دین کے ہم پیروکار ہیں واقعی وہ ابراہیمی دین ہے؟

☆ کیا مرنے کے بعد دوبارہ انہیں اٹھایا جائے گا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اور اٹھایا گیا تو پھر؟

یہ اور اسی طرح کے دیگر سوالات نے لازمی طور پر حضرت عمرؓ کو جھنجوڑا ہو گا کیونکہ وہ فہم و فراست اور سوچ سمجھ رکھنے والے حساس انسان تھے' مختلف ادیان اور ان کے عقائد سے پوری طرح آشنا تھے۔ انبیائے سابقہ اور مختلف اقوام کے بارے میں مشہور قصے کہانیوں سے بھی واقف تھے۔ تجارتی سفروں میں ان مقامات سے گزرنے کا انہیں کئی مرتبہ اتفاق ہو چکا تھا' جو تاریخی اہمیت کے حامل تھے۔ خود خانہ کعبہ کی مرکزیت و تقدس کے بارے میں انہیں آگہی تھی۔ ان ساری باتوں نے آخرکار انہیں حلقہ اسلام میں داخل کر دیا۔ آپ کا قبول اسلام کسی فوری و ہنگامی واقعے کا نتیجہ نہیں' جیسا کہ روایات سے بظاہر تاثر ملتا ہے' بلکہ چھ سال کے گہرے تجزیے' عملی تجربے اور بھرپور سوچ بچار کا نتیجہ تھا۔ کوئی بھی انسان اپنا عقیدہ فوری اور ہنگامی طور پر تبدیل نہیں کر سکتا' اس کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ اس کے اندر تبدیلی کا عمل غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر جاری رہتا ہے۔ کوئی اچانک واقعہ اس کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے' اس کے ذریعے اس کی گومگو کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ حتمی نتیجے تک پہنچ جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ بھی ان مختلف مرحلوں سے گزر کر مسلمان ہوئے۔ یہ وہ مرحلے ہیں' جنہوں نے آپ کو اسلام کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے اور معروضی تجزیہ کرنے پر مجبور کر دیا اور آپ کے قلب و ذہن میں اسلام کی صداقت و حقانیت بتدریج اترتی چلی گئی۔ جب اسلام میں داخل ہو گئے' تو خالق کائنات کی عبادت سر عام ہونے لگی۔ بقول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ "ما عبدنا الله جهرة حتى اسلم عمر"[1]۔ "ابن اسحاق کہتے ہیں کہ آپ نے اسلام لاتے ہی فرمایا خدا کی قسم ہم کفر کی حالت میں کفر کا اظہار کرتے تھے' اب اسلام اس کا زیادہ حقدار ہے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔ اللہ کا دین کے میں ضرور غالب ہو کر رہے گا۔ ہماری قوم اگر ہم

---

(۱) حجر ۲/۵۱۱

پر ظلم و تعدی کرنا چاہے گی تو اس سے لڑیں گے۔ اگر انصاف کرے گی تو قبول کریں گے پھر آپ صحابہ کرامؓ کو لے جا کر مسجد میں بیٹھے [1]۔ عبداللہ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے "ہم لوگ کعبۃ اللہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ عمرؓ نے اسلام اختیار کیا اور جب عمرؓ نے اسلام اختیار کیا تو قریش سے جنگ کی۔ حتیٰ انہوں نے کعبۃ اللہ کے پاس نماز پڑھی اور ان کے ساتھ ہم نے بھی نماز پڑھی" [2]۔ رسول خدا ﷺ کو جو سب سے پہلا مشورہ دیا وہ یہی تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم دین کو کیوں چھپائیں جبکہ ہم حق پر ہیں، جبکہ وہ لوگ باطل پر ہونے کے باوجود اپنے دین کو ظاہر کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا "یا عمر انا قلیل قد رایت ماتعینا۔" آپ نے پرعزم لہجے میں کہا "فوالذی بعثك بالحق لایبقی مجلس جلست فیه بالکفر الا اظهرت فیه الایمان" [3]۔ چنانچہ گھر سے نکلے اور ابوجہل اور دیگر جو جو لوگ عداوت میں سخت تھے ان کے گھروں کے دروازے کھٹکھٹا کر انہیں اپنے ایمان سے مطلع کیا اور اس مقصد کی خاطر اہل قریش کی ہر محفل اور ہر حلقے تک پہنچے [4]۔ پھر اس پر بھی آپ کی تسلی نہ ہوئی، پیٹ کے سب سے ہلکے شخص جمیل بن معمر کو صبح کے وقت جا کر بتایا تاکہ ہر کسی کو یہ خبر پہنچا دے [5]۔ "اس طرح اگلے دن تک ہر طرف آپ کے اسلام کا چرچا تھا۔ بقول حضرت ابن عباسؓ "اول من جهر الاسلام عمر بن الخطاب" [6]۔ "مکہ کی فضاؤں میں جب پہلی مرتبہ مسلمانوں کا نعرۂ تکبیر گونجا تو اہل قریش سہم گئے [7]۔ مسلمانوں کو دو صفیں بنائے علانیہ مسجد حرام میں داخل ہوتے دیکھا تو انہیں شدید صدمہ پہنچا [8]۔ لیکن انہیں ہمت نہیں ہوتی تھی کہ حضرت عمرؓ پر ہاتھ اٹھائیں، دوسرے مسلمانوں پر تشدد کا سلسلہ جاری تھا مگر آپ سے وہ آنکھ بھی نہیں ملاتے تھے [9]۔ آپ کو یہ بات ناگوار گزری۔ حق کی راہ میں اذیتوں سے لذت آشنا ہونے کی تڑپ دل میں جاگی۔ حجر کے پاس لوگوں کے مجمع میں جمیل بن معمر کے پیچھے پیچھے جا پہنچے۔ یہاں تک کہ وہ مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا اور انتہائی بلند آواز سے چیخا "اے گروہ قریش! اور کعبۃ اللہ کے گرد اپنی مجلسوں میں بیٹھنے والو! سن لو کہ عمرو بن الخطابؓ نے بے دینی اختیار کر لی۔" عمرؓ اس کے پیچھے کہتے جا رہے تھے "اس نے جھوٹ کہا (میں بے دین نہیں ہوا) بلکہ میں نے اسلام اختیار کیا ہے۔ اس بات کی گواہی دی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ ان لوگوں نے آپ پر حملہ کر دیا۔ آپ بھی ان سے جنگ کرتے رہے اور وہ آپ سے جنگ کرتے رہے، یہاں تک کہ آفتاب ان کے سروں پر آ گیا۔ آپ تھک کر بیٹھ گئے اور قریش آپ کے سر پر کھڑے رہے۔ آپ نے فرمایا "تم جو چاہو کرو، میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر ہم تین سو مرد ہو جائیں تو (ہم برابر لڑیں) پھر یا ہم مکہ کو تمہارے لئے چھوڑ دیں گے یا تم ہمارے لئے چھوڑ دو گے" [10]۔ وہ لوگ اسی حالت میں تھے کہ قریش سے ایک بوڑھا عاص بن وائل السہمی جو یمنی کپڑے کا نیا لباس اور نقش و نگار کی قمیص پہنے ہوئے تھا، وہ آ کر پاس کھڑا ہو گیا اور کہا "آخر تمہارا قصہ کیا ہے؟" انہوں نے کہا "عمرؓ بے دین ہو گیا ہے۔" اس نے کہا تو کیا ہوا؟ ایک شخص نے اپنی ذات کیلئے ایک بات اختیار کر لی ہے، پھر تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ بنی عدی کعب اپنے آدمی کو اس طرح تمہارے حوالے کر دیں گے۔ اس شخص کو چھوڑ دو، واللہ! پھر تو وہ آپ سے اسی طرح الگ ہو گئے گویا کپڑا کھینچ کر پھینک دیا گیا [11]۔ مشرکوں کے ساتھ قدم قدم پر مقابلہ جاری رکھا، ان کے جبر کی مزاحمت کی۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ اکیلے لڑتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے حملہ کیا تو عتبہ بن ربیعہ کو گرا کر اس کے سینے پر بیٹھ گئے۔ اس کی دونوں آنکھوں میں انگلیاں گاڑ دیں، یہ دیکھ کر باقی سب لوگ بھاگ گئے [12]۔ قریش آپ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ ایک مرتبہ آپ اپنے گھر میں تھے اور باہر وادی میں اس غرض سے انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اکٹھا تھا۔

---

(1) اثیر: ۴/۵۶ (۲) ہشام: ۱/۳۶۶، حاکم: ۳/۸۳، کثیر: ۳/۷۹، سعد: ۳/۲۱۱، سیوطی: ۱۱۵ (۳) کثیر: ۳/۳۱، سیوطی: ۱۱۴ (۴) ہشام: ۱/۳۷۴، اثیر: ۴/۵۵، کثیر: ۳/۳ سیوطی: ۱۱۲ (۵) ہشام: ۱/۳۷۴، حنفیہ: ۹/۱۰۱، اثیر: ۴/۵۶، کثیر: ۳/۸۱، سیوطی: ۱۱۲ (۶) سیوطی: ۱۱۵ (۷) اثیر: ۴/۵۶، کثیر: ۳/۳۱ (۸) اثیر: ۴/۵۶، سیوطی: ۱۱۴ (۹) سیوطی: ۱۱۲ (۱۰) سیوطی: ۱۱۲، ہشام: ۱/۳۷۴، اثیر: ۴/۵۷، حنفیہ: ۹/۱۰۱ (۱۱) ہشام: ۱/۳۷۴ (۱۲) کثیر: ۳/۳۱۔

جاہلیت میں آپ کے حلیف عاص بن وائل نے یہ کہا کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ پھر کہیں جا کر وہ لوگ واپس آئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں اس وقت چھوٹا تھا اور گھر کی چھت پر چڑھ کر یہ منظر دیکھ رہا تھا[1]۔ ایک اور مرتبہ کفار کے ساتھ لڑائی کے دوران آپ کے ماموں ابوجہل نے پناہ دی تو لوگوں نے حملہ بند کیا[2]۔ اور آئندہ سے تعرض کرنا چھوڑ دیا لیکن یہ بات آپ کے ضمیر کی خلش بن گئی۔ آپ کے اپنے بقول "مجھے یہ برا معلوم ہوا کہ دوسرے مسلمانوں سے مار پٹائی جاری رہے اور میں کھڑا دیکھوں چنانچہ ماموں کے پاس پھر گیا اور اس سے جا کر کہا کہ میں تیری پناہ میں رہنا نہیں چاہتا۔ اس کے بعد مارتے پیٹتے رہے حتیٰ کہ خداوند تعالیٰ نے اسلام کو قوت بخشی[3]۔"

مستشرق موسیو سدیو کے بقول "حضرت عمرؓ مسلمان ہوگئے ان کا اسلام لانا تھا کہ قریش کے جسموں پر لرزہ چھا گیا خوف سے گھبرا اٹھے۔ آپ نبی ﷺ کے سخت دشمن تھے مگر قضا و قدر نے کر رکھا تھا کہ اسلام کی قوت انہی سے قائم ہوگی[4]۔ رہی یہ بات کہ آپ کب مسلمان ہوئے بعض راوی ۵ سن نبوی بتاتے ہیں اور بعض کھینچ کر ہجرت سے چار سال قبل ۹ سن نبوی تک لے جاتے ہیں[5] لیکن ایسی روایتیں شاذ ہیں۔ واقعاتی شہادتیں دونوں میں سے کسی کی تصدیق نہیں کرتیں۔ اس لئے راجح وہی بات ہے جسے راویوں کی واضح اکثریت نے بیان کیا ہے اور تقریباً تمام مؤرخین نے اسے تسلیم کیا ہے کہ آپ نبوت کے چھٹے سال مسلمان ہوئے[6] ابن سعد نے ذی الحج کا مہینہ لکھا ہے[7]۔ اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟ اس بارے میں بھی اختلاف ہے۔ اس کی وجہ آپ کے سن پیدائش کے تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض روایات کے مطابق آپ قبول اسلام کے وقت ۲۶ سال کے تھے[8] اور بعض کے مطابق ۲۷ سال کے تھے[9] لیکن اگر آپ کی ولادت کو عام الفیل کے ۱۳ سال بعد مانا جائے جیسا کہ روایت میں آتا ہے[10] تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے تقریباً ۱۳ سال چھوٹے تھے۔ اس طرح آپ کی عمر تقریباً ۳۳ سال ہونی چاہئے ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے۔ اس بات کو ان روایات سے بھی تقویت ملتی ہے جن میں شہادت کے وقت آپ کی عمر ۶۳ سال بیان کی گئی ہے[11]۔ جاہلیت میں آپ کے پاس سفارت کا منصب ہونا بھی اس بات کی علامت ہے کہ آپ عمر میں بھی ضرور پختہ ہوں گے۔ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ آپ بعثت نبوی سے ۳۰ سال قبل پیدا ہوئے[12] اس سے قبول اسلام کے وقت آپ کی عمر ۳۶ سال بنتی ہے۔

آپ سے پہلے کتنے لوگ دامن اسلام میں آ چکے تھے اس بارے میں بھی مختلف بیانات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے ایمان کو خفیہ رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن ثعلبہ کا بیان ہے کہ آپ ۴۵ مرد اور ۱۱ عورتوں کے بعد مسلمان ہوئے۔ ابو جعفر نے بھی اس کی تائید کی ہے[13]۔ ہلال بن یساف، زہیر، سعید المسیب ۴۰ مرد اور ۱۰ یا ۱۱ عورتوں کے بعد قبول اسلام کے قائل ہیں۔ زہری بھی یہی کہتے ہیں[14]۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ۳۹ مرد اور عورتوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ اسلام لائے تو ۴۰ آدمی ہو گئے[15]۔ تقریباً تمام مورخین نے ان روایات کو محض نقل کر دینے پر قناعت کی ہے ان کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا۔ اس لئے یہی بات مشہور و معروف ہو گئی ہے۔ ہمارے نزدیک ان کو تسلیم کرنے کی شرط یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ یہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو اس وقت مدینے کے اندر موجود تھے ورنہ مجموعی تعداد اس سے کہیں زیادہ بنتی ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ مؤرخین کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ آپ ۶ سن نبوی میں

---

(۱) بخاری ۴/۲۴۲ (۲) سیوطی ۱:۱۱۳ اثیر ۴:۱ ۵۵ (۳) سیوطی ۱:۱۱۳ اثیر ۴:۱ ۵۶ (۴) موسیو ۱۰۳ (۵) مسعودی ۲ ۳۳ کثیر ۳:۱ ۸۲ (۶) سعد ۳ ۲۶۹ طبری جوزی ۱:۲ کثیر سیوطی ۱:۱ (۷) سعد ۳ ۲۶۹ (۸) سعد ۳ ۲۸ سیوطی ۵:۱ ۱ (۹) کثیر ۷ ۱۳۳ سیوطی ۸:۱ ۱ (۱۰) مسلم ۷/۸۷ حاکم ۳/۹۱ طبری ۴/۱۹۷ ذہبی ۱/۸۱ (۱۱) حجر ۲ ۵۰۱ (۱۲) سعد ۳ ۲۶۹ طبری ۴ اثیر ۴:۱ ۵۳ (۱۳) سعد ۳ ۲۶۹ طبری ۴ جوزی ۲ ۱۲ اثیر ۴:۱ ۵۳ کثیر ۳/۷۹ سیوطی ۱:۱۰۹ (۱۴) اثیر ۴/۵۳ جوزی ۱۲:۲ (۱۵) ہشام ۱/۳۶۷ کثیر ۳/۶۹۔

مسلمان ہوئے۔ یہ ان دونوں کی بات ہے جبکہ ہجرت حبشہ ثانیہ ہو چکی تھی کیونکہ پہلی ہجرت بالکل خفیہ تھی اور دوسری ہجرت کا موقع تھا۔ جب آپ اپنی عزیزہ لیلیٰ بنت ابی خثمہ کے جانے پر ملول تھے [۱]۔ ابن اسحاق کے بقول "کان اسلام عمرؓ بعد خروج من خرج من اصحاب رسول اللہ ﷺ الی الحبشہ [۲]۔ "ابن ہشام اور ابن کثیر نے ان کی مجموعی تعداد ۸۳ بتائی ہے [۳]۔ ابن سعد کی نقل کردہ روایت میں ۸۳ مرد تھے مزید ۱۱ عورتیں اور کچھ اور لوگ تھے [۴]۔ ابن کثیر نے بالکل بجا کہا ہے "ھذا یرد قول من زعم انہ کان تمام الاربعین من المسلمین فان المھاجرین الی الحبشۃ کانوا فوق الثمانین [۵]۔ "البتہ ابن کثیر نے یہ امکان ضرور ظاہر کیا ہے کہ ہجرت حبشہ کے بعد جو لوگ مسلمان ہوئے ان میں آپ چالیسویں ہو سکتے ہیں [۶]۔

نوٹ :

فاروق اعظمؓ کے حالات زندگی میں سے عہد نبوی، عہد صدیقیؓ اور عہد خلافت کے اہم واقعات مقالے کے اگلے ابواب میں حسب موقع تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس لئے اس باب میں انہیں بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ البتہ شہادت کا اہم واقعہ اور اس کے محرکات و نتائج کسی اور باب میں نہیں آسکتے تھے لہٰذا اسی باب میں اس کی تفصیلات دے دی گئی ہیں تاکہ سوانحی خاکہ مکمل ہو سکے۔

(۱) ھشام [illegible] کثیر [illegible] (۲) ھشام [illegible] (۳) ھشام [illegible] کثیر [illegible] (٤) سعد [illegible] (٥) کثیر [illegible] (٦) [illegible]

شہادت

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ احد پہاڑ کے اوپر چڑھے۔ آپؐ کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ بھی تھے' احد پہاڑ ہلنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا "اے احد ٹھہر جا کہ تجھ پر ایک نبی' ایک صدیق اور دو شہید ہیں[۱]۔" سرور کونین کا یہ فرمان پیشین گوئی تھی' بشارت تھی' حقیقت کی نشاندہی تھی یا حوصلہ افزائی؟ ہو سکتا ہے یہ چاروں چیزیں بیک وقت مقصود ہوں' لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ آپ اللہ کی راہ میں قتل ہو کر شہادت کا مرتبہ حاصل کریں گے۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ آپ ان معنوں میں شہید ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے پیغام حق کی سچائی کی گواہی ڈنکے کی چوٹ پر دی اور کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ قبول اسلام کے بعد آپ کے دل و ذہن میں کسی قسم کا کوئی شک ہو۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ آپ نے ہر اہم موڑ پر اپنے قول اور عمل سے دین کی حقانیت کی شہادت دی۔ یہاں تک کہ آپ کا وقت آخر آپہنچا اور شہادت حق کی بنا پر حق شہادت کے مستحق قرار پائے۔ "ایک مرتبہ رسول اکرمؐ نے آپ کو سفید رنگ کا کرتہ پہنے ہوئے دیکھا تو پوچھا نیا خریدا ہے یا دھلا ہوا ہے؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "دھلا ہوا ہے۔" آپؐ نے ارشاد فرمایا: "البس جديداً و عش حميداً و مت شهيداً و يرزقك الله قرة عين في الدنيا والآخرة[۲]۔"

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کی بات ہے۔ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کے بقول میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگ ایک جگہ جمع کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص دیگر سارے لوگوں سے تین گز بلند ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے' تو کہا گیا عمر بن الخطابؓ۔ میں نے پوچھا یہ کس وجہ سے ان لوگوں سے بلند ہیں؟ کہا گیا ان میں تین خصلتیں ہیں ایک یہ کہ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے' وہ شہید بنائے ہوئے شہید ہیں اور خلیفہ بنائے ہوئے خلیفہ ہیں[۳]۔ حضرت عوفؓ نے جاکر اپنا خواب حضرت ابو بکر صدیقؓ کو سنایا' انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو بلا بھیجا۔ جب وہ آئے تو حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عوفؓ سے کہا کہ اپنا خواب بیان کرو۔ جب انہوں نے کہا کہ خلیفہ بنائے ہوئے خلیفہ ہیں تو حضرت عمرؓ نے انہیں جھڑک دیا' فرمایا "خاموش! ایسی بات کہتا ہے حالانکہ ابو بکرؓ زندہ ہیں[۴]۔" آپ کا یہ عمل نہایت حکمت و بصیرت پر مبنی تھا اس سے مسلمانوں کے اجتماعی و سیاسی معاملات سے بے شمار خرابیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ البتہ آپ کے ذہن میں حضرت عوفؓ کا خواب محفوظ رہا' چنانچہ اپنے عہد خلافت میں ملک شام میں آپ خطبہ دے رہے تھے۔ آپ کی نگاہ عوف بن مالکؓ پر پڑی تو آپ نے اپنے تصورات کو مکمل کر بیان کرنے کا موقع سمجھا۔ انہیں بلا کر اپنے پاس منبر پر چڑھالیا اور فرمایا کہ اپنا خواب بیان کرو۔ انہوں نے اسے بیان کر دیا تو آپ نے فرمایا' یہ بات کہ میں اللہ کے معاملے میں ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتا تو میں اللہ سے آرزو کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسے ہی لوگوں میں کر دے۔ یہ بات کہ میں خلیفہ بنایا ہوا خلیفہ ہوں تو میں (واضح کرتا ہوں) کہ خلیفہ بنایا گیا ہوں اور اللہ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس نے جو چیز میرے سپرد کی ہے اس میں میری مدد کرے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ شہید بنایا ہوا شہید' تو مجھے کہاں سے شہادت مل سکتی ہے۔ میں جزیرۃ العرب میں ہوں' جہاد نہیں کرتا اور لوگ میرے اردگرد ہیں' مجھے اس کا افسوس ہے' مجھے اس کا افسوس ہے۔ ہاں اگر اللہ چاہے تو اسے لے آئے گا[۵]۔

(۱) بخاری ٤: ۱۹۷ مسلم ٦: ۱۲۸ ترمذی ٥: ۲۸۷ ابوداؤد ٤/٥: ۲۹٥ (۲) حبان ٩/٢٣ سعد ٣: ٣٢٩ مجمع الزوائد ٩: ٢٤ الریاض النضرہ ۱۱۲۷ (۳) سعد ۳: ۳۳ سیوطی: ۱۳۲

(٤) سعد ۳/۳۳ الریاض: ۱۱۵٦ (٥) سعد ۳/۳۳۱ الریاض: ۱۱۵٦

ایک مرتبہ کعب احبار نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ تورات میں آپ کی یہ یہ صفات بیان ہوئی ہیں اور آپ کو وہاں شہید دکھایا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "جزیرۂ عرب میں رہتے ہوئے میری شہادت کے امکانات کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔" کعب بولے بہر حال تورات میں آپ شہید امام عادل اور حق کے معاملے میں ملامت سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "اگرچہ یہ بات درست ہے کہ حق کے معاملے میں میں ملامت کی پروا نہیں کرتا لیکن مجھے شہادت کیسے ملے گی[۱]۔"

ان تمام اشارات کے باوجود آپ کیلئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ قدرت کا فیصلہ کیا ہے؟ اور اس کی تکمیل کی صورت کیا ہوگی؟ آپ اس کے امکان کو محدود سمجھنے میں بالکل حق بجانب تھے کیونکہ ظاہری حالات آپ کی تائید کرتے تھے۔ اس کی آپ کو خوشی نہیں بلکہ افسوس تھا کیونکہ شہادت کی موت آپ کی دلی آرزو تھی اس کی عظمت سے آپ اچھی طرح آگاہ تھے۔ آپ کے خادم حضرت زیدؓ بن اسلم سے مروی ہے کہ آپ کہا کرتے تھے "**اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلک واجعل موتی فی بلد رسولک**[۲]۔" یہی کلمات آپ کی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ نے بھی سنے تو عرض کی "یہ کیسے ممکن ہوگا؟" آپ نے فرمایا "اللہ اپنا حکم جہاں چاہے پورا کر سکتا ہے[۳]۔"

آپ نے ۶ سن نبوی میں قبول اسلام سے لے کر ۲۳ سن ہجری یعنی خلافت کے آخر تک چالیس سال نہایت بھرپور اور متحرک کردار ادا کیا۔ خاص طور پر تقریباً ساڑھے دس سالہ دور خلافت جس میں بائیس لاکھ مربع میل رقبے تک پھیلی ہوئی وسیع سلطنت جس کے بیشتر حصے کی فتوحات کی منصوبہ بندی سے لے کر امن وامان، تعلیم وتربیت، کفالت وعدل اور انتظام والصرام کے تمام معاملات کو بے مثال جذبے اور احساس ذمہ داری سے سرانجام دیتے رہنے کا، خاص طور پر ۱۸ھ کی قحط سالی جس کی فکر نے آپ کے جسم کو کمزور، رنگ کو تبدیل اور توانائیوں کو مضمحل کر دیا۔ اسامہ بن زیدؓ اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ "ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ نے قحط رفع نہ کیا تو عمرؓ مسلمانوں کی فکر میں مر جائیں گے[۴]۔" آپ کے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ نے قحط کے زمانے میں ایک نیا کام کیا، جسے وہ پہلے نہیں کرتے تھے، وہ یہ کہ لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھا کر گھر میں داخل ہوتے اور برابر نماز پڑھتے رہتے، پھر نکلتے اور پہاڑی راستوں پر گھومتے، ایک رات کو پچھلے پہر میں انہیں یہ کہتے ہوئے سن رہا تھا "اے اللہ! امت محمد ﷺ کی ہلاکت میرے ہاتھوں نہ کر[۵]۔"

اسلام اور عوام کی خاطر بنے آپ کو اس طرح گھلا دینے والے کے شایان شان یہی تھا جب اپنے اندر کمزوری وناتوانی محسوس کرے جلد از جلد اپنے رب سے ملنے کا خواہاں ہو۔ چنانچہ ہر سال کی طرح ۲۳ ہجری میں آپ امہات المومنین کو ساتھ لے کر حج پر تشریف لے گئے اور ارکان حج سے فارغ ہونے کے بعد منیٰ سے چلنے لگے، ابطح میں اپنا اونٹ بٹھا لیا، سنگریزے جمع کر کے ایک چبوترہ سا بنایا اور اس پر اپنی چادر کا کنارہ ڈال دیا، پھر چت لیٹ گئے اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہنے لگے "اے اللہ میری عمر زیادہ ہو گئی ہے، ہڈیاں نرم پڑ گئی ہیں، قوتیں جواب دے رہی ہیں اور رعایا پھیل گئی ہے، اس کے انتشار کا اندیشہ ہے اب مجھے اپنے پاس بلا لے۔ اس حال میں کہ میرا دامن عجز وملامت سے پاک ہو[۶]۔" اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کی پرخلوص دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا اور اسی حج کے دوران اور فوراً بعد ایسے اشارے دے دیئے کہ خود آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر واضح ہو گیا کہ آپ کا وقت رخصت انتہائی قریب ہے۔ اس سلسلے میں تواریخ میں ہمیں متعدد روایات ملتی ہیں، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

---

(۱) جوزی ۲۰۷ (۲) بخاری ۲/۲۲۵، مالک ۱/۲۶۲، سعد ۳/۱۲۱، سیوطی ۱۴۴ (۳) سعد ۳/۳۳۱، کثیر ۱/۱۳۷ (٤) سعد ۳/۵ (۵) سعد ۳/۲۲۲

(٦) حاکم ۳/۹۲، سعد ۳/۳۳٤، اثیر ۲/۷۳۔

○ ابو موسیٰ اشعریؓ کا خواب:

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے بہت سے راستے اختیار کئے' سب مٹ گئے۔ یک راستہ رہ گیا جس پر میں چل کے ایک پہاڑ تک پہنچا۔ اتفاق سے رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف فرما تھے۔ آپ کے پہلو میں ابو بکرؓ تھے اور عمرؓ کی طرف اشارہ فرما رہے تھے کہ "ؐ میں نے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون۔" واللہ امیر المومنین مر جائیں گے۔" راوی نے کہا کہ آپ یہ عمرؓ کو لکھ کیوں نہیں دیتے؟ جواب دیا کہ "میں ایسا نہیں ہوں کہ خود انہی کو ان کی وفات کی خبر دوں[1]۔"

○ عیینہؓ بن حصن کی درخواست:

انہوں نے آپ سے عرض کی "یا تو آپ اپنی حفاظت کیجئے یا اہل عجم کو مدینے سے باہر نکال دیجئے' کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ ان میں سے کوئی شخص آپ کے یہاں در نہ کر بیٹھے۔ یہ کہہ کر اپنا ہاتھ اس مقام پر رکھا جہاں ابو لولؤ نے وار کیا تھا[2]۔

○ جبیرؓ بن مطعم کی گواہی:

ان سے روایت ہے اپنے سامنے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے آخری حج کے موقع پر عرفہ کی پہاڑیوں پر کھڑے تھے کہ انہوں نے ایک شخص کو پکار پکار کر کہتے سنا "یا خلیفہ! یا خلیفہ!" کچھ لوگ سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ ان میں سے یک شخص نے یہ سن کر اس سے کہا "اللہ تجھے سر مدہ در گلو کرے! تجھے کیا ہوا؟" جبیرؓ نے بلند آواز میں اس دوسرے شخص سے کہا "اسے گالی نہ دو!" دوسرے دن حضرت عمرؓ عقبہ پر کھڑے رمی جمار فرما رہے تھے۔ جبیرؓ ان کے ساتھ تھے کہ ایک کنکری حضرت عمرؓ کے سر کو لگی اور ان کا سر پھوٹ گیا۔ جبیرؓ نے پہاڑ سے کسی کی آواز آتے سنی 'جو کہہ رہا تھا "رب کعبہ کی قسم! مجھے بتایا گیا ہے کہ اس سال کے بعد عمرؓ اس مقام پر کبھی کھڑے نہ ہوسکے۔" اور یہ وہی شخص تھا جو کل چیخ چیخ کر "یا خلیفہ! یا خلیفہ!" کہہ رہا تھا اور وہ مجھ پر سخت گزر[3]۔

○ حضرت حذیفہؓ کی فتنہ کے متعلق پیش گوئی:

حذیفہؓ سے مروی ہے کہ میں نے عمرؓ بن الخطاب کے ہمراہ وقوف عرفات کیا تھا۔ میرا اونٹ ان کے اونٹ کے پہلو میں تھا اور میرا گھٹنا ان کے گھٹنے سے لگ رہا تھا۔ ہم لوگ منتظر تھے کہ آفتاب غروب ہو تو چلیں۔ انہوں نے لوگوں کی تکبیر اور دعا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے اسے دیکھ تو پسند کیا اور فرمایا "اے حذیفہؓ تمہاری رائے میں یہ طریقہ لوگوں کیلئے کب تک باقی رہے گا۔" عرض کی کہ فتنے پر یک دروازہ لگا ہوا ہے' جب وہ توڑ ڈالا جائے گا یا کھول دیا جائے گا' تو وہ نکلے گا۔ "عمرؓ گھبرا گئے اور فرمایا کہ "وہ کونسا دروازہ ہے اور اس کا ٹوٹنا یا کھولنا کیا ہے؟" عرض کی کہ "ایک شخص مرے گا یا قتل کیا جائے گا۔" فرمایا "اے حذیفہؓ تمہارے رائے میں قوم میرے بعد کس کو امیر بنائے گی۔" عرض کی "میری رائے میں لوگ عثمانؓ بن عفان کا سہرا لیں گے[4]۔"

○ حضرت عائشہؓ کی روایت:

عائشہؓ سے مروی ہے کہ آخری حج میں جو عمرؓ نے امہات المومنین کو کرایا۔ ہم لوگ عرفے سے پلٹے۔ میں المحصب (منیٰ و مکے کے درمیانی مقام) سے گزری تو ایک شخص کو اپنے سواری پر کہتے سنا کہ امیر المومنین عمرؓ کہاں تھے۔ میں نے دوسرے آدمی کو جواب دیتے سنا کہ امیر المومنین یہاں تھے' پھر اس نے اپنا اونٹ بٹھایا

---

(۱) سعد ۳، ۳۳۲' سیوطی ا۔ ۱۳۳ (۲) صنعدوں ۲، ۵٤ (۳) اثر ا ۲ ۷۳ سعد ۳ ۳۳۳ سیوطی ا ٤٤ (٤) سعد ۳ ۳۳۲ مزید تفصیل ب الفتن ماجہ ۲ ٤٧٤

بخاری ۱ ۱ ۲

اور گانے کی آواز بلند کر کے کہا

علیك سلام من امام و بارکت

یدالله فی ذاك الادیم الممزق

(اے امام تم پر سلام ہو اور اللہ کا ہاتھ اس پھیلی ہوئی کشادہ زمین میں برکت کرے۔)

فمن یسع او یرکب جناحی نعامة

لیدرك ماقدمت بالامس یسبق

(پھر جو دوڑے گا یا شتر مرغ کے بازوؤں پر سوار ہو گا' تم نے جو کچھ کل بھیجا اسے آگے جاتا ہو پائے گا۔)

"قضیت اموراً ثم غادرت بعدها

بوائق فی اکمامها لم تفتق

(تم نے تمام امور پورے کر دیے' اس کے بعد تم نے اس حالت میں چھوڑ دیا کہ وہ کلیاں ہیں جو اس طرح اپنے غلاف میں ہیں کہ چٹکی نہیں ہیں)

اس سوار نے وہاں سے جنبش بھی نہ کی اور نہ معلوم ہوا کہ وہ کون ہے' ہم لوگ بیان کیا کرتے تھے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔ عمرؓ اس حج سے آئے اور انہیں خنجر مارا گیا اور وہ انتقال کر گئے۔ محمدؒ بن جبیر بن مطعم نے اپنے والد سے اسی حدیث کے مثل روایت کی ہے اور انہوں نے کہا کہ وہ شخص جس نے عرفات میں کہا کہ اے خلیفہ خدا تمہیں موت دے اس سال کے بعد عمرؓ اس موقف میں کبھی کھڑے نہ ہوں گے اور جس شخص نے جمرے پر کہا کہ مجھے خبر دی گئی ہے کہ واللہ میں سوائے اس کے نہیں دیکھتا کہ امیر المومنین عنقریب قتل کیے جائیں گے۔ وہ شخص قبیلہ لہب کا تھا جو ازد کے بطن سے ہے اور وہ گھوم رہا تھا[1]۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے شعار کہنے والے کے بارے میں پوری چھان بین کی۔ چنانچہ موسیٰ بن عقبہ سے مروی ہے کہ عائشہؓ نے پوچھا کہ "یہ اشعار کہنے والا کون ہے" جزی الله خیرا من امام بارکت الخ (علیك سلام من امام و بارکت)۔ "تو لوگوں نے کہا کہ مزرد بن ضرار۔ عائشہؓ نے کہا کہ "میں اس کے بعد مزرد سے ملی تو انہوں نے خدا کی قسم کھائی کہ وہ اس سال کے موسم میں حج میں موجود نہ تھے[2]۔ حج کر کے جب آپ واپس مدینے پہنچے تو چند اور واقعات ایسے پیش آئے جنہوں نے آپ کی شہادت کے امکان کو یقین میں بدل دیا۔

○...... ابولؤلؤ کی دھمکی:

حضرت عمرؓ ایک دن بازار کا گشت لگانے نکلے۔ راستے میں ابو لؤلؤ ملا اور ان سے کہنے لگا "امیر المومنینؓ! مجھے مغیرہؓ بن شعبہ سے بچائیے! مجھ پر بہت زیادہ خراج ہے۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا "تم کتنا خراج ادا کرتے ہو؟" بولا "دو درہم روزانہ!" حضرت عمرؓ نے کہا "اور کیا کام کرتے ہو؟" کہنے لگا "بڑھئی' نقاشی اور آہن گری۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تمہارے پیشوں کو دیکھتے ہوئے خراج زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے سنا ہے تم کہتے ہو کہ "اگر میں چاہوں تو ہوا سے چلنے والی چکی بنا سکتا ہوں۔" کہنے لگا "ہاں!" فرمایا "تو پھر مجھے ایک چکی بنا دو!" بولا "اگر میں زندہ رہا تو آپ کے لیے ایسی چکی بناؤں گا جس کا چرچا مشرق سے مغرب تک ہو گا" اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اس غلام نے ابھی ابھی مجھے دھمکی دی ہے[3]۔" ابن اثیر کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ ساتھ تھے بہوں

---

(۱) سعد ۳: ۳۳۴ سیوطی ۱۴۴ البر ۱۱۵۸ (۲) سعد ۳: ۳۳۴ (۳) سعد ۳: ۳۴۵ اثیر ۲: ۷۰ البر ۱۱۵۴ سیوطی ۱۳۳ طبری ۴: ۹ سیرہ ۴: ۵۷۵

نے کہا کہ امیر المومنین وہ آپ کو قتل کی دھمکی دیتا ہے(۱)۔ روایت میں آتا ہے کہ آپ نے یہ بھی کہا کہ اللہ سے ڈر اور اپنے آقا سے نیک سلوک کر۔ آپ کا اصل ارادہ یہ تھا کہ مغیرہ سے مل کر اس کے بارے میں سفارش کریں گے لیکن بدبخت کو غصہ آگیا اور کہنے لگا "عمرؓ کا عدل تمام لوگوں کیلئے عام ہے سوائے میرے۔" اس کے دل میں قتل کا ارادہ پیدا ہو گیا اس نے دو نوکوں والا خنجر بنایا اس کو خوب تیز کیا اور زہر میں بجھانے کے بعد ہرمزان کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ "دیکھو یہ خنجر کیسا ہے؟" اس نے کہا "میرے نزدیک یہ ایسا ہے کہ جس کو مارو گے مر جائے گا(۲)۔

○ . کعب الاحبار کی پیشین گوئی:

ابولؤلؤ کی دھمکی کے بعد حضرت عمرؓ اپنے گھر میں تشریف لے گئے۔ دوسرے دن کعب احبار کے پاس آئے اور کہا "امیر المومنینؓ! تیار ہو جایئے' آپ تین دن میں وفات پا جائیں گے۔" کعب عہد رسالتؐ میں یہودیوں کے ایک بہت بڑے عالم تھے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے تھے۔ وہ اپنا میلان اسلام کی طرف ظاہر کرتے تھے' لیکن اعلان اس وقت کرنا چاہتے تھے جب ان پر وہ تمام علامتیں آئینہ ہو جائیں' جو نبی عربی علیہ التحیۃ والتسلیم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کے متعلق انہوں نے کتب یہود میں پائی تھیں۔ چنانچہ جب حضرت عثمانؓ کے حق میں خلافت کا فیصلہ ہو گیا تو کعب نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے کعب کے اس ڈراوے پر متعجب ہو کر ان سے پوچھا "تمہارا مطلب کیا ہے؟" بولے "میں نے یہ توریت میں پڑھا ہے۔" حضرت عمرؓ یہ بات سن کر حیرت میں رہ گئے اور فرمایا "اللہ! عمرؓ بن خطاب کا نام تم نے توریت میں پڑھا ہے۔" کعب نے کہا "نام نہیں' آپ کا حلیہ اور صفات اور یہ کہ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔" حضرت عمرؓ کو چونکہ کوئی تکلیف یا بیماری نہیں تھی' اس لئے کعب کی اس گفتگو سے انہیں اور بھی حیرت ہوئی تاہم انہوں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ دوسرے دن کعب پھر آئے اور کہا "امیر المومنینؓ! ایک دن گزر چکا ہے اور دو دن باقی رہ گئے ہیں۔" پھر اس کے ایک دن بعد انہوں نے کہا "دو دن گزر گئے ہیں اور اب صرف ایک دن اور ایک رات باقی ہے۔ آپ کی زندگی بس کل صبح تک ہے" اور دوسرے دن صبح ابو لؤلؤ نے حضرت عمرؓ کو کاری زخم لگائے۔ اس کے بعد جب لوگ اور ان کے ساتھ کعب حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور حضرت عمرؓ نے کعب کو دیکھا تو فرمایا

توعدنی کعب ثلاثاً اعدھا
ولا شک ان القول ماقال لی کعب

(کعب نے مجھے ڈرایا ہے کہ میری زندگی کے صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں اور جو کچھ کعب نے مجھ سے کہا ہے اس میں کچھ شبہ نہیں)

وما بی حذار الموت انی لمیت
ولکن حذار الذنب یتبعہ الذنب (۳)

(مجھے موت کا کیا ڈر کہ میں تو مر ہی رہا ہوں البتہ یہ خوف ہے کہ ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ ہوتا ہے۔)

○...... حضرت عمرؓ کا خواب:

حضرت عمر فاروقؓ نے زندگی کے آخری جمعہ کو حج سے واپس آنے کے بعد جو ہیکل کی تحقیق کے مطابق ۲۲ ذی الحج بنتا ہے اس دن جو خطبہ دیا اس میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا' میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغ نے مجھے تین ٹھونگیں ماری ہیں۔ میں سمجھتا ہوں

(۱) الریاض ۷۸/۲ (۲) حاکم ۹۱/۳' طبری ۲۶۳۱' سیوطی ۱۳۴ (۳) الریاض ۷۷/۲

کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ میری موت اب نزدیک ہے[1]۔ بعض روایات کے مطابق آپ نے فرمایا "مجھے سرخ مرغ نے دو چونچیں ماریں۔ اللہ میرے پاس شہادت کو ہنکالائے گا اور مجھے بھی قتل کرے گا[2]۔"

○ واقعہ شہادت کی تفصیل:

۲۶ ذی الحج ۲۳ھ کو بدھ کے دن حضرت عمرؓ سورج طلوع ہونے سے پہلے لوگوں کو نماز پڑھانے کیلئے کاشانۂ خلافت سے نکلے۔ انہوں نے مسجد میں کچھ لوگ مقرر کر رکھے تھے' جو ہر نماز سے پہلے صفیں درست کیا کرتے تھے۔ جب صفیں درست ہو گئیں' تو حضرت عمرؓ آئے اور دیکھا کہ پہلی صف کچھ آگے پیچھے ہے۔ اسے درے سے ٹھیک کیا لوگ اپنی اپنی جگہ قرینے سے بیٹھ گئے' تو اذان دی گئی اور حضرت عمرؓ امامت کیلئے آگے بڑھے۔ اس وقت صبح کی سفیدی پوری طرح نمایاں نہ ہوئی تھی۔ ابھی حضرت عمرؓ نے نماز کی تکبیر شروع ہی کی تھی کہ ایک شخص اچانک ان کے سامنے آیا اور اپنے خنجر سے ان پر تین یا چھ وار کئے جن میں سے ایک زیر ناف پڑا۔ حضرت عمرؓ نے دھار دار آہنے کی گرمی محسوس کی۔ نمازیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ہاتھ پھیلا کر کہا "پکڑو اس کتے کو' اس نے مجھے قتل کیا ہے۔" یہ کتا جناب مغیرہؓ بن شعبہ کا نصرانی غلام ابو لؤلؤ فیروز تھا۔ یہ ایران کا باشندہ تھا' جو نہاوند کی جنگ میں پکڑا گیا اور اس کے بعد جناب مغیرہؓ بن شعبہ کی غلامی میں آگیا۔ وہ حضرت عمرؓ کو شہید کرنے کی نیت سے منہ اندھیرے مسجد میں آگیا تھا۔ اس نے اپنی چادر میں ایک خنجر چھپا رکھا تھا' جس کا دستہ بیچ میں تھا اور دونوں طرف بڑی تیز دھار دل کے پھل تھے۔ وہ مسجد کے ایک گوشے میں چھپ گیا اور جب نماز شروع ہوئی تو وار کر دیا اور اس کے بعد اپنی جان بچانے کیلئے بھاگا۔ نمازیوں میں ایک بے چینی سی پھیل گئی' بہت سے لوگ اس کتے کو پکڑنے اور سزا دینے کیلئے اس کی طرف دوڑے' لیکن فیروز نے ان کا ہاتھ اپنی کمر تک نہ پہنچنے دیا اور دائیں بائیں خنجر کے وار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ بارہ آدمی زخمی ہو گئے' جن میں سے ایک قول کے مطابق چھ اور دوسرے قول کے مطابق ۹ جانبر نہ ہو سکے۔ آخر ایک شخص اس کے پیچھے سے آیا اور اپنی چادر اس پر ڈال کر اسے زمین پر گرا دیا۔ فیروز کو یقین ہو گیا کہ وہ سی جگہ قتل کر دیا جائے گا' چنانچہ جس خنجر سے اس نے امیر المومنینؓ کو مجروح کیا تھا اسی خنجر سے اپنا کام بھی تمام کر لیا۔

جو وار حضرت عمرؓ کے زیر ناف پڑا تھا اس سے صفاق اور آنتیں کٹ گئی تھیں اس لئے وہ مہلک ثابت ہوا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ زخم لگنے کے بعد کھڑے نہ رہ سکے' بلکہ فرش پر گر پڑے اور اپنی جگہ نماز پڑھانے کیلئے حضرت عبدالرحمن بن عوف کو کھڑا کر دیا۔ حضرت ابن عوفؓ نے قرآن کی دو مختصر ترین سورتوں "سورۃ العصر اور سورۃ الکوثر" میں لوگوں کو نماز پڑھائی۔ لیکن یک روایت یہ ہے کہ لوگ حضرت عمرؓ اور ان کے گرد دوسرے مسلمانوں کو زخمی پڑے دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھے اور جب لوگ حضرت عمرؓ کو اٹھا کر کاشانۂ خلافت میں لے جانے لگے' تو اس منظر سے ان کے غم و اضطراب میں اور اضافہ ہو گیا۔ مجمع اسی بدحواسی و بے چینی میں تھا کہ کسی نے کہا "اللہ کے بندو! نماز تو پڑھ لو' سورج نکل آیا ہے۔" چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ امام بنائے گئے اور انہوں نے دو مختصر ترین سورتوں میں نماز پڑھائی۔ بقول ہیکل یہ دوسری روایت بلاشبہ صحیح ہے۔ لوگ اس پریشانی و بدحواسی کے عالم میں نماز کیلئے از سر نو صفیں کیسے درست کر سکتے تھے' جبکہ امیر المومنینؓ ان کی نگاہوں کے سامنے زمین پر پڑے تھے اور ان کے زخموں سے جیتا جیتا خون بہ رہا تھا۔ ان کے گرد دوسرے مجروحین خون میں لتھڑے ہوئے تھے اور انہیں میں قاتل کی لاش بھی تھی۔ اگر ہم یہ تصور کر بھی لیں کہ زخم کھانے کے باوجود وہ اپنی جگہ امامت کیلئے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کو کھڑا کرنے کے متعلق سوچ سکتے تھے' حالانکہ اس قسم کا تصور عقل سے سراسر بعید ہے تو بھی یہ خیال کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے کہ لوگ خوف و پریشانی کے ان لمحات میں صفیں درست

(۱) سعد ۳/۳۳۵' حنبل ۱/۱۹۲' مسلم: ۲/۸۱' حاکم ۹۰ (۲) سعد ۳/۳۳۵

کر سکتے تھے۔ اس لئے ہمیں لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ ہوش یا بے ہوشی کی حالت میں مسجد کے قریب کاشانہ خلافت میں لے جائے گئے۔ زخمیوں کو مسجد کے کسی گوشے میں پہنچادیا گیا فیروز کی لاش طیبجا میں لے جا کر ڈال دی گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں "میں عمرؓ کے پاس تھا ان پر مسلسل غشی طاری تھی یہاں تک کہ صبح نمودار ہو گئی۔ جب دن نکلا تو عمرؓ کو ہوش آیا انہوں نے ہماری صورتیں دیکھیں اور پوچھا "لوگوں نے نماز پڑھ لی؟" میں نے کہا "ہاں!" بولے "جس نے نماز چھوڑی وہ مسلمان نہیں ہے!" اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق باہر آئے اور پکار کر لوگوں سے کہا "لوگو! امیر المومنینؓ دریافت فرماتے ہیں "کیا یہ واقعہ تم لوگوں کے مشورے سے ہوا؟" لوگ یہ دیکھ کر سہم گئے کہ یہ بات ان کی طرف رخ کر کے کہی جا رہی ہے اور یک زبان ہو کر چلائے "معاذ اللہ! ہمیں اس کا کوئی علم نہیں ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں" اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ اگر انہیں یہ بات معلوم ہوتی تو وہ اپنی جانیں اور اپنی اولاد فاروق اعظمؓ پر سے فدا کر دیتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ان سے پوچھا "امیر المومنینؓ پر حملہ کس نے کیا ہے؟" لوگوں نے کہا "اللہ کے دشمن ابولؤلؤ نے جو مغیرہؓ بن شعبہ کا غلام ہے۔"

حضرت عمرؓ اپنے بستر پر لیٹے حضرت ابن عباسؓ کے منتظر تھے کہ وہ ان کے سوال کا کیا جواب لے کر آتے ہیں۔ نہیں اس طبیب کا بھی انتظار تھا جو انہوں نے اپنے رشتہ داروں کے ذریعے بلوایا تھا۔ جب حضرت ابن عباسؓ واپس آئے اور لوگوں کی کہی انہیں سنائی اور بتایا کہ ان پر حملہ ابولؤلؤ نے کیا ہے اور دوسرے چند آدمیوں کو زخمی کر کے خودکشی کر لی ہے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرا قاتل کسی ایسے شخص کو نہیں بنایا جو اس کے حضور اپنے کبھی کے کئے ہوئے ایک سجدے کو میرے لئے حجت بناتا الحمد للہ کہ مجھے کسی عرب نے قتل نہیں کیا۔"

ایک عرب طبیب آیا اور اس نے نبیذ پلائی۔ وہ نبیذ جب ناف کے نیچے والے زخم سے نکلی ہے تو بالکل خون معلوم ہوتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک انصاری طبیب کو بلوایا پھر بنو معاویہ کا ایک اور طبیب آیا۔ اس نے حضرت عمرؓ کو دودھ پلایا لیکن وہ جوں کا توں زخم سے نکل گیا اور اس کے رنگ میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ طبیب نے کہا "امیر المومنینؓ! اللہ کو یاد کیجئے۔" مطلب یہ تھا کہ موت قریب ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "بنو معاویہ کے بھائی! تم نے سچ کہا اگر اس کے سوا تم کوئی بات کہتے تو جھوٹ بولتے۔" طبیب کی یہ بات سن کر حاضرین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور وہ رونے لگے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "ہم پر آنسو نہ بہاؤ جسے رونا ہو یہاں سے چلا جائے۔ کیا تم نے رسول اللہ ﷺ سے نہیں سنا کہ "رشتہ داروں کے رونے سے میت پر عذاب ہوتا ہے۔"

○...... قتل ایک سازش

ہم دیکھتے ہیں کہ فاروق اعظمؓ کو عین ان دنوں میں شہید کیا گیا جب اسلامی فوجیں مشرق میں شاہ مکران راسل کو شکست دے کر علاقے پر قبضہ کر چکی تھیں اور دریافت کرنے پر صحار عبدی یوں حالات بیان کر رہے تھے "امیر المومنین اس کے نرم میدانوں کی زمین بھی پہاڑ کی طرح ہے وہاں پانی کمیاب' پھل خراب' دشمن دلیر' بھلائی تھوڑی اور برائی زیادہ ہے۔ کثیر تعداد تھوڑی معلوم ہے اور قلیل تعداد ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کا پچھلا حصہ اس سے بھی بدتر ہے۔" آپ نے سن کر فرمایا تم قافیہ پیمائی کر رہے ہو یا خبر دے رہے ہو؟" اس نے کہا "صحیح خبر دے رہا ہوں۔" آپ نے فرمایا "بخدا میرا لشکر وہاں کبھی حملہ نہیں کرے گا۔" آپ نے وہاں کے سالار' حضرت حکمؓ بن عمرو اور سہیلؓ کو لکھا "تم دونوں کے لشکروں میں سے کوئی بھی مکران سے آگے نہیں بڑھے گا اور دریا سے درے کے علاقوں

تک محدود رہو[۱]۔" بس اسی فرمان نے ان کے قدم روک دیئے تھے۔

جب کسریٰ کی عظیم سلطنت کے آخری فرمانروا یزدگرد جان بچانے کیلئے دردر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا' اس کے آبائی علاقے اسے پناہ دینے سے معذور تھے۔ اس نے چین کے شہنشاہ سے مدد طلب کی' تو اس نے جواب میں لکھا "مجھے آپ کی طرف ایک عظیم الشان لشکر بھیجنے سے جس کا ایک حصہ مرو میں ہو (جہاں یزدگرد چھپا ہوا تھا) اور دوسرا حصہ چین تک ہو' صرف اس بات نے روک رکھا تھا کہ میں اس قوم کے حالات سے ناواقف تھا' مگر جیسا کہ آپ کے سفیر نے بتلایا ہے یہ قوم ایسی ہے کہ اگر پہاڑوں کا مقابلہ کرے' تو انہیں بھی پاش پاش کر دے اور اگر ان کے لشکر کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو مجھے بھی ہٹا سکتے ہیں' بشرطیکہ ان میں یہ خصوصیات باقی رہ گئی ہوں۔ (میرا مشورہ ہے) کہ آپ ان سے مصالحت کرلیں اور مصالحت کرنے کو عزت سمجھیں' جب تک وہ برسرپیکار نہ ہوں آپ ان سے ہرگز جنگ نہ کریں[۲]۔

آخرکار یزدگرد کے قتل ہو جانے کی اطلاع جب حضرت عمرؓ تک پہنچی' تو آپ نے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا "آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے مجوسیت کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا ہے' ان کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔ اب وہ اپنے ملک کی ایک بالشت بھر زمین پر قابض نہیں ہو سکیں گے' جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ دیکھو اللہ نے تمہیں ان کی سرزمین' ان کے ملک' ان کے مال و دولت اور ان کے فرزندوں کا مالک بنا دیا ہے' تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ تم آگے کیا کارنامے انجام دو گے۔"

جب اسلامی لشکروں کے قدم بابل اور نینوی کی قدیم تہذیبوں کے آثار نے چوم ئے تھے' وہ آگے بڑھ کر آرمینیہ کی سرحدیں عبور کر چکے تھے اور ان کے ایک جرنیل عتبہ بن فرقد اسلمی فاروق اعظمؓ کو یہ اطلاع دے رہے تھے کہ "میں اپنی فتوح کے سلسلے میں آذربائیجان تک پہنچ چکا ہوں[۳]۔" ادھر عبدالرحمنؓ بن ربیعہ ترکی کے مفتوحہ علاقوں کا مال غنیمت لے کر حضرت عمرؓ کے قدموں میں ڈھیر کر چکے تھے[۴]۔ جبکہ پہلی مرتبہ برصغیر کی طرف بحری مہمیں بھیجی گئیں۔ ایک نے حکم بن العاص کی زیر قیادت (بمبئی کے قریب) تھانہ پر اور دوسری المغیرہ کی زیر قیادت دیبل (کراچی) پر کامیاب حملہ کر کے واپس آچکی تھیں اور مسلمانوں کی دھاک سمندر عبور کر چکی تھی اور شرک و بت پرستی کی سرزمین توحید کے نعروں سے آشنا ہو چکی تھی[۵]۔

جب انبیاء کی سرزمین فلسطین پر یہود و نصاریٰ کا تسلط ختم ہو چکا تھا۔ بیت المقدس میں مسلمان سجدہ ریز تھے' تاریخی اور مقدس مقامات کی حفاظت و نگرانی کے وہی ذمہ دار بن چکے تھے۔ رومیوں کی سالہا سال کی عظیم الشان سلطنت کی جزیرۂ عرب سے بساط لپیٹ دی گئی تھی۔ قیصر اور قیصریت ماضی کی تہوں میں دفن ہو چکے تھے اور ان کی جان' مال' عزت' مذہب اور دیگر بنیادی حقوق کے سلسلے میں امان نامے پر دستخط خود امیر المومنین کر چکے تھے[۶]۔ جب براعظم افریقہ میں مسلمانوں کے فاتحانہ قدم پہنچ چکے تھے' فراعنہ کی سرزمین مصر پر اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا اور سکندریہ اور فسطاط جیسے تاریخی و تہذیبی مراکز اب اسلامی تہذیب کا گہوارہ بن چکے تھے۔ وہاں کی فضاؤں میں گونجنے والی اذانیں اللہ کی حاکمیت و کبریائی کا اعلان کر رہی تھیں[۷] اور طرابلس پر حملے کی اجازت طلب کر رہی تھیں تو حضرت عمرؓ کو شہید کر دیا گیا۔ کیا یہ اتفاقی واقعہ تھا؟ کیا اپنے دور کی دو سپر طاقتوں کے سرنگوں ہونے کے بعد ان کے سابقہ اہلکاروں اور مراعات یافتہ طبقوں نے اسلام کی ماداوتی کو صدق دل سے تسلیم کر لیا ہو گا اور اپنی ذلت و محرومی کا بدلہ خلیفہ وقت سے چکانے کا نہیں سوچا ہو گا؟ کیا یہود و نصاریٰ کیلئے سرزمین حجاز سے نکل جانے کا غم اور فلسطین کی مقدس سرزمین کے چھن جانے کا المیہ جس کیلئے آج کی طرح تاریخ کے ہر دور میں وہ جانیں نچھاور کرتے رہے ہیں' اتنا ہلکا تھا کہ وہ مسلمانوں کی رواداری' عدل و انصاف' مذہبی آزادی' بنیادی حقوق کی پاسداری سے متاثر ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے وفادار ہو گئے ہوں گے ور اس عظیم انسان سے معاہدہ کرنے کے بعد جسے '

---

(۱) طبری ج:۴ ص:۲۲۹ (۲) طبری ج:۴ ص:۲۱۵ (۳) بلاذری ص:۴۹ طبری ج:۴ ص:۱۸۸٫۴ (۴) طبری ج:۴ ص:۱۹۴ کثیر ج:۷ ص:۲۲۲ (۵) بلاذری ص:۴۲۰ (۶) بلاذری ص:۱۴۵ کثیر ج:۷ ص:۵۵ (۷) بلاذری ص:۲۲۸۔

انہوں نے اپنی خواہش و مطالبہ پر جو دیا تھا گہری محبت کے جذبات رکھتے ہوں گے اور انہوں نے بغض و عناد اور رنج و ملامت کو دل و ذہن سے نکال دیا ہو گا؟ کیا ان عجمی قبائل نے جو ہمیشہ نسل اور قوم پرستی کی وجہ سے عرب سے برسرپیکار رہے اور ان کے ساحلی اور زرخیز علاقوں پر قبضہ کر کے خوشحالی کا لطف اٹھاتے رہے' اب ان کے زیر نگیں آنے کے بعد سہولت و فخر محسوس کرتے ہوں گے۔ کیا وہ قیدی اور غلام جن کے خاندان اسلام سے مقابے میں منتشر یا نیست و نابود ہو چکے تھے' ان کی تربیت اتنی ہو چکی تھی کہ وہ اسلامی احکام اور اسلامی قیادت کے آگے "تسلیم و رضا" کا رویہ اختیار کر لیں؟

حقیقت یہ ہے کہ عوام کی کثریت نے ابتدائی طور پر مجبوری اور ضرورت کے تحت ہی سہی اسلام کی سیادت و قیادت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ حضرت عمر فاروقؓ کی ان علاقوں کے سلسلے میں بصیرت و حکمت پر مبنی پالیسی تھی۔ آپ نے آزادی' نرمی' عدل' معاہدت کی مکمل پاسداری' فلاحی و رفاہی سرگرمیوں' خیر خواہی و بھلائی' کفالت عامہ اور حفاظت کے اقدامات کے ذریعے تمام علاقوں میں یہ ثابت کر دیا کہ ان کی حکومت اور ایڈمنسٹریشن سابقہ حکمرانوں سے کئی گنا بہتر ہے۔ اس طرح انہوں نے بہت ہی قلیل عرصے میں مسلمانوں کو دشمن کے بجائے نجات دہندہ سمجھنا شروع کر دیا۔ ان کے ذہنوں کے خوف اور دلوں کی نفرتیں یگانگت اور تعاون میں ڈھلنا شروع ہو گئیں۔ اس کی نمایاں مثال وہ مشہور واقعہ ہے جو فتوحات شام کے دوران پیش آیا۔ سالار لشکر حضرت ابو عبیدہؓ کو مختلف ذرائع سے مصدقہ اطلاعات ملیں کہ رومیوں نے مقابلے کیلئے اتنا زبردست لشکر جمع کر لیا ہے' جس کی نظیر ملنا مشکل ہے' تو انہوں نے ان تمام شہروں کے والیوں کو جو معاہدۂ صلح سے فتح ہوئے تھے' یہ حکم دیا کہ "وہاں کے باشندوں سے جزیہ و خراج کی جو رقمیں وصول کی گئی ہیں' وہ انہیں واپس کر دی جائیں اور یہ بات واضح کر دی جائے کہ ہم نے یہ رقوم اس لئے واپس کی ہیں کہ تم نے ہم سے یہ عہد لیا تھا کہ ہم تمہارا دفاع کریں گے' لیکن ہمارے خلاف جتنے زبردست لشکر جمع کرلئے گئے ہیں ان کی خبر ہمیں مل گئی ہے اور ہم اتنے طاقتور نہیں ہیں کہ ان کا مقابلہ کر کے تمہارا دفاع کر سکیں۔ اس لئے ہم نے تم سے وصول کردہ رقوم تمہیں واپس کر دی ہیں۔ اگر اللہ نے ہمیں فتح عطا کی تو ہم ان شرائط کی پوری پابندی کریں گے جو ہمارے تمہارے درمیان طے پا چکی ہیں۔" جب ان والیوں نے ان لوگوں سے یہ بات کہی اور ان سے وصول کیا ہوا مال ان کو واپس دے دیا' تو وہ لوگ کہنے لگے' خدا تمہیں فتح عطا کرے اور دوبارہ ہم پر واپس (حکمران بنا کر) لائے۔ آج اگر تمہاری جگہ رومی ہوتے تو ہمیں کچھ بھی واپس نہ کرتے' بلکہ ہر وہ چیز چھین لیتے جو ہمارے پاس باقی رہ گئی ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی نہ رہتا[1]۔

اس کے باوجود ملک کے طول و عرض میں ایسے محدود طبقات اور افراد موجود تھے' جو اسلام اور مسلمانوں کے شدید دشمن تھے' جو اپنے اقتدار و اختیار کے چھن جانے یا علاقوں اور قوموں کے مغلوب ہو جانے پر کڑھتے رہتے تھے اور یہ دیکھ کر ان کے جذبات نفرت میں اور زیادہ شدت پیدا ہو جاتی تھی جب وہ دیکھتے کہ عوام اسلامی تہذیب کے اندر جذب ہوتے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کا اقتدار روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے' ان فتوحات کے اصل ذمہ دار حضرت عمر فاروقؓ ہیں' جن کی بارعب شخصیت' عبقری قیادت اور بے مثال منصوبہ بندی نے دنیا کے نہایت اہم خطے کا سیاسی نقشہ تبدیل کر دیا ہے۔ اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جا سکتا ہے کہ اجنادین کی فتح کے بعد بیت المقدس کی فتح کیلئے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مخالف فوج کے امیر و سپہ سالار اور مشہور دانشمند ارطبون کے ساتھ حضرت عمرو بن العاصؓ کی خط و کتابت ہوئی۔ اس میں انہوں نے ایک دوسرے کو نفسیاتی طور پر پسپا کرنے کی کوشش کی۔ ارطبون نے خط میں لکھا "خدا کی قسم اجنادین کے بعد تو فلسطین میں سے کچھ بھی فتح نہیں کرے گا' واپس چلا جا' فریب نہ کھا اور نہ تجھے بھی پہلے لوگوں کی طرح شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے جواب میں لکھا "تو اپنی قوم میں میری مثل اور نظیر ہے۔ اگر کوئی عادت مجھے غلطی میں ڈالے تو تو میری نصیحت سے بےگانہ ہو گا'

---

(۱) یوسف۔ ۱۳۶

حالانکہ تجھے معلوم ہے کہ میں ان ممالک کا فاتح ہوں اور میرے اس خط کو اپنے وزراء کی موجودگی میں پڑھنا۔ جب خط اس کے پاس پہنچا' تو اس نے اپنے وزراء کو جمع کیا اور انہیں خط پڑھ کر سنایا تو انہوں نے ارطبون سے پوچھا کہ تجھے کیسے پتہ چلا ہے کہ وہ ان ممالک کا فاتح نہیں ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ ان ممالک کا فاتح وہ ہے' جس کے نام کے تین حرف ہیں (یعنی عمرؓ[1])

حضرت عمر فاروقؓ جیسا بصیرت و فراست رکھنے والا شخص جو پورے خطے کے حالات کی جزئیات اور گہرائیوں تک سے آگاہ تھا' وہ مملکت اسلامیہ کے خلاف سازش کرنے والے عناصر' ان کے مذموم عزائم اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے ممکنہ طریقوں سے بے پروا نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلام حال اور مستقبل کی ایک عظیم تہذیبی قوت ہے۔ اس کے استحکام کا دارومدار اس کے مرکز کے مضبوط' متحد اور مستحکم ہونے پر ہے۔ اس لئے انہوں نے متعدد ایسے اقدامات کئے' جو ہر قسم کے خطرات اور اندیشوں کے مقابلے میں حفاظتی حصار بن سکتے تھے۔ ان میں ایک یہ تھا کہ پورے عرب کو متحد و منظم کر کے اسلام کا پشت پناہ بنادیں۔ آپ نے رسول کریم ﷺ کی اس سنت کو کہ انہوں نے کسی عرب مرد کو غلام نہیں بنایا تھا' مزید آگے بڑھایا کہ آپ نے عرب جاہلیت کے عہد کے تمام قیدیوں اور کنیزوں کو اس شرط پر آزاد کر کے ان کے قبائل کو واپس کر دیا کہ وہ ان مسلمانوں کو فدیہ دے دیں' جن کے وہ قبضے میں آئے ہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "کسی عربی پر مالکانہ حقوق (غلام بنا کر) حاصل نہیں ہوں گے اور ساتھ ہی ہم کسی ایسے شخص سے اس کی ملکیت سے کوئی چیز نہیں چھینیں گے' جو اسلام قبول کر چکا ہو[2]۔ علاوہ ازیں بھی ان پر بے شمار رعایات و مہربانیاں کیں۔ دوسرا کام یہ کیا یہود و نصاریٰ کے تمام قبائل کو جو جزیرۂ عرب میں مقیم تھے' ان کو جلاوطن کر کے ملک کے دیگر علاقوں میں بسایا اور ان کو بہتر متبادل زمینیں دیں (تفصیل آپ کے سیاسی لائحہ عمل کے باب میں دی گئی ہے) آپ نے ان میں سے کسی کو کوئی کلیدی عہدہ دینے سے اجتناب کیا۔ آپ کا ایک عیسائی غلام استق تھا جو بڑا باصلاحیت تھا' اس کا کہنا ہے کہ عمر فاروقؓ مجھے کہا کرتے تھے کہ تم اگر مسلمان ہو جاؤ تو تمہیں اہم کام سونپ دیں۔ میں نے انکار کیا' تو انہوں نے آزاد کر دیا کہ جہاں چاہوں چلا جاؤں[3]۔ اسی طرح حضرت ابو موسیٰؓ نے انہیں لکھا کہ ان کا سیکرٹری عیسائی ہے' اس لئے مسجد میں داخل نہیں ہو سکے گا' تو آپ ناراض ہوئے اور کہا "ابو موسیٰؓ تم نے ایک نصرانی کو کیوں اپنا کاتب بنایا[4]۔ یہ سب احتیاط کے تقاضے تھے۔

تیسرا کام یہ کیا کہ غیر مسلموں اور خصوصاً مجوسیوں اور عجمی غلاموں کو دارالخلافہ مدینے میں زیادہ سے زیادہ تین دن قیام کی اجازت دیتے تھے۔ ان کے مستقل قیام کرنے اور کاروبار کرنے سے منع کر دیا۔ اس کی وجہ سکیورٹی تھی اور دوسری ثقافتی کہ "ان کی خرابیاں آجائیں گی[5]۔" ابن شہاب سے روایت ہے کہ قیدیوں میں جو بالغ ہو جاتے اسے مدینے آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے[6]۔ کوفے کے عامل حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے ایک خط لکھ کر اپنے پاس ایک کاریگر غلام کا ذکر کیا اور یہ کہہ کر مدینے میں داخلے کی اجازت چاہی کہ وہ لوگوں کے فائدے کے بہت سے کام جانتا ہے' لوہار ہے' بڑھئی ہے اور نقاش ہے[7]۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کے اصرار اور لوگوں کے وسیع تر فائدے کیلئے اپنے اصول میں نرمی کی آخر کار وہی شخص آپ کا قاتل بن گیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی طور پر اس پالیسی کو نرم رکھنے کے بارے میں آپ پر بہت زیادہ دباؤ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ امرائے لشکر کو لکھا کرتے تھے کہ ہمارے پاس کفار کو گھسیٹ کر نہ لاؤ' اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا جب انہیں ابو لؤلؤ نے خنجر مارا تو پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ مغیرہؓ بن شعبہ کا غلام۔ فرمایا "کیا میں نے

---

(۱) کثیر ۷/۱۵۵ (۲) سعد ۱۳۴ (۳) جوزی ۱۱۹ (٤) بیہقی ۱۲۷/۱۰ جوزی ۱۱۹ (٥) جوزی ۲۱۲ (٦) عبدالرزاق ۱۰/۲۵۱ مسعودی ۳۲۹/۲ سیوطی ۱۶۸ (۷) سعد ۳/۳٤٥

نے تم لوگوں سے کہا نہیں تھا کہ ہمارے پاس کسی کافر کو گھسیٹ کر نہ لانا؛ مگر تم لوگ مجھ پر غالب آ گئے[1]۔ جو لوگ حضرت عمرؓ کی اس پالیسی کو غیر ضروری احتیاط اور سختی سمجھتے تھے ان میں آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ اور ان کے فرزند حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی تھے۔ جن کی رائے کے احترام میں حضرت عمرؓ کو پالیسی میں لچک پیدا کرنی پڑی تھی۔ جب حضرت ابن عباسؓ نے آپ کو اطلاع دی کہ آپ کا قاتل ابولؤلؤ ہے تو آپ نے فرمایا "تم اور تمہارے والد اس کے بہت خواہشمند تھے کہ عجمی غلام مدینے میں زیادہ سے زیادہ لائے جائیں۔ یوں بھی ان کے پاس بہت غلام تھے۔" (اس پر ابن عباس کو شرمندگی ہوئی) انہوں نے عرض کی کہ آپ فرمائیں تو ہم بھی کر گزریں؟ مقصد یہ تھا کہ ہم (مدینے میں مقیم تمام عجمی غلاموں کو) قتل کر دیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "یہ انتہائی غلط فکر ہے، خصوصاً جب تمہاری زبان میں گفتگو کرتے ہیں، تمہارے قبلے کی طرف نماز پڑھتے ہیں اور تمہاری طرح حج کرتے ہیں[2] یعنی مسلمان ہو گئے ہیں۔"

یہ تھے حضرت عمر فاروق کے خصوصی اقدامات جو آپ نے دارالخلافہ کیلئے کیے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی ذات کی حفاظت کا کیوں اہتمام نہیں کیا جب کہ آپ کی حیثیت ایک فرد کی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے امیر منتظم اور نگہبان کی تھی اور آپ یک وسیع و عریض سلطنت کے حکمران تھے۔ اردگرد کی صورتحال یہ تھی کہ بادشاہوں کیلئے تمام مملکتوں میں پروقار محلوں، ذی حشم درباروں میں محفوظ و مامون ہونے کے باوجود سکیورٹی اور پروٹوکول کے وسیع انتظامات کا رواج تھا۔ حضرت عمرؓ عہد جاہلیت ہی سے ان سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان سے نکل لیتے وقت آپ کو کیوں یہ احساس نہیں ہوا کہ آپ کی جان کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ آپ حکمرانی کے ان تمام فلسفوں اور طریقوں کے خلاف تھے۔ آپ خود کو عوام کا خادم نگہبان اور محافظ سمجھتے تھے۔ راتوں کو جاگ کر اور گشت کر کے اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرتے تھے۔ آپ نے پوری زندگی جرأت واستقامت کا مظاہرہ کیا۔

مذکورہ بالا ساری تفصیل بیان کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے اس گمان کو تقویت ملے کہ فاروق اعظم کی شہادت کے پیچھے ایک گہری سازش کارفرما تھی۔ اس میں یہود نصاریٰ مجوسیوں اور بت پرستوں کی مشترکہ کاوش وخواہش تھی، جسے مقامی سطح پر عملی جامہ پہنایا گیا۔ اس میں مذہبی اور سیاسی عوامل کے ساتھ ساتھ جذبہ انتقام بھی کارفرما تھا، جو خاص طور پر فاروق اعظم کی ذات کے خلاف تھا۔ اس کی پشت پر عوام الناس نہیں بلکہ وہ مخصوص طبقات اور گروہ تھے، جنہیں قیصر وکسریٰ کے عہد میں سربلندی اور تسلط حاصل تھا۔ سازش ہمیشہ خفیہ ہوتی ہے۔ اکثر اوقات ٹھوس شہادت سے اسے ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے، حالات و واقعات کی کڑیاں ملا کر اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حالات کا تناظر پیش کیا جا چکا ہے، واقعات کی گواہی حسب ذیل ہے

○ ابولؤلؤ فیروز کا کردار:

فاروق اعظم کا براہ راست قاتل ابولؤلؤ ہے، جس کا اصل نام فیروز تھا۔ دو سال قبل ۲۱ھ میں وہ نہاوند کے معرکے میں قید ہوا اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کے حصے میں آیا[3]۔ انہوں نے صرف چار درہم روزانہ یہ بعض روایات کے مطابق سو درہم ماہانہ ٹیکس عائد کر دیا۔ بجائے اس کے کہ اس کی ساری کمائی خود رکھ لیتے کیونکہ یہ ان کی ملکیت میں تھا اور حضرت عمرؓ سے خصوصی اجازت لے کر اسے مدینے بھجوا دیا، وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل ہو گیا۔ وہاں ایرانی علاقوں سے گرفتار ہو کر آئے ہوئے کئی قیدی بچے بھی موجود تھے۔ اس کو اپنی قوم کے مغلوب ہو جانے، علاقے چھن جانے اور خود گرفتار ہونے کا اتنا شدید دکھ تھا کہ بی اعوزؓ سے مروی ہے کہ "وہ بہت خبیث تھا، جب چھوٹے قیدیوں کو دیکھتا تو ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتا اور رو کر کہتا کہ عرب نے میرا جگر کھا لیا ہے[4]۔" اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا

---

(۱) سعد ۳: ۳۴۸، عبدالرزاق ۱: ۳۵۷، مسعودی ۲: ۳۲۹، شیبہ ۱۴: ۵۸۱ (۲) بخاری ۴: ۷۲، اثیر ۲: ۷۵، حموی ۲: ۱۳۲ (۳) سعد ۳: ۳۴۶، شیبہ ۴: ۵۰۵، حبان ۹: ۳۶ (۴) سعد ۳: ۳۴۶

ہے کہ اس کے اندر قوم پرستی اور علاقائی تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مدینے کے اندر رہتے ہوئے بھی وہ کھلے اظہار سے اجتناب نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا بے اختیار رو دینا اس کے دل میں موجزن جذبات و احساسات کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہی ہے وہ اصل محرک جس نے اسے فاروق اعظمؓ کے قتل کرنے پر آمادہ کیا کیونکہ وہ ان کو ہی تمام مسائل کا انہی کو ذمہ دار سمجھتا تھا[1]۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ کبھی کبھی یہ بھی کہتا تھا "عمر نے میرا کلیجہ چبا لیا ہے۔" جہاں تک حضرت مغیرہؓ کی طرف سے زیادہ ٹیکس لگانے کا تعلق ہے تو اس کے ذمہ دار حضرت عمرؓ نہیں تھے۔ مدعا علیہ کا موقف سنے بغیر یکطرفہ طور پر فیصلہ نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے اس کہنے کا کوئی جواز نہیں تھا کہ "عمرؓ کا عدل ہر کسی کیلئے ہے سوائے میرے۔" اس لئے کہ انہوں نے حتمی فیصلہ نہیں دیا تھا۔ جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ حضرت مغیرہؓ سے اس معاملے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ مالک کی خیر خواہی و وفاداری کی نصیحت کرتا اور اسے عارضی طور پر مطمئن کرنے کیلئے یہ کہنا کہ جتنے کام کرتے ہو ان کے مقابلے میں رقم زیادہ نہیں ہے یہ بطور مربی آپ کی ذمہ داری تھی۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ اسی کاریگر نے آپ کو زخمی کیا ہے تو آپ نے فرمایا "خدا اسے برباد کرے اسے کوئی شکایت نہیں تھی سوائے اس کے کہ میں نے اسے اچھی بات کہی تھی[2]۔" اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکایت محض قتل کا بہانا تراشنے کیلئے تھی۔ قتل کرنے کی سازش پہلے ہی تیار کی جا چکی تھی اس کا جواز اور موقع تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس کا اظہار شکایت کے فوراً بعد اس وقت ہو گیا جب اس نے ترش روئی سے یہ کہہ کر کہ "آپ کیلئے ضرور ایسی چکی بناؤں گا جس کو لوگ بیان کریں گے۔" اس وقت لوگوں کی ایک جماعت آپ کے ساتھ موجود تھی' آپ نے اس کے پیٹھ پھیرتے ہی لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا تھا کہ غلام نے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے[3]۔

ابو لؤلؤ مذہبی لحاظ سے کیا تھا' اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک وہ نصرانی تھا اور بعض کے نزدیک مجوسی۔ حاکم اور ابن شیبہ نے نصرانی قرار دیا ہے۔ ہمارے خیال میں وہ قوم پرست ایرانی تھا' جس نے مجوسیت سے نصرانیت قبول کر لی تھی اس کے اندر دونوں صفات جمع تھیں۔ اس نے قتل کا فیصلہ خود نہیں کیا تھا نہ اس وجہ کی بنا پر کیا تھا جو مذکور ہے بلکہ اس کے انتہا پسندانہ خیالات و جذبات کو ہرمزان' جفینہ اور عباس محمود العقاد کے خیال میں کعب احبار نے استعمال کیا اور اسے ایک منصوبہ بندی سے فدائی حملے پر تیار کیا' جس میں خود اس کے اپنے بچ جانے کا امکان کم تھا۔ آخر کار اسے تیرہ آدمیوں کو زخمی کرنے کے بعد جن میں سے تقریباً سات بعد میں شہید ہو گئے گھیرے میں آ جانے کی وجہ سے خودکشی کرنی پڑی' جدید مورخین بجا طور پر اسے سازش قرار دیتے ہیں۔ حسین ہیکل کے بقول حیرانی ان لوگوں پر ہونی چاہیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ فیروز نے حضرت عمرؓ کو اس لئے شہید کیا کہ امیر المومنینؓ نے خراج میں کمی نہ کر کے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا' حالانکہ خراج کی زیادتی کی دوبارہ شکایت لے کر آنا اس کیلئے کوئی دشوار بات نہیں تھی۔ اس طرح عباس محمود العقاد کے بقول حضرت عمرؓ (اللہ ان کو اپنی رحمت سے نوازے) اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی حکومت کے دشمنوں کی سازش کا شکار ہوئے۔ خراج کا قصہ تو محض ایک پردہ تھا' جو مدینہ اور دوسرے ملکوں کے سازشیوں نے اس قصاص سے بچنے کیلئے ڈالا تھا جس کی سزا انہیں اس سازش یا اس سازش کے اسباب و محرکات کے انکشاف پر بھگتنی پڑتی[4]۔

ڈاکٹر طہٰ حسین نے بھی اس قسم کے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ معاملہ محض حق امانت یا کسی رقم کی ادائیگی کا نہیں تھا اس سے بہت زیادہ تھا۔ معاملہ ان ایرانیوں کا تھا جن کا دیس ان سے چھن گیا تھا' جن کی قوم قتل ہو گئی تھی' جو اپنے انتقام کی آتش نہ بجھا سکے تھے۔ چنانچہ یہ شخص دلی جوش انتقام سے پر تھا اور اس کے دل میں اپنے تمام ہم وطن قیدیوں کیلئے جواب تمام عرب میں تھے' غیظ و غضب کی دہکتی سلگ رہی تھی۔ اس کے خیال میں گویا عرب اس کا (یعنی اس کی قوم کا) جگر کھا گیا تھا۔ اکیلا یہی شخص نہیں تھا جو مدینہ میں رہتا تھا' وہاں ایرانی اور بھی بس رہے تھے جن کے اعزہ جنگوں میں ہلاک کیے گئے تھے(۵)۔

---

(۱) طبری ۴: ۱۶۴ (۲) بخاری ۴: ۲۰۷ سعد ۳: ۳۳۸ (۳) سعد ۳: ۳۴۰ غفاری [illegible] ۱۹ [illegible] ۲: ۷۰ (۴) عقاد ۲۲۵ (۵) طٰہٰ ۲۴۸۔

○..... ہرمزان کا کردار:

یہ ایران کے معروف سپہ سالاروں میں سے تھا اور بڑے علاقے کا سردار اور بادشاہ تھا۔ ان میں مناذر، اہواز، مہر مزد وغیرہ شامل ہیں[1]۔ ۱۷ھ میں فارس کے معرکوں میں اس نے عراقی اور ایرانی رمیندروں اور کاشتکاروں کو مسلسل مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار رکھا۔ ایک مرتبہ شکست کھا کر حضرت عتبہؓ کے ساتھ صلح کی، پھر شرائط کی خلاف ورزی کر کے بغاوت کر دی اسی طرح کئی مرتبہ مغلوب ہو کر صلح کر لیتا۔ جب موقع ملتا عہد شکنی کر کے مقابلے پر آ جاتا، اسی کے ہاتھوں دو جلیل القدر صحابی حضرت مجزاۃ بن ثورؓ اور حضرت براءؓ بن مالک شہید ہوئے۔ آخر کار تستر کے قلعے میں محصور ہو گیا، مشرکوں نے مسلمانوں پر ۸۰ حملے کئے، بالآخر مسلمان قلعہ فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے، جب اندر گھسے ہرمزان کو اپنی موت یقینی نظر آئی اور اس نے دیکھا کہ مسلمان اس کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں تو بولا "تم مجھے تنگی کی حالت میں دیکھ رہے ہو مگر میرے ترکش میں ایک سو تیر ہیں۔ خدا کی قسم جب تک میرے پاس ایک تیر بھی باقی رہے گا تم مجھے پکڑ نہیں سکتے۔ میری اس گرفتاری سے کیا فائدہ جبکہ میں تمہارے سو آدمیوں کو نقصان پہنچاؤں۔ ان میں سے کوئی مقتول ہو گا کوئی زخمی ہو گا۔" مسلمانوں نے کہا "تم کیا چاہتے ہو؟" وہ بولا میں اس شرط پر اپنے آپ کو گرفتاری کیلئے پیش کر سکتا ہوں کہ میرے بارے میں خود حضرت عمرؓ جو چاہیں فیصلہ کریں۔" مسلمانوں نے کہا تمہاری خواہش پوری ہو گی اس پر اس نے اپنی کمان پھینک دی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اسے وفد کے ساتھ مدینے لے آئے، اسے اصلی لباس اور تاج پہنایا گیا۔ جب حضرت عمرؓ کے پاس لے گیا، تو آپ ٹوپی کو تکیہ بنائے مسجد میں اکیلے لیٹے ہوئے تھے وہ دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے پوچھا کہ "آپ کے محافظ اور دربان کہاں ہیں؟" تو لوگوں نے جواب دیا کہ "نہ تو ان کا کوئی محافظ ہے، نہ دربان، نہ سیکرٹری، نہ دفتر۔" وہ بولا "پھر تو پیغمبر ہیں۔" لوگوں نے کہا، "وہ پیغمبر تو نہیں، لیکن کام پیغمبروں والے کرتے ہیں۔" آپ کی آنکھ کھلی تو ہرمزان پر نگاہ ڈال کر پوچھا کیا یہ ہرمزان ہے۔ لوگوں نے کہا، ہاں تو آپ نے اسے اور اس کے لباس کو غور سے دیکھنے کے بعد فرمایا "میں دوزخ کی آگ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور اسی سے مدد کا طالب ہوں۔" پھر فرمایا "خدا کا شکر ہے جس نے اسلام کے ذریعے اس کو اس کے ساتھیوں کو ذلیل کیا۔ اے مسلمانو! تم اس دین کی پابندی کرو اور اپنے پیغمبر کے طریقے سے ہدایت حاصل کرو۔ تم دنیا حاصل کر کے مت اتراؤ کیونکہ یہ دھوکہ دینے والی ہے۔" لوگوں نے کہا "یہ اہواز کا بادشاہ ہے، آپ اس سے گفتگو کیجئے۔" آپ نے فرمایا "نہیں! جب تک اس کے بدن پر کوئی زیور باقی ہو گا" اس پر اس کے بدن سے ہر چیز اتار دی گئی صرف ستر کا لباس باقی رہ گیا تھا۔ اس کے بعد سے معمولی لباس پہنایا گیا، اس وقت حضرت عمرؓ نے پوچھا "اے ہرمزان! تمہیں غداری اور اللہ کے حکم کی نافرمانی کا انجام کیسا لگا؟" وہ بولا۔ "اے عمرؓ! دور جاہلیت میں اللہ نے ہمیں اور تمہیں تنہا چھوڑ رکھا تھا، تو ہم آپ لوگوں پر غالب تھے کیونکہ اس وقت اللہ نہ ہمارے ساتھ تھا نہ تمہارے ساتھ تھا، مگر جب وہ آپ کے ساتھ آ گیا تو آپ ہم پر غالب آ گئے[2]۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تم دور جاہلیت میں ہم پر اس لئے غالب آ گئے تھے کہ تم متحد تھے اور ہم پراگندہ۔" پھر آپ نے پوچھا "تم نے بار بار عہد شکنی کیوں کی؟" وہ بولا "مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے پہلے کہ میں آپ کو سچی بات کی اطلاع دوں آپ مجھے قتل کر دیں گے۔" آپ نے فرمایا "تم اس بات کا اندیشہ نہ کرو۔" پھر اس نے پانی مانگا تو اسے ایک معمولی سے پیالے میں پانی دے دیا گیا۔ اس نے کہا "میں اگر پیاس سے مر بھی جاؤں تو بھی اس پیالے میں پانی نہیں پیوں گا" اس پر اس کی پسند کے مطابق برتن لایا گیا۔ اس کا ہاتھ کانپنے لگا کہنے لگا "مجھے اندیشہ ہے کہ مجھے پانی پیتے ہوئے قتل کر دیا جائے گا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "جب تک تم پانی نہیں پی لو گے اس وقت تک تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔" یہ سن کر اس نے برتن الٹ دیا۔ آپ نے فرمایا "اسے دوبارہ پانی لا کر دو تاکہ اسے قتل اور پیاس کی سزا نہ ملے۔" وہ بولا "مجھے پانی کی کوئی خواہش نہیں ہے، بلکہ میرا

---

(۱) طبری ۱۶۴/۴، الاثیر ۳۸۰/۲ (۲) ایضاً ۹۶۰

مقصد صرف یہ تھا کہ پناہ حاصل کروں۔ "حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں تمہیں قتل کروں گا۔" اس نے کہا "آپ نے مجھے پناہ دی ہے۔" آپ نے فرمایا "تم جھوٹ بول رہے ہو۔" اس پر حضرت انسؓ نے کہا "امیر المومنینؓ یہ سچ کہتا ہے آپ نے اسے پناہ دی ہے۔" آپ نے فرمایا "اے انسؓ کیا میں مجزاۃ بن ثورؓ اور براءؓ بن مالک کے قاتل کو پناہ دے سکتا ہوں؟ خدا کی قسم تم ثبوت لاؤ ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔" وہ بولے "آپ نے فرمایا تھا کہ تم پر کوئی حرج نہیں جب تک تم بات نہ کرو" اور یہ بھی فرمایا تھا "تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا جب تک تم پانی نہ پی لو۔" اس قول کی تائید اور لوگوں نے بھی کی جو ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ اس پر آپ نے ہرمزان سے مخاطب ہو کر فرمایا "تم نے مجھے فریب دیا ہے، خدا کی قسم میں صرف ایک مسلمان سے فریب میں آسکوں گا۔" اس پر وہ مسلمان ہو گیا[1]۔
آپ نے اس کا دو ہزار وظیفہ مقرر کیا اور مدینے میں آباد کیا۔ حضرت انسؓ نے قتل نہ کرنے کا مشورہ دیا تاکہ پیچھے لوگ پر امید رہیں[2]۔

اس ساری تفصیل کا تجزیہ کریں تو حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ وہ انتہائی مکار شخص تھا، دباؤ میں آکر صلح کر لیتا تھا لیکن اپنے ارادے اور دشمنی سے دستبردار نہیں ہوتا تھا۔ جنگوں میں اس کا یہی طریقہ رہا۔

۲۔ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے مسلسل کوششیں جاری رکھتا اور نئے طریقے سوچتا رہتا جب اسے موقع ملتا مدمقابل آجاتا۔

۳۔ وہ انتہائی چالاک اور ہوشیار شخص تھا، نہایت دانشمندی سے اپنے حق میں حالات پیدا کرنے اور ان سے بروقت فائدہ اٹھانے کا ہنر اچھی طرح جانتا تھا۔ گرفتاری کے وقت بھی اس نے کامیاب چال چلی اور حضرت عمرؓ سے بھی شاطرانہ طریقے پر امان حاصل کی۔

۴۔ اس کے ذہن میں عرب و عجم تنازعے کا بڑا گہرا نقش تھا، وہ اسلام کی سربلندی و سرفرازی کو بھی اسی تناظر میں دیکھتا تھا۔ وہ قوم پرستانہ جذبات و خیالات رکھتا تھا اس کے نزدیک اسلام کا غلبہ دراصل عربوں کا غلبہ تھا۔

۵۔ اس پر سرداری و بادشاہت کا غرور اور نخوت طاری تھی۔ اسے ترک کر دینا اور ایک عام آدمی کی طرح سادگی کی زندگی اختیار کرنا بہت مشکل اور کٹھن فیصلہ تھا جو شخص موت کو عام پیالے میں پانی پینے پر ترجیح دیتا ہو اس کی کیا کیفیت ہو گی جب اسے بے سرو سامانی اور مغلوبیت کی زندگی بسر کرنی پڑ رہی ہو۔

۶۔ اس کا اسلام قبول کر لینا کسی گہری سوچ، اسلام کی صداقت و حقانیت پر یقین اور ان تمام مناظر سے متاثر ہونے کی وجہ سے نہیں تھا جو اس نے مدینے میں آکر دیکھے تھے، بلکہ خالصتاً دباؤ اور جان کے خوف کی وجہ سے تھا۔

گرچہ ابن کثیر کا خیال یہ ہے کہ وہ ایک اچھا مسلمان بن گیا تھا اور حضرت عمر فاروقؓ سے علیحدہ نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے[3]۔ اسے آہستہ آہستہ اپنے قریب کیا اور جب آپ کو یہ یقین ہو گیا کہ اہل ایران کی بار بار عہد شکنی کی وجہ مسلمانوں کی زیادتی، ناانصافی یا معاہدوں کی خلاف ورزی نہیں بلکہ بقول حضرت احنفؓ بادشاہت اور بادشاہ کا موجود رہنا ہے تو آپ نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اگلے سال یعنی ۲۱ھ میں ان کے مکمل خاتمے کیلئے کارروائی شروع کی تو ہرمزان سے بھی مشورہ کیا[4] کہ تمہاری کیا رائے ہے میں جنگ کا آغاز فارس سے کروں، آذربائیجان سے یا اصفہان سے؟ اس نے جواب دیا "فارس اور آذربائیجان بازو ہیں اور اصفہان سر ہے اگر آپ ایک بازو کاٹیں گے تو دوسرا کھڑا ہو جائے گا[5] اگر آپ سر کاٹیں گے تو دونوں بازو گر جائیں گے اس لئے آپ سر سے آغاز کریں[6]۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس نے کہا دونوں بازو کاٹ دیں سر ختم ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا "اے اللہ کے دشمن تم جھوٹ بول رہے ہو میں اس کا سر کاٹنے کی کوشش کروں گا۔ جب اللہ سر کو کاٹ دے گا تو دونوں بازو خود بخود ختم ہو جائیں گے[7]۔

---

(۱) اثیر ۲/۳۸۴، طبری ۴/۸۹، کثیر ۸۶/۸، (۲) عبید ۱۶۶، (۳) کثیر ۸۸/۷، (۴) طبری ۸۹/۴، کثیر ۱۸۹/۴، اثیر ۳۸۵/۲، (۵) یوسف ۱۷۹، (۶) طبری ۱۷۲/۴، (۷) طبری ۱۳۹/۴

بہر حال اس کا معاملہ مشکوک رہا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے اپنے علاقے واپس جانے کے بجائے مدینہ شہر میں قیام کو کیوں ترجیح دی؟ اس بارے میں تاریخیں خاموش ہیں اس کا اندازہ ہمیں خود لگانا پڑے گا جس میں صواب و خطاء دونوں کا احتمال موجود ہے لیکن شہادت عمرؓ کی تحقیق کرنے کیلئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ ہم رائے زنی کریں۔ اگر ہم اس وقت کے حالات پر نظر ڈالیں تو مدینہ میں قیام کے فیصلے کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں۔

اپنے علاقے میں اس کا کوئی مستقبل نہیں تھا وہ سب مسلمانوں کے قبضے میں آچکے تھے۔ اس نے کسی معاہدے کے ذریعے نہیں بلکہ آخر وقت تک مقابلے کے ذریعے سے گنوائے تھے۔ اس کے بہت سے معتمد ساتھی یا تو مارے گئے یا دیگر علاقوں کی طرف فرار ہو گئے یا پھر انہوں نے اطاعت قبول کر لی تھی۔ واپس جا کر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا نہ مال و دولت نہ علاقے نہ مقام نہ سرداری اور نہ ہی عوام کی تائید۔ اس نے وہاں کے مسلم سالاروں سے بار بار عہد شکنی کر کے اپنا اعتماد اس قدر گنوا دیا تھا کہ اس کی بحالی ناممکن تھی۔ اس کا بھائی شہریار اس کی گرفتاری کے بعد بھی مسلمانوں کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ اس کیلئے وہاں جا کر غیر جانبدار رہنا ممکن نہیں تھا بصورت دیگر اس کی جان کو دوبارہ خطرہ لاحق ہو سکتا تھا' جسے اس نے بڑی عیاری سے بچایا تھا۔ پھر اسے اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ اسلام کا پرچم اب ہر طرف لہرائے گا۔ یہ اب مستقل سیاسی قوت اور تہذیبی طاقت کے طور پر حکمرانی کرے گا۔ مسلمانوں کا غلبہ یقینی تھا یہ جنگیں نہ تو وقتی دشمنی' جذبہ انتقام اور محدود مقاصد کیلئے تھیں اور نہ ہی عارضی سیاسی تسلط کیلئے۔ اس لئے دارالخلافے میں قیام کرنا اس کیلئے زیادہ مفید تھا۔ اس کے دل میں عرب یا اسلام یا حضرت عمرؓ کے خلاف' جن کی وجہ سے اسے اس کے خاندان اس کی قوم اور اس کے بادشاہوں کو ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑا تھا' جذبہ انتقام کو پورا کرنے کا یہاں رہ کر بہترین موقع مل سکتا تھا۔ اس نے امیر المومنین کی ذاتی سکیورٹی کے عدم اہتمام کو پہلے ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اسے اس کی بزدلی سمجھیں یا حکمت و مصلحت یا صبر و ضبط کا کمال کہ پانچ سال تک وہ خود کوئی اقدام نہ کر سکا۔ اس دوران اسے بدلہ لینے کے بے شمار مواقع ملے ہوں گے' مگر اس نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہاں تک کہ اسے ابولؤلؤ فیروز جیسا شخص مل گیا' جس کے دل میں نفرت و انتقام کی بھٹی اس سے کہیں زیادہ گرم تھی اور اس کو سرد کرنے کیلئے وہ اپنی جان سے گزر جانے کیلئے بھی تیار ہو گیا اور ان دونوں کے جذبات کا شریک نجرانی عیسائی جفینہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا اس طرح تینوں نے مل کر قتل کی منصوبہ بندی کی۔

○ ..... جفینہ کا کردار:

جفینہ عیسائی تھا' جنوبی یمن کے علاقے نجران کی بستی حیرہ کا رہنے والا تھا' قومیت کے اعتبار سے عرب تھا۔ حضرت عبیداللہ بن عمرؓ کے بقول "میں نے جفینہ کو مارا' وہ حیرہ کا ایک عیسائی تھا اور حضرت سعد بن ابی وقاص کا دودھ شریک بھائی تھا' اس رشتے سے اسے مدینہ لائے۔ یہاں وہ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا کرتا تھا(۱)۔ جب میں نے اسے تلوار ماری تو اس نے اپنی دونوں آنکھوں کے درمیان صلیب کا نشان بنایا۔ حضرت عمر فاروقؓ سے اس کی دشمنی کا سبب یہ تھا کہ آپ نے نجران کے عیسائیوں کو خلافت کے آخری سال علاقہ بدر کر دیا تھا' کیونکہ ان کے رومیوں کے ساتھ رابطے تھے' وہ ان کیلئے جاسوسی کرتے تھے' جبکہ اسلامی فوجیں ان کے خلاف برسرپیکار تھیں اور انہیں شکستوں پر شکستیں دیئے جا رہی تھیں۔ امام ابو یوسفؒ کے بقول "عمرؓ نے ان لوگوں کو نجران یمن سے جلاوطن کر کے نجران عراق میں بسا دیا تھا' کیونکہ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے (۲)۔" جفینہ جیسے پڑھے لکھے اور کٹر عیسائی کے دل میں نفرت و انتقام کا طوفان برپا تھا۔ ایک طرف تو وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ عالمی طور پر اس کا مذہب اسلام سے ٹکرا کر پسپا ہو رہا ہے۔ دوسری طرف اس کا قبیلہ اور رشتے دار علاقہ بدر ہو چکے ہیں۔ اس طرح مذہبی اور قبائلی دونوں تعصبات یکجا ہو گئے اور وہ قتل کی سازش میں متحرک ہو گیا۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے اس نے ایک گہری منصوبہ بندی

---

(۱) طبری ۴/۲۱۳ (۲) یوسف ۲۷۴

سے محض انتقام لینے کیلئے مدینہ میں قیام پذیر ہونے کا فیصلہ کیا ہو اور اسے رومیوں اور اس کے قبیلے کے لوگوں کی مکمل پشت پناہی حاصل ہو اور وہ مسلسل فاروق اعظمؓ کو شہید کرانے کیلئے کسی موزوں موقع کی تلاش میں رہا ہو۔ عملاً ہوا بھی کہ وہ اپنے ہی ہم مذہب ابولؤلؤ کو اس کام کیلئے آمادہ کر کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو گیا۔

○ ..... کعب الاحبار کا کردار:

قتل کی سازش کا چوتھا کردار کعب الاحبار ہے ابتداء میں وہ یہودی تھے' مدینہ ہی میں قیام پذیر تھے۔ تورات کے بڑے عالم ہونے کی وجہ سے ان کی عزت تھی۔ یہ بات حیران کن ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے مدینے میں ہونے کے باوجود کبھی نہیں ملے۔ ان کے قبول اسلام کے بارے میں اختلاف ہے' بعض کے نزدیک عہد صدیقؓ میں' بعض کے نزدیک عہد عثمانؓ میں اس وقت مسلمان ہوئے' جب وہ تمام علامتیں پوری ہو گئیں' جو حضرت محمد ﷺ اور اسلام کے بارے میں انہوں نے تورات میں پڑھ رکھی تھیں۔ طبری کا بیان ہے کہ وہ ۱۷ھ میں عہد فاروقیؓ میں مسلمان ہوئے۔ ہمارے نزدیک یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ ۱۶ھ میں جب فاروق اعظمؓ فتح بیت المقدس کے موقع پر وہاں تشریف لے گئے تو یہ بھی ساتھ تھے۔ آپ صبح کی نماز کے بعد یہودیوں کے قبلے صخرہ کے پاس پہنچے اور ان سے اس کا صحیح مقام دریافت کیا۔ آپ کا ارادہ تھا کہ مسجد بنائیں' کعب نے اس کے پیچھے مسجد بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ آپ نے پوچھا کس طرف رخ کریں' تو انہوں نے کہا صخرہ کی طرف۔ آپ نے فرمایا تم نے یہودیت کی مشابہت کی ہے اور میں نے دیکھا تم نے اپنے جوتے بھی اتار لئے تھے۔ وہ بولے یہاں میں براہ راست قدم رکھنا چاہتا تھا۔ آپ نے فرمایا میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر صخرہ کے آگے مسجد بنا دی کہ ہمیں کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ صخرہ کی طرف[1]۔ وہ مسجد آج بھی مسجد عمر کہلاتی ہے۔ پھر آپ نے صخرہ کے مقام کو جسے رومیوں نے کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ بنا دیا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام قمامہ پڑ گیا تھا صاف کرا لیا۔ اتنی دیر میں کعب نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور مسلمانوں نے بھی نعرہ تکبیر لگایا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں بلا کر وجہ پوچھی؟ انہوں نے جواب دیا امیر المومنین آج جو میں نے دیکھا ہے' اس کے بارے میں پانچ سو برس پہلے ایک نبی نے پیشن گوئی کی تھی۔ آپ نے فرمایا "وہ کیسے ہوئی؟" وہ بولے "رومیوں نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا تھا اور وہاں کے مطیع ہو گئے تھے۔ اس پر انہوں نے اس کو تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اہل فارس نے اہل روم پر حملہ کیا تو انہوں نے بھی بنی اسرائیل پر زیادتیاں کیں۔ پھر اہل روم ان پر غالب آ گئے تا آنکہ آپ حاکم ہوئے اللہ نے اس حالت میں ایک نبی بھیجا تھا جس نے فرمایا تھا اے یروشلم (بیت المقدس) تمہیں خوشخبری ہو تمہارے پاس فاروق آئے گا' جو تمہیں پاک و صاف کرے گا[2]۔"

کعب الاحبار کا تاریخ میں ایک اور ذکر ہمیں ۱۷ھ میں ملتا ہے۔ طبری کے مطابق حضرت عمرؓ نے ۱۷ھ جمادی الاول کے مہینے میں ان سے شہروں کے بارے میں مشورہ طلب کیا اور فرمایا "میں مسلمانوں کے شہروں کی سیاحت کرنا چاہتا ہوں' تاکہ آثار و احوال کا خود مشاہدہ کروں تم مجھے اس بارے میں مشورہ دو۔ اس مجمع میں کعب الاحبار بھی موجود تھے' وہ اسی سال مسلمان ہوئے تھے۔ وہ بولے "امیر المومنین! آپ سفر کا آغاز کہاں سے کرنا چاہتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "عراق سے۔" وہ بولے "کہ ایسا نہ کریں کیونکہ برائی کے دس حصے ہیں اور بھلائی کے بھی دس حصے ہیں۔ برائی کا ایک حصہ مغرب میں اور نو حصے مشرق میں ہیں اور بھلائی کا صرف ایک حصہ مشرق میں اور نو حصے مغرب میں ہیں۔ مشرق میں ہی شیطان کا سینگ اور ہر مہلک بیماری ہے۔" حضرت علیؓ نے کھڑے ہو کر کوفے کی اہمیت بیان کی' وہاں سے آغاز کا مشورہ دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اے امیر المومنین مغرب شرارتوں کی زمین ہے اور برائی کے سو حصے ہیں۔ ان میں ایک حصہ دنیا کے تمام لوگوں میں اور ننانوے حصے وہاں ہیں۔" حضرت عمرؓ نے سب کے دلائل کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ پہلے شام جائیں گے' کیونکہ وہاں طاعون کی

---

(۱) طبری ۲/۵۰٤' کثیر ۷/۱۳۰ (۲) طبری ۲/۵۰٤

وجہ سے لوگوں کے موروثی مال ضائع ہو رہے ہیں میں وہاں سے سفر کا آغاز کرتا ہوں۔ ان کے وارثوں میں مال تقسیم کروں گا پھر لوٹ کر باقی شہروں میں گھوموں گا اور انہیں اپنے احکام دوں گا[1]۔

ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کعب الاحبار کے اندر یہودیت کی طرف خصوصی رجحان اور قدیم واقعات کو اپنے رنگ میں پیش کرنے کی عادت اور عراق وشام کے مقابل میں شام کی طرف خصوصی رغبت اور اس کی بالادستی و برتری کا احساس موجود تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اسلام کا اعلان کرنے کے باوجود یہودیت سے ان کا فکری و عملی ناطہ برقرار رہا ہو۔ فاروق اعظمؓ نے حجاز کے علاقے خصوصاً خیبر وغیرہ سے یہودیوں کو جلاوطن کر کے شام کے علاقوں میں جو آباد کیا تھا اس کے پس منظر میں بھی نجرانیوں کی طرح ان کی متعدد سازشیں اور ریشہ دوانیاں تھیں، جن سے وہ باز نہیں آتے تھے، کعب الاحبار پر اس کے اثرات ہوں گے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے آخری دنوں میں خاص طور پر وہ متحرک نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے کہا تھا کہ تورات میں آپ کو شہید دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے شہادت سے تین روز قبل آ کر یہ کہا تھا امیر المومنین آپ تین دن بعد شہید ہو جائیں گے۔ اگلے روز کہا کہ باقی دو دن رہ گئے ہیں۔ پھر کہا کہ باقی ایک دن ہے۔ پھر کہا کہ کل صبح آپ کی وفات یقینی ہے۔

شداد بن اوس کعب سے روایت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ گزرا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کے خصائل بہت ملتے جلتے تھے۔ جب کبھی ہم اس کا ذکر کرتے تھے، تو حضرت عمرؓ ضرور یاد آ جاتے تھے اور جب کبھی عمرؓ کا ذکر ہوتا تھا، تو خواہ مخواہ وہ یاد آ جاتا تھا۔ اس کے زمانہ بادشاہت میں ایک نبی تھے ان کو ایک مرتبہ وحی ہوئی کہ تم اس بادشاہ سے کہہ دو کہ تیری عمر کے تین دن باقی ہیں ولی عہد بنا دے اور اگر کچھ وصیت کرنا ہو تو کر دے۔ جب تیسرا دن ہوا تو بادشاہ نے زمین پر سجدہ میں گر کر نہایت عاجزی سے دعا کی۔ الٰہی مجھے اتنی مہلت دے دیجئے کہ میرا لڑکا جوان ہو جائے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ میں نے آپ کے حکم کی کہاں تک تعمیل کی ہے اور اپنی رعایا سے حتی الامکان کتنا عدل کیا ہے اور جب کبھی اختلاف واقع ہوا تو تیرے حکم کے خلاف ہرگز نہیں چلا۔ اسی طرح کچھ اور باتیں بیان کیں۔ نبی علیہ السلام کے پاس پھر وحی ہوئی کہ اس نے ہم سے ایسی ایسی دعا کی ہے اور اس نے دعا میں جو کچھ واسطہ دے کر کہا ہے سچ کہا ہے ہم اس کی عمر میں پندرہ برس کا اضافہ کرتے ہیں تاکہ اس مدت میں اس کا لڑکا جوان ہو جائے اور پرورش پائے۔ جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نیزہ لگا اور آپ زخمی ہو گئے تو کعب احبار نے یہ قصہ بیان کر کے کہا کہ اگر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی خداوند تعالیٰ سے یہی سوال کریں تو خداوند تعالیٰ انہیں ابھی اور باقی رکھیں گے۔ جس وقت اس کی خبر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہوئی تو آپ نے دعا کی الٰہی! مجھے بغیر عاجز کئے اور بغیر ملامت دیئے اٹھا ہی لیجئے[2]۔ علاوہ ازیں جب آپ زخمی ہو گئے تو کعب نے کہا کہ امیر المومنین میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ بغیر شہید ہوئے نہیں مریں گے اور آپ کہتے تھے کہ "کیسے شہید ہوں گا میں تو جزیرۃ العرب میں ہوں؟"

سر ولیم میور نے اپنی کتاب خلافۃ الاولیٰ میں تین دن قبل پیشین گوئی کا قصہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے "ہمارے لئے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ یہ عجیب قصہ کیسے وجود میں آیا۔ ہو سکتا ہے ابولؤلؤ کے چہرے پر دشمنی اور غضب کے آثار دیکھ کر کعب نے عمرؓ کو خبردار کیا ہو۔" حسین ہیکل کا کہنا ہے کہ ابولؤلؤ اور حضرت عمرؓ کی گفتگو اور کعب کے قصے سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایرانی نے امیر المومنین کو قتل کی دھمکی دی اور یہودی نے تین دن پہلے قتل کا وقت مقرر کر دیا۔ ہمارے خیال میں کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ آسمانی کتابیں انفرادی واقعات کی تعیین اتنی دقت اور تفصیل کے ساتھ کرتی ہوں۔ اس لئے کہ تمام کتب سماویہ

---

(۱) طبری ۲/۴: ۷۲ (۲) سیوطی ۱: ۱۴۵ جوزی ۱: ۳۹۵ (۳) سعد ۳: ۳۹

علم غیب کو صرف خدائے واحد کیلئے مخصوص قرار دیتی ہیں۔ اس سے لازمی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ کعب اس راز سے واقف تھے(۱)۔ اس لئے انہوں نے حضرت عمرؓ کو خبردار کیا تھا۔ آگے لکھتے ہیں کہ اس پر تو یقین رکھتا ہوں کہ انہیں سازش کا علم تھا لیکن قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس میں شریک بھی تھے۔

اس کے برعکس جناب عقاد کی رائے ہے کہ وہ اس سازش میں برابر کے شریک تھے(۲)۔ اسی طرح محمد ابو نصر نے کعب کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے "کعب ایک عالم آدمی تھے اور تورات کو عبرانی زبان میں پڑھا کرتے تھے۔ توریت کے اشعار ایسی ایسی پیچیدہ عبارتوں سے بھرے پڑے تھے کہ جن کو کوئی عرب خواہ وہ عبرانی ہی کیوں نہ پڑھا ہوا ہو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے من گھڑت باتیں مسلمانوں کے درمیان پھیلا دیں اور ان کے دین اور عقیدے کی پاکیزگی کو مکدر کر دیا۔ انہوں نے اوائل اسلام ہی میں ایک بلند اور ممتاز مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ اکثر لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ جو تورات وہ پڑھتے ہیں اسی میں سب چیزوں کا علم موجود ہے اور جو کچھ وہ انہیں بتاتے ہیں وہ بالکل سچ ہے۔ لوگوں کا ان کی نسبت یہ اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا جب انہوں نے تین روز پہلے حضرت عمرؓ کی وفات کی خبر دی اور وہ فی الواقع وقوع میں آ بھی گئی۔ بہت سے لوگ ان اسرائیلیات پر جو انہوں نے بیان کیں آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئے اور انہوں نے ان کو تاریخ اور احادیث و تفسیر کی کتابوں میں داخل کر دیا۔ وہ خود بھی اس سے زیادہ ان کی حقیقت سے واقف نہ تھے کہ وہ خود ان کی بنائی ہوئی باتیں تھیں۔ وہ اپنے کلام کی سند تورات میں سے دیتے تھے لیکن تورات ان باتوں سے خالی تھی۔ آج کل تورات ہمارے سامنے ہے ہم اسے پڑھتے ہیں لیکن ان باتوں میں سے ایک بھی اس میں نہیں ملتی جو کعب الاحبار نے زمانہ گزشتہ میں بیان کی تھیں۔" ان امور کی موجودگی میں ہمارے لئے یہ شک نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی اور کوئی آدمی اس کو جھٹلا نہیں سکتا کہ کعب نے حضرت عمرؓ سے تین روز پہلے آپ کی وفات کا جو تذکرہ کیا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اس تمام سکیم کا پتہ تھا جو ابولولؤ نے حضرت عمرؓ کو شہید کرنے کیلئے تیار کی تھی۔ حضرت عمرؓ کو بتانے کا مقصد یہ تھا کہ ان کی قدر و منزلت مسلمانوں میں زیادہ ہو جائے اور وہ ان کی بیان کردہ روایات اور کہانیوں کو بے دھڑک قبول کر لیں(۳)۔

○...... سازش کے ثبوت:

گزشتہ صفحات میں حالات و واقعات کی شہادتیں پیش کی گئی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کو شہید کرنے کی سازش میں ابولولؤ کے پیچھے یک مجوسی و ایرانی پس منظر رکھنے والا شخص ہرمزان اور ایک عیسائی جفینہ اور ایک یہودی بنیاد رکھنے والا شخص کعب الاحبار موجود تھے۔ ان میں سے دو اپنے مذہب اور قوم پرستی پر پوری طرح جمے ہوئے تھے اور وہ اسلام کا لبادہ اوڑھنے کے باوجود اپنے دلوں اور ذہنوں کو ان جذبات و خیالات سے جو ان کے سابقہ علاقے اور عقیدے سے وابستہ تھے آزاد نہیں ہو سکے تھے۔ ان کی شدت کا یہ عالم تھا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے ایک دیرینہ رفیق اسلام کے ایک عظیم سپوت اور تاریخ کے نمایاں مدبر و منتظم اور انسانیت کے بہت بڑے محسن کے قتل کی سازش میں ملوث ہو گئے۔ جہاں تک جتنی شہادتوں کا تعلق ہے وہ ابتدائی تین لوگوں کے بارے میں ٹھوس ثبوت فراہم کرتی ہیں البتہ آخری کے بارے میں خاموش ہیں۔ اس لئے اگر کوئی اس کا الاؤنس کعب کو دینا چاہے تو اس کی گنجائش موجود ہے۔ یعنی گواہوں میں ایک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فرزند عبدالرحمنؓ ہیں۔

سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ عبدالرحمن بن ابی بکر صدیق نے کہا کہ جس وقت عمرؓ قتل کئے گئے تو میں ابولولؤ کے پاس سے گزرا اس کے ہمراہ جفینہ اور ہرمزان بھی تھے تینوں سرگوشی کر رہے تھے۔ جب میں دفعتاً ان کے پاس پہنچ گیا تو وہ بھاگے ان کے درمیان سے ایک خنجر گر پڑا جس کے دو سرے تھے اور اس کی

(۱) ھیکل،۷۱۶ (۲) عقاد،۵۳۵ (۳) نقوش،۲۱۸/۱۳

وحد بیچ میں تھی۔ تم لوگ دیکھو کہ جس سے عمرؓ قتل کیے گئے وہ کونسا خنجر ہے انہوں نے وہی خنجر پایا۔ عبدالرحمن ابن ابی بکرؓ نے جس کی صفت بیان کی تھی[1]۔

دوسرے چشم دید گواہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ہیں۔ جب انہوں سا نے وہ چھری دیکھی جس سے حضرت عمر قتل کئے گئے تھے تو فرمایا کل میں نے یہ ہرمزان اور جفینہ کے پاس دیکھی۔ میں نے پوچھا "تم دونوں اس چھری سے کیا کرو گے؟" انہوں نے کہا کہ ہم گوشت کاٹیں گے کیونکہ ہم لوگ گوشت کو چھوتے نہیں[2]۔ ان دونوں روایتوں کے تجزیے سے حسب ذیل ثابت ہوتی ہیں:

الف۔ دونوں راوی ثقہ اور عادل ہیں جن کی گواہیاں اسلامی قانون کے اعتبار سے قابل قبول ہیں۔

ب۔ آلۂ قتل مخصوص نوعیت کا تھا جس کی پہچان آسانی کی جا سکتی تھی۔

ج۔ دونوں نے اس خنجر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور واردات کے بعد انہوں نے اسے پہچان لیا یہ بالکل وہی تھا جو ایک روز قبل انہوں نے دیکھا تھا۔

د۔ دونوں نے اسے ہرمزان اور جفینہ کے پاس دیکھا تھا البتہ عبدالرحمن بن ابی بکرؓ نے جب دیکھا تو اس وقت ابولؤلؤ بھی ان کے ساتھ تھا۔

ہ۔ دونوں گواہوں نے محض خفیہ طور پر نہیں دیکھا بلکہ بطور خاص نوٹ کیا۔ ایک کے سامنے وہ گھبرا کر بھاگ گئے اور دوسرے کے سامنے کٹ حجتی پیش کی جو شبہ کے یقین میں بدلنے کیلئے کافی ہے۔

ی۔ دونوں نے واقعے کے بعد گواہی دی کہ ہم نے اس خنجر کو ان لوگوں کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ یہ بالکل وہی ہے جو گزشتہ رات انہوں نے دیکھا۔

ان روایات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آلۂ قتل فراہم کرنے والے ہرمزان اور جفینہ تھے لیکن ابن اثیر نے ابورافع سے نقل کیا ہے کہ جب ابولؤلؤ کے دل میں قتل کا ارادہ پیدا ہوا تو اس نے ایک خنجر بنایا جس کی دو نوکیں تھیں۔ اس کو خوب تیز کیا اور زہر میں بجھانے کے بعد ہرمزان کے پاس لے گیا اور اسے کہا دیکھو یہ خنجر کیسا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میرے نزدیک یہ خنجر ایسا ہے کہ جس کو بھی مارو گے مر جائے گا۔ پس وہ حضرت عمرؓ کی گھات میں رہنے لگا۔ قاتل اعتماد والے بندے کے بغیر کسی کو آلہ دکھاتا نہیں پھرتا[3]۔ خنجر اس نے خود بنایا ہو یا دونوں سے لیا ہو امر واقعہ پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ثابت شدہ حقیقت یہی ہے کہ قتل تینوں کے ارادے، باہمی تعاون اور گہری منصوبہ بندی سے ہوا اور تینوں ہی اس کے بڑے مجرم ہیں۔ ابولؤلؤ نے خودکشی کر لی تھی البتہ حضرت عبیداللہ بن عمرؓ کو جب صحیح صورتحال کا علم ہوا تو انہوں نے ہرمزان اور جفینہ کے ساتھ ابولؤلؤ کی بیٹی کو بھی تہ تیغ کر دیا[4]۔ ان کے جذبات میں ام المومنین حضرت حفصہؓ بھی شریک تھیں[5]۔ وہ قید ہو کر مدینے میں آنے والے تمام لوگوں کو اس سازش کا شریک اور اس جرم کا مرتکب سمجھ رہے تھے[6]۔ روایت میں آتا ہے کہ جوش جذبات میں خونخوار جنگلی درندے کی شکل اختیار کر چکے تھے اور عجمیوں کو تلوار سے روک نہ سکے۔ ان کا ارادہ تھا ان میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑیں۔ حضرت عمرو بن العاص، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین نے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی تو ان سے تلخی اور ہاتھاپائی تک کی نوبت آگئی بالآخر انہیں قید کر دیا گیا۔

حضرت عثمانؓ نے خلیفہ منتخب ہوتے ہی مہاجرینؓ و انصارؓ کو بلا کر حضرت عبیداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مشورہ کیا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ قصاص میں انہیں قتل کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ نے یہی رائے دی۔ بعض فاروق اعظمؓ کی شہادت کے صدمے کی صورتحال میں یہ کہہ رہے تھے "کل عمرؓ شہید کیے گئے اور آج ان کے فرزند کو قتل کیا جا رہا ہے۔" حضرت عمروؓ بن العاص کا مشورہ یہ تھا "امیر المومنین یہ واقعہ اس وقت ہوا جب آپ کی حکومت نہیں تھی بلکہ آپ کے دور سے

---

(۱) سعد ۳/۳۵۵، طبری ۴/۲۴۲ (۲) سعد ۳/۳۵۰ (۳) الکامل ۳/۷۶ (۴) سعد ۳/۳۵۶، طبری ۴/۲۴۲ (۵) یعقوبی ۲/۱۶۲ (۶) سعد ۳/۳۵۷، طبری ۴/۲۱۱۔

پہلے کا واقعہ ہے۔ اس وقت مسلمانوں کا کوئی حاکم نہیں تھا(۱)۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کیلئے کوئی فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ ایک طرف یہ اندیشہ تھا کہ تحقیقات کا دائرہ وسیع کیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ تمام عجمیوں کی جانیں خطرے میں پڑ جائیں اور وسیع و عریض سلطنت کے دوسرے علاقوں پر بھی اس کے منفی اثرات پڑیں۔ دوسری طرف حضرت عمرؓ کے خاندان اور دیگر مسلمانوں کے جذبات کا کیا عالم ہو گا' جو پہلے ہی انتہائی غمزدہ ہیں۔ تیسری طرف یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ ہرمزان اور جفینہ واقعی قتل کی سازش میں براہ راست شریک تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو یہی کام جو عبید اللہ نے کیا حکومت کو کرنا پڑتا۔ چوتھا اہم پہلو یہ تھا کہ مقتولوں کا کوئی قانونی وارث موجود نہیں تھا۔ اس لئے شرعی طور پر بطور حکمران وہی ان کے ولی بنتے تھے۔ اس لئے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اس مسئلے کو حل فرمایا اور فیصلہ دیا "میں مسلمانوں کا ولی ہوں۔ میں نے اس (قتل) کیلئے دیت مقرر کی ہے جسے میں اپنے مال سے ادا کروں گا(۲)۔" اس طرح انہوں نے دیت کی رقم بیت المال میں جمع کرا دی۔

اس طرح انتظامی اعتبار سے مسئلہ تو حل ہو گیا' لیکن مجرموں کے قتل ہو جانے اور تفتیش و تحقیقات کا دائرہ نہایت محدود اور انداز بالکل سادہ رکھا گیا۔ یہاں تک کہ کعب الاحبار سے بھی کسی نے یہ پوچھنے کی کوشش نہ کی کہ ان کی پیشن گوئیوں کا ماخذ کیا تھا؟ اس طرح پشت پناہ قوتوں اور سازش کی تہہ در تہہ وسعتوں تک رسائی کا امکان ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا۔

---

(۱) طبری II:۴/۲۱۱ (۲) طبری II:۴/۲۱۱

شجرۂ نسب
(فاروق اعظمؓ)
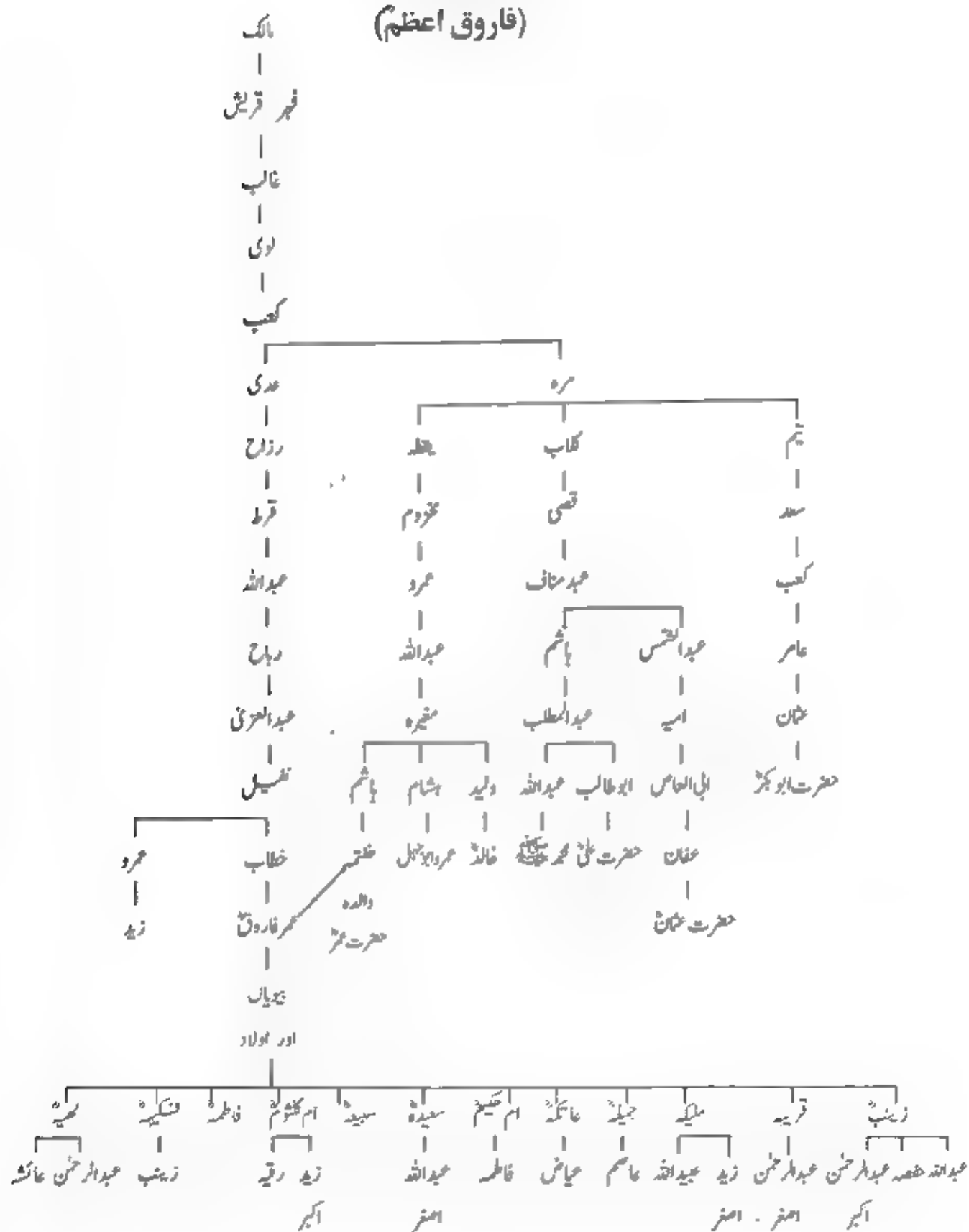
۱۔ زینب بنت مظعون بن حبیب: حضرت عمرؓ کی سب سے پہلی بیوی ہیں[۱]۔ عہد جاہلیت میں ان سے نکاح کیا[۲]۔ انہوں نے اسلام بھی قبول کیا اور ہجرت بھی کی[۳]۔ حضرت عثمان بن مظعون کی بہن تھیں[۴]۔ عبداللہؓ عبدالرحمٰنؓ بن اکبر اور حفصہؓ انہی میں سے پیدا ہوئے[۵]۔

۲۔ قریبہ بنت ابی امیہ مخزومی ام المومنین ام سلمہ کی بہن تھیں۔ عہد جاہلیت میں شادی کی تھی[۶]۔ اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ سے طلاق دے دی[۷]۔ ابن ہشام کے بقول اس وقت طلاق دی جب قرآن مجید میں کافرہ بیویوں کو طلاق دینے کا حکم نازل ہوا[۸]۔

۳۔ ملیکہ بنت جرول عہد جاہلیت میں ان سے نکاح کیا[۹]۔ ام کلثوم بنت جرول بھی ان کا نام ہے۔ بنو خزاعہ میں سے تھیں[۱۰]۔ اسلام قبول نہ کیا طلاق دے دی[۱۱]۔ ان کو بھی حکم نازل ہونے کے بعد طلاق دی[۱۲]۔ ان سے عبیداللہ پیدا ہوئے طلاق کے بعد ابو جہم نے ان سے نکاح کیا[۱۳]۔

۴۔ جمیلہ بنت ثابت (ابو الاقلح) انصاری ان[۱۴] کا پہلا نام عاصیہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام بدل کر جمیلہ رکھا[۱۵]۔ مسلم کی ایک اور روایت میں انہیں بیٹی بتایا گیا ہے جو درست نہیں[۱۶]۔ انہیں بھی طلاق دے دی تھی[۱۷]۔

۵۔ عاتکہ بنت زید بن عمرو۔ آپ[۱۸] بھی اچھی شاعرہ تھیں۔ حضرت عمرؓ کی وفات پر مرثیہ لکھا[۱۹]۔ وفات کے وقت موجود تھیں(۲۰)۔ حضرت عمرؓ نے ۱۲ھ میں ان سے نکاح کیا۔

۶۔ ام حکیم بنت حارث بنت ہشام: ان[۲۱] کے خاوند شام میں فوت ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے نکاح کیا[۲۲]۔ ابو جہل کی بھتیجی تھیں۔ بعض کے نزدیک طلاق دے دی تھی[۲۳] بعض کے نزدیک نہیں۔ ان سے فاطمہ پیدا ہوئیں[۲۴]۔

۷۔ سعیدہ بنت رافع بن عبید (زبیری)[۲۵]:

۸۔ سبیعہ بنت حارث صلح حدیبیہ کے بعد پہلی مسلمان خاتون ہیں جب آیت امتحان نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی آزمائش لی۔ ان کے شوہر کو مہر مثل دے دیا۔ حضرت عمرؓ نے شادی کر لی[۲۶]۔

۹۔ ام کلثوم بنت علیؓ بن ابی طالب: ان کی والدہ فاطمۃ الزہرہ تھیں[۲۷]۔ خاندان نبوت سے قرابت پیدا کرنے کی وجہ سے نکاح کیا[۲۸]۔ مہر میں چالیس ہزار درہم دیئے[۲۹]۔ ۱۷ھ میں شادی کی[۳۰]۔ اس کا سبب رسول اکرم ﷺ کا یہ قول تھا "قیامت کے دن میری قرابت ونسب کے سوا تمام رشتے ہائے قرابت ونسب منقطع ہو جائیں گے[۳۱]۔ ان کے بطن سے زیدؓ اور رقیہؓ پیدا ہوئے[۳۲]۔

---

(۱) زبیری ۱۰ ۳۴۹ (۲) طبری ۱۱: ۴: ۱۹۸ ابن کثیر ۷/۱۳۹ (۳) زبیری ۱۰/۳۴۹ (۴) ابن کثیر ۷/۱۳۹ (۵) طبری ۱۱: ۴: ۱۹۸ (۶) طبری ۱۱: ۴/۱۹۹ (۷) ابن کثیر ۷: ۱۳۹ طبری ۱۱: ۴: ۱۹۹ (۸) ہشام ۳/۳۴۱ (۹) طبری ۱۱: ۴/۱۹۸ (۱۰) زبیری ۱/۳۴۹ سعد ۳ '۲۶۵ متقی ۱۱ ۵۸۱ (۱۱) سعد ۳،۲۶۵ ابن کثیر ۷ ۱۳۹ (۱۲) ہشام ۳ ۳۴۱ (۱۳) طبری ۱۱: ۴/۱۹۸ (۱۴) زبیری ۱ ۳۴۹ (۱۵) مسلم ۵/ ۲۴ سعد ۳/۲۶۶ (۱۶) مسلم ۵ ۲۴ (۱۷) طبری ۱۱: ۴ ۱۹۹ (۱۸) سعد ۳ ۲۶ زبیری ۹ ۳۴۹ (۱۹) ابن کثیر ۷/ ۱۴ (۲۰) طبری ۱۱: ۴/۱۹۹ ایضاً ۲/۳۸۵ (۲۱) سعد ۳/۲۶۶ (۲۲) ابن کثیر ۷/۱۳۹ (۲۳) طبری ۱۱: ۴ ۱۹۹ ابن کثیر ۷ ۱۳۹ (۲۴) طبری ۱۱: ۴ ۱۹۹ (۲۵) زبیری ۱ ۳۵ (۲۶) عسقلانی ۴۸۹ (۲۷) زبیری ۱ ۳۴۹ سعد ۳/۲۶۵ (۲۸) ابن کثیر ۷ ۱۳۹ (۲۹) طبری ۱۱: ۴ ۱۹۹ (۳۰) طبری ۱۱: ۴ ۱۹۹ ابن کثیر ۷ ۸۱ (۳۱) کثیر ۷ ۸۱ (۳۲) طبری ۱۱: ۴ ۱۹۹

۱۰۔ فاطمہ بنت ولید بن عقبہ حضرت خالد بن ولید کی ہمشیرہ تھیں[۱]۔ ان کے خاوند حارث بن ہشام طاعون سے فوت ہو گئے۔ ۲۰ھ میں ان سے شادی کی تھی[۲]۔ یہ عبدالرحمن بن حارث بن ہشام کی والدہ تھیں[۳]۔

۱۱۔ فکیہہ : ام ولد تھیں[۴]۔

۱۲۔ لیہیہ ۔ ام ولد تھیں[۵]۔ بعض نے انہیں یمنی عورت بتایا ہے(۶)۔ ابن سعد نے ان کے بیٹے عبدالرحمن کا لقب ابوالجبر بتایا ہے[۷]۔

---

(۱) ابن کثیر ۷: [illegible] طبری ۴: ۱۱۲ (۲) ابن کثیر ۷: [illegible] (۳) طبری ۴: ۱۱۲ (۴) طبری ۴: ۱۹۹ سعد ۳: ۲۶۶ (۵) طبری ۴: ۱۹۹ (۶) ابن کثیر ۷: ۱۳۹، طبری ۴: ۱۹۹ (۷) سعد ۲۶۶/۳

باب سوم

عہدِ صدیقؓ ---- بصیرتِ عمرؓ کی جولانیاں

☆۔ صدیقؓ و فاروقؓ دو ساتھی دو کردار

☆۔ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب

☆۔ بطور مشیرِ اعلیٰ

☆۔ بطور قاضی

☆۔ فاروقِ اعظمؓ کا انتخاب

عہد نبویؐ ... بصیرت عمرؓ کی تربیت و ارتقاء

O ..... تعلق بالرسولؐ:

ارشاد نبوی ﷺ ہے "الناس معادن کمعادن الذھب والفضۃ خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا والارواح مجندۃ فما تعارف منھا ائتلف وما تناکر منھا اختلف"[1] "(لوگ تو کانیں ہیں جس طرح سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے جو جاہلیت میں اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہیں جبکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور روحیں ملے جلے لشکروں کی مانند ہیں جو باہم متعارف ہوئے وہ تو جڑ گئے اور جو آپس میں ایک دوسرے سے ناواقف رہے تو ان میں اختلاف رہا) سرور کونین ﷺ کا یہ فرمان حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔ آپ عہد جاہلیت ہی سے انتہائی باصلاحیت تھے۔ اگرچہ اس دور کے بارے میں تاریخ ہمیں بہت زیادہ معلومات فراہم نہیں کرتی لیکن اس قدر گمنام شخص بھی نہیں تھے کہ ہم آپ کے ماضی کے بارے میں کچھ جان ہی نہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو واقعات مذکور ہیں وہ آپ کے دیگر ہم عصر لوگوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں اور یہی آپ کے معروف اور متحرک ہونے پر دلالت بھی کرتے ہیں۔ ان واقعات میں آپ کی سیرت و شخصیت کی پوری جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ فہم و فراست' عزم و حوصلہ' علمی ذوق' نظریاتی وابستگی میں خلوص' مزاج میں شدت وہ ساری صلاحیتیں اور خصائص جو عہد اسلام میں آپ کا طرۂ امتیاز تھے ان کی بنیادوں کا سراغ عہد جاہلیت میں تلاش کرنا مشکل نہیں۔ جرأت و ہمت' قلب میں رقت' مخالفوں سے نفرت' انتظامی صلاحیت' غیرت' حق گوئی' بیباکی۔ آپ کے سراپا میں یہ ساری باتیں جمع تھیں اور قبول اسلام سے پہلے آپ نے انہیں اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں بھرپور طور پر استعمال کیا۔ سرور کونین ﷺ سے زیادہ جوہر شناس اور کون ہو سکتا ہے؟ آپ کو معلوم تھا کہ ان صلاحیتوں کا حامل شخص عمر اگر اسلام قبول کرلے تو اسلام کی سربلندی کیلئے کی جانے والی جدوجہد ایک نئے مرحلے میں داخل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے ان کے قبول اسلام کی دعا فرمائی جو منظور ہوئی اور آپ کی توقع بھی پوری ہوئی۔ اسلام اب جاہلیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا پیغام پہنچانے کے قابل ہو گیا۔

مربی اعظم ﷺ نے ۳۱ سال کے اس باصلاحیت جوان کو اپنی تربیت میں لیا تو اس پر خصوصی توجہ فرمائی۔ اسے مقصد زندگی کا شعور دیا' قدم قدم پر اس کی رہنمائی کی۔ اس کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کیا' اس کی سوچ کو نیا زاویہ اور فراست کو نئی شان' جرأت و ہمت کو مقصدیت کی پہچان اور غیرت کو نیا ولولہ عطا فرمایا۔ یہ سب کچھ آپؐ کے منصب رسالت کا لازمی حصہ تھا کیونکہ فرد کی تربیت اور تعمیر شخصیت کیلئے اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری آپ کو سونپی تھی وہ کچھ یوں ہے "لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم ایتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین[2]"۔ (درحقیقت اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا ہے جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے' ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔) آپ کا یہ فیض سارے مسلمانوں کیلئے عام تھا لیکن اس سے استفادہ اپنے ذوق' ظرف' استعداد' صلاحیت اور حاصل ہونے والے مواقع کے لحاظ سے مختلف لوگوں مختلف کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں موقع بھی بھرپور عطا کیا اور استعداد و صلاحیت بھی وافر دی۔ آپ معلم انسانیت ﷺ کے قدم قدم پر رفیق و معاون' سعادت مند شاگرد اور معتمد علیہ مشیر رہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی فکری و ذہنی صلاحیتوں کے بھی حامل تھے کہ ہر بات کی تہہ میں اتر جاتے اور کسی بھی معاملے میں حقیقت تک رسائی سے قبل مطمئن نہ ہوتے اور دین کے مزاج اور اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ اگر کوئی اشکال پیدا ہوتا تو پوری بیباکی

---

(۱) بخاری-۶/۱۷۴' مسلم-۸/۴۱' مغنی:۱۰/۱۴۹' تحریر:۷/۳۵۹ (۲) سورہ آل عمران:۱۶۴

سے سوال کر کے دور فرما دیتے۔ اگر ہم حضرت عمرؓ کی سیرت و کردار کا مذکورہ آیت کے حوالے سے تجزیہ کریں تو دیکھتے ہیں کہ بعثت نبوی ﷺ کے خدائی احسان کا پورا شعور رکھتے تھے اور آپ کی ذات بابرکت کے فیض سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے کیوں کہ رسول محترم ﷺ کی زندگی ان کیلئے مثالی حیثیت کی حامل تھی۔ ایک مرتبہ ان سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو عمرہ میں بیت اللہ کا طواف تو کر لیتا ہے لیکن صفا و مروہ کی سعی نہیں کرتا کہ کیا وہ اپنی بیوی سے ہم بستر ہو سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا نبی ﷺ مکہ میں تشریف لائے تو آپؐ نے بیت اللہ کا سات چکروں کے ساتھ طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی پھر صفا و مروہ کی سات مرتبہ سعی کی۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی[1] "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ[2]۔" راوی کے بقول جب ہم نے اس سے متعلق جابر بن عبداللہ سے بھی پوچھا تو انہوں نے جواب دیا صفا و مروہ کی سعی سے پہلے بیوی کے قریب بھی نہ جاؤ[3]۔ جب ان کے سامنے آیات کی تلاوت ہوتی تو ان کا دل ہیبت سے کانپ اٹھتا اور رقت سے لبریز ہو جاتا۔ انہیں ذہن نشین بھی کر لیتے، سمجھنے کی بھی کوشش کرتے اور پھر عملی زندگی کا حصہ بھی بنا لیتے۔ تزکیہ حاصل کیا تو ایسا کہ دل و ذہن کی کائنات ہی بدل گئی۔ جذبات و احساسات کا رخ تبدیل ہو گیا اور اطوار و اعمال میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا ہو گیا اور آپ کا زہد ایک ضرب المثل بن گیا۔ کتاب کی تعلیم اس طرح حاصل کی کہ ان کا ذوق بھی وحی الٰہی سے ہم آہنگ ہو گیا اور اس کے اندر چھپے ہوئے علوم کے بے پناہ خزانوں سے بھی مالا مال ہو گئے۔

حکمت کی تعلیم ایسی حاصل کی کہ بصیرت و فراست کے دریا کے شناور بن گئے۔ آپ کو زبان نبوت سے "محدث" کا خطاب ملا' آپ کی آراء' احکام اور فیصلوں میں حکمت کی جھلک بہت نمایاں ہے اور پھر گمراہی و ضلالت کی تاریکیوں سے نکلے تو حق و باطل کی حد فاصل "فاروق" بن گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اجتہادی بصیرت تربیت نبوی ﷺ کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ اس عہد باسعادت میں ان چند لوگوں میں سے تھے جو فتویٰ دیا کرتے تھے[4]۔ رسول اکرم ﷺ یہ جانتے تھے کہ ان کے اندر حق پرستی کا ایسا لازوال جذبہ موجود ہے جو بے لوث بھی ہے اور قوی بھی۔ یہ انہیں فکری اور عملی دونوں اعتبار سے کبھی ٹھوکر نہیں کھانے دے گا۔ کیوں کہ وہ اس کی راہ میں نہ تو کسی بات کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ تعلق کی۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا "رحم اللہ عمرؓ یقول الحق ان کان مرا ترکه الحق و ماله صدیق[5]۔" (اللہ عمرؓ پر رحم کرے وہ حق کہتے ہیں اگرچہ کڑوا ہو حق نے ان کو اس حال میں کر دیا کہ ان کا کوئی دوست نہ رہا۔) یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ عمرؓ ہمیشہ حق و صداقت ہی کے علمبردار رہیں گے اس کا اظہار کچھ اس طرح فرمایا "الصدق والحق بعدی مع عمرؓ[6]۔" ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کوئی بات کہی تو رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور ارشاد فرمایا "عمر معی وانا مع عمر[7]۔ والحق بعدی مع عمر حیث کان[8]۔" (عمر میرے ساتھ ہیں اور میں عمر کے ساتھ ہوں۔ میرے بعد حق عمر کے ساتھ رہے گا وہ جہاں اور جیسے ہوں۔)

حضرت عمرؓ پر یہ بھرپور اعتماد دراصل ان کی اجتہادی بصیرت اور مومنانہ فراست کی بناء پر تھا جو اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصی طور پر عطا فرمائی تھی جس کے ذریعے پیش آنے والے ہر نئے اور پیچیدہ مسئلے کو شریعت اسلامی کی روح کے مطابق حل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس بصیرت کے قابل اعتماد ہونے کی مضبوط بنیاد یہ تھی کہ وہ مزاج شناس نبوت تھے ان کی پسند اور ذوق کا معیار نبی ﷺ کی پسند اور ذوق کے معیار کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔ جب کسی مجتہد کو یہ مقام حاصل ہو جائے تو حق تک پہنچنے کے سب دروازے اس کیلئے کھل جاتے ہیں۔ علامہ ابن جوزی نے مذکورہ روایت میں رسول اکرم ﷺ کے اس قول کا اضافہ کیا ہے "عمر بن الخطاب معی حیث احب وانا معه حیث یحب[9]۔" (عمر الخطاب میرے ساتھ ہیں جس طرح میں پسند کرتا ہوں اور میں ان کے ساتھ ہوں جیسا کہ وہ

---

(۱) بخاری ۲: ۱۷ (۲) سورۃ الاحزاب ۳۳: ۲۱ (۳) بخاری ۲: ۱۷ (٤) سعد ۲: ۳۵ (۵) ترمذی ۵: ۲۸ (٦) متقی ٤: ۸۱ (۷) طبرانی ۳: ۱۹۰ طبرانی کی روایت میں یہ جملہ اضافی ہے (۸) طبرانی ۳: ۱۹۰ / جوزی ۲۰ / سیوطی ۱۹۰ / متقی ۱۱: ۵۷۹ (۹) جوزی ۲۰۔

پسند کرتے ہیں۔) اسال نبوت نے حضرت عمرؓ کے بہت سے فضائل و مناقب کو واضح کیا ہے جنہیں اس مقالے میں موقع و محل کی مناسبت سے مختلف جگہوں پر درج کیا گیا ہے۔ آپؐ نے یہاں تک ارشاد فرمایا "ماطلعت الشمس علی رجل خیر من عمر"[1]۔ "(عمر سے بہتر کسی شخص پر کبھی سورج طلوع نہیں ہوا۔) حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے ایک جگہ نکاح کیلئے پیغام بھیجا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے بجائے حضرت مغیرہؓ کے ساتھ نکاح کر دیا۔ رسول اکرم ﷺ کو جب اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ انہوں نے اس امت کے سب سے بہتر شخص کو ٹھکرا دیا ہے "لقد ترکوا أو ردوا خیر هذه الامة"[2]۔" ان احادیث میں حضرت عمرؓ کو رسول اللہ ﷺ نے سب سے بہترین شخص قرار دیا جبکہ بعض دیگر روایات کی بنیاد پر امت کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کی فضیلت کے اعتبار سے اول نمبر پر ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہاں چند صلاحیتوں کی بناء پر سرور کونین ﷺ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں مذکورہ رائے دی ہے۔ بحیثیت مجموعی نہیں (واللہ اعلم) ان صلاحیتوں میں سب سے اہم اجتہادی بصیرت ہے جس کی بناء پر نبی ﷺ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے تمام مناقب پر تقابلی نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وصف کو آنحضور ﷺ نے سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس شخص نے عمرؓ سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا، جس نے عمرؓ سے محبت رکھی اس نے مجھ سے محبت رکھی۔ اللہ جل شانہ نے اہل عرفہ پر عموماً اور حضرت عمرؓ پر خصوصاً فخر کیا ہے، جتنے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں ان سب کی امت میں ایک محدث ہوا ہے۔ اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمرؓ ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! محدث کون ہوتا ہے؟ فرمایا "جس کی زبان سے ملائکہ گفتگو کریں"[3]۔"

خود حضرت عمر فاروقؓ کی سرور دو جہاں سے محبت کا کیا عالم تھا؟ اس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن ہشام کی اس روایت سے کیا جاسکتا ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ حضرت عمرؓ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے ہر چیز سے محبوب ہیں سوائے میری اپنی جان کے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا "نہیں! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے (ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا) جب تک میں تمہیں تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "واللہ اب آپ مجھے اپنی جان سے زیادہ محبوب ہیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا "اے عمر اب بات ہوئی"[4]۔ "عہد رسالت میں فاروق اعظمؓ کی اجتہادی بصیرت کی تربیت و فروغ میں مختلف عوامل نے حصہ لیا۔ اس میں سب سے اہم کردار اس فکری، قلبی اور جذباتی تعلق کا ہے جو انہیں رسالت مآب ﷺ سے تھا۔ پھر اس رفاقت کا بھی گہرا دخل ہے جو قدم قدم پر انہیں میسر رہا۔ پھر آنحضور ﷺ کی شاگردی کا براہ راست جو موقع انہیں ملا اس کا بھی اثر ہوا۔ کئی مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی ترجمانی کے فرائض بھی انہوں نے سرانجام دیئے جس سے ان کی فراست کو مہمیز اور استحکام ملا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مشیر رسالت ہونے کی حیثیت سے مختلف قسم کے مسائل میں وہ عملاً شریک مشورہ رہے۔ اس سے ان کی خاطر خواہ فکری تربیت ہوئی۔ ان کا شعور اور سوچنے سمجھنے کا انداز اسلام کے زاویہ نگاہ اور مزاج کے سانچوں میں ڈھلتا چلا گیا اور پھر اطاعت رسول ﷺ کے ولولے نے ان کے قلب و ذہن کو بصیرت نبوی کی روشنی سے منور کر دیا۔ یہ ہیں وہ عوامل جنہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت کی تربیت کی۔ ان کا محور و مرکز تعلق بالرسول ہے۔ اسی تعلق نے آپ کی بصیرت کو ایک خاص سطح سے بلند کر کے مقام عروج تک پہنچا دیا۔ آپ نے سرچشمہ نبوت سے جو نور فیض حاصل کیا اس کی کرنوں سے زندگی کے ہر شعبے کو اجالنے کیلئے آخری سانسوں تک سرگرم عمل رہے۔ تعلق بالرسول نے آپ کی شخصیت کی تعمیر اور اجتہادی بصیرت کے ارتقاء میں جو کردار سرانجام دیا ہم اس کا تجزیہ کرنے کیلئے اس بحث کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

---

(۱) ترمذی، ۵/ ۲۸۱، تبریزی II ۶۲۴، منقی ۱۱/ ۵۷۷ (۲) مسند ۲/ ۱۲۵، تبریزی II ۶۴/۴ (۳) سیوطی ۱/ ۱۹۴، بخاری ۲/ ۴۰۷، مسلم ۶/ ۹۱، ترمذی ۵/ ۲۸۵، حبان ۹/ ۲۱ (۴) طنطاوی ۵۸۹

٥...... مخلص رفیق:

حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت کی تربیت میں اس رفاقت کا بڑا حصہ ہے جو رسول اکرم ﷺ کے ساتھ انہیں میسر رہی۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ آدمی ہمہ وقت جس کے ساتھ رہے اس کے افکار و عقائد' اخلاق و کردار اور ذوق و مزاج کا اثر قبول کرتا ہے اور پھر ہر رفاقت میں کوئی وجہ مشترک ہوتی ہے۔ جس نوعیت کی وجہ ہوگی' رفاقت کی نوعیت بھی ویسی ہی ہوگی اور اس کے اثرات بھی اسی طرح کے مرتب ہوں گے۔ سب سے زیادہ بے لوث' مضبوط اور پائیدار رفاقت وہ ہوتی ہے جو نظریے اور عقیدے پر استوار ہو' مقصد زندگی اور نصب العین کی وحدت ہم رکاب کرنے کا ذریعہ بن جائے اور رب کائنات کی پہچان اور رضا کی طلب حرز جاں قرار پائے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ظاہری اور باطنی' ہر طرح کی یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم اس کو اللہ کا رنگ قرار دیتا ہے۔ "**صبغة الله و من احسن من الله صبغة و نحن له عبدون**[۱]۔" ("کہو' اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا ہم اس کی ہی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔)

رسول اکرم ﷺ نے ایسے ہی ساتھیوں اور رفیقوں کے ذریعے ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کیا اور دین حق کو تمام باطل ادیان پر غالب کر دیا۔ قرآن حکیم میں ان کی صفات کا تذکرہ کچھ یوں کیا گیا ہے "**محمد رسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم تراهم ركعا سجدا يبتغون فضلا من الله و رضوانا سيماهم في وجوههم من اثر السجود**[۲]۔" (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔)

اس آیت کریمہ میں جن رفقائے رسالت کا ذکر کیا گیا ہے حضرت عمر فاروقؓ ان میں بہت نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ یہ ساری صفت اور نشانیاں ان میں بدرجہ کمال موجود تھیں' جو اس میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ آنحضور ﷺ کی رفاقت نے ان پر وہی رنگ چڑھا دیا جو ان کا اپنا رنگ تھا۔ حقیقت میں جو اللہ کا رنگ تھا...... اور ان کے اندر وہی صفات پیدا کیں جن سے وہ خود متصف تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد رفقائے خاص میں ان کا ہی نام آتا ہے۔ اکثر واقعات میں آنحضور ﷺ کے ساتھ آپ کے دونوں ساتھیوں کا ذکر اکٹھے آیا ہے اور صحابہ کرامؓ کے فضائل میں انہیں جو فوقیت حاصل ہے اس کی وجہ یہی رفاقت ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ایک موقع پر انہیں اپنے کان اور آنکھیں قرار دیا۔ حضرت عبد اللہ بن منطب کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ ظاہر ہوئے' آپؐ نے ان پر نظر ڈالی اور فرمایا "**هذان السمع والبصر**[۳]۔" ایک اور مرتبہ انہیں زمین پر اپنا وزیر قرار دیا۔ حضرت سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "ہر نبی کیلئے دو وزیر آسمان والوں میں سے ہوتے ہیں اور دو وزیر زمین والوں میں سے' سو میرے آسمان والے وزیر جبرائیل اور میکائیل ہیں اور زمین والے وزیر ابو بکرؓ و عمرؓ ہیں[۴]۔"

حضرت عبد العزیزؒ بن المطلب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے اہل آسمان میں سے جبرائیل اور میکائیل اور اہل زمین میں سے ابو بکرؓ و عمرؓ کے ذریعے میری نصرت فرمائی ہے باقی لوگ ان کے بعد آتے ہیں[۵]۔" وزیر صحیح معنوں میں وہی ہو سکتے ہیں جو معاون و مددگار' ہمدم اور غمخوار ہونے کے ساتھ ساتھ فہم و فراست کے حامل بھی ہوں کہ بہترین مشورے دے سکیں اور اپنے قائد کی مرضی و منشاء کو اس کی صحیح روح کے ساتھ نافذ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہوں' یہ دونوں صفات ان میں موجود تھیں۔ وحیہ بن خلیفہ کہتے ہیں "رسول اللہ ﷺ نے اپنا نامہ مبارک میرے حوالے کر کے مجھے

(۱) سورۃ البقرہ ۲: ۱۳۸ (۲) سورۃ الفتح ۴۸: ۲۹ (۳) ترمذی ۵: ۲۷۰ حدیث ۳۶۷۱ (۴) ترمذی ۵: ۲۷۸ حدیث ۳۶۸۰ (۵) [illegible]

قیصر روم کے پاس روانہ کیا۔ میں نے بادشاہ روم کو پیغمبر ﷺ کا نامہ مقدس دیا۔ بادشاہ نے مہر نبوت کو جو نامہ پر ثبت تھا بوسہ دیا اور خط کو مسند کے نیچے رکھ دیا اور پھر اپنے مذہبی سرداروں اور اہل قوم کو بلایا۔ سب جمع ہو گئے تو بقول سیر پیغمبر و حیہ کے "بادشاہ نے اپنے سجادہ شاہی پر کھڑے ہو کر (کسی منبر یا پلیٹ فارم پر نہیں) قوم کو مخاطب کیا اور نامہ کا یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ یہ اسماعیل بن ابراہیم کی نسل کے اس پیغمبر کا خط ہے جس کی آمد کی اطلاع ہمیں مسیح علیہ السلام نے دی تھی۔" بادشاہ نے کہا "ہمیں تمہاری عیسائیت اور نصرانیت کا بھی حال معلوم ہے۔ دوسرے دن مجھے طلب کیا اور مجھے ایک بڑے محل میں لے گیا۔ یہ محل ایک تصویر خانہ تھا تین سو تیرہ تصاویر سے مزین یہ سب تصاویر انبیاء اور مرسلین کی تصاویر تھیں۔" بادشاہ نے مجھ سے کہا "ان تصاویر میں اپنے صاحب (مراد نبی علیہ السلام) کی تصویر تلاش کرو۔ مجھے تصویر کی نشاندہی میں کوئی دقت نہ پیش آئی۔ حضور انور ﷺ کی ایک تصویر آویزاں تھی جیسے وہ کسی شے کو دیکھ رہے ہوں۔"

بادشاہ بولا "تم نے ٹھیک کہا۔" پھر پوچھا

"یہ دائیں جانب کون ہے؟" میں نے کہا:

"یہ پیغمبر ہی کی قوم کا ایک شخص ہے جسے لوگ ابو بکر صدیقؓ کے نام سے پکارتے ہیں۔ پھر پوچھا اور یہ بائیں جانب کس کی تصویر ہے؟"

میں نے کہا "یہ بھی پیغمبر کا ہم قبیلہ ایک شخص ہے۔ قوم اسے عمر بن الخطابؓ کے نام سے پکارتی ہے۔"

بادشاہ نے کہا "ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دین کو نبی کے ان دو ساتھیوں کے ذریعہ مکمل کرے گا۔ یعنی ان کے ذریعہ اس دین کا پورے طور پر نفاذ ہوگا۔ واپسی پر میں نے نبی علیہ السلام سے یہ سب عرض کیا تو فرمایا "صدق بابی بکر و عمر یتم اللہ ھذا الدین ویفتح[۱]۔ بادشاہ نے سچ کہا۔ ابو بکرؓ اور عمرؓ کے ذریعہ سے اس دین کی تکمیل اور کشائش ہوگی۔ بعد کی تاریخ نے اس پیش گوئی کو حرف بحرف ثابت کر دکھایا۔ آپؐ کے ان رفیقوں کی بدولت دین کی حفاظت بھی ہوئی اس کا مکمل نفاذ بھی اسے فروغ بھی ملا اور استحکام بھی۔

رسول اکرم ﷺ کو اپنے دونوں ساتھیوں کی دینی و اجتہادی بصیرت اور راست روی پر اس قدر اعتماد تھا کہ ابی قتادہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "ان یطع الناس ابا بکر و عمر فقد ارشد وا[۲]۔" (اگر لوگ ابو بکرؓ اور عمرؓ کی اطاعت کرتے رہیں گے تو ہدایت پر رہیں گے۔) ایک اور مرتبہ سرور دو جہاں ﷺ نے ان دونوں کی اطاعت کا باقاعدہ حکم دیا۔ یہ آپ کی زندگی کے آخری دنوں کی بات ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "انی لا ادری ما قدر بقائی فیکم' فاقتدوا باللذین من بعدی' وارشد الی ابوبکر و عمر[۳]۔" (مجھے معلوم نہیں کہ تم لوگوں میں میرا کس قدر رہنا ہوگا لہٰذا تم ان دونوں کی پیروی کرنا جو میرے بعد ہوں گے' آپؐ نے ابو بکرؓ و عمرؓ کی طرف اشارہ کیا۔)

ان احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرور دو جہاں ﷺ نے ان دونوں بزرگوں کو خصوصی طور پر اپنی رفاقت میں رکھا۔ آپ ان کی خداداد صلاحیتوں سے آگاہ تھے۔ اس لئے ان کو اپنی توجہ کا خصوصی محور بنایا۔ ان کی تربیت کی اور ان کے جوہروں کو نکھارا اور اس قابل بنایا کہ آپ کی وفات کے بعد امت مسلمہ کی ذمہ داریوں کو سنبھال کر خلافت علیٰ منہاج النبوت کی بنیاد رکھیں۔ اسی رفاقت کی بدولت تاریخ میں "شیخین" کے لقب سے نوازے گئے۔ قبول اسلام کے بعد قدم قدم ساتھ رہے' کوئی اہم واقعہ ایسا نہیں تھا جس میں یہ دونوں مقدس ہستیاں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ ہوں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ عام طور پر دائیں جانب اور حضرت عمر فاروقؓ بائیں جانب ہوتے تھے۔ یہ رفاقت قبر کی آغوش میں پہنچنے کے بعد بھی قائم ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی یہ رفاقت نہ تو رشتہ داری کی بناء پر تھی اور

---

(۱) حوری [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible]

نہ ہی مجبوری وضرورت کی بناء پر اس کی نوعیت نہ تو کاروباری قسم کی تھی اور نہ ہی محض جماعتی وتنظیمی بلکہ قلب ودماغ کی مکمل ہم آہنگی کی اساس پر استوار تھی اور اس کے پیچھے الفت ومحبت کے لازوال جذبات موجزن تھے۔ دیگر سارے تعلقات اسی کا نتیجہ تھے۔ عمرؓ کو صرف حبیب سے نہیں بلکہ دیار حبیب سے بھی انس تھا۔ آپ کی بیٹی حضرت حفصہؓ اور آپ کے خادم حضرت اسلمؓ سے روایت ہے کہ آپ نے دعا فرمائی "**اللهم ارزقنى شهادة فى سبيلك واجعل موتى فى بلا رسولك** ﷺ[1]۔" (اے میرے مولیٰ مجھے اپنے راستے میں شہادت عطا فرما اور میری موت اپنے رسول ﷺ کے شہر میں مقدر فرما۔) آپ کی موت کا وقت قریب آیا تو آپ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دفن ہوں۔ اس مقصد کیلئے حضرت عائشہؓ کی طرف اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کو بھیجا' جب انہوں نے واپس آکر اطلاع دی کہ انہوں نے اجازت دے دی ہے تو فرمایا "**ماكان شىء اهم الى من ذلك المضجع**[2]۔" (اس خواب گاہ سے زیادہ اہم میرے نزدیک کوئی چیز نہ تھی۔) ان کی خوش نصیبی اس سے بڑی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آخرت میں بھی یہ ساتھ برقرار رہے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن نکلے اور مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ میں سے ایک داہنی طرف تھے اور ایک بائیں طرف' آپ دونوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "**هكذا نبعث يوم القيامة**[3]۔" (ہم تینوں قیامت کے روز اسی طرح اٹھائے جائیں گے۔)

یہ رفاقت صحابہ کرامؓ میں معروف ومشہور تھی سب اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ابن ابی ملیکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں سے تھا جو (وفات کے بعد) حضرت عمرؓ کیلئے مغفرت کی دعا کر رہے تھے ان کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک شخص نے پیچھے سے اپنی کہنی میرے کندھے پر رکھی اور کہنے لگا۔ اللہ تم پر رحم کرے۔ مجھے یہی امید تھی کہ اللہ تمہیں تمہارے دونوں ساتھیوں کے ساتھ رکھے گا کیونکہ میں اکثر نبی کریم ﷺ سے سنا کرتا تھا کہ فلاں جگہ میں اور ابو بکر و عمر تھے۔ میں نے یہ کیا اور ابو بکرؓ و عمرؓ نے بھی کیا۔ میں گیا اور ابو بکرؓ و عمرؓ بھی گئے (گویا ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے) اس لئے میں امید کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان دونوں کے ساتھ رکھے گا۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے جو پلٹ کر دیکھا تو کہنے والے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے[4]۔ یہ بات بھی لوگوں سے پوشیدہ نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے دونوں رفیقوں سے بے حد محبت کرتے ہیں یہ متعدد روایات سے ثابت ہے۔ عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ کے اصحاب میں سے کون آپ کو زیادہ محبوب تھے؟ جواب دیا حضرت ابو بکرؓ۔ میں نے پوچھا پھر کون؟ انہوں نے جواب دیا حضرت عمرؓ۔ میں پوچھا پھر کون؟ فرمایا ابو عبیدہؓ بن الجراح۔ میں نے پوچھا پھر کون؟ اس پر حضرت عائشہ چپ ہو گئیں[5]۔ صرف یہی نہیں کہ آپ ان سے خود محبت کرتے تھے' بلکہ ان سے محبت کو ایمان ونفاق کی پہچان قرار دیا۔ ابو سفیانؓ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی محترم نے فرمایا "**لا يحب ابوبكر و عمر منافق ولا يبغضهما مومن**[6]۔" (منافق ابو بکر و عمر سے محبت نہیں کر سکتا اور مومن ان دونوں سے کینہ وبغض نہیں رکھ سکتا۔)

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ ان سے گہری محبت وعقیدت رکھتے تھے اور ان کے احترام واکرام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔ یہ سب کچھ محض ان کے ذاتی اوصاف کی بنا پر نہیں تھا' بلکہ اس میں اس رفاقت کا بھی بڑا حصہ تھا۔ حضرت علیؓ نے عہد خلافت میں بعض روافض وغالیوں نے ان دونوں اصحاب رسالت کی تنقیص کرنا شروع کر دی۔ جب ان کو اس بات کا علم ہوا تو ان کا ردعمل ہماری اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ یزید بن وہب کا بیان ہے "سوید بن غفلہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ سے ملنے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علیؓ امیر المومنین تھے۔" سوید نے عرض کیا "امیر المومنین میں بعض لوگوں سے ملا ہوں جو ابو بکرؓ و عمرؓ کو ان کے

---

(۱) بخاری ۲: ۲۲۵، مسند ۱: ۴۶۱، سعد ۳: ۲۳۱، کنز ۱۱/ ۱۲۷/۷ (۲) سعد ۳/ ۳۳۸ (۳) ترمذی ۵: ۲۷۴ (۴) بخاری ۴: ۱۹۷ (۵) ترمذی ۵: ۲۸۱

(۶) مجمع ۹: ۵۳

درجے سے گرانے کی کوشش کرتے ہیں اوران کی عظیم خدمات کا استخفاف کرتے ہیں۔" شیر خدا غضبناک ہوگئے اوراپی مٹھیاں بھینچے ہوئے منبر خطاب پر جلوہ افروز ہوئے اور پھر مرتضوی خطابت کاشہکار ملاحظہ ہو "اس ذات کی قسم جو دانے کو اگاتا اور مخلوق کو پالتا ہے۔ ان دونوں سے وہی محبت کرے گا جو مومن اور صاحب فضیلت ہوگا۔ ان سے بغض وعناد رکھنا شقاوت اور گمراہی ہے۔ محبت شیخین باعث تقرب الٰہی اور ان سے عناد ضلالت کا سبب ہے۔ آخر لوگوں کو ہو کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ان بھائیوں وزیروں اور دوستوں سرداران قریش و پدران امت کا یوں (بہ بدی) ذکر کرتے ہیں۔ ابو بکرؓ اور عمرؓ کے نام برائی سے لینے والوں سے میں بری ہوتا ہوں۔ ایسے بدگو کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا[1]۔"

صحابہ کرامؓ ان دونوں کی محبت کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا لازمی حصہ اور ذریعہ نجات خیال کرتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے پوچھا تو نے قیامت کیلئے تیاری کی ہے؟ کچھ نہیں بس اتنی بات ہے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "انت مع من احببت" (پس تو قیامت کے دن اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔) حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ یہ حدیث سن کر جتنا خوش ہوئے اتنا کسی اور شے پر خوش نہیں ہوئے۔ پھر کہتے ہیں کہ میں حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ سے محبت رکھتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس محبت کی وجہ سے میں ان کے ساتھ ہوں گا اگرچہ میں ان جیسے عمل نہ کر سکا[2]۔ اکابرین کے ہاں ان کی عزت حب رسول کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص ابو بکرؓ و عمرؓ کی تنقیص کرتا ہے وہ رسول خدا ﷺ سے محبت رکھتا ہے[3]۔

اس رفاقت ہی کی برکت سے بارہا ایسا ہوا کہ جب رب ذوالجلال کی طرف سے پیغمبر برحق ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو اپنی آنکھوں سے حضرت عمرؓ نے کیفیت کا مشاہدہ کیا اور نازل ہونے والے احکام اور ان کے موقع و محل اور سیاق و سباق سے واقف ہوئے اس سے ان کی قرآن فہمی میں اضافہ ہوا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ پر جب وحی اترتی تھی تو آپؐ کے منہ کے پاس شہد کی مکھیوں کی سی گنگناہٹ سنی جاتی تھی۔ ایک دن ان پر وحی نازل ہوئی تو ہم گھڑی بھر کیلئے ٹھہر گئے۔ انہوں نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور اپنے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی "اے اللہ ہمیں زیادہ دینا اور کم مت کرنا ہمیں عزت دینا ذلیل مت کرنا ہم پر عنایت کر محروم مت کرنا۔ ہمیں اوروں پر مقدم کر ہم پر کسی اور کو مقدم مت کرنا ہمیں راضی کر اور ہم پر راضی ہو۔ پھر آپؐ نے (ہماری طرف متوجہ ہو کر) فرمایا مجھ پر دس آیات نازل ہوئی ہیں جو ان پر عمل کرتا رہے گا وہ جنت میں داخل ہوگا پھر آپؐ نے تلاوت فرمائی (قد افلح المومنون[4] دس آیت تک[5]۔) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت یعلی بن امیہ کو ان کی خواہش پر نزول وحی کے دوران کیفیت نبوی ﷺ کا مشاہدہ کرایا[6]۔

ایک مرتبہ حضرت جبرئیل امین رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں تشریف لائے تو حضرت عمرؓ ان خوش نصیبوں میں سے تھے جنہیں ان کے دیدار کا شرف بھی حاصل ہوا اور ان سے دین کو براہ راست سیکھنے اور سمجھنے کا بھی موقع ملا اس سے آپ کی بصیرت و فراست میں اساسیات دین کا شعور رچ بس گیا۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے (اسی حدیث کی ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مجلس مبارک میں صحابہ کا ایک مجمع تھا اور حضرت ان سے خطاب فرما رہے تھے۔ (فتح) کہ اچانک ایک شخص سامنے سے نمودار ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال بہت ہی زیادہ سیاہ تھے اور اس شخص پر سفر کا کوئی اثر بھی معلوم نہیں ہوتا تھا (جس سے خیال ہوتا تھا کہ یہ کوئی بیرونی شخص نہیں ہے) اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی تھی کہ ہم میں سے کوئی اس نووارد کو پہچانتا نہ تھا (جس سے خیال ہوتا تھا کہ یہ کوئی باہر کا آدمی ہے) تو یہ شخص حاضرین کے حلقہ میں سے گزرتا ہوا آیا۔

---

(١) جوزی ا:٢٢ (٢) بخاری ٤ ٢ (٣) ترمذی ٥/٢٨١ (٤) سورہ المومنون ٢٣/١-١٠ (٥) حنبل ٢٥٦/١ ترمذی ٥/٨ (٦) مسلم ٤/٤ نسائی ٥/١٣٠

یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آ کر دوزانو اس طرح بیٹھ گیا کہ اپنے گھٹنے آنحضرت ﷺ کے گھٹنوں سے ملا دیئے اور اپنے ہاتھ حضور کی رانوں پر رکھ دیئے اور کہا "اے محمد ﷺ! مجھے بتلایئے کہ "اسلام" کیا ہے؟" آپؐ نے فرمایا "اسلام" یہ ہے (یعنی اس کے ارکان یہ ہیں کہ دل و زبان سے) تم یہ شہادت ادا کرو کہ "اللہ" کے سوا کوئی "الہٰ" (کوئی ذات عبادت و بندگی کے لائق) نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور ماہ رمضان کے روزے رکھو اور اگر حج بیت اللہ کی تم استطاعت رکھتے ہو تو حج کرو۔ اس نووارد سائل نے آپ کا یہ جواب سن کر کہا "آپ نے سچ کہا۔" راوی حدیث حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم کو اس پر تعجب ہوا کہ یہ شخص پوچھتا بھی ہے اور پھر خود تصدیق و تصویب بھی کرتا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس شخص نے عرض کیا اب مجھے بتلایئے کہ "ایمان" کیا ہے؟" آپؐ نے فرمایا "ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخر یعنی روز قیامت کو حق جانو اور حق مانو اور ہر خیر و شر کی تقدیر کو بھی حق جانو اور حق مانو (یہ سن کر بھی) اس نے کہا "آپ نے سچ کہا۔" اس کے بعد اس شخص نے عرض کیا مجھے بتلایئے کہ احسان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت و بندگی تم اس طرح کرو گویا وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔" پھر اس شخص نے عرض کیا مجھے قیامت کی بابت بتلایئے؟ وہ کب واقع ہو گی؟ آپؐ نے فرمایا کہ "جس سے یہ سوال کیا جارہا ہے وہ اس کو سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔" پھر اس نے کہا تو مجھے اس کی کچھ نشانیاں ہی بتلایئے؟ آپؐ نے فرمایا "(اس کی ایک نشانی تو یہ ہے کہ) لونڈی اپنی مالکہ اور آقا کو جنے گی اور دوسری نشانی یہ ہے کہ) تم دیکھو گے کہ جن کے پاؤں میں جوتا اور تن پر کپڑا نہیں ہے اور جو تہی دست اور بکریاں چرانے والے ہیں وہ بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں گے اور اس میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کریں گے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ باتیں کر کے یہ نووارد شخص چلا گیا۔ پھر مجھے کچھ عرصہ گزر گیا تو حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا "اے عمرؓ کیا تمہیں پتہ ہے کہ سوال کرنے والا شخص کون تھا؟" میں نے عرض کیا "اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جاننے والے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "وہ جبرئیل تھے، تمہاری اس مجلس میں اس لئے آئے تھے کہ تم لوگوں کو تمہارا دین سکھا دیں (۱)۔"

رسول خدا ﷺ کی رفاقت انہیں ہر دنیوی مفاد سے زیادہ عزیز تھی۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک مرتبہ جمعہ کے دن کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے کہ اتنے میں ایک تجارتی قافلہ مدینے میں داخل ہوا۔ سو آنحضور ﷺ کے اصحاب اس کی طرف دوڑ پڑے، یہاں تک کہ پیچھے آپ کے صرف بارہ آدمی رہ گئے ان میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی تھے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی (۲)۔ "واذا راوا تجارۃ او لھوا انفضوا الیھا و ترکوک قائما قل ما عنداللہ خیر من اللھو و من التجارۃ واللہ خیر الرازقین (۳)۔" (اور جب انہوں نے تجارت اور کھیل تماشا دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تجھے کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔)

یہ ایک ایسی رفاقت تھی جو آزمائش کی ہر گھڑی میں قائم رہی اور دکھ سکھ کے ہر مرحلے سے سرخرو ہو کر منزل کی طرف رواں دواں رہی۔ مربی اعظمؐ نے کسی موقع پر بھی اپنے رفقاء کی تربیت کی ذمہ داری کو فراموش نہ کیا۔ اپنی فکر اور نظریے کے ذریعے ان کی شخصیتوں کو سنوارتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ عالم انسانیت کے سامنے اپنی ماہرانہ صلاحیت کے دو عظیم شاہکار پیش کر دیئے، جنہیں دیکھ کر دنیا عش عش کر رہی تھی۔ ان کی راہوں میں عقیدت و احترام کی نگاہیں بچھا دیں۔ نبی آخرالزماں ﷺ کے بعد ان کی سب سے زیادہ عزت کی اور سب سے بڑھ کر اطاعت۔ تربیت کا یہ عمل کس طرح جاری و ساری رہتا تھا؟ اس کی ایک جھلک حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک رات رسول اللہ ﷺ باہر نکلے، دیکھا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ بھی پھر رہے ہیں۔ ان سے دریافت فرمایا کہ "تم اس وقت کیوں نکلے ہو۔" انہوں نے جواب دیا "یا رسول اللہ ﷺ بھوک کے مارے نکلے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "اس رب کی قسم جس کے قبضے میں میری

---

(۱) مسلم ۳۶۱/۱ نسائی ۹۷/۸ حزم ۳۸/۱۲ (۲) جابر ۱۵/۸ ترمذی ۸۷/۵ (۳) سورۃ الجمعہ ۱۱:۶۲

جان ہے میں بھی اسی وجہ سے نکلا ہوں ، تو چلیں ۔" چنانچہ وہ آپ کے ساتھ چل دیئے اور ایک انصاری کے دروازے پر آئے وہ اپنے گھر پر نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے دیکھا تو کہا مرحبا اہلاً ۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ فلاں شخص کہاں ہے ؟ وہ بولی ہمارے لئے میٹھا پانی لینے گیا ہے ۔ اتنے میں وہ انصاری آگیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کو دیکھا تو پکار اٹھا کہ " خدا کا شکر ہے کہ آج کے دن کسی کے پاس ایسے عزت والے مہمان نہیں ہیں جیسے میرے پاس ہیں ۔" پھر وہ گیا اور کھجور کا ایک خوشہ لایا جس میں گدر اور سوکھی اور تازی کھجوریں تھیں اور کہنے لگا اس میں سے کھائیے ۔ پھر اس نے چھری لی آپ ؐ نے فرمایا " دودھ والی بکری مت کاٹنا ۔" اس نے ایک بکری ذبح کی اور سب نے اس کا گوشت کھایا اور کھجور بھی کھائی اور پانی بھی پیا ۔ جب کھانے سے سیر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے فرمایا **" والذی نفسی بیدہ لتسئلن عن ھذا النعیم یوم القیامۃ اخرجکم من بیوتکم الجوع ثم لم ترجعوا حتی اصابکم ھذا النعیم** [1] ۔" (قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم سے قیامت کے دن ان نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھا جائے گا ۔ تم اپنے گھروں سے بھوک کے مارے نکلے مگر اس وقت تک نہیں پلٹے جب تک کہ یہ نعمت تمہیں نہیں ملی ۔)

حدیث کے اس آخری حصے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ ہر ہر موقع پر اپنے ساتھیوں کی تربیت کرتے رہتے تھے ۔ اس لئے یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت کو پروان چڑھانے کا سہرا آپ ؐ ہی کے سر ہے ۔ کہاں عہد جاہلیت کا عمر اور کہاں عہد خلافت کا فاروق اعظمؓ ، تربیت نبوی نے مس خام کو کندن بنا دیا ۔ اس رفاقت کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا دائرہ نجی اور گھریلو معاملات تک وسیع تھا ۔ آپ رسول خدا ﷺ کی خدمت میں مناسب مشورے بھی پیش کرتے تھے جیسے ازواج مطہرات کو پردہ کرانے کا مشورہ [2] ۔ اس طرح واقعہ افک کے موقع پر آپ کا یہ اطمینان دلانا کہ الزام سراسر جھوٹا ہے ۔ اس سلسلے میں آپ نے انتہائی بصیرت افروز طریقہ اختیار کیا ۔ اس کی تفصیل میں جائے بغیر کہ واقعہ کیا ہوا ؟ کیوں ہوا ؟ کیسے ہوا ؟ آپ نے نہایت ادب سے عرض کیا " یا رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہؓ سے آپ کا نکاح کس نے کیا تھا ؟ " آپ ؐ نے فرمایا " اللہ تعالیٰ نے ۔" عرض کیا " حضور ﷺ ! کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ آپ کے رب نے آپ کو عیب دار چیز دی ہو گی [3] ؟" آپ نے اس طرح اس واقعہ کی سچائی کے امکان کو ہی مسترد کر دیا اور تمام شکوک و شبہات اور بدگمانیوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ۔ ان کی بات میں اس قدر وزن تھا کہ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔ یہ رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کے ذہنی و قلبی اطمینان کیلئے کافی تھی ۔

نبی محترم ؐ کی خانگی زندگی میں جب کبھی کوئی الجھن پیدا ہوئی تو حضرت عمرؓ نے آگے بڑھ کر اسے سلجھانے میں بھرپور کردار سرانجام دیا ۔ ہجرت مدینہ کے بعد ابتدائی سالوں میں نبی اکرم ﷺ شدید مالی مشکلات سے دوچار تھے تو ازواج مطہرات نے فاقوں سے تنگ آ کر نان و نفقے کا مطالبہ کیا تو آپ کو پریشانی لاحق ہوئی ۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ ؐ کے گھر پہنچے ۔ آپ ؐ اپنی بیویوں کے درمیان خاموش اور غمگین بیٹھے ہوئے تھے ۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دل میں سوچا کہ میں ایسی بات کہوں جس سے نبی ﷺ کو ہنسا دوں چنانچہ عرض کیا " یا رسول اللہ ﷺ ! کاش آپ خارجہ کی بیٹی کو دیکھتے (حضرت عمرؓ کی بیوی) کہ اس نے مجھ سے خرچ مانگا تو میں اس کے پاس کھڑا ہو کر اس کا گلا گھونٹنے لگا ۔" یہ سن کر حضور ﷺ ہنس دیئے اور فرمایا " یہ سب بھی جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو میرے گرد جمع ہیں اور خرچ مانگ رہی ہیں ۔" تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور اپنی بیٹی حضرت عائشہؓ کا گلا گھونٹنے لگے اور حضرت عمرؓ اٹھے اور اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کا گلا گھونٹنے لگے ۔ دونوں یہ کہہ رہے تھے کہ تم رسول اللہ ﷺ سے وہ چیز مانگتی ہو جو ان کے پاس نہیں ہے ۔ وہ کہنے لگیں خدا کی قسم ہم اب بھی آپ سے ایسی

(۱) مسلم ۱۱۶ (۲) بخاری ۹ ، ۱۴۹ ، حنبل ۱ ، ۲۳۳ ، حیاۃ ۲۲/۹ ، طبری ۳۹/۲۲ (۳) سیوطی ۱۲۳ ۔

چیز نہ مانگیں گی جو آپ کے پاس نہیں ہے[1]۔" اس یقین دہانی کے بعد ہی انہوں نے انہیں چھوڑا۔

ایک اور مرتبہ ازواج مطہرات کی باہمی آویزش نے رسول اللہ ﷺ کی خانگی زندگی کو تلخ کر دیا۔ یہاں تک کہ آپؐ ان سے ترک تعلق کر کے ایک ماہ کیلئے بالا خانے میں پناہ گزیں ہو گئے[2]۔ حضرت عمرؓ کو جب اس شکر رنجی کا علم ہوا تو بے قرار ہو گئے اور ان میں سے ایک ایک کے پاس پہنچے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اپنی رشتے دار حضرت ام سلمہؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا "اے عمرؓ تم عجیب آدمی ہو ہر معاملے میں تم نے دخل دیا ہے یہاں تک کہ اب رسول اللہ ﷺ اور ان کی بیویوں کے بارے میں بھی دخل دینے چلے ہو[3]۔" یہ جواب سن کر ان کی ہمت ٹوٹ گئی اور خاموش ہو گئے اور سرگرمی بند کر دی۔

پھر ایک دن ان تک یہ افواہ پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے تو تڑپ اٹھے۔ یہ پریشانی حضرت حفصہؓ کے باپ ہونے کی حیثیت سے نہیں تھی بلکہ سرور کونین ﷺ کے رفیق و جانثار ہونے کی حیثیت سے تھی کہ جس تعلق کے سامنے دنیا کے تمام رشتے ان کے نزدیک ہیچ تھے صحیح صورتحال معلوم کرنے کیلئے خود خدمت نبوی میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔ حجرے کی چوکھٹ پر بیٹھے ہوئے خادم رباح سے بلند آواز میں کہا کہ میرے لئے حاضر ہونے کی اجازت طلب کرو۔ تین مرتبہ یہ بات کہی مگر اندر سے جواب نہ آیا تو بولے! میں گمان کرتا ہوں کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے خیال فرمایا ہے کہ میں حفصہؓ کیلئے آیا ہوں۔ خدا کی قسم اگر آپؐ مجھے حکم دیں تو میں اس کی گردن مار دوں۔ آنحضور ﷺ تک یہ آواز پہنچی تو انہوں نے اندر بلا لیا[4]۔

حضرت عمرؓ کا اپنا قول ہے کہ میں جب اندر داخل ہوا تو رسول اللہ ﷺ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں بیٹھ گیا تو آپ نے اپنی تہ بند اپنے اوپر کر لی۔ اس کے سوا آپؐ کے پاس کوئی اور کپڑا نہ تھا آپؐ کے بازو پر چٹائی کا نشان پڑ گیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کے خزانے میں ایک صاع کے قریب چند مٹھی بھر جو پڑے تھے اور سی کے مساوی سلم کے پتے حجرے کے ایک کونے میں پڑے تھے اور ایک کچا چمڑہ جس کی دباغت خوب نہیں ہوئی تھی لٹک رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ آپؐ نے پوچھا "اے ابن خطابؓ تجھے کس چیز نے اشکبار کیا ہے؟" میں نے کہا "اے اللہ کے نبی ﷺ میں کیوں نہ روؤں چٹائی کا اثر آپؐ کے بازوؤں پر ہے اور یہ ہے آپ کا خزانہ کہ جس میں چند جو کے علاوہ میں کچھ نہیں دیکھتا جبکہ قیصر و کسریٰ پھلوں اور نہروں میں زندگیاں بسر کر رہے ہیں حالانکہ آپؐ اللہ کے رسول اور برگزیدہ ہیں اور آپؐ کے خزانے کا یہ عالم ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **"الا ترضی ان تکون لنا الآخرہ ولھم الدنیا"** (کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ ہمارے لئے آخرت ہو اور ان کیلئے دنیا۔) میں نے کہا "کیوں نہیں (یعنی میں راضی ہوں(5)۔ پھر حضرت عمرؓ نے ازواج مطہرات کے مسئلے پر بات چیت کی معلوم ہوا کہ آپ نے طلاق نہیں دی تو مسجد نبوی کے دروازے پر آ کر اس کا اعلان کر دیا(6)۔"

اس روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حق رفاقت کو ذاتی و نجی معاملات تک نبھایا اور پھر یہ بھی بات سامنے آتی ہے کہ سرور کونین ﷺ نے بھی ان کی ذہنی و فکری تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ قیصر و کسریٰ کی پر عیش زندگی کے مقابلے میں آخرت کی کامیابی کے مقصد کو ان کے دل میں اس قدر اتار دیا کہ مرتے دم تک پھر کبھی اس کی خواہش نہ کی۔ قیصر و کسریٰ کے وسائل ان کے قدموں کے سامنے ڈھیر کئے گئے تو ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں[7] سادہ غذا اور پھٹے پرانے کپڑوں میں عمر گزار دی[8] اور حکومت کے ایوانوں کو سادگی کی درخشندہ روایات کا نمونہ بنا دیا۔ نبی محترم ﷺ سے رفاقت و تعلق کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ عہد جاہلیت کا وہ عمرؓ جو ان کا شدید ترین دشمن تھا جو انہیں ہمیشہ تنگ کرنے اور ختم کر دینے کے منصوبے بناتا رہتا تھا اب اس قدر جان نثار بن گیا کہ

---

(۱) مسلم ۴: ۱۸۷ (۲) بخاری ۳: ۱۰۶ مسلم ۴: ۱۹۱ نسائی ۶: ۱۶۶ (۳) بخاری ۶: ۶۹ مسلم ۴: ۱۹۱ (٤) مسلم ۴: ۱۸۸ (۵) بخاری ۶: ۷ مسلم ۴: ۱۸۹ حنبل ۱: ۳۵٤ ترمذی ۵: ۹۲ صفحہ ۱۳۸۹ (٦) مسلم ۴: ۱۸۹ (۷) سعد ۳: ۳۱۲ جوزی ۱۶٤ طبری ٤: ۳ (۸) سعد ۳: ۳۱۹ کبیر ۷: ۳٤

یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ آنحضور ﷺ کی شان میں کوئی گستاخی کرے ' انہیں کسی قسم کا کوئی رنج پہنچائے یا ان کے فیصلے پر کسی قسم کا اعتراض کرے یا ان کے مشن و تحریک کے آگے کسی قسم کی رکاوٹ بنے مگر یہ کہ اس کی گردن اڑا دیں۔ چنانچہ اسیران بدر میں سہیل بن عمرو بھی تھے جو قبل ازیں رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں سہیل بن عمرو کے سامنے کے دو دو دانت توڑ دوں کہ اس کی زبان لٹک جائے اور آپؐ کے خلاف کسی جگہ تقریر کرنے کیلئے بھی کھڑا نہ ہو سکے۔" رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا "نہیں میں اس کو مثلہ نہ کروں گا ورنہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی مثلہ کر دے گا اگرچہ میں نبی ہوں۔" اور فرمایا "مجھے امید ہے کہ وہ ایسے مقام پر کھڑا ہو گا کہ تم اس کی خدمت نہیں کر سکو گے[۱]۔"

اس طرح قیام مکہ کے دوران رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ کو تکلیفیں دینے والوں میں عمیر بن وہب بھی تھے۔ بدر میں ان کا بیٹا قید ہو گیا' اس کو چھڑانے کے بہانے آپ کو شہید کرنے کے ارادے سے تلوار کو زہر آلود کئے مدینے پہنچے۔ حضرت عمرؓ کی نگاہ پڑی تو کہا "واللہ یہ کتا اللہ کا دشمن کوئی بدی لئے بغیر نہیں آیا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے ہمارے درمیان جنگ کی آگ بھڑکائی اور یہی ہے وہ جس نے بدر کے روز ہماری تعداد کا تخمینہ قریش کو بتایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کی تلوار اس کی گردن ہی میں اس کے گریباں سے ملا کر پکڑی اور ساتھ جو انصار تھے ان سے کہا "اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس اندر لے چلو اور آپؐ کے پاس بٹھاؤ لیکن آپؐ سے متعلق اس خبیث سے احتیاط کرو کہ یہ بھروسے کے قابل نہیں۔ پھر اسے آپؐ کے پاس مسجد کے اندر لے گئے۔" آنحضور ﷺ نے فرمایا "اے عمرؓ اسے چھوڑ دو تو پھر چھوڑا۔" رسول اللہ ﷺ نے ان کے نیت و ارادے کا راز افشا کیا تو سن کر مسلمان ہو گئے کہ واقعی آپؐ اللہ کے رسول ہیں[۲]۔"

اسی طرح حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے ایک خط کے ذریعے اہل قریش کو یہ اطلاع روانہ کی کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ پر چڑھائی کا قصد فرمایا ہے۔ جب وہ خط رسول اکرم ﷺ نے برآمد کروایا تو حضرت حاطبؓ کو بلوایا' وہ آئے تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اجازت ہو تو میں اس شخص کی گردن اڑا دوں اس نے منافقت کی ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے عمرؓ! تمہیں کیا معلوم شاید اللہ تعالیٰ کی نظر لطف ان لوگوں پر ہو جو جنگ بدر میں موجود تھے کہ اس نے فرمایا ہے کہ "اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم" (جو تمہارا جی چاہے کرو میں نے تمہیں بخش دیا ہے[۳])۔ یہ جواب سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے اور کہا اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ جانتے ہیں[۴]۔

رسول خدا ﷺ سے حضرت عمرؓ کے خلوص و وفاداری اور دینی حمیت کی ایک اور مثال وہ واقعہ ہے کہ جب آنحضور ﷺ کے مکہ کی جانب قصد کی قریش کو اطلاع ملی' تو انہوں نے حضرت ابوسفیانؓ کو تجدید معاہدہ کیلئے روانہ کیا' تو مدینہ پہنچنے پر حضرت عباسؓ نے انہیں پناہ دی اور خچر پر اپنے پیچھے بٹھا کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جا رہے تھے تو حضرت عمرؓ نے دیکھ لیا۔ وہ نبی محترم ﷺ اور اسلام کے خلاف ان کی کارگزاریوں سے پوری طرح آگاہ تھے' ان سے ضبط نہ ہو سکا' پکار اٹھے "یہ تو دشمن خدا ابوسفیان ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جس نے بغیر کسی عہد و پیمان کے تجھ پر قدرت دی ہے۔" اس کے بعد دوڑ کر آنحضور ﷺ کے پاس جانے لگے وہ ان کے پہنچنے سے پہلے اندر داخل ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! یہ ابوسفیان ہے اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی عہد و پیمان کے اس پر قدرت دی ہے آپؐ مجھے اس کی گردن تلوار سے اڑانے کی اجازت دیجئے۔" لیکن آنحضور ﷺ نے اگلے روز انہیں حاضر کرنے کا حکم دیا' آخرکار وہ مسلمان ہو گئے[۵]۔

حضرت عمر فاروقؓ کیلئے یہ بات قابل برداشت نہیں تھی کہ کوئی شخص رسول اکرم ﷺ کے کسی فیصلے پر بد اعتمادی کا اظہار کرنے کی ہمت کرے۔ چنانچہ جنگ حنین کے موقع پر جب آپ مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے تو بنو تمیم کا ایک شخص جسے ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا اور آ کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آپؐ

---

(۱) ہشام ۲/ ۳۰۵ (۲) ہشام ۲/ ۳۱۷ (۳) ہشام ۴/ ۴۱، بخاری ۲۹۱:۱۲ (۴) بخاری ۴:۱۹/ ۱۹ (۵) ہشام ۴: ۴۴

اس وقت لوگوں کو مال غنیمت عطا فرما رہے تھے۔ اس نے کہا "اے محمد ﷺ! آج کے دن آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ میں نے دیکھ ہے۔" آپؐ نے فرمایا "ٹھیک ہے پھر کیا دیکھا؟" اس نے جواب دیا "لم ارك عدلت" "میں نے آپ کو عدل کرتا ہوا نہیں پایا۔"

عبداللہ بن عمرو ابن العاص نے بیان کیا کہ پھر رسول اللہ ﷺ کو غصہ آگیا۔ آپؐ نے فرمایا "تیرا برا ہو۔ جب عدل میرے پاس نہیں ہوگا تو کس کے پاس ہوگا؟" اس پر عمرؓ بول اٹھے "یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں اسے قتل نہ کر دوں؟" آپؐ نے فرمایا "نہیں اسے چھوڑ دو۔ عنقریب اس کی ایک جماعت ہوگی جو دین میں تعمق کیا کرے گی (دین کے معاملات میں بال کی کھال نکالا کرے گی) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ (تعمق فی الدین کرتے کرتے) دین سے اسی طرح نکل جایا کرے گی جیسے تیر کسی جسم میں لگ کر اور اس میں گھس کر نکل جاتا ہے۔ اس کے لوہے میں دیکھا جائے تو اس میں کوئی چیز نہ ملے۔ پھر خود تیر میں دیکھا جائے تو اس میں بھی کوئی چیز نظر نہ آئے پھر اس کے سوفار میں دیکھا جائے تو اس میں بھی کوئی چیز نہ پائی جائے۔ تیر لگا اور معدے کی غلاظت اور (جسم کے) خون سے صاف نکل گیا[1]۔"

ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ رسول اکرم ﷺ کے احکام اور عظیم مقصد کی راہ میں رکاوٹ بننے والے کسی شخص کو برداشت نہیں کر سکتے تھے خواہ وہ کوئی ہو' لیکن اس کے باوجود جلد بازی میں کبھی کوئی کام نہیں کرتے تھے ہمیشہ جماعتی نظام کی پابندی کرتے۔ اپنی طرف سے کوئی کارروائی کرنے کے بجائے حضور ﷺ سے اجازت طلب کرتے تاکہ کسی قسم کی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ ان کی دانش مندی و فراست کو ان کے جذبات و احساسات پر مکمل کنٹرول تھا بحیثیت رفیق رسالت' ان کی یہ خوبی بہت مثبت ٹھہرے اور دور رس اثرات کی حامل تھی چنانچہ خلیفہ بننے کے بعد آپ نے منبر رسول ﷺ پر کھڑے ہو کر جو خطبہ دیا' اس میں اللہ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا "لوگو! میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری شدت و سختی کا احساس ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غلام اور خادم کی حیثیت سے موجود تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ مومنوں کیلئے رؤف رحیم ہیں "بالمومنین رؤفا رحیما[2]۔" پس میں ان کے سامنے ایک بے نیام تلوار کی طرح تھا۔ الا یہ کہ وہ مجھے ڈھانپ لیتے کسی کام سے روک دیتے تو میں رک جاتا ورنہ میں لوگوں کیلئے ایک نرم گوشہ رکھنے والا آدمی ہوں[3]۔"

○ دانشمند مشیر:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عہد نبوی میں ایک اور حیثیت جس نے ان کی اجتہادی بصیرت کے پروان چڑھنے میں نہایت اہم کردار سرانجام دیا۔ وہ سرور کونین ﷺ کے مشیر ہونے کی حیثیت ہے نبی کریم ﷺ ہمیشہ انہیں اپنے ساتھ رکھتے۔ ان کا اپنا بیان ہے "رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے مختلف امور میں سے کسی امر کے بارے میں جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے باتیں کرتے تھے تو میں بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتا تھا[4]۔" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ "شاورهم فی الامر[5]۔" حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں نازل ہوئی[6]۔

اسلامی تحریک مظلومیت' کشمکش' سماجی مقاطعہ' ہجرت' جہاد و قتال' اندرونی مسائل' بیرونی خطرات' تعلیم و تربیت' تنظیم و استحکام اور بین الاقوامی امور جیسے

(۱) [illegible] ۱۳۹:۴ مسلم ۳:۹ [illegible] ۱۱۸:۷ [illegible] ۲۲۴:۳ (۲) سورہ التوبہ ۹:۱۲۸ (۳) حاکم ۱:۱۲۶ (۴) حنبل ۱:۲۳ ترمذی ۱:[illegible] (۵) سورہ آل عمران ۳:۱۵۹ (۶) سیوطی ۱:۴۹

مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ایک ہمہ گیر انقلاب کی طرف رواں دواں رہی۔ اس دوران بے شمار فکری' تہذیبی' تمدنی' سیاسی' معاشی' اخلاقی اور قانونی معاملات سے متعلق انفرادی واجتماعی مسائل سامنے آئے اور نبی ﷺ نے انہیں وحی الٰہی اور اپنی پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ حل فرمایا' لیکن آپ نے حکم نامے کی صورت میں پیش کرنے کے بجائے دین کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں مشاورتی طرز عمل اپنایا۔ تاکہ ایک طرف سیاسی وسماجی استحکام و وحدت کی بنیادی کڑی "مشاورت" کا طریق کار رواج پائے اور دوسری طرف صحابہ کرامؓ میں دین کی سمجھ اور عملی مسائل میں اس کے اطلاق کی صلاحیت پیدا ہو۔ حضرت عمر فاروقؓ کی یہ خوش نصیبی تھی کہ سرور دو جہاں ان پر بے پناہ اعتماد بھی کرتے اور انہیں ہر نئے مرحلے میں شریک مشورہ بھی رکھتے۔ اس طرح شریعت اسلامی کی روح و مزاج سے بھی واقف ہوتے چلے گئے اور احکام دین کی حکمتوں' مصلحتوں اور وسعتوں کے شناسا بھی' روزمرہ کے عملی مسائل کو روح اسلام کے مطابق حل کرنے کی انہیں تربیت بھی ملتی تھی اور مقاصد شریعت کا شعور بھی۔ بطور مجتہد آپ کا سرمایۂ افتخار یہی تھا اور عہد صدیقی اور دور خلافت میں آپ کی اس تربیت کے ثمرات سب کے سامنے آگئے۔ وہ تا ابد یوں ہی جگمگاتی رہیں گی اور منزل مقصود تک پہنچنے کا خواہشمند ہر قافلہ رہنمائی کیلئے ان کا محتاج رہے گا۔

آپ کے کثیر مشوروں کو بارگاہ رسالت میں شرف قبولیت حاصل ہوا۔ آپ کے صائب الرائے اور صحیح الفکر ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے' لیکن کچھ مشورے ایسے بھی ہیں جن پر نبی محترم ﷺ نے عمل نہ فرمایا' لیکن اس سے ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ وہ اخلاص سے لبریز تھے اور جن مقاصد کیلئے آپ نے پیش کئے وہ بھی شک وشبہ سے بالاتر تھے جن حالات کے پس منظر میں وہ دیئے گئے ان میں عمل کی گنجائش موجود تھی۔ سرور کونین ﷺ کا ان پر عمل نہ کرنا وسیع تر حکمت پر مبنی تھا' حضرت عمر فاروقؓ کی فکری تربیت میں ان کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ اس طرح انہیں اپنے خیالات کی مختلف زاویوں سے چھان پھٹک کرنے کا موقع ملا اور ان میں اپنی رائے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے اور اس سے رجوع کرلینے کی عادت پروان چڑھی۔ وہ اپنے مشیر ہونے کی حیثیت اور ذمہ داری کو سمجھتے تھے۔ مشیر کا کام یہ بھی ہے کہ وہ اپنی پرخلوص رائے کی امانت اپنے قائد کے سامنے پیش کردے۔ اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ اسی پر چھوڑ دے۔ اپنی رائے ہی کو خطا سے پاک اور حتمی سمجھنے کی غلطی نہ کرے۔ اسے اپنے قائد کی قوت فیصلہ اور حکمت ودانائی پر جتنا زیادہ اعتماد ہوگا' اتنا اچھا مشیر بن سکے گا۔ حضرت عمر فاروقؓ بطور مشیر انہیں اوصاف سے متصف تھے۔

ابن شہاب سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ منبر پر کھڑے ہوئے اور خطبے میں فرمایا "یاایها الناس ان الرای انما کان من رسول الله ﷺ مصیبا لان الله کان یریه وانما هو منا الظن والتکلیف[1]۔" (اے لوگو! بلاشبہ صحیح رائے تو صرف رسول اللہ ﷺ کی تھی کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ سمجھاتا تھا ہماری رائے تو محض گمان اور کاوش ومحنت ہے۔) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اقدس ﷺ کی خدمت میں جو مشورے دیئے' ان میں سے بعض کو تائید ایزدی بھی حاصل ہوئی مثلاً جنگ بدر کا فیصلہ' اسیران بدر کا معاملہ' عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ' مقام ابراہیم کو بطور نماز گاہ بنانے کا مشورہ' ازواج مطہرات کو پردہ کرنے کا مشورہ' استیذان' امتناع شراب وغیرہ ان سب کی تفصیل ہم موافقات میں بیان کرچکے ہیں ان سے آپ کی اجتہادی بصیرت اور الہامی طبیعت کے جواہر کھلتے چلے گئے۔ آنحضور ﷺ اور تمام مسلمانوں کے دلوں میں آپ کی فہم وفراست کا سکہ بیٹھ گیا۔ ہر نوعیت کے معاملات میں اس مشیر خاص کے مشوروں کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔ ان میں سیاسی' سماجی' معاشی اور تنظیمی ونظریاتی ہر طرح کے امور شامل ہیں۔ یہاں تک کہ دینی معاملات میں بھی حضرت عمر فاروقؓ کے مشورے سرور کونین ﷺ کے فیصلوں کی بنیاد بنے۔ ان میں سے ایک اہم مشورہ نماز باجماعت کیلئے لوگوں کو مسجد نبوی میں بلانے کا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا "جب

---

(۱) داود ۱۱۱/۳۔

مسلمان مدینے آئے تو ایک خاص وقت پر جماعت کیلئے جمع ہو جاتے' کوئی منادی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن صحابہؓ اس بارے میں گفتگو کرنے لگے 'بعضوں نے فرمایا "نصاریٰ جیسا ناقوس بنالو۔" بعض نے کہا "یہود جیسا نرسنگا بنالو۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "کسی شخص کو نماز کے اعلان کیلئے کیوں نہ کھڑا کر دو؟" آپ نے فرمایا "بلال، اٹھو نماز کیلئے پکارو[1]۔"

اس طرح حضرت عمرؓ نے عبادت کیلئے بلانے کے مروجہ طریقوں سے ہٹ کر مشورہ دیا۔ غیر مسلموں سے تشبیہ سے گریز کیا اور آپ ہی کے مشورے کو شرف قبولیت نصیب ہوا۔ کچھ عرصہ تک یہی طرح سلسلہ چلتا رہا پھر اللہ تعالیٰ نے ایک سچے خواب کے ذریعے دو صحابہ کرامؓ کو اذان کے وہ الفاظ سکھائے جو آج بھی ہمارے کانوں میں گونجتے ہیں اور قیامت تک انسانوں کو رب کائنات کی طرف بلاتے رہیں گے۔ ان خوش قسمت صحابہ کرامؓ میں ایک فاروق اعظمؓ بھی ہیں۔ عبداللہ بن زیدؓ بن عبدربہ نے بیان کیا ہے "جب رسول اللہ ﷺ نے ناقوس کو اعلان نماز کیلئے منتخب فرمایا' تو میں نے خواب میں ایک شخص کو ناقوس لئے دیکھا' میں نے کہا "اے بندہ خدا کیا ناقوس بیچتے ہو؟"

وہ بولا "کیا کرو گے؟"

میں نے کہا: "نماز کیلئے لوگوں کو بلائیں گے۔"

وہ بولا: "میں اس سے بہتر چیز کیوں نہ بتادوں۔"

میں نے کہا "ضرور۔"

وہ بولا: "چار مرتبہ اللہ اکبر کہنا.... آخر تک اذان۔"

جب صبح ہوئی تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو کچھ خواب میں دیکھا تھا بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا "یہ سچا خواب ہے' ان شاءاللہ' جاؤ بلال کو بتادو' وہ اذان دے گا کیونکہ اس کی آواز بہت بلند ہے۔" "میں بلالؓ کے پاس گیا اور انہی کلمات کی تلقین کی' تو انہوں نے اذان دی۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب اپنے گھر بیٹھے تھے کہ انہوں نے اذان کی آواز سنی تو چادر کشاں کشاں نکلے اور کہا "قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے' میں نے بھی بعینہ ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فللہ الحمد"[2]" (تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں۔) حضرت عمرؓ دین کے مقاصد اور اس کی وسیع تر حکمتوں کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ ان کے مشوروں سے یہی بات جھلکتی ہے کہ اس کی نمایاں مثال ہر کلمہ گو کو جنت کی بشارت دینے کے سلسلے میں ان کا مشورہ ہے' جسے آنحضور ﷺ نے قبول فرمایا۔ ایک طویل حدیث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کو مکمل طور پر اس لئے درج کیا جا رہا ہے کہ اس میں حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت و فراست کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک دن ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے اور آپ کے گرد و گرد بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی ہمارے ساتھ اس مجلس میں تھے کہ آنحضرت ﷺ ہمارے درمیان سے اٹھے اور کسی طرف کو نکل گئے اور پھر آپ کی واپسی میں بہت دیر ہو گئی' تو ہمیں ڈر ہوا کہ کہیں ہم سے علیحدہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے یعنی ہماری عدم موجودگی میں کسی دشمن وغیرہ سے آپ کو کوئی ایذا نہ پہنچ جائے۔ پس اس خیال سے ہمیں سخت گھبراہٹ اور فکر لاحق ہوئی اور ہم لوگ آپ کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے اور سب سے پہلے میں ہی گھبرا کر حضور ﷺ کی تلاش میں نکلا۔ یہاں تک کہ انصار کے

---

(۱) بخاری ۱/ ۱۵ مسلم ۲۰۲ (۲) ھشام ۲ ۱۵۵

خاندان بنی النجار کے ایک باغ پر پہنچ گیا جو چار دیواری سے گھرا ہوا تھا اور میں نے اس کے چاروں طرف چکر لگایا کہ اندر جانے کیلئے مجھے راستہ مل جائے' لیکن نہیں ملا۔ پھر مجھے پانی کی ایک گول (چھوٹی سی نہر) نظر پڑی' جو باہر کے ایک کنوئیں سے باغ کے اندر جاتی تھی (ابو ہریرہؓ کہتے ہیں) میں سمٹ اور سکڑ کر اس باغ کے اندر گھس گیا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس جا پہنچا۔ حضور نے فرمایا "ابو ہریرہؓ" "میں نے عرض کیا "ہاں یا رسول اللہ ﷺ میں ہی ہوں۔" آپؐ نے فرمایا "تم کیسے آئے؟" میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ آپ ہمارے درمیان تشریف رکھتے تھے پھر وہاں سے اٹھ کر چلے آئے اور جب دیر تک آپ کی واپسی نہیں ہوئی تو ہمیں خطرہ ہوا کہ مبادا ہم سے علیحدہ آپ کو کوئی ایذا پہنچائی جائے۔ اسی خطرے سے گھبرا کر ہم سب چل پڑے اور سب سے پہلے گھبرا کے میں ہی نکلا تھا یہاں تک کہ میں اس باغ تک پہنچا اور جب مجھے کوئی دروازہ کہیں ملا تو لومڑی کی طرح سمٹ سکڑ کے میں اس گول سوراخ میں سے کسی طرح گھس آیا ہوں اور دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے آ رہے ہیں۔" پھر حضور ﷺ نے اپنے نعلین مبارک مجھے عطا فرمائے اور ارشاد فرمایا کہ "میرے یہ جوتے لے کر جاؤ اور اس باغ سے نکل کے جو آدمی بھی تمہیں ایسا ملے جو دل کے پورے یقین کے ساتھ لاالٰہ الا اللہ کی شہادت دیتا ہو اس کو جنت کی خوشخبری سنا دو۔" (ابو ہریرہؓ کہتے ہیں میں وہاں سے چلا) تو سب سے پہلے میری ملاقات عمرؓ سے ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "ابو ہریرہؓ تمہارے ہاتھ میں یہ دو جوتیاں کیسی ہیں؟" میں نے کہا "یہ حضور (ﷺ) کی نعلین مبارک ہیں۔ حضور ﷺ نے مجھے دے کر بھیجا ہے کہ جو کوئی بھی دل سے لاالٰہ الا اللہ کی شہادت دینے والا مجھے ملے' میں اس کو جنت کی خوشخبری سنا دوں۔" (ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ) بس عمرؓ نے میرے سینے پر ایک ہاتھ مارا جس سے میں اپنی سرینوں کے بل پیچھے کو گر پڑا اور مجھ سے انہوں نے کہا "پیچھے کو لوٹو۔" میں روتا ہوا حضور ﷺ کے پاس واپس آیا اور عمرؓ بھی پیچھے پیچھے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے (مجھے اس حالت میں دیکھ کر) پوچھا "ابو ہریرہؓ تمہیں کیا ہوا؟" میں نے عرض کیا کہ "عمرؓ مجھے ملے تھے' حضور ﷺ نے مجھے جو پیغام دے کر بھیجا تھا میں نے وہ انہیں بتلایا تو انہوں نے میرے سینے پر ایک ایسی ضرب لگائی جس سے میں اپنی سرینوں کے بل گر پڑا اور مجھے کہا کہ "پیچھے لوٹو۔" رسول اللہ ﷺ نے عمرؓ کو خطاب کر کے فرمایا "عمرؓ تم نے ایسا کیوں کیا؟" انہوں نے عرض کیا "حضور ﷺ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ کیا آپؐ نے ابو ہریرہؓ کو اپنے نعلین مبارک دے کر اس لئے بھیجا تھا کہ جو کوئی بھی دل کے یقین کے ساتھ لاالٰہ الا اللہ کی شہادت دینے والا ان کو ملے وہ اس کو جنت کی بشارت دے دیں؟" حضور ﷺ نے فرمایا "ہاں! میں نے ہی یہ کہہ کر بھیجا تھا۔" عمرؓ نے عرض کیا "حضور ﷺ ایسا نہ کیجئے' مجھے خطرہ ہے کہ کہیں لوگ بس اس شہادت ہی پر بھروسہ کر کے سعی و عمل سے بے پرواہ ہو کے نہ بیٹھ جائیں' لہٰذا انہیں اسی طرح عمل کرنے دیجئے۔" حضور ﷺ نے فرمایا "تو جانے دو(1)۔" مولانا منظور نعمانی اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر لکھتے ہیں

"پس حدیث مندرجہ بالا کے بارے میں یہ بھی بہت زیادہ قرین قیاس ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ جس وقت بنی النجار کے اس باغ میں حضور ﷺ کے پاس پہنچے ہوں تو اس وقت آپؐ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں شئون رحمت اور تجلیات کرم کے مراقبے و مشاہدے میں مستغرق ہوں اور اسی حالت میں آپؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بطور نشانی اپنی نعلین مبارک عطا فرما کر ہر شاہد توحید کو جنت کی خوشخبری سنا دینے کا حکم دے دیا ہو' لیکن حضرت عمرؓ چونکہ اس پوری حقیقت کے راز اور ان احوال و کیفیات کے اتار چڑھاؤ سے باخبر تھے اس لئے انہوں نے حضور ﷺ سے براہ راست مراجعت و تحقیق تک حضرت ابو ہریرہؓ کو اس کے اعلان عام سے روکا ہو۔ دوسرے طور پر اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ پر اس وقت رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک کی اس خاص کیفیت (یعنی غلبہ رجا و رحمت) کا انکشاف منجانب اللہ ہو چکا تھا اور ان کو اپنے نور فراست سے اس بات کا یقین تھا کہ جب حضور ﷺ پر اس کیفیت کا غلبہ نہیں رہے گا اور اس کا دوسرا پہلو آپ کے سامنے رکھا

---

(1) مسند ' ٤٤ المکتب ' ٨ حجری 1 ٤

جائے گا تو خود آپ اس کو منع فرمادیں گے جیسا کہ ظہور میں آیا۔ اس طرح کے مواقع پر صحیح حقیقت کا ادراک و انکشاف حضرت عمرؓ کی امتیازی فضیلت ہے، جس کو حدیث نبوی ﷺ میں "مقام محدثیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس واقعہ میں حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ جو سختی کا معاملہ فرمایا اس کی صحیح نوعیت کو سمجھنے کیلئے حضرت عمرؓ کی اس امتیازی حیثیت کو پیش نظر رکھنا چاہئے جو صحابہ کرامؓ کی جماعت میں ان کو حاصل تھی یعنی وہ اور حضرت ابوبکرؓ بھی حضور ﷺ کے خاص شریک کار، محرم راز، مشیر خصوصی اور گویا آپ کے وزیر نائب تھے اور صحابہ کرامؓ عام طور سے ان کے اس امتیازی مقام کو پہچانتے تھے اور جس طرح ہر جماعت اور ہر خاندان کا بڑا اپنے چھوٹوں کو تنبیہ اور سرزنش کا حق رکھتا ہے، اسی طرح حضرت عمرؓ بھی یہ حق رکھتے تھے اور بسا اوقات حسب ضرورت اس حق کو آپ استعمال بھی فرماتے تھے[1]۔

اس حدیث سے ایک بات یہ سامنے آئی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ عام طور پر رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر رہتے تھے۔ اس طرح ہر موقع پر مشوروں میں شریک ہونے کا انہیں موقع ملتا۔ دوسری یہ کہ آنحضور ﷺ سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ آپ کی تلاش میں حضرت ابوہریرہؓ کے بعد قریب تر پہنچنے والے یہی تھے۔ تیسری بات یہ ہے کہ دینی معاملات میں ناگوار بات کو بہت جلد بھانپ جاتے اور اگر ان کے نزدیک وہ سنگین نوعیت کی ہوتی تو فوری اور شدید ردعمل کا اظہار کرتے کیونکہ یک زبردست قوت ارادی اور خود اعتمادی کے مالک تھے۔ چوتھا یہ کہ انہوں نے آنحضور ﷺ کو اپنی دانشمندانہ مشورہ بھرپور دلیل کے ساتھ دیا جس کی بنا پر آپؐ نے اس پر فوری طور پر عمل فرمایا۔ اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ بھی پیش آیا

ابوموسی اشعریؓ فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنی قوم کے چند افراد کے ساتھ حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تمہیں خوشخبری ہو اور جو لوگ تمہارے اس طرح ہیں ان کو بھی یہ خوشخبری سنادو کہ جو شخص صدق دل سے گواہی دے گا کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ وہ جنت میں جائے گا۔ ہم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سے یہ خوشخبری سنانے کیلئے نکلے تو سامنے سے عمر بن الخطابؓ آرہے تھے، وہ ہم کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پھر واپس لے گئے اور عرض کرنے لگے یارسول اللہ ﷺ لوگ تو اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ آپؐ نے کچھ نہ فرمایا اور خاموش ہو گئے[2]۔ دینی معاملات کی طرح سیاسی امور میں بھی حضرت عمر فاروقؓ کے مشورے قابل قبول ہوتے تھے۔ ان کی حقیقت پسندی اور سوجھ بوجھ سے آنحضور ﷺ ہمیشہ استفادہ فرماتے۔ چنانچہ ٦ھ میں جب رسول اللہ ﷺ عمرہ کی غرض سے اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو دفاعی ساز و سامان کو ساتھ لے جانا ضروری نہ سمجھا کیونکہ جنگ کرنے کا نہ تو کوئی ارادہ تھا اور نہ ہی بظاہر امکان یہاں تک کہ ذی الحلیفہ تک پہنچ گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ اسے قرین مصلحت نہیں سمجھتے تھے اس لئے پوری بے باکی سے عرض کیا "آپ دشمن کے علاقے میں بغیر اسلحہ اور دوسری ضروریات جنگ کے جا رہے ہیں یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔" رسول کرم ﷺ نے اس مشورے کو قبول فرمایا اور فوراً کسی کو مدینے بھیجا وہ وہاں سے جس قدر اسلحہ اور جانور تھے سب کو ساتھ لے آیا[3]۔

اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر ایک جھنڈا حضرت سعد بن عبادہؓ کے پاس تھا جب داخل ہونے لگے تو کہا "**اليوم يوم الملحمة اليوم تستحل الحرمة**" (آج کا دن جنگ یعنی زد و کشت کا دن ہے آج کعبۃ اللہ کی حرمت حلال سمجھی جائے گی۔) ایک مہاجر نے سن لیا بقول ابن ہشام وہ مہاجر حضرت عمرؓ تھے۔ انہوں نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ سعد بن عبادہؓ نے جو کہا ہے اسے آپ سنئے ہمیں ان سے قریش پر حملہ کرنے کے متعلق اطمینان نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے کہا "تم جاؤ ان سے جھنڈا لے لو اور خود اسے لے کر مکہ میں داخل ہو[4]۔

---

(١) [illegible] (٢) [illegible] (٣) [illegible] (٤) [illegible]

آنحضور ﷺ سیاسی معاملات میں حضرت عمر فاروقؓ کی بصیرت و تجربے سے فائدہ اٹھانے کیلئے انہیں ہمیشہ شریک مشورہ رکھتے۔ انہیں حالات سے بھی آگاہ فرماتے اور رائے لیتے۔ اس کی ایک اور مثال غزوہ حنین کا موقع ہے کہ مالک بن عوف کی قیادت میں ہوازن کے لوگوں نے بھرپور جنگ کا فیصلہ کر لیا۔ بنو ہوازن کی یہ خبریں رسول اللہ ﷺ کو ملیں تو آپؐ نے عبداللہ بن ابی حدرد اسلمیؓ کو روانہ کیا اور ہدایت کی کہ لوگوں کے اندر چلے جائیں اور اس وقت تک انہیں میں رہیں جب تک تمام حالات کا پورا علم نہ ہو جائے۔ پھر واپس آکر آگاہ کریں۔ عبداللہ بن حدردؓ روانہ ہو گئے اور اس وقت تک غیروں میں قیام پذیر رہے، جب تک انہوں نے ایک ایک بات نہ سن لی اور جنگ کے جو منصوبے تیار کئے گئے تھے ان کا پورا علم نہیں ہو گیا۔ عبداللہ بن حدردؓ نے بنو مالک اور بنو ہوازن کے جو حالات تھے انہوں نے پوری طرح معلوم کر لیے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر ایک ایک بات کی خبر دی۔ اب رسول اللہ ﷺ نے عمرؓ بن خطاب کو بلایا اور تمام حالات سے آگاہ کیا۔ اس پر عمرؓ بول اٹھے "ابن حدردؓ غلط کہتے ہیں۔" اس کا جواب ابن حدردؓ نے یہ دیا "اگر آپ نے مجھے غلط قرار دیا ہے تو کیا بات ہے۔ آپ نے تو بعض اوقات حق سے بھی اختلاف کیا ہے۔ آپ نے تو ایسی ہستی سے بھی اختلاف کیا ہے جو مجھ سے کہیں بہتر ہے۔" عمرؓ نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ نہیں سن رہے ابن حدردؓ کیا کہتے ہیں؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "عمرؓ تم غلطی پر تھے اللہ تمہیں سیدھا راستہ دکھائے(۱)۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ سیاسی معاملات میں انہیں اعتماد میں لیتے اور یہ اپنی بے باک رائے پیش کرتے۔ لوگ ان سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ مشاورت کے سلسلے میں ایک آزادانہ ماحول تھا۔ آنحضور ﷺ بھی ان کی غلطی ان پر واضح فرماتے تاکہ ان کی صحیح تربیت ہو سکے۔ اسی طرح روزمرہ کے دیگر عام معاملات میں بھی حضرت عمرؓ کے مخلصانہ مشورے جاری رہے تھے۔ اعمش تابعی نے اپنے استاد ابو صالح سے اس شک کے ساتھ نقل کیا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے یا ابو سعید خدریؓ سے کہ غزوہ تبوک کے دنوں میں جب سامان خوراک ختم ہو گیا اور لوگوں کو بھوک نے ستایا تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ "حضرت! اگر اجازت دیں تو ہم پانی لانے والے اپنے اونٹوں کو ذبح کریں پھر ان کو کھا بھی لیں اور ان سے روغن بھی حاصل کریں۔ حضورؐ نے فرمایا "اچھا کر لو۔" راوی کہتے ہیں کہ پھر حضرت عمرؓ آئے اور انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ نے ایسا کیا (یعنی لوگوں کو اگر اونٹ ذبح کرنے کی اجازت دے دی اور لوگوں نے ذبح کر ڈالے) تو سواریاں کم ہو جائیں گی (لہٰذا ایسا تو نہ کیا جائے) البتہ لوگوں کو آپ ﷺ ان کے بچے کھچے سامان خوراک کے ساتھ بلا لیجئے، پھر ان کے واسطے اللہ سے اس میں برکت کر دینے کی دعا کیجئے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت فرمائے گا۔" حضور ﷺ نے فرمایا "ہاں ٹھیک ہے۔" چنانچہ آپ نے چمڑے کا بڑا دستر خوان طلب فرمایا، پس وہ بچھا دیا گیا، پھر آپؐ نے لوگوں سے ان کا بچا کھچا سامان خوراک منگوایا، پس کوئی آدمی ایک مٹھی چنے کے دانے ہی لئے آ رہا ہے، کوئی ایک مٹھی کھجوریں لا رہا ہے اور کوئی روٹی کا ایک ٹکڑا ہی لئے چلا آ رہا ہے۔ حتیٰ کہ دستر خوان پر تھوڑی سی مقدار میں یہ چیزیں جمع ہو گئیں۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پھر برکت کی دعا فرمائی اس کے بعد فرمایا "اب تم سب اس میں سے اپنے اپنے برتنوں میں بھر لو۔" چنانچہ سب نے اپنے اپنے برتن بھر لئے، حتیٰ کہ (قریباً تیس ہزار کے اس لشکر میں) لوگوں نے ایک برتن بھی بغیر بھرے نہیں چھوڑا۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر سب نے کھایا، حتیٰ کہ خوب سیر ہو گئے اور کچھ فاضل بھی بچ رہا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ نہیں ہے کوئی بندہ جو بغیر کسی شبہ کے کامل یقین و اذعان کے ساتھ ان دو شہادتوں کے ساتھ اللہ کے سامنے جائے، پھر وہ جنت سے روکا جائے(۲)۔"

چند مسائل ایسے بھی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کے مشورے پر عمل نہیں فرمایا، لیکن اس بارے میں دلیل کے ساتھ انہیں مطمئن کیا۔ اس

---

(۱) ہشام ۸۳/۴ (۲) مسلم ج۵/۱۷۵ بحوالہ ج۱

طرح ان میں خود اعتمادی بھی قائم رہی اور مشورے دینے کا جوش و جذبہ بھی تر و تازہ رہا۔ اس کی نمایاں مثال منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی کا معاملہ ہے اس نے ایک سفر کے دوران مہاجر و انصاری کے جھگڑے کو وسیع کرنے اور قبائلی رنگ دینے کی کوشش کی اور انصار کو مہاجرین کے خلاف اکسا کر الگ الگ کرنے کی کوشش کی [۱] تو حضرت زید بن ارقم نے اس کی ساری تقریر سنی اور جا کر آنحضور ﷺ کو سنادی۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی پاس موجود تھے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! آپ عبادہ بن بشیر کو حکم دیجئے کہ جا کر اسے قتل کر دیں۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "عمرؓ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے لوگ کہیں گے کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ یہ مناسب نہیں 'مگر اب کوچ کا اعلان کر دو۔" چنانچہ سب لوگ کوچ کیلئے تیار ہو گئے [۲]۔ اس طرح نبی ﷺ نے اس معاملے میں حضرت عمرؓ کے مشورے پر عمل کرنے کے بجائے انتہائی صبر و تحمل کا طریقہ اختیار فرمایا۔ اس وقت حکمت کا بھی تقاضا تھا کچھ عرصہ کے بعد منافقین کے بارے میں آیات نازل ہوئیں "اذا جاءک المنافقون والح [۳]۔" تو عبداللہ بن ابی کے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ جو ایک مخلص صحابیؓ تھے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپؐ نے عبداللہ بن ابی کے بارے میں جو سنا ہے اس کے باعث آپ انہیں قتل کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اگر آپ قتل ہی کرنے والے ہیں تو میں خود جاتا ہوں' ان کا سر کاٹ کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ خدا کی قسم قبیلہ خزرج کو معلوم ہے کہ اس قبیلے کا کوئی آدمی ایسا نہیں جو اپنے باپ کا اتنا فرمانبردار ہو جتنا میں ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے سوا کسی دوسرے شخص کو آپؐ نے ان کے قتل کرنے کا حکم دیا اور اس نے قتل کر دیا تو شاید میرا نفس اس بات پر قابو نہ پاسکے کہ میں عبداللہ بن ابی کے قاتل کو لوگوں میں چلتا پھرتا دیکھوں۔ اس طرح ایک کافر کے بدلے ایک مومن کو قتل کر دوں اور دوزخی بن جاؤں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نہیں! بلکہ میں ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کر رہا ہوں اور جب تک وہ ہمارے ساتھ ہیں ان کی صحبت کو اچھا رکھنا چاہتا ہوں۔" اس کے بعد عبداللہ بن ابی جب فتنہ برپا کرتا تو خود اسی کی قوم ناراض ہو کر اسے پکڑتی اور اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتی۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو حضرت عمرؓ سے فرمایا "عمرؓ اب تم کیا رائے رکھتے ہو' خدا کی قسم! اگر میں اسی روز اسے قتل کر دیتا' جب تم نے کہا تھا کہ اسے قتل کر دو تو اس کیلئے ان لوگوں کی ناک بھوں ضرور چڑھ جاتی جنہیں اگر آج میں اس کے قتل کا حکم دوں تو وہ خود ہی اسے قتل کر دیں گے۔" حضرت عمرؓ نے عرض کی "واللہ! مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بات میری بات سے کہیں زیادہ بابرکت ہے [۴]۔" رسول کریم ﷺ کی اس بصیرت افروز تدبیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین کا وہ سردار خود اپنے قبیلے اور اپنے گھر میں بے وقعت و بے حیثیت ہو کر رہ گیا' اس کا جھوٹ کھل گیا' اس کا اصلی روپ اور حقیقی عزائم بے نقاب ہو گئے۔ پھر وہ کبھی فتنہ برپا کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔

رسول اکرم ﷺ اپنے مشیر کی خصوصی تربیت کرنا چاہتے تھے' اس لئے اسے بار بار یہ بات سمجھائی کہ نازک حالات اور حساس سیاسی مسائل میں غصہ و جذباتیت سے کبھی بہتر نتائج نہیں نکل سکتے۔ جہاں لوگوں کے جذبات برانگیختہ کر کے غلط رخ دیا جا رہا ہو اور انہیں اپنے ذاتی مقاصد کیلئے استعمال کیا جا رہا ہو' وہاں سختی کے بجائے نرمی کا ہتھیار زیادہ کارگر ہوتا ہے' وہاں مجرموں کو سزا دے کر انہیں زیادہ مقبول بنانے کے بجائے ان کے حقیقی مقاصد و عزائم اور صحیح کردار سے سادہ لوح لوگوں کو روشناس کرنا اور ان سے ہمدردی و تعلق کے رشتوں کو کاٹ دینا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ اس طرح حضرت عمرؓ کی بصیرت و فراست کو مربی اعظم ﷺ کے عملی اقدامات اور ان سے حاصل ہونے والے محسوس نتائج سے گزر کر پروان چڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کندھوں پر ایک وسیع سلطنت کی خلافت کی ذمہ داریوں

(۱) بخاری [illegible] مسلم [illegible] (۲) [illegible] طبری ۳/۳۰۶ (۳) سورۃ المنافقون ۱:۶۳ (۴) ہشام ۳/۳۰۲ طبری ۳/۲۰۸

کا بوجھ آیا تو اپنی حکمت و تدبر اور حسن انتظام سے ایک ترقی یافتہ' پُرامن' منظم معاشرہ قائم کیا اور تاریخ عالم میں بے مثال نقوش چھوڑ گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ بطور مشیر انتہائی جرأت مند اور بے باک تھے۔ وہ بلا جھجک بھرپور انداز میں اپنی رائے پیش کرتے' اپنے موقف کو واضح اور دو ٹوک انداز میں بیان کرتے۔ انہیں اپنی رائے پر مکمل اعتماد ہوتا تھا اور اس کے برعکس کسی بھی بات کو اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک کہ دل کی سے مطمئن نہ ہو جائیں۔ جب انہیں طمینان ہو جاتا تو بسرو چشم قبول کر لیتے۔ اس کی نمایاں مثال حدیبیہ کا واقعہ ہے۔

ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حج کا حکم دیا اور جب مکہ کے قریب پہنچے تو قریش کے سوار آپ کو شہر میں داخل ہونے سے روکنے کیلئے نکلے۔ قریش نے قسم کھائی تھی کہ وہ محمد ﷺ کو زبردستی مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے لیکن رسول اللہ ﷺ جنگ کے ارادے سے نہیں حج کے ارادے سے تشریف لائے تھے اس لئے آپ ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر قیام فرمایا[۱] اور قریش سے گفتگو کرنی چاہی کہ وہ مسلمانوں کو فریضہ حج کی ادائیگی اور کعبے کے طواف سے نہ روکیں۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عمرؓ بن الخطاب سے فرمایا کہ "وہ مکہ جائیں اور اس مسئلے میں قریش سے گفتگو کریں۔" حضرت عمرؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اندیشہ ہے کہ قریش میرے ساتھ زیادتی کریں گے اور مکہ میں بنو عدی بن کعب کا کوئی فرد نہیں جو میری حمایت کرے۔ مشرکین جانتے ہیں کہ میں ان کا کتنا دشمن ہوں میرا طرز عمل ان کے مقابلے میں کتنا سخت ہے۔ تاہم آپ کو ایک ایسے شخص کا نام بتاتا ہوں جو قریش کے نزدیک مجھ سے بھی زیادہ معزز ہے اور وہ عثمانؓ بن عفان ہیں[۲]۔" چنانچہ حضرت عثمانؓ بن عفان مکہ تشریف لے گئے جہاں قریش سے ان کی گفتگو خاصی طویل ہو گئی اور انہیں رکنا پڑا۔ مسلمان سمجھے کہ حضرت عثمان بن عفان شہید کر دیے گئے ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے بیعت لی جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے کہ اگر مشرکین قریش نے عثمانؓ کو شہید کر دیا تو مسلمان ان سے لڑیں گے[۳]۔ لیکن حضرت عثمانؓ واپس تشریف لے آئے اور بتایا کہ قریش نے عرب میں اپنا وقار قائم رکھنے کیلئے مسلمانوں کو اس سال مکہ میں داخل ہونے دینا نہیں چاہتے' لیکن یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ حضور جنگ کے ارادے سے نہیں حج کی نیت سے تشریف لائے ہیں وہ صلح کی بات چیت کرنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ فریقین میں معاہدہ صلح کے متعلق گفتگو جاری رہی۔ حضرت عمرؓ ان شرطوں سے بہت پریشان اور دل تنگ تھے جو اس گفتگو میں رسول اللہ ﷺ قبول فرما رہے تھے۔ چنانچہ وہ یک دم اٹھے اور حضرت ابو بکرؓ کے پاس پہنچ کر ان سے کہنے لگے "ابو بکرؓ! کیا حضور ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟" حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "کیوں نہیں؟" حضرت عمرؓ نے کہا "کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "کیوں نہیں؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا "کیا وہ مشرک نہیں؟" حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "ہیں۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تو پھر ہم اپنے دین میں کمزوری کو دخل کیوں دے رہے ہیں؟" حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "عمرؓ! حضور ﷺ کی اطاعت کرو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں" اور حضرت عمرؓ نے کہا "اور میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔"

حضرت عمرؓ اس گفتگو سے مطمئن نہیں ہوئے جو ان کے اور حضرت ابو بکرؓ کے درمیان ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی غم و غصے کے عالم میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟" "ہوں۔" پھر پوچھا "کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟" فرمایا "ہیں۔" کہا "کیا وہ مشرک نہیں ہیں؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں ہیں۔" حضرت عمرؓ نے کہا "تو پھر ہم اپنے دین میں کمزوری کو دخل کیوں دے رہے ہیں۔" رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "میں اللہ کا بندہ اور اس کا نبی ہوں۔ ہرگز اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور وہ کبھی مجھے ناکام نہیں ہونے دے گا۔" اس جواب سے حضرت

---

(۱) سعد ۹۵/۲' طبری ۲:II/۶۲۰ (۲) واقدی ۳/۵۹۷' طبری ۳:II/۶۳۱' ہشام ۳/۳۲۹ (۳) سعد ۲/۹۷ طبری ۲:II/۶۳۱۔

عزم خاموش ہو گئے[1]۔ بعد کو وہ فرمایا کرتے تھے "اس دن میں نے جو کچھ کیا اور اپنے نزدیک بھلائی کیلئے جو باتیں کیں ان کے ڈر سے آج تک صدقہ دیتا ہوں' روزے رکھتا ہوں' نفل پڑھتا ہوں اور غلام آزاد کراتا ہوں[2]۔"

واقدی نے مزید روایت کیا ہے کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھ کچھ اور اصحاب نبیؐ نے کہا "اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپؐ نے ہمیں نہیں فرمایا تھا کہ آپ عنقریب مسجد حرام میں داخل ہوں گے اور کعبۃ اللہ کی چابی لیں گے اور عرفے میں قیام فرمائیں گے جبکہ صورتحال یہ ہے کہ ہماری قربانی اور ہم بیت اللہ تک نہیں پہنچ سکے؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کیا میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ اس سفر میں ہی ایسا ہو گا؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "نہیں" تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سنو! تم یقیناً عنقریب اس میں داخل ہو گے اور میں کعبے کی چابی لوں گا اور اپنا اور تمہارے سر بطن مکہ میں منڈواؤں گا اور میں عرفے والوں کے ساتھ قیام کروں گا[3]۔" پھر حضرت عمرؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "کیا تم احد کا دن بھول گئے' جب تم پلٹے جا رہے تھے اور کسی کی بات پر دھیان نہیں دیتے تھے اور میں تمہیں پیچھے سے پکار رہا تھا؟ کیا تم یوم الاحزاب کو بھول گئے' جبکہ انہوں نے ہر طرف سے تمہیں گھیر لیا تھا اور نگاہیں پلٹ رہی تھیں اور کلیجے منہ کو آ رہے تھے' کیا تم اس دن کو بھی بھول گئے؟" رسول اکرم ﷺ انہیں کچھ چیزیں یاد کرانے لگے' پھر فرمایا "تم اس دن کو بھی بھول گئے؟" تو مسلمانوں نے عرض کیا "اے اللہ کے نبی ﷺ! اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا۔ ہم نے تو غور ہی نہیں کیا جس میں کہ آپ نے غور فرمایا ہے۔ یقیناً آپ اللہ اور اس کے معاملے کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔" جب رسول اکرم ﷺ عام القضیہ میں داخل ہوئے اور اپنا سر منڈوایا تو فرمایا "یہ ہے وہ جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔" پھر جب فتح مکہ کا دن آیا' آپؐ نے چابی لی اور فرمایا "عمر بن الخطاب" کو میرے پاس لاؤ۔ ان سے فرمایا کہ یہ ہے وہ جس کا میں نے تم سے کہا تھا۔ پھر حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ میں تھے تو فرمایا "اے عمرؓ سنو! یہ ہے وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی۔" تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا "ماکان فتح فی الاسلام اعظم من صلح الحدیبیۃ[4]۔" (اسلام میں صلح حدیبیہ سے بڑھ کر کوئی اور فتح نہیں ہے۔)

حضرت عمرؓ بے باکی کے باوجود مجلس نبوی ﷺ میں انتہائی مودبانہ انداز میں سوال کرتے اور مشورے دیتے۔ ان کے مشورے عموماً دور رس دلائل اور وسیع تر حکمت سے لبریز ہوتے تھے۔ اس لئے آنحضور ﷺ انہیں بہت زیادہ اہمیت دیتے۔ حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش سے گفتگو کیلئے انہوں نے اپنی جگہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کا مشورہ دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے شرف قبولیت بخشا' لیکن صلح نامہ کی شرائط کو دیکھ کر انہوں نے جس ردعمل کا مظاہرہ کیا' وہ اپنی نوعیت کا منفرد اور انوکھا واقعہ ہے اس انداز میں آنحضور ﷺ کے سامنے کبھی کسی صحابیؓ کو بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس موقع پر اور بھی تقریباً سب لوگ ملول اور غمزدہ تھے' لیکن کسی نے اپنی رائے کا اس طرح اظہار نہیں کیا تھا جس طرح کہ حضرت عمرؓ نے۔ حضرت عمرؓ اس موقع پر اس قدر جذباتی کیوں ہوئے؟ ایک نیاز مند اور انتہائی مودب بشر ہونے کے باوجود ان کی بات چیت میں ایسی شدت اور تندی کیوں پیدا ہوئی؟ اس کی مختلف وجوہات ہیں۔

اول یہ کہ قریش کو کسی قانون اور ضابطے کے اعتبار سے اور نہ ہی اخلاقی طور پر یہ حق تھا کہ خانہ کعبہ کے طواف سے روکیں۔ سالہا سال کی روایات بھی یہی تھیں کہ قبائلی اختلافات اور آویزشوں کے باوجود کسی بھی فرد یا گروہ کو نہیں روکا جاتا تھا۔ دوم یہ کہ مسلمان اب مجبور و مقہور نہیں تھے اب وہ آزاد' خود مختار اور فاتح تھے۔ انہوں نے میدان جنگ میں قریش کی قوت اور غرور کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اب وہ خالصتاً مذہبی جذبے سے آئے تھے۔ ان کے پیش نظر امن تھا اس کے باوجود قریش محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے دھونس چلا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کی دینی غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ ان کی یہ نازیبا دھونس مانی جائے اور اس موقع پر

---

(۱) بخاری ۲/۸۲ [illegible] ۱۷۵ [illegible] ہشام ۳/۳۳۱ واقدی ۲/۸ [illegible] طبری ۳/۳۳٤ (۲) بخاری ۲/۱۸۳ ہشام ۳/۳۳۱ واقدی ۲/۶۰۶ طبری ۳/۳۳٤ (۳) بخاری ۲/۱۸۳ (٤) واقدی ۲/۶۰۸۔

کمزوری دکھائی جائے۔ وہ تو مکی دور میں بھی ان کی بالادستی قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ سوم یہ کہ معاہدے کے اندر شرائط بھی قریش ہی کی مرضی کے مطابق تھیں۔ جب کہ وہ اپنی فکر و نظر کے اعتبار سے تو باطل پر ہی تھے' لیکن اس معاملے میں وہ خود اپنے ہی وضع کئے ہوئے سالہا سال کے ضابطوں کی رو سے بھی باطل پر تھے اور اسے زبردستی تھوپ رہے تھے۔ چہارم یہ کہ حضرت عمرؓ کی حمیت اسے بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے قائد جس عظیم مقصد کیلئے اتنا دور سے چل کر آئے تھے اور اپنے ساتھیوں کو ساتھ لائے تھے اس میں ناکامی ہو اور بغیر عمرہ کئے واپس پلٹ جائیں۔ پنجم یہ کہ جب انہوں نے اپنے ہی مسلمان ساتھی حضرت ابو جندل کو کفار کے نرغے میں تشدد سہتے ہوئے دیکھا' معاہدے کی رو سے جنہیں واپس کیا جا رہا تھا اور وہ چیخ کر پکار رہے تھے "اے مسلمانو! کیا میں مشرکوں کی طرف واپس جا سکتا ہوں جو میرے دین کو برباد کر دیں گے (۱)۔"

یہ ایک ایسا جذباتی منظر تھا جس نے ہر ذہن کو پریشان اور ہر آنکھ کو اشکبار کر دیا۔ بقول طبری "مسلمانوں کے دلوں میں اس کا اس قدر رنج اور تعب پیدا ہوا کہ قریب تھا کہ وہ ہلاک ہو جائیں (۲)۔" فطری قابل فہم اور حسب توقع تھا' وہ ان عوامل کے نتیجے میں تھا جنہوں نے ان کے اندر کی کائنات کو جھنجوڑ دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ ان کے اخلاص پر پورا اعتماد رکھتے تھے اور ان کے جذبات و احساسات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی رائے کو ظاہری حالات کے تناظر میں بھی طرح دیکھ رہے تھے۔ اس لئے ان کے سوالات کا برا نہیں منایا' بلکہ انہیں مطمئن کیا۔ حضرت عمرؓ نے بھی ایک تابع فرمان مشیر کی طرح فیصلہ ہو جانے کے بعد بطور شاہد اپنے دستخط ثبت کر دیئے (۳)۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے کہا رسول اللہ ﷺ سے ایسی صلح کی اور وہ شی انہیں عطا کی کہ اگر نبی اللہ ﷺ کسی اور کو مجھ پر امیر بنا دیتے اور وہ وہی کچھ کرتا' جو نبی کریم ﷺ نے کیا' تو میں اس کی نہ سماعت کرتا اور نہ اطاعت۔ وہ بات جو آپ نے ان کیلئے کر دی تھی۔ وہ یہ تھی کہ کوئی مسلمان جب کفار سے ملے گا' تو اسے واپس نہیں کریں گے اور جو کوئی کفار میں سے مسلمانوں سے آملے گا تو اسے واپس کر دیں گے (۴)۔ صلح فیصلے کے نافذ ہو جانے کے باوجود وہ حوصلہ ہارنے والے نہ تھے۔ وہ کفر اور اہل کفر کو شکست دینے کیلئے ہمیشہ نئی نئی راہیں تلاش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی فوری طور پر انہوں نے اپنی بصیرت و فراست کے ذریعے نئی راہ نکالی' جس میں معاہدے کی خلاف ورزی بھی نہ تھی اور کفار سے انتقام لیا جا سکتا تھا۔ وہ یہ کہ خود ابو جندلؓ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے والد کو قتل کر دیں۔ حضرت عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ میں کود کر ابو جندل کے پہلو میں پہنچا اور سہیل بن عمرو انہیں دور دھکیل رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اے ابو جندلؓ صبر کیجئے' یقیناً یہ لوگ مشرک ہیں اور ان کا خون کتے کے خون کی طرح ہے۔ وہ بھی ایک آدمی ہے اور آپ بھی ایک آدمی ہیں اور آپ کے پاس تلوار بھی ہے۔" حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے امید لگائی کہ وہ اپنی تلوار سے اپنے والد کو قتل کر دے گا' لیکن اس نے اپنے والد کے بارے میں گریز سے کام لیا' تو حضرت عمرؓ نے کہا "اے ابو جندلؓ یقیناً آدمی اپنے والد کو بھی اللہ کی راہ میں قتل کر دیتا ہے۔ اللہ کی قسم اگر ہم اپنے آباء کو پاتے تو ان کو اللہ کی راہ میں قتل کر دیتے' پس آدمی تو آدمی کے بدلے میں ہے۔ کہتے ہیں کہ ابو جندلؓ حضرت عمرؓ کے پاس سامنے ہوئے اور کہا "تم ہی انہیں کیوں نہیں قتل کر دیتے؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ان کو اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ "ابو جندلؓ نے کہا: "رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں مجھ سے کچھ زیادہ حق نہیں رکھتے (۵)۔" اگرچہ حضرت عمرؓ کی تجویز پر حضرت ابو جندلؓ نے عمل نہ کیا' لیکن اس صورت حال کے مطابق وہ تجویز بڑی دانشمندانہ' جدت آمیز اور دور رس نتائج کی حامل تھی' جو ان کے اجتہادی

---

(۱) بخاری ۳/۱۸۲' ہشام ۳/۳۳۳' واقدی ۲/۰۸[illegible]' طبری ۲/۲۰۵ [illegible] (۲) طبری ۲/۶۳۵ (۳) [illegible] ۳/۲۲۳' سعد ۲/۹۷' طبری ۲/۶۳۶ (۴) سعد ۲/[illegible]

(۵) واقدی ۲/۶۰۸' طبری ۲/۶۳۶

ذہن کی جھلک پیش کرتی تھی۔ بطور مشیر ان تمام واقعات سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے

۱۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ان کی فہم و فراست، اصابت رائے اور اخلاص کی بدولت رسول اکرم ﷺ نے مشیر خاص کا درجہ دے رکھا تھا اور کم و بیش تمام معاملات میں انہیں شریک مشورہ رکھتے۔ ان پر اعتماد کرتے اور ان کے مشوروں کو اہمیت دیتے تھے۔

۲۔ حضرت عمر فاروقؓ میں دین کی سمجھ اور اجتہادی بصیرت کے پروان چڑھانے میں اس منصب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس سے وہ مزاج شناس نبوت بنے اور انہیں شریعت اسلامی کی روح تک پہنچنے اور اس کے رموز و حکمتوں کو جاننے کا بھی موقع ملا اور عملی مسائل پر ان کے اطلاق کا شعور بھی حاصل ہوا۔

۳۔ حضرت عمرؓ مشورہ دینے میں بڑے جری اور بے باک تھے اپنی رائے اور محسوسات کو نبی کریم ﷺ سے کبھی نہیں چھپاتے تھے۔ آپ بھی ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ ان کے مشورے پر خلوص اور دلائل پر مبنی ہوتے تھے اور اجتماعی معاملات میں ان کی گہری بصیرت کے آئینہ دار بھی۔

۴۔ حضرت عمرؓ خود اعتمادی کے جوہر سے مالا مال تھے۔ سوچ سمجھ کر مشورہ دیتے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے۔ اس کے قبول کیے جانے کی توقع بھی رکھتے اور اصرار بھی کرتے لیکن جب فیصلہ ہو جاتا تو پھر بلا شک و تردد اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے اور اس کے نفاذ میں اپنی پوری توانائیاں کھپا دیتے۔

○ ..... بے لوث مطیع:

رسول اکرم ﷺ کی غیر مشروط اطاعت شرط ایمان ہے۔ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے احکام و فرامین کی بجا آوری و طاعت ناممکن ہے اس لئے ارشاد ربانی ہے "وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ[1]۔" (ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔) زندگی کے مختلف معاملات میں خالق کائنات اپنے بندے سے جس طرح کے طرز عمل کا مطالبہ کرتا ہے۔ اپنے رسول کو ویسا ہی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس لئے رسول اللہ تعالیٰ ہی کی تعلیمات کا عملی مظہر ہوتے ہیں۔ ان کی اطاعت حقیقت میں اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔ "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ[2]۔" (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی طاعت کی۔) فرمان نبوی کے مطابق تو صحیح مومن وہ ہے جس کے ارادے، مرغوبات اور نفس کی خواہشات بھی شریعت الٰہی کے مطابق ہو جائیں۔ کسی ایسی چیز کی طرف سرے سے میلان ہی نہ پیدا ہو جو شریعت کے نزدیک ناپسند ہو۔ "لایومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ[3]۔" (تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی خواہش نفس اس دین کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں۔)

یہ ہے روحانیت اور اخلاص کا اعلیٰ ترین درجہ ایک مجتہد اپنی فکر و نظر اور قول و عمل کے اعتبار سے جب تک اس مقام تک نہ پہنچے وہ اسلام کی صحیح نمائندگی نہیں کر سکتا نہ ہی معتبر ٹھہر سکتا ہے۔ اس کی بصیرت و فراست صرف اسی وقت دین حق کی ترجمان بن سکے گی جب وہ اطاعت نبوی کا حق ادا کرتا ہو۔ حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت کے معتبر، قابل تقلید اور قوی ہونے کا راز بھی یہی ہے کہ انہوں نے انفرادی و اجتماعی معاملات و احساسات اور فکر و عمل کے تمام دائروں میں اطاعت نبوی ہی کو شعار بنایا۔ اپنے جذبات و احساسات اور خواہشات و میلانات تک کو سرنگوں کر دیا۔ ان کے اپنے عہد کے سب لوگ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے وران کی سیرت و کردار میں اس کی جھلک دیکھتے تھے۔ اس لئے ان کی بات کو وزن دیا جاتا تھا۔ ان کی رائے اور اجتہاد پر اعتماد کیا جاتا تھا اور ان کے فیصلوں کو بسر و چشم قبول کر لیا جاتا تھا۔ ان کا اپنا قول ہے "ان الاقتصاد فی السنۃ خیر من الاجتھاد فی الضلالۃ[4]۔" (طریق نبوی پر معتدلانہ عمل اس اجتہاد سے بہتر ہے جو گمراہی ثابت ہو یا جس میں بدعت ہو۔) اس کی حکمت انہوں نے یہ بیان فرمائی "السنۃ السنۃ الزموھا تنجکم من البلاعۃ[5]۔" (طریق نبوی پر قائم رہو گے تو بدعتوں سے محفوظ رہو گے۔)

حضرت عمر فاروقؓ کی بے چون و چرا اطاعت کی بنیاد رسول اکرم ﷺ کی رسالت پر غیر متزلزل یقین و اعتماد تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ آپ کا وجود عالم انسانیت کیلئے دنیوی و اخروی دونوں اعتبار سے خیر و بھلائی کا ذریعہ ہے اور آپ کی دعائیں خالق دوجہاں کے ہاں مقبول و مستجاب ہیں۔ اس لئے کہ آپؐ اس کے سچے رسول ہیں۔ بن کعب بن مالک نے حدیث بیان کی اور انہیں جابر بن عبداللہ نے خبر دی کہ احد کی لڑائی میں ان کے والد شہید ہو گئے اور قرض چھوڑ گئے۔ قرض خواہوں نے تقاضے میں بڑی شدت اختیار کی، تو میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے اس سلسلے میں گفتگو کی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "وہ میرے باغ کی کھجور لے لیں اور میرے والد کو معاف کر دیں" لیکن انہوں نے انکار کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی میرا باغ انہیں نہیں دیا اور نہ ان کیلئے پھل تڑوائے، بلکہ فرمایا کہ کل صبح میں تمہارے یہاں آؤں گا۔ صبح کے وقت آپ تشریف لائے اور کھجور کے درختوں میں ٹہلتے رہے اور برکت کی دعا فرماتے رہے۔ پھر میں نے پھل توڑ کر قرض خواہوں کے سارے حقوق ادا کر دیئے اور میرے پاس کھجور بچ بھی گئی۔ اس کے بعد میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ

---

(۱) سورۃ النساء: ۶٤ (۲) سورۃ النساء: ۸۰ (۳) بخاری: ۹/۱ (٤) جوزی: ۱۸۲/۱ (۵) جوزی: ۱۸۲/۱

تشریف فرما تھے میں نے آپ کو واقعہ کی اطلاع دی۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا "عمرؓ سن رہے ہو!" عمرؓ نے عرض کیا "ہمیں تو پہلے سے معلوم ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں' بخدا اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں(۱)۔ اس سے بھی بڑھ کر آپ کا تو یہ خیال تھا کہ انسان کی دعا آسمان اور زمین کے مابین لٹکی رہتی ہے جب تک رسول اکرم ﷺ پر درود نہ بھیجے۔ چنانچہ فرمایا "ان الدعاء موقوف بین السماء والارض لا یصعد منه شئی حتی تصلی علی نبیك ﷺ(۲)۔"

انہیں یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہونے کی حیثیت سے محمد عربی ﷺ کی کوئی بات بھی خلاف حق نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام صداقتیں اور حقیقتیں جو بظاہر ناممکن نظر آتی ہیں۔ جب سال نبوت سے بیاں ہوتی ہیں تو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ اللہ ہی کے کرشمہ قدرت کا تذکرہ ہوتی ہیں جس کے اختیار و قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ رسول اکرم ﷺ کو ان کے ایمان و یقین کی اس کیفیت کا علم تھا۔ اس لئے ان پر مکمل اعتماد بھی کرتے تھے اور سر عام اظہار بھی۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا کہ آپ نے فرمایا "(بنی اسرائیل کا) ایک چرواہا اپنی بکریوں میں تھا اتنے میں بھیڑیا اس کی ایک بکری لے کر بھاگا۔ چرواہا اس کے پیچھے لگا اور اس سے بکری کو چھڑا لیا۔ بھیڑیے نے اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "اس دن کون بکری کو بچائے گا جس دن میرے سوا کوئی چرواہا نہیں ہوگا۔" لوگوں نے تعجب سے کہا "سبحان اللہ!" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فانی اؤمن بذالك انا و ابوبکر و عمر وما هما فی القوم(۳)۔" (میں اس پر ایمان لایا اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی۔) وہ دونوں اس وقت موجود نہ تھے ان لوگوں میں۔ اسی طرح ایک بیل کے بولنے کا واقعہ بھی ہے کہ دیگر صحابہ کرامؓ نے تو اس کے بولنے پر تعجب کا اظہار کیا' تو رسول اکرم ﷺ نے اپنی طرف سے حضرت ابوبکرؓ اور عمر فاروقؓ کے یہاں ماننے کا اعلان فرمایا۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ایک شخص بیل پر سوار تھا۔ اتنے میں بیل نے کہا: "میں تو کھیتی کیلئے پیدا کیا گیا ہوں سواری کیلئے نہیں۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اس پر میں ایمان لایا اور ابوبکرؓ و عمرؓ اس دن وہ دونوں ان لوگوں میں موجود نہیں تھے(۴)۔"

حضرت عمر فاروقؓ یہ سمجھتے تھے دین کے تمام احکام و مناسک کی روح یہ ہے کہ ہر معاملے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی جائے۔ زندگی کی تمام اشیاء سے یک مسلمان کے تعلق کی بنیاد نہ تو اس کی ذاتی پسند و ناپسند اور نہ ہی اس شئی کا ذاتی حسن و قبح' بلکہ صرف اور صرف اللہ کا حکم اور اس کے رسول ﷺ کا اسوہ و عمل ہے۔ اسی کی اطاعت ہمارے اوپر لازم ہے۔ چنانچہ متعدد صحابہ کرامؓ سے احادیث کی تقریباً تمام کتب میں یہ روایت منقول ہے کہ آپ نے حج کے موقع پر حجر اسود کو مخاطب کر کے فرمایا "مجھے معلوم ہے کہ تو محض ایک پتھر ہے تو کسی کو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فیضان اور اگر میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں ہرگز تجھے نہ چومتا(۵)۔"

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت میں یہ وضاحت ہے کہ یہ آپ کے منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد پہلے سال کے حج کا واقعہ ہے۔ اس میں مزید یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے یہ بات سنی تو فرمایا "امیر المومنین! یہ نہ کہئے حجر اسود میں نفع اور نقصان پہنچانے کی صلاحیت موجود ہے۔" یہ میں جو کہہ رہا ہوں یہ قرآن سے ثابت ہے آپ جانتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "واذ اخذ ربك من بنی ادم من ظهورهم و ذریاتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربکم قالوا بلی شهدنا(۶)۔"

(۱) بخاری ۳/ ۱۳۸ (۲) ترمذی ۱/ ۳۰۲ (۳) بخاری ٤/ ۱٦۹ مسلم ٦/ ۸٥ ترمذی ٥/ ۲۸٦ (٤) بخاری ٤/ ۱٦۹ حبان ۹/ ۲٥ (٥) بخاری ۲/ ۱٦۲ مسلم ٤/ ٦٦' مالك ۱/ ۳٦۷' نسائی ٥/ ۲۲۷' داود ۲/ ۲۲۸' دارمی ۲/ ٥۳' طبرانی ۱/ ٦۳ (٦) سورۃ الاعراف ۷: ۱۷۲۔

چنانچہ جب تمام ارواح نے اقرار بندگی کر لیا' تو اللہ تعالیٰ نے اس پیمان کو صحیفہ میں درج کیا اور اسے اس پتھر کے بطن میں محفوظ کر دیا۔ اب قیامت کے روز اس پتھر کو آنکھیں' زبان اور لب عطا ہوں گے اور یہ ان لوگوں کی طرف سے گویا عملاً گواہی دے گا' جنہوں نے اس پیمان کو پورا کر دکھایا ہو گا۔ یہ پتھر اس مقام پر اللہ کا امانت دار ہے۔" امیر المومنین نے یہ سنا تو بے حد متاثر ہوئے اور فرمایا "ابوالحسن میری خواہش تو یہ ہے کہ میں اور تم ہر حالت میں ساتھ رہیں (۱)۔" اس طرح حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تصریح کو بے حد پسند فرمایا' لیکن ان کے پیش نظر دین کی وسیع تر حکمت عملی تھی' جس کی بنا پر سب کے سامنے آپ نے حجر اسود کو مخاطب کیا تھا' چنانچہ علامہ ابن جوزی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "میرے نزدیک حضرت عمرؓ نے حجر اسود کے بارے میں یہ سب کچھ اس لئے کہا تھا کہ بوسہ دینے اور اسے بصد احترام چھونے کی رسم عہد جاہلیت میں بھی تھی اور حضرت والا کی خواہش یہ تھی کہ دنیا کو اس امر کا احساس ہو جائے کہ مسلمانوں کا حجر اسود کو چومنا اور چھونا ایک جاہلانہ روایت کا اعادہ نہ تھا' بلکہ محض اور محض رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل کی پیروی تھی (۲)۔" حضرت عمر فاروقؓ نے پوری ساری عمر اطاعت نبوی ﷺ میں گزاری' چھوٹے بڑے ہر معاملے میں حتی المقدور اس پر کاربند رہے۔ بے شمار واقعات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چند حسب ذیل ہیں

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی (بعض دیگر روایات کے مطابق ان کا نام عاتکہ تھا) جو صبح اور عشاء کی نماز باجماعت پڑھنے کیلئے مسجد میں آیا کرتی تھیں۔ ان سے کہا گیا کہ آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ حضرت عمرؓ اس کو ناپسند کرتے ہیں اور غیرت محسوس کرتے ہیں آپ مسجد میں کیوں جاتی ہیں؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ پھر مجھے منع کرنے میں انہیں کیا چیز مانع ہے؟ کہا گیا رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ "لاتمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ (۳)۔" (اللہ کی بندیوں کو اس کی مسجدوں میں آنے سے نہ روکو۔) حضرت سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے غنیمت کے مال میں سے آئے ہوئے ایک اونٹ کو ذبح کیا۔ ایک حصہ ازواج النبی ﷺ کی خدمت میں بھیجا جو بچا اسے تیار کرایا اور بعض مسلمانوں کی دعوت کی' جن میں اس روز حضرت عباسؓ بھی تھے۔ حضرت عباسؓ نے کہا "اے امیر المومنین! اگر آپ روزانہ ہمارے لئے ایسا کریں' تو ہم لوگ آپ کے پاس کھائیں اور باتیں کریں۔" حضرت عمرؓ نے کہا "میں ایسا دوبارہ نہ کروں گا۔ میرے دونوں صاحب یعنی نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ ایک عمل کر کے اور ایک راستہ چل کر گزر گئے ہیں۔ اگر میں ان کے خلاف کروں گا تو اور راستے سے بھٹک جاؤں گا (۴)۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے اطاعت نبی ﷺ میں اپنی زندگی کا انداز ہی بدل دیا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ فکر و نظر' عادات و اطوار' بود و باش' ہر چیز میں اسوہ رسالت کو اپنائیں۔ عہد خلافت میں زہد کے اثرات اس قدر گہرے ہو گئے کہ انہوں نے ہر طرح کی راحت کو ترک کر دیا۔ رہن سہن اور خورد و نوش میں ایک اوسط درجے کے آدمی سے بھی کم معیار زندگی اپنایا۔ حالانکہ وسائل کی فراوانی ہو چکی تھی۔ ان کے پیش نظر تو بس ایک ہی بات تھی کہ آخرت میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ہوں۔ ان کے نزدیک اس کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ دنیا میں ان کے نقش قدم پر چلیں اور وہ ساری مشکلات برداشت کریں' جو انہوں نے برداشت کی تھیں۔

مصعب بن سعدؓ سے مروی ہے کہ حفصہؓ بنت عمرؓ نے اپنے والد سے کہا "(بروایت یزید) یا امیر المومنین! (اور بروایت ابو اسامہ) اے والد! اللہ نے آپ کو خوب رزق دیا اور زمین کو آپ پر فتح کر دیا' مال بہت کر دیا۔ اگر آپ اپنے کھانے میں باریک اناج کھائیں اور لباس میں باریک کپڑا پہنیں تو بہتر ہو۔" فرمایا "کہ میں تمہارا فیصلہ تمہیں سے کراتا ہوں۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کیسی مصیبت کی زندگی گزارتے تھے۔ وہ برابر انہیں یاد دلاتے رہے یہاں تک کہ وہ رو دیں۔" پھر

---

(۱) جوزی ۱۲۵ (۲) جوزی ۱۲۵ (۳) بخاری ۱/۲۱۶' مالک ۱/۱۹۸ (۴) سعد ۲۸۸/۳ (۵)

فرمایا کہ "میں نے تم سے کہا ہے کہ واللہ اگر مجھ سے ہو سکے گا تو میں ضرور ضرور ان دونوں (حضرات یعنی رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی معیشت کی زندگی میں شرکت کروں گا کہ شاید میں ان دونوں کے ساتھ ان دونوں کی راحت کی زندگی میں بھی (جو آخرت میں ہے) شریک ہو جاؤں[1]۔"

بعض معاملات میں بہت حساس واقع ہوئے تھے، خاص طور پر ایسی چیزیں جن میں انہیں نمود و نمائش محسوس ہوتی یا جن کے ذریعے ضرورت مندوں کی حاجت روائی کی جا سکتی تھی۔ وہ انہیں محفوظ کرنے کو ناپسند کرتے تھے، لیکن انہیں اپنے احساسات سے علی الرغم اعتدال و توازن پر قائم رکھنے والی قوت اتباع نبوت ہی کا جذبہ تھا۔

ابو وائل کا بیان ہے کہ میں شیبہ کے ساتھ کعبہ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا تو شیبہ نے کہا کہ اسی جگہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے بیٹھ کر فرمایا تھا "لقد هممت ان لا ادع فیها صفراء ولا بیضاء الا قسمته۔" (میں چاہتا ہوں کہ کعبہ کے اندر سرخ و سفید (سونے چاندی جیسی) کوئی چیز نہ رہنے دوں اور سب کچھ تقسیم کر دوں۔) میں نے عرض کیا، آپ کے ساتھیوں نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ جواب دیا "هما المرآن اقتدی بهما۔" (میں بھی انہیں کی اقتداء کرتا ہوں[2]۔)

روزمرہ کے معاملات میں طریق نبوی ﷺ پر عمل پیرا رہنا ان کا معمول تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ امیر المومنین کی خدمت میں عراق سے خراج کا مال آیا ہے۔ آپ نے اسے لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور بولا "اے امیر المومنین، کیا ہی اچھا ہو کہ اس رقم کا کچھ حصہ ممکنہ عسکری مہم، دوراندیشی وغیرہ متوقع حالات کے پیش نظر محفوظ کر لیا جائے۔" حضرت عمرؓ نے غصے سے فرمایا "اس شیطانی وسوسے کا جواب یہ ہے کہ میں آنے والے کل کیلئے آج اللہ کی نافرمانی ہرگز ہرگز نہیں کروں گا اور یہ تمام رقوم آج ہی بالکل اسی انداز میں بانٹ دوں گا جیسے رسول اللہ ﷺ بانٹ دیا کرتے تھے[3]۔"

آپ کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ قوت نافذہ سے نوازا تھا۔ اپنے فیصلوں میں بھرپور استدلال سے کام لیتے تھے اور سرور کونین ﷺ کے قول و عمل کو بڑا خوف و خطر اس کی حقیقی روح کے مطابق نافذ فرما دیتے۔ اس بارے میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اس کی نمایاں مثال ان کے عہد خلافت میں بنی نضیر کے اموال کے بارے میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے دعوے کے بارے میں آپ کا فیصلہ ہے۔ حضرت عمرؓ کی مجلس میں ایک دن کبار صحابہ حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت زبیرؓ بن عوام، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص وغیرہ موجود تھے اتنے میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ بھی آ گئے۔ حضرت عباسؓ نے عرض کیا "اے امیر المومنین، میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دیجئے۔" اس پر حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھ جو صحابہ رضی اللہ عنہم تھے انہوں نے کہا "امیر المومنین، ان دونوں حضرات میں کوئی فیصلہ فرما دیجئے اور معاملہ ختم کر دیجئے۔" عمرؓ نے فرمایا "اچھا تو پھر ذرا صبر کیجئے، میں آپ لوگوں سے اس اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے آسمان اور زمین قائم ہیں کہ کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ "ہماری وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو کچھ ہم (انبیاء) چھوڑ کر جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے جس سے حضور اکرم ﷺ کی مراد (تمام دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ) خود اپنی ذات بھی تھی۔" ان حضرات نے تصدیق کی کہ آنحضور ﷺ نے یہ حدیث فرمائی تھی۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اب میں آپ لوگوں سے اس مسئلہ پر گفتگو کروں گا (جو مابہ النزاع بنا ہوا ہے) یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کیلئے اس فیئ کا ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا جسے آنحضور ﷺ نے بھی کسی دوسرے کو نہیں دیا تھا۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی "ما افاء الله علی رسوله منهم[4]۔" (جس میں اس تخصیص کا ذکر ہے) اور وہ حصہ آنحضور ﷺ کیلئے خاص رہا۔ خدا گواہ ہے میں نے وہ حصہ کوئی اپنے لئے مخصوص نہیں کر لیا تھا اور نہ میں آپ لوگوں کو نظر انداز کر کے اس حصہ کا تنہا مالک بن گیا ہوں۔ فیئ کا مال آنحضور ﷺ خود سب کو عطا فرماتے تھے اور سب میں اس کی تقسیم ہوتی تھی۔ بس صرف یہ مال اس میں سے باقی رہ گیا تھا اور آنحضور ﷺ اس سے

---

(۱) سعد ۳/۲۷۷ (۲) بخاری ۲/۱۵۹ (۳) جوزی ۱۰۱ (٤) سورہ الحشر ۵۹:۶

اپنے گھر والوں کو سال بھر خرچ دیا کرتے تھے اور اگر کچھ تقسیم کے بعد باقی بچ جاتا تو اسے اللہ کے مال کے مصرف میں خرچ کر دیا کرتے تھے (رفاہ عام اور دوسرے دینی مصالح میں) آنحضور ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں اس مال کے معاملے میں یہی طرز عمل رکھا۔ اللہ کا واسطہ دے کر آپ حضرات سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ لوگوں کو یہ بات معلوم ہے؟ سب حضرات نے کہا "ہاں!" پھر عمر رضی اللہ عنہ نے علی اور عباس رضی اللہ عنہما کو خاص طور پر مخاطب کیا اور ان سے پوچھا "میں آپ حضرات سے بھی اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اس کے متعلق آپ لوگوں کو معلوم ہے؟" دونوں حضرات نے مثبت میں جواب دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اپنے پاس بلا لیا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے (جب ان سے تمام مسلمانوں نے بیعت خلافت کر لی) فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں اور اس لئے انہوں نے (آنحضور ﷺ کے اس مخصوص) مال پر قبضہ کیا اور جس طرح آنحضور ﷺ اس میں تصرفات کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بھی بالکل وہی طرز عمل اختیار کیا۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنے اس طرز عمل میں سچے، مخلص، نیکوکار اور حق کی پیروی کرنے والے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور اب میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نائب مقرر ہوا ہوں۔ میری خلافت کو دو سال ہو گئے ہیں اور میں نے بھی اس مال کا تحویل میں رکھا ہے، جو تصرفات رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ اس میں کیا کرتے تھے میں نے بھی خود کو اسی کا پابند بنایا اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اپنے اس طرز عمل میں سچا، مخلص اور حق کی پیروی کرنے والا ہوں۔ پھر آپ دونوں حضرات میرے پاس مجھ سے گفتگو کرنے آئے تھے اور دونوں حضرات کا معاملہ یکساں ہے جناب عباسؓ آپ تو اس لئے تشریف لائے تھے کہ آپ کو اپنے بھتیجے (ﷺ) کی میراث کا دعویٰ میرے سامنے پیش کرنا تھا اور آپ (عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا خطاب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تھا۔ اس لئے تشریف لائے تھے کہ آپ کو اپنی بیوی (فاطمہ رضی اللہ عنہا) کا دعویٰ پیش کرنا تھا کہ ان کے والد (رسول اللہ ﷺ) کی میراث انہیں ملنی چاہئے۔ میں نے آپ دونوں حضرات سے عرض کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ خود فرما گئے ہیں کہ ہماری میراث تقسیم نہیں ہوتی، جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے، لیکن پھر جب میرے سامنے یہ صورت آئی کہ مال آپ لوگوں کے انتظام میں (ملکیت میں نہیں) منتقل کر دوں تو میں نے آپ لوگوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر آپ لوگ چاہیں تو مال مذکور آپ لوگوں کے انتظام میں منتقل کر سکتا ہوں، لیکن آپ لوگوں کیلئے ضروری ہوگا کہ اللہ کے عہد اور اس کے میثاق پر مضبوطی سے قائم رہیں اور اس مال میں وہی مصارف باقی رکھیں جو رسول اللہ ﷺ نے متعین کئے تھے اور جن پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اور میں نے جب سے مسلمانوں کا والی بنایا گیا ہوں، عمل کیا۔ آپ لوگوں نے اس پر کہا کہ ہمارے انتظام میں دے دیں اور میں نے اسی شرط پر اسے آپ لوگوں کے انتظام میں دے دیا اب میں آپ حضرات سے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ میں نے انہیں وہ مال اسی شرط پر دیا تھا؟ عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ آئے ہوئے حضرات نے کہا کہ جی ہاں اسی شرط پر دیا تھا۔ اس کے بعد عمرؓ عباسؓ اور علی رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ میں آپ حضرات سے بھی خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں۔ میں نے آپ لوگوں کو وہ مال اسی شرط پر دیا تھا؟ ان دونوں حضرات نے بھی یہی کہا کہ جی ہاں (اسی شرط پر دیا تھا) عمر رضی اللہ عنہ نے پھر فرمایا کہ کیا اب آپ حضرات مجھ سے کوئی اور فیصلہ چاہتے ہیں؟ اس اللہ کی قسم جس کے حکم سے آسمان اور زمین قائم ہیں اس کے سوا میں اس معاملے میں کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کر سکتا اور اگر آپ لوگ اس مال کے (شرط کے مطابق) انتظام پر قادر نہیں تو مجھے واپس کر دیجئے میں خود اس کا انتظام کر لوں گا"[1]۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمان الٰہی، ارشادات نبوی اور اسوہ حسنہ کی روشنی میں اس معاملے پر غور کیا اور جو کچھ سمجھا اسے پورے دلائل سے واضح فرمایا اور ان حقائق کی تصدیق پوری مجلس سے کرائی اور خود معاملے کے فریقین سے بھی جن کی بنا پر وہ فیصلہ کرنا چاہتے تھے تاکہ فیصلہ منصفانہ بھی

(1) بخاری:۲/۱۴۲، مسلم:۵/۱۵۲، ترمذی:۳/۸۱، نسائی:۷/۱۳۵۔

ہو تیر جا بجا ارانہ بھی اور قوی بھی۔ جب حجت پوری ہو گئی تو اسے پوری قوت سے نافذ فرما دیا۔ یہ اطاعت نبوی ﷺ کا ہی جذبہ تھا کہ جب بھی کبھی فیصلہ کرتے تو پہلے اس معاملے میں سرورِ کونین ﷺ کا قول و عمل دریافت کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر نہ ملتا تو پھر اپنی رائے سے فیصلہ دے دیتے' لیکن بعد میں بھی اگر آپ کو ﷺ کا کوئی حکم ملتا تو فوراً فیصلے سے رجوع کر لیتے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ معمر نے عبداللہ بن عبدالرحمن الانصاری سے اور انہوں نے ابن المسیب سے سنا تھا "اصابع کے مقام پر ابن خطاب نے کوئی فیصلہ کیا۔ بعد میں انہیں آنحضرت ﷺ کے ایک فرمان کے بارے میں جو آپ کے حکم سے لکھا گیا تھا' بتایا گیا تو آپ نے اپنے فیصلے کو بدل دیا[1]۔" آپ دینی معاملات میں اپنی رائے کو آخری چارہ کار کے طور پر اختیار کرتے اور اس میں بھی ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ نئے پیش آمدہ معاملے پر خوب بحث و تمحیص ہو' پھر اس کی روشنی میں جو صائب رائے ہو اسے اختیار کیا جائے۔ اس لئے انفرادی طور پر رائے زنی کو ناپسند فرماتے تھے۔ اس لئے لوگوں کو یہ ترغیب دیتے تھے کہ اطاعت نبوی ہی کو شعار بنائیں اور ذاتی آراء سے گریز کریں' تاکہ صراط مستقیم پر گامزن رہنے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ عبدالملک بن ہارون بن عنترہ نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے "حضرت عمرؓ نے برسر منبر اعلان کیا کہ اصحاب الرائے (وہ لوگ جو دینی امور و مسائل میں اپنی ذاتی رائے کو دخل دیتے ہیں) اسلام کے دشمن ہیں۔ حدیثوں کا محفوظ رکھنا' انہیں گراں گزرتا ہے' تو وہ چہ میگوئیاں اور فکری دراندازیاں کرنے لگتے ہیں اور یوں خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ یاد رکھو ہمارا کام سنت کی اتباع اور پیروی اور تقلید ہے۔ جدت طرازی اور خیال آرائی نہیں اور پیغمبر ﷺ کے نقش قدم پر ہم جب تک چلتے رہیں گے گمراہ نہیں ہوں گے[2]۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اطاعت رسول کا دم بھرا۔ ان کا سب سے اہم آخری معاملہ خلیفہ کے تقرر کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ جب لوگوں نے تقرر کرنے کے بارے میں اصرار کیا تو جواب دیا "اگر میں خلیفہ مقرر نہ کروں (تو بھی ہو سکتا ہے) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کیا اور اگر مقرر کر دوں (تو بھی ہو سکتا ہے) کیونکہ ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ مقرر کیا ہے۔" راوی کہتے ہیں کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ کسی کو بھی خلیفہ بنانے والے نہیں[3]۔ چنانچہ اطاعت نبی ﷺ کے بارے میں صحابہ کرام کا جو خیال تھا' وہ درست ثابت ہوا اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ میں بھی تمہیں اسی طرح چھوڑے جا رہا ہوں' جیسے نبی ﷺ نے چھوڑا تھا[4]۔

○ ..... سعادتمند شاگرد:

حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت کی تربیت میں براہ راست معلم انسانیت ﷺ سے اکتساب علم کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے ایک طالب علم کے طور پر آنحضور ﷺ کی صحبت و رفاقت سے بھرپور استفادہ کیا۔ اگر کبھی قریب نہ ہوتے تو بھی علمی تعلق قائم رہتا۔ ان کا اپنا قول ہے "میں اور میرا ایک انصاری ہمسایہ مدینہ کے بلند حصے بنی امیہ بن زید میں رہتے تھے اور ہم دونوں باری باری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن وہ آتا اور ایک دن میں آتا' جس دن میں آتا تو اس دن کی وحی اور (مجلس نبوی کی) دیگر باتوں کی اطلاع اس کو دیتا اور جس دن وہ آتا' تو وہ بھی اسی طرح کرتا[5]۔"

عہد جاہلیت ہی سے علم کی ان دلچسپیوں کا خصوصی میدان تھا' لیکن جب اسلام قبول کیا تو ان کے ذوق و شوق کی انتہا نہ رہی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا؟ اسلامی تحریک کی اساس ہی علم پر تھی۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے "الناس رجلان' عالم و متعلم ولا خیر فیما سواھما[6]۔" (انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک عالم دوسرے

---

(۱) جوزی ص ۱۲۵ (۲) جوزی ص ۹۲ منتقی ۱/ ۲۹۸ (۳) ۔۔۔ ۱۸۵ سعد ۳/ ۲۴۳ ۔۔۔ (۴) بلاذری ۔۔۔ ۵۴۲ (۵) بخاری ۔۔۔ ۳۱ مسلم ۴/ ۹۳ ترمذی ۵/ ۹۲ (٦) منتقی ۱/ ۱۳۴

علم اُن سے عدد وجو ہیں ان میں کوئی جدائی نہیں۔) ان کا شمار صحابہ کرامؓ میں سب سے بڑے عالموں میں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خاتم النبیین ﷺ کے تلمیذ رشید تھے۔ بطور طالب علم ان کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ جس بات کا انہیں علم نہ ہوتا یا جو ان کے ذہن میں واضح نہیں ہوتی تھی اس کے بارے میں بڑی بے باکی کے ساتھ آنحضور ﷺ سے دریافت فرماتے دیگر صحابہ کرامؓ کے برعکس کبھی شرم و جھجک کی وجہ سے خاموش نہیں رہتے تھے خواہ کسی آیت کے معانی و مفہوم کا معاملہ ہو یا کوئی فقہی و عملی مسئلہ' سوال ان کے جاننے اور سمجھنے کی کلید تھی۔ ان کے سوال نے علم کے بہت سے دروازے کھولے' مسائل کے بہت سے عقدے حل کیے اور معاملات کی بہت سی گرہیں کھولیں۔ آیات کی تفسیر کے ضمن میں انہوں نے جو سوالات پوچھے' وہ گزشتہ باب میں درج کیے جا چکے ہیں۔ فقہی نوعیت کے سوالات کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔ روزمرہ کے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ آیا حالت جنابت میں سویا جا سکتا ہے یا نہیں؟ حضرت عمرؓ نے سوال کر کے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ اگر ہم میں سے کوئی جنبی ہو تو کیا وہ سو سکتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں' اسے چاہئے کہ وضو کرے پھر سو جائے اور جب چاہے غسل کرے[1]۔" اسی طرح غسل جنابت کا طریقہ معلوم کیا تو آنحضور ﷺ نے اس کی تفصیل بتائی[2]۔ ہمیشہ ہر اشکال کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ نماز قصر کا بھی تھا۔ جو کثیر الوقوع ہونے کی وجہ سے آج تک زیر بحث رہتا ہے کہ سفر میں نماز قصر ادا کرنا ضروری ہے یا اختیاری؟ حضرت یعلیٰ بن امیہ سے روایت ہے' میں نے حضرت عمرؓ سے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ليس عليكم جناح ان تقصروا من الصلوة ان خفتم ان يفتنكم الذين كفروا[3]۔" (جب تم لوگ سفر کیلئے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو' جبکہ تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔" اب تو لوگوں کو امن ہو گیا (تو چاہئے کہ سفر میں قصر نہ کریں) حضرت عمرؓ نے کہا "میں نے بھی تعجب کیا تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا۔" آپؐ نے فرمایا "قصر اللہ کا صدقہ ہے جو اس نے تمہیں دیا ہے' سو تم اس کا صدقہ قبول کرو[4]۔" اجتہادی و فقہی مسائل میں دسترس حاصل کرنے اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ سوالات کے ذریعے اپنے علم کو تر و تازہ رکھتے۔ پھر مختلف دینی اصطلاحات سے بھی واقفیت حاصل کرتے اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بھی۔ ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ "اے اللہ کے رسول ﷺ! کوثر جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عنایت فرمایا ہے وہ کیا چیز ہے؟" آپؐ نے فرمایا "وہ ایک نہر ہے جس کا عرض مقام صنعاء سے ایلہ تک سمجھنا چاہئے ان کے (پانی پینے کے برتن) آسمان کے تاروں میں شمار ہوں گے۔ اس میں ایسے پرندے پانی پینے کو آئیں گے جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں کی طرح ہوں گی۔" راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو ضرور نرم و نازک ہوں گے۔" آپؐ نے فرمایا "ان کا کھانا کھانے والا ان سے زیادہ نازک ہو گا۔" ابن اسحاق کے بقول ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جس شخص نے اس میں سے پانی پی لیا وہ کبھی پیاسا نہ ہو گا[5]۔" اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ مختلف امور سے واقف ہونے کیلئے رسول اللہ ﷺ سے کھل کر بات کرتے اور اپنے محسوسات کو بلا جھجک بیان کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ تقسیم کیا' تو میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ اہل صفہ تو ان سے زیادہ حقدار ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "یا تو تم لوگ مجھ سے لایعنی اور فضول سوال کرتے ہو یا پھر بخیل جانتے ہو' حالانکہ میں بخیل نہیں ہوں[6]۔" یہ جواب سننے کے بعد حضرت عمرؓ کے کیا تاثرات تھے روایت میں تو اس کا ذکر نہیں ہے' لیکن ہم ان کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ انہیں خوب ندامت و شرمندگی ہوئی ہو گی۔ ایک سعادت مند شاگرد ہونے کی وجہ سے نپی تلی بات کی اور سوال کی

---

(۱) مسند: ۱/۱۷۰' عبدالرزاق: ۱/۲۹۱' نسائی: ۱/۲۹۱' مالک: ۱/۳۱۹ (۲) بخاری: ۱/۸۸' مسلم: ۱/۴۵۷ (۳) سورہ النساء: ۱۰۱ (۴) مسلم: ۲/۱۴۳'
حنبل: ۱/۲۶' نسائی: ۳/۱۰۳' سبعہ: ۱/۱۵۹ (۵) مسند: ۱/۲۱۱ (۶) حنبل: ۱/۲۰

ے پر پچھتاۓ ہوں گے کیونکہ ایک شاگرد کے طرز سوال کی اصلاح کیلئے استاد کا اس سے بہتر طریقہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے رویے میں اس سے لازمی طور پر تبدیلیاں رونما ہوئیں اور آپ آہستہ آہستہ آداب شاگردی سے پوری طرح آشنا ہو گئے اور پھر عالم یہ تھا کہ جو بات بھی دریافت کرنی ہوتی تھی ہمیشہ ں کے موقع محل کا پورا لحاظ رکھتے اور نہایت مناسب طریقے سے معلوم کرتے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں ،مثلاً حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "حضور ﷺ ہر نماز کیلئے وضو کرتے تھے' جب فتح مکہ کا دن آیا تو آپؐ نے سب نمازوں کو ایک ہی وضو سے پڑھا "حضرت عمرؓ نے آپؐ سے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! آپؐ نے آج ایسا کام کیا جو کبھی نہیں کرتے تھے (یعنی ہمیشہ آپؐ ہر ایک نماز کیلئے وضو کیا کرتے تھے اور آج کئی نمازیں ایک وضو سے پڑھیں)" آپؐ نے فرمایا "میں نے قصداً ایسا کیا ہے اے عمرؓ!"[1]۔

حکمت و بصیرت کا یہ تقاضہ ہے کہ معلم جب غصے کی حالت میں ہو تو اس سے سوال نہ کیا جائے مبادا کہ غصے میں مزید اضافہ ہو اور یہ سوئے ادب بھی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا۔ پھر نبی کریم ﷺ کی حیثیت محض معلم کی ہی نہیں' بلکہ پیغمبر خدا کی تھی۔ آپ کو ناگوار گزرنے والا کوئی سوال غارت اعمال کا سبب بن سکتا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی تو غلطی سے دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا۔ پھر مسجد کے آگے لگی ہوئی ایک لکڑی کی طرف گئے' اس کے اوپر نیچے ہاتھ رکھے' اس وقت آپ کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔ جلد باز لوگ چلے گئے اور باقی یہ کہہ رہے تھے کہ نماز کم ہو گئی ہے۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی تھے' دونوں خوف کی وجہ سے آنحضور ﷺ سے بات نہ کر سکے۔ ایک شخص کھڑا ہوا' جس کا نام ذوالیدین تھا اور عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! آپ بھول گئے ہیں یا نماز کم ہو گئی ہے؟" آپؐ نے فرمایا "نہ میں بھولا ہوں اور نہ ہی نماز کم ہو گئی ہے۔" اس نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! آپؐ بھول گئے ہیں۔" آپؐ لوگوں سے مخاطب ہوئے اور پوچھا "کیا یہ سچ کہتا ہے؟" لوگوں نے اشارے سے کہا کہ ہاں! آپ پھر امامت کی جگہ پر آئے اور باقی ماندہ رکعتیں پڑھیں' پھر سلام پھیرا۔ اس کے بعد اللہ اکبر کہا اور باقی سجدوں کے برابر یا کچھ لمبا سجدہ کیا' پھر اللہ اکبر کہہ کر دوسرا سجدہ کیا[2]۔ حضرت عمر فاروقؓ سوالات پوچھنے میں جری ہونے کے باوجود اس موقع پر خاموش رہے۔ یہ خاموشی بظاہر ان کی طبیعت کے برعکس تھی' لیکن اگر ہم غور کریں' تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بصیرت و فراست کے عین مطابق تھی۔ وہ مزاج شناس نبوت بھی تھے' ایسے معاملات کی نزاکتوں کو سمجھنے والے بھی۔ آنحضور ﷺ کے چہرۂ اقدس پر غصے کے آثار دیکھ کر انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ صورت حال کے واضح ہونے کا انتظار کریں۔ ایک سعادت مند شاگرد کی حیثیت سے ہمیشہ آپ کا یہی طرز عمل رہا۔ ایک اور روایت سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ ایک شخص 'یارسول اللہ ﷺ کے پاس' اور عرض کیا کہ آپ کیوں کر رکھتے ہیں روزہ؟ اس پر آپ ﷺ غصہ ہو گئے (سوال پوچھنے کا انداز غلط تھا۔) حضرت عمرؓ نے جب آپ کا غصہ دیکھا تو عرض کیا "رضینا باللہ ربا وبالاسلام دینا و بمحمد نبیا نعوذ باللہ من غضب اللہ و غضب رسولہ نبیما بیعۃ" (ہم راضی ہوئے اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر اور پناہ مانگتے ہیں ہم اللہ اور اس کے رسول کے غصے اور اپنی بیعت سے کہ وہی بیعت ہے۔)

یہ کلمات بار بار دہراتے رہے یہاں تک کہ آپ کا غصہ ختم ہو گیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ "یارسول اللہ ﷺ جو ہمیشہ روزہ رکھے وہ کیسا ہے؟" آپؐ نے فرمایا "نہ اس نے روزہ رکھا نہ افطار کیا۔" پھر کہا "جو دو دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے وہ کیا؟" آپؐ نے فرمایا "ایسی طاقت کس کو ہے (یعنی اگر طاقت ہو تو خوب ہے)۔" پھر کہا "جو ایک دن روزہ رکھے ایک دن افطار کرے؟" آپؐ نے فرمایا "یہ روزہ ہے داؤد علیہ السلام

(۱) [illegible] ۸۶۱ (۲) ابوداؤد، ۱/۳۶۳۔

کا۔" پھر کہا "جو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن افطار کرے؟" آپؐ نے فرمایا کہ "میں آرزو رکھتا ہوں کہ مجھے اتنی طاقت ہو (یعنی یہ بھی خوب ہے اگر طاقت ہو۔)" پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تین روزے ہر ماہ اور رمضان کے روزے ایک کے بعد دوسرے رمضان تک یہ ہمیشہ کا روزہ ہے (یعنی ثواب میں) اور عرفہ کے دن کا روزہ ایسا ہے کہ میں امیدوار ہوں اللہ پاک سے کہ ایک سال اگلے اور ایک سال پچھلے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور عاشورے کے روزہ سے امید رکھتا ہوں ایک سال اگلے کا کفارہ ہو جائے (۱)۔" اس طرح حضرت عمرؓ نے اپنے استادؐ کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کیلئے نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار کیا۔ پھر ایک اور شخص کے خلاف ادب انداز کے مقابلے میں ایسے کلمات کہے' جو ایمان' عقیدت اور فرمانبرداری و ادب سے لبریز تھے اس طرح اس کی غلطی کا ازالہ کر دیا۔ پھر جونہی مناسب موقع دیکھا' تو صرف وہی سوال ہی نہیں' جو اس شخص نے کیا تھا اس سے متعلقہ اور بھی بہت سے سوالات نہایت اچھے انداز سے پوچھے اور خاطر خواہ جوابات حاصل کئے۔ اس طرح انہوں نے ہر دور کے طالب علموں کیلئے ایک روشن مثال قائم کی' جسے دیکھ کر وہ اپنے طالب علمانہ طرز عمل کو صحیح خطوط پر استوار کر سکتے ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ بھی مجالس نبوی ﷺ میں حضرت عمرؓ کے طالب علمانہ کردار کی جھلک پیش کرتا ہے۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ ایک روز لوگوں نے آپؐ سے سوالات پوچھنا شروع کر دیئے یہاں تک کہ تنگ کر دیا۔ پھر آپؐ (غصے سے) منبر پر کھڑے ہوئے (ایک اور روایت کے مطابق ظہر کی نماز کے بعد) اور فرمایا "مجھ سے پوچھو! اور جو چیز بھی پوچھو گے میں اسے بیان کر دوں گا۔" جب لوگوں نے یہ سنا تو خاموش ہو گئے اور ڈرے کہ کہیں ایسی ویسی بات نہ ہو جائے (یعنی عذاب سے ہلاک نہ ہو جائیں۔) حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا کہ ہر شخص کپڑے میں اپنا سر لپیٹے رو رہا تھا۔ آخر ایک شخص مسجد میں اٹھا' جس سے لوگ جھگڑتے تھے اور اسے اس کے باپ کے علاوہ کسی اور نام سے پکارتے تھے' پوچھا "اے اللہ کے نبی ﷺ! میرا باپ کون ہے؟"

آپؐ نے جواب دیا' "تیرا باپ حذیفہ ہے۔"

اتنے میں حضرت عمر فاروقؓ اٹھے اور عرض کیا "ہم اللہ کے رب ہونے' اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہیں اور فتنوں کی برائی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' میں نے آج کی طرح بھلائی اور برائی کبھی نہیں دیکھی۔ جنت اور دوزخ دونوں کی شکل میرے سامنے لائی گئی' میں نے ان دونوں کو اس دیوار کے پاس دیکھا (۲)۔" اسی واقعہ کو حضرت ابو موسیٰ اشعری نے یوں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کچھ ایسی باتیں دریافت کی گئیں جو آپ کو ناگوار ہوئیں اور جب (اس قسم کے سوالات کی) آپؐ پر بہت زیادتی کی گئی' تو آپ کو غصہ آ گیا اور پھر آپؐ نے لوگوں سے فرمایا (اچھا اب) مجھ سے جو چاہو پوچھو' تو ایک شخص نے دریافت کیا کہ میرا باپ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا "تیرا باپ حذافہ ہے۔" پھر دوسرا آدمی کھڑا ہوا' اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا "کہ تیرا باپ سالم شیبہ کا آزاد کردہ غلام ہے۔" آخر حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرے کا حال دیکھا تو عرض کیا "یارسول الله انا نتوب الی الله عز و جل۔" (اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم اللہ رب العزت سے توبہ کرتے ہیں۔) جیسا کہ شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ناراض ہونے کی وجہ یہ تھی غیر ضروری اور غیر متعلق سوالات کئے گئے۔ آپؐ نے اس لئے ناپسند فرمایا کہ کہیں مسلمانوں کیلئے کسی شی کی تحریم کا باعث نہ بن جائیں' یا ان کیلئے اذیت' مشکلات یا ہلاکت کا باعث ہو۔ آنحضور ﷺ نے ناراضی کے عالم میں یہ فرمایا کہ مجھ سے جو چاہو پوچھو۔ اس کے باوجود بعض اصحاب نے اس بات کو نظر انداز کر کے بے فائدہ سوالات کرنے شروع کر دیئے (۳)۔

(۱) مسلم، ۳/۱۶۷ (۲) بخاری، ۱/۳۲' مسلم ۷/۹۳ (۳) بخاری ۱/۳۱' مسلم ۷/۹۶۔

حضرت عمر فاروقؓ اپنی فراست کی بنا پر بات کی تہہ تک پہنچ گئے اور فوراً ایسے فتنوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ بھی مانگی اور توبہ بھی کی۔ انہیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ سوالات شک وبغاوت کی بناء پر نہ ہوں کہ ان کی وجہ سے اللہ کا عذاب ٹوٹ پڑے[1]۔ انہوں نے یہ جملہ کہہ کر تمام لوگوں کو بالواسطہ غلطی کا احساس دلا دیا اور خاموش کرا دیا اور آنحضور ﷺ کے غصے کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن ثابت سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن الخطابؓ آئے اور عرض کیا "اے اللہ کے رسول ﷺ میں یہود میں سے اپنے ایک بھائی کے پاس گیا تو اس نے توراۃ کی جوامع (تعلیمات) میں سے مجھے کچھ لکھ دیا تو کیا میں آپ کی خدمت میں پیش کروں؟" (یہ سن کر) رسول اکرم ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تو عبداللہ نے کہا تمہاری عقل ماری گئی کیا تم رسول اللہ ﷺ کا چہرہ نہیں دیکھتے۔ تب حضرت عمرؓ نے عرض کیا "میں اللہ کے رب ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہوا[2]۔" اس پر رسول اکرم ﷺ کی وہ کیفیت جاتی رہی، پھر آپؐ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر تم میں موسیٰ علیہ السلام آ جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرو تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔" پھر فرمایا "امتوں میں تم میرا نصیب ہو اور انبیاء میں سے میں تمہارا نصیب ہوں[3]۔"

کتب احادیث و تواریخ شاہد ہیں کہ انہوں نے بطور طالب علم مجلس نبوت میں کبھی کوئی ایسا سوال نہیں کیا جو سرور کونین ﷺ کی ناراضی کا باعث بنے۔ ہمیشہ سوچ سمجھ کر اور بچا تلا سوال کرتے اور یہ توقع رکھتے تھے کہ آپؐ اس کا جواب بھی دیں گے۔ ان کے نزدیک رسول خدا ﷺ کا خاموش ہو جانا انتہائی سنگین بات تھی کیونکہ اس میں سوال کے غلط یا بے موقع ہونے کا احتمال پایا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ کس قدر حساس تھے؟ اس کا اندازہ ان کے خادم حضرت اسلمؓ کی روایت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کسی سفر میں تھے (سفر حدیبیہ میں) رات کا وقت تھا اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے کچھ پوچھا لیکن آپؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے پھر پوچھا آپؐ نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے پھر پوچھا آپؐ نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (اپنے دل میں) کہا "عمرؓ! تیری ماں تجھے روئے۔ رسول اللہ ﷺ سے تم نے تین مرتبہ سوال کیا جو آپ کو پسند نہیں تھا۔ چنانچہ آنحضور ﷺ نے تمہیں ایک مرتبہ بھی جواب نہیں دیا۔" عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ پھر میں نے اپنے اونٹ کو ایڑ لگائی اور مسلمانوں سے آگے نکل گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے بارے میں کوئی وحی نازل نہ ہو جائے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ میں نے سنا ایک شخص مجھے آواز دے رہا تھا۔ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے سوچا کہ میں تو پہلے ہی ڈر رہا تھا کہ میرے بارے میں کہیں کوئی وحی نازل نہ ہو جائے۔ بہر حال میں آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو سلام کیا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ رات مجھ پر ایک سورۃ نازل ہوئی ہے اور وہ مجھے اس تمام کائنات سے عزیز ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے پھر آپ نے "انا فتحنا لک فتحا مبینا[4]۔" (بے شک ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح دی ہے) کی تلاوت فرمائی[5]۔

رسول اکرم ﷺ نے نزول وحی کی کیفیت میں مشغول ہونے کی وجہ سے جواب نہ دیا[6] لیکن حضرت عمرؓ نے یہی سمجھ کہ شاید ان کا سوال ناپسندیدہ تھا۔ اس بنا پر ان کے دل میں جو خوف اور وسوسے پیدا ہوئے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے استاد محترم کے مقام و مرتبے کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور ان کی سچائی و صداقت پر ایمان کامل رکھتے تھے۔ ان کی رضامندی و ناراضی کو خالق کائنات کی رضامندی و ناراضی کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کی ہر رائے اور حکم فکر و عمل کی راہوں میں ان کیلئے قندیل رہنما تھا۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے منہ سے نکلا ہوا کوئی جملہ اس کے برعکس ہو۔ حضرت حارثؓ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ

---

(۱) عسقلانی ۱۹۱/۱ کرمانی ۲ /۸۲ (۲) حجر ۱۵۲/۱۷ (۳) عبدالرزاق ۲۱۳/۱۰، دارمی ۱۱۵/۱ دارمی کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے کہا تھا ... والباب ... (٤) سورہ الفتح ۱/٤۸ (۵) بخاری ۶۷/۵ مالک ۲۰۳/۱، احمد ۲٤٦/۱، ترمذی ۶۱/۵، واقدی ۲/۳۱ (٦) حجر ٤۷۲/۸۔

عمرؓ کے پاس آیا اور پوچھا کہ اگر کوئی عورت یوم النحر کو خانہ کعبہ کا طواف کرے اور پھر اسے حیض آ جائے تو کیا کرے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا "کہ وہ (انتظار کرے اور) طواف وداع کر کے جائے۔" حضرت حارثؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ "مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا ہی بتلایا تھا۔" حضرت عمرؓ نے (ناراض ہو کر) کہا "اربت عن یدك سالتنی عن شیء سالت رسول اللہ ﷺ لکیما اخالف [۱]۔" (تو نے مجھ سے وہ بات پوچھی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے پوچھ چکا تھا تاکہ میں اس کے خلاف بیان کروں۔)

ان ساری احتیاطوں کے باوجود بطور طالب علم اپنی اس ذمہ داری سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ اپنے استاد مکرم سے ہر وہ بات پوچھ لیں جس کا جاننا ضروری ہو۔ خاص طور پر وہ امور جس کا سماجی اور عملی زندگی سے گہرا تعلق ہے حضرت عمرؓ کی تحقیق و جستجو کا اصل موضوع ہوتے تھے۔ علم کو حاصل کرنے اور دین کو سمجھنے میں وہ کبھی شرم و جھجک کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ حضرت عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے کہ قبیلہ جہنیہ کی ایک عورت نے نبی کریم ﷺ کے سامنے زنا کا اقرار کیا اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ میں حاملہ ہوں۔ آنحضور ﷺ نے اس کے ولی سے فرمایا "اس کو بہت اچھی طرح رکھو جب بچہ جن لے تو مجھے خبر دینا۔" اس نے ایسا ہی کیا پھر آپؐ کے حکم سے اسے کپڑے باندھ کر رجم کیا گیا پھر آپؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے پوچھا "یا رسول اللہ ﷺ آپؐ نے اسے رجم بھی کرایا ہے پھر اس پر نماز بھی پڑھتے ہیں؟" آپؐ نے جواب دیا "اس کی توبہ ایسی قبول ہوئی ہے کہ اگر اسے مدینے کے ستر آدمیوں پر تقسیم کیا جائے تو سب کیلئے کافی ہو۔ کیا تو اس سے افضل کوئی چیز پاتا ہے کہ اس نے اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دی؟ [۲]۔"

حضرت عمرؓ کی یہ دلی خواہش تھی ان کی اولاد بھی علم اور دین کی سمجھ میں بہت نمایاں ہوں ایک بھرپور علمی ذوق رکھنے والے شخص کیلئے اس سے بڑھ کر اور سرمایہ کیا ہو سکتا ہے؟ معلم انسانیت ﷺ وقتاً فوقتاً اپنے شاگردوں کے علم و فہم کا امتحان فرماتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے ایسا ہی سوال دریافت فرمایا تو حضرت عمرؓ اپنے بیٹے کی طرف سے صحیح جواب دینے کے کس قدر متمنی تھے؟ اس کا اندازہ درج ذیل روایت سے لگایا جا سکتا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (ایک مرتبہ) پوچھا کہ درختوں میں سے ایک درخت (ایسا) ہے جس کے پتے (کبھی) نہیں جھڑتے اور اس کی مثال مسلمان جیسی ہے مجھے بتلاؤ وہ کیا (درخت) ہے؟ تو لوگ جنگلی درختوں (کے خیال) میں پڑ گئے اور میرے جی میں آیا کہ وہ کھجور (کا پیڑ) ہے۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ پھر مجھے شرم آ گئی تب لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ ہی (خود) اس کے بارے میں بتلایئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وہ کھجور ہے۔" عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے جی میں جو بات تھی وہ میں نے اپنے والد (حضرت عمرؓ) کو بتائی وہ کہنے لگے کہ اگر تو (اس وقت) کہہ دیتا تو میرے لئے ایسے ایسے قیمتی سرمایہ سے زیادہ محبوب تھا [۳]۔

معلم انسانیت ﷺ کے حلقہ درس و تدریس اور مجالس تعلیم و تعلم میں حضرت عمر فاروقؓ ہمیشہ موءدب ذہین اور علمی ذوق و شوق رکھنے والے یکسو طالب علم کے طور پر شریک ہوتے اور بھرپور استفادہ کرتے۔ ہر بات پوری توجہ سے سنتے اس پر غور و خوض کرتے اس کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتے پھر جب اطمینان حاصل ہو جاتا تو سے ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ علم و فضل اجتہادی بصیرت اور دین کی سمجھ میں تمام صحابہ کرامؓ پر فوقیت رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے عالم فقیہ صحابیؓ فرماتے ہیں "ان عمر کان اعلمنا باللہ واقرانا لکتاب اللہ و افقھنا فی دین اللہ [۴]۔" (بلاشبہ عمرؓ اللہ کی ہم سب سے زیادہ معرفت رکھنے والے اور اللہ کی کتاب کے ہم سب سے زیادہ قاری و عالم اور اللہ کے دین کو ہم سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔) حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں "کان علم الناس کلھم قد درس فی علم عمر [۵]۔" (تمام انسانوں کا علم حضرت عمرؓ کے علم میں شامل تھا۔)

(۱) داؤد ۲۸۱/۲ (۲) ترمذی ۴۲۲/۲، نسائی ۶۳/۱ (۳) بخاری ۱/۲۴۳، ۳۶۷/۲ (۴) ... ۲۶/۱۲ (۵) ... ۱۱۴۹/۲

حضرت عمر فاروقؓ کا یہ سارا علم در حقیقت سرچشمہ نبوت سے اکتساب کیا ہوا تھا۔ ان کا جو بھی علمی مقام و مرتبہ ہے' وہ معلم انسانیت کے تلمیذ ہونے کی بنا پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس تلمیذ خاص کی تربیت کی اور اسے علمی وارث بنایا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے "میں نے خواب میں دودھ پیا اور سیرابی کے اثر کو ناخنوں تک محسوس کیا پھر وہ پیالہ عمرؓ کو دے دیا۔" صحابہؓ نے پوچھا "یا رسول اللہ ﷺ! اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟" فرمایا "علم[1]۔" یہ اسی تربیتی عمل کا حصہ تھا کہ سرورِ کائنات ﷺ کی موجودگی میں حضرت عمر فاروقؓ جس بات کو دینی اعتبار سے غلط سمجھتے اسے ٹوکتے اور آپؐ اس کا برا منانے کے بجائے تصدیق کر کے حوصلہ افزائی کرتے اور یہ سلسلہ جاری رہتا۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

ارزق بن قیس سے روایت ہے کہ ہم نے ابورمثہ کی امامت میں نماز پڑھی' بعد ازاں انہوں نے بتایا کہ میں نے یہی یا ایسی ہی نماز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھی۔ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ پہلی صف میں دائیں جانب کھڑے ہوئے تھے۔ ایک شخص تکبیر اولیٰ میں شریک ہوا نبی ﷺ نے جب داہنی اور بائیں جانب سلام پھیرا تو ہم نے آپؐ کے گالوں کی سفیدی دیکھی۔ اتنے میں تکبیر اولیٰ پانے والا شخص کھڑا ہوا تاکہ دو رکعت نفل پڑھے۔ حضرت عمر فاروقؓ اس کی طرف لپکے اور کندھے سے پکڑ کر ہلایا اور اسے بٹھا دیا۔ کہا کہ یہود و نصاریٰ اسی وجہ سے تباہ ہو گئے کہ انہوں نے ایک نماز کو دوسری نماز سے الگ نہ کیا۔ نبی ﷺ نے نظر اٹھا کر دیکھا اور فرمایا "اے ابن خطاب' اللہ تعالیٰ نے تجھے درست بات کہنے کی توفیق دی ہے[2]۔" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں نے شہر کے دور دراز گوشے میں ایک عورت سے لطف اٹھایا ہے سوائے بدکاری کے اس سے سب کچھ کیا ہے' اب میں حاضر ہوں جو چاہیں میرے بارے میں فیصلہ کریں۔" حضرت عمرؓ پکار اٹھے "اللہ نے تیرا عیب ڈھانپا ہے' تو بھی اگر اپنا عیب ڈھانپتا تو بہتر ہوتا۔" رسول اللہ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا' آخر وہ شخص اٹھ کر چلا گیا' پھر آپؐ نے پیچھے ایک آدمی کو بھیج کر اسے بلوایا اور یہ آیت پڑھی "اقم الصلوٰة طرفی النهار و زلفا من اللیل ان الحسنٰت یذهبن السیئات ذلك ذكرٰی للذاكرین[3]۔" (اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یہ ایک یاددہانی ہے ان لوگوں کیلئے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔) ایک شخص بولا یا رسول اللہ ﷺ! "کیا یہ حکم خاص اس کیلئے ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "نہیں! سب لوگوں کیلئے ہے[4]۔"

اس حدیث سے حضرت عمرؓ کی طالبعلمانہ جسارت کا پتہ چلتا ہے جو صرف انہیں کی ذات کا حصہ تھی۔ انہوں نے پہل کر کے اسے ٹوکا اور غلطی کا احساس دلایا۔ رسول اکرم ﷺ کا سکوت ان کی اس بات کی تصدیق کے مترادف تھا۔ پھر آپؐ نے مزید وضاحت کی ضرورت محسوس کی تو اسے واپس بلا لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ مجلس نبوی میں بھی منکرات و مکروہات کے خلاف آگے بڑھ کر اقدام کرنے کی جرأت رکھتے تھے اور دینی معاملات میں بڑے شدید تھے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے "اشد امتی فی امر الله عمر[5]۔" یہی وجہ ہے کہ لوگوں پر ان کا بڑا رعب و دبدبہ تھا' رسول اکرم ﷺ سے زیادہ ان سے ڈرتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ اپنی نرمی اور رحمت و شفقت کی بناء پر بعض چھوٹی موٹی باتوں سے صرف نظر فرماتے تھے' لیکن حضرت عمرؓ انہیں برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کی یہ صفت وسیع تر دینی مقاصد کے حصول اور انسداد منکرات میں ممد و معاون ثابت ہوتی تھی' اس لئے نبی کریم ﷺ ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے آنحضور ﷺ سے اندر آنے کی اجازت چاہی' اس وقت قریش کی عورتیں (امہات المومنین) آپؐ سے باتیں

---

(۱) بخاری ۱۹۸/٤' مسلم ۷/۱۱۲' حبان ۹/۱٦' ترمذی ۲۸۲/٥' حاکم ۸٦/۳' دارمی ۱۲۸/۲' حمیدی ۲٥' (۲) داؤد ۱/۲٦۳ (۳) سورہ ہود ۱۱/۱۱٤ (٤) مسلم ۱۰۲/۸ (٥) سعد ۲۹۱/۳۔

کر رہی تھیں اور زیادہ خرچ مانگ رہی تھیں ان کی آواز آپ کی آواز پر غالب ہو گئی تھی۔ جب حضرت عمرؓ نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو سب لپک کر پردے کے پیچھے ہو گئیں۔ آنحضور ﷺ نے انہیں اجازت دی وہ اندر آئے تو آپ ہنس رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو ہنستا رکھے۔ آپؐ نے فرمایا "مجھے ان عورتوں پر تعجب ہوا جو ابھی میرے پاس بیٹھی تھیں کہ جونہی انہوں نے تمہاری آواز سنی تو لپک کر پردے کے پیچھے چل دیں۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "یا رسول اللہ ﷺ! چاہئے تو یہ تھا کہ میری نسبت آپؐ سے زیادہ ڈرتیں (آپ کا زیادہ استحقاق ہے کہ آپ سے ڈرتیں) پھر عورتوں کو مخاطب کر کے کہا "اے اپنی جانوں کی دشمنو! مجھ سے تو ڈرتی ہو لیکن رسول اللہ ﷺ سے نہیں ڈرتیں؟" انہوں نے کہا "ہاں! آپ آنحضرت ﷺ سے زیادہ غصیلے اور سخت ہیں۔" اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ایھا یاابن الخطاب والذی نفسی بیدہ مالقیک الشیطان سالکا فجا قط الا سلک فجا غیر فجک[1]۔" (اے ابن خطابؓ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے جب شیطان تم کو کسی راہ میں چلتا ہوا ملتا ہے تو اس راہ کو چھوڑ کر جس راہ پر تو چلتا ہے کسی دوسرے راستے پر چلتا ہے۔)

ایک اور واقعہ سے بھی حضرت عمر فاروقؓ کے رعب و دبدبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ہم نے ایک شور سنا اور بچوں کے گانے کی آواز بھی سنی رسول اللہ اٹھے تو دیکھا کہ ایک حبشن ناچ رہی ہے اور کھیل رہی ہے اور اس کے چاروں طرف بچے جمع ہیں اور آنحضور ﷺ نے فرمایا "عائشہؓ آؤ اور دیکھو" میں گئی اور میں نے اپنی ٹھوڑی رسول اللہ ﷺ کے کندھے پر رکھ دی اور سر کے درمیان سے حبشن کا تماشا دیکھنے لگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ابھی تمہارا جی نہیں بھرا؟" میں کہنے لگی "نہیں" تاکہ میں اپنے مرتبہ کا آپ کے نزدیک اندازہ کروں۔ "اتنے میں حضرت عمرؓ آ گئے ان کا آنا تھا کہ لوگ حبشن کے پاس سے منتشر ہو گئے (اور مجمع درہم برہم ہو گیا) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "انی لانظر الی شیاطین الجن والانس قد فروا من عمر قالت فرجعت[2]۔" (میں جن اور انس کے شیطانوں کو دیکھتا ہوں کہ عمرؓ کو دیکھ کر بھاگ گئے۔) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں تب میں واپس آ گئی۔ حضرت عمر فاروقؓ کا یہی رعب و دبدبہ تھا جو لوگوں کے خلاف شرع رسومات و رواج اور عادات واطوار کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ اس طرح کا ایک اور واقعہ بھی ہمیں کتب احادیث میں یوں ملتا ہے۔ حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی غزوہ کیلئے باہر تشریف لے گئے جب واپس آئے تو ایک کالی لڑکی آئی اور اس نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح سالم واپس لائے گا تو میں آپؐ کے سامنے دف بجاؤں گی اور گانا گاؤں گی۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اگر تو نے نذر مانی تھی تو بجا ورنہ نہیں" وہ لڑکی دف بجانے لگی اتنے میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے لیکن پھر بھی وہ دف بجاتی رہی پھر حضرت عثمانؓ تشریف لائے لیکن وہ اسی طرح دف بجاتی رہی۔ پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے تو وہ لڑکی اپنے دف کو سرین کے نیچے رکھ کر اس پر بیٹھ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان الشیطان یخاف منک یا عمر انی کنت جالسا وھی تضرب فدخل ابوبکر وھی تضرب ثم دخل علی وھی تضرب فلما دخلت انت یاعمر القت الدف[3]۔" (اے عمرؓ تم سے شیطان ڈرتا ہے۔ میں بیٹھا ہوا تھا لیکن یہ لڑکی دف بجاتی رہی ابوبکرؓ آئے تب بھی یہ دف بجاتی رہی علیؓ آئے پھر بھی دف بجاتی رہی عثمانؓ آئے تب بھی دف بجاتی رہی مگر اے عمرؓ جب تم داخل ہوئے تو اس نے دف رکھ دیا۔)

رسول اکرم ﷺ جب کسی معاملے میں اپنے شاگرد کی شدت کو غیر ضروری خیال کرتے تو اصلاح بھی فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں تشریف لائے دیکھا کہ حبشی کھیل رہے ہیں اس پر انہیں ڈانٹا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے عمرؓ ان کو کھیلنے دو یہ بنی ارفدہ

---

(۱) بخاری ج ۴ ص ۱۹۹، مسند ج ۱ ص ۱۱۵، حصہ ۹ ص ۲۱۹، جوہر ج ۱۸، حصہ ۳ ص ۴۱ (۲) ترمذی ج ۵ ص ۲۸۴، جوہری ج ۱۸ (۳) ترمذی ج ۵ ص ۲۸۴

ہیں[1]۔ اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ بھی ہے کہ کسی بات پر حضرت عمر فاروقؓ نے کسی کو ٹوکا لیکن رسول اکرم ﷺ نے اجازت دی۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ عمرۃ القضا کے موقع پر نبی کریم ﷺ مکے میں داخل ہوئے تو حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ آپؐ کے سامنے چل رہے تھے اور یہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ

الیوم نضربکم علی تاویلہ

ضربا یزیل الھام عن مقیلہ

و یذھل الخلیل عن خلیلہ

(اے کافروں کے بیٹو! ان کی راہ سے ہٹ جاؤ ورنہ ان کے حکم سے ہم تمہیں خوب ماریں گے۔ ایسی ضرب سے کہ جو سر کو تن سے الگ کر دے گی اور دوست کو دوست سے جدا کر دے گی۔)

حضرت عمرؓ نے جب دیکھا تو فرمایا "اے ابن رواحہؓ! تم اللہ کے حرم میں اور اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے یہ اشعار پڑھتے ہو؟" رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "اے عمرؓ! اسے پڑھنے دو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اس کا کلام کافروں پر تیر مارنے سے بھی زیادہ سخت ہے[2]۔

مجالس نبوی میں حضرت عمر فاروقؓ کے اس طرز عمل اور بھرپور شرکت، کھلے علمی و تربیتی ماحول، آنحضور ﷺ کی خصوصی توجہ نے ان پوشیدہ صلاحیتوں کو جلا بخشی ان کے بے پناہ فکری و علمی جوہروں کو اظہار و نمو کا موقع فراہم کیا اور ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں بہت نمایاں کردار سرانجام دیا۔ پھر سرور کونین ﷺ نے چھوٹے بڑے انفرادی و اجتماعی تمام معاملات میں ان کی تربیت و تزکیے کا عمل جاری رکھا۔ آپؐ یہ جانتے تھے کہ ان کا یہ شاگرد رشید مستقبل میں ایک مستحکم اسلامی ریاست کا معمار، عظیم منتظم و مدبر، معلم و مجتہد، سپہ سالار و فاتح بنے گا۔ اس کی خداداد صلاحیتیں پیغمبرانہ مشن کی ترویج و اشاعت اور فروغ و نفاذ میں بے مثال کارنامے کا باعث بنیں گی۔ اس لئے ان کی سیرت و کردار کا کوئی پہلو بھی تشنہ تربیت نہ رہنے دیا۔

ایک سفر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ کو اپنے باپ کی قسم کھاتے ہوئے سنا تو فرمایا "اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے باپ کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے۔ تم میں سے اگر کوئی قسم کھانا چاہے، تو اللہ تعالیٰ کی کھائے ورنہ چپ رہے[3]۔ "حضرت عمر فاروقؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم میں نے پھر اس طرح کی قسم کبھی نہیں کھائی۔ نہ تو کوئی چیز خود بیان کرتے ہوئے اور نہ ہی کسی کی طرف سے حکایت کرتے ہوئے[4]۔" یہ حدیث معلم کی طرف سے تنبیہ اور متعلم کی طرف سے بلا چون و چرا اور مستقل اطاعت کی بہترین مثال ہے۔ حضرت عمرؓ کی بھی یہ عادت تھی کہ فرمانبردار شاگرد کی طرح ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اپنے معلم و مربی سے رہنمائی حاصل کرتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک شخص کو نہایت عمدہ گھوڑا فی سبیل اللہ ہبہ کر دیا۔ وہ شخص بڑا نادار تھا اس نے اسے تباہ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اسے سستے داموں بکتے ہوئے دیکھا، تو اسے خریدنے کا ارادہ فرمایا، مشورے کیلئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "اسے مت خرید اگر چہ تجھے ایک درہم میں ملے۔ اپنے صدقے کو لوٹانے والے کی مثال اس کتے کی ہے جو قے کر کے پھر سے چاٹتا ہے[5]۔"

حضرت عمرؓ کو جس بات سے روک دیا جاتا تو وہ اسے کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے، وہ اس بارے میں بہت حساس تھے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے (ریشم کا) دھاری دار کپڑا مسجد نبوی کے دروازے پر (فروخت ہوتے) دیکھا انہوں نے فرمایا کہ "یا رسول اللہ ﷺ بڑا اچھا

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible]

ہوتا اگر آپ اسے خرید لیتے اور جمعہ کے دن اور وفود جب آتے تو ان کی پذیرائی کیلئے آپ اسے پہنا کرتے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اسے تو وہی پہن سکتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو۔" اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس اسی طرح کے کچھ حلے آئے تو اس میں سے ایک حلہ آپؐ نے عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے یہ حلہ پہنا رہے ہیں حالانکہ اس سے پہلے عطارد کے حلوں کے بارے میں آپ کو جو کچھ فرمانا تھا فرما چکے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں پہننے کیلئے نہیں دے رہا چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے اپنے ایک مشرک بھائی کو دے دیا جو مکے میں رہتا تھا[1]۔ ان کے دل میں اپنے معلم کی تعلیمات پر ان کی روح کے مطابق عمل کرنے کا بے پناہ جذبہ موجزن تھا ان کے تمام خارجی افعال کا حقیقی محرک یہی تھا۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز تحفے میں آئی ہوئی دیبا کی قبا پہنی پھر اسے اتار کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیا جب لوگوں نے اتار ڈالنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا "مجھے جبرائیل علیہ السلام نے منع کر دیا ہے" یہ سن کر حضرت عمرؓ روتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جس چیز کو آپؐ نے ناپسند فرمایا وہ مجھے دے دی میرا کیا حال ہوگا؟" آپؐ نے فرمایا "میں نے تمہیں پہننے کیلئے نہیں دی بلکہ اس لیے دی ہے کہ اسے بیچ ڈالو" چنانچہ حضرت عمرؓ نے دو ہزار درہم میں بیچ دی[2]۔ اپنے معلم کی اطاعت میں اس قدر مخلص تھے کہ مادی سود و زیاں ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

حضرت عطاء بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کے پاس کچھ مال بھیجا انہوں نے اسے واپس لوٹا دیا۔ آنحضور ﷺ نے پوچھا "تم نے اسے کیوں واپس کیا ہے؟" جواب دیا "یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے فرمایا ہے کہ بہتر شخص وہ ہے جو کسی سے کچھ نہ لے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اس کا تو مطلب یہ ہے کہ مانگ کر کسی سے کچھ نہ لے۔ جو بن مانگے ملے وہ تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے۔" حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ نے کہا "اما والذی نفسی بیدہ لا اسال احدا شیئا ولا یاتینی شیء من غیر مسئلة الا اخذته[3]۔" (قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں اب کسی سے کچھ نہ مانگوں گا اور جو بن مانگے میرے پاس آئے گا اسے لے لوں گا۔)

مربی اعظم ﷺ ان میں صحیح و غلط کی پہچان اور رویے میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کیلئے ضروری ہدایات دیتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی رہی۔ حضرت عمرؓ کا اپنا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بھی مجھے کوئی چیز عطا فرماتے تو میں عرض کرتا کہ "آپؐ مجھ سے زیادہ محتاج کو دے دیں۔" آپؐ فرماتے کہ "اسے لے لو۔ اگر تمہیں کوئی ایسا مال ملے جس پر تمہاری حریصانہ نظر نہ ہو اور نہ ہی تم نے مانگا ہو تو اسے قبول کر لو اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو اس کے پیچھے نہ پڑو[4]۔" معلم انسانیت ﷺ اپنے شاگردوں کے حوال و معمولات سے عموماً باخبر رہتے تھے۔ آپؐ یہ بات جاننے کی کوشش فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کی دی ہوئی تعلیمات پر کس حد تک عمل کیا جا رہا ہے؟ ان سے لوگوں کی سیرتوں پر کس قدر مثبت اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟ در شخصیتوں کی تعمیر کے سلسلے میں آپ کا پیغمبرانہ مشن کہاں تک پورا ہو رہا ہے اس مقصد کیلئے کبھی کبھی اپنی مجلس میں سوالات بھی کرتے تھے۔ اس سے آپ کو معلومات بھی حاصل ہو جاتی تھیں۔ صحابہ کرامؓ کو عمل کی ترغیب بھی ملتی تھی، نیکیوں کے معاملے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا جذبہ بھی پروان چڑھتا تھا اور ان کے باہمی روابط کے استحکام، باہمی تعلقات کی اصلاح اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کا احساس بھی بیدار ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اسی طرح کے سوالات کے ذریعے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معمولات آپ کے سامنے آئے۔

---

(۱) بخاری ۲۲٤ مسلم ۱۳۷ مالک ۲ ۹۱۷ ابن ماجہ ۲ ۸۷ ۱ (۲) مسلم ٦ ١٤ طحاوی ۲ ۲۸۵ (۳) مالک ۲ ۹۹۸ (٤) بخاری ۲ ۱۳ مسلم ۳ ۹۸، حنبل ۱/۱۵ ۲۱، نسائی ۳/۵ ۱۰

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے پوچھا۔ "آج تم میں سے کون کسی جنازے میں شریک ہوا؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، "میں نے؟"

پھر پوچھا "آج تم میں سے کس نے کسی مریض کی عیادت کی ہے؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "میں نے۔"

پھر پوچھا۔ "آج تم میں سے کس نے صدقہ کیا ہے؟" حضرت عمرؓ نے کہا، "میں نے۔"

پھر پوچھا "آج تم میں سے کس نے اس حالت میں صبح کی ہے کہ روزے سے ہے؟" حضرت عمرؓ پکارے "میں نے۔"

اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "وجبت، وجبت [۱]۔" (کہ جنت واجب ہوگئی، جنت واجب ہوگئی۔) اسی طرح کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر اپنے شاگردان رشید حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ سے سوال پوچھا۔ حضرت ابو قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا کہ "آپ کب وتر پڑھتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "اول شب میں۔" پھر حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ "آپ کب وتر پڑھتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "آخر شب میں۔" پھر آپؐ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ "آپ نے احتیاط پر عمل کیا" اور حضرت عمرؓ سے فرمایا "آپ نے طاقت طلب کام کیا [۲]۔"

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ سرورِ دوجہاں ﷺ اپنے شاگردوں کے احوال و معمولات کا جو مشاہدہ فرماتے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ حسب ذیل ہے۔ ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک شب کو نکلے۔ انہوں نے ابو بکرؓ کو دیکھا چپکے چپکے نماز پڑھ رہے ہیں اور عمرؓ کو دیکھا بلند آواز سے قرات کر رہے ہیں۔ جب دونوں (ابو بکرؓ و عمرؓ) رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، آپؐ نے پوچھا "اے ابو بکرؓ میں جو تمہارے پاس گیا تو دیکھا تم چپکے چپکے نماز پڑھ رہے تھے۔" انہوں نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ میں اس کو سناتا تھا جو کانا پھوسی بھی سن لیتا ہے (یعنی خداوند کریم کو)۔" پھر آپؐ نے فرمایا "اے عمرؓ میں جو تمہارے پاس گیا تو دیکھا تم بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔" انہوں نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ میں سوتے کو جگاتا تھا اور شیطان کو بھگاتا تھا (یعنی پکار کر پڑھنے سے یہ غرض تھی کہ جو لوگ سو رہے ہیں نماز کو نہیں اٹھے وہ آواز سن کر چونک جائیں)۔" حسن کی روایت میں اتنا زیادہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے ابو بکرؓ تم اپنی آواز تھوڑی بلند کرو۔ اے عمرؓ تم اپنی آواز تھوڑی پست کرو [۳]۔"

حضرت ابو ہریرہؓ اس واقعہ کی تو تصدیق کرتے ہیں، لیکن اس بات سے اختلاف رکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صاحبین کو آواز پست یا بلند کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ابو ہریرہؓ سے روایت کی طرح ہے کہ اس قصہ میں نہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بکرؓ سے آواز بلند کرنے کو کہا نہ عمرؓ سے آواز پست کرنے کو، بلکہ بلالؓ سے آپ نے سنا تم تھوڑا سا اس سورت میں سے پڑھتے تھے اور تھوڑا اس سورت میں سے۔ انہوں نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ یہ کلام سب کا سب پاکیزہ ہے، اللہ ایک کو دوسرے سے ملاتا ہے۔" آپؐ نے فرمایا "تم سب نے ٹھیک کیا [۴]۔" اس طرح چھوٹے بڑے سب معاملات میں معلم انسانیت ﷺ اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ فرماتے تھے۔ دعا عبادت کا مغز، نسانی جذبات و حساسات کا عکس اور خواہشات و عزائم کا مظہر ہوتی ہے۔ انسان تنہائی کے لمحات میں اپنے رب سے جو کچھ مانگتا ہے، اس سے دراصل اس کے مقاصد زندگی جھلکتے ہیں۔ سرور کونین ﷺ نے اپنے اس شاگرد رشید کو حسب ذیل دعا سکھائی۔ اس کے راوی حضرت عمر فاروقؓ خود ہیں "اللھم اجعل سریرتی خیرا من علانیتی واجعل علانیتی صالحة اللھم انی اسئلك من صالح ما تؤتی الناس من المال والاھل والولد غیر الضال ولا المضل [۵]۔" (اے اللہ میں تجھ سے اس میں سے بہتر کا سوال کرتا ہوں جو تو انسانوں کو مال و دولت، اہل خانہ اور اولاد میں سے دیتا ہے۔

(۱) مسلم ۱۲/۳۷ (۲) داؤد ۲/۸۹ (۳) داؤد ۲/۵۱ (۴) ابو داؤد ۲/۵۲ (۵) ترمذی ۵/۲۳۱۔

وہ یہ کہ نہ تو وہ خود گمراہ ہوں اور نہ دوسروں کو گمراہ کریں۔)

یہ ہے معلم انسانیت ﷺ کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت و شخصیت کی تصویر جس کے نمایاں خدوخال حسب ذیل ہیں

۱۔ حضرت عمرؓ بے پناہ علمی ذوق و شوق رکھتے تھے اس لئے انہوں نے آنحضور ﷺ سے علمی طور پر بھرپور فائدہ اٹھایا۔

۲۔ حصول علم میں نہ تو شرماتے تھے اور نہ ہی جھجکتے تھے۔ دیگر صحابہ کرامؓ کی بہ نسبت زیادہ بے باکی سے آنحضور ﷺ سے سوالات پوچھا کرتے تھے۔

۳۔ طلب علم میں آداب و احترام کا پورا لحاظ رکھتے۔ ان کا سوال ہمیشہ اہم اور موقع و محل کی مناسبت سے ہوتا تھا اور انداز بھی نہایت معیاری ہوتا تھا۔

۴۔ آنحضور ﷺ کے ارشادات و فرامین کے مقاصد و مصالح کی گہرائیوں میں بہت جلد اتر جاتے اور صحیح معنوں میں اپنے معلم کے مزاج شناس تھے۔

۵۔ انہیں اپنے معلم اور ان کے علم و فہم کی سچائی و صداقت پر کامل ایمان و یقین تھا۔ اس کے سوا کوئی بات بھی ان کیلئے باعث کشش نہ تھی۔ ہر چیز کو اسی کسوٹی پر پرکھ کر رد و قبول کرتے۔

۶۔ مختلف احکام و مسائل پر دینی نقطہ نظر سے ہمیشہ غور و خوض کرتے رہتے تھے۔ ان کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر ڈالتے۔ جو الجھن پیش آتی اسے کبھی تشنہ وضاحت نہ رہنے دیتے۔

۷۔ آنحضور ﷺ بھی ان کے علمی رجحان کی قدر کرتے تھے اور انہیں اپنی تعلیم و تربیت کا خصوصی مرکز بنائے رکھتے۔ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔ اچھی بات کی حوصلہ افزائی فرماتے اور قابل توجہ بات پر ٹوکتے تھے۔

۸۔ مجلس نبوی ﷺ میں بھی حضرت عمرؓ کی حیثیت بہت نمایاں ہوتی تھی۔ کئی معاملات میں یہ خود آپ ﷺ کی موجودگی میں رائے دیتے اور بعض منکرات کے انسداد میں بھی پہل کرتے۔ انہیں رسول اکرم ﷺ کی مکمل تائید حاصل ہوتی تھی۔

۹۔ ان کے معمولات آنحضور ﷺ کے سامنے ہوتے تھے۔ آپ ترغیب و ترہیب کے ذریعے انہیں اپنی تعلیم و تربیت کا شاہکار بناتے رہے' تاکہ آپ کے بعد آپ کی تعلیمی روایت کے امین و ناشر بن جائیں۔

۱۰۔ آپ کا حصول علم برائے علم نہیں تھا بلکہ انفرادی و اجتماعی تمام معاملات میں اعمال کی بنیاد تھا۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی کو اسی علم کے عملی سانچے میں ڈھال دیا۔

مذکورہ تمام حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی اجتہادی بصیرت کے پختہ ہونے' ان میں روزمرہ کے مسائل میں صحیح و غلط کی تمیز پیدا ہونے اور دین کی وسیع تر حکمتوں کے فہم و ادراک میں معلم انسانیت ﷺ کی شاگردی کے اس شرف کا بہت بڑا حصہ ہے جو انہیں میسر رہا۔

باب سوم

عہد صدیقؓ ---بصیرت عمرؓ کی جولانیاں

☆۔صدیقؓ وفاروقؓ دوساتھی دوکردار

☆۔حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب

☆۔بطور مشیر اعلیٰ

☆۔بطور قاضی

☆۔فاروق اعظمؓ کا انتخاب

صدیقؓ و فاروقؓ ...... دو ساتھی ..... دو کردار

نبی آخر الزمان ﷺ کی انقلابی تحریک کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے مختلف ذوق، مزاج، طبائع اور صلاحیت و استعداد رکھنے والے انسانوں کو یکجا کر کے بنیان مرصوص بنا دیا۔ ہر قسم کے میلانات و رجحانات رکھنے والوں کو مقصد زندگی کا شعور دے کر ایک ہی منزل کی طرف گامزن کر کے باہم معاون و مددگار بنا دیا اور اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے عالم انسانیت کے سامنے نفوس قدسیہ پر مشتمل ایک یہ گلدستہ پیش کیا جس کا ہر پھول اپنی فطری ساخت، رنگت، خوشبو اور خصائص کے اعتبار سے دوسروں سے مختلف ہونے کے باوجود پورے گلدستے کا حصہ اور اس کی شان میں اضافے کا ذریعہ تھا۔ اس کی نمایاں جھلک آپؐ کے دو عظیم ساتھیوں، ابوبکر و عمر رضوان اللہ علیہما کی سیرت و کردار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں کردار اپنے اخلاق و عادات اور قوتوں اور صلاحیتوں کے اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود آپؐ کے دست و بازو تھے ان دونوں کو آپؐ نے اپنا چشم و گوش بھی قرار دیا[1] اور اہل زمین میں سے اپنے دوست و دزیر بھی[2]۔

دونوں کی صلاحیتیں محسن انسانیت ﷺ کیلئے تقویت کا ذریعہ تھیں۔ ایک مرتبہ انکی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "اللہ کا شکر ہے کہ جس نے تم دونوں کو میرا مددگار بنا دیا[3]۔" یہ ان کی خدمات کا اعتراف اور اسلام میں ان کے مقام و مرتبے کی نشاندہی تھی کہ ان سے محبت و بغض کو ایمان و نفاق کی علامت باور کرایا۔ ارشاد ہوا کہ منافق ابوبکرؓ و عمرؓ سے محبت نہیں کرتا اور مومن بغض نہیں رکھتا[4]۔ کتب احادیث میں بیسیوں فضائل و مناقب میں دونوں کا ایک ساتھ ذکر آیا ہے[5]۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فضیلت و بزرگی اور عظمت و شرف کیلئے مزاج و طبائع کی یکسانیت فکر و فہم کی کلی وحدت اور انداز و اطوار کا مکمل ہم آہنگ ہونا ناگزیر ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں، کیونکہ خالق کائنات نے اپنے علم و حکمت کی بدولت تمام خاصیتیں، صلاحیتیں اور استعداد تمام انسانوں میں کیفیت و کمیت کے اعتبار سے مختلف رکھی ہیں، لیکن ان کا معیار ایک رکھا ہے۔ وہ وہی عظمت و شرف کی بنیاد ہے "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم[6]۔"

یعنی کسی کام کے کرنے کا محرک اگر اللہ کی محبت و رضا ہے اور اس سے رکنے کی وجہ اسی کا خوف و خشیت ہے، تو ایسا ہی شخص اللہ کے نزدیک معزز ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ابوبکرؓ و عمرؓ دونوں ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے محبوب بندے ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں ان کا شمار ہوتا ہے[7]۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنت میں بڑے مرتبے والے لوگ اس طرح دکھائی دیں گے جیسے آسمان کے افق پر ستارے نظر آتے ہیں، ابوبکرؓ و عمرؓ انہیں میں سے ہیں[8]۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں داخل ہوئے، آپؐ کے دائیں بائیں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ تھے اور آپؐ ان دونوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "ہم قیامت کے دن اسی طرح اٹھیں گے[9]۔" یہ مقام و مرتبہ انہیں اس لئے حاصل نہیں تھا کہ ان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز ایک تھا یا کسی واقعے کے سلسلے میں رد عمل ایک جیسا، بلکہ اس لئے حاصل تھا کہ دونوں کا نصب العین ایک تھا، دونوں کے صحیح و غلط کا پیمانہ ایک تھا۔ دونوں کتاب و سنت کی حدود و تقاضوں پر عملی طور پر کاربند تھے۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تقریباً زندگی کے تمام معاملات و مسائل میں ان کے اپنا اپنا نقطہ نظر ہے، دین کی تشریحات و تعبیرات سے لے کر عملی مسائل پر ان کے اطلاق

---

(۱) ترمذی، ۵: ۲۷۵، جوری، ا: ۲۷، اثیر، ۹: ۴۵۰، متقی ۱۱: ۵۶۲ (۲) ترمذی، ۵: ۲۷۸، جوری، ا: ۲۷، کثیر ۷: ۱۳۴، متقی ۱۱: ۵۶ (۳) سیوطی، ا: ۵۱ (۴) جوری، ا: ۲، سیوطی، ا: ۵۲ (۵) ترمذی، ۵: ۲۷۱، جوری، ا: ۲۷، اثیر، ۹: ۴۵۴، سیوطی، ا: ۵ (۶) سورۃ الحجرات ۴۹: ۱۳ (۷) داؤد، ۴: ۲۹۴، جوری، ا: ۱۹، سیوطی، ا: ۵۲ (۸) ترمذی، ۵: ۲۶۸، جوری، ا: ۲۷، اثیر ۹: ۴۵۵، سیوطی، ا: ۵۰ (۹) سیوطی، ا: ۵۱۔

واخلاق تک ان کا طرزِ عمل ان کے الگ الگ فکری و ذہنی رجحانات کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ قبولِ اسلام کی وجوہات بھی دونوں کی بالکل مختلف ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ہادیٔ برحق ﷺ کی دعوت کو دوستی کے ذریعے سے پہچانا۔ اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے آنحضور ﷺ سے محبت رکھتے تھے۔ بعثت سے پہلے ہی آپ کے انتہائی قریبی دوست تھے۔ ان کی امانت و سچائی کو قریب سے دیکھ چکے تھے۔ اس لئے جونہی آپؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو بلا پس و پیش ایمان لے آئے اور زندگی بھر بلا چون و چرا اطاعت کرتے رہے اور ایسی اطاعت کہ جو اور کسی کے حصے میں نہ آسکی اور یہی ان کی عظمت کا راز تھا۔ اس کے برعکس حضرت عمر فاروقؓ نے اسلام اور داعیٔ اسلام کو دشمن کی نگاہوں سے دیکھا جو مروجہ نظام کے باغی تھے' جو آبائی عقائد و نظریات کو جھوٹا قرار دے کر معاشرے کے امن و آشتی کو داؤ پر لگا رہے تھے اور ان تمام اقدار کو مٹانے کا جرم کر رہے تھے۔ جن پر سماجی استحکام کا دارومدار تھا۔ اس طرح انہوں نے ایک ایک چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔ اس کے فوائد و نقصانات اور نتائج و اثرات کا گہرا تجزیہ کیا اور حق باطل کو دلائل کی کسوٹی پر پرکھا اور اپنی اجتہادی بصیرت اور فکر و تدبر کے ذریعے اسلام میں داخل ہوئے اور اپنی شخصیت کو شعوری طور پر اسلام کے سانچوں میں ڈھالا۔

قبولِ اسلام کے ان دونوں واقعات کو ہم سامنے رکھ کر دیگر تمام معاملات ان کے اندازِ فکر کی گتھی تو سلجھ سکتے ہیں اور ان کے طرزِ عمل کی توجیہہ و تعبیر کر سکتے ہیں۔ حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک شب کو نکلے۔ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کو دیکھا تو وہ چپکے چپکے نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر حضرت عمرؓ کو دیکھا تو وہ بلند آواز سے نماز ادا کر رہے تھے۔ جب وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپؐ نے پوچھا "اے ابو بکرؓ! میں جو تمہارے پاس گیا تو دیکھا کہ تم چپکے چپکے نماز پڑھ رہے تھے۔" انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ میں اس کو سناتا تھا جو کانا پھوسی بھی سن لیتا ہے۔" پھر آپؐ نے فرمایا "اے عمرؓ! میں جو تمہارے پاس گیا تو دیکھا تم بلند آواز سے نماز پڑھ رہے تھے۔" انہوں نے جواب دیا "یا رسول اللہ ﷺ میں سوتے کو جگاتا تھا اور شیطان کو بھگاتا تھا۔" حسنؓ کی روایت میں یہ زائد ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اے ابو بکرؓ! تم اپنی آواز بلند کرو اور اے عمرؓ! تم اپنی آواز تھوڑی پست کرو[1]۔" دینی معاملات میں حضرت ابو بکرؓ نرم اور ہلکا رویہ اختیار کرتے کیونکہ ایسی ہی ان کی طبیعت تھی جبکہ حضرت عمرؓ مشکل پسندی اور شدت سے کام لیتے تھے کیونکہ یہی ان کی طبیعت تھی۔ ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا کہ "آپ وتر کب پڑھتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "اول شب میں" اور حضرت عمرؓ سے پوچھا "آپ وتر کب پڑھتے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا "آخر شب میں!" تو آپؐ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا "اخذ هذا بالحذر۔" "آپ نے احتیاط پر عمل کیا اور ہوشیاری کی اور حضرت عمرؓ سے فرمایا "اخذ هذا بالقوة" "آپ نے مشکل کام اختیار کیا جس کیلئے طاقت چاہئے[2]۔"

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کا انداز مختلف ہے' مگر عمل کا محرک ایک ہے یعنی جذبہ اطاعت اور بے پایاں خلوص اور دونوں کے مقاصد بھی بلند تر ہیں اور دونوں کے اعمال نتائج کے اعتبار سے بھی یکساں طور پر قابلِ ستائش ہیں۔ اس سے آپؐ نے دونوں کو اپنے انداز کے مطابق چلتے رہنے کو پسند فرمایا کہ یہی زندگی کی ہمہ رنگی و ہمہ گیری کی علامت ہے۔ دونوں ہی رسالت کے مشیر و وزیر تھے۔ بقول فاروقِ اعظمؓ رسولِ اکرم ﷺ جب مسلمانوں کے امور میں سے کسی امر کے بارے میں ابو بکرؓ سے باتیں کرتے تھے تو میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان دونوں کا وجود آنحضور ﷺ کیلئے قوت کا ذریعہ تھا۔ دونوں کا اختلافِ رائے آپ کیلئے اہم تھا اس لئے کہ اس سے پیش آمدہ مسئلے کے تمام ممکنہ پہلو سامنے آجاتے اور آپ کو صحیح فیصلے تک پہنچنے میں مدد ملتی تھی۔ آپؐ دونوں کی آراء کی قدر و قیمت سے بھی واقف تھے اور ان کے پیچھے چھپے ہوئے جذبہ خلوص سے بھی' آپ کے نزدیک دونوں کا یہ اختلاف دینی و دنیوی اعتبار سے رحمت ہی رحمت اور برکت ہی برکت تھا۔ آپ حسبِ ضرورت و حکمت کبھی ایک کی رائے پر عمل کرتے اور کبھی دوسرے کی' مگر حوصلہ افزائی دونوں ہی کی کرتے کیونکہ وہ اپنی اپنی

---

(۱) داؤد ۲/۵۱' بیہقی ۶/۳۸۴ (۲) داؤد ۲/۸۹۔

جگہ بر سر حق ہوتے۔ اسیران بدر کے معاملے میں حضرت ابو بکرؓ کا مشورہ شفقت و احسان پر مبنی تھا اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ صلہ رحمی بھی ہو جائے ان پر رحم بھی اور لوگوں کی مالی مشکلات کا بوجھ بھی ہلکا ہو سکے' لیکن حضرت عمر فاروقؓ شدت و سختی کے قائل تھے' تاکہ دین کے مقابلے میں تمام رشتوں کی حیثیت ختم ہو جائے اور مشرکین کا غرور و قوت ختم کر دی جائے' تاکہ دین حق کے مقابلے میں پھر کبھی آنے کی انہیں ہمت نہ ہو۔ رسول اکرم ﷺ ان دونوں آراء کی قدر و قیمت کو سمجھتے تھے۔ اس لئے کسی کو غلط یا کسی کو صحیح قرار دینے کے بجائے دونوں کی حوصلہ افزائی فرمائی اور انہیں پیغمبرانہ خلوص و حکمت کے مشابہ قرار دیا' کیونکہ مزاج و طباع کا اختلاف تو پیغمبروں میں بھی موجود رہا ہے' مگر حیثیت و مقام کے اعتبار سے سب برابر تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کو حضرت ابراہیم و حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے مشابہ اور حضرت عمر فاروقؓ کو حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کے مشابہ قرار دیا[1]۔

ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا "میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ملائکہ میں تم دونوں میکائیل اور جبریل علیہم السلام اور انبیاء میں ابراہیم و نوح علیہم السلام سے مشابہ ہو۔ میکائیل اپنی رحمت اور ابراہیم علیہ السلام اپنے عفو و درگزر کی صفتوں کے ساتھ ابو بکرؓ کی شخصیت میں اور جبرئیل اپنی شدت و ہیبت اور دشمنان خدا پر اپنی گرفت اور نوح علیہ السلام اپنے پیغمبرانہ جلال اور زمین پر کفار کی بربادی مطلق کی آرزو کے ساتھ عمرؓ کی شخصیت میں جلوہ فرما ہیں[2]۔" ہر اہم معاملے میں دونوں شخصیتوں کا فرق بہت نمایاں نظر آتا ہے' لیکن دونوں تربیت نبوی ﷺ کے شاہکار اور ملت اسلامیہ کے عظیم ستون تھے' اس لئے کہ ان کی منزل ایک تھی اگرچہ ان کی عظمتوں اور رفعتوں کی وجوہ اور دلائل الگ الگ ہیں۔ بقول عباس محمود العقاد ان دونوں کرداروں کے مابین تقابل و موازنہ کرتے وقت جتنی گوناگوں صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں' وہ تعداد و شمار سے باہر ہیں' البتہ انکو سمیٹ کر "جامع الفاظ" سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ "الفاظ ہیں' اقتداء و اجتہاد۔ ابو بکرؓ اقتداء کا اعلیٰ کردار تھے اور عمرؓ اجتہاد کا مافائق کردار نبی ﷺ سے محبت کرتے اور آپ کی اطاعت میں ان دونوں حضرات کو یکساں مقام حاصل ہے۔ آپ کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش اور تڑپ دونوں حضرات میں یکساں طور پر موجود تھی' لیکن اس کے باوجود ان کے عشق و محبت کی راہیں جدا جدا ہیں۔ اگرچہ ہیں متوازی اور ایک ہی سمت کو جانے والے[3]۔

حضرت ابو بکرؓ کو "صدیق" کا لقب اس لئے ملا کہ وہ سرور کونین ﷺ کی ہر بات کی تصدیق کرتے تھے۔ اس میں سوچ بچار کی کوئی اہمیت نہ تھی' کیونکہ بچپن ہی سے آپ کی سچائی سے واقف تھے' پھر جب اللہ کا برحق نبی تسلیم کر لیا' تو اس بات کی گنجائش ہی کیا تھی کہ آپ کی کسی بات کیلئے دلیل مانگی جائے۔ ان کے نزدیک آپ کی شخصی حیثیت اور نبوی حیثیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ہر بات واجب الاتباع تھی اور شکوک و شبہ سے بالاتر۔ اس لئے کہ بنیادی طور پر مقتدی تھے۔ ان کے برعکس حضرت عمرؓ کو "فاروق" کا لقب اس لئے ملا کہ وہ حق و باطل کے مابین فرق کرنے والے تھے۔ انہوں نے اسلام کی سچائی کو دلائل کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کیا۔ اس وقت تک رسول اکرم ﷺ کا مقابلہ کرتے رہے' جب تک کہ ان کا دل و ذہن سچائی پر مطمئن نہ ہو گیا۔ سرور کونین ﷺ کی شخصی اور نبوی حیثیت میں فرق کرتے تھے' اس لئے کہ وہ مجتہد تھے۔ ان تمام امور کے بارے میں پالیسی کا تنقیدی جائزہ لینا' دلیل طلب کرنا' اختلاف کرنا اور اپنی رائے ظاہر کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ جو انتظامی و سیاسی نوعیت کے ہوں اور نبی محترم ﷺ جنہیں ذاتی حیثیت میں پیش کر رہے ہوں۔ ہاں البتہ جب انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ پیغمبر نہ حیثیت میں کوئی حکم دے رہے ہیں' تو پھر اسے بلا چون و چرا تسلیم بھی کرتے اور پوری قوت سے نافذ کرنے کیلئے بھی سرگرم عمل ہو جاتے' اس کی نمایاں مثال صلح نامہ حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان شرائط کو تسلیم کرنے میں ذرا برابر بھی تردد نہ کیا' لیکن حضرت عمر فاروقؓ کو ان پر شدید اعتراض تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کے

---

(۱) حوری ۵۲:۳۰ (۲) حوری ۵۲:۳۰ (۳) عقسات ۱۴۰۔

پاس پہنچے تو انہوں نے حضور ﷺ کی اطاعت کا مشورہ دیا" خود محمد عربی ﷺ نے جب یہ فرمایا کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا" تو پھر خاموش ہوگئے(۱)۔ بنیادی طور پر تو دونوں ہی پیکر اطاعت تھے' زندگی بھر انہوں نے اپنے محبوب قائد ﷺ کے حکم و منشاء کی خلاف ورزی نہیں کی اور نہ ہی ان کی موجودگی میں کبھی خلاف ورزی ہونے دی' لیکن دونوں کا انداز الگ الگ تھا۔ ایک کے نزدیک اتباع کا درجہ پہلا تھا اور فکر و فہم کا بعد میں اور دوسرے کے نزدیک فکر و فہم بھی اتباع ہی کا لازمہ تھا۔ ایک کے نزدیک حکم کے الفاظ کی زیادہ قدر و قیمت تھی خواہ نتائج کچھ بھی نکلیں اور دوسرے کے نزدیک حکم کا مقصد و منشاء زیادہ اہمیت کا حامل تھا' خواہ الفاظ کچھ بھی ہوں۔ احکام و مسائل کے بارے میں ان دو مختلف نظریوں اور رویوں کی بناء پر اختلاف پیدا ہونا بالکل فطری تھا اور پھر رائے کے اختلاف کی بناء پر کبھی تلخی بھی ہو جاتی تھی کہ دونوں انسان تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ بنو تمیم کے چند سوار نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارا کوئی امیر منتخب کر دیجئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ "قعقاع بن معبد بن زرارہ کو ان کا امیر مقرر کر دیجئے۔" عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ بلکہ آپ اقرع بن حابس کو امیر مقرر کیجئے۔" اس پر حضرت ابو بکرؓ نے کہا "تمہارا مقصد صرف مجھ سے اختلاف کرنا ہے۔" حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ "ٹھیک ہے میرا مقصد صرف تمہاری رائے سے اختلاف کرنا ہی ہے۔" دونوں حضرات میں بات بڑھ گئی اور آواز بلند ہو گئی۔ اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی(۲)۔ "یاایھاالذین آمنو لا تقدموا الخ(۳)۔" مگر یہ مقصد کی یکسانیت تھی اور صحبت نبوی ﷺ کا اثر کہ دونوں خلوص محبت کے ایسے لازوال رشتے میں جڑے ہوئے تھے جیسے یک جان دو قالب ہوں' ان کی عظمت کی بنیاد یہ نہیں تھی کہ کوئی مافوق البشر خصوصیات کے حامل تھے اور ان میں باہمی اختلاف و رنجش کے امکانات معدوم تھے' بلکہ یہ تھی کہ جب کبھی ایسا موقع آتا تو یہ اختلاف و رنجش زیادہ دیر تک برقرار نہ رہتے اور کبھی انا کے پردوں میں چھپ کر مستقل شکل اختیار نہ کر پاتے۔ دونوں جلد ہی اپنے رویے پر غور کرتے' غلطی پر ندامت محسوس کرتے اور ایک دوسرے کو معاف کر دینے کیلئے بے قرار ہو جاتے۔

حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ میں ایک روز حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ آئے اور سلام کے بعد عرض کیا کہ "میرے اور عمرؓ بن خطاب کے درمیان باتوں باتوں میں کچھ رنج ہو گیا۔ میں ان کی طرف بڑھا پھر مجھے ندامت آئی اور میں نے ان سے معافی چاہی مگر انہوں نے معافی سے انکار کر دیا۔ اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔" آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا "خدا تجھے معاف کرے گا اے ابو بکرؓ۔" اس کے بعد حضرت عمرؓ بھی نادم ہو کر حضرت ابو بکرؓ کے مکان پر تشریف لے گئے' مگر حضرت ابو بکرؓ کو مکان پر نہ پا کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک غصہ سے تمتما اٹھا' حتیٰ کہ حضرت عمر فاروقؓ پر حضرت ابو بکرؓ کو بھی رحم آگیا۔ آپ نے گھٹنوں کے بل گر کر عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ میں ان سے زیادہ قصوروار ہوں۔" حضور ﷺ نے فرمایا کہ "جب خداوند تعالیٰ نے مجھے تمہارے پاس مبعوث فرمایا تو تم سب لوگوں نے مجھے جھوٹا کہا' مگر ابو بکرؓ نے میری تصدیق کی اور اپنی جان و مال سے مدد کی۔ کیا آج تم میرے دوست کو چھوڑ دیتے ہو؟" (یہ آپ نے دو مرتبہ فرمایا) ایسا معاملہ پھر کبھی نہیں ہوا(۴)۔ اس واقعہ سے دونوں کے مثالی تعلقات کی بہت بڑی خوبی جھلک رہی ہے کہ ایک دوسرے سے ایک دن کیلئے بھی رنجیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے غلطی کا احساس ہوتے ہی فوراً معافی طلب کی اور حضرت عمرؓ نے مثبت جواب نہ دیا تو یہ سمجھ کر مطمئن نہ ہو سکے کہ میں نے اپنی کوشش کر لی ہے۔ اب حجت پوری ہو گئی' بلکہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ وہ معافی دلا دیں۔ اسی طرح تھوڑے سے وقفے کے بعد حضرت عمرؓ کو بھی معافی نہ دینے پر ندامت ہوئی اور بے چین ہو گئے اور خود ہی

---

(۱) بخاری ۳ ۱۲ مسلم ۵ ۱۰۵ سیرہ ۵ ۳۱۸ سیہیلی ۷ ۴۹ (۲) بخاری ۵ ۱۱۶ ترمذی ۶۳ (۳) سورۃ الحجرات ۴۹ ۱-۲ (۴) بخاری ۴ ۱۹۲ سیوطی ۵۴ نبر ۹ ۴۳۳

تلافی کرنے کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔ ان دونوں کے تعلقات خلوص و محبت' احترام و ادب' اعتماد و تعاون کا ایک حسین امتزاج تھے۔ یہ تعلقات بامقصد تھے اور مقصد ہی کی لگن کی بنیاد پر مستحکم و مضبوط بھی۔ اس لئے مقصد کی طرف پیش رفت کیلئے دونوں میں مقابلہ و مسابقت کی کیفیت رہتی تھی۔ ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ نیکی و بھلائی کے معاملے میں دوسرے سے سبقت لے جائے۔ اس کا محرک یہ حکم خداوندی تھا "فاستبقوا الخیرات[۱]۔" اس کی نمایاں مثال غزوۂ تبوک کی تیاری کے سلسلے میں پیش آنے والا وہ مشہور واقعہ ہے جو تاریخ اسلام میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ حضرت عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صدقے کا حکم دیا۔ اتفاق سے ان دنوں میرے پاس کچھ مال تھا' میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں آج بڑھ گیا' تو حضرت ابو بکرؓ سے سبقت لے جاؤں گا۔ چنانچہ میں اپنا آدھا مال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے آیا۔ آپؐ نے پوچھا "اپنے اہل خانہ کیلئے کیا چھوڑا ہے؟" میں نے جواب دیا "اسی کے برابر۔" اتنی دیر میں ابو بکرؓ وہ سارا مال لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے' جو اُن کے پاس تھا۔ آپؐ نے پوچھا "اے ابو بکرؓ اپنے اہل خانہ کیلئے کیا چھوڑا ہے۔" جواب دیا "اللہ اور اس کا رسولؐ چھوڑ آیا ہوں۔" یہ سن کر میں نے کہا میں ان سے کسی چیز میں بھی آگے نہ بڑھ سکوں گا[۲]۔" مسابقت کا یہ جذبہ خیر و بھلائی اور خدمت خلق کے تمام کاموں میں موجود تھا' جو انہیں رات دن متحرک رکھتا تھا۔

ابو صالح غفاریؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ ایک بڑھیا اندھی اپاہج کی جو مدینہ کے اطراف میں رہتی تھی خبر گیری کیا کرتے تھے۔ اس کو ٹھنڈا پانی اور اس کے دوسرے کام کر دیا کرتے تھے۔ ایک روز جو اس کے پاس آپ تشریف لے گئے' تو بلا توقع اس کا تمام کاروبار ہوا پایا اور اب ہمیشہ ہی کوئی آپ سے پہلے کر جانے لگا' آپ کو بہت حیرت ہوئی۔ آپ نے اس کی جستجو کی' تو وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نکلے' حالانکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اس زمانہ میں خلیفہ تھے۔ آپ کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا "واللہ' آپ کے سوا اور کون ہو سکتا تھا[۳]۔" اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دونوں بزرگ اپنے تمام تر مقام و مرتبے اور مصروفیت و ذمہ داریوں کے باوجود انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے کتنی لازوال داستانیں رقم کر رہے تھے اور عالم یہ تھا کہ چھپ چھپ کر ایسے کام کرتے' تاکہ ان کے دامن خلوص پر ریاکاری کا میل نہ لگنے پائے۔ ان کے نزدیک چھوٹے چھوٹے امور بھی اپنے اثر و افادیت اور سماجی تعلقات اور تنظیمی استحکام کیلئے بنیادی کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے' اس لئے انہیں سرانجام دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے' مثلاً حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ میں ایک روز مسجد میں نماز پڑھ کر دعا مانگ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ مع حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے مسجد میں تشریف لائے اور ارشاد فرمایا "جو مانگو گے پاؤ گے۔" پھر فرمایا "جو شخص چاہے کہ میں قرآن شریف ٹھیک اور اچھائی کے ساتھ پڑھوں تو چاہیے کہ وہ عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت اختیار کرے۔" اس کے بعد میں اپنے گھر چلا آیا' ذرا دیر کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ مجھے مبارکباد دینے تشریف لائے اور آپ تشریف لئے ہی جاتے تھے کہ اتنے میں حضرت عمرؓ بھی تشریف لائے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کو دیکھ کر فرمانے لگے "آپ ہمیشہ نیک کام میں آگے ہی رہتے ہیں[۴]۔"

ہادی برحق ﷺ کے برپا کئے ہوئے عظیم انقلاب کی یہ خاصیت تھی کہ اس نے فکر و ذہن کے زاویئے بدل دیئے اور اخلاق و کردار کے نئے پیکر تیار کئے اور پھر اس سے آگے پیش قدمی کر کے انسانی جذبات و احساسات کی کائنات کو سنوار دیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپؐ نے جاہ و منصب' مال و دولت اور اولاد و خاندان کے تفاخر پر استوار معاشرے کا ذوق و مزاج تبدیل کر دیا۔ اب وہ ان چھوٹے مقاصد کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے بجائے عبادات' تقویٰ' خیر خواہی و مددگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے خواہشمند ہو گئے۔ آپؐ اپنے جانثاروں کے حوال سے آگاہ بھی رہتے اور اس طرح

---

(۱) سورۃ المائدہ ۵:۴۸ (۲) ترمذی ۵/۲۷۷' ابوداؤد ۲/۱۷۳' دارمی ۱/۳۹۱' قیر ااا:۹ ۴۳۲ سیہقی ۶ ۱۸۰ (۳) سیوطی ۱: ۸ (۴) سیوطی ۱: ۵۶۔

کے مقابلہ و مسابقت کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز پڑھ کر صحابہؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ ''آج تم میں سے کسی نے روزہ کا منہ لے کر صبح کی؟'' حضرت ابوبکر صدیق نے کہا کہ ''رات میں نے روزہ کی نیت کی تھی اور بحمد اللہ میں روزہ سے کر رہا ہوں۔'' حضور ﷺ نے فرمایا ''تم میں سے آج کسی نے مریض کی عیادت کی ہے؟'' حضرت عمرؓ نے عرض کی ''میں اب تک مسجد سے ہی نہیں نکلا چہ جائیکہ مریض کی عیادت کروں۔'' حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ ''مجھے خبر ملی تھی کہ بھائی عبدالرحمٰنؓ کی طبیعت کچھ خراب ہے میں مسجد میں آتے ہوئے ان کے پاس ہو کر آیا ہوں کہ ان کی طبیعت کیسی رہی؟'' حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''آج تم میں سے کسی نے مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟'' حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا کہ ''ابھی تو ابھی آپؐ نے نماز پڑھائی ہے' ہم ابھی تک کہیں نہیں گئے۔'' حضرت ابوبکر صدیق نے کہا ''یا رسول اللہ ﷺ میں مسجد میں داخل ہی ہوا تھا کہ اچانک ایک مانگنے والا آگیا' میں نے عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں ایک ٹکڑا جو کی روٹی کا دیکھا اور ان سے لے کر اس سائل کو دے دیا۔'' حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''میں تجھے جنت کی خوشخبری دیتا ہوں۔'' پھر حضور ﷺ نے ایسے کلمات بھی فرمائے کہ جن سے حضرت عمرؓ بھی راضی ہو گئے اور حضرت عمر فاروقؓ نے بھی یقین کر لیا کہ ایسا کوئی نیک کام نہیں جس میں حضرت ابوبکر صدیق نے سبقت نہ کی ہو[۱]۔

یہ تو تھا نیکیوں کے معاملے میں دونوں کی مسابقت کا حال' جہاں تک دنیوی شرف و عزت' اختیارات و مفادات اور جاہ و منصب کے مواقع تھے ان میں صورتحال اس سے بالکل برعکس تھی۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے اور دوسرے کو آگے کرنے میں فخر محسوس کرتا۔ تعلقات کی یہ انوکھی نوعیت تھی جو عالم انسانیت نے اسلامی تحریک کے کارکنوں میں ملاحظہ کی۔ یہ مادہ پرستی کے مقابلے میں خدا پرستی' ہوس کے مقابلے میں ایثار' نفاق کے مقابلے میں اخلاق اور دہریت کے مقابلے میں روحانیت کی فتح تھی۔ اس کے بہت سے مظاہر ہمیں ان دونوں صاحبان رسول اللہ ﷺ کے عملی رویے میں ملتے ہیں۔ نبی آخر الزمان ﷺ اپنی بیماری کے دنوں مسجد میں پہنچنے سے بھی قاصر ہو گئے تو امامت کا مسئلہ تھا۔ اس سے بڑھ کر اور بڑی سعادت کیا ہو سکتی تھی کہ کوئی ایسے مصلے پر کھڑا ہو جس پر سرور کونین ﷺ کھڑے ہوتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو کہلا بھیجا کہ آپ نماز پڑھا دیں' لیکن آپ اپنی رقت قلبی کی وجہ سے یہ ہمت نہیں پا رہے تھے' تو انہوں نے حضرت عمرؓ سے فرمایا ''اے عمرؓ لوگوں کو نماز پڑھا دیجئے۔'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا ''جی نہیں آپ ہی اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں[۲]۔'' اسی طرح سیاسی قیادت کے معاملے میں بھی ایک دوسرے کو آگے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی فہم و فراست پر مکمل اعتماد تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ کی گرما گرم بحث کا پتہ چلا تو فاروق اعظمؓ نے وہاں پہنچتے پہنچتے یک نہایت مدلل و خوبصورت تقریر ذہن میں تیار کر لی' لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تقریر کا ارادہ کیا تو اپنی تقریر سے دستبردار ہو گئے اور ان کی تقریر کو اپنی تقریر سے زیادہ بہتر قرار دیا[۳]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کی یہ خواہش نہیں تھی کہ خود آگے آئیں اور اپنی اہلیت ثابت کریں اور اس سیاسی صورت حال کو اپنے لئے ہموار کریں' بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ صدیق اکبرؓ ہی کو خلافت کا منصب سونپا جائے۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ نے بھی خوبصورت تقریر کرنے کے بعد حضرت عمرؓ و حضرت ابوعبیدہؓ کا نام پیش کیا[۴] تاکہ اس منصب پر انہیں فائز کیا جائے اور وفات کے وقت بھی ان کی یہی حسرت تھی کہ ''کاش اس موقع پر یہ ذمہ داری میں انہیں کے حوالے کر دیتا اور خود ان کے وزیر و مشیر کے طور پر کام کرتا[۵]۔'' ادھر حضرت عمر فاروقؓ کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کا نام پیش کیا تو فوراً فرمایا ''کیا آپ کے ہوتے ہوئے کسی شخص کیلئے یہ زیبا ہے کہ آپ کو اس مقام سے ہٹائے' جس پر آپ کو رسول اللہ ﷺ نے کھڑا کیا ہے۔ اس لئے ہاتھ بڑھایئے۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھایا' تو حضرت عمرؓ نے فوراً بیعت کر لی(۶)۔''

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) طبری [illegible] (۶) بلاذری [illegible]

فاروق اعظمؓ فرمایا کرتے تھے کہ "ابو بکرؓ کی پوری تقریر میں بس یہی بات مجھے ناپسند ہوئی کہ انہوں نے خلافت کے بارے میں میرا نام تجویز کیا کیونکہ مجھے اپنی گردن کٹوا دینا اس سے زیادہ محبوب تھا کہ حضرت ابو بکرؓ کو اس مقام سے ہٹاؤں جس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں مقرر کیا تھا[1]۔" ان تمام مصدقہ واقعات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دونوں مربی اعظم ﷺ کے حسن تربیت کا بہترین شاہکار تھے۔ دونوں اپنی مختلف خصوصیات، مزاج طبائع اور ذوق صلاحیت کے باوجود یک جان دو قالب تھے۔ ان کا مقابلہ و مسابقت بھی مثالی تھا اور تعاون و اشتراک بھی ایک دوسرے کیلئے خلوص و محبت اور ایثار و قربانی کا پیکر تھے۔ باہمی مشاورت، اعتماد، ہمدردی اور تعاون کی جو درخشندہ روایات انہوں نے چھوڑی ہیں وہ تا قیامت مسلمانوں کیلئے باہمی تعلقات کے بہترین نمونے کے طور پر زندہ رہیں گی۔ اختلاف رائے رکھنے، سننے، برداشت کرنے، دلیل کی بنیاد پر قبول کرنے، فیصلے کے بعد مل جل کر اس پر ڈٹ جانے اور اسے نافذ کر دینے کی جو عادات انہوں نے اختیار کیں، وہ آج مسلم معاشرے کو رواداری کا پیغام دے رہی ہیں اور مختلف فرقوں اور گروہوں کیلئے حدود کار کا تعین کر رہی ہیں۔ ابو عقیل سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا "دونوں ہدایت کے امام، راستہ پانے والے، راستہ بتانے والے، صلاح کرنے والے اور کامیابی تک پہنچنے والے تھے جو دنیا سے اس طرح رخصت ہوئے کہ شکم سیر نہ تھے[2]۔"

حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب

رسول اکرم ﷺ کی وفات نے صحابہ کرامؓ کو نڈھال کر دیا[3]۔ انہیں کچھ نہیں سمجھ آ رہا تھا کہ وہ اتنے بڑے سانحے کو کس طرح حقیقت سمجھ کر برداشت کریں۔ حضرت عمرؓ کا یہ عالم تھا کہ مجمع عام میں کھڑے ہو کر یہ کہہ رہے تھے "خدا کی قسم رسول اللہ ﷺ کی وفات نہیں ہوئی۔" ان کا بیان ہے کہ "میرا دل اس کے سوا کسی بات کیلئے تیار نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ آنحضور ﷺ کو دوبارہ مبعوث فرمائیں گے اور ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے (جو ایسی باتیں کہہ رہے ہیں[4]۔)" ان کا یہ خیال تھا کہ وفات کی باتیں منافقین کہہ رہے ہیں، حالانکہ آنحضور ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح چالیس راتیں الگ رہنے کے بعد واپس پلٹ آئیں گے[5]۔" اسی اثناء میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے جو مدینے کے نواح میں واقع ایک مقام سنح میں قیام پذیر تھے۔ آکر حضور ﷺ کی نعش مبارک کو کھول کر بوسہ دیا اور کہا "میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ زندگی میں پاکیزہ تھے اور وفات کے بعد بھی اور اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اللہ تعالیٰ آپ پر دو اموات ہرگز طاری نہیں کرے گا۔" اس کے بعد آپ باہر آئے جہاں حضرت عمرؓ قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے تھے کہ آنحضور ﷺ کی وفات نہیں ہوئی۔ فرمایا "اے قسم کھانے والے عجلت مت کرو" پھر تقریر شروع کی۔ حضرت عمرؓ بیٹھ گئے اور حضرت ابو بکرؓ نے قرآنی آیات کے حوالے سے یہ واضح کیا کہ آپ وفات پا چکے ہیں[6]۔ "صحابہ کرامؓ کو جب یقین ہو گیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور حضرت عمرؓ بے ہوش ہو کر گر پڑے[7]۔ اس لئے کہ وہ ذہنی طور پر اتنے بڑے حادثے کو سہنے کیلئے بالکل تیار نہیں تھے۔ اس موقع پر آپ کا رد عمل بڑا عجیب اور فہم و فراست کے برعکس نظر آتا ہے۔ اس سے آنحضور ﷺ کی ذات سے آپ کے گہرے جذباتی تعلق کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ دراصل اس پیدا ہونے والے عظیم ترین خلاء کے احساس کا نتیجہ تھا، جو بھی

(۱) هشام، ٤ ۔ ۲۱ شیبہ ٤ ۔ ٦٦، بلاذری، ۲ ۔ ٥٨٤ (۲) سعد، ۳ ۔ ۱۱ (۳) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سہیلی ٦، ٥٩٥ (٤) بخاری ٤ ۔ ١٩٤، طبری، ۳ ۔ ۲۰۲

(٥) هشام، ٤ ۔ ٣٠٥، سعد، ۲ ۔ ۲۰۰ (٦) بخاری، ٤ ۔ ١٩٤، هشام، ٤ ۔ ٣٠٥ (٧) طبری، ۳ ۔ ۲۰۱

ارم ﷺ کی وفات کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ آپ نے ان ممکنہ خطرات و نقصانات کو زیادہ شدت سے محسوس کیا' جو آنحضور ﷺ کے بچھڑنے کی صورت میں سلام' اسلامی ریاست اور امت مسلمہ کو گھیرنے والے تھے۔ بہر حال وہ انسان تھے' ان سے غلطی کا صدور ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس سے آپ کی اجتہادی بصیرت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس لئے کہ کوئی مجتہد بھی معصوم عن الخطا نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ کی اس مثال سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ بقول عمر تلمسانی "حضرت عمرؓ بہترین نمونہ اور تربیت کی اعلیٰ مثال تھے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے ان سے غلطیاں اور کوتاہیاں بھی ہوئیں' مگر وہ غلطی پر اصرار کرنے کے بجائے کھلے عام اس کا اعتراف کر لیتے اور فوراً اصلاح احوال کی فکر کرتے تھے۔ اپنی غلطی کو چھپانے کے بجائے کھلے عام اس کا اعتراف اور اپنے موقف سے رجوع ان کا وطیرہ تھا[1]۔"

چنانچہ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا' اگلے روز حضرت ابو بکرؓ کی بیعت عامہ سے پہلے مجمع عام میں انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا[2]۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس موقف و تقریر کو بھی مسلمانوں کی خیر و بھلائی کا ذریعہ بنا دیا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ وفات نبوی پر حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کی تقاریر کے بارے میں فرماتی ہیں کہ "دونوں تقاریر نے فائدہ پہنچایا کیونکہ ان میں منافق بھی تھے۔ "حضرت عمرؓ کے دھمکانے کے ذریعے سے اللہ نے انہیں (نقصان پہنچانے سے) باز رکھا[3]۔

بہر حال جب عالم ہوش میں آئے تو آپ کی بصیرت و فراست پورے طور پر بحال ہو چکی تھی' جذباتی کیفیت کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ اب انہوں نے گرد و پیش کے حالات کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا۔ ان کے نزدیک سب سے اہم سوال اب اسلام کے مستقبل کا تھا' جو اس نوزائیدہ ریاست کے ساتھ وابستہ تھا' جس کی بنیاد سرور کونین ﷺ نے رکھی تھی۔ یہ پورے کرہ ارض پر وہ واحد سرزمین تھی جہاں خدا کی حاکمیت کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ جہاں بطور نظام زندگی اسلام کے ثمرات و برکات جلوہ فگن ہونا شروع ہو چکے تھے' جو دشمنان اسلام کی آنکھوں میں کھٹکتے ہوئے کانٹے کی طرح تھے۔ سرحدوں پر اس وقت کی سپر پاور روم کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی' مدینہ میں منافقین کی ریشہ دوانیاں جاری تھیں' یمن کی طرف جھوٹے نبوت کے دعویدار اسود عنسی نے گمراہی کا علم تھام لیا تھا۔ ادھر مہاجرینؓ و انصارؓ کے مابین سیاسی اختلاف موجود تھا' جو کسی وقت خطرناک شکل اختیار کر سکتا تھا۔ ایسے عالم میں' انہوں نے یہ محسوس کیا کہ نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ فوری طور پر خلیفہ کا انتخاب عمل میں آ جائے' تاکہ ان تمام خطرات پر قابو پانا آسان ہو جائے۔ اس سلسلے میں ان کی فکرمندی کا یہ حال تھا کہ آنحضور ﷺ کی تجہیز و تکفین کے کام میں ہاتھ بٹانا بھی انہیں بھول گیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ خلیفہ کے بغیر ایک لمحہ گزارنا بھی درست نہیں' فوراً حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کے پاس پہنچے اور کہا "ہاتھ بڑھایئے کہ میں بیعت کروں' لسان نبوت ﷺ نے آپ کو امین الامت فرمایا ہے۔ "حضرت عمرؓ کی یہ بات سن کر حضرت ابو عبیدہؓ دم بخود رہ گئے اور حضرت عمرؓ کی طرح اس مسئلے کی اہمیت انہوں نے بھی محسوس کر لی' لیکن ان کی رائے سے مطمئن نہ ہوئے۔ انہیں غور سے دیکھا اور کہا "جب سے تم مسلمان ہوئے ہو ایک بے وقوفی کی بات میں نے تمہاری زبان سے نہیں سنی۔ کیا تم مجھ سے بیعت کرو گے جب کہ تم میں ثانی اثنین صدیقؓ جیسی شخصیت موجود ہے[4]۔"

ابھی یہ دونوں اس اہم مسئلے پر تبادلہ خیال کر ہی رہے تھے کہ خبر ملی کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر خلافت کے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی امامت انہیں ملے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ تیزی سے چلے اور حضرت ابو بکرؓ کو بلانے کیلئے ایک آدمی حضرت عائشہؓ کے گھر بھیجا جسے حضرت ابو بکرؓ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں مصروف ہوں' لیکن حضرت عمرؓ نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کا مسئلہ ہر مصروفیت پر مقدم ہے' چاہے وہ رسول اللہ ﷺ کی تجہیز

---

(۱) تلمسانی ٤٥ (۲) ھشام/٤/٣٠٨ (۳) بخاری/٤/١٩٥ (٤) بلاذری/٢/٥٧٩ سعد/٣/١٨١۔

و تکفین ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے انہوں نے آدمی کے ہاتھ دوبارہ پیغام بھیجا "ایک نہایت اہم مسئلہ درپیش ہے اور اس میں آپ کا ہونا اشد ضروری ہے"[۱]۔ "حضرت ابوبکرؓ یہ کہتے ہوئے گھر سے نکلے "ایسی کیا بات پیش آگئی جو رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تکفین سے بھی اہم ہے؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "آپ کو نہیں معلوم کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور سعد بن عبادہ کو مسلمانوں کا امیر بنانا چاہتے ہیں۔ "جو بات وہاں سب سے زیادہ پسند کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے"[۲]۔ حضرت ابوبکرؓ نے معاملے کی نزاکت کو محسوس فرمایا اور ان دونوں حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کے ساتھ تیزی سے سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ بقول حضرت عمرؓ راستے میں انصار کے دو صالح آدمی معن بن عدی اور عویم بن ساعدہ ملے اور انہوں نے بتایا کہ انصار کسی معاملے میں متفق ہو گئے ہیں۔ ان دونوں نے کہا کہ "اے گروہ مہاجرین کدھر کا ارادہ ہے۔ "ہم نے بتایا کہ "انصاری بھائیوں سے ملنے نکلے ہیں۔" انہوں نے کہا "نہیں' تمہیں اے گروہ مہاجرین! تم انصار کے پاس نہ جاؤ' اپنے معاملات کا خود فیصلہ کر لو۔ "مگر میں نے کہا "خدا کی قسم! ہم ان سے ضرور ملیں گے"[۳]۔"

حضرت عمرؓ کی یہ رائے بہت صائب ہے اور ان کے شورائی طرز فکر کی نمائندہ بھی۔ انہوں نے بجا طور پر یہ سمجھ کہ خلافت کا اہم اور نازک مسئلہ الگ بیٹھ کر حل نہیں ہو سکتا' اس کیلئے ضروری ہے کہ جہاں بحث و تمحیص ہو رہی ہے' وہیں پر ہی دلائل و براہین کی قوت سے اسے طے کیا جائے' تاکہ مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق میں کوئی رخنہ پیدا نہ ہو۔ ان کے نزدیک سیاسی مسائل کو طے کرنے کا واحد طریقہ بات چیت ہی تھی۔ اس لئے انہوں نے عین مجمع میں جا کر دوسروں کے مؤقف کو سننے اور سمجھنے اور اپنے مؤقف کو پیش کرنے کو ترجیح دی' وہاں تک پہنچتے پہنچتے ذہن میں ایک مدلل تقریر کے نکات سوچ لئے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ "جب ہم سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے تو وہاں دیکھا کہ ایک شخص چادر میں لپٹا ہوا بیٹھا ہے۔ "میں نے پوچھا "یہ کون ہے؟" لوگوں نے بتایا کہ یہ سعد بن عبادہ ہیں۔ میں نے پوچھا "انہیں کیا ہوا؟" لوگوں نے کہا کہ یہ بیمار ہیں۔ پھر جب ہم لوگ بیٹھ گئے' تو ان کے خطیب نے کھڑے ہو کر توحید و رسالت کی شہادت دی اور اللہ تعالیٰ کے شایان شان حمد و ثناء کی پھر کہنا شروع کیا "امابعد ہم اللہ کے انصار اور اسلام کے لشکر ہیں اور اے گروہ مہاجرین تم ہمیں میں سے ایک گروہ ہو اور تمہاری قوم کی ایک جماعت چل کر ہمارے پاس آئی' لیکن دیکھتے کیا ہیں کہ اب ان کا ارادہ ہے کہ ہماری اصل سے کٹ کر الگ ہو جائیں اور ہم سے امارت غصب کر لیں"[۴]۔ پھر جب ان کا خطیب خاموش ہو گیا تو میں نے چاہا کہ جواب دوں۔ میں نے بخدا ایسا صرف اس لئے کیا کہ میں نے اپنے دل میں ایک ایسی تقریر تیار کر لی تھی' جو خود مجھے بہت پسند تھی' لیکن پھر بھی مجھے یہ ڈر تھا کہ ابوبکرؓ کی برابری نہیں ہو سکے گی[۵]۔ میں نے ارادہ کیا کہ اسے ابوبکرؓ کے سامنے پیش کروں۔ میں ان کے معاملے میں اپنی تیزی کو کم کر کے ان کی مدارت کیا کرتا تھا۔ ابوبکرؓ نے کہا "عمرؓ سہولت سے کام

وتکفین ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے انہوں نے آدمی کے ہاتھ دوبارہ پیغام بھیجا "ایک نہایت اہم مسئلہ درپیش ہے اور اس میں آپ کا ہونا اشد ضروری ہے"(۱)۔ حضرت ابوبکرؓ یہ کہتے ہوئے گھر سے نکلے "ایسی کیا بات پیش آگئی جو رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین سے بھی اہم ہے؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "آپ کو نہیں معلوم کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور سعد بن عبادہ کو مسلمانوں کا امیر بنانا چاہتے ہیں۔ جو بات وہاں سب سے زیادہ پسند کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے"(۲)۔ حضرت ابوبکرؓ نے معاملے کی نزاکت کو محسوس فرمایا اور ان دونوں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھ تیزی سے سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ بقول حضرت عمرؓ رستے میں انصار کے دو صالح آدمی معن بن عدی اور عویم بن ساعدہ ملے اور انہوں نے بتایا کہ انصار کسی معاملے میں متفق ہو گئے ہیں۔ ان دونوں نے کہا کہ "اے گروہ مہاجرین کدھر کا ارادہ ہے۔" ہم نے بتایا کہ "انصاری بھائیوں سے ملنے نکلے ہیں۔" انہوں نے کہا "نہیں، انہیں اے گروہ مہاجرین! تم انصار کے پاس نہ جاؤ، اپنے معاملات کا خود فیصلہ کرو۔" مگر میں نے کہا "خدا کی قسم! ہم ان سے ضرور ملیں گے"(۳)۔

حضرت عمرؓ کی یہ رائے بہت صائب ہے اور ان کے شورائی طرز فکر کی نمائندہ بھی۔ انہوں نے بجا طور پر یہ سمجھا کہ خلافت کا اہم اور نازک مسئلہ الگ بیٹھ کر حل نہیں ہو سکتا، اس کیلئے ضروری ہے کہ جہاں بحث و تمحیص ہو رہی ہے، وہیں پر ہی دلائل و براہین کی قوت سے اسے طے کیا جائے، تاکہ مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق میں کوئی رخنہ پیدا نہ ہو۔ ان کے نزدیک سیاسی مسائل کو طے کرنے کا واحد طریقہ بات چیت ہی تھی۔ اس لئے انہوں نے عین مجمع میں جا کر دوسروں کے مؤقف کو سننے اور سمجھنے اور اپنے مؤقف کو پیش کرنے کو ترجیح دی، وہاں تک پہنچتے پہنچتے ذہن میں ایک مدلل تقریر کے نکات سوچ لئے۔ ان کا بیان ہے کہ "جب ہم سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے تو وہاں دیکھا کہ ایک شخص چادر میں لپٹا ہوا بیٹھا ہے۔" "میں نے پوچھا "یہ کون ہے؟" لوگوں نے بتایا کہ یہ سعد بن عبادہ ہیں۔ میں نے پوچھا "انہیں کیا ہوا؟" لوگوں نے کہا کہ یہ بیمار ہیں۔ پھر جب ہم لوگ بیٹھ گئے، تو ان کے خطیب نے کھڑے ہو کر توحید و رسالت کی شہادت دی اور اللہ تعالیٰ کے شایان شان حمد و ثناء کی پھر کہنا شروع کیا "امابعد ہم اللہ کے انصار اور اسلام کے لشکر ہیں اور اے گروہ مہاجرین تم ہمیں میں سے ایک گروہ ہو اور تمہاری قوم کی ایک جماعت چل کر ہمارے پاس آئی، لیکن دیکھتے کیا ہیں کہ اب ان کا ارادہ ہے کہ ہماری اصل سے کٹ کر الگ ہو جائیں اور ہم سے امارت غصب کر لیں(۴)۔ پھر جب ان کا خطیب خاموش ہو گیا تو میں نے چاہا کہ جواب دوں۔ میں نے بخدا ایسا صرف اس لئے کیا کہ میں نے اپنے دل میں ایک ایسی تقریر تیار کر لی تھی، جو خود مجھے بہت پسند تھی، لیکن پھر بھی مجھے یہ ڈر تھا کہ ابوبکرؓ کی برابری نہیں ہو سکے گی(۵)۔ میں نے ارادہ کیا کہ اسے ابوبکرؓ کے سامنے پیش کروں۔ میں ان کے معاملے میں اپنی تیزی کو کم کر کے ان کی مدارات کیا کرتا تھا۔ ابوبکرؓ نے کہا "عمرؓ سہولت سے کام لو۔" میں نے پسند نہ کیا کہ ان سے ناراضی کا اظہار کروں، بہرحال ابوبکرؓ مجھ سے زیادہ صاحب علم اور باوقار آدمی تھے۔ انہوں نے تقریر شروع کی، تو خدا کی قسم کوئی ایسا کلمہ نہ چھوڑا جو میں نے اپنے دل میں خوب سنوار کر تیار کیا ہو اور مجھے پسند آیا ہو، جسے انہوں نے ویسے ہی کلمے جیسا یا اس سے بھی زیادہ افضل کلمہ فی البدیہہ نہ کہا ہو(۶)۔" حضرت ابوبکرؓ نے اپنی تقریر میں انصار کی خدمات کی تعریف کی اور مناسب ہوگا کہ امیر ہم ہوں اور تم وزیر، ہر معاملے میں تم سے مشورہ لیا جائے گا اور تمہارے اتفاق رائے کے بغیر ہم کوئی کام نہیں کریں گے(۷)۔ اس تقریر نے چھا ڑ چھوڑا، لیکن حضرت حباب بن المنذرؓ نے انصار کو پھر بھڑکانا شروع کر دیا اور انہیں کچھ دیر قبل کیا گیا وہ فیصلہ یاد دلایا کہ ایک امیر ہم میں ہوگا اور ایک مہاجرین میں سے۔ یہ سن

---

(۱) اثیر، ۲: ۲۲۲ (۲) ایضاً، ۲: ۲۲۳ (۳) ہشام، ۴: ۳۰۹، حنبل ۱: ۳۲۶، طبری، ۳: ۲۰۵، جوزی، ۴: ۶۴ (۴) ہشام، ۴: ۳۰۹، حنبل ۱: ۳۲۶، طبری، ۳: ۲۰۵، جوزی، ۴: ۴۷

(۵) ہشام، ۴: ۳۰۹، حنبل ۱: ۳۲۶ (۶) ہشام، ۴: ۳۰۹، طبری، ۳: ۲۰۵ (۷) معتبر تفصیل ملاحظہ ہو بخاری، ۴: ۱۹۴، بلاذری، ۱: ۵۸۰، سعد ۳: ۱۸۲، اثیر، ۲: ۲۲۳

کر حضرت عمرؓ خاموش نہ رہ سکے، ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور بول اٹھے "ہاں! ایک وقت میں دو امیر جمع نہیں ہو سکتے، خدا کی قسم! عرب تمہاری سیاست ہرگز تسلیم نہیں کریں گے، جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تم میں سے نہیں تھے۔ وہ تو انہی کو اپنا امیر مانیں گے، جن میں نبوت تھی۔ اس روشن دلیل اور اس نمایاں اقتدار سے جو کوئی انکار کرے گا ہم اس سے لڑیں گے۔ ہم محمد ﷺ کے عزیز و اقارب میں ہیں جو کوئی امارت و اقتدار کے مسئلے پر ہم سے جھگڑا کرے گا وہ باطل کی طرف سے جانے والا گناہ کی طرف ڈھلنے والا اور ہلاکت کی دلدل میں پھنسنے والا ہو گا۔" اس کے جواب میں حباب نے انصار سے مطالبہ کیا کہ مہاجرین کو مدینہ سے نکال دیں یا ان پر حکومت کریں۔ اس کے بعد ان تینوں نے مہاجرین سے خطاب کر کے کہا "خدا کی قسم! اگر تم چاہو تو ہم تمہیں اب بھی نکال باہر کریں۔" حضرت عمرؓ نے چیخ کر کہا "تو پھر اللہ تمہیں ہلاک کر دے گا۔" حباب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "بلکہ تمہیں ہلاک کرے گا[1]۔" ان جملوں نے جذبات میں طوفان برپا کر دیا۔ فوراً حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے مداخلت کی اور اہل مدینہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا "اے گروہ انصار! تم نے حمایت و نصرت میں سبقت کی تھی، اب توڑ پھوڑ میں پہل نہ کرو[2]۔"

حضرت ابو عبیدہؓ کی اس بات نے دلوں کا جوش ٹھنڈا کر دیا اور لوگوں میں بحث مباحثہ پھر شروع ہو گیا۔ بشیر بن سعد قبیلہ خزرج کے ایک ممتاز فرد تھے۔ وہ مہاجرین کے ہم نوا ہو گئے، جس سے انصار کے اتحاد میں رخنہ پڑ گیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اسی وقت اندازہ کر لیا کہ راستہ ہموار ہو گیا ہے اور یہ لمحہ لمحۂ فیصل ہے، چنانچہ انہوں نے انصار کو فرقہ بندی سے بچنے اور جماعت کی طرف آنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کا ہاتھ پکڑ کر بلند آواز سے فرمایا "یہ عمرؓ ہیں اور یہ ابو عبیدہؓ ان میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو[3]۔" حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، اسے جڑ پکڑنے کی مہلت نہیں دینی چاہئے، وہ اٹھے اور اپنی پاٹ دار آواز میں فرمایا "ابو بکرؓ اپنا ہاتھ بڑھائیے۔" حضرت ابو بکرؓ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور حضرت عمرؓ نے یہ کہتے ہوئے بیعت کر لی "ابو بکرؓ کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ آپ مسلمانوں کو نماز پڑھائیے۔ آپ خلیفۃ الرسول ہیں اور ہم آپ کے ہاتھ پر اس لئے بیعت کر رہے ہیں کہ آپ ہم سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کو محبوب تھے[4]۔" اس کے بعد بقول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ عمرؓ لوگوں سے مخاطب ہوئے اور کہا "اے گروہ انصار کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بکرؓ کو حکم دیا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں؟" انہوں نے جواب دیا "کیوں نہیں۔" حضرت عمرؓ نے کہا کہ "پھر تم میں سے کس کا دل خوش ہو گا کہ وہ ابو بکرؓ سے آگے ہوں[5]۔"

حضرت عمرؓ کے اس بروقت اقدام کا نتیجہ یہ نکلا، خلافت جیسا اہم مسئلہ طے ہو گیا۔ اختلاف و انتشار کا سارا ماحول بدل گیا۔ حضرت عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ لوگ اب ہر طرف سے آ آ کر حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ حضرت سعد بن عبادہؓ کو روند ڈالتے، اس پر ان کے کسی آدمی نے کہا کہ سعد کو بچاؤ، ان کو نہ روندو۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اللہ اسے ہلاک کرے، اس کو قتل کر دو[6]۔" حضرت عمرؓ نے اندازہ کر لیا کہ رائے عامہ اب ان کے ساتھ ہو گئی ہے، اب سعد کے خلاف سخت رویہ اپنانا ضروری ہے، تاکہ کسی قسم کے رخنہ پڑنے کا امکان نہ رہے، وہ جانتے تھے کہ یہ معاملہ انہیں کی وجہ سے پیچیدہ ہو گیا تھا، اب پھر کہیں بھاڑ نہ پیدا ہو، چنانچہ وہ ان کے سرہانے پہنچ گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ اس پر حضرت سعدؓ نے ان کی داڑھی پکڑی، حضرت عمرؓ نے کہا: "چھوڑ دو اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت بھی نہ رہے گا۔" حضرت ابو بکرؓ نے مداخلت کی اور کہا: "عمرؓ خاموش رہو،

(۱) طبری [illegible] (۲) ایضاً [illegible] ۲۲۲ (۳) [illegible] (۴) بلاذری [illegible] (۵) حنبل [illegible] سعد [illegible] (۶) طبری [illegible]

اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سود مند ہے۔" چنانچہ انہوں نے پیچھا چھوڑ دیا[۱]۔ دوسرے اہم شخص جنہوں نے انصار کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا تھا' وہ حضرت حبابؓ بن المنذر تھے۔ وہ کھڑے ہوئے اور تلوار نکال کر کہا "میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں' میں شیر ہوں' شیر کی کچھار میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔" حضرت عمرؓ نے فوراً جھپٹ کر ان کے ہاتھ پر وار کیا' اس سے ان کی تلوار گر پڑی' تو حضرت عمرؓ نے اسے اٹھا لیا[۲]۔ یہ معاملہ انتہائی دانشمندی اور خوش اسلوبی سے طے کرنے کے بعد حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ رسول اکرم ﷺ کے حجرے کی طرف پلٹے' تاکہ تجہیز و تکفین میں مدد کریں' تو ان کے پہنچنے سے قبل ہی انہیں دفنایا جا چکا تھا[۳]۔ علامہ ابن کثیر کے بقول رسول اللہ ﷺ نے سوموار کے دن وفات پائی اور اسی دن سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکرؓ کی بیعت ہوئی' اگلے دن منگل کی صبح بیعت عامہ ہوئی[۴]۔ "ابن اثیر کے بقول اسی دن اس لئے بیعت کی گئی' تاکہ کوئی ایک دن بھی بلا جماعت نہ گزرے[۵]۔ بہر حال اگلے روز جب تمام لوگ بیعت کیلئے اکٹھے ہو گئے تو مسجد نبوی میں حضرت ابو بکر صدیقؓ منبر پر بیٹھ گئے اور حضرت عمر فاروقؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے پہلے تقریر کی۔ پہلے اللہ تعالیٰ کے شایان شان حمد و ثناء بیان کی' پھر فرمایا "لوگو! میں نے کل آپ سے ایک ایسی بات کہی تھی جو نہ مجھے کتاب اللہ میں کہیں ملی تھی نہ رسول اللہ ﷺ نے بھی مجھے فرمائی تھی' لیکن میرا اپنا یہ خیال تھا کہ حضور ﷺ ہماری رہنمائی فرماتے رہیں گے اور آخر تک ہم میں موجود رہیں گے' لیکن اللہ نے اپنی وہ کتاب تم میں باقی رکھی ہے' جس سے اس کے رسول ﷺ نے ہدایت پائی تھی اور اگر تم بھی اس سے وابستہ رہو گے' تو اللہ اپنے رسول ﷺ کی طرح تمہیں بھی اس کے ذریعے ہدایت دیتا رہے گا۔ اللہ نے تمہاری باگ ڈور ایک ایسے شخص کے حوالے کی ہے جو تم میں سب سے بہتر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا رفیق اور دو میں کا دوسرا ہے جب وہ دونوں غار میں تھے' پس اٹھو اور اس کی بیعت کرو[۶]۔" اس طرح انہوں نے نہ صرف یہ کہ وفات نبی ﷺ پر اپنے ردعمل پر معذرت کی اور غلطی کو تسلیم کیا' بلکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بھی راسخ کی کہ ایک مسلمان کی فکر و نظر اور کردار و عمل کا اصل معیار صرف کتاب و سنت ہی ہیں۔ لوگوں کو توجہ دلانے کیلئے یہی موقع سب سے زیادہ مناسب تھا۔ آخر میں انہوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی عظمت و استحقاق کو ایک مرتبہ پھر اجاگر کیا' تاکہ لوگ خوشدلی اور پوری یکسوئی سے بیعت کریں۔ انہوں نے تقریر ختم کی' تو حضرت ابو بکر صدیقؓ ذمہ داری کے عظیم بوجھ کا اندازہ کر کے اٹھنے سے ہچکچا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ہی انہیں ہمت دلا کر بیعت کیلئے اٹھایا۔ بقول انسؓ بن مالک' میں نے اس روز حضرت عمرؓ کو حضرت ابو بکرؓ سے کہتے سنا "منبر پر چڑھیے' آپ مسلسل انہیں یہی بات کہتے رہے' یہاں تک کہ آپ منبر پر چڑھ گئے اور عوام الناس نے آپ کی بیعت کی[۷]۔" بیعت کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کا سب سے پہلا خطبہ ارشاد فرمایا[۸]۔ مسعودی کہتے ہیں کہ مسلسل تین دن تک بیعت ہوتی رہی[۹]۔

حضرت عمر فاروقؓ ابھی تک مکمل طور پر مطمئن نہیں تھے' ان کے دل میں دو باتیں کھٹک رہی تھیں۔ ایک یہ کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ نے ابھی تک بیعت نہیں کی تھی اور دوسرا یہ کہ بنو ہاشم اور خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل میں ابھی تک شکوہ موجود تھا کہ ان سے خلافت کے بارے میں مشورہ نہیں کیا گیا' اس لئے وہ بھی بیعت سے ہچکچا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ یہ سمجھتے تھے کہ سیاسی استحکام اور مکمل اتفاق و اتحاد کی فضا پیدا کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ دونوں بیعت کر لیں۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ اپنے قبیلے کے سردار بھی تھے اور انصار میں مقبول بھی۔ انہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے منتخب ہونے پر شدید صدمہ ہوا۔ چند روز تک تو ان سے کوئی تعرض نہ کیا گیا' لیکن بعد میں ان سے کہلا بھیجا گیا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بیعت کر لی ہے' اس لئے تم

---

(۱) طبری ۳:۲۲۲ (۲) طبری ۳:۲۲۳ (۳) سیرہ ۴:۱۰۶۸ (۴) کثیر ۵:۳۰۱ (۵) اثیر ۳:۲۲۴ (۶) بخاری ۸:۳۹ ہشام ۴:۳۱۱' حبان ۹:۱۵ کثیر ۵:۲۴۸ (۷) کثیر ۵:۲۴۸ (۸) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ہشام ۴:۳۱۱' سعد ۳:۱۸۲' طبری ۳:۲۱۰ (۹) مسعودی ۲:۳۰۷

بھی بیعت کر لو" لیکن انہوں نے جواب دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا' تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلے میں اپنا ترکش خالی نہ کر دوں[1]۔" اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ "انہیں بغیر بیعت لئے نہیں چھوڑنا چاہئے" لیکن حضرت بشیرؓ بن سعد کا مشورہ تھا کہ مناسب ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ حضرت ابو بکرؓ نے یہ رائے قبول کر لی اور حضرت عمرؓ نے بھی اس پر مزید اصرار نہ کیا۔ جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر بنو ہاشم کا معاملہ ہے' یہ اس لئے ضروری تھا کہ ان کا تعلق آنحضور ﷺ کے خاندان سے تھا۔ ان سے تمام مسلمانوں کو عقیدت تھی' یہ محض ایک فرد کا معاملہ نہیں تھا کہ جسے نظر انداز کر دیا جاتا' ان کی یہ شکایت اپنی جگہ پر بجا تھی کہ انہیں مشورے میں شامل نہیں کیا گیا[2]۔ اگرچہ اس وقت حالات کا رخ ایسا تھا' تجہیز و تکفین سے ان کی فراغت تک انتظار کرنا ممکن تھا اور صورتحال کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ حضرت علیؓ کی بیعت کے بارے میں روایت مختلف ہیں۔ بعض میں ہے کہ انہوں نے تجہیز و تکفین سے بھی قبل بیعت کی تھی[3]۔ بعض میں ہے کہ دوسرے روز بیعت کر لی تھی[4] اور بعض میں ہے کہ چھ ماہ بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد انہوں نے بیعت کی تھی[5]۔ صحیح بات یہی ہے جو علامہ ابن کثیر نے لکھی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دوسرے ہی دن بیعت کر لی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے کسی وقت بھی علیحدگی اختیار نہیں کی اور نہ ہی آپ کے پیچھے نماز پڑھنے سے رکے ہیں۔ یہاں تک کہ مرتدین کے خلاف تلوار اس وقت لے کر جب حضرت ابو بکرؓ ذوالقصہ کی طرف نکلے' تو حضرت علیؓ بھی ساتھ تھے البتہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد جو بیعت انہوں نے کی وہ تجدید تھی[6] تاکہ بعض لوگوں میں جو غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ انہوں نے بیعت نہیں کی وہ دور ہو جائے۔ اس سلسلے میں حضرت عمر فاروقؓ نے جو کردار سرانجام دیا مختلف روایتوں میں اس کی جھلک موجود ہے۔

ابی نضرۃ سے روایت ہے کہ لوگوں نے جب حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کی تو حضرت علیؓ و زبیرؓ الگ ہو رہے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کی طرف حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت کو بھیجا کہ وہ حضرت علیؓ کے گھر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت زبیرؓ نے جھروکے سے دیکھا اور حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اہل جنت میں سے دو آدمی آئے ہیں' ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم ان کے خلاف لڑیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "ان کیلئے دروازہ کھول دو" پھر وہ ان دونوں کو ساتھ لے کر حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے' انہوں نے فرمایا "اے علیؓ کیا تم رسول اکرم ﷺ کے چچا کے بیٹے اور داماد ہو۔ تم کہتے ہو کہ تم اس امر خلافت کے زیادہ حقدار ہو' اللہ کی قسم میں تم سے زیادہ حق رکھتا ہوں۔" انہوں نے جواب دیا کہ "اے خلیفہ رسول کوئی بات نہیں' اپنا ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں بیعت کروں۔" انہوں نے ہاتھ بڑھایا' تو حضرت علیؓ نے بیعت کر لی۔ اس طرح حضرت زبیرؓ نے بھی بیعت کر لی[7]۔ کچھ روایت اس کے برعکس بھی ہیں' جن سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ نے دیگر لوگوں کے ساتھ بیعت کر لی تھی' مگر یہ بیعت انہوں نے خوش دلی سے نہیں کی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ بیعت کریں۔ زیاد بن کلیب سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق بن الخطابؓ حضرت علیؓ کے مکان پر آئے' وہاں حضرت طلحہؓ' حضرت زبیرؓ اور بعض دوسرے مہاجر موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کہا کہ "چل کر بیعت کرو' ورنہ میں اس گھر میں آگ لگا دوں گا۔" حضرت زبیرؓ تلوار نکال کر بڑھے' تو فرش میں پاؤں الجھ جانے کی وجہ سے گر پڑے۔ تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی' لوگوں نے حضرت زبیرؓ کو قابو میں کر لیا[8]۔ بعض صحابہ کرام کا بیان یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ بیعت کرنے نہیں آئے۔ حضرت زبیرؓ نے اپنی تلوار نیام سے نکالی اور کہا "جب تک علیؓ کی بیعت نہیں کی جائے گی میں

---

(۱) طبری II:۳/۲۲۲ (۲) یعقوبی:۵/۸۲' کثیر II:۵/۲۵۰ (۳) کثیر II:۵/۲۴۹ (۴) اثیر I:۲/۲۲۰ (۵) یعقوبی ۵/۸۲' مسعودی ۲/۳۰۹ (۶) کثیر II:۵/۲۴۹ (۷) بلاذری II:۲/۵۸۵ (۸) طبری II:۳/۲۰۲ (۹) ۲۳

یہ تلوار نیام میں نہیں رکھوں گا۔ اس کی اطلاع حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ہوئی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "زبیرؓ سے تلوار چھین کر پتھر پر دے مارو" اور پھر حضرت عمرؓ ان کے پاس گئے اور انہیں زبردستی لے کر آئے۔ انہیں کہا کہ "بیعت تو تمہیں کرنا پڑے گی خواہ خوشی سے کرو یا دل ناخواستہ" تب ان دونوں نے بیعت کرلی (۱)۔ ایک اور روایت میں حضرت زیدؓ بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت زبیرؓ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گھر جا کر خلافت کے معاملے میں مشورے کیا کرتے تھے۔ جب اس کی خبر حضرت عمر بن الخطابؓ کو ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؓ کے ہاں پہنچے اور کہا "اے دختر رسول ﷺ اللہ کی قسم آپ کے والد محترم سے بڑھ کر ہمیں کوئی محبوب نہیں اور نہ ہی آپ کے والد محترم کے بعد آپ سے بڑھ کر ہمیں کوئی عزیز ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد یہ لوگ آپ کے ہاں جمع رہتے ہیں۔ خدا کی قسم میں حکم دوں گا کہ ان کے گھر جلا دیئے جائیں۔" جب حضرت عمرؓ چلے گئے تو وہ صاحبان حضرت فاطمہؓ کے پاس آئے تو انہوں نے کہا "تم جانتے ہو کہ عمرؓ میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ اگر تم نے دوبارہ ایسا کیا تو تمہارے گھروں کو جلا دیا جائے گا۔ اللہ کی قسم مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے حلف کو ضرور پورا کریں گے تم اپنی رائے پر نظر ثانی کرو اور میری طرف نہ لوٹنا۔" چنانچہ وہ وہاں سے رخصت ہو گئے اور اس وقت تک ان کی طرف نہ پلٹے جب تک حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی (۲)۔

صحیح صورت جو بھی ہو ان روایات سے بہر حال یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بیعت کی تکمیل تک اپنی کاوشیں جاری رکھیں۔ آنحضور ﷺ کی وفات کے بعد حالات کا سب سے بڑا تقاضا یہی تھا کہ نظم جماعت کو مضبوط کیا جائے اور امت مسلمہ کے شیرازہ کو منتشر ہونے سے بچایا جائے تاکہ وہ اپنا مقصدی وجود برقرار رکھ سکے اور آنے والے تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کی اہل ہو۔ یقیناً وہ اس میں کامیاب رہے اور تاریخ اسلام پر اس کے بہت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ انہوں نے قدم قدم پر ایسا بھرپور تعاون کیا کہ تاریخ میں اس سے بڑھ کر کسی تعاون کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (از سر نو) مصالحت اور بیعت کیلئے حضرت ابو بکرؓ کے ہاں کہلوا بھیجا کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لائیں لیکن آپ کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو۔ بقول حضرت عائشہؓ وہ دراصل اس موقع پر حضرت عمرؓ کی موجودگی کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ "ہرگز نہیں! بخدا آپ ان کے ہاں تنہا تشریف نہ لے جائیں۔" حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ "میں ان سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ میرے ساتھ ان کا کوئی برا ارادہ ہوگا۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا (۳)۔" چنانچہ وہ اکیلے ہی گئے حضرت عمرؓ پوری خوشدلی سے اپنی رائے سے دستبردار ہو گئے۔ اس موقع پر بھی انہیں صرف یہی اندیشہ تھا کہ کہیں معاملے میں الجھاؤ پیدا نہ ہو اور وہ خود جس حد تک کوئی مثبت تعاون کر سکتے ہیں ضرور کریں۔ ان کی بے لوثی کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خلافت کیلئے سقیفہ بنی ساعدہ میں ان کا نام پیش کیا تو اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "ابو بکرؓ کی کہی ہوئی کوئی بات مجھے ناگوار نہیں ہوئی سوائے اس بات کے خدا کی قسم یہ چیز کہ میں آگے بڑھوں اور تلوار سے میری گردن مار دی جائے جو مجھے گناہ کے قریب نہ کرے۔ مجھے اس چیز سے زیادہ پسند تھی کہ جس قوم میں ابو بکرؓ موجود ہو اس کا امیر میں بنوں (۴)۔"

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیعت کا جو طریق کار اختیار کیا گیا حضرت عمر فاروقؓ یہ سمجھتے تھے کہ اسے آئندہ کیلئے مثال نہیں بنانا چاہئے کیونکہ وہ ایک استثنائی صورت ہے۔ ایک تو اس لئے کہ حضرت ابو بکرؓ کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ کسی اور کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ دوسرا اس لئے کہ آنحضور ﷺ نے قولی اور عملی طور پر مختلف اشاروں کنایوں میں صدیق اکبرؓ کے استحقاق خلافت کا جو عندیہ دیا وہ کسی اور کے بارے میں نہیں ہے (۵)۔ تیسرا یہ کہ اس وقت حالات ہی ایسے تھے

(۱) طبری [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible]

کہ فوری بیعت ضروری ہوگی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے علاوہ کسی اور شخصیت پر اتفاق رائے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں کیلئے فائدہ اسی میں تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد صاحب رسول اللہ ﷺ کے کاندھوں پر ذمہ داری کا یہ عظیم بوجھ ڈالا جائے۔ وفات نبوی ﷺ پر ان کی دانشمندانہ تقریر اور بعد کے حالات نے یہ ثابت کردیا کہ ان سے بڑھ کر کوئی اس منصب کا اہل نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کو اپنے عہد خلافت کے آخری حج کے موقع پر یہ اطلاع ملی کہ فلاں شخص کہتا ہے کہ بخدا "اگر عمر بن الخطابؓ مر جائے" تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کرلیتا کیونکہ ابو بکرؓ کی بیعت تو محض وقتی تھی جو پوری ہوگئی[1]۔ اس پر غضبناک ہوگئے اور مدینہ پہنچ کر ایک خطبہ دیا جس میں اس بات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا "کسی کو اس شخص کا یہ کہنا دھوکہ میں نہ رکھے کہ ابو بکرؓ کی بیعت محض دفع وقتی کیلئے تھی۔ بے شک وہ ایسی ہی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے ہمیں شر سے بچایا اور پھر تم میں کوئی بھی ابو بکرؓ جیسا نہیں ہے جس کی طرف گردنیں جھک جائیں۔

پس جس شخص نے بغیر مسلمانوں کے مشورے کے کسی بھی شخص سے بیعت کی تو اس کی بیعت کا اعتبار نہ ہوگا اور نہ ہی کسی ایسی بیعت کا اعتبار ہوگا جو جماعت کو نظرانداز کرکے دو آدمیوں نے آپس میں کرلی ہو۔ پھر جماعت کی طرف سے ان دونوں کو قتل کا مستحق سمجھا گیا ہو[2]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ خلافت کے انعقاد کیلئے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو شریک مشورہ رکھنے کو اسلام کی روح سمجھتے تھے۔ انہوں نے نہایت بلیغ انداز میں چوری چھپے اور سازش کے تحت بیعت کرنے کے تصورات کو رد کیا۔ انہوں نے عملی طور پر بھی اس کا ثبوت پیش کیا کہ خفیہ طور پر اور مسلمانوں سے الگ ہو کر حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کرنے کے بجائے عین مجمع عام میں جاکر ہر طرح نتائج کا خطرہ مول لیا اور پوری بحث و تمحیص کے بعد دلائل کے ذریعے حضرت ابو بکرؓ کے استحقاق کو ثابت کیا اور پھر کہیں بیعت کیلئے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ اس پیش قدمی کے سلسلے میں بھی ان کے پاس قوی دلائل موجود تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے اس خطبے میں واقعہ سقیفہ کی روداد بیان کرنے کے بعد فرمایا "خدا کی قسم! ہم حاضرین نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت سے بڑھ کر کسی امر کو نفع بخش نہیں پایا۔ ہمیں یہ خدشہ تھا کہ اگر ہم لوگ الگ ہوگئے اور بیعت نہ ہوئی تو وہ ہمارے بعد بیعت کرلیں گے۔ پھر یا تو ہمیں اپنی مرضی کے خلاف ان سے بیعت کرنی پڑے گی یا پھر وہ ہمارے بعد بیعت کرلیں گے۔ پھر یا تو ہمیں اپنی مرضی کے خلاف ان سے بیعت کرنی پڑے گی یا پھر ہم ان کی مخالفت کریں گے جس سے فساد برپا ہوگا۔ پس جو کوئی مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی امیر کی بیعت کرے تو اس کی کوئی بیعت نہیں اور نہ ہی اس کی بیعت معتبر ہے جس نے یہ بیعت کی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کو قتل کردیا جائے[3]۔"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا حضرت عمر فاروقؓ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بالکل بجا کہا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی لوگوں پر چار فضیلتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی رائے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کے بارے میں ہوئی[4]۔ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد یہ پہلا معاملہ تھا کہ جس میں حضرت عمر فاروقؓ کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع ملا اور انہوں نے بڑی حکمت و دانائی' خلوص اور جرأت کے ساتھ اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔ اس سے ہم ان کی شخصیت میں جوہر قیادت نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ ملت مسلمہ کی بھلائی اور اسلام کے مستقبل پر مرکوز کرلی تھیں۔ آنحضور ﷺ کی وفات کے صدمے سے ان پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ بالکل فطری تھی مگر حیران کن بات یہ ہے کہ وہ بہت ہی جلد ختم ہوگئی اور غم نے انہیں اس قدر بے حال نہ ہونے دیا کہ ایک روگ لے کر بیٹھ جاتے۔ ان کی بصیرت و فراست نے فوراً اپنا کام شروع کردیا۔

---

(۱) ھشام ۴/۲۰۶، ۳، سیرۃ ۱۴/۵۶۳، حنبل ۱/۳۲۳، سیرا ۲/۲۲، کثیر ۵/۲۴۵ (۲) مسلم ۳/۸، ۳، شیبہ ۱۴/۵۶۵، حنبل ۱/۳۲۵، طبری ۳/۲۰۵ (۳) حنبل ۱/۳۲۸، طبری ۳/۲۰۶، کثیر ۵/۲۴۶ (۴) اثیر ۴/۶۶۔

نہیں سب سے زیادہ اس بات کی فکر ہوئی کہ اب متبادل قیادت کا انتظام کرنا سب سے اہم ہے۔ پھر وہ سرگرم عمل ہوگئے اور یک ہی دن کے بڑے مختصر حصے میں نہوں نے خلافت کے مسئلے کو طے کرالیا۔ حالات کے ہر مرحلے پر انہوں نے نہایت دانشمندانہ طریق کار اختیار کیا اور تمام مسلمانوں میں اتحاد واتفاق پیدا کر کے سلامی ریاست کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا۔ اب مسلمان آنے والے ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کیلئے پوری طرح تیار تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی باصلاحیت قیادت میں صرف سوا دو سال کے اندر یہ ریاست اس قابل ہوگئی کہ قیصر وکسریٰ کو چیلنج کر سکے۔

○......مشیر اعلیٰ:

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن غنم سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا **"لو اجتمعتما فی مشورة ماخالفتکما**[۱]۔" (مشورہ کر کے تم جس چیز پر متفق ہو میں اس میں کبھی اختلاف نہیں کرتا۔) اس ارشاد کے ذریعے رسول اکرم ﷺ نے اپنے دونوں صاحبوں اور مشیروں کو بالواسطہ طور پر اس بات کی تلقین کی ہے کہ انہیں ہمیشہ آپس میں مشورہ کر کے چلنا چاہئے اور پھر دونوں کے مشورے کی اہمیت وافادیت کو بھی واضح فرما دیا ہے کہ ان کا اتفاق رائے خود نبی ﷺ کی خواہش اور رضا کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت اور قوت وہی ہوگی جو خود ان کے اپنے فرمان کی ہو۔ یہ بات مسلمانوں کیلئے بھی نوید وبشارت تھی کہ آپ کی بصیرت وحکمت اثرات ونتائج کے اعتبار سے ان دونوں بزرگوں کے مشترکہ موقف میں جلوہ فگن رہے گی۔ چنانچہ عہد صدیقی میں حضرت عمرؓ کی حیثیت مشیر ووزیر کی تھی جنہیں ایک طرف تو خلیفہ رسول ﷺ کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور دوسری طرف وہ لوگوں کی تمناؤں کا محور اور جذبات کے ترجمان تھے۔ لوگوں کی بہت سی باتیں اور درخواستیں انہیں کے ذریعے حضرت ابو بکرؓ تک پہنچتی تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیق بھی تمام انتظامی معاملات میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیشہ انہیں شریک مشورہ کرتے اور انہیں اعتماد میں لیتے۔ وہ یہ مشاورت فقہی، قانونی اور سیاسی تمام معاملات پر حاوی ہوتی تھی اور ان میں حضرت عمرؓ پہلے نمبر پر تھے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ابو بکر صدیقؓ کو جب کوئی ایسا امر پیش آتا جس میں وہ اہل علم اور اہل الرائے کا مشورہ لینا چاہتے اور مہاجرین وانصار کے آدمیوں کو بلاتے تو وہ عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، معاذؓ بن جبل، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ کو بھی بلاتے تھے[۲]۔

حضرت عمرؓ کی حیثیت عہد صدیقی میں مشیر سے بھی بڑھ کر وزیر کی تھی۔ مختلف معاملات میں حضرت ابو بکر صدیق اپنی ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دیتے تھے اور ان کو نمائندے کے طور پر پورے اعتماد سے انہیں سرانجام دیتے۔ خلافت کے ابتدائی چھ ماہ مدینے کے نواح میں واقع ایک مقام "سخ" میں قیام پذیر رہے، وہاں سے آکر خلافت کی ذمہ داریاں بھی پوری کرتے تھے اور نمازیں بھی پڑھاتے تھے۔ جب وہ موجود نہیں ہوتے تھے تو ان کے قائم مقام کے طور پر حضرت عمر فاروقؓ ہی امامت کراتے تھے[۳]۔ اس دور میں نماز کی امامت معتمد ترین شخص ہی کے سپرد ہوتی تھی۔ اسی طرح خلافت کے پہلے سال اللہ کو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمر فاروقؓ ہی کو حج کا عامل بنا کر بھیجا[۴]۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ قریب ترین ساتھی اور رفیق رہنے کی وجہ سے ان کی تمام صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انہیں یہ معلوم تھا وہ حجاز اور قرب وجوار کے تمام قبائل اور اقوام کے تمام احوال ومعاملات سے واقف بھی ہیں اور جرأت وحمیت کے پیکر بھی، بہترین منصوبہ ساز بھی

---

(۱) سیوطی ا:۵۱ (۲) سعد ۲:۲/ ۳۵ (۳) سعد ۳:۱۸۶، اثیر ۲:۲۹۱ (۴) سعد ۳:۱۸۷، طبری ۳:۲۸۶، سیوطی:۸۰۔

ہیں اور قائدانہ صفات کے حامل بھی۔ اس لئے اگر انہیں سالار لشکر بنا کر بھیج جائے' تو اسلامی فتوحات کا ایک وسیع باب کھل سکتا ہے اور ان کے ذریعے دور دراز کے علاقوں تک خدا کی حاکمیت کا ڈنکا بجایا جاسکتا ہے' لیکن انہوں نے انہیں یہ ذمہ داری نہیں سونپی۔ یہ ان کے دل کی حسرت ہی رہی' جو ایک مرتبہ ان کی زبان پر ان الفاظ میں ظاہر ہوئی "میں اپنے تین ارادوں سے باز رہا' حالانکہ میں ان میں سے ایک سے بھی باز رہنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک یہ کہ جب اشعث بن قیس میرے پاس لایا گیا تو میں نے چاہا کہ اسے قتل کرادوں۔ دوسرا یہ کہ جب الفجاء میرے سامنے پیش کیا گیا' تو میں اسے جلوانا نہیں چاہتا تھا' بلکہ قتل کرانا چاہتا تھا۔ تیسرا یہ کہ جب میں نے خالدؓ کو شام کی طرف بھیجا' تو عمر بن الخطابؓ کو عراق کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیا' تاکہ میرے دونوں ہاتھ اللہ کی راہ میں پھیل جائیں (۱)۔" صدیق اکبرؓ نے انہیں اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے بجائے حضرت عمر فاروقؓ کو اپنے پاس بطور مشیر و وزیر مدینے ہی میں رکھا' کیونکہ ان کی اجتہادی بصیرت اور فکر و نظر کی گہرائی کے اتنا ہی معترف تھے' جتنا قائدانہ اور سپہیانہ صلاحیت کے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ انہیں مدینے میں ٹھہرانا زیادہ مفید ہے۔ اس طرح ریاست و خلافت کے تمام چھوٹے بڑے امور میں ان کے بصیرت افروز مشوروں سے استفادہ کیا جاسکے اور پورے نظام میں ان کی معاونت محض ایک شعبہ کی سپردگی کی بہ نسبت زیادہ ضروری ہے اور آپ سمجھنے میں وہ حق بجانب تھے۔

بطور مشیر مدینے میں ان کا قیام اس لئے بھی اہم تھا کہ صدیق اکبرؓ یہ جانتے تھے کہ وہ ہر مسئلے کے تمام ممکنہ پہلوؤں پر پورا غور کرتے ہیں' اس کے عواقب و نتائج کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ پوری بے باکی اور مضبوط دلائل سے اپنا موقف پیش کرتے اور دلیل کی بنیاد پر اپنی رائے کو تبدیل کر کے اطاعت کا حق ادا کرتے ہیں۔ مشورے کی امانت پہنچادینے کے بعد اپنی رائے پر بے جا اصرار نہ کرنا اور خلافت کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر کے پورے خلوص کے ساتھ اسے نافذ کرنا' ایک ایسی صفت ہے' جو ان جیسے جلیل القدر انسان کا ہی خاصہ ہوسکتی ہے۔ یہی وہ چیز تھی جو صدیق اکبرؓ کیلئے انتہائی تقویت کا باعث بنی۔ فاروق اعظمؓ کے مشوروں کا تجزیہ کیا جائے' تو ان میں بصیرت' گہرائی' دلائل' بے باکی اور خلوص سب میں چھلکتا نظر آتا ہے۔ مشورہ قبول کیا گیا یا نہیں' کسی حالت میں بھی اطاعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔

ا۔ لشکر اسامہؓ:

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد سب سے بڑا اور سب سے اہم مسئلہ روم کی طرف لشکر اسامہؓ کی روانگی کا تھا' جس کا حکم خود سرور دو جہاں ﷺ دے چکے تھے۔ وفات سے چند روز قبل حضرت اسامہ بن زیدؓ کو بلا کر فرمایا "اپنے باپ کے مقتل پر جاؤ اور کفار کو کچل دو میں نے اس لشکر کا تمہیں والی بنادیا ہے (۲)۔" مہاجرینؓ اولین اور انصارؓ کے معززین میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا' جو اس غزوے میں نہ بلایا گیا ہو' ان میں حضرت ابو بکر صدیقؓ' حضرت عمرؓ' حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح' سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ جیسے جلیل القدر صحابہ کرام بھی شامل تھے (۳)۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو نماز پڑھانے کیلئے آپ ﷺ نے مستثنیٰ کر لیا (۴)۔ لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ آنحضور ﷺ نے مہاجرین و انصار پر ایک نوعمر غلام کو امیر بنادیا ہے۔ آپ نے محسوس کیا کہ کسی وجہ سے تساہل و تاخیر سے کام لے رہے ہیں۔ اس پر آپ نہایت غصے ہوئے اور ایسے عالم میں باہر تشریف لائے کہ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور جسم پر ایک چادر تھی۔ منبر پر چڑھے اور اللہ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا "لوگو! اسامہ کا لشکر جلد بھیج دو' قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم نے اسامہ کی امارت پر اعتراض کیا ہے' تو تم ان سے پہلے ان کے باپ کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو (جو غلط ثابت ہوا) خوب سمجھ لو کہ اسامہ امارت کے قطعی اہل ہیں اور ان کے باپ بھی اس کے اہل ثابت ہو چکے ہیں (۵)۔" یہ لشکر اگلے روز روانہ

---

(۱) بلاذری ۱۲۴:۱ (۲) سعد ۱۹۰/۲ (۳) سعد ۱۹۰/۲ (۴) کثیر ۳۰۴/۶:۱۱ (۵) ہشام ۱۰۳/۴' سعد ۱۹۰/۲۔

ہو گیا "جرف" کے مقام تک پہنچا تو اطلاع ملی کہ رسول اکرم ﷺ انتقال کر چکے ہیں' تو سب لوگ واپس آ گئے۔ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی گئی تو انہوں نے سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ لشکر اسامہؓ روانہ ہو جائے۔ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ تمام عرب قبائل یا تو پورے کے پورے مرتد ہو چکے تھے یا ان میں سے کچھ لوگ ضرور مرتد ہو گئے۔ بہرحال کوئی قبیلہ بھی مکمل طور پر مسلمان نہ رہا' ہر طرف نفاق پھوٹ پڑا' اب یہود و نصاریٰ بھی مسلمانوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور خود مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ نبی ﷺ کی وفات (کے غم) اور اپنی قلت اور دشمن کی کثرت کی وجہ سے ان بھیڑ بکریوں کی طرح ہو گئے جو موسم سرما کی برساتی رات میں حیران ہو گئی ہوں[۱]۔ ان حالات کی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ اور دیگر مسلمانوں نے حضرت ابو بکرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ یہ لشکر ابھی روانہ نہ کیا جائے' لیکن اس کے جواب میں انہوں نے ارشاد فرمایا "خدا کی قسم! میں اس علم کو نہیں کھول سکتا' جس کو رسول اللہ ﷺ نے باندھا ہو خواہ ہمیں پرندے اچک لے جائیں' مدینہ میں درندوں کا دور دورہ ہو جائے اور امہات المومنینؓ تک کو کتے گھسیٹتے پھریں' جیش اسامہؓ کی روانگی کسی حال میں ملتوی نہیں کی جا سکتی[۲]۔"

اس پر عزم اور اٹل جواب کے بعد لوگ لشکر گاہ میں اکٹھے ہو گئے۔ تذبذب کی ابھی تک کیفیت موجود تھی' خود حضرت اسامہؓ صورتحال کی نزاکت کو دیکھ رہے تھے' انہیں یہ بھی خدشہ تھا کہ شاید انہیں مطلوبہ اطاعت نہیں مل سکے گی اس لئے انہوں نے خلیفہ وقت کے مشیر و وزیر حضرت عمرؓ کو جو اس وقت ان کی زیر کمان تھے ان کو حکم دیا "آپ جائیں اور خلیفہ رسول ﷺ سے میری واپسی کی اجازت لے کر آئیں' کیونکہ تمام اکابر اور بہادر مسلمان میرے ساتھ ہیں اور مجھے خلیفہ رسول ﷺ اور رسول اللہ ﷺ کے متعلقین اور دیگر مسلمانوں کے متعلقین کی جانوں کا اندیشہ ہے کہ کہیں مشرکین اچانک انہیں قتل نہ کر دیں[۳]۔" اس مہم کے انصاریوں نے ایک متبادل تجویز بھی پیش کی۔ حضرت عمرؓ سے یہ کہا کہ اگر خلیفہ رسول ﷺ واپسی کی اجازت نہ دیں اور جانے ہی پر اصرار کریں' تو آپ ان کو ہماری طرف سے کہیں کہ وہ ہمارا امیر ایسے شخص کو مقرر کریں' جو عمر میں اسامہؓ سے بڑا ہو[٤]۔ حضرت اسامہؓ کے حکم پر حضرت عمر فاروقؓ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس مدینہ آئے اور آنے کی غرض بیان کی اور اسامہ کی درخواست سنائی' تو انہوں نے جواب دیا "اگر کتے اور بھیڑیے تنہائی کی وجہ سے مجھے کھا جائیں' تب بھی میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کو رد نہیں کروں گا[۵]۔" پھر حضرت عمر فاروقؓ نے متبادل تجویز پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ "انصار نے آپ سے درخواست کی ہے کہ آپ ان کا امیر کسی ایسے شخص کو مقرر کر دیں جو اسامہؓ سے بڑا ہو۔" یہ سن کر ابو بکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے' غصے سے اچھل پڑے اور آگے بڑھ کر حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی اور فرمایا "اے خطابؓ کے بیٹے! تیری ماں تجھے کھو دے' تم مر جاتے' جس شخص کو رسول اللہ ﷺ نے اس منصب پر فائز کیا ہے تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے علیحدہ کر دوں[۶]۔" چنانچہ حضرت عمرؓ بے نیل و مرام اپنی فوج میں واپس آئے' تو انہوں نے پوچھا "کیا کہہ کر آئے ہیں؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "اللہ تمہاری ماؤں کو تمہارا سوگوار بنائے' آگے بڑھو' خلیفہ رسول ﷺ کے ہاں تمہاری درخواست مقبول نہیں ہوئی[۷]۔" بعد ازاں حضرت ابو بکرؓ خود اس مہم کے پڑاؤ میں تشریف لائے اور سے روانہ کرنے لگے' تو حضرت اسامہؓ سے کہا "بہتر ہوتا کہ عمرؓ کو آپ میرے پاس چھوڑ جاتے۔" انہوں نے جواب دیا "ٹھیک ہے' انہیں لے جایئے[۸]۔" اس طرح وہ انہیں لے کر واپس مدینہ آ گئے۔ بقول مسعودی انہوں نے یہ اس لئے کیا تاکہ خلافت کے معاملات میں ان سے مدد حاصل کریں[۹]۔

---

(۱) طبری ۲/۳: ۲۲۵، کثیر ۶/۱: ۳۰٤، اثیر ۲: ۲۲۶ (۲) طبری ۳/۲: ۲۲۵، کثیر ۶/۱: ۳۰۵ (۳) طبری ۳/۲: ۲۲۶، اثیر ۲: ۲۲۶ (٤) طبری ۳/۲: ۲۲۶، کثیر ۶: ۳۰۵، اثیر ۲: ۲۲۶ (۵) طبری ۳/۲: ۲۲۶، اثیر ۲: ۲۲۶ (۶) طبری ۳/۲: ۲۲۶، سیوطی ۶: ۵۸۳، کثیر ۶/۱: ۳۰۵، اثیر ۲: ۲۲۶ (۷) طبری ۳/۲: ۲۲۶ (۸) طبری ۳/۲: ۲۲۷، کثیر ۶/۱: ۳۰۵ (۹) مسعودی ۲: ۱۲۷

اس واقعہ سے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے فکر و نظر اور مزاج و طباع کا اختلاف بہت نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہاں حضرت ابو بکرؓ کی مقدسانہ شان پوری طرح جلوہ گر ہے اور حضرت عمرؓ کی مجتہدانہ فراست اپنے عروج پر ہے۔ دونوں کا موقف اپنی اپنی جگہ بڑا اہم اور جاندار تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کا خیال یہ تھا کہ لشکر کی روانگی حکم نبوی ﷺ کا درجہ رکھتی ہے' اس لئے کہ حضور ﷺ نے خود اس کا فیصلہ فرمایا تھا' اس کی حیثیت نص قطعی کی طرح ہے' جس سے سرتابی کا ایک ایسا شخص سوچ بھی نہیں سکتا' جو نبی محترم ﷺ کا یار غار' مشیر خاص' ساتھی و ہمدم رہا ہو اور ان کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال چکا ہو۔ یہ روز مرہ کا کوئی انتظامی معاملہ نہیں تھا' جس پر ہر شخص کو رائے زنی کا حق حاصل ہو اور جسے شوریٰ کے مشورے سے طے کیا جائے۔ یہ تو خدا کے نبی ﷺ کا طے شدہ امر تھا' جسے تبدیل کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا' جس کی تنفیذ ان کے فرائض میں شامل تھی۔ ساری دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے' ہر شخص چاہے مخالفت پر آمادہ ہو جائے' اندرونی و بیرونی خطرات خواہ ان کی بوٹی بوٹی اڑا دینے تک پہنچ جائیں' پھر بھی خلیفہ اول اپنے محبوب قائد کے فرمان کی تنفیذ سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اگر آج وہ خطرات سے خوفزدہ ہو کر سرور کونین ﷺ کی پالیسیاں تبدیل کرنا شروع کر دے' اور لوگوں کے دباؤ کا اسیر بن جائے' تو پھر کل جب وہ نہیں ہو گا' تو اس دین مبین کا حلیہ کیسا ہو جائے گا؟ انحراف کی نہ جانے کون کون سی راہیں کھل جائیں گی۔ پھر خدا نے جب اس دین کی حفاظت کا خود ہی ذمہ لیا ہے تو پھر ڈر کس بات کا؟ رہا حضرت اسامہؓ کو ہٹانے کا مشورہ اور ان کی قیادت پر اعتراض کا معاملہ' یہ واقعی ان کیلئے اس قدر ناقابل برداشت تھا کہ ان کا یہ جی چاہتا تھا کہ ایسا کہنے والے کا منہ نوچ لیں' کیونکہ رسول اللہ ﷺ خود اس اعتراض کا جواب دے چکے تھے۔ اب اس کو دوبارہ اٹھانے کی آخر کسی کو کیوں ہمت ہو؟ اس لئے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پائے استقامت میں ذرا برابر بھی لغزش پیدا نہ ہوئی اور انہوں نے خود پیادہ جا کر اپنے ہاتھوں سے لشکر کو روانہ کر کے دم لیا۔

اس کے برعکس حضرت عمر فاروقؓ کا موقف یہ تھا کہ اس لشکر کو بھیجنے کا معاملہ انتظامی نوعیت کا تھا' اس کی حیثیت حکم قطعی کی نہیں تھی کہ ہر حال میں اس کی اطاعت واجب ہو۔ جن حالات میں اسے بھیجا جا رہا تھا' وہ اب یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔ پہلے اندرونی طور پر مکمل امن و امان تھا' کسی بیرونی طاقت سے مقابلہ کرنے کیلئے حالات سازگار تھے' جبکہ اس وقت صورت احوال یہ ہو چکی تھی کہ خود دارالخلافہ خطرات کی زد میں تھا۔ اس نو زائیدہ مملکت کی اپنی بقاء داؤ پر تھی۔ اس کے دفاع کیلئے ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ ایک مشیر و وزیر کے طور پر ان کی ذمہ داری تھی کہ حالات کی سنگینی کا خلیفہ وقت کو احساس دلائیں۔ انہیں یہ سمجھائیں کہ سیاسی حالات تغیر پذیر رہتے ہیں' انہیں متعلقہ حالات کے تناظر ہی میں دیکھنا' پرکھنا اور حل کرنا چاہئے۔ ان کے نزدیک لشکر کی روانگی کو کچھ عرصہ کیلئے موخر کرنا حکم عدولی کے زمرے میں نہیں آتا' جس کیلئے بہت زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت ہے۔ حضرت عمرؓ ایک سیاسی اور انتظامی سوچ رکھتے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اس معاملے کو مشاورت سے حل کیا جائے اور رائے عامہ کو ضرور اہمیت دی جائے' جو ہر سیاسی معاملے کو سمجھانے کیلئے اشد ضروری ہے اور خاص طور پر ایسے حالات میں جبکہ پوری سلطنت میں بغاوت کے ڈھول بج رہے ہوں اور مرکز خطرے میں ہو' تو لوگوں کا حوصلہ بلند کرنا' ان کی تقویت کے انتظامات کرنا اور ان کی رائے کو وزن دینا وقت کا تقاضا ہوتا ہے۔

بطور مشیر ان کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ لوگوں کے جذبات و احساسات کو بلا کم و کاست خلیفہ تک پہنچائیں اور ایسی حالت میں جبکہ لوگ خود انہیں نمائندہ بنا کر بھیجنا چاہیں' تو وہ اجتناب کر کے لوگوں کو بددلی' بے اعتمادی اور مایوسی کے گڑھے میں جانے کی راہ ہموار نہ ہونے دیں۔ اس لئے ایک مرتبہ پھر حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں چل دیئے۔ لشکر کی روانگی موخر کرنے کی تجویز جو انہوں نے دیگر لوگوں کے ہمراہ پیش کی تھی اب خود سالار لشکر کی طرف سے لے کر حاضر ہوئے اور اب شرکائے لشکر کی طرف سے قیادت تبدیل کر دینے کی متبادل تجویز بھی ان کے پاس تھی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس دوسری تجویز سے وہ خود اتفاق نہیں کرتے تھے۔ محض لوگوں کی خواہش اور اصرار کو آگے منتقل کرنا مقصود تھا۔ بہر حال لشکر بھیج کر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اتباع و اقتداء کا حق ادا کر دیا۔

ان کے نزدیک ارد گرد کے فتنوں سے زیادہ بڑا اور خطرناک فتنہ یہ تھا کہ مسلمان اطاعت نبوی ﷺ سے انحراف کریں اور خیر و بھلائی کی دوسری راہیں تلاش کریں اور اسے حکمت و مصلحت کا نام دیں۔ حضرت ابو بکرؓ کا یہ اقدام نتائج کے اعتبار سے بہت مفید اور دور رس ثابت ہوا۔ ایک طرف بیرونی طاقتوں کو اندرونی حالات سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ دوسری طرف بغاوت پر آمادہ بہت سے قبائل مرعوب ہو کر خاموش ہو گئے۔ تیسری طرف اس لشکر کی کامیابی نے دیگر مہمات میں مصروف مسلمانوں کے حوصلے بلند کر دیے۔ چوتھی طرف عین ضرورت کے وقت مسلمانوں کو اس فاتح لشکر کے شرکاء کی تازہ دم کمک حاصل ہو گئی اور مرتدین کے خلاف کارروائیوں میں مسلمانوں کے حق میں جنگوں کا پانسہ پلٹ گیا اور سب سے بڑی بات جو دراصل حضرت ابو بکرؓ کے پیش نظر تھی' یعنی پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی ہر حال میں کامل اور غیر مشروط فرمانبرداری کا درس' اس میں وہ کامیاب ہو گئے اور یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کی دینی اور اخروی دونوں کامیابیوں کا راز صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں پنہاں ہے۔ یہ درس مسلمانوں کے اجتماعی شعور کو رہتی دنیا تک اتباع کی شاہراہ پر گامزن رکھے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ لشکر اسامہ کی روانگی کے سلسلے میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پر عزم موقف اور اس کے اثرات کا حوالہ دے کر یہ فرماتے ہیں کہ "قسم ہے وحدہ لا شریک لہ کی اگر ابو بکرؓ خلیفہ نہ ہوتے تو روئے زمین پر کوئی اللہ کی عبادت نہ کرتا[1]۔" حضرت ابو بکرؓ نے جہاں اپنی رائے کو سب سے منوایا وہاں خود بھی اطاعت امر کی درخشندہ مثال پیش کی اور حضرت عمر فاروقؓ کو خود روک لینے کے بجائے حضرت اسامہؓ سے اجازت لی' اس لئے کہ اس وقت وہی صاحب امر تھے' اپنے مشیر و وزیر کو اپنے پاس رکھا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ ہر بات میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے' بلکہ صرف اس خاصیت کی وجہ سے کہ وہ ان سے اختلاف کرنے کی ہمت رکھتا ہے' مشورے کو امانت سمجھ کر ہر حال میں پیش کرتا ہے۔ مافی الضمیر کو پورے دلائل اور اخلاص کے ساتھ سامنے لاتا ہے اور رضا و رغبت سے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

۲۔ مانعین زکوٰۃ کا معاملہ :

سرور کونین ﷺ کی وفات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور انتہائی تیزی سے جزیرہ عرب کی حدود سے نکل کر دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئی۔ بس سے اپنے پرائے سب سہم گئے' یہ حادثہ مسلمانوں کیلئے تو بڑا جانگسل تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی روایت کے مطابق مدینے میں عالم یہ تھا کہ لوگ مدہوش ہو گئے' ان کی عقل جاتی رہی' ان پر سکتہ طاری ہو گیا' فہم و شعور ختم ہو گئے' ان میں سے بعض تو غم سے اس قدر نڈھال ہو گئے کہ عقل ہی کھو بیٹھے۔ بعض چپ ہو رہے' بعض زمین پر بیٹھ گئے۔ حضرت عمرؓ بھی ان میں سے تھے' جو غمزدہ ہو کر حواس باختہ ہو گئے اور چیخ کر کہنے لگے کہ رسول اکرم ﷺ مرے نہیں۔ حضرت عثمانؓ کو گنگ لاحق ہو گیا اور قوت گویائی جاتی رہی۔ ان کو لایا اور لے جایا جاتا رہا' وہ بات نہ کر پاتے۔ حضرت علیؓ تو ایسے بیٹھے کہ حرکت ہی نہ کر پائے۔ رہے عبداللہ بن انیسؓ تو ان کو ایسا مرض لاحق ہوا کہ انتقال کر گئے[2]۔ جب صحابہ کرام کا یہ عالم تھا' تو سلطنت کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہزاروں لوگوں کی کیفیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے' جن کا نہ تو عقیدہ راسخ تھا' نہ اسلام کے مقصد سے آگاہ تھے اور نہ اس کی حقیقی روح و مزاج کی تہہ تک پہنچ سکے تھے اور نہ ہی ان کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ بندوبست ہو سکا تھا۔ ان کے ذہنوں میں شکوک شبہات پیدا ہونا اور بے یقینی کی حالت میں انتشار و انحراف کی راہوں پر چل پڑنا بالکل فطری تھا۔ رسول کرم ﷺ مرکز توازن کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کی عقیدتوں اور محبتوں کا محور تھے۔ ان کے اچانک وفات پا جانے سے وحدت کے ہار کی لڑی ٹوٹ گئی اور فکری و عملی قیادت کا ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوا۔ جب کوئی خلا پیدا ہوتا ہے تو اس کو پر کرنے کیلئے آندھیاں' جھکڑ اور بگولے نمودار ہوتے ہیں' چنانچہ ایسا

---

(۱) سیوطی ۱/۷۴' کنز العمال ۵/۳۰۵ (۲) سہیلی ۶/ ۵۸۲

ہی ہوا۔ شاطر و چالباز لوگوں نے عوام کی جہالت و سادہ دلی سے خوب فائدہ اٹھایا اور جھوٹی نبوت کے دعویدار بن کر مدینہ کی مرکزیت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے' جہاں نہایت خوش اسلوبی مگر بڑی مشکل سے خلافت کا مسئلہ طے کر لیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنے مفادات کیلئے ہر وہ حربہ استعمال کیا' جو ان حالات میں کارگر ہو سکتا تھا۔ قبائلی عصبیتوں کو ہوا دی' لوگوں کی افتادِ طبع سے فائدہ اٹھایا۔ عہد جاہلیت کے رسوم و رواج سے ان کے تعلق کو زینہ بنایا۔ آنحضور ﷺ کے ساتھ ہی اسلام کے کمزور ہونے اور اس کے تقاضوں کے ختم ہو جانے کا پروپیگنڈا بھی کیا۔ ایک اور چیز جو ارتداد کے علمبرداروں کیلئے سودمند ثابت ہوئی' وہ یہ تھی کہ اہل عرب کا طرز و تمدن ہمیشہ سے بدویت پر استوار تھا۔ وہ کبھی مرکزیت اقتدار کے تحت رہنے کے عادی نہیں رہے تھے۔ اسلام نے انہیں ایک مستحکم وحدانی نظام تو دے دیا' لیکن وہ ابھی اس سے مکمل طور پر مانوس نہ ہوئے تھے اور نہ ہی فکری و عملی طور پر ہم آہنگ' بعض دلوں میں خوابیدہ مذہبی تعصب دوبارہ جاگ اٹھا اور اپنا کام کر گیا۔

یہ تھے وہ عوامل جو فتنہ ارتداد کے پیچھے کارفرما تھے۔ ہر قبیلہ اور ہر گروہ اپنے اپنے حالات و ظروف کے مطابق اس میں شریک ہوا۔ مدینے سے دور کے علاقے اور ساحلی قبائل تو مکمل طور پر ارتداد کی لپیٹ میں آ گئے' لیکن نزدیک بسنے والوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ کچھ قبائل ایسے بھی تھے جو ابھی تک مذبذب کا شکار تھے اور حالات کا رخ دیکھ رہے تھے۔ ادھر یہ حالت تھی کہ سات سو آدمیوں پر مشتمل لشکر اسامہ کی قیادت میں روانہ ہو چکا' لوگوں میں خوف اور مایوسی موجود تھی اور پیچھے فرادی قوت بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ مدینے کے اندر منافقین کا ایک مضبوط گروہ موجود تھا' جو کوئی حرکت کر سکتا تھا۔ مہاجرین و انصار کے دلوں میں خلافت کے مسئلے پر بحث و تمحیص کے اثرات ابھی مٹے نہیں تھے۔ خود آنحضور ﷺ کے اپنے قبیلے بنو ہاشم کے اکابرین اور اہل بیت کو یہ شکوہ تھا کہ مسئلہ خلافت میں انہیں شامل مشورہ نہیں کیا گیا۔ اس پس منظر میں ایک سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اسلام کو کس طرح بچایا جائے اور لوگوں کو کس طرح اس کا پرخلوص مطیع بنایا جائے؟ دوسرا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پوری سلطنت میں کس طرح امن و امان بحال کر کے سیاسی استحکام پیدا کیا جائے؟ تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ خود دارالخلافہ مدینہ کو کیسے محفوظ کیا جائے؟ خوف و خطر کے اس طوفان میں مذکورہ تینوں مسائل کو حل کرنے کیلئے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟ ہر مسلمان اس سوچ میں محو تھا اور سب سے زیادہ جنہیں یہ فکر لاحق ہو سکتی تھی' وہ رسول اکرم ﷺ کے دونوں ساتھی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تھے۔ لوگوں کی نظریں انہیں کی طرف اٹھ رہی تھیں اور ان کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ امت مسلمہ کی اس کشتی کو گردابوں سے نکالنے کی راہ تلاش کریں۔ ایک وقت کا خلیفہ تھا اور دوسرا اسے اس منصب پر بٹھانے والا معتمد و مشیر۔ دونوں حالات کی معروضیت کو اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ مسائل کو حل کرنے کیلئے اپنی سوچ اور اپنی رائے رکھتے تھے اور اپنے اپنے مزاج و طبیعت کے مطابق حل کرنے کے خواہشمند تھے۔ ان میں ایک مجتہد تھا اور دوسرا مقتدی' اس لئے ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے فکر و نظر کی راہوں کا جدا ہونا ناگزیر تھا۔ اجتماعی معاملات میں آراء کی یہی نیرنگی و فرق زندگی کے وجود اور اس کے ارتقاء کی علامت ہے۔ دونوں میں طریق کار کے بارے میں شدید اختلاف پیدا ہوا۔ پرزور دلائل سے انہوں نے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کی اور اپنے موقف کی وضاحت کی' لیکن یہ اختلاف باہمی ادب و احترام اور اعتماد و تعاون کی راہ میں حائل نہ ہوا۔ جب فیصلہ ہو گیا' تو مل کر اسے عملی جامہ پہنانے کیلئے سربکف ہو گئے۔

مانعین زکوٰۃ کا معاملہ یہ تھا کہ اس میں مدینہ کے گرد و نواح میں بسنے والے قبائل شامل تھے' جن میں بنو اسد' بنو طے' بنو غطفان' بنو فزارہ' بنو عبس' بنو ذبیان' بنو کنانہ سرفہرست تھے[1]۔ زکوٰۃ سے انکار کے محرکات میں جہاں مال کی محبت' بخل' قبائلی عصبیت جزیہ کی طرح کا ایک ٹیکس سمجھ لینے کی غلط فہمی کارفرما تھی' وہاں انہوں نے ایک آیت قرآنی کی غلط تاویل کو بھی بنیاد بنایا۔ ارشاد ربانی ہے:

(۱) [illegible]

"خذ من اموالهم صدقة تطهرهم و تزكيهم بها و صل عليهم ان صلاتك سكن لهم والله سميع عليم[۱]۔ "اے نبی ان کے اموال سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کیلئے وجہ تسکین ہوگی اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم کسی شخص کو اپنی زکوٰۃ دینے کیلئے تیار نہیں ہیں' سوائے اس کے کہ اس کی دعا ہمارے لئے باعث تسکین ہو۔ ان میں سے بعض نے یہ شعر پڑھا۔

اطعنا رسول الله اذ كان بينا

فواعجبا ما بال ملك ابی بكر[۲]

(جب تک رسول اللہ ﷺ ہم میں موجود تھے تو ہم نے ان کی اطاعت کی پس تعجب ہے کہ ابو بکرؓ کی حکومت کی آخر کیا حیثیت ہے۔)

ان دلائل میں ان کی فکر و نظر کی کجیاں صاف جھلک رہی ہیں۔ اصل بات یہی تھی کہ وہ کسی صورت میں زکوٰۃ دینے کیلئے تیار نہیں تھے۔ انہیں پہلے ہی یہ اندازہ تھا کہ ان کی خواہش پوری نہیں ہو سکے گی اس لئے انہوں نے مسلح تیاریاں شروع کر دیں اور ساتھ ساتھ سیاسی و اخلاقی دباؤ ڈالنے کیلئے حضرت ابو بکرؓ کے پاس وفود بھیج کر بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا۔ وفات نبوی ﷺ کے تقریباً دس دن بعد بنی اسد' غطفان' ہوازن' طے اور قضاعہ کے وفود مدینہ میں جمع ہو چکے تھے[۳]۔ انہوں نے سوائے حضرت عباسؓ کے تمام مسلمان عمائدین کے ہاں قیام کیا۔ اپنے میزبانوں کو قائل کرنے کے ساتھ ساتھ آپس میں بھی اس مطالبے پر سمجھوتہ کر لیا کہ ہم نماز پڑھنے کیلئے تیار ہیں' بشرطیکہ زکوٰۃ معاف کر دی جائے[۴]۔ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر جب اپنے اکابرین کے سمجھوتے کی خبر دی' تو انہوں نے یہ کہہ کر مطالبہ مسترد کر دیا کہ میں وہی زکوٰۃ برابر وصول کروں گا' جو نبی ﷺ وصول فرماتے تھے اور انہیں مدینے سے نکل جانے کیلئے ایک رات اور ایک دن کی مہلت دی[۵]۔ ان کے خلاف جب فوجی کارروائی کا ارادہ کیا تو صحابہ کرامؓ نے گفتگو کی اور کہا کہ یہ لوگ زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کی' جس حالت پر قائم ہیں' انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیں اور ان سے الفت و محبت کا تعلق قائم کریں' یہاں تک کہ ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں ہو جائے اور خود ہی زکوٰۃ دینے لگ جائیں[۶]۔ حضرت عمر فاروقؓ کی بھی یہی رائے تھی' تو انہوں نے بطور مشیر و وزیر اپنے طور پر یہی مشورہ دیا اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی' ان کا اپنا بیان ہے "جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو گیا تو بعض لوگ مرتد ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم نماز تو پڑھیں گے' مگر زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ "میں حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ' لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیجئے اور ان سے نرمی برتئے' یہ تو وحشیوں کی طرح ہیں۔ "حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا "میں تو تم سے مدد کی امید کر رہا تھا' لیکن تمہیں میری ہی تباہی کی فکر ہے۔ جاہلیت کا جابر و جری اور اب اسلام میں کمزور پڑ گیا ہے۔ آخر میں کس طرح ان کے دلوں کو متوجہ کروں؟ ان کے سامنے باتیں بنا کر یا جادوگری کر کے؟ افسوس صد افسوس رسول اللہ ﷺ انتقال فرما گئے ہیں اور وحی بند ہو گئی ہے۔ واللہ جب تک میرے ہاتھ میں تلوار کا قبضہ ہے میں ان سے ضرور جہاد کروں گا کہ اگرچہ یہ معمولی سے رسی وغیرہ بھی نہیں دیں گے۔ "حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس معاملے میں ان کو اپنے سے زیادہ سخت اور مستعد پایا اور لوگوں کو اس طرح سدھایا کہ میرے لئے بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئیں[۷]۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کے مابین ہونے والے مباحثے کی مزید تفصیل سامنے آتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی اور خلیفہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ہوئے اور عرب کے بہت سے قبائل نے کفر و انکار شروع کر دیا' تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "آپ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی موجودگی میں کیونکر جنگ کر سکتے ہو کہ "مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں گا' جب تک وہ لا الٰہ الا

---

(۱) سورۃ التوبہ ۹: ۱۰۳ (۲) کثیر ۶: ۳۱۱ (۳) طبری ۳: ۲۵۸ (۴) طبری ۳: ۲۵۸، کثیر ۶: ۳۱۱ (۵) ایضاً (۶) کثیر ۶: ۳۱۱ (۷) سیوطی: ۷۲

اللہ کی شہادت نہ دے دیں اور جو شخص اس کی شہادت دے دے گا تو میری طرف سے اس کے جان و مال محفوظ ہو جائیں گے سوائے اس کے ذمے واجب الادا حقوق کے۔ رہا اس کا حساب تو وہ اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔" اس پر حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا "بخدا میں ہر اس شخص سے لڑوں گا جو زکوٰۃ اور نماز میں تفریق کرے گا کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اللہ کی قسم اگر انہوں نے چار مہینے کے بچے کے دینے سے بھی انکار کیا' جسے وہ رسول اللہ ﷺ کو دیتے تھے تو میں ان سے لڑوں گا۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا "بخدا یہ بات اس کا نتیجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ابو بکرؓ کو شرح صدر عطا فرمایا اور بعد میں میں بھی اسی نتیجہ تک پہنچا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی حق پر تھے(۱)۔" اگر ہم اس کے نتائج کو نظر انداز کر کے کہ جن کا پیشگی کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا' حالات کے تناظر میں دونوں کے موقف کا تجزیہ کریں تو دونوں اپنی جگہ حق بجانب نظر آتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کا خیال یہ تھا کہ اس وسیع فتنے کو قوت کے بل بوتے پر ختم کرنا مشکل ہے۔ مسلمان اس قابل نہیں ہیں کہ بیک وقت پورے صحرائے عرب سے ٹکر لے سکیں۔ جب تک قبائل اپنے اپنے علاقوں میں محدود ہیں' ان سے گفت و شنید ہو سکتی ہے' لیکن اگر ایک بار مدینے پر حملہ آور ہو گئے' تو پھر ان پر قابو پانا اور ان سے اپنی بات منوانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لئے انہیں حکمت اور حسن تدبیر سے راہ راست پر لایا جائے اور جنگ سے گریز کیا جائے۔ کم از کم لشکر اسامہ کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔ ان کے نزدیک اصل چیلنج ارتداد کا مقابلہ کرنا تھا اس لئے زیادہ سے زیادہ قبائل کو اپنے ساتھ ملانے اور اپنی قوت کو مجتمع کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ وہ مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کو ایک ہی سطح پر رکھنے کے خلاف تھے۔ اس لئے کہ یہ لوگ ہیں تو کلمہ گو ہی اگر انہوں نے تاویل میں غلطی کی ہے' تو انہیں آہستہ آہستہ سمجھا بجھا کر ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان کی اطاعت سیاسی غلبے کی بنیاد پر تھی اور انتشار سے فائدہ اٹھا کر دباؤ ڈال رہے ہیں' تو پھر بھی' اہم چیز سیاسی استحکام کا حصول ہے وہ اگر ہو گیا تو یہ خود بخود مطیع ہو جائیں گے بصورت دیگر قوت بھی استعمال کی جا سکتی ہے' لیکن اس وقت حالات کا تقاضا یہی ہے کہ ان سے نرمی برتی جائے اور ان کی تالیف قلب کی جائے اور ان سے تعاون حاصل کر کے نبوت کے جھوٹے دعویداروں کی سرکوبی کی جائے۔ ان سے سختی کا ایک تو یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مسلمانوں کیلئے لڑائی کا ایک اور محاذ کھل جائے گا اور دوسرا یہ کہ مرتدین کے ساتھ مل جائیں اور ان کیلئے تقویت کا ذریعہ بنیں اور مسلمانوں کیلئے ان کی متحدہ قوت کو شکست دینا مشکل ہو جائے۔ دور والے دشمنوں اور باغیوں کی طرف مہمات بھیجنے کیلئے بھی ضروری ہے کہ مدینے کے اطراف کا ماحول پر سکون ہو۔ یہ تھا اس کی رائے کا تناظر' جس کو مد نظر رکھ کر ہم اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ اجتہادی ذہن رکھتے تھے' اس لئے اسلام کے وسیع تر مقاصد کیلئے اس وقت کے حالات کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے ہر مشورے میں حالات کی رعایت کا لحاظ ناگزیر تھا ایسا سوچنے میں وہ حق بجانب تھے۔ اس معاملے میں عمائدین اور عام لوگوں کی اکثریت بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ سیاستدان تھے اور اس مسئلے کو سیاسی سمجھتے تھے' اس لئے قوت کے بجائے سیاست سے حل کرنا چاہتے تھے' جہاں جذبات کے بجائے عقل کو رہنما بنانے کی ضرورت ہوتی ہے' کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی حالات کو بے قابو بنا سکتی تھی اس لئے اپنی طبیعت کے برعکس ان کا رویہ انتہائی نرم تھا۔

ان کے برعکس حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے تمام تر حلم اور بردباری کے باوجود انتہائی سخت دکھائی دے رہے ہیں' یہ کوئی انوکھی بات نہیں اس لئے کہ انسانی طبیعت میں نرمی و سختی دونوں رخ موجود ہوتے ہیں۔ عام حالات اور روز مرہ کے معمولات میں انسان کے وہی اخلاق و عادات سامنے آتے ہیں' جن کا اس کے مزاج پر غلبہ ہوتا ہے' لیکن ہنگامی حالات اور بحران انسانی شخصیت کے ان خفیہ گوشوں کو بھی ابھار کر سامنے لے آتے ہیں' جنہیں ظاہر ہونے کا پہلے موقع نہیں ملا تھا۔ یہ تبادلہ اتنا زیادہ نمایاں ہوتا ہے' جتنا زیادہ اس کے جذباتی اور نفسیاتی پہلوؤں پر زد پڑتی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کی پوری زندگی ایمان و ایقان کا مرقع تھی۔ خدا اور اس کے رسولؐ

(۱) بخاری ۲، ۹/۲، ۱۰ شیبہ ۱۲ ۵۷۸، ترمذی ۱۱۷ حنبل ۱، ۳، ۲ نسائی ۱۲

کی بلاچوں وچرا اطاعت نے انہیں مقام صدیقیت پر سرفراز کیا۔ انہوں نے اسلام کی خاطر سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ اپنے مثالی قائد اور محبوب ساتھی کے بچھڑنے کے بعد انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ دین اسلام کی امانت اب ان کے سپرد ہے اس کے تمام اجزا اور ہر ستون کی حفاظت ان کی ذمہ داری ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام میں تخفیف کی جاتی رہے اور ابو بکرؓ زندہ رہے۔ اس کے وجود کا فائدہ ہی کیا ہے کہ جس نظریہ کے فروغ کیلئے اس نے اپنی پوری زندگی کھپادی ہو اب اس کی بقاء کا مسئلہ درپیش ہو تو وہ مصلحت اور مداہنت کی خود ساختہ زنجیروں میں اپنے آپ کو باندھ کر تماشا دیکھتا رہے؟ یہ تھا ان کا جذباتی اور نفسیاتی پہلو' جب اس پر روپڑی تو وہ جرأت کی چٹان اور عزم و استقامت کے پہاڑ بن گئے۔ ان کے نزدیک مانعین زکوٰۃ کا مطالبہ سیاسی نہیں' بلکہ خالص دینی معاملہ تھا۔ یہ منا دین کے ایک ستون کو گرا دینے کے مترادف تھا۔ ان کی غیرت ایمانی یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ سرور کونین ﷺ کی قبر کی مٹی ابھی تک خشک بھی نہ ہوئی ہو اور اسلام کا ایک رکن ساقط کر دیا جائے۔ آدمی کلمہ پڑھ کے فرمانبرداری و اطاعت کا عہد کر لیتا ہے۔ اس کے جان و مال کی حفاظت ان حقوق کی ادائیگی سے مشروط ہے' جو اس کے ذمے ہوں۔ جب وہ ان کا انکار کر دیتا ہے' تو گویا خود ہی اب اعلان جنگ کر رہا ہے۔

پھر قرآن حکیم میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کا ذکر بے شمار موقعوں پر ایک ساتھ آیا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے خود زکوٰۃ و صلوٰۃ میں فرق کرنے والوں کا مطالبہ نہیں مانا تھا' جب کچھ لوگوں نے آکر یہ درخواست کی تھی کہ ہم زکوٰۃ تو دیں گے' لیکن نماز معاف کر دی جائے' تو آپ نے فرمایا تھا "بھلا وہ بھی کوئی دین ہے' جس میں نماز نہ ہو[1]۔" اپنے قائد کا یہ اسوہ حسنہ حضرت ابو بکرؓ کے سامنے تھا' اس لئے انہوں نے یہ پرعزم اعلان کیا "بخدا میں ہر اس شخص سے لڑوں گا' جو زکوٰۃ و نماز میں تفریق کرے گا[2]۔" پھر ان کا یہ بھی خیال تھا' رسول اللہ ﷺ دین کو مکمل حالت میں دے گئے ہیں' انہوں نے زکوٰۃ کو نافذ بھی فرمایا اور اس کی شرح و طریقہ بھی بتادیا ہے۔ اب آنحضرت کی وفات کے بعد دین میں کیا کمی واقع ہو گئی ہے؟ اگر اس عمل کو من مانی تاویل کی وجہ سے ترک کر دیا جائے تو باقی کونسی چیز متروک ہونے سے رہ جائے گی۔ اصل عبادت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے' جو زندہ و جاوید ہے۔ سیاسی اعتبار سے بھی اس مطالبے کو ماننا ان کے نزدیک نقصان دہ تھا۔ کسی ایک گروہ کے دباؤ میں آکر اس کی ناجائز بات کو قبول کرنا حکومت کی کمزوری و پسپائی کی علامت تھا۔ اس سے باغیوں کی تالیف قلب اتنا نہ ہوتی' جتنا ان کا حوصلہ بلند ہوتا اور رفتہ رفتہ ناجائز مطالبوں کی بھرمار شروع ہو جاتی' جسے روکنا ممکن نہ ہوتا پھر سودے بازی کر کے ساتھ چلنے والوں پر مکمل اعتماد اور بھروسہ کرنا مشکل ہوتا اور مرتدین کے خلاف مہم میں کبھی وہ دلجمعی و یکسوئی سے شریک نہ ہوتے اور ہمیشہ سر پر سوار رہتے۔ بالفرض اگر سیاسی فائدے کا کچھ امکان بھی ہو تو اس کی خاطر دین سے واضح انحراف کسی صورت میں نفع بخش نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے نزدیک اصل امتحان عزم و استقامت کا تھا اور اصل مقابلہ ایمان و کفر اور ایقان و نفاق کے مابین تھا۔ اس لئے انہیں امید تھی کہ اللہ کی نصرت و مدد مسلمانوں کا مقدر بنے گی اور ان نامساعد حالات میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کیا تو وہ اپنے دین کی خود حفاظت کرے گا'

بہر حال حضرت ابو بکرؓ کا فیصلہ نافذ ہوا۔ ان کے مشیر وزیر حضرت عمرؓ نے اپنا موقف پیش کرنے کے بعد اپنے قائد کے موقف کو پورے غور سے سنا اور اس کی سچائی کے قائل ہو گئے اور اس کی قوت ایمانی کو ان الفاظ میں سراہا "اگر ابو بکر صدیق کے ایمان اور تمام اہل زمین کے ایمان کا وزن کیا جائے' تو ابو بکرؓ کے ایمان کا پلہ بھاری رہے گا[3]۔" حضرت عمرؓ نے اب خلیفہ وقت کی حکمت عملی کے مطابق سوچنا شروع کر دیا اور پوری یکسوئی سے اسے کامیاب بنانے میں لگ گئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے بھی انہیں قدم قدم پر شریک مشورہ رکھنے اور ان کی اصابت رائے سے فائدہ اٹھانے کیلئے کسی مہم پر روانہ کرنے سے گریز کیا اور اپنے پاس رکھا۔ ادھر ناکام پلٹنے والے وفود نے بھی مقابلے کی ٹھان لی اور انہوں نے اپنے اپنے قبیلوں میں جا کر مدینے میں مسلمانوں کی قلت کے بارے میں بتلایا اور انہیں لالچ دے کر حملہ کرنے پر اکسایا[4]۔

---

(۱) ۲۲۲۲۲۲۲۲۲۲ (۲) بخاری ۲/۱۰۹' ترمذی ۲/۱۱۷' نسائی ۵/۱۴ (۳) سیوطی ۱/۹۰ (۴) کثیر ۶/۳۱۲

حضرت ابو بکرؓ کو اس کی پوری توقع تھی اس لئے انہوں نے مضبوط دفاعی حکمت عملی مرتب کی۔ مدینے کے راستوں پر محافظ مقرر کر دیئے اور اہل مدینہ پر مسجد میں حاضر ہونا واجب کر دیا اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا "بلاشبہ وہ علاقہ کافر ہو چکا ہے' ان کے وفد نے تمہاری قلت کو دیکھ لیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ وہ رات کو حملہ آور ہوں گے یا دن کو' ان میں سے جو تمہارے قریب تر ہے' وہ بارہ میل کی مسافت پر ہے۔ وہ لوگ امید کرتے تھے کہ ہم ان کی بات مان لیں گے اور ان سے مصالحت کر لیں گے' مگر ہم نے ان کی بات نہیں مانی' بس تیار ہو جاؤ اور خوب تیاری کرو"[1]۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اپنا بھرپور کردار سرانجام دیا' ادھر ادھر سے پہنچنے والی خبریں جب لوگوں کو پریشان کرتیں تو حضرت عمر فاروقؓ ان کے حوصلوں کو بلند کرتے اور انہیں تسلیاں دیتے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں' حالات جلد ٹھیک ہو جائیں گے اور پھر ابو بکرؓ کو بھی اندرونی و بیرونی حالات سے آگاہ کرتے اور انہیں مفید مشورے دیتے۔ چنانچہ ان پریشان کن خبروں میں سے ایک خبر حضرت عمروؓ بن عاص نے لوگوں تک پہنچائی' جو عمان سے مدینے پہنچے اور راستے میں تمام قبیلوں کی صورتحال دیکھ کر آئے۔ لوگوں نے جب ان سے احوال پوچھے تو جواب دیا "دبا سے لے کر مدینے تک ہر جگہ فوجی لشکر مجتمع ہو کر تیار بیٹھے ہوئے ہیں۔" یہ سن کر قریش متفرق ہو کر مختلف حلقوں میں تقسیم ہو گئے اور آپس میں مشورے کرنے لگے۔

حضرت عمر بن الخطابؓ عمروؓ بن عاص سے ملنے آ رہے تھے کہ ان کو کچھ لوگ نظر پڑے' جو عمروؓ بن العاص کے بیان کردہ واقعات پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ اس حلقے میں حضرت عثمانؓ' علیؓ' طلحہؓ' زبیرؓ' عبدالرحمنؓ اور سعدؓ تھے۔ جب ان کے قریب آئے' وہ خاموش ہو گئے۔ عمرؓ نے پوچھا کیا گفتگو تھی؟ انہوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ عمرؓ نے کہا "جو بات تم لوگوں نے مجھ سے چھپانا چاہی وہ مجھے معلوم ہے۔" طلحہؓ بگڑے اور کہنے لگے "اے ابن الخطابؓ اب تم ہم کو غیب کی باتیں بتاتے ہو۔" عمرؓ نے کہا کہ "غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہے' مگر میرا خیال ہے کہ آپ حضرات یہی کہتے ہوں گے کہ ہمیں عربوں سے قریش کیلئے سخت اندیشہ ہے۔" اب عمرؓ نے قسم دے کر ان سب سے پوچھا کیا یہ بات نہ تھی۔ انہوں نے اس کا اقرار کیا اور کہا کہ آپ سچ کہتے ہیں۔ عمرؓ نے کہا "آپ لوگوں کو اس حالت سے قطعی خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں' بلکہ مجھے تو عربوں کیلئے آپ کی جانب سے اس سے زیادہ اندیشہ ہے' جتنا کہ آپ کو ان کی جانب سے ہے۔ بخدا اگر قریش کے قبائل کسی تنگ و تاریک غار میں جائیں' تو تمام عرب ان کی متابعت میں وہاں چلے جائیں گے۔ اللہ سے ان کے معاملے میں ڈرو اور اس قدر سوئے ظن ان سے نہ رکھو۔ یہ کہہ کر عمرؓ عمروؓ بن العاص سے ملنے چلے گئے اور ان سے مل کر حضرت ابو بکرؓ کے پاس چلے گئے[2]۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جن ارتداد و بغاوت کے وسیع تر فتنے کو مٹانے کیلئے جو حکمت عملی اختیار کی اس میں ان معروضی حالات کو سامنے رکھا' جس کی نشاندہی حضرت عمرؓ کے موقف کے ذریعے ہوئی تھی اور ان خطرات و خدشات کا مقابلہ کرنے کیلئے پیشگی ایسے اقدامات کئے گئے' جو کارگر ثابت ہوں۔

پہلا کام یہ کیا کہ اہل مدینہ کے سامنے تقریر کی اور ان کے اندر جذبہ جہاد کو تر و تازہ کیا اور ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کے احسانات رکھے اور اس کی نصرت و مدد کے وعدوں والی آیات پیش کر کے ان کا حوصلہ بڑھایا[3]۔ دوسرا کام یہ کیا تمام مرتدین کے نام خطوط لکھے' ان میں بھرپور دلائل اور قرآنی آیات کے ذریعے ان کی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ انہیں خدا کا خوف دلایا اور اسلام کی طرف پلٹنے اور اس پر خلوص دل سے جم جانے کی نصیحت کی اور پیامبروں کو حکم دیا کہ اسے مجمع عام میں پڑھ کر سنائیں اور انہیں یہ تنبیہہ کی کہ اذان دیں اور اطاعت قبول کر لیں' ورنہ انہیں بری طرح قتل کر کے ان کے اہل و عیال کو لونڈی و غلام بنا دیا جائے گا[4]۔ تیسرا کام یہ کیا کہ بیک وقت مختلف طرف میں گیارہ فوجی دستے روانہ کر دیئے' تاکہ وہ ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکیں۔ مجموعی کمان اپنے ہاتھ میں رکھی اور تمام سالاروں کو ان کے اہداف' راستے اور ایک دوسرے سے تعاون کے طریقے سمجھا دیئے[5]۔

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] ۳۵۹ (۳) [illegible] ۲۲۸ (۴) [illegible] ۳۱۲ (۵) [illegible]

چوتھا کام یہ کیا کہ اہل مدینہ کی دفاعی سیرت بہت مضبوط کر دی اور حفاظتی انتظامات و نگرانی کا بھرپور اہتمام کیا اور گرد و نواح کے ابتدائی معرکوں کی خود کمان کی[1]۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی اور چھ ماہ کی قلیل مدت کے اندر اندر ہر طرف امن و اماں بحال ہو گیا' یہ ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ ایک مستحکم اور پائیدار حکومت معرض وجود میں آ گئی 'عصبیت اور فتنوں کے دروازے بند ہو گئے۔ مسلمانوں میں باہمی اتحاد و اخوت کی ایک نئی روح بیدار ہو گئی۔ عزم و حوصلے نے جلا پائی' دین اسلام کو حیات نو ملی' جہاد کا جذبہ اجاگر ہو گیا' زیغ و نفاق کے مقابلے میں جذبہ ایمانی فتح یاب ہوا' مسلمانوں کو تائید ایزدی کا پھر سے یقین ہو گیا اور نئی فتوحات کے دروازے کھل گئے' حضرت ابو بکر صدیقؓ اس عظیم کارنامے کے ہیرو ٹھہرے۔ عباس محمود العقاد نے یہ روایت رقم کر کے بہت خوب تبصرہ کیا ہے کہ بقول ابو رجاء بصری "جب میں مدینے میں داخل ہوا تو میں نے لوگوں کا ایک جم غفیر دیکھا۔ اس مجمع میں میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک دوسرے آدمی کا سر چوم رہا ہے اور کہہ رہا ہے "میں آپ پر قربان جاؤں" "آپ نہ ہوتے تو ہم ہلاک ہو جاتے۔" میں نے پوچھا "یہ دونوں بزرگ کون ہیں؟" لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت عمرؓ ہیں' جو حضرت ابو بکرؓ کا سر خوشی سے چوم رہے ہیں کہ مرتدین آپ ہی کی بدولت زیر نگیں ہوئے اور زکوٰۃ روک لینے کے بعد دوبارہ دینے پر مجبور ہوئے۔ ابو رجاء ایک معتبر اور ثقہ راوی ہیں۔ انہوں نے ان دونوں عظیم انسانوں کی محبت اور تعظیم کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ اسی بات کے سزاوار تھے کہ حضرت عمرؓ ان کی عظمت کا اعتراف اسی انداز میں کریں۔ یہ واقعہ اپنی سند کے اعتبار سے صحیح معلوم نہیں ہے' تو اسے صحیح ہونا چاہیے[2]۔

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کثیر ۳۱۳/۶:H (۲) العقاد:۲۰۶

۳۔ حضرت خالدؓ بن ولید کا معاملہ :

ایک دوسرا بڑا اختلاف اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ گہرا اور وسیع جو حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے مابین ہوا وہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے معاملے میں تھا۔ حضرت عمرؓ تواتر اور شدت سے حضرت ابو بکرؓ کو یہ مشورہ دیتے رہے کہ خالدؓ کو سپہ سالاری کے منصب سے معزول کر کے قید کیا جائے اور انہیں شرعی ضابطوں کے مطابق سزا دی جائے۔ لیکن انہوں نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا اور انہیں مانعین زکوٰۃ، مرتدین کے خلاف مہمات میں بھیجنے کے بعد عراق و شام کے خلاف کارروائیوں میں بھی فوج کا سربراہ بنائے رکھا۔ یہ واحد معاملہ ہے جس میں فاروق اعظمؓ نے صدیق اکبرؓ کے فیصلے کو خوشدلی اور اطمینان قلب سے قبول نہ کیا۔ یہ ان کے دل میں حضرت ابو بکرؓ کی وفات تک کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا، یہاں تک کہ انہوں نے خود منصب خلافت سنبھال لیا اور سب سے پہلا فرمان جو انہوں نے جاری کیا، وہ حضرت خالد بن ولیدؓ کو سپہ سالاری سے معزولی کا تھا۔ انہیں حضرت ابو عبیدہؓ کی کمان میں دے دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کا قصور کیا تھا؟ دونوں بزرگوں کا کیا موقف تھا اور ان کے دلائل کیا تھے؟ حضرت عمرؓ اپنے دیگر مشوروں کے برعکس اس بارے میں زیادہ حساس کیوں تھے اور اپنی رائے پر اس قدر مصر کیوں رہے؟ تاکہ ہم دونوں بزرگوں کے مزاج کو جان سکیں اور سیاسی انتظامی معاملات میں ان کی فکر و نظر اور طریق کار کے فرق کو سمجھ سکیں۔ کتب تاریخ میں حضرت خالدؓ پر حسب ذیل الزامات کا پتہ چلتا ہے

۱۔ انہوں نے مالک بن نویرہ کو حالت اسلام میں قتل کر دیا۔

۲۔ مالک بن نویرہ کی بیوی لیلیٰ سے دوران عدت شادی کر لی۔

۳۔ بنت مجاعہ سے حالت جنگ میں نکاح کیا۔

۴۔ مال غنیمت خود ہی تقسیم کر دیتے تھے اور خلیفہ کے پاس حسابات بھیجنے میں کوتاہی کرتے تھے۔

مالک بن نویرہ بنو تمیم کی شاخ بنی یربوع کا سردار تھا۔ عرب کے مشہور شعراء اور شہسواروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ ۸ یا ۹ ہجری کو مسلمان ہوا، بنو تمیم کے ایک وفد کے ساتھ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس کو عامل زکوٰۃ مقرر فرمایا۔ جب اسے رسول اکرم ﷺ کی وفات کی خبر پہنچی تو اس نے زکوٰۃ کو مدینے بھیجنے کے بجائے اپنی قوم میں تقسیم کر دیا اور جواز میں اشعار کہے[۱]۔ پھر سجاح نے آکر نبوت کا اعلان کیا تو اس نے اس کا ساتھ دیا وہ اسی کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی[۲]۔ اس نے مدینے پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو مالک نے اسے اپنے ہی قبیلے کو پوری طرح مطیع کرنے کا مشورہ دیا جو اس نے قبول کر لیا۔ پھر سجاح نے یمامہ جا کر مسیلمہ کذاب سے جب شادی رچالی تو مالک بن نویرہ کو اس کا ساتھ دینے کی غلطی کا احساس ہو گیا اور ادھر حضرت خالدؓ اسد اور غطفان کے قبائل کو مطیع کر چکے تھے۔ بطاح کی جانب آ کر مالک بن نویرہ اور اس کے حلیف قبائل سے مقابلہ کرنے آ رہے تھے، تو اسے خوف لاحق ہوا اور اس نے اپنے پیروکاروں کو منتشر کر دیا اور اجتماع کی ممانعت کر دی کہ کہیں مسلمان انہیں اپنا مقابل نہ سمجھ لیں اور انہیں یہ ہدایت کی "تم اس شورش سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے علاقوں کو چلے جاؤ اور اسلام میں داخل ہو جاؤ[۳]۔" حضرت خالد بن ولیدؓ نے بنی تمیم کے قبائل سے خود مقابلہ کرنے کے بجائے مختلف فوجی دستے روانہ کر دیئے اور انہیں حضرت ابو بکرؓ کے اس فرمان پر عمل کرنے کی تلقین کی کہ جس جگہ جائیں وہاں اذان اور اقامت کہیں۔ اگر وہ اذان اسلامی شعائر کا مثبت جواب دیں، تو ان سے زکوٰۃ کی

---

(۱) بلاذری ۱: ۱۰۷ (۲) ایضاً ۴/۲۹۵ (۳) ایضاً ۴/۲۹۵، طبری ۳/۲۷۷۔

ادائیگی کا اقرار لیں۔ اگر وہ مان جائیں تو ٹھیک ورنہ اچانک ان پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیں [(۱)]۔ مالک بن نویرہ سے جس دستے کا سامنا ہوا اس کی قیادت ضرار بن ازور کر رہے تھے۔ اس میں ایک انصاری صحابی حضرت ابو قتادہؓ بھی شامل تھے' ایک روایت کے مطابق ان کی باقاعدہ جنگ ہوئی [(۲)]۔ دوسری میں تو یہاں تک بھی ہے اسی مقابلے میں مالک قتل ہوا [(۳)]۔ لیکن راجح یہی ہے کہ ان کے درمیان مقابلے کی نوبت نہیں آئی اور اسے ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود دستے کے لوگوں میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا کہ ان لوگوں نے اذان دی' اقامت کہی اور نماز پڑھی یا کہ نہیں [(۴)]۔ اس اختلاف کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ دستے کو ان لوگوں کی تلاش کیلئے مزید حصوں میں تقسیم کرایا گیا ہو گا اور رات کی تاریکی میں ہر کسی کو اصل صورتحال کا پتہ نہیں چل سکا ہو گا۔ بہر حال حضرت ابو قتادہؓ اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں کہ جب خالدؓ کی فوج نے مالک کے قبیلے پر یورش کی تو رات کی وجہ سے وہ حملہ آوروں سے خائف ہوئے اور انہوں نے سمجھ سنبھال لیا' ہم نے ان سے کہا کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم نے پوچھا اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو تو ہتھیار رکھ دو' انہوں نے ہتھیار رکھ دیئے۔ ہم نے نماز پڑھی اور ہمارے ساتھ انہوں نے بھی نماز پڑھی [(۵)]۔

اس روایت میں زکوٰۃ کے اقرار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دستے میں اختلاف زیادہ تر اسی بارے میں ہو گا کیونکہ نماز اس نے بہت سے لوگوں کے سامنے پڑھی تھی جبکہ زکوٰۃ کا اقرار مشکوک تھا کہ اس نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا تھا یا نہیں۔ حضرت ابو قتادہؓ کا خیال تھا کہ اس نے زکوٰۃ کا بھی اقرار کر لیا تھا۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ نہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے اس سے خود اس بارے میں پوچھ گچھ کی۔ روایت میں آتا ہے کہ مالک نے کہا "میں نماز پڑھنے کا تو اقرار کرتا ہوں' لیکن زکوٰۃ دینے سے انکاری ہوں۔" خالدؓ نے فرمایا "کیا تجھے معلوم نہیں کہ نماز اور زکوٰۃ ایک ساتھ قبول ہوتی ہیں' نماز کے بغیر زکوٰۃ اور زکوٰۃ کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی [(۶)]؟" مالک نے کہا "کیا آپ کے صاحب بھی یہی کہتے تھے؟" خالدؓ نے کہا "کیا تو انہیں اپنا صاحب خیال نہیں کرتا؟ اللہ کی قسم! میں نے تیری گردن اڑانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔" اس کے بعد بحث طول پکڑ گئی اور گفتگو میں تیزی آ گئی۔ آخر خالدؓ نے کہا "میں تجھے قتل کر کے رہوں گا۔" اس نے کہا "کیا تمہارے صاحب نے تمہیں یہی حکم دیا تھا؟" خالدؓ نے کہا "اب تو میں تجھے ضرور قتل کروں گا" چنانچہ آپ نے اپنے آدمیوں کو اس کی گردن مارنے کا حکم دیا [(۷)]۔

یعقوبی کی روایت میں ہے کہ زکوٰۃ کے بارے میں اس نے حضرت خالد بن ولیدؓ سے باقاعدہ مناظرہ کیا' اس وقت اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی' جو حضرت خالدؓ کو اچھی لگی۔ انہوں نے مالک کو کہا کہ جو تیرا ٹھکانہ ہے' تو اس وقت تک اس کو نہیں پائے گا' جب تک میں تجھے قتل نہ کر دوں' پھر اس کی بیوی سے نکاح کیا [(۸)]۔ الاغانی میں ہے کہ اس موقع پر مالک کی بیوی اپنے خاوند سے عفو و ترحم کیلئے حضرت خالدؓ کے قدموں میں گر گئی۔ بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے اور آنسوؤں کی لڑی آنکھوں سے جاری تھی' اس حال میں اس کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی' جس نے خالدؓ کو مسحور کر لیا۔ جب مالک نے دیکھا تو کہا "افسوس میری بیوی ہی میرے قتل کا باعث بنی۔" حضرت خالدؓ نے کہا "نہیں! بلکہ تیرے اعمال ہی اس کا باعث بنے۔ یہ کہہ کر اس کی گردن اڑانے کا حکم دیا [(۹)]۔" پھر لوگوں کو عبرت دلانے کیلئے مالک بن نویرہ اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے سروں پر سپاہیوں نے دیگیں رکھ دیں جس سے سوائے مالک کے سب کے چہرے جھلس گئے۔ اس کا چہرہ اس لئے محفوظ رہا کہ اس کے بال بہت گھنے تھے [(۱۰)]۔

---

(۱) طبری ۲/۳: ۲۷۷ (۲) بلاذری ۱: ۱۰۷ (۳) ایضاً (۴) طبری ۲/۳: ۲۸۰ (۵) طبری ۲/۳: ۲۸۰ (۶) حمیکل [illegible] (۷) حلادن [illegible] کثیر ۶/۲: ۳۲۲ (۸) یعقوبی ۲: ۱۳۱ (۹) هیکل ۲۱۴ (۱۰) طبری ۲/۳: ۲۷۹' کثیر ۶/۲: ۳۲۲

ایک اور روایت میں یہ آتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے خود حکم دے کر اپنے سامنے قتل نہیں کرایا تھا بلکہ مالک اور اس کے ساتھیوں کو قید رکھا تھا۔ اس رات اس قدر شدید سردی اور ہوا تھی کہ کوئی شے اس کی تاب نہیں لاتی تھی۔ جب سردی اور بڑھنے لگی تو حضرت خالدؓ نے منادی کو حکم دیا اور اس نے بلند آواز سے چلا کر کہا "ادفئوا اسراکم" یعنی اپنے قیدیوں کو گرم کرو۔ بنی کنانہ کے محاورے میں اس کے معنی قتل کرنے کے تھے' اس لئے سپاہیوں نے قتل کر دیا۔ حضرت خالدؓ نے جب شور و غل سنا تو خیمے سے باہر آئے سپاہی ان سب کا کام تمام کر چکے تھے اب کیا ہو سکتا تھا۔ حضرت خالدؓ نے کہا "اللہ جس کام کو کرنا چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے[۱]۔" ان روایات سے ایک بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ مالک بن نویرہ نے زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار نہیں کیا تھا اور اپنے اس غلط موقف پر اصرار کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حق نہیں ہے' چہ جائیکہ اس کیلئے قوت استعمال کریں۔ اس لئے وہ حضرت ابوبکرؓ کے فرمان کی روشنی میں قابل گردن زنی تھا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت خالدؓ سے قتل کرانے کے بارے میں ہچکچا رہے تھے' لیکن اس بارے میں انہیں یکسو کرنے کا سبب آنحضور ﷺ کے بارے میں صاحبکم کا لفظ استعمال کیا۔ حضرت خالدؓ نے یقین کر لیا کہ وہ آپ کو اپنا قائد تسلیم نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ حضرت خالدؓ نے اسی کو قتل کا سبب قرار دیا[۲]۔ تیسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ حضرت خالدؓ نے اپنے طور پر تحقیق و تسلی کر لی تھی' یہ کہ وہ نماز و زکوٰۃ میں فرق کر رہا تھا' اس لئے مرتد اور واجب القتل ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس کی بیوی کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے اس کا امکان تو ہے' لیکن اس بنا پر قتل کرا دینا ناقابل یقین ہے۔ ہاں البتہ مالک نے کمال ذہانت سے اپنے فیصلہ قتل کو یہ رخ دینے کی کوشش کی جو کافی حد تک کامیاب رہی اور بعد میں حضرت خالدؓ کے بارے میں غلط فہمیوں کی بنیاد بنی۔

رہی یہ بات کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے خود ہی قتل کا حکم دیا یا اتفاقاً ایسا ہو گیا۔ اگر اختلافی روایات میں ترجیح قائم کی جائے تو قتل کا حکم دینا زیادہ درست معلوم ہوتا ہے' لیکن اگر تطبیق دی جائے تو اس کا بھی امکان ہے کہ قتل کرنے کا انہوں نے فیصلہ تو کر لیا ہو' لیکن عملدرآمد کو مزید غور و خوض کیلئے اگلے دن تک موخر کر دیا ہو کیونکہ لوگوں میں ابھی تک اس کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف موجود تھا۔ پھر قیدیوں کو گرم کرنے کے بارے میں ان کے حکم کی غلط فہمی کی بناء پر مالک اور اس کے ساتھی مقتول ہوئے ہوں (واللہ اعلم بالصواب)۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے فوراً بعد مالک کی بیوی ام تمیم سے نکاح کر لیا[۳]۔ خواہ اس کی ان کے پاس کچھ بھی تاویل ہو' البتہ طبری میں یہ صراحت موجود ہے کہ انہوں نے نکاح کے بعد طہر کیلئے چھوڑ دیا[۴]۔ ابن کثیر کے بقول جب حلال ہوئی تو اس کے پاس آئے[۵]۔ ایک روایت اگرچہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے عدت گزرنے کے بعد باقاعدہ پیغام نکاح بھیج کر ام تمیم کی رضامندی سے نکاح کیا[۶] لیکن اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر قابل اعتراض بات نہیں رہتی۔ حضرت عمرؓ برطرفی کا مطالبہ کریں اور حضرت ابوبکرؓ انہیں ملامت کریں اور طلاق دینے کا حکم دیں[۷]۔ بہرحال حضرت خالدؓ پر تنقید کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب حضرت ابو قتادہؓ نے مالک اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے بعد سخت برہمی کا اظہار کیا اور یہ عہد کیا کہ آئندہ کبھی حضرت خالدؓ کے ساتھ کسی بھی جنگ میں شریک نہ ہوں گے[۸]۔ لوگوں کے اندر تو پہلے اس کے بارے میں اختلاف تھا' اب وہ مزید ہو گیا اور چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور ام تمیم سے شادی کا مسئلہ بھی لوگوں کی خصوصی توجہ کا مرکز بن گیا اور اسے قتل کے ساتھ جوڑا جانے لگا۔ جنگ کے دنوں میں شادی کو عربوں کے ہاں ویسے بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔

حضرت ابو قتادہؓ نے فیصلہ کر لیا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس کی اطلاع دیں گے کہ حضرت خالدؓ نے ایک مسلمان کو قتل کیا ہے۔ جب حضرت ابوبکرؓ کی خدمت

---

(۱) طبری:۳/۲۷۸' اثیر:۲/۲۹۵ (۲) طبری:۳/۲۸۰' اثیر:۲/۲۹۶ (۳) اثیر:۲/۲۹۵' یعقوبی ۲/۱۳۱ (۴) طبری:۳/۲۸۷ (۵) کثیر:۶/۳۲۲ (۶) سعید:۲۰۹' فوات الوفیات (۷) حجر:۱/۴۱۴ (۸) طبری:۳/۲۸۰' اثیر:۲/۲۹۵' یعقوبی ۲/۱۳۲۔

میں پہنچے تو وہ ان سے ناراض ہوئے کہ امیر کی اجازت کے بغیر کیوں آئے ہو اور فرمایا "جب تک امیر کے پاس واپس نہیں جائیں گے 'معاف نہیں کروں گا[۱]۔"
اور واقعہ کے بارے میں کوئی توجہ نہ کی اور کہا کہ انہیں ایسے شخص کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنی چاہئے' جسے رسول اللہ ﷺ نے سیف اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا ہو۔ حضرت ابو قتادہؓ مطمئن نہ ہوئے اور حضرت عمرؓ کو سارا واقعہ سنایا اور ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ بہت متاثر ہوئے اور حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اصرار کیا کہ "حضرت خالدؓ ایک مسلمان کے خون کے ذمہ دار ہیں انہیں قید کر لیا جائے۔" حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا "عمرؓ اس بارے میں خاموشی اختیار کرو' خالدؓ سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے' تم اس بارے میں اب ہرگز کچھ مت کہو[۲]۔" لیکن اس سے حضرت عمرؓ مطمئن نہ ہوئے اور کم از کم معزول کر دینے پر برابر اصرار کرتے رہے۔ اسی اثناء میں انہیں معلوم ہوا کہ حضرت خالدؓ نے مالک کی بیوی ام تمیم سے شادی کر لی ہے' تو برہم ہوئے اور ایک مرتبہ پھر حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ "دشمن خدا خالد نے ایک مسلمان کو قتل کیا اور پھر اس کی بیوی پر کود پڑا[۳]۔ لہٰذا اسے برطرف کر دیا جائے۔" انہی دنوں مالک بن نویرہ کے بھائی متمم بن نویرہ بھی حضرت ابو بکرؓ کے پاس اپنے بھائی کے قصاص لینے کیلئے آئے اور ساتھ یہ بھی درخواست کی کہ ہمارے قیدی رہا کر دیئے جائیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے قیدیوں کی رہائی کی درخواست قبول کر لی اور حکم لکھ دیا۔ اس موقع پر بھی حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کے بارے میں سخت اصرار کیا کہ انہیں برطرف کر دیا جائے' کیونکہ ان کی تلوار میں بے گناہ مسلمان کا خون ہے' لیکن حضرت ابو بکرؓ نے یہ کہہ کر دوٹوک فیصلہ دے دیا کہ "عمرؓ یہ نہیں ہو سکتا' میں اس تلوار کو نیام میں نہیں رکھوں گا جسے اللہ تعالیٰ نے کفار کیلئے بے نیام کیا ہے[۴]۔" لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے مشیر خاص کے اس پرزور مطالبے کا لحاظ رکھتے ہوئے حضرت خالدؓ بن ولید کو مدینے بلوایا' تاکہ ان سے باز پرس کر سکیں۔ چنانچہ حضرت خالدؓ میدان جنگ سے مدینے پہنچے اور سیدھے مسجد نبوی تشریف لائے۔ وہ ایک زنگاری قبا پہنے ہوئے تھے اور اپنے عمامے میں تیر لگا رکھے تھے۔ جب حضرت عمرؓ نے انہیں مسجد میں داخل ہوتے دیکھا' تو آگے بڑھ کر ان تیروں کو کھینچ کر توڑ ڈالا اور کہا کہ "محض دکھانے کیلئے اس ہیبت سے آئے ہو' تم نے ایک مسلمان کو قتل کیا اور اس کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ واللہ میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔"

حضرت خالدؓ نے اس وقت ایک لفظ بھی زبان سے نہیں کہا' کیونکہ وہ سمجھے کہ شاید ابو بکرؓ کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس سیدھے چلے آئے اور سارا واقعہ سنایا اور معذرت چاہی۔ اس اعتراف پر حضرت ابو بکرؓ نے انہیں معاف کر دیا[۵]۔ ان کی خوشنودی حاصل کر کے اٹھ آئے' حضرت عمرؓ ابھی مسجد ہی میں بیٹھے تھے' انہیں مخاطب کر کے حضرت خالدؓ نے کہا "اے ام شملہ کے بیٹے اب آ کیا کہتے ہو۔" حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ حضرت ابو بکرؓ ان سے راضی ہو گئے ہیں' چنانچہ چپکے سے اٹھے اور گھر چلے گئے۔ حضرت خالدؓ کو کوئی جواب نہ دیا[۶]۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خاموش کرانے اور مالک کے بھائی متمم کی دلجوئی کیلئے یک اور کام یہ کیا کہ مالک کے قتل کی دیت بیت المال سے ادا کر دی[۷]۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ جن لوگوں کے گمان کے مطابق مالک مسلمان تھا ان کو اطمینان ہو جائے اور یہ قصہ یہیں ختم ہو جائے' لیکن یہ مسئلہ کسی نہ کسی انداز میں ترو تازہ رہا۔ حضرت عمرؓ وقتاً فوقتاً فرمائش کر کے متمم سے وہ اشعار سنتے تھے کہ جو اس نے اپنے بھائی کی وفات پر کہے تھے[۸]۔ یہ واحد معاملہ ہے جس سے حضرت عمر فاروقؓ اپنے موقف پر حضرت ابو بکرؓ کے حتمی فیصلہ کر دینے کے بعد بھی قائم رہے۔ ان کے دل میں حضرت خالدؓ کے بارے میں جو شبہات تھے وہ پورے عہد صدیقی میں قائم رہے اور اپنے آپ کو برسر حق سمجھتے رہے۔ اس کی پہلی بنیاد تو خود حضرت ابو قتادہؓ کی گواہی تھی' جو خود معرکے میں موجود تھے اور حضرت عمرؓ کی معلومات کا واحد ذریعہ تھے۔ دوسری بنیاد ام تمیم سے شادی تھی' جو ان کے شبہے کیلئے تقویت کا باعث تھی۔

---

(۱) طبری II:۳/۲۷۸ (۲) طبری II:۳/۲۷۹ (۳) طبری II:۳/۲۸۰ (٤) طبری II:۳/۲۷۹' اثیر II:٤/۲۵۹ (۵) یعقوبی ۲/۱۳۲ (٦) طبری II:۳/۲۸۰'
کثیر II:٦/۳۲۲ (۷) اثیر II:٤/۲۹٦' حجر ۱:۱/۱٤۱ (۸) بلاذری II:۱۰۸۔

تیسری بنیاد یہ تھی کہ حضرت خالدؓ نے بنو تمیم کے دیگر سرداروں قرۃ الفجاۃ ابو شجرہ اور عیینہ وغیرہ کو تو خود قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ انہیں مدینے روانہ کر دیا' تاکہ حضرت ابو بکرؓ خود جیسا چاہیں فیصلہ کریں' لیکن انہی کے ہم پلہ سردار مالک بن نویرہ کو قتل کرا دیا[۱] اور چوتھی وجہ متمم کے وہ اشعار تھے جنہوں نے خاص و عام کی توجہ کا مرکز بن کر مالک کی بے گناہی کا تاثر مستحکم کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ایک اور واقعہ نے حضرت عمرؓ کو اپنی رائے پر مزید پختہ کر دیا کہ جنگ یمامہ کے بعد حضرت خالدؓ نے بنی حنیفہ کے ایک سردار مجاعہ کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس کی اطلاع حضرت ابو بکرؓ تک پہنچی' تو انہیں بھی شدید دکھ ہوا اور انہوں نے بہت ہی خشم آگین خط لکھا۔ "اے ام خالد بڑے افسوس کی بات ہے' معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اور کوئی کام ہی نہیں رہا کہ تم عورتوں سے نکاح کر رہے ہو' حالانکہ بارہ سو مسلمانوں کا خون تمہارے صحن میں ابھی تک تازہ ہے اور خشک بھی نہیں ہوا۔" یہ خط جب ان کے پاس پہنچا تو کہنے لگے "یہ عمیر یعنی حضرت عمر بن الخطابؓ کی حرکت ہے کہ امیر المومنین نے یہ خط مجھے لکھا ہے[۲]۔" یہ نام بائیں ہاتھ سے کام کرنے کی وجہ سے دیا۔

ایک اور بات بھی تھی جس کی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت خالدؓ کو معزول کر دینا چاہئے' وہ یہ کہ حضرت خالدؓ مرد میدان تھے۔ اس لئے وہ حساب کتاب کے تکلفات میں زیادہ پڑنے کے بجائے خود ہی مال غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیتے تھے حضرت ابو بکرؓ کو نہیں بھیجتے تھے[۳]۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ان کی یہ بات بھی سخت ناگوار تھی' کیونکہ بیت المال کے سلسلے میں بہت محتاط اور حساس تھے۔ روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ خالد کو لکھئے کہ وہ آپ کے حکم کے بغیر کوئی بکری اور اونٹ نہ دیں۔ انہوں نے بات لکھ کر بھیج دی' جواب میں حضرت خالدؓ نے لکھا کہ "آپ اپنا کام کریں اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔" اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ "آپ انہیں معزول کر دیں۔" انہوں نے پوچھا کہ "پھر ان کا قائم مقام کون ہوگا؟" اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "میں۔" حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "آپ؟" پس حضرت عمرؓ نے تیاریاں شروع کر دیں' حتیٰ کہ سواریوں کو بھی اپنے گھر میں بٹھایا۔ صحابہ کرام کو معلوم ہوا' تو حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشورہ دیا کہ حضرت عمرؓ کو مدینے ہی میں رہنے دیں اور حضرت خالدؓ کو شام میں' انہوں نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے' تو انہوں نے ایسی ہی بات انہیں لکھی اور ویسا ہی جواب آنے پر معزول کر دیا کہ واللہ ایسا نہیں ہے کہ مجھے ایک بات سمجھائے جس کا میں ابو بکرؓ کو حکم دوں اور اسے خود نافذ نہ کر سکوں[۴]۔"

۳۔ حضرت عمرؓ و ابو بکرؓ کا موقف:

حضرت خالدؓ بن ولید کے بارے میں دونوں بزرگوں کے موقف کے پس منظر میں مذکورہ تمام واقعات کار فرما تھے۔ دونوں کے پاس اپنی اپنی رائے قائم رکھنے کیلئے بھرپور دلائل تھے اس لئے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ یہ وہ مسئلہ ہے' جس میں ان میں سے کوئی بھی دوسرے کو قائل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ حضرت عمر فاروقؓ قانونی مساوات کے علمبردار تھے۔ ان کے نزدیک مجرم خواہ کوئی بھی ہو' اس کو ضرور سزا ملنی چاہئے۔ عدل و انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ سیف اللہ کا لقب پانے والا شخص بھی قانون کی گرفت سے آزاد نہ ہو۔ حضرت خالدؓ نے ایک کلمہ گو کو عمداً قتل کرایا تھا۔ اگر انہیں غلط فہمی تھی' تو بھی دیگر سرداروں کی طرح حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں روانہ کرنا چاہئے تھا۔ ایک ذمہ دار کی حیثیت سے ان کی اس کوتاہی کی کم سے کم سزا یہی تھی کہ انہیں معزول کر دیا جائے' تاکہ آئندہ کوئی شخص بھی ایسی بے احتیاطی نہ کر سکے۔ ان کے برعکس حضرت ابو بکرؓ کے نزدیک سب سے اہم بات یہ تھی کہ انہیں خود رسول اللہ ﷺ نے سالار لشکر بنایا تھا۔ لسان نبوت ﷺ سے انہیں سیف اللہ کے لقب سے سرفراز کیا گیا تھا[۵] اور پھر اسوہ نبوی موجود تھا کہ بنو جذیمہ کے کچھ لوگوں کو ایسی ہی غلط فہمی کی وجہ سے حضرت

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) کثیر [illegible] (۵) اثیر [illegible]

خالدؓ نے قتل کرایا تھا' تو آپؐ نے دیت ادا کردی تھی' لیکن معزول نہیں فرمایا تھا(۱)۔ اس لئے انہیں معزول کرنا سنت کی خلاف ورزی کے مترادف تھا' پھر مالک بن نویرہ نے زکوٰۃ کا انکار کیا تھا' اس لئے وہ مرتد اور واجب القتل تھا۔ حضرت خالدؓ نے خلافت ہی کی طرف سے دیئے ہوئے اختیار کو استعمال کیا تھا' اس لئے وہ قصوروار نہیں تھے۔ اگر بالفرض غلطی بھی تھی تو محض تاویل اور اجتہاد کی غلطی تھی' جس کا امکان ہر وقت ہوتا ہے' اس کی وجہ سے کسی ذمہ دار کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس معمولی سی بات پر گرفت کے مقابلے میں ان کارناموں کا لحاظ رکھنا ضروری تھا' جو انہوں نے اسلام کی سربلندی اور مشرکین کو نیست و نابود کرنے کیلئے سرانجام دیئے تھے۔ حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ دوران جنگ شادیاں رچا کر حضرت خالدؓ نے مسلمانوں کی شہرت پر دھبہ لگایا تھا۔ یہ کسی عام آدمی کا فعل نہیں تھا' بلکہ ایک معروف سالار کا فعل تھا' اسے عہد جاہلیت اور عہد اسلام دونوں میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں میں پیدا ہونے والے برے اثرات کے ازالے اور تمام لوگوں میں مسلمانوں کے تشخص کی حفاظت کیلئے حضرت خالدؓ کو قرار واقعی سزا دی جائے اور خاص طور پر ام تمیم سے انہوں نے دوران عدت نکاح کر کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا تھا' اس لئے انہیں صرف معزول کر دینا کافی نہیں تھا' بلکہ یہ بھی ضروری تھا کہ انہیں قید کر کے ان پر حد نافذ کر دی جائے۔ اس سلسلے میں چشم پوشی احکام الٰہی کو پس پشت ڈالنے کے مترادف تھی۔ اس سے دین میں خلل پڑنے کا خطرہ تھا' لہٰذا حضرت خالد کی کوئی تاویل و توجیہہ قابل قبول نہیں تھی۔ اگر وہ ایک مقتول مسلمان کی بیوہ تھی اور باقاعدہ نکاح کیا گیا تھا' تو دوران عدت ایسا کرنا موجب حد تھا اور اگر غیر مسلم کی بیوہ تھی اور مال غنیمت کے طور پر آئی تھی' تو بھی انہیں یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ خلیفہ کے ذریعے مال کی تقسیم کے بجائے خود ہی قبضہ کر لیں۔ اس بارے میں حضرت عمرؓ کی شدت ان کے مجموعی مزاج کے عین مطابق تھی' جس کی بنا پر سرور کونین ﷺ نے فرمایا تھا "اشدھم فی امر اللہ عمر(۲)"۔

اس کے برعکس حضرت ابوبکر صدیقؓ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت خالدؓ کی یہ بے احتیاطی ضرور تھی اور اس کا انہوں نے خود بھی اعتراف کیا تھا' لیکن اتنا بڑا قصور نہیں تھا کہ انہیں قید کیا جائے یا موجب حد قرار دیا جائے کیونکہ وہ ایک مرتد کی بیوہ تھی اس لئے اس کی حیثیت لونڈی کی تھی۔ اس لئے شرعی طور پر اس کا مواخذہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کیلئے ان کی سرزنش کرنا اور آئندہ کیلئے تنبیہہ کر دینا کافی تھا اور پھر انہوں نے معافی مانگ کر اس کی تلافی کر لی تھی۔ اس بارے میں ان کو کسی قسم کی سزا دینا مسلمانوں کی شہرت کیلئے زیادہ خطرناک تھا اور اس سے یک الزام کی خود ہی تشہیر ہو جاتی اور فتنہ و فساد کی اس لہر میں مخالفین کو پراپیگنڈہ کا موقع مل جاتا۔ پھر حضرت خالدؓ کے ہٹ جانے سے مخالفین کے حوصلے مزید بلند ہو جاتے اور مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جاتے۔ اس لئے سیاسی اور جنگی اعتبار سے ناقابل تلافی نقصان پہنچتا' لہٰذا بہتر صورت یہی تھی کہ انہیں سمجھانے بجھانے پر ہی قناعت کی جائے۔ مسلمانوں کو ابھی ان کی تلوار کی ضرورت تھی' انفرادی غلطی کو معاف کر دینا زیادہ قرین مصلحت تھا۔ اس لئے ام تمیم سے نکاح پر حضرت ابوبکرؓ نے خود بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور بنت مجاعہ سے شادی پر بہت ہی سخت خط لکھا' لیکن معزول کرنے سے گریز کیا۔ مال غنیمت کے تصرف و تقسیم کے بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ خیال تھا کہ سے مرکزی نظم کے تحت ہونا چاہئے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں ملنا چاہئے کہ وہ اپنی مرضی کر سکے' اس لئے انہوں نے باقاعدہ خط بھی لکھوایا' لیکن ان کا جو جواب تھا' وہ ان کی معزولی کا تقاضا کرتا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو بھی یہ بات بری لگی اس لئے انہوں نے حضرت عمرؓ کو متبادل کے طور پر بھیجنے کا مشورہ کیا' لیکن شوریٰ کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے معزول نہ کیا اور اس کی اس بات کو نظرانداز کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے پاس جنگوں میں قیادت کیلئے حضرت خالدؓ کا کوئی متبادل نہیں تھا اور مدینے میں مشیر و وزیر کیلئے حضرت عمرؓ کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے اسلام' اسلامی ریاست اور مسلمانوں کے وسیع تر مفاد کیلئے دونوں سے حسب مہارت و صلاحیت استفادہ

---

(۱) بخاری ۳/ ۱۰۷، ابن جریر ۲/ ۴۷۸، البدایہ ۲/ ۹۴، کنز العمال ۶/ ۳۲۳ (۲) مسند ۳/ ۲۹۱۔

جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور مال غنیمت کی تقسیم کے اسی طریقے کو مناسب سمجھا کہ سالار لشکر ریاست کا خمس نکال کر باقی حصے کو خود ہی مجاہدین میں تقسیم کرے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کے بارے میں دونوں بزرگوں کا مذکورہ موقف دونوں کے الگ الگ افتاد طبع کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک میں عفو و ترحم کا پہلو نمایاں ہے اور دوسرے میں سختی و شدت کا۔ ایک کے مسائل کا تجزیہ کرنے اور اس کے نتائج کو اخذ کرنے کا انداز اور ہے' دوسرے کا اور۔ ایک کے نزدیک عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت کے تقاضے مختلف ہیں اور دوسرے کے نزدیک مختلف' ایک کی فکر و نظر کا زاویہ اپنا ہے اور دوسرے کا اپنا' ایک کے آدمیوں کو ناپنے کا پیمانہ جدا ہے اور دوسرے کا جدا' ایک کی سیاسی اور فوجی تدابیر کا رجحان اور ہے اور دوسرے کا اور۔ اگر ان سب باتوں کو ایک ہی جملے میں سمیٹ دیا جائے' تو کہا جا سکتا ہے کہ ایک میں اقتداء کا پہلو نمایاں ہے اور دوسرے میں اجتہاد اور تخلیق و نمو کا اور یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جس کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے' اس کی حالت و کیفیت یقیناً مختلف ہوتی ہے۔ اسے اپنے فیصلے میں بہت معتدل و محتاط ہونا پڑتا ہے۔ اس کا منصب اسے بہت سے اقدامات سے روکتا ہے اور بہت سے فیصلوں پر مجبور کرتا ہے۔ جسے ایک مشیر صحیح طور پر محسوس نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ فاروق خود منصب خلافت پر فائز ہوئے' تو اپنے موقف پر نظر ثانی کی ان کی وہ شدت جاتی رہی۔ انہوں نے ابتداء میں حضرت خالدؓ کو فوج سے برطرف کرنے کے بجائے حضرت ابو عبیدہؓ کی کمان میں دے دیا۔ نہ تو انہیں قید کیا' نہ ہی ان پر حد نافذ کی' بلکہ ان کے پاس جب متمم بن نویرہ مالک کے قصاص کا مطالبہ لے کر آئے' تو جواب دیا کہ ابو بکرؓ جو کر گئے ہیں' میں اس کو رد نہیں کروں گا۔ "لا اردشیا صنعة ابو بکر"(1)۔ "پھر آہستہ آہستہ جب مسائل کے ہجوم میں گھرے' تو ان کے سامنے حضرت ابو بکرؓ کی رائے کا اس بارے میں بھی برسر صواب ہونا واضح ہو گیا اور حضرت خالدؓ کی صلاحیتوں کے معترف ہو گئے۔ جب حضرت خالدؓ کے ہاتھوں قنسرین کی فتح کی انہیں اطلاع دی گئی' تو پکار اٹھے "یرحم اللہ ابابکر. ھو کان اعلم بالرجال منی(2)۔" (اللہ ابو بکرؓ پر رحم کرے' وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس واقع ہوئے تھے) اور جب حضرت خالدؓ کا انتقال ہوا' تو ان کا دل مزید نرم ہو گیا اور فرمایا "اللہ ابو سلیمان پر رحم کرے ہم نے ان کے بارے میں بعض امور کا گمان کیا' جو ان میں نہیں تھے(3)۔"

۵۔ حضرت خالدؓ بن سعید کا معاملہ:

حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ اول کے ایسے مشیر نہیں تھے' جو محض اپنا دیانتدارانہ مشورہ دینے پر ہی قناعت کرتے ہوں' بلکہ صحیح معنوں میں ساتھی و ہمدم تھے۔ وہ طے ہونے والے امور نافذ کرانے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کرتے اور منکرات کے خاتمے کیلئے خود آگے بڑھ کر اقدام کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ان کا احساس و جذبہ اور رعب و دبدبہ حضرت ابو بکرؓ کیلئے بہت تقویت کا ذریعہ تھے۔ پھر ان کی بصیرت و فراست اور مردم شناسی بھی انتظامی معاملات میں ان کیلئے مددگار ثابت ہوتی۔ بقول طبری کبھی حضرت عمرؓ کا مشورہ مان لیتے تھے' کبھی نہیں(۳)۔ اس لئے کہ خلیفہ کی حیثیت سے انہیں یہ حق پہنچتا تھا کہ اپنی صوابدید استعمال کریں اور اپنی سمجھ بوجھ اور ذوق و مزاج کے مطابق کاروبار مملکت چلائیں۔ اس بارے میں سب سے زیادہ ذمہ دار بھی وہی تھے اور جوابدہ بھی' لیکن اگر حضرت عمرؓ کا مشورہ قبول نہ بھی کرتے' تو انہیں یہ پورا اعتماد ہوتا تھا کہ کسی قسم کا مسئلہ پیدا نہیں ہو گا۔ بلا چون و چرا اطاعت بھی کریں گے اور ہر طرح کا تعاون بھی کیونکہ وہ نظم جماعت کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ عہد صدیقی میں ان کے مقام و کردار اور اصابت رائے کی ایک جھلک ہمیں حضرت خالدؓ بن سعید کے معاملے میں بھی ملتی ہے۔

---

(1) سعید:۲۱۳ (2) طبری:۳:۶۰۱ (3) کثیر:۷:۱۱۷ (٤) طبری:۳:۳۸۸۔

حضرت خالد بن سعید ابتدائی چند مسلمانوں میں سے تھے اور انہیں حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی (۱)۔ اسلام کو جب پورے حجاز پر غلبہ حاصل ہو گیا تو سرور کونین ﷺ نے انہیں یمن میں عامل صدقات بنا کر بھیجا اور آپ کی وفات کے وقت اسی منصب پر فائز تھے (۲)۔ ایک ماہ بعد مدینے پہنچے تو اس وقت دیباج کا جبہ پہنے ہوئے تھے۔ اسی لباس میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے ملے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے پاس والوں سے چلا کر کہا کہ ان کا جبہ پھاڑ دو کیا یہ ریشم پہنتے ہیں حالانکہ بحالت امن مردوں کیلئے اس کا پہننا ممنوع ہے۔ لوگوں نے یہ سنتے ہی ان کے جبے کو تار تار کر دیا (۳)۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ غلط باتوں کو بالقوۃ روکنے کے سلسلے میں بہت جری تھے اور عہد نبوی کی طرح عہد صدیقی میں بھی اپنا کردار ادا کرتے رہے اور لوگ بھی ان کا حکم ماننے میں کبھی پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ حضرت خالدؓ بن سعید نے مدینے میں آنے کے بعد دو ماہ تک حضرت ابو بکرؓ کی بیعت نہیں کی (۴)۔ اس دوران مسلسل اس بات کیلئے کوشاں رہے کہ حکومت بنو ہاشم کو ملے۔ اس کیلئے مختلف طریقوں سے انہیں بھڑکانے کی کوشش کرتے رہے۔ کبھی کہتے "اے بنو ہاشم آپ کا شجرہ نسب عالی اور اس (منصب) کا میوہ شیریں ہے ہم آپ کے تابع ہیں (۵)۔" کبھی حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر کہتے "اے بنی عبد مناف حکومت پر غیروں نے قبضہ کر لیا ہے اور تم چین سے بیٹھے ہوئے ہو (۶)۔"

ایک مرتبہ انہوں نے حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر کہا "اے ابوالحسن اے بنو عبد مناف کیا تم حکومت کے معاملے میں مغلوب ہو گئے ہو۔" حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ "تم اسے غلبہ سمجھتے ہو یا خلافت؟" بولے "اے بنو عبد مناف! اہلیت کے اعتبار سے تم سے زیادہ اس کا کون مستحق ہو سکتا ہے۔" یہ باتیں حضرت عمرؓ نے بھی سن لیں، چنانچہ پکار اٹھے اللہ تیرا منہ توڑ دے جھوٹے کہیں کے، تیرے دماغ میں ایسی ہی باتیں سمائی رہیں گی مگر یاد رکھ تجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا (۷)۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے عظیم قائد ﷺ کے عمال کو حسب سابق اپنے مناصب پر قائم رکھنے اور آپ کی پالیسیوں کی حرف بحرف پیروی کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے حضرت خالد بن سعیدؓ اور ان کے بھائیوں کو، جو مختلف ذمہ داریوں پر کام کر رہے تھے، یمن سے واپسی کے موقع پر ہی کہا تھا "تم کیوں واپس لوٹ آئے، رسول اللہ ﷺ کے عمال سے زیادہ کوئی شخص مستحق نہیں ہے۔ تم لوگ اپنے کاموں پر واپس جاؤ۔" انہوں نے جواب دیا کہ ابوالحیحہ کے ہم سب بیٹے رسول ﷺ کے بعد اور کسی کی جانب سے کام نہیں کریں گے (۸)۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ خاموش ہو گئے، لیکن اس کے بعد بھی ان کی یہی خواہش تھی کہ سرور کونین ﷺ کے عمال کو ضرور کوئی نہ کوئی پروانہ کی؟ اور شام کی طرف لشکر تیار ہونے لگا تو ایک چوتھائی حصے پر انہیں امیر مقرر کر دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کو ناپسند کیا۔ ان کے دل میں کھٹک تو پہلے ہی سے تھی اس لئے انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا "آپ ایسے شخص کو امیر بنا رہے ہیں، جس کے یہ اقوال و افعال ہیں۔" وہ انہیں بار بار ٹوکتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے خالد بن سعیدؓ کو معزول کر کے یزید بن ابی سفیان کو امیر مقرر کر دیا (۹)۔ بعد ازاں مرتدین کی سرکوبی کیلئے سالار منتخب کئے تو ان کو علم دیئے، ان میں سے ایک خالد بن سعید بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے مخالفت کی اور کہا کہ وہ ناکارہ اور کم عقل ہیں۔ انہوں نے ایسی بے تکی باتیں منہ سے نکالی ہیں، جن سے ہمیشہ فتنے برپا رہیں گے۔ ان کو اپنی بات پر گھمنڈ اور اصرار بھی ہے، اس لئے ان سے کوئی کام نہ لیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان کی رائے سے ذرا متاثر نہ ہوئے اور حضرت خالدؓ کو تیما میں امدادی دستے پر متعین کر دیا (۱۰)۔ بعد میں مختلف ہدایات انہیں بھیجتے رہے اور حسب ضرورت کمک بھی۔ حضرت خالدؓ نے شام کی طرف پیش قدمی کے دوران مرج الصفر کے مقام پر کامیابی کا سہرا اپنے سر پہنے کیلئے دیگر امراء کے لشکر کا انتظار کئے بغیر

(۱) طبری ۲/۸۳، جمہرۃ ۱:۱۰ (۲) بلاذری ا:۱۰۸، اثیر ۲:۸۳ (۳) طبری ۳:۳۸۸، کثیر ۷:۳، منتہی ۱۳ ۳۷۷ (٤) طبری ۳/۳۸۷، منتہی ۱۳ ۳۷۶، بلاذری ۱:۵۸۸ (۵) اثیر ۲:۸۰ (٦) طبری ۳:۳۸۷ (۷) طبری ۳:۳۸۸، کثیر ۷/۳ (۸) اثیر ۲:۸۲ (۹) طبری ۳:۳۸۷، کثیر ۷:۳ (۱۰) طبری ۳:۳۹۲

حملہ کر دیا۔ مد مقابل فوج کے کمانڈر رہاں نے سامنے سے ہٹ کر انہیں غیر محسوس انداز میں اپنے گھیرے میں لے لیا اور ان کے بیٹے سعید بن خالد کو اس کے کچھ آدمیوں نے پانی کی تلاش میں گھومتے ہوئے پا کر شہید کر دیا۔ انہیں اس کی خبر ہوئی تو فرار ہو گئے[1]۔ وہاں سے شکست کھا کر مدینے کی طرف لوٹے تو حضرت ابو بکرؓ نے انہیں ایک ماہ تک مدینے میں داخل نہ ہونے دیا[2] ذی المرہ میں ان کا قیام رہا۔ حضرت ابو بکرؓ نے انہیں لکھا "تم اب وہیں رہو' خدا کی قسم تمہیں مہمات میں آگے بڑھنا آتا ہے' مگر بڑے بزدل اور معرکوں سے جان بچا کر بھاگنے والے ہو' تمہیں مہمات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اور مشکلات میں صبر و ضبط سے کام لینا نہیں آتا۔" جب انہیں مدینے میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی' تو انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے معذرت کی۔ انھل نے کہا "تم میدان جنگ میں بڑے بزدل ہو' جب وہ اٹھ کر چلے گئے' تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "خالد بن سعیدؓ کو عمرؓ اور علیؓ خوب جانتے تھے۔ اگر میں ان کا کہنا مانتا تو میں ان سے ڈرتا اور اجتناب کرتا[3]۔ ایک روایت یہ بھی ہے مرج الصفر ہی کے موقع پر شہید ہو گئے[4]۔ اس بارے میں تقریباً تمام قدیم مورخین نے دونوں طرح کی روایتیں درج کر دی ہیں۔ علامہ ابن اثیر ان اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "خالد بن سعید کا واقعہ مرج الصفر بعہد خلافت ابو بکر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ یہ ملک شام میں واقعہ اجنادین میں حضرت ابو بکرؓ کی وفات سے ۲۴ دن پہلے شہید ہوئے۔ اصحاب سیر نے واقعہ اجنادین' واقعہ مرج الصفر اور واقعہ یرموک کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ ان میں سے کون سا پہلے پیش آیا اور کون سا بعد میں[5]۔ واللہ اعلم!

اس واقعہ سے حضرت عمر فاروقؓ کی مردم شناسی کا پتہ چلتا ہے اور اس کا اعتراف حضرت ابو بکرؓ نے بھی کیا۔ حضرت عمرؓ نے مدینہ میں حضرت خالدؓ بن سعید کی باتوں کا سختی سے نوٹس لیا اور انہیں حضرت ابو بکرؓ تک پہنچایا۔ ان کی بصیرت نے بجا طور پر یہ محسوس کر لیا کہ بنو ہاشم کے استحقاق خلافت کے سلسلے میں کی جانے والی باتیں اثرات کے لحاظ سے وقتی و عارضی ثابت نہیں ہوں گی' بلکہ ہمیشہ کیلئے اختلافات و فتنوں کی بنیاد بنی رہیں گی۔ اس لئے انہوں نے سخت ناپسند کیا کہ ایسے کسی شخص کو کوئی منصب دیا جائے' جو انتشار کو کم کرنے کے بجائے بڑھانے کی کوشش کرے اور طے شدہ امور کو پھر سے اچھالے۔ اگرچہ وہ عہد نبوی میں عامل ہی کیوں نہ رہا ہو' وہ اپنے اجتہادی مزاج کی وجہ سے اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے کہ ایک منتظم و خلیفہ انتظامی معاملات کے سلسلے میں اپنے تجربات اور نئی ضروریات کی روشنی میں کوئی لائحہ عمل مرتب کرے۔ مختلف مناصب پر سرور کونین ﷺ کی تقرری کو سامنے رکھنا بہتر ہے' لیکن لازمی نہیں۔ افراد کے عملی رویے کی بنا پر ان کی اہلیت و مناسبت کا از سر نو جائزہ لینا اور حالات کے تناظر میں تبدیل یا معزول کرنا ضروری ہے' اس لئے انہوں نے حضرت اسامہؓ' حضرت خالدؓ بن سعید کے بارے میں کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنی تقلیدی روش پر قائم رہے' البتہ جزوی طور پر انہوں نے حضرت خالدؓ بن سعید کے بارے میں حضرت عمرؓ کا مشورہ قبول کر لیا اور انہیں سالار بنانے کے بجائے صرف امدادی دستے کا نگران بنایا۔

۶۔ تدوین قرآن:

رسول اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرما کر' لاتکتبوا عنی شیئا غیر القرآن[6]۔ "صحابہ کرامؓ کو اپنی تمام علمی توجہ مرکوز کر کے قرآن حکیم کو ضبط تحریر میں لانے کی بھرپور ترغیب دی' اسلئے بہت سے صحابہ کرامؓ نے لکھ لیا' لیکن وہ کسی ایک جگہ تمام سورتوں کی ترتیب کے ساتھ مدون نہیں تھا[7]۔ بقول خطابی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ پر نزول قرآن کا سلسلہ جاری تھا اور بعض احکام یا تلاوت کے نسخ کرنے والے حکم کے نازل ہونے کا امکان تھا[8]۔ بہت سے صحابہ کرامؓ اسے حافظے

(۱) طبری II:۳: ۲۰۹۱ (۲) کثیر II ۷: ۳۲ (۳) طبری II ۳: ۳۹۲ (۴) بلاذری I ۱۲۶' طبری II ۳: ۴۰۶ کثیر II ۷/ ۳۲ (۵) اثیر II ۲: ۸۴ (۶) مسلم ۸' ۲۲۹ منفی ۱۰' ۲۲۱ (۷) سیوطی IV: ۱/ ۵۸ (۸) سیوطی IV: ۱/ ۵۸۔

میں بھی محفوظ کر لیتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بعض صحابہ کرامؓ نے اپنے خصوصی ذوق کی بناء پر ذاتی سطح پر قرآن کے زیادہ سے زیادہ حصے جمع کرنے کی کوشش کی۔ ان میں حضرت علیؓ، حضرت سالمؓ[1] وغیرہ قابل ذکر ہیں، لیکن اس کی ضرورت ابھی تک باقی تھی کہ سرکاری سطح پر اس کا اہتمام کیا جائے اور شہادتوں اور حفاظوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک نسخہ سامنے لایا جائے، جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر اور تمام امت کیلئے معتمد علیہ ہو، جس کی حیثیت ایک میزان سی ہو، جس کے ساتھ موازنہ کر کے لوگ اپنے نسخوں کی اصلاح کر سکیں اور اسی کے مطابق ترتیب دے سکیں۔ رحلت نبوی ﷺ کے فوراً بعد ارتداد و انتشار کی اٹھتی ہوئی لہر نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی اور اس اہم مسئلے پر کسی کو سوچنے کا موقع نہ مل سکا۔ اسی دوران مرتدین کے خلاف وہ سب سے بڑا معرکہ پیش آیا، جو جنگ یمامہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے، جن کی صحیح تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ کم سے کم تعداد سات سو اور زیادہ تعداد سترہ سو بیان کی جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک بارہ سو ہے[2]۔ ان میں ایک بڑی تعداد صحابہ کرامؓ اور حفاظ قرآن کی بھی تھی[3]۔ یہ سعادت حضرت عمر فاروقؓ کے حصے میں آئی کہ انہیں سب سے پہلے کتاب اللہ کی باقاعدہ تدوین کا خیال آیا۔ اس خیال کا فوری سبب کیا تھا؟ اس بارے میں حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے قرآن کی ایک آیت کے بارے میں دریافت کیا، تو انہیں بتایا گیا کہ اس کا جسے علم تھا، وہ جنگ یمامہ میں شہید کر دیا گیا ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا "اناللہ!" پھر قرآن حکیم کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اسے مصحف میں جمع کیا[4]۔

اس روایت سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ حضرت حسنؓ کے نزدیک یہ عہد فاروقی کا زمانہ ہے، جیسا کہ حکم دیا اور جمع کیا کے الفاظ سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ نے صرف تدوین قرآن کا مشورہ دینے اور فیصلہ کرانے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا، بلکہ اس کیلئے عملاً بھی بھرپور جدوجہد کی تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے پوتے سالمؒ بن عبداللہ سے مروی ہے "جب ابوبکرؓ نے قرآن کو قراطیس میں جمع کیا، تو زیدؓ بن ثابت کو یہ کام سرانجام دینے کیلئے کہا۔ انہوں نے انکار کر دیا، یہاں تک کہ ابوبکرؓ نے عمرؓ کی مدد سے یہ کام کیا[5]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت زیدؓ نے جو کوشش کی، اس کی ذمہ داری و نگرانی حضرت عمرؓ کے سپرد تھی اور اس کی بھی متعدد مثالیں ہیں کہ عہد صدیقی میں حضرت عمرؓ کی بات کی بھی عام طور پر لوگ حکم کی طرح پیروی کرتے تھے اور تدوین کے بارے میں تو باقاعدہ خلافت کی طرف سے وہ تعینات بھی تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دل میں تدوین قرآن کا جو خیال آیا، دوسرا سبب جنگ یمامہ ہی میں حضرت سالم مولی ابو حذیفہؓ کی شہادت ہے، کیونکہ وہ قرآن کے بہت بڑے عالم و قاری تھے۔ رسول اکرمؐ نے جن چار آدمیوں سے قرآن حکیم اخذ کرنے کا حکم دیا تھا، ان میں یہ بھی تھے[6]۔ حضرت عائشہؓ کو ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے میں دیر ہو گئی، تو انہوں نے وجہ پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ ایک قاری قرآن پڑھ رہا ہے، پھر اس کی خوبی قرأت کو بیان کیا۔ آپؐ چادر لے کے باہر نکلے، تو دیکھا کہ وہ حضرت سالمؓ تھے۔ ارشاد فرمایا "خدا کا شکر ہے، جس نے تم جیسے شخص کو میری امت میں پیدا کیا[7]۔" حضرت عمرؓ ان کی بہت تعریف کرتے تھے[8]۔ شہادت سے پہلے فرمایا "اگر سالمؓ زندہ ہوتے تو میں انہیں مشورے پر نہ چھوڑتا، یعنی خلیفہ بنا دیتا[9]۔" حضرت عمرؓ کو ان جیسے عظیم المرتبت آدمی کی شہادت پر یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے[10]۔ تیسرا اہم سبب جس نے انہیں اس عظیم کام کی طرف متوجہ کیا اور حضرت ابوبکرؓ کو بالاصرار راضی کرنے پر مجبور کیا، وہ دیگر بہت سے حفاظ کرام کی شہادت ہے۔

(۱) سجستانی ۱۰، سیوطی ۵۹/۱:IV بلاذری ۵۸۶/۲:II یعقوبی ۱۳۵/۲ (۲) بلاذری ۱۲/۱ (۳) زرکشی ۲۴۲/۱ (۴) جوزی ۲۹، سیوطی ۵۹/۱:IV سجستانی ۱۰ (۵) سجستانی ۹، سیوطی ۶۰/۱:IV (۶) بخاری ۳۰۲/۱ اثیر ۲۴۵/۲:II حجر ۷/۲:I (۷) اثیر ۲۴۵/۲:II حجر ۷/۲:I (۸) برا ۵۶۷/۲ (۹) سعد ۳۴۳/۳، اثیر ۲۴۶/۲:II (۱۰) بخاری ۳۱۰/۵، ترمذی ۳۴۶/۴، یعقوبی ۱۳۵/۲۔

اس کی تفصیل حضرت زیدؓ بن ثابت نے کچھ اس طرح بیان کی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کو جنگ یمامہ میں صحابہؓ کے شہید ہونے کی خبر ملی تو اسی وقت عمرؓ بھی آپ کے پاس آئے۔ ابو بکرؓ کہتے ہیں عمرؓ نے میرے پاس آکر کہا کہ "معرکہ یمامہ میں بہت سے قاریان قرآن کریم مقتول ہو گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ آئندہ معرکوں میں بھی وہ مقتول ہوتے جائیں گے اور اس طرح بہت سا قرآن ہاتھوں سے جاتا رہے گا۔ میری رائے ہے کہ تم قرآن کے جمع کئے جانے کا حکم دو۔" میں نے عمرؓ کو جواب دیا "جس کام کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا میں اسے کس طرح کروں؟" عمرؓ نے کہا "واللہ یہ بات بہتر ہے۔" غرضیکہ وہ مجھ سے بار بار کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا دل کھول دیا اور میں نے بھی اس بارے میں وہی رائے قائم کرلی جو عمرؓ نے قائم کی تھی۔ زیدؓ کہتے ہیں "ابو بکرؓ نے مجھ سے کہا "تم ایک سمجھدار نوجوان ہو اور ہم تم کو متہم نہیں کرتے اور تم رسول اللہ ﷺ کے کاتب وحی بھی تھے۔ اس لئے اب قرآن کی تفتیش اور تحقیق کر کے اسے جمع کرو۔" زیدؓ کہتے ہیں "واللہ مجھ کو ایک پہاڑ اس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینے کا حکم دیتے تو یہ بات مجھ پر اتنی گراں نہ ہوتی جس قدر قرآن کے جمع کرنے کا حکم مجھ پر شاق گزرا اور میں نے ابو بکرؓ و عمرؓ سے کہا "تم دونوں صاحب وہ کام کس طرح کرتے ہو جسے رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا؟" ابو بکرؓ نے جواب دیا "واللہ یہ بات بہتر ہے" اور پھر وہ برابر مجھ سے اس بارے میں بار بار کہتے رہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے میرا دل بھی اسی بات کیلئے کھول دیا جس بات کے واسطے ابو بکرؓ و عمرؓ کا دل کھولا تھا۔ پھر تو میں نے قرآن کی تلاش اور جستجو شروع کر دی اور اسے کھجور کی شاخوں اور سفید پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرنا شروع کر دیا اور میں نے سورۃ التوبہ کے خاتمہ کی آیتوں "لقد جاء کم رسول الآیات" صرف ابو خزیمہ انصاری کے پاس پائیں اور ان کے سوا کسی سے یہ آیتیں نہ مل سکیں۔ وہ منقول صحیفے ابو بکرؓ کے پاس رہے یہاں تک کہ انہوں نے وفات پائی تو عمرؓ نے ان کی حفاظت کی اور عمرؓ کا انتقال ہونے کے بعد وہ صحائف حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کے پاس محفوظ رہے [1]۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ یہ جانتے تھے کہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا کسی ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور پھر یہ بھاری ذمہ داری کا معاملہ تھا جیسا کہ حضرت زیدؓ پر شاق گزرا۔ اس لئے حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت زیدؓ دونوں کو مقرر کیا۔ کتابت تو حضرت زیدؓ کے سپرد تھی کیونکہ وہ رسول اکرم ﷺ کے کاتب رہ چکے تھے لیکن نگرانی و سرپرستی کا فریضہ حضرت عمرؓ نے سرانجام دیا۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت سے فرمایا "مسجد کے دروازے پر بیٹھ جایئے اور جو شخص کتاب اللہ کے کسی حصے پر دو گواہ پیش کرے تو وہ حصہ لکھ لیا کرو" [2]۔ بقول علامہ سیوطی شہادت لینے سے مراد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور زیدؓ دونوں اس بات کی شہادت بہم پہنچاتے تھے کہ جو قرآن انہیں کسی نے سنایا ہے وہ نبی ﷺ کے سامنے ان کے سال وفات میں پیش ہو چکا ہے یا نہیں [3]۔ حضرت عمرؓ اس کام کے محرک تھے اور پھر اس کی نگرانی و سرپرستی بھی چونکہ ان کے سپرد تھی اس لئے انہوں نے اس عظیم کام کے سرانجام دینے میں انتہائی سرگرمی و مہارت سے کام لیا اور ممکنہ ذرائع اختیار کئے۔ ایک کام یہ کیا کہ مجمع عام میں یہ اعلان کیا کہ جس شخص کو آنحضرت ﷺ سے کوئی آیت ملی ہو وہ اسے ہمارے پاس لے آئے [4]۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ تمام لوگوں کو اس کام کے شروع ہونے کا علم ہوا اور ان کے دلوں میں یہ احساس و جذبہ بھی پیدا ہوا کہ وہ اس میں تعاون کریں اور اپنی جمع کردہ آیات کو سامنے لے آئیں۔ اس سے تدوین کی ایک عمومی فضا بنی اور رقم کرنے والی کمیٹی کیلئے بھی آسانی پیدا ہو گئی کہ ان کے پاس جانچنے پرکھنے اور پورے اعتماد کے ساتھ رقم کرنے کیلئے بہت سا مواد اکٹھا ہو گیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ حضرت زیدؓ بن ثابت کی مدد اور معاونت کیلئے ایک جماعت بٹھا دی اور انہیں یہ ہدایت کی کہ اگر کسی لفظ کی لغت کے بارے میں کسی قسم کا اختلاف پیدا ہو تو اسے قبیلہ مضر کی لغت کے مطابق لکھو اس لئے کہ قرآن ہو مضر ہی سے

---

(۱) بخاری، ۵ : ۲۰۰ (۲) سجستانی : ۶، سیوطی ۱:۱۷ (۳) سیوطی ۱:۱۷ (٤) سجستانی : ١٠، حیوۃ : ١٢٩

تعلق رکھنے والے صاحب پر نازل ہوا[۱]۔ بقول یعقوبی اس مجلس میں ۲۵ قریش اور ۵۰ انصاری شامل تھے' انہیں کہا گیا کہ قرآن لکھو اور سعیدؓ بن العاص کے سامنے پیش کرو کیونکہ وہ فصیح آدمی ہیں[۲]۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس مقدس کام میں ایک شورائی اور اجتماعی رنگ پیدا ہو گیا اور بہت سے لوگوں کا علم' تجربہ اور عملی تعاون شامل ہو گیا' جس کی بنا پر یہ کام بہت جلد اور انتہائی خوش اسلوبی سے سرانجام پا گیا اور اس کے مستند اور قابل اعتماد ہونے میں کسی قسم کے شک شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی اور غلطی کے تمام امکانات بھی معدوم ہو گئے۔ لغت کے اعتبار سے جو معتبر کا معیار اختلاف کو مٹانے کا ذریعہ بنا۔ تیسرا کام یہ کیا کہ یہ حکم دیا کہ مصحف کی کتابت کیلئے الا سوائے قریش اور ثقیف کے نوجوانوں کے اور کوئی بھی نہ کرائے۔ اس میں بھی یہی حکمت تھی کہ قرآن حکیم صحیح لفظ و لہجے میں رقم ہو جائے اور تحریر میں بھی کوئی ایسی غلطی نہ رہ جائے' جو بعد میں معانی کے اختلاف کا باعث بن سکے۔ چوتھا کام یہ کیا کہ دو معتبر گواہوں کی شہادت کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے حکم کی سختی سے پابندی کی[۴]۔ یہاں تک کہ آیت رجم کے بارے میں تنہا حضرت عمرؓ خود ہی گواہ تھے کوئی اور شہادت موجود نہیں تھی اس لئے اسے نہیں لکھا گیا تھا[۵]۔ لیکن حکم چونکہ موجود تھا اس لئے انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ حکم کو بھی فراموش نہ کر دیں۔ اس لئے وفات سے قبل ایک خطبے میں منبر رسول پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اور ان پر آیت رجم "الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما" نازل فرمائی ہم نے اسے پڑھا' یاد رکھا اور سمجھا اور رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا بعد میں ہم نے بھی رجم کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مدت گزرنے پر کوئی یہ نہ کہے ہمیں کتاب اللہ میں رجم نہیں ملا اور ایک فریضہ ترک کرنے پر گمراہ ہو جائے' جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے' بے شک اللہ کی کتاب میں حق ہے۔ ہر اس زانی پر جو شادی شدہ ہو خواہ مرد ہو یا عورت' جبکہ گواہ موجود ہوں' حمل نمودار ہو یا وہ خود اعتراف کرے[۶]۔ اس عظیم حقیقت کے باوجود انہوں نے آیت رجم کو لکھنے سے اجتناب کیا تاکہ تدوین قرآن میں گواہوں کی شرط پوری رہے' البتہ اس کے حکم پر عمل کرنے کی تاکید کیلئے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اگر لوگ یہ نہ کہتے کہ عمر بن خطابؓ نے کتاب اللہ میں اضافہ کیا ہے' تو میں اس میں آیت رجم لکھ دیتا کیوں کہ ہم نے اسے پڑھا ہے[۷]۔"

یہ ہے حضرت عمر فاروقؓ کا وہ عظیم کردار جو انہوں نے جمع و تدوین قرآن کے سلسلے میں ادا کیا' بطور مشیر آپ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو جتنے بھی مشورے دیئے ان میں یہ مشورہ آپ کی اجتہادی بصیرت کا شاہکار ہے۔ انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ایک ایسے کام کے سرانجام دینے کیلئے راضی کر لیا جو سرور کونین ﷺ نے نہیں کیا تھا۔ وہ دلائل اور اصرار کے ساتھ انہیں اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ اس میں خیر ہی خیر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تدوین قرآن عہد صدیقی کا بہت عظیم اور لازوال کارنامہ ہے۔ اس اعتبار سے اس کا سہرا انہی کے سر کی رونق بھی ہے کہ ان کی رضامندی کے بغیر اس کارنامہ تکمیل تک پہنچنا ممکن تھا۔ اس

تعلق رکھنے والے صاحب پر نازل ہوا[1]۔ بقول یعقوبی اس مجلس میں ۲۵ قریش اور ۵۰ انصاری شامل تھے' انہیں کہا گیا کہ قرآن لکھو اور سعیدؓ بن العاص کے سامنے پیش کرو کیونکہ وہ فصیح آدمی ہیں[2]۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس مقدس کام اں ایک شورائی اور اجتماعی رنگ پیدا ہو گیا اور بہت سے لوگوں کا علم' تجربہ اور عملی تعاون شامل ہو گیا' جس کی بنا پر یہ کام بہت جلد اور انتہائی خوش اسلوبی سے سرانجام پا گیا اور اس کے مستند اور قابل اعتماد ہونے میں کسی قسم کے شک شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی اور غلطی کے تمام امکانات بھی معدوم ہو گئے۔ لغت کے اعتبار سے ہو مضر کا معیار اختلاف کو مٹانے کا ذریعہ بنا۔ تیسرا کام یہ کیا کہ یہ حکم دیا کہ مصحف کی کتابت کیلئے املا سوائے قریش اور ثقیف کے نوجوانوں کے اور کوئی بھی نہ کرائے۔ اس میں بھی یہی حکمت تھی کہ قرآن حکیم صحیح الفاظ و لہجے میں رقم ہو جائے اور تحریر میں بھی کوئی ایسی غلطی نہ رہ جائے جو بعد میں معانی کے اختلاف کا باعث بن سکے۔ چوتھا کام یہ کیا کہ دو معتبر گواہوں کی شہادت کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے حکم کی سختی سے پابندی کی[4]۔ یہاں تک کہ آیت رجم کے بارے میں تنہا حضرت عمرؓ خود ہی گواہ تھے کوئی اور شہادت موجود نہیں تھی اس لئے اسے نہیں لکھا گیا تھا[5]۔ لیکن حکم چونکہ موجود تھا اس لئے انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ حکم کو بھی فراموش نہ کر دیں۔ اس لئے وفات سے قبل ایک خطبے میں منبر رسول پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اور ان پر آیت رجم "الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما" نازل فرمائی ہم نے اسے پڑھا' یاد رکھا اور سمجھا اور رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا بعد میں ہم نے بھی رجم کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مدت گزرنے پر کوئی یہ نہ کہے ہمیں کتاب اللہ میں رجم نہیں ملتا اور ایک فریضہ ترک کرنے پر گمراہ ہو جائے' جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے' بے شک اللہ کی کتاب میں حق ہے۔ ہر اس زانی پر جو شادی شدہ ہو خواہ مرد ہو یا عورت' جبکہ گواہ موجود ہوں' حمل نمودار ہو یا وہ خود اعتراف کرے[6]۔ اس عظیم حقیقت کے باوجود انہوں نے آیت رجم کو لکھنے سے اجتناب کیا تاکہ تدوین قرآن میں گواہوں کی شرط پوری رہے' البتہ اس کے حکم پر عمل کرنے کی تاکید کیلئے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اگر لوگ یہ نہ کہتے کہ عمر بن خطابؓ نے کتاب اللہ میں اضافہ کیا ہے' تو میں اس میں آیت رجم لکھ دیتا کیوں کہ ہم نے اسے پڑھا ہے[7]۔"

یہ ہے حضرت عمر فاروق کا وہ عظیم کردار جو انہوں نے جمع و تدوین قرآن کے سلسلے میں ادا کیا بطور مشیر آپ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو جتنے بھی مشورے دیئے ان میں یہ مشورہ آپ کی اجتہادی بصیرت کا شاہکار ہے۔ انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یک ایسے کام کے سرانجام دینے کیلئے راضی کر لیا جو سرور کونین ﷺ نے نہیں کیا تھا۔ وہ دلائل اور اصرار کے ساتھ انہیں اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ اس میں خیر ہی خیر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تدوین قرآن عہد صدیقی کا بہت عظیم اور لازوال کارنامہ ہے۔ اس اعتبار سے اس کا سہرا انہی کے سر ہے' روتی بھی ہے کہ ان کی رضامندی کے بغیر اس کا پایہ تکمیل تک پہنچنا ناممکن تھا۔ اس اعتبار سے وہ اجر کے مستحق ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں "اللہ ابو بکرؓ پر رحم فرمائے کہ انہوں نے قرآن کو دو جلدوں کے درمیان جمع کر دیا[8]۔" بقول امام ابو عبداللہ الحارث بن اسد المحاسبی' انہوں نے عہد نبوی ہی کے منتشر اجزاء کو جو اوراق کی مانند تھے ایک ڈورے میں پرو دیا' تاکہ کوئی ٹکڑا ضائع نہ ہو جائے[9]۔ لیکن اگر غور کیا جائے' تو حضرت عمر فاروقؓ بھی کم اجر کے حقدار نہیں ہیں' اس لئے کہ وہی اس کام کے اصل محرک تھے۔ انہوں نے عملی تعاون بھی کیا اور بعد میں بھی اس کی مکمل حفاظت کی۔ اپنے عہد میں اس کے ایک لاکھ سے زیادہ نسخے کرا کے سلطنت کے طول و عرض میں پھیلا دیئے[10] اور وفات کے وقت

(۱) سجستانی ۱۱ بخاری ۱۲۹/۱' سیوطی ۱/۷ ۴۹ (۲) یعقوبی ۲ ۱۳۵ (۳) سجستانی ۱۱ بخاری ۱۲۹/۱ (۴) سجستانی ۱ (۵) سیوطی ۱/۷ ۶۰ (۶) مسلم ۵ ۱۶۵ ترمذی ۲ ۴۴۲ داؤد ۴ ۲۰۳ (۷) مالک ۲ ۸۲۳' حنبل ۲۴۲ ترمذی ۲ ۴۴۲ داؤد ۲۰۳/۳ (۸) شیبہ ۱۰ ۵۴۴ سجستانی ۵' زرکشی ۲۳۹/۱ (۹) زرکشی ۲۳۸/۱' سیوطی ۱/۷ ۶۱ (۱۰) حمو ۲۹ ۸

اصل مسودے کی امانت اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سپرد کر گئے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب قرأت کے اختلافات رونما ہونے شروع ہوئے اور اس کی وجہ سے معانی و مطالب کے اختلاف کا احتمال ہونے لگا یہی نسخہ مددگار ثابت ہوا۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اسے حضرت حفصہؓ سے منگوایا اس کی نقلیں کروا کے واپس دے دیا اور اپنی سلطنت کے ہر علاقے میں نقل شدہ مصحف کا ایک ایک نسخہ بھجوایا اور حکم دیا کہ اس کے سوا کوئی چیز اگر قرآن کی طرف منسوب کی جاتی ہے خواہ وہ کسی صحیفہ یا مصحف میں ہو تو اسے جلا دیا جائے[1]۔ یہ ہیں وہ اہم معاملات جن میں فاروق اعظمؓ نے بطور مشیر نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ہم یہ دیکھتے ہیں دونوں صاحبان رسول اللہ ﷺ کے سامنے جوں جوں نئے نئے مسائل آتے جا رہے ہیں توں توں ان کا نظام مشاورت مستحکم ہوتا جا رہا ہے اور بتدریج ان کی آراء میں ہم آہنگی اور پیدا ہو رہی ہے اور ان کی سوچ میں ربط گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے اور سمجھانے میں زیادہ کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔

لشکر اسامہ کی روانگی کے موقع پر صدیق اکبرؓ نہ صرف یہ کہ ان کا مشورہ مسترد کر دیتے ہیں بلکہ انہیں سختی سے جھڑک بھی دیتے ہیں۔ ان کی کسی بھی دلیل پر غور کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے اس کے بعد مانعین زکوۃ کے معاملے میں ان کے دلائل کو غور سے سنتے ہیں اور پھر ان کا جواب زیادہ قوی دلائل کے ساتھ دیتے ہیں اور اپنے مشیر کو قائل کرتے ہیں کہ صلوۃ و زکوۃ میں فرق کرنے والوں کے خلاف تلوار اٹھانا ضروری ہے۔ پھر حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی کے بارے میں ان کے مشورے پر عمل تو نہیں کرتے مگر اسے بہت زیادہ اہمیت ضرور دیتے ہیں اور انہیں مطمئن کرنے کیلئے حضرت خالدؓ کو مدینے میں طلب کر کے سخت تنبیہ بھی کر دیتے ہیں اور دیگر غلطیوں پر سخت الفاظ میں خطوط بھی لکھتے ہیں۔ پھر حضرت خالدؓ بن سعید کے معاملے میں حضرت عمرؓ کے مشورے کو جزوی طور پر قبول کرتے ہیں اور انہیں، ایک تہائی لشکر کی سالاری سے معزول کر کے ایک چھوٹے سے امدادی دستے کی کمان دیتے ہیں۔ آخرکار تدوین قرآن کے مشورے پر کچھ ہچکچاہٹ کے بعد مکمل طور پر قبول کر لیتے ہیں اور پوری یکسوئی و دلجمعی کے ساتھ تدوین کا انتظام کرتے ہیں۔ دونوں کے نقطہ نظر میں یہ تدریجی اتفاق و توازن اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ باہمی مشاورت کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے اور اس کا تسلسل بالآخر اتفاق، اتحاد کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ عملی مسائل اپنا حل مانگتے ہیں اور باہمی مشاورت اس معتدل حل کی طرف لے جاتی ہے جو زیادہ مفید، مؤثر اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ان دونوں ساتھیوں نے باہمی مشاورت اور اتفاق رائے کی طرف پیش قدمی کرنی ہی تھی کیونکہ عہد رسالت میں دونوں کا اختلافی نقطہ نظر آنحضور ﷺ کے حتمی فیصلے کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد دونوں نے خود ہی حل کر کے ایک نتیجے تک پہنچنا ہوتا تھا۔ اس لئے ان کی آراء اور فتہ رفتہ نقطہ اتصال کی طرف گامزن رہیں۔ پھر اسلام کے ایک اور اصول نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ تھا اطاعت امر کا حکم۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کے تمام تقاضے پوری طرح ادا کئے۔

ان دونوں بزرگوں کے باہمی مشوروں کے مزاج و انداز اور قبول کے معیار، براہین و دلائل اخلاص و دیانتداری اور اس پر عملی نفاذ پر غور کر کے ہم اسلام کے نظام مشاورت کے خدوخال اور حدود و شرائط کو بخوبی جان سکتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر ہم عہد جدید کے بے شمار پیچیدہ مسائل کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کر سکتے ہیں۔

---

(١) بخاری ٦/٩٩

○......بطور قاضی:

ابراہیم نخعی کے بقول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد سب سے پہلے مسلمانوں کے امور پر جسے مقرر کیا وہ حضرت عمر بن الخطابؓ ہیں۔ انہیں منصب قضا تفویض کیا اور وہ اسلام میں سب سے پہلے قاضی ہیں[1]۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان سے فرمایا کہ "میں تو خلافت کے کاموں میں مشغول ہوں اس لئے مسلمانوں کے فیصلے آپ کیا کریں[2]۔" ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے خلیفہ بن جانے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے تقسیم کار کا مشورہ دیا تو خود ہی محکمہ قضاء کے سلسلے میں اپنی خدمات کی پیشکش کی[3]۔ اس سے علامہ ابن کثیر کی نقل کردہ اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کا کوئی قاضی نہ تھا[4]۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت عمرؓ کو قاضی کے تقرر کے بعد باقاعدہ ایوان عدالت سجانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ ایک تو اس لئے کہ عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گیا اور لوگ اپنے اختلافات کو جھگڑوں میں تبدیل کرنے کے بجائے رواداری، ہم آہنگی اور افہام و تفہیم سے خود ہی طے کر لیا کرتے تھے۔ دوسرا امکان اس بات کا بھی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی ہیبت و جلال کی وجہ سے لوگ براہ راست ان کی طرف رجوع کرنے سے ہچکچاتے ہوں۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایک سال تک اور بعض کے مطابق دو سال تک انتظار کرتے رہے۔ اس عرصے میں کوئی یک بادو شخص بھی ان کے پاس اپنا مقدمہ لے کر نہیں آئے[5]۔ حضرت عمرؓ کا اپنا قول ہے کہ "مہینہ گزر جاتا مگر دو آدمی بھی فیصلہ کرانے کیلئے میرے پاس نہ آتے[6]۔"

صورت احوال یہ تھی کہ عہد نبوی میں سرور کونین ﷺ کی ذات بابرکات مرکزیت کی حامل تھی۔ آپؐ ہی حاکم بھی تھے، معلم بھی، سپہ سالار بھی تھے اور منصف اعلیٰ بھی۔ ہر معاملے میں لوگ براہ راست آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ عہد صدیقی میں بھی معاملات بالکل اسی نہج اور انداز کے مطابق چلتے رہے۔ شعبہ جات کی تقسیم کا موثر نظام معرض وجود میں نہ آسکا اس لئے کہ مسائل کی نوعیت و وسعت میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی اور معاملات کی سادگی بھی حسب سابق برقرار تھی۔ لوگ اپنے نزاعی امور خلیفہ رسول ﷺ حضرت ابو بکرؓ ہی کی خدمت میں آکر پیش کرتے تھے۔ پھر آپ کا یہ مستقل وطیرہ تھا کہ اس مقدمے کو حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیتے تھے۔ اگر خود فیصلہ کرتے تو بھی اس کی تصدیق کیلئے حضرت عمرؓ کی گواہی ضرور ثبت کرتے اور اگر اپنی موجودگی میں فیصلہ کرنے کا ارادہ کرتے تو حضرت عمرؓ کو ضرور شریک مشورہ کرتے۔ مختلف واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ سیاسی و انتظامی معاملات کے برعکس جہاں حضرت ابو بکرؓ اپنی ہی صوابدید پر پالیسی کا تعین کرتے فقہی و قانونی معاملات میں ہمیشہ قاضی مدینہ حضرت عمر فاروقؓ ہی کی رائے کو فوقیت دیتے تھے۔

ابو ماجدہ سہمی کا بیان ہے کہ میں اپنے گھر کے ایک غلام سے تختی سے پیش آیا۔ اس نے اپنے دانتوں سے میرا کان پکڑ کر کاٹ لیا، میں نے اس کا کان کاٹ لیا (یہاں راوی کو شبہ ہے کہ انہوں نے کیا بتایا) پھر ہم ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو حج کے سلسلے میں ہمارے پاس آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں حضرت عمرؓ کی طرف بھیج دیا اور فرمایا "انہیں عمرؓ کے پاس لے جاؤ، وہ تحقیق کریں کہ اگر زخم ہڈی تک پہنچ گیا ہے تو قصاص لیں۔" جب ہم عمرؓ کے سامنے پیش کئے گئے، تو انہوں نے زخم دیکھ کر فرمایا "خدا کی قسم یہ زخم تو ہڈی تک پہنچ گیا ہے، اس پر تو قصاص ہے۔ پھر حکم دیا کہ حجام کو بلاؤ، تاکہ وہ قصاص لے، چنانچہ انہوں نے قصاص لیا[7]۔

(۱) [illegible] (۲) سعد [illegible] ۸۷ (۳) سعد ۱۸٤/۳ [illegible] (٤) کثیر [illegible] (۵) طبری [illegible] ٤۲٦/۳ (٦)
سعد ۱۸٤/۳ (۷) داؤد [illegible] طبری [illegible]

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ بطور قاضی اپنی ذمہ داریاں پوری طرح سرانجام دیتے تھے اور حضرت ابو بکرؓ بہت سے قضیے انہیں کی طرف فیصلے کیلئے بھیجتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ حضرت ابو بکرؓ کوئی فیصلہ کھلی کچہری میں کر رہے ہوتے تو حضرت عمرؓ اس میں اپنی رائے کا اظہار کرتے' جسے حضرت ابو بکرؓ نافذ کر دیتے تھے۔ اس کی نمایاں مثال حسب ذیل واقعہ ہے "بنو اسد اور بنو غطفان کے لوگوں پر مشتمل ایک وفد بزاخہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور طالب صلح ہوا۔ یہ لوگ منکرین زکوۃ میں سے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے انہیں کھلی جنگ یا ذلت آمیز صلح کی پیشکش کی' وہ بولے "کھلی جنگ کو تو ہم سمجھتے ہیں' مگر ذلت آمیز صلح کیا ہوتی ہے؟" فرمایا "تمہارے جانور چھین لئے جائیں گے' جو کچھ تمہارا مال ہمارے ہاتھ لگا ہے وہ ہمارا مال غنیمت ہے اور جو کچھ ہمارا مال تمہارے ہاتھ لگا ہے' وہ واپس دینا ہو گا۔ تمہیں ہمارے مقتولوں کی دیت دینی ہو گی اور تمہارے مقتول جہنم میں جائیں گے اور تم لوگوں کو اونٹوں کی دموں کے پیچھے چھوڑ دیا جائے گا۔ تا آنکہ اللہ اپنے رسول ﷺ کے خلیفہ اور مہاجرین کو تمہارے بارے میں کسی عذر کی راہ دکھا دے۔" جب حضرت ابو بکرؓ فرما چکے تو حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا "آپ نے اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے' ہم بھی اس بارے میں مشورہ دے سکتے ہیں۔ آپ نے جو کھلی جنگ یا ذلت آمیز صلح کا ذکر کیا ہے' وہ ٹھیک ہے اور یہ جو فرمایا ہے کہ جو کچھ ہمارے ہاتھ لگا ہے' وہ مال غنیمت ہے اور جو کچھ تمہارے ہاتھ لگا ہے وہ واپس کرنا ہو گا' یہ بھی درست ہے' مگر آپ نے جو فرمایا ہے کہ ہمارے مقتولوں کی دیت دینی پڑے گی یہ غلط ہے کیونکہ ہمارے مقتول راہ خدا میں قتل ہوئے ان کی کوئی دیت نہیں ان کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے[1]۔" سب لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور اسی پر عمل کیا۔

حضرت ابو بکرؓ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو عامل مقرر کیا۔ وہ اپنی محلہ رہی سے واپس لوٹے تو ان کے پاس بہت سا ساز و سامان تھا۔ انہوں نے صدیق اکبرؓ سے کہا کہ اس میں سے کچھ تو آپ کیلئے (یعنی بیت المال) ہے اور کچھ مجھے تحفہ ملا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "سارے کا سارا مال ابو بکرؓ کے حوالے کر دو۔" انہوں نے اس سے انکار کیا۔ انہیں اسی رات ایک خواب دکھائی دیا کہ وہ آگ کے ایک بہت بڑے الاؤ سے ذرا ہٹ کر اوپر کی طرف کھڑے ہیں اور ڈر رہے ہیں کہ ابھی اس میں گر جائیں گے۔ اتنے میں حضرت عمرؓ آتے ہیں اور انہیں کمر سے پکڑ کر بچا لیتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی حضرت معاذؓ حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خواب بیان کر کے سارا مال ان کے حوالے کر دیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "اے معاذ! تم نے یہ سب بغیر اصرار کے کیا ہے' اس لئے اب یہ تمہارے لئے حلال ہے۔" حضرت عمرؓ نے کہا "ہاں اب یہ تمہارے لئے پاک ہے[2]۔" حضرت ابو بکرؓ کسی معاملے میں خود فیصلہ کرنا چاہتے' تو خود ہی اس کی تحقیق و تفتیش کرتے اور فیصلہ فرماتے' اس کا وہ بجا طور پر حق رکھتے تھے اور اس حق و اختیار کو انہوں نے کئی مرتبہ استعمال کیا[3]۔ لیکن اس میں بھی ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بصیرت فاروقی سے بھی استفادہ کریں' جو ان کیلئے بہت بڑا سرمایہ تھی۔

روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک ایسے شخص نے چوری کی' جس کا پہلے ہی ایک ہاتھ اور ایک پاؤں اسی جرم میں کٹا ہوا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے ارادہ کیا کہ اس چوری پر (اس کے ہاتھ کے بجائے) پاؤں ہی کاٹا جائے' تاکہ اس کا ایک ہاتھ باقی رہ جائے' جس سے وہ کھا سکے' طہارت کر سکے اور دیگر کام کر سکے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "نہیں' بخدا آپ اس کا دوسرا ہاتھ ہی کاٹیں گے۔" چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے اسی رائے کے مطابق حکم دیا اور اس کا دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا[4]۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ سنت ہاتھ کاٹنا ہی ہے[5]۔ البتہ اپنے عہد خلافت میں اپنی اس رائے سے انہوں نے رجوع کر لیا اور تیسری یا چوتھی چوری کی صورت میں قید خانے میں بند کرنے کے قائل ہو گئے چنانچہ سدوم نامی شخص کا ہاتھ کاٹنے کے بجائے اسے قید کر دیا[6]۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ قضیوں کے بارے میں عام طور پر حضرت عمرؓ ہی پر بھروسہ کرتے تھے اور حسب ضرورت ان سے تعاون لیتے بھی تھے اور انہیں تعاون دیتے بھی تھے۔ البتہ اگر ان کا کوئی معاملہ

---

(۱) کنز العمال ۳۱۹:۶ (۲) حوالہ ۲۳۱ (۳) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سیوطی ۱۰۲-۹۲ (٤) بیہقی ۲۷٤:۸ (٥) حوالہ ۱۱/۳٥ (٦) مصنف عبدالرزاق ۱۸٦:۱۰ حوالہ ۱۱ ۳٥٥

ہو تا تو اس کا فیصلہ خود فرماتے تھے تاکہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ حسب ذیل واقعہ اس کا ثبوت ہے۔ قاسم بن محمد سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطابؓ کے پاس ایک انصاری عورت تھی۔ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عاصم بن عمر رکھا گیا۔ پھر آپ نے اس عورت کو چھوڑ دیا (ایک دن) وہ مسجد قبا میں آئے تو وہاں عاصم کو اور لڑکوں کے ساتھ مسجد میں کھیلتا ہوا پایا چنانچہ انہوں نے اس کا بازو پکڑا اور اسے اپنے جانور پر سوار کر لیا۔ لڑکے کی نانی نے یہ دیکھ کر ان سے جھگڑا کیا اور بچہ طلب کیا' یہاں تک کہ دونوں حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ "یہ میرا بیٹا ہے۔" اس عورت نے کہا کہ "یہ میرا بچہ ہے۔" حضرت ابو بکرؓ نے (فریقین کا موقف سننے کے بعد) فرمایا "عمرؓ اسے چھوڑ دو اس کی نانی کے حوالے کر دو۔" راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اسے لوٹا دیا اور کوئی بھی تکرار نہ کی[۱]۔

اس فیصلے کی وجہ یہ ہے کہ جب تک بچہ سن شعور کو نہ پہنچے پرورش کا حق نانی کو حاصل ہے۔ چنانچہ امام مالک کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ بعض ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ نے خود خلیفہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکرؓ کے احکام و فرامین کو جب رفاہ عامہ اور عدل و انصاف کے ترازو میں تولا' تو ان کی تائید و تصدیق کرنے سے انکار کر دیا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کے فیصلے کو بدلنے سے انکار کر دیا اور اسی کو صائب جانا۔ عمر بن یحییٰ لزرقی سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کو زمین کا ایک قطعہ بطور جاگیر لکھ دیا اور اس تحریر پر کچھ لوگوں کو گواہ بھی بنالیا' جن میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ حضرت طلحہؓ وہ تحریر لے کر ان کے پاس پہنچے اور انہیں کہا کہ اس پر اپنی مہر ثبت کر دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں اس پر اپنی مہر نہیں لگاؤں گا۔ کیا سارے لوگوں کو چھوڑ کر یہ سب کی سب تمہاری اکیلے کی ہو جائے گی۔" یہ سن کر حضرت طلحہؓ غصے کی حالت میں حضرت ابو بکرؓ کے پاس ہوئے اور کہا "واللہ! میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ۔" انہوں نے جواب دیا بلکہ عمرؓ لیکن انہوں نے انکار کر دیا ہے[۲]۔ علامہ طبری نے غالباً اسی واقعہ کو یا پھر اسی سے ملتے جلتے ایک اور واقعہ کو بیان کیا ہے' جس کا مرکزی کردار حضرت طلحہؓ ہی ہیں۔ تفصیل کچھ اس طرح ہے

حضرت زرقانؓ اور اقرع حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ بحرین کا خراج آپ ہمیں لکھ دیں' ہم اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ ہماری قوم میں سے ایک بھی اسلام کو ترک نہیں کرے گا۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان کی درخواست قبول کر لی اور اس سلسلے میں ایک تحریر بھی لکھ دی۔ حضرت طلحہؓ بن عبد اللہ نے اس معاملے میں طرفین کی سفارت کی تھی۔ اس تصفیے پر کئی اشخاص گواہ بنائے گئے' ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ جب باقاعدہ تحریر لکھ لی گئی اور گواہی کیلئے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کی گئی' تو انہوں نے شرائط دیکھیں' تو گواہی ثبت نہ کی۔ پھر فرمایا "نہیں! واللہ میں ہرگز اس کا لحاظ نہیں کروں گا۔ یہ کہہ کر اسے مٹا دیا اور پھر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔" حضرت طلحہؓ اس پر غصے ہوئے اور حضرت ابو بکرؓ کے پاس آکر کہا "امیر آپ ہیں یا عمرؓ؟" انہوں نے جواب دیا "عمرؓ!" یہ الگ بات ہے کہ اطاعت میری قبول کی گئی ہے' یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے[۳]۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ حضرت عیینہؓ بن حصن کے ساتھ بھی پیش آیا۔ انہیں بھی حضرت ابو بکرؓ نے ایک قطعہ زمین بطور جاگیر لکھ دیا۔ ان سے حضرت طلحہؓ یا کسی دوسرے آدمی نے کہا "یہ صاحب یعنی حضرت عمرؓ اس بارے میں صحیح رہنمائی کر سکیں گے۔ بہتر ہو گا آپ اپنی تحریر انہیں پڑھنے کیلئے دے دیں۔" چنانچہ حضرت عیینہؓ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور وہ خط پڑھنے کیلئے دیا (بقیہ عبارت پہلے واقعے کی طرح مذکورہ ہے "مگر میں مزید اضافہ ہے کہ) حضرت عمرؓ نے اس تحریر پر تھوک کر اسے مٹا دیا۔ بعد ازاں حضرت عیینہؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے درخواست کی کہ وہ اسی مضمون کی ایک نئی تحریر انہیں لکھ دیں' لیکن حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "بخدا! میں اس چیز کی تجدید نہیں کروں گا جس کی عمر نے تردید کر دی ہو[۴]۔"

---

(۱) مالک ۷۶۷/۲ (۲) عبید ۲۵۶ (۳) طبری ۲۷۵/۳ (۴) عبید ۲۵۶۔

مذکورہ تینوں واقعات کو دیکھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے تحریری احکام کو آخر کس حیثیت میں مٹا دینے اور تار تار کر دینے کی جرأت کی تھی؟ کیا یہ تھی دوست ہونے کی حیثیت سے؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت ابو بکرؓ خلیفہ تھے۔ اس لئے ان کی ذمہ داری اور استحقاق مختلف تھا۔ اس کے تقاضے بھی شرعی اور قانونی حیثیت رکھتے تھے' جو ذاتی تعلقات سے ماورا تھے۔ دوستی کی حیثیت ثانوی تھی۔ ایک دوست ہونے کی بنا پر انہیں یہ حق نہیں تھا کہ خلیفہ وقت کے فرمان سے یہ سلوک کریں۔ تو پھر کیا مشیر و وزیر کی حیثیت سے؟ نہیں ایسا بھی نہیں کیونکہ ایک مشیر کا کام خلیفہ کو مشورہ دینا اور اپنی مخلصانہ اور دیانتدارانہ رائے سے آگاہ کرنا ہے۔ آگے اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا خلیفہ کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ مشیر کیلئے یہ مناسب نہیں ہوتا کہ وہ اس کی طرف سے کسی جاری کردہ فرمان کی خلاف ورزی کرے۔ اگر کوئی بات ناپسند بھی ہو' تو اسی کی طرف رجوع کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے بطور مشیر بہت سے مشورے دیئے۔ بعض قبول کیے گئے' بعض نہیں' لیکن انہوں نے کسی صورت میں اطاعت و فرمانبرداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اپنی رائے کے برعکس اسے نافذ کرنے کیلئے اپنی صلاحیتیں کھپا دیں۔ وزیر کا کام بھی در حقیقت یہی ہے کہ حکومت کی طے شدہ پالیسیوں کو عملی جامہ پہنائے۔ تو پھر یہ گواہ کی حیثیت سے؟ ایسا بھی نہیں اس لئے کہ انہیں یہ حق تو پہنچتا تھا کہ اگر ان تحریروں سے اتفاق نہیں رکھتے' تو گواہی نہ دیں' لیکن یہ حق نہیں تھا کہ سرے سے وہ عبارت ہی مٹا دیں' جبکہ گواہ بھی اکیلے وہی نہیں تھے اور لوگ بھی تھے۔

ہم جب اس معاملے کی نوعیت اور حضرت عمر فاروقؓ کے ردعمل اور ان کے فیصلے سے نافذ ہونے پر غور کرتے ہیں' تو اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ انہوں نے یہ کام قاضی و منصف ہونے کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس لئے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ فقہی و قانونی معاملات کو یا تو ان کی طرف ارسال کرتے تھے یا ان کی رائے کے موافق طے کرتے تھے۔ ان فرامین کو جاری کرتے وقت بھی انہوں نے یہ ضروری خیال کیا کہ حضرت عمرؓ کو بھی اعتماد میں لیا جائے اور ان کے نفاذ سے پہلے ان کی گواہی بھی ثبت ہو جائے' لیکن حضرت عمرؓ نے بطور قاضی یہ مناسب نہیں سمجھا کہ زمین کے یہ قطعات تمام لوگوں کے تصرفات سے نکل کر محض چند لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں۔ انہیں یہ حق حاصل تھا کہ اگر خلیفہ وقت کے بھی کسی حکم کو انصاف کے خلاف سمجھیں تو اسے منسوخ کر دیں۔ اس پر عملدرآمد روک دیں' انہوں نے ایسا ہی کیا۔ یہ حالات کا تقاضا بھی تھا اور ان کے ضمیر کی آواز بھی۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ ان کی اجتہادی بصیرت کی غمازی کرتا ہے' جو وقت کے ساتھ ساتھ نکھرتی چلی جا رہی تھی۔ بدلتے ہوئے حالات پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ اسلامی ریاست اور مسلمانوں کی آئندہ کی ضروریات کو پہلے ہی محسوس کر رہے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اسلام نے اجتماعی مفاد اور فلاح عامہ کو انفرادی اغراض پر جو ترجیح دی ہے اسے نئے مسائل پر کس طرح لاگو کیا جا سکتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ زمینیں عطا کر کے کوئی نیا کام نہیں کیا تھا۔ خود سرور کونین ﷺ کا اسوہ موجود تھا' لیکن حضرت عمرؓ کے نزدیک نبی محترم نے جن حالات میں یہ طریق کار اختیار کیا تھا ان میں وہی فلاح عامہ کے مطابق کام تھا۔ ریاست کے دفاع' اسلام کی ترویج و اشاعت' زمینوں کی آبادکاری' زراعت کے پیشے کی طرف لوگوں کو رغبت دلانے' انفرادی اور قومی آمدنی میں اضافے اور افلاس و بیروزگاری کے خاتمے کیلئے وہ انتہائی ضروری تھا۔ آپؐ نے بہت سے لوگوں کو جو قطعے دیئے تھے' جن میں حضرت زبیرؓ' بلال بن حارثؓ المزنی' فرات بن حیانؓ' ابو ثعلبہؓ اور تمیم داریؓ وغیرہ شامل ہیں[1]۔ اس میں در اصل یہی حکمت شامل تھی۔

لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اقدام کے وقت انہوں نے محسوس کیا کہ اب مصالح عامہ کی حکمت نئے طرز عمل کا تقاضا کر رہی ہے اس لئے اسی کو اپنانا چاہئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ آپ کی فراست و بصیرت کے قائل تھے۔ آپ کے فیصلوں کا سن کر ان کے عوامل و مقاصد کو سمجھ گئے اور کسی قسم کی خفت و ناراضی کا اظہار کرنے کے بجائے بلا پس و پیش انہیں نافذ کر دیا اور انہیں آپ کے اختیارات و منصب کیلئے چیلنج باور کرانے کی جو کاوش کی گئی' اسے یہ کہہ کر ناکام کر دیا کہ خلیفہ تو در اصل عمرؓ ہی ہیں اور پھر دوٹوک لفظوں میں اعلان کر دیا' جس چیز کی عمرؓ نے تردید کی ہو میں اس کی تجدید نہیں کروں گا۔ یہ در اصل حضرت عمرؓ کی اجتہادی بصیرت اور فیصلے کی صلاحیت پر ایک غیر متزلزل اعتماد تھا کہ جس سے بڑھ کر کسی اعتماد کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

---

(۱) ایضاً۔ ص ۲۵۳

○ ... فاروق اعظمؓ کا انتخاب:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے' تو انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ ان کے بعد اس عظیم ذمہ داری کو کون سنبھالے گا؟ اس کیلئے یہ بات نہایت آسان تھی کہ جس طرح سرور کونین ﷺ نے کسی کا تقرر نہیں فرمایا تھا' اسی طرح وہ خود بھی اس دار فانی سے رخصت ہو جائیں اور بعد میں لوگ جس کو چاہیں اپنا خلیفہ مقرر کریں' لیکن سقیفہ بنی ساعدہ کے تلخ تجربے نے بجا طور پر انہیں یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا کہ خلیفہ کا تقرر ان کی زندگی میں ہو جانا چاہئے تاکہ بعد میں کسی بڑے اختلاف و انتشار کا امکان نہ رہے۔ جس طرح ان کی پوری زندگی اسوہ نبوی ﷺ کی بلا چون و چرا اطاعت میں گزری تھی' یہاں تک کہ بطور خلیفہ سیاسی و انتظامی معاملات میں بھی اپنی رائے اور اختیار کو تابع کلی کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ اسی طرح شان صدیقیت کا تقاضا یہ بھی تھا کہ نئے خلیفہ کا معاملہ بھی منشائے نبوی ﷺ کی روح کے عین مطابق طے پائے اور مسلمانوں کو خود اس معاملے میں فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ جب گراں جانی کا عالم طاری ہوا اور انہیں موت کے آثار دکھائی دینے لگے' تو لوگ ان کی طرف اکٹھے ہوئے تو انہوں نے ان کے مجمع سے مخاطب ہو کر فرمایا "تم لوگوں پر میری حالت اور میرے مزاج کی کیفیت ظاہر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس مرض سے جانبر نہ ہو سکوں گا۔ اب تم میری امامت اور بیعت سے آزاد ہو اور میرا اور تمہارا پھر وہی تعلق رہ گیا' جو میری خلافت سے پہلے تھا۔ تم جسے مناسب سمجھو اپنا امیر اور قائد چن لو' البتہ اگر میرے مرنے سے پہلے پہلے تم ایسا کر سکو تو بہتر ہو گا تاکہ میرے بعد اختلاف کی گنجائش نہ رہ سکے۔"

لوگ الگ ہٹ گئے اور اس مسئلہ پر غور کیا' لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے یعنی ایسا کوئی فیصلہ نہ کر پائے جو سب کیلئے قابل قبول ہوتا۔ مجمع صدیق اکبرؓ کی خدمت میں لوٹ آیا (یہ ایک لمحہ تاریخ سے ہمکنار تھا) اور اعلان کیا "یا خلیفہ رسول اللہ' اس باب میں آپ کی جو رائے بھی ہو گی ہمیں تسلیم ہو گی۔"

صدیق اکبرؓ نے فرمایا: "ممکن ہے تم لوگ بعد میں اختلاف رائے میں مبتلا ہو جاؤ۔"

لوگوں نے کہا "نہیں ایسا نہیں ہو گا۔"

اس کے بعد اسلام کے مرد بزرگ نے قوم سے عہد لیا کہ وہ ان کی سفارش کو بلا چون و چرا قبول کرے گی۔ امت نے اس بات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اب ابو بکرؓ نے قوم سے مہلت چاہی تاکہ وہ اس اہم مسئلہ کو خالص دینی و ملی نقطہ نظر سے حل کرنے کی کوشش کریں[1]۔ جب لوگوں کی طرف سے ساری ذمہ داری انہیں پر ڈال دی گئی تو ان کی بے چینی میں اور اضافہ ہو گا' مسلمان بہت نازک مرحلے سے گزر رہے تھے۔ روم اور ایران کی سالہا سال سے مستحکم و منظم سلطنتوں سے پنجہ آزمائی ہو رہی تھی۔ اسلامی ریاست کی سرحدیں جزیرہ نمائے حجاز سے آگے پھیل رہی تھیں' عجمی قبائل اور طرح طرح کی قوموں کے زیر نگیں ہونے سے نئے تمدنی' تہذیبی' سیاسی' اخلاقی اور اقتصادی مسائل کا چیلنج سامنے تھا۔ فتنہ ارتداد کے ختم ہو جانے کے باوجود ابھی اس کے اثرات باقی تھے اور ریاست کو اندرونی طور پر مستحکم کرنے کیلئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا' دور دراز علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے فکر و نظر اور اخلاق و کردار کو مکمل طور پر اسلامی سانچوں میں ڈھالنے کی اشد ضرورت تھی' قبائلی طرز سیاست کو ایک نظام میں جذب کر دینا' طبقاتی تقسیم کو ختم کرنا' مفلوک الحال لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنا خواہ وہ دار الخلافہ سے کتنے ہی دور کیوں نہ بستے ہوں اور ایک نئے طرز کی فلاحی و رفاہی ریاست کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا بھی باقی تھا' جس کا ڈھانچہ اور بنیادیں ہادی برحق

---

(۱) طبری | ۴۸

محسن کائنات ﷺ نے فراہم کردی تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ ان تمام مقاصد کی تکمیل کیلئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ایک طرف فہم و فراست اور اجتہادی بصیرت سے مزین ہو اور دوسری طرف بے پناہ انتظامی صلاحیت کا مالک ہو' ایک طرف جرأت و عزیمت کا پیکر ہو تو دوسری طرف سیاسی تدبر اور معاملہ فہمی سے آگاہ' ایک طرف علم و فن کا ماہر ہو تو دوسری طرف عمل و کردار کا نمونہ' ایک طرف رعب و دبدبہ کا حامل ہو تو دوسری طرف رقت و تقویٰ کا شاہکار۔ یہ بے شمار اور متفرق صلاحیتیں کس کے اندر یکجا ہیں؟ انہوں نے کبار صحابہؓ میں سے ایک ایک پر نظر ڈالنا شروع کی۔ ایک ایک کے ماضی و حال کو ٹٹولا' ایک ایک کے انفرادی و اجتماعی رویے کا تجزیہ کیا' تو ایک ہی شخص پر جا کر نظر ٹھہر جاتی کہ وہ شخصیت صرف اور صرف حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر گوشہ ان کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھا۔ اس کا کوئی ورق داغدار نہیں تھا اور کوئی جوہر پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ اپنی شخصیت کے کسی پہلو کو چھپا نہیں سکتے تھے۔ رسول کریم ﷺ کی رفاقت میں رہتے ہوئے بھی بہت نمایاں تھے اور ان کے اپنے عہد خلافت میں بھی نہایت اہم اور نہایت قریب' پھر ان کے مناقب و فضائل سے بھی اچھی طرح واقف تھے' لہٰذا انہوں نے پورے خلوص اور دیانتداری سے یہ فیصلہ کر لیا' یہ منصب فاروق اعظمؓ ہی کے سپرد کیا جائے۔ اس پر ان کا دل اور ضمیر پوری طرح مطمئن ہو گئے۔

صدیق اکبرؓ یہ چاہتے تھے کہ اپنے دل و ضمیر کے اس فیصلے کو اسلام کے مشاورتی طریق کار کے مطابق ہی عملی جامہ پہنائیں۔ یہ بات صحیح تھی کہ لوگوں نے ان کی رائے پر مکمل اعتماد کرنے کا اعلان کیا تھا اور خود ہی انہیں تقرری کا اختیار دے دیا تھا لیکن پھر بھی یہ ضروری تھا۔ چیدہ چیدہ اکابرین کو اعتماد میں لیا جائے اور انہیں شریک مشورہ کر کے اجتماعی صورت پیدا کی جائے۔ یہ خیال آتے ہی انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو بلایا اور ان سے کہا "بتاؤ عمرؓ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔" عبدالرحمٰنؓ نے کہا "اے خلیفہ رسول وہ اوروں کی بہ نسبت آپ کی رائے سے بھی افضل ہیں' مگر ان کے مزاج میں ذرا شدت ہے۔" ابوبکرؓ نے کہا "یہ شدت اس وجہ سے تھی کہ وہ مجھ کو نرم دیکھتے تھے' جب حکومت خود ان کو تفویض ہو گی' تو اس قسم کی اکثر باتیں چھوڑ دیں گے۔ اے ابو محمد میں نے ان کو بغور دیکھا ہے کہ جس وقت میں کسی شخص پر کسی معاملے میں غضبناک ہوتا تھا' تو عمرؓ مجھ کو اس پر راضی ہونے کا مشورہ دیتے تھے اور جب کبھی میں کسی پر نرم ہوتا تھا' تو وہ مجھ کو اس پر سختی کرنے کا مشورہ دیتے۔ اے ابو محمد یہ باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تم ان کا کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔" عبدالرحمٰنؓ نے کہا "بہت اچھا[1]۔" اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی رائے تھوپنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی ہر شخص آزادانہ طور پر اپنی ذاتی رائے پیش کرے۔ اسی لئے انہوں نے اس بات چیت کو خفیہ رکھنے کا حکم دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کھل کر یہ بات بتائی کہ مزاج کی سختی کے علاوہ ان میں اور کوئی نقص نہیں۔ وہ سب سے زیادہ منصب خلافت کے اہل ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ذاتی تجربے کی بنا پر واضح کیا یہ نقص نہیں' بلکہ ایک ایسی خوبی تھی جو ان کیلئے بوقت ضرورت نہایت مفید ثابت ہوتی تھی۔ اس کے بعد ابوبکرؓ نے عثمان بن عفانؓ کو بلایا اور ان سے کہا "اے ابو عبداللہ! مجھے بتاؤ کہ عمرؓ کیسے ہیں؟" عثمانؓ نے کہا "آپ ان کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔" ابوبکرؓ نے کہا "ہاں اے ابو عبداللہ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔" پھر آپ نے کہا "بار الہا میں عمرؓ کے باطن کو ان کے ظاہر سے بہتر سمجھتا ہوں' ہم میں ان جیسا کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔" پھر ابوبکرؓ نے کہا "اے ابو عبداللہ اللہ تم پر رحم فرمائے' ان باتوں کا تم کسی سے ذکر نہ کرنا۔" عثمانؓ نے کہا "بہت اچھا!" اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے کہا "اگر میں نے عمرؓ کو چھوڑ دیا تو تمہیں نہیں چھوڑوں گا' مجھے معلوم نہیں' ممکن ہے عمرؓ اس کو قبول نہ کریں۔ ان کیلئے تو یہی بہتر ہے کہ وہ تمہاری حکومت کا بار اپنے سر نہ لیں۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ میں تم لوگوں کے اس معاملے سے بے تعلق رہتا اور اپنے پیشرو کے طریقے کو اختیار کرتا۔ اے ابو عبداللہ

---

(۱) سعد: ۳/۱۹۹؛ طبری: ۳/۴۲۸؛ جوزی: ۵۰؛ اثیر: ۲/۲۹؛ سیوطی: ۸۲۔
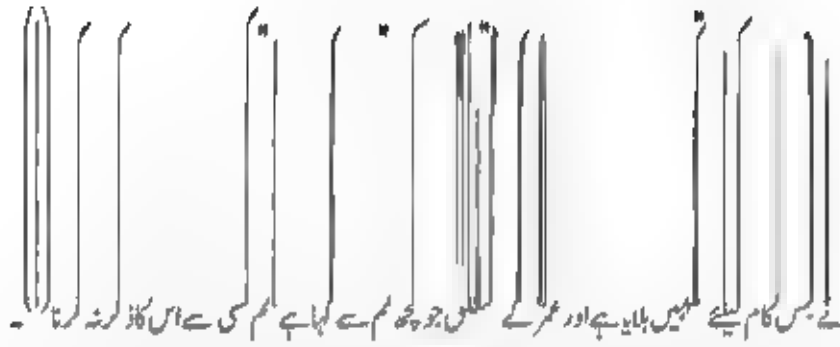
میں نے جس کام کیلئے تمہیں بلایا ہے اور عمرؓ کے متعلق جو کچھ تم سے کہا ہے تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ سے بہت متاثر تھے اور انہیں ہی سب سے زیادہ اہل سمجھتے تھے 'لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ابھی تک یہ یقین نہیں تھا کہ حضرت عمرؓ اس منصب کو سنبھالنے کیلئے خوشدلی سے تیار بھی ہوں گے یا نہیں۔ اس خدشے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کی بے غرضی و بے لوثی سے اچھی طرح آگاہ تھے اس لئے انہوں نے احتیاطاً حضرت عثمان کو بھی یہ اشارہ دے دیا کہ دوسرے نمبر پر ان کے ذہن میں انہیں کا نام ہے۔ ان کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے سعیدؓ بن زید 'ابو عبیدہؓ اور اسیدؓ بن الحضیر سے مشورہ کیا 'تو حضرت اسید نے کہا "اے اللہ 'مجھے حق توفیق دے 'آپ کے بعد میں انہیں سے سب سے بہتر سمجھتا ہوں 'جو رضائے الٰہی سے راضی اور ناراضی سے ناراض ہوتا ہے۔ ان کا باطن ان کے ظاہر سے زیادہ بہتر ہے اور اس امر پر کوئی ایسا والی نہیں 'جو ان سے زیادہ قوی ہو (۲)۔"

بعد ازاں صدیق اکبرؓ نے جب مشاورت کا دائرہ دیگر مہاجرین و انصار تک وسیع کیا 'تو لوگ دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ کچھ لوگ تو انہیں خلیفہ بنانے کے حق میں تھے اور کچھ لوگ مخالف۔ جو لوگ مخالفت کر رہے تھے 'انہیں اس کے علاوہ اور کوئی اعتراض نہیں تھا کہ ان کے مزاج میں شدت اور تند خوئی ہے 'جونہی انہیں یہ اندازہ ہوا کہ حضرت عمر فاروقؓ ہی کو خلیفہ بنائے جانے کا قوی امکان ہے 'تو وہ سرگرم عمل ہو گئے۔ شعبی کا بیان ہے "طلحہؓ 'زبیرؓ 'عبدالرحمن بن عوفؓ اور سعدؓ ابوبکرؓ کے مکان پر موجود تھے 'یہ سب عیادت کیلئے آئے ہوئے تھے۔ ابوبکرؓ نے عمرؓ کو بلوا بھیجا 'عمرؓ آئے تو ان حضرات نے محسوس کیا کہ جیسے حضرت صدیق اکبرؓ عمرؓ سے تخلیہ میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہ سب وہاں سے اٹھ آئے اور ابوبکرؓ و عمرؓ کو تنہا چھوڑ دیا۔ اب یہ حضرات مسجد نبوی میں تشریف لائے اور حضرت علیؓ سے کہلا بھیجا کہ وہ مع اپنے آدمیوں کے مسجد میں آ جائیں۔ علیؓ اور ان لوگوں کو ایک اعلامیہ میں لے تشریف فرما ہوئے 'سب ان کے گرد جمع ہو گئے اور کہا "علیؓ 'تمہیں معلوم ہے 'خلیفۂ رسول اللہ عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کر رہے ہیں اور یہ تو خلیفہ رسول کو بھی معلوم ہے اور ہم بھی جانتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے میں ہم میں سے اکثر کو ان پر (عمرؓ پر) سبقت حاصل ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ با اختیار اور با اقتدار نہ ہونے کے باوجود قوم عمرؓ سے کس قدر مرعوب اور خائف سی رہتی ہے۔ تم ہمارے ساتھ چلو کہ ہم ابوبکرؓ سے اس بارے میں کچھ سوالات کر سکیں۔ اگر انہوں نے واقعی عمرؓ کو زمام حکومت سونپ دی ہے 'تو ہم اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ یہ سب ہوا اب ابوبکرؓ نے ارشاد فرمایا "سب لوگوں کو جمع کر لیا جائے 'تاکہ میں سب کو بتا سکوں کہ میں نے کسے منتخب کیا ہے۔ مسجد میں سب لوگ جمع ہو گئے اور خلیفۃ الرسول منبر پر جلوہ افگن ہوئے اور اعلان کے بعد کہ عمرؓ کو منتخب کیا گیا ہے اور واپس آ گئے 'مگر قوم ابھی تک متذبذب تھی۔ لوگوں نے از سر نو باریاب ہونے کی اجازت مانگی۔ انہیں اذن ورود بخشا گیا 'آنے والوں نے گویا بیک زبان کہا کہ "عمر کو ہم پر مسلط کر کے آپ اللہ کو کیا جواب دیں گے؟" ارشاد ہوا "میں اپنے رب سے کہوں گا کہ میں تیرے سب سے افضل بندے کو اپنا جانشین بنا کر آیا ہوں (۳)۔"

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب لوگوں نے مذکورہ سوال کیا 'تو غصے سے کانپ اٹھے۔ اس وقت آپ لیٹے ہوئے تھے 'لوگوں سے کہا کہ مجھے بٹھا دو۔ پھر ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "کیا تم لوگ مجھے اللہ کا خوف دلاتے ہو۔ تمہاری امارت سے جس نے ظلم سے توشہ حاصل کیا 'وہ برباد ہو گیا۔ اگر اللہ مجھ سے سوال کرے گا 'تو میں کہوں گا کہ اے اللہ تیرے خاص بندوں میں جو سب سے بہتر تھا 'میں نے اسے خلیفہ بنایا۔ اے شخص میں نے جو تم سے کہا ہے اسے ان لوگوں تک پہنچا دینا 'جو تمہارے پیچھے ہیں (۴)۔ لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ سوال کرنے والے حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ تھے (۵)۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ بھی حضرت طلحہؓ کے ساتھ تھے 'اس گفتگو نے خلیفہ اول کو لرزا دیا۔ حسن احسن

---

(۱) سعد ۳: ۱۹۹، طبری ۳: ۴۲۸، جوزی: ۵۰، اثیر ۲: ۲۹۲، سیوطی: ۸۲ (۲) سعد ۳: ۱۹۹، اثیر ۴: ۴۹ (۳) جوزی ۸/۴، سعد ۳: ۱۹۹، جوزی: ۵
سیوطی: ۸۲، اثیر ۴/۶۹ (۴) طبری ۳/۴۳۳، اثیر ۲/۲۹۲ (۵) سعد ۳/۲۷۴

طریق پر مکمل اتفاق واتحاد کے در پے وہ اس مسئلے کو طے کرنا چاہتے تھے' وہ سب آرزوئیں بکھرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ ان کی چشم تصور میں سقیفہ بنی ساعدہ کا کربناک منظر ایک مرتبہ پھر گھوم گیا۔ انہیں یہ اندیشہ ہونے لگا کہ مسلمان برضا ورغبت حضرت عمرؓ فاروق کی خلافت پر متفق نہیں ہوں گے۔ انہیں اس بات کا دکھ بھی کھائے جا رہا تھا۔ پہلے تو ان پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا' لیکن جب انہوں نے پورے خلوص اور دیانتداری سے ایک نام پیش کیا ہے' تو اس پر تنقید کی جانے لگی ہے۔ گر یہی سلسلہ جاری رہا' تو اور بھی کسی شخص پر اتفاق ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ پھر امت مسلمہ کا کیا حال ہو جائے گا۔ اس فکر و پریشانی میں انہوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی' لوگوں کے اعتراض پر سنجیدگی سے غور کیا' عمر فاروقؓ کے مزاج کی شدت و سختی واقعی لوگوں کیلئے اذیت وتکلیف کا باعث بنے گی؟ کیا وہ اپنی اس سختی کے ہوتے ہوئے معتبر اور اہل الرائے لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چل سکیں گے' جن کا تعاون مملکت وسیاست کے امور چلانے کیلئے انہیں قدم قدم پر درکار ہوگا؟ کیا ان کی بے شمار اعلیٰ صفت اس بگاڑ پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گی' جو ان کی درشتی کی وجہ سے پیدا ہو سکتا ہے؟ جب انہوں نے حضرت عمرؓ کی فہم وفراست' انتظامی صلاحیت' خلوص' جذبہ اور عزم واستقامت اور اسی طرح کی دوسری خوبیوں کا موازنہ ان کی شدت سے کیا' تو ایک مرتبہ پھر اسی نتیجے پر پہنچے کہ اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں ہے اور لوگوں کے دلوں میں پایا جانے والا خوف محض واہمہ ہے۔ کیوں کہ حضرت عمرؓ کے غصے میں خواہش نفس اور انا کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ان کی شدت دینی غیرت کی وجہ سے ہوتی ہے' جن کی شدت کی تعریف یہ کہہ کر خود سرور کونین ﷺ نے فرمائی ہو۔ "اشد امتی فی امر الله عمر[۱]"۔ "جن کے بارے میں خود جبریل علیہ السلام نے آکر آنحضور ﷺ سے کہا ہو کہ عمرؓ کو میرا سلام پیش کیجئے اور انہیں خبر دیجئے کہ ان کی رضا حکم ہے اور غصہ عزت[۲]"۔ وہ ناانصافی کیلئے نہیں' بلکہ انصاف کیلئے اور حق وصداقت کی بالادستی کی وجہ سے جوش میں آتے تھے۔ لوگوں کے خائف ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کسی کے ساتھ زیادتی کریں گے' بلکہ اس لئے تھی کہ وہ زیادتی روکنے کیلئے کسی کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔ ان کی سابقہ زندگی خود اس بات کا بین ثبوت تھی۔ اس لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ غور وخوض کیا' تو اور بھی زیادہ یکسوئی حاصل ہوگئی کہ احکام خداوندی کی سربلندی ونفاذ کیلئے بھی اور فتوحات وجہاد کی پالیسی کو جاری رکھنے کیلئے بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بہتر کوئی شخص اس منصب خلافت کا اہل نہیں ہے' البتہ انہیں اس بات کا رنج ضرور تھا کہ لوگ ان کے جذبات واحساسات اور اغراض ومقاصد کو حقیقی پس منظر اور مستقبل کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اگلی صبح اس کا اظہار انہوں نے کچھ اس طرح کیا "عبدالرحمن بن عوفؓ سے مروی ہے کہ وہ ابوبکرؓ کے مرض الموت کے زمانے میں ان کے پاس گئے اور ان کو کچھ غمگین سا پایا۔ عبدالرحمنؓ نے آپ سے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آپ نے تندرستی کے ساتھ صبح کی ہے۔" ابوبکرؓ نے کہا کہ "میں نے تمہاری حکومت ایک ایسے شخص کے حوالے کی ہے' جو میرے نزدیک تم سب سے بہتر ہے' مگر اس سے تم سب کی ناکیں پھول گئیں' ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ یہ منصب خود اس کو مل جائے[۳]۔"

حضرت عبدالرحمنؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا "امیر المومنینؓ اس قدر جوش میں نہ آئیے اس سے آپ نڈھال ہوئے جاتے ہیں۔ لوگوں میں ہر شخص دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو اس کی رائے بھی وہی ہے' جو آپ کی ہے' تو وہ آپ کے ساتھ ہے یا آپ کی رائے کے خلاف کہنے والا ہے' تو وہ آپ کو مشورہ دے رہا ہے' مگر آپ کی پسند اور منشاء کے ساتھ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ صرف خیر خواہی چاہتے ہیں' آپ ہمیشہ صالح اور مصلح رہے ہیں اور آپ کے دل میں دنیا کی کسی چیز کی حسرت نہیں ہے[۴]۔ اس طرح انہوں نے صدیق اکبرؓ کو یہ بات سمجھا دی کہ لوگوں کا اختلاف فطری اور معنوی نوعیت کا ہے' یہ کوئی بہت بڑا سنگین معاملہ نہیں ہے' جس کو بہت زیادہ محسوس کیا جائے اور اختلاف رائے رکھنے والے لوگ بھی بداعتمادی کا اظہار نہیں کر رہے' بلکہ محض اپنے محسوسات بیان کر رہے ہیں' ورنہ صدق دل سے ہر فیصلے

---

(۱) سعد ۳: ۲۹۱' طبری ۲۲: [illegible] کنز ۷: ۱۳۴ (۲) سیرۃ ۲: ۲۸۰' [illegible] ۲۳ منتخب ۲: ۲۷۹ (۳) طبری ۲: ۱۳۷۰' [illegible] ۴: ۲۲۹ [illegible] (۴) طبری ۲: ۱۳۷' [illegible] ۴۳

کی وہ بھی اطاعت کریں گے۔ اس جواب سے حضرت ابو بکرؓ کے ذہن کا بوجھ ہٹا ہو گیا اور ان کی پریشانی کافی حد تک دور ہو گئی اور ایک مرتبہ پھر انہوں نے عوام سے مخاطب ہونے کا فیصلہ کیا۔ عاصم بن عدی کہتے ہیں کہ اپنی بیماری کے زمانے میں اندھیروں میں ابو بکرؓ نے مجمع عام میں ایک تقریر ارشاد فرمائی جو ان کی آخری تقریر تھی۔ اس کے خاص نکات یہ ہیں "دنیا سے مجتنب رہو اور اس پر اعتماد مت کرو اس لئے کہ دنیا دھوکا ہے۔ دنیا پر عقبیٰ کو ترجیح دو اور آخرت اور عقبیٰ کو اپنا مطمع نظر بناؤ۔ دنیا اور آخرت دونوں کی محبتیں ایک دوسرے کی ضد میں امت کو جو مسائل درپیش ہیں ان کے حل کیلئے ہمیں ہمیشہ نبی علیہ اسلام کے اسوہ کو اپنا رہنما بنانا پڑے گا۔ رہا زمام کار اور حکومت سنبھالنے کا مسئلہ تو ظاہر ہے اس کا مستحق ایک ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے جو قوی الارادہ اور طاقتور ہو اور جسے اپنی ذات پر پورا اور مکمل قابو ہو اور جہاں سختی کا موقع ہو وہاں اس سے زیادہ شدید کوئی نہ ہو اور جہاں نرمی کا محل ہو وہاں اس سے زیادہ نرم کوئی دوسرا نہ ہو۔ وہ عقلاء اور خردمند اشخاص کی بات مانے اور لایعنی اور بے کار اور غیر ضروری چیزوں سے اجتناب برتے مصائب اور مسائل کے روبرو حزن و عاجزی نہ دکھائے سیکھنے اور جاننے سے گریز نہ کرے۔ جو چیزیں مدیبی اور لازمی ہیں ان پر متحیر نہ ہو۔ مسائل پر پوری گرفت پاسکے اور کسی معاملے میں بھی حد اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔ ظلم و ستم سے گریز کرے اور مسائل سے باخبر ہو۔ ایسا شخص عمر بن الخطابؓ ہے[1]۔"

صدیق اکبرؓ کی یہ تقریر بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ابتداء میں تو انہوں نے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ تمام اختلافات و انتشار دنیوی زندگی کو مطمع نظر بنانے سے پیدا ہوتا ہے اس لئے اس سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں اسوہ نبوی ﷺ ہی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے بعد ازاں انہوں نے ان تمام صفات کا ذکر کیا جو مسلمانوں کے خلیفہ کے اندر ہونا ضروری ہیں۔ اس طرح انہوں نے اہلیت کا ایک جامع معیار پیش کر دیا جس پر سیاسی معاملات کی پر پیچ راہوں میں قیادت کرنے والی شخصیت کو جانچنا چاہئے۔ یہ وہ صفات ہیں جو دین کے ساتھ گہری وابستگی اس کے شعور اور اخلاق و کردار کی پختگی کے علاوہ ہیں کیونکہ وہ تو بنیادی شرط ہیں۔ حضرت عمرؓ کی خداداد صلاحیتوں کا اس سے زیادہ جامع نقشہ اور اس سے بڑا اعتراف ہمیں اور کہیں سے نہیں ملتا۔ مجمع عام میں جب انہوں نے پوری ذمہ داری کے ساتھ ان کا ذکر کیا تو وہ سب لوگ جو ابھی تک کبیدہ خاطر اور متذبذب تھے وہ بھی ان کی خلافت کے بارے میں یکسو اور مطمئن ہو گئے۔ مزید انہوں نے اس بات کو وضاحت کرنے کی بھی ضرورت محسوس کی کہ یہ عظیم منصب خاندانی اور موروثی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی امانت ہے جو کسی اہل تر شخص ہی کے حوالے ہو سکتی ہے جسے لوگوں کی اکثریت بھی قبول کرنے کیلئے تیار ہو خود ان کے تقرر کی بنیاد بھی رفاقت و دوستی نہیں بلکہ اہلیت و استعداد ہے۔

ابوالسفر کی روایت ہے کہ ابو بکرؓ نے اپنے گوشے سے جھانکا اسماء بنت عمیس جن کے ہاتھ گودے ہوئے تھے آپ کو پکڑے ہوئے تھیں۔ آپ نے کہا "لوگو میں جس شخص کو تم پر خلیفہ بناتا ہوں کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کیونکہ میں نے اس کے متعلق غور کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور نہ میں نے اپنے کسی قرابت دار کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے عمرؓ بن الخطاب کو تمہارا خلیفہ بنایا ہے تم ان کا حکم سنو اور ان کی اطاعت کرو۔ یہ سن کر سب نے کہا ہم بسر و چشم منظور کرتے ہیں اور ہم ان کی اطاعت کریں گے[2]۔ حضرت علیؓ نے فرمایا "ہم تو اس وقت راضی ہوں گے جب خلیفہ عمر بن خطابؓ ہوں گے[3]۔" مسلمانوں کے اس اتفاق و اجماع سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مکمل اور دلی راحت و تسکین حاصل ہو گئی۔ وہ سارے تقاضے پورے ہو چکے تھے جو اسلامی احکام کی روح کے مطابق انعقاد خلافت سے قبل ہونے ضروری تھے۔ چنانچہ انہوں نے چپکے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی خوابگاہ میں بلوایا اور تخلیے میں انہیں اپنا وصیت نامہ لکھوایا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ ابو بکرؓ بن قحافہ کی دنیوی زندگی کا آخری اور اخروی زندگی کا پہلا عہد ہے۔ میری دنیوی زندگی کا انجام آپہنچا ہے اور میں ایک ایسی منزل میں داخل

---

(۱) حوران ۶۹:۱ (۲) یعقوبی ۲/۱۳۷، طبری ۳: ۴۲۸، طبری ۲: ۱۹۲ (۳) طبری ۲: ۷۰

داخل ہو رہا ہوں، جہاں پہنچ کر کافر اور فاجر بھی ان حقائق کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جن سے وہ تمام عمر انکار کرتا رہتا ہے۔ یہ ایسی منزل ہے کہ حقیقتیں عیاں ہو جاتی ہیں اور منکر کو بھی حق کی تصدیق کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ میں نے عمر بن الخطاب ؓ کو اپنے بعد تمہارے لئے خلیفہ مقرر کیا ہے ان کی اطاعت اور فرمانبرداری تمہارا فرض ہے۔ اس معاملہ میں میرے پیش نظر اللہ، رسول ﷺ، اسلام اور میری اپنی ذات کی بھلائی مقصود تھی، تاکہ میں ایک عظیم شخصیت کو حکمرانی سونپ کر اللہ کے یہاں ماجور ہوں۔ اب اگر عمرؓ عدل وانصاف کریں گے، تو یہ میری توقع کے مطابق ہوگا لیکن اگر وہ میرے گمان کے خلاف عمل پیرا ہوتے ہیں، تو بہر حال ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا۔ میری نیت تو ظاہر ہے صلاح وفلاح کی تھی اور میں غیب کا علم نہیں رکھتا، پھر ظلم کرنے والوں کو بہت جلد یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس جانب چل پڑے ہیں۔ اللہ کی رحمتیں ہوں اس کی برکتیں امت کے ساتھ رہیں [۱]۔ "زید بن اسلم نے اپنے والد سے روایت کیا ہے "ابو بکرؓ کے جانشین خلیفہ کیلئے فرمان عثمان بن عفانؓ نے لکھا تھا۔ فرمان لکھتے وقت ابو بکر صدیقؓ نے جانشین کے نام کی جگہ خالی رکھی تھی۔ اسی اثناء میں صدیق اکبرؓ بے ہوش ہو گئے۔ "عثمان رضی اللہ عنہ نے حالت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے خالی جگہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسم گرامی سے پر کردیا۔ خلیفۃ الرسول ہوش میں آئے، تو کہا کہ مجھے وصیت نامہ دکھایا جائے۔ وصیت نامہ میں عمرؓ کا نام دیکھتے ہی پوچھا "یہ کس نے لکھا؟" اور جب عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا "میں نے۔" تو فرمایا "اللہ تم کو اپنی کرم گستری سے نوازے، تم نے بہت صحیح نام لکھا اور تم خود اپنا نام بھی لکھ لیتے، تو یہ بالکل صحیح اور موزوں ہوتا۔ اس لئے کہ تم بھی اس منصب کی پوری اہلیت رکھتے ہو [۲]۔" جب یہ کام ہو چکا تو انہوں نے سوچا کہ اب فاروق اعظمؓ کو اعتماد میں لیں اور انہیں ساری صورت احوال سے آگاہ کریں، تاکہ وہ زندہ حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے آئندہ کیلئے اپنے طرز عمل کو استوار کریں۔ ابو بکر بن سالم نے بیان کیا کہ "ابو بکرؓ نے جب اپنا وصیت نامہ لکھوایا تو انہوں نے حضرت عمرؓ کو بلوایا اور ان پر یہ بات واضح کردی کہ کچھ لوگ انہیں ناپسند کرتے ہیں اور کچھ پسند کرتے ہیں اور یہ بھی کہہ دیا کہ کبھی کبھی اچھوں سے بھی بغض و عناد ہو جاتا ہے اور بروں اور برائیوں سے محبت کی جانے لگتی ہے۔" حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا کہ "مجھے خلافت کی کوئی حاجت نہیں ہے۔" حضرت ابو بکرؓ نے فوراً فرمایا کہ "خود خلافت کو تمہاری حاجت ہے [۳]"۔ "اس طرح انہیں آخر کار ذمہ داری کے اس بوجھ کو اٹھانے کیلئے تیار کر لیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مہر صدیقی سے مزین یہ فرمان لے کر باہر نکلے، ان کے ہمراہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت اسیدؓ بن سعد القرظی بھی تھے [۴]۔ اور ساتھ ہی حضرت ابو بکرؓ کے غلام جن کا نام شدید تھا، وہ بھی باہر مجمع انتظار کر رہا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھ میں اس وقت کھجور کی ایک چھڑی تھی، انہوں نے اس کے ذریعے لوگوں کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا [۵]۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "کیا تم اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہو، جو اس فرمان میں ہے؟" سب لوگوں نے کہا "جی ہاں!" اکثر لوگوں نے جان لیا کہ اس میں کسی کا نام درج ہے [۶]۔ حضرت قیسؓ بن ابی حازم کے بقول اس فرمان کی تفصیل حضرت ابو بکرؓ کے غلام سے پڑھ کر سنائی۔ بعد ازاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے اور تمام لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی [۷]۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ "تین افراد کی فراست اور ہوش مندی کی کوئی مثال نہیں یعنی ابو بکرؓ کی فراست اور دانائی کی، عمر رضی اللہ عنہ کے انتخاب میں، بنت شعیب علیہ السلام کی فراست کی، اس بات کے کہنے میں کہ بابا نہیں (موسیٰ علیہ السلام کو) ملازم رکھ لیجئے اور یوسف علیہ السلام کے ولی نعمت کی فراست کی، جس نے ان کے تقدس اور ان کی جلالت شان کو خوب سمجھا تھا [۸]۔

---

(۱) سعد ۳: ۲۰۰، جوزی ا: ۵۱، سیوطی ا: ۸۲ (۲) سعد ۳: [illegible] ۲ طبری ا۱ ۳: ۴۲۹، جوزی ا: ۵۰، اثیر ۲: ۲۹۲ (۳) جوزی ا: ۵۴، یعقوبی ۲: ۱۳۷ (۴) سعد ۳/ ۲۰۰ (۵) جوزی ا: ۴۹ (۶) سعد ۳/ ۲۰۰ (۷) جوزی ا: ۴۹، سعد ۳: ۲۰۰ (۸) جوزی ا: ۵۲، سیوطی ا: ۸۳۔

بیعت ہو جانے کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کو تنہائی میں بلایا اور انہیں بیش قدر نصیحتیں کیں' بقول حضرت زید رضی اللہ عنہ وہ حسب ذیل ہیں

"میں تم کو چند نصیحتیں کرتا ہوں' اگر تم ان پر کاربند ہو سکو' اللہ کے کچھ حقوق ہیں' جو کہ دن میں ادا ہوتے ہیں' تو وہ رات میں انہیں قبول نہیں کرتا اور اگر وہ رات کیلئے ہیں تو وہ دن میں انہیں قبول نہیں کرتا۔ اگر فرائض ادا نہیں ہوتے' تو نوافل بے کار ہیں۔ قیامت کے دن میزان میں اسی کے اعمال وزنی ہوں گے' جس نے اس دنیا میں حق کی پیروی کی ہے۔ اسی طرح میزان ہلکی اسی شخص کے اعمال کو سبک قرار دے گی' جس نے باطل کی اتباع کی ہے۔ میزان صرف حق کو قبول کرے گی' باطل کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت کے اعمال صالحہ کو در خور اعتنا قرار دے گا اور انہی اعمال کی بنیاد پر انہیں فردوس کی نعمتوں سے نوازے گا اور اہل دوزخ کو ان کے بدترین اعمال کی بنیاد پر جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور ان اعمال شنیعہ کے باعث ان کے اچھے کام بھی رائیگاں جائیں گے۔ اللہ نے آیات قرآنی کے ذریعے ترغیب بھی دی ہے۔ ترہیب بھی کی ہے' یعنی جنت کی طرف مائل بھی کیا ہے اور جہنم سے ڈرایا بھی ہے۔ اللہ سے ہمیشہ کی تمنا کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ یعنی اپنی خودی کی پاسبانی کرو' تم میری ان نصیحتوں پر عمل پیرا ہو گے' تو موت جس سے یوں بھی کوئی مفر نہیں۔ تمہارے لئے بے حد خوشگوار اور محبوب ہو جائے گی اور اگر (خدا نخواستہ) تم نے میری بات کو ضائع کر دیا' تو یہی موت' جس پر کوئی بھی قابو نہیں پا سکتا' تمہارے لئے بے حد ناگوار اور مکروہ شے بن جائے گی[1]۔"

حضرت ابو بکر بن سالم کے مطابق مذکورہ باتوں کے علاوہ یہ بھی شامل تھیں "تم نے رسول اللہ ﷺ کی صحبتیں اٹھائی ہیں۔ تم نے دیکھا کہ سردار نے کس کس طرح ہماری خاطر ایثار کیا ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ ہمیں آقا کے بخشے ہوئے عطیہ سے ہی ان کے متعلقین کی خدمت کرنی پڑی ہے۔ تم نے یہ سب حیرت انگیز اور ملکوتی باتیں دیکھ رکھی ہیں۔ تم نے مجھے بھی خوب برتا ہے اور میرا طرز عمل سمجھا ہے' جو اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ میں سردار ﷺ کی کامل اتباع کروں اور ان کے نقش قدم پر چلوں۔ تمہارا ہر خواب ایک بشارت تھا اور تمہارا ہر قیاس ایک حقیقت تھا۔ بہر حال تمہیں یہ بار سنبھالنا ہو گا اور میں راہ آخرت اختیار کر رہا ہوں۔ "سب سے پہلی چیز جس سے تم کو ہوشیار رہنا ہے' وہ تمہاری اپنی ذات ہے (یعنی حاکم کو اپنی ذات پر پورا قابو ہونا چاہئے) اسی طرح تم کو قوم سے بھی چوکنا رہنا پڑے گا۔ قوم کی آنکھیں نگران ہیں اور وہ سب سے زیادہ اس پر متعجب ہوں گی کہ تم مرعوب ہو گئے اور تم نے سپر ڈال دی۔ زنہار کہ ایسا ہونے پائے یاد رکھو جب تم اللہ اور اللہ والوں سے خائف رہو گے' قوم بھی تمہارا ہر بات تسلیم کرتی رہے گی۔ یہی میری وصیت ہے' یہی میری تلقین ہے' میرا اسلام قبول کرو[2]۔"

تاریخ سے ثابت ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اپنے پیش رو اور اپنے ساتھی و رفیق کی ان مخلصانہ نصیحتوں پر حرف بہ حرف عمل کیا' جس طرح ان کی زندگی میں ان کا حق رفاقت ادا کیا' اسی طرح ان کی وفات کے بعد بھی ان کی متعین کردہ راہ عزیمت و استقامت پر گامزن رہے۔ ان کی تمام توقعات پر پورا اترے' ان کے سہانے خوابوں کی عملی تعبیر پیش کی۔ زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی اجتہادی بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے بدلتے ہوئے حالات و ضروریات کے مطابق منظم کیا' اپنی سیاسی حکمت عملی کے ذریعے اسلامی ریاست کو دنیا کی سب سے بڑی منظم اور فلاحی ریاست بنا کے چھوڑا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب اپنے اس آخری بڑے کارنامے کو سرانجام دے چکے اور اپنے جانشین کو تمام ضروری نصیحتوں سے نوازنے کے فارغ ہوئے' تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے رب کے حضور پھیلا دیئے اور زندگی کی آخری دعا کی۔ "اے اللہ میری نیت میں اس (فرمان) سے صرف ان لوگوں کی نیکی ہے۔ میں نے فتنے کا اندیشہ کیا' اس لئے ان لوگوں کے معاملے میں وہ عمل کیا' جس کو تو خوب جانتا ہے۔ ان کیلئے میں نے اپنی رائے سے اجتہاد کیا' میں نے ان پر ان کے سب سے بہتر' سب سے قوی تر اور سب سے زیادہ راہ راست پر چلانے کے خواہشمند

---

(۱) طبری ۲:۵۲۶' اثیر ۲:۲۹۲ (۲) طبری ۴:۵۴۹ (۳) طبری ۴:۵۴۱

کو والی بنایا۔ میرے پاس تیرا حکم وہ آ گیا ہے، میرے بعد بس تو ہی ان کا مالک و نگران ہے کیونکہ وہ تیرے بندے ہیں اور ان کی پیشانیاں تیرے قبضے میں ہیں۔ اے اللہ ان لوگوں کیلئے ان کے والی کی اصلاح کر، اسے اپنے خلفائے راشدین میں سے بنا، جو تیرے نبی رحمت ﷺ کی راہ ہدایت اور ان کے بعد صالحین کی راہ ہدایت کی پیروی کرے اور اس کیلئے بھی اس کی رعیت کی اصلاح فرما دے[۱]۔" اس دعا کا ایک ایک جملہ خلوص و خیر خواہی کا مرقع ہے۔ جس اجتہاد کا اس میں انہوں نے ذکر کیا ہے، وہ اپنی موجودگی میں خلیفہ کے تقرر کا اجتہاد ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ کی نمایاں خوبیوں پر خود اللہ ہی کو گواہ بنایا ہے۔ اس کے بعد خلیفہ اور رعایا دونوں کی اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی ہے۔ یہ دعا صدیق اکبرؓ کی قلبی کیفیات کی خوب جھلک پیش کرتی ہے۔

ان کی بے غرضی و بے لوثی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پوری طرح مستحق و اہل ہونے کے باوجود خلافت کے منصب جلیلہ کے ذرا برابر بھی خواہشمند نہیں رہے۔ وہ اسے بھاری ذمہ داری سمجھتے تھے، جو حاصل کرنے والوں کیلئے پھولوں کی سیج نہیں، بلکہ کانٹوں کا بستر تھا۔ وفات سے قبل فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو اگر میں نہ کرتا تو بہتر تھا۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ کاش میں بنی سقیفہ کے روز اس امارت کو دو میں سے کسی ایک شخص کے گلے میں ڈال دیتا۔ ان کا اشارہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کی طرف تھا۔ ان دونوں میں سے ایک امیر ہوتا اور میں اس کا وزیر ہوتا[۲]۔

اس روایت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قائدانہ صلاحیت کے پہلے ہی سے معترف تھے۔ ان کی ایک اور خوبی جس کی صدیق اکبر کے ہاں بہت زیادہ قدر و منزلت تھی، وہ سپاہیانہ جرأت و استعداد تھی۔ وہ اچھی طرح باخبر تھے کہ ان کا معتمد ترین ساتھی اور مشیر و وزیر جس طرح علم و فن، فہم و فراست، فقہ و اجتہاد اور سیاست و انتظام کا ماہر ہے، اسی طرح حرب و ضرب کے میدان کا بھی شہسوار ہے۔ اگر دار الخلافہ میں امور مملکت اور روزمرہ کے معاملات و مسائل میں انہیں ان کا کوئی اور ثانی میسر ہوتا، تو انہیں میدان جہاد میں اتار دیتے کیونکہ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ دنیا کے دور دراز گوشوں میں بھی خدا کی حاکمیت کا ڈنکا بجے اور اسلام کا پھریرا لہرائے۔ انہوں نے اپنے مختصر عرصہ خلافت کو اسی لئے جہاد و فتوحات کیلئے وقف کر دیا۔ انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عسکری ذوق و تجربے سے وہ بھرپور فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ چنانچہ وفات سے قبل ارشاد فرمایا "تین چیزیں ایسی ہیں، جو مجھ سے چھوٹ گئی ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ کاش جب میں نے خالد بن ولید کو شام کی طرف بھیجا تھا، اس وقت عمرؓ ابن خطاب کو عراق کی طرف بھیج دیتا، تو میرے دونوں ہاتھ اللہ کی راہ میں پھیل جاتے، یہ کہہ کر انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے[۳]۔

بہرحال حضرت عمر فاروقؓ کو خلیفہ بنانے کے سلسلے میں جو ان کی رائے تھی، اس میں ان کی جنگی حکمت عملی اور جہاد و فتوحات کی اس پالیسی کا گہرا دخل تھا، جس کو جاری رکھنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ انہیں یہ یقین تھا فاروق اعظم اسے پوری مہارت و کامیابی سے آگے بڑھائیں گے۔ اگرچہ وہ ابتداء میں معقول دلائل کی بنا پر اس سے اختلاف رکھتے تھے، جیسا کہ لشکر اسامہ اور مانعین و مرتدین کے خلاف مہمات سے قبل انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا، لیکن جب اس کے انتہائی خوشگوار نتائج سامنے آئے تو انہیں شرح صدر حاصل ہو گیا کہ اسلام کی سربلندی و سرفرازی کا واحد راستہ جہاد ہی ہے۔ چنانچہ فتنہ ارتداد کے دبانے اور جزیرہ نمائے عرب کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دینے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے عراق و شام کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا، تو حضرت عمرؓ نے اپنی تمام تر توانائیں تائید و حمایت میں صرف کر دیں اور لوگوں کے دلوں سے ان دونوں قوتوں کا خوف ختم کر کے انہیں جذبہ جہاد سے سرشار کر دیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مرض نے جب سے شدت اختیار کی تھی اور ان کیلئے باہر مسجد میں جا کر نماز پڑھنا مشکل ہو گیا تھا، تو حضرت عمرؓ ہی کو حکم دیا کرتے تھے

---

(۱) سعد ۳/۲۰۰، جوزی: ۴۹ (۲) یعقوبی: ۲/۱۳۷، طبری: ۳/۴۳۰ (۳) بلاذری: ۱۱۶، یعقوبی: ۲/۱۳۷، طبری: ۳/۴۳۱

کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں(۱)۔ جس دن حضرت عمر فاروقؓ کی بیعت ہو گئی اور اپنی سب سے بڑی ذمہ داری سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو چکے تو چند نصائح اور دعا کے بعد ام المومنین اور دختر نیک اختر عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ "آج کیا دن ہے؟" انہوں نے کہا "دو شنبہ۔" پوچھا "رسول اللہ ﷺ کی وفات کس دن ہوئی تھی؟" انہوں نے جواب دیا "دو شنبے کو۔" تو فرمایا کہ میرے اور رات کے درمیان موت کا فاصلہ ہے(۲)۔ بالآخر یہی ہوا غروب آفتاب کے بعد ان کی مقدس روح مالک حقیقی سے جا ملی اور فاروق اعظمؓ ہی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور اسی رات ہی کو ان کے جسد خاکی کو سرور کونین ﷺ کے پہلو میں دفن کر دیا(۳)۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون!"

دفنا کر جب فارغ ہوئے تو لوگوں سے مخاطب ہو کر سب سے پہلی جو بات انہوں نے کہی وہ یہ تھی "عربوں کی مثال ایسی ہے جیسے نکیل میں بندھا ہوا اونٹ جو اپنے قائد کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے لہٰذا قائد کو چاہئے کہ سوچ سمجھ کر قیادت کرے۔ رب کعبہ کی قسم! میں ضرور انہیں سیدھے راستے پر لے کر چلوں گا(۴)۔"

حضرت عمر فاروقؓ کا عربوں کی نفسیات و رویے کے بارے میں یہ تجزیہ بصیرت افروزی کی علامت ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ سالہا سال سے مروجہ قبائلی نظام نے ان کے مزاج کو بنیادی طور پر اطاعت کوشی کا عادی بنا دیا۔ نظام جاہلیت نے انہیں حق و صداقت کے ہمہ گیر و ابدی معیار سے بیگانہ کر کے ہر صحیح و غلط میں سردار و قبیلہ کی پیروی کا خوگر بنائے رکھا ہے۔ اس لئے ان کے بھٹکنے یا انہیں راہ راست پر رکھنے کا اصل ذمہ دار قائد ہی ہوتا ہے۔ ان کا یہ کہنا ان کے مثبت انداز فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے نزدیک لوگوں کا یہ جذبہ اطاعت ان کی بہت بڑی خوبی تھی' جسے نظم و ضابطے کا پابند بنا کر ایک منظم اور فلاحی معاشرے کے قیام کیلئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے لوگوں کی خامیوں اور کوتاہیوں کا الزام انہیں پر دھر کے مستقبل کو مایوسیوں کے حوالے کرنے کے بجائے اصلاح کے چیلنج کو خود قبول کیا اور انتہائی پر عزم لہجے میں انہیں راہ راست پر چلائے رکھنے کا اعلان کیا۔ حضرت عمرؓ کے اس مختصر سے قول نے ان کے نصب العین کا تعین کر دیا اور لوگوں کو بھی یہ پیغام دے دیا کہ اب عمرؓ کا دور حکمرانی شروع ہو چکا ہے اب اپنے آپ کو ٹھیک کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ شدت و سختی کے اعتراضات سے وہ کسی قسم کے دباؤ میں نہیں آئے کہ اب وہ مداہنت پر اتر آئیں۔ یہی وہ ابتدائی تاثر تھا جس کو فاروق اعظمؓ نے بڑے حکیمانہ انداز میں برقرار رکھا اور آنے والے وقتوں میں عملی طور پر سے سچ کر دکھایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے لوگ بھی تنہائی میں کوئی جرم کرتے وقت ان سے خوفزدہ رہتے تھے۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خلافت کی تقرری کے تمام مراحل میں حضرت عمر فاروقؓ ہمیں کہیں بھی سرگرم عمل نظر نہیں آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس منصب کے نہ تو خواہش مند تھے اور نہ اس کیلئے تیار۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انہیں استصواب رائے میں شامل نہ کیا' تاکہ لوگوں کی آراء سے آزادانہ طور پر آگاہ ہو سکیں اور لوگوں کو بھی اپنے تاثرات بیان کرنے میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو' جب بات کھل کر عام مشاورت میں آ گئی' تو ظاہر بات ہے کہ حضرت عمرؓ کو لوگوں کی ان سے جو سختی کی شکایت تھی اس کا علم ہو گیا ہو گا۔ مگر انہوں نے اس موقع پر بھی کسی قسم کی مداخلت نہ کی اور نہ ہی اپنے حق و صفائی میں کوئی جملہ کہا کیونکہ وہ بے لوث و بے غرضی کے پیکر تھے۔ وہ یہ پسند کرتے تھے کہ لوگ کھل کر اس معاملے پر غور و خوض کریں اور پورے اتفاق و یکسوئی سے جس نتیجے پر بھی پہنچیں' وہی اسلام اور مسلمانوں کیلئے مفید ہو گا۔ انہیں یہ اعتماد تھا کہ صدیق اکبرؓ یہ معاملہ خود ہی خوش اسلوبی سے طے کر لیں گے۔ ان کا اپنا نام کیونکہ زیر غور تھا اس لئے ان کی دانشمندی و فراست نے انہیں بجا طور پر بے نیازی و غیر جانبداری کا رویہ اپنانے پر آمادہ کیا کیونکہ اسی میں امت مسلمہ کی بھلائی تھی۔ اگرچہ وہ اس کے خواہشمند نہیں تھے' مگر کھل کر انکار کر دیتے تو مسلمان مشکلات میں پڑ جاتے اور ایک بحران پیدا ہونے کا خطرہ در پیش ہوتا۔ اس لئے انہوں نے علیحدگی ہی میں صدیق اکبرؓ سے یہ گزارش کی کہ انہیں اس منصب سے معذور رکھا جائے' لیکن جب ان پر ذمہ داری ڈال دی گئی تو انہوں نے اسے پورے شعور سے سنبھالا اور تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کر کے اس کا حق ادا کر دیا اور عملی طور پر صدیق اکبرؓ کی اس بات کو سچ کر دکھایا کہ ان حالات میں خلافت ہی ان کی ضرورت مند تھی۔

---

(۱) سعد ۳: ۲۰۲، اثیر ۲: ۲۸۸ (۲) سعد ۳: ۲۰۲ (۳) سعد ۳: ۲۰۹، یعقوبی ۲: ۱۳۸، صبرحوالہ ۳: ۴۲۳ (۴) طبری ۳: ۴۳۳، اثیر ۲: ۲۹۳

باب چہارم

بصیرت عمرؓ اور قرآن حکیم

☆۔ الہامی طبیعت
☆۔ موافقات قرآنی
☆۔ تعلق بالقرآن

○..... الہامی طبیعت:

حضرت عمر فاروقؓ جب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، تو آپ کی وہ فہم و فراست جو عہد جاہلیت میں طرۂ امتیاز تھی دین کی سمجھ اور اجتہادی بصیرت میں تبدیل ہوگئی۔ ہجرت کے بعد آپ کی طبیعت کا الہامی جوہر زیادہ کھل کر سامنے آتا گیا جو قرآن حکیم اور معلم انسانیت کی صحبت و فیض کا نتیجہ تھا۔ وہ علم جسے آنحضور ﷺ نے اپنے سچے خواب میں پیالے کے طور پر آپ کے حوالے کیا تھا[1] وہ محدثانہ شان میں بدل گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قد کان یکون فی الامم قبلکم محدثون فان یکن فی امتی منھم احد فان عمر بن الخطاب منھم[2]۔" (تم سے پہلے اگلی امتوں میں محدث ہوا کرتے تھے اگر میری امت میں ایسا کوئی ہو تو وہ عمرؓ بن خطاب ہوں گے۔)

امام مسلم اس حدیث کو رقم کر کے لکھتے ہیں کہ ابن وہبؒ نے "محدثون" کی تفسیر میں لکھا ہے "ملھمون" یعنی جن پر الہام ہوا کرتا ہے، جن کی رائے ٹھیک اور جن کا گمان صحیح ہوتا ہے[3]۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کے مراد وہ لوگ ہیں جن سے فرشتے باتیں کریں اور وہ جن کی زبانوں پر صحیح بات جاری ہو[4]۔ امام ترمذی یہی حدیث رقم کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ مجھے سفیان بن عیینہ کے بعض اصحاب نے خبر دی ہے کہ "محدثون" کے معنی ہیں "ملھمون" یعنی جنہیں دین کی خاص سمجھ یا فہم عطا کیا گیا ہو[5]۔ امام بخاری نے یہی حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے اور اس واسطے سے اس میں یہ الفاظ زائد لکھے ہیں "لقد کان فیمن کان قبلکم من بنی اسرائیل رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن من امتی منھم احد فعمر[6]۔" (تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن سے فرشتے باتیں کیا کرتے تھے اس کے بغیر کہ انبیاء ہوں۔ اگر میری امت میں کوئی ایسا ہو تو وہ عمرؓ ہوسکے گے۔)

محدث و ملہم کون ہوتا ہے؟ اس بارے میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں "وہ شخص جس کو فراست صادقہ عطا کی گئی ہو اور اس کی عقل و فہم کو حظیرۃ القدس سے تائید کی جاتی ہو جو یہاں تک کہ تحری میں اکثر اصابت کرتا ہو اور یہ ان امور میں واقع ہوا ہے کہ جن میں صحابہؓ سے آنحضرت ﷺ کے مشورہ لینے کے بعد وحی نازل ہوئی اور اس صورت میں یہ کسبہ حاصل کرنے والا آنحضرت ﷺ کا طفیلی ہوتا ہے۔ مگر قرب و منازل میں اسے ایک مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور اس کی مثال اس طرح پر ہے کہ ایک بادشاہ اپنے وزیر سے مشورہ کرتا ہو اور جو خادم وزیر دور سے بادشاہ کے اشارات و ارشادات کو دیکھتا اور سنتا ہو اور قبل اس کے بارے میں ان اشارات و ارشادات کو بیان کرے وزیر ان سے آگاہ ہوگا۔ اس مقام کا نام محدثیت ہے اور اس مقام کے لوازم سے یہ امر ہے کہ وحی بارہا اس کے اجتہاد کے موافق نازل ہوئی۔ پس بدیں وجہ جب وہ بظن غالب کسی امر کے متعلق جو کچھ خیال کرتا ہے اس کے مطابق ہی وقوع ہوتا ہے فیما بین الناس ممتاز و فائق ہوتا ہے[7]۔

ہجرت مدینہ کے بعد کرہ ارض پر خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر استوار ہونے والی ایک ریاست کی تاسیس ہوئی۔ قرآن نے اپنی دعوت کا رخ اور انداز تبدیل کر لیا اور اجتماعی مسائل کے بارے میں احکام اترنا شروع ہوئے۔ ایک طرف اسلامی ریاست کے تحفظ و بقاء کا مسئلہ تھا دوسری طرف اس کے نظم و استحکام کی ضرورت تھی اور تیسری طرف اجتماعی معاملات کو اس کے مقاصد کے سانچوں میں ڈھالنا۔ اس مرحلے پر سب نے اس بات کو محسوس کیا کہ بہت سے اہم مسائل

---

(1) بخاری ٤: ١٩٨، حبان ٩: ١٦، دارمی ٢: ١٢٨، ترمذی ٢: ٣٦٨، حاکم ٣: ٨٦، جوزی ٤: ٢٥ (2) بخاری ٤: ٢٠، مسلم ٧: ١١٥، ترمذی ٥: ٢٨٥، حبان ٩: ٢١، حاکم ٣: ٨٦، جوزی ٨: ... اثیر ٤: ٦٤ (3) مسلم ٧: ١١٥ (4) کرمانی ١٤: ٢٢٨ (5) ترمذی ٤: ٢٨٦ (6) بخاری ٤: ١٩٨ (7) ساطع ٢: ١٣۔

کے بارے میں حضرت عمرؓ جو کچھ سوچتے ہیں اور نبی محترم ﷺ کی خدمت اقدس میں جس طرح کی تجاویز و مشورے دیتے ہیں وحی الٰہی کم و بیش اسی کے مطابق نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں حضرت عمرؓ کی کثرت آراء موجود ہیں "ان فی القرآن لرایا من رای عمر[1]"۔ "حضرت مجاہدؒ کا بیان ہے آپ جب کوئی رائے دیتے تو قرآن مجید اسی کے مواقع نازل ہوتا۔" کان عمر اذا رای الرای نزل به القرآن(۲)۔" حضرت عبداللہ بن عمرؓ دیگر لوگوں سے تقابلی جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں "ما قال الناس فی شیء وقال فیه عمر الا جاء القرآن بنحو ما یقول عمر(۳)۔" آپ کی الہامی فکر و بصیرت بتدریج ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہی یہاں تک کہ اس کی شہرت اس قدر پھیل گئی کہ لوگ یہ ذکر کرنے لگے کہ آپ کی زبان پر فرشتہ نازل ہوتا ہے۔ بقول حضرت طارق بن شہابؓ "کنا نتحدث ان السکینة تنزل علی لسان عمر(۴)"۔ "حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے یہ بات کوئی تعجب خیز نہیں تھی کہ آپ کی زبان سے فرشتہ بولتا ہے "ما کنا نتعاجب اصحاب محمد ﷺ ان ملکا ینطق بلسان عمر[5]"۔"

رسول اللہ ﷺ سے بہتر آپ کی اس الہامی فکر اور اجتہادی بصیرت سے واقف اور کون ہو سکتا تھا؟ "حضور ﷺ کو معلوم تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام کے مزاج اور روح کی گہرائیوں تک اترنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں اور مسائل کو سطحی نظر سے دیکھنے کے بجائے وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں اور ان کے اثرات و نتائج کا ادراک دوسرے اصحاب سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا "لو کان نبی بعدی لکان عمر بن الخطاب[6]"۔ "اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے شمار اوصاف عطا فرمائے تھے ان میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں وصف دین کی سمجھ تھی اور اسی چیز نے آپ کو اسلامی تاریخ کا ایک عظیم ستون بنا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ کبار صحابہؓ میں سے عظیم مفسر و فقیہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب صالحین کا ذکر کیا جائے تو ضروری ہے کہ ان میں حضرت عمر فاروقؓ کا ذکر کیا جائے کیونکہ آپ ہم سب سے زیادہ کتاب اللہ کے عالم اور دین خدا کے فقیہ ہیں[7]۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ عمرؓ نہایت سبک فہم، تیز خاطر اور معاملہ فہم تھے[8]۔ آپ کی رائے بصیرت کی گہرائی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کئی مقامات ایسے آئے کہ دیگر لوگوں کی اور رائے تھی اور حضرت عمر فاروقؓ کی رائے اور تھی۔ ایسی صورتحال میں وحی الٰہی کے ذریعے حضرت عمر فاروقؓ کی رائے کی تائید کی گئی۔ تاریخ میں ان ہم آہنگیوں کو موافقات عمرؓ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر نبی آخرالزمان ﷺ نے فرمایا "یا عمر ان غضبك عز و رضاك حکم[9]" ۔ "اے عمر تمہارا غصہ عزت ہے اور تمہاری رضامندی حکم۔"

یہ دینی بصیرت ہی تھی کہ جس کی وسعتوں اور پنہائیوں سے نکلی ہوئی رائے جب زبان پر آتی ہے تو حق و صداقت کا سرچشمہ بن جاتی۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "ان اللہ وضع الحق علی لسان عمر یقول به[10]"۔ "(اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کی زبان پر رکھ دیا ہے وہ ہمیشہ حق کہا کرتے ہیں۔)" ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر و قلبه[11]"۔ "(اللہ نے عمر کی زبان اور دل پر حق جاری کر دیا۔) ایک روایت میں "یقول الحق" کے الفاظ بھی ہیں[12]۔ یہی حدیث کہ یہ بیان کرنے کے بعد حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں "جب کبھی لوگوں میں کوئی معاملہ درپیش ہوتا اور اس کے مطابق لوگوں نے کچھ کہا اور عمرؓ نے اس کے بارے میں کچھ کہا تو قرآن ضرور حضرت عمرؓ کے اشارے کے مطابق نازل ہوا[13]۔"

دین کے ساتھ حضرت عمر فاروقؓ کی وابستگی ہی میں ان کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ پیغمبر خدا نے ان کے دین کو قمیص سے تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ

(۱) سیوطی:۱۲۲ (۲) سیرہ ۱۲ ۲۷ سیوطی:۲۲ (۳) سیوطی:۱۲۲ متقی ۱۱ ۵۸ جوزی ۱ ۱۷ نبلا:۱۱/۶۳ (٤) سیرہ ۱۲ ۲۵ رجب ۳۳۷ (۵) شیبہ ۲ ۳٤۔
(٦) ترمذی ۵ ۲۸۱ حاکم ۸٦ جوزی ۲۳ ذہبی ۱ ٦ نبلا:٤ ٦٤ (۷) سیرہ ۱۲ ۳٦ سیوطی ۱ ۱۲۱ (۸) سیوطی ۱ ۱۲۰ (۹) شیبہ ۱۲ ۳۸ جوزی ۲۳ متقی ۱ ۵۷۸
(۱۰) ماجہ ۱ ٤ (۱۱) ترمذی ۵ ۲۸۰ سیرہ ۱۲ ۲۵ حبان ۹ ۲ حاکم ۳ ۸٦ ذہبی ۱ ٦ (۱۲) متقی ۱ ۵۸۰ (۱۳) سیوطی ۱ ۱۲۲ متقی ۱۱ ۵۸

کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "بینا انا نائم رایت الناس عرضوا علی و علیھم قمص فمنھا ما یبلغ الثدی ومنھا ما یبلغ دون ذلک و عرض علی عمر و علیہ قمیص اجترہ قالو افما اولتہ یارسول اللہ قال الدین[۱]۔" (ایک بار میں سو رہا تھا میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگ میرے سامنے لائے جاتے ہیں۔ بعض کے قیص تو اتنے اونچے ہیں کہ چھاتی تک پہنچتے ہیں اور بعض کے یہاں تک بھی نہیں پہنچتے۔ عمر جو لائے گئے تو ان کا قیص اتنا لمبا تھا کہ جس کو وہ کھینچ رہے تھے۔) صحیح مسلم میں "عرض علی عمر" عمر میرے سامنے لائے گئے کی جگہ "مر عمر" عمر آتے ہیں[۲]۔ اس حدیث کی تشریح میں امام نووی نے لکھا ہے کہ دین اور کُرتے میں مناسبت ہے۔ جیسے کرتا بدن کو چھپاتا ہے اور سردی و گرمی سے بچاتا ہے ویسے ہی دین روح اور دل کو محفوظ رکھتا ہے اور گناہ سے بچاتا ہے۔ تحفۃ الاخیار میں ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عمر کا دین نہایت کامل اور حد سے زیادہ تھا[۳]۔

فتح الباری میں ہے کہ قیص دنیا میں ستر پوشی کا ذریعہ ہے جبکہ دین آخرت میں عربوں کے ہاں قیص سے مراد پاکدامنی اور فضل و شرف ہے۔ ابن عربی کے نزدیک نبی ﷺ نے اس کی تاویل دین اس لئے کی ہے کہ دین جہالت کو چھپاتا ہے جس طرح کپڑا بدن کے ننگ کو چھپاتا ہے۔ ابو حمزہؓ کہتے ہیں کہ اس سے مراد دین کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونا ہے مثلاً احکام بجالانے کی حرص اور مناہی سے اجتناب وغیرہ اور حضرت عمرؓ کا مقام اس لحاظ سے بہت بلند تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی تعبیر اس کی ہیئت کی کمی بیشی کے لحاظ سے ہونی چاہئے کہ جس کے جو مناسب حال ہو وہی اس کی طرف منسوب کیا جائے گا مثلاً دین 'علم' جمال' بربادی وغیرہ[۴]۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی اجتہادی بصیرت' الہامی فراست اور دین کی سمجھ کا دارومدار کس چیز پر تھا؟ اس پر ہم جتنا غور کریں اور واقعاتی شہادتوں کا جس قدر تجزیہ کریں صرف ایک ہی نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ قرآن حکیم سے آپ کا گہرا تعلق   اس سرچشمہ بصیرت و فراست اور رشد و ہدایت سے آپ کی قلبی و فکری اور علمی و عملی وابستگی نے آپ کے اندر چھپے ہوئے خداداد جوہر کو تابندگی و درخشانی عطا کی۔ یہاں تک کہ کئی معاملات میں وحی الٰہی نے آپ کی موافقت کی۔

○...... موافقات قرآنی

قرآن حکیم سے اس گہرے تعلق نے آپ کے فہم و فراست کے اندر ایک الہامی شان پیدا کر دی' مدنی دور میں متعدد ایسے مواقع آئے' جن میں وحی الٰہی نے آپ کی موافقت کی۔ آپ کی اجتہادی بصیرت کے مستند و معتبر ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے۔ اس کے بعد دوسری بڑی دلیل سرور کونین ﷺ کے ارشادات ہیں' جن میں آپ کے علم اور بصیرت پر اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک "محدث" کا عظیم خطاب ہے۔ نبی محترم ﷺ نے مختلف انداز میں کئی مرتبہ عطا فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "انہ کان فیمن مضی رجال یتحدثون فی غیر نبوۃ. فان یکن فی امتی احد منھم فعمر[۵]"۔

تیسری بڑی دلیل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ آراء ہیں جو انہوں نے آپ کی بصیرت کے بارے میں ارشاد فرمائیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ کبار صحابہؓ میں سے بہت بڑے فقیہہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں "ماکنا نبعد ان السکینۃ تنطق بلسان عمر[۶]"۔ علاوہ ازیں صحابہ کرامؓ نے آپ کے

---

(۱) بخاری ۴/۲' ۱' مسند ۷ ۱۱۶' ترمذی ۳۶۸/۳' نسائی ۱۱۳/۶ ۱۱۳ مشکوٰۃ ۹ ۲ مرقی ۱۲۷/۲ مورد ۲۵۲ (۲) مسلم ۱۱۲/۷ (۳) مورد ۳۳۲ (۴) فتح ۱۱۶/۷ ۳۳۳

(۵) سیرہ ۱۲ ۲۲ ۱۱۴۸/۲ (۶) سیرہ ۲ ۲۲ عمرو ۲۲ ۱۱۴۹/۲ عید ۴۸۳

بیشتر جتہادی فیصلوں اور قرآن حکیم سے استنباط کیے ہوئے فرامین اور تفسیری کلمات کو اپنے لئے اطاعت و رہنمائی کا مستحق قرار دیا۔ چوتھی بڑی دلیل فقہاء کا آپ کے بصیرت فروز فقہی واجتہادی مسلک سے بھرپور استفادہ ہے جس کے تحت انہوں نے فقہ 'اصول فقہ اور بے شمار احکام و مسائل میں سے دلیل کے طور پر پیش کیا اور عملی مسائل پر اس کے اطلاق کیلئے اسے سمجھنے کی کوشش کی اور حسب ضرورت اس کی تاویل 'توجیہہ اور تشریح بھی کی۔ یہ سلسلہ قرون اولیٰ سے لے کر اب تک جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ موافقات قرآنی کی چار نوعیتیں ہیں۔

۱۔ آپ نے کسی مسئلے کے بارے میں کوئی رائے یا مشورہ دیا تو بعد میں وحی الٰہی کے ذریعے اس کی تائید کی گئی۔

۲۔ آپ کسی بارے میں خداوند دوالجلال کے کسی واضح حکم کے متمنی تھے اور اس کیلئے دعا مانگی تو اسے شرف قبولیت حاصل ہوا اور ایسا حکم نازل ہوا جو آپ ہی کے منشاء کے مطابق تھا یا آپ کی رائے کے موافق اس حکم میں صراحت کر دی گئی۔

۳۔ آپ نے اپنے اجتہاد کی بدولت کوئی عمل کیا اور آیت قرآنی کے ذریعے اس کی توثیق وتصدیق کی گئی۔

۴۔ بعض اوقات کسی بارے میں آپ کے منہ سے کچھ الفاظ نکلے اور بعد میں اسی طرح کے الفاظ وحی الٰہی کے ذریعے نازل ہوئے۔

○...... وحی بمطابق مشورہ

ان موافقات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ جنگ بدر کا فیصلہ :

آپ کی رائے کی تائید کی پہلی مثال ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے جنگ بدر کیلئے نکلنے کے بارے میں مشورہ طلب فرمایا تو حضرت عمر فاروقؓ نے نکلنے کا مشورہ دیا تب یہ آیت نازل ہوئی [1] "كما اخرجك ربك من بيتك بالحق وان فريقاً من المومنين لكارهون [2]۔" اس کا پس منظر یہ ہے کہ ہجرت کے دوسرے سال رسول اللہ ﷺ کے علم میں یہ بات آئی کہ اس وقت اہل قریش کا بہت بڑا سردار ابوسفیان بہت بڑے مال ومتاع کے ساتھ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام سے آ رہا ہے۔ چنانچہ آپ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا کہ تم لوگ کیا کہتے ہو کیا اس قافلے کی راہ روکنے کیلئے ہم نکل پڑیں۔ ممکن ہے کہ تم لوگوں کو بہت مال ودولت مل جائے۔ سب نے مل کر یہ کہا کہ ہاں ضرور چلنا چاہیے۔ اس وقت کچھ لوگوں کے پاس ہتھیار تھے کچھ نہتے تھے سب چل پڑے۔ ان کی تعداد بروایت ترمذی تین سو تیرہ تھی [3]۔ رسول خدا ﷺ تب چاہتے تھے کہ ایک طرف اہل قریش پر معاشی اور سیاسی دباؤ ڈالا جائے اور دوسری طرف یہ کہ مشرکین نے جن لوگوں کو گھروں سے نکل جانے پر مجبور کیا ہے ان کی کفالت کا بھی اہتمام ہو سکے۔

رسول اللہ ﷺ لوگوں کو لے کر نکلے دو روز بعد ایک مقام روحا تک پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ اہل مکہ قافلے کی مدد کیلئے ایک ہزار کا لشکر لے کر چل پڑے ہیں۔ اب آپ کے سامنے دو راستے تھے یا تو قافلے کو لوٹتے یا پھر لشکر کا مقابلہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ کو بتایا کہ دو میں سے ایک چیز تمہیں مل جائے گی۔ آپ ﷺ نے جب دوبارہ مشورہ کیا تو بہت سے لوگوں کی یہ رائے تھی اور اس پر انہوں نے مجادلہ بھی کیا کہ ہمیں آپ قافلے سے نمٹنے کیلئے لے کر نکلے تھے۔ ہم کو گمان بھی نہ تھا کہ ہمیں جنگ کرنا پڑے گی ورنہ ہم جنگ کیلئے تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ کچھ وہ لوگ تھے جو دل میں جنگ سے کراہت و ہچکچاہٹ رکھتے تھے اور خوفزدہ تھے '

---

(۱) سیوطی ۱۲۳ (۲) سورۃ الانفال ۸:۵ (۳) رملق ۳/۷۷ 'عروہ ۱۳۸

لیکن منہ سے کچھ نہ کہتے تھے۔ ایسے عالم میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بہت مدلل اور بھرپور تقریر کی اور بعد میں حضرت عمر فاروقؓ نے بھی بھرپور تقریر کی۔ ان کی یہ رائے تھی کہ کفار کے لشکر کا مقابلہ کیا جائے اور قافلے سے تعرض نہ کیا جائے۔ ان تقاریر کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیگر لوگوں نے بھی تائید کی۔ حضرت مقداد بن عمروؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کے ساتھ ہیں' خدا کا جو منشاء ہے اسے پورا کیجئے۔ خدا کی قسم ہم حضرت موسیٰ کی امت کی طرح نہیں ہیں کہ یہ کہیں "اذھب انت و ربك فقاتلا انا ھھنا قاعدون[1]۔" اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں برک الغماد (حبشہ یا یمن) بھی لے چلیں تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ سی طرح انصارؓ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے حضرت سعد بن معاذؓ نے بھی بھرپور تائید کی اور کہا یا رسول اللہ ﷺ آپ جہاں چاہیں تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچائی کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے' خدا کی قسم اگر سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر بھی آپ اس میں گھوڑا ڈال دیں تو ہم بھی اس میں کود پڑیں گے۔ ہم میں سے کوئی بھی ذرا بھی تامل نہ کرے گا کہ ہم لڑائیوں میں بہادری دکھانے والے اور مصیبتوں کو جھیلنے والے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری جانب سے آپ کو ایسے کارنامے دکھائے گا جن سے آپ مطمئن ہو جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اسی وقت کوچ کا حکم دیا اور فرمایا "رب نے دو میں سے ایک کا مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کیا عجب کہ وہ ایک یہی جنگ ہو۔ میں مشرکین کا مقتل ہیں سے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں[2]۔"

حضرت عمرؓ کی موافقات میں اسے اسی لئے شامل کیا جاتا ہے کہ آپ نے جنگ کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ ایک بہت اچھی تقریر بھی کی اور دیگر لوگوں کی رائے کو ہموار کرنے میں حصہ لیا۔ آپ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ وہ قریش ہیں اور ان کے معزز لوگ۔ اللہ تعالیٰ نے جب سے آپ کو نبوت کی عزت سے نوازا ہے پھر کسی قسم کی کوئی بے عزتی والی بات آپ کے حق میں ممکن نہیں رہی۔ وہ لوگ آپ سے ضرور لڑیں گے اس لئے آپ مکمل تیاری فرمائیں[3]۔ چنانچہ اسی مشورے پر عمل کیا گیا۔ وحی الٰہی کے ذریعے اس فیصلے کی ستائش کی گئی کیونکہ یہی اللہ تعالیٰ کا منشاء تھا کہ حق و باطل کے مابین پہلا مسلح مقابلہ ہو تاکہ حق کا کلمہ سر بلند ہو۔ حق و باطل کا فرق واضح ہو اور کافروں کی جڑ کٹ جائے اور ان کا گھمنڈ اور رعب خاک میں مل جائے۔ جیسا کہ بعد والی آیات میں ارشاد ہوا "کما اخرجك ربك من بيتك بالحق و ان فريقا من المؤمنين لكارهون يجادلونك في الحق بعد ما تبين كانما يساقون الى الموت وهم ينظرون واذ يعدكم الله احدى الطائفتين انها لكم وتودون ان غير ذات الشوكة تكون لكم و يريد الله ان يحق الحق بكلمته ويقطع دابر الكافرين ليحق الحق ويبطل الباطل ولو كره المجرمون[4]۔"

۲۔ اسیران بدر کا معاملہ:

اسی طرح آپ کے مشورے کے سلسلے میں تائید قرآنی کی دوسری مثال اسیران بدر کا معاملہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "جب ہم جنگ بدر میں کفار سے لڑے تو اللہ نے مشرکوں کو شکست دی اور ان میں سے ستر مارے گئے اور ستر قید ہوئے۔"

جنگ بدر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ' عمرؓ اور علیؓ سے مشورہ کیا کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "یا رسول اللہ ﷺ یہ لوگ ہمارے ہم عم بھائی اور خاندان والے ہیں لہٰذا میرے خیال میں آپ ان سے فدیہ لے لیں اور انہیں رہا کر دیں اس طرح فدیہ لینے سے ہمیں طاقت نصیب ہو گی اور شاید اللہ تعالیٰ انہیں کسی وقت ہدایت دیدے تو وہ ہمارے دست و بازو ثابت ہوں گے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے ابن خطاب تمہاری کیا رائے ہے؟"

---

(۱) سورہ المائدہ ۵: ۲٤ (۲) تفصیل ملاحظہ ہو: [illegible] (۳) عروہ ۱۳۹ (٤) سورۃ الانفال ۸: ۵۔۸

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا "ہر گز نہیں! بخدا میری وہ رائے نہیں ہے جو ابو بکرؓ کی ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں فلاں شخص کی گردن مار دوں۔ حمزہؓ کو اجازت دیں کہ وہ اپنے بھائی (عباس) کی گردن اڑا دیں اور علیؓ کو عقیل کے قتل کی اجازت دیں' تاکہ کافروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے دلوں میں کافروں کیلئے کوئی محبت نہیں ہے۔ یہ لوگ ان کے سردار' قائد اور بڑے لوگ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کی بات پسند کی اور حضرت عمرؓ کی بات پسند نہ کی مگر آپ خاموش رہے اور کوئی فیصلہ کئے بغیر اندرون خانہ تشریف لے گئے[۱]۔ بعض لوگ کہنے لگے آپ حضرت ابو بکرؓ کی بات پر عمل کریں گے اور بعض کہتے تھے کہ حضرت عمرؓ کی بات مانیں گے۔ پھر آپ برآمد ہوئے اور فرمایا "اللہ بہت سے لوگوں کے دل اپنی راہ میں بے حد نرم کر دیتا ہے تو وہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتے ہیں اور بعض کے دل سخت کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ اے ابو بکرؓ تمہاری مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سی ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا "من تبعنی فانه منی ومن عصانی فانك غفور رحیم[۲]"۔ "(جو میری اتباع کرے گا وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے گا تو اے خدا تو بخشنے والا مہربان ہے۔) اور اے ابو بکرؓ تمہاری مثال عیسیٰ علیہ السلام کی سی ہے کہ انہوں نے کہا تھا "ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفر لهم فانك انت العزیز الحکیم[۳]"۔ "(اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔) اور اے عمرؓ تمہاری مثال نوح علیہ السلام کی سی ہے کہ انہوں نے کہا تھا "رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا[۴]"۔ "(پروردگار! زمین پر ایک بھی کافر نہ چھوڑ۔) اور اے عمر تمہاری مثال موسیٰ علیہ السلام کی سی ہے کہ انہوں نے کہا تھا "ربنا اطمس علی اموالهم واشدد علی قلوبهم فلا یؤمنوا حتی یروا العذاب الالیم[۵]"۔ "(اے ہمارے پروردگار ان کے مالوں کو تباہ کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں گے حتیٰ کہ دردناک عذاب دیکھیں۔) پھر آپ نے فرمایا "آج کل تم لوگ مفلس ہو لہٰذا ان میں سے کوئی بھی فدیہ دیئے بغیر نہ جانے پائے ورنہ اس کی گردن مار دی جائے[۶]۔"

جب صبح ہوئی تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا آپ ﷺ اور ابو بکرؓ بیٹھے ہوئے تھے اور دونوں رو رہے تھے۔ میں نے عرض کی "یا رسول اللہ ﷺ آپ اور آپؐ کے دوست کس لئے رو رہے ہیں مجھے بتایئے تاکہ اگر رونے کی کوئی بات ہو تو میں بھی رونے لگوں ورنہ آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے متکلف رونے لگوں گا۔"

تمہارے دوستوں نے جو فدیہ لینے کی رائے دی تھی تو مجھے اس درخت سے بھی قریب تر عذاب الٰہی دکھایا گیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی[۷]۔

"ماکان لنبی ان یکون له اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرہ واللہ عزیز حکیم لولا کتب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم[۸]"۔ "(کسی نبی کے یہ شایان نہیں کہ اس کے پاس قیدی رہیں حتیٰ کہ وہ زمین میں خوب خونریزی نہ کرے' تم مال دنیا چاہتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے اللہ غالب حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ تقدیر نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے اختیار کیا ہے اس پر تمہیں سخت عذاب ملتا۔) اس کے بعد آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے غنائم اور فدیہ لینا درست قرار دیا[۹]۔ "فاما منا بعد واما فداء[۱۰]"۔ "(اس کے بعد یا احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے لو۔)

اس آیت کی بناء پر بہت سے صحابہ اور تابعین کا یہ خیال ہے کہ جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر منت رکھ کر رہا کر دیا جائے۔ مگر امام شافعی اور امام مالک کا یہ خیال ہے

(۱) مسلم:۵/ ۱۵۷' حنبل:۱/ ۲۴۵' واقدی:۱/ ۱۰۸' طبری:۱۱/ ۴۷۴۳' جوزی:۳/ ۳۶' کثیر:۱۱/ ۳۷۰۲ (۲) سورہ ابراہیم ۱۴: ۳۶ (۳) سورہ المائدہ ۵: ۱۱۸ (۴) سورہ نوح ۷۱: ۲۶ (۵) سورہ یونس ۱۰: ۸۸ (۶) طبری:۱۱/ ۴۷۵' واقدی:۱/ ۱۰۴' جوزی:۱۱/ ۳۶' مراغی:۱۰/ ۳۴' کثیر:۳/ ۳۲۵ (۷) مسلم:۵/ ۱۵۷' داؤد:۳/ ۸۲' حنبل:۱/ ۲۴۵' کثیر:۱۱/ ۳۷ (۸) سورہ الانفال ۸: ۶۷-۶۸ (۹) حنبل:۱/ ۲۴۵' داؤد:۳/ ۸۲ (۱۰) سورہ محمد ۴۷: ۴۔

کہ امام کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے(۱)۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بصیرت افروز مشورے کی اہمیت کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے انتباہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے "لو نزل عذاب یوم بدر مانجا منہ الا عمر"[۲]۔ "حضرت عمر فاروقؓ کے مشورے سے ہم آہنگ مشورہ صرف حضرت سعد بن معاذؓ کا تھا اس لئے رسول کریم ﷺ نے ان کے بارے میں بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار فرمایا[۳]۔

آپ کا اپنا قول ہے "خداوند تعالیٰ نے مجھ سے تین باتوں میں موافقت کی ہے۔ اول پردے کے بارے میں دوم اسیران بدر کے بارے میں تیسرا مقام ابراہیم کے سلسلے میں[۴]۔ "حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کی لوگوں پر چار فضیلتیں ہیں۔ اول یہ کہ بدر کے قیدیوں کی بابت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں قتل کا مشورہ دیا اور اسی کے موافق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ "لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم[۵]۔"

دوسرا حجاب کے متعلق حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ نبی ﷺ کی ازواج مطہرات پردے میں رہیں۔ اس پر حضرت زینبؓ نے کہا اے ابن خطاب تم ہم پر حکم چلاتے ہو حالانکہ وحی ہمارے گھر میں آتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "واذا سالتموھن متاعا فاسئلوا من وراء حجاب[۶]۔" تیسرا یہ کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں نبی ﷺ نے دعا فرمائی "اللھم ایدالاسلام بعمر۔"

چوتھا یہ کہ حضرت عمرؓ کی رائے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں ہوئی[۷]۔ اس روایت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی عظمت و فضیلت اور صحابہ کرامؓ کی نگاہ میں قدر و منزلت کی جہاں اور بہت سی بنیادیں تھیں وہاں موافقات کا بھی گہرا دخل تھا اور خاص طور پر اسیران بدر کا معاملہ اس قدر نمایاں تھا کہ آپ کی بصیرت و فراست کا ہر طرف چرچا ہوا اور آپ پر لوگوں کا اعتماد بہت بڑھ گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ لوگوں کو کوئی ایسا امر ہرگز پیش نہیں آیا کہ اس میں لوگوں نے مشورہ دیا اور حضرت عمرؓ نے بھی مشورہ دیا ہو مگر یہ کہ اس میں حضرت عمرؓ کے موافق قرآن نازل ہوا جیسا کہ اسیران بدر کی نسبت کہ جب حضرت عمرؓ نے انہیں قتل کر دینے کا مشورہ دیا اور دوسرے لوگوں نے فدیہ لینے کی رائے دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "لولا کتاب من اللہ الخ" اسی طرح حجاب و شراب کے بارے میں بھی حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حکم نازل فرمایا[۸]۔

۳۔ ابن ابی کی نماز جنازہ:

آپ کے مشورے سے موافقت کی ایک اور مثال منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کی نماز جنازہ کے موقع پر آپ کا نبی ﷺ کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ آپ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مدینے منتقل ہونے کے بعد سب سے زیادہ جن لوگوں نے قدم قدم پر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے مختلف سازشیں اور پروپیگنڈہ کیا وہ یہی منافقین تھے اور انہیں عبداللہ بن ابی کی سرپرستی حاصل تھی۔ جنگ احد کے موقع پر عبداللہ بن ابی نے ایک تہائی لشکر تقریباً تین سو افراد کا ایک دستہ عین موقع پر الگ کر لیا[۹]۔ غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر ایک مہاجر انصاری کے معمولی سے جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر اس نے قومی رنگ دینے کی کوشش کی اور یہاں تک کہہ دیا کہ ہم واپس جب مدینے جائیں گے تو ہم میں سے عزت دار لوگ ذلیلوں کو (نعوذ باللہ) نکال دیں گے۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا یا رسول اللہ ﷺ مجھے چھوڑ دیجئے میں اس منافق کی گردن مار دوں لیکن نبی محترم نے رحمدلی و درگزر کی بنا پر یہ فرما کر معاملہ ٹال

---

(۱) طحاوی ۳۷ (۲) واقدی ۱/ ۱۱۰ (۳) طبری ۲/۲۷۷، واقدی ۱/ ۱۱۰ (٤) مسلم ۷/۱۱۶، قرطبی ۲/۱۱۲، سیوطی ۱/۱۲۲ (٥) سورہ الانفال ۸:۶۸

(٦) سورہ الاحزاب ۳۳:۵۳ (۷) [illegible] (۸) [illegible] (۹) [illegible]

دیا کہ جانے دو لوگ کہیں گے کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو مرواتا ہے[۱]۔

عین انہیں دنوں میں جب کہ مسلمان چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ ان کے پاس مادی وسائل کی شدید قلت تھی' صرف نظریے اور عقیدے کا استحکام ہی ان کی مضبوطی اور دفاع کا واحد ذریعہ تھا' منافقین کی یہ کوشش رہی کہ وہ اس میں نقب لگائیں۔ اس میں شکوک و شبہات اور بددلی پھیلانے میں سرگرداں رہتے۔ چنانچہ غزوہ خندق کے موقع پر جب پورا عرب اپنی قوت کو مجتمع کر کے مسلمانوں پر چڑھ دوڑا' ادھر بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا تو مسلمانوں کی مصیبت بڑھ گئی اور وہ خوفزدہ ہوئے۔ اس موقع پر آنحضور ﷺ نے حضرت سلمانؓ کے خواب کی تعبیر میں مسلمانوں کو قیصر و کسریٰ کی فتح کی بشارت دی۔ مسلمانوں میں امید رجاء اور جوش و خروش پیدا ہوا' جبکہ منافقین یہ کہنے لگے کہ تمہیں اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ وہ (محمد ﷺ) (نعوذ باللہ) تم سے خرافات کہتے ہیں غلط امید دلاتے ہیں اور جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ ایک طرف تم سے کہتے ہیں کہ وہ یثرب میں بیٹھے ہوئے حیرہ کے قیصر اور کسریٰ کے شہر دیکھ رہے ہیں اور کہتے ہیں تم ان سب کو فتح کرو گے اور یہاں دوسری طرف تمہاری یہ حالت ہے کہ خندق کھود رہے ہو اتنی بھی طاقت تم میں نہیں کہ کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ کر سکو[۲]۔ کبھی کہتے کہ اب حالت یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص بے فکری سے رفع حاجت کیلئے بھی نہیں جا سکتا[۳]۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ کلام نازل فرمایا "واذ یقول المنافقون والذین فی قلوبھم مرض ما وعدنا اللہ و رسولہ الا غرورا[۴]۔" یہ اور اس طرح کی بے شمار چیرہ دستیاں منافقین کے آئے دن کا معمول تھا۔

۹ھ میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو روم کے خلاف لڑائی کی تیاری کا حکم دیا اس وقت مسلمان بہت ہی عسرت کی حالت میں تھے۔ اس قدر شدید گرمی تھی کہ ہر شخص زیر سایہ رہنا چاہتا تھا۔ قحط سالی بھی تھی اور میوے کی فصل بھی تیار تھی۔ ان دنوں منافقین نے لوگوں کو جہاد سے روکنے' دین الٰہی میں شک ڈالنے اور رسول اللہ ﷺ کی بات بگاڑنے کیلئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ تم اس گرمی میں نہ جاؤ۔ انہیں منافقین کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی[۵]۔ "وقالوا لا تنفروا فی الحر قل نار جھنم اشد حرا لو کانوا یفقھون فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا جزاء بما کانوا یکسبون[۶]۔" (انہوں نے لوگوں سے کہا کہ اس سخت گرمی میں نہ نکلو' ان سے کہو جہنم اس سے زیادہ گرم ہے۔ کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔ اب چاہئے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کر دیں اور روئیں زیادہ۔ اس لئے کہ جو بدی کماتے رہتے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے۔)

پھر جب قافلہ قیادت نبویؐ میں روانہ ہو کر ثنیۃ الوداع پر پہنچا تو عبداللہ بن ابی نے اس کے بالمقابل کوہ ذباب پر اپنی الگ چھاؤنی بنائی۔ ان کی تعداد رسول اللہ ﷺ سے کم نہ تھی۔ جب آپؐ وہاں سے روانہ ہوئے تو وہ دوسرے منافقوں کے ساتھ ارادۃً پیچھے رہ گیا اور اس نے آپ کا ساتھ نہ دیا[۷]۔ اسی سال اس ابوالمنافقین کی زندگی کی مہلت بھی ختم ہو گئی۔ بیماری کے زمانے میں اس نے رسول اللہ ﷺ کو بلایا' آپ تشریف لے گئے اور فرمایا یہودیوں کی محبت نے تجھے تباہ کر دیا۔ اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ وقت ڈانٹ ڈپٹ کا نہیں' بلکہ میری خواہش ہے کہ آپ میرے لئے دعائے استغفار فرمائیں میں مر جاؤں تو مجھے پیراہن میں کفنائیں[۸]۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ اس کے مرنے پر اس کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ میرے باپ کے کفن کیلئے آپ خاص اپنا پہنا ہوا کرتا عنایت فرمائیے۔ آپ نے دے دیا' پھر کہا کہ آپ خود اس کے جنازے کی نماز پڑھائیے۔ آپؐ

(۱) بخاری ۶/۶۵' مسلم ۸/۱۹' ترمذی ۵/۹' طبری ۲۸/۶' ۲۸/۸۹' ۲۸/۸۹ (۲) طبری ۲۱/۵۷ (۳) ہشام ۲/۱۶۹ (۴) سورۃ الاحزاب ۳۳/۱۲ (۵) طبری ۱۰/۱۰۱ (۶) سورۃ التوبہ ۹/۸۱-۸۲ (۷) طبری ۱۰/۱۰۳ (۸) طبری ۱/۲۰۶' زمخشری ۲/۲۹۸۔

نے یہ درخواست بھی منظور کرلی اور نماز پڑھانے کے ارادے سے اٹھے' لیکن حضرت عمرؓ نے آپ کا دامن تھام لیا اور عرض کی کہ حضورؐ آپ اس کے جنازے کی نماز پڑھائیں گے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا سنو اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے۔ "استغفر لهم أو لا تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم[1] مس يزيده على سبعين۔" (اے نبی ﷺ) تم خواہ ایسے لوگوں کیلئے (منافقین) معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو۔ گر تم ستر مرتبہ بھی انہیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ میں ستر سے زیادہ مرتبہ دعا کروں گا۔) حضرت عمرؓ فرمانے لگے 'یا رسول اللہ ﷺ' یہ منافق تھا تاہم حضور ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس پر یہ آیت اتری[2]۔ "ولا تصل على احد منهم مات ابدا ولا تقم على قبره انهم كفروا بالله و رسوله وماتوا وهم فٰسقون[3]۔" (اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے۔)

اور روایت میں ہے کہ اس نماز میں صحابہؓ بھی آپ کی اقتداء میں تھے اور روایت میں ہے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ اس کی نماز کیلئے کھڑے ہو گئے تو میں صف سے نکل کر آپ کے سامنے آ کھڑا ہوا اور کہا کیا آپ دشمن خدا عبداللہ بن ابی کے جنازے کی نماز پڑھائیں گے' حالانکہ فلاں دن اس نے یوں کہا اور فلاں دن یوں کہا اس کی وہ تمام باتیں دہرائیں۔ حضور ﷺ مسکراتے ہوئے سب سنتے رہے' آخر میں فرمایا عمرؓ مجھے چھوڑ دے اللہ تعالیٰ نے استغفار کا مجھے اختیار دیا ہے اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار سے اس کے گناہ معاف کرا سکتا ہوں تو میں یقیناً ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کروں گا۔ چنانچہ آپ نے نماز بھی پڑھائی' جنازے کے ساتھ بھی چلے' دفن میں بھی موجود رہے۔ اس کے بعد مجھے اپنی اس گستاخی پر بہت افسوس ہونے لگا کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ خوب علم والے ہیں۔ میں نے ایسی اور اس قدر جرأت کیوں کی' کچھ ہی دیر ہوئی ہوگی جو یہ دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔ اس کے بعد آخر دم تک نہ حضور ﷺ نے کسی منافق کے جنازے کی نماز پڑھی نہ اس کی قبر پر آ کر دعا کی[4] اور روایت میں ہے کہ اس کے صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپؐ سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر آپ تشریف نہ لائے تو ہمیشہ کیلئے یہ بات ہم پر رہ جائے گی۔ جب آپؐ تشریف لائے تو اسے قبر میں اتار دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا "اس سے پہلے مجھے کیوں نہ لائے' چنانچہ اسے قبر سے نکالا گیا' آپؐ نے اس کے سارے جسم پر دم کیا اور اسے اپنا کرتہ پہنایا[5] اور روایت میں ہے کہ وہ خود وصیت کر کے مرا تھا کہ اس کے جنازے کی نماز خود رسول اللہ ﷺ پڑھائیں۔ اس کے لڑکے نے آ کر حضور ﷺ کو اس کی آرزو اور اس آخری وصیت کی بھی خبر دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کی وصیت یہ بھی ہے کہ اسے آپ کے پیراہن میں کفنایا جائے۔ آپ اس کے جنازے کی نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ حضرت جبرئیل یہ آیتیں لے کر اترے[6] اور روایت میں ہے کہ جبرئیل نے آپ کا دامن تھام کر نماز کے ارادے کے وقت یہ آیت سنائی' لیکن یہ روایت ضعیف ہے[7]۔

آپؐ کے اس لطف و کرم کے مختلف محرکات تھے۔ بعض سلف سے مروی ہے کہ دینے کی وجہ یہ بھی تھی کہ جب بدر کے موقع پر قید ہو کر حضرت عباسؓ آئے تو ان کے جسم پر کسی کا کپڑا ٹھیک نہیں آیا۔ آخر اس کا کرتہ دیا گیا وہ انہیں پورا آیا اس لئے کہ یہ آدمی بھی بڑی ڈیل ڈول والا تھا پس اس کے بدلے میں آپؐ نے اس کے کیلئے اپنا کرتا عطا فرمایا۔ اس آیت کے اترنے کے بعد نہ تو کسی منافق کے جنازے کی نماز پڑھی نہ کسی کیلئے استغفار کیا[8]۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ حدیبیہ

---

(۱) سورہ توبہ ۹: ۸۰ (۲) بخاری ۲/ ۷۶۶' مسلم ۸/ ۱۲۰' ترمذی ۴/ ۳۴۳' طبری ۱۰/ ۲۰۴' ابن ماجہ ۲/ ۹۳' نسائی ۴/ ۳۶' جوزی ۴/ ۴۱۹' ابن کثیر ۱/ ۱۷ (۳) سورہ توبہ ۹: ۸۴ (۴) بخاری ۲ ... احمد بن حنبل ۱/ ۱۹۵' نسائی ۴/ ۶۸' ترمذی ۴/ ۳۴۲' طبری ۱۰/ ۲۰۵' مختصر ص ۳/ ۱۷۸' ابن کثیر ۱/ ۳۷۸ (۵) مسلم ۸/ ۱۲۰' طبری ۱۰/ ۲۰۵' ابن کثیر ۱/ ۱۷۹' نسائی ۴/ ۳۶

(۶) طبری ۱۰/ ۲۰۵' ابن کثیر ۱/ ۳۷۹ (۷) خصائص ۳/ ۱۷۹' طبری ۱۰/ ۲۰۵' زمخشری ۲/ ۲۹۸' ابن کثیر ۱/ ۳۷۹ (۸) زمخشری ۲/ ۲۹۸' ابن کثیر ۱/ ۳۷۹' نسائی ۴/ ۳۶

کے موقع پر مشرکین نے کہا تھا کہ ہم محمد ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے لیکن عبداللہ بن ابی نے کہا تمھیں اجازت دے سکتے ہیں تو اس نے کہا کیونکہ میرے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں میرے لئے اسوہ حسنہ ہے تو اس پر حضور ﷺ نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ روایت کے مطابق اس کے بیٹے حضرت عبداللہؓ نے قریش کی اس پیشکش کو ٹھکرانے کیلئے اسے آمادہ کیا اور کہا کہ کیا آپ آنحضور ﷺ سے پہلے طواف کریں گے اور ہمیں رسوا کریں گے[1]۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ سے اس کا سوال کیا گیا تھا جبکہ آپ کی عادت تھی کہ کسی سائل کے سوال کو رد نہیں فرماتے تھے۔ چوتھی وجہ یہ بھی تھی کہ آپ اس کے بیٹے کی عزت و دلجوئی فرمانا چاہتے تھے کیونکہ وہ ایک صالح صحابیؓ تھا اور بخوبی جانتے تھے کہ کفر کی حالت میں آپ کا قبر پر کھڑے ہونا اور دعا مانگنا اس کیلئے ملع بخش نہیں مگر اس سے دشمنوں کو ٹھٹھا و مذاق کرنے اور ہنسنے کا موقع نہ ملے[2]۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ آپؐ یہ امید رکھتے تھے کہ اتنا بڑا منافق اور دشمن جس کی ساری زندگی چیرہ دستیوں میں گزری تھی پر آپؐ موت کے بعد یہ احسان فرمائیں گے تو اس کے پیروکار اور قوم کے آدمی اور دیگر بہت سے لوگوں پر اچھا اثر پڑے گا اور وہ حلقہ اسلام میں پورے خلوص کے ساتھ داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ آپ نے خود ارشاد فرمایا "وما یغنی عنه قمیصی من الله وربی وصلاتی علیه وانی لارجو ان یسلم به الف من قومه[3]۔" لیکن مذکورہ آیت نازل ہونے کے بعد آپؐ نے پھر کبھی کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں ادا کی۔ اس سے مسلسل ان پر دباؤ بڑھتا رہا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ "وممن حولکم من الاعراب منفقون ومن اهل المدینة مردوا علی النفاق لا تعلمهم نحن نعلمهم سنعذبهم مرتین ثم یردون الی عذاب عظیم[4]۔"

حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کے بارے میں مروی ہے کہ نبی ﷺ ایک روز جمعہ کا خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے اور فرمایا اے فلاں فلاں لوگو تم مسجد سے چلے جاؤ تم منافق ہو' چنانچہ بڑی رسوائی کے ساتھ وہ مسجد سے نکالے گئے۔ جب وہ نکل رہے تھے تو حضرت عمرؓ مسجد کی طرف آرہے تھے۔ حضرت عمرؓ یہ سمجھ کر کہ لوگ پلٹ رہے ہیں شاید نماز جمعہ ہو چکی ہے شرما گئے اور شرم کے مارے ان لوگوں سے اپنے آپ کو چھپانے لگے۔ یہ سمجھ کر کہ عمرؓ کو بھی ہمارے نفاق کا علم ہو گیا ہوگا غرض جب حضرت عمرؓ مسجد میں آئے تو معلوم ہوا کہ ابھی نماز نہیں ہوئی۔ ایک مسلمان نے انہیں اطلاع دی اور بتایا "اے عمرؓ خوش ہو جاؤ کہ آج منافقین کو اللہ تعالیٰ نے رسوا کر دیا ہے۔" ابن عباس کہتے ہیں کہ مسجد سے نکالا جانا عذاب اول ہے اور عذاب ثانی قبر ہوگا[5]۔

حضرت عمرؓ کو خوشخبری دینے کی وجہ یہ تھی کہ وہ منافقین کے بارے میں سخت تھے اور ان سے کسی قسم کی رورعایت درست نہیں سمجھتے تھے۔ یہی آپ کی اجتہادی بصیرت کا کمال تھا کہ آخر کار آپ ہی کی رائے کے مطابق پالیسی بنائی گئی۔ منافقین پر سختی کا آغاز ہوا انہیں بے نقاب کیا گیا۔ زندگی میں ان کی سماجی حیثیت کو ختم کر دیا گیا اور مرنے کے بعد ان کے جنازے سے گریز کیا گیا۔ رسول خدا ﷺ مسند احمد میں ہے کہ جب آپ کو کسی جنازے کی طرف بلایا جاتا تو آپ پوچھ لیتے کہ اگر لوگوں سے اس کی بھلائیاں معلوم ہوتیں تو آپؐ جا کر اس کے جنازے کی نماز پڑھاتے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات کان میں پڑتی تو صاف انکار کر دیتے[6]۔

حضرت عمرؓ کا طریقہ آپ کے بعد یہ رہا کہ جس کے جنازے کی نماز حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑھتے اس کے جنازے کی نماز آپ بھی پڑھتے جس کی حضرت حذیفہؓ نہ پڑھتے آپ بھی نہ پڑھتے۔ اس لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ نے منافقوں کے نام گنوا دیئے تھے اور ان کی تعداد بارہ سے پندرہ تک تھی اور صرف انہی کو یہ نام معلوم تھے۔ اسی بناء پر انہیں رازدار رسول ﷺ کہا جاتا تھا بلکہ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ حضرت عمرؓ یک شخص کے جنازے کی نماز کیلئے

---

(۱) واقدی ۲ / ۶۰۵ (۲) زمخشری ۲ / ۲۹۸ (۳) طبرجلد ۱۰ / ۲۰۶ و زمخشری ۲ / ۲۹۹ (۴) سورہ توبہ ۹ / ۱۰۱ (۵) طبرجلد ۱۱ / ۱۰ ، قرطبی ۸ / ۲۴۳ ، کثیر ۲ / ۳۸۴

(۶) کثیر جلد ۱۰ / ۳۷۹

کھڑے ہونے لگے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چٹکی لے کر انہیں روک لیا[1]۔ جنازے کی نماز اور استغفار ان دونوں چیزوں کے بارے میں مسلمانوں کو روک دینا یہ دلیل ہے اس امر کی کہ مسلمانوں کے بارے میں ان دونوں چیزوں کی تاکید ہے۔ ان میں مردوں کیلئے بھی پورا نفع ہے اور زندوں کیلئے بھی کامل اجر و ثواب ہے[2]۔

○...... وحی بمطابق دعا:

حضرت عمر فاروقؓ کی موافقات کی دوسری قسم آپ کی کسی خواہش و دعا کو شرف قبولیت حاصل ہونا اور بارگاہ ایزدی سے اسی کے مطابق فرمان کے نزول پر مشتمل ہے۔

ا۔ مقام ابراہیمی پر نماز:

اس کی ایک مثال مقام ابراہیمی کو نماز کی ایک جگہ بنانے کی خواہش ہے۔ حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے طواف کر لیا تو حضرت عمرؓ نے مقام ابراہیم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ کیا یہی ہمارے باپ ابراہیم کا مقام ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں!" کہا پھر ہم اسے قبلہ کیوں نہ بنائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[3]۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے سوال پر تھوڑی دیر گزری تھی جو یہ حکم نازل ہوئے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ فتح مکہ والے دن مقام ابراہیم کے پتھر کی طرف اشارہ کر کے حضرت عمرؓ نے پوچھا یہی ہے جسے قبلہ بنانے کا ہمیں حکم ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا "ہاں! یہی ہے[4]۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں میں نے اپنے رب سے تین باتوں میں موافقت کی جو خدا کو منظور تھا میری زبان سے نکلا۔ ایک یہ کہ میں نے کہا حضور ﷺ کاش ہم مقام ابراہیم کو قبلہ بنا لیتے تو حکم نازل ہوا[5]۔ "واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی[6]۔" اس حکم کے نازل ہونے کے بعد سرور کونین ﷺ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ آپ کی اتباع میں آج تک حاجی اسی پر عمل کرتے ہیں اور قیامت تک کرتے رہیں گے۔

ابن جریج کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے طواف میں تین مرتبہ رمل کیا یعنی "دلکی" چال چلے اور چار پھیرے چل کر گئے پھر مقام ابراہیم کے پیچھے آکر دو رکعت نماز ادا کی اور یہ آیت تلاوت فرمائی "واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی۔" حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ مقام ابراہیم کو آپؐ نے اپنے اور بیت اللہ کے درمیان کر لیا تھا[7]۔ رہی یہ بات کہ مقام ابراہیم سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں علمائے تفسیر کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس بارے میں دو گروہ ہیں۔ اختلاف کی بنیادی وجہ لفظ مقام کے معانی کا تعین ہے۔ پہلے گروہ کے نزدیک اس سے مراد مسکن و مستقر ہے اور دوسرے کے نزدیک خاص کھڑے ہونے کی جگہ[8]۔ جو لوگ اسے مسکن و مستقر کے معنی میں لیتے ہیں ان میں سے بھی بعض کے نزدیک پورا حج اس سے مراد ہے جس کے ارکان میں مختلف مقامات شامل ہیں۔ ان میں عرفہ، مزدلفہ، مشعر الحرام، منیٰ، رمی جمار، صفا مروہ اور مطاف وغیرہ۔ یہ حضرت ابن عباسؓ، مجاہد اور عطاء کا قول ہے[9]۔ بعض دوسروں کے نزدیک پورا حرم مقام ابراہیم ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے شعبی اور نخعی بھی اس کے قائل ہیں[10]۔

مفسرین کا دوسرا گروہ جو اس سے مراد خاص پتھر لیتا ہے اس میں بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ پتھر ہے جسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زوجہ محترمہ نے سر دھوتے

---

(۱) کثیر ا: ۳۷۹ (۲) کثیر ا: ۳۸ (۳) قرطبی ۲/۱۱۲، کثیر ا: ۱۶۹/۱، بیضاوی ۱/۱۹۳ (۴) کثیر ا: ۱۶۹ (۵) بخاری ۵: ۱۴۹، مسلم ۷: ۱۱۶، ترمذی ۴: ۲۷۵، حنبل ۱: ۲۳، دارمی ۲: ۴۴، حبان ۹/۲۲ (۶) سورہ البقرہ ۱۲۵ (۷) کثیر ا: ۱۷، طبری ۳: ۳۶ (۸) اصلاحی ۱: ۲۸۵ (۹) طبری ۳: ۳۳، رازی ۴: ۵۳، کثیر ا: ۱۶۸، مرتضی ۲: ۱۱۳ (۱۰) طبری ۳: ۳۴، رازی ۴: ۴۵، قرطبی ۲/۱۱۲

کہیئے حضرت ابراہیمؑ کے پاؤں کے نیچے رکھا تھا۔ حضرت براہیمؑ نے اس پر ایک پاؤں رکھا تو انہوں نے ان کے سر کا ایک حصہ دھویا ان کا پاؤں اس پتھر میں دھنس گیا۔ پھر انہوں نے پاؤں نیچے کیا اور دوسرا رکھا تو دوسرا بھی دھنس گیا۔ اللہ نے اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ بنادیا۔ یہ حضرت حسنؒ قتادہ اور ربیع بن انسؓ کا قول ہے[1]۔

بعض کے نزدیک مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت براہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر شروع کی تھی۔ اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی ساتھ تھے۔ اس موقع پر دونوں مل کر یہ دعا مانگتے رہے جس کا قرآن حکیم میں ذکر ہے[2]۔ "واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم[3]۔" ہمارے نزدیک ٹھیک بات یہی آخری ہے جیسا کہ علامہ ابن کثیر نے مذکورہ بالا حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے تفصیل بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام براہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ آپ کو پتھر دیتے جاتے تھے اور کعبہ کی دیوار بنا کرتے جاتے تھے اور اس پتھر کو سرکاتے جاتے تھے جہاں دیوار اونچی کرنی ہوتی تھی وہاں لے جاتے تھے اس طرح کعبہ کی دیواریں پوری کیں۔ اس پتھر پر آپ کے دونوں قدموں کے نشان ظاہر تھے۔ عرب کی جاہلیت کے زمانہ کے لوگوں نے بھی دیکھے تھے ابوطالب نے اپنے مشہور قصیدہ میں کہا ہے۔

و موطیٔ ابراھیم فی الصخر رطبۃ

علی قدمیہ حافیا غیر ناعل

یعنی اس پتھر میں حضرت ابراہیمؑ کے دونوں پیروں کے نشان تازہ بہ تازہ ہیں جن میں جوتی نہیں بلکہ مسلمانوں نے بھی اسے دیکھا تھا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ مقام ابراہیم میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے پیروں کی انگلیوں اور آپ کے تلوے کا نشان دیکھا تھا۔ پھر لوگوں کے چھونے سے وہ نشان مٹ گئے۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں حکم اس کی جانب نماز ادا کرنے کا ہے تبرک کے طور پر چھونے اور ہاتھ لگانے کا نہیں۔ اس امت نے بھی اگلی امتوں کی طرح بلا حکم خدا بعض کام اپنے ذمہ لازم کر لئے جو نقصان رساں ہیں۔ وہ نشان لوگوں کے ہاتھ لگانے سے مٹ گئے تھے یہ مقام ابراہیم پہلے دیوار کعبہ سے متصل تھا۔ کعبہ کے دروازے کی طرف حجر اسود کی جانب دروازے سے جانے والے کے دائیں جانب مستقل جگہ پر تھا جو آج بھی لوگوں کو معلوم ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یا تو اسے یہاں رکھوادیا تھا یا بیت اللہ بناتے ہوئے آخری حصہ یہی بنایا ہوگا اور یہیں وہ پتھر پڑا رہا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں اسے پیچھے ہٹادیا۔

اس کے ثبوت میں بہت سی روایات ہیں پھر ایک مرتبہ سیلاب میں پتھر یہاں سے ہٹ گیا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اسے پھر اپنی جگہ پر رکھوادیا۔ حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ جب یہ اصلی جگہ سے ہٹایا گیا اس سے پہلے دیوار کعبہ سے کتنی دور تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے اسے اس کی اصلی جگہ سے ہٹا کر وہاں رکھا جہاں اب ہے لیکن یہ روایت مرسل ہے۔ ٹھیک بات یہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسے پیچھے رکھا (واللہ اعلم[4])۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بھرپور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ مقام ابراہیم سے مراد وہی پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر خانہ خدا کی انہوں نے تعمیر کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس پر محققین کا اتفاق ہے اس کی کئی وجوہ ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ طواف سے فارغ ہوئے تو اسی جگہ کھڑے ہو کر یہ آیت تلاوت فرمائی (واتخذوا الخ)

---

(۱) طبری ۳/۳۰: ۳۵، رازی ۵۳/۴، کثیر ۱۶۹/۱ (۲) طبری ۳/۳۴، قرطبی ۱۱۳/۲ (۳) سورہ البقرہ ۲:۱۲۷ (۴) کثیر ۱۷۰/۱

ان الفاظ کی اس جگہ تلاوت دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد یہی مقام ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ عرف عام میں یہ نام اسی جگہ سے مختص ہے اور دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مکے میں رہنے والے کسی آدمی سے مقام ابراہیم کے بارے میں سوال کرے تو وہ اس جگہ کے سوا کوئی اور جگہ نہیں بتائے گا اور اس پتھر کے سوا اس کا کوئی اور جواب نہیں ہوگا۔

۳۔ روایت ہے کہ نبی ﷺ اس مقام کے پاس سے گزرے اور ان کے ساتھ حضرت عمرؓ بھی تھے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ ہمارے باپ ابراہیم کا مقام نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" حضرت عمرؓ نے کہا "کیا ہم سے نماز پڑھنے کی جگہ نہ بنالیں؟" حضور ﷺ نے فرمایا "مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس دن ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

۴۔ یہ پتھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نیچے مٹی کی طرح نرم ہوگیا تھا حتیٰ کہ ان کے پاؤں اس میں دھنس گئے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل میں سے کھلی دلیل ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ ہے لہٰذا اس کا اختصاص حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے بہ نسبت غیر کے۔ لہٰذا اس پتھر پر اس نام کا اطلاق زیادہ مناسب ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے (واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى) اور یہ واضح ہے کہ نماز کا تعلق حرم سے یا دوسرے مقامات سے ایسا نہیں ہے جیسا کہ اس مقام سے ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ مقام ابراہیم یہی جگہ ہونی چاہیئے۔

۶۔ مقام ابراہیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ غسل کے وقت اس پتھر پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کسی اور جگہ پر ان کا قیام ثابت نہیں ہے۔ سو مقام ابراہیم کا لفظ اس پتھر پر اطلاق کرنا زیادہ مناسب ہے[1]۔

حضرت عمرؓ کی خداداد اور عظیم فہم و فراست کا یہ ایک منہ بولتا ثبوت ہے کہ آپ مقام ابراہیم کی اہمیت اور اس کے تقدس کو جان گئے۔ حضرت ابراہیم کی مختلف ادائیں اور اعمال جہاں مناسک حج میں شامل ہوئے وہاں اس پتھر کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ جو تاریخ کی ایک واضح علامت و نشانیوں میں سے ایک ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کے گھر کی بہت بڑی عظمت ہے۔ وہاں اس کے معمار کی عظمتوں کی بھی حد نہیں لیکن جس پتھر پر کھڑے ہو کر معمار نے اپنے کام کی تکمیل کی اللہ نے اسے بھی عظیم بنادیا۔ اس پر اپنے پیغمبر کے قدموں کے نشانات ثبت کر کے معجزہ بنادیا اور کعبہ سے اس کی نسبت کو یہ فرما کر لازوال بنادیا "ان اول بيت وضع للناس للذى ببكة مبركا وهدى للعلمين فيه آيٰت بينٰت مقام ابراهيم و من دخله كان امنا[2]۔" (بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کیلئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی اور تمام جہان والوں کیلئے مرکز ہدایت بنایا گیا۔ اس میں کھلی نشانیاں ہیں اور مقام ابراہیم ہے اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہوگیا۔)

حضرت عمرؓ کی خواہش کی جب موافقت ہوگئی تو اللہ کے نبی ﷺ نے خود اس کے قریب دو رکعتیں نماز ادا کر کے خدا کے حکم کی تعمیل کی اور ایک اسوۂ حسنہ چھوڑا[3]۔ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ یہ حکم ہے کہ اس کے پاس نماز ادا کریں اور یہ تمام مکلفین کیلئے ہے[4]۔ نماز کے ساتھ اس کے قریب دعا مانگنا بھی محبوب ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں مصلی کے معنی ہیں "مدعى يدعى فيه[5]۔" چنانچہ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ اس کے قریب ایک شخص کو کسی کیلئے دعائے مغفرت کرتے دیکھا تو نبی محترم ﷺ نے فرمایا: "ارجع فقد غفر لصاحبك[6]۔"

---

(۱) رازی ٤: ٥٤ (۲) سورۂ آل عمران ۳: ۹٦، ۹۵ (۳) طبری ۱: ۳٦ قرطبی ۲: ۱۱۲ (٤) طبری ۱: ۳۷ (٥) قرطبی ۲: ۱۳ (٦) قرطبی ۲: ۱۳

مقام ابراہیم آج بھی ہزاروں سال گزرنے کے باوجود پوری طرح محفوظ ہے۔ اس کا رنگ زردی اور سرخی کے درمیان ہے، مگر سپید رنگ کے زیادہ قریب ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔ دونوں قدموں کا طول ستائیس سینٹی میٹر اور عرض چودہ سینٹی میٹر ہے اور ان کے مابین درمیانی فاصلہ ایک سینٹی میٹر ہے۔ یہ ایک صندوق میں بند ہے، اور اس کے اوپر غلاف لپٹا رہتا ہے[۱]۔

۲۔ حجاب کا حکم:

اسی سلسلے میں ایک اور مثال پردے کے بارے میں حضرت عمر فاروقؓ کی خواہش ہے۔ پردہ ایک اہم سماجی شعار ہے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی جان ہے۔ اس کے ذریعے اسلام نے عورت و مرد کی فطری حدود کا تعین کیا ہے اور معاشرے میں ان کے دائرہ کار اور رول کو متعین کر کے بہت سی اخلاقی اور سماجی برائیوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ دونوں صنف کی عزت، وقار، آزادی اور خود اعتمادی سے نہایت معقول اور حکمت آمیز حدود کے اندر رہتے ہوئے معاشرے کی تعمیر و ترقی اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کیلئے بھرپور کردار سرانجام دینے کی راہ ہموار کی ہے۔ احکام حجاب سے قبل بھی اسلام کے مخصوص مزاج اور تقدس و پاکبازی کے درخشندہ تصورات کے زیر اثر کافی حد تک چادروں کا اہتمام کیا جاتا تھا اور بے جا اختلاط سے بھی حتی المقدور اجتناب کیا جاتا تھا، مگر اس کی حیثیت عادت، رواج اور روایتی اقدار کی تھی۔

حضرت عمرؓ اس بارے میں واضح شرعی حکم کے متمنی تھے تاکہ ایک طرف اس کے محرکات بدل جائیں، لوگ اسے عبادت و فرمانبرداری کے طور پر اختیار کریں اور پوری یکسوئی اور شعور کے ساتھ معاشرے میں اس کو پروان چڑھائیں۔ دوسری طرف اثرات و نتائج کے اعتبار سے ایک مستحکم اور پائیدار قدر معرض وجود میں آئے، جو ہر علاقے اور ہر دور میں ایک مقدس اور باحیا نظام تمدن کی اساس بن سکے۔ یہ اجتماعی معاملات میں آپ کی فہم و فراست کے لازوال نقوش میں سے ایک ہے۔ اس مقصد کیلئے آپ سرور کونین ﷺ کی خدمت میں عرض کرتے رہتے تھے کہ اپنی بیویوں کو پابند کریں، تاکہ آپ کے اسوہ حسنہ کی پیروی میں، جو کہ صحابیاتؓ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھی، لوگ عملی اقدامات کریں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ کی ازواج مطہراتؓ کے پاس نیک اور بد ہر طرح کے آدمی آتے ہیں، تو آپ انہیں پردے کا حکم دے دیتے۔" اس کے بعد پردے کی آیات نازل ہوئیں[۲]۔

آپ اسی طرح کی ترغیب ازواج مطہراتؓ کو براہ راست بھی دیتے رہتے تھے کیونکہ آپ کے دل میں یہ شدید خواہش تھی کہ پردے کے اصولوں کا چلن ہو اور اس پر سختی سے عمل کیا جائے لیکن یہ اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کہ خود خانہ نبوی ﷺ سے اس کا آغاز نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ازواج نبی ﷺ کو حکم دیا کہ پردہ کریں۔ اس پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے کہا "اے عمرؓ تم ہمارے اوپر خواہ مخواہ کے حکم چلاتے ہو، جبکہ وحی ہمارے گھر میں نازل ہوتی ہے" تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی[۳]۔ "واذا سألتموهن متاعا فسئلوهن من وراء حجاب ذالكم اطهر لقلوبكم وقلوبهن[۴]۔"

ایک مرتبہ اور واقعہ پیش آیا، جس نے پردے کے بارے میں آپ کی رائے کو مزید پختہ کیا اور آپ کے دل میں مچلتی ہوئی آرزو کو توانا کر دیا اور آپ کی زبان سے

---

(۱) الکردی، ۱۲۹۔ مزید تفصیل اور اس کی تاریخ و تعصب کیلئے ملاحظہ ہو ص ۱۹ تا ۱۴ (۲) بخاری، ۵: ۱۴۹ حنبل ۱: ۲۲۳، حبان ۹: ۲۲۴، جوزی، ۱: ۱۰۴ طبری، ۲۲: ۳۹/۲۲، کثیر، ۳: ۵۰۲/۳، سیوطی، ۱: ۱۲۳ (۳) طبری، ۲۲: ۴۰/۲۲، اثیر، ۴: ۶۶/۴، جوزی، ۱: ۱۷ (۴) سورۃ الاحزاب ۳۳: ۵۳

ب ساختہ اس کا ظہار ہوا۔ مجاہد سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مل کر مالیدہ کھا رہے تھے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو بھی دعوت دے دی۔ جب ان دونوں کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ نے بھی پناہاتھ ڈالا تو وہ حضرت عائشہؓ کے ہاتھ سے چھو گیا تو پکار اٹھے، اے افسوس اگر میری بات مان لی جاتی تو کوئی آنکھ بھی نہ دیکھ سکتی۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات آیت حجاب کے نزول سے پہلے ہوئی پھر آیت حجاب نازل ہوئی[1]۔

آیت حجاب کے شان نزول میں ایک اور واقعہ بھی مذکور ہے جس کا تعلق حضرت عمر فاروقؓ سے ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیویاں رات کو "مناصع" کی طرف رفع حاجت کیلئے جاتی تھیں جو ایک کھلا میدان ہے۔ حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ سے کہا کرتے تھے کہ اپنی بیویوں کو پردہ کرایئے لیکن انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا تھا۔ ایک روز رات کو عشاء کے وقت ام المومنین حضرت سودہؓ بنت زمعہ رسول اکرم ﷺ کی اہلیہ جو دراز قد تھیں باہر گئیں۔ حضرت عمرؓ نے آواز دی اے سودہؓ ہم نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ چاہتے تھے کہ پردے کا حکم نازل ہو جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پردے کا حکم نازل کر دیا[2]۔ اس روایت سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ واقعات کی مختلف کڑیاں جو حکمت خداوندی کے تحت احکام حجاب کے نزول کا باعث بنیں ان میں ایک یہ بھی ہے لیکن ہمارے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ یہ واقعہ احکام حجاب کے نازل ہونے کے بعد کا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اگر احکام نازل ہی نہیں ہوئے تھے تو پہچان لیا جانا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسری وجہ حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ایک اور حدیث ہے جس میں اسی واقعہ کی مزید تفصیل بیان کی گئی ہے۔ علامہ ابن کثیر کے بقول "والمشهور ان هذا كان بعد نزول الحجاب[3]"۔ ہاں البتہ معاملات حجاب کے تفصیلی احکام میں اس واقعے کو بھی بہت بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ آپ کے اس ٹوکنے سے وحی الٰہی کے ذریعے ضروری حوائج کیلئے بعض شرائط کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے کی اجازت مل گئی۔

حضرت ہشام بن عروہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "جب ہمیں پردے کا حکم ہوا تو اس کے بعد حضرت سودہ رضی اللہ عنہا رفع حاجت کیلئے نکلیں وہ موٹی تازی عورت تھیں اور اس وجہ سے دیگر عورتوں میں نمایاں ہوتی تھیں۔ جو شخص انہیں جانتا تھا اس سے چھپ نہیں سکتی تھیں۔" حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں دیکھا تو فرمایا "اے سودہؓ واللہ تم اپنے آپ کو ہم سے چھپا نہیں سکتیں۔ اب دیکھ لو کہ تم کیسے نکلتی ہو یہ سن کر وہ واپس پلٹ گئیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک ہڈی تھی۔ اتنے میں سودہؓ آئیں اور کہا "رسول اللہ ﷺ میں نکلی تھی تو حضرت عمرؓ نے مجھے یہ کچھ کہا۔" پس اسی وقت آپؐ پر وحی نازل ہوئی۔ جب وہ خاص کیفیت دور ہوئی تو ہڈی ابھی تک آپ کے ہاتھ میں ہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا "قد اذن لكن ان تخرجن لحاجتكن[4]"۔ "(تمہیں ضروری حاجت کیلئے باہر نکلنے کی اجازت دی گئی ہے۔)

اس روایت میں صراحت یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ واقعہ احکام حجاب کے نزول کے بعد کا ہے اور دوسرا یہ کہ ضروری حاجات کیلئے باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ اگرچہ راوی نے یہ کہا ہے کہ حاجت سے مراد یہاں پاخانہ ہے لیکن اس پر قیاس کر کے ان تمام امور میں نکلنے کا جواز پیدا کیا جا سکتا ہے جو نہایت ضروری ہوں۔ تیسری بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اس اجازت کا سبب بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی بنے۔ بہر حال یہ حضرت عمرؓ کے بہت بڑے اعزازات میں سے ایک ہے کہ آپ کی رائے کے مطابق پردے کا حکم نازل ہوا بعد میں یہی حکم امہات المومنینؓ اور ان کے ذریعے تمام مومنات کا شعار بن گیا۔ قیلہ بنت اشعث رسول اللہ ﷺ کی ملکیت میں آ گئی تھیں۔ آپؐ کے انتقال کے بعد اس نے عکرمہ بن ابوجہل سے نکاح کر لیا تو یہ بات حضرت ابو بکرؓ پر بہت گراں گزری۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اے خلیفہ

---

(۱) [illegible] کثیر [illegible] خورجا: ۱۷ (۲) بخاری [illegible] مسلم ۲،۷ [illegible] ۳۹،۲۲ (۳) کثیر ۳ [illegible] (٤) مسلم ۲،۷ طبری ۲۲ ۱۰

از رسول للہ' یہ رسول اللہ ﷺ کی بیوی نہیں تھی کیونکہ انہوں نے نہ تو اسے اختیار دیا اور نہ ہی پردے کا حکم اور اس کی قوم کی ردت کے ساتھ اس کی ردت کی وجہ سے للہ نے اسے حضور ﷺ سے بری کر دیا[۱]۔" اس طرح گویا پردہ امہات المومنین کی شناخت بن گیا۔

۳۔ استیذان:

موافقت کی اس قسم کی ایک اور مثال طلب اجازت کے بارے میں حکم خداوندی ہے۔ آپ ایک مرتبہ سو رہے تھے کہ ایک غلام بے دھڑک اندر چلا آیا تو آپ نے دعا کی "اے اللہ بغیر اجازت کے آنا حرام کر دے" اس پر آیت استیذان نازل ہوئی[۲]۔ اس واقعہ کی تفصیل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کرم ﷺ نے ایک نصاری لڑکے کو بھیجا کہ وہ حضرت عمرؓ کو بلا کر لائے۔ وہ جب ادھر پہنچا تو انہیں گھر میں سویا ہوا پایا۔ اس نے دروازے کو دھکیلا اور سلام کیا۔ مگر حضرت عمرؓ بیدار نہ ہوئے۔ پھر وہ واپس لوٹا اور دروازہ بند کر کے کھڑا ہو گیا اور اسے ہلانا شروع کر دیا لیکن پھر بھی وہ بیدار نہ ہوئے تو اس نے دعا کی کہ اے اللہ انہیں بیدار کر دے۔ پھر اس نے دروازے کو دھکیلا اور انہیں آواز دی۔ اس پر وہ بیدار ہو گئے اور اٹھ کے بیٹھ گئے۔ لڑکا اندر داخل ہوا تو اس دوران ان کا ستر کھل گیا۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید لڑکے پر بھی ستر ظاہر ہو گیا ہے۔ اس پر انہوں نے یہ خواہش کی کہ کاش اللہ تعالیٰ ہمارے بیٹوں، عورتوں اور خدمت گاروں کو ان اوقات میں بلا اجازت ہمارے ہاں داخلے سے روک دے۔ پھر وہ اسی رائے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہیں اس حاصل میں پایا کہ آپ ﷺ پہ آیت نازل ہو چکی تھی۔ "**یا ایھا الذین امنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات من قبل صلوۃ الفجر و حین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ ومن بعد صلوۃ العشاء**[۳]"۔

حضرت عمرؓ نے اس موقع پر للہ تعالیٰ کی حمد بیان کی۔ رسول للہ ﷺ نے پوچھا "اے عمرؓ یہ کیا ہے؟" جواب میں حضرت عمرؓ نے وہ سب کچھ بیان کیا جو اس لڑکے نے کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بات پر تعجب کیا جو اس نے کیا تھا۔ اس کا نام معلوم کیا اور اس کی تعریف کی۔ پھر فرمایا "اللہ تعالیٰ ایک حلیم کے حلم اور پاکباز کی پاکدامنی سے محبت کرتا ہے اور بدگو اور لپٹ لپٹ کر سوال کرنے والے کو ناپسند کرتا ہے۔" یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد امام رازی فرماتے ہیں "**فھذہ الایۃ احدی الایات المنزلۃ بسبب عمر**[۴]"۔

۴۔ حرمت خمر:

ایک اور اہم واقعہ جس میں وحی الٰہی نے حضرت عمر فاروقؓ کی رائے سے موافقت کی وہ حرمت شراب ہے[۵]۔ اہل عرب شراب کے بہت رسیا تھے حضرت عمر فاروقؓ خود بھی عہد جاہلیت میں بلا کے بادہ نوش تھے بلکہ دوسروں کو بھی محفلوں میں پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے[۶]۔ شراب کو کیونکہ منع نہیں کیا گیا تھا اس لئے اسلام قبول کرنے کے باوجود بھی بہت سے لوگوں میں اس کی عادت موجود تھی۔ اس لئے اس بارے میں روایت نقل کرنے والوں میں کوئی اختلاف نہیں کہ ابتدائے اسلام میں شراب مباح تھی اور اکثر مسلمان مدینے میں بھی اسے پیتے تھے[۷]۔ یہ مختلف اشیاء سے بنائی جاتی تھی جیسا کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا "جس زمانے میں حرمت خمر کا حکم نازل ہوا اس وقت خمر پانچ چیزوں سے بنتی تھی انگور، کھجور، شہد، گندم اور جو اور خمر کے معنی ہیں وہ چیز جو عقل پر پردہ ڈال دے[۸]۔

(۱) طبری: ۲۲: ۴۱ کثیر: ۳: ۵۰۶ (۲) سیوطی: ۱۲۴ (۳) سورہ النور ۲۴: ۵۸ (۴) رازی ۲۴: ۲۸ (۵) بزار ۳: ۱۴۸ ابن اثیر ۸: ۱۳ ابن سعد ۱ ۸ سیوطی: ۲۲: ۶ مسلم ۳۷۱ کثیر: ۳: ۸ (۶) جصاص ۱: ۳۸۲ (۸) بخاری ۵: ۱۸۹ مسلم ۸: ۲۴۵ عبدالرزاق ۹: ۲۳۳ ابوداؤد ۳: ۴۴۴ حزم ۷: ۵۰۳ رازی ۶: ۴۳ نسائی ۸: ۲۹۵

حضرت عمرؓ نے محسوس کیا کہ شراب لوگوں میں ہیجان و غضب پیدا کرتی ہے اسے پی کر شرابی ایک دوسرے کی بدگوئی کرتے اور آپس میں بدکلامی سے پیش آتے ہیں، پھر یہودی اور منافقین اوس و خزرج کو بھڑکانے ان کے پرانے جھگڑوں کو ہوا دیتے کیونکہ اکثر و بیشتر شراب نوشی کے اوقات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے فتویٰ پوچھا[1]۔ حضرت عمر فاروقؓ یہ چاہتے تھے کہ اس پر پابندی لگا دی جائے لیکن اس میں رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمان مکہ میں نازل ہونے والی اس آیت کی بدولت نہ صرف یہ کہ اسے پیتے تھے بلکہ اسے پوری طرح اپنے لئے حلال سمجھتے تھے۔ "ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منه سکرا و رزقا حسنا[2]۔"

چنانچہ انہوں نے اس بارے میں حضور ﷺ سے فتویٰ پوچھا ان کے ساتھ حضرت معاذؓ اور صحابہ کرام کا ایک گروہ بھی شامل تھا۔ عرض کیا "یا رسول اللہ ہمیں شراب کے بارے میں فتویٰ دیجئے کیوں کہ یہ عقل کو رخصت اور مال کو سب کر دینے والی ہے[3]۔ اس وقت تک بھی شراب کی حرمت کے سلسلے میں کوئی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ سے بھی حضرت عمرؓ نے دعا فرمائی "اے اللہ ہمیں شراب کے بارے میں صاف صاف بیان کر دے اس پر یہ آیت نازل ہوئی[4]۔"

"یسئلونك عن الخمر والمیسر قل فیهما اثم کبیر و منافع للناس، واثمهما اکبر من نفعهما[5]۔" "(اے پیغمبر ﷺ) مسلمان تم سے پوچھتے ہیں شراب پینا اور جوا کھیلنا کیسا ہے؟ کہہ دو ان دونوں چیزوں میں بڑا نقصان ہے اور لوگوں کے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کا نقصان فائدے سے بڑھ کر ہے۔) حضرت عمرؓ کو بلایا گیا اور انہیں یہ آیت پڑھ کر سنائی گئی لیکن اس میں کیونکہ ممانعت واضح طور پر نہیں کی گئی تھی اس لئے کچھ لوگوں کے ترک کر دینے کے باوجود بہت سے لوگوں نے پینا جاری رکھا اور دلیل یہ دی کہ اس میں نفع ہے تو ہمیں نفع اٹھاتے رہنا چاہیے[6] اور اسی حالت میں نماز پڑھتے اور اکثر اوقات انہیں پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کرائی اور سورۃ الکافرون کو غلط طور پر یوں پڑھ گئے۔ "قل یا یها الکافرون لااعبد ماتعبدون ولاانتم عبدون مااعبد ولاانا عابدما عبدتم لکم دینکم ولی دین "اس طرح ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے امامت کرائی تو جس طرح پڑھنا چاہئے تھا نہ پڑھ سکے[7]۔ یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے پھر دعا کی "اے اللہ تعالیٰ ہمیں شراب کے بارے میں صاف صاف بیان فرما۔" اس پر ایک اور آیت نازل ہوئی اور حضرت عمرؓ کو بلا کر سنائی گئی۔ "یا یها الذین آمنوا لا تقربوا الصلوٰة وانتم سکاریٰ حتیٰ تعلموا ماتقولون[8]۔" "(اے وہ لوگو! جو ایمان لائے نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ یہاں تک کہ (نشہ اتر جائے اور) جو منہ سے نکالتے ہو اس کو سمجھنے لگو۔) اس دن سے رسول اللہ ﷺ نے اعلان کر دیا کہ لوگ مستی و بے خبری کی حالت میں نماز کے قریب نہ آئیں[9]۔ اس اعلان سے مسلمانوں نے اگر شراب نوشی ترک نہ کی تو برائے نام ضرور کر دی لیکن کچھ لوگوں میں اس کے برے اثرات قائم رہے۔ بعض نے یہ کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم نماز کے وقت نہیں پئیں گے اور یہ سن کر رسول اللہ ﷺ خاموش رہے[10]۔ اس طرح نماز میں خرابی کا تو سدباب ہو گیا، اور نماز عشاء کے بعد پی جانے لگی لیکن اس کی سماجی خرابیاں موجود رہیں۔ شراب نوشی کرنے والے لوگ باہم لڑتے جھگڑتے رہتے تھے[11]۔

---

(۱) ہیکل، ۱: ۶۵ (۲) سورۃ النحل ۱۶: ۶۷ (۳) رازی، ۶: ۴۲، زمخشری ۱: ۲۶۰ طبری ۲: ۲۰۵ (٤) حنبل ۱: ۳۱۷، داؤد ۳/ ٤٤٥ ترمذی ٤: ۲۰، ۳۲ نسائی ۸: ۲۸۶، شوکانی ۱/ ۱۹۷، بیضاوی ۱: ۱۹۷، عربی ۲: ۶۵ (۵) سورۃ البقرہ ۲: ۲۱۹ (٦) کثیر ۲: ۹۲، شوکانی ۱: ۱۹۷ (۷) داؤد ۳: ٤٤٥، رازی ۶: ٤۲ زمخشری ۱: ۲٦ کثیر ۱/ ۵۰۰ (۸) سورۃ النساء ٤: ٤۳ (۹) کثیر ۱/ ۵۰۰ (۱۰) کثیر ۲/ ۹۲ (۱۱) جصاص ۱/ ۳۸۱۔

ایک دفعہ کچھ انصاری لوگ اکٹھے تھے' ان میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بھی تھے۔ وہ شراب پی کر مخمور ہو گئے اور پھر آپس میں فخر جتانے والے اشعار پڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ حضرت سعدؓ نے ایک ایسا شعر پڑھا جس میں انصاریوں کی ہجو تھی۔ اس پر ایک انصاری نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی اٹھا کر دے ماری جس سے ان کی ناک پر زخم آیا اور اس کا نشان باقی رہ گیا[1]۔ اس کی شکایت رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچی' تو وہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود تھے۔ اس وقت تک حرمت شراب کا واضح حکم نازل نہیں ہوا تھا' چنانچہ انہوں نے دعا کی "اے اللہ' ہمیں شراب کے بارے میں کافی و شافی حکم دے۔" تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی "یا یھاالذین امنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون انما یرید الشیطٰن ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ و عن الصلوٰۃ فھل انتم منتھون[2]۔" (اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے' یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے پرہیز کرو امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہو گی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے ؟) حضرت عمرؓ کو بلا کر جب یہ آیت سنائی گئی' تو پکار اٹھے "انتھینا انتھینا انھا تذھب المال و تذھب العقل[3]۔" (ہم باز آئے ہم باز آئے کیونکہ اس میں مال اور عقل دونوں کا نقصان ہے۔) اس طرح ان آیات میں شراب کو قطعی طور پر حرام قرار دیا گیا ہے اور اس کی علتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں کہ اس سے عداوت' بغض' ذکر الٰہی اور نماز سے غفلت پیدا ہوتی ہے۔ یہ چیزیں نشے کے ساتھ یقینی طور پر منسلک ہیں' اس لئے ہر نشہ آور چیز خمر ہے[4]۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "کل مسکر خمر و کل مسکر حرام[5]۔"

حضرت عمر فاروقؓ کے فہم و فراست کی رفعت و عظمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس ام الخبائث کے گہرے انفرادی و اجتماعی اور جسمانی و روحانی اثرات کا کھوج لگایا' جن میں انسان اور انسانیت کا نقصان ہی نقصان ہے۔ جو سماجی تہذیب و ثقافت میں کسی طور پر بھی قابل برداشت نہیں ہو سکتی۔ آپ کی رائے پر وحی الٰہی نازل ہوئی' جس نے مہر تصدیق ثبت کر دی اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اسے ممنوع قرار دے دیا۔ جب یہ آیت اتری تو بروایت ابن کثیر شراب اتنی بہائی گئی کہ مدینے کی زمینوں میں شراب ہی شراب تھی[6]۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں شراب پلا رہا تھا اور لوگ نشے سے جھوم رہے تھے تو منادی نے شراب کی حرمت سنا دی پھر عالم یہ ہو گیا کہ ہر آنے جانے والے نے اپنی شراب بہا دی اور مٹکے توڑ دیئے[7]۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک ٹیلے پر بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ہم تین یا چار افراد تھے' شراب کا مٹکا رکھا تھا اور دور چل رہا تھا کہ میں اٹھ کر نبی ﷺ کے پاس آیا۔ اس وقت تحریم خمر کی آیت اتری میں فوراً اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور وحی سنائی۔ بعض نے شراب پی لی تھی' بعض نے کچھ پی تھی اور کچھ ہاتھ میں دھری تھی' کسی کے منہ کو شراب لگی ہوئی تھی۔ یہ سنتے ہی سب نے اپنی اپنی شراب زمین پر بہا دی اور آخری آیت "فھل انتم منتھون۔" سن کر کہنے لگے "انتھینا ربنا[8]۔" رسول اکرم ﷺ نے شراب کے تمام مشکیزے جمع کر کے میدان بقیع میں لانے کا حکم دیا۔ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے ساتھ سہارا لئے وہاں پہنچے پھر کس کے دن متعلقات پر حنت بھیجی پھر ایک چھری منگوائی اسے تیز کروا کے سارے مشکیزے پھاڑ دیئے۔ لوگوں نے کہا اس میں

---

(۱) رازی ۶/ ۴۳ (۲) سورہ المائدہ ۹۰ ۔ ۹۱ (۳) حنبل ۱/ ۳۱۷ داؤد ۳/ ۴۴۴' ترمذی ۴/ ۳۲۰' نسائی ۸/ ۲۸۶' جصاص ۱/ ۳۸۲' رازی ۶/ ۴۳' کثیر ۲/ ۹۲ ابن ماجہ ۱۹۷ (۴) رازی ۶/ ۴۶ (۵) داؤد ۳/ ۴۴۶ جصاص ۱/ ۳۸۵ کثیر ۲/ ۹۶ (۶) کثیر ۲/ ۹۶ (۷) بخاری ۵/ ۱۹۰ داؤد ۳/ ۴۴۵ کثیر ۲/ ۹۳' نسائی ۸/ ۲۸۷ (۸) کثیر ۲/ ۹۵۔

منفعت بھی تو تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں میں خدا کے غضب سے ڈر کر ایسا کر رہا ہوں۔ شراب میں خدا کی ناراضی ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! اسے میں سب مشرکین سے چیر دوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں! میں خود اس کو ضائع کردوں گا[۱]۔"

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ شراب سے بچو کیونکہ وہ ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ یک واقعہ سنو کہ تم سے پہلے زمانے میں ایک شخص بڑا ہی عابد تھا۔ لوگوں کو چھوڑ چھاڑ کر بستی سے الگ تھلگ عبادت خانے میں عبادت کرتا تھا۔ ایک بدکار عورت کی اس پر نظر تھی' اس نے اپنی خادمہ کو بھیجا کہ ایک گواہی کے بہانے اس کو بلا لائے' وہ بے چارہ آگیا۔ جب وہ کسی دروازے سے داخل ہوتا تو باہر سے اسے بند کر دیا جاتا یہاں تک کہ اس بدکار عورت تک جا پہنچا۔ اس کے پاس ایک بچہ تھا اور ایک شراب کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگی خدا کی قسم! میں نے تجھے کسی گواہی کیلئے نہیں بلایا' بلکہ اس لئے بلایا ہے کہ تو میرے ساتھ رات بسر کرے یا اس بچے کو قتل کر دے یا شراب پئے۔ اس نے یہ سوچ کہ دونوں گناہوں کی نسبت شراب کا گناہ ہلکا ہے' چنانچہ اس نے شراب پی لی۔ اب وہ ایک جام کے بعد پے در پے اور جام مانگنے لگا۔ یہاں تک کہ شراب کے نشے میں اس لڑکے کو بھی قتل کر دیا اور اس عورت کے ساتھ بھی رات گزار دی اس لئے شراب سے بچو وہ ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ شراب اور ایمان بھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے' اگر شراب ہے تو ایمان نہیں اور ایمان ہے تو شراب نہیں[۲]۔

روایت میں ہے کہ امتناع شراب کا یہ حکم بعض مسلمانوں کو شاق گزرا اور انہوں نے کہا شراب ناپاک کیسے ہو سکتی ہے' جبکہ یہ فلاں فلاں کے پیٹ میں تھی۔ جب وہ احد میں شہید ہوئے اور فلاں فلاں کے پیٹ میں تھی جب وہ بدر میں شہید ہوئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[۳] "لیس علی الذین امنوا وعملوا الصالحات جناح فیما طعموا اذا ما اتقوا وامنوا وعملوا الصلحت ثم اتقوا وامنوا ثم اتقوا واحسنوا واللہ یحب المحسنین[۴]۔" (جو لوگ ایمان لائے اور (جنہوں نے) نیک کام کیے ان پر (پہلے) جو کچھ کھا پی چکے اس کا کچھ گناہ نہیں جب وہ شرک سے بچیں اور ایمان پر قائم رہیں اور نیک کام کرتے رہیں پھر (حرام چیزوں سے) بچیں اور یقین کریں اور پھر بچیں اور اچھے کام کریں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے[۵]۔

○ وحی بمطابق عمل:

حضرت عمر فاروقؓ کی موافقات کی تیسری قسم وہ ہے کہ جس میں آپ کے کسی عمل کو سند جواز عطا کی گئی۔ اس کی توثیق میں حکم نازل ہوا اس کی بھی کئی مثالیں موجود ہیں۔

ا۔ شب رمضان میں جماع۔

شریعت محمدیہ ﷺ کے ابتدائی دنوں میں جب ماہ رمضان میں لوگ روزہ رکھتے تو افطار کے بعد ان کیلئے کھانا' پینا' عورتوں کے پاس جانا حلال ہوتا تھا۔ جب تک کہ وہ سو نہ جاتے یا نماز عشاء ادا نہ کر لیتے۔ ان دونوں میں سے اگر کوئی کام کر لیتے تو پھر روزہ شروع ہو جاتا اور ساری پابندیاں عاید ہو جاتیں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ کی روایات سے یہی ثابت ہے[۵]۔ تمام مفسرین کا بھی اس بارے میں اتفاق ہے' البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ

---

(۱) کثیر ۲: ۹۵ (۲) کثیر ۲: ۹۸ (۳) بخاری ۵: ۱۸۹ ترمذی ٤: ۳۲۱ (٤) سورۃ المائدۃ ۹۳ (۵) طبری ۲: ۱٦٤ رازی ۵: ۱۱۲ زمخشری ۱: ۲۲۹' بغوی ۲: ۲٦۸' کثیر ۱: ۲۲۰' شوکانی ۱۰: ۱٦٤۔

حرمت محض نصاریٰ کی شریعت سے ثابت ہے یا شریعت محمدیہؐ سے بھی؟ جب طلوع فجر تک مذکورہ کام حلال ہونے کا حکم نازل ہوا تو سابقہ شریعت کا ناسخ ہوا یا سابقہ حکم کا؟[1] دونوں طرف قوی دلائل ہیں[2]۔ حضرت براءؓ سے مروی ہے کہ جب رمضان کے روزے کا حکم نازل ہوا تو مسلمان پورے رمضان میں اپنی بیویوں کے قریب نہیں جاتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو خیانت میں مبتلا کر لیا تو یہ آیت نازل ہوئی[3]۔ "علم الله انكم كنتم تختانون انفسكم فتاب عليكم و عفا عنكم[4]"۔ دیگر روایات میں ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان افراد میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تھی۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرمان الٰہی (احل لكم ليلة الصيام الخ) کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب مسلمان ماہ رمضان میں نماز عشاء ادا کر لیتے تو ان کیلئے عورتیں، کھانا اور اس طرح کی دوسری چیزیں حرام ہو جاتی تھیں۔ پھر مسلمانوں میں سے کچھ لوگ ماہ رمضان میں عشاء کے بعد بھی کھانے اور عورتوں میں مبتلا ہوئے تو دربار نبوت میں شکایتیں ہوئیں، پھر آیت اتری[5]۔

حضرت عبداللہ بن کعب بن مالکؓ باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ ایک رات دیر تک مسجد نبوی میں بیٹھے رہے۔ گھر پہنچے تو بیوی کا قصد کیا، اس نے کہا کہ مجھے نیند آگئی تھی۔ انہوں نے سمجھا کہ بہانہ کر رہی ہے اس لئے اس سے جماع کر لیا تو اس پر آیت نازل ہوئی[6]۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ ایک رات سوئے تھے، تو ان کے نفس نے ان کو بہکایا۔ پس انہوں نے اپنی اہلیہ سے حاجت پوری کی پھر غسل کیا پھر رونے لگے اور اپنے نفس کو ملامت کرنے لگے شدید ترین ملامت۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا "اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اپنے خطاکار نفس کے بارے میں اللہ اور آپؐ کے حضور معذرت خواہ ہوں۔ اس نے (نفس) میرے لئے اسے مزین کیا تو میں اپنی اہلیہ سے جا ملا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ میرے لئے رخصت پاتے ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اے عمرؓ تمہیں ایسا کرنے کا حق نہیں تھا" جب حضرت عمرؓ گھر لوٹے تو آنحضور ﷺ نے ان کی طرف پیغام بھیجا اور آیت قرآنی کے ذریعے ان کے عذر کے بارے میں انہیں آگاہ فرمایا اور یہ آیت نازل ہوئی[7]۔ "احل لكم ليلة الصيام الرفث الى نسائكم هن لباس لكم وانتم لباس لهن علم الله انكم كنتم تختانون انفسكم فتاب عليكم و عفا عنكم فالئن باشروهن وابتغوا ما كتب الله لكم وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الابيض من الخيط الاسود من الفجر الخ[8]" اس طرح حضرت عمرؓ نے جو کام کیا تھا اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے عفو نازل فرمایا اور رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ اس آیت کو سورۃ البقرہ کی درمیانی سو آیت میں رکھیں[9]۔ اس آیت کا پہلا حصہ جس کا تعلق مباشرت کے ذکر اور اس کی اجازت سے ہے وہ حضرت عمرؓ ہی کے عمل کے بارے میں نازل ہوا[10]۔ چنانچہ بقول ابن عربی "فالئن باشروهن هذا يدل على ان سبب الاية جماع عمرؓ[11]"۔ تو اس طرح ان کی وجہ سے قیامت تک کے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی رعایت سے نوازا جو نہ صرف یہ کہ سہولت کا باعث ہے، بلکہ ان کی حفاظت و پاکیزگی کی بھی ضمانت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو نہ جانے کتنے لوگ نفس کی منہ زور خواہشات سے مجبور ہو کر ہر دور میں گناہ کا ارتکاب کرتے۔ یہ حضرت عمرؓ ہی کے فعل کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بنیاد پر انسانوں کو بہت بڑی آزمائش سے بچا لیا۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے موافقات عمرؓ میں اسے شمار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابتداء اسلام میں رمضان شریف کی رات کو بھی اپنی بیوی سے مباشرت حرام

---

(١) سیوطی ٧/٢: ٢٢ (٢) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ رازی ٥: ١٣ (٣) بخاری ٥: ١٥٦ (٤) سورہ البقرہ ٢: ١٨٧ (٥) طبری ٢/١: ١٦٥، کثیر ١: ٢٢٠ سیوطی ١: ١٦٤ (٦) داود ١: ٢٠١ طبری ٢/١: ١٦٤، کثیر ١: ٢٢٠ (٧) طبری ٢: ١٦٥ رازی ٥: ١١٤، قرطبی ٢: ٣١٥، بیضاوی ٢: ٢٦٨ (٨) سورہ البقرہ ٢: ١٨٧ (٩) طبری ٢/١: ١٦٥ (١٠) قرطبی ٢/ ٣١٧ (١١) ایضاً

تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کے متعلق کچھ کیا تو آیت نازل ہوئی (احل لکم الخ[1]) اس بارے میں بھی اتفاق ہے کہ اس آیت کا دوسرا حصہ جس میں رات کو خورد و نوش کی اجازت دی گئی ہے اس کے نزول کے پس منظر میں حضرت قیس بن صرمہ انصاریؓ کا واقعہ ہے کہ وہ مزدوری سے واپس آئے۔ افطار کیلئے گھر میں کچھ نہ تھا بیوی کہیں سے لینے کیلئے گئی تو تھکاوٹ کی وجہ سے انہیں نیند آ گئی۔ بیوی پلٹی تو سوتا دیکھ کر کہا ہائے تیری محرومی۔ چنانچہ اسی طرح بغیر کھائے پئے اگلا روزہ شروع ہو گیا اگلا دن جب چڑھا تو دوپہر کو بے ہوش ہو گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]۔

۲۔ طریق جماع:

حضرت عمر فاروقؓ کی اس موافقت کی دوسری مثال اس آیت کریمہ کا نزول ہے "نساء کم حرث لکم فأتوا حرثکم انی شئتم وقدموا لانفسکم واتقوا الله واعلموا انکم ملقوه و بشر المومنین[3]۔" (تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اللہ کی ناراضی سے بچو اور خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے (اور اے نبی جو تمہاری ہدایت مان لیں انہیں) خوشخبری دے دو۔) اس آیت کے شان نزول کے بارے میں تین واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کے ذریعے یہود کے ایک خیال کا رد کیا گیا ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے یہودی کہتے تھے کہ اگر عورت سے ہم بستری کیلئے کوئی پیچھے سے آئے گا تو بچہ بھینگا پیدا ہوگا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جہاں سے چاہو آؤ[4]۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بات تورات میں درج ہے۔ جس وقت یہ بات رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا یہودی جھوٹ کہتے ہیں اور یہ آیت نازل ہوئی[5]۔

دوسرا یہ کہ یہودی علماء کے زیر اثر انصاریوں کا خیال بھی یہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے اور اکثر افعال میں وہ ان کی پیروی کرتے تھے اور الٹا لٹانے سے گریز کرتے۔ ان کے برعکس بلکہ کسی خاص طریقے کے پابند نہ تھے جس طرح جو چاہتے کرتے۔ ایک مہاجر مرد نے مدنی انصاریہ عورت سے نکاح کیا اور اپنے من پسند طریقے برتنے چاہے تو اس نے انکار کر دیا کہ میں ہرگز بات نہ مانوں گی جب تک (حضور ﷺ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان نہ کر لوں۔ چنانچہ اس نے حضرت ام سلمہؓ کے ذریعے آپ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی[6])۔

تیسرا یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں ہلاک ہو گیا۔" آپ ﷺ نے دریافت کیا "کیا بات ہوئی؟" عرض کی "آج شب میں نے اپنی سواری الٹ دی۔" اس پر آپ نے کوئی جواب نہ دیا پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی یعنی سامنے سے بھی اور پشت سے بھی لیکن دبر اور حیض سے بچو[7]۔

اب رہی یہ بات کہ مذکورہ واقعات میں سے کس کو تقدیم حاصل ہے اور فی الواقع کون واقعہ سبب نزول ہے۔ روایات میں اس طرح کی کوئی تخصیص موجود نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آیت ایک واقعہ کے بعد نازل ہو چکی ہو اور دیگر دونوں پر اس کا اطلاق کیا گیا ہو اور یہ بھی امکان ہے کہ تینوں باتیں پہلے ہو چکی ہوں پھر یہ آیت نازل ہوئی ہو۔ ہمارے نزدیک اغلب یہی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ ہی کا فعل اس کی بنیاد بنا (واللہ اعلم) حضرت عمرؓ کا اپنا قول ہماری رائے کو تقویت دیتا ہے۔ حضرت نافعؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ جب قرآن کی تلاوت کرتے تو ختم کرنے تک بات نہ کرتے لیکن ایک روز سورۃ البقرہ پڑھ رہے تھے۔ پڑھتے

(۱) سیوطی ۱/۲۱۲ (۲) ترمذی ۲۷۸/۴ (۳) سورۃ البقرہ ۲۲۳:۲ (۴) بخاری ۵/۶ ابن ابی شیبہ ۲۲۹/۴ ترمذی ۲۸۳/۴ بیہقی ۱۹۹/۷ (۵) رازی ۸۵/۶ (۶) ابن ابی شیبہ ۲۳۰/۴ بیہقی ۱۹۵/۷ طبری ۳۹۵/۲-۳۹۶ بیضاوی ۳۳۴/۲ ابن کثیر ۲۶۱/۱ مستدرک حاکم ۲/۲ (۷) ترمذی ۲۸۴/۴ طبری ۳۹۷/۲ بیہقی ۱۹۸/۷ بیضاوی ۳۳۴/۲ رازی ۸۵/۶ قرطبی ۹۲/۳ ابن کثیر ۲۶۱/۱ شوکانی ۲۰۲/۱۔

پڑھتے ایک مقام پر رک گئے اور فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ کس بارے میں نازل ہوئی ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا "یہ میرے بارے میں یوں اور یوں نازل ہوئی[1]۔ علاوہ ازیں قرآن پر غور کرنے سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے جیسا کہ اس سے قبل والی آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی اس لئے اس کے پیچھے کسی خاص رونما ہونے والے واقعے کا ہونا ناگزیر ہے' جبکہ یہودیوں کا خیال پہلے ہی سے چلا آرہا تھا۔ اس کی کسی فوری تردید کی ضرورت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ سبب نزول ہی بن جائے۔ ہاں البتہ آپ ﷺ نے اس آیت کے ذریعے ان کے خیال کی تکذیب ضرور فرمائی۔

اسی طرح انصاریہ کے واقعے کے بارے میں دو مختلف باتیں منقول ہیں۔ ایک کے مطابق جب آپ ﷺ تک بات پہنچی تو یہ آیت نازل ہوئی اور دوسری میں ہے کہ آپ نے اسے بلایا اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ نازل ہونے کا ذکر نہیں ہے چنانچہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ادعی الانصاریة فدعتها فتلا علیها هذه الآیة"[2] اس کے برعکس حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ بات قابل غور ہے کہ آنحضور ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس آیت کا نزول نہیں ہوا تھا پھر نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے بیان فرمائی۔

۳۔ منافق کا قتل

حضرت عمر فاروقؓ کی بے مثال اجتہادی بصیرت اور لازوال فہم و فراست کا شاہکار واقعہ وہ ہے کہ جس میں انہوں نے سرور کونین ﷺ کے فیصلے کو تسلیم نہ کرنے والے نام نہاد مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس سے حضرت عمرؓ کے خلاف ہر طرف پروپیگنڈے کا طوفان برپا ہو گیا۔ رسول خدا ﷺ خود بھی بہت پریشان ہوئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اقدام کی نہ صرف یہ کہ توثیق فرمائی اور حضرت عمرؓ کے بری ہونے کا اعلان کیا بلکہ ایک مستقل قاعدہ اور اصول بنادیا کہ جو شخص نبی ﷺ کے فیصلے اور حکم کو تسلیم نہیں کرتا اور آخری اتھارٹی نہیں سمجھتا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے اس عمل کو حق و صداقت کا معیار اور کسوٹی بنادیا۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

عتبہ بن ضمرہ نے بیان کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد نے دو آدمیوں کے بارے میں بیان کیا جو رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی جھگڑا (فیصلہ طلب امر) لے کر آئے تو آپ ﷺ نے برسر باطل کے خلاف حقدار کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا۔ جس شخص کے خلاف فیصلہ دیا گیا اس نے کہا میں تو اس فیصلے سے راضی نہیں تو فریق ثانی نے کہا تم کیا چاہتے ہو؟ کہا کہ ہم حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرف چلیں تو وہ دونوں ان کی طرف گئے پس جس کے حق میں فیصلہ دیا گیا تھا اس نے کہا کہ ہم یہ جھگڑا نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئے تو آپ نے اس کے خلاف میرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ تم نبی کریم ﷺ کے فیصلے کی پابندی کرو لیکن ان کے ساتھی نے (یہاں بھی) راضی ہونے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم حضرت عمرؓ بن الخطاب کے پاس چلیں' پس وہ دونوں ان کے پاس آگئے۔ جس کے حق میں فیصلہ دیا گیا تھا اس نے کہا کہ ہم اپنا جھگڑا لے کر نبی کریم ﷺ کی طرف گئے تھے تو آپ ﷺ نے اس شخص کے خلاف میرے حق میں فیصلہ فرمایا۔ یہ شخص راضی نہ ہوا تو ہم حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے تو انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے فیصلے پر قائم رہنے کی تلقین فرمائی لیکن یہ شخص پھر بھی راضی نہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا تو اس نے وہی جواب دیا۔ حضرت عمرؓ اپنے گھر میں داخل ہوئے اور ہاتھ میں تلوار سونتے ہوئے نکلے اور اس شخص کا سر اڑا دیا جو نبی کریم ﷺ کے فیصلے سے ناخوش تھا۔ جب انہوں نے اسے قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی[3]۔

(1) عربی:۱/۱۷۴ (2) طبری:۲/۲۹۶' کثیر:۱/۳۶۶ (3) کثیر:۱/۵۲۱' تیسیر:۲/۸۲۸' شوکانی:۱/۴۴۸۔

"فلاوربّک لایؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلّموا تسلیما[١]۔" (اے محمد ﷺ) تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سر تسلیم خم کر دیں۔) یہی واقعہ حضرت عروہ بن زبیرؓ سے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ مروی ہے "دو شخص اپنا ایک جھگڑا لے کر دربار محمدی ﷺ میں آئے۔ آپ ﷺ نے فیصلہ کر دیا لیکن جس کے خلاف فیصلہ ہوا اس نے کہا حضور آپ ہمیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا بہت اچھا ان کے پاس جاؤ۔ جب یہاں آئے تو جس کے موافق فیصلہ ہوا تھا اس نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ حضرت عمرؓ نے دوسرے آدمی سے پوچھا کیا یہ سچ ہے۔ اس نے اقرار کیا۔ آپ نے فرمایا اچھا تم دونوں یہاں ٹھہرو میں آتا ہوں اور فیصلہ کر دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں تلوار لئے آگئے اور اس شخص کی جس نے کہا تھا کہ ہمیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیجئے گردن اڑا دی۔ دوسرا شخص یہ دیکھتے ہی دوڑ کر آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچا اور کہا حضور ﷺ میرے ساتھی کو مار ڈالا گیا اور اگر میں بھی جان بچا کر بھاگ نہ آتا تو میری بھی خیر نہ تھی۔ آپؐ نے فرمایا "میں عمرؓ کے بارے میں یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ وہ اس جرأت کے ساتھ ایک مومن کا خون بہا دے گا۔" اس پر یہ آیت اتری اور اس کا خون کالعدم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کو بری کر دیا لیکن یہ طریقہ لوگوں میں اس کے بعد بھی جاری نہ ہو جائے اس لئے اس کے بعد ہی یہ آیت اتری "ولو انا کتبنا الخ" جو آگے آئی ہے[٢]۔"

علامہ ابن کثیر اور امام شوکانی نے اس قصہ کو غریب قرار دیا ہے کیونکہ راویوں میں ایک نام ابن لہیعہ کا آتا ہے جو کہ ضعیف ہے[٣]۔ لیکن امام ابن تیمیہ نے اسے درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ قصہ دو اور ذریعوں سے بھی روایت کیا گیا ہے پھر ابو عبداللہ احمد بن حنبل کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے ابن لہیعہ سے روایت محض استدلال کیلئے لی ہے۔ میں نے حدیث کو اس شخص سے اس معنی میں لیا ہے گویا کہ میں اس سے استدلال کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک اور روایت کی وجہ سے جو اس کو مضبوط کرتی ہے اس لئے نہیں کہ یہ تنہا حجت ہے[٤]۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں دو آراء ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ یہ آیت یہودی اور منافق کے قصے کے سلسلے میں نازل ہوئی جیسا کہ عطاء، مجاہد اور شعبی کا قول ہے اور میرے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے[٥]۔ امام رازی نے اس آیت کو سابقہ ایک آیت سے متصل قرار دیا ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے "الم تر الی الذین یزعمون انھم امنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ ویرید الشیطان ان یضلھم ضلالا بعیدا[٦]۔" (اے نبی ﷺ تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کیلئے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔)

اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اکثر مفسرین نے اس کے اسباب نزول میں کہا ہے کہ یہ منافقین میں سے ایک فرد اور یہود میں سے ایک فرد کے تنازع کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہودی نے کہا میرے اور تمہارے درمیان ابوالقاسم (محمد ﷺ) ہیں۔ منافق نے جس کا نام بشر تھا نے کہا کہ میرے اور تمہارے درمیان کعب بن اشرف ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول کریم ﷺ حق کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے اور رشوت کی طرف راغب نہیں ہوتے تھے جبکہ کعب بن اشرف رشوت کی شدید رغبت رکھتا تھا اور یہودی حق پر تھا جبکہ منافق باطل پر۔ اس بنا پر یہودی یہ چاہتا تھا کہ آنحضرت ﷺ فیصلہ فرمائیں اور منافق یہ چاہتا تھا کہ کعب

---

(١) سورۃ النساء ٤: ٦٥ (٢) کثیر ١: ٥٢١، سیوطی ٢: ١٢٤، بیہقی ١٧: ٣٩ (٣) کثیر ١: ٥٢، شوکانی ١: ٤٤٨ (٤) بیہقی ١٧: ٣٩ (٥) رازی ١٠: ١٦٣ (٦) سورۃ النساء ٤: ٦٠۔

بن اشرف فیصلہ کرے۔ پھر یہودی نے اپنی بات پر شدید اصرار کیا۔ اس پر دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے' انہوں نے یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس پر منافق نے کہا کہ میں راضی نہیں ہوں گا' جب تک ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فیصلہ نہ دیں۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے بھی یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس پر بھی منافق راضی نہ ہوا پھر کہا میرے اور تمہارے درمیان عمرؓ ہیں۔ دونوں ان کے پاس گئے تو یہودی نے انہیں اطلاع دی کہ نبی علیہ السلام نے اور ابو بکرؓ نے میرے حق میں فیصلہ دیا ہے' لیکن یہ ان کے فیصلے پر راضی نہیں ہوا۔ آپ نے منافق سے پوچھا کیا یہ بات صحیح ہے' اس نے کہا ہاں' پھر انہوں نے فرمایا ٹھہریئے مجھے ایک ضرورت ہے میں اسے پورا کر کے تمہاری طرف آتا ہوں۔ گھر کے اندر داخل ہوئے تلوار لی ان کی طرف آئے اور اس سے منافق پر وار کیا یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا' یہودی دوڑ گیا۔ منافق کے وارثوں نے آنحضور ﷺ سے شکایت کی۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ سے اس واقعے کے بارے میں پوچھا' تو انہوں نے جواب دیا یا رسول اللہ ﷺ اس نے آپ کے حکم کو رد کیا تھا۔ پس اسی وقت حضرت جبرائیلؑ نازل ہوئے اور کہا وہ فاروق ہیں' انہوں نے حق و باطل میں فرق کیا ہے۔ نبی ﷺ نے حضرت عمرؓ سے کہا: "انت الفاروق" اس قول کے مطابق طاغوت کعب بن اشرف ہے[1]۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں یہ واقعہ بذریعہ شعبی و ابن ابی حاتم حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اسے قتل کرنے کے بعد فرمایا "هكذا اقضي لمن يرض بقضاء الله تعالى و رسوله"[2]۔" ہمارے نزدیک یہ واقعہ بالکل صحیح ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے (واللہ علم) اس لئے کہ یہ کم از کم تین مختلف واسطوں سے منقول ہے۔ صرف ایک واسطے میں کسی ایک راوی کے ضعیف ہونے سے اس کی صداقت پر کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ حضرت عمر فاروقؓ کی موافقات میں بہت ہی نمایاں مقام دیئے جانے کے قابل ہے' کیونکہ آپ کی اجتہادی بصیرت' اخلاص' دینی غیرت' حق شناسی و حق پرستی کا نقطہ کمال ہے۔

o...... وحی بمطابق اقوال:

موافقات کی چوتھی قسم وہ ہے کہ آپ نے کسی بارے میں ایک رائے قائم کی تو نہ صرف یہ کہ اس کی موافقت کی گئی' بلکہ آپ کی زبان سے جو الفاظ نکلے کم و بیش وہی الفاظ وحی الٰہی کا حصہ بن گئے۔

ا۔ ازواج مطہرات کا جھگڑا:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد ہے کہ جب ازواج مطہراتؓ رسول اکرم ﷺ کی غیرت کے معاملے میں مجتمع ہو گئیں' تو میں نے کہا "عسى ربه ان طلقكن ان يبدله ازواجا خيرا منكن"[3]۔' اس کے بعد بالکل ٹھیک یہی الفاظ قرآن مجید میں نازل ہوئے[4]۔ اس واقعہ کی تفصیل کیا ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ طلاق کی نوبت کیوں پہنچی؟ اس معاملے میں حضرت عمرؓ کا کیا رول رہا؟ ان تمام سوالوں کا جواب ہمیں قرآن و حدیث سے ملتا ہے۔ مفسرین نے بھی اس پر خوب بحث کی ہے۔ سورہ تحریم کی ابتدائی پانچ آیات میں اس معاملے کے مختلف پہلوؤں کا اجمالی طور پر ذکر کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے "يايها النبي لم تحرم ما احل الله لك تبتغي مرضات ازواجك والله غفور رحيم قد فرض الله لكم تحلة ايمانكم والله مولكم وهو العليم الحكيم واذ اسر النبي الى بعض ازواجه حديثا فلما نبات به واظهره الله عليه عرف بعضه و اعرض عن بعض فلما نباها به قالت من انباك هذا قال نبانى العليم الخبير

---

(۱) روح ۱، ۱۵۳ (۲) ترمذی ۵، ۷، مجمع ۲، ٤٥٦ (۳) سورہ التحریم ٦٦، ٥ (٤) بخاری ۲، ۷، حنبل ۱، ۲۳، جوزی ا:٦، ۱، سیوطی ا:۱۲۲

ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما وان تظاہرا علیہ فان اللہ ھو مولہ و جبریل و صالح المؤمنین والملئکۃ بعد ذالک ظہیر عسی ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجا خیرا منکن مسلمات مؤمنات قانتات تائبات عابدات سائحات ثیبات و ابکارا[1]۔ "(اے پیغمبر ﷺ! جو چیز اللہ نے تم پر حلال کی ہے تم اسے (اپنے اوپر) حرام کیوں کرتے ہو؟ (کیا اس سے) اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہو اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔ خدا نے تم لوگوں کیلئے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے اور خدا ہی تمہارا کارساز ہے اور وہ دانا (اور) حکمت والا ہے اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بیوی سے راز کی بات کہی (اور کہا کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا) پھر جب اس نے (دوسری بی بی کو) خبر کر دی اور اللہ تعالیٰ نے پیغمبر پر اس کا حال کھول دیا تو پیغمبر نے کچھ تو (اس بیوی کو) جتلایا (جس نے راز فاش کر دیا تھا) اور کچھ نہیں جتلایا (چشم پوشی کی اس کی عزت رکھنے کی) جب پیغمبر نے اس بیوی کو یہ جتلایا تو وہ کہنے لگی تم کو یہ (سب حال) کس نے بتلایا ہے۔ پیغمبر نے کہا جاننے والے خبردار نے۔ (اے پیغمبر کی دونوں بیبیو) اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں (اس قصور سے) توبہ کرو (تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا) تمہارے دل جھک پڑے ہیں اور اگر تم دونوں (ایک دوسرے کی مددگار بن کر) پیغمبر پر زور ڈالنا چاہو گی تو یہ سمجھ رکھو کہ خدا اور جبرائیل اور نیک مسلمان سب پیغمبر کے حامی ہیں اور فرشتے الگ ان کے علاوہ مدد کو حاضر ہیں۔ اگر پیغمبر تم کو طلاق دے دیں تو عجب نہیں ان کا پروردگار تمہارے بدلے ان کو تم سے بہتر بیویاں عنایت فرمادے (جو) فرمانبردار ایماندار نماز گزار توبہ کرنے والیاں عاجزی کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں بیاہی ہوئی اور کنواریاں ہوں۔) ان آیات کے شان نزول کے سلسلے میں دو مختلف واقعات منقول ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت ماریہ قبطیہؓ جو کہ ایک لونڈی اور رسول اکرم ﷺ کے فرزند ارجمند حضرت ابراہیم کی والدہ تھیں۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ حضرت حفصہؓ کے گھر ان کی باری والے دن ان سے ملے اس پر انہیں رنج ہوا اور کہا میری باری والے دن میرے بستر پر؟ حضور ﷺ نے انہیں رضامند کرنے کیلئے کہہ دیا کہ میں اسے اپنے اوپر حرام کرتا ہوں۔ اب تم اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کرنا لیکن حضرت حفصہؓ نے یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے کہہ دیا۔ اللہ نے اس کی اطلاع اپنے نبی ﷺ کو دے دی اور یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ آپ نے کفارہ دے کر اپنی قسم توڑ دی[2]۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت حفصہؓ کے گھر میں آپ تھے وہ جب تشریف لائیں اور حضرت ماریہؓ سے آپ کو مشغول پایا تو آپؐ نے انہیں فرمایا تم (حضرت) عائشہؓ کو خبر نہ کرنا میں تمہیں ایک بشارت سناتا ہوں۔ میرے انتقال کے بعد میری خلافت پر (حضرت) ابوبکرؓ کے بعد تمہارے والد آئیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ کو خبر کر دی۔ پس حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا اس کی خبر آپ کو کس نے پہنچائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھے علیم و خبیر خدا نے یہ خبر پہنچائی ہے۔" صدیقہؓ نے کہا "میں آپ کی طرف نہ دیکھوں گی جب تک کہ آپ ماریہؓ کو اپنے اوپر حرام نہ کریں۔" آپؐ نے کر لی اس پر آیت "یاایھا النبی الخ" نازل ہوئی[3]۔ دوسرا یہ کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ام المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں شہد پیتے تھے اور وہاں ٹھہرتے تھے پھر میرا اور حفصہؓ کا اس پر اتفاق ہوا کہ ہم میں سے حضورؐ جس کے ہاں داخل ہوں تو وہ کہے کیا آپ نے مغافیر (ایک بوٹی) کھائی ہے؟ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے (چنانچہ جب آپ تشریف لائے تو اس منصوبہ پر عمل کیا گیا) آپؐ نے فرمایا "نہیں میں زینب بنت جحش کے ہاں شہد پیا کرتا ہوں لیکن اب ہرگز نہیں پیوں گا۔ میں نے اس کی قسم کھائی ہے لیکن تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا[4]۔"

صحیح مسلم کی ایک اور روایت کے مطابق آپؐ نے حضرت حفصہؓ کے ہاں شہد پیا اور باہمی ایکا کرنے والی ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ حضرت سودہؓ

(۱) سورۃ التحریم ۶۶: ۱-۵ (۲) طبری ۱۸: ۱۵۶-۵۷، زمخشری ۴: ۵۶۲، رازی ۸: ۳۰ ۴۳، کثیر ۴: ۳۸۶ (۳) کثیر ۴: ۳۹، زمخشری ۴/۵۶۲ (۴) بخاری ۶/۶۸، مسلم ۴/۱۸۹

اور حضرت صفیہؓ تھیں۔ یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے ان الفاظ میں بھی مروی ہے کہ حضور ﷺ کو مٹھاس اور شہد بہت پسند تھا۔ عصر کے بعد اپنی بیویوں کے گھر آتے اور کسی سے نزدیکی کرتے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ حضرت حفصہؓ کے پاس گئے اور جتنا وہاں رکتے تھے اس سے زیادہ رکے۔ مجھے غیرت سوار ہوئی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان کی قوم ایک عورت نے ایک کپی شہد کی انہیں بطور ہدیہ بھیجی ہے۔ انہوں نے حضور کو شہد کا شربت پلایا اور اتنی دیر روک رکھا۔ میں نے کہا خیر اسے کسی حیلہ سے ٹال دوں گی۔ چنانچہ میں نے حضرت سودہؓ بنت زمعہ سے کہا کہ تمہارے پاس جب حضور ﷺ آئیں اور قریب ہوں تو تم کہنا کہ آج کیا آپ نے معافیر کھایا ہے۔ آپؐ فرمائیں گے نہیں۔ تم کہنا پھر یہ بدبو کیسی آتی ہے۔ آپ فرمائیں گے مجھے حفصہؓ نے شہد پلایا تھا تو کہنا شاید شہد کی مکھی نے عرفط نامی خاردار درخت چوسا ہوگا۔ میرے پاس آئیں گے میں بھی یہی کہوں گی۔ پھر اے صفیہؓ جب تمہارے پاس آپ آئیں تو تو بھی یہی کہنا۔ حضرت سودہؓ فرماتی ہیں جب حضور ﷺ میرے گھر آنے تو دروازے ہی پر تھے جو میں نے ارادہ کیا کہ تم نے جو مجھ سے کہا ہے میں آپ سے کہہ دوں کیونکہ میں تم سے بہت ڈرتی تھی لیکن خیر اس وقت تو خاموش رہی۔ جب آپؐ میرے پاس آئے میں نے بھی یہی کہا پھر حضرت صفیہؓ کے پاس گئے تو انہوں نے بھی یہی کہا پھر حضرت حفصہؓ نے شہد کا شربت پلانا چاہا۔ آپؐ نے فرمایا "مجھے اس کی حاجت نہیں۔" حضرت سودہؓ فرمانے لگیں افسوس ہم نے اسے حرام کرادیا۔ میں نے کہا خاموش رہو[1]۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ شہد پلانے والیوں میں حضرت حفصہؓ اور حضرت زینبؓ بنت جحش دونوں کا نام ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دو الگ واقعے ہیں ان میں کونسا سبب نزول ہے یہ غور طلب ہے[2]۔

اب رہی یہ بات ان آیت کے شان نزول کے سلسلے میں مذکورہ دونوں واقعات میں سے کونسا قابل ترجیح ہے؟ عام طور پر مفسرین کرام کا خیال یہ ہے کہ شہد ہی کو حضور کرم ﷺ نے اپنے اوپر حرام قرار دیا تھا[3]۔ لیکن ہماری رائے میں اغلب یہ ہے کہ دونوں ہی واقعے پے در پے رونما ہوئے ہوں گے (واللہ عالم) علاوہ ازیں چھوٹے موٹے اور بھی مسائل ایسے تھے 'جن کی وجہ سے آپ کی خانگی زندگی تلخ ہوگئی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے براہ راست ازواج مطہرات کی گرفت بھی فرمائی اور تربیت بھی اور اپنے رسول سے فرمایا کہ آپ ان کی خوشنودی کی خاطر اپنے اصولوں اور خدا کی حدود میں ہرگز نرمی نہ پیدا کریں۔ وہ بات جس کو نبی ﷺ نے صیغہ راز میں رکھنے کا حکم دیا تھا جس کی طرف آیت نمبر ۳ میں اشارہ ہے۔ مذکورہ بالا روایات میں اس کی طرف بھی نشاندہی کردی گئی ہے۔ ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دو عورتیں جنہیں اس سورۃ کی چوتھی آیت میں مخاطب کیا گیا ہے 'وہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما تھیں 'کیونکہ مذکورہ واقعات میں ان کا ایک مرکزی کردار تھا۔

اس سارے معاملے میں حضرت عمر فاروقؓ کو اس لئے مداخلت کرنی پڑی کہ ان کی اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ازواج مطہرات میں شامل تھیں۔ مزید یہ بھی کہ آپ یہ جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی پریشانی کو کم کرنے اور مسائل کو سلجھانے میں جو بھی ممکن ہو سکے کریں۔ آپ کو اس شکر رنجی کی کیسے اطلاع ہوئی؟ آپ نے اس کیلئے کیا کیا جس کی بناء پر قرآن مجید میں آپ کی موافقت کی گئی؟ یہ ایک دلچسپ داستان ہے جو تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ کتب احادیث و تفسیر میں موجود ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "میں ایک مدت سے اس فکر میں تھا کہ حضرت عمرؓ سے پوچھوں کہ رسول اللہ ﷺ کی بیویوں میں سے وہ کون سی دو بیویاں ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کے مقابلے میں جتھہ بندی کرلی تھی اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ "بہت ارشاد فرمائی ہے کہ "ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما" لیکن ان کی ہیبت کی وجہ سے میری ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر ایک مرتبہ وہ حج کیلئے تشریف لے گئے اور

(۱) مسلم ۱۸۵/۲' زمخشری ۵۶۳/۱' رازی ۴۱/۳۰ (۲) کثیر ۳۸۸/۴ (۳) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مودودی ۱۷/۶۔

میں ان کے ساتھ گیا۔ واپسی پر راستہ میں ایک جگہ ان کو وضو کراتے ہوئے مجھے موقع مل گیا اور میں نے یہ سوال پوچھ لیا۔ انہوں نے جواب دیا وہ عائشہؓ اور حفصہؓ تھیں۔ پھر انہوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ ہم قریش کے لوگ اپنی عورتوں کو دبا کر رکھنے کے عادی تھے۔ جب ہم مدینہ آئے تو ہمیں یہاں ایسے لوگ ملے جن پر ان کی بیویاں حاوی تھیں اور یہی سبق ہماری عورتیں بھی ان سے سیکھنے لگیں۔ ایک روز میں اپنی بیوی پر ناراض ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے پلٹ کر جواب دے رہی ہے (اصل الفاظ ہیں فاذا هي تراجعني) مجھے یہ بہت ناگوار ہوا کہ وہ مجھے پلٹ کر جواب دے رہی ہے۔ اس نے کہا آپ اس بات پر کیوں بگڑتے ہیں کہ میں آپ کو پلٹ کر جواب دوں؟ خدا کی قسم رسول اللہ ﷺ کی بیویاں حضور کو دو بدو جواب دیتی ہیں (اصل لفظ ہے ليراجعنه) اور ان میں سے کوئی حضور ﷺ سے دن دن بھر روٹھی رہتی ہے (بخاری کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ اس سے دن بھر ناراض رہتے ہیں) یہ سن کر میں گھر سے نکلا اور حفصہؓ کے ہاں گیا (جو حضرت عمرؓ کی بیٹی اور حضور ﷺ کی بیوی تھیں) میں نے ان سے پوچھا کیا تو رسول اللہ ﷺ کو دو بدو جواب دیتی ہے؟ اس نے کہا ہاں! میں نے پوچھا اور کیا تم میں سے کوئی دن دن بھر حضورؐ سے روٹھی رہتی ہے۔ (بخاری کی روایت میں ہے کہ حضور دن بھر اس سے ناراض رہتے ہیں) اس نے کہا ہاں! میں نے کہا نامراد ہو گئی اور گھاٹے میں پڑ گئی وہ عورت جو تم میں سے ایسا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات سے بے خوف ہو گئی ہے کہ اپنے رسول ﷺ کے غضب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہو جائے اور وہ ہلاکت میں پڑ جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کبھی زبان درازی نہ کر (یہاں بھی وہی الفاظ ہیں لاتراجعي) اور نہ ان سے کسی چیز کا مطالبہ کر' میرے مال سے تیرا جو جی چاہے مانگ لیا کر۔ تو اس بات سے کسی دھوکے میں نہ پڑ کہ تیری پڑوسن (مراد حضرت عائشہؓ) تجھ سے زیادہ خوبصورت اور رسول اللہ ﷺ کو زیادہ محبوب ہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے نکل کر ام سلمہؓ کے پاس پہنچا' جو میری رشتہ دار تھیں اور میں نے اس معاملہ میں ان سے بات کی۔ انہوں نے کہا "ابن خطابؓ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ہر معاملہ میں تم نے دخل دیا' یہاں تک کہ اب رسول اللہ ﷺ اور ان کی بیویوں کے معاملے میں بھی دخل دینے چلے ہو۔" ان کی اس بات نے میری ہمت توڑ دی پھر ایسا ہوا کہ میرا ایک انصاری پڑوسی رات کے وقت میرے گھر آیا اور اس نے مجھے پکارا۔ ہم دونوں باری باری رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور جو بات کسی کی باری کے دن ہوتی تھی' وہ دوسرے کو بتا دیا کرتا تھا۔ زمانہ وہ تھا جب ہمیں غسان کے حملے کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ اس کے پکارنے پر جب میں نکلا تو اس نے کہا کہ ایک بڑا حادثہ پیش آ گیا ہے۔ میں نے کہا "کیا غسانی چڑھ آئے ہیں؟" اس نے کہا نہیں اس سے بھی زیادہ بڑا معاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے کہا "برباد ہوئی اور نامراد ہو گئی حفصہؓ (بخاری کے الفاظ میں رغم انف حفصہؓ و عائشہؓ) مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ ہونے والی بات ہے۔"

صبح کی نماز پڑھتے ہی کپڑے پہن کر میں چلا' سیدھا حفصہؓ کے پاس گیا' دیکھا کہ وہ رو رہی ہے۔ میں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے تمہیں طلاق دے دی؟ جواب دیا یہ تو کچھ معلوم نہیں' آپؐ ہم سے الگ ہو کر اپنے بالا خانے میں تشریف فرما ہیں۔ میں وہاں گیا' دیکھا کہ ایک حبشی غلام پہرے پر ہے۔ میں نے کہا "جاؤ میرے لئے اجازت طلب کرو۔" وہ گیا پھر آ کر کہا کہ حضور ﷺ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ میں وہاں سے واپس چلا آیا' مسجد میں گیا دیکھا کہ منبر کے پاس ایک گروہ صحابہ کا بیٹھا ہوا ہے اور بعض کے آنسو نکل رہے ہیں۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا' لیکن چین کہاں؟ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں جا کر غلام سے کہا کہ میرے لئے اجازت طلب کرو۔ اس نے پھر کہا کہ کچھ جواب نہیں ملا۔ میں دوبارہ مسجد میں چلا گیا' پھر وہاں سے گھبرا کر نکلا' یہاں آیا پھر غلام سے کہا' غلام گیا اور وہی جواب دیا۔ میں واپس مڑا ہی تھا کہ غلام نے مجھے آواز دی کہ آیئے آپ کو اجازت مل گئی۔ میں گیا' دیکھا کہ حضور ﷺ ایک بورئیے پر ٹیک لگائے بیٹھے ہیں' جس کے نشان آپ ﷺ کے جسم مبارک پر ظاہر ہیں۔ میں نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ' کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔" آپؐ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور فرمایا "نہیں!" میں نے کہا "اللہ اکبر! یا رسول اللہ بات یہ ہے کہ ہم قوم قریش تو اپنی بیویوں کو اپنے دباؤ میں رکھا کرتے تھے' لیکن مدینے والوں پر ان کی بیویاں غالب ہیں۔ یہاں آ کر

ہماری عورتوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی یہی حرکت شروع کر دی ہے۔" پھر میں نے اپنی بیوی کا واقعہ بیان کیا اور اپنا۔ یہ خبر پا کر حضور ﷺ کی بیویاں بھی ایسا کرتی ہیں' یہ کہنا بھی بیان کیا کہ نہیں ڈر نہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے غصے کی وجہ سے خدا بھی ان سے ناراض ہو جائے اور وہ ہلاک ہو جائیں۔ اس پر حضور ﷺ مسکرائے' میں نے پھر اپنا حفصہؓ کے پاس جانا اور انہیں حضرت عائشہؓ کی ریس کرنے سے روکنا بیان کیا' اس پر دوبارہ مسکرائے۔ میں نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو کچھ دیر رک جاؤں۔ آپؐ نے اجازت دی میں بیٹھ گیا۔ اب جو سر اٹھا کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو آپ کی بیٹھک (دربار خاص) میں سوائے تین خشک کھالوں کے اور کوئی چیز نہ دیکھی۔ آزردہ دل ہو کر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ ﷺ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت پر کشادگی کرے۔ دیکھئے تو فارسی و رومی جو اللہ کی عبادت ہی نہیں کرتے انہیں کس قدر دنیا کی نعمتوں میں وسعت دی گئی ہے۔" یہ سنتے ہی آپ سنبھل بیٹھے اور فرمانے لگے "اے ابن خطاب' کیا تو شک میں ہے؟" اس قوم کے انعامات انہیں بعجلت دنیا میں ہی دے دیئے گئے ہیں۔" میں نے کہا "حضور ﷺ! میرے لئے اللہ سے بخشش کی طلب کیجئے۔" بات یہ تھی کہ آپؐ نے بوجہ سخت ناراضگی قسم کھائی تھی کہ مہینہ بھر تک اپنی بیویوں کے پاس نہ جاؤں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہہ کی (۱)۔

بخاری میں حضرت انسؓ سے اور مسند میں حضرت عبداللہؓ بن عباس سے' حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایات منقول ہوئی ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک مہینہ تک کیلئے اپنی بیویوں سے علیحدہ رہنے کا عہد فرمایا تھا اور اپنے بالاخانے میں بیٹھ گئے تھے۔ ۲۹ دن گزر جانے پر جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا "آپ کی قسم پوری ہو گئی ہے' مہینہ مکمل ہو گیا (۲)۔" سورۃ التحریم کی پانچویں آیت میں تمام ازواج مطہرات کو تنبیہہ کی گئی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ مرکزی کردار تو دو نے ادا کیا' لیکن باقی سب بھی اس جھگڑے میں شریک ہو گئیں اس لئے حضور ﷺ نے سب سے قطع تعلق کر لیا۔ حافظ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں حضرت عائشہؓ کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ ازواج مطہرات کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک میں خود حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ' حضرت سودہؓ اور حضرت صفیہؓ تھیں اور دوسری میں حضرت زینبؓ' حضرت ام سلمہؓ اور باقی ازواج شامل تھیں (۳)۔ حضرت عمرؓ نے بطور تنبیہہ جو الفاظ ازواج مطہرات کو کہے' وہی قرآن حکیم کا حصہ بن گئے۔

بخاری میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "نبی ﷺ کی بیویوں نے آپس کے رشک و رقابت میں مل جل کر حضور ﷺ کو تنگ کر دیا تھا۔ (اصل الفاظ میں اجتمع نساء النبی ﷺ فی الغیرۃ علیہ) اس پر میں نے ان سے کہا کہ بعید نہیں اگر حضور ﷺ تم کو طلاق دے دیں' تو اللہ تم سے بہتر بیویاں آپ کو عطا فرما دے (۴)۔" ابن ابی حاتم نے حضرت انسؓ کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا بیان ان الفاظ میں نقل کیا ہے "مجھے خبر پہنچی کہ امہات المومنین اور نبی ﷺ کے درمیان کچھ ناچاقی ہو گئی ہے۔ اس پر میں ان میں سے ایک ایک کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کو تنگ کرنے سے باز آ جاؤ' ورنہ اللہ تمہارے بدلے تم سے بہتر بیویاں حضور ﷺ کو عطا فرما دے گا۔" یہاں تک کہ جب امہات المومنین میں سے آخری کے پاس گیا (اور یہ بخاری کی ایک روایت کے بموجب حضرت ام سلمہؓ تھیں) تو انہوں نے مجھے جواب دیا "اے عمر' کیا رسول اللہ ﷺ عورتوں کی نصیحت کیلئے کافی نہیں ہیں کہ تم انہیں نصیحت کرنے چلے ہو؟ اس پر میں خاموش ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (۵)۔"

روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کو بھی تسلی دی اور یہاں بھی جو الفاظ آپ کے منہ سے نکلے کم و بیش وہی الفاظ وحی الٰہی کا حصہ

---

(۱) بخاری،۶: ۶۹' مسلم ۴: ۱۹۰' حنبل ۱/ ۲۵۲' ترمذی،۵: ۹۳' طبری ۱۸: ۱۶۱ (۲) بخاری،۶/۳ ،۱ نسائی ۶: ۱۶۶ مسلم،۶: ۱۹۱ (۳) مودودی ۶: ۲۷

(۴) بخاری،۶: ۷۱ (۵) حبان،۹: ۲۲' طبری ۱۸: ۱۶۴' کثیر ۴: ۲۹۰۔

بن گئے۔ سورۃ التحریم کی چوتھی آیت کے آخری کلمات انہیں پر مشتمل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے بیان کیا کہ جب نبی ﷺ نے اپنی بیویوں سے علیحدگی اختیار فرمائی تو میں مسجد نبوی میں پہنچا۔ دیکھا کہ لوگ متفکر بیٹھے ہوئے کنکریاں اٹھا اٹھا کر گرا رہے ہیں اور آپس میں کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عائشہ اور حفصہؓ کے ہاں اپنے جانے اور ان کی نصیحت کرنے کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا "بیویوں کے معاملہ میں آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ اگر آپ ان کو طلاق دے دیں تو اللہ آپ کے ساتھ ہے، سارے ملائکہ اور جبریل اور میکائیل آپؐ کے ساتھ ہیں اور میں اور ابوبکرؓ اور سب اہل ایمان آپؐ کے ساتھ ہیں۔" میں اللہ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ میں نے کوئی بات کہی ہو اور اللہ سے یہ امید نہ رکھی ہو کہ وہ میرے قول کی تصدیق فرما دے گا۔ چنانچہ اس کے بعد سورۃ التحریم کی یہ آیات نازل ہو گئیں۔ پھر میں نے حضور ﷺ سے پوچھا "کیا آپؐ نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟" حضور ﷺ نے فرمایا "نہیں!" اس پر میں نے مسجد نبوی کے دروازے پر کھڑے ہو کر بآواز بلند اعلان کیا کہ حضور ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے[1]۔

اس پورے قصے میں حضرت عمر فاروقؓ کا کردار مثالی رہا کیونکہ جب آنحضور ﷺ ازواج مطہرات سے علیحدہ ہو کر بالا خانے میں قیام پذیر ہو گئے تو یہ تاثر پیدا ہوا کہ شاید آپؐ نے انہیں طلاق دے دی ہے۔ منافقین نے صورتحال سے خوب فائدہ اٹھایا اور اس افواہ کو ایک حقیقت کے طور پر پھیلانا شروع کر دیا۔ وہ عام طور پر مختلف افواہوں سے ہی مایوسی، بے یقینی اور بددلی پھیلاتے اور اپنے مقاصد حاصل کرتے تھے۔ اکثر لوگوں کو اس کا یقین ہو گیا، ہر طرف پریشانی، غمی اور اداسی چھا گئی۔ ایسے عالم میں حضرت عمر فاروقؓ ہی وہ شخص تھے، جنہوں نے اس پر یقین کر لینے کے بجائے اس کی پوری چھان بین اور تحقیق کی، ازواج مطہرات سے بھی ملے، صحابہ کرامؓ سے بھی ملے۔ بار بار کوشش کر کے خود سرورِ کونین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تاکہ صحیح بات تک پہنچ سکیں اور اس کی تصدیق کر سکیں۔ آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور آپ ﷺ سے معلوم کر کے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر بآواز بلند یہ اعلان کر دیا کہ آپؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی۔ اسی طرح اس مسئلے کو سلجھانے کیلئے بھی جو کچھ کیا، وہ آپ کے فہم، فراست اور حکمت و تدبر کا بین ثبوت ہے۔ روایت میں آتا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2] "واذا جاء هم امر من الامن او الخوف اذاعوا به ولو ردوه الى الرسول والى اولى الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم ولولا فضل الله عليكم و رحمته لا تبعتم الشيطن الا قليلا[3]۔" (جہاں انہیں کوئی خبر امن یا خوف کی ملتی ہے اسے پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ اسے رسول اللہ ﷺ اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں، وہ ایسے لوگوں کے علم میں آ جائے، جو یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔) حضرت عمرؓ یہ آیت پڑھ کر فرماتے تھے کہ بے شک میں اس امر کا استنباط کرنے والوں میں سے ہوں[4]۔

۲۔ واقعہ افک:

آپ کے الفاظ کی موافقت کی ایک اور مثال واقعہ افک بھی ہے۔ ۶ھ میں غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر مسلمانوں کے قافلے نے ایک جگہ رات کو پڑاؤ ڈالا۔ رات کے آخری پہر رسول اکرم ﷺ نے وہاں سے روانگی کا حکم دیا۔ حضرت عائشہؓ رفع حاجت کیلئے نکلی ہوئی تھیں۔ ایک ہار کی تلاش میں انہیں دیر ہو گئی۔ کجاوہ باندھنے اور رکھنے پر متعین لوگوں نے ہودج کو اونٹ پر رکھ کر باندھ دیا اور یہ سمجھے کہ حضرت عائشہؓ اس میں موجود ہیں، قافلہ روانہ ہو گیا۔ حضرت عائشہؓ کو ایک بزرگ

(۱) مسلم ۱۸۹/۴، طبری ۱۶۲/۱۸، رازی ۴۴/۳۰، کثیر ۳۸۹/۴ (۲) مسلم ۱۹۰/۴ (۳) سورہ النساء ۸۳:۴ (۴) کثیر ۳۸۹/۴

بزرگ صحابی صفوانؓ بن معطل جو پیچھے آ رہے تھے اونٹ پر بٹھا کر لے آئے۔ منافقین نے بہتان لگا دیا اور پراپیگنڈے کی بھرپور مہم شروع کر دی جو ایک ماہ تک جاری رہی۔ اس سے متاثر ہو کر بہت سے مخلص مسلمان مثلاً حضرت حمنہؓ بنت جحش ٗ حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت مسطحؓ بھی شریک ہو گئے۔ رسول اکرم ﷺ بہت پریشان ہوئے اور تحقیق حالات کیلئے مشورہ طلب فرمایا۔ مختلف صحابہ کرامؓ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی[1]۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! حضرت عائشہؓ سے آپ کا نکاح کس نے کیا تھا؟" آپؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے۔" حضرت عمرؓ نے عرض کیا "حضور ﷺ! کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ آپؐ کے رب نے آپ کو عیب دار چیز دی ہو گی؟" "سبحانك هذا بهتان عظيم۔" "بس اسی طرح کی ایک آیت نازل ہوئی[2]۔ ارشاد ہو "ولو لا اذا سمعتموه قلتم مايكون لنا ان نتكلم بهذا سبحانك هذا بهتان عظيم[3]۔" اس سے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اس الزام سے بری قرار دیا بلکہ اسے سراسر افک اور جھوٹ قرار دیا اور انسانی عزت کو محترم قرار دیا۔ اس بارے میں تفصیلی احکام نازل فرمائے اور اس واقعے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی[4]۔

۳۔ اسی نوعیت کی ایک اور موافقت یہ بھی ہے۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين ثم جعلنه نطفة في قرار مكين ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاما فكسونا العظام لحما ثم انشاناه خلقا آخر[5]۔" (ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا پھر اسے ایک خاص مقام پر نطفہ بنایا پھر نطفہ کو خون بستہ پھر بستہ خون کو لوتھڑا پھر لوتھڑے کو ہڈیاں پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا بعد ازاں ہم نے اسے دوسری تخلیق عطا کی۔) تو میں نے کہا "فتبارك الله احسن الخالقين[6]۔" (بس برتر ہے سب سے اچھا خالق) چنانچہ وحی نازل ہوئی "فتبارك الله احسن الخالقين[7]۔"

۴۔ ایک اور موافقت یہ بھی ہے حضرت عمرؓ یہود کی طرف گئے اور فرمایا "میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری ٗ کیا تم لوگ حضرت محمد ﷺ کی اپنی کتاب میں توصیف پاتے ہو؟"

انہوں نے کہا: "ہاں!"

فرمایا: "تو پھر تم لوگ ان کا اتباع کیوں نہیں کرتے؟"

نہوں نے کہا "اللہ نے جو بھی نبی بھیجا اس کیلئے ایک فرشتہ مقرر کیا جبریل آپ کا کفیل ہے اور وہی ان کے پاس آتا جاتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے البتہ میکائیل ہمارا دوست ہے۔ اگر وہ وحی لاتے تو ہم ان کا اتباع ضرور کرتے۔"

راوی فرماتے ہیں ادھر سے آپ کا گزر ہوا تو وہ بولے "آپ حاضر خدمت ہونے تو یہ وحی اتر چکی تھی[8]۔" "قل من كان عدوا لجبريل فانه نزله على قلبك باذن الله مصدقا لما بين يديه وهدى و بشرى للمومنين من كان عدوا لله وملئكته ورسله و جبريل و ميكال فان الله عدو للكفرين[9]۔"

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ہشام ۳/ ۳۱۰ ٗ بخاری ۵/ ۵۵ ٗ مسلم ۸/ ۱۱۲ ٗ ترمذی ۵/ ۱۳ ٗ بیہقی ۷/ ۴۰۸ (۲) سیوطی ا ۱۲۳ (۳) سورہ النور ۲۴: ۱۶ (۴) ملاحظہ ہو سورہ النور ۲۴: ۱۱ تا ۲۶ (۵) سورہ المومنون ۲۳: ۱۲۔ ۱۴ (۶) قرطبی ۱۲/ ۱۱۰ ٗ کثیر ۳/ ۲۴۱ ٗ سیوطی ا: ۱۲۳ ٗ مراغی ۱۸/ ۹ (۷) سورہ المومنون ۲۳: ۱۴ (۸) طبری ا: ۴۳۴ ٗ زمخشری ۱/ ۱۶۹ ٗ بیضاوی ۱/ ۱۶۳ (۹) سورہ البقرہ ۲: ۹۷۔

(آپ کہہ دیجئے اے نبی کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہے وہ ہوا کرے اس نے اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر قرآن اتارا ہے جو موجودہ کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور ہدایت و بشارت ہے مومنوں کے واسطے جو شخص اللہ ملائکہ رسولوں اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہے وہ ہوا کرے بے شک اللہ کافروں کا دشمن ہے۔)

اس واقعہ کی مزید تفصیل ایک اور روایت سے معلوم ہوتی ہے' جسے مفسرین نے تھوڑے بہت لفظی اختلاف سے مذکورہ آیت کے شان نزول کے ضمن میں نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے "شعبیؒ کہتے ہیں حضرت عمرؓ روحاء میں آئے دیکھا کہ لوگ دوڑ بھاگ کر پتھروں کے ایک تودے کے پاس جاکر نماز ادا کر رہے ہیں۔ پوچھا کہ کیا بات ہے' جواب ملا کہ اس جگہ رسول اللہ ﷺ نے نماز ادا کی ہے۔ آپ بہت ناراض ہوئے کہ حضور ﷺ کو جہاں کہیں نماز کا وقت آتا تھا پڑھ لیا کرتے تھے پھر چلے جایا کرتے تھے۔ اب ان مقامات کو متبرک سمجھ کر خواہ مخواہ وہیں جاکر نماز ادا کرنا کس نے بتایا؟ پھر آپ اور باتوں میں لگ گئے فرمانے لگے میں یہودیوں کے مجمع میں کبھی کبھی چلا جایا کرتا اور یہ دیکھتا رہتا تھا کہ کس طرح قرآن تورات اور تورات قرآن کی تصدیق کر رہی ہے۔ یہودی مجھ سے محبت ظاہر کرنے لگے اور اکثر بات چیت ہوا کرتی تھی۔ ایک دن میں ان سے باتیں کر رہا تھا' جو راستے سے حضور ﷺ نکلے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تمہارے نبی وہ جا رہے ہیں۔ میں نے کہا خیر میں جاتا ہوں' لیکن یہ تو بتاؤ تمہیں اللہ واحد کی قسم خدا کے حق یاد کرو اور خدا کی نعمتوں پر نظر رکھ کر خدا کی کتاب تم میں موجود ہونے کا خیال رکھ کر اسی رب کی قسم کھا کر کہو کہ تم حضور ﷺ کو رسول نہیں مانتے۔ اب سب خاموش ہو گئے ان کے بڑے عالم نے جو ان سب میں علم میں بھی کامل تھا اور سب کا سردار بھی تھا ان سے کہا: تم سخت قسم اس نے دی ہے کیونکہ تم صاف اور سچ جواب نہیں دیتے؟ انہوں نے کہا کہ حضرت آپ ہی ہمارے بڑے ہیں ورا آپ ہی جواب دیجئے۔ اس لاٹ پادری نے کہا سنئے جناب آپ نے زبردست قسم دی ہے سچ تو یہ ہے کہ ہم دل سے جانتے ہیں کہ حضور ﷺ خدا کے سچے رسول ہیں۔" میں نے کہا "افسوس جب جانتے ہو تو مانتے کیوں نہیں۔" کہا صرف اس وجہ سے کہ ان کے پاس وحی آسمانی لے کر آنے والے جبریل ہیں وہ نہایت سختی' تنگی' شدت' عذاب اور تکلیف کے فرشتے ہیں' ہم ان کے اور وہ ہمارے دشمن ہیں۔ اگر وحی لے کر حضرت میکائیل آتے جو رحمت و رافت' تخفیف و راحت والے فرشتے ہیں' تو ہمیں ماننے میں بھی تامل نہ ہوتا۔ میں نے کہا "اچھا بتلاؤ ان دونوں کی خدا کے نزدیک کیا قدر و منزلت ہے؟" انہوں نے کہا کہ ایک تو جناب باری تعالیٰ کے دائیں طرف ہیں اور دوسرا دوسری طرف۔ میں نے کہا "اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں جو ان میں سے کسی کا دشمن ہو اس کا دشمن خدا بھی ہے اور دوسرا فرشتہ بھی' جبریل کے دشمن سے میکائیل دوستی نہیں کر سکتے اور میکائیل کا دشمن جبریل کا دوست نہیں ہو سکتا۔ نہ انہیں سے کسی کا دشمن خدا کا دوست ہو سکتا ہے۔ نہ ان دونوں میں سے کوئی بے اجازت باری تعالیٰ کے زمین پر آسکتا ہے' نہ کوئی کام کر سکتا ہے۔ واللہ مجھے نہ تم سے لالچ ہے نہ خوف ہے۔ سنو جو شخص اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو اس کے فرشتوں' اس کے رسولوں اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہو تو ایسے کافر کا خدا بھی دشمن ہے اتنا کہہ کر میں چلا آیا۔ حضور ﷺ کے پاس پہنچا' تو آپؐ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا "اے ابن خطابؓ مجھ پر تازہ وحی نازل ہوئی ہے۔" میں نے کہا "حضور ﷺ سنا دیجئے" آپؐ نے یہی آیت پڑھ کر سنائی۔ میں نے کہا "حضور ﷺ آپ پر میرے ماں باپ قربان یہی باتیں ابھی ابھی یہودیوں سے میری ہو رہی تھیں۔ میں تو چاہتا ہی تھا' بلکہ اسی لئے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو خبر کروں مگر میرے آنے سے پہلے لطیف خبر سننے دیکھنے والے خدا نے آپ ﷺ کو خبر پہنچا دی[١]۔"

علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ روایت منقطع ہے اس کی سند متصل نہیں کیونکہ شعبی نے حضرت عمرؓ کا زمانہ نہیں پایا[٢]۔ امام شوکانی کہتے ہیں اس کے باوجود اس کی اسناد صحیح ہیں[٣]۔

---

(١) طبری ١/٤٣٣' ورب ٣/٢١٦' کثیر ١/١٣١ (٢) کثیر ١/١٣١ (٣) شوکانی ١/١٠٠۔

اس بات سے اس روایت کی صداقت پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ مضمون کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے کیونکہ صرف شعبی کے طریق پر ہی مروی نہیں ہے بلکہ اسے قتادہ اسدی اور ابن ابی لیلیٰ نے بھی روایت کیا ہے[۱]۔ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ یہود حضرت عمرؓ سے ملے اور کہا تمہارے دوست کے پاس جبریل آتا ہے لیکن وہ ہمارا دشمن ہے اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "من كان عدوالله و ملائكته و رسله و جبريل و ميكائيل فان الله عدو للكافرين۔" راوی کہتے ہیں: "فنزلت على لسان عمر[۲]۔"

اس آیت کے سبب نزول کے سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہود کا مناظرہ خود سرور کونین ﷺ سے ہو۔ انہوں نے آکر کہا کہ ہم آپ سے چند سوالات پوچھتے ہیں جن کے صحیح جوابات نبی کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ اگر آپ سچے نبی ہیں تو ان کے جوابات دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا "بہتر ہے جو چاہو پوچھو مگر عہد کرو کہ اگر ٹھیک ٹھیک جواب دوں تو میری نبوت کا اقرار کرو گے اور میری فرمانبرداری میں لگ جاؤ گے۔" انہوں نے وعدہ کیا اور ذمہ داری قبول کی' لیکن جب صحیح جوابات مل گئے تو اس بناء پر وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے کہ آپ کے پاس جبریل وحی لے کر آتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے اور میکائیل ہمارا دوست ہے[۳]۔ مفسرین نے دونوں واقعات رقم کیے ہیں بعض نے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے ہو سکتا ہے کہ دونوں واقعات ایک ساتھ رونما ہوئے ہوں۔ یہود کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ سے سوالات کر رہی ہو اور دوسری حضرت عمر فاروقؓ سے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں واقعات قریب قریب رونما ہوئے ہوں اور بعد میں وحی نازل ہوئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک واقعہ بعد میں رونما ہوا ہو لیکن آیت کا اطلاق اس پر بھی کیا گیا ہو۔

ہمارے نزدیک دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی صورت یہی ہے کہ دونوں واقعات کو ایک ساتھ مانا جائے لیکن اگر ترجیح دینی ہو تو حضرت عمرؓ کی موافقت والی روایت زیادہ قابل ترجیح ہے کیونکہ امام بخاری نے حضرت انسؓ سے جو روایت نقل کی ہے جو مفسرین کیلئے ایک قوی دلیل ہے اس میں یہ بات تو ہے کہ حضرت جبریل امین نے نبی ﷺ کو تمام سوالوں کے جوابات بتائے' لیکن یہ نہیں ہے کہ مذکورہ آیت اسی سلسلے میں نازل ہوئی' بلکہ یہ ہے کہ آپؐ نے یہ آیت پڑھی "فقرا هده الاية" اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نازل تو پہلے ہو چکی تھی لیکن اس کو آپ نے اس وقت تلاوت کیا کیونکہ یہود نے یہ کہا تھا کہ جبریل یہود کا دشمن ہے جبکہ حضرت عمرؓ کے سلسلے میں جو روایات ہیں ان میں یہ صراحت ہے کہ بس یہ آیت نازل ہوئی (واللہ اعلم)۔

۵۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک اور موافقت یہ بھی ہے ارشاد ربانی ہے "والسبقون السبقون اولئك المقربون في جنت النعيم ثلة من الاولين و قليل من الآخرين[۴]۔" (آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں وہی تو مقرب لوگ ہیں۔ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم۔)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کو سن کر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ کیا اگلی امتوں میں سے بہت لوگ سابقین میں شامل ہوں گے اور ہم میں سے بہت کم لوگ؟" اس کے ایک سال بعد یہ آیت نازل ہوئی "ثلة من الاولين و ثلة من الآخرين[۵]۔" (وہ اگلوں میں سے بھی بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے بھی بہت۔)

نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا "سنو حضرت آدمؑ سے لے کر مجھ تک ایک ثلہ ہے اور میری امت ایک ثلہ ہے۔ ہم اپنے اس ثلہ کو پورا کرنے

(۱) طبری ۱: ۴۳۴؛ سیوطی ۱: ۹۰ (۲) طبری ۱: ۴۳۹؛ کثیر ۱: ۱۳۲؛ سیوطی ۱: ۱۲۴ (۳) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو بخاری ۵: ۱۴۸؛ طبری ۱: ۴۳۱؛ رازی ۳: ۲۱۶؛ کثیر ۱: ۱۳۰؛ طبرسی ۱: ۳۷۵ (۴) سورۃ الواقعہ ۵۶: ۱۰۔۱۴ (۵) سورۃ الواقعہ ۵۶: ۳۹۔۴۰

کیلئے ان حبشیوں کو بھی ساتھ لے لیں گے جو اونٹ کے چرواہے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے واحد و لاشریک ہونے کی شہادت دیتے ہیں(۱)۔" ان تمام موافقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ اجتہادی بصیرت سے نوازا تھا۔ خصوصاً اجتماعی معاملات میں آپ کے فہم و فراست بے مثال تھے۔ آپ کو ایک ایسی الہامی طبیعت نصیب ہوئی تھی کہ آپ سماجی اور عملی مسائل میں دین حق کی علتوں اور مصلحتوں کا ادراک کر لیتے۔ آپ کی فکر اسلام کے مزاج اور روح کی گہرائیوں میں اتر کر گوہر حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنے عہد حکمرانی میں نئے نئے اور پرپیچ مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے حل کیا اور ایک ایسی عظیم اور فلاحی ریاست کا اسلامی تصور پیش کیا جو ہر دور کیلئے روشنی کا مینارہ ہے۔ آپ کو اس خداداد بصیرت کا شعور تھا کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ شکر کے طور پر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے۔

یک روز کعب احبار نے کہا کہ آسمان کا بادشاہ زمین کے بادشاہ پر افسوس کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "مگر اس بادشاہ پر نہیں جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا" اور اس کو سن کر کعب احبار نے کہا واللہ اتورات میں یہی الفاظ موجود ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سجدہ شکر میں گر گئے(۲)۔

(۱) کثیر ۴/۲۸۴' سیوطی ۱۲۴ (۲) سیوطی ۱۲۵

تعلق بالقرآن

○ تعلق بالقرآن کے مختلف پہلو:

قرآن حکیم سے آپ کے تعلق کا مختلف عنوانات کے تحت جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

۱۔ صفاتی تعلق۔

قرآن حکیم کا ایک اہم نام "الفرقان" ہے جس کے معنی ہیں ہر وہ چیز جس کے ذریعے حق و باطل میں فرق و امتیاز ہو۔ اس کے مزید معانی میں دلیل و برہان، مدد و نصرت، صبح اور سحر کا ابتدائی وقت شامل ہیں[1]۔ قرآن حکیم نے نہ صرف یہ کہ حق و باطل کا امتیاز واضح کیا بلکہ سچائی کی دلیل و حجت بھی بھرپور انداز میں پیش کی۔ جاہلیت کی تاریکیاں چھٹ گئیں اور علم و آگہی کی صبح نمودار ہوئی۔ ارشاد ربانی ہے "شهر رمضان الذي انزل فيه القرآن هدى للناس و بينت من الهدى والفرقان[2]۔" "رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کیلئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ یعنی ماہ رمضان کی عظمت و تقدس کی ایک وجہ اس فرقان کا نازل ہونا ہے۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کے متبرک ہونے کی دلیل کے طور پر اسی فرقان کو بھی پیش کیا گیا ہے "تبرك الذي نزل الفرقان على عبده ليكون للعلمين نذيرا[3]۔" (نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کیلئے خبردار کر دینے والا ہو۔)

کلام الٰہی کے فرقان ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقائد حق و باطل میں فرق کر دیتا ہے۔ سچی اور جھوٹی باتوں اور اچھے اور برے اعمال بالکل الگ الگ بیان کر دیتا ہے[4]۔ قرآن حکیم کے اس نام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ حلال و حرام کے مابین فرق کر دینے والی کتاب ہے[5]۔ ادھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا لقب "الفاروق" اس لئے کہ وہ حق کو باطل سے جدا کرنے والے تھے[6]۔ ان کے ذریعے سے اسلام ظاہر ہو گیا[7]۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا "فرق الله به بين الحق والباطل[8]۔" (کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے حق و باطل میں فرق کر دیا۔)

ایک حدیث کے مطابق خود رسول اللہ ﷺ انسانوں کے مابین تصدیق و تکذیب کی بناء پر مومنین اور کافرین کا فرق کرنے والے تھے[9]۔ اللہ تعالیٰ نے میدان بدر میں حق و باطل کے پہلے مسلح تصادم کو یوم الفرقان کا نام دیا ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کو فتح و نصرت حاصل ہوئی اور اہل دنیا کے سامنے حق و باطل کا امتیاز واضح ہو گیا[10]۔ ارشاد ہوا "وما انزلنا على عبدنا يوم الفرقان[11]۔" ان ساری باتوں کو سامنے رکھیں تو قرآن حکیم سے حضرت عمر فاروقؓ کا فکری، صفاتی، مقصدی، جذباتی، اعتقادی اور عملی تعلق نکھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ قرآن حکیم نے حق و باطل کے جس فرق کو افکار و نظریات کے میدان میں واضح کیا حضرت عمر فاروقؓ نے پوری جرأت و قوت سے سماجی و عملی میدان میں آشکار کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے پیروکاروں میں مخلص، جری اور قربانیاں دینے والے پرعزم لوگوں کی کوئی کمی نہیں تھی مگر حضرت عمر فاروقؓ جب اسلام کے علمبردار بنے تو پرعزم لہجے میں عرض کیا

---

(۱) منظور ۱ ۲ ۳ یونس ۵۷۹ (۲) سورہ البقرہ ۲ ۸۵ (۳) سورہ الفرقان ۲۵ ۱ (٤) راغب ۳۷۸ (٥) منظور ۱۰ ۲ ۳ (٦) راغب ۳۷۸ (۷) سیوطی ۱۱۳، جوزی ۱۳، منظور ۱۱/۲ ۳ (۸) سعد ۳ ۲۷ جوزی ۱٤ ۱، اثیر ٤ ۵۷ (۹) منظور ۱۰ ۲ ۳۰۲ (۱۰) راغب ۳۷۸، منظور ۱۰ ۲ ۳ (۱۱) سورہ الانفال ۸ ٤۱۔

"والذی بعثك بالحق لاعلنه کما اعلنت الشرك[1]۔" (قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ میں اسلام کا اسی قدر کھل کر اعلان کروں گا جس طرح شرک کا کرتا تھا۔)

۲۔ فکری تعلق

آپ نے صرف اور صرف قرآن ہی سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے پس منظر میں ایک مسلسل سوچ بچار، چھان پھٹک اور تدریج شامل تھی۔ اس طرح آپ کی اجتہادی بصیرت ایک تدریجی اور ارتقائی عمل سے گزر کر مستحکم ہوئی۔ وحی الٰہی کے مزاج و انداز کے سانچوں میں ڈھلتی رہی اور اس مقام تک پہنچ گئی جہاں خدا اور اس کے بندے کی مرضی جدا جدا نہیں رہتی۔ بقول اقبال:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے[2]

حدیث میں آتا ہے "رضا الله رضا عمرؓ و رضا عمرؓ رضا الله[3]۔" پھر اس میں عجیب بات کیا ہے کہ بے شمار مقامات پر آپ کی رائے رضائے الٰہی سے ہم آہنگ ہوئی۔ جیسا کہ قبول اسلام کے واقعات میں بیان ہو چکا ہے کہ آپ نے پہلی مرتبہ قرآن مجید سنا تو انجانی آواز کے باوجود اس کی فصاحت و بلاغت، زورِ بیان اور سوز و گداز سے بے حد متاثر ہوئے[4]۔ دوسری مرتبہ سنا اس کے اسلوب بیان نے انہیں ششدر کر دیا۔ اس کے طرز استدلال نے ان کے ذہن کو جکڑ لیا اور ان آیات کا سامنا کرنا پڑا "انه لقول رسول کریم وما هو بقول شاعر قلیلا ما تؤمنون ولا بقول کاهن قلیلا ما تذکرون تنزیل من رب العلمین ولو تقول علینا بعض الا قاویل لا خذنا منه بالیمین ثم لقطعنا منه الوتین فما منکم من احد عنه حجزین وانه لتذکرة للمتقین وانا لنعلم ان منکم مکذبین وانه لحسرة علی الکفرین وانه لحق الیقین فسبح باسم ربك العظیم[5]۔"

اگر ہم ان آیت پر غور کریں اور ساتھ ہی آپ کی قلبی و ذہنی کیفیت کا اندازہ لگائیں تو ہم آپ کی بصیرت پر انمٹ اثرات کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں قرآن کی دعوت اور حامل قرآن کی شخصیت کے بارے میں بہت سے شکوک و شبہات پائے جاتے تھے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ ابھر رہے تھے اور ایک ایک کر کے ان کا جواب آ رہا تھا۔ پھر اعتراضات کا جواز ختم ہو گیا۔ انتہائی پر یقین انداز میں کہہ دیا گیا کہ یہ تو رب العالمین کا کلام ہے اور پھر پر زور انداز میں یہ بات کہ اس نبی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ ہم پر جھوٹی بات منسوب کرے۔ ہم اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے اس سے خدا کے کلام ہونے کو ہر قسم کے شک و شبہ سے نکال دیا گیا اور آخر میں جھٹلانے والوں کی حسرت و ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کو ثابت کر دیا گیا کہ ان کے پاس دلیل کی قوت ختم ہو چکی ہے اور پھر اس کی صداقت کا یہ بے لاگ اظہار کہ "انه لحق الیقین" اور آنحضور ﷺ کو اپنے رب کی تسبیح کی نصیحت کر کے کلام کا خاتمہ۔ ان آیت نے نہ صرف یہ کہ آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا بلکہ دل کی تھاہ گہرائیوں میں اتر گئیں اور اس کی ہر ہر دھڑکن کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ بقول آپ کے "فوقع فی قلبی الاسلام کل موقع[6]۔"

اس واقعے کے بعد تو عالم یہ ہو گیا کہ قرآن کو سننے کیلئے بے چین و مضطرب رہنے لگے۔ ہر وقت یہی آرزو دل میں موجزن رہتی کہ چند آیات ہی سننے کا موقع مل سکے۔ اس کی حلاوت سے فیض یاب ہونے کیلئے ایک رات محمد مصطفی ﷺ کو تلاش کرتے کرتے خانہ خدا کے غلاف کے پیچھے جا چھپے۔ جب کہ قرآن سنا تو رقت قلبی سے رو پڑے اور اسلام میں داخلے کی راہ کچھ اور کھل گئی۔ خود ہی بیان کرتے ہیں "فلما سمعت القرآن رق له قلبی فبکیت و دخلنی الاسلام[7]۔"

---

(۱) جوزی ۱۰، سیرہ ۱۴، ۳۱۹ (۲) بال جبریل ۵۵ (۳) مصنی ۱۱، ۵۷۹ (٤) سیرہ ۱٤، ۳۱۹ (۵) سورۃ الحاقہ ۶۹، ۳۸، ۵۲ (٦) سیوطی ۱، ۱۱۰ (۷) ہشام ۱، ۳۷۲۔

قبول اسلام سے قبل تو یہ عالم تھا کہ اس کتاب کو بذات خود پڑھنے کیلئے بے چین تھے۔ ان سے مانگی تو انہوں نے دینے میں ہچکچاہٹ کی۔ اس پر معبودوں کی قسمیں کھانے لگے کہ اسے پڑھ کر ضرور واپس کردوں گا۔ انہوں نے جب یہ کہا کہ ناپاک اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا غسل تک کر لیا[1]۔ جب دیکھا تو قرآنی آیت نے اندر کی کائنات ہی بدل ڈالی۔ اس صحیفے پر مختلف سورتوں کی آیات رقم تھیں۔ خود فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے "بسم الله الرحمن الرحیم" لکھا ہوا تھا۔ میں نے اللہ کا نام دیکھا تو کانپ گیا اور کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ جب ذرا میرے اوسان بجا ہوئے تو میں نے پھر اٹھا کر پڑھا تو یہ آیات لکھی تھیں "سبح لله مافی السموات والارض وهوالعزیز الحکیم له ملك السموات والارض یحیی و یمیت وهو علی کل شیء قدیر هوالاول والآخر والظاهر والباطن وهو بکل شیء علیم هوالذی خلق السموات والارض فی ستة ایام ثم استوی علی العرش یعلم مایلج فی الارض وما یخرج منها وما ینزل من السماء وما یعرج فیها وهو معکم اینما کنتم والله بما تعملون بصیر له ملك السموات والارض و الی الله ترجع الامور یولج اللیل فی النهار ویولج النهار فی اللیل و هو علیم بذات الصدور امنوا بالله و رسوله وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیه فالذین آمنوا منکم وانفقوا لهم اجر کبیر وما لکم لاتومنون بالله والرسول یدعوکم لتومنوا بربکم وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین[2]۔"

ان آیت کو پڑھتے وقت جب بھی اللہ تعالیٰ کا نام آتا کانپ اٹھتے۔ اس کی توحید و حاکمیت' اس کا زبردست طاقتور ہونا' انتہائی حکیم ہونا' آسمانوں اور زمین کا تنہا مالک ہونا اور زندگی و موت پر قدرت رکھنا۔ نہ صرف اول و آخر ہونا' بلکہ ظاہر و باطن کے ہر کہیں میں جلوہ گر ہونا اور ہر چیز کے ہر بھید سے کلی طور پر واقف ہونا یہ سب باتیں ان قبی کسی صاحب عقل و دانش کو لرزا دینے کیلئے کافی ہیں۔ ان آیات میں خالق کائنات کائنات اور انسان کی اپنی حقیقت کو انتہائی جامع اور بلیغ انداز میں کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی قوت' قدرت' بادشاہی' ملکیت' علم کلی کی صفات کا ایسے دو ٹوک انداز میں ذکر ہے کہ واقعی ایک فہم و فراست رکھنے والا آدمی ان پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ توحید کیلئے آفاقی دلائل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی حیثیت خلیفہ اور عہد و میثاق کو یاد دلا کر ایک عظیم ترجمت قائم کر دی گئی ہے۔ انہیں پڑھنے کے بعد آگے بڑھے تو سورہ طٰہٰ کی ان آیت نے چونکا دیا "طه ما انزلنا علیك القرآن لتشقی الا تذکرة لمن یخشی تنزیلا ممن خلق الارض والسموات العلی الرحمن علی العرش استوی له مافی السموات وما فی الارض وما بینهما وما تحت الثری وان تجهر بالقول فانه یعلم السر واخفی الله لا اله الا هو له الاسماء الحسنی[3]۔"

خالق کائنات کی عظمت کا نقش دل پر ثبت ہوتے ہی اس کے کلام برحق کی عظمت و حیثیت کا اعلان اور نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے بالواسطہ طور پر منتخب اللہ ہونے کا اظہار اور پھر یہ کہ ان کو ماننے والے جن مشقتوں سے دوچار ہیں قرآن کا مقصود یہ نہیں' بلکہ یہ ہمہ گیر نصیحت ہے' مگر اس شخص کیلئے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔ گویا یہ مقصد اس قدر عظیم ہے کہ اس کی راہ میں تکلیفیں پہنچ ہیں اور پھر اس کے نازل کرنے والے کی عظمت و کبریائی ظاہر و چھپی ہوئی ہر بات سے آگہی' الوہیت و وحدانیت' تمام اچھے ناموں کا مالک و مستحق یعنی اس کا اعتراف کرتے ہوئے تو قرآن کی دعوت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ حضرت عمرؓ کے دل میں عظمت قرآن جاگزیں ہو گئی۔ بولے "کیا قریش اس سے بھاگتے ہیں؟[4]" پھر آگے پڑھنے لگے جب اللہ تعالیٰ اس قول پر پہنچے "اننی انا الله لا اله الا انا فاعبدنی واقم الصلوة لذکری ان الساعة اتیة اکاد اخفیها لتجزی کل نفس بما تسعی فلا یصدنك عنها من لا یومن بها واتبع هواه فتردی[5]۔" (بے شک میں اللہ ہوں' میرے سوا کوئی معبود نہیں تم میری ہی عبادت کرو اور میری ہی یاد میں نماز قائم کرو بلاشبہ قیامت آنے والی ہے۔ میں اسے

---

(۱) [illegible] ۳۶۹ [illegible] ۲۶۸:۲ (۲) سورہ الحدید ۵۷: ۱ - ۸ (۳) سورہ طہٰ ۲۰: ۱ - ۸ (۴) [illegible] ۱۱ (۵) سورہ طہٰ ۲۰: ۱۴ - ۱۶۔

پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ بدلہ دیا جائے ہر نفس کو اس کے اعمال کا لہٰذا تمہیں اس سے نہ روک دے وہ شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے کہیں تم ہلاک نہ ہو جاؤ۔) حضرت عمرؓ نے کہا "جو ذات ایسی باتیں کہتی ہے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا چاہئے' مجھے بتاؤ محمد ﷺ کہاں ہیں؟(۱)"

قبول سلام کے بعد قرآن سے تعلق اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ اب بہت بڑے عالم اور قاری بن گئے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "مارایت رجلا اعلم باللہ ولا اقرا کتاب اللہ ولا افقہ فی الدین (۲)"۔ "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ہم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے عالم و قاری تھے۔ "کان عمر اتقانا للرب واقرانا لکتب اللہ (۳)"۔ "زید بن وہب سے مروی ہے کہ ابن مسعود کے پاس قرآن کی یک آیت کی قرأت پوچھنے آیا۔ انہوں نے مجھے اس کی قرأت اس طرح بتائی۔ میں نے ان کی قرأت کے خلاف کہا کہ عمرؓ نے مجھے س طرح قرأت بتائی تھی۔ وہ رونے لگے' یہاں تک کہ میں ے ان کے آنسو سنگ ریزوں کے درمیان دیکھے۔ پھر فرمایا کہ اسی طرح پڑھو جس طرح تمہیں عمرؓ نے اس کی قرأت بتائی۔ واللہ یہ السیلحین کے رستے سے بھی زیادہ وضح ہے کہ عمرؓ اسلام کیلئے ایک محفوظ قلعہ تھے۔ سلام میں داخل ہو تا تھا ور اس سے نکلتا نہ تھا۔ جب عمرؓ قتل کر دیئے گئے تو قلعے میں دراڑ پڑ گئی اب اسلام اس سے نکلتا ہے اور داخل نہیں ہوتا (۴)۔

۳۔ جذباتی تعلق:

اس تعلق کی انتہا کا یہ عالم تھا کہ عموماً قرآن پڑھتے ہوئے آپ پر رقت طاری ہو جاتی۔ روایت از علقمہ بن وقاص اللیثی "عمرؓ عشاء کی نماز میں سورہ یوسف کی تلاوت کیا کرتے اور اکثر و بیشتر میں آخری صف میں کھڑا ہوتا اور یوسف علیہ السلام سے متعلق قرآنی آیتیں تلاوت کرتے وقت مجھے حضرت عمرؓ کے رونے کی آواز صاف سنائی دیتی (۵)"۔ "اسماعیل بن محمد بن یوسف نے عبداللہ بن شداد کا قول نقل کیا ہے "وانما اشکوا بثی و حزنی الی اللہ" (یعنی میں اپنے قلبی اضطراب اور حزن و ملال کی شکایت صرف للہ سے کرتا ہوں) پر پہنچے تو باوجود آخری صفوں میں ہونے کے ان کی صدائے گریہ مجھے صاف سنائی دی (۶)۔ ابن عمرؓ کا بیان بھی سی نوعیت کا ہے کہ نہیں تیری صف میں ہونے کے باوجود اپنے والد کے رونے کی آواز واضح طور پر سنائی دیتی تھی (۷)۔

عبداللہ بن عیسیٰ کا قول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرے پر سیاہ نشان تھے۔ یسے نشان جو گھوڑے کے نعل سے کسی کی پشت پر پڑ جائیں۔ حسن نے ہمیں بتایا کہ رات کو تلاوت کرتے کرتے حضرت عمرؓ جب کسی مخصوص آیت کی تلاوت کرتے' تو ان پر رقت طاری ہو جاتی اور کبھی کبھی تو وہ روتے روتے گر پڑتے۔ کثر اس شدت تاثر کے نتیجہ میں وہ بیمار تک ہو جاتے۔ یسے کہ لوگ عیادت کو آنے لگتے۔ ابن عباس نے ایک بار حضرت عمرؓ کو اس شدت سے روتے دیکھا تھا کہ ان کی پسلیاں تک ہل رہی تھیں (۸)۔

آپ نے ایک مرتبہ یک تارک الدنیا عیسائی راہب کو دیکھا کہ وہ اپنے صومعہ میں مشغول عبادت ہے۔ آپ نے سے آواز دی "راہب راہب ذرا سننا۔"

راہب نے سر نکال کر باہر کی طرف دیکھا آپ اسے دیکھتے ہی رونے لگے۔

راہب نے پوچھا "یہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟"

جواب میں یہ آیت تلاوت فرمائی "وجوہ یومئذ خاشعۃ' عاملۃ ناصبۃ تصلی نارا حامیۃ (۹)"۔ "(کچھ چہرے اس روز خوفزدہ ہونگے' تھکے جاتے ہونگے'

---

(۱) جوزی | ۱۱ (۲) سیبہ ۱۲ ۲۶ اثیر | ۴ ۶ (۳) حاکم ۳ ۸۶ (۴) سعد ۳ ۳۷۱ 'سیبہ ۱۲ ۳۴٫ (۵) جوزی ۱ ۶۶۷ (۶) جوزی | ۱۶۷ (۷) جوزی | ۱۶۸

(۸) جوزی | ۱۶۸ 'سیوطی | ۱۲۹ (۹) سورہ الغاشیہ ۸۸ ۴٫۲

شدید آگ میں جھلس رہے ہوں گے۔) فرمانے لگے میں اسی وجہ سے رو رہا تھا[1]۔

O ..... تفسیری ذوق و شوق:

ا۔ رسول اللہ سے تفسیر پوچھنا:

آپ کا یہ جذباتی تعلق سطحی نہیں تھا بلکہ قرآن کی بیان کردہ حقیقتوں اور صداقتوں پر گہرے ایمان اور یقین کا نتیجہ تھا۔ اس لئے آپ کو ہمیشہ معانی و مطالب جاننے کی فکر دامن گیر رہتی۔ اس سلسلے میں ہادی برحق ﷺ سے پوچھنے میں دوسرے صحابہ کرامؓ کی بہ نسبت زیادہ جری تھے۔ اس سلسلے میں کبھی شرم و جھجک رکاوٹ نہیں بنتی تھی۔ حضرت عمرؓ خود ہی روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری "فمنهم شقي و سعيد فاما الذين شقوا ففي النار لهم فيها زفير و شهيق[2]۔" "(قیامت کے روز) کچھ لوگ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت' جو بدبخت ہوں گے' وہ دوزخ میں جائیں گے (جہاں پر گرمی و پیاس) کی شدت سے ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے۔"

میں نے پوچھا "کہ اے اللہ کے نبی ﷺ ہم کس چیز کے مطابق عمل کرتے ہیں؟" کہا "ہم ایسی چیز کے موافق عمل کرتے ہیں جس سے فراغت ہو چکی ہے یا ایسی چیز جس سے فراغت نہیں ہوتی" (یعنی کیا نامہ اعمال پہلے سے لکھا ہوا ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم ایسی چیز کے مطابق عمل کرتے ہو جس سے فراغت ہو چکی ہے۔ اے عمرؓ قلم جاری ہو چکے ہیں' لیکن ہر شخص پر وہی آسان ہے جس کیلئے وہ پیدا کیا گیا ہے[3]"۔ یعلی بن امیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فليس عليكم جناح ان تقصروا من الصلوة ان خفتم ان يفتنكم الذين كفروا[4]۔" "اب تو لوگ امن میں ہو گئے ہیں (یعنی کیا اب بھی قصر ضروری ہے) حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ مجھے بھی یہی تعجب ہوا جیسا کہ تمہیں ہوا ہے۔ تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی بات پوچھی تو انہوں نے ارشاد فرمایا "صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته[5]۔"

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری "والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب اليم[6]۔" تو صحابہ کرامؓ کو بہت شاق گزری۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں یہ مشکل رفع کرتا ہوں۔ پھر وہ گئے اور عرض کیا اے اللہ کے نبی ﷺ! یہ آیت آپؐ کے صحابہ کرامؓ پر بہت شاق گزری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان الله لم يفرض الزكوة الا ليطيب مابقي من اموالكم و انما فرض المواريث لتكون لمن بعدكم۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کیا میں تمہیں سب سے بہتر خزانے کی خبر دوں جو کوئی شخص جمع کرتا ہے؟" (المرأة الصالحة اذا نظر اليها سرته و اذا امرها اطاعته و اذا غاب عنها حفظته[7]۔)

۲۔ صحابہ کرامؓ سے تفسیر پوچھنا:

آپ اس میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے کہ اگر کسی آیت کے مطلب میں انہیں اشتباہ ہو تو دوسرے اصحاب سے پوچھ لیں۔ اس سلسلے میں چھوٹے بڑے کی کوئی قید نہیں ہوتی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھ سے دوسرے اصحاب النبی ﷺ کے سامنے مسئلہ پوچھا کرتے تھے۔ ایک دن حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ آپ ان سے مسئلہ پوچھتے ہیں جبکہ وہ ہمارے بیٹوں کی مانند ہیں۔ حضرت عمرؓ نے

---

(۱) حورث ۱۸۸/۶ (۲) سورہ ھود ۱۱: ۱۰۶-۱۰۵ (۳) ترمذی ۴/۳۵۲' حنبل ۱/۲۴' متفی ۱/۳۷۸ (۴) سورہ النساء ۴: ۱۰۱ (۵) مسلم ۲/۱۴۳' حنبل ۱/۲۲۹' نسائی ۳/۱۱۶' البسیوطی ۱/۱۵۱ (۶) سورہ التوبہ ۹: ۳۴ (۷) داؤد ۲/۱۶۹۔

جواب دیا کہ میں اس بات کو خوب جانتا ہوں جس وجہ سے میں مسئلہ پوچھتا ہوں۔ پھر آپ نے مجھ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا۔ "اذا جاء نصر الله والفتح[1]۔" میں نے کہا کہ "اس میں اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر دی ہے اور یہ سورہ آخر تک پڑھی۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "واللہ میں بھی وہی جانتا ہوں جو تم جانتے ہو[2]۔"

ابو نعیم نے محمد بن کعب القرظی سے روایت کی ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا "عمر بن الخطاب نے مہاجرین صحابہ کی ایک جماعت میں بیٹھ کر یا ہم لیلۃ القدر کا ذکر چھیڑا اور ہر شخص نے جو کچھ اس بارے میں اسے معلوم تھا وہ بیان کر دیا پھر حضرت عمرؓ نے مجھ سے کہا "ابن عباسؓ تم کیوں چپ ہو اور کچھ نہیں کہتے۔ تم اپنی کم سنی کا خیال نہ کرو اور جو کہنا ہے ضرور کہو۔" میں نے یہ اشارہ پا کر کہا "امیر المومنین اللہ تعالی طاق ہے اور وہ طاق عدد کو محبوب رکھتا ہے۔ اس نے دنیا کے دنوں کو سات کی تعداد پر دَور ساز کیا ہے۔ انسان کی خلقت سات (ادوار میں) کی ہے۔ ہماری روزیوں کو سات (تغیرات) سے پیدا فرماتا ہے۔ ہمارے سروں پر سات آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور ہمارے قدموں کے تلے سات طبق زمین کے پیدا فرمائے۔ سات ہی مثانی (آیتیں) عطا کی ہیں۔ اپنی کتاب کو ہم میں سات قرابت مندوں سے نکاح کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اپنی کتاب ہی میں میراث کو سات وارثوں پر تقسیم فرمایا ہے۔ ہم لوگ سجدہ کرنے کی حالت میں اپنے بدن کے سات حصوں کو زمین پر لگایا کرتے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ کے سات ہی طواف فرمائے۔ صفا و مروہ کے مابین سات ہی بار دوڑے اور شیطانوں کو بھی سات سات ہی کنکریاں ماریں لہٰذا میرا خیال ہے کہ لیلۃ القدر بھی ماہ رمضان کی آخری سات راتوں ہی میں ہوگی۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بات سن کر متعجب ہوئے اور انہوں نے کہا "اس بارے میں بجز اس کمسن لڑکے جس کو ابھی جوانی کے زمانے میں بھی قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا اور کسی نے میری موافقت نہیں کی ہے۔" یعنی بس یک ہی میرا ہم خیال ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا "کیوں صاحبو اس مطلب کو میرے سامنے اس طرح کون ادا کرے گا جس طرح پر کہ ابن عباسؓ نے ادا کیا ہے[3]۔"

بن عباسؓ سے مسئلہ پوچھنے کی وجہ جس کی طرف حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے اشارہ کیا ہے یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے نہیں اپنے سینے سے لگایا تھا اور فرمایا تھا "اللهم علمه الحكمة[4]۔" ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ آپ حضرات کا کیا خیال ہے کہ یہ آیت کس سلسلے میں نازل ہوئی "ايود احدكم ان تكون له جنة من نخيل و اعناب تجرى من تحتها الانهر له فيها من كل الثمرات و اصابه الكبر وله ذرية ضعفاء[5]۔" سب نے کہا اللہ تعالی بہتر جانتا ہے۔ حضرت عمرؓ یہ جواب سن کر بہت غصے ہوئے اور فرمایا کہ صاف جواب دیجئے کہ آپ لوگوں کو اس سلسلے میں کچھ معلوم ہے یا نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے عرض کیا "امیر مومنین! میرے ذہن میں اس سے متعلق کچھ چیز ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا "بیٹے کہو اور اپنے آپ کو حقیر مت سمجھو۔" ابن عباسؓ نے عرض کیا "اس میں عمل کی مثال بیان کی گئی ہے۔" پوچھا "کیسے عمل کی؟" عرض کیا "عمل کی۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "دراصل ایک مالدار شخص کی مثال بیان کی گئی ہے جو پہلے تو اللہ عزوجل کی اطاعت کرتا تھا لیکن پھر اللہ تعالی نے اس پر شیطان کو مسلط کر دیا اور وہ معاصی میں مبتلا ہو گیا اور اس کے سارے اعمال غارت ہو گئے[6]۔"

اس روایت سے قرآن مجید کے سمجھنے اور سمجھانے کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کی پالیسی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

---

(۱) سورہ النصر ۱۱۰ (۲) ترمذی ۵ ۱۲ سیوطی ۷ ۵ (۳) ۱۸۸/۲۰۶۲ بر ۲۶۸:۱۱ سیوطی ۷ ۲،۶،۱۸۸ قرطبی ۲ ۱۱۰ (٤) بخاری ٤ ۲۱۷ ترمذی ۵/۳٤٤ (۵) سورہ البقرہ ۲۶۶ (٦) بخاری ۵/۱٦۳ سیوطی ۷: ۲/۱۳۲، ۱۸۸۔

☆ ایک یہ کہ آپ صحابہؓ کرام کی توجہ آیت کی طرف دلاتے رہتے تھے تاکہ وہ ان پر غور وخوض کرتے رہیں۔

☆ دوسرا یہ کہ آپ مشاورتی طریق کار اختیار کرتے' تاکہ صحیح مفہوم تک پہنچنے میں مدد ملے اور غلطی کا احتمال نہ رہے۔

☆ تیسرا یہ کہ وفات النبی ﷺ کے بعد لوگوں کے اندر معانی و مفہوم کے بارے میں اعتماد پیدا ہو اور وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔

☆ چوتھا یہ کہ جس کے ذہن میں مفہوم ہو وہ بلا جھجک پیش کرے اور اس کو چھپا کر نہ رکھے تاکہ ایک طرف کتمان علم سے بچ سکے اور دوسری طرف اس کی تہذیب و تصحیح ہو سکے۔

☆ پانچواں یہ کہ قرآن کی سمجھ اور فہم کا تعلق عمر سے نہیں' بلکہ ذوق سے ہے۔ چھوٹی عمر کے لوگوں کی جس قدر حوصلہ افزائی کی جائے گی ان میں ذوق اسی قدر بڑھے گا اور بڑے ہو کر دینی فرائض بہتر طور پر پورا کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

☆ چھٹا یہ کہ آپ اپنی تشریح و تاویل بھی کھول کر سامنے رکھ دیتے تاکہ لوگ اس سے استفادہ بھی کر سکیں اور اگر اس کے برعکس کوئی بات ہو تو اس کو بیان بھی کر سکیں۔

مذکورہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے قرآن حکیم کے علماء اور قاریوں کو شریک مشورہ رکھتے۔ اس کیلئے انہوں نے باقاعدہ ایک مجلس قائم کر رکھی تھی۔ اس میں بوڑھے اور جوان سب شامل ہوتے تھے۔ بقول ابن عباسؓ "کان القراء اصحاب مجلس عمر و مشاورته کهولا کانوا او شبانا[1]۔" آپ قرآن حکیم کو سمجھنے اور اس کو عملی زندگی کا حصہ بنانے میں کس قدر حریص تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے سورہ البقرہ سیکھنے میں بارہ سال صرف کئے در ختم کرنے کے بعد قربانیاں کیں۔ بقول ابن عمرؓ "تعلم عمر بن الخطاب البقرة في اثنى عشرة سنة فلما ختمها نحر جزورا[2]۔" اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ بس اسی سورہ ہی میں مشغول رہے' بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پورے قرآن مجید پر غور و خوض کے ساتھ ساتھ اس کو بطور خاص اپنی فکر و تدبر کا مرکز و محور بنائے رکھا۔

۳۔ شان نزول سے واقفیت:

آپ کی اجتہادی بصیرت کا دارومدار قرآن فہمی پر تھا آپ خود مفسر قرآن تھے۔ بہت سی آیات کے بارے میں آپ کی آراء حدیث' فقہ اور تاریخ کی کتابوں میں ہیں۔ آپ کثر آیت کے شان نزول سے واقف تھے۔ اس لئے ان کے مطالب و مفاہیم کو جاننے اور متعین کرنے پر پوری طرح قادر تھے۔ اس پر قرآن سے خصوصی دلچسپی نے مہمیز کا کام کیا۔ طارق بن شہاب روایت کرتے ہیں کہ یہود نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ تم لوگ ایک آیت پڑھتے ہو۔ اگر وہ آیت ہم پر اترتی تو اس دن عید مناتے۔ وہ آیت یہ ہے "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا[3]۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا میں جانتا ہوں کہ یہ آیت کہاں اتری' کس دن اتری اور کس وقت اتری۔ یہ آیت عرفات میں اتری جب رسول اللہ ﷺ وہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور اس روز جمعہ تھا[4]۔ یعنی یوم عرفہ بھی مسلمانوں کیلئے عید کا دن ہے اور جمعہ کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا "اے امیر المومنین! نبی کریم ﷺ کی ازواج میں وہ دو بیویاں کون سی ہیں' جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما[5]۔"

---

(۱) بخاری ۸: ۱٤۱ (۲) جوزی ۱۸۸: ۱ (۳) سورہ المائدہ ۵: ۳ (٤) مسلم ۸: ۲۳۸ ترمذی ٤/ ۲۱۳ نسائی ۵: ۲۰۱ حنبل ۱: ۲۹۱ (۵) سورہ التحریم ٦٦: ٤۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پر فرمایا "ابن عباس تم پر حیرت ہے وہ عائشہؓ اور حفصہؓ ہیں۔" پھر آپ نے تفصیل کے ساتھ حدیث بیان کرنا شروع کی [۱]۔ ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ اس آیت کے معنی کیا ہیں "واذ اخذ ربک من بنی آدم من ظہورھم ذریتھم واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلیٰ شھدنا ان تقولوا یوم القیٰمۃ انا کنا عن ھذا غفلین [۲]۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ "رسول اللہ ﷺ سے بھی اس آیت کی تفسیر کا سوال ہوا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ جل جلالہ نے آدم کو پیدا کیا پھر ان کی پیٹھ پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا اور اولاد نکالی اور فرمایا میں نے ان کو جنت کیلئے پیدا کیا اور یہ لوگ جنتیوں کے کام کریں گے' پھر ہاتھ پھیرا ان کی پیٹھ پر اور اولاد نکالی۔ فرمایا میں نے ان کو جہنم کیلئے پیدا کیا اور یہ جہنیوں کے کام کریں گے۔" ایک شخص بولا "یارسول اللہ ﷺ پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ جب پیدا کرتا ہے کسی بندے کو جنت کے واسطے تو اس سے جنتیوں کے کام کرواتا ہے اور موت کے وقت بھی وہ نیک عمل کرکے مرتا ہے تو اللہ جل جلالہ اسے جنت میں داخل کرتا ہے اور جب کسی بندے کو جہنم کیلئے پیدا کرتا ہے' تو اس سے جہنیوں کے کام کراتا ہے اور یہاں تک کہ موت کے وقت بھی وہ برے کام پر مرتا ہے تو اسے جہنم میں داخل کرتا ہے [۳]۔"

ہجرت مدینہ کیلئے آپ نکلے تو پروگرام کے مطابق حضرت ہشام بن العاص نے بھی آپ کے ساتھ آملنا تھا لیکن کافروں نے انہیں قید کرلیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہمیشہ ان کی فکر دامن گیر تھی۔ خود فرماتے ہیں "ہم کہا کرتے تھے کہ جو لوگ کفار ہی میں رہ گئے' اللہ نہ تو ان کی توبہ قبول کرے گا نہ کوئی فدیہ یا قربانی' کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو پہچانا پھر مصیبت پڑنے کی وجہ سے کفار سے مل گئے۔ مگر جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اور ہماری ان باتوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل فرمائیں "قل یٰعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم و انیبوا الیٰ ربکم واسلموا لہ من قبل ان یاتیکم العذاب ثم لاتنصرون واتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم من قبل ان یأتیکم العذاب بغتۃ و انتم لاتشعرون [۴]۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ آیتیں ایک ورق پر لکھیں اور ہشام بن العاص کو بھیج دیں۔ ہشام کہتے ہیں کہ "جب یہ چٹھی مجھے ملی تو میں ان آیتوں کو بار بار پڑھتا تھا' مگر میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا تھا۔ آخر میں کہنے لگا "اے اللہ مجھے ان آیتوں کا مطلب سمجھا دے۔" یہ دعا کرتے ہی میرے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ یہ آیتیں ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہیں' کیونکہ لوگ اور خود ہم اپنے بارے میں نامعلوم کیا کیا کہتے تھے [۵]۔" رسول اکرم ﷺ کے مشیر خاص ہونے کی وجہ سے اکثر مواقع پر آپ کو رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ بارہا آپ نے وحی کے نزول کی کیفیت اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کی۔ آپ سے روایت ہے "رسول اللہ ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ کے منہ کے پاس شہد کی مکھی کی سی بھنبھناہٹ سنی جاتی تھی۔ ایک دن وحی اترنے لگی تو ہم گھڑی بھر کیلئے ٹھہر گئے۔ آپ نے قبلہ رخ ہوکر ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا فرمائی "اللھم زدنا ولا تنقصنا واکرمنا ولا تھنا واعطنا ولا تحرمنا وآثرنا ولا تؤثر علینا وارض عنا وارضنا" پھر آپ نے (ہماری طرف مخاطب ہوکر) فرمایا "آج مجھ پر دس ایسی آیات اتری ہیں کہ جو ان پر قائم رہے گا' وہ جنت میں داخل ہوگا۔" پھر آپؐ نے ہمارے سامنے یہ آیات تلاوت فرمائیں [۶] "قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خشعون والذین ھم عن اللغو معرضون

---

(۱) بخاری ۶: ۱۴۷' نسائی ۴/۱۳۷' حنبل ۱: ۲۵۲ (۲) سورہ الاعراف ۷: ۱۷۲ (۳) مالک ۸۹۸' ترمذی ۵/۶۲' حنبل ۱: ۲۹ (۴) الزمر ۳۹: ۵۳-۵۵

(۵) بیہقی ۹/۱۳ (۶) حنبل ۱/۳۴' ترمذی ۵/۸

والذین هم للزکوۃ فعلون والذین هم لفروجھم حفظون الاعلی ازواجھم اوما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذالک ھم العدون والذین ھم لا منتھم و عھد ھم راعون والذین ھم علی صلواتھم یحافظون اولئک ھم الوارثون الذین یرثون الفردوس ھم فیھا خالدون[1]۔"

حضرت یعلیٰ حضرت عمرؓ سے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ کاش میں رسول اللہ ﷺ کو کبھی اس وقت دیکھتا جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ پھر ایک مرتبہ آپؐ جعرانہ میں تھے اور آپؐ کے اوپر ایک کپڑے کا سایہ کیا گیا تھا۔ آپؐ کے ساتھ چند صحابہ کرامؓ تھے' جن میں حضرت عمرؓ بھی تھے کہ ایک شخص آیا جس نے ایک خوشبودار جبہ پہن رکھا تھا۔ اس نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! آپ کا ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے عمرے کا احرام باندھا ہو اور ایک ایسا جبہ پہنا ہو جس میں خوشبو لگی ہو؟ آپؐ نے خاموشی سے تھوڑی دیر اس پر نظر ڈالی پھر آپؐ پر وحی اترنا شروع ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے یعلیٰ کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ آؤ۔ وہ آئے اور اپنا سر کپڑے کے اندر کیا۔ نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو رہا ہے اور آپؐ لمبے لمبے سانس لے رہے ہیں پھر وہ کیفیت دور ہوئی تو آپؐ نے فرمایا "مجھ سے عمرے کا حکم پوچھنے والا سائل کہاں ہے؟" اسے ڈھونڈ کر لایا گیا' تو آپ ﷺ نے فرمایا "تین بار خوشبو دھو ڈالو' جبہ اتار دو اور باقی وہی کچھ کرو' جو اپنے عمرے اور حج میں کرتے ہو[2]۔"

حضرت زیدؓ بن اسلمؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کسی سفر میں تھے (سفر حدیبیہ میں) رات کا وقت تھا' حضرت عمرؓ بن الخطاب بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ حضرت عمرؓ نے نبی ﷺ سے کچھ پوچھا' لیکن آپؐ نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے پھر پوچھا' آپؐ نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے پھر پوچھا' آپؐ نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر انہوں نے اپنے دل میں کہا "اے عمرؓ! تیری ماں تجھے روئے' تو نے تین مرتبہ سوال کیا' لیکن آنحضور ﷺ نے تمہیں ایک مرتبہ بھی جواب دینا پسند نہیں کیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے اونٹ کو ایڑی لگائی اور تمام مسلمانوں سے آگے نکل گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے بارے میں کوئی وحی نازل نہ ہو جائے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی' میں نے سنا کہ ایک شخص مجھے آواز دے رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں تو پہلے ہی ڈر رہا تھا کہ کہیں میرے بارے میں وحی نہ نازل ہو جائے۔ بہر حال میں آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کو سلام کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "آج رات مجھ پر ایک ایسی سورہ نازل ہوئی ہے' جو مجھے اس تمام کائنات سے زیادہ عزیز ہے' جس پر سورج طلوع ہوتا ہے پھر آپ نے پڑھا[3] "انا فتحنا لک فتحا مبینا[4]"۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مختلف آیات کے سلسلے میں رسول مقبول ﷺ کی بیان کردہ تفسیر سے بخوبی آگاہ تھے اور حسب ضرورت و موقع ایسے لوگوں تک پہنچاتے۔ آپ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "بے شک اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کرتے ہیں۔" صحابہؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! وہ کون لوگ ہیں؟" فرمایا "وہ لوگ جنہوں نے اموال وانساب کے بغیر محض للہ فی اللہ باہم دوستی و محبت کی ہوگی۔ وہ اس وقت بھی سراسیمہ نہ ہوں گے جب دوسرے لوگ گھبرائے ہوئے پائے جائیں گے انہیں اس وقت کوئی رنج نہ ہوگا جب سب لوگ رنجیدہ ہوں گے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی[5]۔ "الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون[6]"۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ

(۱) سورۃ المؤمنون ۲۳: ۱-۱۱ (۲) مسلم ٤: ٤ (۳) بخاری ٥/٦٧ الفتح ٢٠٠٣ ترمذی ٦١/٦ (٤) سورۃ الفتح ٤٨: ١ (٥) مستدرک علی ٢: ١٩٦ (٦) سورۃ یونس ١٠: ٦٢

حضرت عمرؓ کے روبرو آیت کریمہ "کلما نضجت جلودھم بدلنا ھم جلودا غیرھا[۱]" پڑھی گئی۔ اس کو سن کر حضرت معاذؓ نے کہا کہ "میں اس کی تفسیر جانتا ہوں۔ وہ یہ کہ وہ جلدیں ایسی ہوں گی جو یک ساعت میں ایک سو مرتبہ تبدیل ہوں گی۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں نے بھی رسول اللہ ﷺ سے ایسا ہی سنا ہے[۲]۔" حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ آیت "ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا[۳]" سے مراد وہ لوگ ہیں جو بدعتی اور نفس پرست ہیں[۴]۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت ہے کہ نبی ﷺ نے آیت قرآنی "اقم الصلوۃ لدلوک الشمس[۵]" کی تفسیر میں فرمایا کہ اس سے مراد "زوال آفتاب کا وقت" ہے[۶]۔ کئی آیت کے شان نزول میں آپ کے اپنے کسی عمل کا کوئی حوالہ شامل تھا۔ ایک مرتبہ نبی ﷺ کی موجودگی میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک معاملے میں تکرار ہوئی۔ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں تو یہ آیت نازل ہوئی "یاایھاالذین اٰمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی[۷]۔" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حالت ہو گئی کہ نبی ﷺ سے جب بات کرتے تو آواز سنائی نہ دیتی یہاں تک کہ اسے خود نہ سمجھتے[۸]۔

نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں دوبارہ منبر رسول ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص بولا "مجھے مسلمان ہونے کے بعد اپنے کسی عمل کی کوئی پرواہ نہیں کیونکہ میں حاجیوں کو پانی پلاؤں گا۔" دوسرے نے کہا "مجھے بھی اسلام کے بعد اپنے کسی عمل کی پرواہ نہیں کیونکہ میں مسجد حرام کی مرمت کرتا ہوں۔" تیسرے نے کہا کہ "ان چیزوں سے تو جہاد افضل ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ڈانٹ کر کہا کہ "آج جمعہ کا دن ہے' منبر رسول ﷺ کے پاس بلند آواز میں نماز کے بعد تم سے اس بارے میں پوچھوں گا' جس میں تم نے اختلاف کیا ہے[۹]۔" اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری "اجعلتم سقایۃ الحاج و عمارۃ المسجد الحرام کمن اٰمن باللہ والیوم الاخر وجٰھد فی سبیل اللہ لا یستون عند اللہ واللہ لا یھدی القوم الظٰلمین[۱۰]۔"

حضرت عکرمہ سے روایت ہے کہ بنی عبد مناف کے چند کافر سردار ابو طالب کے پاس آکر کہنے لگے "اے ابو طالب! کاش تمہارا (بھتیجا محمد ﷺ) ہمارے غلاموں اور حلیفوں کو اپنے پاس سے ہٹا دیتا کیونکہ وہ ہمارے غلام اور خادم ہیں اور یہ بات ہمیں بہت شاق گزرتی ہے۔ ایسی صورت میں ہم محمد (ﷺ) کی اطاعت کریں گے اور ان کی پیروی اور تصدیق کریں گے' تو ابو طالب نبی ﷺ کے پاس آئے اور اس کا ذکر کیا تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی ﷺ سے کہنے لگے' اچھا ایسا بھی کر دیکھئے' معلوم ہو جائے گا کہ ان کا کیا ارادہ ہے اور اس کے بعد وہ کیا کریں گے' تو یہ آیت اتری[۱۱]۔ "وانذر بہ الذین یخافون ان یحشروا الی ربھم لیس لھم من دونہ ولی ولا شفیع لعلھم یتقون ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغدوۃ والعشی یریدون وجھہ' ما علیک من حسابھم من شیء وما من حسابک علیھم من شیء فتطردھم فتکون من الظٰلمین وکذالک فتنا بعضھم ببعض لیقولوا اھؤلاء من اللہ علیھم من بیننا الیس اللہ باعلم بالشٰکرین[۱۲]۔" (اور اے نبی ﷺ تم اس (علم وحی) کے ذریعے سے ان لوگوں کو نصیحت کرو جو اس کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کئے جائیں گے کہ اس کے سوا وہاں کوئی ایسا ذی اقتدار نہ ہو گا جو ان کا حامی و مددگار ہو یا ان کی سفارش کرے' شاید کہ اس نصیحت سے متنبہ ہو کر وہ خدا ترسی کی

---

(۱) سورۃ النساء ٤: ٥٦ (۲) طبرانی ۱/ ۳۲۱ سیوطی ۲/ ۱۹۳ (۳) سورۃ الانعام ٦: ۱٥۹ (٤) طبرانی ۱/ ۲۰۳ سیوطی ۲/ ۱۹٤ (٥) سورۃ بنی اسرائیل ۱۷: ۷۸ (٦) سیوطی ۲/ ۱۹۸ (۷) سورۃ الحجرات ٤۹: ۲ (۸) ترمذی ۲/ ٦۳ (۹) مسلم ٦/ ۳٦ (۱۰) سورۃ التوبۃ ۹: ۱۹ (۱۱) طبری ۷/ ۲ کنز ۲/ ۱۳٥ (۱۲) سورۃ الانعام ٦: ٥۱-٥۳

روش اختیار کریں اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ ☆ وہ انہیں دیکھ کر کہیں "کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے "ہاں کیا خدا اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے۔)

یہاں شکر گزار بندوں سے مراد وہ لوگ ہیں بلال، عمار بن یاسر، سالم مولی ابی حذیفہ، صبیح اسید کے آزاد کردہ اور ابن مسعود مقداد بن عمرو، مسعود ابن القاری، واقد بن عبداللہ حنظلی، عمرو ذوالشمالین، مرثد بن ابو مرثد ابی مرثد الغنوی جو حمزہ بن عبدالمطلب کے حلیف تھے (رضی اللہ عنہم) اور یہ آیت قریش کے ائمۃ الکفر اور ان کے حلیفوں کے بارے میں اتری تھی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ نبی ﷺ کے پاس آئے اور اپنے غلط مشورے کی معذرت کرنے لگے چنانچہ ارشاد باری ہوا[1]۔ "واذا جاءك الذين يؤمنون ... سوء ابجهالة ثم تاب من بعده واصلح فانه غفور رحيم[2]۔" "جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو تم پر سلامتی ہو۔ تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ (یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھا پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں، تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا "ونزعنا ما فی صدورهم من غل تجری من تحتهم الانهر و قالوا الحمدلله الذی هدانا لهٰذا وما كنا لنهتدی لولا ان هدانا الله لقد جاءت رسل ربنا بالحق و نودوا ان تلكم الجنة اورثتموها بما كنتم تعملون[3]۔" "ہم نے ان کے دلوں کے کھوٹ کو دور کر دیا ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور انہوں نے کہا کہ اس خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں اسکی ہدایت دی۔ ہم ہدایت نہ پاتے اگر اللہ ہدایت نہ کرتا۔ ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے اور ندا آئی یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو اپنے عمل کی بنا پر کہ یہ آیت ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے بارے میں نازل ہوئی اور دوسرے لوگوں کے نام بھی انہوں نے شمار کرائے[4]۔ حضرت ضحاکؓ اس قول باری تعالیٰ کے بارے میں فرماتے ہیں "والذين امنوا بالله ورسله اولئك هم الصديقون والشهداء عند ربهم لهم اجرهم ونورهم والذين كفروا و كذبوا باٰيٰتنا اولئك اصحاب الجحيم[5]۔" "جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے وہ صدیق اور شہداء ہیں۔ پروردگار کے نزدیک ان کیلئے اجر اور نور ہے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخ والے ہیں کہ اس سے مراد آٹھ اشخاص ہیں "ابو بکرؓ، علیؓ، زیدؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، سعدؓ، زبیرؓ، حمزہؓ اور نویں عمرؓ ہیں۔ اللہ انہیں ان کے ساتھ ملحق کر دے کیونکہ وہ خدا کے نزدیک صحیح نیت والے تھے[6]۔"

ابن سعدؓ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے میں فرماتے ہیں "لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الاٰخر يوادّون من حادّ الله و رسوله[7]۔" "ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں اللہ اور رسول کے مخالفین سے محبت کرتے نہیں پاؤ گے کہ یہ آیت حضرت ابو بکرؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ آپ نے جنگ بدر میں اپنے بیٹے کو مقابلے کیلئے بلایا اور فرمایا "یا رسول اللہ ﷺ! مجھے سب سے پہلے مقابلے کیلئے جانے دیجئے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے ابو بکرؓ! ہمیں

---

(۱) طبری ۲۰۷:۷ ، کثیر ۱۳۵:۲ رازی ۲/۱۴ (۲) سورۃ الانعام ۵۴ (۳) سورۃ الاعراف ۴۳:۷ (۴) محمد طاؤس (۵) سورۃ الحدید ۱۹:۵۷ (۶) قرطبی ۲۵۴/۱۷ (۷) سورۃ المجادلہ ۲۲:۵۸۔

اپنی ذات سے متمتع ہونے دے۔ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ کو جنگ بدر میں قتل کیا تھا[۱]۔

۴۔ بطور مفسر

آپ نے کئی قرآنی الفاظ کے معانی بیان فرمائے اور اپنی معلومات اور فہم و فراست کے مطابق متعدد آیت کی تفسیر و تشریح کی۔ چنانچہ اس آیت قرآنی "الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتب یومنون بالجبت والطاغوت[۲]۔" حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ طاغوت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ہاں جاہلیت میں لوگ فیصلے کیلئے جاتے تھے۔ ان میں ایک قبیلہ جہینہ میں تھا اور ایک قبیلہ اسلم میں اور ہر قبیلے میں ایک طاغوت ہوتا تھا۔ یہ وہی کاہن تھے جن کے پاس شیطان (مستقبل کی خبریں لے کر) آیا کرتے تھے۔ حضرت عکرمہ کہتے ہیں کہ الجبت حبشی زبان میں شیطان کو کہتے ہیں اور الطاغوت کے معنی کاہن ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ الجبت سے مراد سحر ہے اور الطاغوت سے مراد شیطان[۳]۔

اسی طرح آیت اتری "احل لکم صید البحر و طعامہ متاعا لکم وللسیارۃ[۴]۔" کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "دریا کا شکار وہ ہے جو اس کے اندر کیا جائے اور اس کا کھانا وہ ہے جسے پانی نے باہر پھینک دیا ہو۔" حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے "جو دریا کا جانور مر کر پانی کے اوپر آجائے وہ حلال ہے۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے "اس کا کھانا" سے مراد دریا کا مردار ہے سوائے اس کے جو بگڑ گیا ہو[۵]۔ "آپ نے آیت "واذا النفوس زوجت[۶]۔" کے بارے میں فرمایا "الفاجر مع الفاجر والصالح مع الصالح[۷]۔" یعنی قیامت کے روز۔ ایک اور روایت "یاایھا الذین امنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا[۸]۔"

فرمایا کہ اس میں توبۃ النصوح کے معنی یہ ہیں کہ ایک آدمی اپنے سابقہ برے اعمال سے خوف کھانے لگے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے بارے میں اس طرح توبہ کرے کہ پھر ان کی طرف کبھی نہ پلٹے[۹]۔"

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے خط کے ذریعے پوچھا گیا۔ اے امیر المومنین! کونسا شخص افضل ہے؟ وہ جسے رغبت گناہ بھی نہ ہو اور گناہ پر عمل بھی نہ کرے یا وہ جسے رغبت تو ہو لیکن پھر بھی وہ اس پر عمل نہ کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں لکھا کہ "وہ لوگ افضل ہیں جنہیں معصیت کی جانب رغبت تو ہوتی ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتے۔ وضاحت کیلئے یہ آیت رقم فرمائی[۱۰]۔ "اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوی لھم مغفرۃ و اجر عظیم[۱۱]۔" اللہ سبحانہ کے فرمان "واتموا الحج والعمرۃ للہ[۱۲]۔" کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ حج اور عمرے میں سے ہر ایک کا اتمام یہ ہے کہ دونوں کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے اور عمرہ حج کے مہینوں کے علاوہ دوسرے مہینوں میں کیا جائے[۱۳]۔ اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ دونوں بہتر طریقے سے ادا ہو سکیں[۱۴]۔

عبدالمطلب بن حنطب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو "انت طالق البتۃ" کہہ کر طلاق دے دی ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت پر غالب نہیں ہو سکتی بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے[۱۵]۔ "یاایھا الذین امنوا اصبروا وصابروا و رابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون[۱۶]۔" حضرت عمرؓ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کہ حاجی زمانہ حج میں تجارت کرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

---

(۱) کثیر ۳۲۹/۴ (۲) سورہ النساء ۵۱ (۳) بخاری ۱۸۰/۵ (۴) سورہ المائدہ ۹۶ (۵) بخاری ۲۲۳/۷ (۶) سورہ التکویر ۸۱/۷ (۷) جوزی ۱۹۲/۱ (۸) سورہ التحریم ۶۶/۸ (۹) جوزی ۱۹۲/۱ (۱۰) جوزی ۱۸۱/۱ (۱۱) سورہ الحجرات ۴۹/۳ (۱۲) سورہ البقرہ ۱۹۳/۲ (۱۳) کثیر ۱/۴ ۲۳ (۱۴) مالک ۳۴۷ (۱۵) حزم ۱۰۷/۷ (۱۶) مالک ۴۴۶/۲ (۱۶) سورہ آل عمران ۲۰۰/۳۔

"لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم[۱]۔" آپ نے فرمایا کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد موسم حج ہی کے بارے میں ہے[۲]۔ ابو صالح مولیٰ عمرؓ سے مروی ہے کہ میں نے آپ سے دریافت کیا "اے امیر المومنین آپ حج کے دنوں میں تجارت بھی کیا کرتے تھے۔" فرمایا "ان (اہل عرب) کی روزی تو حج ہی سے وابستہ تھی[۳]۔"

آپ یہ پسند فرماتے تھے کہ تعزیت کرنے والا مرنے والے کے اہل خانہ کو صبر اور ایمان کی تلقین کرے اور انہیں یاد دلائے کہ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کیلئے کیا اجر رکھا ہے اور انہیں قرآن کا وہ حصہ سنائے جس سے یہ تذکیر حاصل ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اس موقع پر اس آیت کا پڑھنا موزوں ہے[۴]۔ "الذین اذا اصابتهم مصيبة قالوا انا لله وانا اليه راجعون اولئك عليهم صلوات من ربهم و رحمته و اولئك هم المهتدون[۵]۔" آپ کی فقہی آراء اور اجتہادی بصیرت کا حاصل منبع قرآن حکیم ہی تھا۔ اس پر غور و خوض نے آپ کے اندر حکمت و فراست پیدا کی۔ آپ کا شمار صحابہ کرامؓ میں سے دس چوٹی کے مفسرین میں ہوتا ہے[۶]۔ خود نبی کریم ﷺ نے آپ کی تفسیر کی تصدیق فرمائی۔ ایک شخص نے ایک عورت کو سواری پر اپنے پاس بٹھا کر بلا جماع تلذذ حاصل کیا۔ بعد میں اسے ندامت ہوئی تو حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ آپ نے کہا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ۔ بالآخر معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش ہوا، تو یہ آیت نازل ہوئی "اقم الصلوٰة طرفی النهار و زلفا من اللیل ان الحسنٰت یذهبن السیئات ذالك ذكرى للذاكرين[۷]۔"

اس شخص نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ رعایت صرف میرے لئے خاص ہے یا سب لوگوں کیلئے ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی چھاتی پر ہاتھ مارا اور کہا "لاولا نعمة بل للناس عامة" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صدق عمر[۸]۔" حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ فرمان الٰہی "فاعتزلوا النساء فی المحیض[۹]۔" کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مرد بیوی کا بستر چھوڑ کر علیحدہ بستر پر سوئے بشرطیکہ وہ فراخی رکھتا ہو لیکن اگر فقیر ہو اور ایک ہی بستر ہو تو اس کے ساتھ سو سکتا ہے[۱۰]۔ چنانچہ ابو امامہ الباہلی سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ابتداء میں کیونکہ تنگی تھی تو ہم حائضہ بیویوں کے ساتھ ایک ہی بستر اور لحاف میں لیٹا کرتے تھے لیکن اب جبکہ اللہ نے بستروں اور لحافوں میں فراخی عطا کر دی ہے تو اس سے علیحدہ لیٹو جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے[۱۱]۔"

معلوم یہ ہوتا ہے کہ آپ کا یہ حکم احتیاط کے پیش نظر تھا۔ ایسی ہی احتیاط رسول اکرم ﷺ بھی بعض اوقات کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب میں حیض سے ہوتی تھی تو بستر سے اتر جاتی اور بوریے پر آ جاتی۔ نبی کریم ﷺ قریب نہ آتے جب تک پاک نہ ہو جاتی[۱۲]۔" بقول ابن کثیر یہ روایت محمول ہے کہ آپ پرہیز اور احتیاط کرتے تھے نہ یہ کہ یہ محمول ہو حرمت اور ممانعت پر[۱۳]۔ آپ تفسیر قرآن حکیم میں مکمل طور پر رسول خدا ﷺ ہی کی پیروی کو مقدم رکھتے تھے کہ کوئی فتویٰ دینے سے قبل یہ اطمینان کر لیں کہ رسول خدا ﷺ کا فعل و عمل کیا ہے۔

حیض کے مسئلہ میں بھی صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جماع کے علاوہ ہر چیز جائز ہے[۱۴]۔ رسول اکرم ﷺ کا عمل یہی تھا۔ آپ سے اس دوران بیویوں کے ساتھ لیٹنا، مساس کرنا، گود میں سر رکھ کر سونا، ایک برتن میں پانی پینا، ساتھ ٹیک لگا کر قرآن حکیم تک پڑھنا ثابت ہے[۱۵]۔ چنانچہ عراق سے آنے والے کچھ لوگوں نے آپ کے عہد خلافت میں کچھ سوالات پوچھے۔ آپ نے فرمایا "یہ وہ سوالات ہیں جن کے بارے میں میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا

---

(۱) سورۃ البقرہ ۲: ۱۹۸ (۲) شیبہ ۲،۲۸۵ (۳) طبری ۲: ۲۸۵ (۴) بیہقی ۴: ۶۵، روس ۶۲۷ (۵) سورۃ البقرہ ۲: ۱۵۶ (۶) سیوطی ۲،۱۸۷ (۷) سورۃ ہود ۱۱: ۱۱۴ (۸) طبری ۱۲: ۴۲ (۹) سورۃ البقرہ ۲: ۲۲۲ (۱۰) روس ۲۹۱ (۱۱) حزم ۱: ۷۶ (۱۲) داؤد ۱: ۱۱۳ (۱۳) کثیر ۱: ۲۵۹ (۱۴) بخاری ۱: ۷۸، مسلم ۱: ۱۶۸، نسائی ۱: ۱۴۷، ۱۵۰، مدب ۱: ۸۹، جصاص ۱: ۳۹۷ (۱۵) بخاری ۱: ۷۷، داؤد ۱: ۱۱، کثیر ۱: ۲۵۹، جصاص ۱: ۳۹۷

ان میں سے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے یہ کہا "مایحل للرجل من امرأته حائضا" آپ نے فرمایا "فلك مافوق الازار[1]"۔ "مذکورہ بالا آیت کے بارے میں آپ کی تفسیر اور اس فتویٰ میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ اگر مساس کے ذریعے ضبط کے بندھن ٹوٹنے کا خطرہ ہو تو اجتناب اور دوری ہی بہتر ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک اور حدیث کے مطابق ازار کے اوپر سب کچھ جائز قرار دینے کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا "والتعفف عن ذالك افضل[2]"۔"

اسی وجہ سے حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، سعید بن المسیبؒ، شریحؒ، امام شافعیؒ اور اکثر اہل عراق کا یہی مذہب ہے۔ یہ حضرات فرماتے تھے ہیں کہ یہ تو متفق فیصلہ ہے کہ جماع حرام ہے اس لئے اس کے آس پاس سے بھی بچنا چاہئے تاکہ حرمت میں واقع ہونے کا خطرہ نہ رہے[3]۔ قرآن حکیم سے اس تمام تر فکری و قلبی تعلق کے باوجود بہر حال انسان تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ عالم کل کے کلام علم و حکمت کے بحر بیکراں کا کوئی ایک ذہن انسانی احاطہ کر سکے۔ قرآن حکیم ایک طرف تو بے شمار علوم و فنون کا مخزن ہے اور دوسری طرف اس کی اپنی اصطلاحات ہیں اور سینکڑوں الفاظ کے منفرد معانی اور اپنا پیرایہ بیان ہے۔ اس لئے کئی الفاظ ایسے بھی تھے، جن کے حضرت عمر فاروقؓ کو معانی و مطالب معلوم نہیں تھے اور انہیں اس بات کا اعتراف بھی تھا۔ آپ کی عظمت کی دلیلوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ آیت پڑھی "فانبتنا فيها حبا و عنبا و قضبا و زيتونا و نخلا و حدائق غلبا و فاكهة و ابا[4]"۔ "ہم نے اگائے اس میں دانے، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجور، سرسبز باغ اور گھاس۔ فرمایا "فاکھہ، قضب اور ان سب چیزوں کو تو ہم پہچانتے ہیں مگر "اب" کیا ہے؟ پھر اپنا ہاتھ سر پر رکھا بعد ازاں فرمایا "اے عمر کی ماں کے بیٹے! یہ تو تکلفات ہیں کیا ہوا اگر تجھے "اب" کے معنی معلوم نہیں[5]"۔"

۵۔ تفسیر سے رجوع:

اسی طرح ایسی آیات بھی ہیں کہ آپ نے ان کا جو مطلب سمجھا اور ان کا جو اطلاق کیا وہ صحیح نہیں تھا۔ اس لئے استدلال کی بناء پر جونہی آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس سے رجوع کر لیا۔ اس کی نمایاں مثال وفات نبوی ﷺ پر آپ کا رد عمل ہے۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اپنے عہد خلافت میں عمرؓ اپنی کسی ضرورت سے جا رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ان کے ہاتھ میں درہ تھا اور اس وقت ان کے ساتھ میرے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ وہ اپنے دل میں کچھ باتیں کرتے جاتے تھے اور درے سے اپنے پاؤں کو مارتے جاتے تھے۔ یکایک وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے کہا "جانتے ہو کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت کیوں وہ بات کہی تھی کہ آپ نہیں مرے زندہ ہیں۔" میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں امیر المومنین بہتر جانتے ہیں۔" عمرؓ نے کہا "بخدا صرف اس آیت کی وجہ سے، وكذالك جعلنا كم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس و يكون الرسول عليكم شهيدا[6]"۔ "اس آیت سے میں سمجھتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے آخری اعمال دیکھنے تک کیلئے زندہ رہیں گے۔ اسی وجہ سے میں نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق وہ بات کہی تھی[7]"۔

یہ ممکن نہیں کہ زندگی کے ہر معاملے کے بارے میں قرآن حکیم کا ہر حکم اور اس کی روح کسی انسان کے ذہن میں ہر وقت مستحضر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے مشاورتی نظام کو رائج کرنے کے ساتھ لوگوں کو یہ آزادی دے رکھی تھی کہ دین کے معاملے میں کسی جھجک اور رو رعایت کے بغیر کتاب و سنت کا حکم سامنے لائیں۔ آپ کے عہد مبارک میں مرد تو کیا عورتیں بھی اس سلسلے میں اپنا بھرپور کردار سر انجام دیتی تھیں۔ اس کی نمایاں مثال وہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے خطبے میں بقول حضرت عبداللہ بن مصعب ارشاد فرمایا "اپنی عورتوں کے مہر چالیس اوقیہ سے زیادہ نہ باندھو۔ خواہ وہ اقصہ والوں یعنی یزید بن حصین کی بیٹی کیوں

---

(۱) عبدالرزاق ۱: ۲۷۵۷، بیہقی ۱: ۳۱۲، حزم ۱۰/ ۷۷، جصاص ۱: ۳۹۸ (۲) داؤد ۱: ۹۵ (۳) کثیر ۱: ۲۵۹ (٤) سورہ عبس ۸۰: ۲۷-۳۱ (۵) سیوطی ۱۰: ۱۲، حوری ۱: ۱۶۰ (٦) سورہ البقرہ ۲: ۱٤۳ (۷) حیات ۹/ ۱۵، طبری ۱: ۱۱/ ۲۱۱، بلاذری ۲: ۱٤٤، بیہقی ۹/ ۵۰٦۔

نہ ہو جو اس سے زیادہ باندھے گا تو میں زائد حصہ بیت المال میں داخل کر دوں گا۔ اس پر عورتوں کی صف میں سے ایک دراز قد اور چپٹی ناک والی عورت نے کہا "آپ کو اس کا کیا حق ہے؟" فرمایا "کیوں؟" اس نے جواب دیا اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے "**وآتیتم احداھن قنطارا فلاتاخذوا منہ شیئا اتاخذونہ بھتانا و اثما مبینا**"[1]۔ حضرت عمرؓ نے اس پر فرمایا: "**امراۃ اصابت و رجل اخطا**"[2]۔

مسروق بن الاجدع سے بھی ایسی ہی روایت منقول ہے۔ اس کے مطابق آپ منبر رسول پر چڑھے اور لوگوں سے خطاب کیا۔ فرمایا کہ "تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ عورتوں کے مہر سے زیادہ باندھتے ہو؟ جبکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کے ہاں تو مہر زیادہ سے زیادہ چار سو درہم یا اس سے کم ہی ہوتا تھا۔ اگر مہر کا زیادہ باندھنا تقویٰ اور لائق عزت ہوتا تو تم ان سے اس معاملے میں سبقت نہ لے جا سکتے۔ میں ہرگز نہیں جانتا کسی نے بھی کسی عورت کا مہر چار سو سے زیادہ باندھا ہو۔" یہ کہہ کر آپ منبر سے اتر آئے۔ قریش کی ایک عورت نے آپ پر اعتراض کیا کہا "اے امیر المومنین کیا آپ نے عورتوں کے مہر چار سو درہم سے زیادہ باندھنے سے روک دیا ہے؟" فرمایا "پھر کیا ہوا؟" اس نے کہا کہ "کیا آپ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ بات نہیں جانتے۔" پوچھا "وہ کیا ہے؟" اس عورت نے جواب دیا "آپ نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "**وآتیتم احداھن قنطارا** الخ" حضرت عمرؓ نے فرمایا "**اللھم غفرا کل انسان افقہ من عمر**۔" پھر آپ لوٹے اور منبر پر چڑھے اور فرمایا "اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں کے مہر چار سو درہم سے زیادہ باندھنے سے منع کیا تھا پس اب جو شخص اپنے مال میں سے جو اور جتنا پسند کرے وہ دے سکتا ہے میں نہیں روکتا"[3]۔

یہ روایت مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ میں رقم کی گئی ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے زیادہ مہر سے روکنے کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ انسان زیادہ مہر باندھ کر مصیبت میں پڑ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کی بیوی اسے بوجھ معلوم ہونے لگتی ہے اور اس کے دل میں اس سے نفرت بیٹھ جاتی ہے اور کہنے لگتا ہے تو نے تو میرے کندھوں پر مشک لٹکوا دی[4]۔" لیکن جب قرآنی آیت سامنے آئی تو آپ نے رجوع کر لیا۔ بقول ابن کثیر "**کان عمر بن الخطاب نھی عن کثرۃ الاصداق ثم رجع**[5]۔" آپ کا فرمان اس ارشاد نبوی کی روشنی میں تھا جو آپ ہی سے مروی ہے۔ "**خیر النکاح ایسرہ**[6]" لیکن جب آیت قرآنی پر غور کیا گیا تو جان گئے اس کی حیثیت ترغیب کی ہے نہ کہ حکم کی کیونکہ کئی مواقع ایسے آتے ہیں کہ انسان کو کسی اچھے مقصد اچھے رشتے یا کسی اور علت کی بناء پر زیادہ مہر باندھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق نے اپنے رجوع کر لینے کا عملی ثبوت یہ دیا کہ خاندان نبوی سے تعلق جوڑنے کیلئے ام کلثومؓ بنت علیؓ سے نکاح کیا اور چالیس ہزار درہم مہر باندھا[7]۔

حکم قرآنی کی طرف رجوع کرنے کی ایک اور مثال حد سرقہ کے بارے میں حضرت عمر فاروق کا موقف ہے ابتداً آپ یہ خیال کرتا تھا پہلی دفعہ کوئی چوری کرے تو دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے پھر کرے تو بایاں ہاتھ کاٹا جائے۔ پھر تیسری مرتبہ چوری کرے تو دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے۔ آپ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ایک شخص کے بارے میں یہی مشورہ دیا اور اسی پر عمل کیا گیا[8]۔ آپ کے عہد خلافت کے ابتدائی دور میں بھی اسی پر عمل ہوا چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کا ہاتھ کاٹا جبکہ اس سے پہلے بھی ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹا جا چکا تھا[9]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حکم قرآنی کا یہی منشا سمجھتے تھے لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد آپ نے اس سے رجوع کر لیا۔ یہ اس وقت ہوا جب آپ کے پاس سدوم نامی ایک شخص لایا گیا۔ اس نے پہلی بار چوری کی تھی

---

(۱) سورۃ النساء: ۲۰ (۲) حنبل ۱/۲۷۷ جوزی، ص ۱۵۰ کثیر ۱/۴۶۷ (۳) جوزی، ص ۱۵۰ کثیر ۱/۴۶۷، داؤد ۲/۲۱۶ دارمی ۲/۱۴۱ (۴) حنبل ۱/۲۷۷ کثیر ۱/۴۶۷ نسائی ۶/۱۱۷ (۵) کثیر ۱/۴۶۷ (۶) داؤد ۲/۲۴۱ (۷) طبری ۵/۱۹۹، کثیر ۷/۸۱ (۸) بیہقی ۸/۲۷۴ (۹) بیہقی ۸/۲۷۴۔

تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی گئی۔ دوسری مرتبہ چوری کی تو پاؤں کاٹنے کی سزا دی گئی۔ تیسری مرتبہ چوری کی تو آپ نے اس کا دوسرا ہاتھ یا پاؤں کاٹنے کی سزا دینے کا ارادہ فرمایا' تو حضرت علیؓ نے کہا ایسا نہ کیجئے بلکہ چور کیلئے صرف ایک ہاتھ اور ایک پیر کاٹنے کی سزا ہے۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے "انما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ و یسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم و ارجلھم من خلاف[1]"۔ چنانچہ یہ مناسب نہیں کہ آپ اسے اس حال کو پہنچا دیں کہ نہ وہ چل پھر سکے اور نہ کھا سکے۔ اس لئے آپ اسے یا تو تعزیری سزا دیں یا قید خانہ میں ڈال دیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اس کو قید خانے میں بند کر دیا[2]۔

بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ جن کا آپ نے جو مطلب سمجھا اور جو تفسیر بیان کی اس کو قبول عام کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ صحابہ کرام' محدثین اور فقہاء نے قوی دلائل کی بناء پر اس سے برعکس فتویٰ دیا اور عمل کیا۔ اس سے آپ کی عظمت و بصیرت پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ آپ انسان تھے' معصوم عن الخطاء نہیں تھے۔ ایک مجتہد کی حیثیت سے آپ کے قول و عمل میں خطاء و صواب دونوں کا احتمال موجود تھا۔ اس کی نمایاں مثال تیمم کے بارے میں آپ کی رائے ہے۔ جنبی کے بارے میں آپ کی یہ رائے تھی کہ اس کیلئے غسل ضروری ہے' محض تیمم کافی نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی اس بات پر آپ سے متفق تھے[3]۔ آپ کی دلیل قرآن حکیم کی یہ آیت ہے "ولا جنبا الا عابری سبیل حتی تغتسلوا[4]"۔ "آپ کے نزدیک آیہ کریمہ "وان کنتم مرضی او علی سفر او جاء احد منکم من الغائط او لامستم النساء فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا[5]" کے حکم میں جنبی داخل نہیں تھا[6]۔ کیونکہ اس آیت میں لمس کی تفسیر میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد ہاتھ سے چھونا ہے' جماع نہیں' یہی وجہ ہے کہ آپ کے نزدیک عورت کے چھونے پر وضو واجب ہے[7]۔

حضرت عبدالرحمن بن ابزیؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور عرض کیا مجھے جنابت ہوئی ہے' لیکن پانی نہیں ملا۔ آپ نے فرمایا "نماز نہ پڑھ۔" ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ اس شخص نے کہا کہ ہم ایک دو ماہ ایسی جگہ قیام کرتے ہیں (جہاں پانی نہیں ہوتا) آپ نے فرمایا میں تو نماز نہ پڑھوں جب تک پانی نہ ملے۔ اس پر حضرت عمارؓ نے کہا "اے امیر المومنین آپ کو یاد نہیں' جب آپ اور میں ایک غزوہ میں تھے' دونوں جنبی ہو گئے تھے اور پانی نہیں تھا۔ آپ نے نماز نہیں پڑھی تھی اور میں نے مٹی مل کر نماز پڑھ لی تھی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں یہی کافی تھا کہ تم اپنے ہاتھ مٹی پر مار کر جھاڑ لیتے اور پھر انہیں اپنے منہ اور کلائیوں پر پھیر تے[8]۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "اے عمار! اللہ سے ڈرو۔" حضرت عمارؓ نے کہا "بخدا! اگر آپ چاہیں تو میں کبھی بھی یہ بات بیان نہ کروں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا مجھ پر حق مقرر کیا ہے۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "کلا واللہ لنولینک من ذالک ما تولیت[9]"۔

حضرت عمر فاروقؓ کے اسی موقف کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی اختیار کیا۔ اعمش کے بقول' شقیق بن مسلمہ سے روایت ہے کہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے پوچھا اے ابو عبدالرحمنؓ آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر کسی کو غسل کی ضرورت ہو اور پانی نہ ملے تو سے کیا کرنا چاہیے۔ عبداللہ نے فرمایا اسے نماز نہیں پڑھنی چاہئے جب تک کہ پانی نہ مل جائے (ایک روایت کے مطابق خواہ ایک ماہ تک پانی نہ ملے)۔ اس پر ابو موسیٰ نے پوچھا پھر عمارؓ کی روایت کا کیا ہو گا' جبکہ نبی ﷺ نے انہیں فرمایا تھا "تمہیں صرف (ہاتھ اور منہ کا) تیمم کافی تھا۔" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ "تم عمرؓ کو نہیں دیکھتے کہ وہ عمارؓ کی اس بات سے مطمئن نہیں تھے؟" پھر ابو موسیٰ نے کہا اچھا عمارؓ کی بات کو چھوڑو لیکن اس آیت کا کیا جواب دو گے؟" فلم

---

(۱) سورۃ المائدہ ۳۳ (۲) عبدالرزاق ۱۸٦/۱۰' بیہقی ۲۷٤/۸' حرملہ ۳۵۵/۱۱ (۳) مدعمہ ۲۳٤٠٦ (٤) سورۃ النساء ٤۳ (۵) ایضاً (٦) رواس ۱۷۷ (۷) جصاص ۳۰۹/۲ (۸) بخاری ۱۸۸' مسلم ۱۹۳/۱' ابوداؤد ۱۳٦/۱' ابن حبان ۳٠/۲' کثیر ۵٠۱/۱' طبری ٤۱۳/۸' نسائی ۱٦٦/۱ (۹) مسلم ۹۳/۱' ابوداؤد ۱۳٦/۱' طبری ٤۲۱/۸' نسائی ۱٦۹/۱۰' عبدالرزاق ۲۳۸/۱۔

تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبا[1]۔ "حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس کا جواب نہ دے سکے اور فرمایا "اگر ہم اس کی بھی لوگوں کو اجازت دے دیں تو ان کا یہ حال ہو جائے گا کہ اگر کسی کو پانی ٹھنڈا محسوس ہوا تو اسے چھوڑ کر تیمم کر لیا کرے گا۔ "حضرت اعمش کہتے ہیں "میں نے شقیق سے کہا گویا عبداللہ بن مسعودؓ نے اس وجہ سے یہ صورت ناپسند کی تھی۔ "انہوں نے جواب دیا "ہاں[2]۔ "ابن کثیر کی روایت میں حضرت عبداللہ کے قول میں یہ اضافہ ہے کہ سورۃ المائدہ میں فرمان الٰہی ہے[3]۔ "فامسحوا بوجوهكم و ايديكم منه[4]۔ "یعنی پھر وہ اس آیت کو دلیل بنالیں گے لیکن تمام امت کا عمل حضرت عمر فاروقؓ کی رائے کے برعکس ہے بقول ابن قدامہ "واما الاجماع فاجمعت الامة على جواز التيمم فى الجملة[5]۔ "اس کی وجہ مذکورہ آیات اور صحیح احادیث ہیں۔ ان میں حضرت عمارؓ کی حدیث بھی شامل ہے ایک اور قوی حدیث سے جنبی کے تیمم کے جواز کو مزید تقویت ملتی ہے۔

عمران بن حصین سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص علیحدہ کھڑا ہے اور لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک نہیں ہو۔ آپ نے اس سے پوچھا "اے فلاں تم نے لوگوں کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی؟" اس نے کہا کہ میں جنبی ہوں اور پانی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "مٹی سے تیمم کرلو یہ تمہارے لئے کافی ہے[6]۔ "یہی صحابہ کرامؓ اور جمہور علماء کا مسلک ہے۔ جن میں حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ حضرت عمروؓ بن العاص حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عمارؓ شامل ہیں اور یہی ثوری مالک ابو ثور شافعی اسحاق ابن المنذر اور اصحاب کا قول ہے[7]۔ علامہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ارشاد نبوی پوشیدہ و مخفی رہا[8]۔

اب رہی یہ بات کہ کیا رسول اللہ ﷺ کی تعبیر و تشریح حضرت عمرؓ سے تاحیات مخفی رہی؟ حالات و قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اس سے آگاہ ہو چکے تھے کیونکہ یہ اس قدر اہم اور کثیر الوقوع مسئلہ تھا کہ زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا اس لئے آپ نے رجوع کر لیا تھا۔ چنانچہ امام نووی نے ابن الصباغ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا[9]۔ امام قرطبی نے قطعیت کے ساتھ یہ کہا ہے کہ آپ نے اس رائے سے رجوع کر لیا تھا[10]۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے۔

ابتداء میں حضرت عمرؓ مس سے مراد بیوی کا بوسہ لینا اور اسے ہاتھ لگانا سمجھتے تھے اور اسے ناقض وضو خیال کرتے تھے[11]۔ بعد میں آپ نے رائے سے رجوع کر کے اس سے مراد جماع لے لیا (واللہ اعلم) اس کا ثبوت آپ کا اپنا عمل ہے۔ یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نماز کیلئے نکلے تو اپنی بیوی کو بوسہ دیا پھر نماز پڑھ لی لیکن وضو نہ کیا[12]۔ چنانچہ علامہ ابن کثیر نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دونوں روایتوں کو ثابت ماننے کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آپ وضو کو مستحب مانتے تھے[13]۔

ہمارے خیال میں آپ جنبی کے تیمم کو رجوع کرنے کے بعد جائز سمجھنے لگے تھے۔ البتہ آپ نے اپنے طبعی میلان اور ذوق نفاست کی بناپر کوشش یہی کرتے تھے کہ غسل کا موقع مل سکے تو کریں۔ ایک مرتبہ سفر کے دوران جنابت ہوگئی آپ کے پاس پانی نہیں تھا تو لوگوں سے پوچھا کہ اگر ہم تیز تیز چلیں تو کیا سورج طلوع ہونے سے پہلے پانی حاصل کر سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے حکم دیا چلو سواریوں کو تیز کرو چنانچہ سورج طلوع ہونے سے پہلے پہنچ گئے۔ غسل کیا پھر نماز پڑھی[14]۔

---

(۱) سورۃ المائدہ ٦ (۲) بخاری ۱/ ۹۱' مسلم ۱/ ۱۵۷' حبان ۲/ ۲۹۹' ابو داؤد ۱/ ۴۲ (۳) کثیر ۱/ ۵۰۰ (٤) سورۃ المائدہ ٦ (۵) قدامہ ۱/ ۲۱۵ (٦) بخاری ۱/ ۹۱' مسلم ۱/ ٥٦ قدامہ ۱/ ۲۳۵ نسائی ۱/ ۱۷۰ (۷) قدامہ ۱/ ۲۳٤ الوسی ٥/ ٤٢ (۸) حزم ٤/ ۴۹۱ (۹) روائع ۱۷۸ (۱۰) ایضاً (۱۱) بیہقی ۱/ ۱۲٤' کثیر ۱/ ۵۰۲ (۱۲) عبدالرزاق ۱/ ۱۳۵' کثیر ۱/ ۵۰۲ (۱۳) کثیر ۱/ ۵۰۲ (۱٤) عبدالرزاق ۱/ ۲٤٤

غالباً آپ کے پیش نظر وہی حکمت تھی جس کا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ذکر کیا ہے کہ کہیں معمولی سے عذر پر پانی کے بجائے تیمم کرنے کے عادی نہ ہو جائیں (واللہ اعلم) اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو اسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں جیسا کہ رواس نے کہا ہے کہ آپ جمہور صحابہؓ کی رائے سے متفق ہو گئے تھے (۱)۔

ایک تو یہ کہ آپ نے حضرت عمار بن یاسرؓ کو اس حدیث کی روایت کرنے سے ہرگز نہیں روکا تھا بلکہ صرف ان پر اس کی ذمہ داری ڈال دی تھی۔ یہ روایت حدیث کے سلسلے میں احتیاط کی پالیسی کے پیش نظر تھا اور غلط سمجھتے تو ضرور روک دیتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ان کے قول سے مطمئن ہو گئے تھے۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ذاتی اندازہ تھا کہ مطمئن نہیں ہوئے۔ ورنہ حضرت عمرؓ کے قول و عمل سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ دوم یہ کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ خیال کرنا محال ہے کہ آپ کو آنحضور ﷺ کی تفسیر پہنچے اور اس کے باوجود اپنی رائے اور اجتہاد پر قائم رہیں جبکہ بہت سے مثالیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ آپ بارہا حدیث پہنچنے پر اپنی رائے سے دستبردار ہو گئے۔

سوم یہ کہ یہ بات بھی ناممکن ہے کہ سارے فقیہہ صحابہ کرامؓ کا اس بارے میں اجماع ہو اور اس کے قوی دلائل ہوں مگر اس کے برعکس حضرت عمرؓ اپنی رائے ہی کو فوقیت دیتے رہیں۔ اس کے برعکس آپ کا پورا عہد خلافت اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ چھوٹے معاملات میں بھی صحابہ کرامؓ کی رائے لیتے اور جو صائب ہوتی اور جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہوتی اسی کے مطابق عمل کرتے۔

---

(۱) رواس، ۱۷۸

۵ ..... احکام قرآنی پر عمل:

اجتہادی بصیرت اور تفقہ فی الدین میں گیرائی و گہرائی کیلئے ضروری ہے کہ آدمی کتاب و سنت پر پوری طرح عمل پیرا ہو۔ قرآن ایک دعوت انقلاب ہے اس کے اسرار و رموز تک صحیح معنوں میں وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو عالم با عمل ہوں جو اس پر ایسا ایمان رکھیں کہ اس میں شک و شبہ تک نہ ہو اور عمل بھی اس طرح کریں کہ اس کی عملی تفسیر دکھائی دیں۔ بقول اقبالؒ

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن[1]

حضرت عمر فاروقؓ کی بصیرت کا راز بھی اسی میں پنہاں تھا۔ متعدد واقعات اس کا ثبوت ہیں۔ آسائش و آرام کی خواہش ہر آدمی کے دل میں فطری طور پر ودیعت کی گئی ہے۔ ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی غذا اور اس کا لباس اچھا ہو۔ رہائش اور روزمرہ کی زندگی آرام دہ ہو۔ ان مرغوبات نفس کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ "زين للناس حب الشهوات من النساء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث ذالك متاع الحيوة الدنيا والله عنده حسن المآب[2]۔" نفس کی ان خواہشات پر کنٹرول وہی شخص کر سکتا ہے جو کلام الٰہی سے گہرا تعلق رکھتا ہو اور اسے اس کے عقائد و نظریات پر شعوری یقین ہو اور اس کی تعلیمات کو اپنے ہر عمل کی بنیاد سمجھتا ہو۔ ہم دیکھتے ہیں حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد تو یہ حالت ہو گئی کہ آپ کا رہن سہن ریاست کے ایک عام شہری سے بھی کم درجے کا ہو گیا۔

حسن سے مروی ہے کہ عمر بن الخطابؓ نے شدت اور اپنے نفس پر تنگی کو لازم کر لیا۔ اللہ وسعت لایا تو مسلمان ام المومنین حفصہؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ عمرؓ نے سوائے شدت اور نفس پر تنگی کے سب چیز سے انکار کر دیا حالانکہ اللہ نے رزق میں کشادگی دے دی ہے۔ انہیں چاہئے کہ اس مال غنیمت میں سے جو چاہیں اپنے لئے کشادگی کر لیں، انہیں جماعت مسلمین کی طرف سے پوری اجازت ہے۔ ام المومنین حفصہؓ ان لوگوں کی خواہش سے متفق ہو گئیں، جب لوگ واپس ہوئے تو عمرؓ ان کے پاس آئے۔ ام المومنین حفصہؓ نے انہیں ان باتوں سے آگاہ کیا جو قوم نے کہی تھیں۔ عمرؓ نے ان سے کہا کہ اے حفصہؓ اے دختر عمرؓ تم نے اپنی قوم کی تو خیر خواہی کی مگر اپنے باپ کے ساتھ بے وفائی کی میرے خاندان والوں کا صرف میرے جان و مال میں حق ہے لیکن میرے دین و امانت میں کسی کا حق نہیں[3]۔ آپ نے اپنے بود و باش میں ہمہ گیر تبدیلی قرآن حکیم کے ایک ارشاد کو سامنے رکھتے ہوئے کی۔ چنانچہ حسن سے مروی ہے کہ ابو موسیٰ اہل بصرہ کے ایک وفد کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم لوگ روزانہ تو ایسے وقت عمرؓ کے پاس جاتے تھے کہ ان کیلئے تین روٹیاں ہوتی تھیں، کبھی تو ہم نے بطور سالن کے روغن زیتون پایا، کبھی گھی پایا، کبھی دودھ، کبھی خشک کیا ہوا گوشت جو باریک کر کے ابال لیا جاتا تھا، کبھی تازہ گوشت اور یہ کم ہوتا تھا۔ انہوں نے ایک روز ہم سے فرمایا کہ اے قوم! میں اپنے کھانے کے متعلق تم لوگوں کی ناگواری و ناپسندیدگی محسوس کرتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو تم سب سے اچھا کھانے والا تم سب سے اچھی زندگی بسر کرنے والا ہو جاؤں۔ میں بھی سینے اور کوہان کے گوشت کے مزے سے اور بھونے ہوئے گوشت اور رائی اور زیتون کے سالن سے اور باریک روٹیوں کے مزے سے ناواقف نہیں ہوں لیکن میں نے جل وثناء کا ارشاد سنا جس نے قوم کو ان کے کسی کام پر جوان لوگوں نے کیا عار دلائی ہے[4]۔ اس نے فرمایا "اذهبتم طيباتكم في حياتكم الدنيا واستمتعتم بها[5]۔" (تم لوگ اپنی پاکیزہ چیزیں اپنی حیات دنیا میں لے جا چکے اور تم ان سے فائدہ اٹھا چکے اس لئے حیات آخر میں تمہارا حصہ

---

(۱) اقبال ضرب کلیم ۵۳ (۲) سورہ آل عمران ۳: ۱۴ (۳) ابن سعد ۳: ۲۷۸ (۴) ابن سعد ۳: ۲۷۹، جز اول ۳۸ (۵) سورہ الاحقاف ۴۶: ۲

باقی نہیں رہا۔) حرم پاک کے بارے میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہوا اسے امن مل گیا "ومن دخله کان امنا"[۱]۔ اسی بناء پر حضرت عمرؓ کا یہ خیال تھا کہ اس کی حدود میں جو شخص ہو اس سے قصاص نہیں لیا جاسکتا۔ آپ اس پر ہی عمل پیرا رہے آپ اس سلسلے میں کس حد تک پر عزم تھے اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جاسکتا ہے۔ عکرمہ بن خالد سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر حرم مکہ میں مجھے اپنے باپ خطاب کا قاتل بھی مل جاتا تو میں اسے کچھ نہ کہتا یہاں تک کہ وہ حرم سے باہر نہ آجاتا[۲]۔

قرآن حکیم سے اسی عملی تعلق ہی کی یہ شان تھی کہ آپ نے اپنے قول و عمل سے اپنے عہد خلافت میں بھی حتی المقدور کوششیں کیں کہ لوگوں کو ان عملی تقاضوں کو پورا کرنے پر مجبور کیا جائے۔ ان میں سب سے اہم چیز دینی فرائض کی بجا آوری ہے۔ حج کے بارے میں حکم ربانی ہے "ولله على الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلا"[۳]۔ آپ نے اس پر عمل کرانے کیلئے سب سے پہلے زبانی ترغیب کا طریقہ اپنایا اور اس سے متعلق حدیث نبوی کو لوگوں کے سامنے بیان کر کے فرمایا کہ جو طاقت کے باوجود حج نہ کرے وہ یہودی اور نصرانی ہو کر مرے گا[۴]۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میرا یہ ارادہ ہے کہ لوگوں کو مختلف شہروں میں بھیجوں۔ وہ دیکھیں جو لوگ مال رکھنے کے باوجود حج نہ کرتے ہوں ان پر جزیہ لگادیں وہ مسلمان نہیں[۵]۔ آپ نماز تہجد وسط شب میں پڑھنا محبوب رکھتے تھے[۶]۔ جتنا اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا رات کو نماز پڑھتے اور آخر شب ہوتی تو اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کرتے تھے۔ انہیں الصلوۃ الصلوۃ کہہ کر آواز دیتے اور یہ آیت تلاوت فرماتے[۷]۔ "وامر اهلك بالصلوة واصطبر عليها لا نسئلك رزقا نحن نرزقك والعاقبة للتقوى[۸]۔"

آپ کی یہ انتہائی کوشش ہوتی کہ آپ کے عملی اقدامات قرآن حکیم کی روح کے عین مطابق ہوں۔ ایک طرف تو حدود الٰہی کو پوری قوت سے نافذ کیا جائے اور دوسری طرف جو رعایات ہیں ان سے استفادے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ حضرت مغیرہ بن شعبہ پر جبکہ وہ بصرہ کے گورنر تھے نافع بن حارث شبل بن معبد اور ابوبکرہ نے بدکاری کی تہمت لگائی۔ حضرت عمرؓ نے بلایا اور چوتھے گواہ زیاد بن ابیہ نے محض شک کا اظہار کیا تو آپ نے بقیہ تینوں پر حد قذف نافذ فرمادی[۹]۔ آپ کے عمل کی بنیاد یہ آیت تھی[۱۰]۔ "والذين يرمون المحصنت ثم لم ياتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمنين جلدة ولا تقبلوا لهم شهادة ابدا و اولئك هم الفاسقون الا الذين تابوا من بعد ذالك واصلحوا فان الله غفور رحيم[۱۱]۔" بعد والی آیت میں کیونکہ توبہ کرنے والوں کو چھوٹ دی گئی ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا جو شخص توبہ کرے گا میں اس کی گواہی قبول کرلوں گا[۱۲]۔ ان سے کہا توبہ کرو چنانچہ نافع اور شبل نے توبہ کرلی تو آپ ان کی گواہی قبول کرتے لیکن ابوبکرہ نے اپنے آپ کو جھٹلانے سے انکار کردیا لہٰذا حضرت عمرؓ ان کی گواہی قبول نہیں کرتے تھے[۱۳]۔ اسی طرح آپ حد سرقہ کو بھی پوری قوت لیکن ضبط کے ساتھ نافذ کرنے کا حکم دیتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ چوروں پر سختی کرو اور یکے بعد دیگرے ان کے ہاتھ اور پیر کاٹ دو تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تطبیق ہو جائے[۱۴]۔ "السارق والسارقة فاقطعوا ايديهما جزاء بما كسبا نكالا من الله[۱۵]۔"

محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تنگ گھاٹی میں گھوڑے ڈالے۔ وہاں ہم نے ایک ہرن مار جبکہ ہم دونوں احرام کی حالت میں تھے اب اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت عمرؓ نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک شخص

---

(۱) سورہ آل عمران ۳: ۹۷ (۲) حزم ۱۱۱ / ۱: ۴۹۳ (۳) سورہ آل عمران ۳: ۹۷ (۴) کثیر ۱: ۳۸۶ (۵) کثیر ۱: ۳۸۶ (۶) سعد ۳: ۲۸۶ (۷) مالک ۱: ۹۱٫۱ عبدالرزاق ۳: ۴۹ (۸) سورہ طہ ۲۰: ۱۳۲ (۹) طبری ۴: ۷۰ کثیر ۷/ ۸۱۔۸۲ بلاذری ۱: ۴۹۰ (۱۰) بخاری ۳: ۱۵۰ (۱۱) سورہ النور ۲۴: ۴۔۵ (۱۲) بخاری ۳: ۱۵۰ عبدالرزاق ۷/ ۳۸۴ (۱۳) عبدالرزاق ۷/ ۳۸۴ بلاذری ۱: ۴۹۲ (۱۴) طبری ۶: ۲۲۹ (۱۵) سورۃ المائدہ ۳۸۔

سے کہا آؤ میں اور آپ اس بارے میں فیصلہ کریں چنانچہ ان دونوں نے ایک بکری کا حکم دیا۔ یہ پوچھنے والا شخص مڑا اور کہا کہ یہ عجیب امیر المومنین ہیں کہ ایک ہرن کا فیصلہ بھی اکیلے نہیں کر سکے۔ جب تک کہ ایک اور شخص کو اپنے پاس نہیں بلوایا۔ حضرت عمرؓ نے اس شخص کی بات سن لی۔ اسے بلا کر پوچھا "کیا تم نے سورہ المائدہ پڑھی ہے؟" وہ بولا نہیں۔ پوچھا "کیا اس شخص کو جانتے ہو جس نے میرے ساتھ مل کر فیصلہ دیا ہے؟" اس نے جواب دیا نہیں۔ فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ تو نے سورۃ المائدہ پڑھی ہے (اور اس کے باوجود ایسی بات کہتا ہے) تو تجھے مار تا۔" پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی کتاب میں فرمان ہے "یحکم به ذوا عدل منکم هدیا بلغ الکعبة[1]۔" اور یہ عبدالرحمٰن بن عوف ہیں[2]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ قرآن مجید کو سوچ سمجھ کر پڑھیں اور احکام کو یاد رکھیں۔ آپ کی اجتہادی بصیرت احکام قرآنی کی حکمت اور روح تک پہنچنے میں سرگرداں رہتی تھی۔ جب آپ کو کسی بارے میں شرح صدر حاصل ہو جاتا تو اسی کے مطابق فتویٰ دے دیتے۔ آپ کے بیشتر احکام و فرامین میں یہی بات ہمیں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے "واتموا الحج والعمرة لله[3]۔"

حضرت عمرؓ کے نزدیک ان کا پورا کرنا یہ ہے کہ ان دونوں کو الگ الگ ادا کیا جائے۔ عمرے کو حج کے مہینوں میں ادا نہ کیا جائے[4]۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں آتا ہے کہ حج کے مہینے مقرر ہیں[5]۔ "الحج اشهر معلومات[6]۔" ابو نضرہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس تمتع کرنے کی اجازت دیتے تھے اور ابن زبیر منع کرتے تھے۔ میں نے جابر بن عبداللہ سے اس بارے میں ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا "میرے پہلو پر دار حدیث واقع ہے۔" "ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمتع کیا تھا۔ ایک دن حضرت عمر فاروقؓ (عہد خلافت میں) کھڑے ہوئے اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کیلئے جو کچھ جائز قرار دینا تھا دے دیا۔ قرآن حکیم اپنی منازل پر نازل ہوا۔ لہٰذا حج اور عمرے کی اسی طرح تکمیل کرو جیسے قرآن چاہتا ہے[7]۔"

حضرت عمر فاروقؓ کے پیش نظر تین حکمتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ حج و عمرہ کے الگ الگ ادا کرنے سے دونوں کو بہتر طور پر پوری شعوری و قلبی کیفیت کے ساتھ ادا کیا جا سکے گا اور یہی دراصل عبادات کی روح ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ حج اور عمرہ کو جدا کرو تاکہ تم میں سے کسی کا حج بھی پوری طرح ادا ہو اور عمرہ بھی' وہ اس طرح کہ کوئی عمرہ حج کے مہینوں میں ادا نہ کرے' بلکہ اور دنوں میں کرے (۸)۔ دوسری یہ کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ بیت اللہ کی زیارت زیادہ سے زیادہ ہو۔ لوگ حج کیلئے الگ نیت اور سفر کر کے آئیں اور عمرے کیلئے الگ' اس طرح اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں سے خوب فیضیاب ہوں اور اس کا گھر بھی پر رونق و آباد رہے' کیونکہ خانہ کعبہ کی مرکزیت توحید کی عظمت اور امت مسلمہ کی فکری و عملی وحدت و اخوت کی بنیاد ہے۔

حضرت سالم سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے حج تمتع کے بارے میں استفسار کیا گیا' تو انہوں نے اس کے کرنے کا حکم دیا۔ کسی نے کہا تم اپنے والد کی مخالفت کر رہے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ حضرت عمرؓ نے کبھی وہ نہیں کیا' جو تم کہہ رہے ہو۔ انہوں نے تو یہ کہا تھا کہ عمرہ حج سے علیحدہ کرو اور ان کا مقصود یہ تھا کہ حج کے مہینوں کے علاوہ بھی بیت اللہ کی زیارت جاری رہے۔ تم نے خود اس (تمتع کو) حرام قرار دے دیا ہے اور اس پر سزا دینے لگے' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سے حلال قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس پر عمل کیا تھا[9]۔ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ کیا آپ نے حج تمتع سے منع کیا ہے۔ جواب دیا نہیں' بلکہ میرا ارادہ یہ تھا کہ بیت اللہ کی کثرت سے زیارت کی جائے[10]۔ تیسری حکمت جو آپ کے پیش نظر تھی وہ خانہ خدا اور حرم پاک کا تقدس ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کے بیٹے ابراہیم روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ حج تمتع کرنے کا فتویٰ دیا کرتے تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ آپ اپنے فتوے پر غور کریں کیونکہ آپ کو

---

(۱) سورہ المائدہ ۹۵ (۲) مالک ۱:۶۱۶ مسند ۲: ۱۰۲ (۳) سورہ البقرہ ۲: ۱۹۶ (۴) قرطبی ۲: ۳۶۶ کثیر ۱: ۲۳۰ (۵) کثیر ۱: ۲۳ جصاصی ۱: ۳۳۶ رزق ۵: ۱۹۹ (۶) سورہ البقرہ ۲: ۹۷ (۷) مسلم ۴: ۳۸ بیہقی ۵: ۲۱ (۸) مالک ۳۴۷ جصاص ۱: ۳۳۵ (۹) بیہقی ۵: ۲۱ (۱۰) بیہقی ۵: ۲۱۵۔

معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے بعد میں حج کے بارے میں کیا حکم جاری کیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابو موسیٰؓ نے حضرت عمرؓ سے ملاقات کی اور اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ نبی ﷺ اور آپ کے اصحابؓ نے حج تمتع کیا ہے لیکن مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ لوگ حرم کے قریب اپنی بیویوں کے ساتھ شب باش ہوں اور جب چلیں تو ان کے سروں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں[۱]۔ رہی یہ بات کہ منع کرنے کی حیثیت کیا ہے؟ کیا حج تمتع کو ناجائز سمجھتے تھے یا حج و عمرہ کے نگ کرنے کو افضل جانتے تھے اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک ابتداء میں جواز کے قائل نہیں تھے بعد میں اپنی رائے سے رجوع کر لیا' ابن حزم کا بھی یہی خیال ہے[۲]۔ لیکن بعض دیگر علماء کہتے ہیں کہ آپ الگ الگ کرنے کو افضل گردانتے تھے۔ چنانچہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی ممانعت بطور حرام کہنے کے نہ تھی بلکہ اس لئے تھی کہ لوگ کثرت بیت اللہ شریف کا قصد حج اور عمرے کیلئے کریں جیسا کہ آپ سے صراحتاً مروی ہے[۳]۔

علامہ قرطبی کے بقول بعض علماء کا یہ خیال بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جس تمتع سے منع کیا تھا اور سزا دی تھی وہ یہ تھا کہ حج کو عمرے ہی میں فسخ کر دیا جائے[۴]۔

ہمارے نزدیک حضرت عمرؓ جواز تمتع کے قائل تھے اس لئے آپ تختی سے منع نہیں کرتے تھے۔ آپ کا اپنا قول ہے کہ "میں تمہیں تمتع سے منع نہیں کرتا کیونکہ یہ تو کتاب اللہ میں موجود ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا ہے[۵]۔ یہ رجوع کرنے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ مذکور حکمتوں کے پیش نظر آپ افضل اسی کو خیال کرتے تھے کہ حج اور عمرہ الگ الگ کیا جائے۔ جصاص کی یہ بات بالکل درست ہے جس میں انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے موقف کو پیش کرتے ہوئے فرمایا ہے "کان الاختلاف فی الافضل لا فی الحظر والاباحۃ[۶]۔" آپ کی قرآن حکیم سے عملی وابستگی کا ہی نتیجہ تھا کہ جب آپ کے کسی اقدام یا عمل پر کوئی آیت یاد دلائی جاتی' تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر کے رجوع کر لیتے تھے۔ آپ لوگوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کا بہت خیال رکھتے تھے اس کیلئے عملی منصوبہ بنانے کیلئے عوام کے حالات سے آگہی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے منصبی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کیلئے ہر وقت سرگرداں رہتے۔ یہی بات تجسس پر آمادہ کرتی تھی۔ متعدد ایسے واقعات ہیں کہ آپ کے سامنے آیت قرآن "ولا تجسسوا[۷]" پڑھی گئی تو آپ نے کام پر سزا دینے کا ارادہ ترک کر دیا اور محض تنبیہہ پر قناعت کی کیونکہ آپ کے اپنے عمل میں تجسس کا عنصر شامل تھا۔

ایک مرتبہ آپ کو اطلاع دی گئی کہ ابو محجن ثقفی اور ان کے ساتھی اپنے گھر میں مے نوشی کر رہے ہیں۔ آپ فوراً روانہ ہوئے اور ان کے گھر پہنچ گئے۔ دیکھا تو ان کے پاس ایک ہی شخص تھا۔ ابو محجن نے کہا اے امیر المومنین یہ آپ کیلئے جائز نہیں ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تجسس سے منع کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس پر حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبد اللہ بن ارقمؓ نے کہا اے امیر المومنین یہ درست کہہ رہے ہیں کیونکہ یہ بھی تجسس ہی ہے' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں چھوڑ دیا اور باہر آ گئے[۸]۔ آپ کا یہ طریقہ رہا کہ لوگوں کے حالات سے واقفیت اور ان کی حفاظت و نگرانی کرنے کیلئے راتوں کو مدینے کی گلیوں میں گشت لگایا کرتے تھے[۹]۔ کئی مرتبہ آپ اپنے ساتھ کسی اور صحابی کو بھی ملا لیتے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ سے مروی ہے کہ ایک شب میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ گشت پر تھا۔ چلتے چلتے ہم نے دیکھا کہ ایک گھر میں چراغ جل رہا ہے۔ چنانچہ ہم اس سمت کو ہو لیے قریب پہنچے تو گھر کا دروازہ بند تھا اور گھر میں شور و شغب کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ کا ہاتھ پکڑا اور پوچھا تمہیں معلوم ہے کہ یہ کس کا گھر ہے۔ میں نے کہا نہیں' حضرت عمرؓ نے بتایا کہ یہ ربیعہ بنت امیہ بن خلف کا گھر ہے اور ان لوگوں نے شراب کی مجلس جما رکھی ہے لہٰذا اب تمہارا کیا خیال ہے؟

---

(۱) بیہقی ۵ ۲ نسائی ۱۵۳/۵' حنبل ۱ ۳ ۲ ۶ ۳ ۳ (۲) حزم۱۰۷/۷ (۳) کثیر۱/۲۳۴ (۴) قرطبی ۲ ۳۸۸ (۵) قدامہ ۳ ۱ ۲ (۶) جصاص ۳۳۵/۱

(۷) سورہ الحجرات۱۲:۴۹ (۸) عبدالرزاق ۱۰/۲۳۲ (۹) جوزی:۶۳' سیوطی:۱۲۹۔

اس پر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ ہم تجسس کر رہے ہیں اور اللہ نے تجسس سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہاں سے چلے گئے[۱]۔ آپ اس آیت کی تاویل کر کے سزا دے سکتے تھے کیونکہ خود اس کے عینی شاہد تھے لیکن آپ نے حکم قرآنی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنے جذبات پر قابو پایا۔ آپ کے دل میں یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں آپ سے احکام قرآنی کی خلاف ورزی نہ سرزد ہو جائے اس بارے میں خود ہی اپنا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ آپ سد باب منکرات کیلئے درے کو استعمال کرتے تھے وہ آپ کی علامت و نشانی بن گیا۔ اس سے لوگ بہت ڈرتے تھے اور یہ مثل مشہور ہو گئی کہ عمرؓ کا درہ تمہاری تلواروں سے زیادہ ہیبت ناک ہے "الدرۃ عمر اھیب من سیفکم"[۲]۔ "آپ کو اس بات کا احساس بھی تھا حضرت حسن البصریؒ سے روایت ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینے کی گلیوں میں گھوم پھر رہے تھے کہ آپ کے سامنے یہ آیت آئی۔ "والذین یؤذون المؤمنین والمؤمنٰت بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا واثما مبینا"[۳]۔ "اس آیت کو سنتے ہی آپ نے اپنا محاسبہ شروع کر دیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا "میں مومنون اور مومنات کو بڑی اذیت پہنچاتا ہوں۔ "اس کے بعد حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس پہنچے۔ گھر میں داخل ہوئے وہ ایک سجادہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے اپنے نیچے سے کھینچا اور آپ سے کہا امیر المومنین آپ اس پر تشریف رکھئے۔ آپ نے فرمایا "نہیں!" پھر اسے اپنے پاؤں سے سرکا دیا اور یونہی بیٹھ گئے اور مذکورہ بالا آیت تلاوت کرنے کے بعد فرمایا "میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں اس آیت کریمہ کے مصداق نہ ہوں کیونکہ میں بھی مومن مردوں اور عورتوں کو تکلیف پہنچاتا ہوں۔"

حضرت ابی نے کہا نہیں نہیں ان شاء اللہ کیونکہ آپ تو لوگوں کو ادب سکھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ مجبور ہیں کہ آپ اپنی رعیت کی ہدایت و تربیت کریں۔ بعض چیزوں کا اسے حکم دیں اور بعض سے منع کریں۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا میں تو کہتا ہوں کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے[۴]۔ قرآن حکیم سے گہرے فکری و عملی رشتے کا یہ نتیجہ تھا کہ جب آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ کا نام آتا یا کوئی آیت قرآنی پیش کی جاتی آپ کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جاتا۔

زید بن اسلم نے اپنے والد سے روایت کی کہ بلالؓ نے عمرؓ کے پاس جانے کی اجازت چاہی تو میں نے کہا وہ سوتے ہیں۔ انہوں نے کہا "اے اسلم تم عمر کو کیسا پاتے ہو؟" میں نے کہا "وہ سب سے اچھے ہیں سوائے اس کے جب غضب میں ہوتے ہیں تو امر عظیم ہوتے ہیں۔ بلالؓ نے کہا کہ اگر میں اس وقت ان کے پاس ہوتا تو ان کے سامنے قرآن اتنا پڑھتا کہ ان کا غضب چلا جاتا[۵]۔ عبداللہ بن عون بن مالک الدار نے اپنے باپ دادا سے روایت کی کہ مجھے ایک روز عمرؓ نے ڈانٹا اور درے سے مارا عرض کیا میں آپ کو اللہ یاد دلاتا ہوں۔ عمرؓ نے درہ ڈال دیا اور کہا کہ تم نے بہت بڑے کو یاد دلا دیا[۶]۔ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا کہ عمرؓ غضب میں ہوں اور ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے یا خوف دلایا جائے یا کوئی شخص قرآن کی آیت پڑھ دے تو وہ ارادے سے باز نہ آجائیں[۷]۔ ایک شخص عیینہ نے ملنے کی اجازت مانگی آپ نے دے دی تو آتے ہی اس نے کہا اے ابن خطاب تم ہمیں ہمارا حق نہیں دیتے اور نہ ہی عدل کے مطابق فیصلے کرتے ہو۔ یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا۔ حر بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے سوچا اب خیر نہیں اس لئے عرض کیا اے امیر المومنین اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا ہے[۸]۔ "خذ العفو وامر بالمعروف واعرض عن الجاھلین"[۹]۔

انسان کے جذبہ عمل کی سب سے بڑی اساس ایمان و یقین ہے۔ خاص طور پر سماجی معاملات میں جہاں جائز و ناجائز کی حدود قدم قدم پر انسان کے نفع و نقصان پر فوری اور براہ راست اثر انداز ہو رہی ہوتی ہیں وہاں انسان کے ایمان کی آزمائش بڑی سخت ہوتی ہے اور شک و تردد کا شکار انسان کبھی ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ آپ کے سارے عملی رویے کا دارومدار اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر کامل ایمان اور ان کے احکامات کے دنیوی اور اخروی دونوں اعتبار سے مفید ہونے کے شعوری یقین

---

(۱) عبدالرزاق ۱۰: ۲۳۱ بیہقی ۸: ۳۳۳ (۲) سیوطی ۱: ۱۳۷ (۳) سورۃ الاحزاب ۳۳: ۵۸ (٤) جوزی ا: ۱٦۷ (٥) سعد ۳: ۳۰۹ سیوطی ا: ۱۳ (٦) سعد ۳: ۳۰۹/۳ (۷) سعد ۳: ۳۰۹/۳ سیوطی ا: ۱۳۰ (۸) جوزی ط: ۱۵۵ (۹) سورۃ الاعراف ۷: ۱۹۹۔

پر تھا۔ اس کی نمایاں مثال کے بارے میں آپ کی احتیاط ہے۔ سود جاہلانہ معاشرے کی معاشی رگوں میں خون کی طرح گردش کر رہا تھا۔ اس کو فوری طور پر ختم کرنا ناممکن تھا یہی وجہ ہے کہ اس کی حرمت کی آیات بہت بعد میں نازل ہوئیں اور اس کے بارے میں احکام بھی بہت سخت نازل ہوئے۔

بقول روایں حضرت عمرؓ نے ربا کی آیات تلاوت کیں تو آپ کا دل خوف سے کانپ اٹھا اور ایسے واقعات جن سے اس آیت کی وضاحت میں مدد ملتی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت کم وقوع پذیر ہوئے تھے۔ علاوہ بریں حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی کوئی تشریح بھی نہیں سنی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ ربا کے معاملے میں بہت محتاط ہو گئے تھے [۱]۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے۔ "قرآن میں آخری آیت 'آیت ربا' نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور آپ نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ اس لئے ربا سے بھی بچو اور ریبہ (شک) سے بھی بچو [۲]۔ ریبہ سے حضرت عمرؓ کی مراد ہر وہ امر ہے جس کے بارے میں یہ گمان ہو کہ ہو سکتا ہے کہ یہ ربا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ ربا کے معاملہ میں بہت احتیاط کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے حلال کے دس حصوں میں نو حصے ربا کے خوف سے ترک کر دیئے [۳]۔

ایک دن آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ قسم بخدا ہمیں نہیں معلوم کہ ہم تمہیں کوئی حکم دیں اور وہ تمہارے لئے بہتر نہ ہو اور ہو سکتا ہے کہ بعض امور سے تم کو روک دیں لیکن وہ تمہارے لئے بہتر ہوں۔ آیت ربا باعتبار نزول قرآن پاک کی آخری آیات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کی تفصیل بیان کرنے سے قبل ہی وفات پا گئے۔ اب یہی طریقہ ہے کہ آپ لوگ ان امور کو ترک کر دیں جس میں ربا کا شائبہ بھی ہو اور ان امور کو اختیار کریں جن میں ربا کا شائبہ تک نہ ہو [۴]۔

۵۔ قرآنی علوم کی ترویج و اشاعت:

ا۔ تعلیم قرآن پر عمل:

آپ کی بصیرت و فراست پر یہ بات پوری طرح عیاں تھی کہ مسلمانوں کا قرآن حکیم سے تعلق جتنا زیادہ مضبوط ہو گا اتنا زیادہ ان کا ایمان پختہ ہو گا عقیدہ صحیح ہو گا عمل صالح ہو گا اور اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے اسلامی ریاست کے ذمہ دار شہری بن سکیں گے اور دنیا و آخرت میں سرخروئی اور نجات کے مستحق قرار پائیں گے۔ علاوہ ازیں عملی زندگی کے نت نئے مسائل کو بھی حکم خداوندی کی روح کے مطابق حل کرنے کے قابل ہوں گے۔ معاشرے کی مادی و روحانی ترقی کا سارا انحصار اسی تعلق پر ہے۔ اسی وجہ سے آپ نے اپنے عہد خلافت میں قرآن حکیم کی تعلیم کا خصوصی اہتمام کیا۔ عہد صدیقی میں آپ ہی کے مشورے پر قرآن مجید کی تدوین ہوئی [۵]۔ جب خلافت کی ذمہ داریوں کا بوجھ آپ کے کندھوں پر آیا تو آپ نے لوگوں کی تعلیم و تربیت کیلئے قرآن حکیم کو مرکز و محور بنایا۔ علامہ شبلی نعمانی نے بالکل صحیح کہا ہے "اس وقت قرآن مجید کی حفاظت اور صحت کیلئے چند امور نہایت ضروری تھے۔ اول یہ کہ نہایت وسعت کے ساتھ اس کی تعلیم شروع کی جائے اور سینکڑوں ہزاروں آدمی حافظ قرآن بنا دیئے جائیں تاکہ تحریف و تغیر کا احتمال نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ اعراب اور الفاظ کی صحت نہایت اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھی جائے۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید کی بہت سی نقلیں ہو کر ملک میں کثرت سے شائع ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ نے ان تینوں امور کو اس کمال کے ساتھ سرانجام دیا کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہ تھا [۶]۔

آپ کا یہ ارشاد تھا "تعلموا کتاب اللہ تعرفوا بہ واعملوا بہ تکونوا من اھلہ [۷]۔" آپ نے جو نظام تعلیم مرتب کیا اس نے بچوں جوانوں بوڑھوں

---

(۱) رواس ۳۳۰ (۲) حنبل ۱ ۲۶۲ (۳) عبدالرزاق ۸ ۱۵۲ ۴۷۷/۸ (۴) حرجہ ۸ ۱۷۷ (۵) بخاری ۵ ۲۱۰ ترمذی ۴ ۳۴۶ مدیم ۳۶ سیوطی ۷ ۱۴۴/۱ (۶) شبلی ۲ ۲۶۶ (۷) متقی ۲۰۴/۱۰ مسند ۱ ۴۸۵۔

مردوں، عورتوں، دیہاتوں اور شہروں میں قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کا جوش و جذبہ پیدا کر دیا۔ آپ نے مفت تعلیمی سہولیات بہم پہنچانے کیلئے ریاست کے طول و عرض میں معلمین بھیجے اور ان کی باقاعدہ تنخواہوں کا اجراء کیا' تاکہ وہ اپنی معاشی ضرورتوں سے بے نیاز ہو کر علم قرآن کی ترویج کیلئے کوشاں رہیں۔ حضرت حسن کی روایت میں آتا ہے "ان عمر بن الخطاب و عثمان بن العفان كان يرزقان المؤذنين والائمة والمعلمين والقضاة(۱)۔" یہ تنخواہیں اس وقت کے لحاظ سے ایسی ہوتی تھیں جن سے بآسانی گزر اوقات کا انتظام ہو سکے۔ مدینہ منورہ کے اندر بچوں کی تعلیم کیلئے بہت سے چھوٹے چھوٹے مکتب تھے۔ ان کے معلمین کی تنخواہیں پندرہ پندرہ درہم ماہانہ ہوتی تھیں(۲)۔ آپ نے قرآن کی تعلیم لازمی اور جبری قرار دی' کیونکہ آپ یہ جانتے تھے کہ اس کے بغیر آدمی صحیح طور پر اسلام کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ ایسا شخص جو قرآن حکیم کی نہ دعوت کو سمجھتا ہو اور نہ مزاج کو جسے نہ تو اس کے احکام کا علم ہو اور نہ حلال و حرام کا تو وہ برائے نام ہی مسلمان ہو کر رہ جائے گا۔ خاص طور پر بدوی اور دیہاتی اس معاملے میں غفلت برتتے تھے۔ جہاں ترغیب موثر نہ ہو وہاں تعزیر ہی اپنا کام دکھاتی ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ آپ نے ایک ایسے شخص جس کا نام ابوسفیان تھا' چند اور لوگوں کے ساتھ مامور کیا کہ قبائل میں پھر پھر کر ہر شخص کا امتحان لے اور جس کو قرآن مجید کا کوئی حصہ یاد نہ ہو سے سزا دے(۳)۔ آپ کا یہ فرمان تھا کہ قرآن کو پانچ پانچ آیات کر کے سیکھو' کیونکہ جبریل امین نبی ﷺ پر پانچ پانچ آیت کے ساتھ نازل ہوتے تھے(۴)۔ آپ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ سب لوگ احکام قرآن سے آگاہ ہوں۔ اس لئے سورۂ نساء' مائدہ اور نور کی نسبت یہ حکم دیا کہ سب لوگ اس قدر قرآن ضرور سیکھیں کیونکہ ان میں احکام و فرائض مذکور ہیں(۵)۔ عورتوں کے بارے میں چاہتے تھے کہ وہ سورہ النور ضرور پڑھیں' چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھا "وعلموا نساء کم سورة النور(۶)۔"

آپ قرآن مجید کے حصوں کو حفظ کرنے کی ترغیب دیتے تھے اس لئے کہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ قرآن کی اتنی مقدار ضرور حفظ کرے' جس کی تلاوت سے نماز صحیح ہو سکے۔ چنانچہ آپ کی رائے تھی کہ اس کی کم از کم مقدار چھ سورتیں ہیں' جن کو وہ جہری نمازوں میں تلاوت کرے اور ایک سورة دن میں ایک مرتبہ سے زیادہ بار نہ پڑھے۔ قتادہ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے فرمایا کہ ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ اسے چھ سورتیں یاد ہوں۔ دو صبح کی نماز کیلئے' دو مغرب کی نماز کیلئے اور دو عشاء کی نماز کیلئے(۷)۔ آپ کے نزدیک قرآن حکیم سے تعلق ہی نجات کا واحد راستہ تھا۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ مرتے دم تک لوگ اس کا دامن تھامے رہیں' اسی کیلئے کوشاں رہتے تھے۔ اسی بناء پر آپ کی رائے یہ تھی کہ جس شخص کی موت کا وقت قریب ہو اس کے گھر والوں کو چاہئے کہ اس کے پاس بیٹھ کر قرآن کریم پڑھیں' تاکہ وہ بھی حمد کو یاد کرے اور اس پر اللہ سبحانہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اپنے مرنے والوں کے پاس موجود رہو' ان کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرتے رہو (مرنے کے بعد) ان کی آنکھیں بند کر دو اور ان کے پاس قرآن پڑھو(۸)۔

آپ نے علوم القرآن کے فروغ اور اس کے معانی و مطالب سے لوگوں کو آگاہ کرنے کیلئے جو انتظامات کئے ان میں یہ بھی تھا کہ تمام مفتوحہ علاقوں میں قرآن حکیم کے درسوں کا اہتمام کیا۔ یہ کام صرف معلمین کے ذمے نہیں بلکہ حکومت کے مختلف اہلکاروں کی بھی یہ ذمہ داری تھی کہ خود بھی درس قرآن دیں۔ مثلاً آپ نے جب حضرت عمار بن یاسرؓ کو کوفے کا گورنر بنا کر بھیجا تو حضرت عثمان بن حنیفؓ محصولات اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو بیت المال کی ذمہ داری سونپی اور ان تینوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اہل کوفہ کو قرآن کی کم سے کم ایک آیت کا درس دیا کریں(۹)۔ آپ کے نزدیک یہ معاملہ نہایت اہم تھا اس لئے آپ نے ریاست کے طول و عرض میں قرآن حکیم کے چوٹی کے عالموں کو بھیجا تاکہ وہ بھی تعلیم القرآن کا انتظام بھی کریں اور نگرانی بھی اور اس کی ترویج کیلئے جو ممکنہ ذرائع اور طریقے ہو سکیں

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible] (۷) [illegible] (۸) [illegible] (۹) [illegible]

"سیاتی الناس یجادلونکم بشبهات القرآن فخذوهم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب الله[۱]۔" آپ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ صحیح اور مستند حادیث روایت کی جائیں۔ راوی ثقہ ہو اور پوری ذمہ داری سے بات کہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قرآن و حدیث کا فرق و امتیاز قائم رہے۔ سی بناء پر آپ مسلمانوں کو ایک بصیرت افروز تاکید یہ بھی فرماتے تھے کہ قرآن کو علیحدہ لکھو اس کے ساتھ احادیث رسول ﷺ یا تفسیری الفاظ بھی نہ لکھو۔ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ جب بھی کوئی ایسی شے دیکھتے اسے تلف کر دیتے۔ چنانچہ عامر شعبی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے مصحف لکھا اور ہر آیت کے ساتھ اس کی تفسیر بھی لکھی۔ حضرت عمرؓ نے اسے منگوایا اور قینچی سے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا[۲]۔

۲۔ قاریوں کی حوصلہ افزائی:

آپ کی بصیرت و فراست سے یہ بات مخفی نہیں تھی کہ قرآن کی تعلیم کی ترویج اور اس کے حفظ کی طرف زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متوجہ کرنے کیلئے صرف وعظ و نصیحت کافی نہیں ہے۔ س کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ حوصلہ افزائی کیلئے انہیں عطیات دیئے جائیں۔ چنانچہ آپ نے وظائف کی تقسیم میں جو درجہ بندی کی اس میں قرأت کا بھی لحاظ رکھا[۳] اور عمال کو بھی ایسی ہی ہدایات جاری فرمائیں۔ چنانچہ ایک عامل کے نام خط تحریر کیا کہ لوگوں کو قرآن سیکھنے پر عطیات دیا کرو۔ اس پر عامل نے جواباً لکھا کہ آپ نے تحریر کیا ہے کہ میں لوگوں کو قرآن کے سیکھنے پر عطیات دیا کروں۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ بعض لوگ صرف انعام کی خاطر قرآن سیکھیں گے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ عطیات دینے میں آپ ان لوگوں کی عالی ظرفی اور قرآن سے شغف کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں[۴]۔

عمال سے وقتاً فوقتاً قرآن خوانوں کے رجسٹر منگواتے رہتے تھے۔ ان تدبیروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے شمار آدمی قرآن پڑھ گئے۔ ناظرہ خوانوں کا تو شمار نہ تھا لیکن حافظوں کی تعداد سینکڑوں ہزاروں تک پہنچ گئی[۵]۔ فوج کو جو ضروری ہدایات بھیجتے تھے ان میں یہ بھی ہوتا کہ قرآن مجید پڑھیں۔ ایک مرتبہ فوجی افسروں کو لکھ کہ حفاظ قرآن کو میرے پاس بھیج دو تاکہ میں ان کو قرآن کی تعلیم کیلئے جابجا بھیجوں تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جواب دیا کہ میری فوج میں تین سو حفاظ ہیں[۶]۔ آپ نے حوصلہ افزائی کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ قرآن کے عالموں کی خوب عزت و تکریم کی جائے اور ان کا سماجی مقام و مرتبہ بلند کیا جائے۔ آپ س وجہ سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو عمر میں چھوٹے تھے کو شیوخ بدر کے پاس جگہ دیتے اور اپنے ساتھ بٹھاتے۔ کسی نے عرض کیا کہ یہ لڑکا ساتھ کیوں داخل کیا جاتا ہے حالانکہ ان کی ہمسری تو ہمارے بیٹے کر سکتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے یہ اعتراض سن کر فرمایا "یہ لڑکا ان لوگوں میں سے ہے جن (کے درجہ) کو تم جانتے ہو۔" چنانچہ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ایک دن شیوخ بدر کو طلب کیا اور ابن عباسؓ کو بھی ان ہی کے ساتھ بٹھایا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں میں سمجھ گیا کہ حضرت عمرؓ نے آج مجھ کو ان لوگوں کے ساتھ محض اس لئے طلب کیا ہے تاکہ ان کو (میرا مرتبہ) دکھادیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے شیوخ بدر کو مخاطب کر کے دریافت کیا تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "اذا جاء نصر الله والفتح" کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ بعض شیوخ نے اس کے جواب میں کہا "ہمیں اس وقت اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے اور اس سے مغفرت چاہنے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ ہم کو نصرت عطا ہو اور ہمیں فتوحات ہاتھ آئیں۔ بعض شیوخ بالکل ساکت ہو رہے انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ حضرت عمرؓ نے ان کا جواب سن کر میری طرف توجہ فرمائی اور کہا "کیوں ابن عباسؓ کیا تم بھی ایسی ہی کہتے ہو؟" میں نے کہا "نہیں" حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا "پھر تم کیا کہتے ہو؟" میں نے کہا "وہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کی طرف اشارہ ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی تھی اور فرمایا کہ "جس وقت اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آئے تو یہ بات تمہارے دنیا سے سفر کرنے کی علامت ہے اس وقت تم اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح خوانی کرنا اور اس سے مغفرت

---

(۱) دارمی ۱: ۴۹ ، متقی ۱: ۳۷۴ (۲) سیوطی ۱۰: ۵۱۳ (۳) سعد ۳: ۲۹۷ (۴) عبید ۲۱۲ ، سیرہ ۱: ۵۴۳ (۵) شبلی ۲: ۲۶۸ (۶) متقی

چاہتا کیونکہ در حقیقت اللہ پاک بڑا توبہ کا قبول کرنے والا ہے۔" میرا یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا "مجھ کو بھی اس سورت کے بارے میں یہی بات معلوم ہے جو تم کہتے ہو[۱]۔"

آپ حکومت کے مختلف مناصب پر تقرریوں کے وقت بھی اہل علم ہی کو فوقیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ تکنیکی عہدے پر بھی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ساتھ علم کا بطور خاص لحاظ رکھتے۔ بقول سلمان بن بریدہ "ان امیر المؤمنین کان اذا اجتمع الیه جیش من اهل الایمان امر علیهم رجلا من اهل العلم والفقه[۲]۔" یہاں علم سے مراد کتاب و سنت ہی کا علم ہے۔ آپ کے پورے عہد خلافت میں یہی روح کار فرما رہی اور دیگر مقامات پر بھی آپ کی اسی پالیسی کی پیروی کی جاتی تھی۔ عامر بن واثلہ سے روایت ہے "نافع بن عبد الحارث نے جو عسفان میں سے تھے حضرت عمرؓ سے ملاقات کی۔ آپ نے مکہ کا عامل بنا دیا پھر ان سے پوچھا کہ تم نے جنگل والوں پر تحصیلدار مقرر کیا ہے؟" انہوں نے جواب دیا ابن ابزی کو، پوچھا ابن ابزی کون ہے؟ جواب دیا کہ وہ ہمارے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک ہے۔ فرمایا "کیا تم نے یک غلام کو ان پر تحصیلدار بنا دیا ہے؟" انہوں نے جواب دیا "انه قاری کتاب الله تعالی و انه عالم بالفرائض" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "سنو بے شک تمہارے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بہت سے لوگوں کو سربلند کرے گا اور بہت سے لوگوں کو نیچے گرا دے گا[۳]۔"

آپ صحابہ کرامؓ کے فہم القرآن میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ ایسے تمام افراد کی عزت و تکریم کرتے، ان سے استفادہ کرتے، ان سے مختلف سوالات پوچھتے، ان کا امتحان لیتے، ان کی تربیت فرماتے، ان کو اپنا قرب عطا فرماتے، اجتماعی مسائل میں انہیں شریک مشورہ کرتے، تاکہ ایک طرف اسلامی احکام کی روح کے عین مطابق فیصلے صادر کرنے اور انہیں نافذ کرنے میں مدد مل سکے اور دوسری طرف لوگوں کے اندر سوچ بچار کا مادہ پیدا ہو، ان کی صلاحیتوں کو جلا ملے اور وہ احکام کے استنباط و اطلاق کی تربیت پائیں۔ تیسری طرف مشاورتی طرز عمل اختیار کرنے کا رجحان مستحکم ہو اور لوگ معاشرتی معاملات میں اپنی شراکت و ذمہ داری کو محسوس کریں اور چوتھی طرف کتاب و سنت اور علوم و فنون کی طرف لوگ پورے جوش و خروش سے راغب ہوں اور ایک علمی فضا اور ماحول پیدا ہو۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان عظیم مقاصد میں کامیابی عطا فرمائی اور آپ نے جو علمی روایات چھوڑی ہیں، وہ ہر دور کے مسلمانوں کیلئے اور خاص طور پر ارباب اقتدار و اختیار کیلئے روشنی کا مینار ہیں۔ فہم القرآن سے آپ کی دلچسپی کا اندازہ شعبی کی اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی سفر میں ایک سواروں کی جماعت سے ملے جن میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے پکار کر دریافت کرو کہ وہ کہاں سے آ رہے ہیں۔ قافلے کے لوگوں نے جواب دیا "اقبلنا من الفج العمیق نرید البیت العتیق۔" یعنی ہم لوگ دور دراز منزل سے آ رہے ہیں اور بیت اللہ شریف کو جاتے ہیں۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ جواب سن کر فرمایا "بے شک ان لوگوں میں ضرور کوئی عالم آدمی ہے۔" پھر انہوں نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ ان سے بآواز بلند دریافت کرے کہ قرآن کا کونسا حصہ عظیم تر ہے؟ عبد اللہ بن مسعودؓ نے اس سوال کے جواب میں کہا "اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم[۴]۔" عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شخص سے فرمایا "ان سے دریافت کرو کہ قرآن کا کونسا حصہ محکم ہے؟" ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا "ان الله یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربی[۵]۔" عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "ان سے دریافت کرو کہ قرآن کا کونسا حصہ اجمع (جامع تر) ہے؟"

---

(۱) سیوطی ۲:۷۷، ۱۸۸ (۲) طبری [illegible] ۱۸۶ (۳) مسند ۲ [illegible] حنبل ۱ ۲۵۸ دارمی ۲ ۴۴۳ (۴) سورہ بقرہ ۲۵۵:۲ (۵) سورہ نحل ۱۶:۹۰۔

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ[۱]۔" عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ ان سے دریافت کرو کہ "قرآن کا کونسا حصہ احزن ہے؟" جواب ملا "من یعمل سوء ا یجزبہ[۲]۔" پھر حضرت عمرؓ نے ان سے کہا "ان سے پوچھو کہ قرآن میں ارجیٰ حصہ کونسا ہے؟" ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا "قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم[۳]۔" یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس جماعت سے دریافت کیا کہ "کیا تم لوگوں میں ابن مسعودؓ موجود ہیں۔" انہوں نے کہا "ہاں![۴]"۔

اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ قرآن فہمی کا جوہر جہاں بھی پاتے اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ سوالات کا انداز یہ بتاتا ہے کہ امتحان بھی لینا چاہتے تھے تاکہ یہ جان سکیں کہ وہ قرآن کا رخ بھی صحیح ہے۔ اس سے آپ کی مردم شناسی کا بھی پتا چلتا ہے کہ آپ یہ جان گئے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے جوابات ہی ہو سکتے ہیں۔ آپ حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ یہ بھی اہتمام کرتے تھے کہ لوگ بے دریغ تبصرے نہ کریں بلکہ پوری تحقیق کے ساتھ صحیح بات بیان کریں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے کہا کہ مجھے کتاب اللہ میں ایک آیت شدید تر معلوم ہوئی ہے۔ آپ نے جھٹ کر اس شخص کو درہ مارا اور فرمایا "کیا تو نے اس کا سراغ لگا کر اسے معلوم کیا ہے؟ اچھا بتاؤ وہ کونسی آیت ہے؟" اس نے جواب دیا "ومن یعمل سوء ا یجزبہ[۵]۔" آپ نے سن کر فرمایا "جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت ہم بہت عرصہ تک اس حالت میں مبتلا رہے کہ ہمیں کھانا پینا کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔" یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ آیت نازل فرمائی اور ہمیں آسانی عطا کی[۶] "من یعمل سوء ا ویظلم نفسہ ثم یستغفر اللہ یجد اللہ غفورا رحیما[۷]۔" پہلے پہل آپ کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید وہ شخص بلا تحقیق بات کہہ رہا ہے لیکن جب جواب سن کر اطمینان ہوا تو پھر آپ نے اس کی صحیح رہنمائی بھی کر دی کہ ایسا ہی تاثر صحابہ کرامؓ پر بھی ہوا تھا لیکن اس کا جواب بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس طرح اس کی معلومات میں اضافہ کر کے اسے اطمینان دلا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے استغفار کا راستہ بھی کھلا رکھا ہے۔

۳۔ آداب تلاوت:

آپ قرآن حکیم کے بارے میں بہت حساس تھے آپ یہ چاہتے تھے کہ لوگ اسے صحیح طور پر پڑھیں اگر شبہ ہوتا تو عہد نبوی میں بھی آپ اس کی کڑی گرفت کرتے۔ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا بیان کرتے تھے کہ میں نے ہشام بن حکم بن حزام کو سورۃ الفرقان ایک ایسی قرأت سے پڑھتے سنا جو اس قرأت کے خلاف تھی جس طرح میں پڑھتا تھا حالانکہ میری قرأت خود رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکھائی تھی۔ یہ غیر متوقع نہ تھا کہ میں فوراً ہی ان سے الجھ جاتا لیکن میں نے انہیں مہلت دی تاکہ (نماز سے) فارغ ہو لیں اس کے بعد میں نے ان کی چادر پکڑ کر کھینچا اور انہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا اور آنحضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے انہیں اس قرأت کے خلاف پڑھتے سنا ہے جو آپ نے مجھے سکھائی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ پہلے انہیں چھوڑ دو پھر ان سے ارشاد فرمایا کہ اچھا اب قرأت سناؤ۔ انہوں نے سنائی تو آپؐ نے فرمایا کہ اسی طرح نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد مجھے آپؐ نے ارشاد فرمایا اب تم پڑھو میں نے بھی پڑھ کر سنایا آنحضور ﷺ نے اس پر بھی فرمایا کہ اسی طرح نازل ہوئی ہے پھر فرمایا قرآن سات طریقوں سے نازل ہوا ہے اور جس میں آسانی ہو اسی طرح پڑھو[۸]۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ پسند تھا کہ قرآن کریم کو کلمات کی واضح ادائیگی کے ساتھ اس طرح پڑھا جائے کہ الفاظ کے آخری حرف پر جو حرکات ہوں

---

(۱) سورۃ الزلزال ۹۹: ۷، ۸ (۲) سورۃ النساء ۴: ۱۲۳ (۳) سورۃ الزمر ۳۹: ۵۳ (۴) سیوطی ۲:۳۷/ ۱۶۰ (۵) سورۃ النساء ۴: ۱۲۳ (۶) سیوطی ۲:۳۷/ ۱۶۲

(۷) سورۃ النساء ۴: ۱۱۰ (۸) بخاری ۳/ ۹۰، مسلم ۲/ ۲۰۲، حنبل ۱/ ۲۴، داؤد ۲/ ۱۰۱، نسائی ۲/ ۱۵۰، بیہقی ۲/ ۳۸۳۔

وہ بھی پوری طرح ادا ہوں۔ چنانچہ یک مرتبہ آپ کا کچھ لوگوں کے پاس سے گزر ہوا جو ایک دوسرے کو قرآن پڑھ کر سنا رہے تھے۔ جب انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا تو خاموش ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ تم کیا دہرا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم قرآن پڑھ کر ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ قرآن پڑھو لیکن اعراب کی غلطی نہ کرو[1]۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا کہ سنت کا فہم حاصل کرو، عربیت کی سمجھ بوجھ پیدا کرو اور قرآن کو زیر زبر کے پورے اظہار کے ساتھ پڑھو کیونکہ قرآن عربی ہے اور بنو معد کے لہجے میں پڑھو کہ تم معدی ہو[2]۔

آپ قرآن حکیم کی تلاوت کے آداب کا پورا لحاظ رکھتے تھے اس لئے حکم خداوندی کی پیروی کرتے ہوئے روایات میں آتا ہے کہ جب آپ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے تو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتے تھے[3]۔ آداب تلاوت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آواز میں حسن پیدا کیا جائے اس لئے آپ فرماتے تھے کہ قرآن پڑھتے وقت اپنی آواز کو خوبصورت بناؤ[4]۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ خوش آواز تھے اور قرآن کریم تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے۔ حضرت عمرؓ جب ان کے پاس بیٹھتے تو ان سے فرماتے کہ اے ابو موسیٰ" ہمیں ہمارے رب کی یاد دلاؤ۔ اس پر حضرت ابو موسیٰ" قرآن کی تلاوت فرماتے[5]۔ آپ تلاوت میں باقاعدگی کو پسند فرماتے تھے کیونکہ مسلمان کیلئے مستحب یہی ہے کہ قرآن کا ایک حصہ ہر روز کی تلاوت کیلئے اس طرح مقرر کرے کہ اگر کسی دن پڑھنا بھول جائے اور اسے کسی اور کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے نہ پڑھ سکے' تو بعد ازاں اس معمول کی قضا کرے' تاکہ قرآن سے دائمی تعلق برقرار رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی شخص کی رات کی تلاوت کا مقررہ حصہ چھوٹ جائے اور وہ شخص زوال آفتاب کے بعد سے ظہر تک پڑھ لے' تو گویا وہ حصہ اس کا چھانٹا نہیں بلکہ گویا اس نے اسے پالیا[6]۔

آپ اس بات کی ترغیب دیتے تھے کہ قرآن کو خالصۃً للہ پڑھا جائے' آپ کے نزدیک آداب قرأت کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے۔ آپ بجا طور پر یہ جانتے تھے کہ قاریٔ قرآن کیلئے ضروری ہے کہ علم قرآن سے اس کی نیت اللہ سے ثواب حاصل کرنا ہو۔ اس کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے دنیا اور مال و دولت دنیا طلب کرے۔ اس لئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن پڑھو اور اس کے وسیلہ سے اللہ سے مانگو۔ اس سے قبل کہ قرآن ایسے لوگ پڑھیں' جو اس کو ذریعہ بنا کر لوگوں سے سوال کریں[7]۔ ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں کہا کہ ایک زمانہ تھا جب لوگ کتاب اللہ کا علم صرف رضائے الٰہی کی خاطر حاصل کرتے تھے اور اب یہ مرحلہ آگیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ لوگ قرآن اس لئے سیکھتے ہیں کہ لوگوں کو خوش کریں اور ان کے پاس جو دنیا ہے وہ حاصل کریں۔ اپنے اعمال اور قرأت قرآن سے رضائے الٰہی کی نیت رکھو[8] اور اس سے اپنے اعمال کی اصلاح کی غرض رکھو۔ آپ کا ارشاد تھا "ان ھذا القرآن کلام اللہ فلا یغرنکم ما عطفتموہ علی اھوائکم[9]۔" یہی وجہ ہے کہ آپ قرآن حکیم پڑھنے کی اجرت لینے دینے کو غلط سمجھتے تھے تاکہ لوگ اسے محض مادی مفادات کا ذریعہ ہی نہ سمجھ لیں۔ ان کی نیتیں خالص رہیں اور اس کے روحانی فیوض و برکات سے پوری طرح متمتع ہو سکیں۔ ایک موقع پر سعد بن ابی وقاصؓ نے کہا کہ جو شخص قرآن پڑھے گا میں اس کا نام دو ہزار وظیفہ پانے والوں میں درج کر دوں گا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "اف اف' کیا کتاب اللہ کے پڑھنے پر اجرت دی جائے گی[10]۔"

آپ قرآن مجید زبانی پڑھنے کیلئے باوضو ہونا ضروری خیال نہیں کرتے تھے اس لئے اکثر بغیر وضو کے قرآن پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کچھ لوگوں کے درمیان تھے جو قرآن پڑھ رہے تھے۔ اسی اثناء میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ حوائج ضروری کیلئے گئے۔ جب آپ واپس آئے' تو قرآن پڑھتے ہوئے آئے۔ کسی نے کہا اے

---

(۱) سیرہ ۱ ۴۵۹ (۲) سیرہ ۱ ۴۵۷ (۳) سیرہ ۲/ ۱۶۳ (۴) سیرہ ۱/ ۴۶۴ (۵) عبدالرزاق ۲/ ۴۸۶ دارمی ۲ ۴۷۲ (۶) عبدالرزاق ۳/ ۵۰ مالک ۱ ۲۰ (۷) سیرہ ۱ ۴۷۹ حنبل ۱ ۲۶۲ (۸) عبدالرزاق ۳ ۳۸۳/ سیرہ ۱ ۴۸۸ حنبل ۱ ۲۷۹ بیہقی ۹ ۴۲' جوزی ۱۸۳ (۹) دارمی ۲ ۴۴۱ (۱۰) حرمہ ۱۹۵ شیبہ ۱ ۵۴۲

میر المومنین! آپ بغیر وضو کے قرآن پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "یہ فتویٰ تمہیں کس نے دیا؟ کیا مسیلمہ نے[1]؟" جس شخص نے یہ بات کہی تھی وہ مسیلمہ کے ساتھ رہا تھا۔

بقول علامہ ابن رشد "ذهب الجمهور الى انه يجوز لغير متوضى ان يقرا القرآن و يذكر الله[2]۔" آپ قرآن مجید کی کتابت کے آداب کا بھی خیال رکھتے تھے۔ روایت میں آتا ہے حضرت عمرؓ نے کسی شخص کے پاس ایک مصحف نہایت باریک قلم سے لکھا ہوا دیکھا تو اس بات کو برا خیال کیا اور اس آدمی کو جسمانی سزا دی، پھر فرمایا کتاب اللہ کی تعظیم کرو۔ آپ جب بھی کوئی بڑا مصحف دیکھتے تو بہت خوش ہوتے[3]۔ یہی آیت کے سلسلے میں معاملہ تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کے کاتب نے حضرت عمرؓ کے نام ایک خط لکھتے ہوئے اس میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کو "سین" کے بغیر لکھا اس پر آپ نے اسے تازیانے کی سزا دی۔ کسی نے اس سے پوچھا تمہیں میر المومنین نے تازیانے کی سزا کیوں دی ہے؟ اس نے جواب دیا مجھ پر ایک سین کی وجہ سے تازیانے کی مار پڑی[4]۔

۴۔ سرچشمہ علم کی حیثیت۔

بصیرت و حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان سرچشمہ علم کے طور پر صرف قرآن حکیم ہی کی طرف رجوع کریں۔ اسی سے فکری، ذہنی اور روحانی غذا حاصل کریں تمام علوم کو اسی کی بنیاد پر استوار کریں۔ اس دور کی دیگر کتب سے مکمل طور پر اجتناب کریں، تاکہ ان کا علم و عقیدہ خالص رہے اور ہر قسم کے توہمات و خرافات سے محفوظ رہیں۔ آپ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ یہود و نصاریٰ کی گمراہی و بے اعتدالی کی بنیادی وجہ وحی الٰہی کو نظر انداز کر کے ادھر ادھر کے انسانی خیالات کو سند ماننا اور انہیں علم کا منبع قرار دینا ہے۔ چنانچہ آپ مسلمانوں کو ان خرابیوں سے دور رکھنے کیلئے سختی کرتے تھے۔ عمرو بن میمون اپنے والد سے روایت کرتے ہیں "آپ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور کہا "اے امیر المومنین! جب ہم نے مدائن فتح کیا، تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی۔ اس میں بڑی اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں۔"

فرمایا "کیا قرآن سے بھی زیادہ اچھی باتیں؟"

اس نے کہا: "نہیں!"

آپ نے درہ منگوایا اور یہ آیات پڑھنے لگے "الرا تلك ايت الكتب المبين انا انزلنه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون نحن نقص عليك احسن القصص بما اوحينا اليك هذا القرآن و ان كنت من قبله لمن الغفلين[5]۔" (یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں ہم نے عربی قرآن اتارا تاکہ تم سمجھو ہم تمہیں سب سے پاکیزہ قصہ سناتے ہیں جو وحی قرآنی کے ذریعے اتارا گیا اگرچہ آپ اے نبی! اس سے پہلے غافل تھے۔"

پھر فرمایا "تم سے پہلی امتیں اسی وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے علماء اور پادریوں کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور تورات و انجیل کو چھوڑ بیٹھیں، حتیٰ کہ یہ دونوں کتابیں مٹ گئیں اور جو کچھ ان میں تھا وہ ضائع ہو گیا[6]۔" ابراہیم سے روایت ہے کہ عمرؓ کے علم میں یہ بات آئی کہ کسی نے اپنے لئے کتاب دانیال نقل کرلی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسے طلب کیا اور اس کی ہتھیلیوں پر اپنے دونوں ہاتھوں سے مارنا شروع کیا۔ امیر المومنین اس شخص کو مارتے جاتے اور سورۂ یوسف کی ابتدائی آیات پڑھتے جاتے تھے۔ اس کے بعد اس شخص سے مخاطب ہو کر کہا: "کیا کتاب اللہ سے بھی زیادہ دلکش اور خوبصورت باتیں کہیں لکھی ہوئی ہیں۔"

---

(۱) مالک ۱ ۲ عبدالرزاق ۱/۳۲۹، ابن ابی شیبہ ۱ ۳ ۱ (۲) رشد ۱ ۳۱ (۳) سیوطی ۱۷۰۰۲:iv (۴) سیوطی ۲:iv ۱۷ (۵) سورہ یوسف ۱۲: ۱۔۳ (۶) متقی ۳۷۳ جز ء ا ۲۶

نے کتاب دانیال ہوا "امیر المومنین میں معافی چاہتا ہوں بخدا میں نے جو کچھ نقل کیا ہے سے مٹادوں گا۔" زید بن اسلم نے اپنے والد کو کہتے سنا تھا کہ "عمر بن الخطابؓ نے ایک بار فرمایا "جب اسلام ظاہر ہو چکا تو تلاش حق کیا" حتی اسلام ہی حق ہے مگر رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ہم جو جو کرتے تھے اسے نہ ترک کریں گے[۱]۔

۵۔ غلط تاویلات پر سزائیں:

اسی طرح آپ آیت قرآنی کی غلط تاویل کرنے یا ان کی تشریح میں تشکیک پیدا کرنے پر بھی سزائیں دیتے تھے۔ اس کی نمایاں مثال ایک شخص صبیغ تمیمی کا واقعہ ہے۔

سائب بن یزید سے روایت ہے۔ ایک شخص نے امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا "امیر المومنین ہماری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو قرآن کی تاویل چاہتا ہے۔" آپ نے فرمایا: "کاش یہ شخص میرے ہاتھ لگ جاتا۔"

ایک صبح جب امیر المومنین بیٹھے لوگوں کو کھانا کھلوا رہے تھے یہ شخص سر پر عمامہ باندھے اور پورا لباس پہنے وارد ہوا۔ امیر المومنین فارغ ہوئے تو نووارد نے ان سے کہا "والداریات ذروا" (یعنی ان بکھیرنے والیوں کی قسم جو اڑا کر بکھیر دیتی ہیں) سے کیا مراد ہے؟" آپ نے فرمایا "ان سے مراد ہوا ہے اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے نہ سنا ہوتا تو میں یہ نہ کہتا۔" مطلب یہ کہ یہ تشریح اس تشریح کے عین مطابق ہے جو آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی فرمائی تھی۔ پھر والحاملات و قرا (پانی کا بوجھ اٹھانے والیوں) کے بارے میں سوال کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "بادل۔" اور جب پوچھا گیا "فالمقسمات امرا[۲]" (چیزیں تقسیم کرنے والیاں) کیا ہیں؟ تو جواب ملا "فرشتے" اور پہلی بار کی طرح دوسری اور تیسری بار جواب دیتے وقت بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی بات دہرائی کہ یہ تشریحات عین ارشاد نبوی کے مطابق ہیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا "تم ہی ہو وہ؟" (یعنی تمہارے ہی بارے میں مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ تم آیتوں کی تاویل کرتے رہتے ہو۔)" بس پھر کیا تھا امیر المومنین اٹھ کھڑے ہوئے اور اس شخص کو اس کی پیٹھ ننگی کر کے بے تحاشا درے لگانے شروع کر دیئے۔ امیر المومنین نے اس شخص کو اس قدر مارا کہ اس کا عمامہ بھی اس کے سر سے گر گیا۔ اس کے بعد حکم ہوا کہ اس آدمی کو اس کے کپڑے پہنا دیئے جائیں اور اس کو ایک بے کجاوہ اونٹ پر سوار کر کے اس کے وطن چھوڑ آیا جائے اور وہاں یہ اعلان کر دیا جائے کہ صبیغ نے (تاویل کرنے والے کا نام جس کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے) جو اپنی قوم کا سردار تھا علم کی تلاش تو کی مگر وہ غلط راہ پر چل پڑا اور اس کے علم نے اسے گمراہ کر دیا[۳]۔"

اس کے بعد صبیغ پھر اپنی قوم میں معزز نہ ہو سکا۔ صبیغ ہی سے روایت ہے "میں نے عمرؓ سے مرسلات ذاریات اور نازعات کے بارے میں سوال کیا فوراً بولے "اپنا سر کھولو ذرا۔" اتفاق سے میرے سر پر گیسو تھے۔ ارشاد ہوا "تیرا سر گھٹا ہوا ہوتا تو میں تیرا سر ہی اڑا دیتا۔" اس کے بعد اہل بصرہ کو تاکید کر دی گئی کہ وہ میری صحبت میں نہ بیٹھیں[۴]۔" ایک اور روایت کے مطابق آپ نے صبیغ کو سو کوڑے لگوائے اور ایک مکان میں قید کروا دیا اور جب اس کی حالت بہتر ہو گئی تو سے پھر وہی سزا دی اور اسے اونٹ کی ننگی پشت پر سوار کرا کے بصرہ بھجوا دیا اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو ہدایت لکھ بھیجی کہ صبیغ سے لوگ ملنے نہ پائیں[۵]۔"

کچھ عرصہ بعد صبیغ نے ابو موسیٰ کے سامنے اپنا بیان حلفی پیش کیا کہ اب ان کے دل میں تشکک کے وسوسوں کا دخل و عمل ذرا بھی نہیں۔ ابو موسیٰ نے یہ بات امیر المومنین کو لکھ بھیجی۔ آپ نے لوگوں کو صبیغ سے ملنے کی اجازت دے دی[۶]۔ امام زہری کا بیان ہے کہ "ابن خطابؓ نے صبیغ تمیمی کو حروف قرآن کے بارے میں شک آمیز استفسار پر اس قدر سختی سے سزا دی کہ ان کی پشت خونچکاں ہو گئی[۷]۔"

---

(۱) منتھی ۱: ۳۷۴ حدیث ۱۲۲۶ (۲) سورۃ الذاریات ۵۱: ۱-۴ (۳) ابن رجاء: ۱۲۷ (۴) جوزی: ۱۲۷ (۵) دارمی ۱: ۵۵ (۶) دارمی ۱: ۵۶ (۷) جوزی: ۱۲۸

باب پنجم

بصیرت عمرؓ اور احادیث نبویؐ

☆۔ تعلق بالحدیث

☆۔ احادیث کی ترویج واشاعت

☆۔ حزم واحتیاط

تعلق بالحدیث

حضرت عمر فاروقؓ حدیث و سنت سے بڑا گہرا فکری، قلبی اور عملی تعلق رکھتے تھے۔ اسوۂ نبی کی مکمل پیروی ان کی زندگی کا بہت بڑا مقصد تھا۔ اس لئے اس بارے میں بڑا ذوق و شوق رکھتے تھے۔ ان سے مروی احادیث سے بھی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ابن جوزی کے مطابق ان کی تعداد ۵۳۷ ہے[1]۔ سیوطی نے "۵۳۹" رقم کی ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں نہایت جلیل القدر صحابہ کرام کے نام شامل ہیں۔ مثلاً حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت طلحہؓ حضرت عبداللہ بن عوفؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت ابوذرؓ حضرت عمرو بن عبسہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن زبیرؓ حضرت انسؓ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت براءؓ بن عازب، حضرت ابوسعید خدریؓ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین[2]۔ روایت حدیث کے لحاظ سے شاہ ولی اللہ انہیں مکثرین صحابہؓ کے طبقے میں شمار کرتے ہیں، جن کی مرویات کی تعداد ان کے نزدیک ایک ہزار یا اس سے اوپر ہے۔ اس کی دلیل میں فرماتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیشتر روایات اگرچہ ظاہر میں موقوف ہیں، لیکن حقیقت میں سب مرفوع ہیں، کیونکہ ان اصحاب کی اکثر روایات باب فقہ، باب احسان اور باب حکمت میں ہیں کہ وہ متعدد طریقوں سے مرفوع ہیں۔ پھر دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ خود ان اصحاب کے الفاظ میں کوئی اشارہ خفی ایسا ہوتا ہے جو مرفوع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ پس اصول حدیث کے قاعدے کے مطابق ان اصحاب کی بہت سی موقوف روایات حقیقت میں مرفوع ہیں۔ اس لحاظ سے یہ اصحاب والا مکثرین صحابہؓ میں داخل ہیں[3]۔"

اس طرح بہت سے ایسے استدلالات اور فیصلے جو آپ نے فقہی معاملات اور قرآن حکیم کی تعبیر و تشریح اور احکام و مسائل کی توضیح و تبیین میں رسول اکرم ﷺ کے طرز عمل اور احکام کی روشنی میں کئے اگر ان کا شمار کیا جائے تو تعداد بتانا ممکن نہیں۔ فن حدیث کی رو سے وہ بھی احادیث ہی کی تعریف میں آتے ہیں[4]۔ حدیث کے علم و فن کی خدمت کے اعتبار سے حضرت عمر فاروقؓ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے احادیث کی ترویج و اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا؟ جب کہ ارشاد نبوی ہے۔ "بلغوا عنی ولو آیۃ وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج فمن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار[5]۔" (میری طرف سے بیان کرو اگرچہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو نیز بنی اسرائیل سے بھی روایات کرو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔)

○...... ترویج و اشاعت:

احادیث کے ضمن میں حضرت عمرؓ کے طرز عمل کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں، تو وہ مذکورہ بالا حدیث میں بیان کردہ دونوں اہم پہلوؤں پر پوری طرح کاربند نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ حدیث کی بھرپور اشاعت کی جائے اور دوسرا یہ کہ اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ کوئی جھوٹ آنحضور ﷺ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔ جہاں تک احادیث کی ترویج و اشاعت کا تعلق ہے، حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی کاوشوں کو حسب ذیل عنوانات میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

ا۔ کتاب و سنت لازم و ملزوم:

ا۔ حضرت عمر فاروقؓ قرآن و سنت کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ لوگوں کو اس بات کی ترغیب دیتے تھے کہ جس انہماک سے وہ قرآن مجید سیکھتے ہیں اسی ذوق و شوق کے ساتھ احادیث و سنت، علم المیراث اور قرأت وغیرہ بھی سیکھیں، کیونکہ اسلامی تعلیمات کے فہم و ادراک کیلئے ان سب کی طرف توجہ ناگزیر ہے۔ ارشاد فرمایا "تعلموا السنن والفرائض واللحن کما تعلمون القرآن[6]۔" ان کا یہ خیال بالکل بجا تھا کہ خود قرآن حکیم کو سمجھنے کیلئے بھی سنت کو جاننا ضروری ہے اور

(۱) حضری ۱:۱۷۳ (۲) سیوطی ص۱۰۹ (۳) سطا: ۲:۲۲۶ (۴) حضمی ۲۱۲ (۵) صداورقی ۱:۳۱۲، ذہبی ۱:۱۳۲، ضیمی ۱:۱۶۶، رمضی ۱:۱۲۹ (۶) جوہری ۱۹۷

سنت ہی واحد ذریعہ ہے جو قرآن حکیم کی من مانی تاویلات 'معنوی تحریفات اور فکری کجیوں کا راستہ روک سکتی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم کو سمجھنے کیلئے وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو سنتوں کے علم کو زیادہ جاننے والے ہوں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا "سیاتی الناس یجادلونکم بشبہات القرآن' فخذوھم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ[1]۔" (ایک وقت آئے گا کہ لوگ قرآن کی متشابہات کے بارے میں مجادلہ کریں گے پس ان کا مقابلہ سنن سے کرو۔ بے شک اصحاب سنن اللہ کی کتاب کا زیادہ علم رکھنے والے ہیں۔" ان ارشادات کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ حدیث وسنت کی تعلیم کی طرف راغب ہوئے اور پھر سنتوں کے علم سے آگہی رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت بڑھی اور ان کی سماجی حیثیت بلند ہوئی۔ لوگ احکام ومسائل کو جاننے کیلئے انہی کی طرف رجوع کرتے رہے۔ انہی کی روایت کردہ احادیث کو لوگوں نے سینوں میں محفوظ کیا اور آئندہ نسلوں تک منتقل کیا اور جب باقاعدہ تدوین کا مرحلہ آیا تو کتابوں میں محفوظ ہو گئیں۔ ہم سرور کونین ﷺ کے احکام 'اعمال 'افعال اور سرگرمیوں کی زندہ تصویر ان میں دیکھ سکتے ہیں۔

۲۔ تلاش و تجسس:

۲۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے تلاش حدیث میں بہت کاوش کی زمانے کے بدلتے ہوئے حالات 'وسیع تر فتوحات اور نئے نئے سماجی وتمدنی مسائل کا اسوۂ نبی ﷺ کی روشنی میں حل تلاش کرنے کیلئے مجمع عام میں لوگوں سے سوال کرتے کہ اگر اس بارے میں آنحضور ﷺ کا کوئی حکم یا عمل موجود ہو تو پیش کریں۔ چنانچہ جس کسی کو بھی کوئی حدیث معلوم ہوتی وہ کھڑے ہو کر بیان کرتا۔ بسا اوقات کئی اور صحابہؓ بھی اس کی تصدیق کرتے۔ اس استفسار کے ذریعے آپ نے بہت سی ایسی احادیث کا کھوج لگایا جو قبل ازیں ان کے علم میں نہیں تھیں۔ اس کی بہت سی مثالیں کتب احادیث میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں 'مثال کیلئے چند حسب ذیل ہیں۔ اہل کتاب سے جزیہ لینے کے بارے میں تو ان کا ذہن واضح تھا لیکن مجوس سے جزیہ لینے یا نہ لینے کے بارے میں پریشان تھے۔ اس سلسلے میں مختلف عمال نے ان سے مسئلہ دریافت کیا۔ یک دن فرمایا کہ "مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ان کے بارے میں کیا کروں اس پر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے گواہی دی کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا "سنوا بھم سنۃ اھل الکتاب[2]۔" (اس بارے میں) "ان سے وہی طریقہ برتو جو اہل کتاب سے برتتے ہو۔" مزید یہ بھی خبر دی کہ آنحضور ﷺ نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا[3]۔ اس کے بعد انہوں نے مجوس سے جزیہ لینے کے احکام صادر کر دیئے' چنانچہ فارس کے مجوسیوں سے بھی وصول کیا گیا[4] اہل سواد سے بھی وصول کیا گیا[5]۔ نیز آپ نے جزء بن معاویہ کو جو منا ذر دوست میان کے والی تھے کو بھی حکم دیا کہ تمہارے علاقے میں مجوس آباد ہیں ان سے جزیہ وصول کرو[6]۔ ہاں البتہ حضرت عمرؓ نے اپنی اجتہادی بصیرت سے کام لیتے ہوئے انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا۔ تنگ حال 'خوشحال اور متوسط حال اور پھر ان کی حیثیت کے مطابق جزیہ عائد کیا[7]۔

یک اور مثال یہ بھی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو معلوم نہیں تھا کہ آیا دیت میں سے مقتول کی زوجہ کو بھی حصہ ملے گا یا نہیں۔ چنانچہ ابن شہاب سے روایت ہے کہ انہوں نے منیٰ میں لوگوں کو بلایا اور فرمایا "جس شخص کو دیت کا مسئلہ معلوم ہو تو بیان کرے۔" اس پر حضرت ضحاکؓ بن سفیان الکلابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ "نبی ﷺ نے مجھے لکھ بھیجا تھا کہ اشیم ضبابی کی عورت کو اس کی دیت میں سے میراث دلاؤں۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تم خیمے میں جاؤ اور میرا (اس وقت تک انتظار کرو) جب تک میں آؤں۔" جب حضرت عمرؓ پہنچے تو حضرت ضحاکؓ نے پھر وہی بات بتائی' چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا[8]۔ اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کے علم میں بات نہیں تھی کہ اگر کسی کے مارنے سے عورت کے پیٹ کا بچہ (جنین) مر جائے تو اس کی دیت کتنی ہو گی؟ اس

---

(۱) دارمی ۱: ۶۹' سعد ۲: ۱۴۶ (۲) مالک ۱: ۲۷۸' ترمذی ۲: ۷۲' یوسف ۱۳۰ تیر [illegible] ۳: ۲۶۴ (۳) بخاری ۴: ۶۳' عبدالرزاق ۱۰: ۱۸ تیر [illegible] ۳: ۲۶۳' یوسف ۱۲۹ (۴) مالک ۱: ۲۷۸' تیر [illegible] ۳: ۲۶۴ (۵) یوسف ۱۲۹ (۶) بخاری ۴: ۶۳' یوسف ۱۲۹' تیر [illegible] ۳: ۲۶۴ (۷) یوسف ۱۶۸ (۸) مالک ۲: ۸۰' ترمذی ۲: ۴۲۴' تیر [illegible] ۵: ۷۹' شافعی ۲۵۳۔

نے ایک مسئلہ در پیش ہوا[۱]۔ تو انہوں نے لوگوں کو بلایا اور ان سے مشورہ کیا اور انہیں قسم دے کر پوچھا کہ آیا کسی نے نبی ﷺ سے جنین کے سلسلے میں فیصلے سنا ہے؟ اس پر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں نے آنحضور ﷺ سے سنا ہے۔ انہوں نے اس میں ایک غلام یا ایک کنیز دینے کا فیصلہ فرمایا تھا حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ اپنا کوئی گواہ لاؤ چنانچہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ نبی ﷺ نے یہ فیصلہ کیا تھا[۲]۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "الله اکبر لولم اسمع بهذا لقضیا بغیر هذا[۳]۔" (اللہ اکبر اگر ہم نے یہ نہ سن لیا ہوتا تو اس کے برعکس فیصلہ کرتے۔) ایک اور مثال یہ بھی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک عورت لائی گئی جو گودنا کرتی تھی تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ "میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں کچھ سنا ہے؟" حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں اٹھا اور عرض کیا "اے امیر المومنین! میں نے آپؐ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ نہ گودو اور نہ گدواؤ[۴]۔"

حضرت عمر فاروقؓ کے اس بصیرت افروز طریق کار سے بے شمار مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ لوگوں میں علم حدیث کا ذوق و شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے ذہنوں میں محفوظ کرنا شروع کر دیا اور ان کے تجسس میں منہمک ہو گئے۔ دوسرا یہ کہ خبر واحد کو شہرت کا رنگ حاصل ہو گیا۔ وہ حدیث جو پہلے ایک یا چند صحابہ کرامؓ کے علم میں تھی اب بے شمار لوگوں کے سامنے آ گئی اور تدوین میں مختلف طریق کے ذریعے نہایت مستند احادیث کا ذخیرہ اکٹھا کرنے میں آسانی پیدا ہو گئی۔ تیسرا یہ کہ سنت نبوی ﷺ کی اہمیت واضح ہوئی اور اجتماعی طور پر روز مرہ کے مسائل کو اسوۂ حسنہ کی روشنی میں حل کرنے میں مدد ملی۔ لوگ ہر مسئلے میں رہنمائی کیلئے احادیث نبوی ﷺ کو تلاش کرنے لگے اور جو احادیث اس طرح سامنے آئیں ان کو عمل کی بنیاد بناتے رہے۔ چوتھا یہ کہ اس طرح نہایت صحیح احادیث سامنے آئیں جو ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک تھیں۔ ان کو جاننے، صحیح پس منظر میں سمجھنے اور ان سے مسائل کا استنباط کرنے میں غلطی کی گنجائش نہ رہی۔ اگر کہیں کوئی اشکال پیدا ہوا تو دیگر راویوں اور عینی شاہدوں کے بیان سے دور ہو گیا۔ پانچواں یہ کہ اس سے صحیح فیصلے کرنے میں مدد ملی اور خلافت علی منہاج النبوت کے تقاضے نہایت عمدگی سے پورے ہوتے رہے کتاب و سنت سے تعلق مضبوط رہا۔ چھٹا یہ کہ فیصلوں میں ایک اجماعی رنگ پیدا ہو گیا۔ اختلافات کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل سکا۔ ایک ہمہ گیر یکسوئی پیدا ہوئی جو ان کے احترام اور تنفیذ میں نہایت کارگر ثابت ہوئی۔ ساتواں یہ کہ مدینہ کی فکری و ذہنی مرکزیت مستحکم ہوئی۔ یہاں کے فیصلے دیگر تمام علاقوں کی توجہ کا محور بنے۔ یہاں کی روایات ہر طرف منتقل ہوئیں اور سرچشمہ ہدایت بنیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے اہل مدینہ کے عمل کو بھی اپنی فقہ کی بنیاد بنایا ہے کیونکہ عہد عمرؓ میں یہاں احادیث کا چرچا رہا۔

۳۔ معلمین کا تقرر:

۳۔ احادیث کی اشاعت میں حضرت عمر فاروقؓ نے تیسرا اہم اقدام یہ کیا کہ سلطنت کے طول و عرض میں مختلف معلمین بھیجے تاکہ وہ لوگوں کو کتاب و سنت کی تعلیم دیں اور علم دین سکھائیں۔ چنانچہ انہوں نے حمص، دمشق اور فلسطین کی طرف تین جلیل القدر اصحاب کو بھیجا، جن میں حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابودرداءؓ اور حضرت عبادہ بن صامت، رضوان اللہ علیہم اجمعین شامل تھے۔ ان کی یہ ذمہ داری لگائی کہ ان تمام علاقوں میں علم دین پھیلائیں[۵]۔ کوفہ کی طرف عبداللہ بن مسعود کو بھیجا[۶]۔ جن کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ وہ ایک ایسا صندوق ہیں جو علم سے بھرا ہوا ہے[۷]۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بصرہ کی طرف بھیجا۔ وہ وہاں پہنچے تو لوگوں سے کہا: "مجھے امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ نے تمہاری طرف اس لئے بھیجا ہے کہ "اعلمکم کتاب ربکم و سنتکم وانظف طرقکم[۸]۔" (تمہیں تمہارے رب کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت کی تعلیم دوں اور تمہارے راستوں کو صاف کروں۔)

---

(۱) عبدالرزاق ۱۰/۵۸ (۲) بخاری،۸/۴۵، مسلم،۵/۱۱۱، داؤد ۶/۲۶۶ (۳) داؤد ۴/۲۶۷ (۴) ... ۱۷۲/۵، ... ۲/۲۵۳ (۴) نسائی ۸/۱۴۸

(۵) سعد ۲/۳۵۷ (۶) طبرسی ۴/۱۳۹، ... ۲/۴۲۷ (۷) سعد ۲/۳۴۴ (۸) ... ۲/۴۲۷، دارمی ۱/۱۳۵۔

شاہ ولی اللہ نے بالکل بجا کہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مختلف ممالک میں علماء صحابہؓ کو روایت حدیث کیلئے بھیجا اور انہیں وہاں اقامت کا حکم دیا[۱]۔ وہ سب لوگ جنہیں معلمین کے طور پر بھیجا گیا' ان کی خصوصی صفت یہی تھی کہ قرآن کے ساتھ ساتھ احادیث کا علم و فہم بھی رکھتے ہوں' کیونکہ اس کے بغیر نہ تو قرآن کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن ہے اور نہ ہی دین کی تعلیم۔ ان مذکورہ لوگوں میں حضرت معاذ بن جبلؓ بھی شامل ہیں' جن کے بارے میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ "معاذؓ قیامت کے روز علماء سے اس قدر آگے ہوں گے' جتنا کہ حد نظر ہے[۲]۔" رسول اکرم ﷺ نے انہیں یمن کا قاضی مقرر کیا' تو پوچھا کیسے فیصلہ کرو گے' تو انہوں نے بالترتیب کتاب و سنت اور اجتہاد کا ذکر کیا تو فرمایا "تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں' جس نے قاصد رسول ﷺ کو ایسے امر کی توفیق دی جس پر رسول اللہ ﷺ خوش ہیں[۳]۔" اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فیصلوں کے بارے میں پوچھا گیا' تو انہوں نے بھی کتاب و سنت کے ساتھ صالحین کے فیصلوں کو بھی بطور نظیر سامنے رکھنے اور پھر اجتہاد کرنے پر زور دیا[۴]۔

حضرت عبادہؓ بن صامت کتاب و سنت کے گہرے علم کے ساتھ جرأت بھی رکھتے تھے۔ کسی بھی مسئلے پر شام کے گورنر حضرت امیر معاویہؓ سے اختلاف کیا تو حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ملی۔ انہوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں علمی آزادی مہیا کرتے ہوئے لکھا کہ امیر معاویہؓ کی ان پر کوئی حکمرانی نہیں ہو گی[۵]۔ حضرت ابو درداءؓ بھی بہت بڑے عالم و فقیہ تھے اور باعمل بھی۔ ان کا قول ہے کہ "عالم نہیں ہوتا جب تک متعلم نہیں ہو اور علم پر عامل نہ ہو[۶]۔" حضرت ابو بکر صدیقؓ انہیں شریک مشورہ رکھتے تھے' حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ ہم سے دونوں عاقلوں کا حال بیان کرو۔ کہا جاتا کہ وہ عاقل کون ہیں' تو وہ کہتے معاذؓ اور ابو درداءؓ[۷]۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ معلمین کتنے بلند مرتبہ عالم اور محدث تھے۔

۴۔ عالم قاضیوں کا تقرر:

اس سلسلے میں چوتھا اقدام جو حضرت عمر فاروقؓ نے کیا وہ یہ تھا مختلف عمال اور قاضیوں کے تقرر میں ان کی انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ دین کے علم و فہم کا بھی لحاظ رکھا اور انہیں اس بات کا پابند بنایا کہ وہ اپنے روزمرہ کے امور اور فیصلوں میں کتاب و سنت ہی کو بنیاد بنائیں اور پھر سنت کی تعلیم کا بھی اہتمام کریں۔ ان کے نزدیک یہ کام اس قدر اہم تھا کہ مختلف عمال اور گورنروں کی بنیادی ذمہ داریوں میں سنت کی تعلیم دینا بھی شامل تھا۔ ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے میں لوگوں کے سامنے اللہ کو گواہ بنا کر فرمایا "اللھم انی اشھدک علی امراء الامصار انی انما بعثتھم لیعلموا الناس دینھم وسنۃ نبیھم' وان یقسموا فیھم فیئھم وان یعدلوا' فان اشکل علیھم شیء رفعوہ الی[۸]۔" (اے اللہ! میں تیرے سامنے حکام بلاد کے بارے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں نے انہیں صرف اس کام کیلئے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو دین و مذہب کی تعلیم دیں اور سنت نبوی ﷺ کی اشاعت کریں اور ان کے مال غنیمت کو ان کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم کریں اور اگر کوئی دقت پیش آئے تو وہ مجھے مطلع کریں۔)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام کاموں میں ان کے نزدیک ترجیح دین و سنت کی تعلیم کو حاصل تھی۔ یہ کام وہ اسی صورت میں سر انجام دے سکتے تھے' جبکہ وہ خود سنتوں سے باخبر ہوں۔ پھر وہ اس کام کو اس قدر اجاگر کرنا چاہتے تھے کہ لوگ خود ان سے صرف مسائل کے سلسلے میں نہیں' بلکہ دین و سنت کیلئے بھی رجوع کریں اور اپنے عمال کی سیرت و کردار کا جائزہ اسی اعتبار سے لیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ رائے عامہ اس قدر بیدار رہے کہ عمال کو ان کی ذمہ داریوں سے انحراف نہ کرنے دے۔ اس لئے عوام سے ایک خطاب کرتے ہوئے فرمایا "خدا کی قسم میں! اپنے افسروں کو تمہارے یہاں اس لئے نہیں بھیجتا کہ وہ تمہارے منہ پر چپت ماریں یا تمہارے مال

---

(۱) سعد ۲/ ۴۲۷ (۲) سعد ۲/ ۳۴۷ (۳) داود ۳/ ۴۱۲' دارمی ۱/ ۶۰' ترمذی ۲/ ۳۹۴ (۴) نسائی ۸/ ۲۳۰' اثیر ۱/ ۱۰' ۵۵۲' دارمی ۱/ ۶۱ (۵) اثیر ۱۰/ ۵۵۱ ... (۶) سعد ۲/ ۳۵۷ (۷) سعد ۲/ ۳۵ (۸) طبری ۴/ ۲۰۴' حنبل ۱/ ۲۷۹۔ شاملہ ۲/ ۴۲۷

چھین لیں۔ میں تو اس لئے بھیجتا ہوں کہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں اور تمہارے نبی ﷺ کی سنت کی تعلیم دیں۔ جس کسی سے اس کے برعکس معاملہ کیا جائے۔ اسے چاہئے کہ میرے سامنے پیش کریں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں متعلقہ افسر سے اس کا بدلہ لے کر رہوں گا (۱)۔" اسی طرح قاضیوں کو بھی کتاب و سنت ہی کو اساس بنانے کا جو حکم دیا اس کی مثال قاضی شریح کو کوفہ کی طرف روانہ کرتے وقت جو ہدایتیں دیں ان میں یہ بھی تھی "خدا کی کتاب میں جو فیصلہ تمکو ملے اس کو بے چون و چرا اختیار کرلو اور اگر وہاں کوئی فیصلہ نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کرو اگر وہاں بھی نہ ملے تو اجتہاد کرو (۲)۔" وہ وہاں چلے گئے اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے لگے۔ پھر انہیں یاددہانی اور تاکید کیلئے سرکاری خط ارسال کیا اور انہیں کتاب و سنت کے بعد آئمہ ھدیٰ کی آراء اور فیصلوں سے بھی کام لینے کا حکم دیا اور یہ بھی فرمایا کہ "بعد از اں یا تو اجتہاد کر دیا پھر میری طرف رجوع کرو اور تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ میری طرف رجوع کرو (۳)۔" اس میں اپنی طرف رجوع کرنے کے حکم میں بھی یہی حکمت کار فرما نظر آتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس بارے میں محترم کا کوئی فرمان موجود ہو' جسے شریح سے نہ جانتے ہوں تو رجوع کرنے سے اس تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے کیونکہ تمام اکابر صحابہ کرام اور سنتوں کو جاننے والے لوگ مدینے میں قیام پذیر تھے۔ الغرض عمال اور قاضیوں کو دی جانے والی ہدایات و فرامین بھی سنت کی اہمیت کو اجاگر کرے اس کو تلاش کرنے اور ان کی طرف رغبت و رجوع کرنے کا باعث بنے اور علم حدیث کی اشاعت کی طرف پیش قدمی ہوئی۔

۵۔ خطبات میں استعمال:

۵۔ احادیث کی اشاعت و فروغ کے ضمن میں حضرت عمرؓ کی کاوشوں کا پانچواں اہم پہلو خود ان کی روایت کردہ احادیث ہیں جو مختلف صورتوں میں لوگوں کے سامنے آئیں اور پھر کتب احادیث میں محفوظ ہوئیں۔ انکی بھرپور سیاسی و سماجی زندگی کا اس میں بڑا گہرا دخل ہے۔ محمد بن عمر اسلمی کے بقول رسول اکرم ﷺ کے اکابر اصحابؓ سے صرف اس لئے روایت کی قلت ہے کہ وہ لوگ قبل اس کے کہ ان کی حاجت ہو' وفات پاگئے صرف حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت علیؓ بن ابی طالب سے کثرت ہوئی اس لئے کہ یہ دونوں والی ہوئے اور ان دونوں نے لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کیا (۴)۔ آپ کی روایت کردہ احادیث خطبات' فرامین اور فیصلوں کی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں مرفوع بھی ہیں اور موقوف بھی' علاوہ ازیں بہت سی احادیث انہوں نے حسب ضرورت روایت بھی کی ہیں۔ آپ اپنے خطبات میں ہمیشہ قرآن و سنت ہی کو بنیاد بناتے تھے۔ خاص طور پر تعلیمی تربیتی اور اصلاحی اغراض کی خاطر دیئے گئے خطبے اسی سرچشمہ ہدایت سے ماخوذ ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ منبر پر کھڑے ہوئے اور خطبہ میں فرمایا "اے لوگو! صحیح اور درست رائے تو صرف رسول اللہ ﷺ کی تھی اس لئے کہ انہیں اللہ تعالیٰ سمجھاتا تھا ہماری رائے تو محض گمان و تکلف ہے (۵)۔ بس یہی وہ بات تھی جس کی بنا پر آپ اپنی رائے سے حتی الامکان گریز کرتے اور احادیث نبوی ﷺ ہی کو پیش نظر رکھتے۔ ایک مرتبہ شام کے سفر کے دوران جابیہ تشریف لے گئے اور وہاں لوگوں کے سامنے تقریر کی اور فرمایا "اے لوگو! میں تمہارے درمیان اسی طرح کھڑا ہوں جیسے رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے تھے اور آپ نے فرمایا کہ "میں تمہیں اپنے اصحابؓ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں (عزت، اطاعت کی) پھر ان کے بعد جو آنے والے ہیں (تبع تابعین) پھر ان کے بعد جھوٹ مروج ہو جائے گا' یہاں تک کہ ایک شخص حلف و قسم اٹھائے گا۔ اس سے پہلے کہ اس سے قسم لی جائے اور گواہی دے گا بغیر اس کے کہ اس سے گواہی طلب کی جائے' خبردار کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہیں ہوتا مگر یہ کہ ان دونوں کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ تم لازمی طور پر جماعت ہی کے ساتھ وابستہ رہو' جس شخص کو اس کی نیکی خوش کردے اور برائی غمگین تو وہ مومن ہے (۶)۔" اس طرح اپنے

---

(۱) حنبل ۱: ۱۹۳ یوسف ۱۱۵ طبری ۴: ۲۰۴ (۲) بیہقی ۱۰: ۱۱۰ نسائی ۸: ۲۳۱ (۳) بیہقی ۱۰: ۱۱۰ دارمی ۱: ۶۰ (۴) سعد ۲: ۳۷۶ (۵) داؤد ۳: ۴

(۶) ترمذی ۴: ۴۳۱۵ حنبل ۱: ۱۸ ۲۳ - ۲۶' طبرانی ۱۲: ۸۹' کثیر ۷: ۵۶' مسلم ۵: ۲۰۳۔

اس خطبے میں انہوں نے بہت سی احادیث کی روایت کی ہے اور ایسے لوگوں تک انہیں منتقل کیا جو دور دراز علاقوں میں قیام پذیر تھے۔

رسول اکرم ﷺ جمعہ کے روز جمعہ مسجد کی طرف آنا اور غسل کرنا بہت پسند فرماتے تھے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کے روز نہانا ہر بالغ پر واجب ہے[1]۔ حضرت عمرؓ ایک دن جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اصحاب مہاجرین و اولین میں سے ایک بزرگ (حضرت عثمانؓ) مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت عمرؓ نے (دوران خطبہ) پوچھا "کیا یہ آنے کا وقت ہے؟" انہوں نے جواب دیا کہ "میں ایک کام میں مصروف ہو گیا تھا' گھر لوٹا تو اذان کی آواز سنی اور وضو سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "صرف وضو؟ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ نبی ﷺ غسل کا حکم فرماتے تھے[2]۔" اسی طرح غسل کے وجوب کے بارے میں حدیث نبوی ﷺ تمام لوگوں کے سامنے آگئی جو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی کے علم میں نہ ہو اور پھر حدیث پر عمل کرنے کی ترغیب بھی دی اور تنبیہ بھی کی اور پھر نہایت جلیل القدر صحابیؓ کو مجمع میں ٹوکا تاکہ دیگر لوگ اس کا پورا اہتمام کریں۔ یہ بالواسطہ طور پر توجہ دلانے کا نہایت حکیمانہ انداز تھا۔

آپ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی حکم شرعی اور اسوۂ نبوی ضائع ہو جائے' چنانچہ رجم کے بارے میں انہیں یہ اندیشہ ہوا تو خطبہ دیا' جو حضرت ابن عباسؓ' حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت سعید بن المسیبؓ سے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ مروی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا "اے لوگو! جو تمہارے سامنے سنتیں مقرر کر دی گئی ہیں' وہ سنتیں ہیں اور جو فرائض مقرر کر دیے گئے ہیں' وہ فرائض ہیں' اس طرح تمام چیزیں تم پر واضح کر دی گئی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دائیں اور بائیں بھٹک جاؤ۔" پھر آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مار کر فرمایا "تم آیت رجم کے بارے میں ہلاکت سے بچو کہ کوئی کہنے والا یہ کہے کہ ہم کتاب اللہ میں دو حدیں نہیں پاتے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا تھا اور ہم نے بھی رجم کیا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر لوگ یہ نہ کہتے کہ کتاب اللہ میں اضافہ کر دیا ہے تو میں اس میں لکھوا دیتا "الشیخ والشیخۃ فارجموھما البتۃ" بے شک ہم نے اس آیت کو پڑھا ہے[3]۔"

حضرت عمر فاروقؓ جہاں ان احادیث کو لوگوں کے سامنے لانے میں سرگرم ہوتے تھے' جو ان کے علم میں تھیں' وہاں ان باتوں کا ذکر بھی فرما دیتے تھے' جن کے بارے میں انہیں کوئی اشکال لاحق ہوتا تھا' جن کے بارے میں ان کے خیال کے مطابق واضح و حتمی احکام موجود نہیں ہوتے تھے' تاکہ سوچ بچار کے دروازے کھلے رہیں اور سمجھدار لوگ ان پر سنجیدگی سے غور و خوض کرتے رہیں اور تلاش حق کا سفر جاری رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے منبر رسول ﷺ پر خطبہ دیا اور اللہ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا "جب شراب حرام ہوئی تو پانچ چیزوں سے بنا کرتی تھی گیہوں' جو' کھجور' انگور اور شہد سے اور شراب وہ ہے جو عقل میں فتور ڈالے' اے لوگو! میں چاہتا ہوں کہ کاش رسول اللہ ﷺ ہم سے دادا' کلالہ اور سود کے چند ابواب کے بارے میں (مفصل) بیان فرما دیتے[4]۔"

یہاں آپ نے شراب اور اس کے متعلقات کے بارے میں حدیث نبوی کو اپنے الفاظ میں بیان بھی فرمایا ہے اور اس حسرت تجسس کا بھی اظہار کر دیا ہے' جس کا محرک اسوہ نبوی کی مکمل اطاعت کے جذبے کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا۔

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے غلام ابو عبید سے روایت ہے کہ وہ حضرت عمر بن خطابؓ کے ساتھ شریک ہوئے۔ انہوں نے خطبے سے پہلے بغیر اذان و اقامت کے نماز پڑھی پھر بعد میں خطاب کیا اور فرمایا "اے لوگو! رسول اکرم ﷺ نے ان دو دنوں کے روزوں سے منع فرمایا ہے' ان دو دنوں میں سے ایک تمہارے

---

(1) مسلم ۲۹۰:۲ (2) بخاری ۲۱۲:۱' مسلم ۶۹۲:۲' مالک ۱۰۲:۱' حنبل ۱۹۴:۱ (3) مالک ۸۲۴:۲' حنبل ۱۰ ۲۴' داؤد ۲:۳' ۴' ۲ (4) مسلم ۸' ۲۴۵' داؤد ۳' ۴۴۴ نسائی ۲۸۹/۸۔

روزوں کے بعد تمہارے افطار اور عید کا دن ہے اور دوسرا وہ ہے کہ جس میں تم اپنی قربانیوں میں سے کھاتے ہو [۱]۔" اسی طرح ایک دن منبر پر خطبہ دیتے ہوئے رسول کریم ﷺ کی حدیث پیش کی اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے' ہر آدمی کیلئے وہی کچھ ہے' جس کی اس نے نیت کی' جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کیلئے ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول کیلئے ہی ہے اور جس کی ہجرت طلب دنیا کیلئے ہو یا کسی عورت سے شادی کیلئے تو اس کی ہجرت اسی کیلئے شمار ہوگی [۲]۔ اسی طرح جن ان دنوں میں جبکہ ہر طرف جنگیں لڑی جا رہی تھیں اور لوگ اپنے اپنے عزیز و اقارب کی شرکت و شہادت پر فخر کر رہے تھے' حضرت عمرؓ نے' نہایت بصیرت افروز اور حالات کی مناسبت سے نہایت اہم ترتیبی خطبہ دیا اور اس میں دیگر امور کے علاوہ یہ بات بھی فرمائی "ایک اور بات ان جنگوں میں جو آج لڑی جا رہی ہیں' یہ ہے کہ جو شخص مارا جاتا ہے' تم اس کے بارے میں کہتے ہو کہ فلاں شخص شہید ہو گیا' حالانکہ ہو سکتا ہے کہ اس کی نیت طلب دنیا ہو اور اس نے اپنی سواری کی دونوں خرجیوں میں سونا اور چاندی بھر لیا ہو' تو تم اس طرح نہ کہو بلکہ اس طرح کہو جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو راہ خدا میں قتل کیا گیا یا مر گیا وہ جنتی ہے [۳]۔"

٦۔ فرامین :

احادیث کے تحریری ذخیرے میں حضرت عمر فاروقؓ کے احکامات و فرامین بھی شامل ہیں' جو بذریعہ خطوط انہوں نے بحیثیت خلیفہ مختلف عمال کے نام ارسال کئے۔ آپ محض سیاسی' انتظامی اور جنگی معاملات ہی میں ان کی رہنمائی نہیں فرماتے تھے' بلکہ دینی و فقہی معاملات میں بھی انہیں ہدایات دیتے تھے اور وہ بھی ہر معاملے میں' انہیں سے رجوع کرتے تھے۔ آپ کے خطوط میں پائی جانے والی احادیث مرفوع بھی ہیں اور موقوف بھی۔ اس طرح احادیث کی ترویج و اشاعت میں ایک اہم ذریعہ خطوط بھی ہیں' مثلاً جانوروں کی زکوٰۃ' نصاب و شرح کی تفصیل حضرت عمرؓ کے پاس تحریری شکل میں کتاب الصدقہ کے نام سے موجود تھی۔ امام مالک نے اسے اپنی معروف کتاب الموطا میں تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے اسے خود پڑھا تھا [۴]۔ یہ غالباً وہی کتاب تھی جو خود آنحضور ﷺ نے تحریر فرمائی تھی اور عمال کے پاس بھیجنے سے پہلے وصال فرما گئے' جیسا کہ ابو داؤد کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ حضرت ابو بکرؓ پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہی ان کی اولاد سے آگے رقم کی گئی [۵]۔ یہ حدیث بظاہر موقوف ہے کیونکہ اس میں رسول اکرم ﷺ کا نام نہیں لیا گیا لیکن حقیقت میں مرفوع ہے کیونکہ آنحضور ﷺ نے ہی یہ تفصیل بیان فرمائی تھی پھر حضرت عمر فاروق خود شارع نہیں تھے کہ اپنی مرضی سے کچھ لکھتے۔ دیگر روایت سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ تحریر دراصل ارشادات نبوی پر ہی مشتمل ہے۔ ابو عثمان نہدی سے روایت ہے کہ عتبہ بن فرقد کے پاس آذربائیجان میں تھے کہ حضرت عمرؓ کا ایک خط آیا' اس میں لکھا تھا "اے عتبہ بن فرقد! یہ مال جو تیرے پاس ہے نہ تیرا کمایا ہوا ہے اور نہ تیرے باپ کا' نہ تیری ماں کا' پس اس سے تو مسلمانوں کو ان کے ٹھکانوں میں اسی طرح سیر کر جس طرح تو اپنے ٹھکانے میں سیر ہوتا ہے۔ تنعم و عیش کوشی' مشرکوں کی وضع اور ریشمی لباس پہننے سے بچ' بے شک رسول اللہ ﷺ نے ریشمی لباس پہننے سے منع فرمایا ہے' سوائے اتنا کہ آپ نے اپنی بیچ کی انگلی اور کلمہ کی انگلی کو آپس میں ملا کر بتایا [۶]۔ (یعنی دو انگلی کے برابر اگر کہیں لگا ہو' ہو تو حرج نہیں۔) اس خط میں آپ نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے' وہ دراصل احادیث ہی میں منع کی ہوئی باتیں ہیں' جنہیں انہوں نے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان نے سونے یا چاندی کا ایک برتن جو پانی پینے کیلئے تھا زیادہ سونے اور چاندی کے بدلے بیچا' تو حضرت ابو درداءؓ نے ان سے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے

(۱) حنبل ۲۵۶'۱ داؤد ۲ ۴۲۹ (۲) بخاری ۱ ۲ مسند ۱ ۴۸' نسائی ٦ ۱۵۸ (۳) بیہقی ٦ ۳۳۲ (٤) مالک ۲۵۷ ابن ماجہ ۵ ۳۵ (۵) داؤد ۲/۱۳۱

(٦) مسند ۱ ۱٤' احمد ۱ ۹٦ حرج ۱۳

سے منع فرماتے تھے' سوائے اس کے کہ برابر برابر بیچا جائے۔ حضرت معاویہؓ نے کہا کہ میں تو اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ حضرت ابودرداءؓ نے جواب دیا بھلا کون میرا عذر معاویہ کے بارے میں قبول کرے گا کہ میں تو انہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کرتا ہوں اور وہ مجھ سے اپنی رائے بیان کرتے ہیں۔ اب میں اس علاقے میں نہیں رہوں گا جس میں آپ ہیں۔ پھر حضرت ابودرداءؓ حضرت عمرؓ بن خطاب کے پاس چلے آئے اور انہیں قصہ بتایا تو حضرت عمرؓ نے امیر معاویہؓ کو خط لکھا اور حکم دیا کہ اس طرح کی بیع نہ کریں سوائے اس کے کہ ویسی ہی ہو اور برابر تول کر[1]۔ اس میں بھی حضرت عمرؓ نے حدیث ہی کے مطابق اپنا حکم جاری کیا۔ یہ حدیث تھی ان کا اپنا اجتہاد نہ تھا۔ آپ کے عمال کا یہ طریقہ تھا کہ ایسے دینی معاملات میں جن کا انہیں حتمی علم نہیں ہوتا تھا آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے اور آپ کے احکامات کی روشنی میں فیصلہ کرتے تھے۔ اس نے نہایت مربوط انداز میں کتاب و سنت کا عملی مسائل پر اطلاق جاری رہتا تھا۔ آپ کے علم میں جب کوئی ایسی حدیث آتی تھی جس کا اجتماعی مسائل سے تعلق ہوتا تھا' تو اسے عمال کی طرف لکھ کر روانہ کر دیتے تھے' تاکہ اسی کو فیصلوں کی بنیاد بنائیں۔ بجالہ بن عبدہ کہتے ہیں کہ میں مناذر میں جزء بن معاویہ کا کاتب تھا' ہمارے پاس حضرت عمرؓ کا ایک خط آیا جس میں لکھا تھا "تمہاری طرف جو مجوسی ہیں ان پر نظر ڈالو اور ان پر جزیہ عاید کرو کیونکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے مجھے خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجر کے مجوس سے جزیہ لیا تھا[2]۔" ابوامامہ بن سہل سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ابوعبیدہؓ بن الجراح کو لکھا کہ نوجوانوں کو پیراکی اور لڑنے کے قابل لوگوں کو تیر اندازی سکھاؤ' چنانچہ اس غرض سے لوگ اکٹھے تھے اور نشانے لے رہے تھے کہ اتنے میں ایک تیز دھار تیر آ کر ایک لڑکے کو لگا اور اسے ہلاک کر دیا۔ اس لڑکے کا کوئی اصل (حقیقی وارث) نہ پایا گیا۔ اس وقت وہ اپنے ماموں کی گود میں تھا' چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھ کر بھیجا کہ میں اس کی دیت کس کو ادا کروں؟ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے "الله ورسوله مولى من لا مولىٰ له' والخال وارث من لا وارث له[3]۔" (اللہ اور اس کا رسول ﷺ ایسے شخص کے ولی و وارث ہیں' جس کا کوئی ولی و وارث نہ ہو اور ماموں اس کا وارث ہے جس کا اور کوئی وارث نہ ہو۔) اس طرح حضرت عمر فاروقؓ کے ذریعے ایک ایسی حدیث تحریر میں آ گئی اور دور دراز تک پہنچ گئی' جو اجتماعی معاملات میں نہایت اہمیت کی حامل ہے اور اس کے اطلاقات بھی بہت وسیع ہیں۔

۷۔ ذاتی روایات

احادیث نبوی ﷺ کی ترویج و اشاعت میں حضرت عمر فاروقؓ کے کارنامے میں خود ان کی اپنی روایت کردہ احادیث بھی شامل ہیں' جن کی تعداد اچھی خاصی ہے اور وہ ایسی ہیں' جن کا اعتقاد و عمل سے گہرا تعلق ہے۔ جو زیادہ تر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ان پہلوؤں میں رہنمائی دیتی ہیں جو سماجی زندگی میں اہم کردار سرانجام دیتے ہیں۔ ان میں معیشت' معاشرت' آداب زندگی اور فقہی و قانونی معاملات شامل ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی دلچسپی کا میدان ہی یہی تھا' لیکن اس سے بڑھ کر دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ نظری معاملات میں روایت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آپ کی روایت کردہ چند احادیث کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ زہد ایک مسلمان کا سرمایہ حیات ہوتا ہے' مادی اسباب کے بجائے ایک مومن کو اللہ تعالیٰ پر جتنا زیادہ اعتماد و توکل ہوگا' وہ اتنا بہتر انداز میں اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکے گا۔ بروایت عمرؓ ارشاد نبوی ﷺ ہے "اگر تم اللہ تعالیٰ پر اسی طرح توکل کرو جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے' تو تم کو اسی طرح رزق ملے گا جیسا کہ پرندوں کو ملتا ہے۔ صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے ہوئے واپس لوٹتے ہیں[4]۔"

حضرت عمر فاروقؓ اس حدیث کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ روزمرہ کے معاملات میں توکل کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اس لئے انہوں نے اس حدیث کو روایت کیا اور ان کی عملی زندگی بھی اسی کی جھلک پیش کرتی ہے۔ ایک مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ ان تمام چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگے' جن سے سرور دو جہاں ﷺ

---

(۱) مالک' ۲/۶۳۴ (۲) ترمذی' ۳/۷۲ (۳) حنبل' ۱/۲۳۷' ترمذی' ۳/۲۸۵ (٤) حنبل' ۱/۲٤۳' ترمذی' ٤/٤۔

سے پناہ مانگی ہے۔ اس کا انسان کی عملی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ اسیئے حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ "کان النبی ﷺ یتعوذ من خمس من الجبن والبخل و سوء العمر و فتنۃ الصدور و عذاب القبر [۱]۔" (رسول اللہ ﷺ پانچ چیزوں سے پناہ مانگتے تھے۔ نامردی بخل بری عمر سینے کے فتنے اور عذاب قبر سے۔)

نماز کے معاملے میں ایک اہم چیز اوقات کا معاملہ ہے۔ یہ پانچ وقت کا فریضہ ہے۔ عام طور پر ہر مسلمان کو اس کے اوقات کا پتہ ہوتا ہے لیکن اس کے ممنوع اوقات کے بارے میں اکثر لوگ بے خبر رہتے ہیں جس کی وجہ سے بجائے ثواب کے حصول گناہ کے مرتکب ہوتے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس بارے میں حدیث نبوی ﷺ کو روایت کر کے بڑے عظیم معاملے میں لوگوں کو خبردار فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جن چند حضرات نے جن کی سچائی و دینداری میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا اور جن میں میرے سب سے محبوب حضرت عمرؓ نے بتایا ہے کہ نبی ﷺ نے فجر کی نماز کے بعد سورج بلند ہونے تک اور عصر کی نماز کے بعد سورج غروب ہونے تک نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے [۲]۔ اسی طرح روزے کے معاملے میں افطاری کا مسئلہ زیادہ حساس ہوتا ہے اور ہر روزہ دار کو اس کا شدید انتظار ہوتا ہے۔ اس کے وقت کی پہچان کے بارے میں حضرت عمرؓ کو یک حدیث معلوم تھی تو نہوں نے لوگوں کی رہنمائی کیلئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب پورب کی طرف سے رات کی سیاہی آئے اور پچھم کی طرف دن جانے لگے۔ سیاہی بڑھ جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ دار کو چاہئے کہ روزہ کھول لے [۳]۔ شادی و نکاح کے معاملات میں لوگ عام طور پر اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں اور بہت بوجھل اور سخت شرائط عاید کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعد کی زندگی میں اسے پورا نہیں کر سکتے اور یہ بات شکر رنجی اور ناموافقت کا باعث بنتی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اس بارے میں سرور کونین ﷺ کے ارشادات اور اسوہ کو لوگوں کے سامنے بیان فرماتے تاکہ وہ صحیح روش اختیار کریں۔ ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے یہ حدیث پیش کی۔ "خیر النکاح ایسرہ [۴]۔" (بہتر نکاح وہ ہے جو آسان ہو۔)

ایک مرتبہ فرمایا "خبردار عورتوں کے مہر باندھنے میں غلو نہ کرو۔ اگر یہ دنیا میں عزت و تکریم یا اللہ کے نزدیک تقویٰ کا ذریعہ ہوتی تو نبی ﷺ اس کے زیادہ حقدار تھے۔ آپؐ نے اپنی کسی بیوی اور کسی بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں باندھا۔ ایک شخص پہلے تو بیوی کے مہر میں غلو کرتا ہے پھر اس کے دل میں اس کے بارے میں دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ میں نے تمہارے لئے مصیبت جھیلی ہے [۵]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اسوۂ نبوی کی اہمیتوں و حکمتوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ پورے یقین و شعور کے ساتھ اسے منتقل کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک دنیا و آخرت کی نجات کا واحد ذریعہ یہی تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ سے زندگی کے بے شمار پہلوؤں کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں مثلاً یہ کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا "سب سے پہلی چیز جو لوگوں سے اٹھائی جائے گی وہ امانت ہے اور آخری چیز جو باقی رہ جائے گی وہ نماز ہے اور کتنے ہی نمازی ایسے ہیں جن میں کوئی خیر نہیں [۶]۔" اس حدیث کو بھی اسی لئے آپ نے روایت کیا ہے کہ حقوق العباد اور حقوق اللہ میں سے دو اہم چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور نمازوں کو پر اثر بنانے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ لوگوں کو احادیث کی طرف متوجہ کرانے کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کرتے تھے کہ خود ایک خاص ماحول میں عملی اقدام کر کے یہ بتاتے کہ اسوۂ نبوی بھی یہی تھا۔ یہ طریقہ بڑا نفسیاتی اور عملی تھا۔ حضرت ابو الاسود دیلیؒ سے روایت ہے کہ میں مدینے میں آیا اور حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک جنازہ سامنے سے گزرا تو لوگوں نے اس کی تعریف کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "واجب ہو گئی۔" پھر دوسرا جنازہ گزرا لوگوں نے اس کی تعریف کی حضرت عمرؓ نے فرمایا

---

(۱) ۲۰۰۲ ۲ ۲۰۰۲ حنبل ۱ ۳۲۰، نسائی ۸ ۲۶۷ (۲) بخاری ۱ ۲۹۹ حنبل ۱ ۳۰ ۲ (۳) داؤد ۲ ۹۰۹ ٤ (٤) داؤد ۲ ۲۳۱ (۵) نسائی ۶ ۱۱۷ (٦) طبرانی ۱ ۱۳۸

"واجب ہوگئی۔" پھر تیسرا جنازہ نکلا لوگوں نے اس کی برائی کی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: "واجب ہوگئی۔" میں نے پوچھا "اے امیر المومنین! کیا چیز واجب ہوگئی؟" آپ نے جواب دیا: "میں نے اسی طرح کیا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جس مسلمان کیلئے چار آدمیوں نے بھلائی کی گواہی دی لہٰذا اس کو جنت میں لے جائے گا۔" ہم نے عرض کیا کہ اگر تین آدمی گواہی دیں؟ آپ نے فرمایا "تین ہی سہی۔" ہم نے عرض کیا "اگر دو آدمی گواہی دیں؟" آپ نے فرمایا "دو ہی سہی[۱]۔" حضرت عمر فاروقؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا "اے عائشہؓ جن لوگوں نے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور گروہوں میں بٹ گئے وہ بدعتی اور خواہشات نفس کے بندے ہیں ان کیلئے توبہ بھی نہیں ہے۔ میں ان سے بری ہوں اور وہ مجھ سے بری[۲]۔" حضرت عمر فاروقؓ سے مروی روایات میں ایک یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا "رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور ہمیں صدقہ ادا کرنے کا حکم دیا اور مثلہ سے منع فرمایا[۳]۔" یہ روایت بھی آپ ہی سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آزاد عورت سے اس کی اجازت کے بغیر عزل کرنے کی ممانعت فرمائی[۴]۔ اسی طرح یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے کسی چیز پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی قسم کھائی تو اس نے شرک کیا[۵]۔"

۸۔ فیصلے:

احادیث کی روایت اور ترویج واشاعت میں حضرت عمرؓ کے فیصلوں کا بھی اہم کردار ہے کیونکہ آپ کے فیصلوں کا مدار ہی کتاب وسنت پر ہوتا تھا اور اپنے فیصلوں میں جب کسی حدیث کا حوالہ دیتے تھے تو وہ مشہور ومعروف ہو جاتی تھی۔ مثلاً بنی نضیر کے اموال کے سلسلے میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے تنازع میں آپ نے سرور کونین ﷺ کی اس حدیث کو فیصلے کی بنیاد بنایا "لانورث ما ترکنا صدقۃ" (ہماری وراثت تقسیم نہیں ہوتی ہم (انبیاء) جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں صدقہ ہوتا ہے۔) پھر حضور ﷺ کے اسوہ اور طریق کار کی تفصیل بھی بیان فرمائی۔ مالک بن اوس سے روایت ہے کہ دن چڑھ آیا تھا اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قاصد میرے پاس آیا اور کہا کہ امیر المومنینؓ آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں قاصد کے ساتھ ہی چلا گیا اور عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کھجور کی شاخوں سے بنی ہوئی ایک چارپائی پر بیٹھے تھے جس پر کوئی بستر وغیرہ بھی نہیں بچھا تھا اور ایک چمڑے کے تکیے پر ٹیک لگائے ہوئے تھے میں سلام کر کے بیٹھ گیا۔ پھر آپ نے فرمایا "مالک! تمہاری قوم کے کچھ لوگ میرے پاس آئے تھے اور قحط اور فقر وفاقہ کی شکایت کر رہے تھے۔ میں نے ان کیلئے ایک معمولی سے عطیے کا فیصلہ کر لیا ہے تم اسے اپنی نگرانی میں قوم کے درمیان تقسیم کرادو۔" میں نے عرض کیا "یا امیر المومنینؓ! اگر آپ اس کام پر کسی اور کو مامور فرمادیتے تو بہتر تھا" لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے یہی اصرار کیا کہ "نہیں اپنی ہی تحویل میں کام لے لو۔" ابھی میں وہیں حاضر تھا کہ امیر المومنینؓ کے حاجب یرفا آئے اور کہا کہ عثمان بن عفان، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں کیا آپ کی طرف سے اجازت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ہاں! انہیں اندر بلالو۔" آپ کی اجازت پر یہ حضرات بھی اندر تشریف لائے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا "یا امیر المومنینؓ! میرا اور ان کا فیصلہ کر دیجئے۔ ان حضرات کا نزاع اس فئے کے بارے میں تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بنی نضیر کے اموال میں سے (خمس کے طور پر) عنایت فرمائی تھی۔" اس پر حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھ جو صحابہ رضی اللہ عنہم تھے انہوں نے کہا "امیر المومنینؓ! ان دونوں حضرات میں کوئی فیصلہ فرما دیجئے اور معاملہ ختم کر دیجئے۔" عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اچھا! تو ذرا صبر کیجئے میں آپ لوگوں سے

---

(۱) حنبل ۱/۴۴۳ بیہقی ۱/۱۲۴ نسائی ۱/۵۶ (۲) طبری ۲/۲۰۱ (۳) طبری ۱/۲۳۳ (۴) صحیح ۱/۱۰۲ (۵) حنبل ۱/۲۹۸

اس اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔ کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ "ہماری وراثت تقسیم نہیں ہوتی' جو کچھ ہم (انبیاء) چھوڑ کر جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے' جس سے حضور اکرم کی مراد (تمام دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ) خود اپنی ذات بھی تھی؟" ان حضرات نے تصدیق کی کہ آنحضور ﷺ نے یہ حدیث فرمائی تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اب میں آپ لوگوں سے اس مسئلہ پر گفتگو کروں گا (جو یہ التزاع بنا ہوا ہے) یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کیلئے اس فئے کا ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا' جسے آنحضور ﷺ نے بھی کسی دوسرے کو نہیں دیا تھا۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی "ما افاء الله على رسوله منهم"[1] سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "قدیر" تک (جس میں اس تخصیص کا ذکر ہے) اور وہ حصہ آنحضور ﷺ کیلئے خاص رہا۔ خدا گواہ میں نے وہ حصہ کوئی اپنے لئے مخصوص نہیں کر لیا ہے اور نہ میں آپ لوگوں کو نظر انداز کر کے اس حصہ کا تنہا مالک بن گیا ہوں۔ فئے کا مال آنحضور ﷺ خود سب کو عطا فرماتے تھے اور سب میں اس کی تقسیم ہوتی تھی' بس صرف یہ مال اس میں سے باقی رہ گیا تھا اور آنحضور ﷺ اس سے اپنے گھر والوں کو سال بھر کا خرچ دے دیا کرتے تھے اور اگر کچھ تقسیم کے بعد باقی بچ جاتا تو اسے اللہ کے مال کے مصرف میں خرچ کر دیا کرتے تھے (رفاہ عام اور دوسرے دینی مصالح میں) آنحضور ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں اس مال کے معاملے میں یہی طرز عمل رکھا۔ اللہ کا واسطہ دے کر آپ حضرات سے پوچھتا ہوں کیا آپ لوگوں کو یہ بات معلوم ہے؟" سب حضرات نے کہا "ہاں!" پھر عمر رضی اللہ عنہ نے علی اور عباس رضی اللہ عنہما کو خاص طور سے مخاطب کیا اور ان سے پوچھا "میں آپ حضرات سے بھی اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا اس کے متعلق آپ لوگوں کو معلوم ہے؟" دونوں حضرات نے اثبات میں جواب دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اپنے پاس بلا لیا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے (جب ان سے تمام مسلمانوں نے بیعت خلافت کر لی) فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں اور اس لئے انہوں نے (آنحضورؐ کے اس مخصوص) مال پر قبضہ کیا اور جس طرح آنحضور ﷺ اس میں تصرفات کیا کرتے تھے انہوں نے بھی بالکل وہی طرز عمل اختیار کیا۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنے اس طرز عمل میں سچے' مخلص' نیکوکار اور حق کی پیروی کرنے والے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور اب میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نائب مقرر ہوا' میری خلافت کو دو سال ہو گئے ہیں اور میں نے بھی اس مال کو تحویل میں رکھا ہے۔ جو تصرفات رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ اس میں کیا کرتے تھے' میں نے بھی خود کو اسی کا پابند بنایا اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اپنے اس طرز عمل میں سچا' مخلص اور حق کی پیروی کرنے والا ہوں۔ پھر آپ دونوں حضرات میرے پاس مجھ سے گفتگو کرنے آئے تھے اور دونوں حضرات کا معاملہ یکساں ہے۔ جناب عباسؓ! آپ تو اس لئے تشریف لائے تھے کہ آپ کو اپنے بھتیجے (محمد ﷺ) کی میراث کا دعویٰ میرے سامنے پیش کرنا تھا اور آپ (عمر رضی اللہ عنہ) کا خطاب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تھا۔ اس لئے تشریف لائے تھے کہ آپ کو اپنی بیوی (فاطمہ رضی اللہ عنہا) کا دعویٰ پیش کرنا تھا کہ ان کے والد (رسول اللہ ﷺ) کی میراث انہیں ملنی چاہئے۔ میں نے آپ دونوں حضرات سے عرض کر دیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ خود فرما گئے ہیں کہ ہماری میراث تقسیم نہیں ہوتی' جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے' لیکن پھر جب میرے سامنے یہ صورت آئی کہ مال آپ لوگوں کے انتظام میں (ملکیت میں نہیں) منتقل کر دوں تو میں نے آپ لوگوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر آپ لوگ چاہیں تو مال مذکور آپ لوگوں کے انتظام میں منتقل کر سکتا ہوں' لیکن آپ لوگوں کیلئے ضروری ہوگا کہ اللہ کے عہد اور اس کی میثاق پر مضبوطی سے قائم رہیں اور اس مال میں وہی مصارف باقی رکھیں' جو رسول اللہ ﷺ نے متعین کئے تھے اور جن پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اور میں نے' جب سے مسلمانوں کا ولی بنایا گیا عمل کیا۔ آپ لوگوں نے اس پر کہا کہ مال ہمارے انتظام میں دے دیں اور میں نے اسی

---

(۱) سورہ الانفال

ی شرط پر سے آپ لوگوں کے انتظام میں دے دیا۔ اب میں آپ حضرات سے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں میں نے انہیں وہ مال اسی شرط پر دیا تھا ہاں؟" عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ آنے والے حضرات نے کہا کہ "جی ہاں! اسی شرط پر دیا تھا۔" اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ عباس اور علی رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ "میں آپ حضرات سے بھی خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں میں نے آپ لوگوں کو وہ مال اسی شرط پر دیا تھا؟" ان دونوں حضرات نے بھی یہی کہا کہ "جی ہاں! (اسی شرط پر دیا تھا۔) عمر رضی اللہ عنہ نے پھر فرمایا "کیا اب آپ حضرات مجھ سے کوئی اور فیصلہ چاہتے ہیں؟ اس اللہ کی قسم جس کے حکم سے آسمان اور زمین قائم ہیں اس کے سوا میں اس معاملے میں کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کر سکتا اور اگر آپ لوگ اس مال کے (شرط کے مطابق) انتظام پر قادر نہیں تو مجھے واپس کر دیجئے میں خود اس کا انتظام کر لوں گا[۱]۔"

حضرت عمر نے انگلیوں کی دیت کے سلسلے میں فیصلہ کیا کہ انگوٹھا کاٹنے پر پندرہ اونٹ انگشت شہادت کاٹنے پر دس اونٹ درمیانی انگلی کاٹنے پر دس اونٹ اور اس کے برابر والی انگلی کاٹنے پر نو اونٹ اور چھنگلی کاٹنے پر چھ اونٹ لیکن کچھ مدت بعد آپ کو آل حزم کے پاس موجود رسول کریم ﷺ کے ایک خط میں یہ بات لکھی ہوئی ملی کہ سب انگلیوں کی دیت برابر ہے تو آپ نے اسی کو اختیار کیا[۲] اور بعد ازاں ہاتھوں اور پیروں کی کوئی انگلی کاٹنے پر دس اونٹ دیت کا فیصلہ دیا کرتے تھے[۳] اور آپ نے فرمایا "تمام انگلیاں برابر ہیں خواہ چھنگلیا ہو یا انگوٹھا[۴]۔"

ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے مالک بن اوس رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ انہیں سو دینار بھنانے تھے۔ پھر مجھے طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے بلایا اور ہم نے بات چیت کی اور ان سے میرا معاملہ ہو گیا۔ وہ سونے (دینار) کو اپنے ہاتھ میں لے کر الٹنے پلٹنے لگے اور کہنے لگے کہ ذرا میرے خزانچی کو غابہ سے آ لینے دو (تو میں تمہارے یہ دینار بھنا دوں گا) عمر رضی اللہ عنہ بھی ہماری باتیں سن رہے تھے۔ آپ نے فرمایا "جب تک تم ان سے اپنے دینار کے عوض درہم یا اور کوئی چیز جس کا معاملہ ہوا ہو گا لے نہ لو ان سے جدا نہ ہونا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ سونا سونے کے بدلہ میں اگر برابر سرابر نہ ہو تو سود ہو جاتا ہے۔ گیہوں گیہوں کے بدلے میں اگر جیسے کا تیسا نہ ہو تو سود ہو جاتا ہے۔ جو جو کے بدلہ میں اگر برابر نہ ہو تو سود ہو جاتا اور کھجور کھجور کے بدلہ میں اگر برابر سرابر نہ ہو تو سود ہو جاتی ہے[۵]۔"

○ .... حزم و احتیاط:

علم احادیث کے سلسلے میں حضرت عمر فاروقؓ کے کارنامے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے روایت میں انتہائی احتیاط کو ملحوظ رکھا تاکہ رسول اکرم ﷺ کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے اور ساتھ ساتھ شریعت کے اصل مقاصد کی تکمیل ہو اور عملی پہلوؤں کی طرف ہی لوگوں کی توجہ برقرار رہے۔ یہ ایک بصیرت افروز طریق کار تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا عہد ہر طرح کی خرافات اور فکری کجیوں سے محفوظ رہا اور روایت حدیث میں پوری ذمہ داری اور خدا خوفی کا ثبوت دیتے۔ بے جا قیل و قال بے ضرورت اور فرضی باتوں اور محض قصے کہانیوں سے گریز کرتے۔ صرف مستند احادیث ہی کو شہرت ملی اور دین کی بنیاد مضبوط و مستحکم رہی۔ لوگ یہ جانتے تھے کہ آپ اس بارے میں بہت حساس ہیں اور شدت و سختی سے بھی بوقت ضرورت کام لیتے ہیں۔ آپ کا یہ طریقہ بعد والوں کیلئے ایک درخشندہ مثال بنا اور آپ کے دور کی احادیث کو بھی اعتماد کا درجہ ملا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا، "ایاکم والاحادیث الا حدیثا کان فی عهد عمر فان عمر کان یخیف الناس فی الله سمعت رسول الله ﷺ من یرد الله به خیر یفقهه فی الدین[۶]۔"

(روایت حدیث سے بچو سوائے ان احادیث کے جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھیں۔ اسی لئے کہ حضرت عمرؓ لوگوں کو اللہ سے ڈرایا کرتے تھے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔) حضرت عمر فاروقؓ نے احتیاط کا جو طریق اختیار فرمایا اس

---

(۱) صحیح بخاری ۴۲ مسلم ۵/۱۵۲ ترمذی ۳/۸۱ ابو داؤد ۳/۱۹۳ (۲) بیہقی ۸/۹۳ ابن حزم ۱۰/۴۳۷ عبدالرزاق ۹/۳۸۴ (۳) عبدالرزاق ۹/۳۸۴ (۴) عبدالرزاق ۹/۳۸۴ (۵) بخاری ۳/۳۰ (۶) مسلم ۳/۹۵ ابن ۱۰/۵۴۳ ذہبی ۲/۴۲۸۔

کے سات اہم نکات میں

ا۔دین کے بیناتی پہلو پر زور

پہلا کام یہ کیا کہ رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پالیسی کی روح پر سختی سے عمل درآمد کیا اور دین کے بیناتی پہلو پر زور دیا جس کا تعلق عملی زندگی سے تھا جس کو پھیلانا اور اس میں عمومیت کا رنگ پیدا کرنا ضروری تھا جو مقاصد رسالت سے وابستہ تھا۔ دوسرا پہلو جو غیر بیناتی ہے جس کا تعلق محض معلومات سے تھا اس کو پھیلانے سے اجتناب کیا تاکہ وہ شریعت کا لازمی حصہ نہ شمار ہونے لگے اور لوگ دونوں میں امتیاز کریں۔ شاہ ولی اللہ نے بالکل بجا فرمایا ہے "اچھی طرح تلاش و تفتیش سے معلوم ہوا کہ فاروق اعظمؓ کی دقیق نظر حدیث کے دونوں حصوں میں امتیاز پیدا کرنے پر جمی رہی یعنی وہ حصہ جو شرائع کی تبلیغ اور افراد انسانی کی تکمیل سے متعلق تھا۔ اس میں مشغول رکھ کر دوسرے حصے میں انہماک سے لوگوں کو روکتے تھے۔ اسی لئے شمائل نبوی سے متعلق احادیث اور سنن زوائد پر مشتمل احادیث جن کا تعلق رسول اکرم ﷺ کے لباس اور آپ کی عادات سے تھا ان کو کم روایت کرتے تھے کیونکہ ان حدیثوں کا شمار ان علوم میں نہیں ہے جن کا لوگوں کو مکلف بنایا گیا تھا اور عام تشریع و قانون کی حیثیت ان کی نہیں ہے۔ اس سے اس کا احتمال تھا کہ اگر زیادہ توجہ ان کی اشاعت میں کی جائے گی تو سنن زوائد اور سنن ہدیٰ آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے(۱)۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت قرظہؓ کو قلت روایت کی جو تلقین کی تھی امام دارمی اسے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ میرے خیال میں حضرت عمرؓ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایام کی حیثیت سنن اور فرائض کی نہیں(۲)۔ اسلئے گویا اس کے اہتمام کی زیادہ ضرورت انہوں نے محسوس نہ کی۔

۲۔ قلت روایت کا حکم:

حضرت عمر فاروقؓ نے دوسرا اہم کام یہ کیا کہ کثرت روایت سے منع فرمایا اور روایات میں کمی کرنے کا حکم دیا۔ شام کی طرف معلمین کو روانہ کرتے وقت بقول حضرت قرظہؓ بن کعب سے فرمایا "تم ایک ایسے شہر پہنچو گے جس کے باشندوں میں قرآن کی تلاوت اس طرح گونجتی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے تو دیکھنا رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کو بیان کر کے ان لوگوں کو (قرآن کی) مشغولیت سے نہ روک دینا قرآن کو پڑھنے میں خوبی پیدا کرنا اور رسول اکرم ﷺ سے روایت میں کمی کرنا۔ اب جاؤ میں اس معاملے میں تمہارا ساتھی ہوں(۳)۔ ایک اور روایت کے مطابق آپ نے مزید فرمایا "میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا تو اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے(۴)۔" آپ کے اس حکم پر پوری طرح عمل کیا گیا' چنانچہ جب حضرت قرظہؓ اپنے مقررہ مقام پر پہنچے تو لوگوں نے فرمائش کی کہ ہم سے حدیثیں بیان کرو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں ابن خطابؓ نے منع کر دیا ہے(۵)۔

حضرت عمر فاروقؓ کا اپنا عمل بھی اسی کے مطابق تھا اور اس احتیاط پر ہمیشہ کاربند رہے۔ ان کے غلام حضرت اسلمؓ سے روایت ہے کہ ہم جب بھی حضرت عمر فاروقؓ سے کہتے کہ رسول اکرم ﷺ کی حدیث بیان کیجئے' تو جواب دیتے کہ میں ڈرتا ہوں اس بات سے کہ کسی ایک حرف کا اضافہ کروں یا کمی کروں کیونکہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے گا وہ آگ میں جائے گا(۶)۔ ان روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقلیل روایت کے حکم میں آپ کے پیش نظر حسب ذیل امور تھے۔ ایک یہ کہ حدیث کو قرآن پر فوقیت نہ دی جانے لگے اور لوگ اس میں مشغول ہو کر قرآن کے شغف سے محروم نہ ہو جائیں۔ دوسرا یہ لوگ کثرت روایات کی بناپر شعوری یا لاشعوری طور پر روایت میں کمی و بیشی کے مرتکب نہ ہوں کہ اصل حقیقت مختلف الفاظ کی تبدیلیوں میں کھو جائے۔ تیسرا یہ

---

(۱) [illegible] ۲۸۹ (۲) [illegible] (۳) ذھبی [illegible] (۴) منقی [illegible] (۵) حاکم [illegible] ذھبی [illegible] (۶) [illegible] ۲۹۳

کہ عام طور پر لوگ ہر کان پڑی بات کو ادھر ادھر پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ عادت اگر عام ہو جائے تو غلطیوں کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے' لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ روایت حدیث کو مطلقاً مکروہ سمجھتے تو قلت و کثرت دونوں سے روک دیتے[1]۔

۳۔ کتابت حدیث سے اجتناب:

اہل عرب کا حافظہ بہت تیز تھا' انہیں اس پر ناز بھی تھا۔ وہ قلم سے زیادہ حفظ کو ترجیح دیتے تھے اور عام طور پر اہم چیزوں کو قلمبند کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہ ان کے نزدیک پسندیدہ بات نہیں تھی اور رسول اکرم ﷺ نے بھی احادیث کے بارے میں ان کے حافظے پر اعتماد فرمایا اور اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں قرآن و حدیث خلط ملط نہ ہو جائیں' لکھنے سے منع فرمایا البتہ روایت حدیث میں لوگوں کو صدق و سچائی پر قائم رکھنے کیلئے جھوٹ باندھنے والے کو جہنم کے ٹھکانے کا مستحق قرار دیا۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا **"لاتکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحه حدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار[2]۔"** حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے لکھنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے نہ دی[3]۔ کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ حضرت امیر معاویہؓ کے ہاں تشریف لے گئے' تو انہوں نے حدیث کے بارے میں پوچھا اور ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لکھ لے۔ حضرت زیدؓ نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم حدیث میں سے کوئی چیز نہ لکھیں' چنانچہ انہوں نے مٹا دیا[4]۔ ہاں البتہ رسول اکرم ﷺ نے ایسے لوگوں کو احادیث قلمبند کرنے کی اجازت عطا فرمائی جن کا حافظہ تیز نہیں تھا' چنانچہ ایک صحابیؓ نے اپنے حافظے کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو[5]۔"

حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ میں ہر چیز کو لکھ لیا کرتا تھا جو رسول اللہ ﷺ سے سنتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اسے یاد کر لوں۔ قریش نے مجھے اس سے منع کیا اور کہا تم ہر چیز لکھ لیتے ہو' جبکہ رسول اللہ ﷺ ایک انسان ہیں' کبھی رضا سے بات کرتے ہیں' کبھی غضب سے' کہتے ہیں کہ میں سن کر خاموش ہو گیا اور اس کا تذکرہ رسول اکرم ﷺ سے کیا تو آپؐ نے اپنے ہاتھ سے منہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا **"اکتب فوالذی نفسی بیده ماخرج منه الاحق[6]۔"** (لکھو' قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس سے حق کے علاوہ کوئی بات باہر نہیں آتی۔) اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جو خطبہ دیا تھا' حضرت ابو شاہ کے کہنے پر ان کیلئے لکھنے کا حکم دیا[7]۔

حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے اسوہ حسنہ نبویؐ کے یہ دونوں پہلو تھے۔ اس لئے اس بارے میں گومگو کا شکار رہے کہ احادیث کو قلمبند کیا جائے یا نہیں۔ ایک طرف تو حدیث کی تشریعی حیثیت اور ضرورت و اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور یہ اندیشہ رکھتے تھے کہ کہیں عملی زندگی سے متعلق ہدایت کا یہ عظیم ذخیرہ ضائع نہ ہو جائے' کیوں نہ اسے بھی اسی طرح محفوظ کر لیا جائے جیسا کہ قرآن حکیم کو ان کے مشورے سے جمع کیا جا چکا تھا اور دوسری طرف انہیں یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ آنحضور ﷺ نے جس احتیاط کو ملحوظ رکھا تھا کہیں اس سے تجاوز نہ ہو جائے اور قرآن مجید کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائیں یا پھر احادیث کا شغف قرآن کو نظر انداز کرنے کا باعث نہ بن جائے۔ یہ نہایت ہی اہم معاملہ تھا اس لئے انہوں نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ طلب کیا' تو انہوں نے کتابت پر ہی اتفاق کیا' لیکن اس کے باوجود

---

(۱) دارمی، ۱۱۹/۱' منتظر ۳۴۳ (۲) تیر ۲۳/۹' ترمذی ۱۴۷/۶' دارمی ۱۱۹/۱' داود ۳۱۹/۳' ترمذی ۱۴۰/۶ (۳) ترمذی ۱۴۵/۴' تیر ۲۳/۵' دارمی ۱۱۹/۱

(۴) داود ۳۱۹/۳' تیر ۲۲/۹ (۵) ترمذی ۱۴۵/۴' تیر ۱۹/۱' دارمی ۱۲۶/۱ (۶) داود ۳۱۸/۳' حاکم ۱۰۵/۱' تیر ۱۴/۹' دارمی ۱۲۵/۱ (۷) داود ۳۱۹/۳' ترمذی ۱۴۰/۵

حضرت عمرؓ کو طمینان قلب حاصل نہ ہوا خود مسلسل غور و خوض کرتے رہے۔ ایک ماہ تک استخارے بھی کیے' آخر کار اسی نتیجے پر پہنچے کہ انہیں قلمبند نہ کیا جائے۔
حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے' حضرت عمرؓ نے احادیث نبویہ کی کتابت کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے اصحاب رسول ﷺ سے مشورہ دیا تو انہوں نے کہا کہ احادیث نبویہ کی کتابت کرانی چاہیے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ ایک ماہ تک اللہ تعالیٰ سے اس بارے میں استخارہ کرتے رہے۔ ایک دن صبح کو اٹھے اور اس وقت تک حق تعالیٰ نے فیصلے میں یکسوئی عطا فرمادی تھی' تو فرمایا کہ میں نے حدیثوں کو قلمبند کرانے کا ارادہ کیا تھا' لیکن مجھے گزشتہ قوموں کا خیال آیا کہ انہوں نے بھی کتاب لکھی اور پھر اسی پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں' پھر فرمایا "اني لا اشوب كتاب الله بشي ء ابدا[1]۔" (بے شک میں کتاب اللہ کے ساتھ کسی اور چیز کو ملانا پسند نہیں کرتا۔)

مولانا بدر عالم کے بقول اس بیان سے حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں' ایک یہ کہ حضرت عمرؓ جمع حدیث کے خود محرک تھے' دوسرا یہ کہ مشیروں کی رائے بھی جمع کرنے کی طرف تھی۔ تیسرا یہ کہ حدیثوں کو قلمبند نہ کرنے کی وجہ اہل کتاب کی تاریخ تھی' چوتھا یہ کہ لا اشوب کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت سنت کی کتابت کا خیال قائم ہو جاتا' تو شاید کتاب اللہ کے حاشیہ میں لکھا جاتا[2]۔ رسول اکرم ﷺ کو بھی یہی اندیشہ تھا اس لئے ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کو کتابت حدیث سے منع کرتے ہوئے فرمایا "لا كتاب مع كتاب الله[3]۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور میں بھی اسی حکم کو ترجیح دے کر عملی جامہ پہنایا' چنانچہ حضرت عامرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے مصحف (قرآن حکیم) لکھا اور ہر آیت کے نیچے اس کی تفسیر بھی رقم کی۔ حضرت عمرؓ نے اس سے وہ نسخہ طلب فرمایا اور اسے مقراض سے کاٹ دیا[4]۔ حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک تدوین حدیث کا مسئلہ بھی معلوم یہ ہوتا ہے کہ اجتہادی نوعیت کا تھا۔ اسی لئے انہوں نے تمام پہلوؤں پر خوب غور و خوض کیا اور اسی نتیجے تک پہنچے کہ وہ علت ابھی تک موجود ہے' جو خود نبی ﷺ کے پیش نظر تھی اور حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ سرکاری طور پر اس کا اہتمام نہ کیا جائے۔ وہ انسانی عقیدت کی ان کارستانیوں سے اچھی طرح آگاہ تھے' جو بعد کے ادوار میں قدیم اشیاء' شخصیتوں اور تصورات و علامات سے پیدا ہو جانے کے نتیجے میں گمراہی کا سبب بنتی ہیں۔ اسی لئے انہوں نے شجر رضوان کو جڑ سے اکھڑوا دیا[5]۔ حج کے موقع پر مسجد کے ایک کونے میں جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز ادا کی تھی لوگوں کا ہجوم دیکھا تو خطبہ دیا اور فرمایا "تم سے پہلے اہل کتاب بھی انہیں چیزوں سے ہلاک ہوئے انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے آثار اور ان کی نشانیوں کو' پنے نے ذریعہ نجات تصور کیا۔ اگر اس مسجد میں نماز کا وقت ہو جائے تو ضرور ادا کرلی جائے ورنہ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں[6]۔"

اسی طرح انہوں نے حدیث کے معاملے میں بھی یہ محسوس کرلیا کہ ایسا نسخہ جو انہوں نے مرتب کر دیا ہوگا محفوظ رہے گا تو بعد کے لوگوں کے نزدیک تقدس کی علامت اور حجت بن جائے گا۔ لوگ اسے قرآن ہی کی طرح اہمیت دیں گے اور عقیدت و عمل میں قرآن ہی کے ساتھ خلط ملط ہونے کا احتمال باقی رہے گا۔ ابتداء میں تو انہوں نے محض سرکاری طور پر اہتمام کتابت سے گریز کیا' لیکن مزید غور کیا تو اس نتیجے تک پہنچے کہ یہی خطرہ ان نسخوں کے بارے میں موجود ہے جو اگرچہ عمرؓ کی طرف سے تو نہیں' مگر عہد عمرؓ سے متعلق ہوں گے اور ان میں ایسی احادیث بھی ہو سکتی ہیں' جو بیانات میں سے نہ ہوں اور جو تصدیق و توثیق کے مراحل سے بھی نہ گزری ہوں۔ اگرچہ انہوں نے اپنے طور پر بہت احتیاط سے کام لیا تھا' مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ لوگوں نے انفرادی طور پر اس احتیاط کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہو۔ بقول قاسم بن محمد "حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثوں کی بھر کثرت ہو گئی تو انہوں نے لوگوں کو قسمیں دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے سامنے پیش کریں' جب لوگوں نے پیش کر دیا تو آپ نے ان کو جلانے کا حکم دیا۔ اس طرح انہوں نے احادیث کو حافظوں میں محفوظ رکھنے اور انہیں آگے منتقل کرنے کے طریقے کو

---

(۱) بحر ۱ ۲۰۸ (۲) بحر ۱/۲۰۸ (۳) منتخب ۱۰/۲۹۲ (٤) نیسه ۱۰/۵۱۲ (۵) حجۃ اللہ ۱۲۵ (٦) حجۃ اللہ ۱۲۵۔

ہی جاری رہنے دیں۔ اس کے باوجود بھی بہت سی احادیث تحریری شکل میں موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی طرف سے کتابت کی حوصلہ شکنی ضرور کی، جس کے بعد میں خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب تدوین حدیث کا آغاز ہوا تو ابتداء میں احادیث و آثار سب آپس میں مل جل گئے۔ بعد میں کہیں جا کر مدرسیجان کو مگ الگ کیا گیا۔ اگر ابتداء ہی میں خلط ملط ہو جاتے تو نا معلوم بعد میں اس کے کیا کیا منفی اثرات مرتب ہوتے۔

۴۔ کثرت روایت پر سزائیں:

حضرت عمر فاروقؓ یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ رسول اکرم ﷺ سے لوگوں کی عقیدت' احکام دین کی پیروی کے جذبے' علمی ذوق و شوق' تحقیق و تجسس کے فطری رجحانات' عہد نبوی سے بڑھتے ہوئے فاصلے اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضے اور سماجی و تمدنی ضروریات کی بناء پر احادیث و سنت کی طرف لوگوں کا میلان اور انہماک بڑھتا جائے گا۔ صحابہؓ و تابعینؒ میں احادیث کے چرچوں سے بھی وہ اچھی طرح آگاہ تھے اس لئے ان کے نزدیک روایت کی ترغیب و اشاعت سے زیادہ نازک اور زیادہ قابل توجہ معاملہ راویوں کو حدود و قیود کے پابند بنانے کا تھا۔ کثرت روایت کے سلسلے میں انہیں سب سے بڑا اندیشہ یہی تھا کہ ہر سطح کے آدمی تک پہنچنے میں کمی و بیشی بھی ہو سکتی ہے اور اس کے معانی و مطالب کے سمجھنے میں بھی ٹھوکریں کھا سکتے ہیں کیونکہ سب لوگ دینی مسائل کو سمجھنے کی یکساں اہلیت نہیں رکھتے۔ ایک امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لوگ عملی اور احکامی احادیث کے بجائے سنن زوائد ہی میں نہ پڑ جائیں۔ اس لئے حضرت عمرؓ کثرت سے روایت سے صرف منع نہیں کرتے تھے بلکہ ایسے لوگوں پر سختی بھی کرتے تھے۔ دوسری صدی ہجری کے مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ علم الحدیث کے طلبہ کے حلقے میں بیٹھتے تو انہیں خطاب کر کے کہتے کہ اگر ہمیں حضرت عمرؓ اس حالت میں پالیتے تو ضرور سزا دیتے[1]۔

حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ابو سلمہؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابوہریرہؓ سے کہا کہ جس آزادی کے ساتھ آج کل آپ حدیثیں بیان کرتے ہیں کیا حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی ایسا کر سکتے تھے؟ ابوہریرہؓ نے جواب دیا' اگر عمرؓ کے زمانے میں اس طرح حدیثیں بیان کرتا جیسے تم سے بیان کرتا ہوں' تو وہ مجھے اپنے درے سے مارتے[2]۔ ایک اور روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے تین اصحاب حضرت ابن مسعودؓ' حضرت ابو درداءؓ اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ کو محبوس کر دیا اور ان سے فرمایا' تمام رسول اللہ ﷺ سے منسوب کر کے کثرت سے روایت کرتے ہو[3]۔ اگرچہ اس روایت سے بعض محدثین نے کلام کیا ہے اور ابن حزم نے تو اسے جھوٹ کا پلندہ قرار دیا ہے' لیکن مذکورہ تینوں روایتوں کا مرکزی نقطہ ایک ہی ہے کہ صحابہ کرام کثرت روایت پر عام طور پر اس لئے گریز کرتے تھے کہ نہیں حضرت عمرؓ کی سزا کا خوف ہوتا تھا۔ بقول علامہ ذہبی "حضرت عمرؓ اس خوف سے کہ کہیں صحابہ کرامؓ حضور ﷺ سے روایت کرنے میں غلطی نہ کریں ان کو حکم یہ دیتے تھے کہ کم روایت کریں۔ دوسرا خطرہ یہ بھی تھا کہ لوگ حفظ قرآن سے توجہ ہٹا کر ہمہ تن حدیث میں مشغول نہ ہو جائیں[4]۔" معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے یہ سختی بھی دراصل وسیع تر حکمت پر مبنی تھی۔ اس کا مقصد روایات میں اعتدال و احتیاط کو پیدا کرنا تھا۔ روایات کو بالکلیہ منع کرنا نہیں' کیونکہ انہوں نے ایسا کوئی حکم جاری و نافذ نہیں فرمایا تھا کہ پوری سلطنت کے اندر روایت کرنے والوں کو سزا دی جائے۔ اس کا مقصد صرف انتظامی اعتبار سے یہ تاثر پیدا کرنا تھا کہ خوب سوچ سمجھ کر بات نہ کرنے سے سزا بھی مل سکتی ہے۔ سختی کا یہ تاثر دینا ان کی سیاسی و انتظامی حکمت عملی کا ایک اہم جزو تھا۔ مثلاً حابل بن حزام سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ ایک شخص کو پایا اور دونوں کو قتل کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کھلے عام تو یہ حکم دیا کہ اس سے قصاص لو اور خفیہ یہ حکم تھا کہ مقتول کے وارثوں کو دیت دلا دو[5]۔ اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ نے ایسے شخص سے جس کی ہجو کی گئی تھی سب کے سامنے تو یہ کہا کہ ہجو کرنے

---

(۱) متعی ۲۹۱/۱۰ (۲) حاکم ۱۱۰/۱ (۳) ذھبی ۷/۱ (٤) ذھبی ۷/۱ (۵) عبدالرزاق ۲۳۵/۹

والے کی زبان قطع کر دو اور علیحدگی میں یہ کہا کہ میں نے جو کہا تھا کبھی اس پر عمل نہ کرلیا وہ بات میں لوگوں کے سامنے اس لئے کہی تھی تاکہ وہ دوبارہ یہ حرکت نہ کرے[۱]۔

۵۔ روایت بالالفاظ

حضرت عمر فاروقؓ کا روایت حدیث میں احتیاط کی پالیسی کا پانچواں اہم نکتہ یہ تھا کہ آپ یہ چاہتے تھے روایت بالمعنی کے بجائے بعینہٖ وہی الفاظ یاد رکھنا اور انہیں آگے بیان کرنا ضروری ہے جو سرورِ کونین ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہوں۔ راوی کو صرف اتنی بات کرنی چاہئے جتنا کہ اس کے حافظے میں اچھی طرح محفوظ ہو اور وہی روایت کرنی چاہئے جس کے صحیح ہونے پر اسے پورا اطمینان ہو۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے سامنے حدیث بیان کرنے کے بعد فرمایا "من دعاها وعقلها وحفظها فیحدث بها حیث تنتهی به راحلته ومن خشی ان لا یعیها فانی لا احل له ان یکذب علی[۲]"۔ (جس نے اس حدیث کو اچھی طرح حافظے میں جمالیا ہو، سمجھ لیا ہو اور یاد کرلیا ہو اسے چاہئے کہ اس حدیث کو ان مقامات تک بیان کرتا چلا جائے جہاں تک پہنچ کر اس کی سواری رک جائے، مگر جسے اندیشہ ہو کہ وہ اس حدیث کو پوری طرح دل میں نہیں جما سکا میں اس کے لئے جائز نہیں کروں گا کہ وہ میری طرف جھوٹ منسوب کرے۔) قیس بن عبادہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے سنا فرماتے تھے "من سمع حدیثا فاداه کما سمع فقد سلم[۳]"۔ "(جس نے کوئی حدیث سنی اور بالکل ویسا ہی سے آگے ادا کردیا تو وہ سلامتی میں رہا۔) ایک اور مرتبہ ارشاد فرمایا "السنة ماسنه الله ورسول ﷺ لاتجعلوا خطا الرای سنة لسلامه[۴]"۔ حضرت اسلمؒ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک مرتبہ حضرت عمر سے رسول اکرم ﷺ کی حدیث بیان کرنے کی فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا "اخاف ان ازید حرفا او انقص حرفا ان رسول الله ﷺ قال من کذب علی متعمدا فهو فی النار[۵]"۔

---

(۱) ۔۔۔ ص ۲۰۷ (۲) ۔۔ ۲۲۲ (۳) منعی ۲۹۲/۱۰ (٤) ایضا (۵) دارمی ۱۳۲/۱۔

باب ششم

بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے سیاسی مسائل

☆۔پس منظر
☆۔خلافت عمرؓ احادیث نبوی کی روشنی میں
☆۔سیاسی منشور
☆۔سیاسی اجتہادات
☆۔ضابطۂ اخلاق
☆۔سیاسی اصول
☆۔سیاسی استحکام کا فروغ
☆۔قبائلی سیاست کی اصلاح
☆۔یہود و نصاریٰ کی علاقہ بدری
☆۔انتخابی شوریٰ کا تقرر

بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے سیاسی مسائل

○...... پس منظر:

حضرت عمر فاروقؓ نے ۲۲ جمادی والآخر ۱۳ھ کی صبح خلافت کی ذمہ داری سنبھالی[۱] اور ۲۶ ذی الحج ۲۳ھ کی صبح کو دفن کیے گئے[۲]۔ ان کی مدت خلافت بعض روایت کے مطابق ۱۰ سال چھ ماہ اور ۸ دن[۳] اور بعض کے مطابق دس سال پانچ ماہ اور اکیس روز رہی[۴]۔ تقریباً ساڑھے دس سال کا یہ عرصہ صرف تاریخ اسلام ہی میں نہیں بلکہ تاریخ انسانیت میں نہایت بلند اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ انہیں صحیح معنوں میں عہد جدید کی رفاہی و فلاحی ریاست کے تصورات کا نقیب کہا جا سکتا ہے۔ سرور کونین ﷺ نے جس اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تھی اور وحی ربانی اور اسوۂ حسنہ کے ذریعے جس کے خدوخال اصول و ضوابط کا تعین فرمایا تھا ان کے وسیع تر اطلاق کا موقع آپ ہی کے مشیر و وزیر فاروق اعظمؓ کو ملا۔

سرور عالم ﷺ نے مدینہ میں ایک مثالی ریاست قائم کر کے ہدایت و رہنمائی کیلئے ایک عملی نقشہ پیش کر دیا لیکن اپنے تمام تر فیوض و برکات کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وہ بھی تک ایک شہری ریاست تھی کیونکہ آپ کے عہد مبارک میں جزیرۂ نما عرب پر سیاسی غلبہ و برتری حاصل ہو جانے کے باوجود مکمل انتظامی کنٹرول حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ دس سالہ مدنی دور کے ابتدائی پانچ سال تو اس نوزائیدہ ریاست کے دفاع میں صرف ہوئے اور بقیہ پانچ سال فتوحات میں۔ اس طرح آپ کی پوری زندگی جہاد سے عبارت ہے۔ مفتوحہ علاقوں میں آپؐ کے پیش نظر سب سے اہم معاملہ یہ تھا کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دی جائے اور انہیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ اگر کسی قبیلے یا علاقے کا سردار اسلام قبول کر لیتا تھا تو اسے عہدداری پر برقرار رکھا جاتا تھا اور وہاں کے سیاسی نظام میں مداخلت نہیں کی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے رواج و عادات کے مطابق معاملات چلاتے رہیں اور ان کی شخصی آزادی متاثر نہ ہو اور نہ ہی اسلام کے وسیع تر مقاصد کے حصول میں کسی قسم کا رخنہ پیدا ہو۔ لوگوں کی تعلیم و تربیت کیلئے معلمین و مبلغین اور غریبوں کی فلاح و بہبود کیلئے عاملین زکوٰۃ کا تقرر کر دیا جاتا تھا۔ یہی ریاست مدینہ سے وفاداری و وابستگی کی ایک علامت بھی تھی اور حکمت کا بھی یہی تقاضا تھا کہ ایک ایسا خطہ جو کبھی کسی مرکزی نظم کے تابع نہیں رہا اور جس میں سالہا سال کی قبائلی سیاست نے لوگوں کے مزاج و طور کو مخصوص سانچوں میں ڈھال رکھا تھا ان پر کوئی چیز جبر مسلط نہ کی جائے بلکہ تدریجاً انہیں اسلام کی وسعت و وحدت میں جذب کیا جائے۔

رسول کرم ﷺ کی وفات کے بعد اٹھنے والے فتنہ ارتداد نے ایک مرتبہ پھر صورت حال کو نقطہ آغاز تک پہنچا دیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فراست و دانشمندی جرأت و استقامت اور جذبہ جہاد کے ذریعے ایک مرتبہ پھر جزیرۂ عرب کو فتح کیا اور ریاست مدینہ کے سیاسی غلبے کو منوالیا اور بغاوتوں کو ختم کر کے مکمل امن و امان قائم کر دیا لیکن انہیں یہ موقع نہ مل سکا کہ عہد نبوی کے نظم و نسق میں کوئی تبدیلی کریں اور یا انتظامی ڈھانچہ پیش کریں جس کے تحت پورا علاقہ ایک مکمل ریاست بن جائے اور ہر ایک شخص مرکزی حکومت کا وفادار اور اطاعت گزار بن جائے۔ وہ بھی اس پوزیشن میں بھی نہیں تھے کہ ایسا کر سکیں کیونکہ خلافت سے توبہ کے بعد لوگوں کی حالت ابھی نو مسلموں کی سی تھی۔ ان کے قلب و ذہن کی کائنات ابھی اسلام کی روشنی سے پوری طرح منور نہیں ہوئی تھی اور نئے ڈھانچے کی شاید ابھی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ انتظامی امور و معاملات میں اتنی نمایاں تبدیلیاں اور تغیرات رونما نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی سیاسی و سماجی احوال میں ابھی کوئی انقلاب آیا تھا جس سے ایک وسیع تر مستحکم معاشرہ معرض وجود میں آ سکتا۔ اس لئے خلیفہ اول نے بالکل اسی خطوط پر انتظام و انصرام جاری رکھا جس پر نبی ﷺ نے استوار کیا تھا۔ یہاں تک کہ عمال اور امرائے جیش بھی وہی

---

(۱) ابن سعد ۳: ۲۷۴، سیوطی ۱۳۱ (۲) ابن سعد ۳: ۳۶۵ (۳) بلاذری ... (۴) ابن سعد ۳: ۳۶۵۔

برقرار رکھے، جنہیں ہادی برحق ﷺ نے مقرر کیا تھا، سوائے اس کے کہ ان میں سے کسی نے خود معذرت کی ہو اور اگر کسی کو نئی ذمہ داری سونپنے کی ضرورت محسوس کی تو اس سے اجازت لی اور اس کی رضامندی کو سامنے رکھا۔ اس وقت ایک ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی، جو حرف بحرف عہد نبوی ﷺ ہی کی پیروی کرنے والا ہو، جو تقلید و اقتداء کا پیکر ہو، لیکن عین اس موقع پر جب حالات نے کروٹ لی، ضروریات میں وسعت پیدا ہوئی، معاملات میں جدت و نیرنگی نے جنم لیا اور مسائل و مشکلات میں پیچیدگیاں اور الجھنیں ابھرنے لگیں، تو وقت ایک ایسے شخص کی تلاش میں تھا، جو اجتہادی بصیرت کا شاہکار ہو اور جس میں حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہو، تاکہ وہ ٹھوکر نہ کھائے۔ جو امر الٰہی میں سخت بھی ہو اور غیرت و حمیت کا مجسمہ بھی، تاکہ وہ لوگوں کو راہ راست سے بھٹکنے نہ دے۔ مشیت الٰہی نے وقت کی پکار پر لبیک کہا اور فاروق اعظمؓ کو منصب قیادت پر فائز کر دیا۔

○ خلافت عمرؓ احادیث کی روشنی میں:

نبی کریم ﷺ نے آپ کی اہمیت اور کامیاب عہد خلافت کی بہت خوب پیشین گوئی فرمائی تھی۔ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ اپنا خواب بیان فرمایا کہ "میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے کنوئیں پر دیکھا جس پر ایک ڈول پڑا ہوا تھا۔ میں نے کچھ ڈول کھینچے، میرے بعد ابو بکرؓ نے ڈول لیا اور ایک یا دو ڈول کھینچے، مگر ان کے کھینچنے میں کچھ ضعف تھا خدا ان کی مغفرت فرمادیں۔ پھر عمرؓ آئے اور انہوں نے ڈول پکڑا اور اس طرح کھینچا کہ کسی جوانمرد کو میں نے اس طرح کھینچتے نہیں دیکھا، حتیٰ کہ ہر چہار طرف سے پیاسے آئے اور خوب سیراب ہوئے[1]۔" امام نووی تہذیب میں لکھتے ہیں کہ علماء نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ اشارہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی خلافت کی طرف ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں کثرت سے فتوحات اور ظہور اسلام بہت زیادہ ہوگا[2]۔ ابو حاتم کے بقول اس سے خلافت مراد ہے[3]۔

رسول کریم ﷺ فاروق اعظمؓ کی فکری و ذہنی اور جسمانی و انتظامی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں یہ یقین تھا کہ جب لوگوں نے خلافت کی ذمہ داری ان کے سپرد کی تو وہ اس قوت و توانائی کو جو ان کی ذات و فطرت میں موجود ہے۔ احکام خداوندی کے نفاذ میں بھرپور طور پر استعمال کریں گے۔ ارشاد ہوا "وان تولوا عمرؓ تجدوه قويا في نفسه قويا في امر الله[4]۔" (اگر (خلافت کیلئے) عمر کی طرف رخ کرو گے تو انہیں اپنے نفس میں بھی قوی پاؤ گے اور امر الٰہی میں بھی۔) سیاسی حالات ہمیشہ تغیر پذیر رہتے ہیں۔ ان میں ہمیشہ نیرنگی و گہما گہمی موجود رہتی ہے۔ مختلف افراد، خاندان، قبائل اور گروہ اپنے اپنے مزاج و مقاصد کے مطابق سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اس لئے ایک سمجھدار اور کامیاب حکمران وہ ہوتا ہے، جو معاملات پر گہری نظر رکھتا ہو اور جس کا ہاتھ ہر وقت حالات کی نبضوں پر رہے۔ فاروق اعظمؓ کے اندر یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی۔ طارق کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ عمرؓ کیسے آدمی تھے؟ انہوں نے جواب دیا، "وہ ایک ہوشیار پرندے کی مانند تھے، جو ہر جانب یوں نگاہ دوڑائے رکھے، جیسے اس کیلئے ہر قدم پر ایک جال بچھا دیا گیا ہو[5]۔"

سیاسی حالات کے دگرگوں ہونے سے معاشرے میں انتشار و افتراق پیدا ہوتا ہے اور اجتماعی طور پر مختلف فتنے جنم لیتے ہیں۔ بصیرت نبوی ﷺ سے زیادہ جوہر شناس اور کس کی نظر ہو سکتی ہے؟ آپ نے یہ جان لیا کہ جب تک حضرت عمر فاروقؓ جیسا دینی غیرت اور جرأت رکھنے والا شخص موجود ہے، اسلامی معاشرہ فتنوں سے محفوظ رہے گا۔ حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ نبی محترم ﷺ نے فرمایا "میری امت میں فتنوں کا دروازہ اس وقت تک مکمل طور پر بند رہے گا، جب تک

---

(۱) بخاری ۱/۵۲۳ مسلم ۲/۱۱۲ [illegible] (۲) سیوطی ۱/۱۱۹ (۳) [illegible] (۴) حنبل ۲/۵۸ بلاذری ۲/۳۰۲

(۵) جوزی ۱/۱۶۲ (٦) متقی ۱۱/۵۸٤۔

ان میں عمر بن الخطابؓ زندہ ہیں' جب وہ وفات پا گئے تو اس میں فتنے ظہور پذیر ہوں گے (۱)۔" اس حدیث میں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت ہی کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ اس میں کوئی بھی فتنہ رونما نہ ہو سکا' جبکہ باقی تینوں خلفائے راشدین کے زمانے میں فتنے کسی نہ کسی انداز میں ضرور رونما ہوئے۔ ایک اور روایت میں اس کی مزید وضاحت ہمیں ملتی ہے' جس میں نبی محترم ﷺ نے انہیں فتنوں کے آگے رکاوٹ ڈالنے والے بند دروازے سے تشبیہ دی۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے پوچھا کہ فتنوں سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو تم میں سے کس نے یاد رکھا ہے؟ میں نے عرض کی' میں نے' اسی طرح اسے یاد رکھا ہے' جیسے آپؐ نے فرمایا تھا۔ انہوں نے فرمایا "تم رسول اللہ ﷺ سے فتنوں کے بارے میں سوال کرنے میں بڑے جری تھے۔" میں نے جواب دیا "انسان کے گھر والے' مال' اولاد' ہمسائے سب انسان کیلئے فتنہ (یعنی آزمائش کی چیزیں) ہیں اور ان کا کفارہ نماز' روزہ' صدقہ' اچھی باتوں کیلئے لوگوں کو کہنا اور بری باتوں سے روکنا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں نے تم سے اس بارے میں نہیں پوچھا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ اس فتنے سے متعلق بتاؤ جو سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا بڑھے گا" اس پر میں نے کہا "اے امیر المومنین! آپ اس سے خوف نہ کھائیے کیونکہ آپ کے اور اس فتنے کے درمیان ایک بند دروازہ ہے۔" پوچھا "وہ دروازہ توڑ دیا جائے گا یا صرف کھولا جائے گا؟" میں نے کہا "توڑ دیا جائے گا۔" اس پر بولا اٹھے کہ "پھر تو کبھی بند نہیں ہوگا۔" شقیق کہتے ہیں کہ ہم نے حذیفہؓ سے پوچھا کہ کیا عمرؓ اس دروازے سے متعلق علم رکھتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ "ہاں! بالکل اسی طرح جیسے دن کے بعد رات کے آنے کا یقین ہوتا ہے۔" راوی کہتے ہیں "میں نے تم سے ایک ایسی حدیث بیان کی ہے جو قطعاً غلط نہیں ہے۔ ہمیں اس کے متعلق حضرت حذیفہؓ سے پوچھنے میں خوف آتا تھا اس لئے مسروق سے کہا گیا کہ وہ پوچھیں ان کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ "وہ دروازہ خود حضرت عمر فاروقؓ ہی ہیں (۲)۔" حضرت خالد بن ولیدؓ نے بالکل بجا کہا کہ "جب تک ابن خطاب زندہ ہیں فتنے کا دور نہیں آسکتا (۳)۔" فاروق اعظمؓ کا عہد خلافت ہی وہ بابرکت دور ہے جس کی بشارت سرورِ عالم ﷺ نے دی تھی جس میں آپؐ کی بہت سی پیشین گوئیاں پوری ہوئیں۔ جب رسول اللہ ﷺ صدیق اکبرؓ کے ساتھ اہل مکہ سے چھپ کر ہجرت کیلئے نکلے' تو ان کی گرفتاری کی قیمت ایک سو اونٹ مقرر کر دی گئی۔ سراقہ بن مالک تلاش کرتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے (۴)۔ حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ اس موقع پر نبی ﷺ نے سراقہ سے فرمایا تھا "تمہارا کیا حال ہوگا' جب تم کسریٰ کے کنگن' کمر بند اور تاج پہنو گے۔" راوی کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ کے پاس کسریٰ کے کنگن' کمر بند اور تاج آئے تو انہوں نے سراقہ بن مالک کو بلوایا اور یہ چیزیں انہیں پہنا دیں۔ سراقہ کے بڑے بڑے بال تھے' خصوصاً بازوؤں پر بہت بال تھے۔ فاروق اعظمؓ نے انہیں کہا کہ "اپنے ہاتھ اٹھا کر کہو کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے اور سب تعریف اسی اللہ کیلئے ہے جس نے کسریٰ بن ہرمز سے جو یہ کہتا تھا کہ میں لوگوں کا رب ہوں' یہ چیزیں چھین لیں اور انہیں بنی مدلج کے ایک بدو سراقہ کو پہنا دیا (۵)۔"

اس طرح عہد فاروقی میں یہ بشارت نبوی ﷺ حرف بحرف پوری ہوئی۔ اس کی اس لحاظ سے بہت بڑی اہمیت ہے کہ آپؐ نے ایسی حالت میں دی' جبکہ خود اپنے ہی گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیئے گئے' بے سروسامانی اور خانہ بدوشی کے عالم میں' ایک لمبے سفر پر رواں دواں تھے اور ان کی اپنی جان خطرے میں تھی اور دشمنوں کی نظروں سے بچنے کیلئے چھپتے پھر رہے تھے۔ کمزوری و مجبوری کی اس کیفیت میں صرف جزیرۂ عرب ہی کا نہیں' بلکہ عجم کی بہت قدیم' وسیع اور منظم و مستحکم ریاست کے فتح ہونے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ آپ کو یہ یقین تھا کہ کلمہ طیبہ کی سچائی کی قوت اور اس کے علمبرداران کے خلوص وجذبے کی طاقت تمام معبودان

---

(۱) [illegible] ۱ [illegible] ۲۸۰ (۲) بخاری [illegible] ۱۲۳ مسلم ۱ ۸۹ [illegible] ۲۹ [illegible] ۱۵ ۱۵ ترمذی ۲ ۸ ۳ [illegible] ۳ ۲۲۲ (۳) یوسف ۴۸ (۴) بیہقی ۲ ۶

(۵) [illegible] ۲۶۶/۲ بیہقی ۲ ۳۰۰ -

محل کے تخت و تاج کی بساط لپیٹ دے گی اور تمام ظالمانہ نظام شکست سے دوچار ہو کر رہیں گے۔ فاروق اعظم کا عہد خلافت انہیں سچے خوابوں کی عملی تعبیر ہے۔ ایک اور موقع پر آنحضور ﷺ نے امن و خوشحالی کی نوید سنائی اور اسی عہد میں پوری ہوئی۔ حضرت عدی بن حاتم فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک صاحب آئے اور فقر و فاقہ کی شکایت کی پھر دوسرے صاحب آئے اور راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی شکایت کی۔ اس پر آنحضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا "اے عدی! تم نے مقام حیرہ دیکھا ہے؟" میں نے عرض کی "دیکھا تو نہیں ہے البتہ اس کے بارے میں معلومات ضرور ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "اگر تم کچھ دن اور زندہ رہ سکے تو دیکھو گے کہ ایک عورت ہودج میں سفر کرے گی اور (مکہ پہنچ کر) کعبہ کا طواف کرے گی۔ اسے اللہ کے سوا کسی کا بھی خوف نہ ہوگا۔" میں نے اپنے دل میں سوچا کہ پھر قبیلہ طئے کے ان ڈاکوؤں کا کیا ہوگا، جنہوں نے ہر جگہ فساد برپا کر رکھا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے مزید فرمایا "اگر تم کچھ دنوں اور زندہ رہ سکے تو کسریٰ کے خزانوں کو کھولو گے۔" میں حیرت سے بول اٹھا "کسریٰ بن ہرمز؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں! کسریٰ بن ہرمز اور اگر تم کچھ دنوں زندہ رہے تو دیکھو گے کہ ایک شخص ہاتھ میں سونا چاندی بھر کر نکلے گا اسے کسی ایسے آدمی کی تلاش ہوگی، جو اسے قبول کرلے، لیکن اسے ایسا کوئی شخص نہیں ملے گا۔"

اس حدیث کے راوی حضرت عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ہودج میں بیٹھی ہوئی عورت کو تو خود دیکھ لیا کہ حیرہ سے سفر کیلئے نکلی اور آکر کعبہ کا طواف کیا اور اسے اللہ کے سوا کسی (ڈاکو وغیرہ) کا خوف نہیں تھا اور مجاہدین کی اس جماعت میں تو میں شریک تھا جس نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کیے اور تم کچھ دنوں زندہ رہے، تو وہ بھی دیکھ لو گے جو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا ایک شخص اپنے ہاتھ بھر کر نکلے گا[1]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رہبر عالم ﷺ نے ایک ہمہ گیر فکری، اخلاقی، سماجی اور سیاسی و معاشی انقلاب کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اس کے بے شمار مثبت نتائج و فوائد تو آپ ﷺ کی اپنی زندگی میں برآمد ہوگئے اور دنیا نے آپ کی موجودگی میں ان سے استفادہ کیا، لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے وہ محض آپ کی حیات طیبہ ہی تک محدود و مقید انقلاب نہیں تھا، بلکہ اس کے فیوض و برکات نے ابھی اور جلوہ گر ہونا تھا اور اس کے ثمرات نے نوع انسانی کو اپنی وسعت و تکمیل کے ابھی اور مناظر دکھانے تھے۔ الغرض انقلاب اصول و اقدار پر عمل کرتے ہوئے اجتماعی نظام کے تمام شعبوں کی تعمیر و تنظیم اور زندگی کے بہت سے گوشوں کی استواری کے کئی مراحل ابھی باقی تھے، تب ہی جا کر ایسا امن میسر آسکتا تھا جس میں خوف و دہشت نہ ہو۔ ایسی فراخی حاصل ہو سکتی تھی، جس میں فقر و افلاس نہ ہو اور ایسی خوشحالی نصیب ہو سکتی تھی جس میں بڑی بڑی سلطنتوں کے خزانے بادیہ نشینوں کے قدموں کے آگے ڈھیر ہوں۔

حضرت عمر فاروقؓ ایک ایسی ہی اسلامی ریاست کے معمار تھے، جس کی بنیادیں کتاب و سنت پر استوار تھیں۔ جس کے مزاج میں اسلامی روح مکمل طور پر سرایت کیے ہوئے تھی، جس کے تمام شعبوں میں مقصدیت و افادیت بھی تھی اور بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کی رعایت بھی۔ اس کے اہداف میں ان تمام سہانے خوابوں کی عملی تعبیر اور ان تمام بشارتوں کی تکمیل شامل تھی، جن کی طرف سرور کونین ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔ عہد فاروقی ہی میں خاتم الانبیاء ﷺ کی وہ نوید بھی پوری ہوئی کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ چنانچہ حضرت عمرو بن شعیبؒ سے روایت ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے یمن بھیجا، تو وہ چند میں رہے، تا آنکہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں حضرت عمرؓ کے پاس آئے، تو انہوں نے بھی انہیں ان کی پہلی جگہ پہ واپس بھیج دیا۔ پھر حضرت معاذؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس لوگوں کی زکوٰۃ کا ایک تہائی حصہ بھیجا، تو انہوں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں مال جمع کرنے یا جزیہ وصول کرنے کیلئے نہیں بھیجا، بلکہ اس لئے بھیجا ہے کہ تم امیر لوگوں سے وصول کر کے ان کے محتاجوں کو واپس کردو۔" اس پر حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ "میں نے کوئی ایسی چیز آپ کو نہیں بھیجی کہ یہاں مجھے اس کے وصول کرنے والا کوئی مستحق مل رہا ہو۔" پھر اس کے بعد اگلے سال حضرت معاذؓ نے آدھی زکوٰۃ انہیں بھیجی اور دونوں

(۱) [illegible]

میں پہلی جیسی گفتگو کا تبادلہ ہوا اور جب تیسرا سال گزرا تو حضرت معاذؓ نے تمام کی تمام زکوٰۃ ان کے پاس بھیج دی اور جواباً حضرت عمرؓ نے وہی پہلی سی بات کہی تب حضرت معاذؓ نے کہا "ماوجدت احداً یا حذ منی شیئاً"[1]۔ (مجھے یہاں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو مجھ سے کچھ لینے کا مستحق ہو۔) یہ سعادت بھی فاروق اعظمؓ ہی کے حصے میں آئی کہ ان کے عہد مبارک میں آمریت واستبداد کے بت پاش پاش ہو گئے' انسانیت کے سروں پر سالہاسال سے مسند خاندانی بادشاہتوں کے تختے الٹ گئے اور قیصر و کسریٰ کے اقتدار کا سورج ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔ ہادیٔ برحق ﷺ کی وہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی' جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ "جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا' تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں آئے گا اور جب قیصر ہلاک ہو جائے گا' تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں آئے گا۔ قسم ہے اس ذات کی' جس کے قبضے میں میری جان ہے' تم ان دونوں کے خزانوں کو ضرور اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ کرو گے[2]۔"

حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا انعقاد بالکل اسی ترتیب سے ہوا' جس کے اشارے ہمیں احادیث میں ملتے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "آج رات مرد صالح کو (خواب) دکھلایا گیا کہ ابوبکرؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملائے گئے ہیں اور عمرؓ ابوبکرؓ کے ساتھ ملائے گئے ہیں اور عثمانؓ عمرؓ کے ساتھ ملائے گئے ہیں۔" حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب ہم آپؐ کے پاس سے اٹھے' تو ہم نے کہا کہ مرد صالح تو خود رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ جو بعض کا بعض سے ملایا جانا ہے' یہ دراصل اس امر (خلافت و حکومت) کی ذمہ داری و نگرانی کے سلسلے میں ہے' جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے[3]۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں خلافت کی اس ذمہ داری کو ترازو کی صورت میں ایک صحابیؓ نے خواب میں دیکھا۔ حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "تم میں سے جس شخص نے کوئی خواب دیکھا ہو تو اسے بیان کرے۔" ایک صاحب بولے کہ میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو اتری ہے۔ اس میں آپؐ اور ابوبکرؓ تولے گئے' تو آپؐ بھاری نکلے۔ پھر ابوبکرؓ و عمرؓ تولے گئے تو ابوبکرؓ بھاری نکلے۔ پھر عمرؓ و عثمانؓ تولے گئے تو عمرؓ بھاری نکلے پھر وہ ترازو اوپر چلی گئی۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ خواب سننے کے بعد ہم نے آپؐ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار دیکھے[4]۔ یہی حدیث ایک اور واسطے سے بھی مروی ہے' جس میں ہے کہ آنحضور ﷺ کو یہ خواب برا معلوم ہوا' پھر آپؐ نے فرمایا "یہ خلافت تو نبوت کی ہے' پھر اللہ جسے چاہے گا سلطنت دے گا[5]۔" آنحضور ﷺ کی ناگواری کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ذریعے خلافت کا راز افشاء ہو گیا' لیکن آپ نے یہ وضاحت فرما دی۔ یہی وہ دور ہو گا' جس میں خلافت علیٰ منہاج النبوت ہو گی۔ ایک اور حدیث کی رو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور بھی خلافت راشدہ کا حصہ ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے "میری امت میں تیس سال تک خلافت رہے گی' بعد میں ملوکیت آ جائے گی[6]۔"

ترتیب خلافت کی طرف اشارہ اس حدیث میں بھی ملتا ہے' جسے حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے رات (خواب میں) ایک بادل کا ٹکڑا دیکھا' جس میں سے گھی اور شہد ٹپک رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں' کسی نے بہت سا لیا اور کسی نے تھوڑا سا۔ پھر میں نے دیکھا کہ آسمان سے زمین تک ایک رسی لگی ہوئی ہے۔ پھر یا رسول اللہ ﷺ آپ کو دیکھا کہ آپ اسے پکڑ کر اوپر چلے گئے' پھر ایک اور شخص کو دیکھا کہ اس نے اسے پکڑا اور اوپر چلا گیا' پھر ایک اور شخص نے اسے پکڑا اور وہ بھی اوپر چلا گیا' پھر ایک اور شخص نے جب اس رسی کو پکڑا تو وہ ٹوٹ گئی' لیکن پھر مل گئی اور وہ بھی اوپر چلا گیا۔ یہ خواب سن کر حضرت ابوبکرؓ بول اٹھے "میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ ﷺ! آپ مجھے موقع دیجئے کہ میں اس کی تعبیر بیان کروں۔" آپؐ نے فرمایا "اچھا بیان کرو۔" حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا "ابر کا ٹکڑا تو دین اسلام ہے اور اس سے ٹپکنے والا گھی و شہد قرآن ہے' اس کی برکت و حلاوت اور اس کی کار یاد و لینا اور کسی کا کم لینا یہ ہے کہ بعض نے زیادہ قرآن حاصل کیا ہے اور بعض نے کم اور یہ جو رسی آسمان سے زمین تک

(۱) عبید ۵۲۸ (۲) کتاب ۵۳/۷-۱۱ (۳) داؤد ۲۹۰/۴ (۴) ترمذی ۳۶۹/۲ ۔۔ ۲۸۹/۴ (۵) داؤد ۲۹۰/۴ (۶) ترمذی ۳۴۱/۲۔

رہی ہے' تو اس سے مراد وہ حق ہے' جسے آپؐ لئے ہوئے ہیں' پھر اللہ تعالیٰ آپ کو اٹھا لے گا اور اس حق کو ایک اور شخص تھامے گا' پھر ایک اور شخص تھامے گا' پھر وہ منقطع ہو گا لیکن پھر مل جائے گا اور اسے ایک تیسرا شخص حاصل کرے گا اور وہ بھی اٹھ جائے گا۔" پھر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں نے تعبیر ٹھیک کہی یا غلطی کی؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کچھ تو ٹھیک کہا اور کچھ غلطی کی۔" حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا "میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے کیا غلطی کی؟" آپؐ نے فرمایا "قسم مت کھاؤ[۱]۔" ابن عباسؓ اس قصے کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (حضرت ابو بکرؓ کی) غلطی سے باخبر کرتے سے انکار فرمادیا[۲]۔ اس انکار کی بھی یہی حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ لوگ پہلے ہی سے خلافت کے بارے میں حتمی طور پر اپنا خاص ذہن نہ بنائیں' بلکہ فکر و تدبر سے کام لیں' معاملات پر گہری نظر رکھیں اور پوری سوچ بچار و آزادی رائے سے قیادت کا انتخاب کریں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ہادی برحق ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ کو اپنی آزادانہ مرضی سے خلیفہ کے انتخاب کے مواقع ملے' تو انہوں نے فضائل و مناقب کی اسی ترتیب کو سامنے رکھا' جو ارشادات نبوی ﷺ سے ظاہر تھی' کیونکہ نبی محترم ﷺ کے ہاں خلفائے راشدین کے مقام و مرتبے' علمی و عملی قرب و تعلق' مختلف امور میں مشاورت' دینی بصیرت' اسلام کی راہ میں قربانیاں' اعلیٰ صلاحیتیں اور سماجی شرف و عزت سے سب لوگ بخوبی واقف تھے۔ محمد بن حنفیہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے اپنے والد (حضرت علیؓ) سے پوچھا کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد سب سے افضل صحابیؓ کون سے ہیں۔ انہوں نے فرمایا "ابو بکرؓ" میں نے پوچھا ان کے بعد؟ انہوں نے جواب دیا "حضرت عمرؓ۔" پھر مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر پوچھا تو وہ کہہ دیں گے کہ عثمانؓ' اس لئے میں نے عرض کی ان کے بعد تو آپ ہی کا درجہ ہے؟ فرمایا "میں تو مسلمانوں کی جماعت کا ایک فرد ہوں[۳]۔" حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ عہد نبوی ﷺ میں جب ہمیں صحابہ کرامؓ کے درمیان انتخاب کا کہا جاتا تھا' تو ہم سب سے منتخب اور ممتاز ابو بکرؓ کو قرار دیتے تھے' پھر عمرؓ بن الخطاب کو پھر عثمانؓ بن عفان کو[۴]۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ "اے ام المومنین! رسول اللہ ﷺ اگر خلیفہ مقرر کرتے تو کسے کرتے؟" انہوں نے جواب دیا "ابو بکرؓ کو۔" پوچھا گیا ابو بکرؓ کے بعد؟ انہوں نے جواب دیا "عمرؓ کو۔" ان سے پوچھا گیا ان کے بعد؟ جواب دیا "ابو عبیدہؓ بن الجراح کو[۵]۔" اسی طرح ان سے پوچھا گیا کہ مردوں میں آنحضور ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہیں' تو انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ ہی کا نام لیا[۶]۔ صحابہ کرامؓ میں افضلیت کے اعتبار سے حضرت ابو بکرؓ پہلے نمبر پر ہیں اور حضرت عمرؓ دوسرے نمبر پر[۷]۔ امام نووی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس پر اہل سنت کا اجماع ہے[۸]۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ استحقاق خلافت کے اعتبار سے بھی صحابہ کرامؓ نے انہیں اسی درجہ بدرجہ اہل سمجھا اور ذمہ داری سونپی۔ رسول اکرم ﷺ کی وہ پیش گوئی پوری ہو گئی' جو انہوں نے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو مخاطب کر کے کی تھی کہ "میرے بعد تم پر کوئی شخص حکمران نہیں ہو گا[۹]۔"

○ ... سیاسی منشور

حضرت عمر فاروقؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں' تو لوگوں سے مخاطب ہونے کیلئے منبر پر چڑھے اور سب سے پہلے جو کلام کیا وہ یہ تھا کہ تین باتیں ایسی ہیں کہ جب میں انہیں کہوں تو تم لوگ آمین کہو۔

---

(۱) مسند ۲۸۸/۱ (۲) داؤد ۲۸۹/۱ (۳) بخاری ۱۹۰/۱ حنبل ۱۴۷/۲ داؤد ۲۸۷/۱ ماجہ ۳۹/۱ (۴) بخاری ۱۹۱/۱ (۵) شیبہ ۵۷۰/۱۲ مسند ۱۸۱/۳

(۶) [illegible] (۷) تفسیر [illegible] (۸) سیوطی ۵۸۴/۱ (۹) سیوطی ۲۲۲ ۵۲۱۔

☆ اے اللہ! میں ضعیف ہوں' مجھے قوی کر دے۔

☆ اے اللہ! میں سخت ہوں' مجھے نرم کر دے۔

☆ اے اللہ! میں بخیل ہوں' مجھے سخی کر دے[1]۔

گویا ان کے نزدیک ایک کامیاب حکمران میں ان تین صفات کا ہونا ناگزیر تھا' پہلی چیز قوت ہے' اس سے محض جسمانی قوت مراد نہیں ہے' بلکہ وہ تمام قوتیں شامل ہیں جو اقتدار و اختیار کے منصب کا حق ادا کرنے کیلئے ضروری ہیں' مثلاً فکر و تدبر کی قوت' عزم و حوصلے کی قوت' صبر و استقامت کی قوت' بہتر فیصلے کی قوت اور حق و صداقت اور قوانین و ضوابط کو نافذ کرنے کی قوت۔ ایک قوی حکمران وہی ہوتا ہے' جس میں یہ سب قوتیں جمع ہوں۔ حضرت عمرؓ کے اندر یہ سب صلاحیتیں موجود تھیں' انہیں کی وجہ سے وہ "فاروق" کے لقب سے نوازے گئے' لیکن وہ سمجھتے تھے خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کیلئے انہیں زیادہ قوت کی ضرورت ہے' اس لئے وہ اپنے رب کے حضور دست بدعا ہوئے۔ دوسری صفت جس کی انہوں نے دعا کی وہ نرمی ہے' وہ اپنے مزاج کی شدت و سختی سے بھی آگاہ تھے اور لوگوں کے خوف و اعتراض سے بھی۔ انہیں یہ احساس تھا کہ عہد نبوی و عہد صدیقی میں ان کی سختی چل جاتی تھی اور اس سے امور سلطنت کے بگڑنے کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اصل فیصلہ کرنے والے اور حکم دینے والے نہیں تھے' بلکہ مشیر تھے' لیکن اب خلیفہ کی حیثیت سے سختی و نرمی میں توازن کی ضرورت تھی۔ وہ ہر ایسے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے نرمی کی درخواست کر رہے تھے' جس کے سلجھے کیلئے نرمی کی ضرورت ہو۔ اس جملے سے انہوں نے لوگوں کو بھی یہ پیغام دیا کہ وہ پورے صدق دل اور خلوص نیت سے اپنی سختی کو کم کرنے کے خواہاں ہیں۔

تیسری صفت جس کی انہوں نے دعا کی وہ سخاوت ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ایک آدمی کا ذاتی بخل دنیا و آخرت کے اعتبار سے اس کیلئے نقصان دہ ہوتا ہے' مگر پورے معاشرے کو اتنا جلد اور اس قدر وسیع پیمانے پر بحران کا شکار نہیں کرتا' جتنا کہ حکمران کا بخل' حاجت مندوں کی کفالت اور مفلوک الحال لوگوں کی خوشحالی کیلئے ضروری ہے کہ حکمران وسعت و فراخی سے کام لے' سرکاری خزانہ لوگوں کی ملکیت ہے' اس لئے لوگوں ہی کیلئے اس کے دروازے کھول دے۔ اس دعا میں عاجزی بھی ہے اور احساس بھی' استدعا بھی ہے اور عزم بھی' ایک پیغام بھی ہے اور لائحہ عمل بھی۔ انہوں نے یہ واضح کر دیا کہ وہ کسی غرور و گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہیں۔ انہیں اپنی صلاحیتوں سے زیادہ اللہ پر بھروسہ ہے' جس کی توفیق اور تائید و نصرت کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ لوگوں نے ان تمام کلمات پر آمین کہہ دیا' یہ اس بات کا اظہار تھا کہ وہ ان مقدس جذبات و احساسات میں اپنے خلیفہ کے ساتھ ساتھ ہیں۔ اس سے یگانگت کا ماحول پیدا ہو گیا۔ فکر و نظر کے فاصلے مٹ گئے اور دلوں کی دھڑکنیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئیں۔ اس عالم میں خلیفہ دوم نے اپنے پہلے خطبے کا آغاز کیا' جس کے چیدہ چیدہ نکات حسب ذیل ہیں

حضرت عروۃ بن زبیرؓ فرماتے ہیں "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا۔ اللہ کی حمد و ثناء کے بعد آپ نے اللہ بزرگ و برتر کا ذکر کیا۔ نیز روز آخرت کا تذکرہ کیا" پھر آپ نے فرمایا

۱۔ "اے لوگو! میں تمہارا خلیفہ مقرر ہوا ہوں' اگر یہ توقع نہ ہوتی کہ میں تمہارے لئے بہترین اور سب سے زیادہ طاقتور ثابت ہوں گا اور میں تمہارے اہم کاموں کو سرانجام دینے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہوں' تو میں اس ذمہ داری کو قبول نہ کرتا[2]۔" قاسم بن محمد کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا "اگر میں سمجھتا کہ اس بار خلافت کو اٹھانے کی طاقت و اہلیت مجھ سے زیادہ کسی اور شخص میں ہے' تو میں یہ ذمہ داری اسی کو سونپ دیتا اور مجھے اپنی گردن کٹا دیا جانا اس سے زیادہ محبوب ہوتا کہ اس کی اطاعت نہ کی جائے[3]۔"

۲۔ پھر فرمایا "عمر (میرے لئے) کیلئے یہ تشویشناک مہم کافی ہے کہ وہ اس بات کا انتظار کرے کہ وہ تمہارے حقوق کی کیسی حفاظت کرتا ہے اور تمہارے ساتھ

---

(۱) ۔۔۔ سیوطی ص ۱۲۴ (۲) طبری ۴/۲۱۴ (۳) جوزی ص ۵۵

کیا سلوک کرتا ہے۔ اہم کام میں صرف اپنے پروردگار ہی سے مدد طلب کی جا سکتی ہے کیونکہ عمر کو اپنی قوت و تدبیر پر کوئی اعتماد نہیں ہے جب تک اللہ بزرگ و برتر کی مدد، تائید اور رحمت اس کے شامل حال نہ ہو۔"

۳۔ آگے فرمایا "اللہ بزرگ و برتر نے مجھ پر تمہارے کاموں کو انجام دینے کی ذمہ داری سونپی ہے۔ اس لئے میں اللہ ہی سے اس مقصد کی تکمیل کیلئے امداد کا خواہاں ہوں، تاکہ وہ اس کام کی تکمیل میں بھی میری ویسی ہی حفاظت کرے، جیسی اس نے دوسرے کاموں میں میری حفاظت اور مدد فرمائی ہے۔ وہی اپنے احکام کے مطابق مجھے تمہارے مال میںت کی تقسیم میں عدل و انصاف کی توفیق عطا فرمائے گا کیونکہ میں بہت ہی کمزور مسلمان بندہ ہوں، اللہ ہی میری مدد کر سکتا ہے۔"

۴۔ "خلافت کا اہم منصب ان شاء اللہ میرے اخلاق و عادات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرے گا کیونکہ عظمت اور برتری صرف اللہ و بزرگ و برتر کو حاصل ہے۔ اللہ کے بندوں کو اس میں سے کوئی حصہ حاصل نہیں ہے۔ اس لئے تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ خلیفہ بننے کے بعد عمر تبدیل ہو گیا ہے۔"

۵۔ "میں بذات خود حق و صداقت کو سمجھوں گا اور اس کیلئے پیش قدمی کروں گا اور اپنا معاملہ تمہارے سامنے پیش کروں گا، تاہم جس کسی کو کوئی ضرورت درپیش ہو یا کسی پر ظلم ہوا ہو یا ہمارے برخلاف اسے کوئی شکایت ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے سکتا ہے کیونکہ میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں۔ اس لئے تم ظاہر و باطن اور اپنی عزت و آبرو کے تحفظ کے وقت ہر حالت میں اللہ سے ڈرتے رہو۔"

۶۔ "تم بذات خود حق و صداقت کو قائم رکھو اور کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہ کرے اور پھر میرے پاس تم اپنے مقدمات لاؤ۔ اس وقت میں کسی کے ساتھ (بے جا) رعایت نہیں کروں گا۔ مجھے تمہاری بھلائی عزیز ہے اور تمہاری شکایت کو دور کرنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔"

۷۔ "تمہارے عوام اللہ کے شہروں میں آباد ہیں اور کچھ شہر ایسے ہیں جہاں کوئی زراعت نہیں ہوتی ہے اور نہ کوئی پیداوار ہے، سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ مہیا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت سی نعمتوں کا وعدہ کیا ہے۔"

۸۔ میں اپنی امانت (خلافت) اور اپنے فرائض کا ذمہ دار ہوں اور ان شاء اللہ اپنے فرائض اور کاموں کو بذات خود انجام دوں گا، اسے کسی کے سپرد نہیں کروں گا۔ اس کے علاوہ دیگر امور کو بھی مخلص اور خیر خواہ لوگوں کے سپرد کروں گا اور ان شاء اللہ ان لوگوں کے علاوہ اور کسی کے سپرد اپنی امانت نہیں کروں گا[1]۔"

حضرت حسن سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ کی حمد و ثناء کی، پھر کہا کہ اما بعد، میں تمہارے شامل حال کر دیا گیا اور تم میرے شامل حال کر دیئے گئے۔ میں اپنے دونوں صاحبوں کے بعد تم میں خلیفہ ہو گیا۔ جو شخص ہمارے سامنے ہو گا ہم خود ہی اس کا کام کریں گے اور جب ہم سے دور ہو گا تو ہم اہل قوت و امانت کو والی بنائیں گے۔"

۹۔ آخر میں ارشاد فرمایا "جو اچھائی کرے گا، ہم اس کے ساتھ اچھائی کریں گے اور جو برائی کرے گا ہم اسے سزا دیں گے اور اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت کرے[2]۔"

فاروق اعظم کا یہ خطبہ آپ کی بصیرت و فراست کا شاہکار ہے۔ اس میں آپ نے نہایت اہم امور کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی اور اپنے سیاسی لائحہ عمل کا اعلان کیا، تاکہ انہیں آپ کے ہدف کا بھی علم ہو اور طریق کار کا بھی۔ پہلی اہم بات جو آپ نے فرمائی، وہ آپ کی خود اعتمادی کا مظہر ہے۔ آپ نے یہ واضح کیا کہ اس کے باوجود آپ کو اس منصب کی کوئی طلب و خواہش نہیں تھی مگر جب یہ ذمہ داری سپرد کر دی گئی ہے تو میں اس کا پوری طرح اہل ہوں۔ یہ گویا اس بات کا اعلان

(۱) [illegible]

تھا کہ آپ اپنے عمل سے قوت و اہلیت ثابت کریں گے۔ اس لئے لوگوں کو امور خلافت کے بارے میں فکر مند اور مایوس ہونے کے بجائے اطاعت و تعاون کرنا چاہیے۔ یہاں آپ نے بے جا انکساری کے بجائے پورے اعتماد کا مظاہرہ کیا' تاکہ لوگوں میں بھی اعتماد پیدا ہو اور وہ گومگو کی کیفیت سے نکل کر پوری یکسوئی سے میدان عمل میں اتریں اور نئے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے مستعد ہو جائیں۔

دوسری اہم بات انہوں نے یہ کہی کہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت و نگرانی ان کا سب سے بڑا مشن ہے۔ اسے وہ بیرونی محرک سے نہیں 'بلکہ اپنے اندرونی جذبے سے ہی پورا کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہیں صرف اور صرف اللہ ہی کی تائید و رحمت پر اعتماد تھا' جس کے بغیر ان کی قوت و تدبیر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ تیسری اہم بات انہوں نے یہ کہی کہ خلافت کا یہ بار اللہ کی امانت ہے' انہیں امید ہے کہ پہلے کی طرح اب اس کٹھن مرحلے پر بھی حفاظت و تائید فرمائے گا۔ عیست کی تقسیم اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنا اس کی توفیق کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ چوتھی بات یہ کہی کہ منصب خلافت انہیں غرور و تکبر میں مبتلا نہیں کرے گا اور نہ ہی وہ عام چلتے پھرتے انسان کی سطح سے اپنے آپ کو بلند کر کے "بڑے آدمی" بن جائیں گے 'بلکہ اپنے اخلاق و عادات اور اطوار و معاملات میں اسی طرح ممتاز رہیں گے۔

پانچویں بات یہ کہی کہ ان کے نزدیک اصل سربلندی حق و صداقت کو حاصل ہے' ان کی بہت بڑی ذمہ داری ہی یہ ہوگی کہ حق کو سمجھیں' اس تک پہنچیں' اگر ظلم و زیادتی ان سے بھی ہوگی 'تو اس کا ازالہ کریں اور اس کا بدلہ دینے کیلئے تیار ہوں گے۔ وہ عام انسان سے زیادہ کوئی اضافی رعایت حاصل کرنے کے روادار نہیں ہوں گے۔ چھٹے نمبر پر انہوں نے لوگوں کو بھی یہ احساس دلایا کہ حق و صداقت کی پیروی اور انصاف پر عمل کرنا صرف حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے' بلکہ انہیں خود ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہئے۔ معاشرے کی اصلاح تب ہی ہو سکتی ہے کہ حکومت کا کام تو قانون کی بالادستی قائم کرنا ہے' جس میں کسی امیر و غریب اور چھوٹے بڑے اور حاکم و محکوم کی تمیز نہ ہو' تاکہ ہر کسی کی جائز شکایت دور ہو جائے۔ ساتویں بات یہ کہی کہ عوام کی فلاح و بہبود اور رفاہ عامہ ان کی ترجیحات میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوں گی۔ زمینوں کی آبادکاری کے مواقع پیدا کرنا ان کا فرض ہے۔ جب وہ یہ اقدام کریں گے 'تو اللہ کی نعمتوں کے وعدے ایک محسوس حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ آٹھویں بات یہ تھی کہ لوگوں کے سارے کاموں کو ذاتی دلچسپی اور توجہ سے پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ یہی ان کا فریضہ ہے' بصورت دیگر خیر خواہ اور ذی قوت و امانت والیوں کا تقرر کر دیں گے اور ان کے کاموں کے سلسلے میں خود بھی جوابدہ ہوں گے۔ آخری بات یہ کہی کہ سماجی حیثیت اور مقام و مرتبے کا اعتبار اچھائیوں اور نیکیوں پر ہوگا اور برائی کرنے والے اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔ قانون کی گرفت سے کوئی بچ کر نہیں جائے گا۔

○ سیاسی اجتہادات:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اجتہادی بصیرت زندگی کے تمام شعبہ جات کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو نکھارنے اور ان کے اندر پوشیدہ حکمت و مصالح کے حصول کیلئے نئی راہیں اختیار کرنے اور ان کی تنفیذ کیلئے نئے طریقے تلاش کرنے کا باعث بنی۔ انہوں نے جو سیاسی لائحہ عمل اختیار کیا اور حکمرانی کے جن اصولوں کو پیش نظر رکھا' وہ سب کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں' لیکن ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب و سنت کی روح کو جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے پورے سیاسی نظام میں جاری و ساری کر دیا اور ہر اصول کو ایک مکمل عملی ضابطے کی شکل دے دی۔ ان کی سیاسی دلچسپیاں اور سوجھ بوجھ تو عہد جاہلیت ہی سے مسلمہ تھی' جب وہ عین جوانی کے دنوں میں سفارت کے منصب پر فائز تھے' لیکن ان کی سیاسی بصیرت کی تربیت خود سرور کونین ﷺ نے فرمائی۔ اپنا خصوصی مشیر

بنایا اور ہر طرح کے سیاسی معاملات میں اپنے ساتھ رکھا۔ انہیں رائے دینے اور استدلال فراہم کرنے کا بھرپور موقع دیا۔ انکی رائے کو وزن بھی دیا اور برعکس پالیسی کی صورت میں اعتماد میں بھی لیا اور مطمئن بھی کیا۔ نبی محترم ﷺ ان کے اجتہادی جوہر سے اچھی طرح باخبر تھے' ان کی آراء عام لوگوں سے اکثر مختلف ہوتی تھیں۔ آنحضور ﷺ ان کی قدر و قیمت کو جانتے تھے' اس لئے بطور خاص انہیں اپنے زیر تربیت رکھا' تاکہ آنے والے وقتوں میں اسلام کیلئے تقویت' مسلمانوں کیلئے رحمت و وسعت اور عالم انسانیت کیلئے رہنمائی و ہدایت کا باعث بنیں۔ عہد صدیقی میں ان کی سیاسی فہم و فراست کو مزید جلا ملی اور ان کے عہد خلافت میں وہ تمام نتائج و ثمرات ظہور پذیر ہوئے' جن کی خاطر مشیت ایزدی نے ان کی اجتہادی فکر کی پچاس سال تک آبیاری کی تھی۔ ان کا پورا عہد بے شمار سیاسی اجتہادات اور تابندہ سیاسی لائحہ عمل کا شاہکار تھا۔

۱۔ خالد بن ولیدؓ کی معزولی:

حضرت عمر فاروقؓ نے منصب خلافت سنبھالنے کے بعد ابتدائی دنوں میں کام کئے' ان میں سب سے پہلا بڑا اقدام یہ تھا کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کو سپہ سالاری سے ہٹا کر حضرت ابو عبیدہؓ کے ماتحت کر دیا۔ اسی وجہ سے حضرت ابو عبیدہؓ امیر الامراء کے لقب سے مشہور ہوئے[۱]۔ حضرت خالدؓ کیلئے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی کی ماتحتی میں آئے[۲]۔ حضرت عمرؓ کا یہ اقدام سیاسی اعتبار سے نہایت جرأت مندانہ تھا اور اس لحاظ سے غیر معمولی بھی کہ حضرت خالدؓ عہد جاہلیت ہی سے بہت عظیم سپہ سالاروں میں شمار ہوتے تھے۔ غزوہ احد میں مسلمانوں کو بھاری نقصان پہنچانے میں انہیں کی تدبیر کا دخل تھا۔ عہد رسالت و عہد صدیقی میں بھی وہ سپہ سالار رہے۔ انہوں نے کسی معرکے میں بھی شکست نہیں کھائی تھی[۳]۔ تمام مسلمانوں کے دلوں میں ان کے بارے میں عزت و احترام کے گہرے جذبات پائے جاتے تھے۔ ان کی برطرفی حضرت عمرؓ کا سب سے پہلا سیاسی و انتظامی اجتہاد تھا۔ انہوں نے اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنا دیا کہ کسی منصب پر کسی کی تقرری اور معزولی خالصتاً انتظامی معاملہ ہے۔ اس بارے میں خلیفہ وقت کو مکمل صوابدیدی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ یہ فیصلہ کر کے انہوں نے گویا یہ اعلان کر دیا کہ وہ اپنے اختیارات کا بھرپور طور پر استعمال کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ جن امور کو درست سمجھتے ہیں' انہیں لازمی طور پر نافذ کر کے دم لیں گے اور اس سلسلے میں کسی خوف و خطر کی پرواہ نہیں کریں گے۔ یہ اقدام کرتے وقت انہوں نے فرمایا "اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ مجھے کوئی بات سمجھائے' جس کے بارے میں ابو بکرؓ کو تو کہوں لیکن اسے خود نافذ نہ کر سکوں[۴]۔"

فاروق اعظمؓ نے بہر حال اپنی سوچی سمجھی رائے کو نافذ کر کے دکھا دیا۔ یہ ان کی شخصیت اور رعب و دبدبے کا کمال تھا کہ اس سے کوئی بڑا انتظامی مسئلہ پیدا نہ ہو سکا۔ بقول شاہ ولی اللہ یہ امر بھی حضرت عمر فاروقؓ کی سیاست میں داخل ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ جیسے سپہ سالار اور فاتح کو ان کی چند لغزشوں پر معزول کر دیا اور وہ چون و چرا نہ کر سکے[۵]۔ یہ واقعہ سیاسی و انتظامی معاملات میں فاروق اعظمؓ کے منفرد نظریات کا عکاس ہے۔ اس سے ان کے اجتہادی طرز فکر کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ حالات و وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ایک نئی حکمت عملی کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور خلیفہ ہوتا تو شاید اتنا بڑا اقدام اور وہ بھی آغاز خلافت میں' ہرگز نہ اٹھاتا' لیکن حضرت عمرؓ اپنے نظریات میں مخلص بھی تھے اور پختہ بھی۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے بے پناہ قوت ارادی سے نواز تھا۔ انہوں نے سالہا سال کے غور و خوض' ادیان عالم اور مروجہ طرز ہائے حکومت کے جائزے' اسلام کے گہرے مطالعے' مشاورت و وزارت کے تجربے اور نبی محترم ﷺ و صدیق اکبرؓ کے درخشندہ اسوے سے اپنے ذہن میں ایک مثالی اسلامی ریاست کا جو نقشہ مرتب کیا تھا اس کو عملی حقیقت میں بدلنے کا یہ

---

(۱) یعقوبی [illegible] صدیقی [illegible] خلدون [illegible] کثیر [illegible] (۲) [illegible] (۳) کثیر [illegible] (۴) کثیر [illegible] (۵) شبلی [illegible]

بہترین موقع تھا۔ ان کیلئے ضروری تھا کہ جس طرح کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں اسی طرح کی بنیاد استوار کریں' انہوں نے ایسا ہی کیا۔ یہ ایک فطری بات تھی کہ روایت سے ہٹ کر اٹھائے گئے اس قدم پر تنقید ہوتی۔ اس کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا جاتا کہیں دبے لفظوں میں اور کہیں کھل کر۔ چنانچہ جب شام کے دورے پر تشریف لے گئے تو جابیہ میں عین خطبے کے دوران ابو عمر بن حفص بن مغیرہ نے مجمع عام میں کھل کر تنقید کی اور یہاں تک کہہ دیا "اے عمرؓ آپ نے معذرت نہیں کی' بلکہ اس امیر کو معزول کیا' جسے رسول اللہ ﷺ نے مقرر کیا تھا اور اس جھنڈے کو گرایا ہے' جسے انہوں نے سربلند کیا تھا اور اس تلوار کو نیام میں ڈالا ہے' جسے اللہ نے نکالا تھا۔ آپ نے قطع رحمی کی ہے اور ماموں زاد بھائی سے حسد کیا ہے[1]۔"

حضرت عمرؓ نے جو آزادیٔ فکر و رائے کے بہت بڑے علمبردار تھے' ان تمام کڑوی کسیلی باتوں کو انتہائی خندہ پیشانی اور صبر و تحمل سے سنا۔ برا منانے کے بجائے مختصر سا جواب دیا کہ "تم خالدؓ کے قریبی رشتے دار اور نوعمر ہو' اس لئے تمہیں اپنے ابن عم کے بارے میں غصہ ہے[2]۔" یہ کہہ کر دوسرے امور کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کے اس اقدام کے حق و مخالفت میں مورخین نے اپنے اپنے خیالات کے مطابق بہت کچھ لکھا ہے' لیکن سیدھی سی بات یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا' اس کا انہیں حق حاصل تھا۔ یہ شرعی نہیں' بلکہ انتظامی مسئلہ تھا' ان کیلئے یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک ایسے شخص کو سپہ سالاری کے منصب پر برقرار رکھیں' جن پر وہ اعتماد نہیں کرتے' جن کی لغزشوں کی بنا پر عہد صدیقی میں انہیں معزول کرنے' قید کرنے اور سنگسار کرنے تک کا وہ مشورہ دے چکے ہوں' ان کا خاطر خواہ ازالہ ہوئے بغیر وہ کیسے انہیں اس منصب پر برداشت کر سکتے تھے؟ البتہ خلافت پر فائز ہونے کے بعد ان کے رویے میں وہ پہلی سی شدت نہیں تھی۔ فوج سے مکمل طور پر انہیں برطرف نہ کیا' بلکہ بدستور وہ فوجی کے طور پر فتوحات شام میں اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے' حتیٰ کہ دو سال بعد انہیں قنسرین کا گورنر بنا دیا[3]۔ لیکن باہمی اعتماد زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ انہوں نے کچھ اور ایسی غلطیاں کیں' جو حضرت عمرؓ کی سیاسی پالیسی کے مطابق کسی صورت میں بھی قابل معافی نہیں تھیں' اس لئے انہیں ۱۷ھ میں مکمل طور پر معزول کر دیا اور فرمایا کہ "اب کبھی وہ میرے کسی کام کے حاکم نہیں بنیں گے[4]۔" اگر ہم نتائج کے اعتبار سے حضرت عمرؓ کے اس قدام کا تجزیہ کریں' تو دیکھتے ہیں کہ اس سے کوئی نقصان تو نہیں ہوا' البتہ بے شمار ایسے فوائد حاصل ہوئے' جو سیاسی اور انتظامی دور پر ان کے بعض مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ مثلاً یہ کہ اس فیصلے سے آغاز خلافت ہی میں حکومت کے معاملات پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی' ان کی جرأت فیصلہ اور قوت نافذہ کا رعب طاری ہو گیا۔ ہر عام و خاص نے جان لیا کہ ان کی سیاست مداہنت سے پاک ہوگی اور ملامت سے بے نیاز۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر ہر صورت میں لبیک کہیں گے اور حسب سابق انہیں کوئی مجبوری و مصلحت اپنی شوری رائے کو عملی جامہ پہنانے میں رکاوٹ نہیں بن سکے گی۔

دوسرا یہ کہ معاملات حکومت میں ان کے نزدیک قرابت و رشتہ داری کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس بنا پر نہ تو کسی کو خصوصی رعایت دی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس کی لغزشوں سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ وہ خودی کی قیادت و سیاست کو مستحکم کرنے کیلئے نہیں آئے' بلکہ اسلامی اصولوں کی بالادستی ان کا مقصد اول ہے۔ اس اقدام سے انہوں نے خاندان و برادری اور قبیلہ و قوم کے جاہلانہ تصورات پر شدید ضرب لگائی اور ایسے تمام لوگوں کو حیران کر دیا' جن کی سوچ ابھی تک محدود دائروں میں مقید تھی۔ تیسرا یہ کہ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ ان کی آئندہ انتظامی حکمت عملی سخت احتساب پر مبنی ہوگی۔ اس کا آغاز انہوں نے عوام سے نہیں' بلکہ اکابرین و عمال سے کیا' جو اصلاح معاشرہ کی کلید ثابت ہوا۔ لوگوں نے یہ سوچا کہ اتنے معروف و مشہور سپہ سالار کو جس کی مہارت کا ڈنکا شرق و غرب میں بج رہا ہے اگر معاف نہیں کیا جاتا' تو پھر ہماری کیا حیثیت ہے۔ اس تاثر نے فتنہ و انتشار کے دروازے بند کر دیئے اور سیاسی استحکام و امن کی راہیں کھول دیں۔ چوتھا یہ کہ اسلام میں

(۱) کثیر ۷/۱۱۵ (۲) کثیر ۷/۱۱۵ (۳) طبری ۳/۲۰۲ (۴) کثیر ۷/۱۸

قانونی مساوات کا تصور مزید اجاگر ہو گیا۔ فاروق اعظمؓ کا یہ فیصلہ لوگوں تک یہ پیغام پہنچانے کیلئے کافی تھا کہ قانون کی نگاہ میں امیر و غریب' آقا و غلام' حاکم و محکوم' کبیر و صغیر اور اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہیں۔ بعد میں انہوں نے اس پالیسی کو اور آگے بڑھایا۔ پانچواں یہ کہ اس اقدام سے تاریخ اسلام میں اطاعت امر کی ایک نہایت درخشندہ مثال قائم ہو گئی اور امر و اطاعت کی حدود کے نئے گوشے سامنے آئے۔ حضرت خالدؓ نے کسی منفی رد عمل کا مظاہرہ نہ کیا اور یہ فیصلہ بخوشی قبول کرتے ہوئے فرمایا "سمعا و طاعة لامیر المومنین"[۱]۔" اس طرح ان کی عظمت و احترام میں مزید اضافہ ہوا اور لوگوں میں بھی یہ جذبہ اطاعت پیدا ہوا اور معاشرہ بہترین نظم و ضبط کا نمونہ بن گیا۔ چھٹا فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں کے ایمان و عقیدے میں مضبوطی پیدا ہوئی۔ حضرت عمرؓ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پر فتح و نصرت کو حضرت خالدؓ کی مہارت و فراست سے منسلک نہ کر دیا جائے کہ اللہ پر یقین کمزور پڑ جائے اور وہ بھی غرور میں مبتلا ہو جائیں۔ ان کے نزدیک یہ بات اتنی قابل توجہ تھی کہ ایک مرتبہ فرمایا کہ "میں خالد بن ولیدؓ اور مثنیٰ بن شیبان کو ضرور بضرور معزول کروں گا' تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے صرف ان دونوں کی نہیں[۲]۔" لوگوں کو شخصیت پرستی اور فتنہ عقیدت سے بچانے کیلئے وہ اس قدر حساس تھے کہ جب روم فتح ہوا اور اس کی اطلاع ان تک پہنچی تو سجدے میں گر گئے اور فرمایا کہ "سب تعریف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے' جس نے ابو عبیدہؓ کو فتح دی" اور اگر فتح نہ ہوتی' تو کہنے والا کہتا کہ 'کاش! خالد بن ولیدؓ ہوتے'[۳]۔" ساتواں یہ کہ فاروق اعظمؓ کے اس فیصلے سے فرد کے اوپر ادارے کی فوقیت قائم ہو گئی۔ افراد آتے جاتے رہتے ہیں' لیکن ادارے قائم رہتے ہیں۔ ادارے اگر مضبوط ہوں تو افراد کی تبدیلی سے کوئی بڑا تغیر رونما نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی بہت بڑا خلا پیدا ہوتا ہے۔ صرف ایک ہی شخصیت کے گرد گھومنے والے ادارے فرد کے خاتمے کے ساتھ ہی زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔ بہت سے باصلاحیت افراد کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے صحیح مواقع نہیں مل سکتے' جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیگر افراد میں خود اعتمادی اور تجربے کی کمی رہتی ہے اور متبادل قیادت سامنے نہیں آسکتی۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ اداروں کے استحکام کی طرف پہلا قدم ثابت ہوا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے چھوٹے بڑے فوائد گنوائے جاسکتے ہیں' یہ محض ظنی و قیاسی نہیں ہیں' بلکہ بعد میں عہد فاروقی کے اقدامات ان کے فلسفہ سیاست کے ان تمام پہلوؤں کو نمایاں کرتے گئے' جن کی علامات اس پہلے اقدام سے مترشح ہو رہی ہیں۔

۲۔ لقب امیر المؤمنین :

ان کا ایک سیاسی اجتہاد یہ تھا کہ انہوں نے اپنے لئے "امیر المومنین" کا لقب پسند فرمایا اور اسے خطوط و فرامین' خطبات و تخاطب اور سرکاری و نجی تمام محافل میں استعمال کیا۔ یہاں تک کہ ہر مسلم و غیر مسلم' مرد و عورت اور پیر و جواں کی زبان پر چڑھ گیا۔ اس لفظ میں اختصار کے ساتھ ساتھ مرکزیت' مقصدیت' تشخص اور تقدس ہے۔ اس لقب میں مومنین کا لفظ الفت' محبت اور اخوت کے ہمہ گیر رشتے کی علامت ہے اور تمام لوگوں کو ہر قسم کی جھوٹی اور منفی بنیادوں کے بجائے نظریے و عقیدے "ایمان" کے بامقصد' لافانی اور عظیم تعلق میں پرو دیتا ہے۔ ان کا امیر گویا انہیں میں سے ایک شخص ہے' جو ان تمام رشتوں کا نمائندہ ہے' جو انہیں کے اعتقاد و تعاون کی تصویر ہے' پھر امیر کے لفظ میں ایک کشش اور عوامیت ہے۔ یہ لفظ اقتدار و حاکمیت کے بجائے عوام کی شراکت و مشاورت کو نمایاں کرتا ہے اور حاکم و محکوم کی تفریق کو مٹا دیتا ہے۔ یہ لفظ امت وحدت کے عالمگیر تصور کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ ایک مومن خواہ کسی خطے میں رہ رہا ہو' اس کا ایک قلبی اور فکری تعلق اسی کے ساتھ ہوگا' جو مومنوں کا امیر ہے۔ وہ اس کی عقیدت و وفاداری کا سیاسی محور ہوگا۔ یہ لقب کب' کیوں اور کیسے اختیار کیا گیا؟ اس بارے میں متعدد روایت ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ابو بکر سلیمان بن ابی حثمہ سے سوال کیا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں از طرف خلیفہ

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible]

رسول اللہ ﷺ لکھا جاتا تھا پھر شروع خلافت حضرت عمرؓ میں از طرف خلیفہ ابو بکرؓ لکھا جانے لگا، پھر کیا وجہ ہوئی اور وہ کون شخص تھا جس نے سب سے اول امیر المومنین لکھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھ سے شفاء نے جو مہاجرات میں ایک خاتون ہیں اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ از طرف خلیفہ رسول اللہ ﷺ لکھا کرتے تھے۔ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے از طرف خلیفہ رسول اللہ ﷺ لکھنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ حاکم عراق کو لکھا کہ تم ہمارے پاس دو دانا اور ہوشیار آدمیوں کو بھیج دو تاکہ ہم ان سے عراق اور اہل عراق کے متعلق کچھ دریافت کریں۔ حاکم عراق نے آپ کے پاس لبید بن ربیعہ اور عدی بن حاتم کو بھیج دیا۔ جس وقت یہ دونوں مدینہ شریف میں آئے تو مسجد میں پہنچ کر سب سے پہلے عمرو بن عاصؓ سے ملاقات کی اور ان سے یہ کہا کہ امیر المومنین کی خدمت میں ہمیں باریاب کر دیجئے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے کہا "واللہ! تم نے ان کا بہت اچھا لقب رکھا۔" یہ کہہ کر آپ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا "السلام علیک یا امیر المومنین!" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تمہیں یہ کہاں سے معلوم ہوا؟" تو انہوں نے آپ کو تمام قصہ سنایا اور کہا کہ "واقعی آپ امیر ہیں اور ہم مومنین۔" پس اس روز سے یہ کاغذات سرکاری میں بھی لکھا جانے لگا[1]۔

ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ یہ نام سب سے پہلے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے دیا۔ آپ ایک الگ جگہ تشریف فرما تھے کہ وہ داخل ہوئے اور کہا "السلام علیک یا امیر المومنین!" حضرت عمرؓ نے فرمایا "جو بات تم نے کہی ہے اس کی وجہ سے گناہ میں پڑ جاؤ گے۔" انہوں نے جواب دیا "کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟" فرمایا "ہاں!" انہوں نے عرض کیا "کیا آپ ہمارے امیر نہیں ہیں؟" فرمایا "ہاں![2]" ایک اور روایت کے مطابق یہ نام سب سے پہلے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے برسر منبر پکارا۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے انہیں ایک خط کے ذریعے اس لقب سے مخاطب کیا۔ اس کا آغاز اس طرح کیا "لعبد اللہ عمر امیر المومنین من ابو موسیٰ اشعری۔" جب ان کے سامنے اس خط کو پڑھا گیا تو فرمایا "میں اللہ کا بندہ عمرؓ ہوں اور امیر المومنین ہوں۔ ساری تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جو دونوں جہانوں کا رب ہے[3]۔" ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس لقب سے سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے پکارا[4]۔ ایک اور کے مطابق وہ خود ہی اس لقب کے موجد ہیں، اس کا پس منظر یوں بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو مسلمان آپ کو اس طرح پکارتے تھے "اے خلیفہ رسول اللہ کے خلیفہ!" آپ نے فرمایا "اس طرح خطاب بہت طویل ہو جائے گا۔ تم مومنین ہو اور میں تمہارا امیر ہوں۔" اس طرح آپ کا لقب امیر المومنین ہو گیا[5]۔

ان روایات کے اختلاف کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ راویوں نے جس کی زبان سے سب سے پہلے یہ لقب سنا اسی کو اس کا موجد سمجھے۔ اس طرح ساری روایات تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ البتہ سند کے اعتبار سے پہلی روایت زیادہ قوی ہے کیونکہ اس میں راویوں کا نام اور سلسلہ مرقوم ہے۔ اسے بیان کرنے والی حضرت شفاء رضی اللہ عنہا ہیں جو نہایت جلیل القدر اور بزرگ صحابیہ ہیں اور اول مہاجرین میں سے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ان سے گہرا قلبی لگاؤ تھا جب سوق آتے تو انہیں ضرور ملتے تھے۔ علاوہ ازیں گواہوں میں حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے اہم صحابی کا نام بھی شامل ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس نام کو سرکاری طور پر استعمال کرنے اور مستقل طور پر اپنانے کیلئے اپنا معروف شورائی طریق کار اختیار کیا اور مسلمانوں کو بھی شریک مشورہ کیا۔ اس کا اندازہ ابن سعد کی اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے۔ لوگوں نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی اور ابو بکر صدیقؓ خلیفہ بنائے گئے تو انہیں خلیفہ رسول اللہ ﷺ کہا جاتا تھا۔

(۱) [illegible] سیوطی ۱۳۸ (۲) یعقوبی [illegible] مسعودی ۲: ۳۱۳ [illegible] (۳) [illegible] ۱۸۷ مسعودی ۲: ۳۱۳ (٤) [illegible] (۵) بلاذری [illegible] سیوطی ۱۳۸۔

ابو بکر رحمۃ اللہ کی وفات کے بعد عمرؓ بن الخطاب خلیفہ بنائے گئے تو انہیں خلیفہ خلیفہ رسول اللہ ﷺ کہا گیا۔ مسلمانوں نے کہا کہ عمرؓ کے بعد جو شخص آئے گا اسے خلیفہ خلیفہ خلیفہ رسول علیہ السلام کہا جائے گا تو یہ طویل ہو جائے گا۔ تم لوگ کسی ایسے نام پر اتفاق کر لو جس سے اپنے خلیفہ کو پکارو اور جس سے بعد کے خلفاء بھی پکارے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ کے بعض اصحاب نے کہا کہ ہم مومن ہیں اور عمرؓ ہمارے امیر ہیں' لہٰذا عمرؓ امیر المومنین پکارے گئے' وہ پہلے شخص ہیں جن کا یہ نام رکھا گیا(۱)۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ بعض صحابہ کرام کا جب حضرت عمرؓ کو امیر المومنین کے لقب سے مخاطب کرنے پر اتفاق ہو گیا' تو لوگوں نے اسے بہت پسند کیا' سے بہتر جانا اور اسی نام سے پکارنے لگے(۲)۔ اس لقب کے جلد مقبول عام ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ اس سے پہلے ہی سے مانوس تھے کیونکہ عام طور پر مختلف وفود کے قائدین کو امیر ہی کا نام دیا جاتا تھا' جو امارت ہی کے کاموں میں سے ایک کام ہوتا تھا۔ عہد جاہلیت میں بھی لوگوں نے یہ لفظ استعمال کیا تھا اور نبی کریم ﷺ کو امیر مکہ اور امیر حجاز کا نام دیا گیا۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ نے لشکر قادسیہ کی امارت کی بنا پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو بھی امیر المومنین کے نام سے پکارا تھا(۳)۔ حضرت عمر فاروقؓ کیلئے اس لقب کے استعمال ہونے کا آغاز ۱۸ھ میں ہوا(۴) جبکہ وہ اپنی خلافت کے پانچ سال گزار چکے تھے۔

۳۔ سن ہجری کا آغاز:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک اور اجتہادی کارنامہ سن ہجری کا آغاز ہے۔ دفتری ریکارڈ کی ترتیب و حفاظت' سرکاری فیصلوں کے اجراء اور منصوبوں کی تنفیذ' روزمرہ کے معاملات کے تعین' ماضی کے امور و واقعات کی یادداشت اور دیگر بے شمار حکمتوں اور ضرورتوں کا یہ تقاضا تھا کہ تاریخ کو رواج دیا جائے۔ متعدد واقعات نے آپ کو اس طرف متوجہ کیا۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے آپ کو ایک چٹھی لکھی اور اس میں اپنی مشکل کا یوں ذکر کیا "ہمارے پاس امیر المومنین کے مراسلات آتے ہیں' جن پر تاریخ درج نہیں ہوتی لہٰذا ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ ہم کس پر عمل کریں۔ ایک اور روایت کے مطابق انہوں نے لکھا کہ آپ سے قبل ہمارے پاس کچھ خطوط آئے' جن پر تاریخ درج نہیں تھی لہٰذا تاریخ مقرر فرما دیجئے(۵)۔" ایک اور واقعہ یہ پیش آیا کہ آپ کے پاس یمن کا ایک شخص (گورنر) آیا اور عرض کیا کہ میں نے اہل یمن کے ہاں تاریخ کا رواج دیکھا کہ وہ دن' ماہ اور سال درج کرتے ہیں' آپ نے فرمایا "یہ تو بہت اچھی بات ہے' پس تاریخ ڈالا کرو(۶)۔"

تیسرا واقعہ جو حتمی طور پر تاریخ کے تعین کا سبب بنا اور جس نے اس کی ضرورت و اہمیت کے احساس اور اس بارے میں آپ کی سوچ بچار کو عملی اقدام پر مجبور کر دیا' وہ یہ تھا کہ آپ کی خدمت میں ایک شخص کا تحریری معاہدہ پیش کیا گیا' جو دوسرے شخص کے قرض سے متعلق تھا' جس کی ادائیگی کا وقت شعبان میں آتا تھا۔ آپ نے فرمایا "یہ کونسا شعبان ہے؟ وہ جو گزر گیا یا جو اس سال کا ہے یا وہ جو آگے آنے والا ہے؟" پھر آپ نے تمام مہاجرین وانصار کو مشورے کیلئے جمع فرمایا(۷)۔ ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھنے کے بعد فرمایا کہ لوگوں کیلئے ایسی چیز وضع کیجئے' جس سے وہ اپنے قرضوں وغیرہ کی ادائیگی کے وقت کو پہچان لیں(۸)۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ بھی فرمایا کہ "دولت کی کثرت ہو گئی ہے' ہم جو کچھ تقسیم کرتے ہیں اس پر کوئی زمانہ درج نہیں ہوتا تو اسے کیسے ضبط تحریر میں لایا جائے(۹)۔"

ایک شخص نے عرض کیا "رومی تاریخ ڈالا کیجئے۔" کسی نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اس تاریخ کا حساب تو بہت دور تک جاتا ہے کیونکہ وہ لوگ تو ذوالقرنین کے وقت سے حساب لگاتے ہیں۔ ایک اور رائے یہ تھی کہ اہل فارس کی تقویم اختیار کی جائے' مگر اس میں بڑا عیب یہ تھا کہ یہ ہر نئے حکمران کے ساتھ بدل جایا کرتی تھی اور نیا بادشاہ عہد ما قبل کو پس پشت ڈال دیتا تھا(۱۰)۔ خوب بحث و تمحیص کے بعد دیگر ساری تقویمیں مختلف نقائص کی بنا پر رد کر دی گئیں اور لوگوں

---

(۱) سعد ۳: ۲۸۱ (۲) خلدون ۱:۱ [illegible] (۳) خلدون [illegible] (۴) یعقوبی ۲ [illegible] (۵) [illegible] ۲: ۱۵ (۶) [illegible] ۳ (۷) یعقوبی ۲: ۱۴۵ طبری ۴: ۳۹

جوزی ۵۷ (۸) کثیر ۷: ۷۱ جوزی ۵۷ (۹) مسعودی ۲۶۹ (۱۰) جوزی ۵۷' کثیر ۷: ۷۴۔

کی توجہ عہد رسالت مآب ﷺ پر مرکوز ہو گئی اور ہر کسی نے اسی سے متعلق رائے دینا شروع کر دی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ تاریخ کا آغاز نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت سے کیا جائے۔ کچھ اور لوگوں کی رائے تھی کہ آپ کی بعثت کو بنیاد بنایا جائے۔ بعض اور لوگوں کا مشورہ یہ تھا کہ آپؐ کے اخراج مکہ سے شروع کی جائے۔ بعض کے خیال کے مطابق آپ کی وفات کے دن سے آغاز کرنا زیادہ مناسب تھا[۱]۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کا آغاز اس سال سے کیا جائے 'جب نبی ﷺ نے سرزمین شرک کو چھوڑا تھا اور ہجرت فرمائی تھی[۲]۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ساری آراء میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا' اسے شرف قبولیت عطا کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ "ہم تو بس اسی تاریخ سے آغاز کریں گے۔" جب آپؐ نے ہجرت فرمائی تھی کیونکہ آپ کی ہجرت حق و باطل کا فرق کرنے والی ہے' چنانچہ سب لوگوں نے اسی پر اتفاق کر لیا[۳]۔

تاریخ لکھنے کے سلسلے میں سال کا تعین تو ہو گیا' مگر ابھی دن اور مہینے کا تقرر باقی تھا۔ چنانچہ آپ نے اس سلسلے میں بھی مجمع سے مشورہ فرمایا اور ہر کسی کو رائے دینے کا موقع فراہم کیا۔ مکہ سے ہجرت چونکہ ربیع الاول میں ہوئی تھی' اس لئے آپ نے لوگوں سے دریافت فرمایا "ہمیں کس ماہ سے اپنے سال کا آغاز کرنا چاہئے کہ وہ ہمیشہ ہمارے سال کا آغاز ٹھہرے؟" بعض لوگوں نے کہا کہ رجب کو پہلا مہینہ قرار دیا جائے کیونکہ دور جاہلیت میں اس کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ بعض نے کہا ابتدا رمضان سے ہونی چاہئے' بعض نے کہا ذوالحج سے کیونکہ اس ماہ حج ہوتا ہے۔ بعض اصحاب نے مکہ سے ہجرت کے مہینے کی طرف اشارہ کیا اور بعض نے فتح مکہ کی طرف۔ حضرت عثمانؓ نے مشورہ دیا کہ ماہ محرم سے آغاز کریں کیونکہ یہ حرمت کا مہینہ ہے اور اسی سے دیگر مہینوں کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سال کا بھی اول ہے اور اسی مہینے میں لوگ حج سے واپس لوٹتے ہیں' چنانچہ سارے لوگوں نے اسی رائے پر بھی اتفاق کر لیا[٤]۔ یہ ربیع الاول ۱٦ ہجری کا واقعہ ہے جبکہ ان کی خلافت کے اڑھائی سال پورے ہو چکے تھے۔ وہ کیونکہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہیں تاریخ کے آغاز کا شرف حاصل ہوا ہے' اس لئے اس فیصلے کو ان کی اولیات میں شامل کیا جاتا ہے[٥]۔ اسلامی سن تقویم کا یہ اجراء اگرچہ اپنے دامن میں ان گنت فوائد و ثمرات لئے ہوئے ہے' مگر سیاسی اعتبار سے اس کے اثرات بہت وسیع گہرے اور دور رس ہیں۔ اس سے پوری اسلامی تاریخ ذہن میں تروتازہ ہو جاتی ہے۔ ہجرت مسلمانوں کی مظلومیت و قربانیوں اور سیاسی غلبہ و اقتدار کے درمیان پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا نام آتے ہی انسان کی توجہ اس عالمگیر نظام مواخات کی طرف مبذول ہو جاتی ہے' جس نے ہر طرح کی نفرتیں مٹا کر صرف عقیدے اور نظریے کی بنیاد پر لوگوں کو وحدت و محبت اور ہمدردی و تعاون کے لازوال رشتوں میں پرو دیا۔ ہجرت ایک ہمہ گیر عالمی فلاحی ریاست کی تاسیس و تعمیر کے واقعے کو اجاگر کرتی ہے' جس سے عالم انسانیت کو پہلی مرتبہ تحریری دستور میسر آیا اور بنیادی حقوق کا چارٹر ملا۔ ہجرت' اسلام کی نصرت و کامرانی اور عزت و سربلندی کی علامت ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسے اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ قرار دے کر پوری دنیا کو یہ پیغام دیا کہ اس کی نجات اسلام کے سائبان امن و سلامتی کے نیچے پناہ لینے میں ہے اور خاص طور پر ایسے موقع پر اس کا آغاز کیا' جب قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج اور محلات و ایوان اسلامی فوجوں کے قدموں کی خاک بن رہے تھے۔ یہ شاندار سن تقویم رومی' ایرانی اور عربی سنین سے زیادہ روشن' جدید اور کامیاب ثابت ہوا اور ہر طرف اسلامی عظمت و تشخص کا پھریرا لہرانا شروع ہو گیا۔

---

(۱) کثیر ۷/۳: ۷۱' متقی ۱۰/۳۱۰ (۲) یعقوبی ۲/۱٤۵' طبری ٤/٣٩' کثیر ٤/۷۱' جوزی ٤: ۵۷ (۳) متقی ۱۰/۳۱۰ (٤) متقی ۱۰/۳۱۱ (۵) سعد [illegible] طبری [illegible] کثیر ۷/۱۳۳' سیوطی: ۱۳۸۔

۵ ۔۔ ضابطۂ اخلاق

ا۔ ذاتی اصلاح

سیاسی معاملات بڑے متنوع اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ یہ ہمہ وقت تغیر پذیر رہتے ہیں اور ان میں اس قدر وسعت اور گہرائی ہوتی ہے کہ آدمی ان میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ ہر معاملہ کئی پہلو رکھتا ہے اور مثبت و منفی بے شمار ثمرات و نتائج کے امکانات کا حامل ہوتا ہے۔ اکثر اوقات فوری، بڑے اور دور رس اقدامات کا متقاضی ہوتا ہے۔ انہیں سمجھنے اور حل کرنے کیلئے بے شمار راستے اور انداز ہو سکتے ہیں۔ قدم قدم پر دوراہوں سے واسطہ پیش آتا ہے۔ مختلف قومیں، قبائل، علاقے، گروہ اپنے اپنے مقاصد کیلئے اپنے اپنے انداز میں سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ ان سب کے جذبات و حساسات کا خیال رکھتے ہوئے ہمہ گیر مقاصد و مصالح کے حصول کیلئے ہموار راستہ تلاش کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ ان حالات میں اپنے تشخص کو برقرار رکھنا، اصولوں اور ضابطوں کا پابند رہنا اور اپنی شخصیت و عزت و شہرت کو داغدار ہونے سے بچانا بہت مشکل ہوتا ہے، خاص طور پر طاقت، اختیارات اور وسائل بھی موجود ہوں اور پھر مسائل کا بھی عالم یہ ہو کہ اندرونی طور پر وسیع و عریض رقبے کے امن و استحکام کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہو اور بیرونی طور پر وقت کی دو سپر طاقتوں کے ساتھ نبرد آزمائی جاری ہو اور مرکزی کنٹرول سے چلنے والی اسلامی فوجیں قیصر و کسریٰ کے ایوانوں پر دستک دے رہی ہوں۔ ان تمام حالات میں صرف وہی شخص دنیوی اور اخروی اعتبار سے سرخرو ہو کر آگے بڑھ سکتا ہے، جس کا عقیدہ و نظریہ نہایت ہی راسخ اور سیرت و کردار نہایت مضبوط ہو۔ جو بے پناہ قوت ارادی کا حامل ہو، جس کو سب سے پہلے اپنی ذات اور اپنے نفس پر مکمل غلبہ حاصل ہو اور وہ کسی خوف و ملامت کی پروا نہ کرے۔

فاروق اعظمؓ ایسی ہی شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے سنت نبوی ﷺ پر عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنی ذات کو بطور نمونہ پیش کیا۔ ان کی سیاسی کامیابیوں کا سب سے بڑا راز اپنی ذات کی اصلاح میں پنہاں تھا۔ انہوں نے اپنے ذاتی کردار کے ذریعے عوام الناس کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور اہل قوت و ثروت کو سرنگوں کیا، یہی ان کا سب سے پہلا سیاسی اصول بھی تھی۔ عظیم مورخ مسعودی نے بالکل بجا کہا ہے کہ "آپ حد درجہ متواضع تھے۔ موٹا لباس پہنتے تھے، اللہ کے معاملے میں شدت اختیار کرتے تھے۔ آپ کے تمام عمال و گورنر جملہ افعال و اخلاق میں آپ کی پیروی کرتے تھے اور ہر کوئی حاضری کو غیابت میں آپ ہی کی طرح دکھائی دیتا تھا[1]۔" حکمران کی ذاتی اصلاح و کردار ان کے نزدیک پورے ماحول اور معاشرے کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ خود اگر درست ہو تو لوگ بھی درست ہو جاتے ہیں، وہ اگر بگڑ جائے تو تمام لوگ بگڑ جاتے ہیں۔ ان کے اس نظریے کی جھلک ہمیں اس روایت میں ملتی ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "رعایا امام کے حقوق ادا کرتی رہتی ہے، جب تک امام اللہ کے حقوق ادا کرتا رہتا ہے۔ جب امام عیش کرنے لگتا ہے، تو وہ بھی عیش کرنے لگتے ہیں[2]۔"

تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ مسعود بن مخرمۃ کہتے ہیں کہ "ہم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ لگے رہتے تھے، تاکہ تقویٰ سیکھیں[3]۔" حضرت عمرؓ خورد و نوش کی اشیاء کے بارے میں تحقیق کیا کرتے تھے کہ یہ کہاں سے آئی ہیں، مبادا کہ کسی اور کا حق کھائیں۔ خاص طور پر مسلمانوں کے اموال کے سلسلے میں بڑے حساس تھے۔ زید بن اسلمؓ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ دودھ پیا، تو بہت بھلا معلوم ہوا، پوچھا "یہ کہاں سے آیا ہے؟" جو لایا تھا وہ بولا کہ "میں فلاں پانی کے

---

(۱) مسعودی، ۲/۳۱۳ (۲) شیبہ ۱۳/۲۶۵، سعد ۳/۲۹۲ (۳) سعد ۳/۲۹۸، جوزی ص ۱۵۸

کے گھاٹ پر گیا' جہاں زکوٰۃ کے جانور پانی پی رہے تھے۔ لوگوں نے ان کا دودھ نچوڑ کر مجھے دے دیا' جو میں نے اپنی مشک میں رکھ لیا۔ یہ وہی تھا جو آپ نے پیا ہے۔" حضرت عمرؓ نے یہ سن کر چناہاتھ منہ میں ڈالا اور قے کر دی [1]۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ایک اونٹ خریدا اور سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا۔ جب وہ پل کر تیار ہوا' تو اسے لے کر مدینے آگیا۔ اتفاق سے اسے دیکھ کر پوچھا کہ "یہ اونٹ کس کا ہے؟" بتایا گیا کہ عبداللہؓ کا ہے۔ فرمایا "خوب خوب امیرالمومنین کے بیٹے کا۔" میں نے یہ طنزیہ کلام سنا تو دوڑتا ہوا آیا اور عرض کیا "امیرالمومنین کیا ہوا؟" پوچھا "یہ کیسا اونٹ ہے؟" میں نے جواب دیا کہ "میں نے اسے عام مسلمانوں کی طرح سرکاری چراگاہ میں بھجوا دیا تھا۔" فرمایا "مگر وہاں یہ ہوا ہو گا کہ اسے دیکھنا یہ امیرالمومنین کے صاحبزادے کا اونٹ ہے۔ اسے پانی پلانا کہ یہ ابن امیرالمومنین کا اونٹ ہے۔" پھر فرمایا "اے عبداللہؓ اس کی اصل قیمت رکھ لو اور منافع بیت المال میں جمع کرا دو [2]۔" ایک مرتبہ ان کی بیوی حضرت عاتکہؓ نے بیت المال کی مشک تولی اور بعد میں انگلیوں پر لگی ہوئی مشک کو دوپٹے سے پونچھ لیا' تو حضرت عمرؓ جب آئے' تو اسے پہلے پانی سے دھویا' پھر بھی کچھ خوشبو رہ گئی' تو مٹی سے دوپٹے کو رگڑ دیا [3]۔ آپ فرمایا کرتے تھے "اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا غضب سے مغلوب نہیں ہوتا' متقی انسان اپنی خواہشات کی پیروی نہیں کرتا۔ اگر یوم قیامت (کا خوف) نہ ہوتا' تو حالات اس طرح نہ ہوتے' جیسے تم دیکھتے ہو [4]۔"

ان کے نزدیک تقویٰ غیرت' خودداری اور بے نیازی کا متقضی ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا "متقی و پرہیزگار آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی دنیا پرست کے آگے سرنگوں ہو [5]۔" وہ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ تقویٰ فرائض کی ادائیگی سے بڑھ کر ایک چیز ہے' جو زندگی کے ہر معاملے اطاعت رب کا جذبہ بیدار کر دیتی ہے اور تمام اعمال کا محرک بن جاتی ہے۔ ایسے ہی لوگ صحیح معنوں میں فضیلت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے لوگوں سے پوچھا "سب سے افضل و برتر لوگ کون ہوتے ہیں؟" لوگ بولے "نماز ادا کرنے والے۔" فرمایا "نمازیوں میں تو نیک و بد سب ہی لوگ ہوتے ہیں۔" لوگوں نے کہا "روزہ رکھنے والے۔" فرمایا "ان میں بھی ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔" لوگوں نے کہا "اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے۔" فرمایا "ان کا بھی یہی معاملہ ہے۔" پھر فرمایا "ہاں اگر دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا خوف و تقویٰ ہو' تو پھر ہی آدمی اللہ کی اطاعت کا پورا پورا حق ادا کر سکتا ہے [6]۔"

ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کہ "گناہ کی رغبت رکھنے والا شخص بہتر ہے' جو اس پر عمل نہ کرے یا پھر وہ شخص جسے سرے سے رغبت ہی نہ ہو؟" فرمایا "وہ لوگ جنہیں معصیت کی طرف رغبت تو ہوتی ہے' لیکن اس کا ارتکاب نہیں کرتے [7]۔" پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی "اولئك الذين امتحن الله قلوبهم للتقوى لهم مغفرة واجر عظيم [8]۔" ان کا خیال تھا کہ تقویٰ کا وصف صرف اور صرف خدا خوفی سے حاصل ہوتا ہے اور اللہ ہی کی حفاظت کا ذریعہ بن جاتا ہے' چنانچہ لوگوں کو ایک مرتبہ تلقین فرمائی "اللہ بزرگ و برتر سے ڈرتے رہو کیونکہ تقویٰ کا وصف خوف خدا سے حاصل ہوتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے' اللہ تعالیٰ اسے محفوظ رکھے گا [9]۔" فاروق اعظمؓ کے ان بصیرت افروز اقوال و اعمال نے ایک طرف تو لوگوں کی تعلیم و تربیت کیلئے اہم کردار سرانجام دیا اور دوسری طرف ان کے دلوں میں اطاعت و جانفشانی کے جذبات پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے' جو ایک حکمران کی کامیابی و مضبوطی کا بہت بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔

۲۔ احساس ذمہ داری:

امور مملکت کو چلانے کیلئے ایک اور اہم وصف جو نہایت ضروری ہے' وہ احساس ذمہ داری ہے۔ جس حکمران کے دل میں خود ذمہ داری کا احساس نہ ہو' جو خود لاپرواہی اور بے نیازی برتتا ہو' جس کے ذہن پر کام کی دھن سوار نہ ہو' وہ دوسروں سے ان اوصاف کی توقع نہیں رکھ سکتا' نہ ہی انہیں فرائض کی بجا آوری کا پابند کر سکتا

ہے۔ دنیا میں ناکام حکمرانوں کی وجہ عموماً ان میں احساس ذمہ داری کا فقدان ہی ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا یہ عالم تھا کہ فرائض کی بجا آوری انہیں اپنی جان، مال، آرام اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "ساحل فرات پر اگر کوئی اونٹ ضائع ہو کے مر جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے اس کی باز پرس کرے گا[۱]۔" حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ عمر بن الخطابؓ ایک اونٹ کی ننگی پشت پر بیٹھے ہوئے ایک طرف کو چلے جا رہے ہیں۔ میں نے دیکھ کر کہا "امیر المومنین کدھر کا قصد ہے؟" فرمایا "صدقہ کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے اس کی تلاش میں نکلا ہوں۔" میں نے کہا "اس نوع کے تقویٰ کی مثال قائم کر کے آپ نے اپنے جانشینوں کے رتبے میں اپنے سے بہت فروتر کر دیا ہے۔" اس پر عمرؓ نے مجھ سے کہا "ابوالحسن! مجھے اس پر ملامت نہ کرو۔ اس خدا کی قسم جس نے محمد ﷺ کو منصب نبوت دے کر بھیجا ہے۔ اگر لب فرات پر بھیڑ کا بچہ بھی ضائع ہو گیا تو قیامت میں مجھ سے اس کی پرسش ہوگی[۲]۔" احساس ذمہ داری کا صحیح اندازہ عام طور پر مشکل حالات اور بحرانی کیفیت ہی میں صحیح طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ فاروق اعظمؓ کے عہد میں مشکل ترین زمانہ ۸ ھ کا تھا، جس میں مدینے کا شدید ترین قحط آیا، جسے "عام الرمادہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عالم یہ تھا کہ شہر خشک ہو گئے، مویشی ہلاک ہو گئے اور لوگ بھوک کے مارے مرنے لگے۔ حال یہ ہو گیا کہ بوسیدہ ہڈیوں کا سفوف بنا کر بطور غذا استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے۔ صحرائی اور شہری چوہوں کے بل کھودتے اور جو کچھ اس میں ہوتا نکال لیتے[۳]۔" ان حالات میں آپ نے جس احساس ذمہ داری کا مظاہرہ کیا وہ ہر عہد کے حکمرانوں کیلئے ایک روشنی کا مینار ہے۔ اس سے مصیبت زدہ لوگوں کے دلوں کو حوصلہ ملا اور ان کے مصائب کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ بقول ابن عمرؓ "لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھا کر گھر میں داخل ہوتے اور آخر شب تک برابر نماز پڑھتے رہتے، پھر باہر نکلتے اور پہاڑی رستوں پر گھومتے رہتے۔ ایک رات آخر پہر میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا "اے اللہ امت محمدیہ ﷺ کی ہلاکت میرے ہاتھوں پر نہ کر[۴]۔" شام، عراق اور مصر سے غلہ اور جانور منگائے اور ہزاروں لوگوں کو اپنی نگرانی میں پکوا کر کھلانے کا انتظام کیا اور گھر والوں کیلئے لے جانے کی اجازت دی۔ گھی اور گوشت کو اپنے لئے حرام کر لیا، تاوقتیکہ لوگ سیراب نہ ہو جائیں[۵]۔ عیاض بن سفینہ سے مروی ہے کہ میں نے قحط کے سال عمرؓ کو دیکھا کہ سیاہ رنگ کے ہو گئے تھے۔ ہم لوگ پوچھتے کہ یہ کاہے کو ہوا؟ تو فرماتے "ایک عربی آدمی تھا، جو گھی اور دودھ کھاتا تھا، لوگوں پر قحط کی مصیبت آئی، تو اس نے یہ چیزیں اپنے اوپر اس وقت تک حرام کر لیں، جب تک لوگ سرسبز نہ ہو جائیں۔ اس نے زیتون کھایا تو اس کا رنگ بدل گیا اور بھوکا رہا تو اور زیادہ تغیر ہو گیا[۶]۔"

اسامہ بن زید بن اسلم اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے قحط رفع نہ کیا، تو عمرؓ مسلمانوں کی فکر میں مر جائیں گے[۷]۔ انہی دنوں اپنے ایک لڑکے کو خربوزہ کھاتے ہوئے دیکھا، تو فرمایا "خوب خوب اے فرزند امیر المومنین، تم میوہ کھاتے ہو، حالانکہ امت محمدیہ بھوک کے مارے دبلی ہو گئی ہے۔" وہ بچہ نکل کر بھاگا اور رونے لگا۔ اس کو پوچھنے کے بعد اسے خاموش کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ اس نے ایک مٹھی بھر کھجور کے عوض خریدا ہے[۸]۔ آپ نے پورے زمانہ قحط میں اپنے لڑکوں اور بیویوں میں سے کسی کے گھر کچھ نہیں چکھا، صرف رات کے وقت لوگوں کے ساتھ کھا لیتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ اسی طرح خوشحال ہو گئے، جیسے پہلے تھے[۹]۔

یہ ہیں حضرت عمرؓ کے احساس ذمہ داری کی جھلک پیش کرنے والے بے شمار واقعات میں سے چند، جنہوں نے آپ کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں اعتماد و محبت کی ایسی قندیلیں روشن کر دیں کہ وہ ان کے ہر فیصلے کو نہایت خوشدلی اور اطاعت کے بھرپور جذبے سے قبول کرتے تھے اور آپ کی شدت و سختی کو بھی اخلاص

---

(۱) سعد ۳ : ۳ ۲ ، طبری II : ۴ ۳ ۲ (۲) جوزی ، ۱۶۲ (۳) سعد ۳ ، ۳ ، ۲ ، ابن اثیر ۲ : ۲۸۸ (۴) سعد ۳ ، ۳۱۲ (۵) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سعد ۳ ، ۳۱۲ جوزی ، ۶۸ (۶) سعد ۳ ، ۳۱۵ (۷) سعد ۳ ، ۳۱۵ (۸) سعد ۳ ، ۳۱۵ ، جوزی ، ۶۹ (۹) سعد ۳ ، ۳۱۷ ۔

وہمدردی کا تقاضا سمجھ کر برداشت کرتے تھے۔ اس سے ہر طرح کی سیاسی سازشوں اور گروہ بندیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر آپ کے اس احساس ذمہ داری کا اثر آپ کے عمال پر بھی پڑتا تھا اور وہ بھی اپنے امور میں نہایت مستعد رہتے تھے اور اپنے افکار' انداز اور رویوں سے عوام کے خیر خواہ ہونے کا عملی مظاہرہ کرتے تھے۔ اس طرح آپ نے پورے سیاسی نظام کو ایک متحرک اور فعال کردار عطا کر کے تاریخ انسانی میں کامیاب ترین حکمران کے طور پر زندہ رہنے کا شرف حاصل کیا۔

۳۔ امانت و دیانت۔

بطور ایک حکمران' آپ کے ذاتی اوصاف میں سے ایک بہت بڑا وصف امانت و دیانت ہے' امور مملکت میں اس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ایک خلیفہ و حکمران کو ریاست کے بے شمار وسائل اور اموال و املاک پر بے پناہ اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں' جس سے وہ انہیں ملک کی تعمیر و ترقی اور عوام الناس کی فلاح و بہبود پر صرف کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں ذاتی اسراف اور لاپرواہی و خیانت کے ذریعے ضائع کر کے معاشرے کو زوال و بحران کا شکار بھی کر سکتا ہے' اس لئے عہد حاضر میں امانت و دیانت اور اموال و املاک کے تحفظ کا حکام سے باقاعدہ حلف لیا جاتا ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس بارے میں بہت زیادہ حساس واقع ہوئے تھے۔ وہ بیت المال کے وسائل و ذرائع کو ذرہ برابر بھی ضائع کرنے یا ضائع ہونے دینے کے روادار نہ تھے۔ وہ امانت و دیانت کا ایک شاہکار تھے۔ آپ ذاتی اخراجات کیلئے بطور تنخواہ صرف اس قدر لیتے تھے کہ بمشکل گزر اوقات ہو سکے۔ چنانچہ ابو امامہ بن سہل بن حنیف لکھتے ہیں کہ آپ نے مدتوں بیت المال میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا' حتیٰ کہ آپ پر تنگدستی غالب آ گئی۔ آپ نے اصحاب رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق مشورہ کیا اور یہ کہا کہ میں تو اس کام میں منہمک ہوں اپنے خرچہ کا کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "صبح و شام کا کھانا آپ بیت المال سے لے لیا کریں۔" اسی کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبول فرمایا[۱]۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "میں اپنی طرف سے اللہ کے مال کو بمنزلہ مال یتیم رکھا ہے۔ اگر میں غنی ہوں تو اس مال سے بچوں اور اگر فقیر ہوں تو اصول کے مطابق اس میں سے کھاؤں[۲]۔"

احنف سے مروی ہے کہ ہم لوگ عمرؓ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک جاریہ (لونڈی) گزری۔ لوگوں نے کہا کہ امیر المومنین کی سریہ (باندی و حرم) ہے تو اس (باندی) نے کہا کہ "امیر المومنین کی کوئی سریہ نہیں ہے اور نہ وہ ان کیلئے حلال ہے کیونکہ وہ اللہ کا مال ہے۔" ہم لوگوں نے کہا کہ پھر اللہ کے مال میں کونسا مال ان کیلئے حلال ہے؟ اس جاریہ کے پہنچنے کی دیر تھی کہ ہمارے پاس قاصد آیا اور ہمیں بلایا' ہم ان کے پاس آئے۔ انہوں نے فرمایا "تم لوگوں نے کیا کہا تھا؟" ہم نے کہا کہ ہم نے کوئی بری بات نہیں کہی ایک جاریہ گزری تو ہم نے کہا "یہ امیر المومنین کی سریہ ہے۔" وہ کہتے کہ "وہ امیر المومنین کی سریہ نہیں ہے ورنہ وہ امیر المومنین کیلئے حلال ہے' وہ اللہ کا مال ہے۔" ہم نے کہا کہ "پھر ان کیلئے اللہ کے مال میں سے کیا حلال ہے؟" انہوں نے (عمرؓ نے) فرمایا کہ "میں جو چیز حلال سمجھتا ہوں تمہیں بتاتا ہوں۔ میرے لئے (سال میں) دو جوڑے حلال ہیں (ایک جوڑا ایک چادر اور ایک تہمد کا ہوتا ہے) ایک جوڑا جاڑے میں اور ایک جوڑا گرمی میں اور وہ سواری جس پر میں حج و عمرہ کروں۔ میری اور میرے عیال کی خوراک جیسی قریش کے آدمی کی ہوتی ہے' جو نہ تو ان کے امیروں کی ہو اور نہ ان کے فقیروں کی۔ پھر اس کے بعد میں بھی مسلمانوں میں سے ایک آدمی ہوں' جو سب کو پہنچے گا وہ مجھے بھی پہنچے گا[۳]۔"

ایک مرتبہ ربیع بن زیادہ حارثی بطور قاصد حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہیں حضرت عمرؓ کی ہیئت اور طریقہ بڑا عجیب لگا اور ان کے ہاں جو سخت اور خراب کھانا کھایا اس کی شکایت کی اور عرض کیا "یا امیر المومنین! آپ عمدہ کھانے' عمدہ سواری اور عمدہ لباس کے زیادہ مستحق ہیں۔" حضرت عمرؓ نے پاس رکھا

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible]

ہو اکا خذ (جریدہ) اٹھایا اور ان کے سر پر مار کر فرمایا "واللہ! میں نہیں سمجھتا کہ تم نے اس بات سے اللہ کو راضی کرنے کا ارادہ کیا ہو۔ تم نے صرف میرا تقرب حاصل کرنا چاہا ہے' خدا تمہارا بھلا کرے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم میں کوئی خیر ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ میری اور ان کی (رعایا) کی کیا مثال ہے؟" انہوں نے عرض کیا "آپ کی ان کی کیا مثال ہے؟" فرمایا "اس کی مثال ایک جماعت کی سی ہے' جس نے سفر کیا اور اپنے اخراجات اپنی ہی قوم کے کسی شخص کے سپرد کر دیئے اور اس سے کہہ دیا کہ ہم پر خرچ کرنا۔ کیا اس کیلئے یہ حلال ہے کہ اس میں سے اپنے لئے کچھ کرے؟" انہوں نے کہا کہ "امیر المومنین نہیں۔" فرمایا "میری اور ان کی (رعایا) ایسی ہی مثال ہے"[۱]۔ "حضرت سلمانؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ "کیا میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟" انہوں نے عرض کیا "اگر آپ نے مسلمانوں کی زمین سے ایک درہم یا اس سے کم و بیش حاصل کر کے خلاف حق خرچ کر دیا' تو آپ خلیفہ نہیں بادشاہ ہیں۔" یہ سن کر حضرت عمر فاروقؓ نے عبرت حاصل کی (آنسو جاری ہو گئے[۲]۔) ایک مرتبہ ایک محفل میں فرمایا کہ "واللہ! مجھے معلوم نہیں کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ؟ اگر میں بادشاہ ہوں تو یہ بہت بڑا بوجھ ہے۔" (حاضرین میں سے) کسی نے عرض کیا "امیر المومنین ان دونوں میں تو بہت بڑا فرق ہے۔" پوچھا "وہ کیا؟" اس نے جواب دیا "خلیفہ بغیر حق کے نہ تو کچھ لیتا ہے اور نہ ہی خلافت حق خرچ کرتا ہے۔ آپ تو بحمد اللہ ایسے ہی ہیں' جبکہ بادشاہ ظلم و زبردستی کرتا ہے' جہاں سے چاہتا ہے لیتا ہے' جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے[۳]۔

آپ کا پورا عہد مبارک خلافت و ملوکیت کے اس بنیادی فرق کی واضح تصویر نظر آتا ہے۔ آپ نے نہ تو کبھی خود خلاف حق مال حاصل کیا اور نہ ہی رشتہ داروں اور عزیزوں کو ایسا کرنے دیا۔ محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ آپ کے داماد آپ کے پاس آئے اور انہوں نے چاہا کہ مجھے کچھ بیت المال میں سے دے دیں۔ آپ نے جھڑک دیا اور کہا "کیا آپ چاہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک میں خیانت کنندہ بادشاہوں میں شمار ہوں۔" پھر آپ نے ان کو اپنے مال سے دس ہزار درہم عطا کئے[۴]۔ حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس کچھ مال غنیمت آیا' اس کی خبر آپ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ہوئی۔ وہ تشریف لائیں اور کہنے لگیں "امیر المومنین! اس مال پر آپ کے اقرباء کا بھی حق ہے اور اللہ تعالیٰ نے ذوی القربیٰ سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔" جواب دیا "بیٹی میرے اقرباء کا حق تو میرے ذاتی مال میں ہے' یہ تو مسلمانوں کا مال غنیمت ہے۔ کیا خوب تم نے اپنے باپ کو تو تباہ کرنا چاہا اور اقربا کی بھلائی چاہی[۵]۔" آپ بیت المال کو تمام مسلمانوں کی امانت سمجھتے تھے' اس لئے اسے کبھی اپنی ذاتی خواہش و مفاد پر صرف نہیں کرتے تھے۔ ہر معاملے میں مفاد عامہ اور عوام کی خواہش و مرضی کو اصل اہمیت دیتے تھے۔ اگر کبھی ذاتی تصرف کی ضرورت پیش آتی تو معروف طریقے پر عوام سے اجازت لے کر بقدر ضرورت استعمال کرتے تھے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک روز عمرؓ نکل کر منبر کے پاس آئے' وہ کچھ بیمار تھے۔ ان سے شہد کی تعریف کی گئی (کہ اس مرض میں مفید ہے) اور بیت المال میں ایک عکہ (وزن شہد) ہے۔ انہوں نے کہا کہ "اگر تم لوگ مجھے اس کی اجازت دو (تو خیر) ورنہ وہ مجھ پر حرام ہے۔ لوگوں نے انہیں اس کی اجازت دی[۶]۔ معاوضہ اس قدر کم لیتے تھے کہ اس میں گھر بار کی کفالت مشکل ہو جاتی تھی اور پھر ہنگامی اور اتفاقی ضروریات کیلئے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ عمران سے مروی ہے کہ عمرؓ کو جب ضرورت ہوتی تو وہ محافظ بیت المال کے پاس آتے اور اس سے قرض لے لیتے۔ اکثر تنگی ہوتی' محافظ بیت المال ان کے پاس آکر تقاضا کرتا اور ان کے ساتھ ہو لیتا' تو وہ اس سے حیلہ کرتے (کہ فلاں وقت دوں گا) اور اکثر ان کی تنخواہ نکلتی تو وہ اسے ادا کر دیتے تھے[۷]۔

---

(۱) سعد ۳/ ۲۸ [illegible] (۲) سعد ۳/ ۳۰۶ [illegible] طبری ۵/ [illegible] ۲۱۱ سیوطی [illegible] ۱۴ (۳) سعد ۳/ ۳۰۲، سیوطی [illegible] ۱۴۰ (۴) سعد ۳/ ۳۰۲، سیوطی [illegible] ۱۳۰ (۵) جوزی ۹۷

(٦) سعد ۳/ [illegible] طبری ۵/ [illegible] ۲ [illegible] ۱ سیوطی ۱۲۹ (۷) ایضاً۔

یہ قرض محض ذاتی ضروریات کیلئے ہوتا تھا ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس لئے وہ کچھ نہ کچھ کاروبار کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ اپنے وسائل و آمدنی پر انحصار کر سکیں۔ کاروباری معاملات کیلئے اگر سرمائے کی ضرورت پڑتی تو بھی بیت المال سے قرض نہیں لیتے تھے۔ اس کیلئے ذاتی تعلقات کو استعمال کرتے تھے۔ عزیمت پر مبنی اس طرز عمل میں کیا حکمت تھی؟ اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے۔ ابراہیم سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ تجارت کرتے تھے حالانکہ وہ خلیفہ تھے۔ انہوں نے شام کیلئے ایک قافلہ تیار کیا اور ایک صحابیؓ کو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے پاس بھیجا اور چار ہزار درہم بطور قرض مانگے۔ انہوں نے قاصد سے کہا کہ "ان سے کہو کہ وہ بیت المال سے لے لیں پھر اسے ادا کر دیں۔" قاصد آپ کے پاس آیا اور ان کے جواب کی خبر دی تو یہ آپ کو سخت ناگوار گزرا۔ پھر آپ خود جا کر ان سے ملے اور کہا کہ "تم کہتے ہو کہ بیت المال سے لے لیں۔ اگر میں مال کے واپس آنے سے پہلے مر جاؤں تو تم لوگ کہو گے کہ اسے امیر المومنین نے لے لیا ہے اس لئے وہ رقم معاف کر دو اور قیامت کے روز اس کا مجھ سے مواخذہ ہو ہرگز نہیں! میں چاہتا ہوں کہ تمہارے جیسے حریص اور لالچی سے لوں کہ اگر میں مر جاؤں تو اسے میری میراث سے لے لے[1]۔

خلافت کی ذمہ داریاں جتنی زیادہ بڑھتی گئی ذاتی کاروبار اتنا ہی ٹھپ ہوتا گیا اور پھر آپ کی معمولی تنخواہ گزارے کی کفالت نہیں کرتی تھی اس لئے تنخواہ بڑھانے کے بجائے بیت المال سے حسب ضرورت بطور قرض رقم حاصل کر لیتے تھے۔ جب وفات کا وقت قریب آیا تو سب سے زیادہ آپ کو اسی کی فکر تھی اس لئے اس کی ادائیگی کیلئے بیٹے کو خصوصی طور پر وصیت فرمائی۔ عثمان بن عروہ سے مروی ہے کہ عمرؓ بن الخطاب نے بیت المال سے اسی ہزار درہم قرض لئے تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ کو بلایا اور فرمایا کہ "اس قرض میں عمرؓ کے اموال بیچ ڈالو پورا ہو جائے تو خیر ورنہ بنی عدی سے مانگو۔ اس کے بعد بھی تکمیل نہ ہو تو قریش سے مانگو اور ان کے آگے نہ بڑھو۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا کہ "آپ بیت المال سے کیوں نہیں قرض لے لیتے کہ اسے ادا کر دیں۔" فرمایا "معاذ اللہ! تم اور تمہارے ساتھی میرے بعد کہو کہ ہم نے تو اپنا حصہ عمرؓ کیلئے چھوڑ دیا تم تو مجھے اس سے تسلی دے دو مگر اس کا خمیازہ میرے پیچھے ہو اور میں ایسے امر میں پڑ جاؤں کہ بغیر اس سے رہائی کے نجات نہ ملے۔" پھر عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ "تم اس کے ذمہ دار ہو جاؤ" وہ ذمہ دار ہو گئے۔ عمرؓ اس وقت تک دفن نہیں کئے گئے جب تک کہ ابن عمرؓ نے اس کے متعلق اہل شوریٰ اور متعدد انصار کو اپنے اوپر گواہ بنا لیا۔ تدفین کو ایک جمعہ بھی نہ گزرا تھا کہ ابن عمرؓ عثمانؓ بن عفان کے پاس مال لے آئے اور انہوں نے ادائے مال کی سبکدوشی پر گواہوں کو حاضر کیا[2]۔ اولاد انسان کی کمزوری ہوتی ہے ان کو تکلیف و ضرورت میں مبتلا دیکھ کر بسا اوقات آدمی اختیارات میں تجاوزات پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن فاروق اعظمؓ اس کے برعکس اپنی اولاد پر عام لوگوں سے زیادہ سختی کرتے تھے تاکہ آخرت میں جواب دہی سے بچ سکیں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دبلی لڑکی کو دیکھا کہ کودتی جا رہی ہے۔ پوچھا "یہ لڑکی کس کی ہے؟" عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ "یہ آپ کی لڑکیوں میں سے ایک کی ہے۔" پوچھا "یہ میری کون سی لڑکی ہے؟" عبداللہؓ نے کہا کہ "میری بیٹی۔" فرمایا "اس کا یہ حال کیونکر ہوا؟" عرض کیا "آپ کے عمل سے کہ آپ اسے نفقہ نہیں دیتے۔" انہوں نے کہا کہ "واللہ! میں تمہارے بچوں کی وجہ سے یہ امید نہ دلاؤں گا کہ میں تمہارے بچوں پر وسعت کروں گا[3]۔"

ایک اور روایت میں آپ کے بیٹے حضرت عاصمؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے میرے پاس یرفا کو بھیجا اور مجھے بلوایا۔ میں ان کے پاس آیا تو وہ فجر یا ظہر کیلئے اپنی جانماز پر تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں اس مال کو اس کا والی بننے کے قبل بھی بغیر حق کے حلال نہیں سمجھتا تھا اور جب سے اس کا والی ہوا ہوں بالکل سے اپنے اوپر حرام

(۱) عیید ۲۳۹ سعد ۲۷۸/۳ (۲) سعد ۳۵۸/۳ (۳) سعد ۳ ... [illegible]

بھی نہیں سمجھتا ہوں۔" میری امانت عود کر آئی ہیں نے تمہیں اللہ کے مال سے یک مہینے تک نفقہ دیا ہے اور میں تمہیں زیادہ دینے والا نہیں ہوں لیکن میں تمہاری مدد اپنے العابہ کے (باغ کے) پھل سے کروں گا اسے کاٹ لو اور بیچ ڈالو۔ تم پنی قوم کے تاجروں میں سے کسی کے پاس کھڑے ہو جاؤ جب وہ کوئی چیز بغرض تجارت خریدے تو تم بھی اس کے شریک ہو جاؤ اور نفع اپنے اور اپنے اہل و عیال کیلئے خرچ کرو ( )۔" آپ کے نزدیک امانت و دیانت میں یہ بات شامل تھی کہ سرکاری اموال و املاک کی بھرپور نگہداشت و حفاظت کی جائے اور اس سلسلے میں ہر طرح کے تقاضے پورے کئے جائیں۔ یہ کام محض ماتحتوں پر چھوڑنے کے بجائے خود بڑھ کر اس کا عملی ثبوت فراہم کیا جائے کیونکہ ہر چیز کی آخری ذمہ داری بہر حال خلیفہ پر عائد ہوتی ہے۔ ابو سلیمان فرماتے ہیں "جب میں مدینہ آیا تو ایک گھر میں داخل ہوا وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک سیاہ تہہ باندھے ہوئے صدقہ اور خیرات کے اونٹوں کو روغن قطران مل رہے تھے[۲]۔" ایک اور روایت میں حضرت عثمانؓ بن عفان کے ایک غلام بیان کرتے ہیں "میں حضرت عثمانؓ کے پیچھے سوار تھا تا آنکہ وہ صدقات کے ایک باڑے میں گئے۔ اس دن سخت گرمی تھی اور باد سموم چل رہی تھی وہ صدقات کے اونٹوں کا باڑہ تھا۔ وہاں ایک شخص تہہ باندھے ہوئے اور سر پر بھی ایک چادر باندھے ہوئے تھے وہ اونٹوں کو نکال رہے تھے جو وہاں داخل ہوئے تھے۔" حضرت عثمانؓ نے فرمایا "تم کس کو دیکھ رہے ہو؟" جب ہم وہاں پہنچے تو وہ حضرت عمرؓ بن الخطاب تھے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا "(قرآن کریم کے معیار کے مطابق) قوی اور امین آپ ہی ہیں[۳]۔"

ابو بکر عبسی بیان کرتے ہیں "میں حضرت عمرؓ بن الخطاب اور حضرت علیؓ بن ابی طالب کے ساتھ صدقات (کے جانوروں) کے باڑے میں گیا۔ اس وقت حضرت عثمانؓ سایہ میں بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے اور حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے ہوئے جبکہ سخت گرمی پڑ رہی تھی انہیں کچھ لکھوا رہے تھے۔ ان کے بدن پر دو سیاہ چادریں تھیں ایک چادر کو تہبند کی طرح باندھے ہوئے تھے اور دوسری چادر سے سر کو لپیٹ رکھا تھا۔ آپ صدقات کے اونٹ گن رہے تھے اور ان کے رنگ اور دانت کے بارے میں لکھوا رہے تھے۔ حضرت علیؓ نے (حضرت) عثمانؓ سے فرمایا "حضرت شعیب کی بیٹی نے کتاب اللہ سے یہ کہا تھا "یاابت استجارہ ان خیر من استاجرت القوی الامین[۴]۔" (ابا جان! انہیں (حضرت موسیٰ) کو اجرت پر ملازم رکھ لو کیونکہ جس سے تم اجرت پر کام لو ان میں سے وہ بہتر ہے جو قوی اور امین (امانت دار) ہو۔" پھر انہوں نے حضرت عمرؓ کی طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "ایسے قوی اور امین آپ ہی ہیں[۵]۔"

حضرت عمر فاروقؓ کی بطور حکمران امانت و دیانت کی یہ تھیں چند مثالیں، جن کے بڑے گہرے اثرات نہ صرف عمال و ملازمین پر پڑے، بلکہ عوام الناس بھی آپ کی پیروی میں امانت و دیانت کے پیکر بن گئے اور پورا معاشرہ مدح و استحکام کی شاہراہوں پر گامزن رہا۔ ان کی زندگی میں کبھی اجتماعی طور پر اس میں کوئی ضعف پیدا نہ ہو سکا۔ قیس عجلی بیان کرتے ہیں کہ فتح ایران کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جب کسریٰ کی دستار، تلوار اور دیگر ساز و سامان آیا، تو آپ نے فرمایا "وہ لوگ جنہوں نے یہ چیزیں بحفاظت بھیجی ہیں نہایت ہی امانتدار ہیں۔" حضرت علیؓ نے فرمایا "چونکہ آپ خود عفت شعار اور پاکیزہ ہیں، اس لئے آپ کی رعایا بھی پاک دامن اور ایماندار ہے[۶]۔"

۴۔ خود احتسابی:

تمام ذاتی اوصاف میں سے سب سے نمایاں وصف جو کسی حکمران کو دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کر سکتا ہے، وہ خود احتسابی ہے۔ اگر ایک آدمی اپنے خیالات و افکار، اندرونی جذبات و احساسات، اطوار و عادات اور فرائض و معاملات کا خود جائزہ لیتا رہے اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر خود ہی گرفت کرے اور ان کی اصلاح کیلئے خود ہی کاوشیں کرے تو وہ کبھی مایوسی و نامرادی کے گڑھوں میں نہیں گر سکتا۔ وہ کبھی خدا اور خلق خدا کے سامنے ذلیل و رسوا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ

(۱) [illegible] ۲۰۷ (۲) [illegible] ۲۲۶ (۳) طبری [illegible] (۴) القصص ۲۸:۲۶ (۵) [illegible] (۶) طبری [illegible] ۱۶۴

بہت بڑی عزیمت کا کام ہے۔ یہ ہر آدمی کے بس کی بات نہیں' خاص طور پر جب کسی کو عہدہ و اختیار ملتا ہے' تو اس کا نشہ اس میں بہت سی ایسی خرابیاں بھی پیدا کر دیتا ہے' جن کا صدور اس کی ذات سے قبل ازیں ہونا ناممکن تھا۔ اگر خود احتسابی کے ذریعے ان کا ساتھ ساتھ ازالہ نہ ہوتا رہے' تو یہ اور زیادہ گہری ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ رعایا بھی ان سے آگاہ ہو جاتی ہے اور اس کے دل میں بھی یہ ساری خرابیاں' بد اعتمادی' بدگمانی اور نفرت کی چنگاریاں ابھارنا شروع کر دیتی ہیں' جو بالآخر بغاوت کا شعلہ بن کر اقتدار کے ایوانوں کو بھسم کر دیتا ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بطور حکمران کامیابی و کامرانی کے اسباب کا جائزہ لیا جائے' تو ان میں خود احتسابی کا وصف بہت نمایاں نظر آئے گا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز میں حضرت عمر بن الخطاب ؓ کے ہمراہ نکلا' یہاں تک کہ وہ ایک احاطے میں داخل ہو گئے۔ میرے اور ان کے درمیان دیوار حائل تھی اور وہ احاطے کے اندر تھے۔ میں نے انہیں کہتے سنا "واہ واہ اے خطاب کے بیٹے عمر امیر المومنین' تجھے ضرور اللہ سے ڈرنا ہو گا ورنہ وہ تجھے عذاب دے گا[1]۔"

وہ اپنے نفس کو مکمل طور پر شریعت کے تابع اور اپنی گرفت میں رکھتے تھے کیونکہ اسی کی خواہشات و کیفیات اور اسی کی ضروریات و داعیات انسان کو بے راہ روی اور ظلم و استحصال کی راہوں پر گامزن کرتی ہیں۔ وہ سب سے زیادہ احتساب اپنے نفس کا کرتے تھے۔ اس کے اندر ذرا سی کجی کو برقرار رکھنے کے روادار نہ تھے۔ اپنے عہد خلافت ہی میں ایک روز کندھے پر مشک اٹھائی اور چل دیئے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا؟ جواب دیا کہ "میرے نفس میں کچھ غرور و تکبر پیدا ہو گیا تھا پس میں نے اسے ذلیل کر دیا ہے[2]۔" تکبر ہی وہ سب سے پہلی اور بڑی خرابی ہے جو عام طور پر حکمرانوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر اسے مٹا دیا جائے' تو پھر اس کے اندر عجز' خدمت خلق اور ہمدردی و مساوات کے احساسات پروان چڑھ سکتے ہیں۔ اس لئے آپ تکبر کو نفس کے اندر کبھی سر اٹھاتے ہوئے نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ ایک دن منبر پر چڑھے اور لوگوں کو جمع کرنے کے بعد اللہ کی حمد و ثناء کی' پھر فرمایا "اے لوگو! میں نے اپنے آپ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ میرے پاس پھل وغیرہ کچھ نہیں تھے کہ لوگ اس میں سے کھاتے' سوائے اس کے کہ بنی مخزوم میں میری چند خالہ تھیں' جنہیں میں میٹھا پانی پلاتا تھا' تو وہ میرے لئے کشمش کی چند مٹھیاں جمع کر دیتی تھیں۔" یہ کہہ کر آپ منبر سے اتر آئے۔ پوچھا گیا "یا امیر المومنین! یہ کچھ بتانے میں آپ کا کیا مقصد ہے؟" فرمایا "میں نے اپنے دل میں ایک چیز محسوس کی' تو چاہا کہ اسے کم کر دوں[3]۔" آپ اپنے نفس کی خواہشات کا احتساب کرنے کے ساتھ ساتھ معاملات و ذمہ داریوں کے سلسلے میں بھی اپنا احتساب خود کرتے تھے۔ کسی بیرونی دباؤ اور محرک کے بغیر اپنے ہر طرز عمل کا عدل و انصاف کے میزان پر جائزہ لیتے تھے کہ وہ صحیح ہے یا غلط' ان کا سب سے پہلا اور بڑا محاسب خود ان کا اپنا ضمیر ہوتا تھا۔ اگر پورے فکر و استدلال سے کسی مسئلے پر اسے مطمئن کر دیتے' تو پھر اپنے فیصلے پر چٹان کی طرح ڈٹ جاتے تھے' لیکن اگر ان کی وزنی دلیل نہ ہوتی' تو پھر پوری فراخدلی اور جرأت مندی کے ساتھ اپنے رویے کی اصلاح کر لیتے اور اپنی انا کو ٹھکراتے ہوئے اپنے فیصلے یا بات سے رجوع کر لیتے۔ عموماً ہر وہ بات جو ان کے دل و ضمیر میں کھٹک پیدا کرتی' اس پر ضرور نظر ثانی کرتے تھے اور اپنے سابقہ طرز عمل کے ازالے کیلئے ہر ممکنہ تدبیر اختیار کرتے تھے۔ ایک دفعہ راستے میں چلتے چلتے کسی شخص نے کہا "امیر المومنین! ایک شخص نے مجھ پر ظلم کیا ہے' آپ میرے ساتھ جا کر ذرا انصاف تو کر دیجئے۔" آپ نے آہستہ سے اپنا درہ اس کے سر پر مارا اور فرمایا "جس وقت عمرؓ خود اپنے آپ کو تمہارے سامنے پیش کرتا ہے' تو تم اسے چھوڑ دیتے ہو' لیکن جب وہ مسلمانوں کے امور میں سے کسی میں مصروف ہوتا ہے' تو آ کر کہتے ہو کہ مدد کیجئے' مدد کیجئے۔" وہ آدمی بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ فوراً بعد آپ کو اپنے رویے کی غلطی کا احساس ہوا تو اسے واپس اپنے پاس بلوایا اور اپنا درہ اس کے سامنے ڈال کر فرمایا "لے مجھے بھی مار کر اپنا بدلہ لے لے۔" آدمی بولا "اب نہیں ہو سکتا میں اس بدلے کو اللہ کی خاطر اور

---

(۱) [illegible]/[illegible]' [illegible]' بیہقی ۸/۴۷' سعد ۳/۲۹۲' کنز ۱۲/۷=۱۲۵' سیوطی ۱۲۹ (۲) کنز ۱۲/۷=۱۲۵' سیوطی ۱۲۹ (۳) سعد ۳/۲۹۳۔

آپ کی خاطر چھوڑتا ہوں۔" آپ نے فرمایا "یوں نہیں، یا تو اسے اللہ کی خاطر چھوڑ یا میری خاطر تاکہ مجھے معلوم ہو جائے۔" آدمی بولا "جائیے، میں نے معاملے کو اللہ کی خاطر ترک کر دیا۔" اس کے بعد آپ گھر لوٹ آئے اور آتے ہی دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور مصلے پر بیٹھ کر فرمایا "خطاب کے بیٹے! تو بڑے کم درجے کا مالک تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے رفعت دی، تو گمراہ تھا اللہ نے تجھے ہدایت دی۔ تو خوار تھا اللہ نے تجھے معزز و مکرم بنایا اور اس کے بعد تجھے مسلمانوں پر مسند کر دیا۔ اب اگر کوئی تجھ سے آ کر امداد کا طلب گار ہوتا ہے، تو تو اسے مارتا ہے۔ کل جب تو اپنے رب کے حضور جائے گا، تو اس کا کیا جواب دے گا۔" راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ دیر تک اسی طرح اپنی ملامت کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے محسوس کیا کہ وہ دنیا کے سب سے بہترین شخص ہیں۔[1]

اس روایت سے آپ کی خود احتسابی کے عظیم جذبے کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کے ایک اور واقعے میں ایاس بن سلمہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک دن بازار سے گزر رہا تھا کہ اتنے میں حضرت عمرؓ اپنے ہاتھ میں درہ لئے اپنی کسی ضرورت کے سلسلے میں ادھر آنکلے۔ انہوں نے اپنے درے سے ہلکی سی ضرب لگائی، جو میرے کپڑے کے کنارے پر لگی اور فرمایا "اے سلمہ یوں لوگوں کا راستہ روک کر نہ چلو۔" میں راستے سے ہٹ گیا۔ انہوں نے مجھے اور کچھ نہ کہا یہاں تک کہ اگلے سال پھر اسی بازار میں ہمارا آمنا سامنا ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا "سلمہ کیا اس سال حج کا ارادہ ہے؟" میں نے عرض کیا "ہاں امیر المومنین!" انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی طرح اپنے گھر میں لے گئے۔ وہاں جا کر میرے ہاتھ میں ایک کیسہ تھما دیا جس میں چھ سو درہم تھے۔ پھر فرمایا "یہ درہم لے لو اور انہیں کام میں لاؤ۔ یہ بدلہ ہے اس درے کا جو میں نے گزشتہ سال آپ کو مارا تھا۔" میں نے عرض کیا "امیر المومنین! میں تو اسے بھول چکا تھا اب آپ کے یاد دلانے پر یاد آیا۔" فرمایا "خدا کی قسم میں تو اسے نہیں بھولا تھا۔"[2] ایک مرتبہ مکے کے راستے میں کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ دھوپ کی شدت کی وجہ سے اپنے اوپر کپڑا ڈال رکھا تھا۔ کھڑے ہوئے تو ایک شخص نے کہا "امیر المومنین! ابھی ہمارے بھی کام آیئے، ہمارا مدتوں سے ایک کام اٹکا ہوا ہے۔" آپ نے پوچھا "آخر کس نے آپ کا کام بگاڑا ہے؟" اس نے جواب دیا "آپ نے۔" حضرت عمرؓ کو یہ بات ناگوار گزری اور اسے ایک درہ رسید کیا۔ وہ بولا "آپ نے فیصلہ کرنے میں بڑی عجلت برتی ہے، قبل اس کے کہ صحیح جائزہ لیتے۔ اگر میں مظلوم ہوں تو آپ نے میرا حق مجھے نہیں دلایا اور اگر ظالم ہوں تو معاملہ صاف ہو گیا۔" حضرت عمرؓ نے یہ سنتے ہی اس کا دامن تھام لیا اور اسے اپنا درہ دیتے ہوئے کہا کہ "اپنا بدلہ لے لو۔" اس نے جواب دیا "میں ایسا نہیں کروں گا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "واللہ! تمہیں ایسا کرنا پڑے گا ورنہ میں اسی طرح عمل کروں گا جیسے ایک منصف اپنے حق کے بارے کرتا ہے۔" وہ آدمی بولا "میں نے معاف کر دیا۔" حضرت عمرؓ بار بار اصرار کرتے رہے کہ "بہتر ہے کہ آج ہی اپنا بدلہ لے چکاؤ اور اگر تم سے ہو سکے، تو مجھے اعتماد و اتحاد دو کہ میں روپڑوں"۔[3]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ چند ہمسفر تجار مدینے آئے اور عید گاہ میں ٹھہرے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے کہا کہ "کیا تم چاہتے ہو کہ ہم رات بھر چوری سے ان کی حفاظت کریں؟" چنانچہ دونوں رات بھر حفاظت کرتے رہے اور نمازیں پڑھتے رہے، جو اللہ نے ان کیلئے فرض کی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس دوران بچے کے رونے کی آواز سنی، تو وہاں سے چلے گئے۔ اس کی ماں سے کہا کہ "اللہ سے ڈر اور بچے کے ساتھ بھلائی کر۔" پھر واپس اپنے مقام پر آگئے۔ دوبارہ رونے کی آواز سنی، تو اس کے پاس گئے اور اسی طرح کہہ کر واپس آگئے۔ آخر شب ہوئی تو پھر رونے کی آواز سنی، اس کی ماں کے پاس آ کر کہا "تیرا بھلا ہو، میں تجھے بری ماں سمجھتا ہوں، کیا بات ہے؟ میں دیکھتا ہوں کہ تیرے لڑکے کو رات سے قرار نہیں۔" اس نے جواب دیا "اے بندۂ خدا! تم مجھے رات سے پریشان کر رہے ہو، میں اس کا دودھ چھڑانا چاہتی ہوں، تو انکار کرتا ہے۔" فرمایا "کیوں (چھڑانا چاہتی ہو؟)" اس نے کہا کہ "عمر صرف دودھ چھوڑنے والوں

(۱) طبری [illegible] (۲) طبری [illegible] (۳) طبری [illegible]

کا حصہ (وظیفہ) مقرر کرتے ہیں۔ "پوچھا "اس کی کیا عمر ہے؟" اس نے جواب دیا "اتنے اتنے مہینے۔" فرمایا "اللہ تیرا بھلا کرے اس کے ساتھ جلدی نہ کر۔"
انہوں نے فجر کی نماز اس حالت میں پڑھی کہ شدت گریہ سے لوگ ان کی قرأت کو سمجھ نہ سکتے تھے۔ جب سلام پھیرا تو کہا "عمرؓ کی خرابی ہے اس نے مسلمانوں
کے کتنے بچے قتل کر دیے۔" پھر انہوں نے منادی کرنے والے کو حکم دیا تو اس نے اعلان کیا کہ "دیکھو خبردار اپنے بچوں کے ساتھ دودھ چھڑانے میں جلدی نہ
کرو۔ ہم اسلام میں پیدا ہونے والے ہر بچے کی عطا مقرر کرتے ہیں۔" اس کے متعلق انہوں نے ہر طرف یہ فرمان بھیجے کہ "ہم اسلام میں پیدا ہونے والے ہر بچے
کی عطا مقرر کرتے ہیں[1]۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے ذاتی کردار کا جو نمونہ پیش کیا، وہ ایک سمجھدار مسلمان حکمران کا بہترین ماڈل ہے۔ پوری انسانی تاریخ انبیاء کرام کے علاوہ کسی ایسے بے
غرض، متقی، احساس ذمہ داری رکھنے والے، امانت و دیانت کے پیکر اور خود احتسابی عادل اور عوامی ہمدردی کا جذبہ رکھنے والے جامع الصفات حکمران کیلئے ایک
جگمگاتی ہوئی قندیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملت اسلامیہ کے ایک حکمران کی ذاتی زندگی، فہم و سوچ اور احساس و جذبات کو ماپنے کا یہی ایک پیمانہ بھی ہے۔ ہماری
تاریخ کا یہ ایک ایسا درخشندہ باب ہے کہ کوئی مسلمان اس کو فراموش نہیں کر سکتا۔ ہمارے اجتماعی ضمیر اور لاشعور میں یہ معیار موجود ہے، جس کے ذریعے ہم اپنے
دور کے سیاسی رہنماؤں اور مقتدر لوگوں کو جانچتے رہتے ہیں۔ جب وہ ہماری توقعات اور ہمارے معیار سے بالکل برعکس نظر آتے ہیں، تو ہمارے دلوں میں ان کے
خلاف نفرت و بغاوت جنم لیتی ہے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کے جذبات ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور ہمارا پورا سیاسی نظام، اجتماعی ڈھانچہ اور پورا معاشرہ انتشار کا
شکار رہتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان حکمرانوں اور رعایا کی توقعات کے مابین اس بعد کو ختم کیا جائے۔ اگر کسی ملک کے مقتدر طبقات اپنی ذاتی زندگی اور
طرز عمل میں فاروق اعظمؓ کی طرح تبدیلی پیدا کر لیں، تو وہ معاشرہ دنیا کے اندر جنت کا نمونہ بن جائے۔

---

(1) سعد ۳۰۱/۳

٥..... سیاسی اصول

ا۔ آزادئ تنقید و رائے:

عہد فاروقی میں عوام کو تنقید و رائے کی مکمل آزادی تھی' جس کا دائرہ آپ کی ذات سے لے کر حکومت کے تمام معاملات پر حاوی تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ دورِ جدید کی اصطلاح کے مطابق جمہوری مزاج رکھتے تھے۔ اس لئے جمہور کی سوچ اور رائے عامہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک عوام کو ہر سیاسی معاملے میں رائے رکھنے اور اسے بلا کم و کاست حکمرانوں تک پہنچانے' دلیل دینے اور دلیل طلب کرنے' ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر انہیں ٹوکنے اور ان کا احتساب کرنے اور کسی مسئلے میں ان سے جواب طلب کرنے' ان کی ذات اور پالیسیوں کے بارے میں جواب دہی کرنے' اس کا جواز مانگنے اور اس پر تنقید کرنے اور اس سلسلے میں مشورے دینے کا پورا پورا حق رکھتے ہیں۔ کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر شہری کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ ہر آدمی کو اپنے بنیادی حقوق طلب کرنے اور ان کی حفاظت کا تقاضا کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ یہاں تک کہ عوام کو خلیفہ کے تقرر کا بھی اختیار حاصل ہے اور عمال و گورنروں کے بارے میں شکایت کرنے اور انہیں معزول کرانے کا بھی استحقاق رکھتے ہیں۔ خلیفہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عام لوگوں کی صحیح رائے کا احترام کرے۔ خلق خدا کی آواز پر کان دھرے اور پکار پر لبیک کہے۔

آپ کی طبیعت کی شدت و سختی' کبھی آپ کے جمہوری مزاج' جمہوریت پسندی اور جمہوری طرزِ عمل پر غالب نہیں آئی اور نہ ہی کبھی اس نے آمریت کا روپ دھارا۔ آپ نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ لوگوں کے منہ بند کئے جائیں اور ان پر اپنی پسند و ناپسند اور ذاتی رائے کو مسلط کر کے من مانی کا سکہ رواں کیا جائے۔ چاہے عوامی مجلس ہو یا شوریٰ' اپنی ذاتی رائے کو آپ نے ہمیشہ عام آدمی کی طرح رکھا اور جو بات حق نظر آئی اسی کو اختیار کیا اور پالیسیوں کی بنیاد بنایا۔ آپ کی شدت اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تنفید کیلئے ہوتی تھی' اپنی ذاتی رائے کے تسلط کیلئے نہیں۔ آپ کے جمہوری مزاج اور فکر و عمل کی متعدد مثالیں کتب و تاریخ و سیر میں محفوظ ہیں' جن سے مذکورہ بالا تمام پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔ سفیان بن عیینہ کے بقول حضرت عمر بن خطابؓ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے' جو میرے عیب مجھ پر ظاہر کرتا رہے[1]۔ یہ وہ بات ہے جو کبھی کوئی آمر اور خود سر حکمران پسند نہیں کرتا۔ اسے تو صرف خوشامد اور اپنی تعریف اور اپنی حکمت و دانشمندی کے گن گانے والے اچھے لگتے ہیں' لیکن آپ لوگوں کو یہ حق دیتے تھے کہ جو محسوسات ہیں' ان کا کھل کر اظہار کریں' جس بات کو برا سمجھیں اس پر ٹوکیں۔ ایک مرتبہ ایک آدمی نے کہا "عمرؓ خدا سے ڈر۔" اس نے کئی مرتبہ یہ بات دہرائی تو کسی نے اسے ٹوکا کہ "چپ رہ' تو نے امیر المومنینؓ کو بہت کچھ کہہ سنایا ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اسے مت روکو' یہ لوگ اگر ہم سے ایسی باتیں کہنا چھوڑ دیں' تو پھر ان کا فائدہ ہی کیا اور اگر ہم ان کی باتوں کو قبول نہ کریں تو ہمیں بھلائی سے عاری سمجھنا چاہئے اور بعید نہیں کہ یہ بات اپنے کہنے والے ہی پر چسپاں ہو جائے[2]۔

آپ کے عہد مبارک میں ہر شخص کو آپ پر تنقید کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ لوگ اپنے اس بنیادی حق کو بلا خوف و خطر استعمال کرتے تھے۔ آپ نے نہ تو کبھی ان کا منہ بند کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کبھی برا منایا' بلکہ معقول طریقے سے جواب دینا اپنی ذمہ داری سمجھا۔ اس کی ایک مثال وہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے پاس کہیں سے کچھ کپڑے بھیجے گئے' تو آپ نے انہیں لوگوں میں تقسیم کر دیا' ہر کسی کے حصے میں ایک ایک چادر آئی۔ پھر ایک دن (جمعہ کے خطبے کیلئے) منبر پر کھڑے ہوئے' تو آپ نے دو چادروں سے بنا ہوا ایک کرتہ پہنا ہوا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا "لوگو میری باتیں غور سے سنو۔" اس پر حضرت سلمانؓ

---

(۱) سعد ۳/۲۹۳' سیوطی ۱۳۰' (۲) یوسف ۱۲۴' جوزی ۱۰۶۔

بولے "نہیں ہم نہیں سنیں گے۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا "اے ابو عبداللہؓ! کیا بات ہے؟" انہوں نے جواب دیا "آپ نے ہمیں تو ایک ایک چادر دی ہے' لیکن آپ کے پاس پورا کرتہ ہے۔" آپ نے فرمایا "اے ابو عبداللہ! جلدی نہ کرو پھر آپ نے آواز دی "عبداللہ" لیکن کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔" پھر آپ نے آواز دی "اے ابو عبداللہ بن عمرؓ۔" اس پر عبداللہ بن عمرؓ بولے "امیر المومنین! میں حاضر ہوں۔" آپ نے فرمایا "میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا یہ تمہارا کپڑا نہیں ہے' جو میں نے پہنا ہوا ہے؟" انہوں نے جواب دیا "بخدا ایسا ہی ہے۔" اس پر حضرت سلمانؓ نے کہا "ہاں اب آپ کہئے تو ہم سنتے ہیں (۱)۔" مرد تو مرد عورتیں بھی اپنا حق تنقید کھل کر استعمال کرتی تھیں' چنانچہ جب آپ نے ایک خوبصورت نوجوان نصر بن حجاج کو عورتوں سے تعلقات قائم کرنے کے جرم میں شہر بدر کر کے بصرہ بھیج دیا' جب ایک زمانہ تک اسے وہاں رہنا پڑا' تو ایک دن اس کی ماں اذان اور اقامت کے درمیانی وقفے میں ان کے راستے میں کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں حضرت عمرؓ اپنا مخصوص درہ لئے ہوئے برآمد ہوئے' تو بولی "امیر المومنین! قیامت کے دن میں اور تم اللہ کے روبرو کھڑے ہوں گے اور اللہ تم سے محاسبہ کرے گا۔ یہ کیا کہ عبداللہؓ اور عاصمؓ تو تمہارے پہلو میں رہیں اور میرا بیٹا اس قدر دور کر دیا جائے کہ میرے اور اس کے درمیان بے شمار پہاڑ اور میدان حائل ہو جائیں؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "عبداللہؓ اور عاصمؓ عصمتوں پر ڈاکے نہیں ڈالتے پھرتے (۲)۔"

معاملہ آپ کی ذات کا ہو یا سرکاری پالیسی کا لوگ کھل کر اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے' آپ کا مقام و مرتبہ اور رعب و دبدبہ کبھی سد راہ نہیں بنتا تھا۔ آپ رائے عامہ کو اہمیت بھی دیتے تھے اور اپنے آپ کو عوام کے سامنے جوابدہ بھی سمجھتے تھے۔ آپ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو جب شام سے معزول کیا' تو عوام نے اس کا برا منایا۔ چنانچہ جب آپ وہاں کے دورے پر گئے تو جابیہ میں مجمع عام سے خطاب فرمایا' دیگر امور کے علاوہ اس واقعے کا بطور خاص اس طرح ذکر فرمایا "البتہ خالد بن ولیدؓ کے سلسلے میں تم لوگوں سے معذرت چاہوں گا' میں نے انہیں حکم دیا تھا کہ تمام مال و دولت کمزور اور بے سہارا مہاجرین کیلئے محفوظ رکھیں' لیکن انہوں نے یہ مال قوی اور ذی مرتبہ اور فصیح اللسان اشخاص پر صرف کر دیا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے ان سے لے کر حضرت ابو عبیدہؓ کو امیر بنا دیا۔" آپ کی اس وضاحت کے باوجود کئی لوگوں کو پورا اطمینان نہ ہوا' انہوں نے کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ حضرت حفصؓ بن المغیرہ اٹھے اور کہا "اے عمرؓ! یہ کیسی معذرت ہے؟ تم نے ایک ایسے سردار کو معزول کیا ہے' جسے رسول اللہ ﷺ نے سرداری سونپی تھی۔ تم نے ایک ایسی تلوار کو نیام میں کر دیا ہے' جسے رسول اللہ ﷺ نے بے نیام کیا تھا' تم نے ایک ایسے جھنڈے کو سرنگوں کر دیا ہے' جسے رسول اللہ ﷺ نے لہرایا تھا' تم نے قرابت کا کوئی خیال نہ کیا اور اپنے ابن عم سے حسد برتا۔" حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا "تم ان کے قریبی عزیز ہو اور کم عمر ہو' تمہیں اپنے چچیرے بھائی خالدؓ کے معاملے میں غائبانہ طیش آ گیا ہے (۳)۔"

آپ اپنی پالیسیوں کے بارے میں تمام اعتراضات و تجاویز کو نہایت کھلے دل و دماغ سے سنتے تھے اور ان کا خیر مقدم کرتے تھے' کیونکہ آپ یہ عوام کا حق بھی سمجھتے تھے اور فرض بھی کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کریں اور صحیح و غلط پر کڑی نظر رکھیں۔ اس وجہ سے کہ اسلامی نظام سیاست و مملکت کی روح ہی یہی ہے اور اس میں بے پناہ حکمتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ عوام کی حکومتی معاملات میں شرکت کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ معاملات کی اصلاح و بہتری کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تیسرا یہ کہ حکومت کو اپنے اقدامات کا شرعی جواز ڈھونڈنے اور عوام کے سامنے اس کی وضاحت کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور حکومت کے خلاف نفرت و مخالفت کا صحیح یا غلط لاوا دلوں ہی میں نہیں پکتا رہتا۔ آپ کے عہد خلافت کے بیسیوں واقعات اس کا ثبوت ہیں' ان میں سے ایک حسب ذیل ہے۔ عمران بن سواد روایت کرتے ہیں کہ میں نے صبح کی نماز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی۔ آپ نے سورہ سبحان اور ایک دوسری سورۃ پڑھی۔ جب آپ لوٹنے لگے'

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible]

تو میں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ آپ نے فرمایا "کیا کوئی ضرورت ہے؟" میں نے کہا "ہاں ایک ضرورت ہے۔" آپ نے فرمایا "ساتھ چلے آؤ۔" چنانچہ میں آپ کے ساتھ گیا جب آپ گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے مجھے اندر آنے کی اجازت دی۔ آپ ایک ایسے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے جس پر کچھ بچھا ہوا نہیں تھا۔ میں نے کہا "میں نصیحت کرنے اور خیر خواہی کرنے کیلئے آیا ہوں۔" آپ نے فرمایا "ناصح کا صبح شام خیر مقدم کیا جاتا ہے۔" میں نے کہا "مسلمان قوم کو آپ کی چار باتوں پر اعتراض ہے۔" یہ سن کر آپ نے اپنے درے کا سرا اپنی ٹھوڑی پر رکھ لیا اور نچلا حصہ اپنی ران پر رکھا' پھر فرمایا "ہاں بیان کرو۔" میں نے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کرنے کی ممانعت کر دی ہے' حالانکہ نہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا تھا اور نہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسا کرنا حلال ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "یہ حلال ہے' بشرطیکہ وہ حج کے مہینوں میں یہ سمجھ کر عمرہ ادا نہ کریں کہ حج کے بجائے وہ کافی ہے' حالانکہ حج اللہ کا اہم فریضہ ہے۔ اس معاملے میں درست طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے کو حرام قرار دیا ہے' حالانکہ اللہ کی طرف سے اس کی اجازت تھی۔ ہم قبضہ کر کے متعہ کیا کرتے تھے اور تین دن کے بعد (اس عورت کو) چھوڑ دیتے تھے۔" آپ نے فرمایا "رسول اللہ ﷺ نے اسے ضرورت کے زمانے میں حلال قرار دیا تھا' پھر لوگوں کی یہ ضرورت رفع ہو گئی تھی' کیونکہ اس کے بعد میں نے کسی مسلمان کو نہیں دیکھا کہ اس نے اس (متعہ) پر عمل کیا ہو اور نہ دوبارہ انہوں نے اس فعل کا اعادہ کیا۔ اب اگر ضرورت مند ہے' تو وہ باقاعدہ نکاح کرے اور اگر تین دن بعد چھوڑنا چاہے' تو طلاق دے کر چھوڑ دے' اس معاملے میں بھی میری رائے درست ہے۔"

(تیسری بات) میں نے یہ کہی "آپ لونڈی کو آزاد قرار دیتے ہیں جبکہ اس کے کوئی بچہ پیدا ہو' آپ اسے اس کے آقا کی مرضی کے بغیر آزاد قرار دیتے ہیں۔" آپ نے فرمایا "میں نے دو قسم کی حرمت و عزت کو ملا دیا ہے' میرا مقصد خیر خواہی ہے' بہر حال میں اللہ سے معافی کا خواستگار ہوں۔" میں نے کہا "رعایا آپ کی سختی اور تشدد کی شکایت کرتی ہے۔" اس بات پر آپ نے درہ کو اٹھایا اور اس پر ہاتھ پھیرتے رہے' پھر فرمایا "میں حضرت محمد ﷺ کا زمیل (ہمرکاب) ہوں (آپ کا اشارہ تھا کہ آپ غزوۂ قرقرہ میں حضور ﷺ کے پیچھے بیٹھے تھے)۔" پھر فرمایا "خدا کی قسم! میں پیٹ بھر کر کھاتا ہوں اور سیراب ہو کر پیتا ہوں' میں لوگوں کو دھمکاتا بھی ہوں اور اپنی عزت کی مدافعت بھی کرتا ہوں۔ کبھی لوگوں کو ہاتھ سے ہٹاتا ہوں' کبھی مارتا ہوں' کبھی عصا بھی نکالتا ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی' تو میں معذور سمجھا جاتا۔" جب حضرت امیر معاویہؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی' تو انہوں نے فرمایا "خدا کی قسم' حضرت عمرؓ اپنی رعایا سے بخوبی واقف تھے[1]۔"

ذاتی حیثیت میں وہ عام آدمی کی طرح رہتے تھے۔ روزمرہ کے معاملات میں انہیں کوئی اضافی سہولیات یا مراعات حاصل نہیں تھیں' یہاں تک کہ عام لوگ بھی بین دین اور رویے میں انہیں کوئی خصوصی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ محض اسلامی انداز سیاست اور آزادیٔ فکر و عمل ہی کا نتیجہ تھا۔ اس سلسلے میں تاریخ ہمارے سامنے ایک حیران کن واقعہ پیش کرتی ہے۔ صبح بن نباتہ کا بیان ہے کہ میں اور میرے والد رود (ایک مقام) سے چلے اور صبح ہوتے ہی مدینے پہنچ گئے۔ صبح صادق کا وقت تھا' لوگ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ جب لوگ فارغ ہوئے تو بازاروں میں اپنے اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں ایک شخص پنادرہ ہاتھوں میں لیے ہماری طرف بڑھا اور کہا "اعرابی کیا اسے بیچو گے۔" آخرکار اس نے میرے والد کو اسی قیمت پر راضی کر لیا' جو وہ چاہتا تھا' یہ عمر بن الخطابؓ تھے۔ پھر وہ بازار کا چکر لگانے لگے اور لوگوں کو بین دین اور معاملات میں تقوی کی ہدایت فرمانے لگے۔ وہ بازار کے کبھی ایک سرے تک جاتے اور کبھی دوسرے سرے تک۔ ایک مرتبہ وہ میرے والد کے پاس سے گزرے' تو میرے والد نے کہا "مجھے ابھی تک دام نہیں ملے' کیا یہی وعدہ تھا آپ کا؟" جب دوسری مرتبہ سامنا ہوا' تو میرے والد

---

(۱) طبری ۳: ۲۲۴

نے پھر اسی طرح کہا، تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا "جب تک میں (رقم ادا کرنے کا) وعدہ پورا نہیں کروں گا نہیں جاؤں گا۔" جب تیسری مرتبہ حضرت عمرؓ وہاں سے گزرے، تو میرے والد غصے سے جھپٹ پڑے اور ان کا گریبان پکڑ لیا اور کہا "تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے اور میرے ساتھ ظلم و زیادتی کی ہے" اور دست و گریبان ہو گئے۔ اس پر لوگ میرے والد پر ٹوٹ پڑے اور کہنے لگے "اے دشمن خدا! تو نے امیر المومنین سے یہ جسارت کی ہے؟"

حضرت عمرؓ نے میرے والد کا گریبان اس مضبوطی سے تھام لیا کہ وہ بے بس ہو گئے کیونکہ وہ تھے بھی بے حد شدید اور قوی، پھر وہ انہیں لے کر قصاب کی دکان پر پہنچے اور کہا "میں نے تمہیں قسم دلائی تھی کہ اس شخص کو اس کا حق دے دینا اور مجھے میرا منافع۔" قصاب نے کہا "امیر المومنین میں نے ابھی تک ایسا نہیں کیا لیکن میں ابھی اس شخص کو اس کا حق دیئے دیتا ہوں اور آپ کو آپ کا منافع۔" قصہ یہ تھا کہ عمرؓ نے میرے والد سے قصاب کیلئے جانور خرید لئے تھے، میرے والد کو جانوروں کی قیمت ملنی تھی اور حضرت عمرؓ کو منافع، چنانچہ جب میرے والد کو ان کا حق مل گیا تو حضرت عمرؓ بولے "کیا تمہیں تمہارا حق مل گیا ہے؟" میرے والد نے کہا "ہاں!" انہوں نے فرمایا "لیکن ہمارا حق ابھی باقی ہے، تم نے مجھے زدوکوب کیا، مکے رسید کئے اور میں نے جوابی کارروائی کو اللہ کی خاطر ترک کر دیا۔" اصبغ کہتے ہیں وہ منظر اب تک میری نظروں کے سامنے ہے۔ "پھر حضرت عمرؓ نے بائیں ہاتھ میں منافع کی ران اٹھائی اور دائیں ہاتھ میں درہ اور اسی عالم میں پورے بازار سے گزر گئے اور اپنے اونٹ پر جا بیٹھے[۱]۔

آپ پر بلاخوف و خطر تنقید کی ایک مثال وہ بھی ہے کہ جب آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو تین مرتبہ سلام کرنے اور جواب نہ آنے کی صورت میں واپس لوٹ جانے کی حدیث کا گواہ لانے کیلئے کہا، تو یہ فیصلہ ہوا کہ شام کو مسجد کے منبر کے پاس وہ گواہ پیش کریں گے۔ مسلم کی روایت کے مطابق جب آپ منبر کے پاس آئے، تو پوچھا "ابو موسیٰ تم کیا کہتے ہو؟ کیا کوئی گواہ ملا ہے؟" انہوں نے جواب دیا ہاں ابی بن کعب ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "بے شک وہ معتبر ہیں۔" پھر ابی بن کعب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "اے ابو الطفیل ابو موسیٰ کیا کہتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "اے ابن خطاب کے بیٹے صحابہ رسول ﷺ پر عذاب مت ہو" حضرت عمرؓ نے یہ جواب سن کر فرمایا "واہ! سبحان اللہ میں نے تو ایک حدیث سنی اور یہ مناسب سمجھا کہ اس کی تحقیق کروں[۲]۔" ان واقعات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ایک مسلمان حکمران کو کھلی کتاب کی طرح معاشرے میں رہنا چاہئے۔ اسے یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ اپنے رعب و دبدبے، سماجی مقام اور اختیارات کے بل بوتے پر لوگوں کی زبانیں بند کرے اور ابلاغ کے ذرائع پر قدغن لگائے اور اپنے اردگرد خوشامدیوں کا ایک حصار کھینچ لے اور ان کی داد و ستائش کے نغموں میں بدمست ہو جائے، بلکہ اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ ناقدین کو حوصلہ دے، آزادیٔ رائے کو برقرار رکھے اور عوام کے اندر چل پھر کر اپنا اور اپنی پالیسیوں کا جائزہ لے۔ ہر بات کا دلیل سے جواب دے اور اپنی پوزیشن صاف رکھے اور اپنے روزمرہ کے طرز عمل سے یہ ثابت کرے کہ وہ بھی عام لوگوں کی طرح ایک انسان ہے۔ اس کے اندر یہ حوصلہ بھی ہونا چاہئے کہ تلخ باتوں اور سخت رویوں کو بھی خوشدلی سے برداشت کرے اور اپنے عدل و انصاف میں ذرا برابر بھی کمی نہ آنے دے۔

۲۔ باخبری:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذاتی اصلاح کے بعد دوسرا اہم سیاسی و انتظامی اصول باخبری تھا۔ ایک حکمران تمام ذاتی اعلیٰ اوصاف رکھنے کے باوجود کبھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ مجموعی سیاسی احوال، مملکت اور اس کے تمام شعبوں کے معاملات اور عوام کے افکار و رجحانات اور ہر طرح کے احوال کے بارے میں صحیح طور پر باخبر نہ ہو۔ جب تک سے حالات کی تغیر پذیری اور اس کی کیفیت و وسعت اور اثرات و نتائج کا شعور نہ ہو۔ وہ کبھی اپنی اجتہادی بصیرت

(۱) [illegible] (۲) مسلم [illegible]

کو استعمال کر کے امن و استحکام اور تعمیر و ترقی کی نئی راہیں تلاش نہیں کر سکتا۔ سیاسی امور کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ ہر دم تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہر وقت حالات کی نبض پر ہاتھ رہنا ضروری ہوتا ہے' یہ صرف باخبری ہی سے ممکن ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس حقیقت کا گہرا شعور رکھتے تھے اس لئے انہوں نے عوام کے احوال مختلف علاقوں اور گوشوں کے ہر طرح کے حالات اور حکومت کے اداروں اور کارندوں کی کارکردگی اور ان کے تاثر کو جاننے کیلئے اپنے عہد کے تمام ممکنہ وسائل اور طریقوں کو استعمال کیا۔ انہیں عوام کے مسائل اور ان کی مشکلات اور رائے عامہ کے بارے میں بسا اوقات وہاں کے رہنے والوں سے بھی زیادہ معلومات ہوتی تھیں کیونکہ وہ مختلف اور متفرق ذرائع سے حاصل ہوتی تھیں' جس کے نتیجے میں ان کی ہر پالیسی متعلقہ علاقوں کے معروضی حالات' وہاں کی نفسیات و رجحانات اور ضروریات کے عین مطابق ہوتی تھی' اس لئے اسے مکمل پذیرائی نصیب ہوتی تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا تھا کہ ہر جگہ کے لوگ مرکز کی گرفت اور نظر کا ادراک رکھتے ہوئے اپنے معاملات چلاتے تھے۔ انہیں یہ بات اطمینان دلاتی تھی کہ خلیفہ وقت ان کے احوال سے پوری طرح باخبر ہے اور ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہے۔ ایک مرتبہ سفر شام کے موقع پر اعوص میں تقریر کے دوران فرمایا ''تم اپنی شکایات ہم تک پہنچاؤ' جو شخص شکایات پہنچانے کی استطاعت نہیں رکھتا' تو وہ جس شخص تک انہیں پہنچا سکتا ہے پہنچا دے۔ ہم بلا خوف اس کا حق وصول کریں گے''[1]۔

معاملات کے بارے میں ان کی باخبری کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے کوئی آدمی جھوٹ یا دغا کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اس کی اطلاع ہو گی' یہی وجہ ہے کہ بقول ابن کثیر جب ان کے سامنے کوئی شخص دو باتیں کہتا اور ان میں سے ایک غلط ہوتی' تو فوراً کہتے کہ اسے روکو' اسے روکو[2]۔ اس وجہ سے ان کے پاس عموماً جو اطلاعات اور خبریں پہنچتی تھیں' پھر وہ ہر خبر پر یقین نہیں کرتے تھے' بلکہ مختلف اور ذرائع سے بھی اس کی تصدیق کرتے تھے۔ یہ چیز ان کے سیاسی و انتظامی لائحہ عمل کیلئے بہت مفید تھی۔ آپ کی باخبری عوام کی دینی' اخلاقی' تمدنی' معاشی' سیاسی اور فکری و ذہنی ہر طرح کی حالتوں کے بارے میں ہوتی تھی۔ آپ کی بڑی بڑی پالیسیوں' فیصلوں اور اقدامات کی بنیاد عام طور پر وہی اطلاعات و معلومات ہوتی تھیں' جو بالواسطہ یا بلاواسطہ حاصل ہوتی تھیں۔

(الف) براہ راست معلومات:

عوام کے حالات سے باخبر رہنے کا ان کا پہلا اہم ذریعہ طرز بود و باش تھا' وہ ہر وقت عوام ہی کے اندر رہتے تھے۔ ان کا رہن سہن اوسط درجے کے عام آدمی کی طرح تھا۔ نہ کوئی محل' نہ کوئی دربان' نہ کوئی دفتر' نہ خدمت گزاروں اور خوشامدیوں کی کوئی ٹیم۔ نہ ہٹو بچو کی صدائیں لگانے والے محافظ' حکومتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے بھی اور ذاتی اور گھریلو ضروریات کی تکمیل کیلئے بھی ایک عام آدمی کی طرح مسجدوں' گلیوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر طرح کے لوگوں سے رات دن ان کا رابطہ رہتا تھا' ان کے افکار و خیالات کے جاننے' ان کے مسائل و مشکلات کا جائزہ لینے اور ان کے احوال کو جانچنے کیلئے انہیں کسی اور کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں تھی' وہ براہ راست ان سے باخبر رہتے تھے۔ حقائق سے اس قسم کا تعلق اور قرب نہ تو آپ کے عہد کے دیگر حکمرانوں کو میسر تھا اور نہ ہی آج کل کے حکمرانوں کو میسر ہے۔ یہ بات آپ کی سیاست کو سربلندی عطا کرنے کا سبب ہے۔ آپ کے عوامی انداز اور لوگوں سے قریبی تعلق کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب کسریٰ کے خلاف فوجی مہمات کے دوران اہواز کے بادشاہ کو گرفتار کر کے ایک وفد کے ساتھ مدینے لایا گیا' تو وفد سب سے پہلے آپ کے گھر آیا۔ وہاں انہیں یہ خبر ان کی خبر ملی کہ آپ کوفہ سے آنے ہوئے ایک اور وفد کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہیں۔ یہ سن کر وہ لوگ تلاش کرتے ہوئے مسجد گئے' وہاں بھی وہ نہیں ملے' تو جب وہ لوٹنے لگے' تو مدینے کے لڑکوں کے پاس سے گزرے' جو کھیل رہے تھے۔ لڑکوں نے کہا ''کیا امیر المومنین کو تلاش کر رہے ہو؟

---

(۱) ایضاً II، ۳۰۰ (۲) ایضاً II، ۱۳۴

وہ تو مسجد کے دائیں طرف سوئے ہوئے ہیں اور اپنی ہی ٹوپی کو تکیہ بنایا ہوا ہے۔" جب لوگ دوبارہ مسجد پہنچے تو ہرمزان نے پوچھا "(حضرت) عمرؓ کہاں ہیں؟" لوگوں نے کہا کہ یہ ہیں۔ اس نے پوچھا۔ "ان کے محافظ اور دربان کہاں ہیں؟" لوگوں نے بتایا کہ ان کا نہ کوئی محافظ ہے اور نہ کوئی دربان نہ تو کوئی سیکرٹری اور نہ ہی دفتر۔ وہ بولا "پھر تو یہ پیغمبر ہیں۔" لوگوں نے جواب دیا "پیغمبر تو نہیں ہیں لیکن کام پیغمبروں والے کرتے ہیں۔" اتنے میں لوگوں کی بھیڑ ہو گئی اور حضرت عمرؓ شوروغل سے بیدار ہو کر اٹھ بیٹھے[1]۔ آپ کے اندازو اطوار کی بہترین منظر کشی حضرت قتادہ کے اس بیان میں ہمیں ملتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہونے کے باوجود پھٹا ہوا کپڑا جس میں چمڑے کا پیوند لگا ہوتا تھا پہن لیتے تھے اور اسی حالت میں ہاتھ میں درہ لئے بازار چلے جاتے تھے اور اس سے لوگوں کو آداب سکھاتے اور تنبیہ کرتے تھے۔ اگر آپ کے سامنے ترکش کی پرانی رسی یا چھوارے کی گٹھلی آجاتی تو اسے اٹھا کر لوگوں کے گھروں میں پھینک دیتے تھے تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں[2]۔

عوام کے درمیان رہنے اور ان جیسا رہن سہن اختیار کرنے اور ان سے بلا روک ٹوک ملنے جلنے کا طرز سیاست بے شمار حکمتوں کا حامل تھا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ حکمران کیلئے یہی ہوتا ہے کہ اسے صحیح معلومات سے باخبری حاصل ہوتی ہے۔ ان کی یہ پالیسی صرف اپنی ذات تک محدود نہیں تھی بلکہ ریاست کے تمام عمال کیلئے تھی۔ ابن خزیمہ بن ثابت انصاری بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جب کسی کو حاکم مقرر کرتے تھے اس سے ایک معاہدہ لکھواتے تھے جس پر مہاجرین وانصار کے ایک گروہ کو گواہ ٹھہراتے تھے جس میں یہ شرائط ہوتی تھیں کہ وہ عمدہ سواری پر سوار نہیں ہوگا نہ میدہ کی روٹی کھائے گا نہ باریک لباس پہنے گا اور عوام کی ضروریات کو روکنے کیلئے دروازہ بند نہیں کرے گا۔ پھر کہتے تھے "اے اللہ! گواہ رہنا[3]۔" اسی طرح حکام کو جو نصائح لکھتے تھے ان میں یہ بات بھی ہوتی تھی "ائمہ اور قائدین کی بے خبری سے زیادہ نقصان دہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی[4]۔"

آپ چلتے پھرتے لوگوں کے حالات سے باخبری کے ساتھ ساتھ ان کی مشکلات و تکالیف کا موقع پر ہی ازالہ کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کی ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک آدمی کو یہ کہتے سنا "اے عمرؓ خدا سے ڈرو تم اس شخص کو حاکم مقرر کرتے ہو جو تمہاری شرائط کی خلاف ورزی کرتا ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔" آپ نے اس کو بلوایا تو اس نے عیاض بن غنم کے بارے میں شکایت کی۔ آپ نے انہیں مدینے میں طلب کیا، بکریاں چرانے کا حکم دیا انہوں نے معذرت کی۔ آپ نے یہ نصیحت کی کہ وہ باریک کپڑا نہیں پہنے گا اور نہ ہی عمدہ سواری پر سوار ہوگا[5]۔" ایک مرتبہ بازار میں حاطب بن ابی بلتعہ کو معروف نرخ سے کم پر منقیٰ بیچتے ہوئے دیکھا تو آپ کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اس طرح جائز نرخ پر بیچنے والے دیگر تاجروں کا نقصان ہوگا تو اسے یہ حکم دیا کہ "یا تو اپنے نرخ بڑھا دو یا پھر ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ[6]۔" براہ راست حالات سے باخبر رہنے کا آپ کا ایک اور طریقہ ملاقات کی عام اجازت تھی۔ آپ کا گھر ہو یا مسجد ہر جگہ ہر وقت ہر آدمی ہر طرح کا مسئلہ لے کر حاضر ہو سکتا تھا۔

حضرت کعب الاحبارؓ کہتے ہیں کہ میں مدینے میں ایک شخص جس کا نام مالک تھا کا مہمان ہوا۔ وہ حضرت عمر فاروقؓ کا ہمسایہ تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ امیر المومنین سے ملاقات کرنے کا کیا طریقہ ہے؟" اس نے جواب دیا "ان سے ملنے کیلئے نہ کسی دروازے کی رکاوٹ ہے نہ ہی پردے کی وہ نماز پڑھاتے ہیں پھر بیٹھ جاتے ہیں جو چاہے ان سے گفتگو کر سکتا ہے[7]۔" براہ راست باخبری کا ایک اور منفرد اور تاریخ عالم میں تابندہ مثال بن کر جگمگانے والا طریقہ جو انہوں نے اختیار کیا

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible]

[illegible]

وہ گشت کا تھا۔ رات کے سائے جب گہرے ہو جاتے اور لوگ اپنے بستروں پر میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہوتے، تو ان کا حقیقی محافظ ان کی حفاظت و نگرانی اور دیکھ بھال کیلئے کبھی کیلا اور کبھی کسی کو ساتھ لے کر گشت کر رہا ہوتا تھا۔ وہ اپنے گھر کے گرد چوکیدار رکھنے کے بجائے رعایا کے گھروں کی چوکیداری کر رہا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ باہر سے آ کر مدینے میں قیام کرنے والے قافلوں کی حفاظت بھی خود ہی جا کر کرتا تھا۔ اس دوران بارہا ایسے واقعات پیش آئے، جن میں آپ نے نہ صرف یہ کہ لوگوں کی حاجت روائی کی اور موقع پر ان کی مشکلات و تکالیف دور کیں، بلکہ آپ کے بہت سے مشاہدات حکومت کی مروجہ پالیسیوں کو تبدیل کرنے کا باعث بھی بنے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں، ان سے اس گشت کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اوزاعی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ رات کی تاریکی میں (عوام کے احوال جاننے کیلئے) گھر سے نکلے، تو حضرت طلحہؓ کی آپ پر نظر پڑ گئی۔ انہیں تجسس ہوا اور انہوں نے آپ سے نظریں بچا کر پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ آپ ایک گھر میں داخل ہو گئے، حضرت طلحہؓ ایک اور گھر میں چلے گئے۔ صبح ہوئی، تو وہ اس گھر میں گئے، دیکھا کہ ایک اپاہج بڑھیا بیٹھی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ یہ آدمی تمہارے پاس کیوں آتا ہے؟" بڑھیا نے جواب دیا کہ "یہ تو ایک مدت سے میرے پاس آتا ہے اور میری خدمت بھی کرتا ہے اور میرے دکھ درد کا مداوا بھی کرتا ہے۔" یہ سن کر حضرت طلحہؓ پکار اٹھے "طلحہ تیری ماں تجھے روئے تو عمرؓ کا کھوج لگاتا ہے"[1]۔ "براہ راست باخبر رہنے کا آپ کا ایک اور اہم ذریعہ دورے تھے۔ قریب و نزدیک کے علاقوں تک براہ راست پہنچنا ان کی خواہش و کوشش ہوتی تھی۔ مدینے کے گرد و نواح سے باخبر رہنے اور وہاں کے لوگوں کے مسائل و مشکلات کے حل کیلئے انہوں نے ہفتے میں ایک دن مخصوص کر رکھا تھا۔ چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب ہر ہفتے کے دن مدینے کے آس پاس گاؤں میں جایا کرتے تھے۔ جب کسی غلام کو ایسے کام میں مشغول پاتے، جو اس کی طاقت سے زیادہ ہوتا تھا، تو اسے کم کر دیا کرتے تھے[2]۔ جہاں تک دور دراز کے علاقوں کا تعلق ہے، تو ان کے حالات سے وہ عہد جاہلیت میں منصب سفارت کی ذمہ داریوں اور متعدد تجارتی سفروں کی بنا پر باخبر تھے۔ عہد خلافت میں بھی شام و عراق مفتوح ہوئے تو مرکز میں کام کے بوجھ، نئے اداروں کی تعمیر و تشکیل کی کاوشوں اور آمد و رفت کی بے شمار دقتوں کے باوجود آپ نے متعدد دورے کئے۔ صرف شام کے مختلف علاقوں میں چار مرتبہ سفر پر نکلے[3]۔ عراق کے خلاف مہمات کے دوران آپ کی یہ خواہش تھی کہ خود لشکر کی کمان سنبھالیں، لیکن صحابہ کرامؓ کے مشورے کی بنیاد پر آپ نے مدینے میں قیام قبول کیا[4]۔

اپنی شہادت سے قبل آپ یہ پختہ عزم کر چکے تھے کہ اپنی وسیع عریض سلطنت کا تفصیلی دورہ کریں گے۔ چنانچہ حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا "اگر میں زندہ رہا، تو ان شاء اللہ ایک سال تک رعایا کے علاقوں کا دورہ کروں گا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ لوگوں کے بہت سے اہم کام مجھے بتائے نہیں جاتے کیونکہ ان کے حکام وہ ضروری باتیں مجھ تک نہیں پہنچاتے ہیں اور تمام لوگ مجھ تک خود نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے میں شام جاؤں گا اور وہاں دو مہینے قیام کروں گا، پھر جزیرہ کے علاقے جاؤں گا وہاں بھی دو مہینے رہوں گا پھر مصر جاؤں گا وہاں بھی دو ماہ قیام کروں گا پھر بحرین کا سفر کروں گا وہاں بھی دو ماہ رہوں گا، پھر کوفہ آؤں گا وہاں بھی دو ماہ بسر کروں گا۔ سب سے آخر میں بصرہ جاؤں گا، وہاں بھی دو مہینے رہوں گا۔ خدا کی قسم یہ سال نہایت ہی عمدہ سال ہو گا"[5]۔ زندگی نے انہیں اس عظیم مشن کی مہلت تو نہ دی، لیکن وہ اپنے پورے عہد خلافت میں بالواسطہ طور پر بہر حال ممکنہ حد تک بیشتر مسائل و حالات سے باخبر ضرور رہے۔

(ب) بالواسطہ باخبری:

آپ نے بالواسطہ سلطنت کے عوام اور ان کے علاقوں سے متفرق مسائل و معاملات سے باخبر رہنے کیلئے چار مختلف طریقے اختیار فرمائے۔ ان میں ایک طریقہ وفود

(۱) [illegible] (۲) مالک: ۹۸۰ (۳) طبری: ۱۰۹/۴، کنز: ۵۹/۷ (٤) مسعودی: ۳۱۷/۲ (۵) طبری: ۲۰۱/٤، حور: ۱۲۳

کا تھا۔ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے وفدوں اور لوگوں سے پورے جوش و جذبے سے ملاقات فرماتے اور ان سے ہر چھوٹے بڑے مسئلے کے بارے میں سوالات کرتے اور ہر طرح کی معلومات حاصل کرتے اور پوری توجہ اور دلچسپی سے مسائل کا جائزہ لے کر حسب ضرورت ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ فتوحات ایران کے دنوں میں سلمہ ابن قیس نے غنیمت میں حاصل ہونے والے جواہرات ایک قاصد کے ذریعے آپ کی طرف روانہ کئے تو آپ نے اس کا خیر مقدم کرنے کے بعد فوری طور پر وہاں کے حالات کی تفصیل پوچھنا شروع کر دی۔ بقول قاصد آپ نے پوچھا "تم مجھے مہاجرین کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کیسے ہیں؟" میں نے عرض کیا "اے امیر المومنینؓ! وہ جیسا کہ آپ چاہتے ہیں خیریت سے ہیں اور اپنے دشمنوں پر انہوں نے فتح و نصرت حاصل کر لی ہے۔" پھر آپ نے پوچھا "ان کے بھاؤ کیسے ہیں؟" میں نے کہا "وہاں کے نرخ سب سے ارزاں ہیں۔" آپ نے پوچھا "گوشت کا بھاؤ کیا ہے؟ کیونکہ وہ عربوں کا ایک ایسا درخت ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔" میں نے کہا: "گائے کا یہ بھاؤ ہے اور بھیڑ بکری کا یہ بھاؤ ہے[1]۔"

ایک ہی علاقے سے بسا اوقات کئی کئی وفود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ بصرہ سے کئی وفود بیک وقت پہنچے ہوئے تھے تو آپ نے حکم دیا سب مل کر اپنی ضروریات پیش کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا' مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں باتیں بتائیں۔ ایک وفد میں احنف بن قیس بھی شامل تھے' وہ کھڑے ہوئے اور کہا "اے امیر المومنین! آپ کی وہی حیثیت ہے' جیسا کہ انہوں نے بیان کی ہے۔ البتہ ہم کبھی کبھی آپ کو خبریں نہیں پہنچا سکتے' جن سے عوام کے مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ اس وقت حاکم نظروں سے اوجھل باتوں پر تجربوں کے نقطہ نظر کے مطابق ہی غور کر سکتا ہے جو بات وہ سنتے ہیں اس کے مطابق اسے علم حاصل ہوتا ہے۔ ہم لوگ منزل بمنزل فروکش ہوتے رہے' یہاں تک کہ ہم ایک خشکی کے حصے میں مقیم ہوئے۔ ہمارے بھائی اہل کوفہ ایک نہایت ہی عمدہ مقام پر آباد ہیں' جہاں شیریں چشمے اور سرسبز باغات ہیں اور انہیں ہر قسم کے پھل میسر ہیں مگر ہم اہل بصرہ خراب اور دلدلی زمین میں آباد ہیں۔ اس کا ایک حصہ جنگل ہے اور ایک حصہ کھاری سمندر کے قریب ہے۔ ہمارے گھر آدمیوں سے بھرے ہوئے ہیں' ہماری تعداد زیادہ ہے' مگر وظیفہ بہت کم ہے۔ ہمارے اندر شرفاء کی تعداد کم ہے اور مصیبت زدہ لوگ زیادہ ہیں۔ ہمارا سکہ (درہم) بڑا ہے' مگر پیمانہ چھوٹا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں وسعت دی ہے اور (فتوحات کے ذریعے) ہماری زمینوں میں اضافہ کیا ہے۔ لہٰذا اے امیر المومنینؓ! آپ ہمارے وظائف میں اضافہ کریں اور ہمیں مزید اراضی دیں' تاکہ ہم بسر اوقات کر سکیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان کے گھروں اور بستیوں کے بارے میں تحقیقات کرائی اور انہیں مزید اراضی اور جاگیریں دیں[2]۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ مجھے ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "اشعریؓ کو کس حالت میں چھوڑا ہے؟" میں نے کہا کہ انہیں اس حالت میں چھوڑا ہے کہ وہ قرآن پڑھا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا "دیکھو وہ عقیل و فہیم ہیں' مگر یہ بات ان تک نہ پہنچانا۔" پھر مجھ سے فرمایا کہ "تم نے اعراب کو کس حالت میں چھوڑا ہے؟" میں نے پوچھا "کیا اشعریوں کو؟" آپ نے فرمایا "نہیں بلکہ اہل بصرہ کو!" میں نے کہا کہ "اگر یہ بات ان تک پہنچے تو انہیں ناگوار گزرے۔" آپ نے فرمایا "انہیں خبر نہ کرنا' ہیں تو وہ اعراب ہی مگر یہ کہ اللہ کوئی ایسا آدمی عطا کرے جو اس کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو[3]۔"

(ج) خطوط:

آپ کیلئے حالات سے باخبر رہنے کیلئے بالواسطہ ایک اور ذریعہ خطوط کا تھا۔ آپ کا خطوط کے ذریعے تمام عمال' عساکر اور دیگر ذمہ داران سے ہر وقت رابطہ رہتا تھا۔ تمام اہم معاملات اور فوجی مہمات کے سلسلے میں مرکزی کنٹرول ہوتا تھا اور براہ راست آپ ہی کی منصوبہ بندی اور ہدایت کے مطابق عمل کیا جاتا تھا اس لئے آپ

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible]

کو ہر معاملے سے باخبر رکھا جاتا تھا اور تواتر کے ساتھ آپ کے پاس خطوط ارسال کیے جاتے تھے اور ان میں ہر نوعیت کی تمام ضروری معلومات فراہم کی جاتی تھیں' تاکہ آپ کو صحیح فیصلے تک پہنچنے اور احکامات جاری کرنے میں آسانی ہو۔ اگر کہیں آپ تشنگی محسوس کرتے' تو حکم جاری کرنے سے پہلے وضاحت طلب فرماتے تھے۔ علامہ شبلی کے بقول "حضرت عمرؓ کی بڑی کوشش اس بات پر مبذول رہتی تھی کہ ملک کا کوئی واقعہ ان سے مخفی نہ رہنے پائے۔ انہوں نے انتظامات ملکی کے ہر صیغہ پر پرچہ نویس اور واقعہ نگار مقرر کر رکھے تھے' جس کی وجہ سے ملک کی ایک ایک خبر اور واقعہ ان تک پہنچتا تھا۔" طبری لکھتے ہیں "عمرؓ پر کوئی بات مخفی نہیں رہتی تھی' عراق کے جن لوگوں نے خروج کیا اور شام میں جن لوگوں کو انعام دیئے گئے سب کی تحریری اطلاعات ان کو پہنچیں[1]۔" حضرت عمرؓ نے نعمان بن عدی کو میسان (زیریں عراق) کا افسر خراج مقرر کیا' جب وہ مدینے سے جانے لگے' تو ان کی بیوی وطن چھوڑ کر پردیس جانے کیلئے تیار نہیں ہوئیں۔ ان کو مجبوراً اکیلے جانا پڑا۔ میسان کی شادابی اور آسائش انہیں بہت بھائی' تو انہوں نے بیوی کو بلانے کیلئے چند شوق انگیز شعر لکھ کر بھیجے جن میں دو حسب ذیل ہیں

من مبلغ الحسناء ان حليلها

بميسان يسقى في زجاج و حنتم

لعل امير المؤمنين يسوئه

تنادمنا في الجوسق المتهدم

(کوئی ہے جو میری حسین بیوی کو یہ خبر پہنچائے کہ تمہارے شوہر کو شیشے کے گلاس اور فیروزی جگ میں شراب پلائی جاتی ہے اگر امیر المومنین کو معلوم ہو جائے کہ میں ساتھیوں کے ساتھ ٹوٹے قلعہ میں بیٹھ کر شراب پیتا ہوں تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ناراض ہوں گے۔) حضرت عمرؓ کو میاں بیوی کے اس ذاتی معاملے کی بھی اطلاع ہو گئی اور انہوں نے معزولی کا خط بھیج دیا' اس میں لکھا "بلاشبہ تمہارے یہ اشعار مجھے برے لگے ہیں' میں تمہیں معزول کرتا ہوں۔" نعمان جب مدینے پہنچے' تو ان سے حضرت عمرؓ نے وضاحت طلب کی۔ انہوں نے جواب دیا "وہ تو محض شاعرانہ تفریح تھی' میں نے تو شراب سونگھی تک نہیں۔ ان شعار سے بیوی کو اکسانا مقصود تھا۔" حضرت عمرؓ نے عذر قبول کرتے ہوئے فرمایا "میرا بھی یہی خیال ہے' مگر آئندہ تمہیں کوئی عہدہ نہیں دینا[2]۔" آپ کا رابطہ بذریعہ خطوط صرف عمال سے نہیں' بلکہ پوری رعایا اور ضرورت مندوں سے رہتا تھا' جو دار الخلافہ کی طرف آنے جانے والے لوگوں' سرکاری و غیر سرکاری وفود اور حج کی غرض سے آنے والے لوگوں کے ذریعے اپنے احوال اور مسائل سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ آپ ان کی روشنی میں مختلف اقدامات کرتے رہتے تھے۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جب آپ کا کوئی قاصد کسی مقام پر جاتا تو واپسی پر باقاعدہ منادی کرادی جاتی تھی کہ کوئی شخص اگر خط بھیجنا چاہے' تو لکھ کر دے دے۔ اس کا اندازہ اسی روایت سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بصرہ کے عامل کو ہدایت روانہ کیں۔ ان کا قاصد کئی دن تک بصرہ میں رکا رہا اور جب وہاں سے روانہ ہونے لگا' تو اعلان کرا دیا گیا کہ سرکاری ہرکارہ روانہ ہونے کو ہے جو امیر المومنین کو کچھ لکھنا چاہے لکھ کر بھیجے[3]۔

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible]

۳۔ مشاورت:

مشاورت اسلامی نظام زندگی کا ایک بنیادی اصول ہے۔ سیاسی و انتظامی معاملات میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اسلام نے کسی شخص کو یہ حق نہیں دیا کہ غیر منصوص مشترکہ معاملات میں ذاتی مرضی و من مانی کو مسلط کرے' چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے "امرھم شوری بینھم"[1]۔ "(اپنے معاملات آپس میں مشورے سے چلاتے ہیں۔)

حضرت عمر فاروقؓ جیسا فہیم و بصیر شخص اس کی تمام حکمتوں اور تقاضوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ آپ نے اپنے پورے عہد حکومت میں' اس پر عمل کیا اور اس کی نزاکتوں اور دائروں کا لحاظ رکھا اور ایک مستحکم سیاسی نظام قائم کر کے دکھایا۔ ذیل میں کچھ ایسے واقعات درج کئے جا رہے ہیں' جن سے ایک طرف آپ کی اجتہادی بصیرت کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف عصر حاضر میں ہماری رہنمائی کے بے شمار پہلو سامنے آتے ہیں۔ عامر سے مروی ہے کہ جب کسی امر میں لوگ اختلاف کرتے تھے تو میں دیکھتا کہ حضرت عمرؓ نے اس بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے کیونکہ وہ کسی معاملے میں اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتے تھے' جب تک ان سے قبل اس بارے میں فیصلہ نہ کیا گیا ہو۔ یہاں تک کہ آپ مشورہ لیتے تھے[2]۔

اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مشاورت کا دائرہ ایک تو اس لئے وسیع رکھتے تھے تاکہ سابقہ کئے گئے فیصلوں کا پوری طرح علم ہو سکے اور مستقل پالیسی کا تسلسل جاری رہ سکے۔ دوسرا یہ کہ نئے معاملے میں دیگر لوگوں کی آراء بھی سامنے آسکیں اور فیصلہ حق و انصاف' یکسوئی' شعور اور اتفاق سے ہو سکے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے نفاذ میں مشکل پیش نہیں آتی۔ آپ اس مشاورتی طرز عمل کو گہری بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے اور یہ خواہش رکھتے تھے کہ لوگوں کی اچھی طرح تربیت کریں' بصیرت و فراست جہاں جہاں پائی جاتی ہے' اس کی حوصلہ افزائی کریں اور ہر پیر و جواں کے اندر پائی جانے والی اس صلاحیت و استعداد اور پوشیدہ جوہر کو نکھرنے کا موقع دیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی مجلس میں جوان اور بوڑھے علماء ہر وقت موجود رہتے تھے اور کبھی کبھی حضرت عمرؓ ان سے مشورہ کرتے وقت یہ وضاحت بھی کر دیا کرتے تھے کہ کوئی شخص ایسا نہ ہو کہ اپنی کم عمری کی بنا پر رائے نہ دے کیونکہ علم کا تعلق عمر کی کمی بیشی سے نہیں ہے' بلکہ اللہ سبحانہ کے فضل سے ہے' جس کو چاہے عطا کرے[3]۔"

معاملات کی نوعیت کے مطابق آپ مشورے کے فورم کا تعین کرتے تھے۔ ریاست کی بنیادی پالیسی اور اس کے رہنما اصولوں کا فیصلہ عام طور پر مقررہ شوریٰ کے اندر ہوتا تھا' جس کے آپ عہد نبوی و صدیقی میں خود بھی اہم ممبر رہے۔ آپ شوریٰ کے فیصلوں کو اپنی ذاتی رائے پر ترجیح دیتے تھے۔ آپ کے نزدیک اجتماعی سوچ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ انفرادی سوچ پر اسے بالادستی حاصل ہو۔ مشاورت کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ وہ حق کی تلاش اور مناسب ترین فیصلے تک رسائی کیلئے ہو۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے' جبکہ وہ معنی اور موثر ہو اس میں خوب بحث و تمحیص کی جائے اور آزادانہ اور دیانتدارانہ ہو۔ وہ صرف خلیفہ کی رائے کی تصدیق و تائید کیلئے نہ ہو آپ مضبوط دلائل اور کثرت رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ شام اور عراق کی زمینوں کے بارے میں آپ کے ذہن میں نئی پالیسی وضع کرنے کا خیال آیا تو شوریٰ کے سامنے آپ نے یہ مسئلہ رکھا۔ آغاز ہی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا "میں نے آپ کو صرف اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ میری امانت میں شریک ہوں' جو میں نے آپ کے معاملات کی ذمہ داری اپنے سر لے کر قبول کی ہے کیونکہ میں بھی آپ ہی میں سے ایک فرد ہوں۔ آج حق بات کہیں آپ میں سے جو چاہے میری مخالفت کرے اور جو چاہے میری موافقت

---

(۱) سورۃ الشوری ۴۲:۳۸ (۲) مصنف (۳) عبدالرزاق ۱۱ ۴۴ ۱۱۲ ۲۳۴

کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔ آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے' جو حق بات کہتی ہے۔ خدا کی قسم اپنے کلام سے میرا مقصد بجز حق کے اور کچھ نہیں[1]۔ آپ کی خاص و عام مجالس شوریٰ جاری رہتی تھیں' عموماً پہلے مشاورت عامہ ہوتی' اگر اس میں اطمینان بخش حل سامنے نہ آتا' تو پھر اسے مخصوص شوریٰ میں لے جاتے اور حتمی فیصلہ وہیں ہوتا تھا۔ عراق میں حضرت ابوعبیدہؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے لوگوں سے مشورہ کیا اور پوچھا کیا کریں؟ ان سب نے کہا کہ آپ ہمیں ساتھ لے کر خود چلیں' لیکن خواص نے یہ رائے دی کہ رسول اکرم ﷺ کے کسی صحابیؓ کو عراق کا امیر لشکر بنا کر بھیج دیجئے اور خود مدینے میں رہ کر ان کی مدد کیجئے۔ اس پر فاروق اعظمؓ نے ان لوگوں کو دوبارہ جمع کر کے فرمایا "مسلمانوں کیلئے یہی بہتر ہے کہ ان کے معاملات مشورے سے طے ہوں۔ میرا بھی وہی خیال تھا جو تم لوگوں کا ہے' لیکن تمہارے اہل الرائے نے مجھے جانے سے روک دیا ہے اور اب میری بھی یہی رائے ہے کہ میں خود مدینے میں رہوں اور عراق کسی اور شخص کو بھیج دوں[2]۔"

اس روایت سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ آپ صحیح تر رائے کی تلاش میں ہر وقت کوشاں رہتے تھے اور سوچ بچار کے مرحلے میں پہلی والی رائے کو ترک کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی یہ ذمہ داری سمجھتے تھے کہ ایک فورم کی رائے لینے کے بعد اگر تبدیلی کی ضرورت پیش آئے' تو اسے دوبارہ ضرور اعتماد میں لیا جائے۔ یہ نہایت بصیرت افروز طرز عمل تھا اس سے عوام کے ساتھ اعتماد کا رشتہ برقرار رہتا تھا اور وہ سب اپنے آپ کو امور مملکت میں شریک سمجھتے تھے اور ہر فیصلے کے عمل درآمد میں والہانہ جذبہ اطاعت سے معمور ہوتے تھے۔ ایک حاکم و منتظم کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ بارہا یہ ہوتا تھا کہ آپ لوگوں کی کثرت کے مشورے کو اپنی ذاتی رائے پر ترجیح دے کر قبول کر لیتے۔ ایک مرتبہ ایک فوجی مہم کیلئے سالار لشکر مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئی' تو حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے مشورہ دیا کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو مقرر فرما دیں۔ آپ نے جواب دیا کہ "میں جانتا ہوں کہ سعدؓ بہادر آدمی ہیں' مگر اندیشہ ہے کہ فن حرب سے واقفیت میں کمی کی بنا پر وہ یہ ذمہ داری پوری نہیں کر سکیں گے۔" بعد میں حضرت عثمانؓ نے بھی حضرت سعدؓ ہی کے تقرر کا مشورہ دیا اور کسی بھی شخص نے مخالفت نہ کی۔ آپ نے دیکھا کہ کثیر لوگوں کا یہی مشورہ ہے' تو انہیں امیر لشکر بنا دیا اور سارے لشکر کو اس سے آگاہ کر دیا۔ حضرت سعدؓ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے' تو انہیں حکم دیا کہ تنہا عراق پہنچ جائیں اور لشکر کی قیادت کریں[3]۔ سیاسی و انتظامی معاملات میں مشاورت کا کیا انداز اور طریق کار تھا؟ اس کی ایک جھلک ایران کے خلاف سب سے بڑی جنگی مہم کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے سے قبل آپ نے جو مشورے کئے ان کی تفصیل کتب تاریخ میں موجود ہے[4]۔ (جنگ نہاوند کی تیاری اور سپہ سالار کے انتخاب کے سلسلے میں بھی آپ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا[5]۔ معاہدے کیلئے فلسطین جانے کے بارے میں بھی آپ نے مشاورت کی حضرت عثمانؓ اور علیؓ نے جو رائے دی اس کی تفصیل بھی کتب میں موجود ہے[6]۔

مشاورت کا ایک اور دائرہ انفرادی تھا۔ ہر شخص کو یہ حق اور آزادی حاصل تھی کہ جس وقت چاہے' جس بارے میں چاہے مشورہ دے سکتا ہے۔ وہ اگر آپ کے دل کو لگتا' تو آپ اسے بے چون و چرا قبول کر لیتے تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ آخری حج کے موقع پر ایک اہم خطاب کرنے والے تھے (یہ خطاب ریاست و حکومت کے اہم معاملات سے متعلق تھا) میں نے عرض کیا "اے امیرالمومنین! حج کے دنوں میں ہر طرح کے معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے آدمی جمع ہوتے ہیں اس لئے میرا یہ خیال ہے کہ آپ اپنا ارادہ ملتوی کر دیں کیونکہ وہ دارالہجرۃ اور دارالسنۃ ہے' وہاں پر اہل الفقہ' اشراف الناس اور اصحاب رائے رہتے ہیں۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا' (تم ٹھیک کہتے ہو) مدینے پہنچتے ہی میں سب سے پہلی فرصت میں لوگوں سے خطاب کروں گا[7]۔

---

(۱) یوسف: ۱۶۱ خضری ۱۸۳ (۲) ہیکل ۵۸٤ (۳) مسعودی ۱: ۳۱۷ (٤) مفصل کیلئے دیکھئے ہیکل ۲: ۲۲۲ (۵) طبری II: ۳: ۱٤۲ تا ۱۵۳ (٦) کثیر II: ۷: ۱۲۹ (۷) بخاری ۲: ۵۷٤

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی تجویز نہایت معقول تھی کہ نہایت اہم اور سنجیدہ مسائل کو عامۃ الناس کے سامنے رکھنے سے معاملات کے سدھرنے کے بجائے بگڑنے کا امکان ہوتا ہے۔ اس لئے ان کو محدود اور اہل افراد میں زیر بحث لانا چاہئے۔ حضرت عمرؓ نے فوراً یہ مشورہ قبول کر لیا۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ اہل اور سمجھ دار لوگوں سے خود بھی مشورہ کرتے رہتے تھے۔ ہر ایسا شخص اس کا اہل تھا' جو کسی خاص معاملے میں زیادہ معلومات اور تجربہ رکھتا ہو۔ آپ اپنی سیاسی و انتظامی پالیسیوں کو حتمی شکل دینے میں حتی المقدور یہ کوشش کرتے تھے کہ تمام آراء سامنے آ جائیں۔ ایران کے خلاف ابتدائی فتوحات میں وہاں کے علاقے تستر و اہواز کا ایک مشہور بادشاہ ہرمزان گرفتار ہو کر مدینے لایا گیا' جس نے بعد میں اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ دیگر مہمات میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے کیونکہ وہ ان علاقوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک مرتبہ اس سے پوچھا کہ حملہ فارس سے شروع کیا جائے یا آذربائیجان سے یا اصفہان سے؟ اس نے جواب دیا فارس اور آذربائیجان دو بازو ہیں اور اصفہان سر۔ اگر ایک بازو کٹ جاتا ہے تو دوسرا کام کرتا ہے' لیکن اگر سر کٹ جائے تو بازو بے کار ہو جاتے ہیں' اس لئے پہلے سر سے شروع کیجئے۔ حضرت عمرؓ کو یہ مشورہ پسند آیا اور فوجوں کو اصفہان فتح کرنے کا حکم دے دیا[1]۔

آپ کی نظر معاملات کی باریکیوں پر رہتی تھی۔ آپ کی کامیاب سیاست کا یہ ایک اہم راز تھا' آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر بات کی تہہ تک پہنچیں۔ اس مقصد کیلئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مشاورت میں شامل کرتے رہتے' یہاں تک کہ کسی نتیجے تک پہنچ جاتے' پھر اسی کی بنیاد پر ایک واضح پالیسی وضع کر لیتے' مثلاً فارس ہی کی مہمات کے دوران آپ نے محسوس کیا کہ ذمی بار بار عہد شکنی اور بغاوت کرتے ہیں' لیکن آپ بے چین تھے کہ یہ معلوم کریں کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ آپ نے یہی سوال ہرمزان سے پوچھا' لیکن وہ کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے سکا' پھر آپ نے تستر سے آنے والے وفد کی طرف رخ کر کے فرمایا "شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان ذمی افراد کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ تمہارے ساتھ عہد شکنی کرتے ہیں۔ وہ بولے جہاں تک ہمیں معلوم ہے ایفائے عہد اور حسن سلوک ہوتا ہے۔" آپ نے فرمایا "پھر اس قسم کے واقعات کیوں رونما ہوتے ہیں؟" اس سوال کا بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا' البتہ حضرت احنف نے کہا "اے امیر المومنین! اس کا سبب میں بتاتا ہوں کہ آپ نے ہمیں اس علاقے میں پیش قدمی سے منع فرمایا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ ہم اپنے مقبوضات میں رہیں حالانکہ ان کا بادشاہ ان کے ملک میں زندہ سلامت موجود ہے۔ اس وجہ سے جب تک ان کا بادشاہ زندہ رہے گا' وہ ہم سے جنگ کرتے رہیں گے کیونکہ دو بادشاہ اکٹھے نہیں رہ سکتے جب تک کہ ایک دوسرے کو نکال نہ دے۔ اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ اسی وجہ سے یہ واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ یہ بادشاہ ہی ہے جو انہیں بھڑکاتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا' جب تک آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم ان کے ملک میں گھس جائیں۔ اس طرح بادشاہت کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ اس کو نکال کر اس کی قومی عزت و وقار کو ختم کر سکتے ہیں اس طرح اہل فارس کی توقعات منقطع ہو جائیں گی اور حوصلے پست ہو جائیں گے۔" آپ نے فرمایا "تم سچ کہتے ہو تم نے معاملے کی پوری تشریح و توضیح کی[2]۔"

---

(1) بخاری ۲/۲۲۲، بلاذری ۴۳۳، ہیکل ۲۹۸ (۲) طبری ۴:III، ۸۹

۴۔ مساوات:

فاروق اعظمؓ کے سیاسی و انتظامی طریقِ عمل کا ایک بہت بڑا اصول مساوات تھا۔ اسلام نے نسل انسانی کو جس ہمہ گیر مساوات کا پیغام دیا ہے، حضرت عمرؓ نے اسے کمال حکمت و بصیرت سے عملی حقیقت کا روپ دینے کیلئے سرگرم عمل رہے۔ اپنے انفرادی رویے، فرامین و احکامات اور حسن انتظام سے اس کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کر دیا کہ ان میں دور حاضر کی ایک جدید اسلامی و فلاحی ریاست کیلئے ایک بہترین رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ آپ کے عہد مبارک میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ رقم کی جاتی ہیں۔ مساوات بنیادی طور پر سماجی نظریات سے ابھرنے والا ایک دلکش تصور ہے۔ اسے سماجی معمولات اور رویے مختلف روپ اور شکلیں عطا کرتے ہیں اور اس کا رخ متعین کرتے ہیں۔ اس کے استحکام کا دارومدار بالا طبقوں اور خاص طور پر حکمرانوں کے طرز عمل پر ہوتا ہے۔

فاروق اعظمؓ نے اپنے دونوں عظیم پیش رو ساتھیوں یعنی سرورِ کونین ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے روایات کے تسلسل کو جاری رکھا۔ اسلامی ریاست کی بے پناہ وسعت اور مال و سائل کی ریل پیل ہو جانے کے باوجود ایک عام آدمی کی طرح زندگی بسر کی۔ گلیوں اور بازاروں میں بھی عام آدمیوں کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔ نہ تو اپنی سماجی حیثیت کو بلند کیا نہ اضافی حقوق و مراعات حاصل کیں اور نہ ہی مقام و مرتبے کے اعتبار سے اپنے آپ کو بڑا سمجھا۔ آپ کے رعب اور دبدبے سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں زلزلہ برپا تھا لیکن زندگی انتہائی سادہ تھی۔ وہ ایسے حکمران تھے کہ جو دربانوں اور پہرہ داروں سے بے نیاز تھے اور ان کی زندگی اور رہن سہن اس قدر سادہ تھا کہ ناواقف شخص انہیں دیکھ کر نہیں پہچان سکتا تھا، چنانچہ اہواز کے بادشاہ ہرمزان کو جب گرفتار کر کے مدینے لایا گیا تو وفد پہلے حضرت عمرؓ کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کوفہ کے ایک وفد کے ساتھ مسجد گئے ہیں۔ مسجد میں انہوں نے جا کر دیکھا تو وہاں کسی کو نہ پایا، واپس پلٹے تو کچھ لڑکے کھیل کود میں مصروف تھے۔ ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ مسجد کے دائیں کونے میں سوئے ہوئے ہیں اور اپنی لمبی ٹوپی کو تکیہ بنایا ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ وفد کوفہ سے ملاقات کے وقت اپنی لمبی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ وہ جب چلے گئے تو انہوں نے اس ٹوپی کو اتار کر تکیہ بنا لیا اور سو گئے تھے۔ ان کے علاوہ مسجد میں اور کوئی نہیں تھا اور ان کے ہاتھ میں ان کا درہ تھا۔ ہرمزان نے پوچھا "عمرؓ کہاں ہیں؟" لوگوں نے بتایا کہ "یہ ہیں!" لوگ اپنی آواز آہستہ کرنے لگے تاکہ انہیں بیدار نہ کر دیں۔ ہرمزان نے پوچھا کہ "ان کے محافظ اور دربان کہاں ہیں؟" وفد نے جواب دیا کہ ان کا نہ تو کوئی محافظ ہے نہ دربان نہ کوئی سیکرٹری ہے نہ دفتر۔ "ہرمزان بولا "ینبغی ان یکون نبیا" (ایسے تو نبی ہو سکتے ہیں۔) لوگوں نے کہا "بل یعمل عمل الانبیاء" (وہ پیغمبر تو نہیں لیکن پیغمبروں والے کام کرتے ہیں۔) اتنے میں لوگوں کی بھیڑ ہو گئی اور حضرت عمرؓ شور و غل سے بیدار ہو گئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ وفد نے کہا کہ "یہ اہواز کا بادشاہ ہے اس سے بات کیجئے۔" فرمایا "نہیں! اس وقت تک بات نہیں کروں گا جب تک اس کے جسم پر زیور ہوگا[1]۔" اس پر اس کے بدن سے ہر چیز اتار دی گئی۔

اپنے دل میں اگر کبھی دوسروں سے بالاتر ہونے کا احساس پاتے تو خود ہی احتساب نفس کے ذریعے اسے ختم کر دیتے۔ ایک مرتبہ منبر پر چڑھے لوگوں کو جمع کیا اور اللہ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا "اے لوگو! میں نے اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ میرے پاس پھل نہ تھے کہ لوگ کھاتے سوائے اس کے کہ میری چند خالائیں تھیں، جنہیں میں میٹھا پانی پلاتا تھا تو وہ میرے لئے کشمش کی چند مٹھیاں جمع کر دیتی تھیں۔" یہ کہہ کر آپ منبر سے اتر آئے۔ پوچھا گیا "یا امیر المومنین! اس سے آپ کا مقصد کیا ہے؟" فرمایا "میں نے اپنے دل میں کچھ (تکبر) محسوس کیا تو چاہا کہ اس سے کچھ کم کر دوں[2]۔" ایک روز ایک مشکیزہ کندھے پر اٹھا کر

---

(۱) طبری ۸۷/۵، البدایہ ۸۷/۷ (۲) سعد ۲۹۳/۳

چل پڑے۔ لوگوں نے کہا "یہ کیا؟" فرمایا "میری طبیعت میں کچھ غرور و تکبر پیدا ہو گیا تھا اس کو میں نے ذلیل کیا ہے[۱]۔" آپ ذات کے ساتھ ساتھ اپنے عمال و احکام کو بھی عام آدمیوں کی طرح سماجی زندگی بسر کرنے اور احساس بالاتری سے دور رکھنے کی پوری کوشش فرماتے تھے تاکہ مساوات انسانی کے عملی مظاہر سامنے آ سکیں۔ یک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو دیکھا کہ آگے آگے چل رہے ہیں اور دیگر لوگ ان کے پیچھے ہیں۔ قریب آئے تو درہ رسید کیا انہوں نے کہا "خیر تو ہے؟" فرمایا "کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اس طرح کا طرز عمل متبوع کیلئے فتنہ اور تابع کیلئے ذلت ہے۔"

آپ اسلامی حکومت کے عمال کا معاشرے میں یہی تاثر قائم کرنا چاہتے تھے کہ وہ کوئی بالاتر مخلوق نہیں ہیں بلکہ عوام ہی میں سے انہیں کی طرح کے لوگ ہیں جن پر کچھ اجتماعی امور کی ذمہ داریوں کا بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ اس لئے ابن خزیمہ بن ثابت کے بقول جب کسی کو حاکم مقرر کرتے تھے تو اس سے ایک معاہدہ لکھواتے تھے جس پر مہاجرینؓ و انصارؓ کی ایک جماعت کو گواہ ٹھہراتے تھے نیز اس میں یہ شرط ہوتی تھی کہ وہ عمدہ سواری پر سوار نہیں ہو گا نہ میدہ کی روٹی کھائے گا نہ باریک لباس پہنے گا اور عوام کی ضروریات کو روکنے کیلئے دروازہ بند نہیں کرے گا[۲]۔ ایک تقریر میں عمال کو مخاطب کر کے فرمایا "عوام کی طرف سے غافل ہو کر دروازے بند کر کے نہ بیٹھے رہو کہ ان کے اصحاب قوت کمزوری کو ہضم کر جائیں۔ ان پر کسی دوسرے کو ترجیح دے کر ان کے ساتھ ظلم نہ کرنا[۳]۔"

اس طرح عمال کو مساوات قائم کرنے کا ایک بنیادی اصول بتایا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے مصر کی جامع مسجد میں منبر بنایا تو لکھ بھیجا کہ "کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ اور مسلمان نیچے بیٹھے ہوں اور تم اوپر بیٹھو[۴]۔" ایک مرتبہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے بارے میں عوام کی طرف سے امتیازی سلوک کے بارے میں کسی قسم کی شکایت پہنچی تو انہیں خط لکھا کہ "رعیت کے ساتھ اس طرح پیش آؤ جیسا تم پسند کرو گے کہ تمہارا امیر تمہارے ساتھ پیش آئے۔ مجھ سے شکایت کی گئی ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو۔ ایسا نہ کرو اس طرح بیٹھو جس طرح اور لوگ بیٹھتے ہیں[۵]۔" سماجی مساوات کے بارے میں آپ کی یہ پالیسی پوری طرح نافذ العمل رہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو آپ کا باخبر رہنا اور اصلاح احوال کیلئے ہمہ تن مصروف رہنا تھا لیکن آپ کے احکامات میں تاثیر کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ آپ خود اپنے قول و عمل سے اس پر کاربند رہتے تھے۔ اس کا اپنا ارشاد ہے "اگر میں ایسے مقام پر پہنچ جاؤں جہاں صرف میرے لئے گنجائش ہو اور دوسرے لوگ وہاں نہ سما سکتے ہوں تو خدا کی قسم وہ میرا صحیح مقام نہیں ہے تاآنکہ میں عام لوگوں کے برابر نہ ہو جاؤں[۶]۔"

سماجی مساوات کو پروان چڑھانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ روزمرہ کی سماجی محافل ہیں جو نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ چنانچہ فاروق اعظمؓ ان کی اہمیت و افادیت سے بھی واقف تھے اور اپنی عظیم ذمہ داریوں سے بھی اس لئے ان میں ہر طرح کے امتیازات پر ضرور ضرب لگاتے۔ اس کا اندازہ اس ایک روایت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ بقول حضرت ابن عباسؓ ایک مرتبہ امیر المومنین حج کیلئے تشریف لائے ہوئے تھے ان کا قیام میرے ہاں تھا۔ ایک دن صفوان بن امیہ نے کھانے کا انتظام کیا کھانے کا ایک بہت بڑا خوان لایا گیا جسے چار آدمی اٹھائے ہوئے تھے۔ کھانے پر سب لوگ بیٹھ گئے کھانا شروع ہوا تو خدام ایک طرف کو ہو گئے۔ امیر المومنین نے پوچھا "کیا قصہ ہے؟ تمہارے ملازمین تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھا رہے۔ کیا تم ان لوگوں کی طرف سے بالکل ہی بے پروا ہو؟" سفیان بن عبداللہ نے عرض کیا "امیر المومنین! واللہ یہ بات نہیں ذرا اصل ہمیں فرق مراتب کا بھی تو لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔" یہ سن کر شدید غضبناک ہوئے اور فرمایا "جو گروہ اپنے آپ کو پست اور اعلیٰ طبقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اس کیلئے اللہ کی تعزیریں بہت سخت ہوتی ہیں۔" پھر خدام سے مخاطب ہو کر فرمایا "آؤ تم لوگ بھی بیٹھ

---

(۱) کنز II ۷ ۱۲۵ سیدھی ۱۲۹ (۲) طبری II ۴ ۷ ۲ خوری ۱۱ کنز II ۷ ۱۳۴ (۳) یوسف ۳۷۴ (۴) سیبی II ۴ ۲ (۵) خورشید ۳۳۸

(۶) طبری II [illegible]

جاؤ۔ "پھر یہ عالم تھا کہ خدام نے بیٹھ کر خوب کھایا لیکن امیر المومنین نے ہاتھ تک نہ لگایا[۱]"۔

ایک دفعہ قریش کے سرداران جن میں سہیل بن عمرو حارث ابن ہشام ابو سفیان بن حرب اور کچھ دیگر روسا ملاقات کیلئے حاضر ہوئے۔ اتفاق سے صہیب' بلال اور چند دیگر آزاد کردہ غلام بھی موجود تھے' جو غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے' حضرت عمرؓ نے سرداروں کو چھوڑ کر انہیں پہلے اندر بلالیا۔ یہ بات ابو سفیان کو (جو زمانہ جاہلیت میں تمام قریش کے سردار تھے) بڑی ناگوار گزری' وہ بولے "کیا زمانہ ہے غلاموں کو تو اذن باریابی بخشا گیا اور ہماری طرف کسی نے التفات تک نہیں کیا۔" جواب میں سہیل بن عمرو جو بڑے خردمند شخص تھے' بولے "مجھے تمہاری ناگواری خاطر کا احساس تمہارے چہروں سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اگر تم غضبناک ہو تو سب سے پہلے تمہیں اپنے نفوس پر غصہ کرنا چاہئے۔ پکارنے والے نے تو سب کو پکارا تھا' لیکن انہوں نے دعوت حق کے قبول کرنے میں سبقت کی' لیکن تم نے جھٹلایا۔ اب ذرا قیامت کے دن کا بھی تصور کرو' جب یہ لوگ بلائے جائیں اور تمہیں چھوڑ دیا جائے[۲]"۔ اسی نوع کا ایک اور دلچسپ واقعہ اور بھی ہے' جسے نوفل بن عمارہ نے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ دو سردار حارث بن ہشام اور سہیل بن عمرو امیر المومنین سے ملنے کیلئے آئے۔ یہ دونوں ان کے دائیں اور بائیں جانب بیٹھ گئے' اب مہاجرین اولین بھی آنا شروع ہو گئے۔ جونہی کوئی آتا' تو حضرت عمرؓ اسے اپنے قریب جگہ دیتے اور حارث و سہیل کو ہٹنا پڑتا۔ فاروق اعظمؓ کہتے "سہیل تم ادھر' حارث تم ادھر' یہاں تک کہ یہ دونوں مجلس کے بالکل آخری سرے تک پہنچ گئے۔" جس وقت یہ لوگ باہر آرہے تھے' تو حارث نے سہیل سے کہا "دیکھا تم نے عمرؓ ہم سے کیسے پیش آئے؟" سہیل نے جواب دیا "اے بھائی ہمیں انہیں نہیں بلکہ اپنے نفوس کو ملامت کرنی چاہئے۔ داعی نے جب انہیں بلایا تو انہوں نے جلدی کی اور ہمیں پکارا تو ہم نے تاخیر کر دی۔" ان دونوں کے دل پر اس کا بہت زیادہ بوجھ تھا۔ اس دن پھر امیر المومنین کو ملنے چلے گئے اور عرض کیا "امیر المومنین آپ کے آج کے طرز عمل سے گویا ہماری تنبیہ اور فہمائش مقصود تھی' آخر آپ کے تقرب کی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے؟" آپ نے فرمایا "میں نہیں جانتا سوائے اس کے کہ آپ نے روم کی سرحدوں کی طرف اشارہ فرمایا۔" چنانچہ دونوں شام کی طرف چلے گئے اور شہادت پائی[۳]۔ ان تمام روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کے نزدیک سماجی مساوات کا مفہوم و مقصد ہی یہ تھا کہ معاشرے کے سرداروں' رئیسوں اور متکبر اور اختیار و قوت رکھنے والوں کے مقابلے میں پسے ہوئے' ناتواں اور کمزور مگر اسلام کے مخلص اور متقی اور قربانیاں دینے والے لوگوں کو سربلند کیا جائے۔ ان کے حقوق و مفادات کا تحفظ کیا جائے' ان کی عزت و تکریم کی جائے' ان کے کارناموں اور صلاحیتوں کا اعتراف کیا جائے اور معاشرے میں ان کی سماجی حیثیت کو تسلیم کروا کے' انہیں خوب پذیرائی دی جائے' تاکہ لوگ ہر قسم کے قبائلی' نسبی اور معاشی تفاخر کو چھوڑ کر ان اعلیٰ اوصاف کی بنیاد پر بلند مقام و مرتبہ حاصل کریں' جو اسلام کی نظر میں محمود و مطلوب ہیں۔ آپ کی یہ پالیسی بصیرت و حکمت اور فراست و تدبر کا بہترین نمونہ تھی' اس نے تاریخ اسلام پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے۔ آج بھی ہم ان درخشندہ مثالوں کی روشنی میں ہر طرح کے سماجی امتیازات کا خاتمہ کر سکتے ہیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے احیاء کیلئے ان سے مدد حاصل کر سکتے ہیں۔

اس عہد میں بھی اس کا نتیجہ بہت اچھا نکلا' لوگ سالہا سال کے مروجہ سرداری نظام اور اس کی مسلط کردہ قباحتوں کے چنگل سے آزاد ہو گئے اور انہوں نے سکون و اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا اندازہ ثابت کی اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ "ابو سفیانؓ نے مکہ میں ایک غلط جگہ پر اپنا مکان بنوایا اور پہاڑیوں سے آنے والے پانی کے آگے اس طرح پتھر رکھوائے کہ اس سے دیگر لوگوں کے مکانوں کے بہہ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ کے پاس آکر شکایت کی' تو انہوں نے ابو سفیانؓ کو مجبور کیا کہ وہ سارے پتھر ہٹا دیں' جن کی تعداد پانچ یا چھ تھی' تو لوگوں نے قبلہ رخ ہو کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا' جس نے اسلام کے طفیل داد دی کہ

---

(۱) حوری ۱:۹۷ (۲) ص د ۱:۹۸ (۳) صوری ۱:۹۹

میں عمرؓ کو ابوسفیانؓ پر ایسا غالب کر دیا، جس چیز کا حکم دیتے وہ اس کی اطاعت کرتا ہے[۱]۔" فاروق اعظمؓ نے اسلامی مساوات کے ہمہ گیر تصور کو سیاسی، قانونی اور معاشی تمام معاملات پر لاگو کیا۔ انہوں نے سیاسی اثر و رسوخ اور مقام و مرتبے کی بنیاد پر کبھی کسی پر عام لوگوں کو فوقیت نہیں دی اور نہ ہی کبھی انہیں ایسے حقوق اور مراعات دیں، جن کی وجہ سے وہ بالا طبقہ کے لوگ کہلائیں۔

جبلہ غسانی شام کے ایک علاقے کا مشہور رئیس اور بادشاہ تھا۔ غسانی قبائل کے رئیس ان دنوں قیصر روم کے دست نگر اور وفادار ہوتے تھے۔ جب رومی سلطنت کی بساط الٹ گئی تو جبلہ نے فاروق اعظمؓ کو ایک عریضہ لکھا کہ میں مشرف بہ اسلام ہونے کیلئے مدینے آنا چاہتا ہوں۔ فاروق اعظمؓ نے جواب دیا کہ "آ جاؤ تم کو وہی فوائد اور حقوق حاصل ہوں گے جو ہمیں ہیں اور تم پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو ہمارے اوپر ہیں[۲]۔" اس جواب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے صراحتہً یا اشارۃً یہ دریافت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اسے کیا مقام و مرتبہ ملے گا اور کیا اضافی حقوق ہوں گے، لیکن حضرت عمرؓ نے واضح طور پر بتا دیا کہ وہ سب مسلمانوں کے مساوی شمار کیا جائے گا، بہر حال وہ مسلمان ہو گیا۔ ایک مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ اس کی چادر کا ایک گوشہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آ گیا، جبلہ نے اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا، اس نے بھی برابر جواب دیا۔ جبلہ غصے سے بے تاب ہو گیا اور حضرت عمرؓ کے پاس آیا، حضرت عمرؓ نے اس کی شکایت سن کر کہا "تم نے جو کچھ کیا اس کی سزا پائی۔" اس کو سخت حیرت ہوئی اور کہا کہ "ہم اس مرتبہ کے لوگ ہیں کہ کوئی ہمارے آگے گستاخی سے پیش آئے تو قتل کا مستحق ہوتا ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست کو بالا کر دیا۔" اس نے کہا کہ "اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں شریف و ذلیل کی کچھ تمیز نہیں، تو میں اسلام سے باز آتا ہوں۔" غرض وہ چھپ کر قسطنطنیہ چلا گیا، لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی خاطر قانون انصاف کو بدلنا نہیں چاہا[۳]۔ آپ نے سیاسی و مالی ذمہ داریاں سونپنے میں اثر و رسوخ کے بجائے ہمیشہ اہلیت و صلاحیت کو سامنے رکھا۔ آپ کے عہد میں آزاد کردہ غلام یعنی موالی بھی اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں، حالانکہ اسلام سے قبل ایسے لوگوں کے کسی قسم کے انسانی، سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق تسلیم نہیں کیے جاتے تھے۔ یہ اسلام ہی کی برکت تھی کہ وہ نہ صرف یہ کہ عام لوگوں کے ہم پلہ ہو گئے، بلکہ اہم مناصب کے بھی مستحق قرار دیے گئے۔ فاروق اعظمؓ نے اپنے ایک مولی کو حمی کا عامل مقرر کیا، جن کا نام "ہنی" تھا[۴]۔ ایک شخص اشق کا بیان ہے کہ میں حضرت عمرؓ کا ایک عیسائی غلام تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے تاکہ ہم تمہیں مسلمانوں کے بعض اہم امور سونپ دیں؟ کیونکہ ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ ہم ان کے امور کسی ایسے شخص کے سپرد کریں، جو ان میں سے نہ ہو۔ میں نے انکار کر دیا تو انہوں نے مجھے آزاد کر دیا اور فرمایا "جہاں چاہو چلے جاؤ[۵]۔"

ایک مرتبہ حضرت نافع بن عبدالحارث نے جنہیں فاروق اعظمؓ نے مکہ کا عامل بنا دیا تھا، ایک مقام عسفان میں ان سے ملاقات کی۔ حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ "تم نے وادی میں کس کو تحصیلدار مقرر کیا ہے؟" انہوں نے جواب دیا کہ "ابن ابزیٰ کو۔" پوچھا "ابن ابزیٰ کون ہے؟" جواب ملا "ہمارے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک ہے۔" ارشاد فرمایا "تم نے ایک آزاد کردہ غلام کو ان کا ذمہ دار بنایا ہے؟" انہوں نے جواب دیا "وہ کتاب اللہ کے عالم اور علم المیراث کے جاننے والے ہیں۔" اس پر فاروق اعظمؓ نے فرمایا "ہاں ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ تمہارے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بہت سے لوگوں کو سربلند کرے گا اور بہت سے لوگوں کو نیچے کر دے گا[۶]۔" جب آپ زخمی حالت میں تھے تو آئندہ خلیفہ کے بارے میں بہت فکر مند تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "اگر مجھے ان دو آدمیوں میں سے ایک مل جائے، تو میں خلافت کی یہ ذمہ داری اس کے سپرد کر دیتا کیونکہ میں دونوں کو قابل بھروسہ سمجھتا ہوں۔ ایک ابی حذیفہؓ کے آزاد کردہ

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible]

غلام حضرت سالمؓ اور دوسرے ابو عبیدہ بن الجراحؓ[1]۔"

یہ تمام روایات یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ فاروق اعظمؓ کے نزدیک تمام مسلمانوں کے سیاسی حقوق مساوی تھے' یہاں تک کہ سیاسی عہدوں اور ذمہ داریوں کیلئے آزاد کردہ غلام تک برابر استحقاق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے عہد میں جتنے عمال کا تقرر کیا اس میں سارے مسلمانوں کے مساوی حقوق کا اصول سامنے رکھتے ہوئے ان میں سے زیادہ قابلیت و صلاحیت رکھنے والے افراد کو چنا۔ نہ تو کسی علاقے' قبیلے اور خاندان کو زیادہ اہمیت دی اور نہ ہی امیروں' سرداروں' رئیسوں اور بادشاہوں کو درخور اعتناء سمجھا۔

علی ھذا القیاس فاروق اعظمؓ کے سیاسی لائحہ عمل میں ہی مساوات کی پالیسی قانونی معاملات میں بھی تھی اور معاشی معاملات میں بھی' جن کی آئندہ الگ الگ ابواب میں مکمل تفصیل بیان کی جائے گی۔

---

(۵) سعد ۳: ۳۴۳' [illegible] ۲/۶۸۔

۵۔ قوت نافذہ:

ایک کامیاب سیاستداں وحکمران کے ذاتی اوصاف میں سب سے اہم وصف قوت فیصلہ اور سیاسی لائحہ عمل میں قوت نافذہ ہے۔ کسی رائے تک پہنچنے میں تاخیر کرنے والا اور اپنے فیصلوں اور پالیسیوں کے سلسلے میں گومگو میں مبتلا رہنے والا شخص کبھی کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا اور نہ ہی یکسوئی اور دلجمعی سے کوئی کام کر سکتا ہے۔ ایک فہیم وبصیر حکمران وہی ہوتا ہے' جو جلد ہی معاملے کی حقیقت تک پہنچ جائے اور بروقت اپنا فیصلہ سنادے اور پھر اسے پوری قوت سے نافذ بھی کردے۔ اس کے بہت سے فائدے ہوتے ہیں' ایک یہ کہ حکومت کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ نچلی سطح تک یکسوئی اور اتحاد واتفاق پیدا ہوتا ہے۔ تیسرا یہ کہ حالات کنٹرول میں رہتے ہیں اور فتنہ پردازوں اور منافقوں کو سازش کا موقع نہیں ملتا۔ چوتھا یہ کہ حق دار کو اس کا حق اور ظالم کو اس کی سزا بہت جلد مل جاتی ہے۔ پانچواں یہ کہ کسی ایک مسئلے پر غیر ضروری اوقات اور وسائل صرف نہیں ہوتے اور چھٹا یہ کہ حکومت اور عوام کے درمیان ایک گہرا رابطہ وتعلق قائم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو مختلف امور میں مشورہ کرنے کی ہدایت کے بعد فرمایا "فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ط ان اللہ یحب المتوکلین (۱)۔" (جب کسی چیز کا عزم کرو تو پھر اللہ پر بھروسہ کرو اللہ تعالیٰ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔) حضرت عمر فاروقؓ بھی اسی آیت کی عملی تفسیر تھے۔ وہ کسی رائے تک پہنچنے کے بعد پھر بھی سستی اور کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ اسے پورے عزم' جوش اور قوت کے ساتھ نافذ کردیتے تھے۔ یہی ان کی سیاست وتدبیر میں کامیابی وکامرانی کا راز تھا۔ حدیث میں ان کی اسی قوت نافذہ ہی کا تذکرہ کچھ یوں ملتا ہے "اشدامتی فی امر اللہ عمر (۲)۔" (میری امت میں امر الٰہی کے بارے میں سب سے زیادہ سخت عمرؓ ہیں۔)

اچھے سے اچھے اصول وضابطے' قوانین ودساتیر اور معقول سے معقول فیصلوں کے پیچھے اگر قوت نافذہ نہ ہو تو وہ بے اثر اور بے فائدہ رہتے ہیں' لیکن یہ قوت ہر شخص یا حکمران کے اندر نہیں ہوتی کیونکہ اس کو حاصل کرنے کیلئے کڑے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے' جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ فاروق اعظمؓ کا ارشاد ہے "اللہ کے احکام وہی شخص نافذ کرسکتا ہے' جو نہ تو کسی کی نقالی کرے' نہ مداہنت سے کام لے اور نہ خواہشات نفسانی کے پیچھے چلے۔ اللہ کا حکم وہی شخص نافذ کرسکے گا' جس کی قوت کار کبھی اضمحلال کا شکار نہ ہو اور جو حق کے معاملے میں اپنی پارٹی سے بھی رعایت نہ برتے (۳)۔" آپ کی اپنی ذات کیونکہ ان تمام شرائط پر پوری اترتی تھی' اس لئے آپ تاریخ اسلام ہی نہیں' بلکہ تاریخ انسانیت میں نہایت کامیاب وکامران حکمران کی حیثیت سے یاد کئے جاتے ہیں۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے سوا میں کسی شخص کو نہیں پہنچانتا' جس نے نہایت جرأت کے ساتھ اللہ کی راہ میں کسی ملامت کی پروا نہ کی ہو (۴)۔ ایک آدمی حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس آیا اور پوچھا "امیر المومنین میرے لئے یہ زیادہ بہتر ہے کہ اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی لعن طعن کی پروا نہ کروں یا اپنی تمام توجہات اپنے ہی نفس کی اصلاح پر مرکوز رکھوں؟" آپ نے جواب دیا "جو فرد کسی درجہ میں بھی مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا سربراہ کار بنادیا گیا ہو' اسے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرنا چاہئے' لیکن جس کے سر یہ ذمہ داری نہ ہو اسے چاہئے کہ اپنے نفس کی اصلاح کرے اور امور کے ذمہ داران کا خیر خواہ رہے (۵)۔"

حکمرانوں کی ایک بہت بڑی کمزوری یہی ہوتی ہے کہ وہ بااثر لوگوں کے پراپیگنڈے اور مختلف پریشر گروپس کے دباؤ میں آکر علی الاعلان حق کا ساتھ دینے اور حق کے مطابق فیصلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں اور مداہنت کرنا شروع کردیتے یا پھر ایسے لوگوں کی ملامت سے خوفزدہ ہوتے ہیں' جن کے حقوق ومفادات پر

---

(۱) آل عمران ۳/۱۵۹ (۲) سعد ۳/۲۹۱ (۳) یوسف ۱۰۵ (۴) سیوطی ۱۲۰ (۵) یوسف ۱۴۰۔

رو پڑ گئی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی قوت نافذہ کمزور پڑ جاتی ہے۔ حکومت کے فیصلوں اور قوانین کا احترام اور خوف ختم ہو جاتا ہے' جس سے ہر طرف انار کی و انتشار پھیل جاتا ہے۔ آخر کار کمزور مایوس اور زور آور باغی ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے ارشادات میں سب سے زیادہ زور مداہنت سے گریز اور علامت سے بے خوف ہونے پر دیا ہے۔ آپ کی قوت نافذہ کا ایک اور اہم راز یہ بھی تھا کہ آپ محض حکم دے دینے کو کافی نہیں سمجھتے تھے' بلکہ اس بات پر نظر رکھتے تھے کہ اس پر اس کی صحیح روح اور مقصد کے مطابق عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ ایک مرتبہ حاضرین سے فرمایا "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر میں نے اپنے علم کے مطابق بہترین آدمی کو تم پر عامل مقرر کر کے اسے عدل کا حکم دے دیا' تو میں اپنے فرض سے عہدہ براء ہو گیا؟" لوگوں نے کہا "جی ہاں!" فرمایا "نہیں' یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا' جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ جو کچھ میں نے حکم دیا تھا اس پر عمل بھی کیا جا رہا ہے یا نہیں(۱)۔" جب بھی آپ کو کسی ذریعے سے یہ اطلاع اور خبر ملتی تھی کہ آپ کے احکامات پر عمل نہیں ہو رہا' تو فوراً کارروائی کرتے اور ایسے لوگوں کو عام طور پر سخت سزا دیا کرتے تھے۔ آپ کی یہ گرفت عمال ہی پر ہوتی تھی کیونکہ وہی اس کے سب سے بڑے ذمہ دار ہوتے تھے۔ اس کی ایک مثال عیاض بن غنم کا وہ مشہور واقعہ ہے' جسے عمارہ بن خزیمہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ جب کسی شخص کو عامل مقرر کرتے' تو انصار اور دوسرے لوگوں پر مشتمل ایک جماعت کو گواہ بنا کر اس شخص سے چار شرائط کی پابندی کرنے کا عہد لیتے تھے یہ کہ عمدہ خچر پر سوار نہ ہو گا' باریک کپڑے نہیں پہنے گا' چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا' اپنے دروازے بند کر کے لوگوں کی ضروریات سے بے نیازی نہ برتے گا اور اپنی ڈیوڑھی پہ دربان نہ رکھے گا(۲)۔ راوی کے بقول ایک مرتبہ آپ مدینے کی سڑک پر جا رہے تھے' کسی شخص نے پکار کر آپ سے یہ کہا کہ "عمرؓ کیا خیال ہے تمہارے عامل عیاض بن غنم کے مصر کا عامل رہتے ہوئے بھی۔ کیا تمہاری یہ شرطیں تمہیں اللہ کے حضور تمہیں بچا لیں گی؟ درایں حالیکہ وہ باریک کپڑے بھی پہنتا ہے اور اپنے دروازے پر دربان بھی رکھتا ہے۔"

اب حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہؓ کو بلایا' جو افسران تک آپ کے پیغامات پہنچایا کرتے تھے اور انہیں مصر روانہ کیا۔ آپ نے ان سے کہا "تم انہیں جس حال میں پاؤ اسی حال میں میرے پاس لاؤ۔" راوی کہتا ہے کہ یہ وہاں پہنچے' تو ان کے دروازے پر دربان کو موجود پایا' پھر اندر داخل ہوئے تو ان کے بدن پر ایک مہین قمیص نظر آئی۔ انہوں نے ان سے کہا کہ "امیر المومنین کا بلاوا ہے چلو۔" انہوں نے کہا "مجھے اپنی قبا پہن لینے دو۔" یہ بولے کہ نہیں اسی حال میں چلو۔ راوی کہتے ہیں کہ وہ انہیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب حضرت عمرؓ نے انہیں دیکھا تو فرمایا "اپنی قمیص اتار دو' پھر آپ نے موٹے اون کا ایک کرتہ منگوایا اور بھیڑ بکریوں کا ایک گلہ اور ایک لاٹھی بھی منگوائی اور ان سے فرمایا "یہ کرتا پہنو' یہ لاٹھی لو اور یہ بکریاں چراؤ' ان کا دودھ خود بھی پیو اور راہگیروں کو بھی پلاؤ اور جو بچ رہے' وہ ہمارے لئے محفوظ رکھو سن لیا تم نے؟" انہوں نے جواب دیا "ہاں سن لیا' مگر موت آ جانا اس سے اچھا ہے (کہ میں ایسا کروں)۔" آپ نے بار بار ان سے یہی بات کہی' مگر ہر بار انہوں نے یہی جواب دیا کہ "اس سے بہتر یہی ہو گا کہ موت آ جائے۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ "یہ بات تمہیں اتنی ناگوار کیوں محسوس ہوتی ہے' جبکہ تمہارے باپ کا نام غنم اسی لئے پڑ گیا تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتے تھے؟ کیا تم آئندہ بھلی روش اختیار کر سکو گے؟" انہوں نے جواب دیا "ہاں یا امیر المومنین!" آپ نے فرمایا "اچھا تم جاؤ اور آپ نے ان کو ان کے منصب پر بحال کر دیا۔" راوی کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد یہ اتنے اچھے بن گئے کہ حضرت عمرؓ کا کوئی دوسرا عامل اتنا اچھا نہ تھا(۳)۔

اس روایت سے احکام و فرامین کے نفاذ کے سلسلے میں آپ کی حکمت عملی کا جو خاکہ سامنے آتا ہے' وہ کچھ یوں ہے کہ آپ کی پالیسی بالکل واضح' اور شرائط معلوم و مشہور ہوتی تھیں' جن کے باقاعدہ گواہ ہوتے تھے تاکہ کسی کی سرتابی کی صورت میں ایک دلیل و حجت موجود ہو اور پھر عوام کے اندر بھی آپ نے اس قدر بیداری

---

(۱) عبدالرزاق ۱/۳۲۴ ... ۱۱۰ (۲) یوسف: ۱۱۶ جوزی: ۱۲۱ طبری: ۴/۲۰۷ (۳) کنز: ۷/۱۱۵۔

پیدا کردی تھی کہ وہ چلتے پھرتے ہر جگہ پر آپ کو توجہ دلا سکتے تھے کہ آپ کی پالیسی پر کس حد تک عمل ہو رہا ہے۔ پھر آپ کسی شکایت کا فوری نوٹس لیتے تھے اور اپنے عمال کو بلا دلیل دفاع کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے۔ پھر آپ کے فیصلے اور حکم کا یہ حال ہوتا تھا کہ اس کے الفاظ اور معانی دونوں پہلوؤں پر بعینہٖ عمل ہوتا تھا اور اس کی خلاف ورزی کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر آپ نہایت سخت گرفت کرتے تھے اور عمال کے رد عمل کو سامنے رکھ کر مستقبل کا فیصلہ کرتے تھے۔ جہاں معزولی ضروری ہوتی' وہاں معزول کر دیتے اور جہاں صرف انتباہ سے بہتر نتائج پیدا ہونے کا امکان ہوتا' وہاں اسی سے کام چلاتے۔ کوئی لگا بندھا اصول نہیں ہوتا تھا' بلکہ آپ اپنی حکمت و بصیرت سے کام لے کر مطلوبہ نتائج کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ آپ کی پالیسی میں نیرنگی' جدت اور افادیت کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ آپ کی قوت نافذہ کا ایک عظیم مظہر حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی بھی ہے۔ ان کی تمام جنگی خدمات' رعب و دبدبہ اور مہارت و صلاحیت کے باوجود عہد صدیقی میں ان کے بارے میں بعض شکایات پہنچیں' تو فاروق اعظم کا یہی مشورہ تھا کہ انہیں فوری طور پر معزول کر دیا جائے' لیکن حضرت ابو بکرؓ نے مصلحتاً یہ بات نہیں مانی تھی' لیکن جب فاروق اعظم خلیفہ بنے' تو فوراً فوج کی سپہ سالاری سے ہٹا کر حضرت ابو عبیدہؓ کے ماتحت کر دیا اور فرمایا "مقصد ایسا نہیں ہے کہ وہ مجھے کوئی بات سمجھائے جس کا میں ابو بکرؓ کو حکم دوں اور خود نافذ نہ کر سکوں[۱]"۔

دوسری مرتبہ جب فوج سے انہیں مکمل طور پر برطرف کیا گیا' تو عالم یہ تھا کہ حضرت بلالؓ نے فاروق اعظمؓ کے حکم پر مجمع عام میں ان کی ٹوپی اتار لی اور مشکیں کس دیں اور کہا کہ "ہم اپنے حاکموں کا حکم سنتے اور اس کی اطاعت کرتے ہیں[۲]" اور حضرت خالدؓ کا جواب یہ تھا کہ "میں امیر المومنینؓ کی نافرمانی نہیں کر سکتا جو تمہیں حکم ملا ہے ویسا ہی کرو[۳]"۔ "حکم کے نافذ ہونے کی اس منفرد اور درخشندہ مثال میں جہاں اسلام کے نظام تربیت کا بڑا دخل ہے' وہاں خود فاروق اعظمؓ کی بارعب شخصیت کا بھی مرکزی کردار ہے۔ تاریخ کے اتنے بڑے اور مشہور و معروف سپہ سالار' جو مقبول و ہر دلعزیز بھی ہوں کے خلاف اتنا بڑا اقدام کرنا اور اس کے نتیجے میں کسی قسم کا انتظامی مسئلہ پیدا نہ ہونا اور کوئی بڑا رد عمل پیدا نہ ہونا حضرت عمرؓ کی کامیاب قوت نافذہ ہی کا کارنامہ ہے۔ آپ سختی و نرمی کو نہایت برمحل استعمال کرتے تھے اور اس میں ایک حسین امتزاج رکھتے تھے' اس لئے آپ کی پالیسی پوری طرح نافذ ہوتی تھی۔ آپ بخوبی جانتے تھے کہ کس معاملے میں سختی کرنا ضروری ہے اور کس حد تک ضروری ہے۔ آپ کا یہ ارشاد ہے کہ "امر خلافت اس وقت تک اصلاح پذیر نہیں ہو سکتا جب تک ایسی سختی نہ کی جائے جس میں جبر نہ ہو اور ایسی نرمی نہ کی جائے جس میں سستی نہ ہو[۴]"۔ "آپ کی شخصیت اور حکمت عملی دونوں کا اثر ہمیں آپ کی قوت نافذہ میں جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آپ کی وفات کے بعد سختی و نرمی کے توازن میں جب فرق آیا' تو اس کے کربناک نتائج سامنے آئے اور آپ کی بصیرت و فراست کے نقوش اور زیادہ نمایاں ہوئے۔

روایت میں آتا ہے کہ ۲۶ھ کو آپ کے بعد آنے والے جلیل القدر خلیفہ حضرت عثمانؓ نے حرم کعبہ کی تجدید و توسیع کا حکم دیا۔ انہوں نے ایک جماعت سے حرم کی توسیع کیلئے کچھ زمینیں خرید لیں' مگر کچھ لوگوں نے انکار کیا' تو آپ نے ان کی عمارتیں گرا دیں اور انہیں خرید کر ان کی قیمتیں بیت المال میں جمع کرا دیں۔ ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر چیخ و پکار کی' تو آپ نے انہیں قید کرنے کا حکم دیا اور فرمایا "میرے حلم اور بردباری کی وجہ سے تمہیں یہ جرأت ہوئی ہے (کہ تم مجھ پر چلاتے ہو) جب تمہارے ساتھ حضرت عمرؓ نے اس قسم کی کارروائی کی تھی تو تم ان پر نہیں چیخے چلائے تھے[۵]"۔ "اسی طرح جب حضرت عثمانؓ کے خلاف وسیع پیمانے پر فتنہ پردازی کے ابھر کر پھیلنے میں آپ کی نرم مزاجی اور عفو و درگزر کی پالیسی کا بھی حصہ تھا۔ آپ نے انتشار سے بچنے کیلئے بغاوتوں کا سختی سے سر کچلنے سے گریز کیا اور اپنے عمال کو بھی بہت زیادہ ڈھیل دیے رکھی۔ اس کا احساس انہیں اس وقت ہوا' جب حالات بے قابو ہو چکے تھے چنانچہ انہی دنوں آپ نے بلوائیوں کے بہت بڑے مرکز مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ کو بلوایا۔ بہت سی تلخ باتوں کے تبادلے کے بعد آپ نے فرمایا "اگر میں بھی تم سے اسی طرح

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible]

بازپرس کرتا جس طرح حضرت عمرؓ تم سے بازپرس کرتے تھے تو تم سیدھے رہتے مگر میں نے تمہارے ساتھ نرمی اختیار کی تو تم مجھ پر گستاخ ہو گئے (۱)۔"

○ سیاسی استحکام کا فروغ:

ا۔ سیاسی گروہوں سے بہتر تعلقات:

فاروق اعظمؓ نے جب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں، تو ان کے پیش نظر سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ مملکت کو سیاسی طور پر مضبوط و مستحکم کریں، تاکہ مکمل امن وامان قائم ہو سکے اور ایک منظم فلاحی ریاست کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو، جو تمام انسانوں کے حقوق کی حفاظت و بجا آوری کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ عہد جاہلیت کی قبائلی سیاست، محدود دھڑے بندیوں اور وسیع تر منظم معاشرے سے ناآشنائی، خانہ بدوش اور بدویانہ طرز تمدن اور باہمی آویزشوں نے ابھی تک ان کی عادات و اطوار کو مکمل طور پر تبدیل نہیں کیا کہ وہ ایک مربوط مہذب معاشرے کے تمام تقاضے پورے کر سکیں۔ خود عہد نبوی ﷺ میں ریاست کا دائرہ محدود ہونے کے باوجود اس میں کچھ نہ کچھ ناخوشگوار واقعات رونما ہوتے رہتے تھے اور منافقین اپنی چالبازیوں میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ کبھی اوس و خزرج کے پرانے اختلافات بھڑک اٹھتے اور کبھی مہاجرین و انصار کے مابین کوئی رنجش پیدا ہو جاتی تھی۔ کبھی آس پاس کے یہودی و عیسائی قبائل مسلمانوں کو سیاسی طور پر نقصان پہنچانے اور بے اثر کرنے کی سازشیں کرتے رہتے تھے۔ آنحضور ﷺ کی وفات کے بعد پورے حجاز کا فتنۂ ارتداد مدینہ کی سیادت و قیادت کے خلاف ایک کھلی بغاوت کا اعلان تھا، جس میں اکثر و بیشتر قبائل نے بھرپور حصہ لیا اور، اپنی اپنی سیاسی آزادی کے علم اٹھا لئے۔ یہاں تک کہ مذہبی طور پر بھی آزاد ہونے کیلئے نبوت کے جھوٹے دعویداروں کے ہمرکاب ہو گئے اور اندرونی حالت یہ تھی کہ تین گروہ سیاسی طور پر ابھر آئے اور انہوں نے اپنے آپ کو منظم کر کے خلافت کا استحقاق ثابت کرنا شروع کر دیا اور عام لوگ کسی نہ کسی سے ضرور متاثر ہوئے۔ حضرت عمرؓ کی دانشمندی اور حاضر دماغی سے مسئلہ خلافت تو طے ہو گیا، لیکن تینوں گروہوں میں سیاسی وحدت اور انفرادیت کا شعور بدستور موجود رہا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو بنو ہاشم اور انصار کے اکابر سے خلافت صدیقی کو منوانے کیلئے کچھ سختی بھی کرنا پڑی۔ اسی لئے عہد صدیقی میں دونوں گروہ کسی نہ کسی حد تک فاروق اعظمؓ سے کھچے کھچے رہے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ سے اپنے مختلف معاملات طے کرنے کیلئے، انہیں گھر بلوایا تو یہ شرط عائد کی کہ وہ اکیلے آئیں گے کیونکہ وہ حضرت عمرؓ کی موجودگی کو ناپسند کرتے تھے (۲)۔ اسی طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بطور خلیفہ فاروق اعظمؓ کی تقرری میں بھی بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑا اور اس کا فاروق اعظمؓ کو بھی بخوبی احساس تھا۔ جب انہوں نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں، تو انہوں نے اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دی اور یہ کوشش کی کہ سب کو ساتھ لے کر چلیں اور ان میں پائے جانے والے گروہی احساس کو ختم کر کے سب کو وحدت و اخوت کی لڑی میں پرو دیں اور مشترک مقاصد کی خاطر مل جل کر آگے بڑھنے کا جذبہ دوبارہ تر و تازہ کر دیں کیونکہ یہی سیاسی و ملی استحکام کی راہ تھی۔ اس بارے میں وہ کس قدر حساس تھے اس کا اندازہ حسب ذیل روایت سے لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ (حضرت) عمرؓ نے قریش کے لوگوں سے فرمایا "مجھے یہ اطلاع پہنچی ہے کہ تم نے (مخصوص) محفلیں قائم کر رکھی ہیں یہاں تک کہ جب دو اشخاص بھی کہیں بیٹھتے ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں کے ساتھیوں میں سے ہیں اور وہ فلاں کا ہم نشیں ہے۔ یہاں تک کہ ہر مجلس و محفل کی کثرت ہو گئی ہے۔ خدا کی قسم! یہ چیز تمہارے دین و مذہب میں تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ نیز تمہاری عزت و شرافت اور خود تمہاری ذات میں بھی دخیل ہو رہی ہے۔

(۱) طبری ۴:۲۵۶، ۳ (۲) بخاری ۵:۸۲۔

مجھے وہ زمانہ نظر آرہا ہے کہ تمہارے بعد جو آئیں گے وہ یہ کہیں گے "یہ فلاں کی رائے ہے۔" یہ لوگ اسلام کو کئی حصوں میں بانٹ دیں گے۔ تم اپنی مجالس کو وسیع کرو اور مل کر بیٹھا کرو۔ اس طرح تمہارا اتحاد و اتفاق ہمیشہ قائم رہے گا اور دوسرے لوگوں میں تمہارا رعب زیادہ قائم رہے گا[۱]۔" فاروق اعظمؓ نے اپنی بے پناہ بصیرت و فراست سے ایسی سیاسی حکمت عملی اختیار کی کہ تمام سیاسی گروہ مطمئن ہو گئے اور حکومتی معاملات میں ان کے دست و بازو بن کر شریک ہوئے اور اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق بھرپور مثبت کردار ادا کیا۔ ان کے پورے عہد خلافت میں قبائلی و گروہی چپقلش کا کوئی ایک بھی قابل ذکر واقعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ وہ واقعی حدیث نبوی ﷺ کے مطابق فتنوں کے آگے بند دروازہ ثابت ہوئے۔ مختلف لوگوں کو حکومت کا وفادار اور اپنا گرویدہ بنایا۔ اس کی کچھ جھلکیاں حسب ذیل ہیں۔

(الف) بنو ہاشم:

قریش میں بنو ہاشم کا قبیلہ بہت معزز اور ممتاز تھا۔ رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے اسے اور بھی زیادہ شرف حاصل ہو گیا۔ مسلمانوں میں ہمیشہ انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اس لئے وفات نبوی ﷺ کے بعد ان کا سیاسی اثر و رسوخ بڑھ گیا اور یہ اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے رہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منتخب ہونے کے وقت انہیں جو احساس محرومی پیدا ہوا وہ حضرت عمرؓ کے انتخاب کے وقت اور گہرا ہو گیا۔ یہاں تک کہ بچوں کے ذہن بھی اس سے متاثر ہوئے۔ ابو البختری سے روایت کہ ایک روز حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر پر خطبہ فرما رہے تھے کہ حسین بن علیؓ نے کھڑے ہو کر کہا کہ "میرے ابا کے منبر کے اوپر سے نیچے اتر یئے۔" آپ نے فرمایا "بے شک منبر تمہارے ہی ابا کا ہے میرے باپ کا نہیں مگر یہ تو بتلاؤ کہ تمہیں کس نے سکھلایا ہے۔" حضرت علی کرم اللہ وجہہ کھڑے ہوئے اور آپ نے کہا "واللہ! میں نے ان سے کچھ نہیں کہا ہے۔" حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر کہا "او بے وفا تجھے خوب ہی ماروں گا۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "آپ اس کو سچ بات پر کیوں جھڑکتے ہیں واقعی منبر ان کے باپ کا ہے[۲]۔"

حضرت عمرؓ نے بڑے خوبصورت انداز میں اس سوال کا جواب دیا اور اس کا برا منانے کے بجائے انہیں عزت و تکریم دی لیکن یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ بطور خلیفہ ان کی تقرری کے دنوں میں ان کی شدت و سختی پر جو اعتراض کیا گیا تھا اس میں بنو ہاشم کا بہت بڑا ہاتھ تھا اور ان کے عہد خلافت کے آغاز میں بھی بدستور موجود تھا اور لوگوں میں کسی نہ کسی انداز میں پھیلایا جا رہا تھا۔ محمد بن زید سے مروی ہے کہ علیؓ اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ اور سعدؓ سب مل کے جمع ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ عمرؓ سے بے باک (بے تکلف) عبدالرحمنؓ بن عوف تھے۔ سب نے عبدالرحمنؓ بن عوف سے کہا کہ "آپ امیر المومنین سے لوگوں کیلئے گفتگو کرتے (تو بہتر ہوتا) کیونکہ انسان طالب حاجت بن کر آتا ہے اسے آپ کی ہیبت اپنی حاجت بیان کرنے سے روکتی ہے اور وہ بغیر اپنی حاجت بیان کئے واپس چلا جاتا ہے۔" عبدالرحمنؓ ان کے پاس گئے اور کہا "اے امیر المومنین! لوگوں پر نرمی کیجئے کیونکہ آنے والا آتا ہے اسے آپ کی ہیبت اپنی حاجت بیان کرنے سے روک دیتی ہے اور وہ واپس چلا جاتا ہے آپ سے گفتگو نہیں کرتا۔" فرمایا "اے عبدالرحمنؓ میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں سچ بتاؤ کیا علیؓ اور طلحہؓ و زبیرؓ و سعدؓ نے تمہیں اس بات کا مشورہ دیا؟" انہوں نے کہا "جی ہاں!" فرمایا "اے عبدالرحمنؓ! واللہ میں لوگوں کیلئے نرم ہو گیا تھا مگر نرمی میں بھی اللہ سے ڈرا۔ پھر میں نے سختی کی یہاں تک کہ سختی میں بھی اللہ سے ڈرا۔ پھر رہائی کی کونسی صورت ہے۔" عبدالرحمنؓ اپنی چادر کو ہاتھ سے کھینچتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ "آپ کے بعد لوگوں کیلئے افسوس ہے آپ کے بعد لوگوں کیلئے افسوس ہے[۳]۔"

---

(۱) طبری ج ۴/۲۱۴ (۲) سیوطی ص ۱۴۳ (۳) سعد ۳/۲۸۷، طبری ج ۴/۲۰۷

بہر حال فاروق اعظمؓ نے پورے خلوص اور نیک نیتی سے مسلسل یہ کوشش کی کہ بنو ہاشم کے دلوں میں پائے جانے والے رنج وملال کو کم کریں اور انہیں امور مملکت میں پورے طور پر شریک کریں۔ وہ بنو ہاشم کو خلافت کا اہل تو سمجھتے تھے' لیکن انہیں اس بات سے انکار تھا کہ یہ کوئی موروثی استحقاق ہے' جو لوگوں کی آزادانہ مرضی کے بغیر محض خاندان کی بناء پر کسی کو دیا جا سکتا ہے۔ وہ بجا طور پر اسے ایک انتخابی ادارہ سمجھتے تھے جو عوام کی مرضی سے اہل ترین شخص کو منصب امارت سونپنے کا ذریعہ تھا خواہ اس کا کسی خاندان و قبیلہ سے تعلق ہو' اس انتخاب میں ذاتی اوصاف کے ساتھ ساتھ سیاسی حالات اور دیگر اسباب و عوامل اور اثرات و نتائج کو بھی سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا ضروری تھا' چنانچہ انہوں نے مختلف انداز سے بنو ہاشم کو صحیح صورت حال سمجھانے کی کوشش کی' چنانچہ ایک سفر کے دوران مناسب موقع دیکھ کر حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا "اے ابن عباسؓ! حضرت علیؓ ہمارے ساتھ کیوں روانہ نہیں ہوئے؟" حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں۔" پھر آپ نے فرمایا "اے ابن عباسؓ تمہارے والد رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں اور تم ان کے چچازاد بھائی ہو' پھر تمہاری قوم کو (تمہیں منتخب کرنے سے) کس چیز نے روکا؟" میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں۔" انہوں نے کہا "لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ ناپسند کرتے تھے۔" میں نے کہا "کیوں؟ ہم تو ان کیلئے بہترین انسان تھے۔" آپ نے فرمایا "وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ نبوت و خلافت دونوں چیزیں تمہارے اندر جمع ہوں' شاید تم کہو کہ حضرت ابو بکرؓ نے اس بات سے رجوع کر لیا تھا ہرگز نہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے سب سے زیادہ دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا۔ اگر وہ خلافت کو تمہارے لئے مقرر کرتے تو قریب ہونے کے باوجود تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچتا[۱]۔"

راستہ لمبا تھا شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہو گیا حضرت عمرؓ کی فرمائش پر ابن عباسؓ نے زہیر کے چند مدحیہ اشعار سنائے' تو حضرت عمرؓ بولے "اس نے بہت خوب اشعار کہے ہیں۔ میرے علم میں قبیلہ بنی ہاشم سے بڑھ کر ان کا کوئی مصداق نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے قرابت داری کی وجہ سے انہیں فضیلت حاصل ہے' حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: "آپ نے صحیح بات کہی ہے اور توفیق خداوندی ہمیشہ آپ کے شامل حال رہی ہے۔" پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا: "اے ابن عباسؓ کیا تم جانتے ہو کہ حضرت محمد ﷺ کے بعد تمہاری قوم کو تم سے کس چیز نے روکا؟" بقول حضرت ابن عباسؓ میں نے اس کا جواب دینا پسند نہ کیا اس لئے کہا: "اگر میں نہیں جانتا تو امیر المومنین مجھے اس سے باخبر کریں۔" آپ نے فرمایا: "وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ تمہارے اندر نبوت و خلافت جمع ہیں مبادا کہ تم اپنی قوم سے بدسلوکی کرو۔ اس لئے قریش نے خلافت کو اپنے لئے پسند کیا' ان کی یہ رائے درست تھی اور اس میں وہ کامیاب رہے[۲]۔" اس گفتگو سے حضرت ابن عباسؓ پوری طرح قائل تو نہ ہو سکے اور انہوں نے کھل کر اپنا موقف بھی پیش کیا[۳]۔ لیکن اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے وقتاً فوقتاً بنو ہاشم کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ فاروق اعظمؓ نے ان کاوشوں کے ساتھ ساتھ اپنے عملی رویے سے ان کی قدر افزائی بھی کی اور انہیں سیاسی امور میں بھی شریک کیا۔ ایک کام یہ کیا کہ حضرت علیؓ کو مرکزی شوریٰ کا رکن بنایا اور انہیں متحرک کیا' جب بھی کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو ان کی رائے کو خصوصی طور پر معلوم کرتے اور اسے بہت زیادہ وزن دیتے۔ اکثر اسی کے مطابق فیصلہ دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک وہ زیادہ صائب ہوتی تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ عمرؓ ایک زمانے تک اس طرح رہے کہ بیت المال سے کچھ نہیں کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ فقر کی نوبت آ گئی' انہوں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ کو بلا کر ان سے مشورہ طلب کیا کہ "میں نے اپنے آپ کو اس امر خلافت میں مشغول کیا ہے' مگر وہ میرے لئے کافی نہیں ہے۔" عثمانؓ بن عفان نے کہا کہ "کھائیے اور کھلایئے۔" یہی سعیدؓ بن زید بن عمرو بن نفیل نے بھی کہا' آپ نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ "اس معاملے میں تم کیا کہتے ہو؟" انہوں نے کہا: "صبح اور شام کا کھانا (کھایئے)۔ عمرؓ نے اسی کو اختیار کیا[۴]۔" اسی طرح دیگر بہت سے امور میں حضرت علیؓ کی رائے پر عمل کیا' مثلاً حد شرب کا تعین[۵]۔ سواد کی زمینوں کی عدم تقسیم کا فیصلہ[۶]۔ نفلی روزہ میں لونڈی سے جماع کا کفارہ[۷]۔ تیسری مرتبہ چوری کرنے والے کا دوسرا ہاتھ کاٹنے کے بجائے اسے قید کر دینے کا معاملہ[۸]۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فقہی بصیرت کے خاص طور پر معترف تھے اور کھلے عام

---

(۱) طبری ۴/۲۲۲ (۲) طبری ۴/۲۲۳ (۳) مقدمہ ... طبری ۴/۲۲۴ (۴) سعد ۳/۳۰۷ (۵) مالک ۸۴۲ (۶) عبید ۶۱ (۷) سعد ۲/۳۳۹ (۸) رواس ۵۰۲

اس کا اظہار فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ خطبے میں فرمایا "ہم میں سب سے زیادہ علم فقہ کے ماہر علیؓ ہیں [1]۔" قادسیہ کے معرکے میں ان سے مزید فوجی کمک بھیجنے کی درخواست کی گئی' تو انہوں نے خود ہی جانے کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب اور دیگر اکابر صحابہؓ نے اپنے مقام پر رہ کر ہی جیوش و بعوث بھیجنے کا مشورہ دیا تو اسے قبول کر لیا [2]۔ حضرت عمر فاروقؓ نے سب سے بڑھ کر بنو ہاشم کی قدر و منزلت کی۔ دیوان کو مرتب کرنے کا پروگرام بنایا' تو حضرت علیؓ کو شامل مشورہ کیا۔ مردم شماری اور ترتیب دیوان کیلئے تین آدمیوں پر مشتمل کمیٹی بنائی' تو اس میں حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کو بھی مقرر کیا [3]۔ مرتبے کے لحاظ سے درجہ بندی میں بنو ہاشم کو نبی کریم ﷺ سے قرابت کی وجہ سے سب سے پہلے نمبر پر رکھا۔ ان کے بعد وہ لوگ جو رسول اکرم ﷺ سے قریب تھے۔ بدری صحابہؓ کے وظائف پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کئے' اور حضرت علیؓ کے ساتھ ساتھ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے وظائف بھی پانچ پانچ ہزار مقرر کئے اور حضرت عباسؓ کا وظیفہ بھی پانچ ہزار مقرر کیا [4]۔ حضرت انسؓ کے بقول جب کبھی قحط پڑتا تھا' تو حضرت عمرؓ حضرت عباسؓ کے وسیلے سے دعائے استغفار کرتے تھے اور فرماتے تھے "اے اللہ' ہم نبی ﷺ کو وسیلہ بناتے تھے تو بارش برساتا تھا۔ اب ہم اپنے نبی کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں' پس بارش برسا دے [5]۔"

سائب کے بقول قحط کے روز صبح کو میں نے عمرؓ کو عاجزی و گریہ وزاری کرتے دیکھا۔ جسم پر ایک چادر تھی' جو گھٹنوں تک نہیں پہنچتی تھی' آپ استغفار میں بہی آواز بلند کر رہے تھے' آنکھیں رخساروں پر آنسو بہا رہی تھیں' داہنی جانب عباسؓ بن عبدالمطلب تھے۔ اس روز اس طرح دعا کی کہ رو بقبلہ تھے اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کے بلند آواز سے اپنے رب کو پکارا اور دعا کی۔ ان کے ساتھ لوگوں نے بھی دعا کی' پھر آپ نے عباسؓ کا ہاتھ پکڑ کے کہا "اے اللہ! ہم لوگ تیرے رسول ﷺ کے چچا کو تیرے سامنے شفیع بناتے ہیں۔ عباسؓ بھی بڑی دیر تک ان کے پہلو میں کھڑے ہوئے دعا کر رہے تھے اور ان کی آنکھیں برس رہی تھیں [6]۔" ایک مرتبہ بہت سا مال آیا' اس کی تقسیم کا پروگرام بنایا' تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بلایا اور فرمایا "میں نے تم دونوں سے زیادہ خاندان والا کسی کو نہیں دیکھا۔ تم دونوں اس مال کو لوگوں میں تقسیم کر دو۔ اگر کچھ بڑھے تو اسے واپس کر دینا [7]۔"

قرآن مجید میں مال غنیمت کے پانچویں حصے کو اللہ اس کے رسول ﷺ اور قرابت داروں کا حق قرار دیا گیا ہے [8]۔ رسول اکرم ﷺ اس کے چار حصے کرتے تھے۔ ایک حصہ اپنے قرابت داروں دوسرا یتیموں تیسرا مساکین چوتھا مسافروں اور مہمانوں پر خرچ کرتے تھے [9]۔ آپ کی وفات کے بعد کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ایک حصہ بدستور آنحضور ﷺ کے قرابتداروں کا حق ہے اور کچھ کا خیال تھا کہ آپ کے خلیفہ کے رشتہ داروں کو ملے گا [10]۔ حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان سوال کو انہیں مدات میں تقسیم کر دیتے تھے' جن میں حضور ﷺ کرتے تھے' لیکن آپؐ کے رشتہ داروں کو نہیں دیتے تھے' لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں دینا شروع کر دیا' بعد کے خلفاء نے اسی پر عمل کیا [11]۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ "رسول اللہ ﷺ کا حصہ آپ کے بعد خلیفہ کو ملے گا۔" پھر ان میں اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ یہ دونوں حصے گھوڑوں اور خدا کی راہ میں جہاد کی تیاری میں صرف کر دیں [12]۔ حضرت عمر فاروقؓ نے خمس کا پانچواں حصہ پورے کا پورا ان کے حوالے کرنے کی تجویز تو منظور نہ کی' البتہ یہ اعلان کر دیا کہ اس سے بنو ہاشم کے ہر غیر شادی شدہ فرد کی شادی کرا دیں گے اور ہر عیالدار کو خادم فراہم کر دیں گے اور ایسے لوگوں کو زیادہ حصہ دیں گے' جن کی تعداد زیادہ ہو گی اور ضرورت مندی کی بنیاد پر زیادہ مستحق ہوں گے [13]۔

اسی طرح بنو نضیر کے اموال کو بھی میراث کے طور پر حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے حوالے تو نہ کیا کیونکہ انبیاء کرام کی میراث نہیں ہوتی۔ البتہ انہیں یہ

---

(۱) سعد ۲: ۳۳۹ (۲) بلاذری ۱: ۲۵۵ (۳) یعقوبی ۔۔۔ سعد ۳: ۲۹۵ طبری ۴: ۲۰۹ (٤) عبید ۲۱۲ سعد ۳: ۲۹۷ (٥) بخاری ۲: ۱۶ (٦) سعد ۳: ۳۲۲

(۷) عبید ۳۳٤ سعد ۳: ۲۸۸ (۸) ۔۔۔ ٤۱ (۹) عبید ۲۹۸ (۱۰) داؤد ۳: ۳۰۰ (۱۱) عبید ۳۰٤ داؤد ۳: ۳۰۰ (۱۲) داؤد ۳: ۳۰۰ (۱۳) عبید ۳۰٦

فرمایا کہ اگر آپ لوگ چاہیں تو ان کا انتظام آپ لوگوں کے سپرد کر سکتا ہوں لیکن آپ لوگوں کیلئے ضروری ہوگا کہ اللہ کے عہد اور میثاق پر مضبوطی سے قائم رہیں اور اس مال میں وہی مصارف باقی رکھیں جو رسول اکرم ﷺ نے باقی رکھے۔ انہوں نے اس کا اقرار کیا تو ان کے حوالے کر دیا۔ حضرت علیؓ کے بقول ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس مال آیا تو انہوں نے بلا کر مجھے کہا کہ "اسے لے لیں۔" میں نے کہا کہ "میں نہیں لینا چاہتا۔" آپ نے فرمایا "اسے لے لیجئے کہ آپ اس کے زیادہ حقدار ہیں۔" میں نے کہا مجھے اس کی حاجت نہیں ہے۔" پھر آپ نے اسے بیت المال میں جمع کر دیا[1]۔ یہ بھی بنو ہاشم کی بہت بڑی قدر افزائی تھی کہ اسے اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے ان پر اعتماد کیا۔

حضرت عمر فاروقؓ جب صلح بیت المقدس کے موقع پر شام تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ کو پیچھے اپنا قائم مقام بنا کر گئے[2]۔ جب خلیفہ کے انتخاب کیلئے چھ آدمیوں پر مشتمل مجلس شوریٰ بنائی تو اس میں حضرت علیؓ کا نام بھی شامل کیا[3]۔ اس طرح انہیں خلافت کا پوری طرح اہل سمجھا انہیں اس بات کی توقع تھی کہ لوگ حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ میں سے کسی کو منتخب کریں گے اس لئے دونوں کو الگ الگ بلا کر وصیت کی۔ حضرت علیؓ سے فرمایا "اے علیؓ شاید یہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے تمہاری قرابت اور دامادی کو اور جو کچھ اللہ نے تمہیں علم و فقہ عطا کیا ہے اس کا لحاظ کریں اگر تم اس امر کے والی ہو تو اللہ سے ڈرنا[4]۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بنو ہاشم میں سے کسی کو عامل و امیر بنا کر مدینے سے باہر نہیں بھیجا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہیں کاروبار حکومت چلانے کیلئے مشوروں کی ضرورت ہوتی تھی اور وہ ان کی قابلیت و لیاقت اور عقل و حکمت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ دوسرا ان کی تعظیم پیش نظر تھی۔ ان کا یہ ہمیشہ دستور رہا کہ زیادہ افضلیت رکھنے والے صحابہ کرامؓ کو چھوڑ کر کم افضل لوگوں کو عامل بناتے تھے۔ اس کی وجہ ان سے پوچھی گئی تو فرمایا "مجھے یہ ناپسند ہے کہ انہیں عمل میں آلودہ کروں[5]۔" ایک دن حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا کہ "بخدا میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تم لوگوں کو چھوڑ کر دوسروں کو عامل مقرر کرتے تھے بخدا میں نہیں کہہ سکتا کہ حضور ﷺ آپ حضرات سے اراد تاً در رکھتے تھے حالانکہ آپ اس کے اہل تھے یا بذات رسالت کو یہ اندیشہ تھا کہ آپ لوگ اسے اپنے مرتبے کیلئے استعمال کریں گے اور آپ پر عتاب ہوگا اور عتاب ضرور ہوگا[6]۔" حضرت عمر فاروقؓ کے ان تمام اقدامات سے بنو ہاشم آپ سے پوری طرح مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے آپ سے تمام امور میں بھرپور تعاون کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی حکومت و خلافت کو استحکام ملا اور ریاست اندرونی طور پر مضبوط ہو گئی۔

(ب) مہاجرینؓ و انصارؓ:

مہاجرین و انصار دو نہایت اہم گروہ تھے۔ دونوں کی اسلام کیلئے بے شمار خدمات اور قربانیاں تھیں اور ان کی قدر و منزلت بھی مسلمہ تھی۔ سیاسی لحاظ سے دونوں مضبوط تھے۔ مواخات مدینہ نے دونوں میں بہت قربت و یگانگت پیدا کر دی تھی۔ دینی امور میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے مقاصد کی یکسانیت کے باوجود سیاسی طور پر ان میں رنگ الگ تشخص کا احساس کسی نہ کسی حد تک موجود رہا۔ اس کی وجہ مزاج و طبائع کے فرق کے ساتھ ساتھ سابقہ سیاسی نظام اور قبائلیت و علاقائیت کے گہرے شعور کے اثرات اکابرین کو چھوڑ کر عام سطح کے لوگوں میں موجود تھے۔ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے وقت دونوں کا یہ دعویٰ تھا کہ خلیفہ ان میں سے ہونا چاہئے کیونکہ اپنی اپنی خدمات کے حوالے سے وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ یہ مسئلہ صرف مدینے ہی کی سطح تک محدود ہوتا تو شاید اس کا طے کرنا مشکل ہو جاتا لیکن معاملہ پورے عرب کی قیادت کا تھا اس لئے فاروق اعظمؓ کی اس دلیل میں بہت وزن تھا جو انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں پیش کی تھی "خدا کی قسم! عرب تمہاری سیادت ہرگز قبول نہیں کریں گے جبکہ نبی ﷺ تم میں سے نہیں تھے۔ وہ تو انہیں کو اپنا امیر مانیں گے جن میں نبوت تھی[7]۔"

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) ابن سعد [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) ہیکل [illegible] (۷) [illegible]

اس طرح یہ حق اصولی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ عرب کے ان مخصوص حالات میں صرف اور صرف اہل قریش ہی اس منصب کو اچھی طرح سنبھال سکتے ہیں۔ حکمت نبوی بھی اس سے باخبر تھی اس لئے اشارہ فرمایا تھا "الائمة من القریش[۱]۔" یہی وجہ ہے کہ یکے بعد دیگرے یہ منصب مہاجرین اور قریش کو سونپا گیا۔ فاروق اعظمؓ نے کمال حکمت و تدبر سے اس بات کی کوشش کی کہ سیاسی و حکومتی معاملات میں ان دونوں گروہوں کو بھرپور شرکت کا موقع دیا جائے۔ ان کو مساوی قدر و منزلت دی جائے اور ہر اہم معاملے میں دونوں کو شریک مشورہ رکھا جائے تاکہ نہ تو مہاجرین میں احساس برتری پیدا ہو اور نہ ہی انصار میں احساس محرومی۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ اس میں پوری طرح کامیاب رہے' اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ کی پالیسی بہت متوازن تھی۔ اپنی خلافت کے ابتدائی دنوں میں انہوں نے جو سیاسی منشور پیش کیا' اس کی ایک شق یہ تھی "وہ مہاجرین جو تلواروں کے سایوں میں (جنگ کر رہے) ہیں قید نہیں کئے جائیں گے اور انہیں کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ ان کو اور ان کے اہل و عیال کو مال غنیمت فیاضی کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا اور جب تک وہ واپس آئیں میں ان کے اہل و عیال کی نگرانی کرتا رہوں گا۔" ایک اور شق یہ بھی تھی "وہ انصار جنہوں نے اللہ کی راہ میں قربانی دی ہے اور دشمنوں سے جنگ کر رہے ہیں' ان کے نیک کاموں کو سراہا جائے گا اور ان کی لغزشوں کو معاف کیا جائے گا۔ نیز اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیا جائے گا[۲]۔"

حضرت عمر فاروقؓ کو جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا' تو اہل شوریٰ' انصار اور معاذ بن جبلؓ' ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ سے مشورہ کرتے تھے[۳]۔ یہ تینوں صحابہ کرامؓ جن کا ذکر ہوا ہے انصاری تھے اور مہاجرین میں سے بھی جن کو زیادہ تر شریک مشورہ کرتے تھے' وہ بھی تین ہی تھے۔ ان میں حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف شامل ہیں[۴]۔ حضرت ابیؓ کے بارے میں فرمایا کہ "وہ تمام مسلمانوں کے سردار ہیں[۵]۔" فتویٰ و قضا کا بھی یہی معاملہ تھا' جب کوئی فتویٰ لینا ہوتا تھا تو حضرت عثمانؓ' اور حضرت ابیؓ و زیدؓ کے پاس بھیجتے تھے[۶]۔ انہوں نے حضرت زیدؓ کو قاضی القضاۃ بنایا اور ان کی تنخواہ مقرر کی۔ ایک خطبے میں فرمایا کہ "جو شخص فرائض (میراث) کے بارے میں پوچھنا چاہے' وہ زید بن ثابتؓ کے پاس جائے۔" شہر کے باہر مہمات میں انہیں بھیجنے سے گریز کرتے تھے۔ جب اس بارے میں ان سے پوچھا جاتا تو جواب دیتے: "زیدؓ کا مرتبہ میرے نزدیک کم نہیں ہوا' لیکن اہل شہر ان امور کے زیادہ محتاج ہیں' جو انہیں پیش آتے ہیں۔ وہ جو کچھ زیدؓ کے پاس پاتے ہیں کسی اور کے پاس نہیں پاتے[۷]۔" وظائف کی تقسیم کے وقت بھی فاروق اعظمؓ نے ازواج مطہرات کے بعد سب سے زیادہ ترجیح ان مہاجرین و انصار کو دی' جو غزوہ بدر میں شریک تھے۔ بعض روایات کے مطابق مہاجرین انصار سب کیلئے برابر وظیفہ پانچ ہزار مقرر کیا[۸]۔ بعض کے مطابق مہاجرین کا پانچ اور انصار کا چار ہزار وظیفہ تھا[۹]۔ اس طرح گویا تریسی مہاجرین اور دو سو' کتیس انصاریوں کو اضافی وظائف ملے[۱۰]۔

ہر طرح کی مشاورت میں بھی مہاجرین و انصار کو شامل رکھا۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سفر شام کے موقع پر حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی کہ وہاں وباء (طاعون) پھوٹ پڑی ہے۔ اب ان کے سامنے مسئلہ تھا کہ وہاں جانا چاہئے یا واپس لوٹ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا "میرے سامنے مہاجرین اولین کو بلاؤ۔" ابن عباسؓ کہتے ہیں میں نے انہیں بلایا تو حضرت عمرؓ نے ان سے مشورہ لیا اور انہیں بتایا کہ ملک شام میں وباء پھیلی ہے۔ انہوں نے آپس میں اختلاف کیا' بعض نے کہا کہ آپ کے ساتھ متقدمین صحابہؓ میں سے بقیہ لوگ ہیں۔ ہم انہیں وبائی ملک میں لے جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ "اب انصار کے لوگوں کو بلاؤ۔" "میں نے بلایا' تو حضرت عمرؓ نے ان سے مشورہ لیا اور انہیں بتایا کہ ملک شام میں وبا پھیلی ہے۔" انہوں نے بھی مہاجرین کی طرح اختلافی آراء پیش کیں۔ پھر

---

(۱) بخاری ۳: ۷۸۸ مسلم ۶: ۲ (۲) طبری II ٤: ۲۲۷ (۳) سعد ۲: ۳۵۰ (٤) سعد ۲: ۳۵ (۵) سیر II ۹: ۲۹ (۶) سعد ۲: ۳۵۱ (۷) سعد ۲: ۳۵۹ (۸) سعد ۳/۲۹۳ (۹) عبید ۲۱۲ (۱۰) ہشام ۲: ۲۶٤۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا "اصحاب قریش کے بوڑھوں کو بلاؤ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔" میں نے انہیں بلایا تو انہوں نے کوئی اختلاف نہ کیا اور حل کر کہا کہ "ہم مناسب سمجھتے ہیں آپ لوگوں کو واپس لے جائیے اور انہیں وباء کے سامنے نہ کیجئے[1]۔" فاروق اعظمؓ کو مرتے دم تک مہاجرین وانصار کی قدر افزائی اور ان کے حقوق کی حفاظت کا خیال رہا۔ جب زخمی حالت میں تھے اور شام و عراق تک سے لوگ عیادت کیلئے پہنچ رہے تھے تو ان سے وصیت کی درخواست کی گئی تو فرمایا "میں تمہیں کتاب اللہ کی وصیت کرتا ہوں' جب تک تم لوگ اس کی پیروی کرتے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔" "میں تمہیں مہاجرین کی قدر دانی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ آدمی تو بہت بھی ہوں گے اور تھوڑے بھی (مگر مہاجرین کی تعداد وہی رہے گی) میں تمہیں انصار کی قدر دانی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ یہ اسلام کی وہ گھاٹی ہیں جس کی طرف اسلام نے پناہ لی[2]۔" صرف عوام ہی کو نہیں' بلکہ آنے والے خلیفہ کو بھی ان کے بارے میں خصوصی وصیت فرمائی۔

روایت میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "میں اپنے بعد والے خلیفہ کو اللہ سے تقویٰ اور مہاجرین اولین کے متعلق وصیت کرتا ہوں کہ وہ ان کے حق کی حفاظت کرے اور ان کے حرام کو ملحوظ رکھے اور میں ان انصار کے متعلق بھی وصیت کرتا ہوں جنہوں نے دارالاسلام اور ایمان کو پناہ دی۔ ان کے محسن کو قبول کیا جائے اور ان کے برے سے درگزر کیا جائے[3]۔" یہ صرف چند جھلکیاں ہیں' جن سے مہاجرین وانصار کے بارے میں حضرت عمر فاروقؓ کے برتاؤ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے' ورنہ فوج' انتظام والصرام' عدالت' بیت المال' فتاویٰ' تحقیق وتفتیش' تعلیم وتدریس اور شوریٰ وغیرہ ہر شعبے میں انہوں نے اہلیت وذوق اور مقام ومرتبے کا لحاظ رکھتے ہوئے مہاجرین وانصار کو اس قدر اور اس طرح شریک کیا کہ سب یک جان اور بنیان مرصوص بن گئے۔ ان کے الگ الگ تشخص کی سیاسی طور پر ضرورت ہی نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے دور میں باہمی رنجش وکشیدگی کا کوئی ایک بھی واقعہ نہیں ملتا۔ یہ بات حکومت کے استحکام' اندرونی امن اور فتوحات میں بہت مددگار ثابت ہوئی۔ ان کو اعتماد میں لے کر کام کرنے کا یہ عالم تھا کہ بقول ابن خزیمہ حضرت عمرؓ جب کسی کو حاکم مقرر کرتے' تو اس سے بذریعہ معاہدہ کچھ شرائط طے کرتے اور مہاجرین وانصار ہی کے لوگوں کو گواہ بناتے[4]۔

۲۔ قبائلی سیاست کی اصلاح:

ملکی وحدت واستحکام کیلئے قبائلی سیاست کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا۔ فاروق اعظمؓ کے پیش نظر یہ تھا کہ ہر شخص اپنے قبیلے سے تعلق ووابستگی رکھنے کے باوجود ریاست وحکومت کا پوری طرح وفادار بن جائے۔ عرب کا پورا ماضی قبائلی سیاست ہی کی آماجگاہ رہ چکا تھا۔ اس کا مضبوط سیاسی' معاشی' سماجی اور جغرافیائی پس منظر تھا' اس لئے یہ ناممکن تھا کہ قبائلی سیاست کو بالکل ختم کر دیا جائے اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ مختلف قبائل میں بناؤ اور بگاڑ' دوستی اور دشمنی مقامی حالات کے مطابق جاری رہتی تھی اور یہ ایک فطری بات تھی۔ حضرت عمرؓ کے نہ تو یہ بات بس میں تھی نہ ان کے پاس وسائل وذرائع تھے اور نہ ہی وقت تھا کہ قبائل ہی کی باہمی رنجشیں ختم کرنے میں لگے رہتے۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ مرکزی حکومت کے کنٹرول کو مضبوط کیا اور عدل وانصاف قائم کر دیا اور قانون کی حکمرانی قائم کر کے خاندانی' قبائلی' علاقائی' لسانی اور مذہبی تفریق ختم کر دی اور امیر وغریب اور آقا ومحکوم کو مساوی کر دیا۔ جس سے ظلم واستحصال کا خاتمہ ہو گیا اور بے اصولی وتعصب پر مبنی باہمی جھگڑے خود بخود ختم ہو گئے۔ دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ عمال وگورنروں کے اختیارات میں اضافہ کر دیا۔ علاقے کے نظم وضبط کے وہ ذمہ دار تھے اور عوام کے سامنے بھی اور مرکزی حکومت کے سامنے جوابدہ تھے۔ زکوٰۃ کی وصولی اور تبلیغ دین کیلئے الگ الگ لوگ مقرر کئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام اور علاقوں کا حکومت سے تعلق محض علامتی نہیں تھا' بلکہ عملی اور انتظامی تھا۔ لوگوں کو یہ حق حاصل تھا کہ کوئی عامل اگر ظلم وزیادتی کرے تو اس کے خلاف

---

(۱) مسلم ۶: ۲۹۰ مالک ۲: ۸۹۴ کنز ۱۱: ۷۷ (۲) سعد ۳: ۳۳۶ (۳) شیبہ ۱۴: ۵۷۳ حنبل ۱: ۳۰۵ سعد ۳: ۳۳۴ طبری ۴: ۱۹۲ حاشیہ ۳۵ حوری ۱: ۲۰ (۴) عبد ۴: ۸۰۲

شکایت کریں اور جب بھی کوئی شکایت پہنچتی اس کا ضرور ازالہ فرماتے۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "میرے جس عامل نے کسی پر ظلم کیا اور مجھے اس کی شکایت پہنچ گئی' مگر میں نے اصلاح نہ کی تو گویا میں نے خود اس پر ظلم کیا[۱]۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ قوی شخص کو عامل بنائیں' تاکہ وہ خوفزدہ ہو اور قبائلی سیاست کے دباؤ میں نہ آئے اور پوری جرأت سے قوانین کو نافذ کر سکے۔ اس لئے فرمایا "میں کسی کو اس حالت میں عامل بنا کر گناہ کروں گا' جبکہ میں اس سے زیادہ قوی کو پاؤں[۲]۔" اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قبائلی سرداروں کے اوپر مضبوط حیثیت گورنروں کی تھی۔ طاقتوروں کے مقابلے میں کمزوروں کو حوصلہ ملا اور قبیلے کے ساتھ صحیح و غلط کی تمیز کے بغیر وابستگی لوگوں کی مجبوری و ضرورت نہ رہی' جیسا کہ عہد جاہلیت میں ہوتی تھی۔ اب ریاست کا قانون ان کے جائز حقوق و مفادات کے تحفظ کیلئے موجود تھا۔ ۱۷ھ میں حضرت عمرؓ نے بصرہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا تقرر کیا' تو اہل بصرہ کو خط لکھا جو وہاں پڑھ کر سنایا گیا کہ میں نے ابو موسیٰؓ کو تم پر حاکم مقرر کیا ہے' تاکہ تمہارے کمزور انسانوں کو طاقتور انسان سے حق دلوائے[۳]۔"

تیسرا کام جس سے قبائل کا زور ٹوٹا اور مرکزی حکومت مضبوط ہوئی' وہ یہ کیا کہ عمال کو رفاہی و فلاحی امور کا پابند بنایا۔ لوگوں کے حقوق کی ادائیگی' عدل و انصاف کی فراہمی اور ان کی ضروریات زندگی کی کفالت اور ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کو نبھانے کا حکم دیا۔ اس لئے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے بارے میں لوگوں کو جو خط لکھا اس میں مزید یہ تھا کہ ان کی تقرری کا مقصد یہ بھی ہے کہ تمہارے ساتھ مل کر تمہارے دشمنوں سے جنگ کریں۔ تمہارے فرائض ادا کریں' تمہاری غنیمت تمہارے لئے اکٹھی کریں اور اسے تمہارے درمیان تقسیم کریں اور تمہارے راستوں کو پاک صاف کریں[۴]۔ ایک مرتبہ خطبہ جمعہ میں فرمایا "اے اللہ! میں تمام شہروں کے حکام پر تجھ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں صرف اس لئے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو ان کا دین اور ان کے نبی ﷺ کی سنت سکھائیں' ان پر عدل کریں' ان کی غنیمت ان میں تقسیم کریں اور ان کے کام میں جو مشکل ہو اسے میرے سامنے پیش کریں[۵]۔" یہ سارے کام محض کاغذ پر درج نہیں تھے اور نہ ہی صرف گفتگو اور زبان کی زینت بنے رہے' بلکہ عملاً انہیں کر کے دیکھا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ حکومت کی ضرورت و اہمیت واضح ہوئی۔ ایک منظم نظام کے فیوض و برکات سے عوام پہلی مرتبہ روشناس ہوئے اور وحدت و استحکام کو فروغ ملا۔ لوگوں کے سامنے عمال کی نفع بخشی آئی اور وہ قبائلی طرز سیاست کی حد بندیوں سے نکل کر وسیع پیمانے پر سوچنے لگے اور انہیں سیاسی معاملات میں شریک کار ہونے کا احساس ہوا۔ حکومت کلاں پر اعتماد پیدا ہوا اور اس کا حکومت پر اور یہی استحکام کی کلید تھی۔

چوتھا کام یہ کیا کہ جس علاقے سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔ اس کے محتاجوں پر خرچ کرنے کا حکم جاری کیا۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے یمن سے زکوٰۃ کا ایک تہائی حصہ انہیں روانہ کیا' تو اعتراض کرتے ہوئے فرمایا "میں نے تمہیں مال جمع کرنے اور جزیہ وصول کرنے کیلئے نہیں بھیجا' بلکہ اس لئے مامور کیا ہے کہ تم میر لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر کے انہیں کے محتاجوں میں واپس کر دو۔" صرف اسی صورت میں اسے قبول کرتے تھے' جبکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہاں لینے والا کوئی نہیں[۶]۔ ان کی فراست کے مطابق یہ طریق کار اس قدر ضروری تھا کہ انہوں نے وفات سے قبل بعد والے خلیفہ کو بھی اسی پر عمل پیرا رہنے کی وصیت فرمائی۔ بقول امام ابو عبید القاسم اس کی اصل وہ فرمان نبوی ہے' جو حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت دیا تھا کہ لوگوں کو نماز کی دعوت دینا جب وہ اقرار کریں' تو انہیں کہنا "ان اللہ فرض علیکم صدقۃ اموالکم' تؤخذ من اغنیائکم فترد الی فقرائکم[۷]۔"

فاروق اعظمؓ نے اس پالیسی پر اس لئے سختی سے عمل کیا کہ وہ جانتے تھے کہ دور دراز کے قبائلی علاقوں کو مسائل و مشکلات اور بھوک و افلاس کے چنگل سے نکالنے کا یہی ایک بہترین طریقہ تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس سے سیاسی وحدت و استحکام میں مدد ملے گی اور لوگوں کے دلوں میں احساس محرومی پیدا ہونے نہ دیا جائے

(۱) سعد ۳/ ۳۰۵ (۲) سعد ۳/ ۳۰۵ (۳) طبری ۶۹/۱ (۴) کنز ۸۲/۷ (۵) کنز ۸۲/۷ (۵) وصف ۱۱۶ سعد ۲۳۶/۳ حنبل ۲۷/۱ طبری ۲۰۱/۴ (۶) عبید ۵۲۸ (۷) عبید ۵۲۷

کے مکانات ختم ہو جائیں گے۔ اس فیصلے کے پس منظر میں یہ بات بھی شامل تھی کہ عہد صدیقی کے آغاز میں، مانعین زکوٰۃ نے جو فتنہ اٹھایا تھا ان میں بعض ایسے قبائل بھی تھے، جن کی یہ رائے تھی کہ ہم زکوٰۃ کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن اسے مدینے نہیں بھیجیں گے بلکہ خود ہی اپنے قبیلے میں تقسیم کر دیں گے۔ صدیق اکبرؓ نے ان کی اس بات کو اس لئے مسترد کر دیا تھا کہ وہ قبائلی عصبیت کی وجہ سے زکوٰۃ حکومت کے حوالے کرنے سے انکاری تھے اور اسے حکومت کی دخل اندازی قرار دیتے تھے۔ فاروق اعظمؓ نے اپنی اجتہادی بصیرت سے کام لیتے ہوئے بالواسطہ طور پر ان کے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا کہ زکوٰۃ انہیں کے غریب لوگوں کا حق ہے در سوچی سمجھی پالیسی کے مطابق انہیں میں تقسیم کرنے کو ترجیح دی جائے گی۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ تمام علاقوں میں خوشی و اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور عوام و خواص کا حکومت پر اعتماد بڑھ گیا اور اسے اپنا حقیقی خیر خواہ سمجھنے لگے۔ اس سے حضرت عمرؓ نے جو سب سے بڑا مقصد حاصل کیا' وہ یہ تھا کہ قبائلی سرداروں کا زور ٹوٹ گیا' حکومت کے مقابلے میں قبائل کی فوقیت و اہمیت کم ہو گئی' قبائلی حد بندیوں کی ایک اہم دیوار گر گئی۔ عام سطح کے لوگ بھی وسیع پیمانے پر سوچنے لگے اور حکومت و خلافت سے ان کا تعلق مزید گہرا ہو گیا۔

پانچواں کام یہ کیا کہ قبائل کی شخصی آزادی کو برقرار رکھا۔ ان کے مباح رسوم و رواج' عادات و اطوار اور مخصوص علاقائی و جغرافیائی روایات کو نہیں چھیڑ' سوائے اس کے کہ ان میں بہت بڑی خرابی ہو' اس کیلئے بھی کوئی فوری و ہنگامی انقلابی تبدیلیاں کرنے کے بجائے تدریج کا طریقہ اختیار کیا۔ فکری و اخلاقی اور مذہبی و سماجی تبدیلیوں کیلئے دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا سہارا لیا' یہاں تک کہ غیر مسلم قبائل کو مسلمان کرنے کیلئے بھی کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا۔ انہیں آزادی فکر' عدل و انصاف اور ہمدردی و خیر خواہی کے ذریعے متاثر کیا۔ غریبوں کا جزیہ معاف کر دیا اور مستحق لوگوں کے وظائف مقرر کئے۔ جنگ سے پہلے وہی شرائط پیش کی جاتی تھیں' جو عہد نبوی و صدیقی میں پیش کی جاتی تھیں' قبول اسلام' جزیہ یا جنگ۔ پہلی دونوں صورتوں میں ان کی شخصی آزادی کا پورا احترام کیا جاتا تھا۔ آذربائیجان کی فتوحات کے دنوں میں وہاں کے غیر مسلموں نے جزیہ دینے کے بجائے جنگی خدمات سرانجام دینے کی پیشکش کی' تو اسے فاروق اعظمؓ کی اجازت سے قبول کر لیا گیا اور آئندہ کیلئے یہی رواج ہو گیا کہ جو لوگ مسلمانوں کے دشمنوں سے جنگ کرتے تھے' ان کا اس سال کا جزیہ معاف ہو جاتا تھا[۱]۔ اس پالیسی کا نتیجہ بھی سیاسی استحکام کی صورت میں برآمد ہوا اور معاملات پر حکومت کی گرفت مضبوط ہوئی اور قبائل کو اپنی روایات' اقتدار' حقوق' مذہب اور عزت کی حفاظت کے نام پر اندرونی طور پر منظم ہونے اور سیاسی طور پر متحد ہو کر حکومت کا مقابلہ کرنے کے مواقع نہ مل سکے۔ اس سے قبائلی عصبیت بھی آہستہ آہستہ دم توڑتی گئی اور کم از کم فاروق اعظمؓ کے پورے دور میں اس کے سر اٹھانے کی نوبت نہ آ سکی۔

چھٹا کام یہ کیا کہ خود اپنے کردار و عمل سے قبائلی نظام پر ضرب لگائی اور اپنے خاندان و قبیلے کو سیاسی امور سے ایک طرف کر دیا۔ انہیں اضافی مراعات دینا تو درکنار ان کے جائز حقوق دینے میں بھی یہ احتیاط کی کہ کہیں غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں۔ وظائف کی تقسیم کے معاملے میں انہوں نے اس کا پورا لحاظ رکھا۔ روایت میں آتا ہے کہ جب ان کے سامنے ناموں کی فہرست پیش کی گئی اس میں اس طرح درج تھا کہ بنو ہاشم کے بعد بنو تیم اور بنو تیم کے بعد بنو عدی۔ میں نے انہیں فرماتے سنا کہ عمرؓ کو اس کے مقام پر رکھو (یعنی اسے بڑھاؤ نہیں) شروع ان سے کرو جو رسول اللہ ﷺ سے قریب تر ہوں۔ بنو عدی عمرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہیں یا ابو بکرؓ کے خلیفہ ہیں اور ابو بکرؓ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ تھے۔ بہتر ہو تا کہ آپ اپنے کو اس مقام پر رکھتے جہاں اس جماعت نے رکھا تھا۔ فرمایا ''خوب خوب اے بنی عدی تم نے میرے نام سے بلندی چاہی کہ میں حسنات سے تمہارے باعث محروم ہو جاؤں' نہیں اور تا مرگ

(۱) عمدی II [illegible]

نہیں چاہیے دفتر تم پر بند ہی کیوں نہ ہو جائے یعنی اگرچہ تم لوگ سب سے آخر میں لکھے جاؤ(۱)۔ ایک مرتبہ ان کے داماد نے بیت المال سے امداد کی درخواست کی تو اسے جھڑک دیا اور فرمایا "کیا تم چاہتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ سے خائن بادشاہ بن کر ملوں؟" جب وقت گزر گیا تو اسے بلا کر اپنے ذاتی مال میں سے دس ہزار درہم ادیے(۲)۔ یہی قانون کے نفاذ کے بارے میں تھا۔ جب لوگوں کو کسی چیز سے روکنا چاہتے تو سب سے پہلے اپنے عزیزوں کے پاس جاتے اور انہیں فرماتے کہ "اگر تم اس چیز میں ملوث ہوئے تو دوگنی سزا دوں گا(۳)۔"

مناصب پر تقرری کے سلسلے میں بھی انہوں نے جان بوجھ کر اپنے قبیلے بنو عدی کو محروم رکھا۔ حضرت حسن سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ اہل کوفہ کے بارے میں فرمایا کہ انہوں نے مجھے تھکا دیا ہے۔ اگر میں کسی نرم و رحمدل آدمی کو ان پر حاکم مقرر کرتا ہوں تو اس سے گستاخیاں کرتے ہیں اور اگر سخت گیر قسم کے حاکم مقرر کرتا ہوں تو شکایتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایک شخص بول اٹھا "امیر المومنین! میں ایک طاقتور، دیانتدار اور اطاعت گزار شخص کا نام لے سکتا ہوں، جو کسی حاکم کی حیثیت سے آپ کو مطمئن کر دے گا اور وہ بہت قابل تعریف ہے۔" آپ نے پوچھا "وہ کون ہے؟" اس نے جواب دیا "عبداللہ بن عمرؓ" حضرت عمرؓ بولے "استغفر اللہ! میں یہ تقرر ہرگز نہیں کروں گا، مجھے تو اللہ کی رضا مطلوب ہے(۴)۔" اسی طرح خلافت کے معاملے بھی انہوں نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو مشورے میں شامل کرنے کی اجازت دی، لیکن یہ واضح کر دیا کہ وہ مذاکرات میں تو شریک ہوں گے، لیکن خلافت میں ان کا کوئی حق نہیں ہوگا(۵)۔

قبائلی سیاست کے عادی خطے کو ایک منظم وفاقی طرز حکومت تبدیل کرنے کے بعد انہیں سب سے زیادہ اندیشہ یہ تھا کہ گر مرکزی حکومت کے بارے میں کبھی یہ تاثر پیدا ہوا کہ اس میں کسی قبیلے کو بالادستی حاصل ہو رہی ہے، تو دبے ہوئے قبائلی تعصبات پھر ابھر آئیں گے، جو بالآخر انتشار و افتراق کا باعث بن کر اسلامی ریاست کے منفرد تشخص اور مرکزی نظام کو درہم برہم کر دیں گے۔ اس لئے آپ نے وفات سے قبل متوقع خلفاء کو اس سلسلے میں محتاط رہنے کی خصوصی وصیت فرمائی۔ روایت میں آتا ہے کہ آپ نے حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہاری قوم صرف تمہیں میں سے کسی کو امیر بنائے گی۔ اے عبدالرحمنؓ! اگر لوگوں کا معاملہ تمہیں تفویض ہو تو اپنے قرابتداروں کو لوگوں کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا۔ اے عثمانؓ! اگر لوگوں کا معاملہ تمہارے سپرد ہو، تو تم اولاد ابی معیط کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط نہ کر دینا۔ اے علیؓ! اگر لوگوں کے معاملے میں تم والی بنائے جاؤ تو بنو ہاشم کو ان کی گردنوں پر نہ سوار کر دینا(۶)۔" ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فاروق اعظمؓ نے سیاسی وحدت و استحکام کیلئے سب سے اہم اور سب سے نازک معاملے کو خوب پہچانا اور نہایت خوش اسلوبی و دانشمندی سے سلجھایا اور بعد میں آنے والوں کو اس کی طرف پوری طرح متوجہ کیا۔ آپ کی بصیرت و فراست کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ آخرکار اسی مسئلے نے امن و استحکام کو تہ و بالا کرنے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا، جس کی نشاندہی انہوں نے کر دی تھی اور خلافت کا انوکھا، وسیع، جمہوری اور روشن تصور ملوکیت کے دھندلکوں میں کھو گیا۔ انسانیت آج بھی اسے محسوس حقیقت کے روپ میں دیکھنے کیلئے ترس رہی ہے۔ اس خواب کی عملی تعبیر صرف اسی صورت میں سامنے آ سکتی ہے کہ قبائلی سیاست میں فاروق اعظمؓ ہی کے طرز عمل کو پورے خلوص اور دیانتداری سے اپنایا جائے۔ اس کیلئے انہیں جیسے عزم و حوصلے اور جرأت ایمانی کی ضرورت ہے۔ حضرت عمرؓ نے قبائلی سیاست کو ایک موثر اور کامیاب حکمت عملی اور حسن تدبیر کے ساتھ وحدت و استحکام سے ہمکنار کر دیا۔ ان کے پورے عہد خلافت میں ہمیں کوئی ایسا قابل ذکر فتنہ نظر نہیں آتا جو اس کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ اس کے باوجود انہیں یہ شدت سے احساس تھا کہ قبائلی تعصبات کو

---

(۱) سعد ۳: ۲۹۵، طبری II: ۴ ۲ (۲) سعد ۳: ۳، سیوطی I: ۱۳ (۳) سعد ۳: ۲۸۹، طبری II: ۴: ۲۰۷، سیوطی I: ۱۳۹ (۴) حدرہا I: ۱۲۰ (۵) سعد ۳: ۳۴۹

(۶) سعد ۳/ ۳۴۴، شیبہ ۱۴/ ۵۷۹، بلاذری II: ۱۸۳، طبری II: ۲۷۰۴، ۱۹

ہمیشہ کیلئے ختم نہیں کر سکے۔ ان کا وجود اور علامتیں ابھی تک معاشرے میں موجود ہیں، جنہیں مٹانے کیلئے انہوں نے رات دن صرف کئے تھے۔ انہیں اپنی آنکھوں سے سر اٹھاتے ہوئے دیکھنے کی بہ نسبت اس دنیا سے اٹھ جانا زیادہ محبوب تھا، چنانچہ انہوں نے دعا کی "اے اللہ! یہ لوگ مجھ سے اکتا گئے ہیں اور میں بھی ان سے بیزار ہو گیا ہوں۔ میرے احساسات جداگانہ ہیں اور ان کے احساسات الگ ہیں۔ مجھے نہیں معلوم ہے کہ ہماری کیا حالت ہوگی۔ مجھے اسی قدر معلوم ہے کہ ان کا صرف اپنے قبیلہ سے تعلق ہے۔ اس لئے (اے خدا) مجھے اپنی طرف اٹھا لے[1]۔"

عصر حاضر میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں پر نسلی، علاقائی، قبائلی، لسانی امتیازات نہ ہوں اور جہاں مذہب و رنگ کے تعصبات کی بنا پر معاشروں میں انتشار و عدم استحکام نہ ہو، بلکہ دور حاضر کی مغربی تہذیب نے قومیتوں کے نعروں کی بنا پر دنیا کو دو عظیم جنگوں اور ہولناک تباہیوں سے دوچار کر کے نفرتوں کی دیواروں کو مزید سربلند کر دیا ہے اور اس کے حق میں ایسے دلائل فراہم کئے ہیں اور عالمی طاقتوں نے مختلف جگہوں پر قومیتوں کے تعصبات کی اس طرح پشت پناہی کی ہے کہ پوری دنیا کا عالمی امن و استحکام خطرات کے بھنور میں پھنس چکا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت نے جس طرح اپنے عہد کے بین الاقوامی، بین المسلمی و مذہبی مسائل کو حل کر کے ایک مستحکم معاشرے اور تہذیب کی بنیاد رکھی تھی اگر ہم اس کی روح کو سمجھ سکیں اور ان اصولوں اور پالیسیوں سے مدد حاصل کریں اور ان تجربات سے استفادہ کریں، جنہوں نے اپنی افادیت و تاثر کو عملی طور پر ثابت کیا ہے، تو یقیناً ہم ایک بہترین عالمی تہذیب کے احیاء کا فریضہ سرانجام دے سکتے ہیں۔

ملکی سطح پر ہم اگر اپنے مسائل کا جائزہ لیں، ہم یہ دیکھتے ہیں مختلف قومیتوں کی وحدت اور مسلم تشخص کی بنیاد پر جس ہم آہنگی نے ایک نیا ملک پاکستان تخلیق کر کے دکھا دیا تھا، اسی میں کمزوری نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور اسی سے لاپرواہی نے باقی ماندہ پاکستان کی سالمیت و بقا کیلئے بے شمار خطرات اور اندیشے پیدا کر دیئے ہیں۔ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ قومیتوں کے تنگ دائروں میں رہ کر سوچنے والے تنگ نظر لوگ بڑی چالاکی سے عوام کو تقسیم کر کے اور ان میں نفرتوں اور کدورتوں کا بارود بھر کے اپنے مقصد حاصل کر رہے ہیں اور منتخب ہو کر قومی اداروں پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہیں۔ اس طرح ملک کے بجائے عوام کی زیادہ تر وابستگی مفاد اور مجبوری کی بنا پر اپنے علاقے اور قبائل کے ساتھ پختہ ہوتی جا رہی ہے اور بالکل ویسی ہی صورتحال پیدا ہو گئی ہے، جیسی فاروق اعظمؓ کے عہد میں تھی۔ انہوں نے اپنی اجتہادی بصیرت سے جو اقدامات کئے، وہ ایسے عالمگیر اور مفید ثابت ہوئے کہ آج بھی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ ان کو اختیار کیا جائے۔ بلا تفریق عدل، اہل، قومی، دیانتدار اور ملی جذبہ رکھنے والے منصف مزاج عمال، دن رات رفاہی و فلاحی کاموں میں منہمک رہنے والے نمائندے اور زکوٰۃ کو انہی علاقوں اور صوبوں کے مفلسوں اور ناداروں میں تقسیم کر کے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے جامع منصوبوں اور مختلف قبیلوں، علاقوں اور صوبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی مقامی اقدار، رسوم و رواج اور عادات و اطوار اور آزادیوں کو برقرار رکھتے ہوئے ملک و ملت کے وفادار بنانے کی ضرورت ہے اور پھر جس طرح حضرت عمرؓ نے ہم عصری کو سیاست سے دور رکھا اور مختلف مناصب پر فائز کرنے سے اجتناب کیا۔ اسی طرح آج بھی ضروری ہے کہ ہمارے حکمران اپنے ذاتی تعلق داروں، وفاداروں، اور صوبے کے لوگوں اور پارٹی کے ورکروں کو پوری قوم پر مسلط کرنے سے اجتناب کریں، خواہ بیورو کریسی ہو، فوج ہو، عدلیہ ہو، پالیسی ساز

(۱) طبری ۲۱۰۲/۴

ادارے ہوں سرکاری ملازمین ہوں یا دیگر مفاد عامہ کے مناصب سب پر میرٹ اور اہلیت وصلاحیت کو ہی معیار بنایا جائے۔ جو حکومت بھی یہ طریقہ کار اختیار کرے گی وہی قومی حکومت کہلانے کی حقدار ہوگی اور وہ پاکستان کی تاریخ میں اسی طرح یاد رکھی جائے گی جیسے حضرت عمرؓ کی حکومت تاریخ اسلام میں ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ یہود و نصاریٰ کی جلاوطنی:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سیاسی وحدت واستحکام کیلئے ایک اور اہم قدم یہ اٹھایا کہ اپنے عہد خلافت کے آخری سال یہود و نصاریٰ کو عرب سے نکال دیا۔ اس طرح مرکز اسلام ارض اسلام کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر مسلموں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ کر لیا۔ اس سے امت مسلمہ کو ایک ایسا الگ خطہ میسر آگیا' جو چودہ صدیوں سے تمام دنیا کے مسلمانوں کی عقیدتوں' محبتوں اور امیدوں کا محور ہے۔ فاروق اعظمؓ کی یہ سیاسی حکمت عملی تقریباً بائیس سالوں کے تلخ تجربات کا ایک فطری نتیجہ تھی' جو یہود و نصاریٰ کے رویوں اور سرگرمیوں سے مسلمانوں کو ہوئے۔ رسول اکرم ﷺ نے ہجرت کے بعد میثاق مدینہ کے ذریعے جو مذہبی آزادی' حقوق انصاف اور رعایات ان دونوں گروہوں کو دیئے' وہ تاریخ انسانیت کا ایک روشن باب ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے ہر قدم پر وعدہ خلافی کی' دھوکہ دیا' مسلمانوں کے دشمنوں کا خفیہ وعدے سے ساتھ دیا۔ جاسوسی کی' مجرموں کی پشت پناہی کی' حملہ آوروں کو دعوت دی' مشکل اوقات میں ساتھ چھوڑا اور مسلمانوں کو ہر قسم کا نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اسلام کے خلاف ان کا بغض وعناد کسی دلیل پر نہیں' بلکہ نفرت وتعصب اور تنگ نظری کی بنا پر تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے خود یہ محسوس فرمالیا تھا کہ ان کا جزیرہ عرب میں رہنا ہمیشہ نقصان وفتنے کا سبب بنا رہے گا[1]۔ اس لئے ارشاد ہوا "لئن عشت ان شاء الله لاخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب فلا اترك الا مسلما[2]۔" (اگر میں زندہ رہا تو ان شاء اللہ یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے ضرور نکال دوں گا اور مسلمان کے سوا اس میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔) راوی کہتے ہیں کہ کہ پھر حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں نکال دیا[3]۔

رسول اکرم ﷺ نے بوجوہ ہی اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ اس میں زیادہ تر عنصر آپ کی بیکراں رحمت وشفقت کا تھا' جیسا کہ یہود خیبر کے معاملے سے ظاہر ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے بقول جب خیبر فتح ہوا' تو رسول اکرم ﷺ نے یہودیوں کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ فرمایا' تو انہوں نے درخواست کی کہ سارا کام ہم خود کریں گے اور اس (زمین) کی پیداوار کا نصف لیں گے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "اچھا جب تک ہم چاہیں گے' تمہیں اس شرط پر یہاں رہنے دیں گے[4]۔" ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں سیاسی صورتحال یہی تھی کہ آپ کا اخراج مناسب نہیں سمجھتے تھے' اس لئے آپ نے فوراً نکالنے کے بجائے فرمایا "اگر میں زندہ رہا" گویا آپ نے سے مستقبل کے کسی وقت کیلئے اٹھا رکھا۔ غالباً شام سے سرحدی کشیدگیوں کی وجہ سے آس پاس اور راہ میں بسنے والے قبائل سے نرمی زیادہ قرین مصلحت تھی۔

بہر حال نبی ﷺ یہ سمجھتے تھے کہ آئندہ کسی مناسب موقع پر یہود و نصاریٰ کو سرزمین حجاز سے ضرور نکال دینا چاہئے۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ

(۱) حنبل ۱ ۲۴۸ ترمذی ۳ ۸۱ بیہقی ۹ ۷ ۲ (۲) عبید ۱ حنبل ۱ ۲۴۲ ترمذی ۳ ۸۱ بیہقی ۹ ۷ ۲ (۳) عبید ۱ (٤) بخاری ۳/۷۱

عنہ کے بقول آنحضرت ﷺ کے منہ سے جو آخری بات نکلی وہ یہ تھی کہ "یہود کو سرزمین حجاز سے نکال دو اور نجرانیوں کو جزیرہ عرب سے باہر نکال دو[۱]۔" امام ابو عبید کے بقول آنحضور ﷺ نے یہ بات اس وقت کہی ہوگی جب ان میں بدعہدی کے آثار پیدا ہوئے ہوں گے یا معاہدہ صلح کے خلاف کوئی نئی روش دیکھی ہوگی[۲]۔ سیاسی حالات ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اس لئے سیاسی فیصلے بھی حتمی نہیں ہوتے۔ ان میں حالات وضروریات کے تقاضوں کے مطابق تغیر ناگزیر ہوتا ہے۔ بہت سے اقدامات اہم ہونے کے باوجود مقاصد کے حصول اور اثرات ونتائج کو مفید بنانے کیلئے مناسب وقت کے انتظار کے متقاضی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عہد صدیقیؓ اور عہد فاروقیؓ کے ابتدائی سالوں میں مملکت کی اعلیٰ مصلحت وہی رہی جو عہد نبوی ﷺ میں تھی لیکن جونہی سیاسی احوال بدلے فتوحات میں وسعت پیدا ہوئی اور جزیرہ عرب کے وحدتی رشتوں کو مزید استوار کرنا ضروری اور ممکن ہوا۔ فاروق اعظمؓ نے اجتہادی بصیرت اور مدبرانہ سیاست کو روبہ عمل لاتے ہوئے یہود ونصاریٰ کو شام کے علاقوں میں منتقل کر دیا۔ اس کیلئے انہوں نے تدریج کا طریق کار اختیار کیا اور باری باری مختلف علاقوں سے ان کا انخلاء کیا اور عدل وانصاف کا پورا پورا خیال کیا اور انہیں معاوضے اور متبادل زمینیں فراہم کیں تاکہ اسلام کی روح اور حکومت کی ساکھ دونوں محفوظ رہیں اور امت مسلمہ کے وسیع تر مفادات کی تکمیل بھی ہو جائے۔

سیاسی ریاست کو وحدت واستحکام سے ہمکنار کرنے کیلئے یہ ضروری تھا کہ کم از کم مرکز اسلام میں صرف اور صرف دین اسلام باقی رہے اور وہاں پر عقیدہ بالکل صحیح اور خالص ہو تاکہ حج کی خاطر یا دارالخلافہ میں اپنی ضروریات ومسائل کے حل کیلئے دور دراز سے آنے والے لوگوں کیلئے تعلیم وتربیت کا ایک مثالی نمونہ موجود ہو اور آس پاس سے مکمل اطمینان ہو۔ اسی حکمت کے پیش نظر سرور کونین ﷺ نے ارشاد فرمایا "اللہ یہود ونصاریٰ کو تباہ کرے کہ انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو مساجد بنا دیا۔ آگاہ رہو کہ عرب میں دو دین باقی نہ رہیں[۳]۔" ابن شہاب کے بقول آپ نے فرمایا "لایجتمع دینان فی جزیرۃ العرب۔" حضرت عمرؓ نے اس حدیث کی تحقیق کی۔ جب انہیں تشفی اور یقین ہو گیا تو یہود خیبر کو نکال دیا[۴]۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اسی کی بنیاد پر انہوں نے خیبر فدک اور نجران سے یہودیوں کو نکال دیا[۵]۔

(الف) اہل نجران:

رسول کرم ﷺ نے اہل نجران جو یمن میں واقع ہے ایک معاہدہ کیا اور انہیں تمام بنیادی حقوق مذہبی آزادی اور ہر قسم کے تحفظات فراہم کئے اور ان پر کچھ خراج اور شرائط عائد کیں جن میں سود نہ کھانے خیر خواہی برتنے ذمہ داریاں ٹھیک ادا کرنے اور ظلم وزیادتی کر کے بھاگ نکلنے کی کوشش نہ کرنا[۶]۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس معاہدے کی تجدید فرمائی[۷]۔ فاروق اعظمؓ کے عہد میں وہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سود کھانے لگے ان کی تعداد بڑھ کر چالیس ہزار ہو گئی۔ حضرت عمرؓ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ان سے اسلام کے وجود کو نقصان نہ پہنچے اس لئے انہیں جلاوطن کرنے کا سوچنے لگے[۸]۔ ادھر ان کا یہ عالم تھا کہ کثرت کی وجہ سے ان میں اختلافات اور آپس میں حسد پیدا ہو گیا۔ وہ خود ہی خلیفہ دوم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور منتقل کر دینے کی درخواست کی۔ حضرت عمرؓ نے موقع غنیمت جانا کیونکہ پہلے ہی ان کی طرف سے خطرہ محسوس فرما رہے تھے چنانچہ انہیں جلاوطن کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ بعد میں انہوں نے معافی کی درخواست کی لیکن حضرت عمرؓ نے قبول نہ کی[۹]۔ آپ نے اس فیصلے میں دراصل اسی حدیث کو بنیاد بنایا کہ عرب میں دو دین ہرگز باقی نہ رہیں[۱۰]۔ ایک روایت

---

(۱) [illegible] (۲) عبید ۹۹ (۳) مالک ۸۹۲ بیہقی ۹: ۲۰۸ [illegible] ۲۷ (۴) بلاذری [illegible] یعقوبی ۱۵۵ بیہقی ۹: ۲۰۸ (۵) [illegible] ۲۲۰ بیہقی ۹: ۲۰۸ (۶) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو یوسف ۷۲ بلاذری ۷۵ (۷) یوسف ۷۳ (۸) بلاذری ۷۵ (۹) بلاذری ۷۷ (۱۰) بلاذری ۷۷

کے مطابق ان پر حجت پوری کرے کیلئے اسلام قبول کر لینے کی دعوت دی اور فرمایا "بصورت دیگر میں رمضان کے بعد میں بری الذمہ ہوں گا"[1]۔ "اس ساری کارروائی میں سب سے اہم اور قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ ان کے ساتھ انتہائی احسان اور بھلائی کا معاملہ کیا۔ ان کی تمام جائیدادیں اور مویشی باقاعدہ خرید لئے[2] اور ایک تحریر لکھ کر دی جس میں نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد نامے کے ایفا کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ یہ لوگ شام و عراق کے جس میں کے پاس سے گزریں اسے چاہئے کہ زمین کی کھیتی کرنے میں ان کی مدد کرے اور یہ لوگ جو کچھ خود کاشت کر لیں وہ ان کیلئے راہ خدا میں صدقہ اور ان زمینوں کا بدل ہیں جنہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ کسی کو اس بارے میں ان پر اعتراض کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی ان سے کسی قسم کا تاوان لیا جا سکتا ہے اور مزید یہ کہ دو سال کا جزیہ بھی معاف کر دیا[3]۔ ایک اور روایت کے مطابق اس معاہدے میں شام و عراق کی قابل کاشت اور افتادہ زمینیں خالی کر کے دینے کا حکم بھی شامل تھا[4]۔ فاروق اعظمؓ کے اس اقدام سے عرب کا جنوبی علاقہ غیر مسلموں سے پاک ہو گیا۔ سیاسی وحدت و استحکام کی راہ ہموار ہوئی' فرمان نبوی کا اتباع بھی ہو گیا اور نہایت خوش اسلوبی سے یہود و نصاریٰ کا انخلاء ہوا۔ ان کے حقوق و مفادات کا پورا پورا تحفظ کیا گیا اور انہیں توقع اور استحقاق سے بڑھ کر صلہ ملا جس سے وہ مطمئن ہو گئے۔

فاروق اعظمؓ کے اس فیصلے سے ان کی اجتہادی فکر کے اس رجحان کی نشاندہی ہوتی ہے کہ سیاسی حالات کے بدلنے سے معاہدوں پر عمل درآمد کی نئی صورتیں تلاش کی جا سکتی ہیں جس سے ان کی روح بھی مجروح نہ ہو اور حالات کے تقاضوں اور مملکت کی وسیع مصلحتوں کا لحاظ رکھا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاروق اعظمؓ کے تدبر و سیاست سے بخوبی آگاہ تھے اس لئے ان کے عہد خلافت میں نجرانیوں نے اپنی زمینوں کی واپسی کی درخواست کی' تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا "تمہارا برا ہو' عمرؓ نہایت صحیح اور حق فیصلے کرتے تھے۔ میں ان کے کئے ہوئے کاموں میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا[5]۔" ایک اور روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے فرمایا "عمرؓ بڑے معاملہ فہم تھے' میں ان کے خلاف عمل برا سمجھتا ہوں[6]۔"

(ب) اہل خیبر:

رسول اکرم ﷺ نے خیبر پر محرم ۷ھ میں غزوہ فرمایا' یہاں کے باشندے عرصے تک آپ کے مقابلے پر جمے رہے اور آپ کو روکے رکھا اور مسلمانوں سے لڑتے رہے۔ رسول اکرم ﷺ نے مہینہ بھر ان کا محاصرہ جاری رکھا۔ پھر انہوں نے اس پر صلح کر لی کہ ان کے خون معاف کئے جائیں' ان کے بال بچے قید نہ کئے جائیں وہ زمین سے جلاوطن ہو جائیں گے اور زمین' سونے چاندی مال و اسباب سمیت مسلمانوں کیلئے چھوڑ جائیں گے' سوائے اس مال کے جو ان کے جسموں پر ہے اور یہ کہ وہ مسلمانوں سے کوئی چیز نہیں چھپائیں گے[7]۔ ایک اور روایت کے مطابق معاہدے میں یہ بات بھی تھی کہ ان کا خون معاف کر دیا جائے' وہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے اور صرف وہی چیزیں لے جائیں گے جو اونٹوں پر لادی جا سکتی ہیں' لیکن سونا' چاندی' زرہیں رسول اللہ ﷺ کا حق ہیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی چیز نہیں چھپائیں گے اور نہ غائب کریں گے اور اگر ایسا کیا' تو پھر ان کیلئے نہ امان ہو گی نہ عہد[8]۔" انہوں نے حسب عادت ابتداء ہی میں بد عہدی کر دی اور وہ مشک چھپائی' جس میں حیی بن اخطب کا مال و زیور تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے اس کے بیٹوں کو سزا دی اور جب انہیں معاہدے کے مطابق جلاوطن کرنے کا ارادہ فرمایا' تو انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں رہنے دیجئے' ہم زمین کی اصلاح کریں گے اور اس پر کام کریں گے۔ چونکہ رسول اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کے پاس اتنے غلام نہیں تھے' جنہیں یہاں کام پر لگایا جاتا اور خود انہیں اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کا انتظام کرتے۔ آپ نے ان کی درخواست منظور فرمائی اور سارے کھیت اور نخلستان اس شرط پر انہیں عطا فرما دیئے کہ آدھی پیداوار ان کی ہو گی[9]۔ حضرت ابن عمرؓ کی

---

(۱) عبید ۹۹ (۲) بلاذری ا:۷۷ (۳) یوسف ۷۵ (۴) بلاذری ا:۷۵ (۵) عبید ۹۹ (۶) یحییٰ ۲۲ بلاذری ا:۷۷ (۷) بلاذری ا:۲۶ مسعودی ۲:۲۹۸ (۸) بلاذری ا:۳۷ (۹) مسعودی ۲:۲۹۰ بلاذری ا:۳۱ یوسف ۵

روایت کے مطابق رسول کرم ﷺ نے یہود کے اس معاملے کو قبول کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ "جب تک ہم چاہیں گے' تمہیں اس شرط پر یہاں رہنے دیں گے"[۱]۔ اس طرح یہ معاملہ طے ہوگیا اور رسول اللہ ﷺ کے بقیہ عہد مبارک اور عہد صدیقی اور فاروق اعظمؓ کے عہد کے سات سال تک اسی پر عمل کرتا رہا۔ یعقوبی کے بقول ۲۰ھ میں حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں جلاوطن کردیا[۲]۔ اس قدم کے کئی اسباب تھے جو مختلف روایات سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ علامہ بلاذری کے بقول حضرت عمر بن الخطابؓ کی خلافت میں ان میں وبا پھوٹ پڑی اور وہ مسلمانوں سے چالیں چلنے لگے' اس لئے انہوں نے انہیں جلاوطن کردیا اور خیبر کی زمین ان مسلمانوں میں تقسیم کردیں' جن کا ان میں حصہ تھا[۳]۔ حضرت نافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اہل خیبر نے مسلمانوں میں تباہی پھیلانی چاہی' ان کے ساتھ خیانتیں کیں اور عبداللہ بن عمرؓ کو بالاخانے سے نیچے پھینک دیا' جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں کی زمینیں اہل حدیبیہ میں سے ان لوگوں میں تقسیم کردیں' جو یوم خیبر میں شریک ہوئے تھے[۴]۔

روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسباب تو بہت سے موجود تھے لیکن فوری واقعہ جو جلاوطنی کے فیصلے کی بنیاد بنا' وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ بلاوجہ ظلم تھا' جو اس بات کی علامت تھا کہ وہ لوگ اب حد سے گزر گئے ہیں اور وہ اس قدر سرکش ہوگئے ہیں کہ قانون' ضوابط' اخلاق' معاہدہ وغیرہ میں سے کسی چیز کا پاس و خاطر رکھنے کے روادار نہیں ہیں۔ یہ بات ریاست کے انتظامی معاملات کیلئے انتہائی خطرناک تھی اور مسلمانوں کے امن واستحکام کیلئے بھی یہودیوں کی موجودگی اور سازشیں ہر وقت خطرہ بنی رہتی تھیں۔ اس لئے حالات کا یہی تقاضا تھا کہ اس موقع پر انہیں یہاں سے رخصت کردیا جائے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے طور پر اس کا فیصلہ کرنے کے بجائے مسلمانوں کو اعتماد میں لینا ضروری سمجھا اور ان کے پورے احوال سامنے رکھ دیئے' تاکہ بعد میں کسی کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے اور ہونے کا موقع نہ ملے۔ یہی ان کے حسن انتظام اور تدبیر وسیاست کی خوبی تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بقول خطبے کیلئے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب خیبر کے یہودیوں سے ان کی جائیداد کے سلسلے میں معاملہ کیا تھا' تو آپ نے فرمایا تھا کہ جب تک اللہ تعالیٰ تمہیں قائم رکھے ہم بھی قائم رکھیں گے۔ اس کے بعد عبداللہ بن عمرؓ وہاں اپنے اموال کے سلسلے میں گئے' تو ان کے ساتھ ظلم وتعدی کا معاملہ کیا گیا' جس سے ان کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ پھر خیبر میں ان کے سوا کوئی ہمارا دشمن نہیں' صرف یہی ہمارے دشمن ہیں اور ان پر ہمیں شبہ ہے۔ اس لئے انہیں شہر بدر کردینا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ جب حضرت عمرؓ نے پختہ ارادہ کرلیا' تو (ایک یہودی خاندان) ابی حقیق کا ایک شخص آیا اور کہا "یا امیر المومنین کیا آپ ہمیں شہر بدر کردیں گے جبکہ محمد ﷺ نے ہمیں باقی رکھا تھا اور ہم سے جائیداد کا ایک معاملہ بھی کیا تھا اور اس کی شرط بھی لگائی تھی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں رسول اکرم ﷺ کا فرمان بھول گیا ہوں؟ جب حضور ﷺ نے تم سے کہا تھا کہ "تمہارا کیا حال ہوگا' جب تم خیبر سے نکالے جاؤ گے اور تمہارے اونٹ تمہیں رات رات لئے پھریں گے۔" اس نے جواب دیا "وہ تو ابوالقاسم کا مذاق تھا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اے دشمن خدا تو نے جھوٹی بات کہی' چنانچہ انہیں شہر بدر کردیا اور ان کے پھلوں' اونٹ اور دوسرے سامان یعنی کجاوے اور رسیاں وغیرہ سب کی قیمت ادا کردی[۵]۔ ان کی زیادتیوں اور عہد شکنیوں کے باوجود فاروق اعظم کا حسن سلوک اور رواداری تاریخ اسلام کا ایک درخشندہ باب ہے۔ جائیداد کی قیمت ادا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں زمینوں کی جگہ پر متبادل زمینیں بھی عطا فرمائیں اور انہیں تیما اور اریحا منتقل کردیا[۶]۔ اس طرح وہ دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بجائے اسلامی ریاست ہی میں اپنے پورے حقوق ومراعات کے ساتھ قیام پذیر ہوگئے۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کے پیچھے دراصل ریاست کی وحدت اور اس کے استحکام کی عظیم ترین حکمتیں شامل تھیں۔ اس اقدام کا محرک وہ احادیث تھیں' جن میں سرور کونین ﷺ نے جزیرۂ عرب

---

(۱) بخاری ۲:۷۱، مسلم ۲:۲۶ (۲) یعقوبی ۲:۱۵۵ (۳) بلاذری ۳۰ (۴) بلاذری ۳۸ (۵) بخاری ۳:۷۷، بیہقی ۹:۲۰۷ (۶) بخاری ۳:۷۱، مسلم ۲:۲۶، بیہقی ۹:۲۰۷

میں دو دین اکٹھے نہ رکھنے اور یہود و نصاریٰ کو جلاوطن کر دینے کا حکم دیا تھا۔ اسوۂ نبوی ﷺ بھی یہی تھا کہ وعدہ خلافیوں کی بنا پر مدینہ کے گرد و نواح کی بستیوں کو جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ فاروق اعظمؓ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ یہود خیبر کو زمینوں پر برقرار رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے پاس ان زمینوں کی کاشتکاری و آبادکاری کا کوئی معقول نظام اور افرادی قوت موجود نہیں تھی 'لیکن اب حالات بدل چکے تھے اور سیاسی و معاشی عوامل اس پالیسی پر نظر ثانی کے متقاضی تھے۔ اب ان کی اجتہادی بصیرت ہی ان تقاضوں کو نہ پہچان سکتی 'تو اور کون پہچانتا؟ چنانچہ انہوں نے نہایت جرأت مندی سے فیصلہ صادر فرما دیا اور حکمت و تدبر سے اسے عملی جامہ پہنایا۔ امام ابو عبید القاسم نے بالکل بجا تجزیہ کیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں بکثرت کام کرنے والے (کاشتکار) آگئے اور ان میں زمین کا بندوبست کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی 'تو انہوں نے یہودیوں کو خیبر سے نکال کر شام بھیج دیا[۱]۔ فاروق اعظمؓ رسول اکرم ﷺ کی تدبیر و سیاست کی روح و مزاج کو سمجھتے تھے اور اس کے مقاصد و مصالح سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کی یہ منصبی ذمہ داری تھی کہ اس کے تسلسل کو نئے حالات کی روشنی میں جاری رکھیں اس لئے ان کا یہ پختہ عزم تھا کہ "لئن عشت ان شاء الله لاخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب"[۲]۔ "(اگر میں زندہ رہا تو ان شاءاللہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دوں گا۔)

بڑے بڑے سیاسی فیصلے اگر مخصوص احوال 'فضا اور موقع محل سے مناسبت نہ رکھتے ہوں تو شدید نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں اور اہداف سے دور بھی لے جا سکتے ہیں۔ اس لئے ایک ماہر سیاستدان اور حکمران و خلیفہ کا یہ فرض ہے کہ حالات کی نبضوں پر اس کا ہاتھ رہے اور وہ دانشمندی کے ساتھ ساتھ صبر و جرأت کی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہو 'تاکہ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کر سکے اور اسے روبہ عمل لا سکے۔ حضرت عمرؓ نے یہود و نصاریٰ کے اخراج کیلئے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا 'بلکہ مناسب وقت کا انتظار کیا۔ خیبر کے یہود نے اپنی حرکتوں سے خود ہی وہ موقع فراہم کر دیا 'جس سے حضرت عمرؓ نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور رائے عامہ کو اپنے اس اقدام کے بارے میں ہموار کر کے ریاست کے وسیع تر مقاصد کو حاصل کر لیا۔ یہ ان کی دانشمندی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ چنانچہ اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا نبی ﷺ نے فرمایا ہے "ہم نے خیبر والوں سے اس شرط پر صلح کی ہے کہ ہم جب چاہیں گے ان کو وہاں سے نکال دیں گے۔ اب ان لوگوں نے عبداللہ بن عمرؓ پر دست درازی کی ہے اور اس سے قبل بھی یہ انصاری پر دھاوا بول چکے ہیں۔ ہمارے علم کی حد تک اس سرزمین پر ان کے سوا ہمارا کوئی اور دشمن نہیں ہے۔ اب خیبر میں جن لوگوں کے اموال و املاک ہوں 'وہ وہاں جا کر انہیں خود سنبھال لیں کیونکہ میں ان کو نکالنے والا ہوں[۳]۔

(ج) اہل فدک:

فدک مدینے سے دو تین دن کی مسافت پر واقع ایک علاقے کا نام ہے 'جہاں بکثرت چشمے اور پھلوں کے باغات ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے سات ہجری میں اسے صلح کے ذریعے فتح فرمایا[۴]۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ جب نبی ﷺ نے خیبر فتح کیا تو ان لوگوں نے کہا "اے محمد ﷺ! ہم ان اموال کے مالک رہے ہیں اور ہمیں ان کے بارے میں آپ لوگوں سے زیادہ علم ہے 'لہٰذا آپ اس سلسلے میں ہمارے ساتھ معاملہ کر لیجئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے آدھی پیداوار پر معاملہ کر لیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ جب تم کو نکالنا چاہیں گے نکال دیں گے۔ اس بات کی خبر اہل فدک کو بھی ہو گئی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت محیصہ بن مسعودؓ کو ان کے پاس بھیجا 'تو انہوں نے بھی وہی معاملہ طے کر لیا جو اہل خیبر نے کیا تھا۔ اس شرط کے ساتھ کہ آپ ان کی حفاظت کریں گے اور ان کا خون نہیں بہائیں گے 'چنانچہ آپ ﷺ نے اہل خیبر کی طرح ان کے معاملے کو برقرار رکھا۔ فدک رسول اللہ ﷺ کی ملکیت قرار پایا کیونکہ مسلمانوں نے اونٹ یا گھوڑے نہیں دوڑائے تھے[۵]۔ باشندگان فدک نے زمین اور نخلستان کے نصف حصے پر مصالحت کی تھی۔ عہد نبوی میں یہاں کی آمدنی مختلف رفاہی کاموں پر خرچ فرماتے تھے۔ ان میں

---

(۱) عبید ۵۸ (۲) حم[illegible] ۲۴۰ (۳) یوسف ۵۱ (۴) یاقوت ۴/۲۳۸ (۵) یوسف ۵۱ 'یاقوت ۴/۲۳۹

مسافروں کے خورد و نوش فقرائے بنی ہاشم کی ضروریات اور ان کی بیوؤں کی شادیوں کے اخراجات شامل ہیں[۱]۔ وفات نبوی کے بعد آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا صدیق اکبرؓ کے پاس خیبر و فدک سے اپنا حصہ حاصل کرنے کیلئے گئیں تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "ہماری (انبیاء کرام کی) میراث تقسیم نہیں ہوتی' بلکہ ہمارا ترکہ صدقہ ہے[۲]۔" فاروق اعظمؓ کے عہد میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ اموال لینے کے بارے میں مطالبات لے کر گئے تو انہوں نے وراثت دینے سے تو انکار کر دیا' البتہ مدینے کے اموال کو ان کے زیر انتظام دے دیا کہ وہ متعینہ کاموں پر صرف کرتے رہیں' لیکن خیبر و فدک کو کسی کے حوالے نہ کیا اور فرمایا "دونوں رسول اللہ ﷺ کا صدقہ ہیں' ان کے حقوق کیلئے جو وقتی طور پر پیش آتے تھے یا پھر وقتی حادثات کیلئے خاص تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کے انتظامات پر خلیفہ کو مختار بنایا تھا۔" امام زہری کے بقول ان دونوں کا انتظام آج تک اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے[۳]۔

حضرت عمر فاروقؓ نے جب یہود و نصاریٰ کو سرزمین حجاز سے جلاوطن کرنے کا فیصلہ فرمایا' تو آخر میں اہل فدک کی باری آئی' تو انہوں نے ان سے نہایت عدل وانصاف کا برتاؤ کیا اور نخلستان واراضی میں ان کا جتنا حصہ تھا اس کی عادلانہ قیمتیں جانچنے کیلئے چند واقف کاروں کو بھیجا اور جو قیمتیں انہوں نے تجویز کیں' وہ ان کو دے دیں[۴]۔ انہیں معاوضے میں سونا' چاندی اور اونٹوں کے پالان دیئے[۵] اور انہیں شام کی طرف بھیج دیا[۶]۔

O ..... انتخابی شوریٰ کا تقرر:

اجتہادی بصیرت' فاروق اعظم کی شخصیت کا ایک ایسا وصف تھا' جو آپ کے آخری سانس تک اپنی جولانیاں دکھاتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و دانش اور فہم و فراست کا جو وافر خزانہ عطا فرمایا تھا' اس سے اسلام اور اہل اسلام ہر اہم موڑ اور کٹھن مرحلے پر فیضیاب ہوتے رہے۔ ذی الحج ۲۳ھ کو جب آپ ہر سال کی طرح حج پر تشریف لے گئے' تو آپ کی الہامی سوچ کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ آپ کا شاید آخری حج ہو۔ مختلف علامات واشارے جن کا ہم جائزہ لے چکے ہیں' یہی خبر دے رہے تھے۔ آپ کے ارشادات' اقدامات' فرامین' نصیحتوں اور وصیتوں کا گہرا تجزیہ کریں' تو معلوم ہو سکتا ہے کہ حالات کو کس انداز میں دیکھ رہے تھے اور اپنے خیالات و تجربات کی روشنی میں آئندہ پیش آنے والے ممکنہ مسائل کو کس طرح حل کرنے چاہتے تھے؟ اسلامی نظام حیات کی کن بنیادوں کو مضبوط بنانا چاہتے تھے' تاکہ تہذیب و تمدن کی عمارت تادیر انسانیت کو سکون و راحت اور امن و حفاظت کا سائبان فراہم کرتی رہے۔ بصیرت عمرؓ کے اس پہلو کو جاننا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم انہی رہنما اصولوں کی قندیل سے اپنے دور کے تیرہ و تاریک گوشوں کو منور کر سکتے ہیں۔

تمام معاملات میں سب سے زیادہ اہمیت خلافت کے مسئلے کو حاصل تھی۔ قبل ازیں سقیفہ بنی ساعدہ میں انتخاب کے مسئلے پر مہاجرین وانصار نے صورتحال کو جس طرح خطرناک بنا دیا تھا' اب اس کا امکان اس سے کہیں زیادہ تھا کیونکہ روم' ایران اور مصر کی فتوحات میں تمام عربوں نے مل کر حصہ لیا تھا' ہر قبیلے نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ اس لئے سب ہی خلافت کے حقدار ہونے کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ آخری حج کے موقع پر کھل کر اس طرح کی چہ میگوئیاں ہونا شروع ہوئیں' تو آپ سخت پریشان ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے (قرآن مجید) پڑھتا تھا۔ جب وہ آخری حج آیا' جو حضرت عمرؓ نے کیا تھا' تو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے منیٰ میں مجھ سے کہا "کاش تم امیر المومنین کو آج دیکھتے جب ان کے پاس ایک شخص آیا اور بتایا کہ فلاں شخص یہ کہتا ہے کہ اگر میر

(۱) بلاذری ۱:۳۴ (۲) بخاری ۴:۴۲ مسلم ۵:۱۵۵ (۳) بخاری ۴:۴۲ مسلم ۵:۵۵ (۴) بلاذری ۱:۳۴ (۵) بلاذری ۱:۳۴ (۶) یاقوت ۴:۲۳۹۔

لمومنین کا انتقال ہو گیا' تو ہم فلاں سے بیعت کریں گے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "میں آج شام کھڑے ہو کر لوگوں کو متنبہ کروں گا جو (مسلمانوں کے حق کو) غصب کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کی کہ آپ ایسا نہ کریں کیونکہ موسم حج میں ہر طرح کے ناواقف اور معمولی لوگ جمع ہوتے ہیں' وہ آپ کی مجلس پر چھا جائیں گے اور مجھے خطرہ ہے کہ وہ آپ کی بات تو صحیح محل پر نہیں رکھیں گے اور آپ کی بات کو چاروں طرف پھیلا دیں گے۔ اس لئے ابھی آپ توقف کیجئے' جب آپ مدینہ پہنچیں جو دار الہجرت اور دار السنہ ہے تو وہاں آپ کے مخاطب رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ ومہاجرین وانصار ہوں گے۔ وہ آپ کی بات کو محفوظ رکھیں گے اور اسے صحیح محل پر بھی رکھیں گے۔ اس پر آپ نے فرمایا "واللہ' میں اس بات کو مدینے میں سب سے پہلی فرصت میں رکھوں گا"[1]۔" واپس مدینے پہنچے تو جمعہ کے دن خطبہ دیا' یہ زندگی کا آخری جمعہ ثابت ہوا۔

ابن عباسؓ ہی کی روایت ہے کہ آخری ذی الحج میں ہم لوگ مدینے میں واپس آئے اور جمعہ کے روز دوپہر ڈھلتے ہی میں مسجد نبوی میں آیا۔ میں نے سعید بن زید کو منبر کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا میں بھی ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ میں نے حضرت عمرؓ کو آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سعید بن زید سے کہا 'آج عمر ایسی بات کہیں گے' جو خلیفہ ہونے سے آج تک نہیں کہی۔" سعید کو میری بات کا یقین نہیں آیا اور کہا "ایسی کیا بات ہے' جو پہلے کبھی نہیں کہی اور آج کہیں گے۔" اتنے میں حضرت عمرؓ منبر پر آ کر بیٹھے اور موذن کی اذان سے فارغ ہونے کے بعد کھڑے ہوئے۔ اللہ کی حمد وثنا کے بعد (آیت رجم کے بارے میں بتایا) پھر فرمایا "میں تم سے یہ بات کہتا ہوں کہ مجھ کو یہ خبر پہنچی ہے کہ فلاں شخص نے کہا ہے کہ خدا کی قسم اگر عمرؓ مر گئے' تو میں فلاں شخص کی بیعت کروں گا' تو کوئی شخص اس دھوکے میں نہ رہے کہ ابو بکرؓ کی بیعت یکایک ہوئی تھی اور وہ پوری ہو گئی۔ یہ بیعت اگرچہ اسی طرح ہوئی' مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے شر سے بچایا اور محفوظ رکھا۔ تم میں سے کون تھا' جس کی طرف ابو بکرؓ سے زیادہ لوگوں کی گردنیں متوجہ ہوتی ہیں۔ اب جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کی بیعت کرے گا۔ دونوں (کرنے اور کروانے والا) واجب القتل ہوں گے[2]۔" اس کے بعد انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ کے تمام واقعے کی تفصیل بیان فرمائی۔ ابن سعد نے معدان بن ابی طلحہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے نبی ﷺ اور ابو بکرؓ کا ذکر کیا' پھر فرمایا کہ "میں نے خواب دیکھا کہ ایک مرغ نے مجھے چونچ ماری اور یہ مجھے بغیر میری موت کی نزدیکی کے نہیں دکھایا گیا ہے' پھر چند قومیں مجھ سے فرمائش کرتی ہیں کہ اپنا خلیفہ بنا دو۔ اللہ ایسا نہیں ہے کہ اپنا دین اور اپنی خلافت ضائع کر دے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث کیا۔ اگر کسی امر (یعنی موت) نے میرے ساتھ عجلت کی' تو خلافت ان چھ آدمیوں کے درمیان (انہیں کے) مشورے سے ہو گی' جن سے رسول اللہ ﷺ اپنی وفات تک راضی رہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض وہ قومیں میرے بعد اس امر (خلافت) میں طعن کریں گی' جن کو میں نے اپنے اسی ہاتھ سے اسلام پر مارا ہے' وہ اگر (طعن) کریں' تو اللہ کے دشمن' کفار اور گمراہ ہیں[3]۔" ایک تو آپ نے حضرت ابو بکرؓ کے انتخاب کو استثنائی قرار دیا اور شورائیت سے ہٹ کر ذاتی پسند یا سازش کے ذریعے کسی بھی انتخاب کو سخت ناپسند فرمایا۔ اس طرح آپ نے نہایت دانشمندی سے وقت کے تقاضوں کے مطابق سابقہ دونوں طریقوں سے ہٹ کر ایک تیسری راہ نکالی' جو آپ کی اجتہادی بصیرت کا شاہکار تھی۔ اس سے بے شمار خواہشمندوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مختلف قبائل کی طرف سے اپنے استحقاق کیلئے دعوے کرنے اور اس کیلئے سرگرم عمل رہنے کے امکانات ختم ہو گئے اور پھر اسے عام لوگوں کی مرضی پر نہیں چھوڑ کر وہ اپنی اپنی پسند کے امیدوار کیلئے فضا ہموار کریں یا گروہ بندی کریں۔ یہ ساری چیزیں مسلمانوں کی ملی یکجہتی اور سیاسی استحکام کیلئے خطرناک چیلنج بن سکتی تھیں' جن کا آپ نے بروقت تدارک کر دیا۔ پھر آپ نے اس میں اپنی مرضی کرنے کے بجائے رسول اکرم ﷺ کے تاحیات راضی رہنے کا جو فارمولا دیا' وہ نہایت اطمینان بخش

(۱) بخاری ۸۶/۲ '۱۰۵۲ هشام ۴/ ۳۰۸ (۲) هشام ۴/ ۳۰۸ (۳) سعد ۳: ۳۳۵.

ور قابل قبول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بالمقابل کوئی ایک بھی آواز بلند نہ ہوئی۔ یہ آپ کے سیاسی تدبر پر لوگوں کے بھرپور اعتماد اور آپ کی حکمت عملی کے مقبول و کامیاب ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ دوسرا طریقہ استصواب کا ہو سکتا تھا' جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے تقرر کے وقت کیا تھا' لیکن آپ نے اس سے بھی گریز کیا۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ آپ خلیفہ کے تقرر کو بھی منصب خلافت کی طرح ایک انتہائی بھاری ذمہ داری سمجھتے تھے۔ آپ اپنے بے مثال تقویٰ اور خوف آخرت کی وجہ سے یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی مرضی کو شامل کر کے عنداللہ مسئول ہوں۔ چنانچہ آپ کے فرزند حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے پوچھا کہ "امیر المومنین (خلیفہ) نامزد کرنے میں آپ کو کونسا امر مانع ہے؟" آپ نے جواب دیا "میں پسند نہیں کرتا کہ زندگی میں بھی اس (ذمہ داری) کا بوجھ اٹھاؤں اور مرنے کے بعد بھی[1]۔" دوسری وجہ یہ تھی کہ ریاست کی بے پناہ وسعت اور اس کے متفرق انتظامی معاملات کی بھرمار' نہایت پیچیدہ اور متنوع مسائل اور مخصوص سیاسی صورتحال کی وجہ سے آپ کو کسی بھی فرد کے بارے میں مکمل یکسوئی اور اطمینان حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ آپ اپنے فارمولے کے مطابق اہلیت رکھنے والے جس فرد کے بارے میں غور و فکر کرتے اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ کرتے' تو اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی ایسا نمایاں خدشہ سر اٹھا لیتا' جو آپ کے ارادے کو متزلزل کر دیتا۔ آپ کی فردشناسی کی قوت حائل ہو جاتی۔ ابن اسحاق امام زہری کے واسطے سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضرت عمرؓ سے ملاقات کی' تو وہ مضطرب اور پریشان تھے' فرمانے لگے "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور اس مسئلہ خلافت کا کیا حل نکالوں؟" میں نے کہا "آپ حضرت علیؓ کو مقرر کر دیں۔" فرمایا' بلاشبہ وہ اس کے اہل ہیں' مگر ان میں ظرافت ہے اور وہ تمہیں بالکل ظاہری شریعت پر چلائیں گے۔" میں نے کہا "حضرت عثمانؓ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" فرمایا "میں نے اگر انہیں بنا دیا' تو ابی معیط کا بیٹا (مروان) لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہو جائے گا اور اہل عرب ان سے ناراض ہو جائیں گے' بلکہ قتل کر دیں گے۔" پھر میں نے کہا "طلحہؓ کو مقرر کر دیجئے۔" آپ نے فرمایا "ان میں اپنی شان کا احساس ہے اللہ باوجود ان کی اس بات کے جاننے کے انہیں امت محمدیہ کا حاکم نہیں بنائے گا۔" میں نے پوچھا "پھر حضرت زبیرؓ کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟" فرمایا "وہ بہادر ضرور ہیں' مگر بازار میں اشیاء کے نرخ معلوم کرتے پھرتے ہیں کیا ایسا شخص مسلمانوں کا حکمران بن سکتا ہے؟" میں نے کہا "حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بارے میں کیا رائے ہے؟" فرمایا "وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ سپاہی تو ضرور ہیں مگر سیاسی آدمی نہیں ہیں۔" پھر میں نے عبدالرحمنؓ بن عوف کا نام لیا' تو آپ نے فرمایا کہ "آپ نے بہت اچھے آدمی کا نام لیا ہے' مگر وہ کمزور ہو چکے ہیں۔ اے ابن عباس! خلافت کا اہل وہ شخص ہو سکتا ہے' جو طاقتور ہو مگر سخت نہ ہو' مسکین مزاج ہو مگر کمزور نہ ہو' خرچ کرنے میں محتاط ہو مگر بخیل نہ ہو۔ سخی ہو مگر مسرف نہ ہو[2]۔"

جب آپ ایسا جامع صفات آدمی کسی کو نہیں پا رہے تھے' تو یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ تقرری کا بوجھ اپنے ذمے لے لیتے۔ آپ اس سلسلے میں بھی سوچ بچار کر رہے تھے کہ آپ پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔ آپ کے حوصلے اور صبر و استقامت کا یہ کمال تھا کہ شدید زخمی ہونے کے باوجود ہوش و حواس میں رہے اور اس مسئلے کے حل کیلئے جزئیات تک کا تعین کر دیا۔ اس سلسلے میں آپ مشاورت اور غور و فکر کے کئی مراحل سے گزرے۔ لوگوں نے ان سے کہا "امیر المومنین' بہتر ہوتا اگر آپ کسی کو خلیفہ نامزد کر دیتے۔" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "اگر ابو عبیدہؓ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ بنا دیتا اور اگر میرا رب مجھ سے پوچھتا تو کہہ دیتا کہ میں نے تیرے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ابو عبیدہؓ اس امت کے امین ہیں اور اگر ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ زندہ ہوتے' تو خلافت ان کے سپرد کر دیتا اور اگر میرا رب مجھ سے پوچھتا تو کہہ دیتا کہ میں نے تیرے نبی (ﷺ) کو فرماتے سنا ہے کہ سالمؓ اللہ تعالیٰ سے بہت محبت کرتے ہیں[3]۔" ایک شخص نے کہا "عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق

---

(۱) ابن سعد ۳: ۳۴۲ (۲) [illegible] طبری ۴: ۲۲۷

کیا خیال ہے؟" فرمایا "اللہ تجھے غارت کرے' بخدا میں نے اللہ سے اس بات کی خواہش کبھی نہیں کی افسوس ہے تجھ پر! میں اس شخص کو خلیفہ کیسے بناؤں جو اپنی بیوی کو طلاق دینے سے عاجز رہے۔ وہ ہمارے نزدیک اتنا عقل مند نہیں ہے کہ تمہاری زمام کار سنبھالے۔ یہ میرے لئے کوئی پسندیدہ بات نہ ہو گی کہ میں اپنے کسی گھر والے کیلئے خلافت چاہوں۔ اگر یہ بھلائی ہے' تو ہمیں حاصل ہو چکی ہے اور اگر برائی ہے' تو اس کا ہم سے دور ہی رہنا اچھا ہے۔ خاندان عمر کا ایک ہی فرد کافی ہے اور امت محمدی کی مسئولیت کیلئے کافی ہے۔ بہر حال میں نے اپنے نفس سے جنگ کی اور اپنی اولاد کو محروم کر دیا۔ اس کے بعد بھی اگر مجھے نجات مل جائے اور میں اس طرح چھوٹ جاؤں کہ نہ سزا ملے نہ جزا تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی۔ دیکھو اگر میں کسی کو خلیفہ بناؤں تو بنا سکتا ہوں کہ جو مجھ سے بہتر تھے حضرت ابو بکرؓ انہوں نے خلیفہ بنایا تھا اور اگر نہ بناؤں تو یہ بھی کر سکتا ہوں کہ جو مجھ سے بہتر تھے آنحضرت ﷺ انہوں نے کسی کو اپنا قائم مقام نامزد نہیں فرمایا تھا اور اللہ اپنے دین کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔" لوگ ان کے پاس سے چلے گئے' شام کو پھر آئے اور کہا "امیر المومنین! بہتر ہوتا اگر آپ کوئی وصیت فرما دیتے۔" فرمایا "میں نے گفتگو کے بعد پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں غور کروں اور تم میں سے کسی کو خلیفہ بنا دوں' لیکن میں نے نہ چاہا کہ زندگی میں بھی اس کا بار اٹھاؤں اور مرنے کے بعد بھی۔ پس یہ جماعت تم پر مقرر کر دی گئی ہے' جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "یہ لوگ جنتی ہیں اور ان چھ آدمیوں کا نام لیا[1]۔"

ابن قتیبہ نے "الامامۃ والسیاسۃ" میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "اگر میں معاذؓ بن جبل کو پاتا' تو انہیں خلیفہ بنا جاتا اور اگر خالدؓ بن ولید ہوتے تو یہ ذمہ داری ان کے سپرد کر دیتا۔" پھر حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث دہرائیں' جو ان دونوں کے متعلق تھیں اور کہا کہ گر اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرمائے گا' تو وہ یہ حدیثیں پیش کر دیں گے۔ مجھے اس روایت میں شک ہے' خاص طور پر حضرت خالدؓ کے متعلق۔ بھلا حضرت عمرؓ انہیں مسلمانوں کی خلافت کیسے سونپ دیتے' جبکہ قنسرین کی امارت سے انہیں معزول کر چکے تھے[2]۔ روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت عمرؓ بن خطاب سے کہا "بہتر ہوتا اگر آپ کسی کو خلیفہ بنا دیتے۔" حضرت عمرؓ نے دریافت کیا "کس کو؟" کہا "آپ کا کام کوشش کرنا ہے کیونکہ آپ ان کے رب نہیں ہیں۔ اگر آپ اپنی زمین کے نگراں کو بلاتے ہیں' تو کیا یہ نہیں چاہتے کہ وہ اپنی واپسی تک کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر آئے؟" فرمایا "کیوں نہیں!" کہا "اور جب آپ اپنے ریوڑ کے چرواہے کو بلاتے ہیں' تو کیا یہ نہیں چاہتے کہ وہ اپنی واپسی تک کسی دوسرے کو اپنی جگہ مقرر کر آئے؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اگر میں کسی کو خلیفہ نامزد کروں تو ہو سکتا ہے کہ جو مجھ سے بہتر ہے حضرت ابو بکرؓ انہوں نے اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا اور اگر خلیفہ نامزد نہ کروں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو مجھ سے بہتر تھے سرکار رسالت ﷺ انہوں نے اپنا خلیفہ نامزد نہیں فرمایا تھا[3]۔" روایت ہے کہ سعدؓ بن زید نے حضرت عمرؓ سے کہا "اگر آپ مسلمانوں کے کسی فرد کے متعلق اشارہ فرما دیتے' تو لوگ آپ کو امین سمجھتے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں اپنے بعض ساتھیوں میں حرص پاتا ہوں۔" اس کے بعد فرمایا "اگر سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ اور ابو عبیدہؓ بن الجراح میں سے کوئی ہوتا' تو میں اسے خلیفہ بنا دیتا کیونکہ مجھے ان پر اعتماد تھا۔" دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں کسے خلیفہ بناؤں؟ اگر ابو عبیدہؓ بن جراح ہوتے' تو انہیں بنا دیتا۔" اس شخص نے کہا "امیر المومنین! آپ عبداللہ بن عمرؓ سے کیوں گریز فرماتے ہیں؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "خدا تجھے غارت کرے۔ واللہ! میں خدا کی رضا نہ چاہوں گا کہ ایسے شخص کو خلیفہ بناؤں جو اپنی بیوی کو اچھی طرح طلاق بھی نہ دے سکتا ہو[4]۔"

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ زخمی ہونے کے بعد حضرت عمرؓ کو جب ان کے گھر لے جایا گیا' تو انہوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو بلا کر کہا "میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔" حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے دریافت کیا "آپ کو خدا کی قسم! کیا آپ مجھے اس خلافت کا مشورہ دے رہے ہیں؟"

(۱) سعد ۳: ۳۳۹ ' طبری ۴: ۲۲۸ (۲) قتیبہ ۱: ۲۳ (۳) سعد ۳: ۳۴۳ ' مسعودی ۲: ۳۲۹ ' جوزی ۲۱۶ (۴) عبد ۴: ۲۷۷

حضرت عمرؓ نے جواب دیا "بخدا نہیں!" اس گفتگو کے بعد حضرت عبدالرحمنؓ کی زبان سے آخری بات جو نکلی وہ یہ تھی کہ "بخدا اب میں اس میں کبھی دخل نہ دوں گا[1]" آپ نے خلافت کو چھ آدمیوں یعنی حضرت عثمانؓ بن عفان' حضرت علیؓ بن ابی طالب' حضرت زبیرؓ بن عوام' حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ' حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی مجلس مشاورت پر منحصر کردیا۔ ان حضرات کی خلافت کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کا ایک قول ماثور ہے کہ "میں نے ان لوگوں سے زیادہ کسی کو خلافت کا حق دار نہیں پایا کہ رسول اللہ ﷺ تا حین حیات ان سے خوش رہے۔ ان میں سے جس کو بھی خلیفہ بنایا جائے' وہی میرے بعد خلیفہ ہوگا۔" اور ان چھ بزرگوں کا نام لینے کے بعد فرمایا "اگر خلافت سعدؓ کو ملے' تو انہیں دے دی جائے کہ میں نے سعدؓ کو کسی کمزوری اور خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا تھا۔ بصورت دیگر جس کو بھی اس خدمت کیلئے انتخاب کیا جائے' مسلمانوں کو اس کی مدد کرنی چاہئے[2]۔" جب لوگوں کو حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کا علم ہوا' تو وہ مطمئن ہوگئے۔ فاروق اعظمؓ نے ان حضرات کو بلایا' جنہیں خلافت کی مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا تھا اور فرمایا "علیؓ! میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر خلافت تمہیں مل جائے' تو بنو ہاشم کو لوگوں کی گردن پر سوار نہ کردینا! عثمانؓ! میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں اگر تم خلیفہ ہو جاؤ تو بنو ابی معیط کو لوگوں کی گردنوں پر سوار نہ کردینا سعدؓ! میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر خلافت کا فیصلہ تمہارے حق میں ہو' تو اپنے رشتہ داروں کو لوگوں کی گردن پر سوار نہ کردینا۔" اسی طرح دوسرے ارکان شوریٰ کو بھی قسمیں دلائیں' پھر کہا "جاؤ! مشورہ کرکے فیصلہ کرو' مسلمانوں کو نماز صہیبؓ پڑھائیں گے[3]۔"

حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ ان کے انتقال سے پہلے مشاورت ختم ہو جائے اور مسلمان اپنے لئے خلیفہ کا انتخاب کریں' تاکہ وہ اپنی جان اسلام اور سلطنت کے انجام کی طرف سے مطمئن ہو کر جان آفرین کے سپرد کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کو ارکان شوریٰ میں شامل کردیا تھا' لیکن وہ صرف شوریٰ کے دوسرے ارکان اور حضرت عمرؓ کے درمیان ایک واسطہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "لوگ کھڑے ہو کر مشورہ کرنے لگے' مجھے حضرت عثمانؓ نے ایک یا دو بار مشورے میں شامل ہونے کی دعوت دی' لیکن بخدا! میں اس میں شامل ہونا پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان کے معاملے میں ہوگا وہی جو والد نے کہا تھا اور خدا کی قسم' میں نے بہت ہی کم دیکھا ہے کہ ان کے ہونٹوں میں حق کے سوا کسی بات کیلئے جنبش پیدا ہوئی ہو۔" جب حضرت عثمانؓ نے مجھ سے بہت زیادہ اصرار کیا' تو میں نے کہا: "کیا آپ لوگوں کو عقل نہیں ہے کہ امیر المومنینؓ زندہ ہیں اور آپ امیر بنا رہے ہیں؟ خدا کی قسم! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے حضرت عمرؓ کو مرقد سے جگادیا۔" انہوں نے فرمایا "تم لوگ مہلت دو! اگر میں مر جاؤں تو صہیبؓ تمہیں تین دن نماز پڑھائیں گے۔ پھر تم اپنے معاملے میں اتفاق کرو اور اگر اس کے بعد تم میں سے کوئی مسلمانوں کے مشورے کے بغیر امیر بنے تو اس کی گردن مار دو[4]۔" جس دن حضرت عمرؓ پر حملہ کیا گیا ہے' حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ مدینہ میں موجود نہیں تھے اس لئے لوگوں سے مہلت طلب کرنے کے بعد کہا "اپنے بھائی طلحہؓ کا تین دن انتظار کرنا' اگر وہ آجائیں تو فبہا ورنہ اپنے معاملے کا تصفیہ و فیصلہ کرلینا[5]۔" معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ ڈرتے تھے کہ لوگ ان کی وفات کے بعد ایک دوسرے کی مخالفت کریں گے اور ان کی یہ مخالفت شورش کی صورت اختیار کر جائے گی۔ بنو ہاشم حضرت علیؓ کی مدد کریں گے' بنو ابی معیط حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیں گے اور اہل فوج حضرت زبیرؓ' حضرت طلحہؓ یا حضرت سعدؓ کو چاہیں گے کہ یہ تینوں ممتاز سپہ سالاروں میں سے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے انصار کو بلا کر کہا "انہیں تین دن تک ایک گھر میں بند رکھو۔ اگر وہ ٹھیک ٹھیک کام کریں تو خیر ورنہ گھر میں گھس کر ان کی گردنیں مار دینا[6]۔" پھر ابو طلحہ انصاریؓ کو بلایا' جو عرب کے گنے چنے بہادروں میں سے تھے اور ان

(۱) [illegible] ۲۷ [illegible] طبری [illegible] ۱۹۱/۴ (۲) بخاری [illegible] ۳۶ (۳) سعد ۳/۳۴۴' شیبہ ۱۴/۵۷۹' بلاذری [illegible] ۱۸۳' فیر ۳۴/۲۸ (۴) سعد ۳/۳۴۰
عبد [illegible] ۲۲۹ (۵) [illegible] ۲۲۸ (۶) سعد ۳/۳۴۴

سے کہا "جس گھر میں یہ مشورہ کریں اس کے دروازے پر کھڑے ہو جانا اور کسی کو گھر میں نہ جانے دینا" دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "ابو طلحہ" اپنے قبیلے کے پچاس انصاریوں کو لے کر ارکان شوریٰ کے ساتھ رہنا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کسی ایک رکن کے گھر میں جمع ہوں گے۔ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر اس گھر کے دروازے پر کھڑے ہو جانا اور کسی کو گھر میں نہ جانے دینا' ان لوگوں کو تین دن سے زیادہ مہلت دینے کی ضرورت نہیں۔ اس دوران میں انہیں اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لینا چاہئے۔ یا اللہ! میری طرف سے تو ان کا نگران ہے[1]!" آپ نے اراکین شوریٰ کو بلایا اور ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "میں نے لوگوں کے معاملے میں غور کیا ہے' ان کے دلوں میں تمہارے خلاف کوئی جذبہ نہیں پایا۔ اگر کوئی اختلاف یا ناگواری ہو گی' تو تمہارے اندر ہو سکتی ہے۔ تین دن تک مشاورت کرنا اگر طلحہؓ (جو ان دنوں اپنے اموال کے انتظام کے سلسلے میں سراۃ گئے ہوئے تھے) آ جائیں' تو انہیں شامل کر لینا۔" فرمایا "طلحہؓ کے بارے میں مجھے کون اطمینان دلائے گا؟" حضرت سعدؓ نے ذمہ داری لی[2]۔ آپ نے ہر طرح کے ممکنہ پہلوؤں کے بارے میں واضح لائحہ عمل فراہم کیا' تاکہ کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہو۔ اس کا اندازہ آپ کی ان ہدایات سے ہو سکتا ہے۔ آپ نے حضرت صہیبؓ کو ہدایت کی "اگر پانچ کوئی فیصلہ کر لیں اور ایک تسلیم نہ کرے' تو اس کی گردن مار دینا۔ اگر چار ایک طرف ہوں اور دو تسلیم نہ کریں تو ان دونوں کی گردن مار دینا۔ اگر تین ایک طرف ہوں' عبد اللہ بن عمرؓ حتمی فیصلہ کریں گے۔ اگر لوگ تسلیم نہ کریں تو فیصلہ اس طرف ہو گا' جس طرف عبد الرحمن بن عوف ہوں گے۔ اگر پھر بھی باقی تین تسلیم نہ کریں تو ان کی گردن مار دینا[3]۔"

آپ نے حضرت مقداد کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ "جب مجھے قبر میں دفن کر چکو' تو اس جماعت (مجلس شوریٰ) کو کسی گھر میں یا بعض روایات کے مطابق حضرت عائشہؓ کے حجرے کے پاس اکٹھا کرو' تاکہ اپنے میں سے کسی کا انتخاب کر لیں (۴)۔" آپ نے آئندہ منتخب ہونے والے خلیفہ کو کچھ نصیحتیں بھی فرمائیں' تاکہ انہیں اپنی حکمت عملی کا حصہ بنا کر آپ کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکے۔ روایات میں ہے اور عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو مہاجرین اولین کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ ان کے حقوق کو پہچانے اور ان کے احترام و عزت کو ملحوظ رکھے اور میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ انصار سے بہتر سلوک کرے' جو دار الہجرت اور دار الایمان (مدینہ منورہ) میں (رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے سے) مقیم ہیں۔ (خلیفہ کو چاہئے) کہ وہ ان کے نیکوں کو نوازے اور ان کے بروں کو معاف کر دیا کرے اور میں ہونے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ شہری آبادی سے بھی اچھا معاملہ رکھے کہ یہ لوگ اسلام کی مدد' مال جمع کرنے کا ذریعہ اور (اسلام کے) دشمنوں کیلئے ایک مصیبت ہیں اور یہ کہ ان سے وہی وصول کیا جائے' جو ان کے پاس فاضل ہو اور ان کی خوشی سے لیا جائے اور میں ہونے والے خلیفہ کو اعراب سے بھی اچھا معاملہ کرنے کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ اصل عرب ہیں اور اسلام کی جڑ ہیں اور یہ کہ ان سے ان کا بچا کھچا مال وصول کیا جائے اور انہیں کے محتاجوں میں تقسیم کر دیا جائے اور میں ہونے والے خلیفہ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے عہد کے نگہداشت کی (جو اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلموں سے کیا ہے) وصیت کرتا ہوں کہ ان سے کئے گئے عہد کو پورا کیا جائے۔ ان کی حفاظت کیلئے جنگ کی جائے اور ان کی حیثیت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالا جائے[5]۔"

آپ نے ریاست کی مضبوطی' حکومت کے بھرم اور ساکھ کی بقا اور اپنی پالیسیوں کے تسلسل کیلئے یہ بھی وصیت کی کہ "آپ کے عمال کو ایک سال تک اپنے عہدوں اور علاقوں میں بحال رکھا جائے[6]۔" آپ کے مذکورہ طرز عمل اور احکامات و ارشادات سے خلافت کے بارے میں آپ کے نظریات کے حسب ذیل

---

(۱) سعد ۳: ۳۳۶؛ طبری ۴: ۲۲۹ (۲) سعد ۳: ۳۴۴؛ خیاط ۱: ۱۵۴؛ صدی ۴: ۲۲۸ (۳) سعد ۳: ۳۴۲؛ خیاط ۱: ۱۵۴؛ طبری ۴: ۲۲۹؛ یعقوبی ۱۶۰ (۴) طبری ۴: ۲۳ (۵) یوسف ۱۲؛ عبید ۲۲۰؛ حنبل ۱/ ۳۰۹؛ بخاری ۴/ ۲۰۸؛ سعد ۳/ ۳۳۷؛ طبری ۴/ ۲۲۷؛ شیبہ ۱۴/ ۵۷۸؛ حافظ ۳۵۵؛ جوزی ۲۱۵ (۶) سعد ۳: ۳۵۹۔

نمایاں پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱۔ خلافت ایک عظیم ور نازک منصب ہے اس کی ذمہ داریاں انتہائی بھاری ہیں۔ اس پر متمکن فرد کیلئے ضروری ہے کہ اس کا کما حقہ' احساس کرے۔ یہاں تک کہ آپ نے اٹھائے جانے کی دعا کی' فرمایا "مجھے اپنے اوپر کبھی کسی چیز کا خوف نہیں ہوا سوائے تمہاری امارت کے[۱]۔ "تم لوگ میری امارت پر رشک کرتے تھے واللہ مجھے یہ پسند ہے کہ میں کسی طرح بھی نجات پا جاؤں نہ کچھ مجھ پہ ہو نہ میرے لئے ہو۔ واللہ! اگر میرے پاس وہ سب کچھ ہوتا جس پر آفتاب طلوع ہوتا ہے' تو میں ہول مطلع (قیامت) سے اسے فدیہ میں دے دیتا۔"

۲۔ خلافت کسی خاندان کا یا قبیلے کا حق نہیں ہے اسے کسی خاص قبیلے میں مقید نہیں رہنا چاہئے۔ حکمت اور اسلامی مقاصد کی تکمیل ور اسلام کے مزاج کی روح یہ ہے کہ گردش میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے عشرہ مبشرہ میں ہونے کے باوجود اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ ور اپنے قریبی عزیز حضرت سعید بن زیدؓ کو منتخب کرنے یا شوریٰ کی کارروائی کا موثر حصہ بننے سے منع فرمایا اور اپنے خاندان بنو عدی کو نہایت خوبصورت دلیل دے کر الگ کر دیا اور آئندہ کے حکمرانوں کیلئے ایک رہنما صول چھوڑ۔ "اگر خلافت اچھی چیز ہے تو ہم نے اس کو حاصل کر لیا اور اگر بری ہے تو عمرؓ کے خاندان کیلئے یہی کافی ہے کہ اس کے یک فرد سے اس کا محاسبہ ہو اور صرف اسی سے امت محمدیہ کے امور کا جواب طلب کیا جائے[۲]۔"

۳۔ خلیفۃ المسلمین کیلئے ضروری ہے کہ منتخب ہونے کے بعد قبائلی وابستگی سے بالاتر ہو جائے اور امور سلطنت چلانے کیلئے انتظامی افسران کا تقرر کرتے وقت رشتہ داروں کو مسلط کرنے سے گریز کرے۔ آپ نے انتخابی شوریٰ کے ارکان کو الگ الگ بلا کر یہ بات ذہن نشین کر دی۔ علاوہ ازیں آپ کا اپنا عمل یہ رہا ہے کہ اپنے ساڑھے دس سالہ دور خلافت میں اس قدر وسیع سلطنت کے بے شمار انتظامی عہدوں میں سے اپنے ایک رشتہ دار کو صرف ایک چھوٹا سا عہدہ دیا اور اسے بھی جلد ہی برطرف کر کے ایک درخشندہ روایت قائم کی۔ دور جدید میں ہم قبائل کے ساتھ سیاسی پارٹیوں پر بھی اس کا اطلاق کر سکتے ہیں۔

۴۔ آپ یہ سمجھتے تھے کہ خلیفہ کا انتخاب مسلمانوں کا حق ہے' اسے مشاورت کے مناسب فورم پر باہمی مشورے سے طے کرنا چاہئے اور اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ عامۃ الناس کی اجتماعی رائے اور اس کے بارے میں جذبات کیا ہیں' تاکہ وہ امور کو بہتر طور پر چلا سکے۔ رسول اکرم ﷺ کا اسوہ یہی تھا کہ آپ نے کسی کا تقرر نہیں کیا تھا۔ اسے عوام کی نمائندگی کرنے والے اہل حل وعقد پر چھوڑ۔ جب حضرت عمرؓ نے اس کا حوالہ دیا' تو لوگ سمجھ گئے کہ آپ بھی کسی کا تقرر نہیں فرمائیں گے۔ آپ نے ذاتی پسند یا سازش کے ذریعے خلیفہ کے تقرر کو ناجائز قرار دیا۔ آپ اس کے اس قدر مخالف تھے کہ دونوں کو واجب القتل سمجھتے تھے۔ عہد حاضر میں ایسی سازشوں اور طریقوں کو خلاف اسلام قرار دیا جا سکتا ہے۔

۵۔ آپ خلافت کے استحقاق کی بنیاد دین سے وابستگی' اس میں سبقت' اس کی خاطر دی جانے والی قربانیوں کو سمجھتے تھے۔ فرمایا "یہ خلافت سب سے پہلے بدر والے مسلمانوں کا حق ہے' جب تک ان میں سے ایک بھی باقی رہے پھر احد والے' اسی طرح درجہ بدرجہ' لیکن یہ ان لوگوں کا حق نہیں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے یا جو فتح کے وقت آزاد کئے گئے اور نہ ہی ان کی اولادوں کا حق ہے[۳]۔" انتخابی شوریٰ کے تقرر کے وقت اسے عشرہ مبشرہ تک محدود کر دینا بھی آپ کے اسی تصور کا غماز ہے کہ ایسے افراد کی دین کے ساتھ کمٹمنٹ جو ثابت شدہ ہوئے ساتھ ساتھ ان کے اعمال نامے اور نظریاتی تعلق اور رسول اکرم ﷺ کے دیئے گئے معیارات شرافت کو سامنے رکھا جائے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جانچنے کے وہی پیمانے تھے' جن کی آپ نے نشاندہی کی تھی اور دور جدید میں ہم اس کی روح

---

(۱) سعد ۳: ۲۰٤ (۲) طبری ٤: ۲۲۸ (۳) سیوطی ۱٤٤

کو سامنے رکھ کر مناسب معیارات مقرر کر سکتے ہیں۔

۶۔ آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ اسلام میں انتخاب کا کوئی خاص طریق کار مقرر شدہ نہیں ہے۔ شریعت کے مصالح اور حالات و وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے شورائیت کا کوئی مناسب طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے' جس میں ناپسندیدہ باتوں سے مکمل طور پر اجتناب کیا گیا ہو۔ روایت میں آتا ہے جب آپ نے یہ فرمایا کہ "اگر میں خلیفہ بناؤں تو (بنا سکتا ہوں) جو مجھ سے بہتر تھے انہوں نے خلیفہ بنایا ہے اور اگر ترک کردوں تو (کر سکتا ہوں) جو مجھ سے بہتر تھے انہوں نے ترک کیا' تو راوی کہتے ہیں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ خلیفہ بنانے والے نہیں ہیں [1]۔ آپ نے اپنے دور کے حالات اور وقت کے تقاضوں پر جب غور کیا تو اس نتیجے تک پہنچے کہ ترک کرنا ہی بہتر ہے' لیکن اس طرح نہیں جیسے رسول اکرم ﷺ نے ترک کیا تھا' بلکہ ایک تیسرا طریقہ اختیار کیا اور انتخابی شوریٰ تک خلافت کو محدود کر کے ایک اجتہادی فیصلہ فرمایا' جو نہایت صائب تھا۔ اس کے پیچھے کئی دنوں اور راتوں کا غور و خوض کار فرما تھا۔ آپ نے حضرت ابن عباسؓ سے جو پہلے شخص تھے' جنہوں نے زخمی ہونے کے بعد آپ سے ملاقات کی فرمایا "میرا یہ خیال ہے کہ اب عام لوگ مجھ سے ملاقات نہیں کر سکیں گے۔ مجھ سے تین باتیں ذہن میں رکھئے' ایک یہ کہ میں نے کلالہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ دوسرا یہ کہ میں نے کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کیا۔ تیسرا یہ کہ عرب کے تمام قیدی جو میری وفات تک ہوں آزاد ہیں [2]۔ اس طرح آپ نے آئندہ آنے والے زمانوں کیلئے اس بات کو پسند کیا کہ خلیفہ اپنی پسند سے کسی کا تقرر کرنے سے احتراز کرے۔ دور جدید کے سیاسی و سماجی حالات اور طریقہ ہائے انتخاب اسی حکمت عملی کا تقاضا کرتے ہیں۔

۷۔ آپ نے خلیفہ کے تقرر کیلئے جو ضابطہ مقرر فرمایا' اس کے ہر پہلو میں ہمارے لئے رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ اس کی علتوں اور حکمتوں پر غور کر کے عہد حاضر کے بے شمار پیچیدہ انتخابی مسائل کو ہم حل کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ نے گہری اور مسلسل سوچ بچار کے ذریعے مروجہ حالات کا تجزیہ کیا۔ ماضی کے تجربات کو سامنے رکھا اور آئندہ پیش آنے والے ہر طرح کے ممکنہ خطرات و نقصانات کو نشان زد کرنے کے بعد ایک واضح لائحہ عمل دیا' جس میں ہر اندیشے سے بچنے کیلئے کوئی نہ کوئی اصول وضع کر کے ٹھوس منصوبہ بندی کی اور چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کا تعین کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت خوش اسلوبی سے خلافت کا مسئلہ طے ہو گیا اور ایک وسیع و عریض سلطنت سیاسی انتشار سے بچ گئی۔ آپ نے طے کر دیا کتنے آدمیوں کی شوریٰ ہو گی' اجلاس کہاں منعقد ہو گا' حفاظت کون کرے گا' نماز کون پڑھائے گا' کاسٹنگ ووٹ کس کا ہو گا' بصورت دیگر کیا ہو گا؟ کتنے دنوں میں فیصلہ لازمی ہو گا؟ اکثریتی فیصلہ تسلیم نہ کرنے کی صورت میں کیا طریقہ ہو گا' وغیرہ وغیرہ۔ دور جدید میں اگر پالیسی ساز ادارے اور الیکشن کمیشن کے ذمہ داران اسی سنجیدگی اور گہرائی سے معاملات کا جائزہ لے کر انتظامات کریں' تو کوئی وجہ نہیں کہ وسیع تر قومی و ملی مقاصد حاصل نہ ہو سکیں یا سیاسی استحکام اور مثبت نتائج حاصل نہ ہو سکیں۔

---

(۱) سعد ۳، ۳۴۳، (۲) سعد ۳، ۳۴۳، طبری ۱: ۲۷۲۲

باب ہفتم

بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے انتظامی مسائل

☆۔ تمہید
☆۔ پبلک ایڈمنسٹریشن کے جدید تصورات
☆۔ فاروق اعظمؓ کا فلسفۂ تنظیمِ عامہ
☆۔ انتظامی حکمت عملی جدید تناظر میں
☆۔ تنظیمِ عامہ کا ضابطہ اخلاق
☆۔ تنظیمِ عامہ کے فرائض

بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے انتظامی مسائل

O .. تمہید:

اجتہادی بصیرت ایسی صلاحیت کا نام ہے جو کسی انسان کو زندگی کے ہر معاملے کی پنہائیوں اور تہوں میں چھپی ہوئی حقیقتوں سے آشنا کرتی ہے۔ مجتہد پیش آنے والے حالات و وقت کی نوعیت اس کے پس منظر اور پیش منظر کو عام انسانوں سے بالکل مختلف انداز میں دیکھتا ہے۔ وقت کی ضرورتیں اور اجتماعی حکمتوں اور مصلحتوں کے تقاضے اس کے ذہن رسا کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں۔ مستقبل کے گرد انسانی لاچاری و لاعلمی کے لپٹے ہوئے دبیر و سیاہ پردے اس کے نور بصیرت کو گزر جانے کا راستہ دے دیتے ہیں۔ اجتہادی بصیرت اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ذاتی وصف ہے جو اسی کی عنایت و کرم ہی سے حاصل ہوتا ہے اور قائم رہتا ہے۔ یہ جسے ملتا ہے اس کے ہاتھ میں ایک ایسی شاہ کلید (Master Key) آجاتی ہے جو زندگی کے ہر قفل کو لگ جاتی ہے۔ جس کے ذریعے انسانی فوز و فلاح اور تعمیر و ترقی کے بند دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فاروق اعظمؓ کو ایسی ہی اجتہادی بصیرت سے نوازا تھا۔ اس نے اجتماعی نظام کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر دائرے کو نئی وسعت، نیا زاویۂ نگاہ اور تعلیمات اسلام کی روشنی میں نیا لائحہ عمل فراہم کیا۔ اس نے جس طرح قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی بھرپور رہنمائی کی اسی طرح عصر حاضر بھی اسی کا محتاج ہے۔ آپ کی اجتہادی بصیرت سے دور حاضر میں جن شعبوں میں سب سے زیادہ استفادہ کرنے کی ضرورت ہے ان میں انتظامی معاملات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے کیونکہ انسانی تہذیب و تمدن کے مسلسل ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسانوں کے مسائل میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ تعلیم، صحت، امن عامہ، عدل و انصاف، آبادی، ماحولیات، علاقائیت، فرقہ واریت، قومیت، زراعت، صنعت، تجارت، ٹرانسپورٹ، ابلاغیات، اطلاعات وغیرہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو متنوع اور مختلف قسم کے ان گنت مسائل سے دوچار نہ ہو۔ جس کا دائرہ قصبات اور شہروں سے لے کر بین الاقوامی سطح تک وسیع ہو چکا ہے۔ یہ مسائل انتظامی نوعیت کے ہیں ان کو حل کرنا حکومتوں کی سب سے بڑی ذمہ داری بن چکی ہے۔ ان مسائل و معاملات کی نوعیت کو سمجھنا، انہیں حل کرنے کیلئے منصوبہ بندی کرنا، ان تمام مادی و انسانی وسائل کو بروئے کار لانا جو مددگار ہو سکتے ہوں، پالیسیاں اور حکمت عملی وضع کرنا، اثرات و نتائج کا تجزیہ کرنا، مقاصد و اہداف کا تعین کرنا، ان کے حصول کو یقینی بنانا، ایسے افراد کار اور عملے کا تقرر کرنا جو انہیں سرانجام دے، اس کی پیشہ ورانہ تربیت کرنا اور محاسبہ کرنا، یہ سب کچھ ایک وسیع شعبہ علم کے سانچوں میں ڈھل چکے ہیں۔ جنہیں "علم انتظامیات" پبلک ایڈمنسٹریشن یا ایڈمنسٹریٹو سائنس کہا جاتا ہے۔ جو سب سے زیادہ مقبول علم بن چکا ہے۔ عصر حاضر کی پوری تہذیب کو اس سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ W.V.Donham کے بقول "اگر ہماری تہذیب ناکام ہو جاتی ہے تو اس کی اصل وجہ ایڈمنسٹریشن کی ناکامی ہوگی"[1]۔ گوئل کے بقول "پبلک ایڈمنسٹریشن نے آج اپنی اہمیت و وسعت دونوں کو بہت وسیع کر لیا ہے تاکہ ان نئے آلات اور فنی اصولوں کے ذریعے عوام کی فلاح و بہبود کی حفاظت و نگرانی کی جا سکے جو سائنس اور ٹیکنالوجی نے فراہم کئے ہیں"[2]۔

نبی کریم ﷺ کے بعد فاروق اعظمؓ تاریخ اسلام کے اعلیٰ مدبر اور کامیاب ترین منتظم کی حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے حالات و وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی روح کو سامنے رکھتے ہوئے نئے انتظامی تصورات، انتظامی آلات اور انتظامی طریقے متعارف کرائے اور اسلامی مقاصد کے حصول کیلئے اپنی ذات اور پوری انتظامی

---

(۱) Tyagi:15 (۲) Goel:3.

مشینری کو سرگرم عمل کردیا۔ عصر حاضر میں صرف مسلمانوں ہی کو نہیں 'بلکہ پوری عالم انسانیت کو جس کے انتظامی معاملات جدید ترین وسائل وذرائع کی موجودگی کے باوجود روبرو درپردو دگرگوں ہوتے جارہے ہیں۔ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ آپ کی اس کامیابی کا راز کیا تھا؟ بائیس لاکھ اکیاون ہزار مربع میل سے زائد رقبے پر پھیلی ہوئی سلطنت کے انتظامی معاملات کی موثر نگرانی' کمانڈ اور کنٹرول کے ذریعے آپ نے حاصل کی؟ یہ سب کچھ ایسے حالات اور دور میں کیا' جبکہ رابطے' اطلاعات اور نقل وحمل کے ذرائع انتہائی محدود تھے۔

آج یہ ضرورت ہے کہ ہم تنظیم عامہ (Public Administration) کے بارے میں آپ کے فلسفے اور نظریات کا جائزہ لیں۔ آپ کے تجربات اور انتظامی حکمت عملی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کریں۔ آپ کے نظریاتی اصولوں اور انتظامی ماڈل کے خدوخال پر غور وخوض کریں اور یہ فیصلہ کریں کہ ان سے ہم کیا درکیونکر رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں؟ اس موضوع پر ایک الگ باب لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ دور جدید میں نظم عامہ کو ترقی اور جدیدیت کے سبب سب سے بڑے آلہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس کے بعد کوئی بھی حکومت نہ تو اپنی ذمہ داریاں بطریق احسن سرانجام دے سکتی ہے اور نہ ہی اپنے ان مقاصد اور منشور کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے' جن کی بنا پر اس نے عوام کو اپنا ہمنوا بنا کر اقتدار حاصل کیا ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی کامیابی وناکامی' اچھی وبری شہرت اور مستقبل کے امکانات کا دارومدار تنظیم عامہ کے وسیع نظام پر اس کی گرفت اور اس کے تعاون پر ہوتا ہے۔ پبلک ایڈمنسٹریشن کا انتظامی ڈھانچہ عوام کے بارے میں اس کے طرز عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے کہ لوگ اسی کو اصل حکومت سمجھتے ہیں۔ یہ حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ کار کے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ حکومت کی طرف سے عوامی مسائل کو حل کرنے کا کام اسی کے ذمے ہوتا ہے۔ اس کی کارکردگی اور روزمرہ معاملات وضروریات سے دلچسپی حکومت کی کارکردگی اور ساکھ کا ذریعہ بنتی ہے۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی متعدد' متنوع اور متفرق ضروریات وحاجات کو پورا کرنے کیلئے بتدریج نئے نئے ادارے معرض وجود میں آتے جارہے ہیں' جو ایک ہمہ گیر اور پیچیدہ نظام میں ڈھل چکے ہیں۔ اب چند سیاستدانوں اور ماہروں پر مشتمل عاملہ (Excutive) پورے ملک کے معاملات کو نہیں چلا سکتی۔ اس کیلئے ایک وسیع انتظامی مشینری کو سرگرم عمل رہنا پڑتا ہے' جسے پبلک ایڈمنسٹریشن کہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بیشتر معاملات میں حکومت سے بھی یہ زیادہ طاقتور ہو چکی ہے' بلکہ اصل حکومت ہی یہی بن چکی ہے کیونکہ اس میں ایک مضبوط نظم' درجہ بندی کا سلسلہ' ربط' تسلسل اور استقلال پایا جاتا ہے اور اس سے وابستہ لوگ ذہانت' قابلیت' تکنیکی صلاحیت اور انتظامی تجربے کے اعتبار سے نہایت مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں۔ وہ مسائل کی نوعیت ووسعت' عوام اور سیاستدانوں کی نفسیات اور قوانین وضوابط کی گہرائیوں سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ ان کا باہمی پیشہ ورانہ رابطہ اور تعلق انہیں ایک غالب طبقے کی حیثیت دے دیتا ہے' جس پر کسی بھی سیاسی حکومت کا مکمل کنٹرول ناممکن ہوتا ہے۔ سیاسی حکومتوں کے ارکان اپنی کم علمی' ناتجربہ کاری اور مرعوبیت وکمزوری کی وجہ سے سارا انحصار اسی پر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر حکومتیں بار بار تبدیل ہوتی رہتی ہیں جبکہ پبلک ایڈمنسٹریشن قائم ودائم رہتی ہے۔ اس لئے اس کا پلہ ہمیشہ سب پر بھاری رہتا ہے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ اس عظیم شعبے سے متعلق اسلامی تصورات ونظریات اور نبی ﷺ کے کردار وتعلیمات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ امریکہ اور یورپ کے محققین اور دانشوروں نے ایک صدی قبل سیاسیات سے اسے الگ کرکے نئے شعبۂ علم کے طور پر ترقی دے کر اپنے نظامات اور اداروں کو مضبوط اور مستحکم کرکے بدلتے ہوئے حالات وزمانے کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا ہے۔ جس سے دنیا بھر میں اپنے تہذیبی وثقافتی غلبے کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

جبکہ مسلمان سکالرز اسے ابھی تک سیاسیات ہی سے خلط ملط کئے جارہے ہیں۔ انہوں نے گزشتہ صدی میں لکھی گئی کتابوں میں اس شعبہ علم کو الگ طور پر تحقیق وتوجہ کا اس قدر مستحق نہیں سمجھا جتنا کہ دور جدید میں اس کو اہمیت حاصل ہوگئی ہے' لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دور جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھتے

ہوئے اسلامی تعلیمات روایت اور اصولوں پر نئے سرے سے غور و خوض کریں، سیاسیات اور انتظامیات کو الگ الگ زیر بحث لائیں، حکومت اور نظمیہ عامہ کے فرق کو واضح کریں اور نظمیہ عامہ کے بنیادی فلسفہ، کردار، ضابطہ اخلاق، مزاج و مقاصد، اختیارات و مراعات اور طریق تقرری اور فرائض و احتساب کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں واضح کریں اور اس کی حدود و قیود کا تعین کر کے نظمیہ عامہ کا ایک جدید ترقی یافتہ اسلامی ماڈل پیش کریں۔ عصر حاضر میں عالم اسلام کے المیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم ابھی تک ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ وضع نہیں کر سکے جو موجودہ زمانے میں ہماری حاجات و ضروریات، تہذیب و ثقافت، عقائد و نظریات، اخلاق و اقدار اور مزاج و مقاصد سے ہم آہنگ ہو۔ جس سے ہم عملی رہنمائی حاصل کریں اور اپنے تمام مسائل کو حل کر سکیں۔ اہل مغرب کے سیکولر تصورات پر مبنی ماڈلز ہمارے لئے غیر مانوس اور اجنبی ہیں۔ ہماری روایات اور نفسیات سے متصادم ہیں۔ ان کی ہو بہو نقالی ہمارے مسائل کو حل کرنے کے بجائے، انہیں گھمبیر بنا رہی ہے۔ ہمارے اجتماعی نظام اور ادارے تباہ ہو رہے ہیں کیونکہ ہماری سوچ اور عمل میں تضاد و تصادم ہمیں مسلسل انتشار و افتراق کے گڑھوں میں دھکیل رہا ہے۔ پھر اہل مغرب نے اپنے نوآبادیاتی عہد میں مغلوب اسلامی ممالک کیلئے جو انتظامی ڈھانچہ متعارف کرایا وہ ان کے اپنے مفادات اور ضرورتوں کے مطابق تھا۔ وہ بیوروکریسی کے مکمل اجارہ داری، رعب و دبدبہ، خوف و ہراس، حاکم و محکوم کے نمایاں فرق، حقوق و مراتب کی تفریق اور گہری طبقاتی عداوت اور لڑاؤ اور حکومت کرو، خون نچوڑو اور ضمیر میں خلش نہ پیدا ہونے دو، بیرونی آقاؤں کی خدمت و چاکری کرو اور اپنے عوام پر ڈنڈے برساؤ، سچائی اور انصاف کے بجائے دھونس اور دھاندلی کی بنیادوں پر استوار تھا۔ وہ اپنے مقاصد و مدارج میں ان کے اپنے ممالک میں چلنے والے ڈھانچوں سے مختلف اور برعکس تھا۔

ہماری بدنصیبی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اکثر مسلم ممالک آزادیاں حاصل کرنے کے بعد بھی اسی فرسودہ ڈھانچے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ نہ تو انہوں نے سیاسی آزادی کے بعد کے تقاضوں اور بدلے ہوئے حالات کی ضرورتوں کی بنا پر اس میں کوئی جوہری تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے اور نہ ہی ان تحقیقات و تجربات سے استفادہ کر سکے ہیں، جو خود اہل مغرب نے پبلک ایڈمنسٹریشن کے شعبوں میں کئے ہیں۔ ہم موجودہ فکری و تہذیبی غلامی اور عملی و انتظامی مشکلات کے چنگل سے اس وقت تک نجات حاصل نہیں کر سکتے، جب تک پبلک ایڈمنسٹریشن کے ناقص و غلامانہ نظام سے چھٹکارا حاصل نہیں کر لیتے۔ جدید مسلم سکالروں اور اسلامی تحریکوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ، اسلامی تشخص کے احیاء اور مختلف علوم کی اسلامائزیشن، مختلف اداروں اور شعبوں کی اسلامی بنیادوں پر استواری، ملکی سطحوں پر نفاذ اسلام کیلئے جو گرانقدر علمی و عملی کوششیں کر رہے ہیں، علم انتظامیات کو اسلامی نظریہ حیات کے سانچوں میں ڈھالنے کو خصوصی اہمیت دیں اور نظمیہ عامہ کا ایک مقبول ماڈل دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی گرانقدر خدمات کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے، جنہوں نے ایک ہزار سال تک نہایت کامیابی سے دنیا کے نہایت اہم اور وسیع حصے کے انتظامات کو نہایت تدبر اور کامیابی سے چلایا۔ اس موضوع پر الگ کام کرنے کی ضرورت ہے اور اب تک کئے گئے کام کو جدید اصطلاحات و تصورات اور زاویہ نگاہ سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ نظمیہ عامہ کے شعبے سے متعلق لوگ اس کو آسانی سے سمجھ سکیں اور سے بطور مضمون پڑھنے اور پڑھانے والے افراد اسلامی ماڈل کی نوعیت و افادیت سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

خاص اسلامی اساس پر اس علم کے فروغ اور نظمہ عامہ کے تمام پہلوؤں کو اسلامی سانچوں میں ڈھالنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت کو چراغ راہ بنائیں۔ آپ نے پبلک ایڈمنسٹریشن کا جو فلسفہ دیا، جو حکمت عملی اپنائی اور جو تنظیمی اصول وضع فرمائے، ان میں صحابہ کرامؓ کی مشاورت اور تائید شامل تھی۔ وہ صحیح معنوں میں اسلام کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ کتاب و سنت کے بعد اسلامی قانون کا مآخذ اجماع صحابہؓ ہی ہے۔ دور جدید میں ایک نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں اسلامی مفکروں کو کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کو جاننے اور عملی مسائل کو حل کرنے کیلئے اس کے ماتحت عمل کا علم حاصل کرنے کی کثر سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے اندر طلب بڑھی ہے۔ اہل مغرب میں سے بھی پبلک ایڈمنسٹریشن کے شعبے میں کئی مفکرین اسلامی تجربات سے استفادہ کرنے کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں۔ مثلاً Jeffrey اسلام

کے مثبت مطالعے پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے اس بارے میں ہمارے تجزیے کی بنیادیں ہمیشہ غلط رہی ہیں۔ اس کے بقول "ہمیں دیکھنا چاہئے تھا کہ یہ اپنے معاشروں میں کیسے کام کرتا ہے؟ ہمیں فیصلہ اس بنیاد پر کرنا چاہئے کہ یہ لوگوں کی مخصوص ضروریات کو ان کے مخصوص ماحول میں کس طرح سرانجام دیتا ہے کیونکہ اسلام کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ یہ عملی مذہب ہے اور زندگی کے عملی راستے کی تعلیم دیتا ہے[۱]۔"

○ نظمیہ عامہ (Public Administration) کے جدید تصورات:

ا۔ پبلک ایڈمنسٹریشن ...... معنی و مفہوم:

پبلک ایڈمنسٹریشن دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ پہلا پبلک اور دوسرا ایڈمنسٹریشن۔ عام مفہوم میں لفظ (Public) عموماً عوام یا عوام سے متعلق کسی چیز یا معاملے کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً عام لوگوں کے زیر استعمال معروف جگہ کو (Public Place) کہا جاتا ہے۔ کسی معاملے میں عوام کی رائے کو (Public Opinion) کہتے ہیں، لیکن اصطلاحی اور مخصوص معانی کے اعتبار سے اس سے مراد ایسی چیز یا سہولت ہے، جو حکومت کی طرف سے عوام کو فراہم کی جاتی ہے۔ مثلاً جو پالیسیاں حکومت عوام کیلئے بناتی ہے انہیں (Public Policies) کہا جاتا ہے جو ادارے اس غرض کیلئے قائم کیے جاتے ہیں، وہ ادارات عامہ (Public Institution) کہلاتے ہیں۔ جو خدمات افرادی قوت اور سرکاری ملازمین کے ذریعے سے سرانجام دی جاتی ہیں، ان کا نام خدمات عامہ (Public Services) ایسی تنظیم جو حکومت کی طرف سے پانی، بجلی، گیس جیسی استعمال کی ضروری اشیاء فراہم کرتی ہے، اسے (Public Utility) کا نام دیا جاتا ہے اور بنیادی سہولیات کے ایسے سارے پروگرام کو جس کے انتظامات و مالی اخراجات گورنمنٹ برداشت کرتی ہے، مثلاً سڑکیں، عمارات، ہسپتال، سکولز وغیرہ (Public works programme) کہلاتے ہیں۔ اس کے بالمقابل لفظ نجی یا (Private) استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد ایسی چیز، معاملہ، تنظیم یا سرگرمی جس کے مالک و ذمہ دار عوام خود ہوتے ہیں۔ مثلاً معیشت و صنعت کا وہ حصہ جو ریاست کی طرف سے کنٹرول کیا جاتا ہے اسے (Public Sector) اور جو نجی یا غیر سرکاری طور پر چلایا جاتا ہے اسے (Private Sector) کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لفظ پبلک میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کی وہ ساری سرگرمیاں شامل ہیں جو وہ انتظامی آلات کے ذریعے سرانجام دیتی ہے[۲]۔

دوسرا لفظ (Administration) ہے۔ فعل "To Administer" لاطینی لفظ (Ad اور Ministr) سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مدد پہنچانا، خدمت کرنا، انتظام کرنا[۳]۔ لغوی اعتبار سے ایڈمنسٹریشن کی نجی یا سرکاری تنظیم و ادارے کے انتظام کو چلانے، اسے کنٹرول کرنے اور اس کے تمام معاملات کی نگرانی اور دیکھ بھال کو کہتے ہیں۔ عوامی یا کاروباری، امور کو چلانے والا شخص (Administrater) کہلاتا ہے اور ہر ایسا عہدہ یا مسئلہ یا عملی Administrative ہوتی ہے جس کی نوعیت انتظامی ہو[۴]۔ ایڈمنسٹریٹر وہ ہوتا ہے جو دوسروں کی سرگرمیوں کی رہنمائی کرتا ہے اور انہیں مربوط اور کنٹرول کرتا ہے[۵]۔

۲۔ ایڈمنسٹریشن کی تعریفیں:

ایڈمنسٹریشن کے اصطلاحی معنی کے تعین کیلئے مختلف مفکرین و ماہرین نے اپنے اپنے انداز میں تعریفیں کی ہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

---

white 2 (۵) Crowther 15-16 (۴) Tyagi 3 (۳) Crowther:936-7 (۲) Buraey 91 (۱)

۱۔ یہ بنی نوع انسان کی اجتماعی سرگرمیوں کی تنظیم اور صحیح ترتیب کا نام ہے[۱]۔

۲۔ ایڈمنسٹریشن ایک طریق کار کا نام ہے جو تمام اجتماعی کاوشوں میں مشترک ہے خواہ وہ پبلک ہوں یا پرائیویٹ خواہ سول ہوں یا ملٹری بڑے پیمانے پر ہوں یا چھوٹے[۲]۔

۳۔ Brooks Adams کے بقول "ایڈمنسٹریشن بہت سے اور اکثر اوقات متضاد سماجی توانائیوں کو نہایت ہوشیاری سے ایک نظم میں کچھ اس طرح پرونے کی صلاحیت کا نام ہے کہ وہ متحد طور پر کام کر سکیں[۳]۔"

۴۔ Gladden کے نزدیک لوگوں کیلئے فکرمند ہونے ان کی دیکھ بھال کرنے اور معاملات چلانے کا نام ہے[۴]۔

۵۔ FM. Marx کا کہنا ہے کہ ایڈمنسٹریشن شعوری مقاصد کے حصول کی تگ و دو میں پر عزم اقدام کا نام ہے۔ یہ معاملات کی منظم ترتیب اور وسائل کے تخمینہ شدہ استعمال کا نام ہے' جس کا مقصد چیزوں کو اسی طرح وقوع پذیر کرنا ہے جیسا کوئی چاہتا ہے اور خواہشات کے برعکس نتائج پیدا ہونے سے پہلے ہی ہر چیز کی پیش بندی کر لینے کا نام ہے[۵]۔

ان تعریفوں میں پرائیویٹ اور پبلک ایڈمنسٹریشن کی تخصیص کے بغیر اس کے بنیادی خدوخال اور عمومی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے' لیکن بہی نوعیت حدود کار اور قوانین و ضوابط کے اعتبار سے دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ اس لئے پبلک ایڈمنسٹریشن کو الگ طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اگرچہ فاروق اعظم کے نظریہ و عمل سے ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کے ایسے جامع اصول ہمارے سامنے آتے ہیں' جو دونوں سطحوں پر رہنمائی کرتے ہیں' لیکن ہمارا اصل ہدف گورنمنٹ کے حصے کے طور پر اس کے فلسفہ' مقاصد اور طریق کار کا جائزہ لینا ہے۔ اس لئے پبلک ایڈمنسٹریشن کو الگ طور پر زیر بحث لایا جاتا ہے۔

۳۔ پبلک ایڈمنسٹریشن کی تعریفیں:

پبلک ایڈمنسٹریشن کی مختلف مفکرین نے جو تعریفیں کی ہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں

۱۔ "یہ ایک وسیع انسانی سرگرمی ہے' جو اجتماعی سماجی مقاصد کے حصول کیلئے مطلوبہ انسانی اور مادی وسائل کو منظم کرنے سے متعلق ہے[۶]۔"

۲۔ پبلک ایڈمنسٹریشن حکومت کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا نام ہے۔ اس میں لوگوں کی کاوشوں کو اس طرح مربوط کیا جاتا ہے کہ وہ مفوضہ کاموں کو سرانجام دینے کیلئے مل جل کر کام کر سکیں۔ جبکہ آرگنائزیشن سے مراد قوانین اور تعلقات کار کا ایسا ڈھانچہ ہے' جو ان پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کیلئے وضع کیا جاتا ہے[۷]۔"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ ایڈمنسٹریشن اور آرگنائزیشن دونوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ انسانی وسائل کو کنٹرول کریں۔ انتظامی سرگرمیاں خالص فنی اور مخصوص نوعیت کی بھی ہو سکتی ہیں' جو ایڈمنسٹریشن کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثلاً صحت عامہ یا بہت بڑی عمارات اور پلوں کی تعمیر جس میں سینکڑوں اور بسا اوقات لاکھوں لوگوں کی سرگرمیوں کی تنظیم' رہنمائی اور نگرانی کچھ اس انداز میں کی جاتی ہے کہ اس کے نتیجے میں نظم و ضبط اور مستعدی سامنے آتی ہے[۸]۔

۳۔ اس سے مراد حکومتوں کا وہ مرکزی آلہ ہے' جو عمومی سماجی مسائل حل کرنے کے کام آتا ہے[۹]۔

۴۔ پبلک ایڈمنسٹریشن ان تمام عملی اقدامات (Operations) پر مشتمل ہے' جو اپنے مقاصد کی تکمیل یا پبلک پالیسی کو نافذ کرنے کیلئے کئے جاتے ہیں[۱۰]۔

White:1 (۱۰) Nigro.3 (۹) Ibid:7(۸) Pfiffner 7(۷) R. Presthus.7 (۶) Ibid:4 (۵) Goel: 3 (۴) Ibid:2 (۳) White: 1 (۲) Tyagi 3 (۱)

۵۔Nigro کے مطابق اس کی تعریف کو متعین کرنے کیلئے حسب ذیل امور کو سامنے رکھا جائے۔

ا۔ پبلک سیٹنگ میں معاون گروہی کوششیں۔

۲۔ یہ انتظامی' قانونی یا عدالتی تمام برانچوں اور ان کے مابین باہمی تعلقات پر محیط ہے۔

۳۔ پبلک پالیسی کو وضع کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے اس طرح یہ سیاسی طریق کار کا حصہ ہے۔

۴۔ یہ نمایاں طور پر پرائیویٹ ایڈمنسٹریشن سے مختلف ہے۔

۵۔ افراد اور پرائیویٹ گروپوں کے ساتھ اس اعتبار سے منسلک ہے کہ پورے معاشرے کو خدمات فراہم کرتی ہے[۱]۔

۶۔W. wilson کا کہنا ہے کہ "پبلک ایڈمنسٹریشن" قانون کے تفصیلی اور منظم اطلاق کا نام ہے' قانون کا ہر اطلاق' ایڈمنسٹریشن کا عمل ہے[۲]۔

۷۔Goel نے مختلف تعریفوں کی خوبیوں کو خوبصورت انداز میں اپنی جامع تعریف میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مطابق "پبلک ایڈمنسٹریشن قوم اور عوام کے مفاد کیلئے کفایت و مستعدی کے ساتھ اس عوامی پالیسی کے نفاذ سے تعلق رکھتی ہے' جو مجاز اتھارٹی کی طرف سے طے کی گئی ہو[۳]۔

۸۔ مسلم مفکر M.Al. Buraey کا کہنا ہے کہ حال ہی میں امریکہ میں نئی پبلک ایڈمنسٹریشن کے وکیلوں نے اس اصطلاح کے ساتھ اہم مقاصد کو منسلک کر دیا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اچھی مینجمنٹ' سماجی انصاف بطور قدر کے موروثی طور پر اس کی تعریف میں شامل ہیں چنانچہ H.G. Frederickson سیدھے سادے طریقے پر کہتا ہے۔ "نئی پبلک ایڈمنسٹریشن ایسی پالیسیوں اور ڈھانچوں کو تبدیل کر دینے کی راہیں تلاش کر رہی ہے' جو منظم انداز میں سماجی انصاف کی راہ میں رکاوٹ ہیں[۴]۔"

مذکورہ تعریفوں میں فیصلہ سازی' سٹرکچر' منتظمین کا رویہ شامل نہیں ہے اس لئے مذکورہ مصنف کے نزدیک "پبلک ایڈمنسٹریشن عوام کے منظم گروہوں کی ان سرگرمیوں کو کہتے ہیں' جو وہ حکومت یا اس کے کسی شعبے کے مفوضہ کام کو تعاون' ہم آہنگی اور نہایت معقول فیصلوں کے ذریعے اتنا موثر انداز میں پورا کرتی ہیں' جتنا ممکن ہو۔ یہ ایک ایسا طریق کار ہے جس کے ذریعے مقاصد متعین اور حاصل کئے جاتے ہیں اور صورتحال تبدیل کی جاتی ہے[۵]۔"

۴۔ نمایاں پہلو:

مذکورہ تعریفوں کو سامنے رکھیں تو ایڈمنسٹریشن کے حسب ذیل پہلو سامنے آتے ہیں۔

ا۔ یہ انسانوں کی ایک تنظیم کا نام ہے جو ان کی مشترک اور اجتماعی سرگرمیوں کو منظم و مربوط کرتی ہے۔ اس کا اصل مالک فرادی قوت ہے' جس سے استفادہ کرنا' اس کو مخصوص سمت میں چلانا اس کی رہنمائی کرنا اور اسے کنٹرول کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ یہ ایک بامقصد عمل ہے۔ یہی اس کی وجہ جواز اور بنیاد ہے۔ اس کے تمام مقاصد متعینہ اور شعوری ہوتے ہیں۔ اس کے اہداف واضح اور نصب العین طے شدہ ہوتا ہے۔ اس کی کامیابی کا معیار و پیمانہ یہ ہے کہ کہاں تک انہیں حاصل کر سکی ہے؟ معاملات کو کس حد تک اپنی منشا کے مطابق ڈھال ہے اور فضا کو ان کے حصول کیلئے سازگار بنایا ہے اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج اس کے مقاصد سے کتنے ہم آہنگ ہو رہے ہیں۔

۳۔ اس کا ایک اہم پہلو مادی وسائل ہیں۔ ان کی فراہمی' ان کا تحفظ شدہ استعمال' ان میں کفایت و بچت' کم سے کم وسائل کو صرف کر کے زیادہ سے زیادہ پیش

---

(۱) Nigro 11 (۲) Goel.4 (۳) Ibid.4 (۴) Buraey 227 (۵) Ibid 228

رفت کرنا اسراف وضیاع سے بچنا ان کی تخصیص و تعین بھی اس کا اہم کام ہے۔

۴۔ ایڈمنسٹریشن حالات وقت اور معاملات و مسائل کا صحیح تجزیہ کرنے کا کام ہے۔ اس میں گہرے سوچ بچار اور تجربات و اندازوں کے ذریعے آئندہ پیش آنے والے امور کو بھانپنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے منفی و مثبت اثرات کو قبل از وقت محسوس و معلوم کرنے کے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

۵۔ ایڈمنسٹریشن بطور علم یک سماجی علم ہے کیونکہ اس کا تعلق انسانوں سے ہے' جو فکر و سوچ' جذبات و احساسات' تصورات و نظریات اور ذہنی و نفسیاتی پس منظر رکھنے والی مخلوق ہے۔ اس میں تنظیم کے چلانے والوں اور ان سے متاثر ہونے والوں کے مزاج' مقاصد' دلچسپیاں' تعصبات' رجحانات' محبتوں اور خواہشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے رد عمل میں بے شمار اندرونی و بیرونی عوامل شامل ہوتے ہیں۔ وہ حالات سے متاثر ہوتے ہیں اور انہیں متاثر کرتے ہیں' اس لئے ان پر طبعی سائنس کے اصول و ضوابط لاگو نہیں ہوتے۔

۶۔ ایڈمنسٹریشن کیلئے منصوبہ بندی لازمی ہے' تمام پالیسیاں اور فیصلے اسی کا حصہ ہوتے ہیں۔ دستیاب معلومات کی روشنی میں مادی و انسانی وسائل کا بھرپور استعمال' متبادل راہوں کا خاکہ اور ان کی طرف عملی اقدامات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ مضر امور کو روکنا اور مفید سے بھرپور فائدہ اٹھانا اس کا خاصہ ہے۔

۷۔ ایڈمنسٹریشن کو بطریق احسن چلانے کیلئے ایک سسٹم وضع کرنا اور انتظامی ڈھانچہ تعمیر کرنا ضروری ہے' جس میں اختیارات و ذمہ داریوں کا تعین فیصلہ سازی کے مراکز سے لے کر نفاذ تک کے مراحل۔ مختلف شعبوں کا قیام اور ان کا باہمی ربط وغیرہ سب شامل ہیں۔

۸۔ ایڈمنسٹریشن پر عزم اقدامات کا نام ہے' جو مناسب اور بروقت ہوں اور حوصلے اور دانشمندی سے کیے گئے ہوں۔ لاپرواہی' سستی' کم ہمتی اور گومگو کی کیفیت شدید بحرانوں کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ منتظمین کیلئے ایک آزمائش بھی ہے اور صلاحیتوں کے نکھارنے کا ذریعہ بھی۔ تنظیم کی ناکامی حقیقت میں ناظم کی ناکامی ہے۔

۵۔ ضرورت و اہمیت:

یہ آٹھوں خصوصیات ہر اچھی ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ میں بیک وقت پایا جانا ضروری ہیں۔ اس کی کارکردگی اور مقاصد کے حصول میں کامیابی انہی خصوصیات کے معیاری تناسب سے وابستہ ہوتی ہے' خواہ ایڈمنسٹریشن پرائیویٹ ہو یا پبلک لیکن پبلک ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داری اور کردار بہت وسیع ہوتا ہے۔ وہ ایک قصبے سے لے کر بین الاقوامی سطح کے معاملات کو سرانجام دیتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے' حکومت کے ہر معاملے اور ریاست کے ہر ادارے کو ڈیل کرتی ہے۔ ملک کا ہر سیاسی' سماجی' معاشی' ثقافتی' تعلیمی اور رفاہی ڈھانچہ اس کی سوچ اور عمل پر استوار ہوتا ہے۔ اس کے رویے اور فیصلے تمام پرائیویٹ تنظیموں کو براہ راست متاثر کرتے ہیں۔ اس لئے اسے آئین' قانون' اصول و ضوابط کے اندر رہ کر کام کرنا ہوتا ہے۔ اسے قانون سازاداروں' عوامی نمائندوں اور حکومتی عزائم و ارادوں اور پالیسیوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے منصوبہ کار پیش کرنا ہوتا ہے اور تمام فیصلوں کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے دور جدید میں اس کیلئے حالصتاً پیشہ ورانہ اور غیر سیاسی ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے فرائض' نظام کار' تنظیمی ڈھانچہ' ضابطہ اخلاق' مزاج و مقاصد' پرائیویٹ ایڈمنسٹریشن سے بہت حد تک مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے عملے کی تقرری کے ضوابط' ملازمت کی شرائط اور اختیارات و احتساب کیلئے ملکی آئینوں میں اس سلسلے میں اصول و ضوابط اور وضاحتیں درج ہوتی ہیں۔

دور جدید میں پبلک ایڈمنسٹریشن کی ضرورت و اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ تہذیبی و تمدنی ترقی اور عوامی مسائل میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے کردار' سائز اور ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جیسا کہ مختلف تعریفوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس سے مراد حکومت کا وسیع ہوا راتی مسند' نظام اور ڈھانچہ ہے جو اس کے تمام معاملات کو چلانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اخلاقی' قانونی اور اصولی طور پر اس کا سیاست سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے' لیکن حکومت سے گہرا تعلق ہوتا ہے' جو اگرچہ سیاسی ہوتی ہے۔ اسے سیاسی اداروں کے ماتحت ہو کر کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک وسیع مشینری کی ہوتی ہے' جو

حکومت ہی کے کنٹرول میں ہوتی ہے اور اسی کے نمائندے کی حیثیت سے، اسی کے طے شدہ مقاصد و ہدایات کے مطابق معاملات کو کنٹرول اور منظم کرتی ہے۔ ریاست کے نظم و نسق کا تعلق عوام کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے تمام تقاضے وزیر اعظم اور چند وزراء پر مشتمل عاملہ (Executive) سرانجام نہیں دے سکتی۔ یہی مشینری سارے انتظامی امور سرانجام دیتی ہے۔

دور جدید میں ریاست کا مکمل انتظامی ڈھانچہ عاملہ (Public administration) (Executive) جسے ہم سہولت کیلئے نظامیہ کہہ سکتے ہیں پر مشتمل ہوتا ہے۔ داخلی نظم و نسق کو عملی طور پر سرانجام دینے کی ذمہ داری نظمیہ عامہ کے سپرد ہوتی ہے۔ اس کے دو اہم حصے ہوتے ہیں، ایک دفتری امور کو سرانجام دینے والا شعبہ جسے بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یہ عاملہ کے دفتری نظام (Secretariate) کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ حکومت کا ریکارڈ اور حافظہ ہوتا ہے۔ دوسرا اہم شعبہ خدمات عامہ (Civil Services) یہ عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں، عوام کے عملی مسائل کے حل، امن و امان کے قیام اور اس طرح کے بے شمار مالی و انتظامی امور کو سرانجام دیتا ہے، اس سے وابستہ اہلکاروں کو سول سرونٹس کہا جاتا ہے۔ جمہوری نظام میں عاملہ (Executive) سیاستدانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں وزیر اعظم پارلیمانی طرز حکومت میں اور صدر، صدارتی طرز حکومت میں اپنی کابینہ کے ساتھ شامل ہوتا ہے، وہی اس کا سربراہ ہوتا ہے۔ اس عاملہ کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ تمام اہم امور کے بارے میں بنیادی پالیسیاں وضع کرے۔ اسے برسر اقتدار پارٹی کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی طرف سے پارلیمینٹ میں قانون سازی کیلئے تجاویز پیش کرتی ہے۔ اس کا دوسرا کام بطور انتظامی باڈی کے یہ ہوتا ہے کہ وہ پاس ہونے والے قوانین پر عمل درآمد کرائے اور سرکاری ملازمین کی وسیع مشینری کی نگرانی کرے، جو انتظامی امور کو مستعدی سے سرانجام دینے کیلئے ضروری ہے۔ یہاں اسے مربوط کرنے اور کنٹرول کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کا تیسرا کام یہ ہے کہ وہ امور انتظامی کے ذمہ دار کی حیثیت سے عوام الناس کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھے[1]۔

مذکورہ تینوں کاموں کو سرانجام دینے کیلئے بالواسطہ یا بلاواسطہ پبلک ایڈمنسٹریشن ہی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جہاں تک پہلے کام کا تعلق ہے یعنی پالیسی سازی، تو اس بارے میں اگرچہ دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک کے مطابق یہ صرف اور صرف سیاستدانوں کا کام ہے۔ دوسرا یہ کہ سیاست اور ایڈمنسٹریشن دونوں لازم و ملزوم ہیں، ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں[2]۔ یہی رائے زیادہ صائب ہے اور عملی طور پر ہر شعبے اور ہر سطح پر اس کی کارفرمائی ہے کیونکہ صحیح پالیسی کیلئے صحیح معلومات، تجزیاتی رپورٹس، تکنیکی مشورے اور گہرے سوچ بچار پر مبنی جن تجاویز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ صرف ماہر و تجربہ کار سرکاری ملازمین ہی فراہم کر سکتے ہیں۔ اسی طرح قوانین کے نفاذ کا اہم مرحلہ بھی پبلک ایڈمنسٹریشن کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جس پالیسی کی اہمیت، جواز اور روح و مقاصد کے بارے میں وہ یکسو نہیں ہوں گے یا اس کے تعین میں ان کا مشورہ شامل نہیں ہوگا، اس کے بارے میں وہ کبھی بھی قابل عمل منصوبہ بندی نہیں کریں گے اور نہ ہی اس کے پیچھے وہ جذبہ کارفرما ہوگا، جو اسے بھرپور انداز میں چلانے اور نتیجہ خیز بنانے کیلئے ناگزیر ہوتا ہے اور اس بات کا بھی امکان ہوتا ہے کہ وہ مختلف توجیہات، ضابطوں کے جال اور عدم توجہی کے گرداب میں پھنس کر رہ جائے۔

جہاں تک عوام الناس کے ساتھ مسلسل اور وسیع رابطے کا تعلق ہے، وہ دور جدید کے پیچیدہ، الجھے ہوئے اور متنوع و متفرق مسائل و معاملات کے پس منظر میں محدود تعداد پر مبنی عاملہ (Executive) کیلئے ممکن ہی نہیں۔ نہ تو وہ کروڑوں انسانوں کے انفرادی مسائل کو سننے کیلئے وقت نکال سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو حل کرنے کی کوئی آسان سی صورت ورنہ ہی وہ براہ راست ایسے احکامات جاری کر سکتے ہیں، جو ان کے مقام و مرتبے، دائرہ کار اور اختیارات سے مناسبت رکھتے ہوں۔

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو Laski.356.87 (۲) Goel 132

علاوہ ازیں گراں باتوں میں الجھ جائیں گے تو اپنا اصل کام چھوڑ بیٹھیں گے اور حکومت کی مجموعی کارکردگی صفر ہو جائے گی۔ اس لئے عملی حقیقت یہی ہے کہ عوام اور سیاستدان دونوں مسائل کے حل کیلئے پبلک ایڈمنسٹریشن کے محتاج ہیں اور حکومت و عوام کے درمیان موثر اور نتیجہ خیز رابطے کا یہی واحد ذریعہ ہے۔ دور جدید میں بیوروکریسی نے اپنا روپ تبدیل کر لیا ہے۔ عوام کی خدمت کرنے کے بجائے ان کے حاکم گورنر اور منتظم بن چکے ہیں۔ وہ عوام کے خدا بن بیٹھے ہیں اور خوف و ہراس کے ذریعے ان سے اطاعت کے طالب ہوتے ہیں[1]۔

اس صورتحال کی وجہ سے بیوروکریسی اور سیاستدانوں میں ایک گرم و سرد کشمکش بھی پائی جاتی ہے۔ سیاستدانوں کیلئے اسے مکمل طور پر تابع فرمان بنانا ناممکن ہے۔ ان سے صرف ہم آہنگی پیدا کر کے ہی وہ حکومت کر سکتے ہیں۔ آئینی اور قانونی طور پر بااختیار ہونے کے باوجود عملی طور پر بیوروکریسی کی طاقت کے آگے بے بس ہوتے ہیں کیونکہ وہ زیادہ مضبوط اور مربوط ہوتی ہے اور انہیں ناکام و بدنام کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کے عزائم و ارادوں کو آگے رکاوٹ ڈالنے اور انکے فیصلوں اور پالیسیوں کے نفاذ میں روڑے اٹکانے کیلئے ایسے تکنیکی اور فنی طریقے اختیار کر سکتی ہے، جن پر کوئی گرفت ہی نہ کی جا سکے۔ ترقی پذیر ممالک میں سیاسی اداروں کے مستحکم نہ ہونے کی وجہ سے اسے غلبہ حاصل ہے۔ بعض مفکران کی اس بے پناہ طاقت و اہمیت کے پیش نظر یہ خیال رکھتے ہیں کہ مفاد عامہ کا حقیقی تحفظ سیاستدانوں کے بجائے اسی کی منصبی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ Harish Khare اپنے مقالے "Role of bureaucracy; soft state soft administration." میں یہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ وہ سیاسی قیادت کی ناکامی کی صورت میں اپنے آپ کو ملک کی ترقی کیلئے اپنی توانائیاں صرف کرے۔ اس کے بقول "بیوروکریسی کو عوام کے بہترین مفادات کو یقینی بنانے کیلئے بالآخر خود اپنی آئینی ذمہ داری کو پورا کرنے پر غور و خوض کرنا چاہئے جو تنگ نظر اور غیر ذمہ دار سیاسی طبقے کے ہاتھ میں گروی ہیں"[2]۔ پبلک ایڈمنسٹریشن سے وابستہ اہل کار یہی سمجھتے ہیں کہ حقیقی حکمرانی کا حق انہیں حاصل ہے۔ ملک کے اندرونی اور خارجہ تعلقات کے سارے امور کے بارے میں پالیسیاں وضع کرنا انہیں کی ذمہ داری ہے، اس لئے حکومتوں کی تبدیلیوں کے باوجود ان پالیسیوں میں کوئی جوہری فرق رونما نہیں ہوتا۔ پاکستان کا معاملہ اس سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔ یہاں سیاسی جماعتوں اور مخصوص سیاستدانوں کو اقتدار میں لانے اور انہیں ہٹانے کا فیصلہ سول بیوروکریسی اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کرتی ہے۔ حکومت، سیاست اور جمہوریت کو جتنا چاہتے ہیں کنٹرول کرتے ہیں۔ جتنا چاہتے ہیں آزادی دیتے ہیں، خود سیاسی نظام، نظریہ، تصورات اور ڈھانچہ بھی اسٹیبلشمنٹ وضع کرتی ہے۔ اپنے مجموعی خاکے میں جو رنگ بھرنا چاہتے ہیں اور جس طرح کے مہرے لگانا چاہتے ہیں لگاتے ہیں۔ یہاں سیاسی، قانونی اور انتظامی طاقت ایک طبقے کے ہاتھ میں مرتکز ہو چکی ہے۔ پاکستان کا پورا آئین اسلامی ہونے کے باوجود اس کے دفاع کا حلف اٹھانے والے اس کی بنیاد پر فیصلے کرنے والے اور اسے نافذ کرنے والے اداروں پر حاوی طبقہ اسلامی ذہن نہیں رکھتا۔ اس لئے پورے ملک اور معاشرے میں ہمیں اسلام کا کہیں نفاذ و چلن دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے میری نظر میں اسلامائزیشن کیلئے سیاسی نظام و نظریہ سے زیادہ انتظامی نظریہ و نظام کو اسلامی سانچوں میں ڈھالنے کی ضرورت ہے، ورنہ ہمارے نظریہ و عمل اور آئین و حالات میں ہمیشہ تضاد رہے گا۔

۶۔ اصول و طریق کار

پبلک ایڈمنسٹریشن کو اپنے پیشہ ورانہ فرائض کو سرانجام دینے کیلئے حسب ذیل اصول اور طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے علم انتظامیات (Administrative Science) میں ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے اور سول سرونٹس کو پیشے اور دوران ملازمت عملی طور پر ورکشاپس میں ٹریننگ اکیڈمیز اور

(۱) Buraey:253 (۲) Goel:5.

سیمینارز کے ذریعے خصوصی تربیت دی جاتی ہے' تاکہ اپنی کارکردگی کو معیاری سے معیاری بنا سکیں۔ مختلف ماہرین اپنے اپنے انداز میں ان میں کمی بیشی کرتے ہیں' بحیثیت مجموعی حسب ذیل ہیں۔ پالیسی سازی' انفرادی و اجتماعی فیصلہ سازی' منصوبہ بندی' قیادت سازی' نگرانی' کنٹرول' مربوطی و رابطہ کاری' اطلاعات' تفویض اختیارات' اختیارات کا استعمال' نظام مراتب' تنظیم کی تعمیر' محکمے کی ترقی' امن و امان کا قیام' عدل و انصاف' نظم و ضبط کا فروغ' علاقائیت اور فرقہ واریت کا خاتمہ' جمہوری اقدار کا احیاء' قومی یکجہتی میں اضافہ' آئین کے مقاصد کا حصول' تنظیم کو بطور ادارہ متحرک کرنا وغیرہ شامل ہیں[۱]۔

بعض مفکرین پبلک ایڈمنسٹریشن کے اصولوں کو ایک لفظ POSDCORB میں جمع سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ انتظامی مستعدی کیلئے یہ انتہائی ضروری ہیں اور یہ تقریباً تمام تنظیموں میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہیں۔

P سے مراد "Planning" یعنی چیزوں کا خاکہ بنانا' ضرورت کا جائزہ لینا اور ایسا طریق کار متعین کرنا جو عوامی پالیسی کے مقاصد کے حصول کیلئے مددگار ہو۔

O سے مراد "Organisation" باقاعدہ ایک انفراسٹرکچر اور ڈھانچہ تیار کرنا' جس کے ذریعے کام کرتا ہے۔ اتھارٹی کا تعین کرنا' تقسیم کار' امور کی ترتیب' وضاحت اور ان میں باہمی مربوطی پیدا کرنا تاکہ طے شدہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔

S سے مراد "Staffing" اس کے تحت عملے کا تقرر' ان کی تربیت اور کام کرنے کیلئے سازگار ماحول پیدا کرنا شامل ہے۔

D سے مراد "Directing" فیصلہ سازی کے مستقل کام کی انجام دہی۔ انہیں عام یا مخصوص ترتیب اور شعبہ جات کے سراپا میں ڈھالنا اور انہیں ضروری رہنمائی فراہم کرنا۔

C سے مراد "Co-ordinating" ایڈمنسٹریشن کے مختلف پہلوؤں کو باہم مربوط و منسلک کرنے کیلئے تمام ضروری فرائض سرانجام دینا۔

R سے مراد "Reporting" انتظامیہ کے تمام ذمہ داروں کو اس بات سے باخبر رکھنا کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں ایسی ایجنسی کا قیام شامل ہے' جس میں ریکارڈز' ریسرچ اور تفتیش کے ذریعے تمام رفقائے کار باخبر رہیں۔

B سے مراد "Budgeting" اس میں مالیاتی منصوبہ بندی' اکاؤنٹنگ اور اس پر کنٹرول شامل ہے[۲]۔

جدید ماہرین انتظامیات پبلک ایڈمنسٹریشن کے کردار کو نئے علاقائی' ملکی اور عالمی مسائل کی وجہ سے ترقی دیتے جا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر نیا مسئلہ اپنے حل کیلئے جس طرح کے اقدامات کا متقاضی ہوتا ہے' وہ صرف اور صرف پبلک ایڈمنسٹریشن ہی کے ذریعے سے نبھائے جا سکتے ہیں۔ اس لئے اس کی ذمہ داریاں اضافہ پذیر رہی ہیں اور ہمیشہ اضافہ پذیر رہیں گی۔ مسلم مفکر محمد المبیورے کے مطابق "پبلک ایڈمنسٹریشن کے حسب ذیل کام جدید دور میں اس کی اہمیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تعلیمی نظام کو ترقی دینا' ملکی ہمسائیگی کے معاملات کی تجدید' پانی اور ہوائی آلودگی کا خاتمہ' کثیر القومی اور بین الاقوامی اداروں کے عفریت کو چلانا' نئی اور ترقی پذیر ریاستوں میں معاشی اور سماجی اداروں کو پروان چڑھانا' یہاں تک کہ نئی قوم کا احیاء بھی اس میں شامل ہے[۳]۔

اسی طرح ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کے جذبے اور اصولوں کو تحریک دینا' حالات و زمانے کے مطابق تبدیلی کو متعارف کرانا' تنگ نظری' دہشت گردی اور باعث زوال عوامل کا کھوج لگانا اور دانشمندانہ طریقے سے ان کا ازالہ کرنا' انتظامی اجتہاد کو بروئے کار لاتے ہوئے نئے پروگرامز اور پراجیکٹس شروع کرنا' جو عوامی فلاح و بہبود اور ملکی ترقی کیلئے ناگزیر ہوں۔ ماحول کے ساتھ اپنا رابطہ مضبوط بنانا اور ہر معاملے میں عوام کی شراکت اور تعاون کو یقینی بنانا ایڈمنسٹریشن کے جدید اصولوں اور

---

(۱) Buraey:229 (۲) Goel.6 (۳) Buraey:229 ۔

طریق کار کا نمایاں پہلو ہے۔ نئی ایڈمنسٹریشن کے حجم اور ساز میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے طریق کار میں بھی بعض تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ تقابلی ایڈمنسٹریشن، ترقیاتی ایڈمنسٹریشن، بین الاقوامی ایڈمنسٹریشن، علاقائی ایڈمنسٹریشن اور انتظامی اخلاقیات کے بارے میں نئے تصورات پروان چڑھتے ہیں۔ دور جدید میں اس نظریئے کو شہرت و پذیرائی حاصل ہو رہی ہے کہ مختلف ملکوں کے تصورات و نظریات، آئیڈیالوجیز، تہذیبی و تمدنی ضروریات، نفسیاتی و علاقائی مسائل اور مزاج و رویے مختلف ہیں اور معاشی حالات اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک ایسی انتظامی مشینری پروان چڑھانا جو حکومت کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے قابل ہو، اس کا تعلق متعلقہ ممالک کے مقامی حالات و ماحول سے ہے۔ تنظیمی ترقی (Administrative Development) کا صرف وہی ماڈل کامیاب ہو سکتا ہے، جو اس کے ثقافتی و جغرافیائی ماحول سے مطابقت رکھتا ہو۔ سیاسی و انتظامی نظاموں، شکلوں اور طریقوں کی اس مطابقت کیلئے (Endogeneity) کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ جو پہلی مرتبہ 1977ء میں یونیسکو کی کانفرنس منعقدہ مراکش میں استعمال کی گئی، جس کا عنوان تھا

"Adaptation of administration to different socio-cultural context[1]"

تجربات نے ثابت کیا ہے کہ امریکہ اور یورپ کے تنظیمی ماڈل جوہری خصوصیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کا فلسفہ زندگی، مقصد حیات، اخلاق اقدار اور مذہب کے بارے میں اجتماعی سوچ اور تہذیب و ثقافت یکساں ہے۔ اس لئے ان ماڈلز کو روبہ عمل لانے سے تقریباً ایک جیسے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ترقی پذیر ممالک بالعموم اور مسلم ممالک بالخصوص جب ان کی ہو بہو نقالی کرتے، تو اس کے نتائج بالکل الٹ نکلتے ہیں۔ جو انتظامی طور طریقے انہیں ترقی سے ہمکنار کرتے ہیں، وہ ہمیں تنزل سے دوچار کرتے ہیں۔ Ruth Green Wald نے بالکل سچ کہا ہے

"Productivity improvements strategies developed in United States may not be applicable in Asia because they do not take into consideration differences in te number of constraints, The nature of the constraints and the length of time required for implementation[2]."

اسلامی ممالک کیلئے اجنبی ماڈلز کا نفاذ اور مغربی اور سیکولر تصورات کی غلامانہ پیروی کے تباہ کن نتائج سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ ہم جدید تنظیمی آلات اور فنی طریقوں سے اس طرح فائدہ اٹھائیں کہ ہمارے اپنے قومی و ملی مقاصد کا حصول ممکن ہو۔ ہمارے معاشروں اور ملکوں میں امن و استحکام آئے، ہماری اپنی تہذیب و ثقافت پروان چڑھے اور ہم دینی، اخلاقی، روحانی، سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے ترقی کر سکیں۔ ہمیں زیادہ تر انحصار اپنی دینی اقدار، تاریخی روایات اور انتظامی تجربات پر کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ اپنے مقامی حالات اور ماحول کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ ان تینوں کے دانشمندانہ اشتراک ہی میں ہمارے مسائل کا حل ہے۔

اسلامی ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کی ذمہ داریاں بہت زیادہ وسیع ہیں، ان میں لوگوں کے انفرادی و اجتماعی، روحانی و مادی، دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کے تمام تقاضے بھی شامل ہیں اور پورے دین پر عمل کرنا اور کرانا، اس کیلئے تمام ضروری طریقے اختیار کرنا اور اجتماعی ماحول فراہم کرنا اس کا لازمی حصہ ہے۔ یہاں Man کی مینجمنٹ سے مراد لوگوں کو محض اپنے انتظامی مقاصد کیلئے استعمال کرنا نہیں، بلکہ ان کے فکر و ذہن اور اخلاق و کردار کی تربیت، ان کی شخصیت کی تعمیر، ان کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کی نشوونما اور ان کا جائز استعمال اور تنظیم مقاصد کو ان کے اپنے مقاصد بنا دینا اور ان کے حصول کو اخلاقی، دینی، پیشہ ورانہ اور قومی فرض کے طور پر انجام دینے کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ Money کی مینجمنٹ سے مراد اس کو اللہ اور قوم کی امانت سمجھ کر استعمال کرنا، اس کی پیدائش میں اسلامی اور اخلاقی اصولوں کی

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ Buraey 231 (۲) Goel:374

پاسداری کرنا اس کے حصول میں حلال و حرام کے اسلامی ضابطوں اور ملکی قوانین کا احترام کرنا اور غیر قانونی ظالمانہ اور باطل طریقوں سے اجتناب کرنا۔ اس کے صرف میں ذاتی مفادات اسراف و تبذیر ضیاع سے بچنا اور اس کے تقسیم و تبادلے میں عدل و انصاف اور فلاح و احسان کے طریقے اختیار کرنا ہے۔ مالی منصوبہ بندی، بجٹ سازی اور اکاؤنٹنگ کو شفاف اور دیانتداری کے تقاضوں کے مطابق Meterialtt کے مینجمنٹ سے مراد تمام قومی ذرائع و وسائل کو جس قدر ممکن ہو ترقی دینا ان کے منصوبہ بندی، کفایت اور دانشمندی سے زیر استعمال لانا، قومی ملکی اور ملی مقاصد کی تکمیل کیلئے انہیں صرف کرنا اسلامی حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے ان کے انتظام و انصرام کرنا۔ علی ھذا القیاس ہم ایڈمنسٹریشن کے تمام اصولوں اور طریقوں کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں فروغ دے کر ایک ایسا جدید اور ترقی یافتہ ماڈل وضع کر سکتے ہیں، جو ہماری ضروریات کو بھی پورا کرے اور جدید سیکولر ماڈلز کا بہترین متبادل ہو۔

۷۔ آغاز و ارتقاء:

پبلک ایڈمنسٹریشن باضابطہ علم کے طور پر اگرچہ گزشتہ صدی کی آخری ایجاد ہے، لیکن عملی طور پر یہ اتنا ہی قدیم ہے، جتنا خود انسان۔ غاروں میں بسنے والے انسانوں نے کچھ انتظامی امور کو اپنے انداز میں سرانجام دیا۔ مثلاً یہ کہ گھر کا سربراہ اپنے دائرہ کار کا ایڈمنسٹریٹر ہوتا تھا۔ یہی بات قبائلی سربراہوں اور رہنماؤں کے بارے میں بھی صحیح ہے، جنہوں نے آج تک بہت سے انتظامی فنکشنز سرانجام دیئے ہیں۔ ان دنوں ایڈمنسٹریشن کی دو شکلوں یعنی پرائیویٹ اور پبلک کا فرق نہیں ہوتا تھا۔ یہ تفریق اس وقت پیدا ہوئی، جب شہروں اور قصبوں میں منظم زندگی کی مختلف شکلیں رونما ہونا شروع ہوئیں۔ اغلب یہ ہے کہ سربراہ مملکت کے ساتھ جو سب سے پہلا ایڈمنسٹریٹر ہوتا تھا، وہ ٹیکس وصول کرنے والا ہوتا تھا۔ وہ بادشاہ یا امیر کی وزارت کا رکن اور سربراہ ریاست کا نہایت قریبی تعلق دار ہوتا تھا۔ اس کا کام نہایت اہم ہوتا تھا، جب تک کہ وہ تمام واجبات و محصولات وصول نہیں کر لیتا تھا، جو اس تحفظ کا معاوضہ ہوتے تھے، جو بادشاہ کے زیر سایہ میسر ہوتا تھا۔ بادشاہ کا یہ فرض تھا کہ وہ گروپ کے اندر نظم و ضبط قائم رکھے اور بیرونی خطرات و حملوں سے حفاظت کرے[1]۔

پرانی تہذیب کے ارتقاء اور قدیم بادشاہتوں اور سلطنتوں کی تعمیر و ترقی کے دوران پبلک ایڈمنسٹریشن کے اندر ایک فرق پیدا ہوا۔ یہ علاقائی، مرکزی اور مقامی ایڈمنسٹریشن کے درمیان تھا۔ سماجی زندگی جب مزید پیچیدہ ہوئی، تو بادشاہ پر مختلف فرائض اور کاموں کا بوجھ بڑھ گیا، تو اس نے اپنے اختیارات وزارت کو تفویض کر دیئے۔ ان افسران کو ریاست اور اس کے بنیادی امور کے بارے میں معمولی نوعیت کی ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں۔ وہ اپنے وقتوں میں اپنی اتھارٹی اپنے معاونین کو سونپ دیتے تھے۔ تاجی کے بقول جدید پبلک سروس کے وہی باوا آدم تھے[2]۔ یورپی ممالک میں جہاں جاگیرداری نظام قائم ہوا، وہاں علاقے کا جاگیردار ہی اپنے علاقے کے سیاہ و سفید اور انتظامی معاملات کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ ہر قسم کی اتھارٹی و اختیارات سے حاصل ہوتا تھا اور بادشاہوں کی طرف سے اسے مکمل پشت پناہی ہوتی تھی۔ لوگ طوعاً کرھاً اس کا ہر حکم ماننے کے پابند ہوتے تھے کیونکہ ان کے کارندے جبر و تسلط کے نظام کے محافظ ہوتے تھے۔ اس طرح کوئی باقاعدہ انتظامی ادارے معرض وجود میں نہ آسکے۔ اہل عرب کے ہاں منظم و مربوط زندگی کا فقدان تھا۔ متعدد تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشی اور جغرافیائی عوامل کے نتیجے میں وہ اپنے اپنے قبائل کے ساتھ اس قدر منسلک تھے کہ کسی بالاتر سیاسی و انتظامی نظام کے تحت رہنا ان کیلئے ممکن نہیں تھا۔ قصی نے اہل قریش کے انتظامی امور کو قبائل میں تقسیم کر کے ان کے مرکزی اتحاد کو قائم کیا، جسے انہوں نے اپنی گہری روایت پرستی کی بناء پر اسلام کے غلبے سے قبل تک قائم رکھا۔ البتہ انہوں نے باہمی مشاورت کیلئے "دار الندوہ" کے نام سے ایک مرکز قائم کیا، جہاں اہم انتظامی فیصلے کیے جاتے تھے[1]۔

(۱) Buraey:228 (۲) Gladdenll:2 (۳) مشکوٰۃ ******

اسلامی عہد اپنی کارکردگی' نئے انتظامی رجحانات' عوامی شراکت' سادگی' جمہوری طرز ایڈمنسٹریشن' اخلاقی اقدار کی آمیزش' نفسیاتی طرز عمل' ماحول سے مطابقت' ماقبل کے انتظامی تجربات سے استفادے' فعالیت و مستعدی' آزادی و مساوات کی فوقیت' عدل وانصاف کے اعلیٰ اصولوں کی پاسداری' اہلیت وصلاحیت کے فروغ' نتیجہ خیزی کے ہدف' تخلیقی وترقیاتی نظریہ کے قیام کے اعتبار سے نہایت منفرد اور مثالی تھا۔ رسول اکرم ﷺ خود ایک اعلیٰ واکمل منتظم ومدبر تھے۔ آپؐ نے نہایت حکمت دانشمندی کے ساتھ ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کیا۔ انتہائی محدود مادی وانسانی وسائل کے ذریعے حسن تدبیر سے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول میں کامیابی حاصل کرکے دکھائی۔ جماعتی سرگرمیوں کی تنظیم وترتیب' افراد کی رہنمائی مربوطی' دیکھ بھال' نگرانی اور کنٹرول کے فن میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ معاملات کو حسب منشاء ڈھالنے' ماحول کو مقاصد کیلئے سازگار بنانے' امکانی خطرات ونقصانات کا اندازہ لگانے' قبل از وقت پیش بندی کرنے' جماعت وتنظیم سے وابستہ تمام لوگوں کو انس ومحبت کے رشتے میں پرونے' ان کے دلوں میں گھر کرنے' انہیں معاملات میں شریک کرنے اور مطلوبہ نصب العین کی خاطر جان' مال' اولاد' خواہشات وتعصبات' آرام وسکون اور سب کچھ قربان کردینے کیلئے آپ نے اپنے صحابہ کرامؓ کو جس طرح تیار کیا' ان کی مثالیں پڑھ کر دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ اس طرح آپ نے ترقیاتی نظریہ (Development Administration) کا آغاز کیا اور زندگی کے ہر شعبے کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کردیا۔ آپ نے انتظامی اصول وقوانین کا تعین کیا' طریق کار کی بنیادیں فراہم کیں' سادہ نوعیت کے انتظامی ادارے قائم کئے' عاملہ (Excutive) کے اہلکاروں' اہل حل والعقد' اولوالامر' اہل شوریٰ کے اوصاف کی نشاندہی کی اور انتظامیہ (Public Administration) کے افسران مثلاً والیوں (Governers)' عاملوں (Tex Controllers)' قاضیوں (Judges) اور فوجی سالاروں (Militry Commanders) کا تقرر کیا۔ اس میں جن باتوں کا خیال رکھا' وہ بہترین انتظامی مشینری کیلئے آج بھی رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ آپ نے پالیسی سازی' منصوبہ بندی' فیصلہ سازی' عملے کی ترقی وتربیت کیلئے جو نظام وڈھانچہ وضع کیا' وہ مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے ایک تبدیلی متعارف کرائی اور تعمیر وترقی کے جذبے کو جوش دے کر "امت" کو بطور تنظیمی ادارہ منظم ومتحرک کردیا۔ مکی دور میں آپ کی پالیسی وحکمت عملی' ہجرت مدینہ کی منصوبہ بندی' مہاجرین کی آبادکاری' مدینہ کی شہری ریاست کے امن وامان کو قائم رکھنے اور حفاظت ودفاع اور بنیادی انسانی حقوق اور ان کی ادائیگی کے طریق کار کے تعین میں میثاق مدینہ کا کوئی جواب نہیں۔ آپ کی صنعتی' زرعی' تجارتی' عدالتی' سیاسی' اخلاقی' قانونی' تعلیمی' سائنسی معاملات میں پیش رفت اور پالیسیاں نہایت دانشمندانہ تھیں۔

عہد خلافت راشدہ میں حضرت عمر فاروقؓ کا دور بطور خاص اہم ہے۔ آپ کو رسول اکرم ﷺ کے بعد اسلامی ایڈمنسٹریشن کا جد اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ آپ اسلامی ریاست وتہذیب کے ابتدائی معماروں میں سے تھے۔ آپ نے مشرق ومغرب کی قدیم بادشاہتوں کو فتح کرلیا' جو فارسی ورومی تھیں' آپ نے ترقی وجدیدیت کو پروان چڑھایا۔ اسلام کے احکامات اور نبی کریم ﷺ کی سنت واسوہ کی روح اور بنیادی اقدار پر ایک واضح انتظامی ڈھانچہ استوار کیا' جو آپ کی اجتہادی بصیرت کا شاہکار ہے[۱]۔ بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے دنیا کے ہر گوشے میں جہاں جہاں انہیں موقع ملا سیاسی وانتظامی معاملات میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں[۲]۔ مسلمانوں کے سیاسی وتہذیبی زوال کے بعد اقوام مغرب نے اپنے غلبہ وتسلط کے دوران ایڈمنسٹریشن کے اپنے انداز اور طریقوں کو رائج کیا اور اپنی نوآبادیاتی وسامراجی ضرورتوں کے پیش نظر ترقی پذیر ممالک میں بالعموم اور اسلامی ممالک میں بالخصوص حاکمانہ' جابرانہ اور شاطرانہ طرز اختیار کیا اور جاتے جاتے اپنے پیچھے ایک ایسا حکمران طبقہ اور انتظامی مشینری چھوڑ گئے' جو ابھی تک ان کے نقال وپیروکار ہیں۔

(۱) دیکھئے Buraey 248، Sultan 50 (۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو Gladden: 214/1، 57/2، 231/2، Buraey 240

۸۔ پبلک ایڈمنسٹریشن کی نوعیت

پبلک ایڈمنسٹریشن نوعیت کے اعتبار سے مختلف پہلو رکھتی ہے جو حسب ذیل ہیں

(الف) بطور فن (Art):

فن دراصل نظری معلومات اور مہارتوں کے کامیاب استعمال اور اصولوں اور ضابطوں کے عملی اطلاق کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے پبلک ایڈمنسٹریشن کو بھی مثبت نتائج کے حصول کی ایک بہترین کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ "یہ دراصل گورنمنٹ کے اداروں کی مشینری کو صحیح کرنے اور صحیح طور پر چلائے رکھنے کا فن ہے۔ اس کا ایک اور فنی پہلو یہ ہے کہ حکومت کی پالیسیوں کو تدبر و حکمت سے نافذ کیا جاتا ہے اور ان سے مطلوبہ نتائج حاصل کئے جاتے ہیں[۱]۔" ایڈمنسٹریشن کے مختلف تصورات و نظریات کو عملی طور پر پرکھا جاتا ہے اور انتظامی مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ اس کے فن ہونے کی حیثیت ہے کہ دور جدید میں بے شمار سرپرستی ادارے معرض وجود میں آچکے ہیں، جن کا بنیادی مقصد انتظامی مہارتوں اور قابلیتوں کو پروان چڑھانا ہے۔ اس لئے Pfiffner کی یہ بات بجا ہے کہ "یہ بالکل واضح ہے کہ آج کل کی پبلک ایڈمنسٹریشن اصولی طور پر ایک فن (آرٹ) ہے، جس میں مفید مہارتوں اور فنی طریقوں کی دریافت اور ان کا اطلاق شامل ہے۔ یہ نمائندہ بازوں کی وضع کردہ پبلک پالیسیوں کے نفاذ میں مددگار ثابت ہوتے ہیں[۲]۔" لیکن اس کے ان فنی پہلوؤں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ اسے مکمل طور پر فن قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس کے طے شدہ ضابطے ہر وقت ہر جگہ مطلوبہ نتائج نہیں دے سکتے۔ اسے صورتحال کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔

(ب) بطور سائنس۔

دور جدید سائنس کا زمانہ کہلاتا ہے اس لئے مغربی مفکرین میں اکثر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے شعبہ ہائے علم کو سائنسی قرار دینے کی کوشش کریں، گرچہ وہ بنیادی طور پر سماجی علوم ہوتے ہیں۔ یہی رویہ ہمیں پبلک ایڈمنسٹریشن کے بارے میں بھی ملتا ہے۔ سائنس سے مماثلت و اختلاف کے حسب ذیل پہلو ہیں۔

(ج) مماثلت:

۱۔ سائنس کی طرح اس میں بھی تجربات و مشاہدات کے ذریعے حقائق کی تلاش کی جاتی ہے۔

۲۔ اس میں بھی نتائج کی ترتیب سے کچھ عالمگیر قوانین اور کلیات تک پہنچا جاسکتا ہے۔

۳۔ اس میں بھی صحیح علم اور واضح اصولوں کا ایسا قابل عمل پیکیج تیار کیا جاسکتا ہے، جس کے اطلاق سے حسب توقع نتائج برآمد ہوں۔

(د) اختلاف۔

۱۔ سائنس کا تعلق مادے سے ہے، جو فطرت کے اٹل اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ ایک جیسے ماحول میں اس کا عمل ایک جیسا ہوتا ہے، جبکہ ایڈمنسٹریشن ایک سوشل سائنس ہے اس کا تعلق انسانوں سے ہے جو الگ الگ انفرادیت، خصوصیات اور جذبات و احساسات رکھتے ہیں۔

۲۔ سائنس کا سماجی اقدار و نظریات سے تعلق نہیں ہوتا جبکہ ایڈمنسٹریشن ان دونوں چیزوں کو نظر انداز کرکے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔

۳۔ مادے کا تو سائنسی تجزیہ ممکن ہے، لیکن انسانی رویے کو کبھی بھی سائنسی تجزیے کے ذریعے نہیں پرکھا جاسکتا۔

۴۔ انتظامی کارکردگی کو جانچنے کے درست پیمانے اور علامتیں ابھی تک صحیح طور پر متعین نہیں کی جاسکیں، صرف اس بارے میں اندازے ہی لگانا ممکن ہو سکا ہے۔

---

(۱) Prethus:3 (۲) Pfiffner:3 .

اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنسی طریق کار سے استفادے کی کوششوں کے باوجود یہ بنیادی طور پر ایک سوشل سائنس ہے اور اسے رہنا چاہئے اسے طبعی و قطعی علم بنانے کی خواہش ایک خوشنما خواب کی طرح ہے[۱]۔

(ر) بطور باضابطہ علم (Discipline):

پبلک ایڈمنسٹریشن دور جدید میں ایک باضابطہ علم کے طور پر اپنی حیثیت منوا چکا ہے اور عہد حاضر کے گوناگوں مسائل کی وجہ سے اس کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہو رہا ہے اور دیگر بے شمار سوشل سائنسز کو پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ اب استحکام و ترقی کی ساری پیش رفت صرف اس کے ذریعے ممکن ہے۔ دنیا بھر کی اہم یونیورسٹیوں میں بہت مقبول شعبۂ علم بن چکا ہے۔ اسے پڑھنے والے طلبہ کی پبلک اور پرائیویٹ دونوں سیکٹروں میں بھرپور ضرورت ہے۔ اسے ایک الگ علم کے طور پر سب سے پہلے 1887ء میں Woodrow Wilson نے امریکہ میں اپنے ایک مضمون "The Study of Public Administration" میں متعارف کرایا' جس میں پہلی مرتبہ اس نے سیاسیات اور ایڈمنسٹریشن میں فرق کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اس کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ بعد ازاں 1900ء میں F.J. Goodnow نے اس تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک کتاب لکھی' جس کا عنوان تھا "Politics and Administration" جس میں اس نے لکھا کہ سیاسیات کی توجہ ریاست کی پالیسیوں یا اس کی مرضی کے اظہار پر مرکوز ہوتی ہے' جبکہ ایڈمنسٹریشن ان پالیسیوں کی تعمیل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طرح اسے سیاسیات کے اندر ہی ایک الگ علمی میدان کے طور پر شامل کیا گیا۔ 1937ء تک اس پر کئی کتب لکھی گئیں' بعد ازاں 1948ء تک بے شمار کتب صنعتی تناظر میں لکھی گئیں اور اس کے اصول وضوابط مرتب کئے گئے۔ Fayal نے اسے ایڈمنسٹریٹو سائنس کا نام دیا اور یہ کہا کہ اس کا تعلق صرف خدمات عامہ سے نہیں ہے' بلکہ ہر سائز' شکل اور مقصد کی سرگرمیوں سے ہے۔ اس کی ہر سطح وشکل میں منصوبہ بندی' تنظیم' اقتدار و حکم' مربوطی' کنٹرول شامل ہوتا ہے' تاکہ صحیح طور پر کام کیا جاسکے۔ ہر کوئی ان عام اصولوں کا ضرور خیال کرتا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف مفکرین نے اپنی اپنی سوچ کے مطابق پبلک ایڈمنسٹریشن کے اصول وضع کئے اور اس کے اغراض ومقاصد سے بحثیں کیں' جنہیں 1938ء سے 1940ء تک یہ کہہ کر چیلنج کیا جانے لگا کہ یہ سائنسی وہمہ گیر نہیں ہیں' بلکہ ان کا تعلق الگ الگ ماحول' ثقافت' اقدار اور تاریخی پس منظر سے ہے۔ دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں نے حکومتوں کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا اور قوموں اور ملکوں کی تعمیر نو کی بے پناہ ضرورت نے انتظامی سطح پر نئے نئے تجربات کرنے اور طریقے اختیار کرنے پر مجبور کیا اور انتظامی اقدامات کے ذریعے ہر طرح کے بے شمار مسائل کو حل کرنے کی راہ سجھائی' جس کی وجہ سے اس علم میں خوب ترقی ہوئی۔ امریکہ میں باقاعدہ انتظامی پیشہ وران کی الگ انجمن قائم ہوئی' جس میں منصوبہ بندی' پروگرام' بجٹ' عملے کے انتظام اور تنظیمی اصولوں کے ماہرین شامل کئے گئے اور اسے سیاسی انجمن سے الگ کیا گیا[۲]۔ بعد ازاں پبلک ایڈمنسٹریشن کے نظریے اور عمل کو آپس میں ملانے کا آغاز ہوا' اسے سیاسی ماحول ہی کا ایک لازمی حصہ قرار دیا گیا۔ تقابلی و ترقیاتی ایڈمنسٹریشن کے تصورات نے اہمیت حاصل کی۔

(س) بطور پیشہ

پبلک ایڈمنسٹریشن کے باضابطہ علم بننے کے ساتھ ہی اس کی طرف طلبہ کی توجہ مبذول ہوئی' قومی وملکی ضروریات نے مہمیز کا کام کیا ہے' جس کی وجہ سے دور جدید میں باقاعدہ ایک پیشے کی شکل اختیار کر چکا ہے' جو نہایت معزز اور باوقار سمجھا جاتا ہے۔ سہولیات واختیارات' سماجی مقام اور منفعت رسانی اور پرکشش مفادات کی وجہ سے انتظامی ذوق اور قائدانہ صلاحیتیں رکھنے والے طلبہ کی ترجیح میں اسے پہلا نمبر حاصل ہے۔

---

(۱) مفصل تفصیل ملاحظہ ہو Tyagi 29 (۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو Goel:30-31 ' Tyagi 16-22.

○ فاروق اعظمؓ کا فلسفۂ نظمیۂ عامہ:

فاروق اعظم ایک مایہ ناز مفکر و مدبر کامیاب منتظم اور طاقتور حکمران تھے۔ ایک وسیع و عریض سلطنت کے انتظام و انصرام کے سلسلے میں آپ کے سامنے جو نئے نئے بے شمار معاملات و مسائل آتے رہے' ان پر ہر وقت غور و فکر کرتے رہتے۔ اجتہادی مسائل کو اصحاب شوریٰ کے سامنے رکھتے' کھل کر بحث و تمحیص کا موقع دیتے اور جب کسی بھی مسئلہ کے حل پر اطمینان اور یکسوئی حاصل ہو جاتی' تو پوری دانشمندی سے اسے نافذ کر دیتے' لیکن بحیثیت مجموعی آپ کے انتظامی اقدامات' انتظامی پالیسیوں اور اصول و طریق کار کی بنیاد آپ کے اپنے فہم اسلام اور اجتہادی بصیرت پر تھی۔ آپ مصنف و فلسفی نہیں' بلکہ ایک عملی انسان تھے اس لئے نظمیہ عامہ کے سلسلے میں آپ کا نظریہ و فلسفہ آپ کے خطبات' احکامات' عملی رویے اور پالیسیوں سے مترشح ہوتا ہے' اس کے نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں۔

آپ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "اللہ کے احکام وہی نافذ کر سکتا ہے' جو نہ تو دوسروں کی نقالی کرے' نہ مداہنت سے کام لے اور نہ ہی اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلے۔ اللہ کا حکم وہی شخص نافذ کر سکے گا جس کے ڈول میں کبھی پانی کی کمی نہ پڑے اور جو حق کے معاملے میں اپنی پارٹی سے بھی نرمی نہ برتے[1]۔" ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے "ڈول میں کمی نہ پڑنے" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ عربی محاورہ ہے' جس سے دریادلی' فیاضی اور وسیع القلبی کی صفت ظاہر کی جاتی ہے۔ ایک دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے "جس کی قوت کار کبھی اضمحلال کا شکار نہ ہو۔" آپ نے اپنے اس قول میں اسلامی ایڈمنسٹریٹر کی سب سے بڑی ذمہ داری' یعنی احکام خداوندی کے نفاذ کی نشاندہی کی ہے' جو ایک سیکولر ایڈمنسٹریشن سے منفرد و ممتاز ہے اور دوسری طرف ان اعلیٰ انتظامی اصولوں پر روشنی ڈالی ہے' جو کامیابی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ نقالی کرنے والا کبھی حالات و وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے اور اجتہادی طریقے اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ روایتی اور فرسودہ طریقوں پر نتائج کی پروا کئے بغیر بلا سوچے سمجھے گامزن رہتا ہے۔ مداہنت سے کام لینے والا مختلف افراد اور گروہوں کے متضاد اور متقابل مقاصد و دباؤ کے آگے ڈانواں ڈول رہتا ہے اور کبھی بھی منصفانہ اور جرأت مندانہ اقدام نہیں کر سکتا۔ اپنی نفسانی خواہشات کا اسیر پوری تنظیم اس کے ماحول اور اس کے مستقبل کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ کنجوس اور کمزور منتظم وسائل کی مینجمنٹ اور مقاصد کے حصول میں ناکام ثابت ہوتا ہے اور حق کے معاملے میں اپنے خاندان' قبیلے یا پارٹی سے امتیازی سلوک کرنے والا پبلک ایڈمنسٹریشن کی ساکھ' اپنی شخصی ذمہ داری اور عوام کے اعتماد کو سخت ٹھیس پہنچاتا ہے۔ ایک آدمی نے آپ سے پوچھا "امیر المومنین میرے لئے یہ زیادہ بہتر ہے کہ خدا کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی لعن طعن کی پروانہ کروں یا اپنی تمام توجہات اپنے ہی نفس کی صلاح پر مرکوز رکھوں؟" آپ نے جواب دیا "جو شخص کسی درجہ میں مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا سربراہ کار بنا دیا گیا ہو' اسے تو راہ خدا میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرنا چاہئے اور جس کے سر یہ ذمہ داری نہ ہو' اسے چاہئے کہ اپنی اصلاح کی فکر کرے اور اپنے حکمران کا خیر خواہ رہے[2]۔"

آپ اسلامی نظمیہ عامہ کے کردار اور عمل کو دین کی سربلندی اور سرفرازی کیلئے وقف کرنا چاہتے تھے۔ اس کے ہر انتظامی تقاضے کو پورا کرنا اس کا بنیادی فرض سمجھتے تھے کیونکہ وہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہے اس کے بعد حکومت اور عوام کے سامنے۔ ایک مرتبہ عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "حکمران کو اپنی رعایا کے ضمن میں سب سے زیادہ اہتمام ان دینی اعمال کے سلسلے میں کرنا چاہئے' جو ان پر اللہ کا حق ہے اور جن کی طرف اللہ نے ان کی رہنمائی فرمائی ہے۔ ہماری ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ ہم تم کو اللہ کی اطاعت کا حکم دیں' جس کا اس نے تمہیں حکم دیا ہے اور اس نافرمانی سے روکیں' جس سے اس نے تمہیں منع

---

(۱) یوسف ۱۵ (۲) " ۱۶

فرمایا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دور و نزدیک کے تمام لوگوں پر اللہ کا حکم نافذ کریں' اس کی مطلق پروا نہ کریں کہ حق کس کے خلاف پڑتا ہے[١]۔" انہوں نے اپنا لقب امیر المومنین اختیار کر کے بھی منصب خلافت کے دینی تشخص کو اجاگر کیا' وہ اسے رعایا کی خدمت و فلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام ایک خط میں لکھا "سب سے زیادہ سعادت مند حکام وہ ہوتے ہیں' جن کی وجہ سے رعایا خوشحال اور فارغ البال ہوتی ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ بہت ہی شقی ہوتے ہیں' جو انسانی معاشرے کو مصائب و آلام سے دوچار کر دیتے ہیں۔ یاد رکھو تم گمراہ ہو گئے تو تمہارے عمال بھی گمراہ ہو جائیں گے۔ پھر تمہاری مثال ان بہائم کی ہو جائے گی' جو صحرا میں سبزہ زار دیکھتے اس طرف مڑ جاتے ہیں اور یہی چیز ان کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے[٢]۔" آپ کے نزدیک جس طرح انسان کے انفرادی اعمال کا دارومدار نیت پر ہے' اسی طرح ایک منتظم کی نیت بھی انتظامی معاملات میں بہتری یا خرابی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام ایک دوسرے خط میں لکھا "جس شخص کی نیت خالص ہو گی' اس کا وقار قوم کے اندر برقرار رہے گا اور اس معاملے میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا۔ تاہم ریاکار کے دل کے تمام بھید اللہ کو معلوم رہتے ہیں۔ ریاکاروں کیلئے اللہ کی رحمت کے خزینے بند رہیں گے[٣]۔"

آپ یہ سمجھتے تھے کہ پبلک ایڈمنسٹریشن سے وابستہ اہلکاروں کو کسی معاملے میں ایسا طریق کار اختیار کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا' جو کسی شخص کی جان ضائع کرنے کا باعث بن جائے۔ ان کی تو بنیادی ذمہ داری ہی یہ ہے کہ ایسی حکمت عملی اختیار کریں جو لوگوں کو تحفظ فراہم کرے۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا طریق کار اختیار کرتا ہے' تو وہ اس کا پوری طرح ذمہ دار سمجھا جائے گا۔ زید بن وہب سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ باہر نکلے اس حال میں کہ آپ کے ہاتھ کانوں پر تھے اور بآواز بلند کہہ رہے تھے "حاضر ہوں' حاضر ہوں۔" لوگوں نے پوچھا کہ انہیں کیا ہوا؟ کسی نے بتایا کہ انہیں اطلاع ملی ہے کہ کسی علاقے سے کوئی امیر دریا عبور کر رہے تھے کہ درمیان میں نہر آ گئی کشتیاں موجود نہیں تھیں۔ امیر نے کہا کوئی شخص بلاؤ جو پانی کی گہرائی کا پتہ لگا سکے چنانچہ ایک بوڑھا شخص لایا گیا' مگر اس نے کہا کہ مجھے سردی لگ جانے کا خوف ہے' لیکن امیر نے اسے مجبور کر کے پانی میں اتار دیا۔ وہ پانی میں اترا تو اسے سردی نے آلیا' وہ پکارنے لگا "عمرؓ کہاں ہیں؟ عمرؓ کہاں ہیں؟ جو مجھے بچا لیں' وہ اسی حالت میں غرق ہو گیا۔" حضرت عمرؓ نے اس امیر کو آنے کا حکم بھیجا' وہ آ گیا تو حضرت عمرؓ اس سے کئی روز تک اعراض برتتے رہے۔ جب کسی سے ناراض ہوتے تھے' تو یہی رویہ اختیار کرتے تھے۔ بعد ازاں اس امیر سے آپ نے پوچھا کہ "اس شخص کا کیا قصور تھا' جسے تم نے مار ڈالا؟" اس نے کہا "امیر المومنین میں نے اسے عمداً نہیں مارا۔ دراصل ہمارے پاس دریا عبور کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور ہم پانی کی گہرائی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد ہم نے اس قدر فتوحات حاصل کی ہیں اور اتنا مال غنیمت ملا ہے۔" اس پر آپ نے فرمایا "ایک مسلمان میرے لئے ان تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے' اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ میرا ایسا کرنا سنت بن جائے گا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔ جاؤ اس کے اہل خانہ کو دیت ادا کرو اور مجھے کبھی نظر نہ آنا[٤]۔"

حضرت عمر فاروقؓ ایڈمنسٹریشن میں اقربا پروری کے سخت مخالف تھے۔ اسے اسلامی روح اور حکمت عملی کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "دوستی پسندی اور قرابت کی بنیاد پر منصب سونپنے والا اللہ' اس کے رسول اور مومنین سے خیانت کرتا ہے[٥]۔" ایک مرتبہ اہل کوفہ کے بارے میں پریشان تھے کہ اگر نرم حاکم بھیجتا ہوں تو گستاخیاں کرتے ہیں اور اگر سخت آدمی بھیجتا ہوں تو شکایت۔ ایک شخص نے کہا اگر آپ چاہیں تو اس مقصد کیلئے قوی و امین اور فرمانبردار (مسلم) شخص کا نام لے سکتا ہوں؟ پوچھا "وہ کون ہے؟" اس نے آپ کے بیٹے کا نام لیا کہ عبداللہ بن عمرؓ۔ جواب دیا "اللہ تجھے ہلاک کرے تو نے اس سے اللہ کی خوشنودی نہیں چاہی[٦]۔" آپ محض عرب کے مخصوص حالات کی بنا پر نہیں' بلکہ ہر دور میں سرکاری ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ میں اقربا پروری کے مہلک اثرات

---

(١) یوسف: ١٣ (٢) یوسف: ١٤، جوزی: ١٣١ (٣) جوزی: ١٣١ (٤) بیہقی ٨: ٣٢٣ (٥) جوزی: ٧٦ (٦) جوزی: ١٢١

کا صحیح شعور رکھتے تھے۔ آپ کو آخر وقت تک اس کا احساس رہا چنانچہ شہادت سے قبل ممکنہ خلفاء حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو یہی نصیحت فرمائی کہ "اگر لوگ آپ کو خلیفہ منتخب کریں تو اپنے خاندان والوں کو ان کی گردنوں پر مسلط نہ کر دینا"[1]۔ عہد عثمانی میں خوفناک فتنے کے اسباب میں سب سے بڑا سبب اقربا پروری کا یہی تاثر تھا۔ دور جدید میں بھی حکومتوں کے عدم استحکام ساکھ کی مجروحیت اور حکومت و عوام میں اعتماد کے فقدان کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ بیورو کریسی اقرباء پروری کا ایک ادارہ اور طبقاتی کلب بن چکی ہے جس کی بنا پر اس کے فیصلے بے اثر ہیں اور عوام میں طاعت کا جذبہ مفقود ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ اپنے ایک عامل حضرت عتبہؓ کو خط لکھا "تم لوگوں کو ظلم سے بچاؤ، تقویٰ اختیار کرو اور ڈرتے رہو ایسا نہ ہو کہ بغاوت و سرکشی کی وجہ سے تمہیں زوال آ جائے۔ اللہ اس وقت تک تمہارے ساتھ رہے گا جب تک تم اللہ کے عہد پر قائم رہو گے۔ اس لئے تم اللہ کے عہد کو پورا کرو اور اس کے احکام کی سختی سے پابندی کرو وہ تمہارا حامی و مددگار رہے گا"[2]۔

آپ کے نزدیک اسلامی نظام حکومت میں مقتدر لوگوں کی طاعت کا عوام میں جذبہ پیدا کرنے والی چیز شریعت کی اطاعت ہے۔ حضرت حسن سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "رعایا امام کے حقوق اس وقت تک ادا کرتی رہتی ہے جب تک وہ اللہ کے حقوق ادا کرتا رہتا ہے۔ جب امام عیش کرنے لگتا ہے تو وہ بھی عیش کرنے لگتے ہیں"[3]۔ "ایک مرتبہ فرمایا "لوگ اس وقت تک مسلسل درست رہیں گے جب تک ان کے ہادی و پیشوا درست رہیں گے"[4]۔" آپ کا یہ معمول تھا کہ اپنی حکومت کے اہلکاروں کو اسلامی نظریہ عامہ کے روح و فلسفہ اور اس کے تقاضوں سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کے نام ایک خط میں لکھا "مابعد کاموں میں زور (روانی) باقی رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ آج کا کام کل پر نہ ڈالا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو تمہارے سامنے کاموں کا ڈھیر لگتا چلا جائے گا اور تمہیں یہ سمجھ نہیں آئے گی کہ ان کاموں میں سے کن کو پہلے کیا جائے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ کام بگڑ جائیں گے اور امیر کے تمام کام اس وقت تک پوری طرح سرانجام پاتے ہیں جب تک وہ اللہ عزوجل کے احکام کی پیروی کرتا رہتا ہے۔ جب وہ خود حدود فراموشی اور ناحق کارروائیاں کرنے لگتا ہے تو ماتحت بھی ویسا ہی کرتے ہیں اور دیکھو لوگوں کے دلوں میں برسر اقتدار طبقہ کے بارے میں ایک نفرت سی پیدا ہو جاتی ہے خدا تمہیں اس کیفیت سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اس سے دلوں میں کینے پیدا ہو جاتے ہیں اور دنیا کو ترجیح دی جاتی ہے اور خواہشات نفس کی پیروی کی جاتی ہے لہٰذا تم حق کو قائم کرنے میں کوشاں رہو خواہ دن کی ایک ہی ساعت نصیب کیوں نہ ہو"[5]۔

اس فرمان میں ایک طرف نظریہ عامہ کے نہایت اہم اساسی اصول اطاعت و مستعدی کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی حکمتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ احکام الٰہی کی پیروی ماتحتوں کیلئے قابل تقلید مثال پیش کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور دوسری طرف حکمرانوں کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت کے برے نتائج سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی گئی ہے کہ اہل اختیار کو جو بالخلاط کام کرنے اور عوام سے نفرت کرنے اور خواہشات نفس کی پیروی کرنے کے بجائے ہر حال میں حق کو قائم کرنے کیلئے کوشاں رہنا چاہئے کیونکہ یہی ان کا فرض منصبی ہے۔ ان کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے کردار کے ذریعے لوگوں کی نفرتوں کو محبتوں اور چاہتوں میں بدلیں۔ ایک خط میں فرمایا "لوگوں کی چاہت میں ہی اللہ کی چاہت ہے۔ اللہ کی چاہت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ تم نے لوگوں کو کیا فائدہ پہنچایا۔ جتنا زیادہ لوگوں کو فائدہ ہو گا اللہ تعالیٰ اتنا زیادہ انعام دے گا"[6]۔ "حضرت عمرؓ انتظامیہ کے اہلکاروں کے مرکزی رول کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عوام انہی کے فکر و کردار کا عکس پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد کیا "لوگ اس وقت تک استقامت کی راہ پر گامزن رہتے ہیں جب تک ان کے امام اور رہنما استقامت اختیار کرتے رہتے ہیں"[7]۔"

---

(۱) سعد ۳: ۳۴۰، بلاذری ۱: ۸۳، طبری ۱: ۱۹۲، سیرہ ۱۲: ۵۷۹ (۲) طبری ۱: ۷۸ (۳) سعد ۳: ۲۹۲ (۴) ایضاً (۵) جوزی ۱: ۱۳۱، عبد ۲: ۲، بیہقی ۱: ۱۳۵ (۶) جوزی سیرہ ۲۱۱ (۷) جوزی ۱۹۸۔

وضعی اور سامراجی نظاموں کے اس فلسفے کے برعکس کہ انسانوں کو کنٹرول کرنے کیلئے ضروری ہے کہ حکومتی اہلکاروں کا رعب و دبدبہ ہو' ان کا اعلیٰ سٹیٹس ہو' عوام سے آزادانہ میل جول سے اجتناب کریں' ان سے قریب ہونے کے بجائے ایک فاصلہ رکھیں۔ فاروق اعظمؓ کا فلسفہ یہ تھا کہ وہ عوام میں سے ہیں اور انہیں کے اندر رہنا چاہئے چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ جب کسی کو عامل مقرر کرتے تو ایک جماعت کو گواہ بناتے جو انصار اور کچھ لوگوں پر مشتمل ہوتی' ان پر چار شرطیں عائد کرتے۔ ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہو گا' باریک کپڑا نہیں پہنے گا' چھنے ہوئے آٹے کی روٹی (یعنی سفید روٹی) نہیں کھائے گا' اپنا دروازہ بند کر کے دربار نہیں رکھے گا[1]۔ "ایک مرتبہ انہیں خبر پہنچی کہ حضرت سعدؓ نے دروازہ بنوالیا ہے' اب لوگوں کی آوازیں ان تک نہیں پہنچتیں' تو انہیں پیغام بھیجا تو انہوں نے دروازہ جلوا دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو ان کے پاس روانہ کیا جو حکام کے پاس جانے کیلئے ان کے سفیر تھے۔ وہ سعد کے پاس پہنچے اور کمرے سے ان کا ہاتھ پکڑ کر باہر لائے اور انہیں کہا کہ یہاں لوگوں کے درمیان بیٹھیں' اس پر سعدؓ نے ان سے اپنے سابق رویے کی معذرت کی۔ عیاض بن غنم کو بھی اسی ضابطے کی خلاف ورزی پر برطرف کیا[2]۔ جب دور دراز علاقوں سے وفود آتے' تو ان سے پوچھتے کہ کیا اس کا حاکم بیماروں کی عیادت کرتا ہے؟ اور غلاموں کی بات سنتا ہے؟ کمزوروں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہوتا ہے؟ کیا اس نے دروازے پر کوئی دربان تو نہیں رکھا ہوا؟ اگر کوئی اس کے برخلاف کرتا اسے برطرف کر دیتے[3]۔

ایڈمنسٹریشن کے بارے میں آپ کے اس نظریے کا اثر تھا کہ آپ عوام کے اندر رہتے ہر شخص ہر وقت ہر جگہ آپ سے بات کر سکتا تھا۔ پیوند لگے کپڑوں کے ساتھ گھومتے پھرتے تھے۔ قتادہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ جب خلیفہ تھے' تو صوف کا جبہ پہنا کرتے تھے' جس پر کپڑے اور چمڑے کے پیوند لگے ہوتے تھے۔ یہی جبہ پہنے ہوئے کندھے پر درہ لٹکائے آپ منڈیوں میں پھرا کرتے تھے' تاکہ آپ لوگوں کی سیاست کریں۔ راستے میں اگر آپ کو رسیوں کے ٹکڑے اور گٹھلیاں ملتیں' تو انہیں اٹھا لیتے اور لوگوں کے گھروں میں ڈال دیتے تاکہ وہ ان سے کچھ فائدہ اٹھا سکیں[4]۔ "آپ کے عہد مبارک میں فتوحات نے مسلمانوں کیلئے خوشحالی کے دروازے کھول دیئے۔ پورے معاشرے کا معیار زندگی بہتر ہو گیا' لیکن آپ نے فقر ہی کی راہ پر گامزن یہاں تک کہ صحابہ کرامؓ نے متعدد مرتبہ منصوبہ بندی کے ذریعے آپ کو اپنی حالت بہتر کرنے کی کوشش کی' لیکن آپ نے رسول اکرم ﷺ کی زندگی اور حضرت ابو بکرؓ کے حالات وواقعات کے حوالے دے کر انکار کر دیا[5]۔ آپ کہا کرتے تھے کہ "ہم لذات وعیش کی پروا نہیں کرتے' اپنی لذات کو آخرت کیلئے باقی رہنے دیتے ہیں۔" "آپ جو کی روٹی کو زیتون کے روغن سے کھاتے تھے' پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتے اور اپنا کام خود ہی کرتے تھے[6]۔

آپ کا انداز یہ تھا کہ نمود و نمائش اور فخر و تکبر کی ہر علامت سے اجتناب کرتے۔ فتح بیت المقدس کے دوران جلوس نے آپ سے کہا کہ آپ عرب کے بادشاہ ہیں' ان شہروں میں اونٹ مناسب حال نہیں۔ اگر آپ ترکی گھوڑے پر سوار ہوتے اور موجودہ لباس کے علاوہ کوئی اور لباس پہنتے تو رومیوں کی نگاہوں میں بڑی قدر ہوتی (؟؟) آپ نے فرمایا "ہم ایسے لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے عزت دی ہے ہم اللہ کے سوا کوئی اور بدل نہیں چاہتے[7]۔" آپ غلاموں اور خادموں کی قطاروں' ہٹو بچو کی صداؤں سے بے نیاز مغلوب قوموں کے سامنے بھی چھوٹے موٹے امور اپنے ہاتھ سے سرانجام دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے' جبکہ عام مسلمان بھی اپنے خلیفہ کو ایسے کام سرانجام دیتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہے ہوتے۔ جب آپ نے شام کا دورہ کیا' تو ایک مقام پر پانی سے گزرنے کی جگہ آئی' تو آپ اپنے اونٹ سے اترے' دونوں موزے اتار کر اپنے ہاتھ میں لئے اور اونٹ کے ساتھ ہی پانی میں گھس گئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا آپ

---

(۱) طبری/۲ ۲۰۷ کثیر/۷ ۱۳۴ جوزی/۱۱۶ (۲) ابن سعد ۱۰ ... ۹ ... ۲۷ طبری/۴/۲۰۷ ... (۳) یوسف ۱۱۷ طبری/۴/۲۳۶ (۴) ... ۳۳۶ (۵) سعد ۲۷۶ کثیر/۷/۱۳۷ (۶) شبلی ۳۲۷ (۷) کثیر/۷/۶۰

نے اہلِ ارض کے رو برو ایک بہت عظیم کام کیا ہے۔ آپ نے ان کے سینے پر زوردار تھپڑ مار کر فرمایا "اے ابو عبیدہ کاش یہ بات تمہارے سوا کوئی اور شخص کہتا' تم لوگ تمام انسانوں سے ذلیل' حقیر اور فقیر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے عزت دی' پس جب بھی تم اسلام کے بغیر عزت کے خواہاں ہو گے اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کر دے گا[۱]۔" آپ ایڈمنسٹریشن کو ایک اہم فریضہ ذمہ داری سمجھتے تھے اور اپنے قول و عمل سے عوام کی تربیت کرتے رہتے تھے۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں جب تہ و بالا ہو گئیں اور ہر طرف اسلام کا پھریرا لہرانے لگا' تو وہاں کی شان و شوکت اور کروفر سے مسلمان بھی متاثر ہونے لگے' تو آپ مختلف طریقوں سے انہیں اسلام ہی کی سادگی پر قائم رکھنے کی کوششیں کرتے رہے۔ ان کی نمایاں مثال ایران کے ایک علاقے کے بادشاہ ہرمزان کے گرفتار ہو کر مدینے لائے جانے کا واقعہ ہے۔ اس نے ایسا ریشمی لباس پہن رکھا تھا' جو سونے سے مرصع تھا' زیورات اس کے زیب تن تھے اور سر پر یاقوت سے مرصع تاج جسے آذین کہا جاتا پہنا ہوا تھا۔ آپ کے سامنے لایا گیا' تو آپ اس وقت مسجد میں سو رہے تھے' آپ کے سر کے نیچے تکیے کی جگہ پر آپ کا سادہ سا عمامہ تھا۔ آپ کی آنکھ کھلی' تو اٹھ کر بیٹھ گئے اور پوچھا "کیا یہ ہرمزان ہے؟" لوگوں نے جواب دیا ہاں۔ آپ نے اسے اور اس کے لباس کو غور سے دیکھا اور فرمایا "میں دوزخ کی آگ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور اسی کی مدد کا طالب ہوں' سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں' جس نے اسلام کے ذریعے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ذلیل کیا۔ اے مسلمانو' تم اس دین کی پابندی کرو اور اپنے نبی کے طریقے سے ہدایت حاصل کرو۔ تم دنیا طلب کر کے مت اتراؤ کیونکہ یہ دھوکہ دینے والی ہے۔ پھر آپ نے اس وقت تک اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا' جب تک اس کے بدن پر یہ لباس اور زیور ہو گا[۲]۔"

آپ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کی ذاتی ضرورت و خواہش کی بنا پر انسان تو انسان کسی جانور کو بھی تکلیف پہنچے۔ ایک دفعہ مچھلی کی خواہش کی' تو آپ کا غلام یرفا پنی سواری پر دو روز کی مسافت طے کر کے مچھلی خرید لایا۔ سواری سے اتر کر اس کا پسینہ دھو رہا تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کو پتہ چل گیا۔ دیکھ کر فرمایا "تم نے عمر کی خواہش کے پیچھے ایک جانور کو اتنی تکلیف دی واللہ میں مچھلی ہرگز نہیں کھاؤں گا[۳]۔" اہلِ کار کو رعایا جیسا طرزِ زندگی اختیار کرنے کی کوشش اس لئے کرنی چاہیے' تاکہ ان کی تکالیف' رنج و غم' مصائب کی شدت کا احساس اور اندازہ کر سکے۔ چنانچہ فرمایا "مجھے رعایا کا حال کیسے معلوم ہو گا اگر وہ تکلیف نہ پہنچے' جو انہیں پہنچ رہی ہے[۴]۔" اسلامی ایڈمنسٹریشن میں عوام کا یہ حق ہے کہ کسی اہلکار کا جب اور جس معاملے میں چاہیں محاسبہ کریں اور اسے راہِ راست پر رکھیں۔ اہلکار کو چاہیے کہ وہ اس بات کا برا منانے کے بجائے اس کی وضاحت پیش کرے یا اپنی اصلاح کرے' جیسا کہ اس مشہور واقعے میں ہے کہ بیت المال میں کچھ چادریں آئیں' تو آپ نے تقسیم کر دیں' ہر کسی کے حصے میں ایک ایک چادر آئی۔ حضرت عمرؓ کو کرتے کی ضرورت تھی' آپ کا قد لمبا تھا اس لئے ایک چادر سے نہیں بن سکتا تھا۔ چنانچہ آپ کے فرزند حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی چادر ان کے حوالے کر دی' اس طرح آپ نے کرتا سلوایا' وہی پہن کر جمعہ کے روز منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور فرمایا "لوگو! غور سے سنو۔" حضرت سلمان فارسیؓ نے پکار کر کہا کہ "ہم نہیں سنتے۔" آپ نے پوچھا "اے ابو عبداللہ کیوں نہیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے تو ہمیں ایک ایک چادر دی ہے اور اپنے لئے کرتہ؟" آپ نے فرمایا "اے ابو عبداللہ جلدی نہ کرو۔" پھر آپ نے آواز دی اے عبداللہ! اس پر کوئی جواب نہ آیا۔ پھر آپ نے آواز دی عبداللہ بن عمرؓ! انہوں نے جواب دیا "امیر المومنین حاضر ہوں۔" "انہیں بتائیے کہ کس طرح تم سے چادر ملی اور میں نے کپڑا بنایا ہے؟ کیا بخدا ایسا ہی ہے۔" اس پر حضرت سلمانؓ نے کہا۔ "ہاں اب ہم سنیں گے[۵]۔"

آپ کے انتظامی فلسفے کا ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ آپ انتظامی عہدے اور منصب کو فخر و ناز کا سرمایہ نہیں' بلکہ ایک بھاری ذمہ داری سمجھتے تھے۔ اسی کا احساس آپ کو

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] ۸۷/۲ (۳) شبلی ۲۲۳/۲ (٤) طبری ۹۸/٤ (۵) جوزی ۱۲۹ ص [illegible]

ہر وقت رواں دواں رکھتا، ہر وقت اسی کی فکر رہتی۔ کبھی آپ راتوں کو گشت کر کے رعایا کے حالات معلوم کرتے اور ان کی حفاظت و مدد کرتے[۱]۔ "آپ کا ارشاد ہے کہ اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ ضائع ہو کر مر جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے اس کی بازپرس کرے گا[۲]۔" کبھی آپ زخمی اونٹ کے زخم میں ہاتھ ڈال کر دیکھتے اور فرماتے "میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تیری تکلیف کے بارے میں مجھ سے پوچھا نہ جائے[۳]۔" سائب بن یزید سے مروی ہے کہ میں نے عمر بن الخطابؓ کو ہر سال دیکھا کہ وہ اونٹوں کا سامان اور کجاوے اور جھولیں درست کرتے تھے جن پر لوگوں کو اللہ کی راہ میں سوار کراتے اور جب کسی کو اونٹ پہ سوار کرتے تو اس کے ساتھ اس کا سامان بھی کر دیتے[۴]۔ کبھی آپ اس خیال سے بیت المال کے بھاگنے والے اونٹوں کی تلاش میں دوپہر کو چلچلاتی ہوئی دھوپ میں نکل کھڑے ہوتے کہ قومی وسائل ضائع نہ ہو جائیں[۵]۔ اس طرح کے ہزاروں کام سرانجام دینے کے باوجود کبھی آپ کا دل اس بات پر مطمئن نہ ہوتا کہ آپ نے اپنی ساری ذمہ داری پوری کر دی ہے۔ آپ جب زخمی حالت میں تھے تو لوگ تعریفیں کرنے لگے۔ آپ نے ارشاد فرمایا "مجھے کبھی اپنے اوپر کسی امر کا خوف نہیں ہوا سوائے تمہاری امارت کے[۶]۔"

آخری دن ایک نوجوان آیا اور کہنے لگا "امیر المومنین آپ کو اللہ کی طرف سے خوشخبری ہو آپ نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی ابتداء میں اسلام لانے کا شرف حاصل کیا پھر آپ والی بنائے گئے اور عدل و انصاف سے حکومت کی پھر شہادت پائی۔" حضرت عمرؓ نے سن کر فرمایا "میں تو اس پر بھی خوش تھا کہ ان باتوں کی وجہ سے میرا معاملہ برابر برابر ختم ہو جاتا نہ میرے ذمے کچھ باقی ہوتا اور نہ میرے لئے کچھ ہوتا[۷]۔" (یعنی نہ تو عذاب دیا جاتا نہ ثواب۔) حضرت ابن عباسؓ کے بقول جب میں نے دیگر باتوں کے علاوہ جب یہ کہا کہ "آپ کی خلافت کے بارے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہ ہوا اور اب آپ قتل کے ذریعہ شہادت پا رہے ہیں۔" آپ نے فرمایا "دوبارہ کہو۔" تو میں نے یہ باتیں آپ کو دوبارہ سنائیں۔ پھر عمرؓ نے کہا "اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اگر زمین کا سارا سونا چاندی میرے پاس ہوتا تو میں اس کو فدیہ میں دے کر پیش آمدہ حاضری کی ہولناکی سے چھٹکارا چاہتا[۸]۔" حضرت ابن عباسؓ نے عرض کی "امیر المومنین واللہ آپ کا اسلام نصرت تھی امامت فتح تھی واللہ آپ کی امارت نے روئے زمین کو عدل سے بھر دیا ہے۔ کوئی دو فریق آپس میں جھگڑا کرتے ہیں تو دونوں آپ کے فیصلے پر اپنا جھگڑا ختم کر دیتے ہیں۔" فرمایا "مجھے بٹھا دو۔" جب بیٹھ گئے تو ابن عباسؓ سے فرمایا "اپنی گفتگو کا میرے سامنے اعادہ کرو۔" انہوں نے اعادہ کیا تو فرمایا "کیا تم قیامت کے دن جب اللہ سے ملو گے تو اس کے سامنے میرے لئے اس کی شہادت دو گے۔" ابن عباسؓ نے کہا "جی ہاں!" حضرت عمرؓ اس سے بہت خوش ہوئے[۹]۔"

آخرت کا خوف ہی وہ سب سے مؤثر ذریعہ ہے جو عمال و منتظمین کو اختیارات و وسائل اور سماجی مقام و مرتبے کی گمراہ کن وادیوں میں راہ راست پر رکھ سکتا ہے۔ آپ نے بعض عمال کے نام خط لکھا جس کے آخر میں تھا "اپنے اچھے دنوں میں اپنا محاسبہ کرتے رہو قبل اس کے کہ ایک ایسا وقت آئے جو تم سے شدت و تنگی کا حساب لے ایسا ہی شخص دوسروں کیلئے قابل رشک اور رضائے الٰہی میں کامیاب ہوتا ہے۔ البتہ وہ شخص جسے دنیوی زندگی نے تغافل میں مبتلا کر رکھا ہے اور وہ خواہشات نفسانی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے اسے عاقبت میں ندامت و حسرت ہو گی لہٰذا انسان کو نصیحتوں پر غور و فکر کرنا چاہئے اور برے اعمال سے مکمل اجتناب کرنا چاہئے[۱۰]۔" ایک مرتبہ فرمایا "اللہ سے ڈرنے والا کبھی مغلوب نہیں ہوتا اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والا شخص نفس پرستی سے دور رہتا ہے۔ اگر یوم قیامت کا خوف

---

(۱) طبری [illegible] (۲) سعد [illegible] (۳) سعد [illegible] سیوطی [illegible] (۴) سعد [illegible] (۵) کثیر [illegible] (۶) سعد [illegible] (۷)

[illegible] (۸) یوسف [illegible] (۹) سعد [illegible] (۱۰) جوزی [illegible]

نہ ہوتا' توحالات ایسے نہ ہوتے' جیسے تم دیکھتے ہو[۱]۔" آپ ایسے ہی عمال کا تقرر فرماتے' جن کا دل خوف آخرت اور احساس ذمہ داری سے مزین ہو۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت سعید بن عامرؓ کو بلوایا اور کہا ہم نے طے کیا ہے کہ تمہیں غیر مسلم آبادیوں کی حکومت سونپ دیں۔ "وہ بولے "مجھے آزمائش میں نہ ڈالئے۔" ارشاد ہوا "تم لوگ چاہتے ہو کہ ذمہ داری کا قلادہ میری گردن میں ڈال کر خود بری الذمہ ہو جاؤ[۲]۔" عمال اس بات سے گھبراتے تھے کہ ان کی غلطی کوتاہی' لاپرواہی کی وجہ سے انتظامی امور بگڑ نہ جائیں یا پرکشش عہدے کی وجہ سے کہیں بشری کمزوری کی وجہ سے بھٹک کر اپنی آخرت نہ برباد کر دیں۔ دور جدید کے سیکولر رجحانات کے برعکس وہ ایسے عہدوں کے پیچھے بھاگنے کے بجائے ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے۔ مالک بن حدثان کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے مجھے دن چڑھے بلوایا۔ جب میں پہنچا' تو میں نے انہیں بغیر بچھونے کے ایک تخت پر بیٹھے پایا۔ مجھے دیکھ کر فرمایا "اے مالک! تمہاری قوم والوں میں سے کچھ میرے پاس آئے' میں نے انہیں مال دینے کا فیصلہ کیا ہے لہٰذا ان میں تقسیم کر دو۔ "میں نے عرض کی کاش آپ اس کا حکم میرے سوا کسی اور کو دیتے۔ فرمایا "نہیں تم ہی سنبھالو[۳]۔"

روایت میں آتا ہے کہ حضرت نعمان بن مقرن اور سوید بن مقرن حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں دریائے دجلہ و فرات کے سیراب کردہ علاقوں میں کام کرتے تھے۔ دونوں نے استعفیٰ پیش کیا اور کہا "ہمیں اس کام سے معافی دی جائے جو ایک بدکار عورت کی طرح اپنی زیب و زینت دکھا کر تباہ کر رہا ہے[۴]۔" آپ نے ان کا استعفیٰ قبول کر لیا اور حکمت اسی میں دیکھی کہ انہیں ایسے کام میں لگایا جائے' جس میں ان کی زیادہ رغبت ہے' چنانچہ جہاد پر بھیج دیا۔ آپ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اجتماعی و انتظامی معاملات میں بگاڑ اور انتشار پیدا کرنے میں سب سے بڑا کردار نیت کے کھوٹ کا ہوتا ہے۔ اگر منتظمین بدنیت ہوں' اصلاح احوال کیلئے سنجیدگی اور ڈھنگ سے کوشش نہ کریں اور جتنا کام کرتے ہیں' اس میں شہرت' ناموری' نمود و نمائش اور ریاکاری کو پیش نظر رکھیں' تو ایک طرف پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور دوسری طرف اللہ کی تائید و رحمت ختم ہو جائے گی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام خط میں لکھا "جس شخص کی نیت خالص ہوگی اس کے اور عوام کے درمیان اللہ تعالیٰ کافی ہوگا۔ جو شخص لوگوں کے سامنے (اس ارادے کو خوشنما بنا کر پیش کرے گا' جو اس کے دل میں ہے اور اس کے برعکس ہے جو ظاہر کر رہا ہے' جسے اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے' تو تمہارا اس اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیا خیال ہے جو اسے رزق اور رحمت کے خزانے لٹانے میں جلدی کرنے والا ہے[۵]۔" آپ کے انتظامی فلسفے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ خلیفہ و حکمران یا حکومت کا کوئی اہلکار عام انسانوں ہی کی طرح کا ایک انسان ہوتا ہے۔ وہ خدا کا اوتار' ظل سبحانی اور مقدس ہستی نہیں ہوتا۔ اس کی منصبی ذمہ داری اور انتظامی اختیارات اسے بالاتر مخلوق نہیں بناتے۔ اس لئے اسے چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو عام انسانوں کی طرح سمجھے اور ان کی ضروریات اور جذبات و احساسات کا اپنی ذات میں دیکھ کر ان کا خیال رکھے' یہی سب سے بڑی حکمت اور سب سے بڑی معرفت ہے۔

شاہ روم جب پے در پے شکستیں کھانے کے بعد عاجز و مرعوب ہو گیا' تو اس نے جنگ بند کر دی اور حضرت عمرؓ سے قربت حاصل کرنے کیلئے خط و کتابت شروع کر دی۔ اس نے ایک دفعہ آپ سے متعدد باتیں دریافت کیں' ان میں سے ایک یہ تھی کہ ایک ایسا مقولہ تحریر کریں' جس میں تمام علم سمٹ کر آ جائے۔ حضرت عمرؓ نے تحریر کیا "جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو' وہی دوسروں کیلئے پسند کرو۔ جو چیز تمہیں ناپسند ہو وہ دوسروں کیلئے بھی پسند نہ کرو' اس میں تمہارے لئے ساری حکمت مجتمع ہو گئی ہے۔ تم اپنے زیردست لوگوں کا خیال رکھو' اس میں تمہارے لئے ساری معرفت سا گئی ہے[۶]۔" یہ صرف آپ کا حکیمانہ مقولہ نہیں ہے' بلکہ بطور حکمران آپ کا اپنا عمل اسی کے مطابق رہا' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر رہا کہ آپ نے اپنے لباس' خوراک' رہائش اور دیگر سہولیات میں عوام کو اپنے اوپر ترجیح دی۔ اپنے معیار زندگی کو عوام کے اوسط معیار سے بھی پست رکھا۔ یہاں تک کہ فتوحات کی وجہ سے خوشحالی کے دروازے کھلے اور ساری رعایا کا معیار بلند ہوا' تو

---

(۱) جوزی ۱۰۶ (۲) حسن ۱۶۰ (۳) دیوہ ۳/۱۹۲ (۴) طبری ۴/۱۳۹ (۵) جوزی ۱۳۱ (۶) طبری ۴/۲۰۹

پھر بھی آپ نے اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کی۔ حضرت حسنؒ سے مروی ہے کہ عمر بن الخطابؓ نے شدت اور اپنے نفس پر تنگی کو لازم کر لیا۔ اللہ وسعت لایا تو مسلمان (آپ کی بیٹی) ام المومنین حفصہؓ کے پاس گئے۔ ان سے کہا کہ عمرؓ نے سوائے شدت اور اپنے نفس پر تنگی کے ہر چیز سے انکار کر دیا ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے رزق میں کشادگی دے دی ہے۔ انہیں چاہئے کہ اس مال غنیمت میں سے جو چاہیں اپنے لئے کشادگی کریں' انہیں جماعت مسلمین کی طرف سے اجازت ہے۔ حضرت حفصہؓ ان لوگوں کی خواہش سے متفق ہو گئیں۔ لوگوں کے واپس چلے جانے کے بعد حضرت عمرؓ ان کے پاس تشریف لائے' تو انہیں ان باتوں سے آگاہ کیا' جو قوم نے ان سے کہی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا "اے حفصہؓ" اے دختر عمرؓ تم نے اپنی قوم کی تو خیر خواہی کی مگر اپنے باپ کے ساتھ بے وفائی کی۔ میرے خاندان والوں کا صرف میری جان و مال میں حق ہے' لیکن میرے دین و امانت میں کسی کا کوئی حق نہیں[1]۔"

قحط کے دنوں آپ کی مرغوب غذا کوہان اور کلیجی کے پکے ہوئے ٹکڑے آپ کے سامنے رکھے گئے۔ خادم سے پوچھا "یہ کہاں سے آئے ہیں۔" اس نے جواب دیا "امیر المومنین یہ ان اونٹوں کا گوشت ہے' جو آج ہم نے ذبح کئے ہیں۔" فرمایا "خوب خوب میں بہت برا والی ہوں۔ اگر میں ان کا اچھا حصہ خود کھاؤں اور برا لوگوں کو کھلاؤں۔ یہ پیالہ اٹھاؤ اور ہمارے لئے کوئی اور کھانا لاؤ۔" پھر روٹی اور زیتون لایا گیا' آپ روٹی پر زیتون لگانے لگے اور اپنے خادم سے فرمایا "اسے یرفا تم پر افسوس ہے یہ پیالہ ثمغ (جگہ کا نام) میں میرے گھر والوں کے پاس لے جاؤ۔ میں نے انہیں تین دن سے کچھ نہیں دیا ہے۔ میرے خیال میں وہ بے آب و دانہ ہیں' ان سے ان کے سامنے رکھو[2]۔" انہی دنوں ایک مرتبہ آپ کے پاس گھی سے چپڑی ہوئی روٹی لائی گئی۔ آپ نے ایک بدوی کو بلا کر اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔ وہ پیالے کے کنارے لگے گھی کو لقمے سے صاف کرنے لگا۔ آپ نے اس سے فرمایا "یوں لگتا ہے جیسے تم گھی میسر نہ ہو۔" اس نے کہا "بے شک میں نے اتنے دنوں سے نہ تو گھی کھایا ہے' نہ زیتون اور نہ ہی کسی کو کھاتے دیکھا ہے۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے قسم کھائی کہ "اس وقت تک نہ تو گھی کھائیں گے نہ گوشت جب تک لوگ سرسبز (خوشحال) نہ ہو جائیں چنانچہ اسی پر عمل کیا[3]۔"

ایسی اور بھی بے شمار مثالیں ہیں' جن سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ یہ سب آپ کی اس سوچ فلسفہ ایڈمنسٹریشن کا نتیجہ ہیں کہ "رعایا کا حال مجھے کیسے معلوم ہوگا' جب تک مجھے بھی وہی تکلیف نہ پہنچے' جو انہیں پہنچی ہے[4]۔" آپ کے کامیاب و کامران حکمران ہونے کا یہی راز تھا۔ عوام اسی وجہ سے آپ سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ آپ کے ایک عامل خالد بن عرفطہ ملنے آئے' تو آپ نے لوگوں کا حال دریافت فرمایا۔ انہوں نے عرض کی: "امیر المومنین! میں نے اپنے پیچھے لوگوں کو اس حالت میں چھوڑا ہے کہ وہ دعا کر رہے تھے کہ اللہ ان کی عمروں میں سے کچھ عمر آپ کی عمر میں لگا دے[5]۔" ایک ایڈمنسٹریٹر اور منیجر کو اپنے پیشے' اس کی ذمہ داریوں اور ان کے تقاضوں اور تحت عملے کی سرگرمیوں کو کس نظر سے دیکھنا چاہئے اور ان کی رہنمائی و نگرانی کس انداز میں کرنی چاہئے اور اپنے سارے امور کے سلسلے میں عوام کا شعور بیدار کرنے اور انہیں اعتماد میں لینے کیلئے کیا طریقہ اپنانا چاہئے؟ اس سلسلے میں آپ کا ایک جامع خطبہ نقل کیا جا رہا ہے جس میں آپ کے نظامی فلسفے کے کئی پہلو واضح ہوتے ہیں۔ یہ خطبہ آپ نے عوام الناس کے سامنے دیا' جس میں آپ کی حکومت کے کئی اہلکار اور مختلف شعبوں سے وابستہ ذمہ دار موجود تھے اس میں سب کیلئے رہنمائی ہے۔ اسے امام ابو یوسف نے اپنی مشہور تصنیف "کتاب الخراج" میں نقل کیا ہے۔ اس کے مختلف اجزا دیگر کتابوں میں بھی روایت کردہ ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا "اے لوگو! کسی بھی صاحب اختیار کو یہ حق نہیں کہ اس کی کسی ایسے کام میں اطاعت کی جائے جس میں اللہ کی نافرمانی ہو۔ یہ مال صرف اسی وقت درست ہے' جب یہ تین شرائط کے مطابق ہو (۱) حق کے مطابق لیا جائے' حق کے مطابق خرچ کیا جائے اور ناجائز ذرائع سے بچا جائے۔ میں تمہارے

(۱) سعد ۳/ ۲۷۸ (۲) سعد ۳/ ۳۱۲' جوزی ۶۸ (۳) سعد ۳/ ۳۱۳ (۴) طبری ۴/ ۹۸ (۵) سعد ۳/ ۲۹۸ (۶) ۴۲

مال کا اس طرح نگران ہوں، جس طرح یتیم کا ولی اس کے مال کا نگران ہوتا ہے۔ اگر میں غنی ہوں گا تو اس سے احتراز کروں گا اور اگر تنگ دست ہوں گا تو معروف کے مطابق کھاؤں گا۔ اگر کوئی کسی پر ظلم یا زیادتی کرے گا تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ اس کے ایک گال کو زمین پر رکھ کر اپنا پاؤں اس کے دوسرے گال پر نہ رکھ دوں، تاکہ وہ حق کو تسلیم کرے۔ اے لوگو! تمہارے مجھ پر کچھ حقوق ہیں، یہ حقوق تم مجھ سے وصول کرو، تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں تمہارے خراج اور تمہارے فے میں سے جو کچھ وصول کروں حق کے مطابق وصول کروں۔ تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ جو خراج میرے پاس آئے وہ میرے پاس سے خرچ نہ ہو مگر اس جگہ جہاں اس کے خرچ کا حق ہو۔ تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ میں تمہارے عطیات اور تنخواہوں میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کی حفاظت کروں، تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں اور تمہیں سرحدوں پر نہ روکے رکھوں۔ اب یہ ایسا زمانہ آگیا ہے، جس میں امانت دار کم ہیں، قرآن پڑھنے والے زیادہ اور سمجھنے والے کم ہیں اور لوگوں کی آرزوئیں بڑھ گئی ہیں۔ لوگ کام آخرت کا کرتے ہیں، لیکن اس سے دنیا طلب کرتے ہیں۔ یہ ایسا عارضہ ہے جو دین کو اس طرح کھا جاتا ہے، جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ جو بھی اس صورت حال سے دوچار ہو اسے چاہئے کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے۔

اے لوگو! اللہ نے اپنے حق کو مخلوق کے حق پر فوقیت دی ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ کا فرمان ہے "ولا یامرکم ان تتخذوا الملائکۃ والنبیین اربابا ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون"[1] ترجمہ "وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بناؤ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔" یاد رکھو! میں نے تم کو لوگوں پر حکومت کرنے والا اور ظالم حکمران بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ میں تم کو ہدایت بہم پہنچانے والا مقتدا بنا کر بھیجتا ہوں۔ مسلمانوں کے حقوق ادا کرو، ان کو مار کر ذلیل نہ کرو، نہ ان کی تعریف کر کے ان کو فتنہ میں مبتلا کرو اور اپنے دروازے ان پر بند نہ کرو کہ ان کے طاقتور ان کے کمزوروں کو کھا جائیں۔ خود کو ان پر ترجیح نہ دو کہ یہ ان پر ظلم ہوگا اور ان کے لئے ناواقف نہ ہو اور ان کی قوت کو کام میں لا کر کافروں سے قتال کرو۔ اگر اہل لشکر اکتاہٹ محسوس کریں تو قتال سے رک جاؤ کہ دشمن کے ساتھ جہاد کرتے وقت یہ امر بہت نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ "اے لوگو! میں تمہیں امراء امصار پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں محض اس لئے بھیجا ہے تاکہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں، فے تقسیم کریں، جھگڑوں کے فیصلے کریں اور کوئی دشواری ہو تو معاملہ میری طرف بھیجیں"[2]۔

آپ نے اس تقریر کی ابتداء ہی میں اسلام کی نہایت ہی منفرد اور اہم انتظامی قدر کو اجاگر کیا ہے، جو منتظمین کے حق اطاعت کو محدود و مشروط کرتی ہے اور ان کے اختیارات کو شرعی ضابطے کا پابند بناتی ہے۔ پھر نظمیہ عامہ کے نہایت اہم اصول یعنی مالیاتی مینجمنٹ کے اہداف، مقاصد، طریق کار، وسائل کی تعیین و تقسیم کے نمایاں پہلو اور ان کی حدود و شرائط کا ذکر کیا ہے کہ حق کے مطابق لینا، حق پر خرچ کرنا اور ناجائز ذرائع سے بچنا، یہ حکومت کی بجٹ سازی ٹیکسیشن اور معاشی پالیسیوں کا بھی رہنما ضابطہ ہے۔ پھر آپ نے بطور منتظم اپنے مالی حقوق و اختیارات اور حفاظت و استعمال کو "یتیم کے ولی" کی نہایت خوبصورت تشبیہ سے واضح کیا ہے۔ پھر آپ نے ظلم کے خاتمے کیلئے یہ فلسفہ دیا ہے کہ طاقتوروں اور ظالموں کا زور توڑا جائے اور انہیں حکومت کی طاقت سے سرنگوں کر کے مظلوموں کو حقوق دلائے جائیں، تاکہ زیادتیوں کا ازالہ ہو سکے۔ پھر آپ نے عوام کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنے، ان کے دفاع کیلئے رائے عامہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اس بات کو ظاہر کرنے کیلئے کافی ہے کہ آپ کے نزدیک نظمیہ عامہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی پالیسیاں واضح رکھے۔ عوام کو اعتماد میں لے اور اپنی حکمت عملی کو عوامی مفادات سے ہم آہنگ کرے۔ پھر آپ نے نظمیہ عامہ کے اہم فرائض معاشی ترقی، امن و امان، سرحدوں کی حفاظت اور بربادی کے تمام عوامل سے بچانے کی تدابیر اختیار کرنا اور سماجی اور طبعی ضروریات کی تکمیل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر آپ نے نظمیہ عامہ کے مرتب کردہ کو نمایاں کیا ہے کہ عمومی سماجی خرابیوں اور مسائل کی نشاندہی کرنا، ان کا شعور اور ازالے کا احساس بیدار

(۱) سورۃ آل عمران ۳/۸۰ (۲) یوسف ۱۸ـ۱۶۲

کر کے تقویٰ اور خدا ترسی کی ترغیب دینا اور حقوق خداوندی کی ادائیگی کیلئے تیار کرنا اس کے کاموں کا حصہ ہے' صرف روکھے انتظامی معاملات کو ڈیل کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ پھر آپ نے حکومت کے ان اہلکاروں کو جو آپ کی اس تقریر کے دوران جلسے میں موجود تھے سر عام ان کی ذمہ داریوں کی نوعیت واضح کی ہے کہ وہ حاکم و فرمانروا نہیں ہیں' بلکہ خادم اور ہدایت دینے والے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو قدیم بادشاہتوں کے دور کی ایڈمنسٹریشن اور عصر جدید کی بیورو کریسی کے مزاج و نخوت کے برعکس' اسلامی تصور کو منفرد انداز عطا کرتی ہے۔ آپ نے آخری حصے میں پبلک ایڈمنسٹریشن کو پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق اور ایسے انتظامی گروں سے روشناس کرایا ہے' جو مقاصد کے حصول' ادارتی ترقی اور موثر و نتیجہ خیز ایڈمنسٹریشن کیلئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب سے آخر میں آپ نے جن معاملات میں عوام کو گواہ بنایا ہے' وہ آپ کی انتظامی حکمت عملی کا شاہکار ہیں۔ آپ کی انتظامی پالیسیاں' اسلام کا طرہ امتیاز اور بعد والے خلفاء کیلئے روشن قندیل بن گئیں۔ روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہؓ اور دیگر حکام کے نام ہدایت نامہ بھیجا' جس میں لکھا "تم اسی روش پر قائم رہو جس پر حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں قائم تھے' کسی بات میں تبدیلی نہ کرو اور اگر کسی کام میں دشواری معلوم ہو تو ہماری طرف رجوع کرو۔ ہم اس مسئلے کو قوم کے سامنے پیش کر کے جواب بھیجیں گے۔ تم تغیر و تبدل سے پرہیز کرو کیونکہ میں بھی تمہاری وہ بات مانوں گا جو عمرؓ تسلیم کیا کرتے تھے[1]۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں نجران کے عیسائی ان کے پاس آئے اور عرض کی حضرت عمرؓ نے ہمیں ہماری زمینوں سے باہر نکال دیا اب آپ ہم پر احسان کر کے ہمیں واپس کر دیجئے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "تمہارا برا ہو' حضرت عمرؓ نہایت صحیح اور حق فیصلے کرتے تھے۔ میں عمرؓ کے کئے ہوئے کاموں میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا[2]۔" عوام کو فاروق اعظم کی پالیسیوں پر اس قدر بھرپور اعتماد تھا کہ اس میں ذرا برابر تبدیلی بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد مشاورت سے نئے خلیفہ کا فیصلہ کرنے لگے' تو انہوں نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں سے یہ وعدہ لیا کہ کتاب اللہ اور سنت نبوی کے بعد دونوں خلفاء کے طریقے پر چلیں گے[3]۔ شعبی کہتے ہیں کہ جب حضرت علیؓ (دارالخلافہ تبدیل کر کے) کوفے میں آئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ میں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ حضرت عمرؓ کے نافذ کردہ قوانین کو منسوخ کر دوں[4]۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مملکت کے تمام عمال کے پاس خط بھیجا جس میں لکھا "جو شخص پوچھے کہ مال فے کو کہاں کہاں صرف کرنا چاہئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے حضرت عمر بن خطابؓ نے حکم دیا اور مومنوں نے اسے عدل کے موافق پایا۔ نبی ﷺ کے اس قول کے مطابق کہ اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق جاری کر دیا ہے۔ انہوں نے عطایا مقرر کئے اور تمام ادیان کے پیروکاروں کی ذمہ داری لی۔ اس جزیے کے بدلے میں جو ان پر عائد کیا گیا۔ نہ اس میں سے پانچواں حصہ نکالا اور نہ ہی اسے غنیمت سمجھا[5]۔" امام ابو یوسف نے ہارون الرشید کو لکھا کہ جو محصول حضرت عمرؓ نے نافذ کئے ہیں' وہ انہی شرائط کے ساتھ قیامت تک نافذ رہیں گے' اس میں آپ اپنی رائے کو دخل نہیں دے سکتے۔ میں نے آپ پر یہ واضح کر دیا ہے کہ گرجا گھر اور بیع کیوں باقی رہنے دیئے گئے تھے[6]۔ آپ کی بصیرت و فراست' معاملہ فہمی اور انتظامی صلاحیت کے سب ہی معترف تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ارشاد ہے "اللہ کی قسم! وہ (حضرت عمر) نہایت مستعد و ماہر منتظم اور بے مثال شخصیت کے حامل تھے۔ وہ پیش آنے والے معاملات کیلئے ان کے مطابق حل پیدا کر لیتے تھے[7]۔" طارق کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ عمرؓ کیسے آدمی تھے؟ انہوں نے جواب دیا "وہ ایک ہوشیار پرندے کی مانند تھے (جو ہر طرف اپنے نگاہ دوڑائے) کہ اس کے گرد جال بچھایا جا رہا ہو[8]۔"

---

(۱) [illegible] (۲) عبید ۹۹ (۳) طبری ۲۲۸/۴ (۴) عبید ۱۰۰ (۵) [illegible] ۱۹۱ (۶) یوسف ۱۴۷ (۷) عبید ۴۸۳ (۸) جوزی ۱۶۲۔

○ انتظامی حکمت عملی جدید تناظر میں

ا۔ جدیدیت (Modernization)

جدیدیت سے مراد نئے کسی نظریہ' چیز' طریقے' انداز یا کام کو نئے' عصری اور تازہ ترین حالات و وقت کی ضروریات اور تقاضوں کے عین مطابق کرنا۔ اسے قدیم اور روایتی قواعد' سوچ اور عادات سے ہٹ کر اختیار کرنا۔ اس میں جدت اور نیاپن پیدا کرنا اور اس طرح تبدیل کرنا کہ جدید ضروریات کو بہ بہت حسن و خوبی سے پورا کر سکیں۔ جدیدیت دوسری قوموں کے افکار و نظریات' تہذیب و ثقافت' اطوار و عادات اور نظاموں کی نقالی کو نہیں کہتے' بلکہ نئی سائنسی ایجادات' آلات و ورار' ذرائع' وسائل اور فنی طریقوں کو اپنے مقاصد' خواہشات اور ضروریات کیلئے استعمال کرنے کو کہتے ہیں۔

جدیدیت کی اصل معراج جدت (innovation) ہے۔ یعنی خود یا خیال' نئی بات' نیا قانون' نیا قاعدہ' نیا طریقہ اور نیا آلہ ایجاد کرنا' صورتحال کو بدل ڈالنا اور خود آگے بڑھ کے جدیدیت کی قیادت کرنا کہ دوسرے لوگ اور دوسری قومیں اس کی پیروی کریں اور آنے والے زمانے اسے مشعل راہ بنائیں۔ اسلامی تصور کے مطابق اجتہاد در حقیقت اسی جدت و جدیدیت کا نام ہے۔ مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی ایسا دین ہے' جو سب سے جدید بھی ہے اور جدیدیت کا علمبردار بھی ہے۔ اس نے محض قدامت پسندی' روایت پرستی اور باپ دادا کی اندھی تقلید کے جذبے سے کسی چیز کو اختیار کئے رکھنے کو سختی سے مسترد کر دیا اور زندگی کے معاملات کے سلسلے میں ہمہ گیر اصول' جامع اقدار اور رہنما قوانین فراہم کئے۔ ہر شعبۂ زندگی کو بالکل منفرد اور جدید خطوط پر استوار کر کے ایک بالکل نئی اور ترقی یافتہ تہذیب و ثقافت کی بنیاد رکھی۔ دنیوی امور کے بارے میں ممنوعات کو نہایت محدود اور مباحات کا دائرہ لامحدود کر دیا' تاکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی اجتماعی سوچ' تحقیقات' تجربات اور ضروریات کے مطابق انہیں جدید اور ترقی یافتہ طریقوں کے ذریعے بہتر سے بہتر انداز میں سر انجام دینے کے قابل ہو سکیں۔ یہ طریقے وہ خود بھی وضع کر سکتے ہیں اور معروف و مروجہ طریقوں سے استفادہ بھی کر سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی فلسفے اس کی تعلیمات اور مزاج و مقاصد سے متصادم نہ ہوں۔

فاروق اعظمؓ نے اپنی اجتہادی بصیرت ہی کے ذریعے اسلام کی روح کو سمجھا۔ اس کے احکامات کی روشنی میں جدت و جدیدیت کو فروغ دیا۔ بعض ایسے نئے اقدامات کئے' جن کے خوشہ چینوں میں صرف ہمارا جدید عہد ہی نہیں' بلکہ آئندہ آنے والے زمانے بھی شامل ہوتے رہیں گے۔ حضرت عمر فاروقؓ مجتہد تھے اس لئے وہ حالات و زمانہ کی تبدیلی اور اس کے نتیجے میں بدلتی ہوئی جدید ضروریات اور ان کے تقاضوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے وقت کے جدید مسائل کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور انہیں حل کرنے کیلئے پبلک ایڈمنسٹریشن کو نئے خطوط پر استوار کیا۔ اس کی بہترین مثال آپ کی اولیات ہیں[(۱)]۔ ایڈمنسٹریشن میں روایت پسندی اور قدامت پرستی کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے اس شعبے میں پرانے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ نئے نئے تجربات کئے اور حسب ضرورت نئی پالیسیاں اور حکمت عملی وضع کی اور امن و استحکام' ترقی' وحدت اور حقوق کی فراہمی کیلئے نئے راستے تلاش کئے۔ نئے انتظامی آلات و طریقوں کے اختیار کرنے میں انہیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ انہوں نے جدت و جدیدیت کو صرف اختیار ہی نہیں کیا' بلکہ اس کے رجحانات کو اسلامی معاشرے میں تحریک دی اور پروان چڑھایا۔ سیکولر تصور کے برعکس آپ کا تصور جدیدیت یہ تھا کہ اسے اسلامی اصول و روایات کی پاسداری کرتے ہوئے نئے تقاضوں کے مطابق پالیسیاں

(۱) [illegible]

بنائی جائیں اور انہیں اسلامی انتظامی ماڈل کا جزو بدن بنایا جائے۔ آپ کے زمانے میں دنیا کی تمام مملکتوں میں ایڈمنسٹریشن گھسے پٹے قدیم اور روایتی اصولوں کے مطابق چلائی جا رہی تھی' جو قبائلیت' بادشاہت اور جاگیرداری کے فلسفوں کے زیر اثر تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اسلامی فلسفے کے تحت پہلی مرتبہ نئے تصورات کا ایک واضح خاکہ اور ڈھانچہ پیش کیا' جو بعد کی اسلامی مملکتوں کیلئے سنگ میل ثابت ہوا۔ اسلام کا یہی وہ پہلو ہے' جس نے اہل مغرب کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا۔ آزادی' مساوات' عدل' وسیع المشربی' بنیادی حقوق' عوامی شراکت' جوابدہی' انتخاب' احتساب' نگرانی' قیادت' کمیونیکیشن' یونٹی آف کمانڈ وغیرہ پر مبنی ایڈمنسٹریشن کے جدید نظریات میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کی خوشہ چینی کا سراغ فاروق اعظمؓ کے فلسفے سے نہ لگایا جا سکے۔ ایک محقق کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ

"Umar's administration was characterized by innovation and reform. It also incorporated concepts which we regard as new to present day administrative theory and practice." (Al-Buraey:248)

اسلام نے اجتہاد کا اصول اسی مقصد کیلئے مقرر کیا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے دیگر شعبوں کی طرح ایڈمنسٹریشن میں اس اصول کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے مختلف حکومتی اداروں کی تجدید (Modrenize) کی۔ مثلاً آپ نے معاشرے کی بڑھتی ہوئی اجتماعی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف قسم کی عمارات سرکاری سطح پر تعمیر کرائیں جن سے نہ صرف عوام کو جدید سہولیات میسر آئیں' بلکہ حکومتی اہلکاروں کو انتظامی معاملات کے سنبھالنے میں نہایت مددگار ثابت ہوئیں۔ ان میں بعض مذہبی نوعیت کی تھیں' جیسے مساجد وغیرہ جو فکری' تعلیمی' تربیتی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کی تعداد چار ہزار تک ہے۔ دوسری دفاعی اور فوجی نوعیت کی تھیں جو علاقوں کی حفاظت اور امن وامان کے قیام میں اہم کردار ادا کرتی تھیں' ان میں قلعے' چھاؤنیاں اور بارکیں وغیرہ شامل تھیں۔ تیسری سول اور سرکاری نوعیت کی تھیں' جن میں انتظامی نوعیت کے معاملات نمٹائے جاتے تھے۔ ان کی نوعیت سیکرٹریٹ کی سی تھی۔ انہیں "دار الامارۃ" کہا جاتا تھا۔ اس میں صوبہ جات اور اضلاع کے حکام آکر قیام کرتے تھے' ان کے دفاتر بھی موجود ہوتے تھے[1]۔ "چوتھی قسم دیوان کی تھی' جن میں مختلف قسم کے رجسٹر اور کاغذات ہوتے تھے۔ ان میں افواج' عمال اور عوام کی تفصیلات ان کے وظائف و مراعات کا ذکر ہوتا تھا۔ پانچویں نوعیت بیت المال کی تھی۔ یہ بڑی مضبوط اور مستحکم ہوتی تھی۔ عام طور پر مسجد کے قریب ہوتی تھی' تاکہ اس کی نگرانی ہوتی رہے۔ چھٹی قسم قید خانوں کی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے پہلی مرتبہ اس کا اہتمام کیا۔ ساتویں قسم مہمان خانوں کی تھی' اس کا انتظام بھی سرکاری طور پر کیا گیا تھا۔ ان کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے شہروں سے آنے والے لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ چند روز کیلئے آسانی سے قیام کر سکیں[2]۔ انہیں (دار الرقیق) کہا جاتا تھا۔ اس میں مسافروں کی ضروریات کا سارا سامان موجود ہوتا تھا' جس میں آٹا' ستو' کھجور' کشمش وغیرہ[3]۔ مکے اور مدینے کے راستے کو تو مسافر خانوں سے بھر دیا' وہاں دیگر ضروریات کے ساتھ سائے اور پانی کا انتظام ہوتا[4]۔

آپ نے جو نئے نئے شہر بسائے وہ شہری منصوبہ بندی (Town Planing) کا شاہکار تھے۔ ان میں کوفہ' بصرہ' فسطاط' موصل اور جیزہ شامل ہیں۔ درمیان میں مساجد اور دفاتر' چاروں طرف کشادہ اور سیدھی سڑکیں' مختلف بلاکوں میں تقسیم' آب وہوا کے اعتبار سے نہایت مفید اور تمام ضروری سہولیات سے مزین شہر بسائے گئے جو اس وقت کے سرحدی علاقوں پر واقع تھے' جو دفاعی اعتبار سے بھی بہت اہم تھے۔ ان میں سلیقے اور منصوبے سے لوگوں کو آباد کیا گیا۔ بہت جلد یہ اسلامی تہذیب وثقافت کے مراکز بن گئے۔ حضرت عمرؓ نے پہلی مرتبہ یہاں پکے مکانات تعمیر کرنے کی بھی اجازت دی۔ حضرت عمرؓ نے اس بارے میں خصوصی ہدایات دیں' مثلاً کوفہ کی تعمیر کیلئے آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھا "مسلمانوں کیلئے ایک شہر (دار الہجرۃ) بساؤ' جہاں کمیونٹی سنٹر (قیروان) بھی ہو۔ "ابتدائی طور

---

(۱) بلاذری ا:۴۹۰ (۲) شبلی ۲:۲۲۲ (۳) سعد۳:۲۸۳ (٤) سعد۳:۳۰۶

پر جس جگہ کا انتخاب کیا گیا وہاں بہت مچھر تھے۔ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے لکھا "عربوں کی حالت اونٹ کی سی ہے۔ ان کو ایسی جگہ راس نہیں آسکتی جو اونٹ کو راس نہ آئے تم ان کیلئے اور جگہ تلاش کرو لیکن میرے اور ان کے درمیان سمندر حائل نہ ہو۔" اس میں مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگوں کیلئے الگ الگ قطعات مختص کیے گئے جو عربوں کی تمدنی روایات کے عین مطابق تھے۔ اسی طرح بصرہ بھی حضرت عمر فاروقؓ کے مشورے سے نہایت سرسبز اور پر فضا مقام پر تعمیر کیا گیا[1]۔

آپ کے بے شمار فیصلے ایسے تھے جو حالات و زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے نئے انداز میں کیے جو دور جدید کی نظمیہ عامہ کو معاملات کے انتظام و انصرام میں رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص حاطب کے غلاموں نے قبیلہ مزنیہ کے آدمی کا اونٹ چرا کر کاٹ کھایا۔ آپ نے کثیر بن صلت کو ان کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے حاطب سے کہا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ تو نہیں بھوکا رکھتا ہوگا۔ خدا کی قسم میں تم سے ایسا تاوان دلاؤں گا جو تجھے بہت گراں گزرے گا۔" پھر آپ نے دست دے سے پوچھا "تیرا اونٹ کتنے کا ہوگا؟" اس نے کہا کہ میں نے چار سو درہم کا خریدا لیکن میں نے نہیں بیچا۔ آپ نے حاطب سے فرمایا کہ "اسے آٹھ سو درہم ادا کرو[2]۔" آپ نے اس موقع پر فرمایا "یاد رکھو بخدا اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ تم لوگ غلاموں سے خوب کام لیتے ہو اور ان کو بھوکا رکھتے ہو۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مجبور ہو کر حرام چیز کھالے تو وہ حلال ہو جائے تو میں یقیناً اس کے ہاتھ کاٹ ڈالتا[3]۔"

دور جدید میں افراد اور اداروں کے ملازمین کے بارے میں اگر وہ کسی جرم میں ملوث ہوں تو یہ تحقیق کی جاسکتی ہے کہ کہیں ان کی زیادتی و لاپرواہی کا دخل تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ثابت ہو تو ان پر تاوان عائد کر کے معاملات کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح دور جدید میں صنعتی اور مشینی ترقی کی وجہ سے زمینی، سمندری اور فضائی حادثات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے، لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ آئے دن سینکڑوں لوگ مارے جاتے ہیں، جن میں بیشتر خاندانوں اور گھرانوں کے کفیل و سہارا ہوتے ہیں، جو ان کے بعد اجڑ جاتے ہیں، مگر ان کی دیت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے، جس کی وجہ سے مرنے والوں کے بچے عمر بھر افلاس و بے چارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اسلام نے قتل خطاء کی دیت "عاقلہ" یعنی قاتل کے خاندان اور قبیلے کے لوگوں پر ڈالی ہے، تاکہ سب مل کر پسماندگان کے نقصان کو کم از کم معاشی اعتبار سے پورا کریں۔ دور جدید میں عاقلہ ان ٹرانسپورٹ کمپنیوں کو قرار دیا جاسکتا ہے، جن کے ڈرائیوروں کی غفلت و لاپرواہی سے حادثہ پیش آیا ہو یا انشورنس کمپنی کی طرف بھی دیت کی ادائیگی کی ذمہ داری منتقل کی جاسکتی ہے۔ اس کی بنیاد حضرت عمر فاروقؓ کے اس فیصلے پر استوار کی جاسکتی ہے۔ بقول تقی امینی "حضرت عمرؓ کے زمانے میں حالات کی تبدیلی سے جب معاشرتی زندگی کی نئی تنظیم وجود میں آئی تو انہوں نے عاقلہ کے نظام کو وسعت دی اور یہ قانون مقرر کیا کہ اگر قاتل اہل دیوان میں سے ہے تو عاقلہ اہل دیوان ہوں گے۔" اہل دیوان میں ایک دفتر یا محکمہ کے لوگ شامل ہوتے تھے، جن کے نام ایک رجسٹر میں درج ہوتے تھے۔ اس تبدیلی پر علامہ سرخسی کی رائے یہ ہے "رسول اللہ ﷺ نے دیت کی ذمہ داری خاندان اور قبیلے پر اس لئے ڈالی تھی کہ اس وقت قوت و مدد انہی کے ذریعے حاصل ہوتی تھی۔ پھر حضرت عمرؓ نے جب دفاتر کا نظام مرتب کیا تو یہ قوت و مدد اہل دفاتر سے وابستہ ہو گئی تھی۔" اگر ہم پیشہ و ہم مشرب لوگوں سے یا یونین اور انجمن کے ممبروں سے یا جماعت کے اراکین و پیر کے مریدین سے باہمی قوت و مدد حاصل ہو تو سب کو دیت کا ذمہ دار بنانے کی اجازت ہے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے "اگر آج باہمی مدد ہم پیشہ لوگوں سے ہو سکتی ہے تو عاقلہ ہم پیشہ لوگ قرار پائیں گے[4]۔"

دور جدید میں لوگوں کی زندگی ڈاکٹروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے ان کا علم و تجربہ ہو یا نہ ہو کلینک کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنی مہارت ثابت کرنے کیلئے

(1) [illegible] (2) [illegible] ۳۶۰ (3) [illegible] ۳۳:۱ صفحہ ۸۵ (4) صفحہ ۹۹

چھوٹی موٹی بیماریوں کیلئے بھی زیادہ طاقت کی اور مہنگی دوائیاں لکھ دیتے ہیں' جن کے منفی اثرات کا وبال مریضوں کو سہنا پڑتا ہے۔ بسا اوقات اپنی غلطی' نااہلی' مصروفیت یا پرواہی سے ان کے امراض کو زیادہ پیچیدہ بنا دیتے ہیں اور موت سے بھی ہمکنار کر دیتے ہیں۔ اپریشن کے وقت پٹیاں اور اوزار تک پیٹ میں بھول جاتے ہیں۔ کیا سے تقدیر کا لکھا سمجھنا چاہیے یا پھر ڈاکٹر کی کوتاہی کا ثبوت ہونے کی صورت میں اسے ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے؟ حضرت عمر فاروق کا فیصلہ وہاں کا ذمہ دار ہے اسے اس کی سزا دی جا سکتی ہے۔ ایک ڈاکٹر نے غلطی سے ایک بچے کے عضو تناسل کا ایک حصہ کاٹ دیا' تو آپ نے اس پر تاوان عائد کیا(۱)۔" اسی طرح آپ نے بے شمار نئے نئے انتظامی فیصلے کر کے اصلاح احوال کیلئے ایسے خطوط متعین کیے' جنہیں ہم لاتعداد مسائل کے حل کی بنیاد بنا سکتے ہیں۔ چند حسب ذیل ہیں۔

ابو سفیان نے مکہ میں نیا مکان غلط جگہ پر تعمیر کروایا۔ پہاڑیوں سے آنے والے پانی کے آگے پتھر رکھوا دیئے' جن کی وجہ سے پانی کا رخ دوسری طرف ہو گیا' جس سے دیگر لوگوں کے مکانات بہہ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے خود جا کر وہ پتھر اٹھوا دیئے' پھر قبلہ رو ہو کے اللہ کا شکر ادا کیا' جس نے اسلام کی وجہ سے وادی مکہ میں عمرؓ کو ابو سفیان پر غالب کیا(۲)۔ آپ پسے ہوئے غریب لوگوں کو سر بلند کرنے اور اعتماد دینے اور اسلام کے جدید اور منفرد عادلانہ نظام کی ساکھ کو مستحکم کرنے کیلئے عہد جاہلیت کے طاقتور سرداروں کے گھمنڈ کو انتظامی آلات کے ذریعے ختم کرتے رہتے تھے' تاکہ وہ مطیع و فرمانبردار بن کر رہیں اور حکومتی کنٹرول اور اتھارٹی ثابت ہو جائے۔

یک مرتبہ قریش کے چند رؤسا جن میں سہیل بن عمرو' حارث بن ہشام اور ابو سفیان آپ کو ملنے کیلئے حاضر ہوئے۔ اسی دوران اتفاق سے حضرت صہیبؓ' حضرت بلالؓ اور چند دوسرے موالی بھی باہر پہنچے۔ آپ نے ان لوگوں کو پہلے ہی اندر بلوا لیا۔ ابو سفیان کو سخت ناگوار گزرا اور کہا "آج کیا زمانہ آ گیا ہے کہ انہیں تو اندر بلا لیا گیا ہے اور ہماری طرف کسی نے التفات تک نہیں کیا۔" سہیل بن عمرو بڑے عقلمند تھے' بولے "مجھے تمہاری ناگواری خاطر کا احساس تمہارے چہروں سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ تمہیں شکایت خود اپنی ذات سے ہونی چاہیے۔ پکارنے والے نے تو سب کو پکارا تھا' لیکن ان لوگوں نے سبقت حاصل کر لی اور تم نے دیر کر دی۔ اب قیامت کا تصور کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پہلے بلا لئے جائیں اور تمہیں چھوڑ دیا جائے(۳)۔"

اسی طرح کے ایک واقعے میں حارث اور سہیل بن عمرو تھے۔ ملاقات کے وقت حضرت عمرؓ کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد مہاجرین اولین آنا شروع ہو گئے۔ جوں جوں کوئی برگزیدہ مہاجر (صحابی) آتا' حضرت عمرؓ اسے قریب جگہ دے دیتے' ان دونوں کو ہٹنا پڑتا۔ آپ فرماتے "ھاھنا یا سہیل' ھاھنا یا حارث" (سہیل تم یہاں' حارث تم یہاں) یہاں تک کہ دونوں مجلس کے بالکل کنارے تک پہنچ گئے۔ جب باہر نکلے تو حارث سہیل سے کہا "دیکھا تم نے حضرت عمرؓ ہم سے کیسے پیش آئے؟" "میرے بھائی ہمیں شکایت اپنے آپ سے کرنی چاہیے' ہم نے اسلام کی دعوت عام قبول کرنے میں تاخیر بھی تو بہت کی۔" تاہم حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل کا دونوں کو بہت ملال تھا۔ اسی دن پھر ملنے کیلئے چلے گئے اور عرض کیا "امیر المومنین! آپ کے آج کے طرز عمل سے گویا ہماری فہمائش اور تنبیہہ مقصود تھی۔ آخر آپ کے تقرب کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟" فاروق اعظمؓ نے روم کی سرحدوں کی طرف اشارہ فرمایا' دونوں شام کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں جہاد میں اپنی جانیں دے دیں۔ اللہ ان پر رحمت نازل فرمائے(٤)۔

آپ کی کامیاب انتظامی حکمت عملی میں جدت و نیرنگی کا بڑا گہرا دخل تھا۔ آپ نہایت دانشمندی سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور واقعات کی تحقیق و تفتیش کیلئے اچھوتے طریقے اختیار کرتے۔ ان کی وجہ سے آپ کا رعب قائم ہوتا' جرائم کم ہوتے اور امن و امان برقرار رہتا۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے'

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible]:۹۸ (۳) ایضاً:۹۹ (٤) ایضاً

ایک دن آپ کو سرِ راہ ایک نوجوان لڑکے کی لاش ملی' آپ نے تفتیش کی مگر قاتل کا سراغ نہ مل سکا۔ آپ نے دعا کی "اے اللہ مجھے توفیق دے کہ میں قاتل کا پتہ چلا سکوں۔" اس واقعے کو ایک سال گزرا تھا کہ عین اسی جگہ جہاں مقتول کی لاش دیکھی گئی تھی ایک نومولود اور نوزائیدہ بچہ پڑا ہوا پایا گیا۔ اس سے آپ کی ڈھارس بندھی اور فرمایا "انشاء اللہ اب میں قاتل کا پتہ چلا لوں گا۔" آپ نے اس بچے کو ایک عورت کے سپرد کیا اور اسے حکم دیا کہ "بچے کی نگہداشت کرتی رہے' اس کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھے' اسے حکومت کی طرف سے معاوضہ ملے گا اور ساتھ ہی ان عورتوں پر بھی نگاہ رکھے' جو اس بچے کو گود لینے کی طرف مائل ہوں۔ اگر کوئی ایسی عورت نظر آئے جو بچے کو پیار کرے اور چھاتی سے لگائے تو انہیں اس کا مکمل پتہ بتایا جائے۔" جب یہ بچہ بڑا ہوا' تو ایک عورت اس سرکاری دایہ کے پاس آئی اور کہا "میری مالکن نے مجھے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ انہیں یہ بچہ لوٹا دیا جائے۔" اس نے کہا بالکل ٹھیک چلو میں بھی چلتی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے بچہ ساتھ لیا اور پیغام لانے والی عورت کے ساتھ چل دی۔ جس وقت یہ دونوں مالکن کے پاس پہنچیں' جو اصل میں بچے کی ماں تھی اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا' پیار کیا' چوما اور چھاتی سے لگا لیا۔ مگر یہ مالکن کون تھی؟ ایک جلیل القدر انصاری صحابیؓ کی بیٹی تھی۔ حضرت عمرؓ کو صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا انہوں نے ہاتھ میں تلوار اٹھائی اور عورت کے مکان پر پہنچے۔ بچی کی ماں کے والد اپنے دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ امیر المومنین نے انصاری صحابیؓ سے پوچھا "تمہیں معلوم ہے تمہاری لڑکی نے کیا کیا ہے؟" صحابیؓ بولے "امیر المومنین میری بیٹی اسلامی کردار کا نمونہ ہے۔ وہ اللہ کے حقوق بھی پہچانتی ہے اور اپنے والد کے حقوق بھی اور صوم و صلوٰۃ کی پابند ہے۔" حضرت عمرؓ بولے "بہر حال یہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں اس لڑکی سے کچھ باتیں کروں اور اس کو نیک اعمال کی طرف راغب کروں۔" صحابیؓ نے کہا "امیر المومنین اللہ آپ کو جزائے خیر دے آپ یہیں ٹھہریں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" گھر میں جا کر صحابیؓ نے اعلان کیا کہ امیر المومنین اندر آنا چاہتے ہیں' آپ اندر تشریف لے گئے اور حکم دیا کہ "میرے اور صحابیؓ کی لڑکی کے علاوہ گھر میں کوئی نہ رہے۔" جب گھر بالکل خالی ہو گیا' تو آپ نے اپنی تلوار نیام سے نکالی اور فرمایا "تم پورا واقعہ مجھے سچ سچ بتا دو۔" ان کی عادت تھی کہ اگر کوئی اصل واقعے کو بلاکم و کاست بیان کر دیتا' تو اسے نہ جھٹلاتے۔ لڑکی بولی "امیر المومنین ذرا ٹھہریئے میں قسم کھاتی ہوں کہ پورا واقعہ سچ سچ بیان کروں گی۔" "ایک سن رسیدہ عورت میرے پاس آتی رہتی تھی' میں نے اسے ماں بنا لیا تھا اور وہ بھی مجھ سے ماں جیسا برتاؤ کرتی تھی۔ میرا طرز عمل ایسا ہو گیا تھا گویا میں اس کے بطن سے پیدا ہوئی ہوں۔ کچھ مدت بعد ایک دن وہ عورت آئی اور کہا "بیٹی مجھے ایک سفر درپیش ہے میری بچی ایک بیٹی ہے میری غیر موجودگی میں ممکن ہے اسے تکلیف ہو' میں چاہتی ہوں کہ اسے تمہارے پاس چھوڑ جاؤں' واپسی پر اسے بلا لوں گی۔ اس بہانے سے اس بڑھیا نے ایک جوان لیکن بے ریش و بروت لڑکے کو میرے پاس چھوڑ دیا۔ یہ لڑکا ایک دوشیزہ کی ہیئت اختیار کئے ہوئے تھا۔ جب اسے لایا گیا' تو اس کی ہیئت کذائی سے مجھے گمان تک نہ گزرا کہ یہ لڑکی نہیں ہے۔ ایک دن جب میں سو رہی تھی تو اس نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنا لیا۔ میری آنکھ کھلی تو حالت یہ تھی کہ مجھ سے استفادہ کی منزل میں تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک خنجر اٹھایا' جو اتفاق سے میرے پہلو میں تھا اور اس بدبخت کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد میں نے اسے پھینکوا دیا' مگر اس افسوسناک واقعے کا نتیجہ یہ بچہ تھا۔ جب یہ بچہ پیدا ہوا' تو میں نے اسے بھی عین اسی مقام پر ڈلوا دیا۔ بس یہ ہے قصہ اس مقتول کا اور اس مولود کا۔"

امیر المومنین بولے "لڑکی تو نے سچ کہا۔" اس کے بعد آپ نے اسے نصیحتیں کیں' ہدایتیں دیں اور اسے دعا دے کر گھر سے باہر آ گئے۔ صحابیؓ سے جو اس شجاع اور پاکدامن لڑکی کے والد تھے' فرمایا "تمہاری لڑکی ایک قابل قدر لڑکی ہے' میں نے اسے نصیحتیں کی ہیں اور چند ہدایات دی ہیں۔" صحابیؓ نے عرض کی "امیر المومنین اللہ آپ کو رعیت کی پاسداری کا صلہ دے"[1]۔ آپ حالات و وقت کے تقاضوں کو بھی خوب سمجھتے تھے اور قوانین کے خلاق کے محل کو اچھی طرح

(۱) جوزی، ۷۸۔

جانتے تھے' آپ مستقبل کے نتائج کا اندازہ کرکے فیصلے فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی پالیسیاں زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر ہر دور کی اسلامی ایڈمنسٹریشن کا دستور العمل ٹھہری ہیں۔ روایت میں آتا ہے کہ آپ نے ایک شخص کو حرم کی حدود میں ایک درخت کو کاٹتے اور اپنے اونٹوں کو کھلاتے ہوئے دیکھا۔ اس شخص کو طلب کیا' وہ آیا تو فرمایا "اے اللہ کے بندے تمہیں معلوم نہیں کہ مکہ حرام ہے اور اس کی حدود میں درخت کاٹنا جائز نہیں ہے۔ ان حدود میں قطع شجر یا شکار وغیرہ ناگزیر صورتوں میں ہی جائز ہو سکتے ہیں؟" اس نے جواب دیا "امیر المومنین میں نے اضطرار کے عالم میں یہ کیا ہے' میرے پاس جو جانور ہیں وہ بے حد کمزور ہیں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید وہ سب ہی مر جاتے۔" آپ نے یہ بات سنی تو آپ کا دل بھر آیا۔ آپ نے صدقے کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ جو آٹے کی بوریوں سے لدا ہوا تھا منگوا کر اس شخص کے حوالے کیا اور فرمایا "آئندہ کبھی حرم کے درخت نہ کاٹنا"[۱]۔ "یہ ایڈمنسٹریشن کا منفرد انداز ہے کہ بظاہر سرا کے مستحق شخص کو حقیقی عذر اور مجبوری دیکھ کر شفقت و معاونت کا حقدار ٹھہرا لیا جائے۔ اس طریق کار کو کبھی عہد حاضر میں بھی اپنایا جائے' تو معاشروں کا نقشہ تبدیل ہو جائے۔ ایک شخص پیاسا تھا اس نے کچھ لوگوں سے جن کے پاس پانی موجود تھا پانی مانگا' انہوں نے انکار کر دیا' یہ بے چارہ پیاس سے مر گیا۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو اس شخص کا قاتل قرار دیا اور ورثاء کو خون بہا دلوا دیا[۲]۔

ہمارا دور اس جدیدیت کے مقابلے میں کتنا فرسودہ اور پسماندہ ہے کہ حکومتوں کی پالیسیوں سے عوام بے روزگاری اور بھوک و افلاس کا شکار ہو رہے ہیں۔ صرف پاکستان سے چوبیس لوگ مجبور ہو کر خودکشی کر چکے ہیں' مائیں بچوں سمیت اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہیں' مگر اس کی ذمہ داری کسی کے سر پر نہیں ڈالی جا رہی۔ یہ معمول کے واقعات بن چکے ہیں۔ اب تو ان پر بہت زیادہ افسوس کرنے کی بھی کسی کو فرصت نہیں۔ آپ کی توجہ زندگی کے تمام معاملات کی طرف ہوتی تھی۔ آپ حکومتی انتظامات کو جدید سانچوں میں ڈھالنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے۔ اس کی ایک مثال ٹکسال کا قیام بھی ہے' چنانچہ روایت میں آتا ہے۔ عہد جاہلیت سے دور فاروقی تک اہل عجم کے بنائے ہوئے سکے دراہم استعمال ہوتے تھے۔ اس سے مارکیٹ پر ان کی بالادستی بھی ہوتی تھی اور وہ کھوٹ بھی ملا دیتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ اپنا مستقل ٹکسال قائم کریں اور اونٹ کے چمڑے کے سکے ہوائیں' لوگوں نے مشورہ دیا کہ اس سے اونٹ ختم ہو جائیں گے۔ آپ نے اس پر عمل نہ کیا' بلکہ ایرانی شکل کے درہم ہوائے' جن پر "الحمد للہ" اور "لا الہ الا اللہ" تحریر کر کے اسلامی سکے کا اجراء کیا۔ ان کے اوزان بھی یکساں کر دیئے[۳]۔

ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی کے بقول "حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں بکثرت فتوحات ہوئیں' جن کے نتیجے میں مسلمانوں پر مال و دولت کے خزانے کھل گئے اور مسلمانوں کو ایسی تہذیبوں اور تمدنوں سے سابقہ پڑا' جن سے وہ پہلے واقف نہ تھے' لہٰذا ناگزیر ہوا کہ خلیفہ دوم ان نئے تہذیبی اور ارتقائی حالات کا مقابلہ ایسے تہذیبی و ارتقائی اصولوں سے کریں' جو شریعت اسلامی اور اس کے عمومی اصولوں سے ماخوذ ہوں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زندگی کے تمام پہلوؤں میں خواہ وہ سیاسی ہوں یا اقتصادی' معاشرتی ہوں یا قانونی ایسی ترقی پذیر تبدیلیاں کر دیں' جو ایک طرف امت مسلمہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں کو بروئے کار لائیں اور دوسری طرف معاشرے کو اسلام کے بنیادی اصولوں سے دور بھی نہ ہونے دیا۔ آپ نے شہر آباد کئے اور مختلف علاقوں کے قاضیوں کے نام فرامین و احکام جاری کئے' جو آج کل بھی قاضیوں' قانون دانوں اور حکومت کے مالی امور کے ماہرین کیلئے رہنما اصولوں کا کام دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ریاست کا مالی نظام قائم کیا' محکموں کے ریکارڈ (دواوین) مرتب کئے۔ یک ٹکس اور مضبوط اقتصادی نظام کی عمارت استوار کی اور لوگوں کی اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ استوار کیا۔ حضرت عمرؓ نے اسلامی حکومت کی تعمیر میں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی روح کو کمال درجہ کی مہارت کے ساتھ سمویا' بلکہ انہوں نے اس عمارت میں ایسی زرنگاری کی' جس نے اسے مزید چکاچوند بخش دی[۴]۔

---

(۱) جوزی ا:۷۶ (۲) ایضاً ۹۹ (۳) شبیہ ۲۷۹ ... ص ۶۴۲ (۴) ... ۸۰

۲۔انجذاب(Assimilation)

فاروق اعظمؓ کی انتظامی حکمت عملی کا ایک اور اہم نقطہ انجذاب ہے۔ آپ ایڈمنسٹریشن میں تنگ نظری' محدودیت اور جمود کے قائل نہیں تھے۔ آپ کی اس سوچ اور رویے نے اسلام کو ایک جاندار' متحرک' ٹھوس' قابل عمل اور دلکش جدید تہذیبی قوت کے طور پر ایسے علاقوں میں متعارف کرایا جو قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں کی آماجگاہ تھے۔ مثلاً عراق' ایران' شام' فلسطین' مصر وغیرہ یہ ممالک عربوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور خوشحال تھے۔ ان کو اپنے مستحکم سیاسی نظاموں پر فخر تھا اور عہد عمرؓ تک قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں سپر پاور کی حیثیت رکھتی تھیں اور حجاز کے زرخیز علاقوں پر قابض تھیں اور ان کا سیاسی اثر و نفوذ عہد رسالت میں ایک چیلنج بنا رہا۔ عہد صدیقیؓ میں اٹھنے والے طوفانِ بغاوت و ارتداد کے پیچھے بھی ان کی شہ اور منصوبہ بندی شامل تھی۔ عہد فاروقیؓ میں جب اسلامی لشکروں کے جذبہ جہاد اور فاروق اعظمؓ کی اعلیٰ حکمت عملی اور منصوبہ بندی اور اللہ کی تائید و نصرت سے مغلوب ہو کر مسلمانوں کی قلمرو میں شامل ہوئے' تو ضرورت اس بات کی تھی کہ وہاں کے سالہا سال کے تجربات اور انتظامی طور طریقوں سے استفادہ کیا جائے اور ان میں سے جو صحیح ہوں اور اسلامی مزاج سے مطابقت رکھتے ہوں انہیں اسلامی فریم ورک میں جذب کیا جائے۔ آپ نے نہایت فراخدلی سے یہ قدم اٹھایا۔ یہ اجنبی نظاموں کی نقالی نہیں تھی' بلکہ انجذاب تھا کیونکہ آپ نے مرعوبیت کے ساتھ انہیں بلا چون چرا اختیار نہیں کیا' بلکہ پوری طرح چھان پھٹک کی کہ کہیں وہ کتاب و سنت کے اصولوں سے متصادم تو نہیں۔ اچھے عناصر کو اسلامی سانچوں میں ڈھال کر ایک نیا انتظامی ماڈل تشکیل دیا' جو شریعت کے مقاصد اور عوام کی فلاح و بہبود کو حاصل کرنے کیلئے زیادہ مفید اور کارگر ثابت ہوا' پھر جن لوگوں پر ان کا اطلاق ہوتا تھا' ان کیلئے بھی زیادہ مانوس اور قابل قبول تھا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسلام کے سیاسی اقتدار کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور یہی اس کا فطری طریقہ تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا یہ عمل ہر دور کے مسلمانوں کیلئے یہ رہنمائی فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں اور زمانوں کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے عالمی نظاموں کے انتظامی آلات و اوزار سے استفادہ کر سکتے ہیں اور ایسے انتظامی ادارات اور نظامات وضع کر سکتے ہیں' جو اسلام کے مقاصد اور مزاج و روح سے ہم آہنگی رکھتے ہوئے اور اس کے مجموعی فریم ورک کا جزو بننے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں اسلام کی طاقتور روحانی و اخلاقی روح شامل کی جائے۔ انہیں اسلامی اقدار و تشخص کا تابع کیا جائے اور اسلامی مقاصد کا خدمت گزار بنایا جائے۔ اس طرح آج بھی مسلمان مغلوبیت سے غلبے اور مرعوبیت سے خود اعتمادی کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ نے نئے فتح ہونے والے ممالک کی انتظامی تقسیم کو زیادہ تر حسب سابق برقرار رکھا' چنانچہ عراق میں نوشیرواں کے عہد سے خراسان' آذربیجان' فارس کے نام سے جو صوبے تھے اور ان کے تحت جو اضلاع تھے' انہیں ویسے ہی رہنے دیا۔ فلسطین کو ضرورت کے تحت دو صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کا صدر مقام ایلیا اور دوسرے کا رملہ کو قرار دیا اور مصر کو بھی بالائی اور زیریں دو صوبوں میں تقسیم کر کے الگ الگ گورنر مقرر کئے[1]۔ مروجہ انتظامی و سیاسی تقسیم کو جزوی رد و بدل کے ساتھ قائم رکھنے میں بھی بہت بڑی حکمت و مصلحت یہ تھی کہ مانوس طریقوں کو اپنے فریم ورک میں جذب کیا جائے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بڑا لشکر تیار کر کے روانہ کیا۔ اہل لشکر اور ان کے اہل خاندان کو مصارف بھی تقسیم فرما دیئے۔ اس وقت آپ کے پاس ہرمزان (ایران کا ایک مدبر اور وہاں کے ایک علاقے کا بادشاہ جو گرفتار ہو کر آیا اور مسلمان ہو گیا تھا) بیٹھا تھا۔ اس نے عرض کیا کہ اگر کوئی فوج سے نکل کر گھر بیٹھ جائے تو سپہ سالار کو کیسے معلوم ہو گا۔ آپ ان کیلئے دیوان بنائیں' پھر اس نے دیوان کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔ چنانچہ آپ نے رجسٹروں کے قیام کا ارادہ فرمایا تو اس سلسلے میں اہل حل و عقد

---

(٦) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو شبلی II: ۱۹۴۔

سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے بھی یہی مشورہ دیا اور کہا میں نے شام میں دیکھا ہے کہ وہاں کے بادشاہوں نے دفاتر قائم کر رکھے ہیں اور فوج کی بھی وہاں باقاعدہ تنظیم ہوتی ہے۔ آپ بھی اگر دفاتر قائم کر دیں تو مناسب ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور قریش کے نوجوانوں میں سے عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم کے ذمہ یہ کام سپرد کیا کہ وہ لوگوں کے نام ان کے مراتب کے لحاظ سے لکھیں[۱]۔ فاروق اعظمؓ نے انجذاب کیلئے جو اقدامات کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ نے عملی زندگی سے متعلق مروجہ طور طریقے جن میں کوئی خرابی نہیں تھی برقرار رکھے چنانچہ آپ کے مقرر کردہ معروف جج قاضی شریحؒ نے آپ کے عہد میں سوت کاتنے والوں میں اعلان کیا "سنتکم بینکم" یعنی تمہارا دستور و رواج تم میں باقی رکھا جائے گا[۲]۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف علاقوں کے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں بیرونی سیاسی و تہذیبی غلبے کے خلاف عمومی طور پر نفرت و بغاوت کے شدید احساسات پروان نہ چڑھ سکے۔ یہ بات انجذاب میں مدد و معاون ثابت ہوئی۔ آپ نے اس مقصد کے حصول کیلئے ان کے بے شمار مروجہ انتظامی طریقے بحال رکھے کیونکہ وہ لوگ ان سے سالہا سال سے مانوس تھے۔ ان سے نظمیہ عامہ کی کارکردگی زیادہ موثر اور بہتر ہو سکتی تھی۔ مولانا شبلی نعمانی نے بالکل بجا لکھا ہے "جہاں تک ہم کو معلوم ہے کہ عراق کے سوا حضرت عمرؓ نے کسی صوبے کی پیمائش نہیں کرائی' بلکہ جہاں جس قسم کا بندوبست تھا اور بندوبست کے جو کاغذات پہلے سے تیار تھے' ان کو اسی طرح قائم رکھا"[۳]۔ "یہاں تک کہ دفتر کی زبان تک نہیں بدلی' یعنی جس طرح اسلام سے پہلے عراق و ایران کا دفتر فارسی میں' شام کا رومی میں' مصر کا قبطی میں تھا' حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی اسی طرح قائم رہا۔ خراج کے محکمے میں جس طرح قدیم سے پارسی' یونانی اور قبطی ملازم تھے بدستور بحال رہے تاہم حضرت عمرؓ نے قدیم طریقہ انتظام میں جہاں کچھ غلطی دیکھی اس کی اصلاح کر دی"[۴]۔

آپ نے سواد (عراق) کی زمینوں کو انہیں کے پاس رہنے دیا کیونکہ وہ کاشتکاری میں مہارت رکھتے تھے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہوا' دوسرا یہ کہ ان کے تجربات سے استفادے کا موقع ملا' تیسرا یہ کہ ان پر یہ احسان تھا کیونکہ ان کے روزگار کا ذریعہ برقرار رہا' وہ ریاست کے وفادار بن گئے اور اصل ملکیت بھی حکومت کے پاس رہی۔ اسی طرح جزیہ کی وصولی کے طریق کار کو بھی نہایت سہل اور سادہ رکھا گیا' جو انجذاب کیلئے نہایت مناسب تھا۔ روایت میں آتا ہے کہ ان پر چار درہم ماہانہ جزیہ مقرر کیا گیا۔ ہر بستی کے قابل جزیہ باشندوں کی تعداد کے مطابق رقم کا حساب لگایا اور وہاں کے زمیندار کو واجب الادا رقم بتا دی۔ پھر ان سے کہا کہ اب جاؤ اور اس رقم کو اپنی اپنی آبادی میں تقسیم کر لو۔ راوی کہتا ہے کہ عاملین کا دستور یہ تھا کہ تمام گاؤں والوں کے ذمے واجب الادا جزیہ کا ذمہ دار اس گاؤں کے زمیندار کو بناتے اور اس سے وہ رقم وصول کرتے[۵]۔ اس طریق کار سے ایک طرف تو وہاں کے مقامی لوگوں اور ان کے بااثر نمائندگان کو حکومت کے انتظامی معاملات میں شراکت کا احساس پیدا ہوا اور دوسری طرف بلا انتظامی اخراجات سو فیصد ٹیکسوں کی وصولی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

علاوہ ازیں ہر مسلمان ہونے والے پر جزیہ کے ساقط ہونے کے اسلامی اصولوں کی کارفرمائی سے بعض عمال نے یہ محسوس کیا کہ لوگ محض جزیہ سے بچنے کیلئے مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں' جس پر اس طرح کا شبہ ہوتا تھا اس کا جزیہ معاف نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس پالیسی کو ختم کر دیا کیونکہ ابتدائی طور پر ان کا اس مقصد کیلئے اسلام میں داخل ہونا بالآخر انہیں اسلامی معاشرے میں جذب کرنے کا سبب بن سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ روایت میں ہے کہ عجمیوں میں سے ایک شخص نے اسلام قبول کر لیا مگر اس سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "یا امیر المومنین میں مسلمان ہو چکا ہوں پھر بھی مجھ سے جزیہ وصول کیا جا رہا ہے۔" حضرت عمرؓ نے کہا "ہو سکتا ہے تم جزیہ سے بچنے کیلئے مسلمان ہو گئے ہو۔" اس نے کہا "تو کیا اسلام مجھے اس سے نجات نہیں

(۱) ... ۱۹۹ (۲) محمد حمایی، ۳۰۱ (۳) شبلی ۲۰۹:II (٤) ماوردی ۳، ۲۰۲ شبلی II، ۲۰۹ (۵) عبید: ۵٤

دیا سکتا؟" حضرت عمرؓ نے کہا "کیوں نہیں؟" پھر اسے پروانہ لکھ دیا کہ اس سے جزیہ وصول نہ کیا جائے[۱]۔" آپ نے تہذیبی وثقافتی انجذاب کیلئے ہمہ پہلو انتظامی آلہ نفوذ (Penetration) کا طریقہ اختیار کیا۔ اس سلسلے میں اعلیٰ اسلامی اقدار کو بروئے کار لا کر غیر مسلموں اور غیر عربوں کے دلوں میں جگہ بنائی' جس کے بہت جلد گہرے اور وسیع اثرات برآمد ہونا شروع ہوگئے' جنہوں نے پوری مملکت کے امن واستحکام میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے غیر مسلموں سے جزیہ وخراج کی وصولیوں میں نہایت نرم اور عادلانہ سلوک کیا جیسا قبل کی تاریخ میں کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ جبیر بن نفیر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے پاس کثیر مال آیا' تو انہوں نے کہا "تم لوگوں نے لوگوں پر بے جا دباؤ ڈال کر انہیں تباہ کر دیا ہوگا۔" اس پر مال لانے والے بولے "نہیں! اللہ کی قسم ہم نے ان کی سہولت اور خوش دلی کے ساتھ یہ کچھ ان سے وصول کیا ہے۔" آپ نے پوچھا "بغیر کوڑے مارے اور بغیر لٹکائے؟" انہوں نے جواب دیا "جی ہاں!" اس پر آپ نے فرمایا "الحمد للہ! جس نے مجھے اور میرے دور حکومت کو رعایا پر مظالم اور تشدد سے محفوظ رکھا[۲]۔"

یک مرتبہ ایک عامل سعید بن عامر سے خراج کی رقم تاخیر سے لانے پر جواب طلب کیا' تو انہوں نے کہا "آپ نے ہمیں حکم دے رکھا ہے کہ کاشتکاروں سے چار دینار سے زائد وصول نہ کریں چنانچہ ہم بھی اس سے زیادہ ان سے مطالبہ نہیں کرتے۔ البتہ ہم نے انہیں فصلیں کٹنے تک مہلت دے دی ہے۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "جب تک میں زندہ ہوں تمہیں اس عہدے سے معزول نہیں کروں گا[۳]۔" عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حذیفہ بن الیمان کو دجلہ کے اس پار اور عثمان بن حنیف کو ادھر کے علاقے پر مامور کیا تھا۔ جب یہ دونوں آپ کے پاس واپس آئے تو آپ نے دریافت فرمایا "تم لوگوں نے زمین پر یہ کس حساب سے عائد کیا ہے؟ شاید تم نے اپنی عملداری کے باشندوں پر اتنا بوجھ ڈال دیا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ حذیفہ نے جواب دیا "میں نے کچھ فاضل چھوڑ دیا ہے۔" عثمان نے کہا "میں نے دوگنا چھوڑ دیا ہے اگر چاہتا تو اسے بھی وصول کر لیتا۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر میں عراق کی بیواؤں کیلئے زندہ رہا تو انہیں اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد کسی امیر کی محتاج نہیں رہیں گی[۴]۔" اس طرح آپ نے اپنی نظریہ عامہ کو نرمی' خدمت' کفالت اور ہمدردی واحسان کے کاموں میں لگا دیا اور ان کی نگرانی کی اور بعد والے خلیفہ کو بستر مرگ پر یہ وصیت کرنا ضروری سمجھا کہ "اہل ذمہ سے کئے گئے معاہدوں کو پورا کیا جائے' ان کی برداشت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالا جائے اور ان کے پیچھے ان کا پورا دفاع کیا جائے[۵]۔" آپ نے ذاتی طور پر عمل کر کے خدمت وکفالت کی درخشندہ مثالیں قائم کیں۔ دور خلافت میں دمشق کے علاقوں میں سے جابیہ کے مقام سے گزرے تو دیکھا کہ وہاں نصاریٰ کی ایک جماعت جذام میں مبتلا ہے' اسے دیکھ کر حکم دیا کہ صدقات میں سے انہیں دیا جائے اور ان کی باقاعدہ معاشی امداد جاری کی جائے[۶]۔

جابیہ میں ہی قیام کے دوران ایک ذمی شخص حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور انہیں بتایا کہ مسلمان اس کے انگور تیزی سے لے جا رہے ہیں' چنانچہ آپ اس طرف نکل گئے وہاں اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو دیکھا کہ اپنی ڈھال میں انگور بھرے اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا "ارے تو بھی یہ حرکت کر رہا ہے؟" اس نے جواب دیا "امیر المومنین! ہم فاقہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔" چنانچہ حضرت عمرؓ واپس ہو گئے اور یہ حکم دیا کہ انگور والے کو اس کے انگوروں کی قیمت دے دی جائے[۷]۔ آپ کے عہد کی ایسی بے شمار مثالیں ہیں' جو اسلامی حکومت کے عوام میں نفوذ اور انہیں اسلامی تہذیب وثقافت میں جذب کرنے کا باعث بنیں اور پھر آپ کی انتظامی پالیسی کے یہی اصول بعد کے ادوار میں بھی اسلامی نظریہ عامہ کیلئے رہنمائی کا کام کرتے رہے۔ ہر نیک صالح حکمران نے ان کو عملی جامہ پہنانے کو اپنا فرض اولین سمجھا۔ اس کا اندازہ اس روایت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ابو جعفر جسر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وہ خط دیکھا ہے جو انہوں نے

---

(۱) عبید: ۵۰ (۲) عبید: ۴۶ (۳) ایضاً (۴) یوسف: ۳۷ صفحہ ۲۳۷ (۵) ایضاً (۶) بلاذری: ۱۳۵ (۷) عبید: ۱۰۵

عدی بن ارطاۃ کو بھیجا تھا۔ یہ خط بصرہ میں ہمیں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا "اما بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جزیہ لینے کا جو حکم دیا ہے وہ صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو اسلام قبول کرنے سے گریز کر کے سرکشی اور کھلے خسارے کو منظور کرتے ہوئے کفر اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا تم ان میں سے جو جزیہ کا بار اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے اس پر جزیہ لگا دو کیونکہ اسی میں ایک طرف تو مسلمانوں کا معاشی مفاد ہے اور دوسری طرف انہیں اپنے دشمنوں کے مقابلے میں قوت حاصل ہو گی اور دیکھو جو تمہارے علاقے میں عمر رسیدہ کمزور اور کمائی سے لاچار ذمی ہوں ان کا بیت المال سے مناسب وحسب ضرورت وظیفہ مقرر کر دو اور اگر کسی مسلمان کا غلام بوڑھا ہو گیا ہو اس کی قوتیں جواب دے چکی ہوں اور وہ کسب معاش کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس مسلمان آقا کا فرض ہے کہ وہ اس کی گزر بسر کا بندوبست کرے' تا آنکہ موت یا آزادی ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیں۔ میں یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ مجھے امیر المومنین حضرت عمرؓ کے متعلق یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ ایک ایسے بوڑھے ذمی کے پاس سے گزرے جو دربدر لوگوں سے بھیک مانگ رہا تھا تو انہوں نے فرمایا "ہم نے تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا' تیری جوانی میں تو ہم تجھ سے جزیہ وصول کرتے رہے پھر بڑھاپے میں تجھے اس طرح دردر کا بھکاری بنا کر چھوڑ دیا۔" چنانچہ انہوں نے بیت المال سے اس کیلئے وظیفہ جاری کر دیا [۱]۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ اسے گھر لے گئے اور اسے اپنی طرف سے کچھ دیا۔ پھر بیت المال کے خازن کو بلا کر کہا کہ اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو کیونکہ یہ بات انصاف سے بعید ہے ان کی جوانی میں ان سے جزیہ کھائیں اور بڑھاپے میں بے سہارا چھوڑ دیں۔ پھر آپ نے اس جیسے آدمیوں کا جزیہ ساقط کر دیا [۲]۔ "دور جدید میں اسلامی ممالک کی حکومتوں اور بیوروکریسی اور پبلک ایڈمنسٹریشن سے وابستہ اہل کار مختلف علاقوں' زبانوں' نسلوں اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والے عوام کو چالاکیوں' چالبازیوں اور خوف واستبداد کی روشوں کے ذریعے کنٹرول کرنے کے بجائے حضرت عمر فاروقؓ کے اختیار کیے ہوئے طریقوں پر عمل کر کے وہ حیران کن نتائج حاصل کر سکتے ہیں جو آج سے چودہ صدیاں پہلے حاصل ہوئے۔ آپ کے طرز عمل اور پالیسی میں نفوذ وانجذاب کی حکمت عملی نہایت کارگر ثابت ہوتی تھی۔ آپ کی ایڈمنسٹریشن کا مجموعی تاثر اتنا اچھا تھا کہ مستقبل کے بارے میں خود مقابلہ کرنے والے لوگ بھی اتنا خوفزدہ نہیں ہوتے تھے کہ اپنا تن' من' دھن سب کچھ قربان کر دینا ضروری خیال کرتے ہوں۔ وہ کسی وقتی مفاد' تعصب یا سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے میدان جنگ میں آتے تو ان کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ مصالحت ہو جائے۔ آپ کا سپہ سالاروں کو یہ حکم تھا کہ جب بھی ایسی پیش کش ہو' اسے معقول شرائط کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ اگر کوئی اسلام قبول کرنا چاہے' تو آزادی کے ساتھ انہیں اس کا بھی موقع دیا جائے' تاکہ وہ اسلامی تہذیب ومعاشرت میں پوری طرح جذب ہو سکے۔

زیاد بن جزء زبیدی کی روایت میں آتا ہے کہ فتح مصر کے دوران سکندریہ کے حاکم نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ پیغام بھیجا کہ "اے اقوام عرب! میں تم سے زیادہ قابل نفرت قوموں یعنی اہل فارس وروم کو جزیہ ادا کرتا تھا۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو جزیہ ادا کرنے کیلئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ میرے علاقے کے جنگی قیدی لوٹا دیں [۳]۔" انہوں نے فاروق اعظم کو اس سے مطلع کیا تو آپ نے لکھا "تم حاکم سکندریہ کے سامنے یہ تجویز رکھو کہ وہ جزیہ ادا کرے مگر جو جنگی قیدی تمہارے قبضے میں ہیں انہیں اختیار دیا جائے گا کہ وہ اسلام قبول کریں یا اپنی قوم کے مذہب کو برقرار رکھیں' جو مسلمان ہو جائے گا وہ مسلمانوں میں شامل ہو گا۔ اس کے حقوق وفرائض' نہی جیسے ہوں گے' مگر جو اپنی قوم کے مذہب پر برقرار رہے گا اس پر وہی جزیہ مقرر کیا جائے گا' جو اس کے ہم مذہبوں پر مقرر ہو گا۔ البتہ وہ جنگی قیدی جو سرزمین عرب میں پہنچ گئے ہیں اور مکہ' مدینہ اور یمن کے علاقوں میں جا کر الگ الگ ہو گئے ہیں ان کو واپس کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ ہم ایسے معاملے پر مصالحت نہیں کر سکیں گے' جس کو ہم پورا نہ کر سکیں۔"

---

(۱) عبید ۹۸ (۲) یوسف ۱۲۶ (۳) طبری ۵/۲۶۰۱' ابن کثیر ۷/۹۹۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے حاکم سکندریہ کو حضرت عمرؓ کے خط کے مضمون سے مطلع کیا تو اس نے یہ تجویز منظور کر لیں لہٰذا جو جنگی قیدی ہمارے قبضے میں تھے نہیں ہم نے اکٹھا کر لیا درویں تمام عیسائی افراد بھی جمع ہو گئے۔ ہم ان میں سے ایک ایک آدمی کو لاتے تھے اور اسے اسلام یا عیسائیت میں سے کسی ایک مذہب کو اختیار کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ جب کوئی اسلام قبول کرتا تھا' تو اس وقت ہم ایسا نعرۂ تکبیر بلند کرتے تھے' جو اس نعرے سے زیادہ زوردار ہوتا تھا' جبکہ ہم کوئی گاؤں فتح کرتے تھے۔ قبول اسلام کے بعد ہم اسے اپنے حلقے میں شامل کر لیتے تھے۔ جب کوئی عیسائیت کو ترجیح دیتا تھا تو عیسائی بہت فخر کرتے تھے اور انہیں اپنے حلقے میں شامل کر لیتے تھے۔ ہم اس وقت اس پر جزیہ عائد کر دیتے تھے تاہم اس موقع پر ہمیں بہت رنج ہوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہمارا کوئی آدمی نکل کر ان کی طرف چلا گیا ہو[1]۔"

اس روایت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا اور آپ کی نظیمہ عامہ کا اصل مقصد علاقوں پر قبضہ کرنا وہاں کے لوگوں کو سیاسی و انتظامی طور پر اپنا محکوم بنانا اور ان کے مادی و معاشی وسائل کو اپنے قبضے میں لینا نہیں ہوتا تھا' بلکہ انہیں حلقہ بگوش اسلام کرنا ہوتا تھا۔ آپ کی فوج کا ہر ہر سپاہی اسی جذبے سے سرشار ہوتا تھا۔ ان سے ممکن عمل معاہدہ کرنا' انہیں ہر طرح کی فکری و مذہبی آزادی دے کر قریب کرنا اور اسلام قبول کرنے کے اہم محرکات' جزیہ و خراج سے نجات اور مسلمانوں ہی کی طرح کے حقوق و فرائض کی فراہمی ایک مستقل وطیرہ تھا' جس کے نہایت خوشگوار اثرات رونما ہوتے تھے۔ اس واقعے کا مصر کے بقیہ علاقوں کی فتوحات پر بھی مثبت اثر پڑا' یہاں تک کہ اہل مصر نے اپنے بادشاہ سے کہا "آپ اس قوم سے جنگ کرنے کا قصد کر رہے ہیں جنہوں نے قیصر و کسریٰ کو شکست دی اور ان کے ملک پر قابض ہو گئی ہے۔ آپ ان سے مصالحت و معاہدہ کر لیں' نہ تو آپ ان سے مقابلہ کریں اور نہ ہی ہمیں ان کے مقابلے کیلئے بھیجیں۔" اس نے بات ماننے سے انکار کر دیا اور مسلمانوں سے جنگ کا فیصلہ کیا۔ مسلمانوں نے جب شہر "عین شمس" کا محاصرہ کر لیا تو اہل شہر نے دروازہ کھول دیا اور مصالحت کیلئے حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس پہنچ گئے[2]۔ ان سے جو صلح نامہ کیا گیا اس کے مندرجات حسب ذیل ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ عمرو بن العاصؓ نے اہل مصر کو جان و مال اور مذہب کی پناہ دی ہے۔ ان کے گرجے' صلیبیں اور خشکی و تری کے تمام مقامات محفوظ رہیں گے بشرطیکہ وہ جزیہ ادا کریں اور مجتمع ہو کر یہ صلح نامہ قبول کر لیں۔ ان سے انتہائی آمدنی پانچ کروڑ کے قریب وصول کی جائے گی۔ اگر ان میں سے کوئی جزیہ دینے سے انکار کرے گا' تو ان سے جزیہ وصول نہیں ہو گا' مگر اس کی حفاظت کی ذمہ داری سے ہم بری ہوں گے۔ اگر ان کی آمدنی مقررہ رقم سے کم ہوئی تو اسی قدر اندازے سے وصولی کی رقم بھی کم کر دی جائے گی۔ روم اور حبشہ کے باشندوں میں سے جو کوئی اس صلح نامہ میں شامل ہونا چاہے' تو اس کے حقوق فرائض بھی اہل مصر کے حقوق و فرائض کے برابر ہوں گے' جو اس سے انکار اور دوسری جگہ جانا چاہے تو اسے مکمل پناہ دی جائے گی تاآنکہ وہ امن کے مقام پر پہنچ جائے اور ہماری سلطنت سے نکل جائے۔ جو اس معاہدے میں لکھا گیا ہے اس کے ذمہ دار اللہ' اس کے رسول' خلیفہ امیر المومنین اور تمام مسلمان ہیں۔ اہل حبشہ میں سے جو اس معاہدے کو قبول کریں تو ان کیلئے یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اس قدر افراد اور گھوڑوں سے مدد کریں نیز وہ جنگ نہ کریں اور درآمد و برآمد کی تجارت نہ روکیں[3]۔"

اس معاہدے میں ایک طرف تو ہر طرح کے مذہبی معاشرتی' سیاسی اور معاشی حقوق کی حفاظت کی ضمانت موجود ہے' دوسری طرف کم آمدنی کی صورت میں ان سے جبر وصولی کے بجائے رعایت بھی کی گئی ہے اور پھر معاہدہ تسلیم نہ کرنے والوں کو بھی بحفاظت چلے جانے کی سہولت بھی عطا کر دی گئی ہے اور سب سے بڑی حکمت افروز شق یہ بھی ہے کہ اس عادلانہ اور منصفانہ معاہدے میں جو بھی شامل ہونا چاہے اس کو آزادانہ اختیار دیا گیا ہے۔ نہیں بھی سارے حقوق کی فراہمی کا عندیہ دیا گیا

(۱) طبری ۱۰۵/۴ (۲) طبری ۱۰۸/۴' کثیر ۹۹/۷ (۳) طبری ۱۰۹/۴' کثیر ۹۸/۴۔

تاکہ وہ مقابلے پر آنے کے بجائے مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگی و تعاون کو ترجیح دیں اور مستقل طور پر اسلامی تہذیب کا حصہ بن جائیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے فتوحات فاروقی کے اصلی اسباب میں سے بجا طور پر ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی بدولت جو جوش، عزم، استقلال، بلند حوصلگی، دلیری پیدا ہوگئی تھی اور جس کو حضرت عمر فاروقؓ نے اور زیادہ قوی اور تیز کر دیا تھا، روم اور فارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اس کی ٹکر نہیں تھا سکتی تھیں، البتہ اس کے ساتھ اور چیزیں بھی مل گئی تھیں، جنہوں نے فتوحات میں نہیں، بلکہ قیام حکومت میں مدد دی۔ اس میں سب سے مقدم چیز مسلمانوں کی راست بازی اور دیانتداری تھی۔ جو ملک فتح ہو جاتا تھا وہاں کے لوگ مسلمانوں کی راست بازی کے اس قدر گرویدہ ہو جاتے تھے کہ باوجود اختلاف مذہب کے ان کی سلطنت کا زوال نہیں چاہتے تھے۔ یرموک کے معرکے میں مسلمان جب شام کے اضلاع سے نکلے تو تمام عیسائی رعایا نے پکارا کہ "خدا تم کو پھر اس ملک میں لائے" اور یہودیوں نے تورات ہاتھ میں لے کر کہا "ہمارے جیتے جی قیصر اب یہاں نہیں آسکتا[۱]"۔

۳۔ مطابقت (Endogeneity):

اس سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی علاقے میں سیاسی و انتظامی طور طریقے وہاں کے مقامی ثقافتی ماحول کے تناظر میں اختیار کئے جائیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے نظریہ و عمل کا ایک اور پہلو ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ نظم عامہ کا ایک ایسا ڈھانچہ پروان چڑھایا جائے جو وہاں کے سماجی، ثقافتی، علاقائی اور روایتی حالات سے مطابقت رکھتا ہو (دور جدید میں مینجمنٹ کے اس طریقے کو Ecological Approach کہا جاتا ہے[۲]) چنانچہ آپ نے عشور کا نظام نافذ کرتے وقت علاقائی رواج کو سامنے رکھا اور نبط اور قطنیہ کے لوگ مدینے کے بازار میں جب اشیاء لاتے تو ان سے عہد جاہلیت سے مروجہ رواج کے مطابق دسواں حصہ وصول کرنے کا طریق کار برقرار رکھا اور گیہوں اور تیل کا بیسواں حصہ لیتے تھے[۳]۔ اس کی ایک اور مثال وہ واقعہ ہے جسے عبداللہ بن قیس نے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں شامل تھا جو حضرت عمرؓ کی شام میں آمد پر ان کا استقبال کر رہے تھے۔ ابھی حضرت عمرؓ چل رہے تھے کہ اذرعات کے باشندوں میں سے کچھ کھیل کرتب کرنے والے لوگوں نے تلواروں اور گلدستوں سے ان کا استقبال کرنا شروع کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "بس کرو، ان کو روک دو اور انہیں واپس کر دو۔" اس پر حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کیا "امیر المومنین یہ تو ان عجمیوں کا دستور ہے اگر آپ انہیں اس سے روکیں گے تو یہ خیال کریں گے کہ آپ ان سے کئے ہوئے معاہدہ صلح میں کچھ خلل ڈالنا چاہتے ہیں۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "انہیں رہنے دو (اس علاقے میں) عمرؓ اور آل عمرؓ ابوعبیدہؓ کے زیر فرمان ہیں[۴]۔"

امام ابو عبید القاسم کے بقول کھیل کرتب والی یہ جماعت اپنے علاقے میں آنے والے حاکموں اور بادشاہوں کا استقبال اسی انداز میں کرتی تھی، حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند کرتے ہوئے روک دیا، لیکن پھر بحال کر دیا۔ اس لئے کہ یہ رواج صلح سے پہلے ان میں رائج تھا، یہی حال ان کے دیگر رسم و رواج اور دستور وغیرہ نیز گرجوں اور معبدوں کا ہوگا جن کی موجودگی میں صلح کی گئی ہو، لہٰذا کسی کیلئے یہ عہد شکنی روا نہیں[۵]۔ اپنے آپ کو اس علاقے میں حضرت ابوعبیدہؓ کے زیر فرمان رکھنے میں اصل مقصود یہی تھا کہ وہ اس علاقے کی روایات و ثقافت کو سامنے رکھتے ہوئے ایڈمنسٹریشن کا جو اسلوب اختیار کریں گے، وہی اسلامی مقاصد کے حصول میں زیادہ ممد و معاون ہوگا کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ انتظامیہ کے فرائض میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ اپنے علاقے کے لوگوں کے جذبات و احساسات کا خیال رکھیں تاکہ انہیں ان کا اعتماد حاصل ہو اور وہ ان میں نفوذ کر کے رغبت و خوش دلی سے حکومتی احکام کی اطاعت و فرمانبرداری پر تیار کر سکیں۔ انتظامی ضرورت کے تحت حالات سے مطابقت اور لوگوں کے جذبات و احساسات کو سامنے رکھتے ہوئے ریاست کے وسیع تر مفادات کیلئے اہم فیصلے کرنے کی ایک نمایاں مثال ہو تغلب

(۱) سیرۃ II ۱۸۳ (۲) Buraey:231 (۳) ملاحظہ ۲۸۱ (۴) عبید: ۱۵۱ بلاذری: ۱۴۵ (۵) عبید: ۱۵۱۔

کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ ہے۔ زرعہ بن نعمان سے روایت ہے کہ جب حضرت عمر فاروقؓ نے بنی تغلب سے جزیہ وصول کرنا چاہا تو وہ دیگر علاقوں میں منتشر ہونے لگے۔ میں نے ان کے بارے میں حضرت عمرؓ سے گفتگو کرنی چاہی اور عرض کیا "اے امیر المومنین! بنی تغلب عرب ہیں اور جزیہ کے نام سے گھبراتے ہیں۔ یہ لوگ کھیتی باڑیاں اور مویشیوں کے علاوہ کچھ مال نہیں رکھتے البتہ یہ اپنے دشمنوں کو رک پہنچانے والے لوگ ہیں لہٰذا آپ ان سے اپنے دشمنوں کو تقویت نہ پہنچائیے۔" چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس شرط پر ان سے صلح کرلی کہ "میں ان سے صدقہ کا دوگنا وصول کروں اور ساتھ ہی ان سے یہ شرط بھی رکھی کہ اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں[1]۔" امام ابو عبید نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا کہا ہے "ہمارے خیال میں انہوں نے جزیہ کا نام اڑا کر یہ صورت اس لئے جائز رکھی کہ انہیں بنو تغلب کی طرف سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ جزیہ کے نام سے بیزاری اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ اگر انہیں مجبور کیا گیا تو وہ رومیوں سے جا ملیں گے اور اسلام کے خلاف ان کے مددگار بن جائیں گے۔ پھر ان پر یہ حقیقت بھی منکشف تھی کہ اگر ان سے واجبی جزیہ لینے کے ساتھ ہی اتنی رعایت کردی جائے کہ اس کا نام (جزیہ) باقی نہ رکھا جائے تو اس سے مسلمانوں کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ بنابریں انہوں نے ان کیلئے جزیہ کا لفظ اڑا دیا اور اس کی واجب الادا رقم صدقہ کے نام سے لینے لگے جو مسلمانوں سے وصول کی جانے والی زکوٰۃ سے دوگنی ہوتی تھی۔ اس طرح ایک طرف تو ان کے مخالفین سے جاملنے کے اندیشے کا سدباب ہو گیا اور دوسری طرف ان کے ذمہ مسلمانوں کے جو واجب الادا حقوق تھے وہ بھی پورے پورے وصول ہو گئے اور اس فیصلے میں حضرت عمرؓ صائب الرائے اور اپنی جگہ بالکل حق بجانب تھے[2]۔"

آپ کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے کہ "اللہ کی قسم وہ (حضرت عمرؓ) نہایت مستعد اور ماہر منتظم اور بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔ وہ پیش آنے والے معاملات کیلئے ان کے مطابق حل پیدا کر لیتے تھے۔" چنانچہ ان کا یہ عمل بھی ان کے بے شمار محاسن اور حالات کے تقاضوں کے مطابق مسائل کے حلوں میں سے ایک تھا جو وہ پیدا کر لیتے تھے[3]۔ حضرت عمر فاروقؓ کی بنو تغلب کے سلسلے میں سب سے بڑی رعایت یہ تھی کہ انہوں نے بنو تغلب کے عرب ہونے کے باوجود ان سے اموال کا ایک حصہ لے کر جاں بخشی کردی اور صرف اولاد کو عیسائی نہ بنانے کی شرط رکھی حالانکہ عربوں کے بارے میں عام قانون یہ تھا کہ یا تو اسلام قبول کرتے یا انہیں قتل کر دیا جاتا۔ امام ابو عبید نے اس کے دو اسباب بیان کئے ہیں ایک تو یہ کہ انہوں نے عیسائیت قبول کر رکھی تھی (اسلام دوسرے مذہب میں دخل اندازی درست نہیں سمجھتا) دوسرا یہ کہ آپ کے سامنے وہ حدیث تھی جس کے وہ خود راوی ہیں چنانچہ انہوں نے فرمایا "اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس دین کی حفاظت ساحل فرات پر ربیعہ کے نصاریٰ سے کرائے گا تو میں کسی عرب کو اسلام قبول کئے یا قتل کئے بغیر نہ چھوڑتا[4]۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے جو انتظامی پالیسیاں اختیار کیں ان میں ایک لچک اور نیرنگی وجدت تو موجود تھی لیکن ان کی اساس کتاب وسنت پر ہی تھی۔ آپ نے شریعت کے مزاج، مقاصد اور احکام کی اصل روح کی بھرپور پیروی کرتے ہوئے زمانے کے حالات پر اس کا دانشمندانہ اطلاق کیا یہی آپ کی اجتہادی بصیرت کا کمال تھا۔ آپ کی یہ پالیسی انتظامی تجربہ کاری کا نتیجہ تھی۔ آپ کو جبلہ کے سلسلے میں ندامت وافسوس کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک منتظم سے غلطی کا صدور ممکن ہے، خواہ کتنا ہی کھرا کیوں نہ ہو، لیکن ایسی صورت میں فراست کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اپنی پالیسی پر نظر ثانی کی جائے اور پہنچنے والے نقصان کے ازالے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ آپ کا یہی اسوہ ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ غسان کا یہ شہزادہ جبلہ جو نصرانی تھا دمشق کے موقع پر آپ کی خدمت میں آیا آپ نے اسے اسلام اور

(۱) عبید ۴۸۲، بخاری ۱۹۸۶، عبدالرزاق ۱۰/۳۶۷، طبری ۴/۵۷ (۲) عبید ۴۸۲ (۳) ایضاً (۴) ایضاً ۴۸۲۔

ادائے صدقہ کی دعوت دی، اس نے انکار کیا اور کہا میں اپنے دین پر قائم رہوں گا اور صدقہ دوں گا۔ آپ نے فرمایا "اگر تو اپنے دین پر قائم رہتا ہے تو جزیہ دے۔" اس نے ناک چڑھائی حضرت عمرؓ نے فرمایا "ہمارے پاس تیرے لئے تین باتوں میں سے ایک کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام، جزیہ یا پھر جہاں تیرا جی چاہے چلا جائے۔" چنانچہ وہ تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ بلاد روم میں چلا گیا۔ آپ کو جب یہ خبر ہوئی تو بڑی ندامت ہوئی، عبادہ بن صامت نے انہیں ملامت کی اور کہا "اگر آپ صدقہ لینا قبول کر لیتے اور پھر اس کو تالیف کرتے تو وہ ضرور مسلمان ہو جاتا۔" پھر جب ۲۱ھ میں آپ نے عمیر بن سعد انصاری کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ بلاد روم کی طرف بھیجا تو انہیں حکم دیا کہ جبلہ بن الایہم سے لطف و کرم سے پیش آنا اور اسے باہمی قرابت کا پاس دلا کر بد اسلام کی طرف آنے کی دعوت دینا اور کہنا "جو صدقہ تم نے دینے کیلئے کہا تھا وہی دو اور اپنے دین پر قائم رہو۔" لیکن اس نے یہ پیشکش مسترد کر دی اور اسی پر قائم رہا کہ وہ بلاد روم ہی میں رہے گا[1]۔" آپ کا ایک نہایت اہم انتظامی طریقہ تھا کہ جس جگہ کوئی مسئلہ پیدا ہوتا اس کی تہہ تک پہنچ کر اس کا مستقل حل نکالتے۔ آپ ذمیوں کے معاملے میں بڑے حساس تھے کہ اگر ان سے کوئی زیادتی اور عہد شکنی ہو گئی تو وہ کبھی بھی اسلامی معاشرے میں جذب نہیں ہو سکیں گے۔ ایرانی علاقوں میں آویزشوں کے دوران آپ تک یہ اطلاعات پہنچیں کہ وہ بار بار مسلمانوں کے مقابلے میں آجاتے ہیں اور پر امن طور پر اسلامی ریاست کا حصہ نہیں بن رہے، تو آپ کو شدید تشویش ہوئی، چنانچہ آپ نے اس کی تحقیق کی اور اصل وجوہ کا کھوج لگا کر اس کا ازالہ کیا جس کے بہت جلد خوشگوار نتائج نکلے۔

حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے (فارس سے آنے والے) وفد سے فرمایا "شاید مسلمان ذمیوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ تمہارے ساتھ عہد شکنی کرتے ہیں۔" وہ بولے "جہاں تک ہمیں علم ہے ایفائے عہد اور حسن سلوک ہوتا ہے۔" آپ نے فرمایا "پھر اس قسم کے واقعات کیوں رونما ہوتے ہیں؟" کوئی بھی اس کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ البتہ احنف بن قیس بولے "امیر المومنین! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ نے ہمیں پیش قدمی سے منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ ہم اپنے مقبوضہ علاقے کے اندر رہیں حالانکہ ان کا بادشاہ ان کے ملک میں زندہ سلامت موجود ہے۔ اس وجہ سے جب تک ان کا بادشاہ زندہ رہے گا وہ ہم سے جنگ کرتے رہیں گے کیونکہ دو بادشاہ ایک جگہ نہیں رہ سکتے جب تک ایک دوسرے کو نکال نہ دے۔ میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے یہ واقعات رونما ہوتے ہیں۔ یہ بادشاہ ہی ہے جو انہیں بھڑکاتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم ان کے ملک میں گھس جائیں۔ اس طرح ہم فارس سے بادشاہت کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ اس کو ملک سے نکال کر ان کی قومی عزت و وقار کو ختم کر سکتے ہیں۔ اس طرح اہل فارس کی توقعات منقطع اور حوصلے پست ہو جائیں گے۔" آپ نے فرمایا "تم سچ کہتے ہو تم نے معاملے کی پوری تشریح و توضیح کی ہے۔ پھر آپ نے پیش قدمی کی اجازت دے دی۔" چنانچہ آپ نے مروجہ علاقائی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کو ایرانی علاقوں میں پیش قدمی کی اجازت دے دی[2]۔ آپ نے جو انتظامی حکمت عملی اختیار کی اس میں متعلقہ علاقوں کے عوام کی ذہنی و فکری پس منظر، نفسیاتی عوامل، رواجات اور اخلاق و عادات کا لحاظ رکھا اور اسلامی فریم ورک میں رہتے ہوئے ان سے مطابقت پیدا کی۔ آپ بخوبی اس بات سے آگاہ تھے کہ پہلے سے طے شدہ انتظامی آلات، ٹھوس ضابطے اور رویے ہر وقت اور ہر جگہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ ان کے کارآمد ہونے کا تعلق مقامی ماحول، حالات اور مزاج کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ آپ کے عہد میں مسئلہ اور بھی نازک اور حساس ہو گیا تھا کیونکہ مختلف قومیں مقابلے کے بعد مغلوب ہوئی تھیں۔ ان کی عربوں کے ساتھ قدیمی آویزش تھی اور وہ بالکل متضاد نظریات اور تہذیب رکھتی تھیں۔ اگر مسلمانوں کے غلبے کے بعد بھی تہذیبی کشمکش اور تصادم برقرار رہتا تو وہ کبھی بھی اسلامی ثقافت میں جذب نہ ہو سکتیں۔ اس طرح ان کا مستقل طور پر اسلام قبول کرنا تو در کنار انہیں

---

(۱) ۸۰ ق ۱۹۲ (۲) ایضاً ص ۷۸

کنٹرول کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ اگر ہر وقت مقابلے اور طاقت کے استعمال کی ضرورت در پیش رہتی تو سیاسی خلیج بھی زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ اندرونی انتشار اور الجھاؤ تیز رفتار فتوحات کی راہ میں حائل ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے انتظامی پالیسیوں میں لچک رکھی اور جہاں اس سلسلے میں قوی دلیل دیکھی تو اسے فراخدلی سے قبول کرتے ہوئے اپنی عمومی پالیسی میں مستثنیات کی گنجائش رکھی۔ مثلاً حضرت عمرؓ خود بھی انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور عمال کیلئے بھی لازم کیا ہوا تھا کہ اپنے معیار زندگی کو اوسط درجے کے مسلمانوں کے برابر رکھیں بصورت دیگر سزا دیتے تھے' لیکن مخصوص حالات کی وجہ سے شام کے گورنر حضرت امیر معاویہ کے معاملے کو نظر انداز کر دیا۔ ۷اھ میں جب آپ شام کے دورے پر تشریف لے گئے تو خچر پر سوار تھے۔ سامنے دیکھا کہ حضرت معاویہؓ ایک شاندار جلوس کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے گھوڑے سے اتر کر آپ کو سلام کیا' آپ جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا "آپ نے انہیں تکلیف پہنچائی ہے کم سے کم ان سے بات تو کر لیتے۔" آپ حضرت معاویہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "یہ شاندار جلوس تمہارا ہے؟" انہوں نے جواب دیا "جی ہاں!" فرمایا "دوسری طرف تمہارا حال یہ ہے کہ تم ہر وقت گھر میں گھسے بیٹھے رہتے ہو حالانکہ جانتے ہو کہ اہل حاجت تمہاری ڈیوڑھی پر کھڑے ہیں۔" حضرت معاویہؓ نے جواب دیا "یہ بھی درست ہے۔" آپ نے فرمایا "افسوس ہے تم پر ایسا کیوں ہے؟" انہوں نے جواب دیا "ہمارے ملک میں دشمن کے جاسوس بہت ہیں۔ اگر ہم اس شان و شوکت سے نہ رہیں تو دشمن ہمیں کمزور سمجھ کر ٹوٹ پڑے۔ رہی گھر میں گھسے کی بات سو ہمیں ڈر ہے کہ ہماری فیضی رعایا کو جری بنا دے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں آپ کا عامل ہوں۔ آپ مجھے گھٹائیں گے گھٹ جاؤں گا' بڑھائیں گے بڑھ جاؤں گا اور روک دیں گے رک جاؤں گا۔" تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں جب تم سے باز پرس کرتا ہوں' صاف بچ نکلتے ہو' اگر تم سچے ہو تو یہ عقل مند آدمی کی رائے ہے۔ اگر جھوٹے ہو تو ایک چالباز کا دھوکہ ہے۔ میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے روکتا ہوں[1]۔" ایک مرتبہ آپ نے حضرت معاویہؓ کو دیکھ کر فرمایا: "یہ عرب کا کسریٰ ہے[2]۔"

حالات و واقعات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے حکمت عملی وضع کرنے میں آپ کی پبلک ایڈمنسٹریشن نے نہایت دانشمندانہ طریقے اختیار کئے۔ اس کی ایک مثال مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ کی ہے۔ فتح کے بعد انہیں اطلاع ملی کہ بعض قبطی باشندے یہ کہہ رہے تھے "عرب کتنے خستہ حال اور حقیر لوگ ہیں' جن کے مطیع و فرمانبردار ہمارے جیسے دگ ہو گئے ہیں۔" اس پر حضرت عمرو کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ بات انہیں مخالفت پر آمادہ نہ کر دے۔ انہوں نے حکم دیا کہ اونٹ ذبح کئے جائیں اور انہیں نمک اور پانی میں پکایا جائے' نیز سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ وہ سب حاضر ہوں اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس کی اطلاع دے دیں۔ پھر خود وہاں جا بیٹھے اور اہل مصر کو بھی آنے کی اجازت دی' پھر گوشت اور شوربہ لایا گیا' انہیں مسلمانوں کے کھانے کا معائنہ کرایا گیا' مسلمانوں نے عربی طریقے پر کھانا کھایا۔ اہل مصر عباؤں میں ملبوس تھے اور ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے' جب وہ وہاں سے رخصت ہوئے تو ان کی جرأت اور بے باکی میں اور اضافہ ہو گیا۔ دوسرے دن مسلمان سپہ سالاروں کو حکم دیا گیا کہ وہ خود اور اپنے ساتھیوں کو مصری لباس اور جوتوں میں لائیں' اہل مصر کو دوبارہ وہاں آنے کی اجازت دی گئی۔ انہوں نے گزشتہ روز سے مختلف صورتحال دیکھی۔ انہوں نے دیکھا کہ عربوں کو مصری کھانے کھلائے جا رہے ہیں اور سب لوگ مصری معاشرت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ تیسرے دن مسلمان فوجیوں کو حکم دیا گیا کہ معائنہ کرانے کیلئے مسلح ہو کر آئیں۔ اہل مصر کو بھی آنے کی اجازت دی گئی اور ان کے سامنے مسلح فوج کو گزارا گیا۔ اس کے بعد حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا "مجھے تمہارے خیالات کا علم ہو گیا تھا' جب تم نے عربوں کی سادگی اور کفایت شعاری دیکھی تو اس وقت مجھے اندیشہ ہوا

(۱) جلد ۲ (۲) ص ۲۵۲

کہ تم (غلط فہمی میں) ہلاک نہ ہو جاؤ۔ اس لئے میں نے چاہا کہ تمہیں دکھاؤں کہ عربوں کی اپنے وطن میں کیا حالت تھی' پھر تمہاری سرزمین میں آکر کیا تبدیلی ہوئی۔ پھر میں نے تمہیں دکھایا کہ جنگ کی صورت میں ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ انہوں نے پہلی (سادہ) زندگی میں رہ کر تم پر فتح حاصل کی اور تمہارے ملک پر دوسرے دن کی طرز معاشرت اختیار کرنے سے پہلے قبضہ کر لیا لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں اس بات سے مطلع کیا جائے کہ تیسرے دن تم نے جن لوگوں کو (مسلح حالت میں) دیکھا تھا وہ دوسرے دن کی طرز معاشرت نہیں چھوڑیں گے اور پہلے دن کی طرز معاشرت کی طرف نہیں لوٹیں گے۔" یہ سن کر وہ منتشر ہو گئے اور آپس میں کہہ رہے تھے: "تمہیں عربوں نے اپنے پاؤں سے روند ڈالا ہے۔"

جب حضرت عمرؓ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے مصاحبوں سے فرمایا "خدا کی قسم اس کی (یعنی عمرو بن العاصؓ کی) جنگ بہت نرم ہوتی ہے۔ اس کے اندر دوسروں جیسا دبدبہ اور تیزی نہیں ہوتی' مگر اس کی کاٹ بہت سخت ہوتی ہے۔" پھر آپ نے انہی کو حاکم برقرار رکھا[1]۔ آپ نے مفتوحہ علاقوں کے عوام سے مطابقت و ہم آہنگی کو فروغ دینے کیلئے مروجہ آمرانہ اور جابرانہ انتظامی طریقے تبدیل کر کے ان سے نہایت قریبی اور کھلے رابطے کو پروان چڑھایا (دور جدید اس طریق کار کو (Human relation approach) کہا جاتا ہے) اور اسلام کی اعلیٰ اور عالمگیر قدروں کو انتظامی آلات کے طور پر عملی جامہ پہنایا۔ ان میں عدل و انصاف' پابندی عہد' رحم دلی و خیر خواہی' آزادی و رواداری' ایثار اور فیاضی' عفو و درگزر' فلاح و بہبود' صداقت و دیانت اور عزت نفس کی پاسداری وغیرہ شامل ہیں۔ یہ غلبہ حاصل کرنے والے حاکموں کی طرف سے علاقائی' لسانی' نسلی اور مذہبی تفاوت رکھنے والے محکوموں اور مغلوبوں کیلئے اپنی نوعیت کی منفرد مثال تھی جس کا وہاں کے لوگوں نے پہلی مرتبہ مشاہدہ کیا تھا۔

آپ کی رہنمائی میں آپ کے گورنروں اور سپہ سالاروں نے غیر مسلموں سے نہایت معقول اور قابل قبول معاہدات کئے[2] اور ہر حالت میں ان کی پابندی کراتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے پہلی مرتبہ جبر واستبداد اور ظلم واستحصال سے نجات حاصل کی اور کھلی اور آزاد فضا میں سکھ کا سانس لیا۔ اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا اور یہی نکلا۔ انہوں نے اسلامی نظام کیلئے دل و ذہن کے دریچے کھول دیئے۔ اسلامی تہذیب کو اپنا سب سے بڑا محسن قرار دیا اور اسلامی ریاست کے دفاع کیلئے اپنے ہم مذہب لشکروں کے مقابلے میں صف آراء ہو گئے۔ روایت میں آتا ہے کہ مسلمانوں کی فوجیں شام کے علاقوں میں جب رومیوں سے برسرپیکار تھیں' تو مسلمانوں کو خبر ملی کہ ہرقل نے بہت بڑی فوجیں جمع کی ہیں' جو یرموک کی جنگ کیلئے ان کی طرف بڑھ رہی ہیں' تو انہوں نے اہل حمص کو وہ سارا خراج واپس کر دیا' جو ان سے لیا تھا اور کہا "ہم دوسرے مشاغل کے باعث تمہاری مدد اور حفاظت سے معذور ہو گئے ہیں اب تم جانو اور تمہارا کام۔" اس پر اہل حمص نے کہا "ہمیں تمہاری حکومت اور تمہارا عدل اس ظلم و جور سے زیادہ محبوب ہے جس میں ہم تمہارے آنے سے قبل مبتلا تھے۔ ہم ہرقل کی فوج کی مزاحمت کریں گے اور تمہارے عامل کے ساتھ مل کر شہر کی حفاظت کریں گے اور یہود نے کہا "تورات کی قسم ہرقل کا عامل حمص میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا' جب تک وہ ہمیں مغلوب نہ کر لے اور ہماری تمام کوششیں ضائع نہ ہو جائیں۔" پھر انہوں نے شہر کے دروازے بند کر لئے اور ان کی حفاظت کرنے لگے اور یہی ان شہروں کے یہود و نصاریٰ نے بھی کیا' جن سے صلح ہو چکی تھی انہوں نے کہا "اگر رومی اور ان کے ساتھی مسلمانوں پر غالب ہو گئے' تو ہماری جو حالت تھی' وہی پھر ہو جائے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے تو ہم اسی حالت پر رہیں گے۔" پھر جب اللہ نے کافروں کو ہزیمت دی اور مسلمانوں کو غالب کیا تو انہوں نے اپنے شہروں کے دروازے کھول دیئے اور مقلسین (گانے بجانے والوں) کو ساتھ لے کر نکلے' جشن منایا اور خراج ادا کیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت

(۱) طبری ۱۱: ۱۱ (۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو طبری ۳: ۱۸۳'۱۸۲ یوسف: ۱۲۰' ۱۴۹۔

ابو عبیدہؓ جب کہ قنسرین اور انطاکیہ کی طرف روانہ ہوگئے اور انہیں بھی فتح کر لیا[۱]۔ اس واقعے کو امام ابو یوسف نے یوں بیان کیا ہے جب ذمیوں نے دیکھا کہ مسلمان ان کے ساتھ کی گئی شرائط کے پوری طرح پابند ہیں اور ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کر رہے ہیں' تو وہ دشمنوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے بڑے مددگار اور دشمنوں کے خلاف بہت سخت ہوگئے۔ جن شہروں میں مسلمانوں کی صلح ہوتی تھی وہاں کے باشندوں نے اپنی جانب سے کچھ افراد کو رومیوں اور مملکت روم کے حالات کا پتہ لگانے کیلئے جاسوس بنا کر بھیجا تا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ وہ لوگ کیا اقدام کرنے والے ہیں۔ چنانچہ ہر شہر کے بھیجے ہوئے افراد یہی خبر لے کر واپس آئے کہ رومیوں نے تنا زبردست لشکر جمع کر لیا ہے کہ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ یہ سن کر ہر شہر کے رؤسا ان امراء کے پاس آئے جنہیں حضرت ابو عبیدہؓ نے ان پر مقرر کیا تھا اور یہ خبر ان تک پہنچائی۔ ابو عبیدہؓ کے مقرر کردہ والیوں نے ان کو اس کی اطلاع لکھ کر بھیجی۔ حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس مختلف مقامات سے پے در پے یہی اطلاعات آنے لگیں۔ یہ بات ان پر اور عام مسلمانوں پر بڑی بار بن گئی۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے ان تمام والیوں کو جنہیں آپ نے صلح کے ذریعے فتح کیے ہوئے شہروں پر مامور کیا تھا' یہ لکھا کہ وہاں کے باشندوں سے جزیہ اور خراج کی جو رقمیں وصول کی گئی ہوں وہ انہیں واپس کر دی جائیں اور یہ بات واضح کر دی جائے کہ ہم نے یہ رقوم اس لئے واپس کی ہیں کہ تم نے ہم سے یہ عہد کیا تھا کہ ہم تمہارا دفاع کریں گے' لیکن ہمارے خلاف جتنے لشکر جمع کر لئے گئے ہیں ان کی خبر ہمیں مل گئی ہے۔ ہم اتنے طاقتور نہیں ہیں کہ ان کا مقابلہ کر کے تمہارا دفاع کر سکیں' اسی لئے ہم نے تم سے وصول کردہ رقوم تمہیں واپس کر دی ہیں۔ اگر اللہ نے ہمیں ان پر فتح عطا کی تو ہم ان شرائط کی پوری پابندی کریں گے جو ہمارے اور تمہارے درمیان طے پا چکی ہیں۔

جب ان والیوں نے ان سے یہ بات کہی اور ان سے وصول کیا ہوا مال انہیں واپس دے دیا تو وہ کہنے لگے "اللہ تمہیں فتح عطا کرے اور دوبارہ ہم پر (حکمران بنا کر) واپس لائے۔ آج اگر تمہاری جگہ یہ رومی ہوتے تو ہمیں کچھ بھی واپس نہ کرتے' بلکہ الٹا ہر وہ چیز چھین لیتے جو ہمارے پاس باقی رہ گئی ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی نہ رہتا[۲]۔ آپ کے انتظامی فلسفے کی حقانیت' آپ کی حکمت عملی کی کامیابی اور آپ کی پبلک ایڈمنسٹریشن کے بااصول' عادلانہ' متحرک' جاندار اور بے مثال ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ مغلوب ہونے والے غیر مسلم بھی بڑی حیران کن سرعت کے ساتھ اسلامی ریاست کا جزو لاینفک بن گئے' لہٰذا پبلک ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کے جدید نظریات و طریقوں پر لازم ہے کہ آپ کے دور کو سلام پیش کریں۔

آپ کے عمال نے آپ کی اسی انتظامی حکمت عملی کی مکمل پیروی کی کہ جنگوں کے بجائے صلح کو بنیاد بنایا جائے۔ علاقوں پر قبضے کے بجائے دلوں پر حکومت کی جائے۔ وسعت و فراوانی کا ایک ایسا ثقافتی ماحول پیدا کیا جائے کہ حاکم و محکوم کے درمیان فاصلے' تضادات اور رنجشیں ختم ہو جائیں اور نظمیہ عامہ کو اعلیٰ مقاصد کے حصول میں کامیابی حاصل ہو۔ شام کی فتوحات کے دوران آپ کے کمانڈر حضرت ابو عبیدہؓ نے یہی بات سامنے رکھی۔ بقول امام ابو یوسف "ابو عبیدہؓ نے ان لوگوں سے ان شرائط پر صلح کر کے اس لئے منظور کیا اور جو درخواستیں وہ لوگ کرتے تھے انہیں اس لئے مان لیتے تھے' تا کہ ان کی تالیف قلب ہو اور دوسرے شہروں کے لوگ بھی جنہوں نے ابھی صلح کی پیشکش نہیں کی تھی' یہ باتیں سن کر صلح پر آمادہ ہو جائیں[۳]۔ آپ نے علاقے کے لوگوں کی شکست خوردہ رومیوں کے سلسلے میں ہم آہنگی اور امن و امان کے فروغ کیلئے یہاں تک شرط منظور کر لی کہ جو رومی مسلمانوں سے جنگ کیلئے آئے تھے اور اب ان لوگوں سے آملے تھے انہیں بھی امان دے دی جائے اور یہ بھی حق دیا جائے کہ وہ اپنے ساز و سامان' مال اور اہل و عیال سمیت بلا روک ٹوک روم چلے جائیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے یہ شرط منظور کر لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شہروں کے دروازے آپ پر کھول دیئے گئے اور جزیہ ادا کیا۔ اس کے بعد تو آپ جن علاقوں سے گزرتے وہاں کے رؤسا صلح کی درخواستیں پیش کرتے' جنہیں

---

(۱) [illegible] ص ۱۴۳ (۲) یوسف ۱۳۹ (۳) ایضاً

جائز دو قبول کر لیا جاتا۔ جنہیں جزیہ و خراج کی رقمیں واپس کر دی گئی تھیں وہ بھی دکانوں اور بازاروں میں ملاقات کر کے تجدید معاہدہ کرتے[1]۔ فاروق اعظمؓ کی نظمیہ عامہ نے کمال دانشمندی سے علاقائی و ثقافتی روایات سے مطابقت کے ذریعے عوام میں نفوذ پیدا کیا پھر بھرپور روابط اور کمیونی کیشن کے ذرائع سے باہمی ہم آہنگی کو فروغ دیا۔ پھر عدل و انصاف، نرمی، تالیف قلب، مذہبی آزادی اور عزت نفس کے احترام اور فلاح و بہبود کے اعلیٰ انتظامی اصولوں کے ذریعے ایسی شاندار اور پائیدار کامیابیاں حاصل کیں، جو جابرانہ سیاسی و ثقافتی تسلط سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔

۳۔ ترقیاتی نظمیہ (Development Administration)

دور جدید میں ترقیاتی نظمیہ کے تصور کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے، جس کا مرکزی کام یہ ہے کہ سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی کی رفتار کو تیز کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے ایسے پروگرامات اور منصوبے وضع کیے جائیں جن کا منطقی نتیجہ ترقی و خوشحالی ہو۔ ایسا لائحہ عمل اختیار کیا جائے جو غربت، استحصال اور ناانصافیوں کا ازالہ کرے اور عوام کے معیار زندگی کو بہتر بنائے۔ George Gant کے بقول "یہ ایڈمنسٹریشن کا وہ حصہ ہے جس میں توجہ کا مرکز پبلک ایجنسیوں کو اس طرح منظم کرنا اور چلانا ہے کہ سماجی و معاشی ترقی کے واضح پروگرام متحرک ہوں اور انہیں سہولیات میسر ہوں۔ اس میں مینجمنٹ کی صلاحیتوں کو اختیار و استعمال کر کے براہ راست ترقیاتی راہوں پر لگایا جاتا ہے۔" E.W.Weidner کے بقول اس سے مراد "Maximising innovation for development".[2] اس کیلئے جن باتوں کو ضروری خیال کیا جاتا ہے ان میں انتظامی اجتہاد، عوامی شراکت، طے شدہ حکمت عملی اور منصوبے، ان پر مسلسل نگرانی، جدید انتظامی طریقوں کا استعمال، کامیابیوں سے مربوط ہونا اور اپنے آپ کو اس مقصد کیلئے پوری طرح وقف کر دینا شامل ہے۔ اگر ہم اس جدید تصور اور اس کے معیارات کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو یقینی طور پر فاروق اعظمؓ کو صرف اسلام میں نہیں بلکہ تاریخ انسانی میں ترقیاتی نظمیہ کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ نے اس کے تصور اور نظام کو پہلی مرتبہ منظم و مربوط انداز میں عملی طور پر متعارف کرایا۔ اسلام کی روح، ریاست کی ضروریات اور حالات و وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پوری پبلک ایڈمنسٹریشن کو ایک ولولہ اور شعور دے کر قومی تعمیر و ترقی، عوامی فلاح و بہبود، خدمت و معاونت اور افادیت و جدیدیت کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰؓ کو لکھا کہ "اما بعد! اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ سعادت مند نگران وہ ہے جس کے سبب اس کی رعایا کو سعادت نصیب ہو اور سب سے بدبخت نگراں وہ ہے جس کے ہاتھوں اس کی رعایا تباہ ہو جائے۔ دیکھو تم خود راہ راست سے نہ ہٹنا کیونکہ اس کے نتیجہ میں تمہارے عمال بھی بگڑ جائیں گے۔ ایسا کرو گے تو اللہ کے حضور تمہارا حال اس جانور کا سا ہو گا جس نے زمین پر کچھ سبزہ دیکھا تو اس کو چرنے لگا تاکہ موٹا ہو جائے، حالانکہ اسی موٹاپے میں اس کی موت مضمر ہے۔ والسلام[۳]۔"

آپ نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کو تحریک دی۔ روحانی، اخلاقی، سماجی، تمدنی، سیاسی، معاشی، عدالتی، تعلیمی، عسکری وغیرہ۔ غرض کوئی گوشہ ایسا نہیں جسے آپ نے جدید خطوط پر استوار کر کے اسے وسعت و رفعت سے روشناس نہ کرایا ہو۔ یہ کام آپ اکیلے سرانجام نہیں دے سکتے تھے اس لئے پوری نظمیہ کو اس مشن پر لگا دیا۔ غربت و افلاس کو ختم کرنے، ناانصافی و استحصال کو روکنے، امن و آشتی کو یقینی بنانے، لوگوں کے معیار زندگی کی بلندی اور آسودگی و خوشحالی کے حصول کیلئے آپ نے بھرپور منصوبہ بندی کی۔ عمال و افسران کو واضح پروگرامات دے کر متحرک کیا اور انہیں ایسے طریقے اختیار کرنے کا پابند بنایا، جو ترقی کے اہداف کیلئے ضروری تھے۔ آپ نے ۱۷ھ میں بصرہ کی گورنری سے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو مقرر فرمایا اور وہاں کے لوگوں کو لکھا

---

(۱) یوسف، ۱۰۴ (۲) Goel.12 (۳) یوسف ۱۴، طبیہ ۱۳، ۲۶۵۔

"میں نے ابو موسیٰ کو تمہارا امیر مقرر کیا ہے جو تمہارے طاقتور انسان سے کمزوروں کو حق دلوائیں گے 'تمہارے ساتھ مل کر تمہارے دشمنوں سے جنگ کریں گے۔ تمہاری ذمہ داریاں ادا کریں گے 'تمہاری غنیمت تمہارے لئے اکٹھی کریں گے اور اسے تمہارے درمیان تقسیم کریں گے اور تمہارے راستوں کو پاک صاف رکھیں گے"[1]۔ اس ارشاد میں آپ نے متفرق رعیت کی جس چھ ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے وہ نظمیہ عامہ کے وسیع رول کی نشاندہی کرتی ہیں۔ آپ یہ جائزہ بھی لیتے رہتے تھے کہ آپ کے عمال و اہلکار کس حد تک آپ کی پالیسی اور ہدایات کو عملی جامہ پہناتے ہیں 'تاکہ آپ کی منصوبہ بندی اور فلاحی پالیسیوں کے اثرات دور دراز کے علاقوں اور نچلی سطح کے عوام تک پہنچ سکیں۔ اس سے آپ کا رابطہ 'انتظامی کنٹرول 'موثر نگرانی اور نظمیہ عامہ کو مقاصد کے حصول کیلئے متحرک رکھنے میں کامیاب ہو جاتے تھے 'ترقی کا زینہ ہیں۔ چنانچہ قادسیہ کی فتح کے بعد عمرو بن معدی کرب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے وہاں کے سالار حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا لوگ ان سے خوش ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "میں نے سعدؓ کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ لوگوں کیلئے چیونٹی کی طرح دانہ جمع کرتے ہیں اور مہربان ماں کی طرح شفقت کرتے ہیں 'وہ مجبور کی محبت میں بدوی اور جباتیہ کے اہتمام میں نبطی ہیں۔ مساوات کے ساتھ تقسیم کرتے ہیں اور قصیوں میں عدل کرتے ہیں اور (قابلیت کے ساتھ) سرایا بھیجتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "معلوم ہوتا ہے تم دونوں نے ایک دوسرے کی توصیف میں سمجھوتہ کر لیا ہے۔" حضرت عمرؓ نے یہ اس لئے کہا کہ اس سے قبل سعدؓ نے ایک مرتبہ عمرو کی توصیف لکھی تھی 'عمرو نے کہا "ہرگز نہیں اے امیر المومنین! جو کچھ میں جانتا ہوں آپ کو اس کی خبر کر دی ہے"[2]۔ "حضرت سعدؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے حکم پر ۱۷ھ میں جدید شہر کوفہ کی بنیاد رکھی جو ایک بلند اور پر فضا مقام تھا اور شہری منصوبہ بندی میں اپنی مثال آپ تھا۔ جہاں چالیس ہزار آدمیوں کی آبادی کیلئے مضبوط مکانات 'عرب قبائل کے جدا جدا محلے 'چالیس 'تیس اور بیس ہاتھ چوڑی شاہراہیں اور سات ہاتھ چوڑی گلیاں رکھی گئیں جو بالکل سیدھی تھیں۔ درمیان میں جامع مسجد بنائی گئی جس میں بیک وقت چالیس ہزار آدمیوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش تھی جس کے ساتھ ہی ایوان حکومت 'بیت المال کے مکانات اور مہمان خانے تعمیر کئے گئے جہاں باہر کے مسافروں کو سرکاری خرچ سے کھانا فراہم کیا جاتا۔ علاوہ ازیں اسی نہج پر آپ کی اجازت سے آپ کے گورنروں نے بصرہ اور فسطاط جیسے شہر آباد کئے۔ موصل اور جیزہ کو وسعت دی 'جن میں جدید ترین سہولتیں فراہم کر کے تہذیبی و تمدنی ترقی کی بنیادیں فراہم کیں۔ رفتہ رفتہ یہی شہر 'مسلمانوں کی علمی 'ادبی 'ثقافتی 'معاشی 'سیاسی 'دفاعی اور صنعتی سرگرمیوں کے مراکز بن گئے"[3]۔

غیر عرب علاقوں کے عوام کی نوے فیصد سے زائد آبادی کے روزگار کا زیادہ تر انحصار زراعت و باغبانی پر تھا۔ ان کی ترقی و خوشحالی کیلئے ضروری تھا کہ اس پر بھرپور توجہ دی جائے اور ایسے ذرائع و وسائل اختیار کئے جائیں جو انفرادی طور پر لوگوں کے بس سے باہر ہیں۔ بقول شبلی "زراعت کی حفاظت و ترقی کا حضرت عمرؓ کو جو خیال تھا 'اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے ان سے آکر شکایت کی کہ شام میں میری کچھ زراعت تھی 'آپ کی فوج ادھر سے گزری اور اس کو برباد کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت اس کو دس ہزار درہم معاوضے میں دلوائے۔ تمام ممالک مفتوحہ میں نہریں جاری کیں اور بند باندھے۔ تالاب تیار کرائے 'پانی کی تقسیم کیلئے دہانے بنانے اور نہروں کے شعبے نکالنے اور اس قسم کے کاموں کا ایک بڑا محکمہ قائم کیا۔ علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ خاص مصر میں ایک لاکھ بیس ہزار مزدور روزانہ سال بھر میں اس کام میں لگے رہتے تھے اور یہ تمام مصارف بیت المال سے ادا کئے جاتے تھے۔ خوزستان اور اھواز کے اضلاع میں جزء بن معاویہ نے حضرت عمرؓ کی اجازت سے بہت سی نہریں کھدوائیں جن کی وجہ سے بہت سی افتادہ زمینیں آباد ہو گئیں۔ اسی طرح اور سینکڑوں نہریں تیار ہوئیں

(۱) کنز [illegible] طبری [illegible] (۲) بلاذری [illegible] (۳) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کتب [illegible] بلاذری [illegible] ص [illegible] سیبی [illegible]

جس کا پتہ جستہ جستہ تاریخوں میں ملتا ہے[۱]۔ آپ دور دراز سے آنے والے وفود کی ضروریات اور مسائل بڑے غور سے سنتے اور انتظامی سطح پر جن اقدامات کی ضرورت ہوتی اس بارے میں فوری طور پر عمال کو احکامات صادر فرماتے کیونکہ پوری حکومتی مشینری کو لوگوں کی ترقی و خوشحالی کیلئے سرگرم عمل رکھنا آپ کا بہت بڑا مقصد تھا۔ روایت میں آتا ہے کہ احنف بن قیس اہل بصرہ میں سے کچھ لوگوں کے ساتھ حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ آپ نے وفدین میں سے ایک سے آنے کی غایت پوچھی' پھر احنف کی طرف متوجہ ہوئے' ان کے جسم پر موٹے جھوٹے کپڑے تھے اور وہ ایک گوشے میں خاموش بیٹھے تھے' پوچھا "کیا تمہیں کچھ حاجت نہیں؟" وہ بولے "ہاں' امیر المومنین! بھلائی کی کنجیاں تو اللہ کے ہاتھ ہی میں ہیں نو آباد شہروں میں ہمارے بھائی گزشتہ قوموں کے مساکن میں مقیم ہیں' ان کی ایک جانب آب شیریں اور دوسری جانب سرسبز باغ ہیں' لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ایسی جگہ رہتے ہیں جو شور زدہ اور مرطوب ہے' اس میں کثرت سے جھاڑیاں ہیں۔ نہ اس میں رطوبت خشک ہوتی ہے اور نہ اس کی چراگاہوں میں چارہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ایک جانب مشرق میں آب شور بہتا ہے اور دوسری جانب مغرب میں بیابان ہے۔ بالکل بے آب و گیاہ۔ ہمارے پاس کھیت ہیں نہ مویشی' جن سے ہمیں کچھ حاصل ہو۔ ہماری روزی شتر مرغ کی روری کی طرح دور ہے۔ ہمیں پانی کیلئے دو فرسخ جانا پڑتا ہے' جو ضعیف ہو اس کیلئے یہ کیسی مصیبت ہے؟ جب کوئی عورت پانی لانے جاتی ہے تو اس خوف سے کہ کہیں دشمن نہ آ پڑے یا درندہ اس کے بچے کو نہ پھاڑ کھائے' اپنے بچے کو گلے میں باندھ لیتی ہے' جس طرح بکری کا بچہ باندھا جاتا ہے۔ اگر امیر المومنین نے ہم سے اس مصیبت کو دور نہ کیا اور ہمارے فاقوں کا علاج نہ کیا تو ہم اس قوم کی طرح ہو جائیں گے جو ہلاک ہو چکی ہے۔" حضرت عمرؓ نے دیوان میں ان کے بال بچوں کے نام لکھ لئے' سب کیلئے وظائف جاری کر دیئے اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو حکم دیا کہ ان کیلئے نہر کھدوائیں' چنانچہ انہوں نے جو نہر کھدوائی وہ نہر ابو موسیٰ کے نام سے مشہور ہوئی جو چار فرسخ یا نو میل لمبی تھی[۲]۔ "اس سے ہر گھر میں میٹھے پانی کی فراوانی ہو گئی۔ اس طرح اس سے آبپاشی کے علاوہ دیگر مقاصد بھی حاصل ہو گئے۔ آپ نے وہاں ایک اور نہر بھی کھدوانے کا حکم دیا اور لکھا کہ اس کام کا متولی معقل بن یسار المزنی کو مقرر کیا جائے اس وجہ سے وہ نہر معقل کے نام سے مشہور ہوئی' جو دریائے دجلہ سے کاٹ کر لائی گئی[۳]۔

آپ نے تجارت' مواصلات اور رابطے کی غرض سے بھی اپنی حکومت کے پانچویں سال ایک عظیم الشان نہر کھدوائی جو نہر امیر المومنین کے نام سے مشہور ہوئی جو سب سے بڑی اور فائدہ رساں نہر تھی۔ اس میں دریائے نیل کو بحر قلزم سے ملا دیا گیا تھا۔ ۱۸ھ میں جب پورے عرب میں قحط پڑا' تو آپ نے تمام اضلاع کے حکام کو لکھا کہ ہر جگہ سے کثرت سے غلہ اور اناج روانہ کیا جائے۔ اگرچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی' لیکن شام اور مصر سے خشکی کا جو راستہ تھا' وہ بہت دور دراز تھا' اس لئے غلہ بھیجنے میں دیر لگی۔ حضرت عمرؓ نے مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ کو لکھا کہ مصر کے باشندوں کی ایک جماعت کے ساتھ دار الخلافہ میں حاضر ہوں۔ جب وہ حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا دریائے نیل کو اگر سمندر سے ملا دیا جائے تو عرب میں قحط و گرانی کا کوئی اندیشہ نہیں ہو گا ورنہ خشکی کے راستے غلہ آنا دقت سے خالی نہیں۔ چنانچہ عمرو بن العاصؓ نے فسطاط سے (جو قاہرہ سے دس بارہ میل دور ہے) بحر قلزم تک نہر تیار کرائی اس ذریعے سے جہاز دریائے نیل سے چل کر قلزم میں آتے تھے اور یہاں سے جدہ پہنچ کر لنگر انداز ہوتے تھے جو مدینہ منورہ کی بندرگاہ تھی۔ یہ نہر ۶۹ میل لمبی تھی اور تعجب یہ ہے کہ صرف چھ ماہ میں بن کر تیار ہوئی' چنانچہ پہلے سال ۲۰ بڑے بڑے جہاز جن میں ساٹھ ہزار اردب غلہ بھرا ہوا تھا اس نہر کے ذریعے مدینہ منورہ کی بندرگاہ میں آئے۔ یہ نہر مدتوں تک جاری رہی اور اس کے ذریعے مصر کی تجارت کو نہایت ترقی ہوئی[۴]۔

---

(۱) طبری ٤/٧٨' شبلی ٢٦٦ (۲) بلاذری ٣٥٠' طبری ٤/٧٨ (۳) بلاذری ٣٥٢ (٤) سیوطی ٢٣١

عہد جدید میں اتنے بڑے کام کی صرف منصوبہ بندی اور سروے میں کئی سال گزر جاتے ہیں جبکہ کھدائی کے جدید ترین آلات ٹریکٹر' بلڈوزر اور دیگر وسائل و ذرائع میسر ہیں' لیکن فاروقی عمال کی ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے جانفشانی' حسن کارکردگی اور کمال کی حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی مدد آپ کے اصولوں پر عوام کو متحرک کیا اور حکومت کے معاون اور مددگار بنا کر بڑے بڑے منصوبے نہایت کم وقت اور کم خرچ میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور ترقی کی رفتار کو تیز کیا۔ اسی طرح دور دراز علاقوں سے رابطے' انتظامی کنٹرول اور تمدنی' معاشی ترقی کیلئے سڑکیں اور پل اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کیلئے نہایت عمدہ طریق کار اختیار کیا گیا' جس سے دور کی ترقیاتی نظریہ کیلئے بہترین رہنمائی فراہم ہوتی ہے۔ ان کا انتظام براہ راست حکومت کے کنٹرول میں دینے کے بجائے مفتوحہ قوموں سے معاہدات میں یہ شرط رکھی جاتی تھی کہ سڑکوں اور پلوں کا اہتمام کریں گی۔ اس پالیسی میں بہت سی حکمتیں تھیں ایک یہ کہ جن قوموں کا علاقہ ہوتا تھا وہ جب محنت و وسائل سے یہ کام سرانجام دیتی تھیں تو ان کی حفاظت و نگرانی کا بھی خود ہی اہتمام کرتی تھیں۔ دوسری یہ کہ ان سے زیادہ تر استفادہ وہ خود کرتی تھیں' اس لئے مناسب یہی تھا کہ خود انہیں تعمیر کریں۔ تیسری حکومتی انتظامیہ کے اوقات' وسائل اور توجہات دیگر رفاہی و فلاح کے کاموں پر صرف ہوتی تھیں۔ چوتھی یہ کہ حکومت کے ترقیاتی منصوبوں کی تیز رفتار تکمیل میں تمام علاقے کے لوگوں کی براہ راست شرکت و شمولیت ممکن ہوگئی۔ پانچویں یہ کہ ان میں احساس ذمہ داری اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے جذبے کو تحریک ملی۔

حکومتی کارندوں اور ایڈمنسٹریٹروں کا حکومتی مالیات کو بڑھانے' ظلم و استحصال کا رویہ عوام اور انتظامیہ کے درمیان نفرتوں کی دیواریں چنتا ہے' باہمی اعتماد و یگانگت کے سوتے خشک کر دیتا ہے جس سے ترقیاتی پالیسیوں کا رخ معکوس ہو جاتا ہے۔ فاروق اعظمؓ نے بحرین اور ہجر کے علاقے میں حضرت ابوہریرہؓ کو عامل بنا کر بھیجا' وہ کہتے ہیں کہ میں وہاں گیا اور سال کے آخر میں آپ کے پاس دو تھیلے لے کر آیا' جن میں پانچ لاکھ درہم تھے۔ انہیں دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فرمایا ''میں نے آج تک اس سے زیادہ مال یکجا نہیں دیکھا۔ اس میں کسی مظلوم کا مارا ہوا حق یا کسی یتیم اور بیوہ کا (غصب کیا ہوا) مال تو شامل نہیں؟'' ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا ''نہیں خدا کی قسم! ایسا ہو تو سب سے برا آدمی میں ہی قرار پاؤں گا کہ سارا فائدہ تو آپ کے حصے میں آئے اور سارا وبال میرے سر پڑے''(۱)۔ ''ایک مرتبہ آپ نے لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا ''لوگو! کسی اطاعت کے مستحق کا حق اتنا اہم نہیں کہ اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہو تو بھی اس کی اطاعت کی جائے۔ مجھے اس مال کے سلسلے میں تین ہی باتیں مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ اسے حق کے ساتھ وصول کیا جائے' حق کی راہ میں دیا جائے اور باطل پر صرف ہونے سے روکا جائے۔ تمہارے مال کے سلسلے میں میری حیثیت وہی ہے جو کسی یتیم کے سرپرست کی ہوتی ہے۔ اگر میں ضرورت مند نہ رہا تو اس سے دستکش رہوں گا اور اگر ضرورت مند ہو گیا تو اس میں سے معروف کے مطابق حاصل کروں گا(۲)۔''

میں کسی کو کسی پر ظلم و زیادتی کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔ ایسا کرنے والے کا ایک گال زمین پر ہوگا اور دوسرا میرے قدموں کے نیچے تا آنکہ وہ حق کے آگے سر ڈال دے۔ لوگو! مجھ پر تمہارے سلسلے میں کچھ ذمہ داریاں ہیں' جن کو میں تمہارے سامنے گناتا ہوں۔ تمہیں چاہئے کہ ان کے بارے میں میرا احتساب کرتے رہو۔ میری ذمہ داری ہے کہ تمہارے خراج اور فئے کی رقمیں ان کے مقررہ طریقوں سے ہی وصول کروں اور یہ کہ جب یہ اموال میرے ہاتھ میں آجائیں تو مناسب مصارف میں صرف ہوں۔ تمہارے سلسلے میں میری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ انشاء اللہ میں تمہارے عطایا اور وظائف میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کی حفاظت کا انتظام کروں' نیز میری یہ ذمہ داری ہے کہ تمہیں ہلاکت کے منہ میں نہ دھکیلوں اور سرحدوں پر زیادہ عرصہ مامور نہ کیے رکھوں(۳)۔''

---

(۱) [illegible] ۱۹۹ (۲) [illegible] ۲۷۲ (۳) ایضاً ۱۱۱

اس طرح آپ نے مادی وسائل کی منفعت اور حصول دولت، صرف دولت اور تقسیم دولت کے سلسلے میں معاشیات کے کلی درجے (Macro Level) میں جس پالیسی کا ذکر کیا ہے، ہر طرح کے ظلم واستحصال کے خاتمے، محفوظ ماحول کی فراہمی اور وظائف میں بتدریج اضافے اور خود عوام کو بیدار رہنے اور احتساب کرنے کا حق دیا ہے۔ یہی درحقیقت ترقی وخوشحالی کی کلید ہے۔ آپ کے عہد مبارک میں اس کے مثبت اثرات عملی طور پر ظاہر ہوئے۔ آپ نے ترقی وخوشحالی کے تسلسل کو قائم ودائم رکھنے کیلئے طویل المیعاد اور وسیع البنیاد منصوبہ بندی کی اور جرأت مندانہ اور ٹھوس فیصلے کئے جو وقتی وہنگامی مسائل کے حل کے بجائے مستقل نوعیت کے تھے کیونکہ آپ اسلامی تہذیب کو ہمیشہ کیلئے قائم ودائم رکھنا چاہتے تھے۔ اس کی نمایاں مثال شام کی زرخیز زمینوں اور مصر کی مفتوحہ اراضی کو مجاہدین میں تقسیم نہ کرنے کا فیصلہ ہے، جسے آپ نے آزادانہ غور وخوض، بھرپور بحث ومباحثے کیلئے مشاورت کے مختلف دائروں میں پیش کیا اور عمال ومنتظمین کو اس کے مثبت ومنفی تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کا موقع دیا۔ استدلال کی قوت سے سب کو یکسو کیا اور شوریٰ سے اس کی حتمی منظوری لے کر نافذ کر دیا۔ جب آپ سے مفتوحہ زمینیں تقسیم کر دینے کی درخواست کی گئی تو آپ نے جواب دیا "ایسی صورت میں تمہارے بعد میں آنے والے مسلمانوں کو کیا ملے گا؟ اور مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر اس علاقے کی تقسیم کروں تو تم آپس میں پانی پر جھگڑتے رہو گے[1]۔" حضرت بلالؓ نے اصرار کیا تو فرمایا "نہیں، یہ تو اصل سرمایہ ہے میں اسے وقف عام رکھوں گا اور اس سے فاتحین اور ان کے ساتھ دیگر مسلمانوں کے وظائف جاری کئے جائیں گے[2]۔"

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو خط لکھا "مجھے تمہارا خط ملا ہے جس سے معلوم ہوا ہے کہ لوگ تم سے تقاضا کر رہے ہیں کہ ان کا مال غنیمت جو اللہ تعالیٰ نے بطور فئے انہیں پلٹایا ہے ان میں تقسیم کر دیا جائے تو دیکھو تم ایسا کرو کہ ان کے مجاہدوں نے جو مال ومتاع اور جانور وغیرہ لشکر نے تمہارے پاس جمع کیا ہے اسے تو موجودہ مسلمانوں میں تقسیم کر دو، لیکن زمینیں اور نہریں ان پر کام کرنے والوں کیلئے چھوڑ دو تاکہ ان سے وصول شدہ آمدنی مسلمانوں کے وظائف میں کام آئے۔ اس لئے کہ اگر ہم نے یہ زمینیں بھی موجودہ لشکریوں میں تقسیم کر دیں تو ان کے بعد آنے والوں کیلئے کچھ بھی نہیں رہے گا[3]۔" امام ابو یوسف نے بالکل بجا لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان زمینوں کا خراج وصول کر کے اسے سارے مسلمانوں میں تقسیم کر دینے کی جو رائے اختیار کی وہ اسلامی معاشرے کے مفاد عامہ کی ضامن تھی۔ اگر یہ زمینیں عطیہ دینے اور روزینے جاری کرنے کیلئے سارے انسانوں پر وقف نہ قرار دے دی جاتیں تو نہ سرحدوں کی حفاظت کا بندوبست ہو سکتا تھا، نہ فوجیں ہی اتنی طاقتور ہو سکتی تھیں کہ جہاد جاری رکھ سکیں۔ فوجوں اور تنخواہ دار محافظوں کی غیر موجودگی میں اس کی بھی کوئی ضمانت نہ تھی کہ اہل کفر اپنے ملکوں پر دوبارہ قبضہ نہ کر لیں[4]۔ حضرت عمرؓ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "اللہ نے تمہارے بعد میں آنے والوں کو بھی فئے میں شریک قرار دیا ہے۔ اب اگر میں اسے تقسیم کر دیتا ہوں تو تمہارے بعد آنے والوں کیلئے کچھ نہیں بچے گا۔ اگر میں زندہ رہا تو صنعا کے ایک چرواہے کو بھی اس فئے میں سے اس کا حصہ پہنچ جایا کرے گا جبکہ اس کا خون اس کے چہرہ ہی میں ہو گا[5]۔" ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا "اگر میں زندہ رہا تو ضرور ہر مسلمان کو اس کا پورا پورا حق ملے گا، یہاں تک کہ مصر وحمیر کے چرواہے کو بھی حصہ پہنچے گا، اس کیلئے اسے کوئی مشقت نہیں کرنی پڑے گی[6]۔"

آگے ساری مفتوحہ زمینوں کیلئے یہی پالیسی اختیار کی گئی اور یہ ایک مستقل ضابطہ بن گیا۔ آپ کی ٹیم عاملہ نے اس کو پورے خلوص اور یکسوئی سے نافذ کیا۔ چنانچہ فتح مصر کے موقع پر حضرت زبیرؓ بن العوام نے کھڑے ہو کر کہا "اے عمرو بن العاصؓ یہ علاقہ ضرور بالضرور تقسیم کر دو۔" تو انہوں نے جواب دیا "میں اسے تقسیم نہیں کروں گا تاوقتیکہ اس بارے میں امیر المومنین کی رائے لکھ کر نہ معلوم کر لوں۔" چنانچہ انہوں نے اس بارے میں لکھ کر بھیجا تو آپ نے جواب میں لکھا

---

(۱) عبید ۵۹، (۲) عبید ۶۱ (۳) یوسف ۲۴، عبید ۶۰ (۴) یوسف ۲۷ (۵) یوسف ۲۴، سعد ۳/۲۹۹ (۶) عبید ۶۱، سعد ۳/۲۹۹۔

"اسے بغیر تقسیم کیلئے چھوڑ دو تا آنکہ اس سے عامۃ عورتوں کے حمل سے پیدا ہونے والے بھی جہاد میں حصہ لیں[1]۔" امام ابو عبید نے اس کی تشریح میں لکھا ہے "حضرت عمرؓ کے اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمین مسلمانوں کیلئے وقف شدہ فے بن جائے اور جب تک مسلمانوں کا وجود باقی رہے 'نسلاً بعد نسلٍ' قرناً بعد قرن یہ زمین اور اس کی آمدنی مسلمان مجاہدوں کیلئے باعث قوت بنی رہے اور دشمنوں سے جنگ کرنے میں اس سے انہیں مدد پہنچتی رہے[2]۔" حضرت عمر فاروقؓ نے اس اہم بنیادی معاملے کو نہایت فہم و فراست اور تدبر و مہارت سے طے کر کے سب لوگوں کو دلائل کی قوت سے ہمنوا بنالیا پھر انتظامات کے سلسلے میں بھی ان کو مشورے میں شریک کیا۔ روایت میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "اب معاملہ واضح ہو گیا ہے اب یہ بتاؤ کہ کون ایسا ماہر اور دانشمند ہے جو ان زمینوں کا مناسب طور پر بندوبست کردے اور کاشتکاروں پر ان کی برداشت کے مطابق (خراج) تجویز کردے۔" لوگوں نے بالاتفاق عثمان بن حنیف کا نام پیش کیا اور کہا "آپ ان کو اس کا ذمہ دار بنا کر روانہ کر سکتے ہیں کیونکہ یہ صاحب فہم و بصیرت اور تجربہ کار ہیں۔" آپ نے ان کو بلا تاخیر علاقہ سواد کی پیمائش کے کام پر مامور کردیا۔ حضرت عمرؓ کی وفات سے ایک سال پہلے تک سواد کوفہ کی لگان دس کروڑ درہم تک ہوگئی تھی[3]۔ بعض روایت کے مطابق بارہ کروڑ تک پہنچ گئی[4]۔

آپ نے ان کی تقسیم کیلئے وسیع پیمانے پر مردم شماری کرائی' علاقوں اور قبائل کے حساب سے رجسٹر مرتب کرائے اور تمام رعایا کے وظائف کا تقرر کر کے نہایت ترقی یافتہ اور مربوط نظام مرتب کرایا۔ ساری انتظامی مشینری کو ترقی و خوشحالی کے اس عظیم منصوبے کی تکمیل میں منہمک کردیا۔ پھر آپ نے اموال کی تقسیم کیلئے جس جوش و جذبے سے کام کیا' وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ عبداللہ بن عمیر سے مروی ہے کہ عمر بن الخطابؓ نے فرمایا "میں لوگوں کو جتنا زیادہ مال ہوگا اتنا زیادہ دوں گا' میں انہیں گن گن کر دوں گا' اگر اس کام نے مجھے تھکا دیا تو پیمانے سے ناپ کر دوں گا' پھر اگر اس کام نے بھی تھکا دیا تو ہاتھ بھر بھر کر بغیر حساب کے دوں گا[5]۔" یہی جذبہ آپ نے اپنے عمال کے اندر بھی پیدا کیا۔ حضرت حسنؓ سے مروی ہے "حضرت عمرؓ نے (اپنے ایک عامل) حضرت حذیفہؓ کو لکھا کہ "لوگوں کو ان کی عطایا اور تنخواہیں دے دو۔" انہوں نے بعد میں جواب لکھا کہ "ہم نے یہ کردیا ہے اور بہت کچھ بچ گیا ہے۔" حضرت عمرؓ نے پھر لکھا کہ "وہ غنیمت جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے نہ عمرؓ کی ہے نہ آل عمرؓ کی اسے بھی انہی میں تقسیم کردو[6]۔" آپ کی اس حکمت عملی سے جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو گیا' ریاست کے مادی وسائل صرف فوجیوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہونے کے بجائے ساری رعایا میں پھیل گئے' مال و دولت پر محدود طبقے کے تسلط کا خاتمہ ہو گیا اور ترقی و خوشحالی کے ثمرات اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے ساری خلق خدا کے مستفید ہونے کے دروازے کھل گئے۔ انتظامی اعتبار سے اس کے کیا اثرات رونما ہوئے اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جاسکتا ہے۔ جہم بن ابی جہم سے مروی ہے کہ خالد بن عرفطہ العذری حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ آپ نے لوگوں کا حال دریافت فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا "یا امیر المومنین' میں نے اپنے پیچھے والوں کو اس حالت میں چھوڑا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے کہ وہ ان کی عمروں میں سے کچھ آپ کی عمر میں بڑھا دے' جس کسی نے قادسیہ کو روندا اس کی عطا دو ہزار یا پندرہ سو ہے' جو بچہ پیدا ہوتا ہے اسے سو درہم اور ہر ماہ دو جریب دیئے جاتے ہیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت' ہمارا کوئی لڑکا جب بالغ ہوتا ہے تو اسے پانچ سو یا چھ سو والوں میں شامل کردیا جاتا ہے۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی گھر میں ایک بچہ ہے جو کھانا کھاتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو کھانا نہیں کھاتا تو اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے' وہ سے جہاں مناسب یا نامناسب ہے خرچ کرے؟"

حضرت عمرؓ نے فرمایا "فالله المستعان" (اللہ ہی سے مدد کی درخواست ہے) جو انہیں دیا گیا ہے وہ انہی کا حق ہے میں اس کے ادا کرنے کیلئے مستعد ہوں' جن میں وہ بھی ہے جو سے لیتا ہے۔ اس پر میری مدح نہ کرو کیونکہ وہ (میرے باپ) خطاب کا مال نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس میں کچھ زیادہ ہے' لیکن یہ مناسب

---

(۱) عبید ۶۰ (۲) ایضاً (۳) یوسف ۳۶ (٤) یحییٰ ۱۶۹ (۵) سعد ۳/۳ ۳ (٦) سعد ۳ ۲۹۹ بلاذری ٤۳۹

نہیں ہے کہ میں ے ان سے روکوں۔ اگر ان چھوٹے عربوں میں سے کسی کی عطا نکلے تو اس سے بکری خریدے اور اسے اپنے دیہات میں کر دے۔ جب دوسری عطا نکلے تو اس سے بھی جانور خریدے اور اسے بھی اسی میں کر دے [1]۔" آپ نے آخر میں لوگوں کو جو مشورہ دیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس آمدنی کو کھاپی کر ختم کرنے کے بجائے مزید ترقی کیلئے پیداواری ذرائع پر صرف کریں اور اس سے حسب صلاحیت سرمایہ حاصل کر کے اپنی اور قومی آمدنی میں اضافہ کریں۔ پبلک ایڈمنسٹریشن کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ معاشرے کے ہر طبقے اور ہر علاقے کے لوگوں کے حقوق و مفادات میں شریک کرے۔ ان کی اہمیت کا احساس کرے نیز بلا تخصیص ان سے تعلقات کو نہایت خوشگوار رکھے۔ کسی ایک طبقے کی پذیرائی کے بجائے سب کو مساوی رکھے۔ ان کی ضرورت مندی کا خیال رکھتے ہوئے ترقی و خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن کرے اور پوری مملکت کے عوام کو متحدہ قوت اور بنیان مرصوص بنادے۔ اس سارے کام کی تمام تر ذمہ داری وقت کے حکمران پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہی مملکت کا منتظم اعلیٰ ہوتا ہے اور ان پالیسیوں کے نظام کار کو وضع کرنا اسی کا فریضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے زخمی حالت میں وفات سے قبل بعد والے خلیفہ کو وصیت کی جو آپ کی بصیرت کا شاہکار ہے۔ آپ یہ چاہتے تھے آپ کی پالیسیوں کا تسلسل جاری رہے۔

"میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ میں اسے مہاجرین اولین کے سلسلہ میں یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان کا مقام پہچانے اور ان کے حقوق تسلیم کرے۔ انصار جنہوں نے پہلے سے ایمان لا کر دار الہجرت کو آباد کر رکھا تھا ان کے بارے میں میں اسے تلقین کرتا ہوں کہ ان کے

نہیں ہے کہ میں اسے اس سے روکوں۔ اگر ان چھوٹے عربوں میں سے کسی کی عطا نکلے تو اس سے بکری خریدے اور اسے اپنے دیہات میں کر دے۔ جب دوسری عطا نکلے تو اس سے بھی جانور خریدے اور اسے بھی اسی میں کر دے(۱)۔" آپ نے آخر میں لوگوں کو جو مشورہ دیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس آمدنی کو کھا پی کر ختم کرنے کے بجائے مزید ترقی کیلئے پیداواری ذرائع پر صرف کریں اور اس سے حسب صلاحیت سرمایہ حاصل کر کے اپنی اور قومی آمدنی میں اضافہ کریں۔ پبلک ایڈمنسٹریشن کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ معاشرے کے ہر طبقے اور ہر علاقے کے لوگوں کے حقوق و مفادات میں شریک کرے۔ ان کی اہمیت کا احساس کرے' بالتخصیص ان سے تعلقات کو نہایت خوشگوار رکھے۔ کسی ایک طبقے کی پذیرائی کے بجائے سب کو مساوی رکھے۔ ان کی ضرورت مندی کا خیال رکھتے ہوئے ترقی و خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن کرے اور پوری مملکت کے عوام کو متحدہ قوت اور بنیان مرصوص بنا دے۔ اس سارے کام کی تمام تر ذمہ داری وقت کے حکمران پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہی مملکت کا منتظم اعلیٰ ہوتا ہے اور ان پالیسیوں کے نظام کار کو وضع کرنا اسی کا فریضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے زخمی حالت میں وفات سے قبل بعد والے خلیفہ کو وصیت کی جو آپ کی بصیرت کا شاہکار ہے۔ آپ یہ چاہتے تھے آپ کی پالیسیوں کا تسلسل جاری رہے۔

"میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ میں اسے مہاجرین اولین کے سلسلہ میں یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان کا مقام پہچانے اور ان کے حقوق تسلیم کرے۔ انصار جنہوں نے پہلے سے ایمان اور دار ہجرت کو آباد کر رکھا تھا ان کے بارے میں میں اسے تلقین کرتا ہوں کہ ان کے نیکوکاروں کی خدمات قبول کرے اور غلطی کرنے والوں کے سلسلہ میں عفو و درگزر سے کام لے۔ میں اسے دوسرے شہروں اور قصبات کے باشندوں کے سلسلہ میں بھی نصیحت کرتا ہوں کہ ان سے ان کی رضامندی کے ساتھ صرف ان کے فاضل اموال وصول کرے کیونکہ یہی لوگ اسلام کی دفاعی قوت ہیں' دشمنوں کو انہی کے باعث پیچ و تاب ہے اور یہی مال جمع کرنے والے لوگ ہیں۔ اہل بادیہ کے سلسلہ میں میں اسے یہ ہدایت کرتا ہوں کہ ان کے فالتو اموال کا ایک حصہ لے کر انہی کے فقراء پر تقسیم کر دیا کرے کہ یہی لوگ عرب کی جان اور اسلام کی اصل آبادی ہیں۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ذمہ داری میں داخل ہیں' ان کے بارے میں میں اسے یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ پر پوری طرح کاربند رہے۔ ان کے دفاع میں جنگ کی جائے اور ان پر کبھی ان کی قوت برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے(۲)۔"

آپ کی وصیت آپ کے عمر بھر کے طرز عمل کا عکس بھی پیش کرتی ہے' آپ کے تجربات کا نچوڑ بھی ہے اور آپ کی انتظامیہ کی کامیابی کا راز بھی۔ عموماً ترقی و خوشحالی سے معزز طبقات بھی نمایاں فائدہ اٹھاتے ہیں اور شہری بھی' لیکن دیہاتی لوگ بکھرے ہوئے ہونے اور دور دراز علاقوں سے تعلق کی وجہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ انہیں مناسب وسائل' سہولیات اور تحفظات میسر نہیں آسکتے اور ان کے صحیح احوال بھی حکمرانوں کے ایوانوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ یہ مسئلہ عہد حاضر میں بھی اسی طرح گمبھیر ہے' جیسے کئی صدیوں پہلے تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ان کا دیگر طبقات کی طرح یکساں طور پر احساس تھا' چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے "میں اسلام میں چار چیزوں کو تباہ نہیں ہونے دوں گا اور انہیں کسی حالت میں نہیں چھوڑوں گا۔ اول یہ کہ میں اللہ کے مال کے جمع کرنے اور حفاظت کرنے میں پوری طاقت استعمال کروں گا۔ ہم اسے اس مقام پر خرچ کریں گے جہاں خرچ کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ہم نے عمرؓ کے خاندان کو بالکل الگ کر دیا ہے۔ ہمارے قبضے میں کچھ مال و دولت نہیں ہوگی۔ دوم یہ کہ وہ مہاجرین جو تلواروں کے سایوں میں جنگ کر رہے ہیں قید نہیں کیے جائیں گے۔ انہیں تکلیف نہیں دی جائے گی' ان کو اور ان کے اہل و عیال کو مال غنیمت فیاضی کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا اور جب تک وہ واپس آئیں میں ان کے اہل و عیال کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ سوم وہ انصار جنہوں

---

(۱) سعد ۲۹۸/۳' بلاذری ۴۳۹/۱ (۲) بخاری ۱۰۷/۲' یوسف: ۱۳۱' سعد ۳۳۹/۳۔

نے اللہ کی راہ میں قربانی دی ہے اور دشمنوں سے جنگ کر رہے ہیں ان کے نیک کاموں کو سراہا جائے گا اور ان کی لغزشوں کو معاف کیا جائے گا نیز اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیا جائے گا۔ چہارم اعراب عرب کی اصل آبادی ہیں اور اسلام کا سرمایہ ہیں ان سے جنس کی صورت میں صدقہ اور زکوٰۃ لی جائے گی درہم و دینار کی صورت میں صدقہ وصول نہیں کیا جائے گا اور ان کا صدقہ انہی کے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا جائے گا [۱]۔ آپ کے حکم سے اہل عوالی (مدینے سے باہر کے دیہاتی باشندوں) کی فہرست مرتب کی گئی۔ انہوں نے ان کی خوراک جاری کر دی [۲]۔ اسی طرح یمن، شام اور عراق کے دور دراز تک کے لوگوں کو وظائف جاری کئے گئے [۳]۔ بیورے نے حضرت عمرؓ کے اس قول کو نوٹ کر کے کہ "اگر عراق کے پہاڑوں میں کسی خچر کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں مجھ سے پوچھے گا کہ میں نے اس علاقے کی سڑکیں کیوں ہموار نہیں کیں۔" تبصرہ کرتے ہوئے بجا لکھا ہے

"The moral as well as the administrative lesson from this incident might also account for the fact that balanced development and grouth of all regions was a state policy under Umar's administration[4]."

آپ نے ایک مرتبہ فرمایا "میں (دیہاتی عربوں کی آبادیوں کا) صدقہ انہیں میں لوٹاؤں گا تا آنکہ ان میں سے ہر ایک کے پاس سو اونٹ ہو جائیں۔" امام ابو عبید القاسم نے یہ واقعہ رقم کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس قسم کی اور بھی بہت سی روایات ہیں، جن کا یہاں تذکرہ مناسب نہیں۔ یہ جو کچھ ہمیں دیہاتی عربوں کے بارے میں ملتا ہے یہی عمل دیگر بستیوں کے باشندوں سواد (عراق) والوں اور الجبال کے ایرانی علاقوں کے باشندوں سے کیا جائے گا۔ جو مراعات ان عربی دیہاتیوں کو حاصل ہوں گی انہیں بھی حاصل ہوں گی اور جو پابندیاں ان عربی دیہاتوں پر ہوں گی وہی ان پر بھی ہوں گی [۵]۔ حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے ایک عامل کے پاس کچھ لوگ آئے تو انہوں نے عربوں کو تو دیا لیکن غیر عربوں کو چھوڑ دیا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں لکھا "اما بعد آدمی کیلئے یہی بدی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے [٦]۔" یہ اور اس طرح کے بے شمار واقعات حضرت عمر فاروقؓ کی ایڈمنسٹریشن کے ترقیاتی مقاصد کی تفصیلات ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ آپ نے نظمیہ عامہ کو اس ہمہ گیر کام کیلئے جس طرح سرگرم عمل کیا اور جس طرح اپنی سمجھ بوجھ اور انتظامی آلات کے ذریعے اسے فروغ دیا وہ عصر حاضر کی نظمیہ عامہ کیلئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

(۱) [illegible] ۲۲۷ (۲) سعد ۲۹۸/۳ (۳) [illegible] (٤) Buraey:248 (۵) عبید ۲۲۰ (٦) عبید [illegible]

۵۔ نظمیاتی ترقی (Administrative Development):

نظمیاتی ترقی سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت Al-Buraey نے بہت خوبصورت الفاظ میں کی ہے۔ اس کے مطابق

"Administrative development like its counteepart political development, is the quantitative or horizontal growth and improvement of administrative and governmental institutions and programmes, or a qualitative or vertical growth and improvement in terms of quality and performance of newly emerged institutions or policies of administrative system of any political society[(1)]."

اس تصور سے اس کی بے پناہ اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس سے مراد دراصل مختلف قاعدے اور فنی طریقے استعمال کر کے انتظامی اداروں کی اصلاح کرنا اور انہیں بہتر بنانا اور ترقی دینا ہے۔ دورِ جدید میں ہر اعتبار سے ترقی ہی انسان کا مقصودِ زندگی ٹھہری ہے۔ ہر فرد، قوم، ملک اور بین الاقوامی ادارے اسی میں ہمہ وقت لگے ہوئے ہیں لیکن یہ اس وقت ممکن نہیں ہے جب تک پبلک ایڈمنسٹریشن اور اس کے مختلف اداروں کو ترقی نہ دی جائے کیونکہ ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کا سارا انحصار اسی پر ہوتا ہے۔ ترقی وجدیدیت کا یہی سب سے بڑا آلہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا کے سماجی علوم میں سے علم انتظامیات کو سب سے زیادہ اہمیت و مقبولیت حاصل ہو رہی ہے تاکہ نظمیاتی ترقی کو ممکن بنایا جاسکے۔ حکومت کے انتظامی اداروں کو فروغ دینے اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کیلئے وفاقی سطح پر الگ ادارہ قائم کیا جاتا ہے جو مستقل طور پر یہی کام کرتا رہتا ہے۔ پاکستان میں اسے (O&M) یعنی آرگنائزیشن اینڈ مینجمنٹ ڈویژن کہا جاتا ہے لیکن اس کی اپنی کارکردگی ناقص ہے۔ اس کی ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ مختلف انتظامی ادارے اپنے اپنے شعبے میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ترقی کو فروغ دینے میں ناکام ہیں۔ سیاسی، سماجی، معاشی، تجارتی، صنعتی، عدالتی، قانونی، تعلیمی، عسکری، دفاعی، فلاحی، نشریاتی وابلاغی ادارے ہوں یا صحت، امن عامہ، احتساب اور قانون سازی سے متعلق ادارے۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ تک اپنے اہداف و مقاصد کے حصول میں ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی پالیسیاں وقتی، ہنگامی اور محدود نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان کے فیصلے ذاتی، گروہی اور طبقاتی مصلحتوں سے آلودہ، ان کا طریق کار فرسودہ، حاکمانہ اور ظالمانہ، ان کا طرزِ عمل لوگوں کی توہین و تذلیل، نوعیت انکی سستی و کاہلی، محض ضابطوں کی کارروائی اور غیر ذمہ داری پر مبنی، ان کا اصل کام مسائل کے حل کے بجائے نئے مسائل پیدا کرنا، لوگوں کی سہولت و خدمت کے بجائے ان کیلئے مشکلات پیدا کرنا، قوانین کو فلاح و بہبود کے بجائے رکاوٹیں ڈالنے کیلئے استعمال کرنا ہے۔ ان کا عملہ گریڈوں کے چکر میں اندھا، باہمی تعاون کے بجائے انتشار و تصادم کا عادی، ٹانگیں کھینچنے اور ٹانگیں مارنے کا شوقین۔ یہ سب کچھ صرف ہمارے ملک ہی کی نہیں بیشتر مسلم اور ترقی پذیر ممالک کی صورتحال کا آئینہ ہے۔ بیورے نے بالکل صحیح کہا ہے

"It can be argued, with much supporting evidece, that one of the most serious problems hindring the process of development in the developing world is the lack of efficacious administrative institutions and competent personnel to run them[(2)]."

ان مسائل پر قابو پانا جس طرح آج کے دور میں ترقی کیلئے ضروری ہے اسی طرح عہد فاروقی میں بھی تھا۔ نظمیاتی ترقی کے بغیر اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

---

(۱) Buraey 230 (۲) Ibid.225۔

فاروق اعظمؓ نے اس اہم مسئلہ پر آج سے چودہ صدیاں پہلے کس طرح توجہ دی؟ کون سے اقدامات کن خطوط پر کیے؟ ان کی بنیادی روح کو محرک کیا تھا اور اہم اصول کیا تھے؟ یہ سب کچھ جاننا اس لئے ضروری ہے کہ ہم عہد حاضر میں غیروں کی نقالی کرنے کے بجائے ایک جدید اور ترقی یافتہ اسلامی انتظامی ماڈل تشکیل دے سکیں جو ایک طرف ہمارے تمام انتظامی مسائل حل کر سکے اور دوسری طرف بقاء خودداری آزادی تشخص روایات اور ثقافت کی حفاظت کر سکے۔ آپ نے اس سلسلے میں جو کام کئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(الف) انتظامی ڈھانچے کی تشکیل.

آپ نے ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا جو ایسی وسیع و عریض سلطنت کی ضروریات کا کفیل ہو جو قبل ازیں چار بادشاہوں کے زیر تسلط رہ چکی ہو۔ بقول طبری "مصر فتح ہوا تو تمام سابقہ ممالک ایک شخص (خلیفہ) کے زیر نگیں آ گئے اور مختلف اقوام و سلاطین اس سے فیض یاب ہونے لگے۔ مصر کا الگ بادشاہ ہوتا تھا۔ اہل مکران کا بادشاہ راسل دردبر ہوتا تھا اہل سجستان کا اپنا بادشاہ ہوتا تھا اور اہل خراسان حریاب کا بادشاہ خاقان کہلاتا تھا"[۱]۔ "تقریباً ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل رقبے پر پھیلی ہوئی یہ عظیم الشان ریاست دور جدید کی سترہ ریاستوں پر مشتمل تھی جہاں مختلف مذاہب قومیتیں تہذیبیں زبانیں اور نسلیں مجتمع ہو گئی تھیں۔ ان کے ہر طرح کے معاملات سنبھالنا انہیں کنٹرول کرنا ان کے مسائل و مشکلات کو حل کرنا انہیں اپنا ہمنوا بنانا اور ان کی فلاح و ترقی کا اہتمام کرنا اور اسلامی تہذیب و ثقافت میں جذب کرنا اتنا عظیم اور دشوار کام تھا جو تنظیمی ترقی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ فاروق اعظمؓ نے نہایت فراست و تدبر اجتہادی بصیرت اور گہرے غور و خوض کے بعد تنظیمی ترقی کے ہر پہلو پر توجہ دی اور اسے بے مثال بنایا۔ آپ نے جو نئے اور منفرد اقدامات کئے وہ آپ کی "اولیات" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو نظام مملکت اور پبلک ایڈمنسٹریشن کو جدید ترین خطوط پر استوار کرنے سے متعلق ہیں۔

مثلاً انتظامی ضروریات کے پیش نظر سن ہجری کا آغاز انتظامی ذمہ داری کیلئے نہایت بامعنی و مقدس لقب "امیر المومنین" کا اختیار کرنا ملک کی دفاعی و انتظامی ضروریات کیلئے نئے نئے شہروں کو جدید خطوط پر "بسانا" افواج کی باقاعدہ تنظیم و ترتیب محاکم و دفاتر کا قیام وظائف کے نظام کا آغاز زمینوں کی پیمائش براہ راست حالات سے آگہی کیلئے گشت کا طریقہ اختیار کرنا صوبوں کے گورنروں کے خلاف اس علاقے کے لوگوں کی شکایات سننے اور بروقت ان کا ازالہ کرنے کیلئے حج پر ان کی حاضری کو یقینی بنانا اور انہیں کھلی کچہری میں پیش کرنا سزاؤں میں جلاوطنی وسوی کا آغاز زرعی ترقی کیلئے نہری نظام کا قیام حاجیوں کی سہولت کیلئے مقدس و پبلک مقام خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی توسیع ضروری اشیاء محفوظ رکھنے کیلئے گوداموں کا اہتمام تجارتی ٹیکس عشور کا نفاذ تاکید و تنبیہ کیلئے درہ کا ہاتھ میں رکھنا نئے شہروں کی آبادکاری بحری راستوں سے غلہ منگوانا مساجد میں قندیلوں کا اہتمام گھوڑوں کی زکوٰۃ مسجد نبوی میں وسعت اور فرش کو پکا کرانا وغیرہ[۲]"۔

جیسا کہ ان اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے آپ نے حکومتی اور انتظامی ڈھانچہ کی آئینی و دستوری ترامیم اور فقہی و قانونی طریقوں کو اختیار کر کے وضع نہیں کیا تھا بلکہ اسلام کے بارے میں اپنے مجموعی فہم اور اجتہادی بصیرت کا بھرپور استعمال کیا حیران کن رفتار سے بڑھتی ہوئی فتوحات اور تیزی سے بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے آپ پے در پے انتظامی اقدامات کرتے رہے اور حسب ضرورت نظم عامہ کے اہلکاروں کو اسکی ہدایات و رہنمائی فراہم کرتے رہے جن سے بتدریج ایک مربوط و مستحکم انتظامی ڈھانچہ معرض وجود میں آ گیا جو نہ صرف آپ کے بعد کے ادوار کیلئے مفید ثابت ہوا بلکہ عصر حاضر کی سیاسی و انتظامی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی افادیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ نظام نظری تجریدی اور فلسفیانہ بحثوں کے بجائے ٹھوس عملی حقائق اور ناگزیر

---

(۱) طبری [illegible] (۲) [illegible]

ضرورتوں کی بنیاد پر قائم ہوا۔ حسین ہیکل نے بالکل درست کہا ہے "وسیع و برق رفتار فتوحات کے دور میں تدوینِ دستور کی گنجائش ہوتی ہے نہ وہ اسے برداشت کرتا ہے' چنانچہ فتوحات کا دور بالطبع اجتہاد کا دور ہوتا ہے' جس میں ہنگامی حالات اور ان کے مقتضیات کو دیکھ کر ہی فیصلہ کیا جاتا ہے"[1]۔ اس ڈھانچے کی ایک اور خاصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تشکیل محض آپ کی ذاتی سوچ اور انفرادی ذوق کی مرہونِ منت نہیں ہے بلکہ آپ نے اسلام کے ہمہ گیر اصول "مشاورت" کو اس کی حقیقی روح اور ضابطوں کے مطابق اختیار کیا۔ ہر بنیادی پالیسی' یا قدم اور اہم تبدیلی کیلئے اصحاب شوریٰ کی طرف رجوع کیا اور آزادانہ بحث و تمحیص اور مکمل غور و خوض اور متعلقہ معاملے کے تمام پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا۔ اس طرح آپ اسلام میں شورائی اجتہاد کے خالق ہیں۔ آپ کے بیشتر فیصلے اجماعی ہیں۔ اس لئے قرآن و سنت کے بعد شریعت کا سب سے بڑا ماخذ یہی ہیں کیونکہ ان میں صحابہ کرام کا اجماع پایا جاتا ہے۔ "آپ احکام و اجتہاد میں سب سے زیادہ مشورہ کرتے تھے"[2]۔ فتووں سے پہلے اہل بدر سے مشورہ کرتے تھے[3]۔ "بعد ازاں مہاجرین و انصار سے مشورہ کرتے"[4]۔ جب ضرورت محسوس ہوتی مسجد نبوی میں کھلے عام مشورہ کرتے' ہر آدمی اس میں اپنی رائے دے سکتا تھا[5]۔ آپ کے ہاں قرآن کے قاریوں کی محفل لگی رہتی تھی اور مشورے میں ہر عمر کے لوگ شریک ہوتے تھے[6]۔ امیر المومنین کا لقب اختیار کرنے سے پہلے بھی مشورہ کیا[7]۔ شراب کی سزا اسی کوڑے مقرر کرتے وقت بھی مشورہ فرمایا[8]۔ دیوان کی ترتیب[9]' زمینوں کے پیمائش کے اہتمام سمیت اکثر و بیشتر معاملات باہمی مشاورت سے طے کئے گئے۔

پھر آپ نے مقامی و علاقائی مسائل کے حل کیلئے عمال کو بھی اس بات کا پابند بنایا کہ وہ صالح' سمجھدار ماہرین اور مقامی حالات سے واقف لوگوں سے مشورہ کیا کریں تاکہ وہاں کی ایڈمنسٹریشن معروضی حالات کے مطابق فیصلے اور کام کرسکے۔ روایت میں آتا ہے کہ قاضی شریح نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا' وہ کثرت ان سے پوچھتے رہتے تھے' تو انہوں نے جواب میں لکھا "سب سے پہلے کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر اس میں نہ ہو تو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے موافق فیصلہ کرو۔ اگر اس میں نہ ہو تو صالحین کے فیصلے کے مطابق عمل کا مطلب یہ ہے کہ اگر انہوں نے کسی بارے میں کوئی چیز طے کر رکھی ہے' تو اسی کو جاری رکھو۔ اگر نہیں ہے تو ان کو مشورے میں شریک کرکے فیصلے کرو۔ اپنی ذاتی مرضی کو کم سے کم دخل دو۔ اگر اس میں بھی نہ ہو تو جیسے چاہو آگے بڑھو یا پیچھے ہٹو۔ میں سمجھتا ہوں کہ پیچھے ہٹنا تیرے لئے زیادہ بہتر ہے"[10]۔ "بصرہ سے احنف بن قیس ایک وفد کے ساتھ آئے' وہاں کی اقتصادی مشکلات کا ذکر نہایت سمجھداری اور خوبصورت انداز میں کیا۔ آپ نے حضرت ابو موسیٰؓ جو وہاں کے گورنر تھے لکھا کہ "احنف کو اپنا مقرب بناؤ' معاملات حکومت میں صلاح مشورہ کرو اور ان کی بات مانو"[11]۔ "آپ نے فرمایا "یہ نوجوان اہل بصرہ کا سردار ہے"[12]۔ "آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھا "فوجی امور میں طلیحہ اسدی اور معدی کرب سے مشورہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ماہر اور آزمودہ لوگ ہیں البتہ انہیں کسی درجے میں حکومتی کام نہیں سونپا جانا چاہیے"[13]۔ "ذمہ داری نہ سونپنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ معدی نے عہد صدیقی میں نبوت کے جھوٹے دعویداروں کی مدد کی تھی اور طلیحہ خود دعویداروں میں سے ایک تھا البتہ بعد میں توبہ کرکے مسلمان ہوگئے۔ اس لئے ان سے احتیاط ضروری تھی' مگر وہ جو تجربہ رکھتے تھے اس سے علاقائی و مقامی حالات کی روشنی میں مشورہ حاصل کرنا انتظامی طور پر مفید ہو سکتا تھا۔

اسی طرح آپ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو شام کی مہمات میں وہاں کے بااثر اور تجربہ کار دانشوروں' سلیط اور مسلمہ سے بھی مشورے کا حکم دیا[14]۔ اس طرح انتظامی معاملات میں اس مشاورتی طریق کار کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کا دیا ہوا نظام مسلمانوں کی اجتماعی سوچ اور تجربات کا آئینہ دار بن گیا جس میں استواری و پائیداری کی صفت

---

(1) ہیکل ۵۷۴ (2) محمصانی ۲۹۶ (3) مغنی ۲۹۹/۱ (4) سعد ۳۲۹/۲ (5) بلاذری ۲۶ (6) عبدالرزاق ۱۱ ۴۴ (7) سیوطی ۱۳۶ (8) سعد ۲۹۰/۳ سیوطی ۱۳۷ (9) طبری ۳ ۱ طبری ۴ ۹ ۲ سعد ۲۹۵/۳ (10) نسائی ۸ ۲۳۸ دارمی ۱ ۶ (11) ابن اثیر ۲ ۲۸ کثیر ۸۲/۷ (12) طبری ۷۵/۴ (13) طبری ۱۲۱ (14) مسعودی ۳۱۶/۲

پیدا ہو گئیں۔ اس ڈھانچے کی ایک اور خاصیت یہ تھی کہ وہ ہر علاقے کے مقامی حالات، رواجات، ضروریات اور تہذیبی و ثقافتی عوامل سے ہم آہنگ ہو کر چلنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جس کی تفصیل اور مثالیں ہم "مطابقت" کے عنوان سے پیش کر چکے ہیں۔ جو عناصر اسلام کے مجموعی مزاج، مقاصد اور فریم ورک میں فٹ ہو سکتے ہوں ان کے ناجائز ہونے کی کوئی علت و قرینہ موجود نہ ہو اور نتائج و کارکردگی کے اعتبار سے مفید ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو ملیامیٹ کیا جائے۔ تمام معاملات کے سلسلے میں اسلام کی یہی حکمت عملی ہے۔ اسی لئے مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ممنوعات بہت محدود ہیں۔ فاروق اعظمؓ نے نظمیاتی معاملات میں اسی کو آگے بڑھایا۔ بقول ہیکل "اگر حضرت عمرؓ جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں میں کوئی ایک نظام وضع کرنے کی کوشش کرتے، تو اس کے نتائج نہ ان کیلئے خوشگوار ہوتے نہ مسلمانوں کیلئے۔ شہریوں کو بدویانہ نظام خوش نہ آتا اور بدوی شہری نظام قبول نہ کرتے اس میں حرج نہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں مثلاً یمن وغیرہ میں ان کا سابقہ نظام بحال رہے اور حضرت عمر بس یہی کریں کہ ہر ریاست میں اپنا ایک والی بھیج دیں، جو وہاں مدینہ کی حکومت قائم کر کے لوگوں سے صدقات وصول کرے، ان میں اللہ کی حدود قائم کرے اور انہیں دین کی تعلیم دے، تاکہ وہ اپنی زندگی کو اس کے احکام کے سانچے میں ڈھال لیں اس کے سوا باقی تمام معاملات میں ہر قوم اور ہر قبیلے کی شخصی آزادی برقرار رکھی جائے، جس کے وہ برسوں سے عادی چلے آ رہے ہیں اور ان ریاستوں کے باہمی روابط کو مملکت کے مجموعی مفاد پر اثر انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اب جبکہ بدو عرب کا نظام یہ تھا، ہمیں حق پہنچتا ہے کہ آج کل ایک دستوری اصطلاح مستعار لے کر ان روابط کو ایک ایسے وفاق سے موسوم کریں، جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوئٹزرلینڈ کی ریاستوں کے مشابہ تھا[1]۔"

فاروق اعظمؓ کے اس انداز سے عصر حاضر کی تمام اسلامی مملکتوں کیلئے یہ جواز پیدا ہوتا ہے کہ وہ نظام حکومت اور ایڈمنسٹریشن میں اسلامی اصول و ضوابط اور بنیادی اقدار کے اندر رہتے ہوئے حالات و وقت کے مقتضیات اور نئے نئے تجربات سے بھرپور استفادہ بھی کر سکتے ہیں اور انہیں مقامی ضروریات سے ہم آہنگ بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح مختلف صوبوں اور علاقوں کے رجحانات و اختلافات کو بھی مناسب توجہ کا مستحق سمجھتے ہوئے اپنی پالیسیوں کو لچکدار بنا سکتے ہیں، تاکہ وسیع تر ملی، قومی اور ملکی مقاصد حاصل کئے جا سکیں اور ان میں کوئی تضاد و تصادم پیدا نہ ہو۔ جیسا کہ ہم انجذاب اور مطابقت کے عنوانات کے تحت دیکھ چکے ہیں کہ آپ نے صوبوں اور علاقوں کی انتظامی تقسیم دفتری انتظامات و مالیات کی مینجمنٹ میں سالہا سال کے تجربات پر لوگوں کیلئے مانوس سٹرکچر کو تہہ و بالا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس میں حسب ضرورت ترمیم و اضافہ کو کافی سمجھا۔ جہاں خوشہ چینی کی ضرورت تھی، بغیر مرعوبیت و نقالی کے جذبے کے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

(ب) انتظامی اداروں کا قیام:

حضرت عمرؓ نے ایک طرف تو فتوحات کو وسعت دی کہ قیصر و کسریٰ کی وسیع سلطنتیں ٹوٹ کر عرب میں مل گئیں اور دوسری طرف حکومت و سلطنت کا نظام قائم کیا اور اس کو اس قدر ترقی دی کہ ان کی وفات تک حکومت کے جس قدر مختلف شعبے ہیں، وہ سب وجود میں آ چکے تھے[2]۔ نظمیاتی ترقی کا ایک ناگزیر پہلو یہ کہ معاملات و مسائل کے اضافے اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ قائم شدہ انتظامی اداروں کو بھی ترقی دی جائے اور نئی ضرورتوں کے پیش نظر نئے نئے ادارے قائم کئے جائیں، جو حکومتی کارکردگی کو بہتر، موثر اور تیز رفتار بنا سکیں۔ نوعیت کے اعتبار سے حسب ذیل گیارہ ادارے تھے

(۱) عدالت	(۲) بیت المال	(۳) محاصل	(۴) فوج	(۵) پولیس	(۶) تفتیش و احتساب
(۷) افتاء	(۸) اوقاف و عطیات	(۹) امور خارجہ	(۱۰) نظارات نافعہ	(۱۱) تعلیم و مذہبی امور	

---

(۱) ہیکل ۵۸۱ (۲) شبلی ۱۸۷:۲۔

آپ کے ان اداروں کی تشکیل و تنظیم سے تقسیم کار کا ایک مربوط سلسلہ شروع ہوا۔ آپ نے ان شعبہ جات کو صوبوں تک پھیلا دیا۔ ان کا رخ صحیح رکھنے اور انہیں مرکزی پالیسیوں کے تابع رکھنے کیلئے براہ راست مرکز کے کنٹرول میں رکھا، ان کے عہدیداروں کا تقرر خود ہی کرتے تھے اور انہیں حسب ضرورت رہنمائی و ہدایات فراہم کرتے تھے۔ مثلاً آپ نے کوفہ میں حضرت سعدؓ کو پھر حضرت عمار بن یاسرؓ کو گورنر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے استعفیٰ دیا تو حضرت جبیر بن مطعمؓ کا تقرر کیا۔ پھر اس کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا تقرر کیا، جو آپ کی وفات تک برقرار رہے[1]۔ آپ عمال کو کسی علاقے پر مستقل طور پر قائم رکھنے کے بجائے تبدیل کرتے رہتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو تین مرتبہ بصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ حضرت علاء بن حضرمیؓ کو دو مرتبہ بحرین کا عامل بنایا[2]۔

اس پالیسی میں بے شمار حکمتیں پائی جاتی تھیں ایک یہ کہ انہیں ذاتی طور پر اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا موقع نہ ملے دوسری یہ کہ وہاں کی علاقائی اور گروہی سیاست میں فریق نہ بن سکیں۔ تیسری یہ کہ زیادہ دیر تک حاکم رہنے کی وجہ سے عوام کو جو شکایات پیدا ہوتی تھیں ان کا ازالہ ہو جائے۔ چوتھی یہ انتظامی امور میں نیا جذبہ اور جدت پیدا ہوتی رہے۔ آپ نے لشکر اور صلوٰۃ کی ذمہ داری بھی وہاں کے حاکم ہی کے سپرد کی، وزیر و معلم کے طور پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا تقرر کیا، جو بڑے عالم اور مفسر تھے۔ قضاء اور بیت المال کے امور بھی انہیں کے سپرد کر دیئے[3]۔ بعد میں قضا پر شریح کو مقرر فرمایا اور عبداللہ بن عبداللہ کو فوج کا سربراہ بنا دیا[4]۔ دریائے دجلہ کے سیراب کردہ علاقوں حضرت حذیفہ بن الیمان کو اور دریائے فرات کے سیراب کردہ علاقوں پر جو کوفہ کے صوبے میں آتے تھے حضرت عثمان بن حنیف کو مقرر کیا۔ ان دونوں کے ذمے ان علاقوں کی پیمائش اور درجہ بندی بھی تھی[5]۔ آپ نے ان علاقوں پر اور ان ذمہ داریوں پر تعیناتی کے سلسلے میں بھی تین مرتبہ تبدیلیاں کیں۔ آغاز میں حضرت نعمان بن مقرن اور سوید بن مقرن کو مقرر کیا۔ انہوں نے بعد میں یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ "ہمیں اس کام سے معافی دی جائے جو بدکار عورت کی طرح اپنی زیب و زینت دکھا کر تباہ کر رہا ہے۔" آپ نے ان دونوں کو سبکدوش کر کے حذیفہ بن اسید غفاری اور جعفر بن عمرو المزنی کو مقرر کیا، پھر ان دونوں نے بھی استعفیٰ دے دیا، تو پھر مذکورہ بالا دونوں کا تقرر فرمایا[6]۔

آپ نے چار انتظامی اداروں کو بالکل الگ رکھا۔ انتظام، عدالت، فوج اور مالیات اس میں بہت بڑی حکمت یہ تھی کہ یہ سب ادارے نوعیت کے اعتبار سے نہایت اہم تھے۔ ان کی ترقی و استحکام اسی صورت میں قائم رہ سکتا تھا کہ باہمی ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کریں اور آزادانہ طور پر کام کرتے رہیں اور یہ کہ ان کا باہمی اختلاف مقامی انتشار کا باعث نہ بنے اور باہمی اتحاد مرکزی گرفت کو کمزور نہ کر دے۔ ان کو براہ راست اپنے کنٹرول میں رکھتے تھے، معاملات خوش اسلوبی سے چلتے رہیں اور ان کا ہر چھوٹا بڑا معاملہ آپ کی نظر میں ہو اور ان کا ارتقاء آپ کی پسند و مرضی اور آپ کی سوچ اور ذہن کے مطابق ہو۔

(ج) دیوان کا قیام:

نئے انتظامی اداروں کے قیام کے سلسلے میں آپ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے دفتری نظام کو ترقی دی اور سیکرٹریٹ کا آغاز کیا۔ اسے دیوان کہا جاتا تھا[7]۔ دیوان ایک فارسی لفظ ہے جسے معرب کر لیا گیا ہے اس کے معنی ہیں رجسٹر۔ جس میں فوجیوں اور وظیفہ خواروں کے نام درج کئے جائیں۔ بعد میں اس لفظ کا مفہوم بدل گیا اور یہ اس مقام کیلئے استعمال ہونے لگا جہاں سرکاری کاغذات رکھے جاتے ہیں، جسے آج کل کی اصطلاح میں محافظ خانہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ان عمارتوں پر بولا جانے لگا جن میں سرکاری دفاتر ہوں اور ساتھ ہی رجسٹر کے معنی میں بھی[8]۔ آپ نے جو دیوان بنائے ان کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔

---

(۱) طبری ٤ ۱۳۹ (۲) طبری ٤ ۸٦ (۳) مسعودی ۲ ۳٤۲ یعقوبی ۱۷۱ (٤) طبری ٤/ ۱٥٥ (٥) ماوردی ۱۷٦ (٦) طبری ٤ ۱۳۹ (۷) ماوردی ۱۹۹

(۸) ہیکل ٦۱۰

(i) دیوان انشاء:

اس سے مراد سرکاری مراسلات و دستاویزات کا محکمہ۔ اس میں احکامات' خطوط' جوابات اور معاہدات وغیرہ کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ یہ دراصل اسلام میں سب سے پہلا سرکاری ادارہ تھا[۱]۔ اس کا آغاز رسول اکرم ﷺ نے فرمایا اور اپنی ایک مہر بھی بنوائی جس پر "محمد رسول اللہ" کندہ ہوتا تھا۔ آپ نے بادشاہوں کو جو خط لکھے ان پر یہ مہر لگائی[۲]۔ آپ کے عہد مبارک میں اس کی نقل آپ ہی کے گھر میں ہوتی تھی۔ بعد میں حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی یہ کاغذات اپنے گھر میں رکھتے تھے[۳]۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ترقی دے کر الگ دفتر بنایا' اس کیلئے ایک الگ مکان مختص کیا[۴]۔ تمام سرکاری کاغذات پر رسول اکرم ﷺ کی مہر ثبت کی جاتی تھی' اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ سرکاری دستاویزات کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انہیں سنبھالنے اور مرتب کرنے کی وسیع پیمانے پر ضرورت تھی[۵]۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص معن بن زائدہ کو جعلی مہر بنوا کر مال حاصل کرنے کے جرم میں سزا دی[۶]۔ آپ کی یہ پالیسی تھی کہ دفتری معاملات کا نگران اور سیکرٹری غیر مسلم کو نہیں ہونا چاہئے' خواہ وہ کتنا ہی ماہر ہو کیونکہ اس میں حکومتی معاملات اور اہم راز ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ سے کہا گیا کہ شہر انبار میں وہاں کا ایک باشندہ ایسا ہے جسے دفتر کے حساب کتاب میں بہت مہارت ہے آپ اسے کاتب مقرر کر لیں۔ آپؓ نے فرمایا "اس صورت میں مجھے مسلمانوں کو چھوڑ کر (غیر مسلم) کو بھیدی بنانا ہوگا"[۷]۔ آپ عمال کو بھی غیر مسلم سیکرٹری رکھنے سے سختی سے منع فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں شام سے مال غنیمت آیا تو آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ "اپنے کاتب (سیکرٹری) کو بلائیں' تاکہ وہ مسجد میں لوگوں کو غنیمت کے مال کی تفصیل پڑھ کر سنائے۔" انہوں نے جواب دیا کہ "وہ نصرانی ہے اس لئے مسجد میں داخل نہیں ہو سکے گا۔" آپ نے غصے سے فرمایا "تم نے ایک غیر مسلم نصرانی کو کیوں اپنا کاتب بنایا[۸]۔" آپ کے نزدیک سیکرٹری ہونے کیلئے مسلمان ہونے کے ساتھ سب سے اہم شرط اس کا انشاء پرداز ہونا تھا' تاکہ وہ خطوط و مراسلات کی زبان اور ڈرافٹنگ بالکل درست کر سکے۔ اسی پر حکومت کی اور دفتری نظام کی ساکھ کا دارومدار ہوگا۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے سیکرٹری سے حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھوایا' تو اس نے عنوان میں "من ابی موسیٰ" لکھنے کے بجائے "من ابو موسیٰ" لکھ دیا۔ یہ خط جب آپ کو پہنچا تو بڑے برہم ہوئے اور انہیں لکھا "میرا خط پا کر اس سیکرٹری کو ایک کوڑا مارو اور نوکری سے الگ کر دو۔" بعض لوگوں کا خیال ہے کہ برہمی کا سبب یہ ہے کہ اس نے سرکاری آداب کا خیال نہیں رکھا۔ اسے لکھنا چاہئے تھا کہ "الی عمر بن الخطاب امیر المومنین من ابی موسیٰ الاشعری[۹]۔" ایک مرتبہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے سیکرٹری نے ایک تحریر بھیجی جس کی ابتدا بسم اللہ سے کی گئی تھی مگر کاتب نے سہواً یا قصداً بسم للہ میں سین نہیں لکھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لکھا کہ کاتب کو کوڑے لگائے جائیں۔ بعد میں کسی نے کاتب سے پوچھا تمہیں کس قصور پر مارا گیا؟ اس نے جواب دیا: "سین نہ لکھنے پر[۱۰]۔"

(ii) دیوان الخراج

یہ ایسا دفتر تھا جس میں حکومت کو مختلف علاقوں سے حاصل ہونے والے محصولات کی آمدنی اور اس کے مصارف کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ پھر ان آمدنیوں سے حکومتی اخراجات کے ساتھ ساتھ ملازمین کی تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے آپ نے ریاست کے طول و عرض میں بسنے والے تمام باشندوں کی مردم شماری کرائی اور رجسٹروں میں سب کے نام لکھوائے اور انہیں وظائف جاری کئے۔ بقول ماوردی "رجسٹروں میں ناموں کی ترتیب نسب کے اعتبار

---

(۱) سیرۃ: ۲۵۹ (۲) بلاذری: ۴۴۸ (۳) جہشیاری: ۹۲ (۴) سیوطی: ۲۲۳ (۵) سیرۃ: ۲۵۵ (۶) بلاذری: ۴۴۸ (۷) طبری: ۴/۲۰۲ (۸) سیرۃ: ۲۵۹ جوزی: ۱۱۹ بیہقی ۱۰/۱۲۷ (۹) خورشید: ۲۶۷ (۱۰) جوزی: ۱۳۲۔

سے اور وظائف کی مقدار اسلام کیلئے خدمات اور اسلام میں سبقت کے لحاظ سے مقرر کی گئی مگر جب سابقین اسلام باقی نہ رہے تو وظائف کی مقدار میں شجاعت اور حسن عمل کو مد نظر رکھا جانے لگا[۱]۔ محرم ۲۰ھ میں آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کے بعد اس کا آغاز فرمایا۔ اس سلسلے میں بھی مشورہ فرمایا کہ کس سے شروع کریں؟ لوگوں نے مشورہ دیا کہ اپنے آپ سے۔ فرمایا "نہیں! مجھے یاد ہے کہ رسول کریم ﷺ نے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب سے ابتدا فرمائی تھی[۲]۔"

فہرستیں بنانے کیلئے آپ نے تین ماہر نسبوں عقیل بن ابی طالب' مخرمہ بن نوفل اور جبیر ابن مطعم کو بلایا۔ ان سے فرمایا کہ "لوگوں کے نام ان کے مرتبے کے مطابق لکھو۔" انہوں نے جب لکھا تو بنو ہاشم سے شروع کیا ان کے بعد حضرت ابو بکرؓ اور ان کی قوم کو لکھا' پھر حضرت عمرؓ اور ان کی قوم کو بہ ترتیب خلافت لکھا۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو فرمایا "واللہ! مجھے اسی طرح پسند ہے مگر پہلے نبی کریم ﷺ کی قرابت سے شروع کرو' جو ان کے جتنا قریب ہو وہ اس تحریر میں بھی قریب ہو' عمرؓ کو بھی اسی مقام پر رکھو جہاں اس کو اللہ نے رکھا ہے[۳]۔ جب انصار کی باری آئی تو آپ نے فرمایا "سعد بن معاذ اشہلی کی قوم سے شروع کرو پھر جو ان کے قریب تر ہو[۴]۔"

مختلف علاقوں کے اعتبار سے مختلف رجسٹر ہوتے تھے' مثلاً بنو خزاعہ' بنو غسان اور حمیر وغیرہ' اسی طرح اہل یمن' شام' عراق وغیرہ کے الگ رجسٹر تھے۔ ان میں ان کے وظائف کی تعداد درج ہوتی تھی[۵]۔ شام اور عراق میں محاصل کے جو دفاتر پہلے سے موجود تھے ان کو اسلامی عہد میں اسی طرح باقی رکھا گیا۔ شام کا دفتر رومی حکومت کی وجہ سے رومی زبان میں اور عراق کا دفتر فارسی حکومت کی وجہ سے فارسی زبان میں تھا[۶]۔ اس عظیم دفتری نظام کے قیام کی ضرورت فتوحات کی وسعت اور حکومتی محاصل کی آمدنی میں بے پناہ اضافے کی وجہ سے پیش آئی۔ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں تو جو بھی آمدنی حاصل ہوتی تھی' وہ زیادہ تر غنیمت کے طور پر حاصل ہوتی' جو مجاہدوں میں تقسیم ہو جاتی۔ حکومت کو اس کا پانچواں حصہ ملتا' جو بہت محدود ہوتا۔ خراج اور فے کی آمدنی بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی' تاہم جو کچھ بھی حکومت کے پاس آتا' وہ فوراً ہی اہل مدینہ اور ضرورت مندوں میں تقسیم ہو جاتا۔ ابن جوزی کے مطابق عہد نبوی میں سب سے آخری مال جو لایا گیا' وہ بحرین سے آٹھ ہزار درہم تھا۔ آپ یہ تمام دولت ایک ہی نشست میں تقسیم کر کے کھڑے ہو گئے۔ آپ کے عہد اور عہد صدیقی میں بیت المال قائم نہیں ہوا تھا' اسے حضرت عمرؓ نے قائم کیا[۷]۔ عہد فاروقی میں مختلف علاقوں سے بکثرت مال آنا شروع ہوا' تو آپ نے نہایت ترقی یافتہ انتظامی طریقے کو اختیار کیا جو نظمیاتی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دور جدید میں حکمت اور ضرورت کے اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے اسے ہر ہر شعبے میں ہمہ پہلو ترقی دی جا سکتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ میں بحرین سے حضرت عمرؓ کے پاس آیا' ان سے ایسے وقت میں ملا' جب وہ دن کی آخری نماز عشاء میں تھے۔ میں نے سلام کیا' تو مجھ سے لوگوں کا حال پوچھا اور فرمایا "کیا لائے ہو؟" میں نے کہا پانچ لاکھ درہم۔ ارشاد ہوا "کیا تم جانتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟" عرض کی پانچ لاکھ درہم۔ پھر ارشاد ہوا "تم کیا کہتے ہو؟" عرض کی ایک لاکھ' ایک لاکھ' ایک لاکھ' ایک لاکھ' ایک لاکھ' اس طرح پانچ مرتبہ شمار کر دیا۔ آپ نے فرمایا "تم نیند میں ہو' اپنے گھر والوں کے پاس جا کے سو رہو' صبح ہو تو میرے پاس آنا۔" میں صبح کے وقت ان کے پاس گیا تو فرمایا "تم کیا لائے ہو؟" عرض کی پانچ لاکھ درہم۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "کیا وہ حلال ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں! میں اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔" انہوں نے لوگوں سے فرمایا کہ "ہمارے پاس بہت سا مال آیا ہے' اگر تم لوگ چاہو تو میں تمہیں شمار کر کے دوں اور اگر چاہو تو تمہارے لئے پیمانے سے ناپ کر دوں۔" ایک شخص نے کہا "امیر المومنین! میں نے ان عجمیوں کو دیکھا ہے کہ وہ دفتر مرتب کر لیتے ہیں کہ اسی پر لوگوں کو دیتے ہیں۔" پھر انہوں نے بھی دیوان مرتب کیا' مہاجرین اولین کیلئے پانچ پانچ ہزار' انصار کیلئے چار چار ہزار اور

---

(۱) ماوردی ۲۰۲ (۲) سعد ۳ ۲۹٦ ماوردی ۲۰۲ بلاذری ٤٤ (۳) سعد ۳ ۲۹۵' طبری ٤ ۲۱۰ (٤) سعد ۳ ۲۹٦ (۵) سعد ۳ ۲۹۷' بلاذری ۴۳۸

(٦) ماوردی ۲۰۲ (۷) جوزی ۱۰۰۔

ازواج نبی ﷺ کیلئے بارہ بارہ ہزار مقرر کیے[1]۔ جن حضرات نے اس نظام کے قیام میں آپ کو مثبت مشورہ دیا ان میں حضرت عثمانؓ حضرت خالد بن ولیدؓ ولید بن ہشام اور ہرمزان شامل ہیں[2]۔ اس نظام کے قیام کی تاریخ کے بارے میں اگرچہ مورخین کا اختلاف ہے۔ علامہ طبری' علامہ سیوطی وغیرھم کا خیال ہے کہ ۱۵ھ میں آغاز ہوا لیکن کچھ شواہد ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے یہ کہ ابن سعد' بلاذری اور ماوردی کی ۲۰ھ کے بارے میں روایت زیادہ صحیح ہے۔ آپ نے یہ انتظام اس وقت کیا' جب عراق و شام مکمل طور پر فتح ہو گئے۔ قبل ازیں آپ کی پالیسی حسب سابق تھی کہ مال پہنچنے والے دن یا پھر اگلے دن تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ ۱۶ھ میں جب مدائن کی فتح کے بعد غنیمت کے پانچویں حصے کے طور پر بہت سارا مال و اسباب آیا' جس میں کسریٰ بن ہرمز کی قباء' تلوار' پیٹی' شلوار قمیص' تاج' موزے اور طلائی کنگن بھی تھے' تو آپ نے حضرت سراقہؓ کو سب پہنائے اور فرمایا "کہو اللہ اکبر!" انہوں نے کہا اللہ اکبر! پھر فرمایا "کہو اس خدا کا شکر ہے جس نے انہیں کسریٰ بن ہرمز سے چھین کر بنی مدلج کے ایک بدو سراقہ بن مالک کو پہنایا۔" پھر ازراہ کرم آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ سے فرمایا "میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اسے فروخت کر کے شام سے پہلے پہلے تقسیم کر دیں[3]۔"

دیگر مال کے بارے میں قسم کھائی کہ "اسے چھت نہیں ڈھانکے گی کہ آپ اسے تقسیم کر دیں گے۔" حضرت عبداللہ بن ارقمؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے مسجد میں اس کی حفاظت کرتے ہوئے رات بسر کی۔ صبح ہوئی تو سورج طلوع ہونے کے بعد آپ آئے اور چادریں ہٹوا دیں اور قادسیہ کے مال کی طرح تقسیم کرا دیا[4]۔ بلکہ شروع میں آپ اس پالیسی پر اتنی شدت سے گامزن تھے کہ ابن عمر کے بقول "امیر المومنین کی خدمت میں عراق سے خراج کا مال آیا آپ نے سے لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کیا تو ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا "امیر المومنین! کیا ہی اچھا ہو اگر اس رقم کا کچھ حصہ کسی عسکری مہم اور غیر متوقع اور ہنگامی حالات کے پیش نظر محفوظ کر لیا جائے۔" آپ نے غصے سے جواب دیا "اس شیطانی وسوسے کا جواب یہ ہے کہ میں آنے والے کل کیلئے آج اللہ کی نافرمانی ہرگز نہیں کروں گا۔ یہ تمام رقوم میں آج ہی بالکل اسی انداز میں تقسیم کر دوں گا جیسے رسول اللہ ﷺ بانٹ دیا کرتے تھے[5]۔" آپ کی اجتہادی بصیرت نے بعد میں حالات و وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی جذباتی سوچ پر نظر ثانی کرنے اور اپنی حکمت عملی تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ آپ اسی نتیجے پر پہنچے کہ انتظامی معاملات میں شریعت کی روح کی حفاظت اور وسیع تر مقاصد و مصالح کے حصول کیلئے نیا طریق کار اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں' یہی آج کے عہد کیلئے آپ کا ایک خوبصورت پیغام ہے۔

(iii) دیوان الجند :

حضرت عمرؓ سب سے پہلے شخص تھے' جنہوں نے فوج کو ایک منظم شکل دی اور فوجی نظم و نسق کیلئے دیوانی فوج قائم کی۔ اس محکمے کے فرائض میں سپاہیوں کے نام' ان کے اوصاف' ان کی تنخواہوں کی مقدار اور ان کے کارناموں کے بارے میں مکمل معلومات بہم پہنچانا اور دوسرے انتظامی معاملات داخل تھے[6]۔ آپ کو فوجیوں کے رجسٹروں کا اہتمام کرنے کا خیال کیوں اور کیسے آیا؟ اس کی وضاحت اس روایت سے ہوتی ہے "حضرت عمرؓ نے ایک بڑا لشکر تیار کر کے روانہ کیا اور اہل لشکر اور اس کے اہل خاندان کو مصارف بھی تقسیم فرما دیے۔ اس وقت آپ کے پاس ہرمزان موجود تھا۔ اس نے عرض کی "اگر کوئی فوج سے نکل کر اپنے گھر بیٹھ جائے تو سپہ سالار کو کیسے معلوم ہو گا آپ ان کیلئے دیوان بنوائیں۔" پھر اس نے دیوان کے بارے میں تفصیلات بتائیں[7]۔

---

(۱) سعد ۳/ ۳۰۰' ۳۳۰' بلاذری: ۴۳۹' ماوردی: ۱۹۹ (۲) سعد: ۳/ ۲۹۵' طبری: ۴/ ۲۰۹' یعقوبی ۱۵۰' ماوردی: ۱۹۹ (۳) کنز II: ۷/ ۶۸ (۴) کنز II: ۷/ ۶۹ (۵) حور فضا: ۱۰۱ (۶) حسن ۲۰۲' (۷) ماوردی: ۱۹۹۔

آپ نے حساب کتاب رکھنے کیلئے مستطیل کاغذ استعمال کیا ـــ لپیٹ کر رکھ دیتے تھے۔ فوج کی دو قسمیں ہوتی تھیں 'ایک وہ جو باقاعدہ فوج تھی جو ہر وقت جنگی مہمات میں مصروف رہتی تھی اور دوسری وہ 'جسے بوقت ضرورت طلب کیا جاتا تھا اسے "مطوعہ" کہتے تھے 'اسپ کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ ابتداء میں فوجیوں اور دیگر سرکاری ملازمین کا نام یک ہی رجسٹر میں درج ہوتا تھا 'لیکن رفتہ رفتہ اس سیغے کو ۱۵ھ میں اس قدر مرتب اور منظم کردیا کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ آپ نے بے شمار فوجی چھاؤنیاں قائم کیں 'بارکیں بنائیں' قلعوں کی تعمیر و مرمت کی' تمام چھاؤنیوں میں اصطبل اور رسد خانے قائم کئے 'فوج کا اندرونی نظام قائم کیا اور افسران کے ذریعے ان میں تنخواہیں تقسیم کی جاتی تھیں۔ انہیں "عریف" کہا جاتا تھا اس کی نوعیت اس طرح تھی کہ محرم میں تنخواہ 'فصل بہار میں بھتہ اور فصل کٹنے کے وقت خاص خاص جاگیروں کی آمدنی تقسیم ہوتی تھی 'ایک عریف یک لاکھ درہم تقسیم کرتا تھا۔ کوفہ و بصرہ میں سو عریف ہوتے تھے 'جن کے ذریعے ایک کروڑ درہم تقسیم ہوتے تھے' تنخواہوں میں کارنامے 'سپاہیانہ کارکردگی اور حفظ وغیرہ کی وجہ سے اضافہ کیا جاتا تھا اور خصوصی انعامات بھی دیئے جاتے تھے۔ مقررہ رقوں کے علاوہ مال غنیمت مراتب کے اعتبار سے فوج میں تقسیم ہوتا۔ اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی تھی' چنانچہ جلولا میں نو نو ہزار اور نہاوند میں چھ چھ ہزار درہم یک فوجی کے حصے میں آئے۔ ہر فوج کے ساتھ یک افسر خزانہ 'ایک محاسب 'ایک قاضی اور متعدد مترجم ہوتے تھے[1]۔

جہاد کیلئے الگ گھوڑے اور اونٹ ہوتے تھے 'جن کی رانوں پر جیش "فی سبیل اللہ" لکھا ہوتا تھا ان کی پرورش کیلئے نقیع کی چراگاہ مختص تھی 'جہاں سے سالانہ تیس ہزار اونٹ اور تین سو گھوڑے اللہ کی راہ میں سوار کرائے جاتے۔ آپ یہ بھی فوجیوں کو دیتے جنہیں دیتے ان کا سامان کجاوے' جھولیں درست کرا کے دیتے۔ کبھی اس کام میں خود بھی شریک ہوتے اور ضرورت کا سامان بھی ساتھ دے کر روانہ فرماتے[2]۔ مستقل فوج کو قائم کرنے ہی کی ضرورت تھی 'جس کی وجہ سے سرکاری اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ انہیں گزر اوقات کیلئے کاروباری معاشی سرگرمیوں اور زراعت و باغبانی سے دور رکھا جائے اور ان کی کفالت کا بہترین انتظام کیا جائے۔ اس لئے آپ نے سواد کی زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم نہ کرنے کی جو وجوہات بیان کیں 'ان میں یک یہ بھی تھی۔ آپ نے فرمایا "دیکھئے ان سرحدوں کی حفاظت کیلئے بہر حال کچھ آدمی تعینات کرنے ہوں گے جو مستقلاً وہاں رہیں گے۔ یہ بڑے بڑے شہر جیسے شام 'الجزیرہ 'کوفہ 'بصرہ' مصر ان میں فوجی چھاؤنیاں قائم رکھنا اور ان کو وظائف دیتے رہنا ناگزیر ہے۔ اب اگر زمینیں اور ان پر محنت کرنے والے کاشتکار تقسیم کردیئے جائیں گے 'تو ان لوگوں کو کہاں سے دیا جائے گا؟ یہ سن کر سب نے یہ کہا "آپ ہی کی رائے صحیح ہے۔ آپ نے جو فرمایا وہ خوب ہے اور جو رائے قائم کی ہے وہ بہت موزوں ہے۔ اگر ان شہروں اور سرحدوں پر افواج نہیں رکھی جائیں گی اور ان کیلئے بطور تنخواہ کچھ مقرر نہ کیا جائے گا تو اہل کفر اپنے شہروں پر پھر سے قابض ہو جائیں گے[3]۔" فوج کے دفاتر اور جنرل مرکز کی بجائے صوبوں میں ہوتے تھے۔ فوج کا سالار تمام مصارف کے بارے میں بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔ آپ اس کے حسابات پر کڑی نگرانی کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو آپ نے مشورہ دیا تھا کہ خالد بن ولیدؓ کو لکھیے کہ آپ کے حکم کے بغیر کوئی بکری اور اونٹ نہ دیں 'انہوں نے یہ خط بھیج دیا۔ جواب میں حضرت خالدؓ نے لکھا "آپ مجھ سے اور میرے کام سے سروکار نہ رکھیں۔" حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر معزول کر دینے کا مشورہ دیا 'لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مصلحۃً اس کو تسلیم نہ فرمایا[4]۔

جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے وہی حکم دیا۔ حضرت خالدؓ نے مذکورہ جواب دیا تو آپ نے معزول کردیا[5]۔ آپ افسروں کو طلب کر کے خود آڈٹ کرتے تھے۔ جلولا کی فتح کے بعد زیاد بن ابی سفیان حساب کے کاغذات لے کر مدینے آئے تو آپ نے خود انہیں چیک کیا[6]۔

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سیوطی الصبعہ فوج ص [illegible] ۲۶ (۲) سعد ۳: ۵ ۳ (۳) یوسف ۲ (۴) کنز ۷: ۴۵ (۵) عصامہ ۷: ۱۱۵ (۶) سیوطی: ۲۷۸

○ نظمیہ عامہ کا ضابطہ اخلاق:

ہر ملک کی نظمیہ عامہ اس کی سالمیت اس کے نظریے اس کے آئین اور اس کی تہذیب و ثقافت اور اس کے ہر قسم کے مفادات کے تحفظ کیلئے معرض وجود میں آتی ہے۔ اس کا کام مذکورہ امور کو نہایت اعلیٰ معیار کے مطابق سرانجام دینے کیلئے نظام کار اور انفراسٹرکچر وضع کرنا' سارے عوام کو منظم کرنا اور دستیاب مادی وسائل کو دانشمندی اور کفایت سے استعمال کرنا ہوتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم ملک کا نظریہ ہوتا ہے۔ یہ جتنا زیادہ مضبوط و مستحکم اور عوام کے دل و ذہن میں راسخ ہوتا ہے اور اس کے تمام اداروں کے مزاج و مقاصد میں روح رواں کے طور پر کام کرتا ہے' اتنا ہی اس ملک و قوم کو اعتماد' اتحاد' استحکام اور ترقی نصیب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں جن ممالک کا بنیادی نظریہ سیکولرازم ہے' وہاں نظمیہ عامہ کا سب سے پہلا فرض ہی سیکولرزم کا فروغ ہوتا ہے۔ اس کے تمام فیصلے' پالیسیاں' اقدامات کی بنیاد اسی کے اصولوں پر رکھی جاتی ہے۔ جہاں قومیت' جمہوریت' کمیونزم یا کوئی مذہب ایک نظریے کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے وہاں تمام حکومتی ادارے اسی کیلئے کام کرتے ہیں۔ اس لئے نظمیہ عامہ کے ضابطہ اخلاق کا تعین اسی نظریے کے مطابق ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی نظمیہ عامہ کو ایک تفصیلی ضابطہ اخلاق دیا' جو اسلامی شریعت سے ماخوذ تھا۔ انہوں نے شریعت کی تعلیمات' اس کی روح اور مزاج و مقاصد کو سامنے رکھ کر مرتب کیا۔ شریعت جامع اصولوں کو نہایت حکمت و بصیرت سے انتظامی معاملات پر منطبق کیا اور نظمیہ عامہ کو سختی سے اس کا پابند بنایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اس کی پوری طرح پاسداری کی یہی وجہ ہے کہ آپ کے پورے عہد خلافت میں پوری طرح نافذ رہا ہے۔ معروف مورخ علامہ مسعودی کے بقول "آپ حد درجہ متواضع تھے۔ موٹا لباس پہنتے تھے' لیکن جب اللہ اور لوگوں کے درمیان کوئی معاملہ ہوتا تھا تو اس میں حد درجہ سختی برتتے تھے۔ آپ کے جملہ عمال' افعال و اخلاق میں آپ کی پیروی کرتے تھے۔ وہ سب کے سب آپ کے سامنے آپ ہی کی طرح نظر آتے تھے[1]۔" پبلک ایڈمنسٹریشن کے شعبے میں آپ کے مقرر کردہ ضابطوں کو عصر حاضر میں اسی طرح اسلامی فقہ و قانون کا اہم ماخذ قرار دینے کی ضرورت ہے' جس طرح آپ کے اجتہادات زندگی کے دیگر شعبوں کے سلسلے میں تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ کا دیا ہوا ضابطہ اخلاق اسلامی ریاست کی نظمیہ عامہ کیلئے چراغ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ محض روحانی اور نظریاتی اعتبار ہی سے نہیں' بلکہ فنی اعتبار سے بھی دیکھا جائے' تو اس سے بہتر ضابطہ اخلاق وضع کرنا ممکن ہے۔ یہ اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہے کہ عصر حاضر میں اسے واجب الاتباع قرار دینا چاہئے' البتہ حالات و زمانہ کی تبدیلی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے اطلاق کے ذرائع اور حکمت عملی میں جہاں ترمیم کی ضرورت ہو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کیلئے رہنمائی آپ کی اس اجتہادی بصیرت سے مل سکتی ہے' جو اس کے پیچھے کار فرما ہے۔ جس کا آسانی سراغ ہمیں ان واقعات سے مل سکتا ہے' جو اس ضابطہ اخلاق کے تحت دیے ہوئے عنوانات کی تفصیل میں پیش کئے گئے ہیں۔

۱۔ اتباع شریعت:

اسلامی ریاست کی نظمیہ عامہ کے ضابطہ اخلاق میں سب سے پہلی اتباع شریعت ہے کہ وہ ذاتی طور پر احکام شریعت کے پوری طرح پابند ہوں۔ اپنی ذاتی زندگی اور طرز عمل میں شریعت کا عملی نمونہ ہوں۔ پھر ہی کہیں جا کر وہ شریعت کے نفاذ کی منصبی ذمہ داریاں پوری کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ نے بالکل بجا کہا ہے۔ "امارت و سیادت کا مستحق صرف وہ شخص ہے جو سے دینی فریضہ تصور کرتا ہو اور تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتا ہو اور اس کے تمام فرائض و واجبات کو

---

(۱) مسعودی ا ۳ ۲ ۳

حتی المقدور سر انجام دیتا ہو"[1]۔ حضرت عمر فاروقؓ نے خلافت کے دوسرے سال عراق کے خلاف جنگی مہمات کی خود قیادت کرنے کا عزم کیا۔ اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا' تو انہوں نے بالاتفاق خود مدینے میں قیام کرنے اور حضرت سعد بن مالک زہریؓ کو امیر مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے ان کو عراق کا امیر مقرر کر دیا اور انہیں وصیت کرتے ہوئے فرمایا "اے سعد بن وہیب اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ بات تجھے دھوکا میں نہ ڈالے کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ کا ماموں یا دوست کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ برائی برائی کو نہیں مٹاتی' بلکہ برائی کو نیکی سے مٹایا جاتا ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ اور کسی کے درمیان اس کی اطاعت کے بغیر کوئی رشتہ نہیں۔ پس لوگوں کے شریف اور رذیل اللہ کی ذات کے بارے میں برابر ہیں۔ اللہ ان کا رب ہے اور وہ اس کے بندے ہیں' وہ عافیت سے ایک دوسرے سے فضیلت حاصل کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے اسے اطاعت سے حاصل کرتے ہیں پس تو اس امر پر نگاہ رکھ جس پر تو نے رسول اللہ ﷺ کو بعثت سے لے کر وفات تک قائم دیکھا اور اس کی پابندی کر۔ بالتحقیق وہی حقیقی امر ہے' یہ تجھے میری نصیحت ہے' اگر آپ نے اسے ترک کر دیا اور اس سے بے رغبتی کی تو آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آپ خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے اور جب آپ نے ان سے الگ ہونا چاہا' تو انہیں فرمایا "عنقریب آپ کو ایک شدید امر سے واسطہ پڑے گا' پس آپ کو جو مصیبت آئے اس پر صبر کرنا' خوف الٰہی آپ کے کام کی تکمیل کرے گا اور یاد رکھ خوف الٰہی دو باتوں میں جمع ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اور اس کی معصیت سے اجتناب کرنے میں اور اس کی فرمانبرداری یہ ہے کہ آدمی دنیا کے بغض اور آخرت کی محبت سے اس کی فرمانبرداری کرے اور اس کی نافرمانی یہ ہے کہ آدمی دنیا کی محبت اور آخرت کے بغض کے ساتھ اس کی نافرمانی کرے اور دلوں کیلئے حقائق ہیں' جنہیں اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے' ان میں سے کچھ پوشیدہ ہیں اور کچھ ظاہر ہیں۔ ظاہری حقیقت یہ ہے کہ حق کے بارے میں اس کی تعریف اور مذمت کرنے والا برابر ہو اور پوشیدہ حقیقت یہ ہے جو اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے ظاہر ہونے اور لوگوں کے ساتھ محبت کرنے اور لوگوں کی محبت سے معلوم ہوتی ہے' پس محبت سے بے رغبتی نہ کر' بلاشبہ انبیاء نے بھی اپنی محبت کے بارے میں دعائیں کی ہیں اور اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے محبوب بنا دیتا ہے اور جب کسی بندے سے بغض رکھتا ہے تو اس کو مبغوض بنا دیتا ہے۔ پس تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا وہی مقام سمجھ' جو لوگوں کے ہاں تیرا ہے۔"

اس نصیحت کی ابتدا میں آپ نے یہ واضح کیا کہ رسول اکرم ﷺ سے نسبی تعلق کسی کام نہیں آئے گا۔ اصل تعلق اطاعت کا رشتہ ہے اس لئے آپ نے سیرت النبی کی مکمل پیروی کا حکم دیا۔ یہ وہ تصور ہے جو آدمی کو غرور و گھمنڈ کے بجائے اتباع شریعت کا پابند بناتا ہے۔ پھر آپ نے مشکل حالات میں صبر و استقامت اور خشیت الٰہی اختیار کرنے کی ترغیب دینے کے ساتھ ہی ان کے عملی پہلو بھی واضح کر دیئے' تاکہ انہیں پورے شعور اور حقیقی تقاضوں کے مطابق اختیار کیا جائے اور دین سے گہرا تعلق قائم رہے۔ آخر میں ایک منتظم کو اسلامی تعلیمات کی روشنی عوام کے دلوں میں صحیح مقام حاصل کرنے اور انہیں صحیح مقام دینے کی نصیحت کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں سے محبت کرے اور ان سے محبت لے۔ یہ وہ چیز ہے جو اسے منصبی فرائض کو اعلیٰ معیار تک ادا کرنے کے قابل بناتی ہے۔ ان کے ذہن نشین کرایا کہ عوامی فلاحی ذمہ داری پر ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے مقام و مرتبے کا تعین بھی بندوں کے دلوں میں اس کے مقام و مرتبے کے تعین سے ہوگا۔

آپ عہدیداروں کے تقرر کے وقت ان کے تقویٰ اور اتباع شریعت کا خیال کرتے اور بعد میں بھی اس کا جائزہ لیتے رہتے۔ آپ کی تعلیمات اور پالیسیوں کا عوام کو علم تھا اس لئے وہ بھی حکام کو اسی پیمانے سے جانچتے تھے۔ آپ کے عمال و گورنروں میں سے ایک حضرت سعید بن عامر بھی تھے۔ حمص کے کچھ لوگوں نے جہاں کے وہ گورنر تھے حضرت عمرؓ کے پاس شکایت بھیجی کہ وہ طلوع آفتاب کے بعد عوام سے ملتے ہیں' رات کے وقت بھی کسی سے نہیں ملتے۔ ہفتے میں ایک دن اپنے گھر

---

(1) تمیمہ ا:۵۔

سے باہر نہیں آتے۔ آپ کو جب یہ شکایت پہنچی تو فرمایا "اے اللہ مجھے عدل کی توفیق دے اور تیری فراست کم نہ کرے۔" پھر حضرت سعید بن عامر اور شکایت کرنے والوں کو مدینے طلب فرمایا اور شکایت کرنے والوں سے فرمایا "اب ان کے سامنے اپنی شکایات بیان کرو۔" چنانچہ انہوں نے مذکورہ بالا تینوں شکایتیں من و عن دہرا دیں۔ آپ نے سعید بن عامر کو حکم دیا کہ ان شکایات کا جواب دیں۔ وہ بولے "یا امیر المومنین! میرے پاس کوئی نوکر نہیں اس لئے میں صبح کا کھانا خود ہی تیار کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کے بعد لوگوں سے ملاقات کرتا ہوں۔ دوسری بات یعنی رات کے وقت لوگوں سے ملاقات نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے رات کا وقت صرف عبادت الٰہی کیلئے مخصوص کر رکھا ہے۔ تیسری بات یہ کہ میں ہفتے میں ایک روز گھر سے باہر نہیں نکلتا اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی خادم نہیں ہے جو میرے کپڑے دھو دیا کرے اور چونکہ میرے پاس عموماً صرف ایک ہی جوڑا کپڑوں کا ہے اس لئے میں اسے خود ہی دھو کر سکھانے کیلئے ڈال دیتا ہوں اور جب وہ سوکھ جاتا ہے تو اسے پہنتا ہوں۔ اس کام کیلئے میں نے ہفتے میں ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔" آپ نے سعید بن عامر کے یہ جوابات سن کر خدا کا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ بحمد اللہ عمال کے تقرر میں میری فراست کم نہیں ہے۔ پھر اہل حمص سے مخاطب ہو کر فرمایا "آپ لوگ بھی خدا کی شکر کریں کہ اس نے آپ کو ایسا امیر دیا ہے لہٰذا اس کے متعلق گمان نیک رکھا کرو اور اس سے بھلائی کے ساتھ پیش آیا کرو۔" اس کے کچھ عرصے بعد آپ نے سعید بن عامر کو ہزار دینار بھیجے اور انہیں اپنے تصرف میں لانے کی اجازت دی۔ سعید کی بیوی بولیں "خدا نے ہمیں اب فارغ البال کر دیا ہے اب آپ اپنے اور میرے کچھ کپڑے بنائیں اور گھر کیلئے کچھ تھوڑا بہت سامان خرید لیں۔" اس کے جواب میں سعید بولے "دوسرے لوگ ہم سے بھی زیادہ اس کے مستحق ہیں۔" چنانچہ انہوں نے اپنی بیوی سے کہہ کر ان دیناروں کو ایک تھیلی میں ڈالا اور تمام بنام غریبوں، ناداروں اور یتیموں میں انہیں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ تاہم ان میں سے پھر بھی جب کچھ دینار بچ گئے تو ان کی بیوی بولیں "ان باقی دیناروں میں سے آپ ایک خادم اپنی خدمت کیلئے رکھ لیں۔" سعید نے جواب دیا "کیا آپ کے خیال میں مجھے واقعی کسی خادم کی ضرورت ہے جب کہ کچھ اور لوگ ہم سے زیادہ ان دیناروں کے مستحق ہیں[1]۔"

اس روایت سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فاروق اعظم کی پبلک ایڈمنسٹریشن سے عوام کی کیا توقعات تھیں اور پھر اس سے وابستہ اہلکار بغیر کسی نمود و نمائش اور ریاء و شہرت اپنی صرف اجتماعی نہیں بلکہ نجی زندگی کو کس طرح احکام شریعت سے ہم آہنگ کرنے میں سرگرم عمل ہوتے تھے اور عوامی فلاح و بہبود کو اپنی ضروریات پر کس طرح ترجیح دیتے تھے۔ آپ نے احکام شریعت کی پیروی کا ایک ایسا جذبہ ان کے اندر پروان چڑھایا کہ وہ باہمی میل جول میں بھی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ واقعہ ہے کہ آپ کے مشہور جرنیل سعد بن ابی وقاصؓ آپ کے مقرر کردہ مدائن کے گورنر مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ سے ملے۔ وہ اکثر ریاضت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ سعد بن ابی وقاص نے ان سے مدائن میں ملاقات کی تو ان سے کہا "اے ابو عبداللہؓ! مجھے کچھ نصیحت کیجئے۔" سلمان فارسی بولے "جب کسی کام کی ہمت کرو تو خدا کا نام لیا کرو اور اس کا زیادہ سے زیادہ ذکر کیا کرو، حکمت کی باتیں بیان کرتے وقت زبان کا لحاظ رکھا کرو، جب کچھ تقسیم کرنے لگو تو ہاتھ پر نظر رکھا کرو۔" یہ کہہ کر سلمان فارسیؓ رونے لگے۔ سعد بن وقاصؓ نے ان سے رونے کا سبب پوچھا تو بولے "آپ دیکھتے ہیں کہ میرے گھر میں طہارت اور لوازم عبادت کے آرام و آسائش کا کوئی سامان نہیں ہے، لیکن حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ترک آرائش کوئی بڑی بات نہیں، خدا کا خوف سب سے اہم چیز ہے، بس اس لئے روتا ہوں کہ دنیاوی معاملات میں جو میرے سپرد ہیں مجھ سے کوئی کوتاہی نہ ہو جائے، جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بن جائے[2]۔" اس میں حضرت سلمانؓ نے حکام کے ضابطہ اخلاق کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، لیکن سب سے اہم اللہ تعالیٰ سے ہر وقت تعلق قائم رکھنا اور اس کا ذکر اور یاد ہے اور ذاتی ریاضت سے بڑھ کر ان امور کو پوری تن دہی سے ادا کرنا ہے جو منصب کی وجہ سے سپرد کئے گئے ہیں۔ ان کے بارے جوب

---

(۱) مسعودی ۲/۲: ۳۱۳ (۲) ایضاً

وہی سب سے زیادہ ہوگی۔ اللہ کی رضامندی ان کی صحیح بجا آوری سے مشروط ہے۔ حضرت عمرؓ کا اپنا طریقہ یہ تھا کہ خود احتسابی کرتے رہتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک روز میں آپ کے ہمراہ نکلا یہاں تک کہ وہ ایک احاطے میں داخل ہوگئے۔ میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا "عمر بن الخطابؓ امیر المومنین ہیں خوشی کی بات ہے' واللہ اے فرزند خطاب تجھے ضرور اللہ سے ڈرتا ہوگا' ورنہ اللہ تجھ پر عذاب نازل کرے گا"[1]۔ "آپ نے ایک مرتبہ عمال کیلئے اتباع شریعت کی اہمیت کو نہایت خوبصورت دلیل سے واضح کیا۔ ارشاد فرمایا "رعایا امام کے حقوق ادا کرتی رہتی ہے' جب تک امام اللہ کے حقوق ادا کرتا رہتا ہے۔ جب امام عیش کرنے لگتا ہے تو وہ بھی عیش کرنے لگتے ہیں"[2]۔ "ایک مرتبہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھا اس میں روم کے لشکروں اور ان کی طرف سے خطرے کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ نے حمد و ثناء کے بعد لکھا "اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بندۂ مومن پر کوئی سختی اترتی ہے' تو اس کے بعد وہ خوشی دیتا ہے۔ ایک سختی دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی"[3]۔ "اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے "یاایھا الذین امنوا اصبروا و صابروا و رابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون"[4]۔"

حضرت حسنؒ راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا "امابعد کام میں زور و قوت (اور رونق) باقی رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ آج کا کام کل پر نہ ڈالا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو تمہارے سامنے کاموں کا ڈھیر لگتا چلا جائے گا اور تمہیں یہ سدھ نہ رہے گی کہ ان میں سے کس کام کو پہلے انجام دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنے کام بگاڑ دو گے اور اس حقیقت کو کبھی نہ بھولنا کہ تمام کام امیر کیلئے اسی وقت تک پوری طرح انجام پاتے ہیں جب تک وہ امیر خود اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتا رہتا ہے' لیکن جب امیر خود حدود فراموشی اور ناحق کارروائیاں کرنے لگتا ہے تو پھر ماتحت بھی اس کے نقش قدم پر چلنے لگتے ہیں اور دیکھو لوگوں کو اپنے برسر اقتدار طبقہ سے ایک قسم کی کد اور تنفر سا پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا ہمیں اس کیفیت سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اس طرح دلوں میں کینے پیدا ہو جاتے ہیں۔ دنیا کو ترجیح دے دی جاتی ہے اور خواہشات نفس کی پیروی کی جاتی ہے' لہٰذا تم حق کو قائم کرنے میں کوشاں رہو خواہ اس مبارک مقصد کیلئے تمہیں دن کی ایک گھڑی ہی نصیب ہو"[5]۔ "آپ نے اس فرمان میں بروقت کام کرنے کیلئے نہایت اہم دلیل دی ہے' جسے دور حاضر میں سامنے رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ آبادی و مسائل میں اضافے کی وجہ سے فائلوں کے ڈھیر لگتے رہتے ہیں اور پھر بروقت کام نہ کرنے کی وجہ سے عوام بھی اذیتوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور تمام امور بھی ناقابل اصلاح حد تک بگڑ جاتے ہیں۔ دوسرا "اتباع شریعت اور حق کی پیروی کی خصوصی طور پر تاکید کی گئی ہے یہی نظمیہ عامہ کے ضابطۂ اخلاق کا پہلا نقطہ ہے۔

آپ اس بات پر بھی نظر رکھتے تھے کہ آپ کے عمال شریعت کے احکام کے مطابق امور کے فیصلے دے رہے ہیں یا نہیں؟ آپ کی طرف سے مقرر کردہ بحرین کے عامل مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ آرہے تھے۔ انہیں ربذۃ کے مقام پر عراق کے کچھ سوار احرام باندھے ہوئے ملے۔ انہوں نے شکار کے اس گوشت کے بارے میں پوچھا (کہ حلال ہے یا نہیں) جو اہل ربذۃ والوں کے پاس تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے اسے کھانے کی اجازت دی' وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس اجازت کے بارے میں شک ہو' جب میں مدینے پہنچا تو اس کا ذکر حضرت عمر فاروقؓ سے کیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "تم نے انہیں اس بارے میں کیا حکم دیا؟" میں نے کہا کہ "کھانے کی اجازت دی۔" حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا "اگر تم نے اس کے علاوہ فتویٰ دیا ہوتا تو میں تمہارے ساتھ ایسا ایسا کرتا یعنی ڈرانے لگے۔" ایک دوسری روایت کے مطابق فرمایا "میں تمہیں سزا دیتا"[6]۔ "آپ نے حضرت عتبہؓ کو لکھا "تم لوگوں کو ظلم سے بچانا' تقویٰ اختیار کرو' اور ڈرتے رہو ایسا نہ ہو کہ تمہاری غداری یا سرکشی کی وجہ سے تمہیں زوال آجائے۔ اللہ اس وقت تک تمہارے ساتھ رہے گا جب تک تم اللہ کے عہد پر قائم رہو گے۔ اس لئے تم اللہ کے عہد کو پورا کرو اس کے احکام کی پابندی کرو' وہ تمہارا مددگار رہے گا اور تمہاری مدد کرے گا"[7]۔

(۱) ابن سعد: ۳/۲۹۲ (۲) ایضاً (۳) مالک: ۴۴۲ (۴) آل عمران: ۲۰۰ (۵) عیون: ۱۲ (۶) مالک: ۳۵۱ (۷) طبری: ۴/۲۸

۲۔ قریبی رابطہ:

آپ کے دیئے ہوئے ضابطہ اخلاق کا دوسرا اصول عوام سے قریبی اور گہرا رابطہ ہے۔ یہ رابطہ پبلک ایڈمنسٹریشن کے اہلکاروں کی اخلاقی ذمہ داری کے ساتھ پیشہ ورانہ ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ نہ تو عوام کے مسائل و معاملات سے آگاہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی ان کے جذبات و احساسات کا علم ہو سکتا ہے۔ اس لئے دور جدید میں ماحول سے رابطہ و تعلقات پروان چڑھانا اور تعلقات عامہ (Public Relation) کیلئے خصوصی انتظامات کئے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محکمے اس مقصد کیلئے الگ شعبے قائم کرتے ہیں۔ آپ خود کھلا رابطہ رکھتے تھے' آپ سے گھر اور مسجد میں بلا روک ٹوک ہر وقت ملاقات ہو سکتی تھی۔ آپ کا نہ تو کوئی دربان تھا نہ ہی سیکیورٹی افسر' گلیوں' بازاروں' محلوں کے عوام کے حالات معلوم کرنے کیلئے سر عام پھرتے رہتے تھے اور پھر راتوں کو محلوں اور مدینے کے نواحی علاقوں میں گشت کرتے رہتے تھے۔ آپ اپنے اہلکاروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ جب کسی کو حاکم مقرر کرتے تھے' تو اس سے معاہدہ لکھواتے تھے اور مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کو اس پر گواہ ٹھہراتے تھے۔ اس میں یہ شرائط ہوتی تھیں' وہ عمدہ سواری پر سوار نہیں ہوگا' میدہ کی روٹی نہیں کھائے گا' باریک لباس نہیں پہنے گا اور عوام کی ضروریات کو روکنے کیلئے دروازہ بند نہیں کرے گا[1]۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ شرط بھی ہوتی تھی کہ ڈیوڑھی پر دربان نہیں رکھے گا[2]۔ ان شرائط کا اصل مقصد یہ تھا کہ حکام اپنے آپ کو عوام کی سطح پر رکھیں۔ ان کے درمیان سماجی مقام اور طبقاتی تفاوت کی دیواریں حائل نہ ہوں۔ ان کے درمیان ایسا آزادانہ میل جول' رابطہ اور قرب ہو کہ وہ ایک دوسرے کے معاملات سے اچھی طرح باخبر ہوں اور ایک ہی معاشرے کا حصہ بن کر رہیں۔ یہ چیز اسلامی نظم عامہ کے تشخص کی علامت ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا "اللہ کے نزدیک امام کے حلم سے زیادہ گرانمایہ اور بے خبری سے زیادہ قابل نفرت چیز اور کوئی نہیں"[3]۔ "ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے عمال کو مخاطب کر کے فرمایا "عوام کی طرف سے غافل ہو کر دروازے بند کر کے نہ بیٹھو"[4]۔ "ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام خط لکھا اس میں حسب ذیل نکات تھے

۱۔ واضح ہو کہ عوام اپنے بادشاہ سے دور رہتے ہیں' خدا کی پناہ اگر میں اور آپ بھی کورانہ روش اور کینہ توزی پر گامزن ہوں۔

۲۔ روزمرہ عدالت ضرور کیجئے اگرچہ تھوڑی دیر کیلئے۔

۳۔ اگر بیک وقت دو ایسے امر پیش ہوں کہ ایک میں عاقبت اور دوسرے میں دنیا کا سود و بہبود ہو تو عاقبت کو ترجیح دیجئے۔ دنیا فنا ہونے والی ہے اور عاقبت کو دوام حاصل ہے۔

۴۔ بدکردار لوگوں پر پوری نگرانی رکھئے۔

۵۔ مسلمان مریضوں کی عیادت میں کوتاہی نہ کیجئے۔

۶۔ ان کے جنازہ میں شرکت کیجئے۔

۷۔ عوام کیلئے پناہ روادہ کھلا رکھئے اور اس کے معاملات میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتے رہئے' آپ بھی تو انکی میں سے ایک فرد ہیں البتہ ان کے مقابلے میں آپ کی ذمہ داری کہیں زیادہ ہے۔

۸۔ اے ابو موسیٰ مجھے آپ کی اور آپ کے اہل بیت کی عوام کے مقابلے میں خوش لباسی پر تکلف کھانوں اور اعلیٰ سواری کی اطلاع ملی ہے اس سے بچتے رہئے کہ مویشی

---

(۱) [illegible] ۱۲٤/۷ (۲) یوسف ۱۱٦' عبدالرزاق ۲۳۳/۱۱ (۳) جوزی ۱۸۳ (٤) یوسف ۱۱۸۔

کی مانند ہری بھری دوب سے پیٹ بھرتے رہنا خود کو فربہ بنانا ہے اور فربہی کا نتیجہ آخر میں برا ہوتا ہے۔

۹۔ حاکم کی کج روی کے اثر سے رعیت بھی اسی قسم کی ہو جاتی ہے۔ بد بخت ہے وہ حاکم جس کی وجہ سے عوام بد بخت ہو جائیں۔ والسلام[۱]۔

س خط میں عوام سے قریبی رابطے اور ذمہ داریوں کی بجا آوری کیلئے ضابطہ اخلاق کے کئی سنہری اصول بیان کئے ہیں جو نظریہ عامہ اور عوام کے درمیان محبت، اخوت اور اعتماد و یگانگت کیلئے ضروری ہیں۔ ان میں جنازہ و عیادت یعنی خوشی و غمی میں شرکت نہایت اہم ہے۔ آپ ان اصولوں کی محض تبلیغ و ترغیب پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جاتے تھے 'بلکہ بطور منتظم اعلیٰ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ ان پر عملدر آمد کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ عوام کے ساتھ آپ کا ذاتی طور پر قریبی ربط اس سلسلے میں مددگار ہوتا تھا۔ آپ مختلف علاقوں سے آنے والے وفود سے وہاں کے عامل کے بارے میں پوچھتے تھے کہ "وہ کیسا ہے۔" جب جواب ملتا کہ اچھا ہے تو پھر پوچھتے "کیا تمہارے مریضوں کی عیادت کرتا ہے؟" وہ کہتے ہاں! پھر پوچھتے "کیا وہ غلام کی بھی عیادت کرتا ہے؟" جواب ملتا ہاں! پھر پوچھتے کہ "کمزوروں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے؟ کیا اس نے اپنے دروازے پر دربان رکھا ہوا ہے؟" اگر ان خصلتوں کے بارے میں ان کا جواب نفی میں ہوتا تو اسے معزول کر دیتے[۲]۔ آپ کی دی ہوئی ہدایات دکھاوے 'ضابطے کی کارروائی اور محض پند و نصائح کیلئے نہیں ہوتی تھی 'بلکہ سوچی سمجھی پالیسی کا حصہ ہوتی تھیں۔ آپ ان پر عملدر آمد خود بھی کرتے اور عمال سے بھی کرواتے۔ اس بات پر نظر رکھتے کہ کہیں ان کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی۔ کسی بھی ذریعے سے منفی اطلاع ملتی تو فوری طور پر کارروائی کرتے۔

ایک بار جب آپ مدینہ کی کسی سڑک پر جا رہے تھے کسی شخص نے پکار کر آپ سے یہ کہا کہ "عمرؓ کیا خیال ہے تمہارے عامل عیاض بن غنم کے مصر کا عامل رہتے ہوئے بھی کیا تمہاری یہ شرطیں اللہ کے حضور تمہیں بچا لیں گی؟ در یں حالیکہ وہ باریک کپڑا بھی پہنتا ہے اور اپنے دروازے پر دربان بھی رکھتا ہے۔" اب عمر رضی اللہ عنہ نے محمد بن مسلمہ کو بلایا 'جو افسران تک آپ کے پیغامات پہنچایا کرتے تھے اور انہیں مصر روانہ کیا۔ آپ نے ان سے یہ کہا کہ "تم انہیں جس حال میں پاؤ اسی حال میں میرے پاس لاؤ۔" راوی کہتا ہے کہ یہ وہاں پہنچے 'تو ان کے دروازہ پر ایک دربان کو موجود پایا۔ پھر اندر داخل ہوئے تو ان کے بدن پر ایک مہین قمیص نظر آئی۔ انہوں نے ان سے کہا کہ "امیر المومنین کا بلاوا ہے 'چلو۔" انہوں نے کہا کہ "مجھے اپنی قبا پہن لینے دو۔" یہ بولے کہ "نہیں" اسی حال میں چلو۔" راوی کہتا ہے کہ چنانچہ وہ انہیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب عمرؓ نے انہیں دیکھا تو فرمایا کہ "اپنی قمیص اتار دو۔" پھر آپ نے موٹے اون کا ایک کرتا منگوایا اور بھیڑ بکریوں کا ایک گلہ اور ایک لاٹھی بھی منگوائی اور ان سے یہ فرمایا کہ "یہ کرتا پہنو' یہ لاٹھی اور یہ بکریاں چراؤ۔ ان کا دودھ خود پیو اور راہ گیروں کو پلاؤ اور جو بچ رہے وہ ہمارے لئے محفوظ رکھو۔ سن لیا تم نے؟" انہوں نے کہا "ہاں! (سن لیا) مگر موت آجانا اس سے اچھا ہے (کہ میں ایسا کروں۔)"

آپ نے بار بار اس سے یہی بات کی مگر ہر بار انہوں نے یہی جواب دیا "اس سے بہتر یہی ہوگا کہ موت آجائے۔" حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ "تمہیں یہ بات اتنی ناگوار کیوں معلوم ہوتی ہے جبکہ تمہارے باپ کا نام غنم اسی لئے پڑ گیا تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتے تھے؟ کیا تم آئندہ بھلی روش اختیار کر سکو گے؟" انہوں نے جواب دیا "ہاں! امیر المومنینؓ۔" آپ نے فرمایا "اچھا تم جاؤ" اور آپ نے ان کو ان کے منصب پر بحال کر دیا۔ راوی کہتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد یہ اتنے اچھے بن گئے کہ عمر رضی اللہ عنہ کا کوئی دوسرا عامل اتنا اچھا نہ تھا[۳]۔

---

(۱) حمید ۲۶۳ (۲) طبری ۵: ۲۲۶ یوسف ۱۱۲ (۳) یوسف ۱۱۶ [illegible] ۱۲۹۔

۳۔ ادائیگی حقوق:

نظمیہ عامہ کے ضابطہ اخلاق کی ایک اور شق یہ ہے کہ عوام کے حقوق دینے ' دلانے اور ان کی حفاظت کرنے میں ہمہ وقت سرگرم عمل رہیں محض روایتی اور فنی طریقے پر اپنے ماضابطہ فرائض کو سرانجام دیئے جانا ہی کافی نہیں ہے۔ ہر سرکاری افسر کو اپنے دائرہ عمل اور دائرہ اختیار میں یہ دیکھنا چاہئے کہ مظلوموں کی داد رسی ہو رہی ہے اور حقداروں کو ان کے حقوق بلا رکاوٹ اور بلا تردد مل رہے ہیں کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی۔ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بصرہ کا گورنر مقرر کر کے بھیجا اور اہل بصرہ کے نام خط بھی ارسال کیا' جس میں لکھا تھا "میں نے ابوموسیٰ کو تم پر حاکم بنا کر بھیجا ہے تاکہ وہ تمہارے کمزور انسان کو طاقتور انسان سے حق دلوائے' تمہارے دشمنوں کے خلاف جنگ کرے' تمہاری ذمہ داریاں پوری کرے' تمہارے مال غنیمت کی حفاظت کرے' پھر اسے تمہارے درمیان تقسیم کرے اور تمہارے راستوں کو پاک صاف کرے[1]۔" حضرت عتبہؓ کو لکھا "تم لوگوں کو ظلم سے بچاؤ' تقویٰ اختیار کرو اور ڈرتے رہو ایسا نہ ہو کہ تمہاری غداری یا سرکشی کی وجہ سے تمہیں زوال آ جائے[2]۔" ان ہدایات میں سب سے مقدم اس بات کو رکھا ہے کہ کمزوروں کو طاقتوروں سے حقوق دلانا یا انہیں ظلم سے بچانا کیونکہ ریاست کی وہ طاقت جسے نظمیہ عامہ استعمال کرتی ہے اس کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ کمزوروں اور ناتوانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے جنہیں عموماً غالب افراد اور طبقے یا تو تسلیم نہیں کرتے یا پھر طاقت کے نشے میں پامال کرتے ہیں۔ ریاست کی قوت' جبر و استبداد کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے عوام کو آزادی دلانے کیلئے استعمال ہونی چاہئے نہ کہ ان شکنجوں کو مزید کسنے کیلئے۔ پھر آگے آپ نے کئی اور بنیادی حقوق کا ذکر کیا ہے جن کی ادائیگی خود نظمیہ عامہ نے کرنی ہے۔ وہ ایسے حقوق ہیں' جس کیلئے ایک پورا انفراسٹرکچر اور نظام کار وضع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو منصوبہ بندی' پالیسی سازی اور نگرانی و کنٹرول جیسے فنی ضابطوں کو بروئے کار لائے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا یہ کام ہے کہ ایسے تمام طریقے استعمال کرے جو مطلوبہ مقاصد کے حصول کیلئے ضروری ہوں۔

اسلامی معاشرے میں سرکاری ملازم حقیقی معنوں میں عوام کے خادم (Civil servents) ہوتے ہیں۔ ان سے ظالموں کے ساتھی بننے یا خود ظلم کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی' یہ بات آپ تقرری کے وقت واضح کر دیتے تھے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ جب اپنے عاملوں کو رخصت کرتے تو انہیں فرماتے "میں تمہیں جابر و قاہر بنا کر نہیں بلکہ امام و رہنما بنا کر بھیجتا ہوں۔ مسلمانوں کو مار پیٹ کر انہیں ذلیل نہ کرنا' نہ ان کی تعریفیں کر کے انہیں آزمائش میں ڈالنا' ان کے حقوق چھین کر ان پر ظلم نہ کرنا اور مسلمانوں کی سہولت و خوشحالی کیلئے ہر طرح کا اہتمام کرتے رہنا[3]۔"

روایت ہے کہ عمر بن الخطابؓ نے عوام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "خدا کی قسم! میں اپنے افسروں کو تمہارے یہاں اس لئے نہیں بھیجتا کہ وہ تمہارے منہ پر چپت ماریں یا تمہارے مال چھین لیں۔ میں انہیں تمہارے پاس اس لئے بھیجتا ہوں کہ وہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کی سنت سکھائیں۔ جس کسی کے ساتھ دین اور سنت سے ہٹا ہوا سلوک کیا جائے اسے چاہئے کہ وہ اپنا معاملہ میرے سامنے پیش کرے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' میں متعلق افسر سے اس (مظلوم) کا بدلہ لے کر رہوں گا۔" یہ سن کر عمرو بن العاصؓ اچھل کر کھڑے ہوگئے اور بولے "امیرالمومنین! کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی رعایا پر والی مقرر کیا گیا ہو اور وہ ان میں سے کسی کی تادیب کرے تو آپ اس سے اس آدمی کی جانب سے قصاص لیں گے؟" آپ نے فرمایا "ہاں! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں اس سے ضرور قصاص لوں گا اور میں نے تو رسول اللہ ﷺ کو اپنے آپ سے قصاص دلواتے دیکھا ہے۔ سنو! تم لوگ مسلمانوں کو مار کر انہیں ذلیل و خوار نہ کرو' ان کی حق تلفیاں کر کے ان کو کفر کی طرف مت دھکیلو اور انہیں لے کر جنگلوں اور دلدلوں میں نہ گھسو کہ وہ تباہ و برباد ہو جائیں[4]۔"

---

(۱) طبری II: ۴/ ۷۱' کثیر II: ۷/ ۸۲ (۲) طبری II: ۴/ ۷۸ (۳) یوسف، ۱۱۵ (۴) یوسف ۱۱۵' سعد ۳/ ۲۸۱۔

آپ نے حکومتی اہلکاروں کو راستی پر قائم رکھنے' ان کی حق تلفیوں اور زیادتیوں کا ازالہ کرنے اور دور دراز علاقوں سے تعلق رکھنے والے عوام کو موقع پر ان کے حقوق دلانے کیلئے پہلی مرتبہ کھلی کچہریوں کا آغاز کیا۔ اس کا بہترین موقع اور مقام حج ہی ہو سکتا تھا کہ لوگوں کو اس کیلئے الگ سفر کی صعوبتیں اور اخراجات برداشت نہ کرنے پڑیں۔ اس لئے آپ کا یہ فیصلہ نہایت بصیرت افروز تھا کہ آپ ان دنوں عوام سے قریب تر ہیں ان کی مشکلات اور مسائل سے براہ راست آگہی حاصل کریں۔ افسران کے بارے میں شکایات کو ان کے سامنے سنیں اور ان کا ازالہ کریں۔ چنانچہ آپ ہر سال ضرور حج پر جانے کا اہتمام کرتے سوائے ایک سال کے کہ ان دنوں آپ فلسطین گئے ہوئے تھے' باقاعدگی سے حج کئے۔ آپ خصوصی طور پر تمام عمال کو یہ ہدایت کرتے کہ وہ بھی حج پر آئیں۔ ایک کھلی کچہری کی روداد حسب ذیل ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کو ادائیگی حقوق کی کتنا فکر تھی اور کس طرح آپ اسے یقینی بنایا کرتے تھے۔ روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عاملوں کو لکھ بھیجا کہ حج کے موقع پر آپ سے ملیں' چنانچہ اس موقع پر یہ سب حاضر ہوئے اور آپ نے کھڑے ہو کر ان سے فرمایا "لوگو! میں نے اپنے ان عمال کو تم پر راست بازی کے ساتھ نگرانی کرنے کیلئے بھیجا ہے۔ میں نے انہیں اس لئے عامل نہیں مقرر کیا کہ تمہارے جان ومال وعزت و آبرو پر دست درازیاں کریں' لہٰذا جس کسی پر ان میں سے کسی نے کوئی ظلم کیا ہو وہ کھڑا ہو جائے۔" راوی کہتا ہے کہ اس اعلان پر اس دن سارے عوام میں سے بجز ایک آدمی کے اور کوئی نہ اٹھا۔ اس آدمی نے کہا "امیر المومنین! آپ کے عامل نے مجھے سو کوڑے مارے ہیں۔" عمرؓ نے دریافت کیا "کیا تم بھی اسے سو کوڑے مارنا چاہتے ہو؟ ایسا ہو تو اٹھو اور اس سے قصاص لے لو۔"

یہ سن کر عمرو بن العاصؓ اٹھے اور انہوں نے آپ سے یہ کہا "امیر المومنین اگر آپ اپنے عمال کے سلسلہ میں یہ پالیسی اختیار کریں گے تو یہ ان کو بہت شاق گزرے گی اور یہ ایک مستقل طریقہ بن جائے گا جسے آپ کے بعد آنے والے (خلفاء) بھی اختیار کر لیں گے۔" عمرؓ نے جواب دیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس عامل سے اس شخص کا قصاص نہ لوں' جبکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خود اپنے سے قصاص لیتے دیکھا ہے؟ اے آدمی اٹھو اور قصاص لے۔" پھر عمرو (بن العاصؓ) نے کہا: "اچھا تو ہمیں اس کی اجازت دیجئے کہ ہم اس شخص کو کسی طرح راضی کر لیں۔" راوی کہتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی اجازت دے دی اور لوگوں نے اس شخص کو فی کوڑا دو دینار کے حساب سے دو سو دینار دے کر اپنا حق قصاص فروخت کر دینے پر راضی کر لیا[1]۔ اس روایت سے آپ کی ایڈمنسٹریشن کے چند اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اپنی پالیسیوں کو کامیاب بنانے کیلئے عمال پر سخت کنٹرول رکھتے تھے۔ دوسرا یہ کہ ان کی خاطر خواہ تشہیر کرتے تاکہ ہر خاص وعام کو علم ہو جائے کہ وہ کیا ہے۔ رائے عامہ اتنا بیدار اور موثر ہو کہ اپنے حقوق کا تحفظ کر سکے۔ تیسرا یہ کہ آپ لوگوں کو یہ اعتماد دیتے تھے کہ ان کی شکایات کسی صورت میں نظر انداز نہیں کی جائیں گی بروقت معاملے کا نوٹس لیا جائے گا۔ چوتھا یہ کہ سرعام زیادتیوں کا ازالہ کیا جائے گا' تاکہ وہ خود آئندہ اس طرح کی جرأت نہ کریں اور دوسروں کیلئے بھی باعث عبرت ہو۔ پانچواں یہ کہ قصاص لینا ہر آدمی کا حق ہے اسے حاکم وقت معاف نہیں کر سکتا' بلکہ اسے دلانا اس کا بنیادی فریضہ ہے۔ ہاں البتہ کسی بھی وجہ سے بلا دباؤ اگر فریقین راضی نامہ کر لیں تو یہ امن اور ان کے باہمی تعلقات کیلئے زیادہ مفید ہے۔ ایڈمنسٹریٹر کو اس میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے۔ حقوق کی ادائیگی اور ازالہ کیلئے آپ ہر قدم اٹھانے کیلئے تیار رہتے تھے۔ اس کیلئے ہر سختی کو درست سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا "میں کسی کو کسی پر ظلم وزیادتی کرنے کا موقع نہ دوں گا۔ ایسا کرنے والے کا ایک گال زمین پر ہو گا اور دوسرا میرے قدموں کے نیچے تاآنکہ وہ حق کے آگے سر ڈال دے"[2]۔ اس سلسلے میں آپ خود اپنا احتساب کرتے تھے کہ کہیں آپ سے زیادتی سرزد نہ ہو جائے۔ غلطی کی صورت میں خود اپنی ذات کو بھی قصاص کیلئے پیش کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ آپ نے کسی بات پر ایک آدمی کو سزا دی تو وہ بولا "میں تو ان دو آدمیوں سے بھی زیادہ محتاط ہوں ایک وہ آدمی جو پہلے ناداں تھا پھر اسے علم ہو گیا۔ دوسرا وہ آدمی جس نے کوئی غلطی کی تو اسے معاف کر دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا "تو نے سچ کہا تو مجھ سے بدلہ لے لے۔" راوی کا بیان ہے کہ اس آدمی نے آپ کو معاف کر دیا[3]۔

---

(۱) یوسف ۱۱۶' سعد ۲۹۳/۳ (۲) یوسف ۱۱۷' (۳) یوسف ۱۱۵۔

ایک اور روایت میں ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کچھ مردوں اور عورتوں کو جو ایک حوض پر بھیڑ لگائے ہوئے تھے مارا۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد آپ کی ملاقات علیؓ سے ہوئی' تو انہوں نے آپ سے پوچھا (کہ کیا بات ہے) آپ نے فرمایا "(میں نے ایک ایسا کام کیا ہے جس کے سبب) مجھے ڈر ہے کہ میں ہلاکت کا لقمہ بن گیا۔" اس پر علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اگر آپ نے ان لوگوں کو کسی دشمنی یا کینہ و بدخواہی کے سبب مارا ہے' تو بلاشبہ آپ نے اپنی ہلاکت مول لے لی' لیکن اگر آپ نے خیر خواہی اور اصلاح کے جذبے کے تحت مارا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ کی حیثیت ہی نگران کی ہے۔ آپ کا تو کام ہی ادب اور سلیقہ سکھانا ہے[1]۔" "آپ لوگوں کو بار بار ان کے حقوق اور اپنی ذمہ داریاں گنواتے' تاکہ وہ آپ کی حکومتی کارکردگی کو عمل کے پیمانوں سے ماپیں اور عدم اطمینان کی صورت میں دنیا ہی میں وہ وصول کر لیں۔ "لوگو! مجھ پر تمہارے سلسلہ میں کچھ ذمہ داریاں ہیں جن کو میں تمہارے سامنے گناتا ہوں۔ تمہیں چاہئے کہ ان کے بارے میں میرا احتساب کرتے رہو۔ میری ذمہ داری ہے کہ تمہارے خراج اور فے کی رقمیں ان کے مقررہ طریقوں سے ہی وصول کروں اور یہ کہ جب یہ اموال میرے ہاتھ میں آ جائیں' تو اپنے مناسب مصارف میں صرف ہوں۔ تمہارے سلسلہ میں میری ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ انشاء اللہ میں تمہارے عطایا اور وظائف میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کی حفاظت کا انتظام کروں نیز میری ذمہ داری ہے کہ تمہیں ہلاکت کے منہ میں نہ دھکیلوں اور (گھر سے دور) سرحدوں پر زیادہ طویل عرصہ تک مامور کئے رہوں[2]۔"

آپ کی ان واضح پالیسیوں سے لوگ مطمئن رہتے تھے۔ وہ آپ اور آپ کی ایڈمنسٹریشن کے دل و جان سے گرویدہ رہتے تھے۔ آپ لوگوں کو اعتماد میں لینے کیلئے ان کے سامنے یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھے' جو دورۂ شام کے موقع پر آخری تقریر میں آپ نے کیا تھا اور خلق خدا اس کی گواہ تھی "تم آگاہ ہو جاؤ کہ میں نے اپنے دور خلافت میں تمہارے وہ تمام حقوق ادا کئے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر مقرر کئے تھے۔ ہم نے تمہارے مال غنیمت اور گھروں کی تقسیم میں عدل و انصاف سے کام لیا۔ اسی طرح تمہارے جنگی امور میں بھی انصاف کیا اور جو تمہارے حقوق تھے وہ سب ادا کئے۔ ہم نے تمہارے لئے فوجوں کا انتظام کیا۔ تمہاری سرحدوں کی حفاظت کی' تمہیں آباد کیا اور جہاں تک تمہارا مال غنیمت حاصل ہوا اس کے مطابق ہم نے تمہیں وسیع حصہ دیا اور تمہاری غذائیں پوری کیں۔ ہم نے حکم دیا کہ تمہیں عطیات اور وظائف دیئے جائیں اور تمہیں ہر ممکن امداد دی جائے۔ جسے کچھ معلومات حاصل ہوں اسے چاہئے کہ وہ اس پر عمل بھی کرے اور ہمیں بھی اطلاع دے' انشاء اللہ ہم اس پر عمل کریں گے تمام اختیار اللہ ہی کو حاصل ہے[3]۔" حقوق کی ادائیگی کا عظیم کام منتظمین کیسے سرانجام دے سکتے ہیں؟ اس بارے میں آپ نے نہایت اہم اشارہ کر دیا ہے۔ روایت میں آتا ہے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ "(امور مسلمین کی تدبیر کا) یہ کام اسی وقت خوش اسلوبی سے انجام پا سکتا ہے جب کہ جبر و ظلم سے کام لئے بغیر سختی برتی جائے اور کمزوری دکھائے بغیر نرمی کا سلوک کیا جائے[4]۔"

۴۔ سادہ زندگی:

فاروق اعظمؓ کے نزدیک سرکاری اہلکاروں کے ضابطہ اخلاق میں ایک بات سادہ زندگی بھی ہے۔ اس کا لباس' رہن سہن' خورد و نوش اس وقت کے اوسط درجے کے آدمی کے برابر ہونا چاہئے تاکہ نہ تو وہ نفسیاتی اور ذہنی طور پر کسی فخر و گھمنڈ میں مبتلا ہو اور نہ ہی عملی طور پر اس کے اور عوام کے معیار زندگی میں ایسا فرق ہو کہ وہ مختلف طبقات میں شمار ہوں۔ معاشرے میں ان کی عزت و وقار اور محبت و عقیدت کی بنیاد عوامی خدمت ان کے ساتھ اخلاص و ہمدردی' عدل و انصاف اور اس سے گہرا اخلاقی تعلق ہو۔ وہ انہیں اپنا' اپنے میں سے ہی اور اپنے ہی جذبات و احساسات کا ترجمان اور اپنے ہی مفادات کا محافظ سمجھیں۔ یہ وہ چیز ہے جو

---

(۱) یوسف، ۱۱۵ (۲) ایضاً، ۱۱۶ (۳) طبری،۴/۲۰۵ (۴) یوسف، ۱۱۸۔

حاکم و محکوم اور منتظمین و کارکنان کے فرق کو مٹا دیتی ہے۔ اس کے باہمی تعلقات کو مضبوط کر کے انہیں "بنیان مرصوص" کی شکل میں ڈھال دیتی ہے۔ بڑے بڑے عہدوں کی کشش اور مادی لالچ دوران کا سماجی کردار اعتدال پر آجاتا ہے۔ ان کے پیچھے لپکنے کا رجحان ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ انہیں عظیم ذمہ داری ناگزیر بوجھ اور امانت سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ ان کے تقاضے پورا کرنے کیلئے اپنا تن من دھن لگا دیتے ہیں۔ آپ کا اپنا طرز عمل بھی انتہائی سادگی کا تھا اور اپنے عمال کو بھی اس کا پابند بناتے تھے۔ اس کی وجہ سے نہ تو آپ کے عہد میں آپ کی عزت و توقیر انتظامی گرفت اور شان و شوکت میں کمی آئی اور نہ ہی بعد کے ادوار میں اس کی وجہ آپ کو کمتر سمجھا جاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے کامیاب حکمران و منتظم قرار پانے لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے اور آپ کے رعب و دبدبے کو مثبت شکل دینے میں ایک اہم کردار اس زہد و سادگی کا بھی تھا۔ دور جدید میں اعلیٰ سے اعلیٰ کوٹھیاں، دفاتر کاریں اور دیگر سہولیات رکھنے والے افسران اس سے محروم ہیں۔ حضرت عمرؓ اس امر کو قطعاً جائز نہیں سمجھتے تھے کہ امت کے مال میں سے ضرورت کے بغیر کچھ بھی صرف کیا جائے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ "میرے نزدیک یہ مال ایسا ہے کہ تین باتیں پائی جائیں تو یہ مال صحیح ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مال حق کے مطابق لیا جائے، حق کے مطابق دیا جائے، لینے اور دینے میں ناجائز طریقے اختیار نہ کئے جائیں۔ تمہارے مال کے سلسلہ میں میری مثال مال یتیم کے ولی کی سی ہے یعنی اگر میرے پاس مال ہو اور مجھے اس مال میں سے لینے کی ضرورت نہ ہو تو میں اس مال سے احتراز کروں گا اور اگر میں فقیر ہوں گا تو میں جائز طریقے سے اپنے کھانے کیلئے لے لوں گا[1]۔"

حضرت عمرؓ نے ایک ایسی مجلس میں جس میں احنف بن قیس بھی تھے خود اس امر کی تحدید کی کہ انہیں امت کے مال سے کس قدر لینے کی اجازت ہے چنانچہ احنف بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عمرؓ کے دروازے پر بیٹھے تھے کہ ایک لونڈی آئی۔ ہم نے کہا کہ یہ امیر المومنینؓ کی لونڈی ہے۔ اس نے کہا کہ "میں نہ امیر المومنینؓ کی لونڈی ہوں اور نہ ان کیلئے حلال ہوں بلکہ میں اللہ کا مال ہوں۔" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ واپس چلی گئی اور حضرت عمرؓ باہر آئے اور آپ نے ہم سے دریافت فرمایا کہ "تمہارا کیا خیال ہے میرے لئے اللہ کا مال کس حد تک حلال ہے؟" ہم نے کہا کہ "امیر المومنینؓ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔" آپ نے پھر پوچھا ہم نے پھر وہی جواب دیا۔ آپ نے فرمایا کہ "اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتا دوں کہ میں اس میں سے کیا حلال سمجھتا ہوں۔ بس حج اور عمرہ کیلئے ایک سواری، سردی اور گرمی کا لباس اور پیٹ بھرنے کے بقدر اہل خانہ کی روزی اور وہ حصہ جو مسلمانوں کو ملتا ہے کیونکہ میں بھی مسلمانوں میں سے ایک ہوں۔" معمر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جب حج اور عمرہ کیلئے جاتے تھے تو آپ کے پاس صرف ایک اونٹ ہوتا تھا[2]۔" یہ بیت المال سے آپ کی تنخواہ کا معیار تھا اس کی سطح اوسط درجے کے آدمی کے برابر تھی اس میں اضافی اخراجات مثلاً پھل وغیرہ شامل نہیں تھے۔ چنانچہ بیہقی روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو آپ اور اپنے اہل و عیال کا کھانا بیت المال سے لیتے اور پھل آپ اپنے جیب خاص سے خریدا کرتے تھے[3]۔

بقول رواس یہ سالن بھی جس کا بوجھ آپ بیت المال پر ڈالتے تھے حد درجہ معمولی ہوا کرتا تھا اور کسی طور پر بھی وہ اس سالن سے بہتر نہ ہوتا جو اس وقت کے تنگدست گھرانوں کو میسر آتا تھا اور اس معاملہ میں حضرت عمرؓ تمام مسلمانوں کی خوشحالی اور تنگ حالی کو ملحوظ رکھا کرتے تھے۔ اگر مسلمانوں پر خوشحالی ہوتی تو حضرت عمرؓ اپنے لئے بھی نسبتاً سہولت اختیار فرماتے اور اگر مسلمانوں پر تنگی کا دور ہوتا تو حضرت عمرؓ بھی اپنے اہل و عیال کیلئے تنگی برقرار رکھتے۔ لوگوں نے تنگی اور قحط سالی کے زمانے میں حضرت عمرؓ کو اپنی ذات پر اور اپنے اہل و عیال کیلئے تنگی برقرار رکھتے خود دیکھا اور یہ بھی کہ آپ خلیفہ وقت ہونے کے باوجود اس معیار کی غذا استعمال نہ فرماتے جو آپ کو اپنے گراں بار فرائض منصبی کی ادائیگی کیلئے قوت بخش ہو[4]۔ چنانچہ ام المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ حضرت عمرؓ

(۱) یوسف، ۳٦، سعد، ۲۷٦ (۲) عبدالرزاق، ۱۱/۳۲۳، سعد، ۳/۲۷٦، عبید، ۲٤۸، سیوطی، ۱۲۸ (۳) بیہقی، ۱۰/۱۰۷ (٤) رواس، ۸۰

کے پاس آئے اور ان سب نے آپؓ سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور کہا کہ اگر آپؓ عمدہ غذا استعمال کرتے تو وہ آپ کو حق کی خدمت کیلئے زیادہ قوت مہیا کرتی۔ آپؓ نے فرمایا "کہ کیا تم سب کی یہی رائے ہے؟" سب نے کہا "جی ہاں" تو آپ نے کہا کہ 'مجھے معلوم ہے کہ تم خیر خواہی سے بات کر رہے ہو لیکن میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اسی راستے پر دیکھا ہے۔ اگر میں ان کا راستہ چھوڑ دوں گا تو میں ان کی منزل پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا[1]۔" ایک مرتبہ لوگوں پر قحط کا سال آیا تو حضرت عمرؓ نے سارا سال گھی استعمال نہ کیا اور نہ کوئی روغنی چیز تا آنکہ قحط دور ہو گیا اور لوگ خوشحال ہو گئے[2]۔ قحط کے سال حضرت عمرؓ تیل سے روٹی کھاتے رہے' یہاں تک کہ آپؓ کے پیٹ سے قر قر کی آواز آنے لگی مگر آپ نے فرمایا کہ ' خواہ تو کتنا ہی قر قر کر جب تک گھی فراوانی سے بازار میں نہیں آ جاتا تجھے اسی طرح تیل کھانا پڑے گا[3]۔" امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ گھی سے روٹی کھا رہے تھے کہ آپؓ نے ایک شخص کو بلایا جو دیہات سے آیا تھا۔ وہ بھی کھانے میں شریک ہو گیا اور بڑے بڑے لقمے لینے لگا اور پیالے پر لگا ہوا گھی چاٹنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ تم تنگدست ہو تو اس نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے اتنی مدت سے گھی نہیں کھایا اور نہ کسی کو کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ "میں گھی نہیں کھاؤں گا جب تک کہ لوگ اسی طرح کی غذا نہ کھانے لگیں جیسی پہلے کھایا کرتے تھے[4]۔"

آپ نے اپنی خورونوش کا معیار اس لئے عام آدمیوں کی سطح پر رکھتے تھے' تاکہ آپ کو ان کی مشکلات و تکالیف کا احساس رہے اور آپ کی آل اولاد بھی اپنے آپ کو عوام ہی کے برابر سمجھے۔ جہاں تک آپ کے لباس کا تعلق ہے' وہ بھی آپ کے فرمان کے عین مطابق ہوتا تھا یعنی ایک جوڑا گرمیوں میں اور ایک سردیوں میں' اسی طرح عہد خلافت گزار دیا۔ جو لباس پہنتے تھے اس پر کئی کئی پیوند ہوتے تھے۔ حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ عمر بن الخطاب کی تہہ بند میں بارہ پیوند تھے' جن میں بعض چمڑے کے تھے حالانکہ وہ امیر المومنین تھے[5]۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ میں نے عمرؓ کے بدن پر تہہ بند دیکھی جس میں چودہ پیوند تھے بعض چمڑے کے تھے۔ ان کے بدن پر کرتا تھا نہ کسی چادر کا عمامہ بندھا ہوا تھا۔ ان کے پاس درہ تھا اور مدینے کے بازار میں گھوم رہے تھے[6]۔ ایک مرتبہ آپ جمعہ کی نماز میں تاخیر سے پہنچے' آپ نے ایک سنبلانی کرتہ پہن رکھا تھا۔ آپ نے منبر پر چڑھ کر لوگوں سے معذرت کی اور فرمایا "مجھے صرف اس کرتے نے روکا' میرے پاس سوائے اس کے دوسرا کرتہ نہ تھا اور یہ سیا جا رہا تھا۔" ایک اور روایت کے مطابق اس کا حال یہ تھا کہ آپ اپنی آستین کو کھینچنے لگے' جب چھوڑتے تو آپ کی انگلیوں کے کناروں کی طرف پلٹ جاتی[7]۔ آخری مرتبہ جب شام کے علاقوں میں تشریف لے گئے تو مہاجرین و انصار کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی۔ آپ ایلہ پہنچے تو وہاں کے بشپ کو اپنی قمیص اتار کر دی جو طویل سفر کی وجہ سے پھٹ گئی تھی۔ آپ نے فرمایا "تم اسے دھلوا کر اور پیوند لگوا کر دو۔" وہ قمیص لے گیا اور اسے دھلوا کر اس میں پیوند لگوا دیا اور اس جیسی دوسری قمیص بھی سلوا کر ساتھ لے آیا۔ آپ نے پوچھا "یہ کیا ہے؟" بشپ نے کہا "یہ قمیص تو آپ کی ہے جو میں نے دھلوا دی ہے اور پیوند لگوا دیا ہے اور یہ دوسری میری طرف سے ہے۔" آپ نے اسے دیکھ کر واپس لوٹا دیا اور فرمایا "میری قمیص پسینے کو زیادہ جذب کرتی ہے[8]۔" اس موقع پر ابو عبیدہؓ نے لباس بدلنے کا مشورہ دیا تو آپ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "ہماری عزت اسلام سے ہے[9]۔" ایک مرتبہ آپ نے حج پر آنے جانے میں صرف پندرہ سولہ دینار یا ایک سو اسی درہم صرف کئے۔ اس پر بھی آپ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہنے لگے "ہم نے اس مال میں اسراف کیا[10]۔" مدینے سے آنے جانے میں نہ تو کوئی خیمہ نصب کیا اور نہ ہی کسی عمارت کا سایہ لیا صرف چمڑے کا بچھونا اور چادر درخت پر ڈال کر آرام کر لیتے (۱۱)۔

---

(۱) عبدالرزاق ۱۰: ۲۲۳، سیوطی ۱۲۸، کنز ۷: ۱۳۴ (۲) سعد ۳: ۳۱۳ (۳) ایضاً سیوطی ۱۳ (۴) مالک ۹۳۳ (۵) سعد ۳: ۳۲۸ (۶) ایضاً ۳۲۹ (۷) سعد ۳: ۳۲۹ (۸) کنز ۷: ۱۳۵، طبری ۴: ۶۴ (۹) حاکم ۱: ۶۲ (۱۰) مسعودی ۲: ۳۷۰، سعد ۳: ۳۰۸ (۱۱) ایضاً ۳: ۲۷۹

یہ آپ کی سادگی کی سینکڑوں مثالوں میں سے صرف چند نمونے کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ ایسی حالت میں جبکہ آپ حکومت کے اعلیٰ ترین انتظامی عہدے پر فائز تھے۔ اپنی عملی زندگی کا یہ درخشندہ اسوہ پیش کرنے کے بعد آپ یہ استحقاق رکھتے تھے کہ اپنے عمال اور رعایا کو بھی سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کر سکیں۔ آپ کے ماتحتوں پر یہ واجب تھا کہ آپ کی خواہش کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔ ایک مرتبہ آپ کھانا سامنے رکھ کر کھانے ہی والے تھے کہ غلام نے آکر اطلاع دی کہ (آپ کے ایک عامل) عتبہ ابن فرقد دروازے پر کھڑے ہیں' آپ نے انہیں اندر بلوالیا۔ انہوں نے دیکھا کہ آپ کے سامنے روٹی اور زیتون رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کہا کہ "قریب آؤ' پھر انہیں کھانے میں سے کچھ دیا۔" وہ کھانا کھانے لگے تو اتنا بدمزہ تھا کہ نگل ہی نہ سکے' کہنے لگے "اے امیر المومنین" کیا آپ کیلئے عمدہ کھانا (مائدہ) نہیں ہے؟" آپ نے جواب دیا "کیا وہ تمام مسلمانوں کیلئے ہو سکتا ہے؟" انہوں نے کہا "نہیں" پھر آپ نے فرمایا "اے عتبہ تم پر افسوس ہے' کیا تم چاہتے ہو کہ میں (چند روزہ) دنیوی زندگی میں مزید ار کھانا کھاؤں؟[1]"۔

آپ کے عمال بھی آپ ہی کے طرز عمل کی عموماً پیروی کرتے تھے کیونکہ آپ کے مقرر کردہ ضابطہ اخلاق میں اس کو بنیادی حیثیت حاصل تھی' چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے شام کے گورنر مقرر کئے گئے تھے۔ وہ کھردرے اون کا موٹا لباس پہنتے تھے۔ ایک بار ان کے کچھ قریبی لوگوں نے ان سے کہا "ہمارے گرد و نواح میں دشمن رہتے ہیں آپ ماشاء اللہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گورنر ہیں آپ بھی اس نواح کے حکمرانوں کی طرح ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت سے رہا کریں تاکہ ان پر آپ کا اچھا اثر پڑے۔" عبیدہ بن جراحؓ نے جواب دیا "رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں میں جس طرح زندگی بسر کرتا تھا کیا اسے ترک کر دوں؟[2]"۔ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقرر ایک اور عامل سلمان فارسیؓ تھے جو مدائن کے گورنر مقرر کئے گئے تھے۔ وہ موٹے صوف کا لباس پہنتے تھے اور گدھے کی ننگی پیٹھ پر سواری کرتے تھے' جو کی روٹی کھاتے تھے اور ہمیشہ ریاضت الٰہی میں مصروف رہتے تھے[3]"۔ آپ کے ایک اور عامل حضرت سعید بن عامر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ وہ اپنا کھانا بھی خود تیار کرتے تھے' کپڑوں کا صرف ایک جوڑا تھا اسے بھی خود ہی دھوتے تھے اور سکھا کر پہنتے تھے[4]"۔ آپ عمال کو خطوط کے ذریعے بھی عیش و عشرت سے اجتناب کرنے کی تلقین فرماتے تھے تاکہ وہ سادگی کو اپنائیں۔ ابو عثمان کہتے ہیں کہ ہم لوگ آذربائیجان میں تھے کہ حضرت عمرؓ کا ایک خط ہم تک پہنچا۔ اس میں لکھا تھا "عتبہ بن فرقد تمہیں عیش و عشرت سے گریز لازم ہے' مشرکوں کے لباس اور ریشم سے پرہیز بھی' اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تعیش سے باز رہنے کا حکم دیا ہے[5]"۔

آپ لباس کو اعتدال میں رکھنا چاہتے تھے اور اس کو ایک تہذیبی علامت سمجھتے تھے۔ آپ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ غیر مسلم قوموں کا تشبہ اختیار کرنا اور عیش کوشی میں ان کا مقابلہ کرنا مسلمانوں کے تشخص اور اعلیٰ اوصاف کو گھن کی طرح کھا جائے گا۔ خاص طور پر عربوں کی روایتی خصوصیات گہنا جائیں گی چنانچہ فرمایا "تم لوگ لباس کا پورا پورا حق ادا کر سکتے ہو مگر شرط یہ ہے کہ تمہاری بدوی سخت کوشی اور مردانگی قائم رہے اور تمہیں آل عدنان ہونے کا احساس رہے' مسلمانوں کو عجمی قوموں کے تنعم سے دور رہنا چاہئے اور ان کی پیرایہ پوشی سے اجتناب کرنا چاہئے۔ ریشم اور حریر پہننے سے انہیں خاص طور پر گریز کرنا چاہئے' اس لئے کہ سردار دو جہاں ﷺ نے منع فرمایا ہے[6]"۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ عمال کے ساتھ ساتھ معاشرے کے معززین میں کفایت شعاری کو اپنائیں اور معاشرے کے غریبوں اور ناداروں کا لحاظ کریں کیونکہ اگر وہ اپنے معیار زندگی میں بہت زیادہ بلندی و تفاوت پیدا کریں گے' تو ان کے دلوں میں احساس کمتری پیدا ہو گا اور یہ کبھی نفرت میں تبدیل ہو کر معاشرے کی بنیادوں کو ہلا سکتا ہے۔

---

(۱) ایضاً ۲:۱۲۲ (۲) مسعودی ۱:۳۱۵ (۳) ایضاً ۳۱٤ (٤) ایضاً (۵) جوزی ۱:۱۴۰ (٦) ایضاً

حضرت عمرؓ نے حضرت عتبہؓ کو تحریر کیا کہ وہ بصرہ کی فوج میں سے دس افراد کا ایک وفد بھیجیں چنانچہ حضرت عمرؓ کی طرف ایک وفد روانہ ہوا جس میں احنف بن قیس بھی شامل تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے سوالات کئے انہوں نے کہا "لوگ اس حالت پر ہیں کہ جیسا آپ چاہتے ہیں۔" آپ نے فرمایا "اب تم اپنے ٹھکانوں پر جاؤ" چنانچہ وہ اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے آپ نے ان کے لباس پر نگاہ ڈالی تو آپ نے یک کپڑا دیکھا جو باہر نکلا ہوا تھا۔ آپ نے اس کو سونگھا پھر فرمایا "یہ کس کا ہے؟" حضرت احنف نے کہا "میرا ہے۔" آپ نے فرمایا "تم نے یہ کتنے میں خریدا؟" انہوں نے کہا "تقریباً آٹھ (درہم) اس کی قیمت بتائی اور اصل قیمت سے کچھ کم رقم بتائی کیونکہ انہوں نے بارہ درہم میں سے خریدا تھا۔" آپ نے فرمایا "تم نے اس سے کم کا (لباس) کیوں نہیں خریدا۔ تم اس زائد رقم سے کسی مسلمان کو فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ تم فضول خرچی سے بچو تاکہ تم جانی اور مالی فائدہ حاصل کر سکو۔ اسراف مت کرو ورنہ تمہیں جانی اور مالی دونوں صورتوں میں نقصان ہوگا[1]۔" حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی سادگی کو دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بالکل بجا فرمایا تھا کہ "اللہ تعالیٰ نے ابو بکرؓ و عمرؓ کو قیامت تک کے بادشاہوں کیلئے حجت بنایا ہے۔ خدا کی قسم وہ دونوں سبقت لے گئے اور اپنے بعد آنے والوں کو مشکل میں ڈال گئے ان کی یاد امت کو غمگین کرتی ہے اور سرداروں کیلئے موجب طعن ہے[2]۔" آپ کے اس ضابطہ اخلاق سے عوامی مناصب پر فائز افسروں کیلئے عصر حاضر میں حالات و زمانہ کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسب ذیل رہنما اصول مقرر کر سکتے ہیں۔

- عمال کا معیار زندگی عیاشانہ اور طبقہ وارانہ نہیں ہونا چاہئے۔ وہ اوسط درجے کا ہو تاکہ پورے اعتماد کے ساتھ اوپر اور نیچے والے لوگوں کے درمیان رہ سکیں۔ آپ نے اپنی ذات کے معاملے میں جو سختی کی اسے دوسرے عمال پر اس طرح لاگو نہیں کیا کہ وہ بھی پھٹے ہوئے کپڑے پہنیں ہاں البتہ ایک مثال قائم کر دی کہ اگر حالات کا تقاضا ہو تو ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔
- اوسط درجے کا معیار حتمی طور پر مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق کسی بھی ملک اور زمانے کے معاشی حالات سے ہے۔ اس لئے سادہ زندگی کی سطح بھی لازمی طور پر بلند ہوگی۔ آپ کے عہد میں عہد نبوی کے مقابلے میں بے پناہ ترقی و فراخی ہوئی۔ پورے معاشرے کا معیار بلند ہوا۔ آپ نے خود اس میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے صرف عیش کوشی اور اسراف سے منع فرمایا ہاں اپنی ذات کو عہد نبوی ﷺ ہی کے معیار پر رکھا۔ یہاں تک صحابہ کرامؓ نے مل کر کوشش کی کہ اپنے معیار کو دوسرے لوگوں کی طرح بلند کریں لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ دور جدید میں نظم عامہ سے وابستہ لوگوں کو ملک کے مجموعی حالات کے سامنے رکھ کر زندگی گزارنی چاہئے جو سادگی کے زمرے میں آئے نہ کہ عیاشی کے۔
- ناگہانی آفات اور قحط سالی کے دنوں میں عمال و افسران کیلئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ مشکلات و تکالیف میں لوگوں کے ساتھ شریک ہوں۔ اپنے معیار میں کمی کر کے ذاتی اور سرکاری وسائل کو عوام کی مشکلات و تکالیف دور کرنے میں لگا دیں۔ عام حالات میں جو معیار ان کیلئے مباح تھا اب مکروہ اور حرام کے درجے میں آ سکتا ہے۔
- افسران کو اپنی تنخواہ اور آمدنی کے مطابق معیار کا تعین کرنا چاہئے۔ اگر ان کی آمدنی کے دیگر جائز ذرائع ہوں تو غرور و تکبر کی خاطر نہیں بلکہ شریفانہ طور پر حقیقی ضروریات کے مطابق کچھ اضافہ کر سکتے ہیں۔ آپ نے علاقائی ضرورت اور حکمت کی بنا پر حضرت امیر معاویہؓ کے فراخی اختیار کرنے کو نظر انداز کیا تھا۔
- جہاں تک سرکاری وسائل کا تعلق ہے ان کا ذات کی خاطر یا نمود و نمائش پر بے دریغ استعمال یا سرکاری اجلاسوں میں الللے تللے کرنے سے آپ نے خود بھی مکمل طور پر اجتناب کیا اور افسران کو بھی ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس اخراجات صرف اس قدر ہونے چاہئیں جو بہت ضروری ہوں اور مکمل کفایت شعاری اختیار کرنی چاہئے۔

---

(۱) طبری ۷۸/۳:۱۱ (۲) طبری ۷۸:۱۱۔

○ آپ نے بیاہ، خورد و نوش، طرزِ زندگی وغیرہ میں غیر مسلموں کے ساتھ تشبہ سے سختی سے منع کر دیا کیونکہ وہ تہذیبی و ثقافتی معاملہ ہے۔ افسران کی طرف سے انہیں اختیار کرنا لوگوں کیلئے باعث تقلید بن سکتا ہے۔ اس سے پورے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اس لئے آپ نے حدیث کی بنیاد پر اس سے سختی سے روکا اور ہدایت دیں۔

۵۔ معتدل رویہ:

پبلک ایڈمنسٹریشن کا براہ راست عوام کے ساتھ تعلق ہوتا ہے' لوگ چاہیں یا نہ چاہیں بے شمار معاملات میں لوگوں کو ان سے واسطہ پیش آتا ہے۔ اجتماعی مشکلات کا حل ان کے پاس ہوتا ہے' حکومت کی پالیسی اور فیصلوں کو نافذ کرنے کیلئے انہیں عوام سے رابطہ کرنا پڑتا ہے۔ اس صورتحال میں اکثر و بیشتر افسران کا رویہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے' وہ انتظامی معاملات کو بنا بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی۔ پھر ایک اور اہم پہلو یہ ہوتا ہے کہ مختلف افراد' گروہوں' قومیتوں' مذہبوں اور علاقے کے لوگوں کے مزاج و طبائع مختلف ہوتے ہیں۔ ان سے معاملہ کرتے وقت ایک منتظم کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کو سامنے رکھے' اس طرح یہ ایک فنی معاملہ بن جاتا ہے۔ نظریہ عامہ کے ضابطہ اخلاق میں یہ بات شامل ہے کہ اس کا رویہ نہایت معتدل ہو' اس سے مراد یہ ہے کہ سختی اور نرمی دونوں کو استعمال کرنے میں توازن سے کام لیا جائے۔ صورتحال کے مطابق جب' جہاں اور جتنی ضرورت ہو اتنا ہی انہیں استعمال کیا جائے۔ آپ نے انتظامی معاملات کے بارے میں فرمایا "یہ کام اسی وقت خوش اسلوبی سے انجام پاسکتا ہے' جبکہ ظلم و جبر کے بغیر سختی برتی جائے اور کمزوری و سستی دکھائے بغیر نرمی کا سلوک کیا جائے"(۱)۔

یہ نہایت اہم پہلو ہے کہ ریاست کو امن و امان' نظم و ضبط اور ظلم و استحصال کے خاتمے کیلئے اور بسا اوقات مفاد عامہ کے سلسلے میں اہم پالیسیوں کو نافذ کرنے کیلئے مختلف اداروں کے ذریعے سخت موقف اور طریقہ کار اختیار کرنا پڑتا ہے' لیکن اس میں ظلم اور جبر نہیں ہونا چاہئے' بلکہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ طاقت اور قانون کا اندھا اور بے دریغ استعمال ریاست کی ساکھ اور وقار کو ختم کر دیتا ہے۔ عوام اور افسران کے مابین ایسی دوریاں پیدا ہو جاتی ہیں' جن کو پاٹنا محال ہو جاتا ہے اور مسائل میں کہیں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی نرمی کا معاملہ ہے اگر حکومتی ادارے کسی معاملے کو اس حد تک بگاڑ لیتے ہیں کہ اس میں مجبوراً نرمی کرنی پڑتی ہے' تو یہ ان کی کمزوری کا پہلو ہوتا ہے۔ اس سے عوام کے ردعمل میں ایسے رجحان کو تقویت ملتی ہے' جب چاہیں مجبور کر کے وہ چیز حاصل کر لیں جس کا انہیں حق حاصل نہیں ہے۔ حضرت شعبہؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کسی علاقے پر کسی کو حاکم مقرر کر کے بھیجتے تو آپ ان کے بارے میں فرماتے "اے اللہ! میں نے' نہیں اس لئے مقرر نہیں کیا ہے کہ لوگوں کا مال چھینیں اور انہیں زد و کوب کریں' جو حاکم کسی پر ظلم کرے تو وہ میرے نزدیک حکومت کے لائق نہیں"(۲)۔

محمد بن زید سے مروی ہے کہ علیؓ اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ اور سعدؓ سب مل کر جمع ہوئے' ان میں سب سے زیادہ عمرؓ سے بے باک (بے تکلف) عبدالرحمن بن عوفؓ تھے۔ سب نے عبدالرحمن بن عوفؓ سے کہا کہ "آپ امیر المومنین سے لوگوں کیلئے گفتگو کرتے (تو بہتر ہوتا) کیونکہ انسان طالب حاجت بن کر آتا ہے' اسے آپ کی ہیبت اپنی حاجت بیان کرنے سے روکتی ہے اور وہ بغیر اپنی حاجت بیان کئے واپس چلا جاتا ہے۔" عبدالرحمنؓ ان کے پاس گئے اور کہا "اے امیر المومنینؓ! لوگوں پر نرمی کیجئے کیونکہ آنے والا آتا ہے اسے آپ کی ہیبت اپنی حاجت بیان کرنے سے روک دیتی ہے اور وہ واپس چلا جاتا ہے آپ سے گفتگو نہیں کرتا۔" فرمایا "اے عبدالرحمنؓ! میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں سچ بتاؤ کیا علیؓ اور طلحہؓ و زبیرؓ و سعدؓ نے تمہیں اس بات کا مشورہ دیا؟" انہوں نے کہا "جی ہاں!" فرمایا "اے عبدالرحمنؓ! واللہ میں لوگوں کیلئے نرم ہو گیا تھا مگر نرمی میں بھی اللہ سے ڈرا' پھر میں نے ان پر سختی کی یہاں تک کہ سختی میں بھی اللہ سے ڈرا' پھر رہائی کی کون سی صورت ہے؟"

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible]

عبدالرحمٰنؓ اپنی چادر کو کھینچتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے تھے کہ "آپ کے بعد لوگوں کیلئے افسوس ہے آپ کے بعد لوگوں کیلئے افسوس ہے"(۱)۔ "ایک مرتبہ قریش کے ایک فرد نے آپ سے کہا "آپ کچھ نرم ہو جائیے آپ کی ہیبت نے لوگوں کو لرزا دیا ہے۔" آپ نے پوچھا "میری ہیبت میں ظلم تو شامل نہیں؟" کہنے والے نے کہا "نہیں" آپ نے فرمایا "اللہ میری ہیبت کو اور زیادہ کرے"(۲)۔ "یہی فرق ہے رویے کے صحیح اور غلط ہونے کا۔ افسران کا رعایا پر رعب بذات خود کوئی بری چیز نہیں اس کا ہونا انتظامی معاملات میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ اس وجہ سے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ ان سے ظلم وزیادتی کا خطرہ ہے تو اس کا اثر بالکل مختلف ہوگا' معزز شریف اور نیک لوگ ان سے دور ہوتے جائیں گے ایسی ایڈمنسٹریشن ظالمانہ ہوگی۔ رعایا کبھی بھی دلی و ذہنی اعتبار سے اس کو اپنا نہیں سمجھے گی اس کی ہمدردو خیر خواہ نہیں ہوگی۔ حدیث نبوی کی رو سے ایسا حاکم سب سے برا ہوتا ہے لوگ جس کے شر کے خوف کی وجہ سے اس کی عزت کریں۔ اس کے برعکس اگر عدل کی وجہ سے لوگ ہیبت زدہ ہیں تو یہی چیز امن وامان میں مددگار ہوتی ہے۔ ماتحت عملہ اور عوام ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی سے باز رہتے ہیں۔ فاروق اعظمؓ کا یہی تاثر تھا جو اتنی وسیع وعریض سلطنت میں امن وامان کی بنیاد تھا اسی کے اضافے کیلئے آپ نے دعا فرمائی۔ دور جدید میں بھی ہر افسر کے دائرہ عمل میں اس تاثر کا عملی بنیادوں پر قائم ہونا انتہائی ضروری ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے میرے دل میں ان کیلئے رحم اور ان کے دلوں میں میرا رعب بٹھا دیا ہے"(۳)۔

معتدل رویے کا اس بات سے گہرا تعلق ہے کہ سختی ونرمی کی اصل اساس کیا ہے؟ اگر ان دونوں کے پیچھے اصل محرک رحم وشفقت کا جذبہ ہو اور خلوص وخیر خواہی پائی جاتی ہو' معاشرے کی بھلائی اور اجتماعیت کا مفاد ہو' تو اس کی کیفیت اور اثرات بالکل مختلف ہوں گے' جس طرح گھر کے نظام میں والدین کرتے ہیں۔ اس میں اعتدال وتوازن پایا جاتا ہے' کبھی بدخواہی وضرر کا شائبہ پیدا نہیں ہوتا' جو چیزیں چلی بھی جاتی ہیں اور ان کے نتائج بھی مفید ہوتے ہیں۔ رعایا سے رویوں میں بھی اسی طرح گھر کا ماحول اور پدرانہ شفقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ آپ نے ایک شخص کے نام کسی عہدہ پر تقرری کا فرمان لکھ دیا۔ اتنے میں حضرت عمرؓ کے خاندان کا ایک بچہ آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا اور اسے بوسہ دیا' بولا "میں نے آج تک کسی بچے کو گود میں نہیں بٹھایا نہ ہی بوسہ دیا ہے۔" آپ نے فرمایا "اگر اللہ نے تمہارے دل سے رحم ومحبت کے جذبات چھین لئے ہیں' تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ یاد رکھ اللہ تعالیٰ اپنے انہی بندوں پر رحم کرتا ہے' جو رحیم وکریم ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر آپ نے تقرری کا فرمان اس کے ہاتھ سے واپس لے لیا(۴) اور فرمایا "بخدا تو لوگوں کیلئے نہایت کم رحمت رکھتا ہے میری سلطنت میں تو کسی عہدے پر فائز نہیں ہوگا(۵)۔" بالکل اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے بنو اسد کے ایک شخص کو اس بنا پر منصب سے محروم کر دیا کہ اس نے بچوں سے شفقت کے اظہار پر تعجب کا اظہار کیا تھا(۶)۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "آخرت کے معاملے کو چھوڑ کر ہر چیز میں رعایت اور درگزر کی بخشش دی جا سکتی ہے"(۷)۔

اگر کسی کو کسی جرم میں سزا دی جائے تو اسے ہمیشہ برا نہیں سمجھنا چاہئے' بلکہ اس کی اصلاح کرنی چاہئے۔ اگر وہ آئندہ کیلئے صحیح راہ اختیار کر لیتا ہے' تو وہ قابل عزت اور مستحق توجہ ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا "اپنے گناہوں سے تائب ہونے والوں کی صحبت اختیار کرو' یہ لوگ دل کے بڑے رقیق ہوتے ہیں۔" ایک اور مرتبہ ارشاد ہوا "انسان کسی کام میں خطاکار ثابت ہوتا ہے' تو اس کے بعد گر رنج وملال میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کی تقصیر کے گناہ دھل جاتے ہیں(۸)۔" انسان ہونے کی حیثیت سے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ حکومتی اہلکار کا رویہ کسی بھی وجہ سے اعتدال سے ہٹ جائے۔ ایسی صورت میں سے خود اپنا احتساب کرنا چاہئے۔ آپ کا اپنا طرز عمل بہترین رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

---

(۱) سعد ۳: ۲۸۸ طبری ۱: ۲۰۷ جوزی ۱۳۷ (۲) جوزی ۱۳۷ (۳) کنز ۱۱: ۱۳۴ (۴) جوزی ۱۲۲ (۵) بیہقی ۹: ۴ (۶) جوزی ۱۲۲ (۷) جوزی ۱۷۹ (۸) ایضاً

حضرت احنفؓ سے روایت ہے کہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے ساتھ تھا' آپ کو ایک شخص ملا' اس نے عرض کی "امیر المومنینؓ میرے ساتھ چلئے اور فلاں شخص پر میرا انصاف کیجئے کیونکہ اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔" آپ نے اس کے سر پر اپنا درہ مار کر فرمایا "تم لوگ (وقت بے وقت) امیر المومنین کو بلاتے ہو' حالانکہ وہ خود تمہارے کاموں میں مستعد رہتے ہیں' حتیٰ کہ جب وہ مسلمانوں کے کسی (اہم) کام میں مشغول ہوتے ہیں' تب بھی تم ان کے پاس آ کر فریادیں کرتے ہو۔" وہ شخص ملامت کرتا ہوا واپس لوٹ کر جانے لگا' تو حضرت عمرؓ نے اس کو بلا کر اپنا درہ اس کے سامنے ڈال کر فرمایا "تم اپنا قصاص لے لو۔" اس نے کہا "نہیں میں اللہ کے واسطے اور تمہارے واسطے درگزر کرتا ہوں۔" آپ نے فرمایا "ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ کے پاس اجر پانے کیلئے اللہ کے واسطے ہی درگزر کرو۔" اس نے کہا "میں اللہ کے واسطے چھوڑے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا' کچھ دیر کے بعد پھر آیا اور دو رکعت نماز پڑھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "اے ابن خطابؓ تو پست تھا' اللہ نے تجھ کو بلند کیا' تو گمراہ تھا اللہ نے تجھے ہدایت دی' تو ذلیل تھا اللہ نے تجھے عزت دی پھر تجھ کو لوگوں پر حاکم بنایا۔ ایک شخص تیرے پاس داد خواہی کیلئے آیا تو نے اس کو مارا' کل تو جب اللہ کے پاس جائے گا تو اسے کیا جواب دے گا؟" احنف کہتے ہیں کہ اس معاملے میں حضرت عمرؓ اپنے آپ کو اس قدر ملامت کرتے تھے کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ تمام زمین والوں سے آپ بہتر ہیں[1]۔"

۲۔ تحائف سے اجتناب:

سلطنیہ عامہ کے ضابطہ اخلاق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ تحائف سے مکمل طور پر اجتناب کریں۔ رسول کریم ﷺ نے ان سے سختی سے منع فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس پالیسی کو اپنے عہد خلافت میں جاری و ساری رکھا۔ نہ تو خود کسی سے تحفہ قبول فرماتے نہ اہل خانہ کو لینے دیتے اور نہ ہی عمال و افسران کو اس کی اجازت دیتے' یہ بھی رشوت کی ایک قسم ہے۔ اس سے دینے والا خوشامد' چاپلوسی' ناجائز توقعات' غیر ضروری قرب' بلا جواز اعانت و مدد کا طالب ہوتا ہے' جبکہ افسر خود غرضی' مفاد پرستی' غرور و دباؤ اور زیادتی و ناانصافی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ رشوت و تحائف ادا نہ کر سکنے والوں کے جائز کاموں میں بھی رکاوٹ ڈالتا ہے اور ان سے طمع رکھتا ہے اور ناجائز کاموں کو کرنے کا عادی بن جاتا ہے۔ اس سے کرپشن' اقربا پروری اور استحصال کو فروغ ملتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس تحائف روانہ کئے' اس سامان کو آپ نے کھولنا شروع کیا۔ ابھی ایک ہی تھیلی کھولی تھی کہ پکار اٹھے "اسے واپس کر دو اسے واپس کر دو نہ ہم یہ دیکھیں گے کہ کیا کیا ہے اور نہ ہی تم اسے قریش کو دکھاؤ گے کہ یہ آپس میں کٹ مریں گے[2]۔" آپ نے حکم تحریر فرمایا کہ "ہدیہ قبول نہ کرو کہ یہ رشوت ہے۔" حضرت عمرؓ حاکم کو ہدیہ دینے کو بھی رشوت شمار کرتے تھے[3]۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے کسی عامل نے آپ کی اہلیہ کو دو گاؤ تکیے بھیجے۔ حضرت عمرؓ آئے اور آپ نے دیکھا تو پوچھا کہ "یہ کہاں سے آئے؟ کیا تم نے خریدے ہیں۔ دیکھو مجھے بتا دو مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔" اہلیہ نے بتایا کہ فلاں شخص نے بھیجے ہیں' آپ نے کہا کہ اللہ فلاں کا ناس کرے۔ جب انہیں کوئی کام پڑتا ہے اور مجھ پر بس نہیں چلتا تو یہ میرے گھر والوں کو واسطہ بناتے ہیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے ان گاؤ تکیوں کو زور سے ان کے نیچے سے کھینچا جن پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور اٹھ کر جانے لگے۔ خادمہ دوڑی کہ ان کے اندر روئی ہماری ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت ٹانکے ادھیڑے روئی نکال کر پھینکی اور تکیے لے کر باہر نکل گئے۔ ان میں سے ایک ایک مہاجر عورت کو دے دیا اور دوسرا ایک انصاری عورت کو دے دیا[4]۔ ایک شخص حضرت عمرؓ کو ہر سال اونٹ کی ران بھیجا کرتا تھا۔ وہ حضرت عمرؓ کے پاس کوئی معاملہ لے کر آیا اور بولا کہ اے امیر المومنینؓ ہمارے درمیان اس طرح صاف فیصلہ کر دیجئے' جس طرح اونٹ کی ران اونٹ سے علیحدہ کر دی جاتی ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے تمام عمال کو حکم تحریر کیا کہ "ہدیہ قبول نہ کرو کہ یہ رشوت ہے[5]۔"

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) بیہقی۔ ۱۰/۱۳۸ (٤) ایضاً (۵) [illegible] ۳۴۷۔

بقول رواس غرض حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ

۱۔ حاکم کو ہدیہ لینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ فی الحقیقت رشوت ہے۔

۲۔ یہ مال راشی کو واپس نہیں کیا جائے گا اور نہ مرتشی کیلئے رکھنا جائز ہے بلکہ ایسا مال راہ خدا میں خرچ کر دیا جائے[1]۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ نے زوجہ عمرؓ عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل کو ایک فرش بطور ہدیہ بھیجا' جسے میں سمجھتا ہوں کہ ایک گز اور ایک بالشت کا ہوگا۔ عمرؓ ان کے پاس آئے' تو اسے دیکھا' پوچھا کہ "تمہارے لئے کہاں سے آیا؟" انہوں نے کہا کہ "ابو موسیٰ اشعریؓ نے بطور ہدیہ دیا ہے۔" حضرت عمرؓ نے اسے لے کر ان کے سر پر مارا جس سے ان کا سر ہل گیا' پھر فرمایا کہ "ابو موسیٰ اشعری کو میرے پاس بلا لاؤ اور انہیں پیدہ چلا کے تھکا دو۔" ابن عمرؓ نے کہا کہ وہ اس طرح لائے گئے کہ تھک گئے اور کہہ رہے تھے "یا امیر المومنینؓ! مجھ پر عجلت نہ کیجئے۔" عمرؓ نے فرمایا کہ "تمہیں کیا چیز برانگیختہ کرتی ہے کہ تم میری ازواج کو ہدیہ دو۔" عمرؓ نے اس فرش سے ان کے سر پر مارا اور فرمایا "اسے لے لو ہمیں اس کی حاجت نہیں[2]۔" آپ تحائف کے بارے میں اس قدر محتاط تھے کہ ایک مرتبہ آپ کی زوجہ ام کلثومؓ نے شاہ روم کی بیوی کو تحائف بھیجے' جو بادشاہ نے بھی تحائف بھیجے' تو آپ نے وہ بیت المال میں جمع کرا دیئے۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت ام کلثومؓ بنت علیؓ نے کچھ خوشبوئیں اور دوسرے تحائف ڈاک کے ذریعے ملکہ روم کے پاس بھیجے اور وہ وہاں پہنچ گئے تو ہرقل کی بیوی (ملکہ روم) نے اپنی خواتین کو جمع کر کے کہا "یہ عرب کی ملکہ اور ان کے پیغمبر کی بیٹی کے تحائف ہیں۔" اس کے بعد ملکہ روم نے ان سے خط و کتابت کی اور اس کے بدلے میں تحائف بھیجے' جن میں ایک نہایت قیمتی ہار بھی تھا۔ جب وہ لے کر آیا تو حضرت عمرؓ نے ان کے تحائف کو رکوا دیا' پھر لوگوں کو نماز کیلئے بلوایا جب وہ جمع ہو گئے' تو آپ نے ان کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں پھر یہ فرمایا "میں جو اہم کام مشورہ کے بغیر انجام دیتا ہوں' اس میں بھلائی نہیں ہوتی ہے۔ تم مجھے مشورہ دو کہ ام کلثومؓ نے ملکہ روم کو تحائف پیش کیے تھے (اس کے جواب میں) ملکہ روم نے تحائف بھیجے ہیں۔"

کچھ لوگوں نے کہا "یہ تحائف ان کے تحائف کے بدلے میں ہیں' اس لئے وہی (ام کلثومؓ) اس کی حقدار ہیں۔ ملکہ روم کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ وہ آپ کے ماتحت ہے' جو آپ سے ڈرے۔" دوسرے لوگوں نے کہا "ہم کپڑے تحفہ کے طور پر بھیجا کرتے تھے تاکہ ہمیں اس کا بدلہ ملے اور ہم انہیں اس لئے بھیجا کرتے تھے تاکہ وہ فروخت ہوں اور ہمیں ان کی قیمت حاصل ہو۔" آپ نے فرمایا "لیکن یہ قاصد مسلمانوں کا قاصد ہے اور یہ ہرکارہ ان کا ہرکارہ ہے۔" آخرکار آپ نے حکم دیا کہ یہ تحائف بیت المال میں جمع کر دیئے جائیں اور انہیں (حضرت ام کلثومؓ) کو ان کے خرچ کے مطابق رقم واپس کی گئی[3]۔ آپ کے خادم حضرت اسلمؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عمرؓ نے فرمایا "اے اسلم دروازہ بند کر دو اور کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دو۔" پھر ایک روز انہوں نے میرے جسم پر ایک نئی چادر دیکھی تو پوچھا کہ "یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟" میں نے عرض کیا "یہ عبیداللہ بن عمرؓ نے دی ہے۔" فرمایا "عبیداللہ سے لے لو مگر کسی اور سے ہرگز کچھ نہ لو[4]۔" ۲۳ھ میں آپ نے اصفہان کی جنگوں میں حضرت سلمہ بن قیس اشجعی کو امیر لشکر مقرر فرمایا' جنگ میں اللہ تعالیٰ نے فتح دی۔ انہوں نے مال غنیمت میں کچھ زیورات و جواہرات دیکھے' تو انہوں نے فرمایا "تمہیں اس میں سے کوئی حصہ نہیں پہنچے گا۔ تم خوشی سے اس بات کی اجازت دو کہ ہم سے امیر المومنینؓ کی طرف بھجوا دیں کیونکہ وہ بہت محنت و مشقت برداشت کر رہے ہیں۔" تمام مسلمان اس کے بھجوانے پر راضی ہو گئے' تو حضرت سلمہ نے ان زیورات

(۱) رواس ۳۳۷ (۲) سعد ۳۰۸/۳ (۳) طبری ۲۶۰/۴ (۴) سعد ۳۰۹۔

کو صندوقچے میں رکھا' اپنے قبیلے کے ایک شخص کے ہاتھ روانہ کرتے ہوئے کہا "اسے لے کر سوار ہو جاؤ' جب بصرہ پہنچو تو امیر المومنین کے انعامات کی توقع پر دو سواریاں خرید و' ان پر اپنا اور اپنے غلام کا زادِ راہ لاد و' پھر امیر المومنین کی طرف روانہ ہو جاؤ۔" قاصد کے بقول حضرت عمرؓ نے مجھ سے جنگ اور علاقے کے تمام حالات دریافت فرمائے' میں نے جواہرات کے سلسلے میں بھی واقعہ کی تفصیلات بیان کیں اور صندوقچہ نکال کر پیش کیا۔ حضرت عمرؓ نے زیورات کے نگینوں کی طرف نگاہ ڈالی تو وہ سرخ' زرد اور سبز رنگ کے تھے۔ آپ نے (پیچھے کی طرف) چھلانگ لگائی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے "اگر یہ زیورات قبول کر لوں تو اللہ عمرؓ کا پیٹ نہ بھرے۔" عورتوں نے یہ خیال کیا کہ شاید میں آپ پر حملہ کر رہا ہوں' وہ سب پردے کے پاس آگئیں۔ آپ نے مجھے فرمایا "یہ جو تم لائے ہو واپس لے جاؤ۔" اپنے غلام یرفا کو میرے بارے میں حکم دیا کہ "اے یرفا! اسے صدقہ کی دو اونٹنیاں دے دو۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا "جب تم اپنے سے زیادہ کسی کو اس کا ضرورت مند دیکھو تو دونوں اسے دے دو۔" میں نے عرض کیا "امیر المومنینؓ میں ایسا ہی کروں گا۔" پھر مجھے فرمایا "اگر مسلمان ان (زیورات) کے تقسیم ہونے سے پہلے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے تو میں تم اور تمہارے حاکم کے ساتھ بہت برا سلوک کروں گا۔" قاصد کہتا ہے "میں وہاں سے جلد کوچ کر کے (حضرت) سعد کے پاس پہنچا اور کہا "آپ نے مجھے جس کام کیلئے مخصوص کیا تھا اللہ نے اس میں برکت عطا نہیں فرمائی۔ آپ ان زیورات کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ اس سے پہلے کہ مجھ پر اور آپ پر کوئی مصیبت نازل ہو۔" چنانچہ انہوں نے یہ (زیورات) ان میں تقسیم کر دیئے۔ اس وقت ایک ایک نگینہ پانچ یا چھ درہم میں فروخت ہوا' حالانکہ ہر ایک نگینہ میں ہزار کی قیمت سے زیادہ تھا۔[1]"

مذکورہ سب واقعات یہ واضح کرتے ہیں کہ آپ نے افسران کے ضابطہ اخلاق میں ہر قسم کے تحائف سے اجتناب کو نہ صرف شامل کیا' بلکہ اپنی عملی مثالوں سے اس پر سختی سے عمل کرایا۔ خود جب آپ اس قدر محتاط تھے تو کسی کی کیا مجال ہو سکتی تھی کہ وہ لینے کی ہمت کر سکے۔ دورِ جدید میں بھی حکومت و مملکت کے سربراہان اور وزراء سے لے کر اعلیٰ بیورو کریٹس ایسا عملی نمونہ پیش کریں' تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نچلی سطح تک سرطان کی مانند پھیلی ہوئی کرپشن اور رشوت ستانی کا خاتمہ نہ ہو سکے۔ اصل بات یہ ہے کہ کرپشن پر وہی قابو پا سکتا ہے' جو سب سے بڑھ کر خود اپنے اور اپنے اہل خانہ اور اقرباء کے معاملوں میں حد سے زیادہ سختی برتے۔

(۱) [illegible]

O.... نظمیہ عامہ کے فرائض

دورِ جدید میں پبلک ایڈمنسٹریشن کے کردار کو خالص انتظامی اور فنی نوعیت کے فرائض کی ادائیگی تک محدود سمجھا جاتا ہے' مثلاً پروگرام ڈیزائن کرنا' فیصلہ سازی' عملے کی بھرتی' تربیت' تنظیم کی تعمیر' تبدیلی متعارف کرانا' ترقی کا فروغ بطور ادارہ ایڈمنسٹریشن کو متحرک کرنا وغیرہ [1]۔ بعض دفعہ اس میں لاء اینڈ آرڈر' عدل و انصاف' دہشت گردی' فرقہ واریت اور علاقائیت کے خاتمے اور قومی یکجہتی اور جمہوری اقدار کے فروغ کو بھی شامل کرتے ہیں۔ جدید سیکولر ماڈلز ان کو خالصتاً مادی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے ہاں معقولیت' مستعدی' کفایت' اثر پذیری وغیرہ کا تعلق مادیت سے ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اخلاقی اقدار مثلاً افراد کی عزت نفس' سماجی مساوات اور شخصی نشوونما کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہی ان کی عالمگیر ناکامی کے اسباب ہیں۔ ایک طرف پبلک ایڈمنسٹریشن کے شعبے میں بے شمار تجربات ہو رہے ہیں' اسے سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ مدد حاصل ہے۔ ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ پر لاتعداد کتب لکھی جا رہی ہیں' نئے نئے نظریات کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ عملے اور ملازمین کی فنی تربیت کیلئے جدید ترین طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ ہر شعبے میں منتظمین کو جدید ترین آلات و اوزار میسر ہیں' لیکن دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں' جہاں اقربا پروری' ناانصافی' استحصال' بدنظمی' چوریاں اور ڈاکے' دہشت گردی' فرقہ واریت و علاقائیت اور دیگر تعصبات کی خون آشامیاں' جرائم' خودکشیاں' بے روزگاری' بھوک و افلاس' پسماندگی' انتشار' کشمکش' عدم تحفظ اور بے اطمینانی کی خوفناک فضا موجود نہ ہو۔ خفیہ ایجنسیاں' سیکورٹی فورسز' تربیت یافتہ عملے' اطلاعات کے برقی ذرائع' تیز رفتار سواریاں' عبقری ذہن' انتظامی آلات کسی ایک بڑے شہر میں بھی نظمیہ عامہ کے کتابی اہداف و مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ چہ جائیکہ ان سے ملکی اور بین الاقوامی سطح تک کسی بڑے کارنامے کی توقع رکھی جا سکے۔ ایڈمنسٹریشن کے مادی فلسفے' مادی معیارات اور مادی طریقے اور مادی اہداف کبھی انسانیت کو اعتدال و توازن' عدل و انصاف' امن و آشتی اور فوز و فلاح کی منزل تک نہیں پہنچا سکتے کیونکہ دنیا کی سب سے بڑی گمراہی زندگی کا مادی تصور ہے۔

اسلامی ممالک کی انتظامی حالت اور بھی دگرگوں ہے' وہ ایڈمنسٹریشن کے مغربی و لادینی ماڈلز کی نقالی کر کے تباہی و بربادی کے راستے پر گامزن ہیں' جو اپنی روح' مزاج اور نتائج کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں۔ وہ ایسے ثقافتی ماحول کیلئے تو کسی حد تک کارآمد ہو سکتے ہیں' جس کے لوگ خود غرض' مادہ پرست' مذہب سے بے تعلق' عفت و عصمت سے عاری' روحانیت سے بیگانہ' اخلاقی طور پر دیوالیہ' زندگی کے اعلیٰ مقصد اور نصب العین سے تہی دامن اور حیات بعد موت سے بے خبر ہوں' لیکن یہ معاشروں کیلئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں' جو دین و اخلاق پر استوار ہوں۔ ایسے ماڈلز کو اسلامی زاویۂ نگاہ سے جانچے اور پرکھے اور اسلامی اقدار کے سانچوں میں ڈھالے بغیر اپنانا اپنے مقصد زندگی' نظریہ حیات' تہذیب و ثقافت' اپنے ماحول اور عوام سے ٹکرانے کے مترادف ہے۔ مسلم ممالک کے اندر پائی جانے والی بے چینی' بے یقینی' مایوسی' بداعتمادی اسی اندھا دھند نقالی کا نتیجہ ہے۔ یہاں فکری و عملی تضادات پنپ رہے ہیں' عوام اور انتظامی اداروں کے مابین ہم آہنگی کے بجائے کشمکش برپا ہے۔ اخلاقی اور سماجی خرابیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں اور نظمیہ عامہ کا زیادہ تر وقت اپنے عوام کو دبانے اور خاموش کرانے میں صرف ہوتا رہتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نظمیہ عامہ کا ایک جدید اسلامی ماڈل تشکیل دے کر روبہ عمل لایا جائے جس میں ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کے سلسلے میں جدید سائنسی اور فنی معلومات' تجربات' آلات اور مہارتوں سے استفادہ کرتے ہوئے انہیں علی اسلامی اقدار اور اخلاقی و روحانی معیارات کے تابع کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ایسا ثقافتی ماحول فراہم کیا جائے' جس میں یہ ماڈل اپنا مثبت اور نتیجہ خیز کردار ادا کر سکے۔

Buraey 229 (1)

حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک یہ ذمہ داری خلیفہ وقت اور اس کی زیر سرپرستی سرگرم عمل نظمیہ عامہ کی ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسانیت کی تعمیر و ترقی اور فلاح و بہبود کیلئے بھرپور کردار ادا کرے اور اسلامی قدروں کو بام عروج تک پہنچائے۔ اس لئے آپ نے نظمیہ عامہ کو جن فرائض و مقاصد کا پابند بنایا' ان میں سب سے اہم پہلو اسلامی نظریہ حیات کی سمجھ بوجھ اور تعلیم و تفہیم پیدا کرنا' اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کا جذبہ بیدار کرنا اور اس کے اصول و ضابطوں کی تبلیغ و اشاعت ہے۔ لوگوں کا تعلق اپنے رب سے اسقدر جوڑ دینا کہ وہ اس کے ہر حکم کے آگے بلاچون و چرا سر تسلیم خم کردیں۔ ان کے اندر خدا خوفی اور تقویٰ پیدا ہو' وہ تمام انسانی حقوق کی پاسداری' سزا اور قانون کے ڈر سے نہیں' بلکہ صرف اسی کی رضا کیلئے کریں۔ آپ نے نظمیہ عامہ کو ان فرائض کی ادائیگی پر لگا کر ایک ایسا ماحول پیدا کردیا' جس میں اچھائیوں پر عمل کرنا آسان اور برائیوں کی طرف راغب ہونا مشکل ہوگیا۔ حکومت اور اس کی ایڈمنسٹریشن جب خود عدل و انصاف کی علمبردار بن گئی' تو اس کی بے پناہ طاقت و قوت کے سامنے ظلم و استحصال کا باقی رہنا ناممکن ہوگیا اور "عدل فاروقی" تاریخ انسانی میں ایک ضرب المثل بن گیا۔

آپ جن فرائض کی بجا آوری کا حکم اپنے عمال و افسران کو دیتے تھے' وہ ان کی ذات تک محدود نہیں ہوتے تھے' ان کا مقصد ان علاقوں میں ایسا نظام کار وضع کرنا ہوتا تھا جو ان کی ادائیگی میں معاون و مددگار ثابت ہو۔ چونکہ اس حکم کا مخاطب ایک عام فرد نہیں' بلکہ ذمہ دار و مقتدر شخص ہوتا تھا اس لئے اس کے عملی اطلاق میں ان انتظامی آلات و طریقوں کا استعمال جو اس فرض کی ادائیگی کیلئے ضروری ہوں' خود بخود شامل تھا۔ مثلاً قیام صلوٰۃ کے حکم سے یہ مراد لینا صحیح نہیں کہ گورنر قریب والی مسجد میں باقاعدگی سے نماز ادا کرے' بلکہ اس کی ذمہ داری ہے کہ علاقے میں قیام صلوٰۃ کے کیا تقاضے ہیں اور انہیں کیسے پورا کیا جاسکتا ہے۔ اس میں نماز کی فضا تیار کرنا' سکھانے کا اہتمام کرنا' مساجد کی تعمیر' آئمہ کا تقرر' اس سے متعلق تمام معاملات کی براہ راست نگرانی' اطلاعات کا نظام' پیش آمدہ مسائل و مشکلات کے ازالے کا اہتمام وغیرہ سب انتظامی طریقے اختیار کرنا خود بخود اس حکم میں شامل ہے۔ آپ صرف عمال ہی کو ان کے فرائض نہیں بتاتے تھے' بلکہ رعایا میں اس کی بھرپور تشہیر کرتے تھے تاکہ ہر خاص و عام کے علم میں ہوں۔ رائے عامہ بیدار ہو' حکومتی و انتظامی معاملات میں ان کی شراکت و اعتماد یقینی ہو' وہ اہلکاروں پر نظر رکھیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریاں کہاں تک ادا کر رہے ہیں۔ ہر حاکم کو تقرر کے وقت تحریر دیتے' جن میں یہ فرائض درج ہوتے تھے' وہ وہاں مجمع عام میں جاکر سناتا۔ کبھی آپ خود جمعہ یا دیگر اہم مواقع پر تقریر کر کے لوگوں میں اعلان فرماتے' کبھی آپ خطوط اور زبانی نصیحتوں میں ان کی یاد دہانی کراتے رہتے۔ ان میں سے اہم فرائض حسب ذیل ہیں

ا۔ دین کی تعلیم و اشاعت:

اسلامی ریاست کی نظمیہ دینی اعتبار سے نہایت اہم اور بامقصد ذمہ داری پر فائز ہوتی ہے۔ اس کیلئے نظریاتی طور پر پختہ اور باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ دین کی تعلیم و اشاعت کا اہتمام کرے اور ایسا طریق کار اور نظام قائم کرے' جس سے لوگ دین کا علم و شعور حاصل کریں اور کتاب و سنت کے احکامات سے آگاہ ہوں' چنانچہ ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے میں ارشاد فرمایا "خدا کی قسم! میں اپنے افسروں کو تمہارے یہاں اس لئے نہیں بھیجتا کہ تمہارے منہ پر تھپڑ ماریں اور تمہارے اموال چھین لیں۔ میں انہیں تمہارے پاس اس لئے بھیجتا ہوں کہ وہ تمہارا دین اور تمہارے نبی ﷺ کی سنت سکھائیں۔ جس کسی کے ساتھ دین و سنت سے ہٹا ہوا سلوک کیا جائے' اسے چاہئے کہ اپنا معاملہ میرے سامنے پیش کرے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' میں متعلقہ افسر سے اس کا بدلہ لے کر رہوں گا"[1]۔

---

(1) یوسف ۱۱۴؛ طبری ۵/۲۰۴؛ مسعدی ۳/۲۲۶؛ حنبل ۱/۴۱؛ بیہقی ۹/۲۹

فسروں کو مقرر کرتے وقت جو نصیحتیں فرماتے تھے' ان میں ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ "تم انہیں خالص قرآن کی تعلیم دو' رسول اکرم ﷺ سے کم روایت کرو' میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہوں[1]۔" آپ نے ۱۴ھ میں نماز تراویح باجماعت ادا کرنے کا اہتمام فرمایا' اس بارے تمام شہروں میں تحریری احکام فرمائے' لوگوں کیلئے دو قاری مقرر فرمائے۔ یک مردوں کو نماز تراویح پڑھاتا تھا اور دوسرا عورتوں کو[2]۔ دین کی تعلیم و اشاعت کیلئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کا تقرر کیا جائے' جو خود دین کے عالم ہوں۔ چنانچہ سلمان بن بریدہ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے پاس مومنوں کا کوئی لشکر اکٹھا ہو جاتا تو آپ اہل علم و فقہ میں سے کسی کو امیر مقرر کرتے تھے[3]۔ آپ خود بھی اپنے خطابات کے ذریعے اشاعت دین' امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض ادا کرتے رہتے تھے اور لوگوں کو دین سکھانے اور اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کا احساس بیدار فرماتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر آپ کا ایک اہم خطبہ نقل کیا جاتا ہے۔ آپ نے مجمع عام میں کھڑے ہو کر فرمایا "میں تم سے اس خدا سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں جس کے ماسوا ہر شے فنا ہو جائے گی۔ جس کی اطاعت گزاری سے اس کے دوست مستفید ہوتے ہیں اور جس کی نافرمانی سے اس کے دشمن خسارہ میں رہتے ہیں۔ برباد ہونے والوں کا عذر قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ان کے سامنے ہدایت آ چکی۔ اللہ کی حجت و برہان جب واضح ہو چکی تو اب حجت اور بحث کی گنجائش بھی کہاں۔ یاد رکھو' ایک سرپرست اپنے ماتحتوں کا اس سے بہتر حق ادا نہیں کر سکتا کہ وہ ان کو ان کے فرائض کی انجام دہی پر آمادہ کرے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اللہ کے احکامات نافذ کریں اور اپنے زیر تکفل اور زیر نگرانی لوگوں کو یعنی اولاد وغیرہ کو اللہ کی نافرمانی نہ کرنے دیں۔ ہمیں چاہئے کہ قریب اور دور سب ہی جگہ کے لوگوں کو احکام الٰہی کا تابع بنائیں اور اس کی پرواہ نہ کریں کہ حق کی جانب نزدیک کے لوگ مائل ہوئے کہ دور کے' تاکہ ان پڑھ سیکھ جائیں اور غیر معتدل لوگ راہ راست پر آ جائیں اور میں ایسے لوگوں سے بھی واقف ہوں جن کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دل ہی دل میں سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ہم یہ کریں گے ہم وہ کریں گے۔ ہم نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کریں گے' مجاہدوں کے ساتھ جہاد کریں گے' ہجرت کریں گے' اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ قتال کریں گے' لیکن محض حسن آرزو سے کیا ہوتا ہے۔ جو کوئی بھی اپنے فرائض پر عمل پیرا ہوتا ہے اور اپنی نیت صحیح رکھتا ہے' وہی نجات یافتہ ہوتا ہے ورنہ نہیں۔ جو کوششوں میں اضافہ کرتا ہے' اسے اللہ کے ہاں اور ملتا ہے۔ جہاد سب سے مرتفع اور اعلیٰ پائے کا عمل ہے اور اصل جہاد یہ ہے کہ انسان اعمال بد اور بد عمل لوگوں کو مطلقاً چھوڑ دے۔ بعض لوگ مجاہد ہونے کے مدعی ہیں' لیکن جہاد دراصل اللہ کی راہ میں ہوتا ہے۔ جہاد یہ ہے کہ حرام چیزوں سے بچا جائے' اسلام کے اعداء سے لڑا جائے اور مشکلات کے مواقع پر کوششوں میں اور اضافہ کیا جائے۔ بعض لوگ ہیں کہ اجر کی خاطر لڑتے ہیں' بعض ذکر کی خاطر' اللہ کو یہ ناگوار نہیں کہ تم کشادگی حاصل کرو' مگر وہ دراصل تم کو زیادہ بڑی سہولتوں کی جانب برانگیختہ کرتا ہے۔ اپنے فرائض انجام دو' یہ تم کو جنت الفردوس دلوائیں گے۔ طریق نبوی ﷺ پر قائم رہو' نئے فتنوں سے محفوظ رہو گے۔ سیکھو' جانو اور حاصل کرو اس لئے کہ بے خبری میں سے چارگی ہے۔ دین میں نئی نئی بدعتیں بے حد مکروہ ہیں' طریق نبوی ﷺ پر معتدلانہ عمل' اس اجتہاد سے بہتر ہے جو گمراہی ثابت ہو۔ نصیحتوں پر عمل کرو' لڑتا وہ ہے جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہے' سعادت مندی یہ ہے کہ انسان دوسروں سے سبق لے' شقی ماں کے بطن سے شقی برآمد ہوتا ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری بے حد لازم ہیں کہ ان میں عزت و آبرو ہے۔ عصیاں شعاری اور تفرقہ سے پرہیز کرو کہ یہ باعث تذلل اور خواری ہے گو یا لوگ اقتدار سے متنفر رہتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ تجھے اس سے سابقہ ہو[4]۔" ایک مرتبہ اللہ کو گواہ کر کے فرمایا "اے اللہ میں تیرے سامنے حکام بلاد کے بارے میں اعلان کرتا ہوں کہ میں نے انہیں اس کام کیلئے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو دین و سنت کی تعلیم دیں[5]۔"

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) طبریہ [illegible] مسلم [illegible]

ابو حصین کے مطابق جب حضرت عمرؓ حکام کو مقرر کرتے تھے تو ان کے ساتھ نکل کر انہیں رخصت کرنے جاتے تھے اور انہیں جو نصیحتیں کرتے تھے ان میں یہ بھی تھی کہ "تم لوگوں کو قرآن کی تعلیم دو اور نبی کریم ﷺ سے کم روایت کرو میں ہر معاملے میں تمہارے ساتھ شریک ہوں"[1]۔ آپ مختلف طریقوں سے یہ بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ عمال اس سلسلے میں کہیں کوتاہی تو نہیں کر رہے؟ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ مجھے ابو موسیٰ اشعریؓ (عامل بصرہ) نے حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا' تو انہوں نے پوچھا "تم نے اشعریؓ کو کس حالت میں چھوڑا ہے؟" میں نے کہا کہ "انہیں اس حالت میں چھوڑا ہے کہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے رہے تھے۔" آپ نے فرمایا "خبردار وہ بڑے آدمی ہیں' لیکن یہ بات انہیں نہ بتانا"[2]۔ آپ کا اپنا طریقہ بھی یہ تھا کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ قرآن کی طرف رغبت دلائیں۔ حضرت ابو موسیٰ نہایت خوش الحان تھے' جب مدینے میں ہوتے' تو آپ انہیں دیکھتے تو فرماتے "اے ابو موسیٰ ہمیں رب کی یاد دلاؤ" کر سناؤ' وہ ان کے پاس قرآن پڑھتے تھے[3]۔

دین کی تعلیم و اشاعت کا عظیم کام اس وقت تک خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں پاسکتا جب تک کہ انتظامیہ کے منصب پر ایسے لوگوں کو فائز نہ کیا جائے جو خود دین کے عالم و فاضل ہوں۔ سلیمان بن بریدہ سے روایت ہے حضرت عمر فاروقؓ کا یہ طریقہ تھا کہ جب آپ کے پاس مسلمانوں کا کوئی لشکر تیار ہو جاتا' تو آپ ان پر کسی عالم و فقیہ فرد کو امیر مقرر کر دیتے[4]۔ خواہ وہ کسی شعبے سے متعلق ہوں اس کی یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ لوگوں کو دین بھی سکھائیں۔ مسعودی کے بقول حضرت عمرؓ نے عمار بن یاسرؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا۔ عثمانؓ بن حنیف کو محصولات اور عبداللہ بن مسعودؓ کو بیت المال کی ذمہ داری سونپی اور ان تینوں کو حکم دیا کہ وہ اہل کوفہ کو قرآن کی کم از کم ایک آیت کا درس دیا کریں[5]۔ آپ کے نزدیک اسلامی نظریہ عامہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ سرکاری نوکر و ملازم کے طور پر محض فنی و انتظامی ذمہ داریوں کی ادائیگی کو کافی نہ سمجھیں' بلکہ مشنری سپرٹ کے ساتھ پوری لگن اور خلوص سے دینی کام سرانجام دیں' تاکہ لوگ انہیں صحیح معنوں میں رہبر و رہنما سمجھیں اور ان سے مسائل کے حل کے علاوہ ہدایت و رہنمائی حاصل کریں۔ ایک موقع پر گورنروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "سنو میں نے تمہیں آمر و جابر بنا کر نہیں بھیجا ہے' بلکہ ہادی و رہنما بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگ تم سے رہنمائی حاصل کریں"[6]۔

آپ کے نزدیک ہدایت و رہنمائی میں دین کے تمام معاملات کی مینجمنٹ اور ایڈمنسٹریشن شامل ہے' جو فرائض کی ادائیگی کا جذبہ بیدار کرنے سے لے کر ہمہ گیر راست بازی و احکامات دینی کے نفاذ تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک دو مرتبہ مجمع عام میں خطاب کرتے ہوئے جو باتیں ارشاد فرمائیں' ان میں یہ بھی تھی۔ "کوئی سرپرست اپنے ماتحتوں کا اس سے بہتر حق ادا نہیں کر سکتا کہ انہیں ان کے فرائض کی انجام دہی پر آمادہ کرے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اللہ کے احکامات نافذ کریں اور اپنے زیر نگرانی لوگوں کو اللہ کی نافرمانی نہ کرنے دیں۔ ہمیں یہ چاہئے کہ قریب و دور سب ہی جگہ سے لوگوں کو احکام الٰہی کا تابع بنائیں اور اس بات کی پروا نہ کریں کہ حق کی جانب نزدیک کے لوگ مائل ہوئے یا دور کے تاکہ اس پڑھ سیکھ جائیں اور غیر معتدل لوگ راہ راست پر آ جائیں"[7]۔ آپ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ شریعت سے انحراف تمام انحرافات اور انتشارات کی بنیاد بنتا ہے۔ اس لئے دنیوی اور انتظامی امور کی اصلاح کیلئے بھی ضروری ہے کہ دین و سنت کی پوری پابندی کی جائے۔ ۱۷ھ میں بصرہ کے گورنر حضرت مغیرہؓ پر اخلاقی الزام عائد کیا گیا تو آپ نے انہیں برطرف کر کے اپنے پاس بلا لیا اور ان کی جگہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو مقرر کیا اور فرمایا "اے ابو موسیٰ! میں تمہیں حاکم بنا کر ایسی سرزمین کی طرف بھیج رہا ہوں جہاں شیطان نے انڈے دیئے ہیں اور ان میں سے چوزے بھی نکل آئے ہیں۔ اس لئے جو طریقہ (سنت نبوی ﷺ) تمہیں معلوم ہے اس کی پابندی کرنا اور تبدیل مت ہو جانا ورنہ اللہ بھی اپنا طریقہ تمہارے ساتھ تبدیل کر دے گا"[8]۔

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) طبری ۴: ۲۰۴ (۴) یوسف ۱۹۳' طبری ۴: ۱۸۶ (۵) مسعودی ۲: ۳۷۰ (۶) یوسف ۱۱۸ (۷) حوری ۱۸۲ (۸) طبری ۴: [illegible]

آپ نے ایک مرتبہ کوفہ میں تمام عمال کا تبادلہ کر دیا۔ حضرت عمارؓ بن یاسر کو انتظامیہ کا اور حضرت عثمانؓ بن حنیف کو محصولات کا ذمہ دار بنایا۔ بیت المال کی ذمہ داری حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو سونپی۔ ان تینوں کو یہ حکم دیا کہ اہل کوفہ کو کم از کم ایک ایک آیت کا درس دیا کریں۔ حضرت عمارؓ بن یاسر کیونکہ گورنر تھے اس لئے ان کی نشست کا فرش الگ تھا۔ البتہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت عثمانؓ بن حنیف کی نشست کا فرش مشترکہ تھا[1]۔ ہر شعبے کے افسران کو درس قرآن دینے کا حکم یہ ظاہر کرتا ہے کہ بلا تخصیص تمام حکومتی عہدیداروں کی بنیادی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی ترویج و اشاعت کو اولیت دیں۔ درس دینے کا دو طرفہ فائدہ تھا۔ ایک یہ کہ وہ خود قرآن سے وابستہ رہیں گے' آیات کو پیش کرنے کیلئے ان کا بہترین انتخاب کریں اور اس کی تفسیر پر غور و خوض کریں گے اور اسلامی تعلیمات پر انہیں عبور حاصل ہوتا جائے گا اور دوسری طرف عوام کو اسلام سمجھنے میں آسانی رہے گی' ان کا حاکموں سے فکری و ذہنی تعلق بھی قائم ہو گا اور دین و دنیا کی تفریق مٹ جائے گی۔ آپ خود بھی ذکر و فکر اور تعلیم و تعلم کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے' لوگوں کی تربیت فرماتے تھے۔ اس طرح کی ایک محفل کا ذکر حضرت ابی اسیر کے خادم ابی سعید کچھ اس طرح کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عمرؓ بن الخطاب عشاء کے بعد مسجد میں گشت کرتے تھے' جس کسی کو دیکھتے نکال دیتے سوائے اس شخص کے جو کھڑا ہوا نماز پڑھتا ہو۔ اصحاب رسول ﷺ کے ایک گروہ کے پاس سے گزرے جن میں ابی بن کعب تھے' پوچھا "یہ کون لوگ ہیں؟" ابی نے جواب دیا کہ "یا امیر المومنین! آپ کے عزیزوں کی ایک جماعت ہے۔" پوچھا کہ "نماز کے بعد تمہیں کس چیز نے چھوڑا؟" انہوں نے کہا کہ "ہم لوگ بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔" وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ جو شخص ان کے زیادہ قریب تھا اس سے فرمایا کہ شروع کرو انہوں نے دعا کی چنانچہ انہوں نے ان میں سے ایک ایک آدمی کو جو دعا کر رہے تھے پڑھوایا یہاں تک کہ میری باری آئی۔ میں ان کے پہلو ہی میں تھا فرمایا "پڑھو" میری آواز بند ہو گئی اور خوف سے لرزنے لگا۔ انہوں نے محسوس کیا اور فرمایا "اگر تم کہتے کہ اے اللہ ہماری مغفرت کر دے اللہ ہم پر رحمت کر' (تو بہتر ہوتا)" راوی نے کہا کہ پھر عمرؓ نے شروع کیا اس جماعت میں ان سے زیادہ آنسو بہانے والا ان سے زیادہ رونے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے بعد فرمایا کہ "اب واپس جاؤ۔" سب لوگ منتشر ہو گئے[2]۔

۲۔ اقامت الصلوۃ:

اسلامی نظریہ عامہ کا ایک دوسرا اہم فرض فرائض کا اہتمام کرنا ہے۔ بقول بیورے "اس کا کام افراد کو ایک ایسا ماحول فراہم کرنا ہے جس کے تحت وہ اپنے خدا سے مستقل تعلق قائم کر سکیں[3]۔ اس کا سب سے اہم ذریعہ وہ فرائض ہیں' جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں۔ ایک با مقصد اسلامی اور نظریاتی مملکت کے کارندے کی حیثیت سے ایڈمنسٹریشن سے وابستہ لوگ آئینی اور اخلاقی طور پر پابند ہیں کہ خود بھی فرائض پر عمل کریں اور ایسی منصوبہ بندی اور نظام کار وضع کریں کہ لوگ ان کی بجا آوری کیلئے متحرک رہیں۔ یہ محض دینی ضرورت ہی نہیں بلکہ انتظامی امور کو نہایت خوش اسلوبی' دیانتداری' جوش و جذبے اور خدمت خلق کے احساس کے ساتھ سر انجام دینے کا ایک ایسا نسخہ ہے جس کا متبادل آج تک ایجاد نہیں ہو سکا۔ لوگوں کا اپنے رب سے تعلق جتنا مضبوط ہو گا' وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں اتنا زیادہ اخلاص و استقامت کا مظاہرہ کریں گے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک ایسا ثقافتی ماحول پیدا کیا جائے' جو روحانیت اور اخلاقی اقدار کو اتنا فروغ دیتا رہے کہ لوگ اپنی انفرادی و اجتماعی معاملات اور باہمی تعلقات میں عدل' احسان اور تقویٰ کی پاسداری کریں۔ یہ سب کچھ فرائض ہی کے اہتمام سے ممکن ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے' اس لئے انہوں نے اس سلسلے میں بھرپور کوشش کی۔ آپ نے لوگوں کو سنن اور فرائض سیکھنے کا حکم دیا[4]۔ فرائض کے اہتمام میں سب سے اہم چیز نماز ہے۔ قرآن حکیم میں حکمرانوں کے فرائض میں ایک اقامت الصلوۃ ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے مسلمان اور کافر میں فرق

---

(۱) مسعودی، ۲: ۳۷۰ (۲) سعد، ۳: ۲۹۹ (۳) Buraey.302 (٤) متقی، ۱۰: ۲۵۲۔

کرنے والی چیز نماز کو قرار دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "جس نے نماز چھوڑ دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔" راوی کے بقول آپ نے ایسی حالت میں نماز ادا کی جب آپ کے زخم سے خون بہہ رہا تھا[۱]۔ آپ نے اپنے گورنروں کو لکھا "میرے نزدیک تمہارا سب سے اہم فریضہ نماز ہے۔ جس نے اس کی حفاظت کی اور باقاعدگی سے ادا کرتا رہا اس نے اپنے دین کو محفوظ رکھا۔ جس نے اس کو ضائع کر دیا وہ دیگر فرائض کو اور زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا[۲]۔" آپ نے نماز کے صحیح اور بروقت اہتمام کو اپنا بہت بڑا منصبی فریضہ سمجھا اور اپنے افسروں کو اس کی جزئیات تک سے آگاہ رکھتے تھے، تاکہ وہ اپنی اپنی عملداری میں عوام کو ان کا پابند بنائیں۔ چنانچہ آپ نے گورنروں کو ان کے اوقات کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا "نماز ظہر اس وقت ادا کرو جب آفتاب ڈھل جائے اور اس کا سایہ ایک ہاتھ کے برابر ہو جائے اور اس وقت تک پڑھ سکتے ہو، جب آدمی کا سایہ خود اس کے قد کے برابر ہو جائے۔ عصر کا وقت اس وقت سے شروع ہوتا ہے، جب آفتاب بلند اور سفید ہو اور یک اونٹ سوار غروب آفتاب سے قبل چھ یا نو میل کا سفر طے کر سکے۔ نماز مغرب اس وقت پڑھو جب سورج غروب ہو جائے اور عشاء کی نماز اس وقت پڑھو، جب شفق غائب ہو جائے یہاں تک کہ ایک تہائی رات گزر جائے۔ جو شخص اسے پڑھے بغیر لیٹے تو اللہ کرے اسے نیند نہ آئے اور اللہ کرے اسے نیند نہ آئے اور نماز فجر اس وقت پڑھو، جب تارے صاف اور گھنے ہوئے ہوں[۳]۔" آپ کا ارشاد ہے نماز کے سلسلے میں لوگوں پر نظر رکھو کہ کون نماز میں آگئے ہیں کون نہیں آئے۔ اگر کچھ لوگ بیمار پڑ جائیں تو ان کی عیادت کرو اور اگر بات دوسری ہو تو انہیں ملامت کرو[۴]۔" آپ حکام کو روانہ کرتے وقت فرماتے تھے کہ "میں نے تمہیں اس لئے حاکم مقرر کیا ہے کہ تم نمازیں قائم کرو اور حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو[۵]۔"

اقامت صلوٰۃ کی ذمہ داری نبھانے ہی کا جذبہ تھا کہ آپ نے نظریہ عامہ کو مساجد کی تعمیر کی طرف متوجہ کیا کیونکہ انہیں مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور عدالتی سرگرمیوں کے مراکز اور تہذیب و ثقافت کے محور کی حیثیت حاصل ہے، یہ اس زمانے کے کمیونٹی سنٹر تھے۔ بقول ابن حزم آپ کے عہد میں مشرق و مغرب کا کوئی شہر باقی نہ رہا، جس میں مساجد نہ تعمیر کی گئی ہوں[۶]۔ علاوہ ازیں آپ نے قیام صلوٰۃ کیلئے جو نظام کار وضع کیا اس میں عوام کی رہنمائی و سہولت اور گورنروں کی مدد و معاونت کیلئے فقہا اور معلمین کا الگ سے تقرر بھی شامل تھا، جو فرائض و عبادات سمیت زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل پیش کرتے تھے۔ اس طرح نماز کی مینجمنٹ کے ضمن میں آپ نے جو منصوبہ بندی کی اس میں اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری پر مبنی عمومی اجتماعی ماحول سے لے کر ترغیب و ترہیب، فکری و عملی رہنمائی، نئے پیش آمدہ مسائل کا حل اور تمام ضروری سہولیات و وسائل کی فراہمی شامل تھی۔ اس سلسلے میں آپ کا اسوہ اور طریق کار آپ کے اپنے دور کے سرکاری اہلکاروں کیلئے ہی نہیں ہر دور کی اسلامی نظریہ عامہ کیلئے روشن قندیل ہے۔ اس کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں

دار الخلافہ میں جہاں نماز کے معاملات کی نگرانی براہ راست آپ کی ذمہ داری تھی۔ آپ لوگوں پر نظر رکھتے تھے کہ کون وقت پر نماز ادا کر رہا ہے کون نہیں۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے صبح کی نماز کے وقت سلمان بن ابی حثمہ کو نہ دیکھا۔ ان کا گھر مسجد نبوی اور بازار کے درمیان تھا، جب آپ نماز سے فارغ ہو کر بازار جانے لگے، تو راستے میں ان کی والدہ شفاء ملیں، تو انہیں کہا کہ میں نے صبح کی نماز میں سلمان کو نہیں دیکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ رات وہ نماز پڑھتے رہے، جس کی وجہ سے آنکھ لگ گئی، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "مجھے صبح کی جماعت میں حاضر ہونا رات بھر کی عبادت سے زیادہ عزیز ہے[۷]۔" ایک مرتبہ آپ عصر کی نماز پڑھ کر لوٹے، تو ایک شخص ملا تو پوچھا "تم صلوٰۃ عصر میں کیوں شامل نہیں ہوئے؟" اس نے کوئی عذر بیان کیا، تو آپ نے فرمایا "تم نے اپنے ثواب کو گھٹا دیا[۸]۔" عوام کی اصلاح و تربیت نظریہ عامہ کی یک ہمہ وقتی ہمہ پہلو اور مستقل ذمہ داری ہے۔ اس لئے آپ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت اسے

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) مالک: ۲۰۳ (۴) عمر فاروق: ۲۸۲ (۵) طبری: ۲۰۴/۵ (۶) حزم: ۸۰-۲ (۷) مالک: ۱۳۱ (۸) [illegible]

سرانجام دینے میں مصروف رہتے۔ ایک مرتبہ لوگوں کو سر راہ نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا "نماز مسجد میں ادا کیا کرو"[۱]۔ "ایک عورت کو دیکھا کہ وہ بچے کو نماز کیلئے اٹھا رہی ہے لیکن وہ نہ اٹھنے کی ضد کر رہا ہے تو فرمایا "اسے چھوڑ دو جب تک سمجھنے نہ لگے اس پر نماز فرض نہیں"[۲]۔ "گویا آپ یہ چاہتے تھے کہ بچوں پر قبل از وقت سختی و جبر کے بجائے انہیں آہستہ آہستہ نماز کی ترغیب دی جائے اور عادی بنایا جائے۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے نماز پڑھتے ہوئے لومڑی کی کھال کی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ آپ نے اس کے سر سے اتار پھینکی اور فرمایا "تمہیں پتہ نہیں کہ شاید یہ پاک نہ ہو"[۳]۔ "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کی تربیت اس نہج پر کرنا چاہتے تھے کہ وہ ایک طرف تو آداب نماز میں سے ہر ایک کو وہی مقام واہمیت دیں جو در حقیقت ہے۔ دوسری طرف بلاوجہ تکلفات و توہمات سے گریز اختیار کر کے اصل مقصد اور اس کی روح کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ صفائی و نظافت آپ کے نزدیک سر ڈھانپنے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے اس کی پاسداری کرنی چاہئے۔ آپ کا موقف دور جدید میں بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے' جہاں کئی لوگ ٹوپی نہ ہونے کی وجہ سے نماز تک چھوڑنے سے حرج محسوس نہیں کرتے اور کئی ایسے لوگ بھی ہیں جو سر ڈھانپنے کیلئے پھٹی ہوئی اور بوسیدہ چٹائی کی غلیظ ٹوپیاں تک سر پر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک شخص کو آپ نے دیکھا کا سر اوندھا کئے نماز پڑھ رہا ہے' تو آپ نے فرمایا "یہ کیا کر رہے ہو؟ اپنا سر اونچا کرو خشوع اس سے زائد کسی کیفیت کا نام نہیں ہے جو انسان کے قلب میں موجود ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے زائد خشوع لوگوں کو دکھلائے' جو اس کے دل میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوہرا نفاق کر رہا ہے"[۴]۔ "آپ نماز سے متعلق ممنوعات و مکروہات سے لوگوں کو باز رکھنے کیلئے بوقت ضرورت سرزنش و سختی سے بھی گریز نہیں کرتے تھے' تا کہ وہ لوگوں کی عادات کا حصہ نہ بن جائیں اور پھر کسی کیلئے بھی ان سے منع کرنا ممکن نہ رہے۔ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دو رکعتوں کی نیت باندھ رہا ہے' جبکہ موذن اقامت کہہ رہا تھا آپ نے اس کی سرزنش کی اور فرمایا "جب موذن اقامت کہہ رہا ہو تو اس فرض نماز کے سوا کوئی نماز جائز نہیں"[۵]۔ "آپ ایسا کرنے والے کو مارا کرتے تھے"[۶]۔ "اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ غروب آفتاب کے بعد اقامت سے قبل دو رکعتیں پڑھ رہا ہے اور ساتھ ہی ادھر ادھر ملتفت ہو رہا ہے۔ جب اس نے نماز پوری کی تو اسے درے سے مارا اور فرمایا "نماز میں ادھر ادھر مت دیکھا کرو"[۷]۔ "نماز کی ایڈمنسٹریشن میں منتظمین کیلئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ لوگ کسی امر مباح کو فرائض و سنن کا درجہ نہ دے دیں اور مستقبل کیلئے کسی بگاڑ کا پیش خیمہ ثابت نہ ہوں۔ اس کا بروقت نوٹس لینا اور اس کی صحیح حیثیت کو مشتہر کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ تمیم داریؓ کو عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے دیکھ تو درہ مارا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ بیٹھ جائیے تو آپ بیٹھ گئے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا "آپ نے مجھے کیوں مارا؟" آپ نے فرمایا "اس لئے کہ تم عصر کے بعد دو رکعت پڑھ رہے تھے' حالانکہ میں نے اس سے منع کیا ہے۔" تمیمؓ نے کہا "میں نے یہ رکعتیں ان کے ساتھ بھی پڑھی ہیں' جو آپ سے بہتر تھے (یعنی رسول اللہ ﷺ)۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اے لوگو' مجھے تم سے کسی قسم کا اندیشہ نہیں' بلکہ مجھے یہ خوف ہے کہ تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ عصر اور مغرب کے درمیان نماز پڑھا کریں گے یہاں تک کہ وہ اس ساعت میں بھی نماز پڑھتے رہیں گے جس میں رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے جیسا کہ ظہر اور عصر کے درمیان پڑھتے ہیں۔ پھر کہیں گے کہ ہم نے فلاں اور فلاں کو عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا ہے"[۸]۔ اسی طرح کا واقعہ حضرت زید بن خالد کے ساتھ بھی پیش آیا۔ آپ نے انہیں فرمایا "اے زید بن خالدؓ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ ان دو رکعتوں کو رات تک نماز پڑھنے کا جواز بنالیں گے تو میں ان دو رکعتوں پر کبھی نہ مارتا"[۹]۔ "آپ یہ بھی اہتمام کرتے تھے کہ لوگ نماز صحیح صحیح ادا کرنا سیکھ جائیں۔

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) شیبہ ۱/ ۹٤ (٤) رواس ٤٣٩ (۵) شیبہ ۱/ ۷۳' رواس ٤٢٨ (٦) عبدالرزاق ۲/ ٤٣٦ (۷) شیبہ ۱/ ٦٨ (۸) [illegible] (۹) [illegible]

بسا اوقات آپ منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو تشہد سکھاتے اور فرماتے "کہو التحیات للہ الخ"[1]۔ "علقمہ بیان کرتے ہیں کہ (کبھی کبھی) حضرت عمرؓ ثناء پڑھتے وقت اپنی آواز بلند کر لیا کرتے تھے جس سے ہم یقین کر لیتے تھے کہ آپ ہمیں سکھانا چاہتے ہیں"[2]۔ یہ اور اس طرح کی دیگر بے شمار روایات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اقامت صلوٰۃ سے متعلق تمام امور کی سرانجام دہی نظمیہ عامہ کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ آپ نے اس کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ لوگ خود ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ایک جیسی سے یہ بھی جائزہ لیتے تھے کہ حکومت کے افسران کس کیفیت و طریقے سے نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کی بر طرفی کیلئے فاروق اعظمؓ کے سامنے شکایت کافی ہوتی تھی کہ "نماز اچھی طرح ادا نہیں کرتے" جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے خلاف اہل کوفہ نے شکایت کی۔ آپ نے انہیں برطرف کر کے حضرت عمارؓ بن یاسر کو گورنر بنادیا۔ آپ نے انہیں بلا بھیجا جب وہ مدینے پہنچے تو ان سے پوچھا "اے ابو اسحٰق کوفہ والوں کا خیال ہے کہ تم اچھی طرح نماز نہیں پڑھتے اور پڑھاتے؟" انہوں نے جواب دیا کہ "خدا گواہ ہے کہ میں انہیں نبی کریم ﷺ ہی کی طرح نماز پڑھاتا تھا اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ عشاء کی نماز پڑھاتا تو اس میں پہلی دو رکعتیں طویل کرتا اور دوسری دو رکعتیں ہلکی پڑھاتا۔" آپ نے فرمایا "اے ابو اسحٰق! تم سے مجھے یہی امید تھی۔" پھر بھی آپ نے کئی آدمیوں کے ساتھ انہیں کوفہ بھیجا (تاکہ مزید تحقیق کی جاسکے) قاصد ہر ہر مسجد میں جاکر سعدؓ سے متعلق سوال کرتا اکثر لوگوں نے تعریف کی[3]۔ آپ نے اس کے باوجود کوفہ کی امارت پر بحال نہ کیا بلکہ اور طرف بھیج دیا تاکہ نماز کے معاملے میں افسران اور عوام کے مابین اعتماد کا فقدان اصلاح و تربیت کے کام میں حائل نہ ہو۔

بیورے نے بڑے خوبصورت انداز میں ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کے نقطہ نظر سے نماز کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے نمبر پر دور جدید کے اداروں میں لنچ ٹائم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ لوگ دوبارہ جسمانی توانائی حاصل کر کے کام پر آسکیں۔ اگر اس میں نماز ظہر کا وقت شامل کر دیا جائے تو لوگ روحانی و نفسیاتی توانائی حاصل کر کے زیادہ فعال کردار ادا کرسکنے کے قابل ہو جائیں گے۔ دوسرا یہ کہ اسلامی تنظیم میں قیام صلوٰۃ کا فروغ مرد و خواتین کو غور کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ کہیں غلط کام تو نہیں کیا۔ اس طرح ضمیر کی اندرونی میکانیت سے ان کی اصلاح کرتا ہے۔ تیسرا یہ کہ کام بذات خود مقصد نہیں ہے بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہے۔ نماز سے اللہ کا فرض ادا کرنے سے دیگر فرائض کی ادائیگی کی تحریک پیدا ہوتی ہے جو اپنے سربراہ یا ماتحتوں کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ چوتھا یہ کہ مغرب میں تنظیمی ترقی (OD) کیلئے احساس بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نماز انسانی شخصیت اور رویوں کی ترقی میں جو موثر کردار ادا کرتی ہے وہ تنظیمی ترقی کیلئے مغربی طریقوں کا بہترین متبادل ہے۔ پانچواں یہ کہ سوشلائزیشن ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کی اہم ضرورت ہوتی ہے۔ نماز افسران اور ماتحتوں کے مابین باہمی روابط کی نہایت اعلیٰ مثال ہے جہاں ان کے مابین مراتب کا فرق ختم ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اس کے برعکس مغربی طریقوں میں منتظمین اور کارکن ایک دن یا ہفتے یا مہینے میں کتنی مرتبہ بالمشافہ ملتے ہیں؟ چھٹا یہ کہ لنچ ٹائم میں جسم کو غذا فراہم کرنا اور نماز کے وقت روح کو غذا فراہم کرنا اسلامی ایڈمنسٹریشن میں توازن پیدا کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کا ایک تحفہ ہے جس سے وہ زندگی کے تمام امور میں جسم اور روح کو ملا کر حصہ لیتے ہیں۔ آخری یہ کہ نماز سے جسم کے مختلف حصوں کی مخصوص حرکات و سکنات سے روحانیت کے ساتھ ساتھ جسمانی ورزش کا پہلو بھی پایا جاتا ہے جو پورے جسم کو تر و تازہ کر دیتا ہے[4]۔

---

(۱) مالک ۱/ ۹۰ (۲) حرمہ ۴/ ۹۸ (۳) بخاری ۱/ ۱۸۳ مسلم ۲۰۸ ابن ماجہ ... ۲۸۶/۱ (٤) Buraey.303 .

۳۔ نظام زکوۃ

صلوۃ کی طرح زکوۃ بھی ایک ایسا فریضہ ہے جس کے تقاضے اجتماعی نظام کار کے وضع کئے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ارشاد ربانی کے مطابق یہ نظریہ نے فرائض منصبی میں شامل ہے "الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ" نبی کریم ﷺ نے اس کی تحصیل و تقسیم کیلئے باقاعدہ نظام وضع فرمایا، عاملین مقرر فرمائے۔ قرآن حکیم میں اس کے مصارف میں سے "والعاملین علیھا" کی باقاعدہ مد اسی غرض کیلئے مقرر کی گئی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دل میں وفات نبویؐ کے بعد یہ خواہش رہی "اگر کہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کر لیا ہوتا کہ جو شخص صدقہ (زکوۃ) دینے سے انکار کرے، اس کے باوجود کہ میں اسے صحیح مصرف میں استعمال کر رہا ہوں تو کیا میں اس سے جہاد کروں؟ تو میرے لئے یہ معلوم کر لینا سرخ اونٹوں کے پانے سے بہتر ہوتا [۱]۔" تاہم حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوۃ کے خلاف جہاد کا جو فیصلہ فرمایا سب نے بحث و تمحیص کے بعد اسے قبول کر کے اجتماعی حیثیت دے دی۔ بقول حضرت عمرؓ "اللہ تعالیٰ نے مانعین زکوۃ سے جہاد کے سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ کو شرح صدر فرما دیا تھا مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہی حق ہے [۲]۔" "حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو وصیت فرمائی تھی کہ جو شخص مال زکوۃ عامل حکومت کے سوا کسی غیر کے حوالے کرے اگرچہ وہ مال پوری دنیا کیوں نہ ہو عند اللہ قابل قبول نہیں [۳]۔ آپ کا زکوۃ کے معاملات سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے ایک مکتوب جس میں زکوۃ کا پورا نصاب درج تھا تلوار کی ایک نیام میں محفوظ کر رکھا تھا [۴]۔ اس کا مضمون بالکل صحیفہ صادقہ سے ملتا جلتا تھا [۵]۔

آپ کے عہد خلافت میں سلطنت میں وسعت کے ساتھ مسائل و معاملات میں بھی وسعت پیدا ہوئی تو آپ نے نہایت ٹھوس اور وسیع نظام کار وضع فرمایا اور عاملین کو وقتاً فوقتاً جو ہدایات دیتے رہتے تھے وہ عہد جدید میں ہمارے لئے بہترین رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے پہلا اہم کام یہ کیا کہ نہایت تجربہ کار، دیانتدار اور اعلیٰ پائے کے لوگ بطور عامل مقرر فرمائے، جو زکوۃ کے ساتھ دیگر محاصل بھی وصول کرتے تھے۔ بقول ماوردی خلیفہ کے فرائض میں ہے کہ دیانتداروں کو اپنا قائم مقام اور قابل اعتماد لوگوں کو حاکم و عامل مقرر کرنے اور خزانے کو ایسے لوگوں کے سپرد کرے، تاکہ انتظام قابل لوگوں سے مضبوط ہو اور خزانہ دیانتداروں کے قبضے میں محفوظ ہو [۶]۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت محمد بن مسلمہؓ، حضرت زیاد بن حدیرؓ، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت عثمان بن حنیفؓ جیسے لوگ شامل تھے۔ آپ خود دیانتداری کی اعلیٰ مثال پیش کرتے اس لئے عاملین بھی تقلید کرتے۔ ایک عامل زکوۃ ابن ابی ربیعہ اپنی جمع کردہ زکوۃ لائے، جب مدینے پہنچے تو حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لے گئے اور نہیں کھجوریں پیش کیں۔ انہوں نے تو تناول کیں لیکن حضرت عمرؓ نے نہ کھائیں۔ اس پر ابن ابی ربیعہ بولے "خدا آپ کا بھلا کرے ہم تو ان (زکوۃ کے جانوروں) کا دودھ بھی پیتے ہیں اور ان میں سے بعض کو کھا بھی لیتے ہیں۔" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "میرا موقف تمہاری طرح کا نہیں ہے۔ تم تو ان جانوروں کی دموں کے پیچھے لگے رہتے ہو تب تم ان میں سے کچھ لے لیتے ہو لیکن میری کیفیت تمہاری طرح نہیں ہے [۷]۔" ایک دفعہ آپ نے دودھ پیا تو بھلا معلوم ہوا، پوچھا "یہ کہاں سے آیا ہے؟" لانے والے نے بتایا کہ میں پانی (کے حوض) پر گیا وہاں زکوۃ کے جانور پانی پی رہے تھے۔ لوگوں نے ان کا دودھ نچوڑ کر مجھے دیا، میں نے اپنی مشک میں ڈال لیا،

---

(۱) [illegible] (۲) بخاری [illegible] (۳) شافعی ۱۰۱ (۴) ابو یوسف ۷۶، مالک ۱/۲۵۷، عبید ۳۵۲ (۵)

عبید [illegible] (۶) [illegible] (۷) [illegible]

یہ دی تھی۔ آپ نے اپنا ہاتھ منہ میں ڈال کر قے کردی [۱]۔ آپ کے عمال دیانتداری میں آپ کی پیروی کرتے تھے اس کا اندازہ حسب ذیل روایت سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ سعید بن المسیب راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے معاذؓ کو بنی کلاب یا بنی سعد بن ذبیان پر زکوٰۃ کا محصل بنا کر بھیجا۔ چنانچہ انہوں نے انہی (قبائل کے فقراء) میں وہ زکوٰۃ تقسیم کردی اور کچھ بھی نہ بچا اور اپنی گردن پر وہی بوریا رکھ کر گھر پلٹے جسے لے کر نکلے تھے۔ یہ سماں دیکھ کر ان کی بیوی نے کہا "تم جو کچھ لاتے ہو اسے ان تحائف اور سوغاتوں سے کیا نسبت ہے جو عمال (محصلین زکوٰۃ) اپنے بال بچوں کیلئے لاتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "میرے ساتھ ایک نگران افسر تھا۔" ان کی بیوی نے کہا "رسول اللہ ﷺ اور ابوبکرؓ تو تمہیں معتمد علیہ اور امین سمجھتے تھے، یہ عمرؓ کو کیا ہوا کہ انہوں نے تم پر نگران مسلط کردیا؟" پھر وہ اپنی سہیلیوں میں گئیں اور وہاں انہوں نے حضرت عمرؓ کے اس رویہ کی شکایت کی۔ چنانچہ یہ شکوہ حضرت عمرؓ تک پہنچا اور انہوں نے حضرت معاذؓ کو بلا کر کہا "کیا میں نے تمہارے ساتھ کوئی نگران افسر بھیجا تھا؟" تو انہوں نے کہا: "اپنی بیوی کے پاس خالی ہاتھ پہنچنے کا اس کے سوا میں کوئی عذر نہ پیش کر سکا۔" اس پر حضرت عمرؓ ہنسے اور انہیں کچھ دیتے ہوئے کہا "یہ دے کر اسے منالو۔" ابن جریج کہتے ہیں کہ حضرت معاذؓ نے "نگران افسر ان" سے مراد اپنے "رب" کو لیا تھا [۲]۔

آپ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کی ذمہ داری کو جہاد سے کمتر نہیں سمجھتے تھے یہی شعور عمال میں بھی پیدا فرماتے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں واضح ہدایات دے کر روانہ فرماتے تاکہ انہیں ریاست کی پالیسی اس کی روح اور مقاصد و اہداف کا علم ہو اور وہ اپنی صلاحیتیں بہتر انداز میں لگا سکیں۔ چنانچہ بصرہ کے عامل زکوٰۃ سفیان بن مالکؓ کو مدینے میں دیکھا تو فرمایا "کیا تمہیں یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ جہاد کی طرح کے کام میں لگے رہو [۳]۔" شہاب بن عبداللہ خولانی روایت کرتے ہیں کہ سعد جو یعلی بن امیہ کے ساتھیوں میں سے تھے چل کر مدینہ میں حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ انہوں نے سعد سے دریافت کیا: "کہاں کا قصد ہے؟" انہوں نے جواب دیا "جہاد کا۔" حضرت عمرؓ نے کہا "واپس جاؤ، یاد رکھو کہ حق کے مطابق عمل کرنا نہایت عمدہ جہاد ہے۔" جب انہوں نے پلٹنا چاہا تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا "جب تم مال والے کے پاس پہنچو تو نہ تم بھلائی کو چھوڑو نہ اسے بھلائی فراموش کرانے دو۔ تم تمام مال کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کردو اور مال والے کو اختیار دو کہ وہ ان میں سے ایک حصہ پسند کرے پھر تم باقی ماندہ دو تہائیوں میں سے ایک حصہ کو چن لو (اور ان میں سے زکوٰۃ لو) پھر اسے فلاں فلاں (مستحقین) میں خرچ کرو۔" راوی کہتا ہے کہ انہوں نے کچھ باتیں بیان کی۔ سعد کہتے ہیں "ہم زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے نکلتے تھے اور واپسی پر ہمارے پاس صرف ہمارے کوڑے ہوتے [۴]۔"

زکوٰۃ کی مینجمنٹ کو فعال اور موثر بنانے کیلئے آپ عمال سے موثر رابطہ رکھتے اور اس سے متعلقہ مسائل سے پوری طرح باخبر رہتے۔ ان کے حل میں جو عملی مشکلات منتظمین کو پیش آتیں ان کے ازالے کیلئے بروقت اقدامات کرتے اور جزئیات تک میں ان کی رہنمائی فرماتے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام حضرت عمرؓ نے اپنی ایک تحریر میں لکھا کہ "جو مسلمان تاجر تمہارے یہاں سے گزریں ان سے دو سو درہم پر پانچ درہم زکوٰۃ وصول کرو [۵]۔" انس بن سیرین بیان کرتے ہیں کہ مجھے انس بن مالکؓ نے ابلہ پر عامل بنا کر بھیجا۔ میں نے کہا کہ آپ نے مجھے سب سے برے عمل کیلئے بھیجا ہے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کی تحریر نکالی جس میں لکھا تھا کہ "مسلمانوں سے ہر چالیس درہم پر ایک درہم لے لو [۶]۔" "اگر چاندی دو سو درہم ہو اور دو سو درہم سے زائد ہونے کی صورت میں ہر چالیس درہم پر ایک درہم ہے [۷]۔" اور حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ حضرت عمرؓ نے مجھے عراق کے ٹیکس کی وصولی کیلئے روانہ کیا اور فرمایا کہ کسی مسلمان کا مال اگر دو سو درہم ہو تو اس پر پانچ درہم لے لو اور دو سو درہم سے زائد ہونے کی صورت میں ہر چالیس درہم پر ایک درہم وصول کرو [۸]۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا

---

(۱) مالک ۱/۲۶۹، بیہقی ۷/۵۱ (۲) عبید: ۵۲۸ (۳) یوسف: ۸۲ (۴) عبید: ۵۲۹، عبدالرزاق: ۴/۱۳ (۵) عبدالرزاق ۴/۸۸ (۶) روس: ۳۵۵ (۷) عبید: ۱۳۱

(۸) عبید: ۳۸۱۔

کہ "تمہارے یہاں جو مسلمان عورتیں ہیں انہیں حکم دو کہ اپنے زیورات پر زکوٰۃ ادا کریں"[1]۔ حضرت عمرؓ نے سفیان بن عبداللہ ثقفی کو طائف میں زکوٰۃ کی وصولیابی کیلئے بھیجا۔ وہ لوگ بکری کے بچے بھی زکوٰۃ کے حساب میں شمار کرتے تھے۔ انہوں نے آکر حضرت عمرؓ کو اس کے بارے میں بتایا تو آپ نے فرمایا "کہ ہاں ان کے بکری کے بچے بھی شمار کرو، حتیٰ کہ وہ بچہ بھی جو چرواہا ہاتھ میں اٹھا کر لایا ہو، لیکن انہیں زکوٰۃ میں وصول نہ کرو"[2]۔ ایسے ہی ایک اور عامل سفین بن مالک کو زکوٰۃ کی وصولیابی کیلئے بصرہ روانہ کیا۔ وہ وہاں کچھ عرصہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے، پھر انہوں نے حضرت عمرؓ سے جہاد کی اجازت چاہی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "کہ کیا اب تم مصروف جہاد نہیں ہو؟" انہوں نے کہا "کہاں؟ جب کہ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ شخص ظلم کرتا ہے۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا "کہ کس طرح؟" انہوں نے بتایا کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے بکری کے بچے بھی شمار کر لیتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "ہاں! انہیں شمار کرو اگرچہ چرواہا اسے کندھوں پر اٹھا کر لائے۔ کیا تم ان کیلئے وہ بھیڑ بکری نہیں چھوڑ دیتے جس نے تازہ بچہ دیا ہو اور وہ اسے دودھ پلاتی ہو اور وہ بکری جو انہوں نے ذبح کیلئے رکھی ہوئی ہو اور وہ اسے چارہ کھلاتے ہوں اور وہ بکری جو بچہ دینے والی ہو اور وہ نر بکرا جو نسل کشی کیلئے رکھا گیا ہو"[3]۔

آپ زکوٰۃ کی وصولی کیلئے نہایت نرمی کی تلقین فرماتے تھے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ لوگ خوش دلی سے ادا کریں، تاکہ ان کا انہیں اجر و ثواب بھی ملے، وہ بد دیانتی کرنے اور چھپانے کی کوشش نہ کریں اور وصولی کا انتظام خوش اسلوبی سے چلے۔ ایک اور بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ منتظمین کی طرف سے بھی ظلم و زیادتی نہ ہو۔ قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے سے زکوٰۃ میں ادا کی ہوئی بھیڑ بکریاں گزریں، تو انہوں نے اس ریوڑ میں ایک موٹے تھنوں والی بکری دیکھی اور کہا "میرا خیال ہے کہ اس کے مالک نے بخوشی اسے نہیں دیا ہوگا۔ خبردار! مسلمانوں کی پسند کی چیزیں نہ لیا کرو"[4]۔ یحییٰ نے اپنی روایت میں مذکورہ بالا الفاظ میں اتنا اضافہ کیا ہے "لوگوں کو آزمائش میں نہ ڈالو، کھانے سے بچتے رہو"[5]۔ آپ کے عاملین آپ کے ان ضابطوں کی پوری پابندی کرتے تھے، اس کی گواہی خود عوام دیتے تھے۔ محمد بن یحییٰ کہتے ہیں کہ (شجع وقبیلہ) کے دو بزرگوں نے اسے بتایا کہ حضرت عمرؓ نے محمد ابن مسلمہ کو زکوٰۃ کا محصل بنا کر بھیجا چنانچہ (وہ) محمد ہمارے پاس آتے اور بیٹھتے۔ ان کے پاس جب بھی ہماری طرف سے کوئی ایسی بکری پہنچتی جس سے ان کا حق پورا ادا ہو جاتا تو وہ اسے (زکوٰۃ میں) قبول کر لیتے تھے[6]۔

آپ مستحقین زکوٰۃ کی شکایات سننے کیلئے ہر وقت اپنے دروازے کھلے رکھتے اور شکایات کے ازالے کیلئے فوری اقدام کرتے اور عاملین کی گرفت بھی کرتے۔ اس سے وہ اپنے معاملات درست رکھتے۔ ابو عبید نے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ دوپہر کو ایک درخت کے سایہ میں قیلولہ کر رہے تھے کہ ایک اعرابیہ آئی۔ اس نے بغور لوگوں کو دیکھا اور حضرت عمرؓ کے پاس پہنچی اور عرض کی کہ میں ایک مسکین عورت ہوں، میرے بچے ہیں اور امیر المومنین نے ہمارے ہاں تحصیل زکوٰۃ کیلئے محمد بن مسلمہ کو مامور کیا ہے، لیکن انہوں نے ہمیں نہیں دیا۔ میں آپ کی خدمت میں پہنچی ہوں کہ آپ ان سے ہمارے لئے سفارش کر دیں، اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے یرفاء (حضرت عمرؓ کا غلام) کو آواز دی اور فرمایا کہ محمد بن مسلمہ کو میرے پاس بلا لاؤ۔ اس عورت نے کہا "میری حاجت براری کیلئے یہ زیادہ مفید ہوگا کہ آپ میرے ساتھ ان کے پاس چلیں۔" حضرت عمرؓ نے کہا "ان شاء اللہ وہ ضرور تمہیں دیں گے۔" یرفاء محمد بن مسلمہ کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ امیر المومنین کی طلب پر پہنچو، چنانچہ وہ آئے اور کہا "السلام علیک یا امیر المومنین" انہیں دیکھ کر وہ عورت شرما گئی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہوں کہ تم میں سے بہترین شخص کو منتخب کروں، بھلا بتاؤ تو تم اللہ کے سامنے کیا جواب دو گے۔ جب وہ تم سے اس عورت کے بارے

---

(۱) بیہقی ٤: ۱۳۹ جصاص ۳: ۷۵ (۲) مالک ۱: ۲۶۵ جصاص ۳: ۲۷۵ سیبہ ۱: ۱۳۲ (۳) یوسف ۸۲ (٤) مالک ۱: ۲۶۷ یوسف ۸۲ عبید ۳۶۵ (۵) عبید ۳۶۵ (٦) یوسف ۸۳ عبید ۳۶۵۔

میں سوال کرے گا؟" اس پر محمد بن سلمہ آبدیدہ ہو گئے۔ ازاں بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان اپنے رسول ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ ہم نے ان کی تصدیق کی اور ان کے بتائے ہوئے راستہ کی اتباع کی۔ رسول اللہ ﷺ نے وہی عمل کیا جو اللہ نے آپ کو حکم دیا، چنانچہ آپ نے زکوٰۃ اس کے مستحق مساکین میں تقسیم فرمائی اور اسی پر عمل پیرا رہتے ہوئے آپ نے اپنی جان اللہ کو سونپ دی۔ پھر اللہ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ان کا جانشین بنایا۔ وہ بھی آخر دم تک آپؐ کے طریقہ کار پر عمل پیرا رہے۔ پھر اللہ نے مجھے ان کا جانشین بنایا اور میں نے تم میں سے بہترین افراد کو منتخب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اگر میں نے دوبارہ بھی تمہیں مامور کیا، تو اس عورت کو اس سال اور اس سے پہلے سال کی زکوٰۃ دینا اور مجھے نہیں معلوم کہ شاید میں تمہیں مامور نہ کروں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اس عورت کیلئے ایک اونٹ منگوایا اور اسے آٹا اور زیتون کا تیل دیا اور کہا کہ یہ لے لو۔ ہم خیبر جا رہے ہیں وہاں تم ہم سے ملو۔ وہ عورت خیبر میں پہنچی اور حضرت عمرؓ نے اس کیلئے دو مزید اونٹ منگوائے اور کہا کہ یہ لو اس میں گزر بسر ہو جائے گی تا آنکہ محمد بن مسلمہ تمہارے پاس پہنچیں۔ میں نے انہیں ہدایت کر دی ہے کہ وہ تمہارا اس سال کا اور پچھلے سال کا حق تمہیں ادا کر دیں[1]۔"

جراد بن شبیط راوی ہیں کہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس تھا کہ ان کے پاس بظاہر ایک ہٹا کٹا کھاتا پیتا شخص آیا اور اس نے کہا "یا امیر المومنین! میں مر گیا اور میرے بال بچے بھی تباہ و برباد ہو گئے" تو حضرت عمرؓ نے کہا "تم میں سے ایک شخص گھی کے کپے کی طرح چکنا چپڑا آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مر گیا اور میرے بال بچے تباہ و برباد ہو گئے۔" پھر اسے قریب بلاتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنا واقعہ یوں بیان کیا "میں اور میری ایک بہن اپنے والدین کے ایک اونٹ کو جسے پانی بھرنے کے کام میں لایا جاتا تھا چراتے تھے۔ ہماری ماں اپنی تہبند ہمیں پہنا دیتی تھی اور ہمیں مٹھی مٹھی اندرائن کے بیج کھانے کیلئے دے دیا کرتی تھیں۔ ہم اپنے اس اونٹ کو لے کر نکلتے، جب سورج نکل جاتا تو میں اپنی تہبند بہن کے پاس ڈال کر ننگا محنت کرنے لگتا۔ پھر ہم اپنی ماں کے پاس واپس جاتے اور وہ ہمارے لئے اندرائن کے بیجوں کا ہریرا تیار رکھتیں کیا سر سبز زمانہ تھا وہ۔" پھر حضرت عمرؓ نے کہا "اسے صدقہ کے جانوروں میں سے ایک ربیع میں پیدا ہونے والی اونٹنی (جو ایک سال سے کم عمر کی ہوتی ہے) دے دو (راوی جراد بن شبیط کہتے ہیں) چنانچہ میں نے دیکھا کہ وہ اونٹنی اس طرح نکل کہ اس کے پیچھے اس کی ماں اور اس کا باپ دونوں آ رہے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ اس دن اس شخص پر مجھے جتنی جلن آئی اتنی جلن کبھی کسی پر مجھے نہیں آئی تھی[2]۔"

بقول امام ابو عبیدؒ "ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو تین اونٹ دے دیئے ہیں اور یہ بڑی قیمت کا مال ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ اس لئے کیا تھا کہ سے تنگدستی اور عیالداری سے نکال کر آسودہ کر دیں کیونکہ اس نے بال بچوں کی تباہی کا ذکر کیا تھا اور حضرت عمرؓ کی رائے یہی تھی کہ جب دیا جائے تو آسودہ و تونگر کر دیا جائے[3]۔" زکوٰۃ کے مستحقین کو دینے کے سلسلے میں آپ کی یہی پالیسی رہی کہ انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا جائے اور غربت و افلاس کو ختم کر دیا جائے کیونکہ یہی زکوٰۃ کا اصل مقصود ہے۔ اس کا منشاء مستقل طور پر ضرورت مند اور وظیفہ خوار پیدا کرنا نہیں ہے جیسا کہ پاکستان میں کیا جا رہا ہے، بلکہ آپ یہ چاہتے تھے کہ زکوٰۃ کے مال کو اتنا فراخی سے تقسیم کیا جائے کہ وہ لوگ اگلے سال خود صاحب نصاب ہو جائیں اور باقی رہ جانے والے غریبوں کی مدد کرنے کے قابل ہوں۔ یہ نہایت حکیمانہ پالیسی تھی اور پورے ملک کو خوشحالی و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی نہایت کارگر تدبیر تھی۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "جب تم دو تو تونگر و آسودہ کر دو[4]۔" آپ سے استفسار کیا گیا کہ اعراب سے وصول ہونے والی زکوٰۃ کو کس طرح صرف کیا جائے تو آپ نے کہا کہ قسم بخدا میں انہیں زکوٰۃ لوٹاتا رہوں گا یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس سو اونٹنیاں یا سو اونٹ ہو جائیں[5]۔" یہی کچھ حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ پر مامور کارکنوں سے کہا: "ان پر بار بار زکوٰۃ

(۱) عبید ۵۳۰ (۲) عبید ۵۰۱ (۳) عبید ۵۰۲ (۴) عبید ۵۰۲، بیہقی ۷/۱۵ (۵) عبید ۵۰۴۔

تقسیم کر دو خواہ ان میں سے ایک کے پاس سو اونٹ ہی کیوں نہ ہو جائیں [۱]۔ امام ابو عبیدؒ نے مذکورہ روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا فرمایا ہے کہ ان کا یہ مطلب نہیں ہے سو اونٹ والا شخص بھی زکوٰۃ کا حقدار ہو' بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ اتنی مقدار میں دی جائے کہ محتاج اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ یعنی یہ کہ حاجت مند اور فقیر کو زکوٰۃ کی مد میں سے محض زکوٰۃ اگر اتنی مقدار دے دے کہ سو اونٹ تک پہنچ جائے تو جائز ہوگا۔ اسی بنا پر بعض تابعین زیادہ دینے کو کم دینے پر ترجیح دیتے تھے [۲]۔ ہمارے نزدیک اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مستحق زکوٰۃ کو حکومت صرف اتنا دینے کی پابند نہیں کہ جتنا اس کے صاحب نصاب بننے میں کمی ہو' بلکہ حکومت زکوٰۃ کے خزانے کو دیکھ کر جتنا مناسب سمجھے دے سکتی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی عمومی پالیسی یہی تھی کہ زکوٰۃ جس علاقے سے وصول ہو وہاں کے مستحقین میں تقسیم کر دی جائے۔ مرکز میں صرف اسی صورت میں بھیجی جائے' جب وہاں کی ضروریات سے زائد ہو۔ اس پالیسی سے آپ کے عہد میں معاشی' سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے بہترین نتائج برآمد ہوئے۔ عمرو بن شعیب کہتے ہیں کہ حضرت معاذؓ جب سے رسول اللہ ﷺ نے انہیں یمن بھیجا' چند میں رہے۔ تا آنکہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور انہوں نے بھی انہیں ان کی پہلی جگہ پر واپس بھیج دیا۔ پھر حضرت معاذؓ نے ان (حضرت عمرؓ) کے پاس لوگوں کی زکوٰۃ کا تہائی حصہ بھیجا' تو حضرت عمرؓ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں مال جمع کرنے یا جزیہ وصول کرنے کیلئے نہیں بھیجا' بلکہ اس لئے مامور کیا ہے کہ تم امیر لوگوں سے وصول کر کے ان کے محتاجوں میں تقسیم کر دو۔" اس پر حضرت معاذؓ نے کہا "میں نے کوئی ایسی چیز آپ کو نہیں بھیجی کہ یہاں مجھے اس کا کوئی مستحق وصول کرنے والا مل رہا ہو۔" پھر اگلے سال معاذؓ نے آدھی زکوٰۃ انہیں بھیجی اور دونوں میں پہلی جیسی گفتگو کا تبادلہ ہوا اور جب تیسرا سال گزرا تو حضرت معاذؓ نے تمام کی تمام زکوٰۃ ان کے پاس بھیج دی اور جواباً حضرت عمرؓ نے وہی پہلی سی بات کہی۔ تب حضرت معاذؓ نے کہا "یہاں مجھے ایک (ضرورت مند) بھی ایسا نہیں ملتا جو مجھ سے کچھ (صدقہ و زکوٰۃ) لینے کا مستحق ہو [۳]"۔

اس روایت سے عہد فاروقی میں معاشی خوشحالی اور ترقی کی رفتار میں بتدریج اضافے کی جو نشاندہی ہوتی ہے اس میں یقیناً آپ کی موثر اور جاندار ایڈمنسٹریشن کا بہت بڑا دخل تھا۔ دور جدید میں زکوٰۃ کی مینجمنٹ میں اسی حکمت عملی کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ امام ابو عبید القاسم نے اس سلسلے میں مذکورہ روایت کے ساتھ اور نئی روایات پیش کرنے کے بعد لکھا ہے۔ بقول ابو عبیدؒ "آج ان تمام آثار پر جملہ علماء کا اتفاق ہے کہ ملک کے ہر علاقہ کے باشندے یا گھاٹوں میں سے ایک گھاٹ سے پانی پینے والے اپنے حلقہ کی زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں اور یہ استحقاق اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ ان میں ایک یا اس سے زائد حاجت مند باقی رہیں۔ خواہ اس احتیاج کو رفع کرنے کیلئے وہاں کی تمام زکوٰۃ کام میں آ جائے اور محصل زکوٰۃ کو وہاں سے بغیر کچھ لئے خالی ہاتھ ہی واپس آنا پڑے۔ اگر غلطی سے ایک علاقے کی زکوٰۃ دوسرے علاقے میں چلی جائے تو امام کو چاہئے کہ واپس بھیج دے [۴]۔" البتہ اگر ہنگامی حالات اور ناگہانی آفات کی وجہ سے ملک کے دوسرے حصوں میں شدید ضرورت اور احتیاج لاحق ہو جائے' تو قومی ہم آہنگی ملی یکجہتی اور عقل و حکمت کا یہی تقاضا ہے کہ ان کی بھرپور مدد کی جائے۔ اس سلسلے میں زکوٰۃ کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور کوئی بھی مناسب حکمت عملی اختیار کی جا سکتی ہے۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے عام الرمادۃ (قحط سالی) کے بعد ابن ابی ذباب کو محصل بنا کر بھیجتے وقت کہا تھا "ان سے دو سال کی زکوٰۃ لینا' پھر ایک سال کی انہی میں تقسیم کر دینا اور دوسرے سال کی میرے پاس لے آنا۔" اور یہی مضمون حضرت معاذؓ کی اس روایت کا ہے' جس میں انہوں نے اہل یمن سے کہا تھا "میرے پاس یمنی چادریں اور کپڑے (خمیص و لبیس) لے آؤ۔ میں دوسری چیزوں کے بجائے زکوٰۃ میں تم سے یہ لے لوں گا۔ اس لئے کہ ان کا دینا تمہارے لئے زیادہ آسان ہے اور یہ کپڑے مہاجرین کیلئے مدینہ میں زیادہ سود مند رہیں گے [۵]۔"

---

(۱) عبد ۲ ۵ (۲) مفصل کیلئے ملاحظہ ہو عبید ۲ ۵ (۳) عبد ۲۸ ۔ (۴) مفصل کیلئے ملاحظہ ہو عبید ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ (۵) عبد ۳۱

اس طرح گویا ایک چیز اگر دوسرے لوگوں کیلئے زیادہ مفید ہو تو یہ بھی ایک اہم بنیاد بن سکتی ہے۔ البتہ ایسا صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے 'جب وہاں کے لوگوں کی ضروریات پوری ہو گئی ہوں۔ قحط سالی' زلزلے' سیلاب وغیرہ جیسی قدرتی آفات جب مستحقین کو خصوصی توجہ کا حقدار بنا دیتی ہیں' تو جو لوگ صاحب نصاب ہوں کیا وہ خصوصی رعایات کے حقدار نہیں ہیں؟ یقیناً ہونے چاہئیں اور ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کیلئے دو طریقے اختیار کئے 'ایک تو یہ کہ سو بکریوں پر مشتمل ریوڑ کے مالک کو بھی مستحق قرار دے دیا اور دوسرا جو زکوٰۃ دینے کے قابل تھے 'ان سے وصولی مؤخر کر دی اور اگلے سال فراخی پیدا ہونے پر دو سالوں کی اکٹھی وصول فرمائی۔ روایت میں آتا ہے کہ آپ نے حکم دیا "زکوٰۃ میں سے اس شخص کو دو جس کے پاس قحط سالی بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ چھوڑ دے اور اس شخص کو زکوٰۃ نہ دو جس کے پاس قحط سالی دو ریوڑ (بھیڑ بکریوں کے) چھوڑ دے[1]۔"

امام ابو عبید القاسم نے اس پالیسی کی نہایت خوبصورت توجیہہ پیش کی ہے کہ اس روایت میں قحط سالی کیلئے "سنۃ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس (کے ایک معنی اگرچہ سال ہیں تاہم یہاں اس کے) معنی قحط سالی اور خشک سالی ہیں 'جو لوگوں کے مال اور مویشی غارت کر دیتی ہے اور ایک بھی کودے دار (ترو تازہ) دودھ دینے والا جانور باقی نہیں چھوڑتی۔ اسی طرح یہ پھلوں اور کھیتیوں کو بھی جلا ڈالتی ہے (سنۃ کی جمع سنون و سنین ہے 'اس معنی میں) اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے "ولقد اخذنا آل فرعون بالسنين ونقص من الثمرات (الاعراف ۱۳۰)" (اور ہم نے آل فرعون کو قحط سالیوں اور پھلوں کی قلت میں گرفتار کر دیا۔) چنانچہ ان حالات میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہو گئی تھی کہ سو بھیڑ بکریوں کے مالک کو بھی زکوٰۃ دے دی جائے' چنانچہ ان کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے "من ابقت له السنة غنما" جس کیلئے قحط سالی ایک ریوڑ بھیڑ بکریوں کا چھوڑ دے (یعنی سو عدد) جس میں خاص طور پر "سنۃ" کی شرط ہے۔ اس لئے کہ قحط سالی میں یہ سو بھیڑ بکریاں جو بھوک اور قحط سے لاغر و نڈھال ہوں سرسبزی کے زمانہ کی دس بکریوں کی برابری نہیں کر سکتیں۔ بناء بریں انہوں نے لوگوں پر نرمی و مہربانی کرتے ہوئے سو بکریوں کے مالک کو بھی زکوٰۃ لینے کی اجازت دیدی 'بلکہ انہوں نے اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ قحط سالی میں لوگوں سے زکوٰۃ کی وصولی کو مؤخر کر کے اگلے سال پر ملتوی کر دیا اور جب بارش سے سیرابی و سرسبزی نہ ہوئی 'انہوں نے زکوٰۃ وصول نہ کی۔ یہی نہیں بلکہ ان کی خیر خواہی میں آپ کی معاملہ فہمی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ آپ نے ایسے قحط کے زمانہ میں چوروں سے ہاتھ کاٹنے کی حد بھی ہٹا دی تھی اور فرمایا تھا "قحط سالی کے زمانہ میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی[2]۔"

زکوٰۃ کے مستحقین سے متعلق آپ کی پالیسی کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ان کا حق حکومت پر واجب الادا رہتا ہے 'اس لئے ہر صورت میں اسے ادا ہونا چاہئے۔ امام ابو عبید کے بقول "لیکن اگر امام کو ضرورت مند مستحق زکوٰۃ کا علم نہ ہو سکے اور وہ (اس علاقہ کے علاوہ) دوسروں میں ان کی زکوٰۃ بانٹ دے یا اس کے بعض ماتحت عمال سے ایسا ہو جائے اور پھر بعد میں اسے اس (غلطی) کا علم ہو تو اس بارے میں حضرت عمرؓ بن الخطابؓ سے یہ روایت ہے کہ انہوں نے ایسے موقع پر اگلے سال دگنی زکوٰۃ کر دی تھی[3]۔" زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے حوالے سے آپ کی بصیرت افروز حکمت عملیوں میں ایک یتیموں کے اموال کے سلسلے میں بھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ یتیم اور بچے کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے[4]۔ اور حضرت عمرؓ یتیموں کے سرپرستوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ یتیموں کے مال سے آمدنی حاصل کریں تاکہ یہ نہ ہو کہ زکوٰۃ ان کے مال کو ختم ہی کر دے اور آپ نے کہا کہ یتیموں کے مال کو تجارت میں لگاؤ تاکہ زکوٰۃ ان کے مال کو نہ کھا جائے[5]۔ خود حضرت عمرؓ کا یہی عمل تھا کہ آپ یتیم کے مال سے آمدنی حاصل کرتے اور اس کی زکوٰۃ بھی ادا کرتے تھے[6]۔ زکوٰۃ کے عاملین زکوٰۃ ہی کی آمدنی سے تنخواہ لینے کے حقدار ہیں۔ اس کو رضاکارانہ بنیادوں پر استوار کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ ایک مستقل اور ٹھوس نظام کار وضع کیا جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کیلئے

(۱) عب ۴۹۰ (۲) عب ۵۰۸ (۳) عبید [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible]

معاوضہ ہو اور کام کرنے والا بلاجھجک جائز سمجھ کر وصول کرے' تاکہ وہ پورے اعتماد' دلجمعی اور دلچسپی سے زیادہ سے زیادہ وقت اس پر صرف کرنے کے قابل ہو سکے۔ حضرت عبداللہ بن السعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجھے زکوٰۃ کی تحصیل کے کام پر مامور فرمایا۔ جب میں کام سے فارغ ہو گیا اور انہیں ادا کر دی تو انہوں نے میرے لئے اجرت دینے کا حکم دیا۔ میں نے عرض کی کہ میں نے راہ اللہ یہ کام کیا ہے' وہی اس کا اجر دے گا تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں جو کچھ دے رہا ہوں اسے لے لو۔ میں نے بھی رسول اللہ ﷺ کے عہد میں کام کیا تھا۔" میں نے بھی وہی کہا جو تم نے کہا ہے' تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "تجھے جو چیز بغیر سوال کئے دی جائے تو اسے خود بھی کھاؤ اور صدقہ بھی کرو"[1]۔ "حضرت عبداللہ بن ساعدیؓ ہی کی ایک اور روایت سے اس معاملے کی مزید وضاحت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ شام تشریف لائے تو مجھے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ تمہیں مسلمانوں کے معاملات کا (سرکاری طور پر) عامل بنایا گیا ہے' انہیں سرانجام دیتے ہو' لیکن جب اجرت دی جاتی ہے تو نہیں لیتے؟ میں نے جواب دیا کہ میرے پاس گھوڑے اور غلام ہیں اور (مالی طور پر) میں بہت اچھا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جو مال مجھے اجرت میں ملتا ہے' وہ مسکینوں کے صدقے میں صرف ہو۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے بھی یہی چاہا تھا' جو تم چاہتے ہو۔ رسول اکرم ﷺ جب مجھے (معاوضے میں) مال دیتے تو میں عرض کرتا یہ اسے دیجئے جو مجھ سے زیادہ حاجت مند ہو۔ ایک مرتبہ آپؐ نے مجھے مال دیا تو میں نے کہا کہ اسے مجھ سے زیادہ محتاج کو دیجئے' تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ اس مال میں سے جو تجھے بغیر سوال کئے اور طمع کئے دے تو اسے لے لے چاہے اسے تو اپنے کام میں لائے چاہے تو اسے صدقہ کر دے اور اگر نہ دے تو اس کے پیچھے خواہ مخواہ کی جان مت کھپا[2]۔"

۴۔ انسداد منکرات:

آپ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے شرعی فریضے کی ادائیگی کیلئے بھی نظمیہ عامہ کو متحرک کیا۔ ان کے شعور میں یہ بات راسخ کر دی کہ ان کا کام محض انتظامی امور کی بجا آوری اور امن وامان کا قیام نہیں ہے' بلکہ دینی اعتبار سے فکری و اخلاقی تربیت کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ منکرات سے بھی روکنا ہے۔ آپ اس کی طرف عمال کی توجہ مبذول کراتے' ان کی رہنمائی فرماتے اور انہیں واضح احکامات دیتے تاکہ وہ منصبی ذمہ داریاں بآسانی پوری کر سکیں۔ مثلاً آپ نے صوبائی گورنروں کو لکھا "سوروں کو مار ڈالو اور جزیہ کی رقم سے ان کی قیمت منہا کر دو"[3]۔ سور کیونکہ غیر مسلموں کے ہاں حلال سمجھا جاتا ہے اس لئے آپ نے ان کی قیمت جزیہ سے منہا کرنے کا حکم دیا تاکہ ریاست کے مقاصد بھی پورے ہوں اور وہ لوگ بھی یہ نہ محسوس کریں کہ ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس طرح آپ نے شراب کے خاتمے کیلئے کیا کیونکہ وہ شریعت میں ممنوع ہے۔ اگر اسے روکنے کیلئے انتظامی آلات اختیار نہ کئے جائیں' تو کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے قبیلہ ثقیف کے ایک شخص کے گھر میں شراب دیکھی تو اسے جلا دینے کا حکم دیا' جو جلا دیا گیا' اس کا نام رویشد تھا۔ آپ نے فرمایا "تو فویسق ہے"[4]۔"

۱۸ سن ہجری کا واقعہ ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کو خط لکھا "چند مسلمانوں نے جن میں ضرار اور ابو جندل بھی ہیں شراب پی ہے۔ ہم نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے تاویل کی ہے اور کہا ہے کہ ہمیں اختیار دیا گیا تھا تو ہم نے اسے اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "فھل انتم منتھون" (کیا تم باز آنے والے ہو؟) اس میں عزم صمیم (یعنی پختہ ممانعت) نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ "مذکورہ آیت ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کن ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ تم

(۱) مسلم ۳/۹۸' نسائی ۵/۱۰۱' داؤد ۲: ۱۶۴ (۲) نسائی ۵/۱۰۲ (۳) عبید ۹۷ (٤) عبید ۹۷۔

(شراب پینے سے) باز آجاؤ"۔ آپ نے ابو عبیدہؓ کو حکم دیا کہ "شراب پینے والوں کو سب مسلمانوں کے سامنے بلاؤ اور پوچھو کہ آیا شراب حلال ہے یا حرام۔ اگر وہ کہیں کہ حرام ہے تو انہیں اسی کوڑے مارو اور ان سے توبہ کراؤ اور اگر وہ کہیں کہ شراب حلال ہے تو ان کی گردنیں مار دو۔" چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ نے انہیں بلوایا' ان سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ "شراب حرام ہے۔" اس پر انہیں کوڑوں کی سزا دی۔ بعد میں وہ لوگ اس قدر شرمندہ ہوئے کہ گھروں میں بیٹھ گئے' بلکہ حضرت ابو جندل کے دل میں بہت سے وسوسے اور شکوک پیدا ہو گئے۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو تحریر کیا "ابو جندل کے دل میں بہت سے توہمات و شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔ اللہ آپ ہی کے ذریعے ان کے دل سے یہ اوہام و شکوک نکال سکتا ہے۔ آپ اس کو خط لکھئے اور وعظ و نصیحت کیجئے۔" حضرت عمرؓ نے ابو جندل کے نام خط تحریر فرمایا "یہ حقیقت ہے کہ ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء" تم توبہ کرو اور اپنا سر اٹھا کر باہر نکلو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم"[1]۔" جب ابو عبیدہؓ نے یہ خط پڑھ کر سنایا' تو ان کے دل میں سکون ہوا اور قلب کی بے چینی دور ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے دوسرے لوگوں کو بھی اسی قسم کے خطوط لکھے۔ ان کی بدولت وہ گھر سے باہر نکلنے لگے' آپ نے عام مسلمانوں کو لکھا "تم اپنے آپ میں رہو جو تبدیلی اور اصلاح کا مستحق ہو اس کی اصلاح کرو مگر کسی کو بدنام نہ کرو ورنہ یہ مصیبت پھیل جائے گی"[2]۔

اس واقعے کی تفصیل سے نہ صرف نظیمہ عامہ کی اس ذمہ داری کا کہ انہیں منکرات کے انسداد کیلئے بھرپور کردار ادا کرنا چاہئے' پتہ چلتا ہے بلکہ یہ رہنمائی بھی ملتی ہے کہ اس نازک ذمہ داری کو پورا کرتے وقت نہایت دانشمندانہ حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے اور بعد میں ان کے اثرات کا بھی ضرور جائزہ لینا چاہئے اور اگر ان میں سے کوئی منفی پہلو ہوں' تو ان کا ازالہ کرنا بھی ان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ یہ بھی طے کرنا ان کا کام ہے کہ کس معاملے میں سختی کریں اور کتنی سختی کریں۔ کہاں دلسوزی اور نرمی کی ضرورت ہے؟ دور جدید کے ایڈمنسٹریٹروں کیلئے انتظامی معاملات کے سلسلے میں بے شمار سبق پنہاں ہیں۔ آیت کی غلط تاویل نہایت اہم معاملہ تھا آپ نے گردن مار دینے کا حکم دیا۔ بصورت دیگر صرف حد کے نفاذ کا' لیکن اس کو مجمع عام میں کرنے کا حکم اس لئے دیا' تاکہ آئندہ کیلئے عبرت بنے' لیکن بعد میں آپ نے مجرموں کو سمجھانے کیلئے نہایت مختصر اور جامع خطوط لکھ کر ان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا اور انہیں حسب سابق معاشرے کا حصہ بننے اور اعتماد کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنے کیلئے تیار کیا اور عوام کو بھی جو تلقین کی وہ نہایت اہم تھی کہ اگر وہ ہر کسی کو بدنام کرنے کیلئے کمربستہ رہیں گے' تو منکرات ختم ہونے کے بجائے بڑھیں گی اور انتشار پیدا ہو جائے گا۔

شراب کے خاتمے کیلئے آپ مکمل طور پر یکسو تھے۔ یہ نئے مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کی جس طرح گھٹی میں پڑی ہوئی تھی سخت پالیسی کے بغیر اس کا تدارک ممکن نہیں تھا۔ اس کے مکمل خاتمے کیلئے اس کی تجارت کے خاتمے کو یقینی بنانا ضروری تھا' چنانچہ آپ کو اطلاع ملی کہ سواد (عراق) کے باشندوں میں سے ایک شخص شراب کی تجارت میں بڑا نفع کما کر امیر بن گیا ہے' تو آپ نے گورنر کو لکھا "اس کی ہر چیز جس تک تمہاری رسائی ہو توڑ ڈالو' اس کے تمام چوپایوں کو ہانک کر لے آؤ اور دیکھو کہ اس کی کسی چیز کو کوئی پناہ نہ دے"[3]۔ دور جدید میں بھنگ' شراب' چرس' افیون' ہیروئن اور مہلک نشہ آور ادویات کی روک تھام اس وقت تک نہیں ہو سکتی' جب تک منشیات فروش مافیا کے خلاف ایسے ہی کارروائی نہ کی جائے جیسی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔ انتظامی افسران کیلئے ضروری ہے کہ وہ انسداد منکرات کے سلسلے میں اپنے اقدامات کے مثبت و منفی اثرات پر غور کریں۔ ایک طرف نصب العین کو سامنے رکھیں اور دوسری طرف حالات اور افراد کا معروضی تجزیہ کر کے حکمت عملی وضع کریں اور مختلف تجربات سے نتائج اور سبق حاصل کریں' تاکہ ردعمل الٹ ہی نہ نکلے۔ منتظم اعلیٰ کیلئے تو اور بھی ضروری

(۱) الزمر ۳۹/۵۳ (۲) طبری ۴/۹۷ (۳) عبید ۹۷۔

ہے کہ ماتحت افسران پر نظر رکھے اور جہاں معاملات بگڑنے کا اندیشہ ہو' وہاں بروقت مداخلت کرے' خرابیوں کا نوٹس لے اور اصلاحی لائحہ عمل اختیار کرے۔ ایک شخص نے حضرت عمرؓ کی سواری روک کر رو کر یہ شکایت کی کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے مجھے شراب پینے کی سزا کے ساتھ ساتھ میرا منہ کالا کر کے پھرایا اور یہ منادی کرادی کہ مجھ سے کوئی نہ بولے یا بیٹھے۔ میں نے سوچا ہے کہ یا تو میں ان کی گردن مار دوں یا ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو یا پھر شرک کی سرزمین میں جا بسوں۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر رو پڑے اور فرمایا "مجھے خوشی نہیں ہوگی کہ تم شرک کی زمین پر چلے جاؤ' میں تو جاہلیت میں خود لوگوں کو شراب پلاتا تھا۔ "پھر ابو موسیٰ کو خط لکھا "مجھے فلاں شخص نے آکر یہ اور یہ بتلایا ہے' جب میرا خط پہنچے تو لوگوں کو اس کے پاس بیٹھنے اور ملنے جلنے کی اجازت دے دو اور اگر وہ توبہ کرے تو اس کی شہادت قبول کرو' پھر آپ نے اس شخص کی دلجوئی کیلئے دو سو درہم مرحمت فرمائے[1]۔ "معاشرے میں توہمات و خرافات اور فکری و نظریاتی بگاڑ پیدا کرنے کا ایک ذریعہ جادوگری ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اس کے بے پناہ منفی اثرات کی وجہ سے اسے ارتداد کے مترادف سمجھتے تھے۔ آپ نے وفات سے ایک سال قبل یہ فرمان بھیجا "ہر ساحر اور ساحرہ کو قتل کر دو۔" راوی کہتے ہیں کہ ہم نے تین ساحروں کو قتل کیا[2]۔

ایک گورنر جزء بن معاویہ کے سیکرٹری جن کا نام بجالہ تھا' وہ کہتے ہیں آپ نے مذکورہ حکم کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ ان ازدواجی رشتوں کو جو مسلمانوں اور آتش پرستوں میں برپا ہو چکے ہیں' ان کو ختم کرادیں اور زمزموں اور منتروں کو پڑھنے سے روک دیں[3]۔ "ابو عثمان کہتے ہیں کہ ہم آذربائیجان میں تھے' تو حضرت عمر فاروقؓ کا ہمیں خط ملا' لکھا تھا "اے عتبہ بن فرقد (سالار مسلمین) عیش و عشرت' اہل شرک اور ریشم کے لباس سے گریز کرو اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے لباس حریر سے منع فرمایا ہے[4]۔ "علاوہ ازیں آپ نے بے شمار منکرات کو روکنے کیلئے ٹھوس اقدامات کئے' جس سے نظریہ عامہ کے اس فریضے کی ادائیگی کیلئے اسلامی ذمہ داری کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اس درخت کی طرف آتے ہیں اور نوافل پڑھتے ہیں جس کے نیچے رسول اکرم ﷺ نے بیعت رضوان کی تھی' تو اس کو جڑ سے اکھاڑ دیا تاکہ لوگ توہمات و خرافات میں مبتلا نہ ہوتے رہیں[5]۔ ایک مرتبہ حضرت انس بن مالک کو ایک قبر کے پاس نماز پڑھتے دیکھا تو یہ کہہ کر منع فرمایا کہ "قبر ہے قبر[6]۔ "آپ میت پر ماتم کرنے پر ڈنڈے مارتے' پتھر پھینکتے اور منہ میں مٹی جھونک دیتے تھے[7]۔ اسی طرح کرائے پر رونے والی عورتوں کو بھی سزا دیتے تھے[8]۔

آپ زمانہ جاہلیت کی مکروہ روایات کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے' چنانچہ روایت میں ہے کہ "حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو تحریر کیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے علاقہ میں کچھ لوگوں نے زمانہ جاہلیت کے انداز میں نعرہ بلند کیا ہے اور قبیلہ ضبہ کے لوگوں کو یا آل ضبہ کہہ کر جوش دلایا ہے۔ انہیں آپ خوب سرزنش کیجئے اور ایسی جسمانی اور مالی سزا دیجئے کہ اگر ان میں دین اسلام کا فہم و شعور پیدا نہ ہو تو یہ منتشر ہی ہو جائیں[9]۔ "لوگ ہبہ کے معاملات میں ہیرا پھیریاں کرنے لگے' محض زبانی اور کاغذی ہبہ کو باطل قرار دے کر موہوب لہ کا قبضہ لازم قرار دیا۔ آپ نے فرمایا "لوگوں کا کیا حال ہو گیا ہے کہ وہ بیٹوں کو مال ہبہ کر کے اپنے پاس ہی روک لیتے ہیں۔ اگر وہ پہلے مر جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیا تھا یہ میرا مال ہے اور اگر باپ پہلے مر جاتا تو یہ کہ وہ میرے بیٹے کا ہے میں نے اسے ہبہ کیا تھا۔ جو کوئی ہبہ کرے اور اس کو نافذ کرے یعنی موہوب لہ اس پر قبضہ نہ کرے یا موہوب لہ مرے تو وہ اس کے وارثوں کو ملے گا[10]۔ "آپ مخلوط مجالس سے بھی منع فرماتے تھے اور اس پر سزائیں دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک حوض پر مردوں اور عورتوں کی بھیڑ دیکھی تو انہیں مارا[11]۔ آپ نے جابیہ میں

---

(۱) جوزی: ۱۳۳ (۲) عبدالرزاق ۱۸۳/۱۰' جوزی: ۱۳۳ (۳) جوزی: ۱۳۴ (۴) جوزی: ۱۳ (۵) جوزی: ۱۳۵ (۶) بخاری: ۱۱۰/۱

بیہقی ۴۳۵/۲ (۷) بخاری ۸۵/۲ (۸) جوزی: ۱۹۰ (۹) حربی/۹: ۳۷۱ (۱۰) مالک: ۷۵۳ (۱۱) یوسف: ۳۶۳۔

خطبہ دیتے ہوئے فرمایا "جب مرد اور عورت اکٹھے ہوں تو تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے [۱]۔" آپ نے نامحرم مردوں اور عورتوں کے تخلیے کی ممانعت کر دی [۲]۔ عراق کے ایک شخص نے آکر بتایا کہ میں آپ کے پاس ایک ایسا امر لے کر آیا ہوں جس کا سر پیر کوئی نہیں۔ آپ نے پوچھا "وہ کیا؟" اس شخص نے کہا جھوٹی گواہیاں جو ہمارے ملک میں بہت پھیل گئی ہیں۔ پوچھا "کیا یہ سچ ہے؟" جواب ملا "ہاں" آپ نے حکم دیا کہ کسی مسلمان کو معتبر گواہ بنائے بغیر گرفتار نہ کیا جائے [۳]۔ بقول ابو جعفر آپ مشتبہ اشخاص پر بہت سخت تھے اور اللہ کا حق حاصل کرنے میں بہت شدت پسند تھے تا آنکہ اللہ کا حق حاصل کر کے رہیں۔ آپ کمزوروں پر مہربان اور شفیق تھے [۴]۔ آپ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا وہ رخصت ہونے کیلئے آئے تو آپ نے فرمایا "اے مغیرہ! شریف انسان کو تم سے مطمئن رہنا چاہئے اور بدکاروں کو تم سے ڈرنا چاہئے [۵]۔" اس طرح آپ نے اصلاح احوال کیلئے انتظامی نقطہ نظر سے ایک جامع فارمولا دے دیا۔

۵۔ قیام عدل:

نظمیہ عامہ کے فرائض میں سے ایک بہت بڑا فریضہ قیام عدل ہے۔ آپ خود بھی عدل کرتے اور عدل کرنے والوں کو ہی سرکاری مناصب پر مقرر کرتے خواہ وہ جج ہوں یا دیگر ذمہ داریوں کے حامل۔ پھر آپ متواتر اس سلسلے میں انہیں ہدایات جاری کرتے رہتے اور ان کے معاملات پر گہری نظر رکھتے کہ کہیں عدل کے تقاضوں کو فراموش کرتے ہوئے ظلم و استحصال تو نہیں کر رہے۔ آپ کے نزدیک عدل صرف عدلیہ کی نہیں' بلکہ پوری پبلک ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داری ہے۔ انہیں ہر ہر معاملے میں عدل ہی کے اصولوں پر کاربند رہنا چاہئے' پھر ہی عدل و انصاف کی برکتوں سے معاشرہ فیض یاب ہو سکتا ہے۔ "عدل فاروقی" ایک مشہور اصطلاح کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آپ کے عہد میں ایک مرتبہ زلزلہ آیا' آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی اور زمین پر درہ مار کر کہا "قرار پکڑ کیا میں تجھ پر عدل نہیں کرتا؟ زمین اسی وقت ساکن ہو گئی [۶]۔" آپ نے حضرت سعدؓ کے ساتھ چھ ہزار فوج کو روانہ کرتے وقت سب کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "جسے کسی چیز کا علم ہو' وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ بلاشبہ عدل کیلئے علامت اور شہادت ہوتی ہے۔ اس کی علامات حیاء' سخاوت' آسانی اور نرمی ہیں اور اس کی بشارت رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کیلئے ایک دروازہ مقرر کیا ہے اور ہر دروازے کیلئے ایک چابی مہیا کی ہے۔ پس عدل کا دروازہ غور و فکر کرنا ہے اور اس کی چابی زہد ہے۔ غور و فکر موت کو یاد کرنے اور اعمال پیش کرنے کیلئے تیار ہونے کو کہتے ہیں اور زہد ہر کسی سے حق ہی لینا ہے' جسے حق قبول کرے اور یہ کہ بقدر کفایت روزی پر اکتفا کرنا ہے۔ گزارے کی روزی جس کی کفایت نہ کرے اسے کوئی چیز بھی غنی نہیں کر سکے گی۔ میں تمہارے اور اللہ کے درمیان ہوں مگر میرے اور اللہ کے درمیان کوئی نہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دعا سے مدد کرنا میرے ذمے لگایا ہے پس تم اپنی شکایت ہم تک پہنچاؤ۔ جو شخص ہم تک شکایت پہنچانے کی استطاعت نہیں رکھتا' وہ جس شخص تک پہنچا سکتا ہے پہنچا دے' ہم اس کیلئے اس کا حق بلاخوف وصول کریں گے [۷]۔"

آپ نے اس تقریر میں عدل کی علامتیں' فلسفہ اور بنیادیں بہت خوبصورتی سے واضح فرمائی ہیں' تاکہ لوگ اسے زندگی کے ہمہ گیر رویے کے طور پر لیں۔ آخر میں آپ نے لوگوں کو اعتماد دلایا ہے کہ بطور منتظم ہر ظلم و زیادتی کے خلاف کارروائی کر کے ضرور حق دلائیں گے۔ اس کی کسی بھی ذریعے سے صرف اطلاع پہنچ جانا کافی ہوگا۔ آپ کے نزدیک عمال و حکام کے تقرر کا سب سے بڑا مقصد عدل کا قیام تھا۔ آپ نے زندگی کے آخری جمعہ کے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا "اللھم انی اشھدک

(۱) حنبل ۲۰۸ (۲) شاہ ۱۶۶ (۳) مالک، ۷۲۰ اثیر ۱۰/۵۶۰ (۴) طبری، ۲۰۷ (۵) طبری، ۱۶۵ (۶) شاہ ۳/۳۴۸ (۷) کثیر ۷/۳۶۔

علی امرآء الامصار فانی انما بعثتھم علیھم لیعدلوا علیھم [1] ۔ "آپ جن عمال کو مقرر کرتے تھے انہیں بھیجتے وقت بہت سی نصیحتیں فرماتے۔ انہیں بھیجنے کے مقاصد اور ان کی ذمہ داریاں بتاتے۔ ان میں یہ بات بھی شامل ہوتی "وتقصوا بینھم بالحق وتقسموا بینھم بالعدل [2] ۔ "آپ کے عمال عموماً آپ کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرتے' تاہم اگر کسی کے خلاف کوئی شکایت آپ تک پہنچتی تو پوری تحقیق و تفتیش کرتے۔ ایک مرتبہ حضرت سعدؓ جو کوفہ کے گورنر تھے کے خلاف شکایت آئی تو آپ نے کئی آدمیوں کو بھیجا جنھوں نے ہر ہر مسجد میں جاکر حضرت سعدؓ کے بارے میں لوگوں سے پوچھا' سب نے آپ کی تعریف کی' لیکن جب وہ مسجد بنی عبس میں گئے تو ایک شخص جس کا نام اسامہ بن قتادہ تھا کھڑا ہوا اور کہا کہ "آپ نے اگر خدا کا واسطہ دے کر پوچھا ہے' تو سنئے سعد نہ تو جہاد کرتے ہیں' نہ مال کی تقسیم صحیح کرتے ہیں اور نہ ہی عدل کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ "حضرت سعدؓ بھی موجود تھے' انہوں نے سن کر کہا "خدا کی قسم! میں تین دعائیں کرتا ہوں "اے اللہ! اگر تیرا یہ بندہ جھوٹا ہے اور صرف ریا و نمود کیلئے کھڑا ہوا ہے تو اس کی عمر دراز کر دیجئے' اسے فقر میں مبتلا کر دیجئے اور اسے فتنوں میں ڈال دیجئے۔" آخر وہ شخص ایسے ہی حالات کا شکار ہوا۔ جب اس سے پوچھا جاتا تو کہتا میں ایک بوڑھا اور پریشان حال ہوں مجھے سعد کی بددعا لگ گئی تھی۔ واقعہ کے راوی عبدالمالک کہتے ہیں کہ میں نے اسے دیکھا تھا اس کی بھویں بڑھاپے کی وجہ سے آنکھوں پر آگئی تھیں' لیکن اب بھی وہ راستوں میں لڑکیوں کو چھیڑتا پھرتا تھا [3] ۔

اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی نظامیہ عامہ میں عدل و انصاف کے حوالے سے کس طرح کا ماحول اور صورتحال تھی۔ اس کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ نے انتظامی آلات کو اس مقصد کیلئے بھرپور استعمال فرمایا' جن میں نگرانی' رہنمائی' رابطہ' حالات سے آگہی' کنٹرول' احتساب وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انتظامی عہدوں پر تقرر ہی ان لوگوں کا کرتے' جن سے عدل کی امید ہو سکتی تھی' لیکن پھر بھی ان کو ان کے حال پر چھوڑنے کے بجائے ان پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ آپ نے خلیفہ بننے کے بعد ابتدائی دنوں ہی میں اپنے آزاد کردہ غلام اور معتمد یرفا کو شام کے فوجی افسران (حضرت خالد بن ولیدؓ' یزید بن ابی سفیانؓ' شرجیل بن حسنہ اور عمرو بن العاصؓ) کے حالات' مسلمانوں کے ساتھ ان کے طرز عمل اور عام چال ڈھال کا حال معلوم کرنے کیلئے روانہ فرمایا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے سب کی فرداً فرداً تعریف کی۔ یرفا کو واپسی پر اپنے ہم نفس حضرت معاذ بن جبلؓ کے ساتھ مل کر ایک خط لکھ کر دے دیا' جس میں خود فاروق اعظمؓ کو زبردست نصیحتیں کیں۔ اس کا ابتدائی حصہ کچھ اس طرح تھا "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ابو عبیدہ بن الجراح اور معاذ بن جبل کی طرف سے عمر بن الخطابؓ کو سلام علیک۔ ہم اس معبود کے سپاس گزار ہیں' جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ ہمیں معلوم ہے آپ کو اپنی اصلاح کی کتنی فکر رہتی تھی۔ اب آپ امت محمد ﷺ کے کالے گورے کے حاکم ہو گئے ہیں۔ آپ کے سامنے دوست دشمن' بڑے چھوٹے' کمزور اور طاقتور سب بیٹھتے ہیں۔ ان سب کے آپ کے ذمے حقوق ہیں اور سب کیلئے آپ کی میزان عدل میں حصہ ہے۔ اے عمرؓ! ذرا خیال رکھنا آپ ان کے ساتھ کس طرح انصاف کرتے ہیں۔ ہم آپ کو اس دن کی یاد دلاتے ہیں جب سارے راز کھل جائیں گے اور چھپی برائیاں حشت از بام ہو جائیں گی۔ جب چہرے ایک "سلطان غالب" کے سامنے ذلیل و خوار ہوں گے [4] ۔"

آپ نے اس کے جواب میں جو تفصیلی خط لکھا اس کی چیدہ چیدہ باتوں میں ایک تو یہ تھی "تم نے لکھا ہے کہ خلافت سے پہلے اصلاح نفس کی آپ کو لگن تھی' یہ تم نے کیسے جانا؟ تمہارے الفاظ سے ستائش کی بو آتی ہے۔" ایک اور بات یہ لکھی "بلاشبہ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد اور رہنمائی عمر کے شامل حال نہ ہو تو وہ انصاف کا حق ادا نہ کر سکے۔" آخر میں ہدایت کی کہ "تم مجھے خط لکھتے رہا کرو میں تم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا [5] ۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ جس طرح نصیحتیں کرنے میں بیباک تھے اسی طرح نصیحتیں کرنے کیلئے بھی ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو حکمرانوں کو بہت ہی کم نصیب ہوتی ہے' جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو عقل

---

(۱) مسلم ۲: ۸۰ (۲) طبری ۲۰۰۹/۴:۱۱ (۳) بخاری ۱۸۳/۱:۱ (٤) خورشید ۲۲ (۵) ایضاً ۲۴۔

کل سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور حق بات سننے اور پہچاننے کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ ایڈمنسٹریشن کے بالائی مراکز میں عدل کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور نیچے رعایا جاں بلب ہو جاتی ہے۔ ایک اور واقعہ بامشافہ بھی پیش آیا۔ آپ نے سعید بن عامر حذیم کو پروانہ بھیجا کہ تم کو شام کے ایک حصے کا عامل مقرر کیا جاتا ہے۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "نہیں! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ سارا بوجھ تم میرے اوپر ڈال دو اور خود گھروں میں بیٹھ جاؤ۔" جب سعید نے حضرت عمرؓ کا اصرار دیکھا اور انہیں اندازہ ہوا کہ انہیں نہیں چھوڑیں گے تو انہوں نے حضرت عمرؓ کو بہت خوب نصیحت کی "اے عمرؓ اللہ سے ڈرتے رہو اور اپنا رخ اور اپنے فیصلوں کو ان سب کیلئے درست رکھو جنہوں نے تم کو اپنا نگران بنایا ہے، خواہ وہ قریبی ہوں یا دور کے رہنے والے اور دوسرے لوگوں کیلئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو[1]۔" اس سے ہمارے سامنے یہ اصول آتا ہے کہ پبلک ایڈمنسٹریشن کے اہلکاروں کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے کی ستائش کرتے رہیں۔ ہر جائز و ناجائز کام میں ایک دوسرے کو تقویت دیں اور ماتحت افسران اپنے بڑوں کی جی حضوری کرنے کی کوشش کریں بلکہ ان کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ ایک دوسرے کو حق و صداقت اور عدل و انصاف کی نصیحتیں کرتے رہیں اور اپنی مشترکہ ذمہ داریوں کا احساس بیدار کریں' تاکہ معاشرے میں حقیقی عدل قائم ہو سکے۔

ایڈمنسٹریشن آف جسٹس کے لوازمات کیا ہیں؟ اس کیلئے افسران کو اپنے طرز عمل میں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟ اس بارے میں حضرت عمر فاروقؓ کے نظریات نہایت بصیرت افروز اور عملی نوعیت کے ہیں۔ یقیناً ان کے بغیر عدل و انصاف کسی بھی زمانے اور خطے میں کبھی نافذ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے اپنے ایک گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا "سارے انسانوں کو اپنی نظر میں یکساں رکھو اور اپنی مجلس میں ان کے ساتھ یکساں سلوک کرو' تاکہ کمزوروں کو تم سے انصاف کی امید باقی رہے اور معززین میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ تم ان کی خاطر دوسروں پر زیادتی کر سکتے ہو[2]۔" آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ قانون اور ضابطے طاقتوروں کو کنٹرول کرنے اور مجبوروں اور بے کسوں کے تحفظ کیلئے بنائے جاتے ہیں۔ ان کی ساری خلاف ورزی "معززین" کی خاطر' معززین کی وجہ سے اور معززین کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس لئے اہلکاروں کا اصل کام یہ ہے کہ وہ انہیں بلاوجہ ترجیح نہ دیں' تاکہ انصاف صرف ہو ہی نہیں' بلکہ دکھائی بھی دے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی امید باقی رہے۔ یہ امن و امان اور وحدت و استحکام کیلئے ضروری ہے' ورنہ یا تو مایوسی و بددلی پھیلے گی یا بغاوت و سرکشی۔ آپ نے اپنے معروف سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ کے نام خط میں مزید اصولوں کی نشاندہی فرمائی' جب وہ شام میں تھے تو انہیں لکھا "اما بعد! میں تمہیں ایک ایسا خط لکھ رہا ہوں جس میں میں نے امکانی حد تک تمہاری اور تمہاری خیر خواہی کی ہے۔ پانچ باتوں پر عمل کرو تو تمہارا دین سلامت رہے گا اور تمہیں بہتر سے بہتر اجر ملے گا۔ جب کسی مقدمے کے دونوں فریق تمہارے پاس آئیں' تو تمہارے لئے ضروری ہے کہ عادل گواہوں اور قطعی و واضح قسموں کا مطالبہ کرو۔ کمزور کو اپنے قریب آنے دو تاکہ اس کے دل کو تقویت ہو اور اس کی زبان کھل سکے۔ غریب الوطن پردیسیوں کی طرف جلد توجہ کیا کرو کیونکہ اگر اسے زیادہ عرصہ تک روکے رکھا جائے گا تو وہ اپنا کام چھوڑ کر واپس چلا جائے گا۔ اس کا کام خراب کرنے کی ذمہ داری اس کے سر ہے' جس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور جب تک کسی مقدمے میں مناسب فیصلہ تک نہ پہنچ سکو' تب تک صلح کرانے کی کوشش کرو[3]۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی طرف ایک اور خط میں لکھا "لوگ تمہارے پاس اپنی ضروریات پیش کرتے رہیں گے۔ اس لئے جو کوئی تمہارے پاس حاجت روائی کیلئے آئے اس کی تم عزت کرو' ایک کمزور مسلمان کیلئے یہی عدل و انصاف کی خاطر کافی ہے کہ فیصلہ کرنے اور تقسیم کرنے میں اس کے ساتھ انصاف کیا جائے[4]۔" مذکورہ ہدایات میں سے دور دراز سے آنے والوں پر جلد اور خصوصی توجہ دینا دور حاضر کی رہنمائی کیلئے بہت ہی اہم ہے۔ تجربہ و مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ بڑے

---

(۱) طبری ۳۶۸/۱۱ (۲) یوسف ۱۱۶ (۳) ایضاً (۴) طبری ۴/۲۰۶۔

بڑے شہروں میں مختلف محکموں کے دفاتر یا عدالتوں میں باہر کے لوگوں کے کام پھنستے ہیں' تو وہ بے چارے ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں۔ مالی بوجھ کے ساتھ ساتھ پیچھے کاموں کا بھی حرج ہوتا ہے۔ انہیں متعدد مرتبہ لاحاصل چکر لگانے پڑتے ہیں۔ دفتروں میں بیٹھے ہوئے افسران اور نچلا عملہ نہ ان سے ذرا سی ہمدردی رکھتا ہے' نہ ان کی بات سنتا ہے' نہ ان کی طرف توجہ دیتا ہے نہ ان کے جائز کام کو جلد از جلد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنے کام اور حق ہی سے دستبردار ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر کسی خوش نصیب کا کام ہو بھی جائے تو دقتوں کے طویل سفر کی تھکان اسے دلی مسرت سے لطف اندوز نہیں ہونے دیتی۔ یہ نظریہ عامہ کا ناقابل معافی جرم ہے۔ یہ بیوروکریسی کے فلسفے' اس کے نظام' اس کے فرائض اور ضابطہ اخلاق کی ناکامی ہے۔ یہ اس کے مقصد وجود سے انحراف اور جواز وجود کا خاتمہ ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کام کے بگاڑنے کا ذمہ انہیں ذمہ دار قرار دے کر انہیں قابل مواخذہ ٹھہرایا ہے۔ دور جدید میں ایسے قوانین بنانے اور انہیں سختی سے نافذ کرنے کی ضرورت ہے' جن سے ایسے سرکاری ملازمین کو سزا دی جا سکے۔ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا "جب زمین کے ان داتا و محتسب (دیان) جب قیامت کے روز آسمان کے محتسب سے ملیں گے' تو ان کی حالت بہت بری ہو گی۔ سوائے اس کے جس نے عدل کے مطابق حکم دیا' حق کے مطابق فیصلہ کیا اور فیصلے میں نہ تو اپنی نفسانی خواہش کا لحاظ کیا نہ قرابتداری کا' نہ تو عاجز ہوا نہ کسی سے خوفزدہ اور کتاب اللہ کو آنکھوں کے آگے آئینہ بنایا[1]۔"

اس قول میں آپ نے عمال و منتظمین کیلئے لفظ "دیان" استعمال کیا ہے' جو بڑا ہی بلیغ لفظ ہے' جس کے معنی زمینی خدا بھی ہو سکتے ہیں اور حقوق دینے' دلانے اور احتساب کرنے والے بھی۔ آپ نے انہیں اصل خوف روز محشر کا دلایا ہے' جسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ جس میں جاہ و منصب اور اقتدار و اختیار ختم ہو جائے گا۔ یہ خوف ہی وہ چیز ہے جو دنیا میں طاقت و قوت کے نشے کو اتار کر عدل و اعتدال کی راہ پر لا سکتا ہے۔ پھر آپ نے نہایت گرانقدر انتظامی ضابطے بیان کئے ہیں' جو معاشرے میں عدل اجتماعی کیلئے ناگزیر ہیں۔ اگر اہلکار ان کا خیال رکھیں تو دنیا میں بھی معزز' مقبول اور کامیاب ٹھہریں گے اور آخرت میں بھی۔ اس کی کامیابی کا پیمانہ اس کی استطاعت ہے' ارشاد ہوا "من ینصف الناس من نفسہ یعطی الظفر فی امرہ[2]۔"

---

(۱) حوریں‌ا:۱۸۱ (۲) ایضاً:۱۸۳۔

باب ہشتم

بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے معاشی مسائل

☆۔ تمہید
☆۔ ریاست کا معاشی کردار
☆۔ کفالت عامہ
☆۔ معاشی ترقی
☆۔ نظام ٹیکس
☆۔ نظام وظائف

بصیرت عمرؓ اور عصر حاضر کے معاشی معاملات

O ... تمہید:

عصر حاضر کا تیسرا اہم شعبہ جس میں فاروق اعظمؓ کی اجتہادی بصیرت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے' وہ معاشیات کا شعبہ ہے۔ آپ جس طرح کامیاب ترین حکمران اور بہترین ایڈمنسٹریٹر تھے اسی طرح آپ حیران کن حد تک ماہر معیشت دان بھی تھے۔ آپ نے جابیہ کے مقام پر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "جسے قرآن مجید سے متعلق دریافت کرنا ہو' وہ ابی بن کعبؓ کے پاس جائے۔ جسے فرائض پوچھنا ہوں وہ زیدؓ بن ثابت کے پاس جائے۔ جو فقہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہے وہ معاذؓ بن جبل کے پاس جائے اور جو مالی امور دریافت کرنا چاہتا ہے وہ میرے پاس آئے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے خازن و قاسم بنایا ہے[۱]۔"

جیسا کہ ہم نے آپ کے حالات زندگی میں دیکھا ہے کہ معاشی امور سے آپ کی دلچسپی بچپن ہی سے تھی' اور اس میں مہارت اس وقت پیدا ہوئی' جب آپ نے عہد جوانی میں تجارت کا پیشہ اختیار کیا' اور اس مقصد کیلئے کئی بار شام و عراق کے سفر کئے۔ آپ نے وہاں کے نظامات کا بھی مطالعہ کیا اور عملی مسائل سے بھی گزرے۔ آپ کے تمام معاشی تصورات و خیالات ایک الگ مقالے کے متقاضی ہیں۔ اس باب میں کلی معاشیات(Macro Economics) کے زاویۂ نگاہ سے ہم آپ کے معاشی تصورات اور پالیسیوں کا جائزہ لیں گے اور وہ بھی آپ کے حکومتی اقدامات کے چیدہ چیدہ پہلوؤں کو لیں گے' جن سے عصر حاضر میں ہم بھرپور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

O......ریاست کا معاشی کردار:

خاتم النبیین ﷺ نے اہل عالم کو ایک منفرد فلاحی ریاست کا تصور دیا۔ رزق حلال کو اللہ کا فضل' عطیہ اور نعمت قرار دیا ہے۔ طیبات و حسنات میں شمار کر کے اعلیٰ مقاصد کی خاطر اس کے حصول کو عبادت کے بعد سب سے بڑا فریضہ اور کوشش کو جہاد فی سبیل اللہ کی ایک شکل قرار دیا۔ اس طرح معاشی سرگرمیوں کو اہمیت دی اور انہیں اخلاقی و روحانی محرکات بھی فراہم کر دیئے۔ ریاست کے ذریعے ان کو منضبط کیا' انہیں حدود الٰہی کا پابند بنایا اور حلال و حرام کے ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے فروغ دیا۔ منصوبہ بندی' حسن تدبیر' اعلیٰ تعلیمات کے ذریعے فقر و افلاس' ظلم و استحصال' ارتکاز دولت' معاشی تفاوت' لوٹ مار اور معاشی اجارہ داریوں کے خاتمے کی بھرپور کوشش کی اور بطور حکمران ریاست کے مادی و انسانی وسائل کو عوام کی معاشی فلاح و بہبود' کفالت عامہ' گردش دولت اور معاشی ترقی کیلئے بڑی دانشمندی سے استعمال کر کے بہت قلیل عرصے میں حیران کن نتائج حاصل کئے۔ آپ کے عہد مبارک میں سرکاری و شرعی محاصل سے حاصل ہونے والی آمدنی بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے آپ نے ایک طرف نجی شعبے کو مذکورہ مقاصد کیلئے متحرک کیا اور دوسری طرف زکوٰۃ کو مالیاتی پالیسی کے آلہ کے طور پر استعمال کیا اور دیگر جو بھی آمدنیاں ہوتی تھیں' انہیں فوری طور پر لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس لئے باقاعدہ طور پر بیت المال قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ حضرت حسنؓ بن محمد سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے پاس آنے والے مال پر نہ دوپہر گزرنے دیتے تھے نہ رات[۲]۔" بقول امام ابو عبیدؒ یعنی آپ مال کو تقسیم کرنے اور مستحقین تک پہنچانے میں عجلت سے کام لیتے تھے۔ اگر مال آپ کے پاس صبح پہنچتا' تو آپ دوپہر تک اپنے پاس باقی نہ رہنے دیتے۔ اسی طرح اگر شام کو پہنچتا تو آپ رات سے پہلے پہلے تقسیم فرما دیتے تھے[۳]۔"

---

(۱) عبید ۱۱، ۲۲۱ جوزی ۱۰۱ (۲) عبید ۲۳۲ (۳) ایضاً

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو' تو مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ تین راتیں گزرنے سے پہلے پیسے اس میں سے کچھ بھی میرے پاس باقی نہ رہے' اما یہ کہ مجھ پر کوئی قرض ہو اور اسے ادا کرنے کیلئے میں نے کچھ بچالیا ہو"[1]۔ "ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ نے مال کی تقسیم کیلئے حضرت عمرؓ کو مقرر فرمایا۔ اس کی تفصیل آپ کے عہد خلافت میں اس استفسار سے ملتی ہے' جو آپ نے حضرت علیؓ سے کیا تھا۔ اس کے راوی حضرت علیؓ خود ہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ مشورہ کیا کہ "اللہ کے مال میں سے (سب کو دینے دلانے کے بعد بھی) جو رقم بچ رہے' اس کا کیا مصرف ہو؟" لوگوں نے یک زبان کہا "امیر المومنین' امت کی خاطر آپ اپنے اہل وعیال' جائیداد اور تجارت سب سے روگرداں ہو چکے ہیں۔ یہ رقم آپ خود استعمال کیجئے۔" امیر المومنین نے مجھ سے (مراد علی بن ابی طالبؓ) پوچھا "تمہاری کیا رائے ہے؟" میں نے کہا "آخر تمام لوگ آپ کو مشورہ دے ہی چکے' نگران کا اصرار تھا کہ میں ضرور اپنی رائے دوں۔" میں نے بھی کہا "آپ کیوں اپنے آپ کو مبتذل بہ گماں کرتے ہیں یعنی آپ کیوں وہم میں مبتلا ہونا چاہتے ہیں؟" فرمایا "تم کو یہ بات کھل کر کہنی ہوگی۔" میں نے کہا "بہت اچھا' میں پوری بات وضاحت کے ساتھ کروں گا۔" آپ کو یاد ہوگا کہ ایک بار آنحضرت ﷺ نے صدقہ کا کچھ مال آپ کے حوالے کر کے آپ کو اسے محتاجوں میں بانٹنے کیلئے روانہ کیا' اور آپ اس تمام مال کو لئے ہوئے برآمد ہوئے۔ اتفاق سے اس موقع پر آپ کی ملاقات عباسؓ بن عبدالمطلب سے ہوئی اور انہوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ تمام مال وہ خود تقسیم کریں گے۔ اس پر آپ دونوں میں کچھ رنجش سی ہوگئی' پھر آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ "ذرا میرے ساتھ نبی اللہ ﷺ کے پاس چلو۔" اور ہم جب پہنچے تو ہم نے اللہ کے نبی ﷺ کو عالم اضطراب میں پایا' اور ہمیں بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا' چنانچہ ہم دوسرے دن پھر پہنچے۔ دوسرے دن ہم نے حضور انور ﷺ کو عالم انبساط میں پایا۔ آپ کو یاد ہوگا' اس پر ہم نے سردار دوجہاںؐ سے پوچھا بھی تھا کہ ہمارے حاضر ہونے پر یہ دو مختلف کیفیتیں کیسی تھیں۔ سردار دوجہاں نے ارشاد فرمایا تھا "پہلے دن جب تم دونوں (عمرؓ اور علیؓ) میرے پاس آئے تھے' تو میرے پاس صدقے کے دو دینار باقی رہ گئے تھے۔ ان دو دیناروں کے سبب میں مکدر تھا۔ آج میرے نشاط کا باعث یہ ہے کہ میں نے ان دو دیناروں کو بھی ٹھکانے لگا دیا ہے۔" امیر المومنین نے سنا تو ارشاد فرمایا "علیؓ میں مستقل طور پر تمہارا شکر گزار ہوں"[2]۔

قتادہ کا قول ہے "سب سے آخری مال غنیمت جو رسول اللہ ﷺ کی حیات میں لایا گیا' وہ بحرین سے آئے ہوئے آٹھ لاکھ درہم کی شکل میں تھا۔ حضورؐ یہ تمام دولت یک ہی نشست میں تقسیم فرما کر اٹھ کھڑے ہوئے عہد رسالتؐ اور عہد صدیقیؓ میں بیت المال کا قیام ابھی عمل میں نہ آیا تھا۔ بہر حال بیت المال سب سے پہلے فاروق اعظمؓ نے قائم کیا۔ اس سلسلہ میں مالک بن اوس کا بیان ہے "اسلام کے خزانہ عامرہ میں موجود مال وزر کے بارے میں عمری مسلک یہ تھا کہ اس مال و دولت میں کسی کو کسی پر ترجیح حاصل نہیں ہے اور خود امیر المومنین اور رئیس مملکت کو کسی ایک فرد پر ترجیح نہیں دی جاسکتی اور مسلمانوں میں کوئی شخص بھی ایسا نہ رہ جائے گا' جسے اس دولت میں حصہ دار نہ بنایا جائے گا۔ اس معاملہ میں زر خرید غلام مستثنیٰ ہوں گے۔ البتہ اس مال میں مسلمانوں کی حصہ رسدی کا معیار کتاب اللہ اور تعلیمات رسول مقبول ﷺ کی روشنی میں متعین ہوگا۔ مثلاً مال بانٹتے وقت ہم دیکھیں گے کہ ایک شخص نے اسلام کی خاطر تکلیفیں اور مشقتیں کتنی اٹھائی ہیں۔ وہ اسلام کی دولت سے کس مرحلہ پر شرف یاب ہوا ہے۔ اسلام لانے کے بعد اس کی مالی حالت کس درجہ بہتر یا کس درجہ ابتر ہوئی ہے۔ امیر المومنین نے یہ بھی فرمایا کہ "اگر اجل نے انہیں مہلت دی تو دولت کی عادلانہ تقسیم کا ایسا انتظام کریں گے اور مال غنیمت یوں بانٹیں گے کہ صنعاء کی پہاڑی پر چرواہا گلہ چرا رہا ہوگا اور وہیں اس کے حصے کا مال اسے پہنچ جائے گا"[3]۔

---

(۱) عبید ۲۳۲ (۲) جو ...۱: ۱ (۳) جو ...۱

رسول اکرم ﷺ کی معاشی حکمت عملی اس وقت کے معاشی حالات کے عین مطابق تھی۔ آپ نے معاشی معاملات میں ریاست کی ذمہ داریوں کے جو اصول وضع فرمائے تھے 'محدود وسائل میں ان کی بجا آوری کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ حاصل ہونے والے وسائل کو فوری طور پر متعلقہ مقاصد پر خرچ کر دیا جائے۔ عہد فاروقی میں معاشی حالات تبدیل ہو گئے' اللہ تعالیٰ نے بے پناہ فتوحات عطا فرمائیں۔ جن کی وجہ سے حکومتی محاصل کی آمدنیوں میں بے پناہ اضافہ ہوا اس کے ساتھ ہی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ ایک نئی صورتحال تھی جس نے آپ کی حساس طبیعت کو ہلا کر رکھ دیا۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ "مجھے عمر بن الخطابؓ نے بلایا۔ میں آیا تو دیکھا کہ ان کے سامنے چمڑے کے فرش پر سونا پھیلا ہوا ہے۔" مجھے فرمایا کہ "آؤ اور اسے اپنی قوم میں تقسیم کر دو اللہ ہی بہتر جانتا ہے اس نے اسے اپنے نبی علیہ السلام اور ابو بکرؓ سے کیوں علیحدہ رکھا اور مجھے دیا۔ معلوم نہیں کہ خیر کی وجہ سے یا شر کی وجہ سے۔" ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں تقسیم کرنے لگا اور ہٹانے لگا۔ اچانک مجھے رونے کی آواز آئی دیکھا کہ عمرؓ رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اس نے اس مال کو اپنے نبی علیہ السلام اور ابو بکرؓ سے ان کے ساتھ شر کا ارادہ کرنے سے نہیں روکا اور عمرؓ کو اس کے ساتھ خیر کے ارادے سے نہیں دیا" ۔[1]

آپ کے اس احساس نے آپ کے اندر اس عزم کو پختہ کر دیا کہ آپ ان وسائل کو اپنے لئے آزمائش سمجھتے ہوئے پوری خدا خوفی سے استعمال کریں گے اور ان پر اپنے اختیارات کو ذریعہ خیر بنائیں گے نہ کہ ذریعہ شر۔ اس کی صورت آپ کے نزدیک صرف یہی تھی کہ ان کے ایک ایک حبہ تک کو صرف انہیں مقاصد پر خرچ کریں' جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے متعین کر دیئے ہیں۔ آپ کی ساری ذاتی زندگی اور تمام معاشی پالیسیاں اس بات کی شہادت دیتی ہیں۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کہتے ہیں "ایک بار امیر المومنین نے مجھے طلب کیا۔ میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ بے حد خستہ اور گویا غنودگی کے عالم میں ہیں۔" میں نے پوچھا "کیا قصہ ہے امیر المومنینؓ؟" یہ سن کر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک مکان کے اندر لے گئے۔ اس مکان میں بے شمار ساز و سامان کے انبار لگے ہوئے تھے' فرمانے لگے "آل خطاب نے خدا کو بہت سہل سمجھ رکھا ہے۔ یہ سب مال دراصل اس لئے نہیں آیا کہ عمرؓ کے عہد کو رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر صدیقؓ کے عہد پر ترجیح حاصل ہے' یہ تو ایک آزمائش ہے۔ ان دونوں نے (مراد آنحضرتؐ اور ان کے نائب ابو بکر الصدیقؓ) دین کی بنیادیں قائم کیں۔ اب میرا کام یہ ہے کہ میں ان کی پیروی کروں۔" اس کے بعد بقول عبدالرحمٰنؓ بن عوف' ان کے مشورے سے چار چار ہزار درہم مجاہدین کیلئے' چار چار ہزار ازواج نبی کیلئے اور دو دو ہزار باقی تمام کیلئے نکالے گئے اور اس طرح تمام کا تمام مال تقسیم ہو گیا" ۔[2]

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "واللہ مجھے معلوم نہیں کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ' اگر بادشاہ ہوں تو یہ امر عظیم ہے۔" کسی نے کہا "امیر المومنینؓ دونوں میں فرق ہے۔" آپ نے پوچھا "وہ کیا؟" اس نے کہا کہ خلیفہ تو بغیر حق کے کچھ نہیں لیتا اور خلاف حق سے خرچ نہیں کرتا۔ آپ الحمد للہ ایسے ہی ہیں جبکہ بادشاہ زبردستی وصول کرتا ہے اور ذاتی مرضی سے لیتا دیتا ہے۔ یہ سن کر آپ خاموش ہو گئے" ۔[3] "ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے تقریر فرمائی اور لوگوں کی حالت اور اپنے اقتدار اور مال کے متولی ہونے کی کیفیت کو بہت عمدہ طریقے سے بیان فرمایا کہ "قرآن کریم کی تلاوت کر کے معرفت حاصل کرو' اس کے بیان کردہ احکام پر عمل کرو' تاکہ تم قرآن والے بنو۔ یاد رکھو کسی کو اس کا حق اللہ کی نافرمانی کر کے نہیں ملے گا' اگر انسان حق کہے تو نہ اس کی روزی دور ہوتی ہے اور نہ اس کی موت قریب آتی ہے۔ اللہ سبحانہ نے مجھے جو اقتدار سپرد فرمایا ہے اس میں تین باتوں کی وجہ سے کامیابی ہے۔ امانت کی پاسداری' قوت کا استعمال اور اللہ سبحانہ کے نازل کردہ احکام کی تعمیل اور اس مال کی خوبی تین امور میں پنہاں ہے کہ حق کے ساتھ لیا جائے' حق کے ساتھ خرچ کیا جائے اور باطل سے بچا جائے۔ خبردار' میں تمہارے مال کا اس طرح

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible]

نگران ہوں جس طرح یتیم کا ولی یتیم کے مال کا محافظ ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر مجھے ضرورت نہ ہو تو محتاط رہتا ہوں اور اگر ضرورت ہو تو بقدر حاجت اور معروف کے ساتھ اتنا کھاتا ہوں جیسے کوئی سوسائٹی میں لیتا ہے[1]۔ فاروق اعظمؓ مجتہد تھے' آپ حالات و واقعات کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے بے خبر اور بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ آپ پر لازم تھا کہ شریعت کے معاشی احکامات کی نوعیت کو سمجھیں' ان کی اصل روح اور مقاصد کا پوری گہرائی سے جائزہ لیں اور نئے مسائل پر انہیں منطبق کریں۔ چنانچہ ایک طرف تو آپ نے ریاست کے معاشی کردار سے متعلق رسول اکرم ﷺ کے فراہم کردہ مذکورہ اصولوں کو نافذ کرتے ہوئے وسیع پیمانے پر ٹھوس اقدامات کئے اور دوسری طرف ایک جدید ترقی یافتہ اسلامی فلاحی ریاست کا ایک ہمہ گیر تصور اور نظام کار وضع کیا' جو اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ تھا اور ہر دور کی اسلامی ریاست کیلئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ نے اجتہادی بصیرت سے کام لیتے ہوئے محض وقتی و ہنگامی مسائل کو حل کرنے کیلئے نہیں' بلکہ مستقبل کی ضروریات اور اسلامی تہذیب کے استقلال کیلئے زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی ریاست کے کردار اور ذمہ داریوں کا دائرہ وسیع کر دیا۔ نظام حکومت کو مستحکم کرنے کیلئے سیاسی نظام میں اصلاحات کیں۔ انتظامی کنٹرول اور امن و امان کیلئے صوبہ جات اور اضلاع کو مضبوط کیا' ریاستی آمدنی کی تنظیم کیلئے بیت المال قائم کیا اور نظام محاصل کو نئے خطوط پر استوار کیا۔ عدل و انصاف کو یقینی بنانے کیلئے صیغہ عدالت میں اصلاحات کیں' معاشی فلاح و بہبود اور سماجی ترقی کیلئے نظارات نافعہ کا محکمہ قائم کیا اور متعدد اقدامات کئے۔ سرحدوں کی حفاظت کیلئے چھاؤنیاں قائم کیں اور نئے نئے شہر آباد کئے' طاقتور دفاع اور عسکری برتری کیلئے صیغہ فوج میں انقلابی تبدیلیاں کیں' مستقل فوج قائم کی' ان کا الگ دفتر بنایا' بڑی بڑی بارکیں تعمیر کرائیں اور فوج کو جدید ترین اور وافر ساز و سامان سے مسلح کیا۔ تربیت و تعلیم اور ثقافت کے فروغ کیلئے صیغہ تعلیم و مذہبی امور کو مستحکم کیا' ذمیوں کو اسلامی تہذیب کا مستقل حصہ بنانے کیلئے بے پناہ حقوق و مراعات دیں۔ انسانی عظمت و آزادی کیلئے غلامی کے رواج کو انتہائی محدود کر دیا[2]۔

ان تمام شعبوں میں معیشت کا شعبہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا تعلق براہ راست تمام انسانوں سے ہے۔ اس لئے آپ نے اس کی طرف خصوصی توجہ دی۔ آپ کا یہ خیال تھا کہ انسان تو انسان' جانوروں کے بارے میں جو وسیع و عریض سلطنت کے کسی حصے میں عدم توجہی یا ناقص انتظامات کی وجہ سے ضائع ہو کر مر جاتے ہیں' آپ کو آخرت میں جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ارشاد ہوا "لو ان جملاً هلك ضياعاً بشط الفرات خشيت ان يسأل الله عنه آل الخطاب[3]"۔ (اگر فرات کے کنارے ایک اونٹ ناحق ہلاک ہو گا' تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ آل خطاب سے اس کے بارے میں باز پرس کرے گا۔ یہاں آل خطاب سے مراد آپ کی ہی ذات ہے۔ داؤد بن علی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "لو ماتت شاة على شط الفرات ضائعة لظننت ان الله سائلي عنها يوم القيامة[4]"۔ "(اگر فرات کے کنارے ایک بکری بھی ضائع ہو کر مر گئی تو میرے گمان میں قیامت کے دن اللہ مجھ سے ہی اس بارے میں پوچھ گچھ کرے گا۔) اسی سے ملتی جلتی بات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے کہ "میں نے دیکھا عمر بن الخطابؓ ایک اونٹ کی ننگی پشت پر بیٹھے ہوئے ایک طرف کو چلے جا رہے ہیں۔" "میں نے پوچھا "امیر المومنین! کدھر کا قصد ہے؟" فرمایا "صدقے (زکوٰۃ) کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے' اس کی تلاش میں نکلا ہوں۔" "میں نے کہا "اس نوع کے تقویٰ کی مثال قائم کر کے آپ نے اپنے آئندہ جانشینوں کو رتبے میں اپنے سے بہت فروتر کر دیا ہے۔" اس پر انہوں نے جواب دیا "لاتلمني يا اباالحسن' فوالذى بعث محمداً بالنبوة لو ان عناقا ذهبت بشاطئ الفرات لاخذ بها عمر يوم القيامة[5]"۔ "(اے ابو الحسنؓ مجھے اس پر ملامت نہ کرو۔ اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کو نبوت کا منصب دے کر بھیجا' اگر فرات کے کنارے کوئی بھیڑ کا بچہ بھی ضائع ہو گیا تو قیامت کے دن اس پر بھی عمرؓ کا مواخذہ ہو گا۔"

---

(۱) مودودی ۱۷۶ (۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو شبلی "الفاروق" (۳) سعد ۳/۳۰۵- ۳ طبری ۴/۲۰۲ (۴) جوزی ۱۶۱ (۵) ایضاً

ذمہ داری کے اس احساس نے تاریخ عالم میں ریاست کے ایک نئے منفرد اور عظیم فلاحی و معاشی کردار کو متعین کر دیا جو بعد میں بھی اسلامی روایت کا حصہ رہا جبکہ اہل مغرب کے ہاں اس تصور نے بیسویں صدی عیسوی میں جنم لیا ہے۔ آپ نے معاشی ترقی کیلئے ٹھوس منصوبہ بندی کی شاہراہیں اور مسافر خانے بنوائے' نہریں کھدوائیں' وظائف مقرر کئے' روزگار کے نئے نئے ذرائع پیدا کئے' مؤذنوں' اماموں' معلموں اور قاضیوں کو معاشی وسائل کی فراہمی کا انتظام فرمایا' منصفانہ نظام ٹیکس متعارف کرایا' زرعی اصلاحات نافذ کیں' نہایت مفید صنعتی و تجارتی پالیسی وضع کی' کفالت عامہ کا بندوبست کیا اور تمام معاشی مسائل کے حل کیلئے ایک جامع اور ٹھوس حکمت عملی وضع فرمائی۔ عدل و انصاف اور امن و امان کے قیام کی وجہ سے آپ کے تمام اقدامات نتیجہ خیز ثابت ہوئے اور ریاست کے تمام شہری و دیہاتی علاقے خوشحالی کی نعمت سے بہرہ ور ہوگئے۔ آپ نے بطور خلیفہ لوگوں کے تمام چھوٹے' بڑے اور انفرادی و اجتماعی معاشی معاملات میں دلچسپی لے کر ریاست کے معاشی کردار کو وسعت دی اس کی بے شمار مثالیں ہیں' جن میں کچھ حسب ذیل ہیں:

روایت میں آتا ہے کہ آپ نے دار الرقیق (غلام خانہ) اور بعض روایات کے مطابق دار الدقیق (توشہ خانہ) بنوایا۔ اس میں انہوں نے آٹا' ستو' کھجور' کشمش اور حاجت کی دوسری اشیاء رکھیں' جن سے مسافروں اور مہمانوں کی مدد کرتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ نے مکے اور مدینے کے درمیانی راستوں پر بھی وہ ساری اشیاء مہیا کیں جو بے توشہ مسافر کیلئے مفید ہوں اور اسے ایک منزل سے دوسری منزل تک بلا پریشانی پہنچا سکیں[1]۔ آپ نے اجتہادی بصیرت سے کام لیتے ہوئے بیت المال کو مستقل حیثیت دی اور اسے مالی طور پر مضبوط کیا' تاکہ کسی بھی فوری اور ہنگامی بڑی ضرورت کے وقت کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے اور پھر لوگوں کی حاجت روائی کا سلسلہ مستقلاً چلتا رہے' لوگوں کو وظائف کی تقسیم اور بنیادی ضروریات کی فراہمی کے باوجود بیت المال کو بھرا رکھنا' بدلے ہوئے حالات و وقت کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ عاصم بن کلیب نے ابن عباسؓ کو کہتے سنا تھا "فاروق اعظمؓ نماز سے فارغ ہونے کے بعد مسجد میں بیٹھ جاتے اور اگر کسی شخص کا کوئی مسئلہ ہوتا تو اس کے بارے میں وہ اس سے بات کرتے' ورنہ وہ مسجد سے اپنے گھر چلے جاتے۔ ایک بار میں (ابن عباسؓ) عمرؓ کے دولت کدہ پر پہنچے' جاتے ہی میں نے ان کے خادم (یرفا) سے پوچھا کہ اس وقت امیر المومنین کے پاس اہل حاجت تو نہیں آئے ہوئے۔ یرفا نے نفی میں جواب دیا اتنے میں حضرت عثمانؓ بھی آچکے تھے۔ یرفا ہم دونوں کو اندر لے گئے' اس وقت امیر المومنین کے پاس ایک بہت بڑی نقد رقم مختلف تھیلیوں میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ رقم امیر المومنین نے ہم دونوں کے حوالے کر دی اور فرمایا کہ چونکہ وہ ہم دونوں کو اکابر قریش میں سمجھتے ہیں اس لئے ہم اس مال کو مدینے کے اہل حاجت میں بانٹ دیں اور پھر بھی جو رقم بچ رہے' اسے بیت المال میں واپس لے آئیں[2]۔"

بیت المال کے اس منفرد نظام کو آپ ایسی شکل میں قائم نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ وہ بذات خود ارتکاز دولت کا ذریعہ بن جائے۔ آپ کے عہد میں دولت کو گردش میں رکھنے کیلئے یہ ضروری تھا کہ سال میں ایک دن سب کچھ تقسیم کر دیا جائے۔ ان دنوں بین الاقوامی لین دین کیلئے زر مبادلہ کے ذخائر محفوظ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا "اما بعد میں سال کا وہ دن جانتا ہوں کہ بیت المال میں ایک درہم بھی باقی نہ رہے گا کہ عطا کیا جائے' اللہ کو علم ہے کہ میں نے ہر حقدار کو اس کا حق ادا کر دیا ہے[3]۔" حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ "سال میں تین سو ساٹھ دن ہوتے ہیں (قمری حساب سے) اور سال میں ایک دن حضرت عمرؓ بیت المال کو بالکل ہی صاف کروا دیتے تھے تاکہ وہ اپنے پروردگار سے کہہ سکیں کہ انہوں نے بیت المال میں کچھ نہیں چھوڑا اور وہ سب کا سب امت کے کام آجائے[4]۔"

---

(۱) سعد ۲۸۳ (۲) جوزی ۱۶۶:۱ (۳) سعد ۳: ۲۰۳ (۴) جوزی ۳: ۲۰۳۔

آپ نے لوگوں کی معاشی ضروریات کی تکمیل کیلئے جو وسیع انتظام کیا اس کی بنیاد پر آپ کو حق پہنچتا تھا کہ گداگری سے منع کر دیں۔ آپ نے فرمایا "ادنی درجہ کی مزدوری بھی بھیک مانگنے اور دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بہتر ہے"[1]۔ "آپ لوگوں میں ایک طرف تو عزت اور وقار پیدا کرنا چاہتے تھے اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی عادت سے بچنے کیلئے بیت المال کے دروازے کھلے رکھتے تھے اور دوسری طرف پیشہ ورانہ گداگری کو سختی سے ختم کر دینا چاہتے تھے۔ مسیب بن دارم کہتے ہیں "ایک بار امیر المومنینؓ نے ایک فقیر کو صدا لگاتے سنا کہ کوئی اسے رات کا کھانا کھلا دے۔ میر المومنینؓ نے فوراً حکم دیا کہ سائل کو کھانا دیا جائے۔ اس کے بعد سرکاری دار الابل تشریف لے گئے کہ اونٹوں کی دیکھ بھال کریں۔ وہاں انہوں نے بالکل وہی آواز سنی "ہے کوئی جو فقیر کو کھانا کھلائے؟" عمر فاروقؓ غضبناک ہو گئے، پوچھا "میں نے تم لوگوں سے نہیں کہا تھا کہ فقیر کو کھانا کھلا دو۔" لوگوں نے کہا "ہم تو اسے کھانا کھلا بھی چکے۔" یہ سن کر میر المومنین نے فقیر کو بلا بھیجا۔ اب وہ کیا دیکھتے ہیں کہ فقیر کے پاس ایک بہت بڑا تھیلا ہے جو روٹیوں سے بھرا ہوا ہے۔ امیر المومنینؓ فقیر سے مخاطب ہوئے اور کہا "یہ شخص تو سائل نہیں ہے تاجر ہے اور اپنے اہل و عیال کیلئے یوں مال جمع کرتا پھرتا ہے۔" یہ کہا اور تھیلا اس سے لے کر اونٹوں کے آگے ڈال دیا[2]۔

دور جدید میں حکومت پیشہ ور گداگری کی روک تھام کیلئے آپ کے اس عمل کو بنیاد بنا کر تعزیری قوانین وضع کر سکتی ہے۔ بیت المال سے فوری مدد کی آپ کی پالیسی صرف مسلمانوں کیلئے نہیں تھی، بلکہ ریاست کے تمام شہریوں کیلئے تھی، حتیٰ کہ وہ اسلام کے ازلی دشمن یہودی کیوں نہ ہوں۔ انہیں اس حال میں نہیں چھوڑنا چاہئے کہ وہ گداگری کرتے پھریں۔ امام ابو یوسف کے بقول مجھ سے عمر بن نافع نے بروایت ابو بکر حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا "عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا گزر کسی کے دروازے کے سامنے سے ہوا جہاں ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ ایک بوڑھا آدمی تھا جس کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔" آپ نے پیچھے سے اس کے بدن کو ٹھوکا اور پوچھا "تم کس مذہب کے اہل کتاب ہو؟" اس نے جواب دیا کہ "میں یہودی ہوں۔" آپ نے پوچھا "کس چیز نے تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا؟" اس نے جواب دیا "میں بڑھاپے، حاجت مندی اور جزیہ کے باعث بھیک مانگ رہا ہوں۔" راوی کہتا ہے کہ عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور گھر میں سے لا کر اسے کچھ دیا۔ پھر آپ نے بیت المال کے خازن کو بلوایا اور ان سے کہا "اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو کیونکہ یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ان کی جوانی میں ہم ان سے (جزیہ وصول کر کے) کھائیں اور بڑھاپا آئے تو انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔ "انما الصدقات للفقراء والمساکین"[3] (اس آیت میں مذکور) فقراء سے مراد مسلمان فقراء ہیں اور یہ آدمی اہل کتاب کے مسکینوں میں سے ہے۔" آپ نے اس آدمی اور اس جیسے دوسرے افراد کے سر سے جزیہ بھی ساقط کر دیا۔ راوی کہتا ہے کہ ابو بکر نے کہا کہ میں نے عمر کا یہ واقعہ خود دیکھا ہے اور اس بوڑھے کو بھی دیکھا ہے[4]۔"

آپ لوگوں کو معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ترغیب دیتے رہتے تھے کیونکہ یہ آپ کی منصبی ذمہ داری تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا "کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ لو اس لئے کہ تمہیں ہنر کی ضرورت پیش آئے گی[5]۔" آپ کا یہ فرمان دور جدید کیلئے بھی رہنمائی کا ذریعہ ہے، جو حکومت کو فنی تعلیم کے فروغ کیلئے اقدامات کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور لوگوں کو بھی ہنر مندی کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ صرف سادہ قسم کی مزدوری کرنے کے قابل ہونا کبھی معاشی حالات بہتر نہیں کر سکتا۔ حضرت عمرؓ نے جب عرب نوجوانوں کو ذرا آسانی پسند محسوس کیا تو انہیں دھوپ میں کام کرنے اور سخت جان بننے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا "الشمس حمام العرب" (سورج عربوں کا حمام ہے) یعنی وہ دھوپ میں بھی اس قدر محنت کیا کریں کہ پسینہ سے شرابور ہو جایا کریں۔ ایک دوسرے مقام پر اس تلقین کو کتنے پر اثر انداز میں دہرایا "اخشوشنوا فان النعم لا تدوم"[6] (سخت جان ہو نعمتیں تو ہمیشہ رہنے والی نہیں۔)

---

(۱) جوزی/۱: ۹۴ (۲) جوزی/۱: ۹۰ (۳) سورۃ التوبہ ۹/۶۰ (۴) یوسف ۱۲۶ (۵) جوزی ۱۹۹ (۶) عمری/۱: ۱۸۶

دور جدید میں عام عرب کو سوچنا چاہئے کہ تیل کی دولت کب تک دولت رہے گی؟ اور وہ کب تک اس کی بنیاد پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں گے؟ یہ نعمت جب چھن گئی یا اس کے متبادل چیزیں عام ہو گئیں تو پھر کیا کریں گے؟ آپ حکومتی اہلکاروں کی یہ ذمہ داری سمجھتے تھے کہ وہ بازار کے معاملات سے باخبر رہیں۔ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ اور مہنگائی پر نظر رکھیں اور لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا موقع پر فیصلہ کریں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے سب سے پہلے اس مقصد کیلئے احتساب کا نظام قائم کیا اور بذات خود محتسب کے فرائض سر انجام دیتے تھے۔ محتسب کے فرائض کو اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" اجتماعی زندگی کے آداب کی حفاظت اور نگرانی ناموس و آبرو اور امانت کا تحفظ محتسب کے فرائض تھے[1]۔ حضرت شعبیؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بازاروں میں گشت کرتے تھے اور قرآن کریم پڑھتے رہتے تھے اور جہاں کہیں کوئی جھگڑا ہوتا تھا اسی جگہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا کرتے تھے[2]۔ اصبغ بن نباتہ کا بیان ہے کہ میں اور میرے والد مقام زرود سے چلے تو صبح ہوتے ہی مدینے پہنچ گئے۔ صبح صادق کا عمل تھا لوگ نماز فجر ادا کر رہے تھے' نماز ہو چکی تو اپنے اپنے کاروبار میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر میں ہم نے دیکھا ایک شخص ہاتھ میں درہ لئے ہوئے ہمارے سر پر آ کہنے لگا "اعرابی اسے بیچو گے؟" اور اس کے بعد جس قیمت پر وہ خریدنا چاہتا تھا اس پر اعرابی (میرے والد) کو راضی کر لیا۔ معلوم ہوا یہ مول تول کرنے والا شخص خود فاروق اعظمؓ ہے۔ اس کے بعد عمرؓ بازار کا چکر لگانے لگے اور دکانداروں اور اہل کاروبار کو معاملات اور لین دین میں اللہ سے ڈرنے کی ہدایت فرمانے لگے۔ وہ بازار کے کبھی ایک سرے تک جاتے کبھی دوسرے سرے تک[3]۔ آپ آنے جانے والوں سے بھی لوگوں کی معاشی حالت اور پریشانیوں کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ مالک کا بیان ہے کہ میں یک بار صبح ہی صبح امیر المومنینؓ کے پاس پہنچ گیا' مجھ سے پوچھنے لگے "لوگوں کی کیسی کٹ رہی ہے؟" میں نے کہا "بخیر و عافیت۔" فرمایا "اس سلسلے میں کوئی نئی بات تو نہیں سنی؟" میں نے عرض کیا "نہیں بلکہ سب آپ کے ثناء خواں ہیں[4]۔"

آپ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اشیاء کی قیمتیں اعتدال پر رہیں صرف مدینہ ہی نہیں سلطنت کے دور دراز علاقوں کے نرخوں سے بھی آگاہ رہے۔ چنانچہ باہر سے آنے والے ایک قاصد سے دیگر احوال دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی پوچھا "کیف اسعار ھم" (ان کے بھاؤ کیسے ہیں؟) قاصد کہتا ہے میں نے جواب دیا کہ "وہاں کے نرخ ارزاں ہیں۔" آپ نے پوچھا "گوشت کا بھاؤ کیا ہے؟ کیونکہ یہ عربوں کا ایسا درخت ہے جس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتے۔" میں نے کہا "گائے کا یہ بھاؤ ہے۔ بھیڑ بکری کا بھاؤ کیا ہے؟[5]" بد عنوان تاجر عام طور پر گرانی پیدا کرنے کیلئے احتکار کرتے ہیں۔ اس طرح رسد کو روک کر مصنوعی قلت پیدا کرتے ہیں' جب طلب زیادہ بڑھتی ہے تو من مانی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ اس وقت ان کی پوزیشن اور بھی مستحکم ہو جاتی ہے' جب کسی کو اجارہ دارانہ حیثیت حاصل ہو جائے۔ سارے مال کو خرید کر کوئی واحد فراہم کنندہ بن جائے اور مقابلہ و مسابقت ختم ہو جائے۔ اس لئے حضرت عمرؓ یہ حکم دیتے تھے "ہمارے بازار میں کوئی احتکار نہ کرے' جن لوگوں کے پاس اپنی ضرورت سے زائد روپیہ ہے وہ ہمارے ملک میں آنے والے کسی ایک غلے کو خرید کر احتکار نہ کریں اور جو شخص گرمی یا جاڑے میں تکلیف اٹھا کر ہمارے ملک میں غلہ لائے وہ عمرؓ کا مہمان ہے۔ جیسے اللہ کو منظور ہو بیچے اور جیسے اللہ کو منظور ہو رکھ چھوڑے[6]۔" اس روایت میں جہاں آپ نے منافع خوروں کو تنبیہہ کی ہے' وہاں غلہ لانے والوں کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی ہے' تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ بازار میں غلہ لائیں اور قیمتیں گریں۔

بعض تاجر اجارہ دارانہ حیثیت حاصل کرنے کیلئے بازار کی عام قیمت سے عارضی طور پر اپنی اشیاء کے نرخ گرا دیتے ہیں۔ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس طرح جب چھوٹے چھوٹے تاجروں کا دیوالیہ نکل جاتا ہے تو پھر اپنی تمام کسر پوری کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ ان تمام رموز کو سمجھتے تھے اس لئے ایک مرتبہ بازار

---

(١) محتسب ٣٠٦ (٢) طبری ٤:٢٦٣ (٣) جوزی ٧٤: ١ (٤) بجھا ١٦٣ (٥) طبری ٥: ١٨٨ (٦) مالک ٦٥١۔

میں چکر لگاتے وقت حاطب بن ابی بلتعہ کے پاس سے گزرے جو کم قیمت پر منقی بیچ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا "اما ان ترید فی السعر واما ان ترفع من سوقنا"[1]۔ "تجارتی معاملات کی اصلاح اور قیمتوں کے نظام کو منصفانہ بنانے کیلئے آپ کی کاوشوں کا ایک اور مظہر وہ فیصلہ ہے جس میں آپ نے عبداللہ بن ابی ربیعہؓ کو مدینے میں گھوڑے پالنے سے روک دیا۔ لوگوں نے آپ سے آکر یہ درخواست کی کہ آپ اسے اجازت دے دیں۔ آپ نے فرمایا "میں صرف اسی صورت میں اجازت دے سکتا ہوں جبکہ ان کیلئے چارہ مدینے کے علاوہ دوسرے مقام سے لایا جائے۔" چنانچہ انہوں نے گھوڑے اس طرح رکھے کہ چارہ یمن میں ان کی زمین سے لایا جاتا تھا[2]۔ اس بصیرت افروز فیصلے میں عوامی مفادات کے تحفظ کا بھرپور احساس جھلک رہا ہے۔ آپ یہ جانتے تھے کہ ایک ایسی جگہ پر جہاں زرعی زمینوں کی قلت ہے اور لوگ بمشکل ذاتی استعمال کے جانوروں کا پیٹ پالتے ہیں۔ اگر کوئی کاروباری مقاصد کیلئے گھوڑے رکھے گا تو چارے کی قلت پیدا ہو جائے گی اور وہ مہنگا ہو جائے گا۔ ایک تاجر کو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا' لیکن عام لوگوں کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ آپ کا یہ بھی فرمان تھا "اتجروا فی اموال الیتامی' لاتأکلھا الزکوۃ"[3]۔ "یتیموں کے مال سے تجارت کرو' تاکہ اسے زکوۃ تمام نہ کر دے۔ یہ فرمان بھی فہم و فراست کا شاہکار ہے۔ ایک طرف تو یتیموں کا بھلا ہے کہ ان کا مال کم ہونے کے بجائے اضافہ پذیر ہوگا۔ دوسری طرف خود ان کے سرپرستوں کا فائدہ ہے کہ وہ معروف طریقے پر نفع میں شریک ہوسکتے ہیں۔ تیسری طرف عوام کا فائدہ ہے کہ منجمد دولت کے گردش میں آنے سے بہت سے لوگ نفع حاصل کر سکتے ہیں۔ چوتھی طرف ملک اور پورے معاشرے کا مفاد اس میں ہے کہ معاشی سرگرمیوں میں خوب اضافہ ہو۔

آپ محض تاجر ہی نہیں ادیب بھی تھے آپ کا یہ قول تجارت و ادب کے حسین امتزاج کا کس قدر دل آویز مرقع ہے کہ جب خلافت کی ذمہ داریوں نے انہیں تجارتی سرگرمیوں سے دور کر دیا' تو فرمایا "لو کنت تاجراً مااخترت علی العطر شیئا ان فاتنی ربحه لم یفتنی ریحه"[4]۔ "عوام کی فلاح و بہبود ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہتی تھی' چھوٹے سے چھوٹے معاملے سے لے کر بڑے بڑے معاملات تک اس کا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ سفر پر جا رہے تھے' ایک مقام الروحاء کے قریب پہنچے تو پہاڑ پر ایک چرواہے کی آواز سنی' اس کی طرف پلٹ گئے۔ قریب پہنچ کر زور سے پکارا "او بکریاں چرانے والے۔" اس نے جواب دیا تو فرمایا "اے راعی (گڈریئے) میں ایسے مقام سے گزرا ہوں جو تیرے مقام سے زیادہ سرسبز ہے' ہر راعی سے اس کی رعیت کے بارے میں بازپرس کی جائے گی۔ یہ کہہ کر اونٹوں والے راستے پر واپس پلٹ گئے[5]۔ "رعایا کے فائدے کا اس حد تک لحاظ تھا کہ گلی میں سے گزرتے وقت اگر کھجور کی گٹھلی مل جاتی' تو اٹھا کر کسی کے گھر میں پھینک دیتے' تاکہ وہ اسے کام میں لا سکے[6]۔"

مالی معاملات میں ایک اہم معاملہ میراث ہے۔ آپ نے ریاست کی طرف سے اس بارے میں ایک ٹھوس اور واضح حکمت عملی اختیار کی اور میراث کے معاملات میں خود فیصلے کیا کرتے تھے۔ قاضیوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا' تو وہ بھی آپ ہی سے رجوع کرتے تھے[7]۔ آپ میراث کے علم کو بھی لوگوں میں مقبول بنانا چاہتے تھے' تاکہ کسی حقدار کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔ ارشاد فرمایا "فرائض (میراث) کا علم حاصل کرو کہ یہ بھی تمہارے دین کا حصہ ہے۔" آپ نے فرمایا میراث' قرات اور سنت نبوی کی تعلیم حاصل کرو' جس طرح تم قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہو اور فرمایا "جب تم کوئی کھیل کھیلو تو تیر اندازی کا کھیل کھیلو اور جب باتیں کرو تو فرائض (میراث) کے بارے میں باتیں کرو[8]۔"

---

(١) [illegible] (٢) [illegible] (٣) [illegible] ٢٥١ (٤) [illegible] ١٩١ (٥) سعد ٣ ٢٩١ (٦) سیوطی ١٢٩ (٧) تفصیل کیلئے ملاحظہ ھو [illegible] ٣ بعنوان "[illegible]" (٨) ایضا

محمد سے مروی ہے کہ میں نے عبیدہ سے دادا کی میراث یا حصے کی کوئی بات پوچھی تو انہوں نے کہا تم اس کی طرف کیا قصد رکھتے ہو' میں نے اس بارے میں حضرت عمرؓ کے سو فیصلے یاد رکھے ہیں۔ "میں نے پوچھا "کیا سب کے سب عمرؓ کے ہیں؟" انہوں نے کہا "ہاں![1] بھائیوں کے ہوتے ہوئے دادا کی میراث وہ مشکل مسئلہ ہے' جس میں حضرت عمرؓ متامل رہے اور ان کی تمنا تھی کہ کاش نبی کریم ﷺ اس کی وضاحت فرما جاتے۔" چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "میری تمنا تھی کہ رسول اللہؐ دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے ان امور کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ فرما جاتے یعنی جد' کلالہ اور بعض ابواب ربا[2]۔" بقول رواس چونکہ رسول اللہؐ نے دادا کی میراث کے بارے میں وضاحت نہیں فرمائی تھی' اس لئے اجتہادی کا راستہ باقی رہ گیا تھا چنانچہ حضرت عمرؓ نے پہلے ایک اجتہاد کیا۔ پھر مسئلہ کی نوعیت واضح ہوئی تو اس اجتہاد کو چھوڑ کر دوسرا اجتہاد اختیار کیا۔ پھر معاملہ اور واضح ہوا تو ایک اور اجتہاد اختیار کیا اور س طرح آپ نے دادا کی میراث کے بارے میں مختلف فیصلے فرمائے اور ہر فیصلے میں آپ نے حق تک پہنچنے کی سعی فرمائی[3]۔ خود آپ نے فرمایا کہ "میں نے دادا کے بارے میں مختلف فیصلے کئے جن میں میں نے حق تک پہنچنے کی پوری کوشش کی[4]" اور حضرت عمرؓ کے آخری خطبے میں فرمایا "اگر میں زندہ رہا تو اس کے سلسلے میں ایسا فیصلہ کروں گا جسے قرآن پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے دونوں اپنے فیصلے کا مدار بنائیں گے[5]۔"

انہوں نے میراث میں دادا کے حصے کے متعلق اپنی ایک اجتہادی رائے اسی رات شانے کی ایک ہڈی پر لکھی تھی' جس کی صبح ان پر حملہ کیا گیا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ زخم مہلک ہے' تو اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ سے فرمایا "وہ ہڈی لاؤ' جس پر کل میں نے دادا کے حصے کا مسئلہ لکھا تھا۔" اس سے ان کا مقصد اپنی اس تحریر کو مٹا دینا تھا' تاکہ ان کے بعد کوئی اسے حجت نہ بنا لے۔ حضرت عبداللہ نے کہا "امیر المومنین! یہ کام آپ کی طرف سے ہم بھی کر سکتے ہیں۔" یہ کوئی آسان بات نہ تھی کہ حضرت عبداللہ اپنے والد کو زخم کی تکلیف میں مبتلا چھوڑ کر تحریر مٹانے بیٹھ جاتے' لیکن حضرت عمرؓ نہ مانے اور فرمایا "نہیں!" اور وہ اس وقت تک مطمئن نہ ہوئے جب تک ہڈی نہ آ گئی اور انہوں نے اپنی تحریر اپنے ہاتھ سے نہ مٹا دی۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے اس سلسلے میں کئی مرتبہ صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ تحریر لکھنے کے بعد استخارہ کرتے اور فرماتے "اے اللہ اگر اس تحریر میں کوئی خیر ہے تو اسے نافذ فرما۔" بعد میں اسے مٹا کر فرمایا "میری رائے یہی ہوئی کہ میں تمہیں اسی حال پر رہنے دوں جس پر تم رہتے تھے[6]۔" پھر آپ نے فرمایا "میری تین باتیں یاد رکھو' میں نے دادا کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ میں نے کلالہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا اور میں نے تمہارے اوپر کسی کو خلیفہ نہیں مقرر کیا[7]۔"

اس سارے واقعے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل دینے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ فاروق اعظمؓ کے نزدیک حکومتی سربراہ اور اہلکاروں کو رعایا کے معاشی حقوق کے تحفظ' معاشی انصاف کی فراہمی اور چھوٹے بڑے معاشی معاملے کو شریعت کے احکام کی روشنی میں حل کرنے کیلئے کس قدر متحرک و فعال کردار ادا کرنا چاہئے۔ اس سے دور جدید میں ریاست کے معاشی کردار کے بارے میں آپ کے تصورات سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "قاتل مقتول کا قطعاً وارث نہیں ہو تا خواہ اس نے عمداً قتل کیا ہو یا خطاً[8]۔" اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے فیصلے بھی اسی اصول کے مطابق ہیں۔ چنانچہ قتل عمد کے ایک واقعہ میں سراقہ بن جعشم بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے انہیں اطلاع دی کہ ہمارے قبیلے "مدلج" کے ایک شخص نے جس کا نام قتادہ ہے اپنے بیٹے کی طرف تلوار پھینکی جو اس کی پنڈلیوں میں لگی اور خون جاری ہو گیا' جو پھر نہ رکا اور اس کی موت واقع ہو گئی۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کی

---

(۱) سعد ۳: ۲۵۳ (۲) مسلم ۸: ۲۴۵ دالنشرہ ۵۱۵ (۳) ... ۴۲ (۴) عبدالرزاق ۱۰: ۲۶۲ البیہقی ۶: ۲۴۵ (۵) مسلم ۲: ۸۱ حنبل ۱: ۱۹۲' سعد ۳: ۳۳۵

(۶) عبدالرزاق ۱۰: ۳۰۱ (۷) ایضاً ۱۰: ۲۶۲ حنبل ۱: ۲۲۲ (۸) عبدالرزاق ۹: ۴۰۴ البیہقی ۶: ۲۲

طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس پر سراقہ نے کہا کہ اگر آپ حاکم وقت ہیں تو آپ کو چاہئے کہ ہماری طرف توجہ دیں اور ہماری بات سنیں اور حاکم اگر آپ کے علاوہ کوئی دوسرا ہے تو ہمیں اس کے پاس بھیج دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر حضرت عمرؓ اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ ساری بات سن کر حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ مقام قدید میں ایک سو بیس اونٹ گن کر رکھو۔ پھر حضرت عمرؓ وہاں پہنچے اور آپ نے ان میں سے تیس حقہ، تیس جذعہ اور چالیس خلفہ لئے اور پوچھا کہ مقتول کا بھائی کہاں ہے اور اسے کہا کہ یہ لو اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قاتل کیلئے میراث نہیں ہے۔[(۱)] "ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے اس کی ماں اور باپ شریک بھائی کو وارث بنایا اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ آپ نے مقتول کے ماموں کو بلا کر اسے وہ اونٹ دے دیئے[(۲)]۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک شخص نے اپنے بھائی کو خطاً قتل کر دیا تو حضرت عمرؓ نے اسے میراث میں حصہ نہیں دیا۔ اس نے کہا "اے امیر المومنینؓ مجھ سے یہ قتل خطا ہوا ہے۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اگر تم عمداً قتل کرتے پھر تو ہم تم سے قصاص لیتے[(۳)]۔" آپ معاشی ظلم و زیادتی کی ہر شکل کے خاتمے کیلئے اپنا منصبی کردار ادا کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ واقعہ ہے، روایت ہے کہ "حضرت عمرؓ کے عہد میں غیلان بن سلمہ ثقفی نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی اور اپنا مال بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "شیطان جہاں چپکے سے غیب کی خبریں سن لیتا ہے، وہاں اس نے تیری موت کی خبر بھی سن لی ہے اور تیرے دل میں یہ بات ڈال دی ہے۔ ہو سکتا ہے اب تو چند دن ہی زندہ رہے اور قسم بخدا اگر تو نے اپنی بیویوں کی طلاق سے رجوع نہیں کیا اور اپنے بیٹوں سے مال واپس نہ لیا تو تیری بیویوں کو تیرے مرنے پر میراث دلاؤں گا اور انہیں حکم دوں گا کہ تیری قبر پر سنگ باری کریں، جس طرح ابو رغال کی قبر پر ہوئی تھی۔ اس پر اس نے اپنی بیویوں کی طلاق سے رجوع کر لیا اور اپنا مال بھی واپس لے لیا" اور نافع نے بیان کیا ہے کہ وہ بعد میں صرف سات دن زندہ رہا[(۴)] اور المحلی کی روایت میں ہے کہ تیسرے روز مر گیا[(۵)]۔

معیشت کے انفرادی و اجتماعی دائروں کو شریعت ہی کے محور کے گرد گھمانے کیلئے ضروری تھا کہ ریاست کے معاشی کردار کو وسیع کیا جائے۔ آپ نے بطور حکمران جو بھی کردار ادا کیا، وہ دراصل ریاست ہی کی ذمہ داریوں کے بارے میں آپ کے تصورات کی عکاسی کرتا ہے۔ آپ نے لوگوں کے باہمی انفرادی اور گروہی معاملات کو جس طرح عدل و انصاف، فلاح عامہ اور مفاد اجتماعی کے اصولوں سے ہم آہنگ کیا، اسی طرح ریاست اور عوام کے معاملات میں بھی ان کا پورا خاطر رکھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ریاست کی آمدنی میں آپ کے عہد میں بے پناہ اضافہ ہوا جس کی وجہ سے بیت المال میں ہر سال ہزاروں جانور آتے تھے۔ علاوہ ازیں سرکاری فوج کے اہتمام کی وجہ سے جہاد کیلئے ہزاروں گھوڑے تیار رکھنے ہوتے تھے۔ روایت کے مطابق ہر سال ۴۰ ہزار سواریاں مجاہدین کو فراہم کرتے تھے[(۶)]۔ ان کیلئے اصطبلوں اور چراگاہوں کی ضرورت تھی، چنانچہ آپ نے اس مقصد کیلئے کئی زمینیں ریاستی ضروریات کیلئے مختص کر دیں، جسے شرعی اصطلاح میں حمی کہا جاتا ہے۔ آپ اس سلسلے میں ہمیشہ عوام کو اعتماد میں لیتے اور انہیں اپنی پالیسی کا قائل کرتے اور اجتماعی ضروریات اور مجبوریوں کو سامنے رکھتے۔ آپ نے شرف اور ربذہ کی زمینوں کو حمی قرار دیا[(۷)]۔ بنی ثعلبہ کے ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے کہا "اے امیر المومنینؓ آپ نے ہماری زمینوں کو حمی قرار دے دیا، حالانکہ یہ زمینیں وہ ہیں جن پر ہم زمانہ جاہلیت میں لڑتے رہے ہیں اور جب ہم مسلمان ہوئے، تو بھی یہ زمینیں ہمارے پاس تھیں۔ وہ شخص برابر یہ بات دہراتا رہا اور حضرت عمرؓ سر جھکائے رہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے سر اٹھایا اور فرمایا کہ "زمینیں اللہ کی ہیں اور لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ قسم بخدا اگر مجھ پر راہ خدا میں جہاد کی ذمہ داری نہ

---

(۱) عبدالرزاق ۴۰۱۰۳/۹، البیہقی ۷۲/۸، ۱۳۴ (۲) حنبل ۴۹/۱ (۳) عبدالرزاق ۴۰۳/۹ (۴) عبدالرزاق ۶۷/۷، جوزی ۱۹۲ (۵) حزم ۳۵۱/۹ (۶) عبید ۲۷۵ (۷) سعد ۳۰۵/۳۔

ہوتی تو میں ایک بالشت زمین بھی حمی قرار نہ دیتا[۱]۔" ابن قدامہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں نے اراضی کو حمی قرار دیا اور یہ بات سب صحابہؓ کو معلوم تھی' لیکن کسی نے اس کو رد نہیں کیا تو گویا اس پر اجماع ہو گیا[۲]۔ جن زمینوں کو آپ نے حمی قرار دیا' ان میں غریبوں اور ضرورت مندوں کیلئے خصوصی گنجائش رکھی۔ آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ مالدار شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے جانور حمی میں چرائے' البتہ تنگ دست کو حمی میں چرانے کا حق دیا جائے گا' تاکہ اس کی مدد ہو اور اس کے جانور ہلاک ہونے سے بچ جائیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنا ایک غلام جس کا نام ھنی تھا حمی کی دیکھ بھال کیلئے مقرر کیا تھا اور اس سے فرمایا تھا کہ "اے ھنی! مسلمانوں سے ہمدردی سے پیش آنا' مظلوم کی پکار سے ڈرنا کہ مظلوم کی دعا جلد قبول ہو جاتی ہے اور حمی میں کم اونٹوں والے اور کم بکریوں والے کو آنے دینا۔ البتہ عثمانؓ بن عفان اور عبدالرحمنؓ بن عوف کے جانوروں کو نہ آنے دینا کیونکہ ان کے جانور اگر بھوکے ہوں گے تو وہ نخلستان اور فصل میں لے جائیں گے لیکن جن لوگوں کے پاس چند اونٹ یا چند بکریاں ہیں' ان کے جانور اگر بھوکے مریں گے' تو وہ میرے پاس پکارتے ہوئے آ جائیں گے کہ "اے امیر المومنینؓ! اے امیر المومنینؓ! اور میں ان کے جانوروں کو گھاس اور پانی فراہم کروں' یہ میرے لئے اس سے زیادہ آسان ہے کہ میں اس کے بدلے میں ان کو سونا اور چاندی دوں[۳]۔"

آپ نے امانت و دیانت اور حزم و احتیاط کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا' اسے حمی کے معاملے میں پوری طرح برقرار رکھا۔ آپ کا خیال تھا کہ خلیفہ اور خلیفہ کے اہل و عیال میں سے کسی کو حمی میں اپنے جانور چرانے کا حق نہیں کیونکہ ان کیلئے ضروری ہے کہ ایسے مواقع سے دور رہیں جہاں تہمت لگنے کا امکان ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اونٹ خریدے اور انہیں حمی میں پہنچا دیا جب وہ موٹے ہو گئے تو میں انہیں لے کر آیا۔ حضرت عمرؓ بازار آئے اور فربہ اندام اونٹ دیکھ کر پوچھا کہ "یہ اونٹ کس کے ہیں؟" کسی نے بتایا کہ عبداللہ بن عمرؓ کے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "عبداللہ بن عمرؓ کے کیا کہنے' امیر المومنین کا بیٹا ہے۔ میں دوڑتا ہوا آپ کے پاس پہنچا اور پوچھا کہ "امیر المومنینؓ! کیا بات ہے؟" آپ نے پوچھا "یہ اونٹ کیسے ہیں؟" میں نے کہا کہ "کمزور دبلے اونٹ تھے میں نے خرید کر حمی میں بھیج دیئے' تاکہ جو نفع مسلمان حاصل کرتے ہیں میں بھی حاصل کروں۔" اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ "یہی کہا جاتا رہا ہو گا کہ امیر المومنین کے بیٹے کے اونٹ چراؤ' امیر المومنین کے بیٹے کے اونٹوں کو پانی پلاؤ۔ اے عبداللہؓ! اپنا اصل مال لے لو اور باقی مسلمانوں کے بیت المال کیلئے چھوڑ دو[۴]۔"

آپ ریاستی و سرکاری املاک کی حفاظت ذاتی املاک سے بڑھ کر کرتے تھے کیونکہ یہ تمام مسلمانوں کا مال تھا۔ ریاست کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس کی دیکھ بھال اور نگرانی آپ کا اہم منصبی فرض تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ حمی پر دست درازی کرنے والے کو سزا دیا کرتے تھے کیونکہ یہ مسلمانوں کی عام ملکیت پر دست درازی ہے۔ چنانچہ محمد بن زید سے مروی ہے کہ میرے دادا حضرت عثمان بن مظعونؓ کے مولیٰ تھے اور حضرت عثمانؓ کی اس زمین کی نگرانی کرتے تھے جس میں سبزیاں اور ککڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ حضرت عمرؓ کبھی کبھی چلچلاتی دوپہر میں اپنے سر پر کپڑا رکھ کر ہمارے پاس آتے اور حمی کے بارے میں نصیحت کرتے کہ نہ درخت کاٹا جائے اور نہ لکڑیاں چنی جائیں۔ پھر آپ میرے پاس بیٹھ جاتے اور میں آپ کو سبزی اور ککڑی کھلاتا۔ ایک دن آپ نے کہا کہ "میں دیکھتا ہوں کہ تم یہاں سے کہیں نہیں جاتے؟" میں نے کہا "جی" اس پر آپ نے کہا کہ "میں تمہیں یہاں کی اشیاء پر نگران مقرر کرتا ہوں' جس کو درخت کاٹتے اور لکڑی لیتے دیکھو اس کی کلہاڑی اور رسی ضبط کر لو۔" میں نے کہا کہ "اس کی چادر بھی لے لوں۔" آپ نے کہا کہ "نہیں[۵]۔"

(۱) عبید ۲۷۶ (۲) قدامہ ج ۹: ۵۱۹ (۳) بخاری ج ۴: ۳۳، طالب ۳: ۱۰۰۳، یوسف ص ۱۰۰، بلاذری ۱: ۴۳۲، عبید ۲۷۳ (۴) جوزی ص ۱۵۸ (۵) بلاذری ۱: ۴۲۔

٥..... کفالت عامہ:

کفالت عامہ سے مراد یہ ہے کہ دارالاسلام کی حدود کے اندر بسنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ یہ اہتمام اس درجہ تک ہونا چاہئے کہ کوئی فرد ان ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا 'لباس' مکان اور علاج لازماً شامل ہیں۔ ہر وہ ضرورت بنیادی ضرورت ہے جس کی تکمیل پر کسی انسان کی زندگی کی بقاء کا انحصار ہو۔ شریعت کی کسی نص میں ان ضرورتوں کی صراحت نہیں کی گئی۔ مگر خود یہ اصول نصوص سے ثابت ہے جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا۔ اس فقرہ میں جن چار ضرورتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی نوعیت یہ ہے کہ ان کی عدم تکمیل آدمی کی جان کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے۔ متعلقہ نصوص اور ان کے مطابق عمل کی نظیروں سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ کم از کم ان ضرورتوں کی تکمیل اس اصول کا لازمی تقاضا ہے۔ البتہ مخصوص حالات میں مخصوص افراد کیلئے اسی اصول کے تحت بعض دوسری ضرورتیں بھی یہی نوعیت اختیار کر سکتی ہیں۔ اس اصول کا منشاء یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی فرد ان تنظیمات کے باوجود اس حال میں پایا جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہو' تو بالآخر اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ فرد ان وسائل حیات سے محروم نہ رہے' جو ضروریات زندگی کی تکمیل کیلئے درکار ہیں۔ ریاست کو ایسا نظم قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم کر کے بآسانی اور بلا تاخیر اجتماعی خزانے سے بقدر ضرورت مال حاصل کر سکیں اور دارالاسلام کا کوئی باشندہ بھوکا' پیاسا' ننگا' بے ٹھکانا اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے[۱]۔

اسلام نے کفالت عامہ کو یقینی بنانے کیلئے جہاں ایک فرد کو معاشی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینے اور کسب حلال کیلئے کاوش کرنے کی ترغیب دی ہے۔ وہاں زکوٰۃ' صدقات' وراثت' وصیت' عاریت' قرض حسن اور فطرانہ جیسے اصولوں کے ذریعے ایک دوسرے کی معاونت کیلئے معاشرے کے افراد کو متحرک کیا ہے۔ علاوہ ازیں نفقات' کفارات اور دیت کے ضابطے بھی اپنی اصل روح اور اثرات کے اعتبار سے کفالت عامہ کا باعث بنتے ہیں۔ جہاں تک اس سلسلے میں ریاست کے ایسے بھرپور اور وسیع کردار کا تعلق ہے' جو دور جدید کیلئے ایک واضح فلاحی ورفاہی حکمت عملی کی بنیاد بن سکے۔ وہ فاروق اعظمؓ ہی کی فکر و عمل سے ہمیں ملتا ہے۔ آپ نے اپنی بصیرت سے اسلامی اصول و ضوابط کی روح کو سمجھا اور اجتہاد کے ذریعے اور دی شکل دے کر تاریخ انسانی میں سب سے پہلے کفالت عامہ کو بالآخر ریاست کی اہم ذمہ داری بنا دیا۔ آپ نے اپنے اقوال' خطبات' پالیسیوں اور عملی اقدامات کے ذریعے کفالت عامہ کا جامع اور ہمہ گیر تصور پیش کیا۔ دراصل آپ کو مفلسوں اور ضرورت مندوں کا بہت زیادہ احساس تھا۔ آپ کے فرزند حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اکرم ﷺ جب بھی مجھے کوئی عطا دیتے تو میں عرض کرتا "اسے اس شخص کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہے۔" ایک مرتبہ آپؐ نے مجھے مال دیا' تو میں نے وہی کہا کہ "اسے مجھ سے زیادہ حاجت مند کو دے دیجئے۔" آپؐ نے ارشاد فرمایا "اسے لے لو اپنے کام میں بھی لاؤ اور صدقہ بھی کرو۔ اس مال میں سے جو بھی تمہیں ملے' جس کا نہ تم نے طمع کیا ہو نہ ہی سوال کیا ہو تو اسے لے لیا کرو اور جو نہ ملے اس کے پیچھے مت پڑا کرو[۲]۔" آپ اپنے نفس کو حکومت واقتدار کے غرور سے پاک رکھنے کیلئے اپنی مفلسی کے دور کو یاد کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ منبر پر چڑھے لوگوں کو جمع کیا اللہ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا "اے لوگو! میں نے آپ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ میرے لئے پھل نہ تھے کہ لوگ کھاتے' سوائے اس کے کہ بنو مخزوم میں میری چند خالائیں تھیں' جنہیں میں میٹھا پانی پلاتا تھا تو وہ میرے لئے چند مٹھیاں کشمش جمع کر دیتی تھیں۔" پھر منبر سے اتر آئے' پوچھا گیا "یا امیر المومنین اس سے آپ کا کیا مقصد ہے؟" فرمایا "میں نے اپنے دل میں کچھ محسوس کیا تو چاہا کہ اسے کم کر دوں[۳]۔"

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مجلہ: ۲/۹۳-۹۲ (۲) نسائی ۵/۱۰۲ (۳) مسند ۳/۲۹۳

یہی بات ان کے دل میں ایک طرف تو غریبوں کا احساس پیدا کرتی اور دوسری طرف اللہ کے شکر کا جذبہ۔ اسی کی وجہ سے آپ جود و سخا کے پیکر بن گئے۔ حضرت عبداللہؓ نے آپ کے خادم اسلم سے کہا "مجھے عمرؓ کے متعلق حالات بتاؤ۔" انہوں نے بتائے' تو فرمایا "میں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کبھی کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا' جو اتنا زیادہ کوشش کرنے والا اور اتنا زیادہ سخی ہو کہ عمرؓ سے بڑھ جائے"[۱]۔ "جب آپ پر خلافت کی ذمہ داری ڈال دی گئی۔ آپ کی سخاوت کو چار چاند لگ گئے' آپ جب پہلے خطبے کیلئے منبر پر چڑھے' تو سب سے پہلی بات جو آپ نے فرمائی' وہ یہ تھی تین کلمات ہیں' جب میں کہوں تو تم لوگ آمین کہو' اے اللہ میں ضعیف ہوں مجھے قوی کر دے' اے اللہ میں سخت ہوں مجھے رحم کر دے' اے اللہ میں بخیل ہوں' مجھے سخی کر دے"[۲]۔ "آپ نے حکومتی وسائل ہاتھ میں آتے ہی غریبوں' مفلسوں اور ضرورت مندوں کیلئے وقف کر دیئے۔ رات دن اسی کوشش میں لگے رہے کہ کفایت عامہ کا اہتمام کریں۔ جابیہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے مجھے اس تمام مال و دولت کا امین و خازن اور قاسم بنایا ہے۔ حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ ہی بانٹتا ہے۔ میں سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کے اہل بیت یعنی ازواج مطہرات سے تقسیم زر و مال کا کام شروع کرتا ہوں"[۳]۔"

قادسیہ کے عظیم معرکہ میں جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی' تو آپ منبر پر چڑھے اور لوگوں کو اپنی تقریر میں فتح کی بشارت دی اور فرمایا "مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کوئی ضرورت دیکھوں' اسے پورا کر دوں' جب تک ہم سب مل کر اسے پورا کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں۔ جب ہمارے اندر اتنی گنجائش نہ رہ جائے' تو ہم باہمی امداد کے ذریعہ گزر اوقات کریں گے۔ یہاں تک کہ سب کا معیار زندگی ایک سا ہو جائے۔ کاش تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کتنا خیال ہے' لیکن میں یہ بات تمہیں عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں۔ خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو اپنا غلام بنا کر رکھوں' بلکہ خدا کا بندہ ہوں (حکمرانی کی یہ) امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اس کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھوں بلکہ (تمہاری چیز سمجھ کر) تمہاری طرف واپس کر دوں اور (تمہاری خدمت کیلئے) تمہارے پیچھے پیچھے چلوں' یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو میں تمہارے ذریعہ فلاح پاؤں گا اور اگر میں اسے اپنا بنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور (اپنے حقوق کے مطالبہ کے لئے) اپنے گھر آنے پر مجبور کر دوں تو تمہارے ذریعہ میرا انجام خراب ہو گا (دنیا میں) کچھ عرصہ میں خوشی مناؤں گا مگر (آخرت میں) عرصہ دراز تک غمگین رہوں گا۔ میرا حال یہ ہو گا کہ نہ کوئی مجھ سے کچھ کہنے والا ہو گا نہ کوئی میری بات کا جواب دے گا کہ میں اپنا عذر بیان کر کے معافی حاصل کر سکوں"[۴]۔ "آپ کا یہ وہ درخشندہ تصور ہے جس نے حکمران کو حقیقی معنوں میں خادم بنا دیا' خلافت و بادشاہت کے بنیادی فلسفے اور نظام کے فرق و امتیاز کو واضح کیا' بجائے اس کے کہ اپنی ضروریات سے مجبور ہو کر لوگ حکمرانوں کے پیچھے پیچھے پھریں' حکمرانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ گھروں میں بیٹھے ہوئے ان کی کفالت کا انتظام کریں۔ اس کے پیچھے جذبہ و ارادہ کیا کار فرما ہو' حسب ذیل روایت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ عمر بن الخطاب نے فرمایا کہ "میں لوگوں کو اتنا زیادہ دوں گا جتنا زیادہ مال ہو گا۔ میں اسے ان کیلئے شمار کروں گا اور اگر اس نے مجھے تھکا دیا' تو اسے ان کیلئے پیمانے سے ناپ کر دوں گا' اگر اس نے بھی تھکا دیا تو لپ بھر کر بغیر حساب کے دوں گا"[۵]۔ "آپ نے اپنے ایک عامل حضرت حذیفہ کو لکھا کہ لوگوں کو ان کی عطائیں اور تنخواہیں دے دو۔ انہوں نے جواب دیا "ہم نے یہ کر دیا ہے اور بہت کچھ بچ گیا ہے۔" حضرت عمرؓ نے لکھا کہ وہ غنیمت جو اللہ نے عطا فرمائی ہے نہ عمرؓ کی ہے اور نہ آل عمر کی' اسے بھی انہی میں تقسیم کر دو"[۶]۔ "یہ ساری سرگرمی دکھانے کے باوجود آپ پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ آپ کی تعریفوں کے گن گائیں' واہ واہ کے ڈونگرے برسائیں اور آپ کی شہرت کو چار چاند لگیں' بلکہ آپ ان تمام باتوں سے ماورا ہو کر اسے فرض منصبی کے طور پر ادا کرتے تھے۔ اس کا کوئی مادی بدلہ کسی شکل میں لینے

(۱) سعد ۳/۲۹۳ (۲) سعد ۳/۲۱۰ (۳) جوزی ا/۱۵۰ (۴) کنز ۱۱/۷/۴۶ (۵) سعد ۳/۳۰۳ (۶) ایضاً ۳/۲۹۹ سیوطی ۱۴۴

کے روادار نہیں تھے۔ یہ آپ کے خلوص اور معیار اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ عصر حاضر میں اعلیٰ مناصب پر متمکن لوگوں کو چاہئے کہ اس کی پیروی کریں۔ فارس کے علاقے سے اہم فتوحات کے بعد خالد بن عرفطہ العذری حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو آپ نے حسب عادت وہاں کے لوگوں کا حال دریافت کیا' تو انہوں نے عرض کیا "اے امیر المومنینؓ! میں نے اپنے پیچھے والوں کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ وہ ان کی عمروں میں سے کچھ لے کر آپ کی عمر بڑھا دے۔ پھر وہاں کے وظائف کی تفصیل بیان کی۔" آپ نے سن کر فرمایا "فالله المستعان جو انہیں دیا گیا وہ ان کا حق ہے' میں اسے ادا کرنے کیلئے مستعد ہوں' جن میں وہ بھی ہے جو اسے لے بیٹا ہے۔ اس پر میری مدح نہ کرو کیونکہ جو تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ خطاب کا مال نہیں ہے"[1]۔ "کہاں فاروق اعظمؓ کا یہ اسوہ اور کہاں دور جدید کے رہنماؤں کا یہ عمل کہ قومی خزانے کو تو کیا زکوٰۃ کی مد سے حاصل ہونے والی آمدنی کو بھی ذاتی ملکیت سمجھ کر حسب منشاء اقربا و پروری پر لٹایا جاتا ہے۔ اگر معمولی حصہ مستحقوں تک پہنچے' تو اسے بھی نمود و نمائش اور پبلسٹی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

آپ کا یہ حال تھا کہ آپ بیٹے اور اپنے خاندان وقبیلے والوں پر بھی عام لوگوں کو ترجیح دیتے تھے جس کی بے شمار مثالیں ہیں' ان میں سے ایک میں ہے کہ ایک بار فضیل بن عیاض خود اپنے ہی نفس کو ملامت کر رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "اے شخص تو کس منہ سے بات کرتا ہے' یہ حق تو صرف عمرؓ بن الخطاب کو پہنچتا تھا۔" وہ خود تو معمولی غذاؤں پر قانع رہتے اور دوسروں کو لذیذ کھانے کھلاتے' وہ خود موٹا جھوٹا پہنتے اور دوسروں کو نرم و نازک لباس عطا کرتے' وہ لوگوں کو ان کے حقوق بھی دیتے تو بڑھ چڑھا کر دیتے۔ ایک بار انہوں نے ایک شخص کو چار ہزار درہم بطور روزینہ کے دی تو معاً اس میں ایک ہزار کا اضافہ کر دیا اور جب کسی نے کہا کہ اپنے بیٹے عبداللہ کا روزینہ بھی بڑھا دیجئے' تو فرمایا "اس شخص کا باپ احد کے معرکہ میں ابن عمرؓ کے باپ سے زیادہ ثابت قدم رہا تھا"[2]۔

کفالت عامہ کا انتظام اس وقت تک صحیح طور پر نہیں ہو سکتا' جب تک سربراہ حکومت کو لوگوں کی تکالیف' مشکلات اور حاجات وضروریات کا' اچھی طرح علم نہ ہو۔ فاروق اعظمؓ باخبر رہنے کیلئے اس وقت کے تمام وسائل وذرائع استعمال کرتے تھے' لوگوں سے انفرادی ملاقاتوں' خطوط' چلتے پھرتے' تبادلہ خیال' شکایات کی سماعت' تحقیق و تفتیش' آنے والے وفود سے معلومات لیتے۔ اس طرح سلطنت کے طول و عرض کے عوام کی معاشی حالت کا' انہیں اچھی طرح اندازہ ہوتا تھا' اس کی روشنی میں حکمت عملی وضع فرماتے تھے۔ آپ نے متعدد دوروں میں بھی بطور خاص لوگوں کے حالات کا جائزہ لیا۔ آپ کے پاس وسیع معلومات تھیں' لیکن پھر بھی آپ مطمئن نہیں تھے اور یہ چاہتے تھے کہ ایک ایک مقام کا نہایت تفصیل سے دورہ کریں۔ اس کے نمایاں مقاصد کیا ہوں گے؟ حسب ذیل روایت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے "اگر میں زندہ رہا' ان شاء اللہ تو ایک سال تک رعایا کے درمیان دورہ کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عوام کی بعض ضروریات ایسی ہیں جن کی خبر مجھ تک نہیں پہنچ پاتی۔ ان کے مقامی حاکم مجھے ان کی ضروریات سے باخبر نہیں رکھتے اور خود وہ لوگ مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں پہلے شام جاؤں گا اور دو ماہ وہاں ٹھہروں گا' پھر الجزیرہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینہ قیام کروں گا' پھر مصر جاؤں گا اور وہاں بھی دو مہینہ تک رہوں گا' پھر بحرین جاؤں گا اور دو مہینہ وہاں رہوں گا' پھر کوفہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینہ قیام کروں گا' پھر بصرہ جاؤں گا اور دو ماہ وہاں ٹھہروں گا۔ خدا کی قسم! یہ سال کتنا اچھا ہوگا"[3]؟

آپ کا یہ دورہ خاص لوگوں کی حاجات وضروریات سے آگہی حاصل کر کے ان کی کفالت کرنے کیلئے ہوتا تھا' لیکن شہادت نے آپ کو مہلت نہ دی' لیکن دور دراز سے آنے والے لوگوں کی ضروریات کا جب بھی آپ کو پتہ چلا' آپ نے فوری طور پر ان کی مدد فرمائی۔ ایک مرتبہ آپ نے بصرہ کے عامل حضرت عتبہؓ کو لکھا کہ دس آدمیوں کا وفد بھیجیں' تاکہ وہ ان سے وہاں کے حالات معلوم کریں۔ چنانچہ انہوں نے وفد بھیج دیا' وہ جب پہنچا تو وہاں اور بھی کئی وفود آئے ہوئے تھے۔ آپ نے حکم

---

(1) سیوطی: ۱۴۴ (2) جوزی: ۷۷ (3) طبری ۵: ۲۰۱' جوزی: ۱۲۳۔

دیا کہ سب مل کر اپنی ضروریات کے پیش کریں' چنانچہ بہت سے لوگوں نے معاشی حالات کے بارے میں بتایا۔ اس موقع پر احنف بن قیس نے کہا "اے امیر المومنینؓ! آپ کی وہی حیثیت ہے جیسا کہ انہوں نے بیان کی البتہ کبھی کبھی ہم آپ کو وہ خبریں نہیں پہنچا سکتے جن پر عوام کا مفاد وابستہ ہے۔ اس وقت حاکم نظروں سے اوجھل باتوں پر مخبروں کے نقطہ نظر کے مطابق ہی غور کر سکتا ہے اور جو بات وہ سنتے ہیں اس کے مطابق اسے علم حاصل ہوتا۔ ہم لوگ منزل بمنزل فروکش ہوتے رہے یہاں تک کہ ہم ایک خشکی کے حصے میں مقیم ہوئے۔ ہمارے بھائی اہل کوفہ ایک نہایت ہی عمدہ مقام پر آباد ہیں' جہاں شیریں چشمے اور سرسبز باغات ہیں۔ انہیں ہر قسم کے پھل میسر ہیں' مگر ہم اہل بصرہ نہایت خراب اور دلدلی زمین میں آباد ہیں۔ اس کا ایک حصہ جنگل میں ہے اور ایک حصہ کھاری سمندر کے قریب ہے۔ ہمارے گھر آدمیوں سے بھرے ہوئے ہیں اور ہماری تعداد زیادہ ہے' مگر ہمارا وظیفہ بہت کم ہے۔ ہمارے اندر شرفاء کی تعداد کم ہے اور مصیبت زدہ لوگ زیادہ ہیں۔ ہمارا سکہ (درہم) بڑا ہے' مگر ہمارا پیانہ چھوٹا ہے۔ اللہ نے تمہیں وسعت دی ہے اور ہماری اراضی میں اضافہ کیا ہے' لہٰذا اے امیر المومنینؓ! آپ ہمارے وظائف میں اضافہ کریں اور ہمیں مزید اراضی دیں' تاکہ ہم بسر اوقات کر سکیں۔"

اس پر حضرت عمرؓ نے ان کے گھروں اور بستیوں کے بارے میں تحقیقات کی اور انہیں مزید اراضی اور جاگیریں دیں۔ کچھ اراضی کسریٰ کے خاندان کی تھی جو دریائے دجلہ اور حجر کے درمیان تھی' اسے انہوں نے تقسیم کر لیا تھا۔ باقی شاہی زمینیں اسی حال پر رہیں جس حال میں اہل کوفہ کے قریب کی شاہی اراضی تھی۔ یوں اہل بصرہ کی جاگیریں اس کے دو حصے ہو گئے تھے ان کا نصف حصہ لوگوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور نصف حصہ لشکر کیلئے اور جماعتی تقاریب کیلئے چھوڑ دیا گیا تھا[1]۔ آپ لوگوں کو بھی باہمی ہمدردی و مدد اور کفایت شعاری کی تلقین کرتے تھے تاکہ سب کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔ بصرہ کے وفد سے بات چیت کے بعد آپ نے ایک کپڑا دیکھا اس کو سونگھا پھر فرمایا "یہ کس کا ہے؟" حضرت احنفؓ نے کہا "میرا ہے۔" آپ نے فرمایا "تم نے یہ کتنے میں خریدا؟" انہوں نے کہا "تقریباً آٹھ (درہم) اس کی قیمت بتائی اور اصل قیمت سے کچھ کم رقم بتائی کیونکہ انہوں نے بارہ درہم میں اسے خریدا تھا۔" آپ نے فرمایا "تم نے اس سے کم کا (سستا) کیوں نہیں خریدا؟ تم اس زائد رقم سے کسی مسلمان کو فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ تم فضول خرچی سے بچو تاکہ تم جانی اور مالی فائدہ حاصل کر سکو۔ اسراف مت کرو ورنہ تمہیں جانی اور مالی دونوں صورتوں میں نقصان ہوگا[2]۔"

فضیل بن عمیرہ کہتے ہیں احنفؓ بن قیس عراق سے ایک وفد لے کر امیر المومنینؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہوا بے حد گرم تھی امیر المومنینؓ نے اپنے جسم پر چادر لپیٹ رکھی تھی اور صدقہ کے اونٹ کے جسم پر تیل کی مالش کر رہے تھے۔ احنف کو دیکھا تو کہا "احنف ذرا ادھر تو آؤ اس کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ یہ اونٹ صدقہ میں آیا ہے اس پر یتیموں' مسکینوں اور بیواؤں کا حق ہے۔" ایک آدمی بول اٹھا "امیر المومنینؓ! مرنے کے بعد اللہ آپ کو مغفرت سے نوازے' آپ کسی دوسرے بندہ کو' جو صدقہ کے عطیات کی دیکھ بھال پر مامور ہے کیوں نہیں حکم دیتے کہ وہ آپ کی مدد کرے۔" "مجھ سے اور احنف سے زیادہ بڑا خدمت گزار کون ہوگا؟ مسلمانوں کی قیادت اور ولایت کا مطلب ہی یہی ہے کہ ان کی خدمت کی جائے۔ جن والیوں کو تو مسلمانوں کی ایسی ہی خدمت کرنی چاہیے جیسے کہ ایک خادم اپنے سید اور اپنے آقا کی خدمت کرتا ہے[3]۔" کلبی روایت کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت عمرؓ اپنی چادر میں کنکریاں بھر کر اسے سر کے نیچے رکھے ہوئے مسجد میں سو رہے تھے کہ ایک پکارنے والے نے یا عمرؓ' یا عمرؓ پکارنا شروع کیا۔ آپ چونک کر اٹھے اور آواز کی سمت میں دوڑ پڑے۔ دیکھا ایک اعرابی اپنے اونٹ کی نکیل تھامے کھڑا ہے اور اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ جب اس نے حضرت عمرؓ کو دیکھا تو لوگوں نے اسے بتایا کہ یہی امیر المومنینؓ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ "تجھے

---

(۱) [illegible] (۲) طبری [illegible] (۳) [illegible]

کس نے ستایا؟ آپ نے سمجھا کہ وہ کوئی ستم رسیدہ ہے۔ "وہ اٹھ کر (اپنا حال) بیان کرنے لگا۔ چند اشعار پیش کئے' جن میں قحط کی شکایت کی۔ حضرت عمرؓ ہاتھ سر پر رکھ کر چیخے "ہائے عمر! ہائے عمر! لوگو تم سمجھے یہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ قحط اور خشک سالی کا ذکر کر رہا ہے۔ عمر شکم سیر ہو کر کھاتا اور پیتا ہے اور مسلمان قحط و مصیبت میں گرفتار ہیں! کون ہے جو ان لوگوں کو رسد اور کھجوریں اور ان کی ضرورت کی دوسری چیزیں پہنچائے؟" چنانچہ آپ نے دو انصاری افراد کو بہت سے اونٹوں کے ساتھ جن پر اجناس اور کھجوریں لدی ہوئی تھیں روانہ کیا۔ وہ یمن گئے اور اپنے ساتھ جو کچھ لے گئے تھے اسے وہاں تقسیم کر دیا[1]۔ عدی بن حاتم ایک بار حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے قبیلے کے لوگ تھے' وہ کہتے ہیں "جس وقت ہو طے کیلئے مال غنیمت سے روزینہ مقرر کرنے کا وقت آیا تو سب سے پہلے میں امیر المومنینؓ کے روبرو آ گیا مگر انہوں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ میں اب کے بار دوسری طرف سے ان کے سامنے آیا اب کے بھی وہ مڑ گئے۔ "میں نے کہا "امیر المومنینؓ! آپ مجھے نہیں پہچانتے؟" انہیں دفعتہ زور کی ہنسی آ گئی اور وہ ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے اور فرمایا "کیوں نہیں' کیوں نہیں۔ میں تم کو خوب جانتا ہوں' تم اس وقت ایمان لائے تھے' جب لوگوں نے انکار کیا تھا' تم اس وقت آگے بڑھے تھے جب دوسرے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ تم نے اس وقت وفا کی تھی جب دوسروں نے غداری کی تھی اور تمہارا ہی لایا ہوا قبیلہ طے کا صدقہ اور چندہ تو تھا' جس نے روئے انورؐ پر شادمانی اور مسرت بکھیر دی تھی۔ یہ سب کچھ سہی مگر میں نے پہلے ان لوگوں کا خیال رکھا ہے جو فاقوں سے نڈھال ہو چکے ہیں اور ان لوگوں کو جو کچھ دیا جائے گا یقینی ان قبائل کے سرداروں کو' وہ ان کے ذریعہ غریبوں تک پہنچ جائے گا[2]۔"

کفالت عامہ کے فریضہ کی عملاً انجام دہی کی متعدد مثالیں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ملتی ہیں۔ جب آپ شام تشریف لے گئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بڑے مؤثر انداز میں آپ کو یہ بتایا کہ عوام بھوک سے پریشان ہیں۔ آپ نے فوراً مقامی حکام کو حکم دیا کہ ہر مسلمان کیلئے بقدر کفایت غذائی اجناس فراہم کریں[3]۔ "دارالخلافہ سے دور دراز علاقوں میں رہنے والے عوام کی کفالت آپ عمال ہی کے ذریعے کر سکتے تھے اس لئے انہیں بار بار اس کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ ابو عثمان سے روایت ہے کہ جب ہم آذربائیجان میں تھے' تو حضرت عمرؓ نے ہمیں خط لکھا اس میں تھا "اے عتبہ بن فرقد (گورنر) یہ جو مال تیرے پاس ہے نہ تیرا کمایا ہوا ہے نہ تیرے باپ کا' نہ تیری ماں کا' تو اس سے مسلمانوں کو ان کے ٹھکانوں پر سیر کر کے کھلا' جس طرح تو اپنے ٹھکانے پر سیر ہوتا ہے (علاوہ ازیں) عیش کوشی اہل شرک کی وضع اور ریشمی کپڑا پہننے سے بچو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے' سوائے دو انگل حریر کے آپ نے بیچ والی انگلی کو درمیانی انگلی سے ملا کر بتایا تھا[4]۔ "۱۷ھ میں آپ نے بصرہ کی گورنری سے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو ہٹا کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو حاکم مقرر کیا اور اہل بصرہ کو خط لکھا جو وہاں مجمع عام میں پڑھ کر سنایا گیا' اس میں تھا "میں نے ابو موسیٰ کو تمہارا امیر مقرر کیا ہے' تاکہ تمہارے طاقتوروں سے تمہارے کمزوروں کیلئے حق حاصل کریں۔ تمہارے ساتھ مل کر تمہارے دشمنوں سے جنگ کریں' تمہاری ذمہ داریاں ادا کریں' تمہاری غنیمت تمہارے لئے اکٹھی کریں اور اسے تمہارے درمیان تقسیم کریں (ایک روایت میں یہ بھی ہے) اور تمہارے راستوں کو صاف کریں[5]۔"

گویا ان کی ذمہ داریوں میں سے طاقتوروں کے غصب کردہ ہر قسم کے حقوق بھی تھے جو زیادہ تر مالی و معاشی ہوتے ہیں' تاکہ رعایا کو فراخی نصیب ہو' ان کے مال و اسباب محفوظ رہیں' اس کے علاوہ سے اوپر جو بھی ذمہ داریاں ہیں ان میں بھی معاشی ذمہ داریاں شامل ہیں' وہ خود بھی ادا کریں اور ساتھ ساتھ مال و اسباب اور غنائم اکٹھی کر کے ان میں منصفانہ طور پر تقسیم کر کے کفالت عامہ کا اہتمام کریں اور معاشی ترقی کیلئے نقل و حمل کے ذرائع بہتر کریں۔ اسی طرح آپ نے لشکروں کے امراء

---

(۱) حوری ۷۳/۱ (۲) بست (۳) عبید ۲۹۲ (٤) مسند ۱۴۰۰۶ حنبل ۱۹۴/۱ (۵) طبری ۷۱/۵ کثیر ۸۲/۷

(سپہ سالاروں) کے نام بھی خطوط ارسال فرمائے اور ان میں لکھا "مسلمانوں کو مار کر ذلیل نہ کرنا، انہیں محروم کر کے نافرمان نہ بنانا، انہیں محتاج بنا کے فتنے میں نہ ڈالنا اور نہ ہی انہیں جھاڑیوں میں اتار کر ضائع کرنا"[1]۔ "یہ ہدایات بھی نہایت جامع اور بصیرت افروز ہیں۔ آپ نے اس حقیقت کو نہایت خوبصورت الفاظ میں واضح فرمایا کہ معاشی محرومی و ناانصافی، رعایا کو نافرمان بنا دیتی ہے اور ان کے دلوں سے حکومت سے محبت و اطاعت کے جذبوں کو ختم کر دیتی ہے اور محتاجی دین و ایمان ہی کو آزمائش میں ڈال دیتی ہے۔ ان دونوں باتوں سے انہیں محفوظ رکھنا۔ اہل اقتدار کی بنیادی ذمہ داری ہے' جب آپ یہ دیکھتے تھے کہ کسی نے اس سلسلے میں کوتاہی کی ہے' تو اس کے مقام و مرتبے کی پرواکئے بغیر اسے معزول کر دیتے تھے۔ جابیہ میں تقریر کے دوران لوگوں نے حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی پر اعتراض کیا' تو آپ نے معذرت کرتے ہوئے اس کی ایک وجہ یہ بتائی کہ "میں نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ غنیمت کا مال کمزور مہاجرین کیلئے رکھ چھوڑیں' لیکن انہوں نے زور آور' صاحب شرف اور زبان آور لوگوں کو دے دیا"[2]۔

نہاوند کے معرکے میں سپہ سالار حضرت نعمان بن مقرن نے السائب کو غنائم کا والی مقرر کیا اور انہیں ہدایت کی کہ جھوٹ بات مجھ تک نہ پہنچانا اور نہ ہی کسی کا حق مارنا۔ السائب کہتے ہیں کہ میں نے جنگ کے بعد غنیمت جمع کی اور اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا' اتنے میں میرے پاس ایک جاسوس آیا اور اس نے خبر دی کہ نخیر خان کا خزانہ قلعہ کے اندر ہے' چنانچہ میں قلعہ پر چڑھا' دو صندوق دیکھے جن میں جواہر تھے۔ میں نے ان جیسے کبھی نہ دیکھے تھے' دونوں صندوق ان سے بھرے ہوئے تھے۔ میں عمرؓ کے پاس مدینے آیا' ابھی ان تک فتح کی خبر نہیں پہنچی تھی اور وہ مدینہ منورہ میں گھوم رہے تھے اور لوگوں سے پوچھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا "ارے کمبخت کہ تو سہی وہاں کیا حال ہے؟" میں نے جنگ کے واقعات سنائے' نعمان کی شہادت اور ان دونوں صندوقوں کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا "انہیں لے جاؤ اور بیچ کر ان کی قیمت مسلمانوں میں تقسیم کر دو"[3]۔ "ضرورت مندوں کی عزت افزائی بہت ضروری ہے' تاکہ وہ پورے اعتماد اور امید سے حاجت پیش کر سکیں' اس لئے آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا "لوگ (تمہارے پاس) اپنی ضروریات پیش کرتے رہیں گے' اس لئے جو کوئی تمہارے پاس حاجت روائی کیلئے آئے' تم اس کی عزت کرو' ایک کمزور مسلمان کے سلسلے میں عدل کیلئے یہی کافی ہے کہ فیصلوں اور تقسیم میں اس کے ساتھ انصاف کیا جائے"[4]۔ "ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ایک وفد کے ساتھ آپ سے ملاقات کیلئے آئے' تو آپ نے انہیں ہدایت فرمائی "الا واوسعوا الناس فی بیوتھم واطعموا عیالھم"[5]۔" (سنو لوگوں کے گھر میں ان کیلئے فراخی کا سامان فراہم کرو اور ان کے متعلقین کو کھلانے کا سامان کرو۔)

آپ کی اس پالیسی کا نتیجہ تھا کہ دور دراز علاقوں کے لوگوں کی بھی کفالت کا انتظام ہوتا رہتا تھا۔ آپ کے دل میں رعایا کا جو احساس تھا' وہ آپ کے عمال کے اندر بھی پوری طرح جلوہ گر تھا۔ آپ ایسے ہی لوگوں کا تقرر فرماتے تھے' جو آپ کے ہم خیال و ہم رکاب ہوں۔ آپ وقتاً فوقتاً ان کا امتحان بھی لیتے رہتے' تاکہ آپ کو یہ اطمینان ہو کہ وہ بھی رعایا کے' آپ ہی کی طرح مخلص و خیر خواہ ہیں۔ اس کا اندازہ اس روایت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مالک الدار سے مروی ہے "عمر بن الخطابؓ نے چار سو درہم ایک تھیلی میں رکھ کر پیش خدمت کو دیئے کہ وہ یہ رقم ابو عبیدہؓ بن الجراح کو دے آئے اور تھوڑی دیر ان کے مکان میں انتظار کرے اور یہ دیکھے کہ وہ اس رقم کا مصرف کیا کرتے ہیں۔" پیش خدمت نے ایسا ہی کیا' یعنی ابو عبیدہؓ کو یہ رقم پہنچا دی۔ انہوں نے امیر المومنینؓ کو دعائیں دیں' پھر اپنی ایک لونڈی کی معرفت کسی کو سات درہم اور کسی کو پانچ درہم بھجوانے شروع کئے' یہاں تک کہ رقم ٹھکانے لگا دی گئی۔ غلام حضرت عمرؓ کے پاس لوٹا اور پورا ماجرا سنایا۔ اب اتنی ہی رقم معاذ بن جبلؓ کیلئے بھی روانہ کی گئی۔ اس بار بھی غلام کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ یہ دیکھنے کیلئے معاذؓ کے گھر رک جائے کہ وہ اس رقم کو کیسے خرچ کرتے ہیں۔ انہوں

---

(۱) سعد ۳: ۲۸۱ (۲) کنز ... (۳) ... (٤) طبری ۳: ۲۰۳ (۵) ... ۱۰۹۔

نے پہلے تو امیر المومنین کیلئے کلمات خیر کہے اور پھر اپنی لونڈی کو مختلف گھروں کی طرف روانہ کرنے لگے۔ درہم تقسیم ہو رہے تھے کہ معاذؓ کی بیوی آئیں اور کہنے لگیں "ارے ہم بھی تو نادار و قلاش ہیں' کچھ ہمیں بھی تو دو۔" چار ہزار درہم میں دو درہم بچ رہے تھے' شوہر نے یہ دو درہم بیوی کی طرف پھینک دیئے۔ غلام نے یہ سارا قصہ امیر المومنینؓ کو کہہ سنایا۔ آپ مسرور و شاداں ہوئے اور فرمایا "یہ حضرات ایک دوسرے سے بھائیوں جیسا برتاؤ کرتے ہیں[1]۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے بعض عمال ایسے بھی تھے' جو صرف سرکاری خزانے ہی سے نہیں' بلکہ ذاتی مال مفلسوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ ایک حکمران کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہوتی ہے کہ اس کی پوری ٹیم افکار و اعمال میں اس سے پوری مطابقت رکھتی ہو۔ معروف مورخ مسعودی کے بقول "آپ کے جملہ عمال' افعال و اخلاق میں آپ کی پیروی کرتے تھے۔ وہ سب کے سب آپ کے سامنے آپ ہی کی طرح کے نظر آتے تھے[2]۔"

اب تک کی روایات میں ان لوگوں کی کفالت کیلئے آپ کے اقدامات و انتظامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے' جو دار الخلافہ سے دور رہائش پذیر تھے۔ جہاں تک مدینے اور اس کے گرد و نواح کی رعایا کی کفالت عامہ کا تعلق ہے' اس سلسلے میں آپ نے جو درخشندہ سوہ چھوڑا ہے' دنیا کا کوئی حکمران آج تک اس کے عشر عشیر تک نہیں پہنچ سکا' لیکن عصر حاضر میں ایک اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کیلئے ضروری ہے کہ ان رہنما خطوط پر ایسے ادارے تشکیل دیئے جائیں' جو کفالت عامہ کیلئے ان ذمہ داریوں کو مل کر سر انجام دیں' جنہیں فاروق اعظمؓ نے تنہا نبھایا' لیکن یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا' جب تک حکمران وقت اس جذبہ و احساس سے سرشار نہ ہو جس نے آپ کو رات دن سرگرم عمل رکھا۔ ان اداروں کی کارکردگی ایسے ہی حکمران کی متحرک و موثر نگرانی و سرپرستی کی مرہون منت رہے گی۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب جب نماز پڑھ چکتے تو لوگوں کیلئے بیٹھ جاتے تھے۔ کوئی اپنی حاجت پیش کرتا' تو اس پر غور کرتے تھے۔ انہوں نے کچھ نمازیں پڑھیں جن کے بعد نہیں بیٹھے۔ میں دروازے پر گیا اور پوچھا "اے یرفا (آپ کا خادم)۔" یرفا آیا' تو میں نے پوچھا "کیا امیر المومنینؓ کو کوئی بیماری ہے؟" اس نے کہا "نہیں!" ہم اسی گفتگو میں تھے کہ حضرت عثمانؓ آگئے' یرفا اندر چلا گیا۔ پھر وہ ہمارے پاس آیا اور کہا "اے ابن عفانؓ کھڑے ہو جاؤ' اے ابن عباسؓ کھڑے ہو جاؤ۔" ہم دونوں عمرؓ کے پاس گئے' ان کے آگے مال کا ڈھیر لگا ہوا تھا' ہر ڈھیر پر گوشت کا ایک دست تھا۔ فرمایا کہ "میں نے غور کیا تو مدینے میں تم دونوں سے زیادہ خاندان والا کسی کو نہیں دیکھا' تم دونوں اس مال کو لوگوں میں تقسیم کر دو۔ اگر کچھ بڑھے تو واپس کر دینا[3]۔"

لوگوں کی خبر گیری اور کفالت عامہ کیلئے آپ کا سب سے محبوب و مشہور طریقہ راتوں کو گشت کرنے کا تھا۔ جب رعایا میٹھی نیند سو رہی ہوتی' تو ان کا خلیفہ دن کے وقت وسیع و عریض سلطنت کی تمام انتظامی ذمہ داریوں کو بطریق احسن پورا کرنے کے باوجود مدینے کی گلیوں' کوچوں اور گرد و نواح کے علاقوں میں گشت کر رہا ہوتا' تاکہ ان کے مال و اسباب کی حفاظت کرے۔ ان کے مسائل سے آگاہ ہو کہ وہ اس وقت آ کر پیش نہیں کر سکتے' ان کی مشکل و ضرورت کا ازالہ کرے کہ کوئی دوسرا ان کا پرسان حال نہیں ہو سکتا۔ ان گشتوں میں متعدد مرتبہ لوگوں کی حاجت روائی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ حضرت طلحہؓ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ ایک شب کو تاریکی شب میں باہر نکلے اور ایک گھر میں داخل ہو گئے۔ جب صبح ہوئی تو میں اس گھر کی طرف گیا' کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اپاہج بڑھیا بیٹھی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "اس شخص کا کیا حال ہے جو تمہارے پاس آتا ہے؟" اس نے کہا "وہ اتنی مدت سے میری خبر گیری کر رہا ہے اور میری ضرورت کی چیزیں میرے پاس لے آتا ہے اور مجھ سے تکلیف کو دور کرتا ہے۔" میں نے اپنے نفس سے کہا "اے طلحہؓ! تیری ماں تجھے کھو دے تو عمرؓ کی لغزشوں کا پیچھا کرتا ہے[4]۔" حضرت عمرؓ کے غلام اسلم کا بیان ہے کہ تاجروں کی ایک پارٹی مدینہ آئی تو وہ نماز پڑھنے کی جگہ پر اتر پڑے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ

---

(۱) [illegible] ۱۰۲ (۲) مسعودی ۲: ۳۱۳ (۳) سعد ۳: ۲۰۰ [illegible] (۴) کنز [illegible] ۱۳۵ [illegible]

سے فرمایا "کیا آپ رات کو ان کی حفاظت کر سکتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "ہاں!" پس دونوں حضرات نے ان کی حفاظت کرتے اور نماز پڑھتے رات گزاری۔ حضرت عمرؓ نے ایک بچے کے رونے کی آواز سنی تو آپ اس کی طرف گئے اور اس کی ماں سے فرمایا "اللہ سے ڈر اور اپنے بچے سے حسن سلوک کر۔" پھر آپ اپنی جگہ واپس آئے تو آپ نے اس کے رونے کی آواز سنی تو دوبارہ اس کی ماں کے پاس گئے اور اسی قسم کی بات اسے کہی اور پھر اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ جب رات کا آخری حصہ آیا تو آپ نے بچے کے رونے کی آواز سنی تو آپ نے اس کی ماں کے پاس آ کر اسے کہا "تو ہلاک ہو تو بہت بری ماں ہے میں رات سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے بیٹے کو رونے سے قرار نہیں آ رہا۔" اس نے کہا "اے بندۂ خدا میں اسے کھانے سے غافل کر رہی ہوں اور وہ نہیں مانتا۔" آپ نے فرمایا "کیوں؟" اس نے کہا "اس لئے کہ حضرت عمرؓ اس کا روزینہ مقرر کرتے ہیں جس کا دودھ چھٹا ہوا ہو۔" آپ نے پوچھا "تمہارے اس بیٹے کی عمر کیا ہے؟" اس نے کہا "اتنے ماہ۔" آپ نے فرمایا "تو ہلاک ہو اس کے دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کر" اور جب آپ نے صبح کی نماز پڑھی تو آپ رونے کے باعث لوگوں کیلئے واضح قرأت نہ کر سکتے تھے پھر فرمایا "عمرؓ کی شدت نے مسلمانوں کے کتنے بچوں کو قتل کر دیا ہے۔" پھر آپ نے منادی کو حکم دیا تو اس نے اعلان کیا کہ اپنے بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کرو ہم ہر مسلمان بچے کیلئے روزینہ مقرر کرتے ہیں اور آپ نے یہ بات اطراف کو بھی لکھ دی[۱]۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی یہ شب گردیاں اس قدر اہم تھیں کہ ان سے حاصل ہونے والی براہ راست معلومات کی بناء پر آپ اپنی معاشی پالیسیوں کو ہی تبدیل کر دیتے تھے تاکہ کفالت عامہ اس انداز میں ہو کہ اس کے منفی اثرات کسی بھی طبقے پر نہ پڑیں۔ نئے پیدا ہونے والے بچوں تک کو آپ نے ریاست کی ذمہ داری میں شامل کر دیا۔ کہاں یہ عزم و یقین اور احساس ذمہ داری اور کہاں وطن عزیز کے سیکولر حکمرانوں کا رویہ کہ یہاں کا پیدا ہونے والا ہر بچہ ان کی کرپشن بدانتظامیوں عیاشیوں کی وجہ سے سودی قرضوں کا بوجھ لئے ہوئے آنکھ کھولتا ہے اور بجٹ کا بہت بڑا حصہ بہبود آبادی کے نام سے ان کی آمد کو روکنے پر صرف کیا جاتا ہے۔ آپ کے خادم اسلم کا بیان ہے کہ ایک شب میں حضرت عمرؓ کے ساتھ مدینہ کے بیرونی حصے میں گیا تو ہمیں ایک بالوں کا خیمہ نظر آیا۔ ہم اس کے پاس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک عورت دردِ زہ میں مبتلا ہے اور رو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کا حال پوچھا تو اس نے کہا "میں ایک غریب عورت ہوں اور میرے پاس کوئی چیز نہیں۔" حضرت عمرؓ رو پڑے اور دوڑتے ہوئے اپنے گھر واپس آئے اور اپنی بیوی حضرت ام کلثوم بنت حضرت علیؓ سے کہا "کیا آپ کو اس اجر میں کچھ دلچسپی ہے جسے اللہ آپ کے پاس لے آیا ہے" اور انہیں سارا واقعہ بتایا۔ انہوں نے جواب دیا "ہاں!" پس آپ نے اپنی پشت پر آٹا اور چربی اٹھائی اور حضرت ام کلثومؓ نے ولادت کے مناسب حال چیزیں اٹھائیں اور دونوں آ گئے۔ حضرت ام کلثومؓ عورت کے پاس چلی گئیں اور حضرت عمرؓ اس کے خاوند جو کہ آپ کو نہیں جانتا تھا کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اس عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو حضرت ام کلثومؓ نے کہا "یا امیر المومنینؓ! اپنے ساتھی کو بچے کی بشارت دیجئے۔" جب اس شخص نے حضرت ام کلثومؓ کی بات سنی تو اس بات کو بڑا خیال کیا اور حضرت عمرؓ کے پاس معذرت کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "تم پر کوئی خوف نہیں۔" پھر آپ نے ان کو اخراجات اور ان کی ضرورت کی اشیاء پہنچا دیں اور واپس آ گئے[۲]۔ اسلم ہی کا بیان ہے ایک شب میں حضرت عمرؓ کے ساتھ واقم کی سیاہ سنگی زمین کی طرف گیا اور جب ہم صرار مقام میں تھے تو اچانک آپ نے آگ کو دیکھا تو فرمایا "اے اسلم یہاں کوئی قافلہ ہے جنہیں رات نے روک دیا ہے۔ آؤ ان کے پاس چلیں۔" ہم ان کے پاس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ بیٹھی ہے اور ہنڈیا آگ پر رکھی ہوئی ہے اور اس کے بچے بھوک سے چلا رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اے روشنی والو! السلام علیکم" اس عورت نے کہا "وعلیکم السلام!" آپ نے فرمایا "میں قریب آ جاؤں۔" اس نے کہا "قریب

---

(۱) حوالہ [illegible] (۲) [illegible]

آجاؤ یا چھوڑ دو۔ "ہم نے قریب ہو کر کہا "آپ لوگوں کا کیا حال ہے؟" اس نے کہا "ہمیں رات اور ٹھنڈک نے روک دیا ہے۔" آپ نے فرمایا "یہ بچے کیوں چلا رہے ہیں؟" اس نے کہا "بھوک سے۔" آپ نے فرمایا "آگ پر کیا چیز پڑی ہے؟" اس نے کہا "پانی پڑا ہے جس سے میں انہیں بہلا رہی ہوں تاکہ یہ سو جائیں ہمارے اور عمرؓ کے درمیان اللہ ہی فیصلہ کرے گا۔" حضرت عمرؓ رو پڑے اور دوڑتے ہوئے آٹے کے گودام کی طرف واپس آئے اور ایک بورہ آٹا اور چربی کا ایک چرمی برتن نکالا اور فرمایا "اے اسلم اسے میری پشت پر لاد دو۔" میں نے کہا "آپ کے بجائے اسے میں اٹھاتا ہوں۔" آپ نے فرمایا "تو قیامت کے روز میرا بوجھ اٹھائے گا؟" پس آپ نے اسے پشت پر اٹھایا اور ہم اس عورت کی طرف گئے تو آپ نے اسے اپنی پشت سے اتارا اور آٹا نکال کر ہنڈیا میں ڈالا اور اس پر کچھ چربی ڈالی اور ہنڈیا کے نیچے پھونکیں مارنے لگے اور دھواں ایک ساعت تک آپ کی داڑھی میں گھسنے لگا پھر آپ نے اسے آگ سے اتارا اور فرمایا "مجھے پلیٹ دو۔" پلیٹ لائی گئی تو آپ نے اسے بھر دیا پھر اسے بچوں کے آگے رکھ دیا اور فرمایا "کھاؤ" سو وہ کھا کر سیر ہو گئے" اور عورت آپ کیلئے دعا کرتی رہی اور وہ آپ کو نہ جانتی تھی اور آپ مسلسل ان کے پاس رہے یہاں تک کہ چھوٹے بچے سو گئے۔ پھر آپ نے انہیں اخراجات دیئے اور واپس آ گئے پھر میرے پاس آ کر فرمایا "اے اسلم بھوک انہیں رلائے اور جگائے ہوئے تھی"[۱]۔

ابن جوزی اور طبری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اس عورت نے کہا "اللہ آپ کا بھلا کرے آپ امیر المومنینؓ سے زیادہ اس کام (خلافت) کے حقدار ہیں۔" آپ نے فرمایا "تم اچھی بات کہنا جب تم امیر المومنین کے پاس آؤ گی تو مجھے انشاءاللہ وہاں پاؤ گی۔" پھر آپ اس عورت سے الگ ہو کر ایک گوشے میں چلے گئے وہاں آپ بالکل خاموش ہو گئے میں آپ سے بات کر رہا تھا مگر آپ مجھے کوئی جواب نہیں دے رہے تھے تا آنکہ میں نے بچوں کو دیکھا کہ وہ آپس میں کشتی لڑ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں جب وہ سو گئے اور خاموشی و سکون طاری ہو گیا تو آپ کھڑے ہو گئے اور خدا کا شکر ادا کر کے فرمانے لگے "اے اسلم! بھوک نے انہیں بیدار کر رکھا تھا اسی وجہ سے وہ رو رہے تھے۔ اسی لئے میں نے یہ بات پسند کی کہ میں اس وقت تک یہاں سے نہ لوٹوں جب تک میں ان کی وہ حالت نہ دیکھ لوں جو میں نے بھی مشاہدہ کی ہے"[۲]۔ "مالک بن اوس نے بیان کیا کہ دن چڑھ آیا تھا اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اتنے میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قاصد میرے پاس آیا اور کہا کہ "امیر المومنینؓ آپ کو بلا رہے ہیں۔" میں قاصد کے ساتھ ہی چلا گیا اور عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کھجور کی شاخوں سے بنی ہوئی ایک چارپائی پر بیٹھے تھے جس پر کوئی بستر وغیرہ بھی نہیں بچھا تھا اور ایک چمڑے کے تکیے پر ٹیک لگائے ہوئے تھے میں سلام کر کے بیٹھ گیا۔ پھر آپ نے فرمایا "مالک! تمہاری قوم کے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور قحط اور فقر و فاقہ کی شکایت کر رہے تھے۔ میں نے ان کیلئے ایک معمولی سے عطیئے کا فیصلہ کر لیا ہے تم اسے اپنی نگرانی میں قوم کے درمیان تقسیم کرا دو۔ میں نے عرض کیا "یا امیر المومنین! اگر آپ اس کام پر کسی اور کو مامور فرما دیتے تو بہتر تھا لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے یہی اصرار کیا کہ نہیں تم ہی تحویل میں لے لو"[۳]۔ "آپ اہل مدینہ کے گھروں میں خورد و نوش کا کچا سامان بھجوایا کرتے تھے تاکہ حسب ضرورت وہ اسے زیر استعمال لائیں۔ روایت میں ہے کہ امیر المومنینؓ کے پاس ۹ عدد دفتر (رجسٹر) تھے۔ ان کا مسلک تھا کہ جب بھی تحائف اور فواکہات آتے تھے تو ازواج مطہرات کو ان میں سے ضرور حصہ بھجوایا جاتا تھا اجتہ کسی کے حصے میں اگر کمی بیشی ہوتی تھی تو وہ حفصہؓ کے حصہ میں آتی تھی۔ ایک بار بہت سی بھیڑیں ذبح کی گئیں تو بہت کافی مقدار میں ازواج نبیؐ کے مکانوں پر گوشت بھجوایا گیا اور باقی ماندہ گوشت مہاجرینؓ و انصارؓ میں تقسیم کر دیا گیا"[۴]۔ "لیکن اگر آپ یہ محسوس کرتے کہ سب گھروں میں مال و اسباب پہنچانا ممکن نہیں ہے تو سرکاری طور پر کھانا تیار کرا کے اہل مدینہ کی اجتماعی ضیافت کا انتظام کیا جاتا۔ یہ ایک منفرد تصور تھا

---

(۱) ایضاً [illegible] (۲) ایضاً [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible]

لوگ اکٹھے ہوتے ان کی سوشلائزیشن ہوتی۔ ایک دوسرے سے میل ملاقات' رواداری' ہم آہنگی' مساوات اور یکجہتی کا خوبصورت مظاہرہ ہوتا۔ حکومت اور عوام کا تعلق مضبوط ہوتا۔ آپ کو رعایا کی براہ راست خدمت کا موقع ملتا' نظم وضبط کو فروغ ملتا۔ آپ براہ راست خود اس کی نگرانی کرتے۔ سب سے پہلے عوام کو کھلاتے اور بچ جاتا تو پھر خود تناول فرماتے۔ لوگوں کو خورد ونوش کے آداب بھی ساتھ ساتھ سکھاتے۔ امام زہری کہتے ہیں "صدقہ کے چند اونٹ بے کار ہو گئے۔ امیر المومنینؓ نے انہیں ذبح کر دیا اور جب ان کا گوشت پک کر آیا تو صلائے عام کر دی گئی۔ منجملہ اور لوگوں کے حضرت عباسؓ بھی آئے۔" حضرت عباسؓ بولے "امیر المومنینؓ روز ایسی دعوتیں ہوں تو لطف آ جائے۔" امیر المومنینؓ نے کہا "ان اونٹوں کو ٹھکانے لگانے اور ان کا جائز مصرف کرنے کی یہی ایک صورت سمجھ میں آئی۔ جائز مال' جائز طور پر صرف ہو گیا[1]۔"

حضرت اسلم سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ شتر خانے میں ایک اندھی اونٹنی ہے۔ انہوں نے فرمایا "وہ کسی گھر والوں کو دے دو تاکہ وہ اس سے نفع حاصل کریں۔" میں نے کہا "وہ اندھی ہے۔" انہوں نے فرمایا "اسے اونٹوں کی قطار میں باندھ دیں گے۔" میں نے کہا "وہ چارہ کیسے کھائے گی؟" انہوں نے پوچھا "وہ جزیہ کے جانوروں میں سے ہے یا صدقہ کے۔" میں نے جواب دیا "جزیہ کے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "واللہ تم لوگوں نے اسے کھانے کا ارادہ کیا ہے۔" میں نے کہا "نہیں اس پر جزیہ کی نشانی موجود ہے۔" حضرت عمرؓ کے حکم پر اسے ذبح کر دیا گیا۔ راوی کے بقول حضرت عمرؓ کے پاس ۹ پیالے تھے' حضرت عمرؓ کے پاس جو میوہ یا اچھی چیز آتی ان میں رکھ کر آنحضور ﷺ کی ازواج مطہراتؓ کو بھیجا کرتے تھے اور سب سے آخر میں اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس بھیجتے۔ اگر وہ چیز کم ہو جاتی تو کمی حضرت حفصہؓ کے حصے میں ہوتی۔ اس اونٹنی کا گوشت بھی پہلے انہوں نے ۹ پیالوں میں ڈال کر امہات المومنینؓ کی طرف روانہ کیا' پھر اسے پکانے کا حکم دیا اور سب مہاجرین وانصار کی دعوت کی[2]۔

ایسی ہی ایک ضیافت کے موقع پر آپ کو ایک معذور شخص کے مسائل جاننے کا موقع ملا۔ آپ کا رد عمل اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ روایت ہے عمر بن الخطابؓ مدینہ میں لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ آپ ہاتھ میں لاٹھی لئے ان کے درمیان گشت کر رہے تھے۔ اسی دوران میں آپ کا گزر ایک ایسے آدمی کے پاس سے ہوا' جو بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ آپ نے اس سے کہا "بندۂ خدا' دائیں ہاتھ سے کھا۔" اس نے جواب دیا: "بندۂ خدا' وہ مشغول ہے۔" آپ آگے بڑھ گئے' دوبارہ وہاں سے گزرے تو پھر دیکھا کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے۔ آپ نے اس سے پھر کہا "بندۂ خدا' دائیں ہاتھ سے کھا۔" اس نے کہا "بندۂ خدا وہ مشغول ہے۔" اس نے تین بار یہی جواب دیا' آپ نے پوچھا کہ کس کام میں مشغول ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "داہنا ہاتھ موتہ کی لڑائی میں کام آ گیا۔" راوی کہتا ہے کہ یہ سن کر عمرؓ اس کے پاس بیٹھ گئے اور رونے لگے۔ اس سے پوچھنے لگے کہ تمہیں وضو کون کراتا ہے؟ تمہارا سر کون دھوتا ہے؟ کپڑے کون دھوتا ہے؟ فلاں اور فلاں کام کون کرتا ہے؟ پھر آپ نے اس کیلئے ایک ملازم منگوایا اور اسے ایک سواری دلوائی اور دوسرے سامان ضرورت بھی دلوائے۔ یہاں تک کہ اس آدمی کے ساتھ آپ کا انتہائی مشفقانہ سلوک اور مسلمانوں کی بہبود کیلئے حضرت عمرؓ کا یہ اہتمام دیکھ کر محمد ﷺ کے صحابہؓ بلند آواز سے عمرؓ کیلئے اللہ سے دعائیں کرنے لگے۔ غریبوں اور ناداروں کی کفالت کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ تخیر حضرات خوان لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ ضرورت مندوں کو بلا کر کھانا کھلاتے۔ ابن ابی ملیکہ نے ابو محذورہ سے روایت کیا ہے "میں عمرؓ کی خدمت میں باریاب تھا کہ اتنے میں صفوان بن امیہ کھانے کے ایک خوان کے ساتھ جسے چند لوگ اٹھائے ہوئے تھے' حاضر ہوئے۔ امیر المومنینؓ نے اسی وقت اردگرد کے تمام مسکینوں' ناداروں اور محتاجوں کو بلوا بھیجا کہ وہ سب کھانے میں شریک ہو جائیں۔ اس کے بعد

(۱) حوالہ ج ا ص ۱۰۱ (۲) مناقب ۲۷۹۔

فرمایا "ان لوگوں سے خدا سمجھے جو اپنے ناداروں اور فلاکت زدہ ہم قوموں سے غافل ہو جاتے ہیں اور انہیں ساتھ بٹھا کر نہیں کھلاتے۔" صفوان فوراً بولے "امیر المومنینؓ! ہم لوگ ہرگز ان غریبوں سے غافل نہیں۔ ہم ان کیلئے ایثار کرتے رہتے ہیں' ہم پہلے ان کو اچھی چیزیں کھلاتے ہیں پھر خود کھاتے ہیں[۱]۔" کبھی کبھی آپ کو یہ خیال آتا تھا کہ یہ طریقہ مستقل طور پر رائج نہ ہو جائے' لوگ سارا انحصار حکومت ہی پر کرنا شروع نہ کر دیں۔ ان کی توقعات و عادات اس قدر تبدیل نہ ہو جائیں کہ اس طریقے کے منفی پہلو نمایاں ہونے لگیں اور یہ بات رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی راہوں سے انحراف نہ پیدا کر دے۔ سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ "مال غنیمت میں کچھ اونٹ آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک اونٹ بے کار ہو گیا۔ امیر المومنین نے اس کی قربانی کر کے اس کا گوشت امہات المومنینؓ کے گھروں میں بھجوا دیا' باقی ماندہ گوشت کو پکوا کر اسے چند اشخاص کو کھلوایا۔ ان اشخاص میں آنحضرتؐ کے عم محترم حضرت عباسؓ بھی شامل تھے۔" انہوں نے کہا "امیر المومنینؓ! ایسی دعوتوں کا انتظام روز ہو جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔ ہم سب جمع ہوا کریں دعوت کھائیں اور آپ سے باتیں کریں۔" فرمایا "اب اس نوع کی ضیافت کی تکرار نہ ہوگی۔ میرے دو ساتھی تھے دونوں نے اپنے اپنے کام کئے اور ایک خاص راستے پر گامزن ہوئے۔ اب اگر میں ان دونوں (مراد رسالت مآب علیہ السلام اور صدیق اکبرؓ) کی تقلید نہ کروں گا' تو دوسرے راستے پر جا پڑوں گا' جو ان کا راستہ نہ ہوگا۔"

آپ کی خدمت میں ہر مرد' عورت' بچہ' بوڑھا ہر وقت' ہر جگہ حاضر ہو کر بلا تکلف اپنی حاجت و ضرورت پیش کر سکتا تھا۔ آپ فوراً اس پر کارروائی کرتے اور بیت المال سے اس کی حاجت روائی کرتے۔ حضرت شعبی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا "میرے اونٹ کی پشت میں زخم ہے اور دیگر مقامات پر بھی زخم ہیں اس لئے آپ مجھے دوسرا اونٹ دیں۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تمہارے اونٹ کے جسم میں کوئی زخم نہیں ہے۔" یہ سن کر وہ اعرابی پیٹھ موڑ کر بھاگ گیا اور وہ یہ شعر پڑھتا جا رہا تھا۔ ابو حفص نے عمرؓ کی قسم کھا کر کہا ہے "اس اونٹ کو کوئی زخم نہیں پہنچا ہے اور نہ کوئی بیماری ہے۔ اگر انہوں نے غلط بیانی کی ہو تو للہ انہیں معاف کر۔" یہ سن کر آپ نے فرمایا "اے اللہ تو مجھے معاف کر۔" پھر آپ نے اعرابی کو بلا کر اسے اونٹ پر سوار کرا دیا۔ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں امیر المومنینؓ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک انصاری عورت نے آ کر فریاد کی "مجھے پہننے کو کپڑا چاہئے۔" آپ نے کہا "کپڑے مانگنے کا کیا یہ موقع ہے؟" مگر وہ عورت کہتی رہی کہ "میرے پاس تن ڈھانکنے کو بھی کچھ نہیں۔" امیر المومنینؓ اسی وقت کھڑے ہو گئے اور خزانہ سے ایک سفید رنگ کی پوشش نکال کر لائے اور اسے لا کر عورت کے سامنے ڈال دیا اور فرمایا "اس لباس کو لے جاؤ اور اس میں کہیں دریدگی ہو تو رفو کر لو۔ اس کپڑے کو زیادہ سے زیادہ مدت استعمال کرو اس لئے کہ ہر نئی چیز پرانی ہو جاتی ہے[۲]۔"

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ بازار گیا۔ عمر رضی اللہ عنہ سے ایک نوجوان عورت نے ملاقات کی اور عرض کی کہ یا امیر المومنین! میرے شوہر کی وفات ہو گئی ہے اور چند چھوٹی چھوٹی بچیاں چھوڑ گئے ہیں' خدا گواہ ہے کہ اب نہ ان کے پاس کسی جانور کے پائے ہیں کہ سے پکا لیں نہ کھیتی ہے اور نہ دودھ کے قابل کوئی جانور۔ مجھے تو اس کا خطرہ ہے کہ وہ فقر و فاقہ کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جائیں۔ میں خفاف بن ایماء غفاریؓ کی لڑکی ہوں۔ میرے والد آنحضور ﷺ کے ساتھ غزوہ حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔" یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس تھوڑی دیر کیلئے رک گئے' پھر فرمایا "مرحبا! تمہارا خاندانی تعلق تو بہت قریبی ہے اور ایک بہت قوی اونٹ کی طرف مڑے جو گھر میں بندھا ہوا تھا اور اس پر دو بورے غلے سے بھرے ہوئے رکھ دیئے۔ ان دونوں بوروں کے درمیان دوسری ضروریات کی چیزیں اور کپڑے رکھ دیئے اور اس کی نکیل ان کے ہاتھ میں تھما کر فرمایا کہ "اسے لے جاؤ' یہ جب ختم

---

(۱) ص ۱۰۳ (۲) ص ۸۶

ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ تمہیں پھر خیر و بھلائی دے گا۔" ایک صاحب نے اس پر کہا "یا امیر المومنینؓ! آپ نے اسے بہت دے دیا۔" عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "تیری ماں تجھے روئے، خدا کی قسم اس عورت کے والد اور اس کے بھائی جیسے اب بھی میری نظروں کے سامنے ہیں کہ ایک مدت تک ایک قلعہ کے محاصرے میں شریک ہیں اور پھر آخر اسے فتح کر لیا اور پھر ہم نے مال غنیمت میں سے اپنے حصے لئے [1]۔" آپ لوگوں کی مالی مدد کرتے وقت اسلام کی راہ میں قربانیاں دینے والوں کے اہل و عیال کو دیتے وقت نہایت سخاوت سے کام اس لئے لیتے تھے کہ لوگوں کو ریاست پر پورا اعتماد ہو، انہیں ان کے بعد بیوی بچوں کی کفالت و مستقبل کے بارے میں خدشات و خطرات لاحق نہ ہوں اور پوری جانفشانی سے ملک و ملت کے دفاع کا فریضہ سر انجام دیں۔ آپ ان لوگوں کا بیت المال پر حق فائق سمجھتے تھے، جنہوں نے اسلام کو ہر چیز، یہاں تک کہ جان پر بھی فوقیت دی ہو۔ اب یہی ایک عملی طریقہ تھا، جس سے آپ ملک و ملت کے محسنوں کی حوصلہ افزائی کر سکتے تھے۔ آپ بعد میں شہداء کے اہل و عیال کے دکھ درد بانٹتے، ان کی ضروریات کا اپنے گھر والوں سے بڑھ کر خیال رکھتے، ان کی ہمدردی، خیر خواہی اور معاونت میں کوئی بھی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی یہ بصیرت افروز حکمت عملی اسلامی تعلیمات کا بہترین مرقع تھی۔ اگر کسی شخص نے کسی معرکے میں کوئی چوٹ کھائی ہو تو اس کیلئے بھی آپ کا دل شفقت و محبت کے جذبات سے لبریز ہو جاتا اور مدد کیلئے ہاتھ کھول دیتے۔

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں "مجھے یاد ہے کہ لوگ اپنے اپنے روزینے لے رہے تھے۔ ایک شخص آیا، امیر المومنینؓ کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو انہیں اس کے چہرے پر ایک گہری چوٹ کا اثر دکھائی دیا، ایک بے حد گہرا نشان! آپ نے پوچھا "یہ کیسا نشان ہے؟" آدمی نے جواب دیا "یہ ایک چوٹ کا نشان ہے، جس کا اس کو ایک جہاد میں شکار ہونا پڑا تھا۔" امیر المومنینؓ کا دل بھر آیا، فرمایا "اس کو ایک ہزار درہم گن دیے جائیں۔" تھوڑی دیر کے بعد مزید ایک ہزار درہم کیلئے حکم دیا اور یہ حکم چار بار صادر فرمایا۔ آدمی اس سیلاب سخاوت کے آگے نہ ٹھہر سکا اور وہاں سے چلا آیا۔ امیر المومنینؓ نے پوچھا "کہاں گیا وہ غازی؟" لوگ بولے "شاید آپ کے جود و کرم سے وہ شرما گیا اور چلا گیا۔" امیر المومنینؓ بولے "بخدا! اگر وہ نہ جاتا تو اس وقت کل کی کل رقم میں اسی کو دے دیتا۔ اللہ اللہ کیا شخص ہے، راہ خدا میں اس نے ایسی مار سہی کہ اس کا چہرہ بگڑ گیا [2]۔" اسلام کی راہ میں سر انجام دی جانے والی ہر خدمت کی آپ ہر ممکنہ قدر کرتے تھے۔ ثعلبہ بن مالک سے روایت ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مدینے کی خواتین میں کچھ چادریں تقسیم کیں۔ ایک نئی چادر بچ گئی، تو بعض حضرات نے جو آپ کے پاس ہی تھے کہا "یا امیر المومنینؓ! یہ چادر رسول اللہ ﷺ کی نواسی کو دے دیجئے، جو آپ کے گھر میں ہیں (ان کی مراد آپ کی بیوی ام کلثوم بنت علیؓ سے تھی۔)" حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ "ام سلیط رضی اللہ عنہا اس کی زیادہ مستحق ہیں، یہ ان انصاری خواتین میں سے تھیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "آپ احد کی لڑائی کے موقع پر ہمارے لئے پانی کے مشکیزے اٹھا کر لاتی تھیں [3]۔"

آپ کی فیاضی ہر ضرورت مند کیلئے عام تھی۔ ابو الولید کی روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمرؓ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک لنگڑا آدمی ایک اونٹنی کو پکڑے ہوئے آیا، وہ بھی لنگڑی ہو گئی تھی۔ اس نے چند اشعار کہے جس میں آپ کی تعریف کی گئی تھی۔ آپ نے اس پر لا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا، پھر اس شخص نے اپنی اونٹنی کے لنگڑا ہونے کی شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے اونٹنی اس سے لے لی اور اس کے بدلے میں سرخ اونٹ پر اسے سوار کر دیا اور اس کے ساتھ اسے زاد راہ بھی فراہم کیا [4]۔ لوگ اس وجہ سے آپ کی تعریفیں کرتے رہتے تھے۔ اس شخص کے جانے کے بعد حضرت عمرؓ بھی حج کیلئے روانہ ہوئے۔ جب آپ سواری پر جا رہے تھے تو ایک سوار آپ کو ملا جو یہ شعر پڑھ رہا تھا "ماساسا مثلك يا ابن الخطاب، ابر بالاقصى ولا بالاصحاب، بعد النبي صاحب الكتاب۔" (اے ابن خطاب

---

(۱) بخاری ٥: ٦٤ (۲) جوزی ۲۲۹ (۳) بخاری ۲: ۲۲۲ (٤) طبری III ٤: ۲۲۰

تمہاری طرح کسی نے نبی کریم ﷺ صاحب کتاب کے بعد حکومت نہیں کی۔ آپ دوستوں اور غیروں دونوں کے ساتھ سب سے زیادہ نیک سلوک کرتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے چھڑی مار کر اسے ٹوکا کہ ابوبکر کا ذکر کہاں ہے؟"[۱] ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمیرؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے' آپ اس وقت لوگوں میں عطیات تقسیم کر رہے تھے۔ ان کے والد جنگ حنیف میں شہید ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا "اے امیر المومنینؓ! میرے لئے بھی وظیفہ مقرر کیجئے۔" اس وقت حضرت عمرؓ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے جب کام سے فارغ ہوئے تو متوجہ ہو کر پوچھا "تم کون ہو؟" وہ بولے "عبداللہ بن عمیرؓ۔" آپ نے فرمایا "اے یرفا! انہیں چھ سو درہم دے دو۔" انہوں نے پانچ سو دیئے' تو انہوں نے قبول نہیں کئے اور کہا "امیر المومنینؓ نے مجھے چھ سو درہم دینے کا حکم دیا ہے۔" وہ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور انہیں اس سے مطلع کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "اے یرفا! انہیں چھ سو درہم اور ایک عمدہ پوشاک بھی دے دو۔" لہٰذا انہوں نے وہ پوشاک پہن لی' جو حضرت عمرؓ نے پہنائی تھی اور جو لباس وہ پہنے ہوئے تھے' وہ پھینک دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "اے فرزند! تم اپنے کپڑے بھی لے جاؤ۔ یہ تم اپنے گھر کے کام کاج کے موقع پر پہنو اور دوسری پوشاک تمہارے زیب و زینت کے کام آئے گی"[۲]۔" آپ اضطراری حالت میں انسانی اور جانوروں کی جان بچانے کیلئے کوئی غلطی اور کوتاہی کرتا تو اسے نظر انداز کر دیتے تھے اور اس کی وہ حاجت پوری کر دیتے' یہی مستقبل میں اسے باز رکھنے کا حکیمانہ طریقہ تھا۔

چنانچہ عطاء بن عبید سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو حرم کی حدود میں ایک درخت کاٹتے اور اس سے اپنے اونٹ کو کھلاتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اسے طلب کیا اور فرمایا "اللہ کے بندے! تمہیں معلوم نہیں کہ مکہ حرام ہے' اس کے حدود میں درخت کاٹنا بھی جائز نہیں ہے اور ان حدود میں ہمیں کاٹنا یا شکار وغیرہ ناگزیر اور مناسب صورتوں ہی میں جائز ہو سکتے ہیں۔" اس شخص نے جواب دیا "امیر المومنینؓ! یہ میں نے بالکل اضطراری عالم میں کیا ہے۔ میرے پاس جو جانور ہیں' وہ بے حد کمزور ہیں اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید سب مر جاتے۔" حضرت عمرؓ نے یہ بات سنی تو ان کا دل بھر آیا اور صدقہ کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ جو آٹے کی بوریوں سے لدا ہوا تھا' منگوا کر اس شخص کو دے دیا اور ساتھ ہی فرمایا "آئندہ سے تم کبھی حرم کے درخت نہ کاٹنا"[۳]۔" جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ آپ کی حکمت عملی میں یہ بات شامل تھی کہ دین اور ملک کی خاطر کسی بھی طرح کی قربانیاں دینے والوں کی بھرپور مالی معاونت کر کے عملی اعترافات اور حوصلہ افزائی کریں۔ وہاں جن لوگوں کا دامن اسلام کی دشمنی' غداری یا فتنہ و فساد کی وجہ سے داغدار ہوتا تھا' ان پر دباؤ بھی رکھتے تھے۔ اس کی مثال ابو شجرہ کا واقعہ ہے جو عہد صدیقی میں مرتد ہو گیا تھا اور اپنے اشعار میں فخریہ طور پر اس نے اس کا اظہار کیا تھا۔ مرتدین کے قلع قمع کے بعد دیگر بہت سے لوگوں کے ساتھ وہ بھی دوبارہ مسلمان ہو گیا۔ عہد فاروقی میں وہ مدینہ آیا اور اپنی اونٹنی بنو قریظہ کے فرز میں بٹھا دی۔ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ اس وقت مساکین کو صدقہ دے رہے تھے اور عرب کے فقراء میں خود ہی تقسیم کر رہے تھے۔ اس نے کہا "امیر المومنینؓ! مجھے بھی عطا کیجئے کیونکہ میں حاجتمند ہوں۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا "تم کون ہو؟" اس نے جواب دیا "میں ابو شجرہ بن عبدالعزیٰ اسلمی ہوں۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اے دشمن خدا تو نے یہ شعر نہیں کہا ہے "فرویت رمحی من کتیبة خالد وانی لارجو بعدها ان اعمرا۔" (میں نے اپنے نیزے کو خالد کے دستے سے سیراب کیا اور اب میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ عمر کی خبر لوں گا۔) یہ کہہ کر حضرت عمرؓ اس کے سر پر درہ مارنے بڑھے مگر وہ بھاگ گیا اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر براستہ حرہ شوران بنو سلیم واپس پہنچ گیا اور اپنے اشعار میں حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل کی شکایت کی اور ہجو لکھی(۴)۔

اس طرح کی اکا دکا استثناء کو چھوڑ کر آپ کی کفالتی پالیسی نہایت جامع' وسیع اور ہمہ گیر تھی۔ اس سے بھی دور جدید میں استفادہ کرتے ہوئے دین و ملت کے

---

(۱) طبری ۵:۲۲۰۰ (۲) ایضاً ۵:۲۲۹۱ (۳) حوریح۱:۷۷ (۴) بلاذری ۱۰۷۹۔

دشمنوں کو دباؤ میں لایا جا سکتا ہے۔ کفالت عامہ کی ذمہ داری صرف مسلمان شہریوں تک محدود نہیں رکھی جاتی تھی' بلکہ غیر مسلم رعایا کو بھی اس سلسلہ میں وہی حیثیت حاصل تھی جو مسلمانوں کو تھی' بلکہ غیر مسلم رعایا کو بھی اس سلسلہ میں وہی حیثیت حاصل تھی جو مسلمانوں کو تھی۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال کے نگران کو ہدایت کی تھی کہ ضرورت مند اہل ذمہ کا پتہ لگا کر ان کی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا گزر کسی کے دروازہ پر ہوا' جہاں ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی جس کی بصارت زائل ہو چکی تھی' آپ نے پیچھے سے اس کے بازو کو ٹھوکا اور پوچھا "تم کس مذہب کے اہل کتاب ہو؟" اس نے جواب دیا کہ یہودی ہوں۔ آپ نے پوچھا "تمہیں کس چیز نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا؟" اس نے جواب دیا کہ "میں بڑھاپے' ضرورت مندی اور جزیہ کی وجہ سے بھیک مانگ رہا ہوں۔" (راوی) کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے گئے اور گھر میں سے لا کر اسے کچھ دیا۔ پھر آپ نے بیت المال کے خزانچی کو بلوایا اور ان سے کہا "اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو کیونکہ خدا کی قسم یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے (جزیہ وصول کر کے) کھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں"[١]۔ "شام کے سفر میں آپ کو راستہ میں کچھ عیسائی سے ملے جو جذام میں مبتلا تھے۔ آپ نے ان کی معذوری کے پیش نظر ان کیلئے روزینہ جاری کرنے کا حکم دے دیا"[٢]۔

مذکورہ روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے کفالت عامہ میں غذا' لباس' سواری و علاج وغیرہ سب کو شامل کیا۔ اس سلسلے میں آپ نے متعدد اور بھی اقدامات کیے' تاکہ ہر شخص کی حاجت روائی ممکنہ حد تک ہو سکے۔ مثلاً سواری کی شدید ضرورت ان مسافروں کو بھی پیش آتی ہے جو منزل سے پہلے تھک کر رہ جائیں۔ عام مسافرت میں ان کو عارضی قیام کیلئے جگہ کی اور اکثر اوقات سامان غذا کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مکہ اور مدینہ کے درمیانی راستہ پر اس کا انتظام کر دیا تھا کہ ایسے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کی جائے[٣]۔ آپ کی یہ پالیسی تھی کہ کفالت عامہ کا انتظام طے شدہ فارمولے کے مطابق ریاست کے ہر فرد کیلئے ہو۔ اس میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں' کوئی بھی حقدار محروم نہ رہے' اپنے عمال کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے۔ آپ کی یہ خواہش تھی کہ ضروریات زندگی میں مساوات انسانی کے اسلامی تصور کی کارفرمائی ہو۔ حکیم بن عمر سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے لشکروں کے امراء کے نام فرمان جاری کیے کہ غیر عرب اقوام کے جن غلاموں کو تم آزاد کرو اور وہ مسلمان ہو جائیں' تو ان کا شمار ان کے آزاد کرنے والوں کے زمرے میں کرو' جو مراعات انہیں حاصل ہوں وہ انہیں دو اور جو ذمہ داریاں ان پر ہوں وہی ان پر بھی لگاؤ۔ اگر یہ لوگ مل کر جداگانہ قبیلہ کی شکل بنانا چاہیں تو وظائف اور دیگر دستور وغیرہ میں ان سے اپنی طرح کا سلوک کرو[٤]۔ "حسن کہتے ہیں کہ ایک عامل کے پاس کچھ لوگ آئے' انہوں نے عربوں کو تو دیا اور غیر عربوں کو چھوڑ دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے انہیں لکھا "امابعد آدمی کیلئے یہی بدی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے"[٥]۔"

کفالت عامہ کے بارے میں آپ بہت زیادہ حساس تھے۔ ابو وائل کا بیان ہے' میں اس مسجد (خانہ کعبہ) میں شیبہ کے پاس بیٹھا تو انہوں نے کہا کہ جہاں تم بیٹھے ہوئے ہو وہیں عمر رضی اللہ عنہ بھی میرے پاس بیٹھے تھے اور آپ نے فرمایا تھا کہ "میرا ارادہ ہے کہ میں کعبہ میں کسی طرح کا سونا چاندی نہ چھوڑوں' سب مسلمانوں میں تقسیم کر دوں۔" میں نے کہا "آپ ایسا نہیں کر سکتے؟" کہا "کیوں!" میں نے کہا۔ "آپ کے دونوں ساتھیوں نے بھی ایسا نہیں کیا تھا۔" اس پر انہوں نے فرمایا کہ "دونوں حضرات' ایسے تھے جن کی اقتدا کی جاتی ہے"[٦]۔ "حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے کعبہ کا خزانہ راہ خدا میں خرچ کرنے کا ارادہ فرمایا حضرت ابی بن کعب انصاریؓ نے کہا "اے امیر المومنینؓ! آپ سے پہلے آپ کے دو اصحاب گزر چکے ہیں اگر یہ فضیلت کا کام ہوتا تو وہ ضرور کرتے"[٧]۔ "آپ یہ

---

(١) [illegible] ١٢٠ (٢) [illegible] (٣) [illegible] (٤) [illegible] (٥) [illegible] (٦) [illegible] (٧) [illegible]

چاہتے تھے کہ سارے لوگوں کی ساری ضروریات پورا کرنا اگر ریاست کیلئے ممکن نہ ہو تو یہ اسے ضرور کرنا چاہئے کہ دیگر مختلف طریقوں سے اس کا اہتمام ہو۔ چنانچہ آپ غیر مسلموں سے معاہدات میں ایک شرط یہ بھی رکھتے تھے کہ وہ مسافروں کی تین دن تک مہمانی کریں گے [۱]۔ آپ کفالت ضرورت مند کا حق سمجھتے تھے یہاں تک کہ شدید مجبوری کی صورت میں وہ ہتھیار بھی اٹھا سکتا ہے۔ نیز حضرت عمرؓ نے ان لوگوں سے کہا تھا "جو دیہاتیوں کی ایک بستی کے پاس سے گزرے تھے اور ان دیہاتیوں نے انہیں نہ تو ڈول اور رسی دی تھی اور نہ پانی کا پتہ بتلایا تھا کہ تم نے ان پر ہتھیار کیوں نہیں اٹھائے [۲]؟" "جو شخص کسی چیز کا زیادہ ضرورت مند ہو وہ اس چیز کا اس شخص سے زیادہ مستحق ہے' جسے اس کی حاجت کم ہو۔ چنانچہ روایت ہے کہ انصار میں سے کچھ لوگ سفر میں تھے' ان کا زاد راہ ختم ہو گیا اور وہ محتاج ہو گئے اور عرب کے ایک قبیلے کے پاس آئے اور ان سے مہمان نوازی کیلئے کہا۔ انہوں نے انکار کیا انہوں نے ان کو پکڑ لیا اور بقدر ضرورت لے لیا۔ قبیلے والوں نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی تو انصار کو خوف ہوا کہ حضرت عمرؓ ناراض ہوں گے' لیکن حضرت عمرؓ نے قبیلہ والوں کو سرزنش کی اور فرمایا کہ تم مسافروں کو اس چیز سے منع کرتے ہو' جو اللہ تعالیٰ شب و روز اونٹوں اور بکریوں کے تھنوں میں پیدا کرتا ہے۔ مسافر پانی کا اس شخص سے زیادہ حقدار ہے' جو پانی کے پاس مقیم ہو اور ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں۔ مسافر پانی اور سایہ کا زیادہ حقدار ہے [۳]۔ اسی قبیل سے حضرت عمرؓ کا یہ فرمان بھی ہے کہ اگر جو حالات گزر چکے ہیں وہ پھر پیش آئے تو میں مالداروں سے زائد مال لے کر ناداروں کو دے دوں گا۔" حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کچھ لوگوں سے جن کے پاس پانی موجود تھا' پیاس کی شدت میں پانی مانگا' لیکن انہوں نے نہیں دیا اور وہ شخص پیاس کی شدت سے مر گیا' تو حضرت عمرؓ نے ان سب پر اس کی دیت عائد کر دی [۴]۔ آپ کا یہ فیصلہ تمام لوگوں کیلئے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتا تھا کہ آپ نے اس کو قتل خطاء قرار دیا تاکہ ریاست کے اندر کوئی شخص بھوک و پیاس سے زندگی نہ ہارے ورنہ انہیں ذمہ دار سمجھا جائے گا جنہوں نے مدد نہیں کی تھی۔

آپ ضرورت کو اکراہ کی مانند قرار دیتے تھے۔ اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرے' تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص نے اونٹنی چرا کر اسے ذبح کر لیا۔ مقدمہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا' تو آپ نے کثیر بن صلت کو ان کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا' لیکن بعد میں آپ نے فیصلے سے رجوع کر لیا اور فرمایا کہ "اگر یہ نہ سمجھ لیتا کہ تم انہیں بھوکا رکھتے ہو اور بھوک کی وجہ سے انہوں نے اللہ کے حرام کردہ کام کا ارتکاب کیا ہے' تو میں ان کے ہاتھ کٹوا دیتا' لیکن اب اگر انہیں چھوڑ بھی دوں تو تمہارے اوپر بھاری تاوان عائد کروں گا۔" چنانچہ آپ نے اس اونٹنی کی قیمت کا دوگنا تاوان عائد کیا [۵]۔" آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ کفالت عامہ کا بندوبست بالآخر حکومت کی ذمہ داری ہے' اس لئے اگر کسی وجہ سے وہ اس انتظام سے قاصر ہو' تو قطع ید کی سزا دینے کا بھی حق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے قحط کے دنوں میں قطع ید کی حد جاری نہیں کی تھی۔ روایت میں ہے کہ ایک شخص ذبح کی گئی اونٹنی کی شکایت لے کر آیا' تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "کیا تم اس پر راضی ہو کہ ہم تمہیں دو موٹی تازی تر و تازہ دودھ دینے والی اونٹنیاں دے دیں؟ کیونکہ ہم قحط کے زمانے میں قطع ید کی سزا نہیں دیتے [۶]۔" حضرت عمرؓ حاجت کو استحقاق کے قانونی اسباب میں شمار کرتے تھے' بشرطیکہ اس کی تکمیل میں کسی دوسرے کا کوئی نقصان نہ ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ ضحاک بن خلیفہ نے عریض میں سے نالی نکال کر محمد بن مسلمہ کی زمین سے گزارنی چاہی۔ محمد بن مسلمہ نے منع کیا تو اس پر ضحاک نے کہا کہ آپ مجھے کیوں روک رہے ہیں؟ حالانکہ اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں' بلکہ فائدہ ہی ہے کہ آپ بھی اس کے پانی سے اول و آخر اپنی زمین کو سیراب کر سکتے ہیں' لیکن محمد پھر بھی نہ مانے' اس پر ضحاک نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو بلوایا اور ان کو حکم دیا کہ ضحاک کو پانی کی نالی لے جانے

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) عبدالرزاق [illegible]

سے نہ روکو۔ محمد نے کہا کہ نہیں میں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ اس پر حضرت عمرؓ بولے کہ "تم کیوں اپنے بھائی کو روک رہے ہو' حالانکہ اس میں ان کا بھی فائدہ ہے اور تمہارا بھی' تم بھی اس سے سیراب ہو سکو گے۔ شروع میں بھی' اور آخر میں بھی تمہارا کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔" محمد پھر کہنے لگے "قسم بخدا' نہیں۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "قسم بخدا یہ ضرور گزاریں گے' گرچہ تمہارے پیٹ ہی پر سے گزارنا پڑے" اور حضرت عمرؓ نے انہیں حکم دیا کہ یہ پانی کی نالی نکال لیں اور ضحاک نے نالی نکال لی[1]۔ ابو سہل بن مالک نے اپنے والد سے سن کر بیان کیا ہے "امیر المومنینؓ نے اپنے غلام یرفا سے پوچھا کہ تم ہر گھوڑے کو کتنا چارہ کھلاتے ہو؟" یرفا نے کہا "تین تین میر کے قریب۔" امیر المومنینؓ نے یرفا کو ہدایت کی کہ وہ گھوڑوں کی نگہداشت کا خاص خیال رکھیں' اس لئے کہ گھوڑے عربوں کیلئے ان کے اہل بیت اور اہل خاندان کا درجہ رکھتے ہیں"[2]۔ "سلام بن مسکین تمیمی نے احنف بن قیس سے روایت کی ہے' ہم امیر المومنینؓ کی خدمت میں ایک زبردست فتح کی خبر لے کر حاضر ہوئے۔ ہم سے پوچھا "تم لوگ کہاں اترے ہو؟" ہم نے جواب میں اس جگہ کا نام لیا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ امیر المومنین فوراً ہمارے ساتھ ہو لئے اور سیدھے وہاں گئے جہاں ہم نے اپنے گھوڑے اور جانور وغیرہ باندھ دیئے تھے۔ انہیں حضرت عالی نے بغور دیکھا اور پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہا "ان بے زبان جانوروں سے یہ برتاؤ کرتے وقت تمہیں اللہ سے ذرا خوف نہ آیا' آخر ان کا بھی تو تم پر کچھ حق ہے۔ تم نے ان کو آزاد چھوڑ دیا ہوتا' تاکہ یہ کھلے میدانوں میں گھوم پھر کر پیڑ کے پتوں وغیرہ سے اپنا پیٹ بھرتے۔" ہم نے عرض کیا "امیر المومنینؓ! اللہ نے ہم کو اتنی بڑی فتح دی ہے' ہم چاہتے تھے جلد سے جلد یہ خبر آپ کو پہنچا دی جائے اور ملت کو بھی اس مژدہ سے مسرور کیا جائے"[3]۔

---

(۱) مالک ۷۴۶' بیہقی ۶/۱۵۷ (۲) جوزی ۱۵ (۳) جوزی ۱۱۳۔

O...... معاشی ترقی:

ا۔ جدید اور اسلامی تصور:

دور جدید میں دنیا کے ہر معاشی نظام کی اصل منزل مقصود معاشی ترقی ہے۔ ہر حکومت اور ایڈمنسٹریشن اسی کے حصول کیلئے سرگرم عمل دکھائی دیتی ہے۔ ہر سیاسی جماعت اسی کا نعرہ لگا کر عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ عوام کی کثریت اسی کیلئے رات دن سرگرداں ہے۔ ساری دنیا پر اس وقت ایک ہی دھن سوار ہے "معاشی ترقی۔" یوں تو ہر زمانے میں افراد اور معاشرے معاشی ترقی کیلئے تگ و دو کرتے رہے ہیں' اس لئے کہ یہ انسان کی دنیوی زندگی کو بہتر و خوشحال بنانے اور بہتر سے بہتر سہولیات پہنچانے کا اہم درجہ ہے' لیکن دور جدید نے اسے زندگی کا مقصد وحید بنا دیا ہے اور روحانیت و اخلاق پر مسند کر دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی لئے کہا تھا۔

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش [۱]

فکر معاش کو ہر فکر پر حاوی کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ حرص و ہوس' خود غرضی' مفادات پرستی اور ظلم و استحصال میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشی ترقی ایک سراب بن گئی ہے۔ حکیم الامتؒ کے بقول۔

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش مریز و کجدار کی نمائش
جہان مغرب کے بت کدوں میں' کلیساؤں میں' مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقل عیار کی نمائش [۲]

جنگ عظیم دوم کے بعد کلی معاشیات کے نظریے نے جنم لیا' تو قومی تعمیر نو اور معاشی ترقی کو ملکوں اور حکومتوں کی بنیادی ذمہ داری قرار دیا گیا' لیکن ہوس کی خونریزی نے عقل عیار کے خوشنما دعووں میں عوام الناس سے جو اصل سلوک کیا' اس کا اندازہ اقوام متحدہ کی ہیومن ڈویلپمنٹ رپورٹ ۱۹۹۲ء سے کیا جا سکتا ہے۔ جس کے مطابق ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۲ء کی تین دہائیوں کا نام نہاد عالمی ترقیاتی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے۔ امیر' امیر تر اور غریب' غریب تر ہو گئے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کی پانچ ارب آبادی میں سے امیر ترین ایک ارب لوگ غریب ترین ایک ارب لوگوں سے ۳۰ گنا زیادہ مالدار تھے۔ مختلف ملکوں کے درمیان یہ فرق آخری اندازوں کے مطابق ۲۰ فیصد امیر ترین لوگ' ۲۰ فیصد غریب ترین لوگوں سے ۱۵۰ گنا زیادہ مالدار رہیں۔ برطانوی اخبار گارجین نے اپنے اداریے میں اس المناک نتیجے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے "دنیا کی آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے کیلئے ترقی کی جن تین دہائیوں کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا۔ حقیقت میں وہ تنزلی کی دہائیاں ثابت ہوئیں [۳]۔" دور جدید میں معاشی ترقی سے جو مراد لیا جاتا ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی ترقی ایسا عمل ہے جس میں کل قومی آمدنی اور فی کس آمدنی میں حقیقی اور مسلسل اضافہ ہوتا ہے۔ آبادی میں اضافے کی رفتار کے مقابلے میں اشیاء و خدمات کی پیدائش اور صرف تیزی سے بڑھتی ہے۔ یہ اضافہ اگر زیادہ دیر تک جاری رہے

---

(۱) [illegible] ۷۶ (۲) ایضاً ۱۱۶ (۳) [illegible]

اور اس کا پھیلاؤ تمام پیشوں اور طبقوں تک ہو تو کہا جاتا ہے کہ معاشی ترقی ہو رہی ہے۔ معاشی ترقی خود بخود حاصل نہیں ہوتی اس کیلئے حکومتی سطح پر مختلف اقدامات کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس میں سب سے پہلی چیز مربوط منظم تصورات کا ایک مجموعہ (Doctrines) فراہم کرنا ہے جو عوام کی فکر و نظر کی رہنمائی کرے۔ ان کا رخ متعین کرے اور ان کے اندر ایک جذبہ اور امنگ پیدا کرے اور ان کے سامنے ایک ایسا معیار رکھے، جس سے وہ اپنی ترقی و تنزلی کی پیمائش کر سکیں۔

دوسری چیز سیاسی، سماجی، اخلاقی اور معاشی ماحول کی فراہمی ہے، جو پرامن، مستحکم اور ترقی کیلئے سازگار ہو، جہاں قانون کی بالادستی ہو عدل و انصاف ہو، جس میں مختلف افراد، طبقات اور گروہوں کے باہمی معاہدات و معاملات کو تحفظ حاصل ہو اور جائز حدود کے اندر ان کی معاشی آزادیوں کی ضمانت ہو۔ تیسری چیز حکومت کے وہ اقدامات ہیں، جو ترقی کو فروغ دیں اور اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس میں ان عوامل کو تحریک دینا شامل ہے، جو ترقی کا باعث بن سکتے ہیں۔ حسب ضرورت ان میں تبدیلی پیدا کرنا اور نئے نئے مفید عوامل کو سمجھنا اور انہیں اختیار کرنا وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً معاشی ذرائع وسائل کا بھرپور اور بہترین استعمال، انہیں پیداواری کاموں میں لگانا اور نفع بخش بنانا تاکہ قومی آمدنی میں اضافہ ہو اور لوگوں کی آمدنی بھی بڑھے۔ اس طرح نئے طریق پیدائش اختیار کرنا، تقسیم کار کا نیا عمل اپنانا پیداوار میں تخصص حاصل کرنا، بچتوں کی عادت ڈالنا اور انہیں سرمایہ کاری کے مختلف چینلز میں استعمال کرنے کی ترغیب دینا اور سہولیات مہیا کرنا تاکہ اس کی شرح نمو (Growth Rate) میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ مزید یہ کہ مزدوروں میں ہنرمندی، صلاحیت اور مہارت پیدا کرنا، ان کی استعداد کار بڑھا کر ان کے مطابق معقول معاوضوں کا انتظام کرنا اور ان کی شرائط کار بہتر بنانا، ان کی اخلاقی، ملی اور پیشہ ورانہ تربیت کرنا، ان کی عزت و توقیر کر کے نئے جذبے کے ساتھ قومی دھارے میں انہیں شریک کرنا۔ تعلیم کو فروغ دینا اور قومی و ملکی ضرورت کے مطابق ہر شعبہ زندگی کیلئے مطلوبہ افراد کی کھیپ تیار کرنا، جو اعلیٰ تعلیم یافتہ، ماہر اور قابل ہو اور دینی جذبے، ثقافتی شعور، حب الوطنی سے پوری طرح سرشار ہو، جو دیانتداری و خدمت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔ جدید سیکولر تصور کے مطابق معاشی ترقی کی پیمائش کے تین پیمانے ہیں۔

۱۔ حقیقی قومی آمدنی کا طریقہ۔

۲۔ فی کس آمدنی کا طریقہ۔

۳۔ بہتر معیار زندگی کا طریقہ۔

اگرچہ معاشی مفکرین ان پیمانوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے کر اس کے حق میں دلائل دیتے ہیں اور دوسروں کے دلائل کا توڑ پیش کرتے ہیں، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ معاشی ترقی کو محض فنی طور پر جانچنے کے بجائے عملی و افادی پہلو سے دیکھا جائے تو تینوں پیمانے بیک وقت استعمال کر کے حقیقی اور متوازن ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جدید مسلم مفکرین کے نزدیک اسلام کا تصور ترقی مقاصد و مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کے بقول "اقتصادی ترقی کے خالص مادہ پرستانہ تصور کو اسلام مسترد کرتا ہے کیونکہ اسلام محدود معنوں میں مذہب نہیں، بلکہ اس کا مخصوص اقتصادی، سماجی پروگرام ہے۔ اس پروگرام کا محور دنیا کے متعلق اس کا مخصوص زاویہ نظر، خاص اخلاقی قدریں اور منفرد اصول ہیں"(۱)۔ "پروفیسر نسیم شاہد کا کہنا ہے "اسلامی معاشرے میں حیات انسانی کی جملہ سرگرمیوں کو اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر منظم کیا جاتا ہے اور تمام معاشی فیصلے اخلاقی اقدار کی روشنی میں کئے جاتے ہیں۔ اس طرح اسلام معاشی جدوجہد کو اخلاقی حدود سے آشنا کرتا ہے اور معاشی سرگرمیوں کی اس طرح ضابطہ بندی کرتا ہے کہ وہ انسانی شخصیت و کردار کے روحانی ارتقا اور معاشرہ میں باہمی تعاون و تکافل کا

---

(۱) خورشید احمد، ۱۸۱

زبردست ذریعہ بن جاتی ہیں[۱]۔ اس رپورٹ کے مطابق ترقی کے اسلامی فارمولے کو اس طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

ترقی کے اسلامی تصور کی وضاحت کرتے ہوئے جماعت اسلامی کی قائم کردہ کمیٹی نے ۱۹۷۹ء میں اپنی رپورٹ میں لکھا "اس مجلس کی رائے میں کسی بھی قوم کی حقیقی ترقی محض اس کی یک رخی مادی ترقی نہیں ہوتی' بلکہ ترقی یافتہ یا ترقی پذیر قوم وہ ہے' جو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ علمی و فکری اور اخلاقی و تہذیبی لحاظ سے بھی اسی رفتار سے ترقی کر رہی ہو بصورت دیگر اخلاقی انحطاط مادی ترقی کے تعاقب میں لگا رہتا ہے اور کسی نہ کسی مرحلے میں یکایک مادی ترقی کے نشے میں قوم کو پیچھے سے دبوچ لیتا ہے[۲]"۔

ترقی برابر ہے:

۱۔ معاشی ترقی (یعنی قومی دولت' رفتار پیداوار' ورفی کس آمدنی میں مسلسل اضافہ بذریعہ منصفانہ تقسیم دولت۔)

۲۔ اخلاقی (دینی و تہذیبی) ترقی۔

۳۔ جمہور کی اقتصادی فلاح و بہبود میں مسلسل اضافہ[۳]۔

بعض مغربی مفکرین بھی سیکولر تصور ترقی کی خامیوں کا ادراک کرنے لگے ہیں اور اس کے مقابلے میں اسلامی تصور کی عملیت اور حقیقت پسندی میں دلچسپی کا ظہار کرنے لگے ہیں۔ اگرچہ فی الحال ان کی تعداد بہت محدود ہے' لیکن اگر اسلامی معاشی نظام اور ترقیاتی ماڈل کو گہری تحقیق کے بعد دور حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے مدلل انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے' تو یہ متبادل عالمی اقتصادی نظام کے طور پر پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک فرانسیسی سکالر "Roger Garaudy" جو کسی زمانے میں کیمونزم سے متاثر تھا کہتا ہے کہ

"Muslim countries should develop their own model and methods for economic development and should provide the west and east with the Islamic model which relies heavily on the spiritual as well as material well-being[4].

معاشی ترقی کے ضمن میں ایک اور اہم پہلو جو ماہرین معاشیات کی توجہ کھینچ رہا ہے' وہ غیر معاشی عوامل کا کردار ہے۔ معاشی جمود سے فعالیت کے سفر کی ابتدا میں کسی قوم اور ملک کے 'تہذیبی و تمدنی عوامل اہم کردار ادا کرتے ہیں اور بعد میں بھی معاشی ترقی کے فنی لوازمات کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں کیونکہ معاشی تغیرات تن تنہا ظہور پذیر نہیں ہوتے' اس کے پہلو بہ پہلو انسانی تہذیب و تمدن کے ہر گوشے میں بنیادی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ دور جدید میں "ترقیاتی معاشیات" میں ترقیاتی عمل کے صحیح فہم کیلئے ایسے غیر معاشی عوامل کا تجزیہ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے' جو اس پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی صحیح پیمائش کا کوئی پیمانہ دریافت نہیں ہوا کہ مقداری شکل میں انہیں ظاہر کیا جا سکے' اس لئے انہیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے' لیکن معاشیات کو سائنسی علم بنانے کے خواہشمند معیشت دان جب معاشی ترقی کے فارمولوں کو قطعی و حتمی سمجھ کر ایسے ممالک پر لاگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں' جن کی نفسیات' مذہب' تہذیب' سیاست' ثقافت اور نظریات مختلف ہوتے ہیں تو وہ بری طرح غیر مؤثر اور ناکام ہی نہیں' بلکہ بسا اوقات اور تباہ کن ثابت ہوتے ہیں' تو غیر معاشی تغیرات کے وجود کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا[۵]۔ معاشی ترقی کے سلسلے میں ایک اور اہم مسئلہ اسلام کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ہے۔ جدید عالم اسلام پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں' تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ چھپن اسلامی ملکوں میں سے کوئی بھی ترقی یافتہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کویت اور قطر بھی نہیں جن کی فی کس آمدنی دنیا میں

---

(۱) ایضاً ۳۲ (۲) ایضاً ۳۶ (۳) ایضاً ۳۹ (٤) Buraey 208 (۵) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ... ۱۷

سب سے زیادہ ہے کیونکہ معیشت کے ہر شعبے میں وہ پسماندہ ہیں' صرف تیل کے قدرتی عطیے پر ان کی امارت کا دارومدار ہے' اس نے خود اسلام ہی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لوگ شعوری یا لاشعوری طور پر مسلمانوں کی ناکامی کو اسلام کی ناکامی سمجھتے ہیں۔ جب مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ علم معاشیات پر مغربی مفکرو نظریات کے تسلط کی وجہ سے اسلامی نظام معیشت اور معاشی ترقی کے بارے میں اس کے لائحہ عمل اور تاریخی کردار کے بارے میں لاعلم ہیں' تو مغربی مفکرین کا غلط فہمی میں مبتلا ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔

احمد بافر کے تجزیے کے مطابق "دو تین مغربی سکالروں کے علاوہ اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ اسلام معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔" وہ مثال کے طور پر S.D. Goitein کو پیش کرتے ہیں' جس کے مقالے کو وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ اس کے مطابق مسلم دنیا کے معاشی انحطاط کی وجہ اسلام کا سیکولر زندگی اور ریاست کے بارے میں غیر لچک دار رویہ ہے۔" ایک فرانسیسی سکالر اور بعض دیگر مغربی سکالروں نے اس کے نقطہ نظر کو مسترد کر کے یہ تصور پیش کیا کہ تجارت اور معاشی ترقی میں مسلمانوں کی بدحالی کی وجہ دراصل اسلامی تصوف اور تقدیر پر ایمان ہے' جو افراد کے اندرونی محرکات' مہمات اور خطرہ مول لینے کی راہ میں رکاوٹ ہیں' جو معاشی ترقی کیلئے بہت ضروری ہیں۔ Bernard Lewes کی رائے میں اسلام کے سلسلے میں مغربی دانش کی عمومیات کے مطابق اس کی وجہ سماجی اقدار بھی ہیں' جیسے خاندان سے وفاداری' جسے جدید دور میں اقرباء پروری اور قدیم پارسائی و مذہبی وفاداری' جسے تقدیر پرستی کہا جاتا ہے۔[1]

یہ ہے معاشی ترقی کے بارے میں دور جدید کے تصورات و نظریات' اصول و ضوابط' اثرات و نتائج کے چند اہم پہلوؤں اور اسلام کے بارے میں پائی جانے والی بعض غلط فہمیوں کا انتہائی مختصر سا خلاصہ' ان کو سامنے رکھتے ہوئے ہم حضرت عمر فاروقؓ کے خیالات' اقدامات اور پالیسیوں کا جائزہ لیں تو شاید ہی کوئی ایسا پہلو رہ جائے' جسے حل کرنے کیلئے ہمیں مکمل رہنمائی نہ مل سکے۔ معاشی ترقی کے بارے میں خود اسلامی نظریے اور حکمت عملی کا جامع اور واضح تصور بھی آپ ہی عہد مبارک پر غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ آپ ہی کے عہد مبارک میں اسلامی ریاست معاشی ترقی کے بام عروج تک پہنچی۔ اس میں تمام روحانی' اخلاقی' مذہبی' تہذیبی' نفسیاتی' سیاسی' معاشرتی اور معاشی عوامل و متغیرات نے بھرپور کردار ادا کیا۔ آپ نے نہایت دانشمندی اور توازن کے ساتھ انہیں ہمہ پہلو ترقی کیلئے استعمال کیا۔ معاشی ترقی اسلام کے معاشی نظام کا اہم ہدف بھی ہے اور لازمی نتیجہ بھی۔ نبی محترمؐ کو پورا یقین تھا کہ آپ نے جس انقلاب کی بنیاد رکھی ہے' وہ دنیا میں فقر و فاقہ کی ظلمتوں کی جگہ ترقی و خوشحالی کا اجالا لائے گا۔ خوف و دہشت کی بساط لپیٹ کر امن و آشتی کا ماحول فراہم کرے گا اور بادشاہت کا خاتمہ کر کے انسانی فلاح و آزادی کی نوید ثابت ہوگا۔ عہد فاروقی آپ کے اسی یقین کی عملی تصویر بن کر دنیا کے سامنے آیا۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک صاحب آئے اور آنحضورؐ سے فقر و فاقہ کی شکایت کی پھر دوسرے صاحب آئے اور راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی شکایت کی۔ اس پر آنحضورؐ نے فرمایا "عدی! تم نے مقام حیرہ دیکھا ہے؟" میں نے عرض کی کہ "میں نے نہیں دیکھا ہے' البتہ اس کے متعلق مجھے معلومات ضرور ہیں۔" آنحضورؐ نے فرمایا "اگر تم کچھ دنوں اور زندہ رہ سکے تو دیکھو گے کہ ہودج میں ایک عورت حیرہ سے سفر کرے گی اور مکہ پہنچ کر کعبہ کا طواف کرے گی اور اللہ کے سوا سے کسی کا بھی خوف نہیں ہوگا (کیونکہ راستے محفوظ ہوں گے۔)" میں نے (حیرت سے) اپنے دل میں کہا "پھر قبیلہ طے کے ان ڈاکوؤں کا کیا ہوگا جنہوں نے ہر جگہ شر و فساد بپا کر رکھا ہے۔" آنحضورؐ نے مزید ارشاد فرمایا "اگر تم کچھ دنوں زندہ رہ سکے تو کسریٰ کے خزانوں کو کھولو گے۔" میں (حیرت میں) بول اٹھا "کسریٰ بن ہرمز (ایران کا بادشاہ)" آنحضورؐ نے فرمایا "ہاں کسریٰ بن ہرمز اور اگر تم کچھ دنوں زندہ رہے تو دیکھو گے کہ ایک شخص اپنے ہاتھ میں سونا یا چاندی بھر کر نکلے گا' اسے کسی آدمی کی تلاش ہوگی جو اسے قبول کر لے' لیکن اسے کوئی ایسا آدمی نہیں ملے گا جو اسے قبول

---

(1) Buraey:171

کرے۔ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا جو دن مقرر ہے (قیامت کا) اس دن انسان اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ درمیان میں کوئی ترجمان نہ ہوگا۔ "اللہ تعالیٰ اس سے دریافت فرمائیں گے "کیا میں نے تمہارے پاس رسول نہیں بھیجے تھے جس نے تم تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا" وہ عرض کرے گا "آپ نے بھیجا تھا۔ اللہ تعالیٰ دریافت فرمائیں گے "کیا میں نے تمہیں مال نہیں دیا تھا؟ کیا میں نے اس کے ذریعہ تمہیں فضیلت نہیں دی تھی؟" وہ عرض کرے گا "آپ نے دیا تھا۔ "پھر وہ اپنی داہنی طرف دیکھے گا اور سوا جہنم کے سوا اور کچھ نہیں نظر آئے گا۔ پھر بائیں طرف دیکھے گا اور ادھر بھی جہنم کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ عدی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا آپ فرمار ہے تھے کہ "جہنم سے ڈرو اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ ہو (اسے صدقہ میں دے کر) اگر کسی کو کھجور کی گٹھلی میسر نہ آسکے تو (کسی سے) ایک اچھا کلمہ ہی کہہ دے۔" عدی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ "میں نے ہودج میں بیٹھی ہوئی عورت کو تو خود دیکھ لیا کہ حیرہ سے سفر کیلئے نکلی اور (مکہ پہنچ کر) کعبہ کا اس نے طواف کیا اور اسے اللہ کے سوا اور کسی (ڈاکو وغیرہ کا راستے میں) خوف نہیں تھا اور مجاہدین کی اس جماعت میں تو میں خود شریک تھا جس نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کئے تھے اور اگر تم لوگ کچھ دنوں اور زندہ رہے تو وہ بھی دیکھ لو گے جو حضور اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ایک شخص اپنے ہاتھ میں (سونا چاندی) بھر کر نکلے گا اور اسے لینے والا کوئی نہیں ملے گا[1]۔" رسول اکرمؐ کی آخری پیش گوئی بھی فاروق اعظمؓ کے عہد میں پوری ہوئی اور یمن کے علاقے میں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ رہا۔

عمرو بن شعیبؒ کہتے ہیں کہ حضرت معاذؓ جب سے رسول اللہ نے انہیں یمن بھیجا تھا وہیں رہے تا آنکہ رسول اللہ اور حضرت ابو بکرؓ کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور انہوں نے بھی انہیں ان کی پہلی جگہ پر واپس بھیج دیا۔ پھر حضرت معاذؓ نے ان (حضرت عمرؓ) کے پاس لوگوں کی زکوٰۃ کا تہائی حصہ بھیجا تو حضرت عمرؓ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں مال جمع کرنے یا جزیہ وصول کرنے کیلئے نہیں بھیجا بلکہ اس لئے مامور کیا ہے کہ تم امیر لوگوں سے وصول کرکے ان کے محتاجوں میں واپس کردو۔" اس پر حضرت معاذؓ نے کہا "میں نے کوئی ایسی چیز آپ کو نہیں بھیجی کہ یہاں مجھے اس کا کوئی مستحق وصول کرنے والا مل رہا ہو۔" پھر اگلے سال حضرت معاذؓ نے آدھی زکوٰۃ انہیں بھیجی اور دونوں میں پہلی جیسی گفتگو کا تبادلہ ہوا اور جب تیسرا سال گزرا تو حضرت معاذؓ نے تمام کی تمام زکوٰۃ ان کے پاس بھیج دی اور جواباً حضرت عمرؓ نے وہی پہلی سی بات کہی۔ تب حضرت معاذؓ نے کہا "یہاں مجھے ایک (ضرورت مند) بھی ایسا نہیں ملتا جو مجھ سے کچھ (صدقہ و زکوٰۃ) لینے کا مستحق ہو[2]۔"

۳۔ عہد فاروقیؓ ۔۔۔ معاشی ترقی کی پیمائش:

عہد فاروقی میں جو حقیقی اور بے پناہ معاشی ترقی ہوئی اسے جانچنے کیلئے دور جدید کا جو بھی پیمانہ استعمال کیا جائے وہ اس کی گواہی دیتا ہے۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے وقت معیشت کی جو حالت تھی اس کا موازنہ شہادت کے وقت سے کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے بلکہ قیصر و کسریٰ کی عظیم اور ترقی یافتہ سلطنتوں کے عہد میں خود وہاں کے عوام کی جو معاشی حالت تھی اس کا تقابل اگر فاروقی حکومت کے زیر سایہ آنے کے بعد کے معاشی حالات سے کیا جائے تو بہت بڑا فرق دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے عادلانہ معاہدات، معاشی آزادیاں، مراعات و سہولیات، رفاہی و فلاحی اقدامات، مفتوحہ زمینوں کے حقوق مزارعت کی انہیں فراہمی، ناجائز ٹیکسوں کو ختم کرکے ان کی جگہ جزیہ و خراج کی نرم شرائط کے نفاذ، رحمت و شفقت کی حکمت عملی، ان میں غربت و افلاس کے خاتمے اور کفالت عامہ کی ذمہ داری قبول کرکے مقامی لوگوں اور غیر مسلموں کو معاشی ترقی کے ثمرات سے بھرپور استفادے کا حق دے دیا جس کی وجہ سے ان کی حالت سنور گئی اور وہ مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے اور اسلامی ریاست کے دفاع کیلئے خود اپنے سابق حکمرانوں اور ہم مذہب فوجوں کے مدمقابل سینہ سپر ہو گئے۔ معاشی ترقی کے رخ کے صحیح ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہوتی ہے کہ اس کا پھیلاؤ معاشرے کے تمام طبقوں اور پیشوں کی طرف ہوتا ہے کہ پسماندہ اور پسے ہوئے

(۱) بخاری، ج ۱، ۱۷۵ (۲) عبید ۵۹۸

عوام الناس کی حالت میں مثبت تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ انہیں حقوق اعتماد اور خوشحالی فراہم کرتی ہے، غیر منصفانہ خوفناک معاشی تفاوت کو کم کرتی ہے۔ مراعات یافتہ محدود طبقے کی تعیشاتی سطح میں بے پناہ اضافہ ترقی کے بجائے تنزلی کی نشاندہی کرتا ہے۔ فاروق اعظمؓ نے محض شہروں پر توجہ نہیں دی بلکہ دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں، دیہاتیوں اور کسانوں، غریبوں، بیواؤں اور مفلسوں کو خصوصی توجہ کا مرکز بنایا۔ زکوٰۃ کی آمدنی کو مقامی علاقوں میں ہی تقسیم کرنے کی پالیسی کو سختی سے نافذ کرنے کا یہی مقصد تھا، جس کی وجہ سے یمن کے پورے علاقے میں زکوٰۃ کا کوئی مستحق نہ رہا[1]۔ اسی طرح وظیفے میں روزینے مقرر کرتے وقت بھی دور دراز کے لوگوں، ضرورت مندوں یہاں تک کہ غلاموں کا بھی خیال رکھا۔

قیس بن حازم کہتے ہیں جب حضرت عمرؓ شام تشریف لائے، تو حضرت بلالؓ ان کے پاس آئے، اس وقت حضرت عمرؓ کے دربار میں لشکروں کے امراء بھی موجود تھے۔ حضرت بلالؓ پکارنے لگے "اے عمرؓ، اے عمرؓ، اے عمرؓ" حضرت عمرؓ نے کہا "یہ رہا عمر!" تب حضرت بلالؓ نے کہا "تم ان عوام اور اللہ کے درمیان واسطہ ہو، اور تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی نہیں ہے۔ تم اپنے سامنے کے لوگوں، دائیں جانب والوں اور بائیں جانب والوں پر نگاہ ڈالو۔ خدا کی قسم! یہ لوگ جو تمہارے پاس آئے ہوئے ہیں صرف پرندوں کا گوشت کھا کر جی رہے ہیں۔" حضرت عمرؓ نے کہا "اے بلالؓ تم سچ کہتے ہو، میں اس مجلس سے اس وقت تک نہیں اٹھوں گا تاوقتیکہ یہ (امراء) میری طرف سے اس بات کی ضمانت نہ لے لیں کہ ہر مسلم فرد کو دو مد گیہوں اور ان کے مطابق سرکہ اور تیل ملتا رہے گا۔ اس پر ان لوگوں نے کہا "اے امیر المومنینؓ! ہم سب آپ کی طرف سے ضمانت لیتے ہیں کہ انہیں یہ ملتا رہے گا اور یہ ہمارا فریضہ ہوگا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مال و دولت اور محصولات کی فراوانی و کشائش کر دی ہے۔" پھر حضرت عمرؓ نے کہا "اچھا اب ٹھیک ہے"[2]۔ فی کس غلے کی مقدار کے تعین کیلئے نہایت سائنٹفک طریقہ اختیار کیا۔ حارث بن المضرب کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک جریب آٹا گوندھنے کا حکم دیا، پھر اس کی روٹیاں پکوائیں اور ان روٹیوں کو زیتون کے تیل میں چور کر ثرید بنوایا۔ بعد ازاں تیس آدمیوں کو بلا کر دوپہر کو انہیں وہ ثرید کھلایا اور انہیں واپس بھیج دیا، پھر شام کے کھانے پر بھی ایسا ہی کیا۔ بعد ازاں کہنے لگے "فی کس ماہانہ خوراک کیلئے دو جریب غلہ کافی ہے۔" چنانچہ ہر فرد مرد، عورت، غلام کا دو دو جریب غلہ ماہوار راتب مقرر کر دیا[3]۔ "غلاموں کیلئے بھی روزینے مقرر کرنے کا نہایت خوشگوار نتیجہ نکلا، مالکان پر ان کے خرچے کا بوجھ کم ہوگیا اور وہ رضاکارانہ طور پر غلاموں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنے لگے۔ اس طرح حکومت و عوام کے مابین دو طرفہ تعاون کی عظیم روایت پیدا ہوئی، جس نے ترقی کی رفتار تیز کر دی۔

ابو عبیدؒ "ہمارے خیال میں حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو جن کا بیت المال میں کوئی حصہ نہیں، جو راتب مقرر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان غلاموں کے آقا بیت المال میں ان (غلاموں کی) جانب سے رضاکارانہ زکوٰۃ ادا کرتے تھے، چنانچہ اس کے عوض ان کیلئے یہ راتب انہوں نے مقرر کر دیئے حالانکہ وہ (ادائی زکوٰۃ) ان پر واجب نہ تھی۔" سعید بن المسیب نے اس کی تفسیر یوں کی ہے، عبدالخالق بن سلمہ شیبانی کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیب سے صدقہ فطر کے بارے میں دریافت کیا، تو انہوں نے کہا "رسول اللہؐ کے زمانہ میں صدقہ فطر کی مقدار فی کس ایک صاع کھجور، یا نصف صاع گیہوں مقرر تھی۔ "حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مہاجرین کی ایک جماعت نے ان سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے کہا کہ "اگر آپ مناسب خیال فرمائیں، تو ہم اپنے غلاموں کی طرف سے دس (صاع) سالانہ بیت المال کو پیش کرتے رہیں۔" حضرت عمرؓ نے کہا "یہ تمہارا بڑا اچھا خیال ہے اور میری رائے ہے کہ ان (غلاموں) کیلئے میں ماہانہ دو جریب راتب مقرر کر دوں۔" چنانچہ اس طرح امیر المومنین (عمرؓ) جو کچھ غلاموں کے نام سے لیتے تھے اس سے زیادہ نہیں دے دیا کرتے تھے۔ (لیکن ان کے بعد جب) جب یہ لوگ (حکام) آئے تو

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] ۲۲ (۳) [illegible] ۲۳ [illegible]

کہتے ہیں "ہمیں دس (صاع) دیتے رہو اور ہم (غلاموں کے) وجریب دینا بند کر دیں گے۔" یہ ان کی غلطی ہے اور اس سے کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں نکلے گا[1]۔"
بہتر معیار زندگی کی فراہمی اور معاشی ترقی کے ثمرات کو عوام الناس تک منتقل کرنے اور ان کی فلاح و بہبود میں بتدریج اضافہ کرتے جانے کے فارمولے کا اندازہ ہم "کفالت عامہ" کے عنوان سے دیئے ہوئے مواد سے کر سکتے ہیں۔ دور جدید میں معاشی ترقی کی پیمائش کا دوسرا اہم طریقہ حقیقی قومی آمدنی میں اضافے کو جانچنا ہے۔ "ریاست کے معاشی کردار" کے عنوان کے تحت ہم ابتدا ہی میں یہ جائزہ لے چکے ہیں کہ عہد نبویؐ اور عہد صدیقیؓ میں ضروریات کے مقابلے میں آمدنی کم رہی اس لئے پالیسی یہ رہی کہ ریاست کو حاصل ہونے والا سارا مال ہی فوراً تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ عہد نبویؐ میں یکمشت حاصل ہونے والی زیادہ سے زیادہ آمدنی آٹھ لاکھ تک پہنچی وہ بھی صرف ایک مرتبہ۔ اسی طرح عہد صدیقیؓ میں ایسی ہی صورتحال رہی اور حاصل ہونے والی ساری آمدنی فوراً خرچ کر دی جاتی تھی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی چھ ماہ تو مانعین زکوٰۃ کو کنٹرول کرنے اور جھوٹے مدعیان نبوت کی سرکوبی اور اسلامی اقتدار کو بحال کرنے میں صرف ہوئے البتہ سیاسی استحکام حاصل ہونے کے بعد محاصل کی آمدنیوں میں اضافہ ہوا مثلاً زکوٰۃ کی آمدنی بحال ہوئی تو حکومت کے ذریعے مستحقین میں تقسیم کر دینے کا سلسلہ بہتر ہوا جو بھی مال آتا ابتداً بیت المال میں رکھا جاتا۔ معادن قبیلہ جہینہ بنی سلیم سے بہت سا مال آیا یہ سب بیت المال میں رکھا جاتا[2]۔ آنے والی آمدنی کو نام بنام برابر برابر تقسیم کرتے، آزاد اور غلام، مرد اور عورت، خورد و کلاں سب کو مساوی رکھتے۔ بسا اوقات اونٹ، گھوڑے اور ہتھیار خرید کر لوگوں کو جہاد کیلئے سوار کرتے۔ ایک سال انہوں نے بادیہ سے لائی ہوئی چادریں خرید کر بیواؤں میں تقسیم کر دیں۔ غنیمت سے حاصل ہونے والے مال کے خمس میں بھی اضافہ ہوا۔ مسیلمہ کذاب اور اس کے پشت پناہ قبیلے بنو حنیفہ کے سرنگوں ہونے پر صلح نامہ کی شرائط میں سونا، چاندی، مویشی، ہر بستی کے ایک باغ اور پسندیدہ مزرعہ رکھی گئیں، جن سے ریاست کو بھی کافی آمدنی حاصل ہوئی[3]۔ بعد ازاں عراق و شام کی جانب مجاہدین کی پیش قدمی کے دوران مال غنیمت اور جزیہ و خراج کی رقمیں دار الخلافہ میں آنا شروع ہوئیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صفر ۱۲ھ میں حیرہ فتح ہوا تو وہاں کے لوگوں نے دس ہزار دینار، کسریٰ کے موتی اس کے خاندان کی متروکہ زمینیں اور چار درہم فی کس کے حساب سے سالانہ جزیہ ادا کرنے پر صلح کر لی۔ نواحی علاقوں نے دس یا بیس لاکھ درہم سالانہ ادا کرنے پر مصالحت کی[4]۔ آپ کی پالیسی یہی رہی کہ جتنا مال آتا تھا اسے جلد از جلد تقسیم کر دیتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ "میرے والد نے اپنی خلافت کے پہلے سال غنیمت تقسیم کی۔ انہوں نے ہر آزاد، غلام، عورت اور باندی کو دس دس درہم دیئے۔ دوسرے سال غنیمت تقسیم کی تو بیس بیس درہم دیئے[5]۔"

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں بیت المال ان کی جائے قیام "سنح" میں تھا اس کا کوئی محافظ نہیں ہوتا تھا۔ ان سے کہا گیا اے خلیفہ رسول آپ بیت المال میں کسی ایسے شخص کو مقرر کیوں نہیں کر دیتے جو اس کی حفاظت کرے۔ اس پر انہوں نے جواب دیا "کوئی اندیشہ نہیں۔" راوی کے لفظوں میں نے پوچھا "کیوں؟" انہوں نے کہا "وہ مقفل ہے۔" راوی کہتے ہیں کہ "اس میں جو کچھ ہوتا تھا وہ دے دیا کرتے تھے۔ جب وہاں سے مدینے منتقل ہوئے تو بیت المال بھی اس مکان میں منتقل کیا جس میں عہد نبویؐ میں تھا[6]۔" آپ کی وفات کے بعد جب اسے کھولا گیا تو اس میں صرف ایک تھیلی ملی جس میں سے صرف ایک درہم نکلا۔ عہد نبویؐ میں ایک وزن کرنے والا تھا حضرت ابو بکرؓ کے پاس جو مال آتا وہی وزن کرتا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ ان کے پاس آنے والا مال کس مقدار کو پہنچی تو اس نے جواب دیا "دو لاکھ درہم[7]۔" معاشی ترقی کو قومی آمدنی میں اضافے کے پیمانے سے اگر ناپا جائے، جیسا کہ دور جدید میں سب سے زیادہ ترجیح اسی کو دی جاتی ہے تو ہمیں معلوم

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible] (۷) [illegible]

ہوتا ہے کہ آپ کے عہد مبارک میں اس میں جو اضافہ ہوا اس پر تحقیق کرے اور اس کا مکمل احاطہ کرنے کیلئے ایک الگ مقالے کی ضرورت ہے۔ اس وقت کے معاشی نظام اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے بیت المال کو بنیاد وسیع رہنا کہتے ہیں کیونکہ اس پر ملک کے تمام لوگوں کا حق سمجھا جاتا تھا۔ اس کے تمام ذرائع آمدن میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ یہ ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ اس سے تمام ضرورت مندوں کی کفالت کی جاتی تھی' اسی سے عوام کے وظائف مقرر ہوئے۔ اسی سے تمام سرکاری اخراجات پورے ہوتے تھے' علاقوں میں تعمیر و ترقی کے منصوبوں پر عمل ہوتا تھا۔ آپ نے صوبائی سطح پر بھی بیت المال قائم کرے' تاکہ مقامی ضروریات کو بروقت و وسیع پیمانے پر پورا کیا جاسکے۔ مثلاً کوفہ میں حضرت سعدؓ نے مرکزی مسجد کے محراب کے سامنے ایک محل بنایا' اس میں بیت المال بھی تھا خود بھی وہیں رہتے تھے۔ اتفاق سے کسی نے نقب لگا کر کچھ مال چرا لیا' حضرت سعد نے گھر اور بیت المال کا محل وقوع حضرت عمرؓ کی طرف لکھ بھیجا۔ انہوں نے تحریر فرمایا "تم مسجد کو اس طرح منتقل کرو کہ وہ گھر کے پہلو میں ہو اور گھر قبلہ رو ہو کیونکہ مسجد رات دن آباد رہتی ہے اور ان لوگوں کی بدولت بیت المال محفوظ رہے گا[۱]"۔

بیت المال کی آمدنی کا آپ کے ابتدائی دور میں سب سے بڑا ذریعہ مال غنیمت تھا۔ فتوحات کے نتیجے میں پانچواں حصہ سرکاری خزانے میں آتا تھا۔ فاروق اعظمؓ نے جب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو عراق کے سرحدی علاقے فتح ہو چکے تھے اور سواد کا بھی آدھا حصہ مسلمانوں کے زیر قبضہ آچکا تھا۔ ادھر شام میں مہمات جاری تھیں' کئی علاقوں سے ہرقل کی فوجیں پسپا ہو چکی تھیں اور دمشق مسلمانوں کے محاصرے میں تھا[۲]۔ آپ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی لوگوں کو فارس اور عراق کی طرف جہاد کیلئے تیار کیا۔ طبری کی روایت کے مطابق جس وقت حضرت ابو بکرؓ کی وفات ہوئی حضرت عمرؓ نے نماز فجر سے قبل سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ لوگوں کو مثنی بن حارثہ شیبانی کے ساتھ اہل فارس کی لڑائی پر آمادہ کیا۔ جب صبح ہوئی تو لوگوں سے بیعت لی پھر جنگ فارس (عراق) کیلئے مدعو کیا۔ لوگ بیعت (خلافت) کیلئے لگاتار آتے رہے۔ تین روز میں بیعت سے فراغت ہو گئی' آپ لوگوں کو ہر روز جنگ فارس کیلئے ابھارتے رہے' مگر کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کیونکہ اہل فارس کے تسلط' شوکت اور مختلف اقوام پر ان کی حکمرانی کی وجہ سے عربوں کے دلوں میں ان کا بہت زیادہ رعب چھایا ہوا تھا' وہ ان کی طرف رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ چوتھے دن پر لوگوں کو جنگ عراق کی دعوت دی' چنانچہ سب سے پہلے جن لوگوں نے اس پر لبیک کہی' وہ ابو عبید بن مسعود اور سعد بن عبید انصاری بعد ازاں دیگر مسلمانوں نے اس جنگ کیلئے اپنی خدمات پیش کرنا شروع کر دیں۔ جب فوج تیار ہو گئی' تو آپ نے لوگوں کے اصرار کے باوجود کسی سابق الاسلام شخص کو امیر بنانے کے بجائے ابو عبید بن مسعود کو امیر مقرر کیا اور فرمایا "بخدا! میں ایسے ہی شخص کو اس فوج کا امیر بناؤں گا' جس نے سب سے پہلے اپنا نام جہاد کیلئے پیش کیا ہے[۳]"۔ "ان مہمات کیلئے لوگوں کو آمادہ کرنے کیلئے خوف دور کرنا اور معاشی محرکات فراہم کرنا ضروری تھا' چنانچہ حضرت مثنیٰ بن حارثہؓ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "اے لوگو! تم عراق کی جنگ کو کوئی بہت بڑا معرکہ نہ سمجھو کیونکہ ہم نے فارس کے شاداب علاقوں پر قبضہ جما لیا ہے اور سواد کے بہترین نصف پر ہم غالب ہو گئے ہیں اور تقسیم کر کے ہم اس سے بہت کچھ حاصل کر چکے ہیں اور ہمارے پیش رو افراد کو ان پر جرأت حاصل ہو گئی ہے۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ آئندہ بھی ہم کو ایسی ہی کامیابی حاصل ہو گی[۴]"۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے جامع تقریر کی' اسلام کے غلبے' اللہ کی رضاجوئی کے ساتھ ساتھ معاشی فوائد و ترقی کی طرف بھی اشارہ کیا تاکہ دین و دنیا دونوں کی بھلائی کا حصول قوت محرکہ کے طور پر کام کرے اور ہر طرح کے لوگوں کو متحرک کر دے۔ اسلام میں دونوں چیزیں ہی پسندیدہ ہیں۔ اگرچہ مقصود اعلیٰ آخرت ہی کی بھلائی ہے۔ روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر یہ تقریر کی کہ "مسلمانو! تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ حجاز میں تمہاری بودوباش کی صرف یہی صورت ہے

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible]

کہ تم چارے کی تلاش میں ادھر ادھر گھومتے رہو اس کے سوا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ کہاں ہیں وعدۂ الٰہی پر غربت اختیار کرنے والے اور وطن ترک کرنے والے 'تم اس ملک میں جاؤ' جس کے وارث بنانے کا خدا نے تم سے اپنی کتاب میں وعدہ کیا ہے کیونکہ وہ قرآن میں فرماتا ہے "لیظهره علی الدین کله"[1]۔ (ترجمہ تاکہ تمام مذاہب پر اسلام کو غالب کر دیا جائے) اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب اور اس کے مددگاروں کو عزت دینا چاہتا ہے اور ان کو دوسری قوموں کے ملک و دولت کا والی بنانا چاہتا ہے 'خدا کے نیک اور صالح بندے کہاں ہیں'[2]؟ ہوا یہی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ ایک طرف تو اسلام کو ایسا غلبہ نصیب ہوا کہ آج تک کوئی اور دین اس کے مدمقابل نہیں آ سکا۔ ان شاء اللہ قیامت تک ایسا ہی رہے گا اور دوسری طرف مسلمانوں کے قدموں میں قیصر و کسریٰ کے بے بہا خزانوں کے ڈھیر لگ گئے 'لوگ بھی خوشحال ہو گئے اور قومی خزانہ بھی بھر گیا۔ بلاذری کی روایت ہے کہ ازدیوں کی ایک جماعت جو شام پر حملے کا ارادہ رکھتی تھی' آپ نے اسے عراق پر حملے کی دعوت دی اور آل کسریٰ کی غنیمتوں کا شوق دلایا۔ انہوں نے کہا آپ کو اختیار ہے جہاں بھیجیں' آپ نے انہیں العراق کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ اسی طرح جریر بن عبداللہ سے عراق جانے کیلئے قوم کی خاطر مفتوح کے ایک چوتھائی کی شرط رکھی تو آپ نے قبول کر لی[3]۔ مال غنیمت سے جو آمدنی حاصل ہوتی اس کا اندازہ حسب ذیل تفصیلات سے لگایا جا سکتا ہے۔ شام میں جنگ یرموک کا آغاز تو عہد صدیقی میں ہوا' لیکن مکمل فتح حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت سنبھالنے کے دس دن بعد ہوئی۔ اس میں مجاہدین کی تعداد چھیالیس ہزار تھی[4] ہر سوار کے حصے میں پندرہ سو درہم آئے۔ اس طرح آٹھ کروڑ چالیس درہم بنتے ہیں جو تقسیم ہوئے۔ اس حساب سے قومی خزانے میں دو کروڑ آٹھ لاکھ درہم آئے ہوں گے۔

خلافت کے پہلے ہی سال ابوعبید کی قیادت میں فارس کی بے شمار مہمات کے دوران مال غنیمت ہاتھ آیا ہو گا' جس کی تفصیل کتب تاریخ میں موجود نہیں ہے' ان میں سے کسریٰ کی ایک فوج کا سپہ سالار "نرسی" تھا' جو اس کا خالہ زاد بھائی تھا۔ عراق کے بعض اضلاع اس کی قدیم عہد سے جاگیر تھے۔ کسکر مہم کے بارے میں طبری کی روایت ہے کہ ابوعبید نے دشمن کے پڑاؤ کے اطراف کسکر کا تمام علاقہ برباد کر دیا اور مال غنیمت جمع کر لیا۔ کھانے کے بے شمار ذخیرے ہاتھ آئے۔ ابوعبید نے اپنے قریب کے عربوں کو بلایا اور انہوں نے جتنا چاہا لے گئے۔ نرسی کے تمام خزانوں پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا' مگر مسلمانوں کو سب سے خوشی باغ نرسیان کو حاصل کر کے ہوئی کیونکہ نرسی اس کی بڑی حفاظت کرتا تھا اور اس کے ذریعے سے سلاطین فارس کو اپنا دوست بنا تا رہتا تھا۔ مسلمانوں نے اس باغ کو آپس میں تقسیم کر لیا اور اس کے پھل کاشتکاروں تک کو کھلائے اور اس کا خمس عمرؓ کی خدمت میں ارسال کیا اور آپ کو لکھا کہ "اللہ تعالیٰ نے ہم کو وہ چیزیں کھانے کیلئے عطا فرمائی ہیں جن کی سلاطین فارس حفاظت کرتے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی ان چیزوں کو ملاحظہ فرمائیں اور ہم پر خدا کے فضل و انعام کو دیکھیں[5]۔"

اسی سال حضرت مثنیٰ کی زیر قیادت خنافس کے مقام پر بہت بڑی منڈی پر جہاں سواد اور مدائن کے تاجر اکٹھے ہوتے تھے اچانک چھاپہ مارا گیا۔ وہاں سے کس قدر مال حاصل ہوا ہو گا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مثنیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ صرف سونا اور چاندی لو اور ہر شخص اتنا سامان لے جتنا وہ اپنی سواری پر لاد سکتا ہو۔ بازار کے سب لوگ بھاگ گئے سونا چاندی اور نفیس ترین سامان مسلمانوں کے حصے میں آیا[6]۔ ان ساری جنگوں میں سب سے زیادہ مال غنیمت جس میں حاصل ہوا وہ فتح مدائن ہے جو کہ کسریٰ کا پایۂ تخت تھا۔ جہاں ان کے وسیع محل اور خزانے تھے۔ یہ ۱۶ھ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی زیر قیادت فتح ہوا۔ دجلہ اس مشہور اور خوبصورت شہر کے درمیان سے گزرتا تھا۔ ایک بڑے پل نے دونوں حصوں کو ملا رکھا تھا۔ مسلمان جب پہنچے تو پل توڑ دیا گیا' چنانچہ مسلمانوں نے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ مشرکوں نے پانی سے لبریز تلاطم خیز دریا کو اس طرح عبور کرتے دیکھا تو یہ کہہ کر بھاگ گئے کہ یہ انسان

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) طبری [illegible] (۵) طبری [illegible] (۶) طبری [illegible]

نہیں حسن ہیں۔ طبری نے ابن رمیل سے روایت کی ہے کہ جب مسلمانوں نے اہل عجم کو پانی میں شکست دے کر خشکی کی طرف پھر خشکی سے بھی نکال کر مال و دولت سے محروم کر دیا سوائے اس مال کے جو وہ پہلے بھیج چکے تھے۔ کسریٰ کے خزانوں میں تین ارب کا مال تھا انہوں نے نصف مال رستم کے ساتھ بھیج دیا تھا اور باقی نصف مال خزانوں میں موجود تھا[۲]۔ جبکہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جب مسلمان سطح زمین پر کھڑے ہو گئے اور گھوڑے اپنی ایال جھاڑتے ہوئے اور ہنہناتے ہوئے باہر نکلے تو اعاجم کے پیچھے چل پڑے حتیٰ کہ مدائن میں داخل ہو گئے اور وہاں انہوں نے کسی شخص کو نہ پایا بلکہ کسریٰ نے اپنے اہل اور جس قدر وہ مال و متاع اور خزائن اٹھا سکتے تھے انہیں اٹھا لیا اور جن مویشیوں، کپڑوں، ساز و سامان، برتنوں، تحائف اور تیل کے اٹھانے سے وہ عاجز ہو گئے انہیں ترک کر دیا جن کی قیمت کے متعلق معلوم نہیں وہ کتنی تھی اور کسریٰ کے خزانہ میں ۹ ارب دینار تھے۔ انہوں نے ان سے اتنے لے جتنے وہ لے جا سکتے تھے اور جن کو اٹھانے سے عاجز آ گئے انہیں چھوڑ دیا۔ اس کی مقدار نصف یا اس کے قریب قریب تھی[۳]۔ ابن اثیر نے بھی اسی روایت کو ترجیح دی ہے[۴]۔

کسریٰ سے حاصل ہونے والی ایک ایک چیز جتنی قیمت میں بکی اسے سامنے رکھا جائے تو علامہ ابن کثیر کی روایت زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔ ان خزانوں میں موجود مال کے علاوہ مسلمانوں کے دستوں کو ایسے اموال بھی ملے جو وہ نکال کر لے جا رہے تھے۔ مال غنیمت میں حاصل ہونے والے خزائن میں کس طرح کی چیزیں تھیں؟ ان کی تفصیل کتب تاریخ میں موجود ہے جو پڑھنے والوں کو حیران کر دیتی ہے دیکھنے والوں کا کیا عالم ہو گا؟ ابن کثیر نے اس کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔ پھر آپ نے کسریٰ یزدگرد کے پیچھے دستے بھیجے جنہیں ایک گروہ ملا پس انہوں نے اس کو قتل کر دیا اور بھگا دیا اور ان سے بہت سے اموال چھین لئے اور انہوں نے زیادہ تر کسریٰ کے لباس، تاج اور زیورات کو واپس لینا چاہا اور حضرت سعدؓ اموال و خزائن اور تحائف کے حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے جن کی قیمت نہیں لگائی جا سکتی اور نہ کثرت و عظمت کے باعث ان کا مدو شمار کیا جا سکتا ہے اور ہم نے بیان کیا ہے کہ وہاں چونہ گچ کے مجسمے تھے۔ حضرت سعدؓ نے ان میں سے ایک کو دیکھا جو اپنی انگلی سے ایک جگہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ حضرت سعدؓ نے فرمایا "اسے یہاں اس طرح بے کار طور پر نہیں رکھا گیا۔" انہوں نے اس کی انگلی کے سامنے علاقہ کی ناکہ بندی کر لی اور اس کے سامنے انہوں نے پہلے اکاسرہ کے خزائن میں سے ایک بہت بڑا خزانہ پایا اور اس سے بہت سے اموال، قیمتی خزائن اور عمدہ تحائف نکالے اور جو کچھ وہاں تھا مسلمانوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور دنیا میں سے کسی نے ان سے عجیب چیز نہ دیکھی ہو گی اور ان میں نفیس جواہر سے مرصع تاج بھی تھا جس سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور اسی طرح اس کی پیٹی، تلوار، کنگن، قبا اور اس کے محل کا قالین بھی تھا۔ محل ہر جانب سے ساٹھ مربع گز تھا اور قالین بھی اس کے برابر تھا جو سونے، موتیوں اور قیمتی جواہرات سے بنا ہوا تھا۔ نیز اس میں کسریٰ کے تمام ممالک کی تصویر تھی یعنی اس کے شہروں کی نہروں، قلعوں، صوبوں، خزانوں، کھیتیوں اور درختوں سمیت تصویر موجود تھی اور جب وہ تخت حکومت پر بیٹھا کرتا اور اپنے تاج کے نیچے داخل ہو جاتا اس لئے کہ اس کا تاج سنہری زنجیروں کے ساتھ معلق تھا اور وہ اسے اس کے بوجھ کی وجہ سے اپنے سر پر نہیں اٹھا سکتا تھا بلکہ وہ آ کر اس کے پیچھے بیٹھ جاتا پھر اپنے سر کو تاج کے نیچے داخل کر دیتا اور سنہری زنجیریں اسے اٹھائے رکھتیں اور وہ اسے پہننے کی حالت میں چھپائے رکھتا اور جب پردہ ہٹا دیا جاتا تو امراء اس کو سجدہ کرنے کیلئے گر پڑتے اور وہ پیٹی، کنگن، تلوار اور جواہرات سے مرصع قباء بھی پہنتا اور ایک ایک شہر پر غور کرتا اور ان کے بارے میں اور وہاں کے نائبین کے متعلق دریافت کرتا۔ نیز یہ کہ کیا وہاں کوئی واقعہ ہوا ہے؟ اور اس کے متعلق اس کے سامنے بیٹھے ہوئے منتظمین امور اسے خبر دیتے پھر وہ دوسرے شہر کی طرف منتقل ہو جاتا اور اس طرح وہ ہر وقت اپنے تمام شہروں کے حالات کے متعلق دریافت کرتا اور مملکت کے معاملات کو غیر محکم نہ چھوڑتا اور انہوں نے اسے شہروں کے حالات یاد دلانے کیلئے یہ قالین اس کے

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible]

کے سامنے رکھا تھا اور سیاست کے معاملہ میں یہ ایک بہت بہتر بات تھی اور جب اللہ کا فیصلہ آ گیا تو ان ممالک اور اراضی سے ان کا قبضہ جاتا رہا اور مسلمانوں نے بزور قوت ان کے ہاتھوں سے انہیں لے لیا اور ان علاقوں میں ان کی قوت و شوکت کو توڑ پھوڑ دیا اور حکم الٰہی سے ان کا خاتمہ کر کے انہیں حاصل کر لیا اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے مقبوضہ اموال پر حضرت عمرو بن مقرن کو افسر مقرر کیا اور یہ پہلا مال تھا جو قصر ابیض' کسریٰ کے مکانات اور مدائن کے باقی ماندہ گھروں سے حاصل ہوا اور محل میں جو کچھ تھا اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور جو مال ان دستوں نے دیا جو زہرہ بن حویہ کی معیت میں تھے اور زہرہ نے جو کچھ واپس کیا اس میں وہ خچر بھی تھا' جسے انہوں نے ایرانیوں سے چھینا تھا اور وہ تلواروں کے ساتھ اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ پس آپ نے اسے ان سے چھڑ لیا اور فرمایا "بلاشبہ اس کو اہمیت حاصل ہے اور آپ نے اسے مقبوضہ اموال کی طرف لوٹا دیا۔ "کیا دیکھتے ہیں کہ اس پر دو جامہ دان ہیں' جن میں کسریٰ کے کپڑے اور زیورات تھے اور وہ لباس بھی تھا جسے وہ تخت پر پہنا کرتا تھا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور دوسرے خچر پر دو جامہ دانوں میں اس کا وہ تاج تھا جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں' جسے اصحاب اسرایا نے راستے سے چھینے ہوئے مال سے واپس کیا اور دستوں نے جو کچھ واپس کیا اس میں عظیم اموال تھے' جن میں زیادہ تر کسریٰ کا ساز و سامان تھا اور نفیس اشیاء کو وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے' پس مسلمانوں نے انہیں مل کر ان سے نفیس اشیاء چھین لیں اور ایرانی قالین کو بوجھل ہونے کی وجہ سے نہ اٹھا سکے اور نہ ہی اموال کو ان کی کثرت کی وجہ سے اٹھا سکے اور مسلمان بعض گھروں میں آتے تو وہ گھر کو چوٹی تک سونے اور چاندی کے برتنوں سے بھرا پاتے اور بہت سا کافور بھی پاتے جسے وہ نمک خیال کرتے اور بسا اوقات بعض ان میں سے اسے آٹے میں استعمال کر لیتے اور اسے کڑوا محسوس کرتے۔ یہاں تک کہ انہیں اس کی حقیقت معلوم ہو گئی اور غنیمت میں بہت سے اموال حاصل ہوئے اور حضرت سعدؓ نے اس کا خمس نکالا اور حضرت سلمان فارسی کو حکم دیا تو انہوں نے چار اخماس کو غنیمت حاصل کرنے والوں میں تقسیم کر دیا اور ہر گھڑ سوار کو بارہ ہزار درہم ملے اور وہ سب کے سب ہی گھڑ سوار تھے اور بعض کے ساتھ کوتل گھوڑے بھی تھے اور حضرت سعدؓ نے مسلمانوں سے قالین کے پانچ خماس میں سے چار خمس اور کسریٰ کا لباس طلب کیا' تاکہ اسے حضرت عمرؓ اور مسلمانان مدینہ کے پاس بھیج دیں اور وہ اسے دیکھ کر متعجب ہوں۔ پس انہوں نے آپ کو بخوشی اجازت دے دی اور حضرت سعدؓ نے بشیر بن الخصاصیہ کو خمس کے ساتھ حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا اور جس شخص نے اس سے قبل آپ کو فتح کی بشارت دی تھی' وہ حلیس بن فلان اسدی تھے اور ہم نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اسے دیکھا' تو فرمایا "بلاشبہ ان لوگوں نے اس مال کو امناء کے سپرد کیا ہے" تو حضرت علیؓ بن ابی طالب نے آپ سے کہا "آپ عفیف ہیں اس لئے آپ کی رعیت بھی عفیف ہے اور اگر آپ عیش و عشرت کرتے' تو وہ بھی عیش و عشرت کرتی پھر حضرت عمرؓ نے اسے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا اور حضرت علیؓ کو قالین کا ایک ٹکڑا ملا جسے آپ نے بیس ہزار درہم میں فروخت کر دیا۔

اور سیف بن عمر نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کسریٰ کے کپڑے ایک لکڑی کو پہنا کر اسے اپنے سامنے گاڑ دیا' تاکہ لوگ اس کی حیران کن خوبصورتی اور دنیا کی فانی زندگی کی چمک دمک کو دیکھ سکیں اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کسریٰ کے کپڑے بنی مدلج کے امیر حضرت سراقہؓ بن مالک بن جعشم کو پہنائے(1)۔ آپ نے انہیں فرمایا "کہو اللہ اکبر!" انہوں نے اللہ اکبر کہا پھر فرمایا "کہو اس اللہ کا شکر ہے جس نے انہیں کسریٰ بن ہرمز سے چھینا اور بنی مدلج کے ایک بدو سراقہ بن مالک کو پہنایا۔ "طبری نے روایت کی ہے کہ کسریٰ کی پوشاکیں سب سے قوی الجثہ شخص محلم کو بھی پہنائی گئیں۔ کسریٰ (ایران کے بادشاہ) کے سامان آرائش اور اس کی ممتاز تقریبات کی پوشاکیں لائی گئیں۔ کسریٰ ہر موقع اور ہر تقریب پر ایک مختلف لباس پہنا کرتا تھا' اس لئے مختلف قسم کی پوشاکیں جمع کی گئیں تھیں۔ ایسے موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "میرے پاس محلم کو لاؤ۔" اس وقت مدینہ منورہ کی سرزمین میں ان سے بڑھ کر کوئی قوی الجسم انسان نہ تھا۔

---

(1) کتاب [illegible] مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو [illegible] ۲۰۰۴ [illegible] ۳۴۸ [illegible]

کسریٰ کا تاج لکڑی کے دو ستونوں کے درمیان میں بٹھا کر پہنایا گیا نیز تمام شاہی بارود، شاہی لباس اور سامان آرائش سے اسے آراستہ کیا گیا، پھر اسے لوگوں کے سامنے بٹھایا گیا۔ حضرت عمرؓ اور تمام مسلمانوں نے یہ منظر دیکھا تو انہوں نے دنیا کا ایک عجیب، دلکش نظارہ کیا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا، اس کے بعد اس نے دوسری پوشاک زیب تن کی، اس وقت یک دوسری نوعیت کا منظر تھا۔ اس کے بعد اسے ہر قسم کے لباس میں پیش کیا گیا اور اسے بادشاہ کے ہتھیار بھی پہنائے گئے اور اس کی تلوار بھی اس کے گلے میں لٹکائی گئی۔ مسلمانوں نے ان مختلف مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا "وہ مرد مسلمان کس قدر احمق ہو گا، جسے دنیا فریفتہ کر لے، وہ فریب خوردگی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، جو تم نہیں دیکھا۔ کسریٰ نے جو کچھ دیکھا اس کے اندر مسلمانوں کیلئے بھلائی نہیں، بلکہ برائی ہے۔ کسریٰ دنیا کی نعمتوں میں مشغول رہا اور آخرت کیلئے کچھ نہ کیا۔ اس نے اپنے رشتہ داروں، دلہا اور بیوی وغیرہ کیلئے مال جمع کیا اور اپنے آگے کیلئے کچھ نہیں بھیج سکا۔ وہ شخص کس قدر احمق ہے جس نے لوگوں کیلئے مال جمع کیا ہو یا اپنے دشمن کو اس سے فائدہ پہنچایا ہو[1]۔"

قیس بن حازم کا بیان ہے کہ جب ہم مدائن پہنچے تو ہم نے وہاں قیام کیا اور جو کچھ وہاں تھا ہم نے تقسیم کیا اور حضرت عمرؓ کو پانچواں حصہ بھیجا۔ اس کے بعد مدائن کو اپنا وطن بنایا، اسی اثناء میں ہمیں خبر ملی کہ مہران نے جلولا میں اپنا لشکر جمع کر رکھا ہے، وہاں خندق بھی کھودی ہے نیز اہل موصل نے تکریت میں لشکر جمع کر لیا ہے۔ حضرت عمرؓ کو حضرت سعدؓ نے اس کی اطلاع دی، تو انہوں نے ہاشم بن عتبہ کی قیادت میں بارہ ہزار سپاہیوں کا لشکر جلولا بھیجنے کا حکم دیا، جس میں بھی بوقت ضرورت دو دو سواروں کے ذریعے تین دفعہ امداد کی گئی[2]۔ ہاشم نے معرکے کے دنوں میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا "تم اللہ کیلئے بہادری کے ساتھ جنگ کرو، تمہیں ثواب بھی ملے گا اور مال غنیمت بھی، تم اللہ کیلئے کام کرو[3]۔" ابن کثیر کا کہنا ہے کہ اس مہم میں بھی مسلمانوں کو مدائن جتنا سامان ملا[4]۔ ان میں خارجہ بن صلت کو ملنے والی سونے یا چاندی کی ایک اونٹنی بھی تھی، جس کے گلے میں موتیوں اور یاقوت کے ہار پڑے ہوئے تھے۔ اس پر ایک سونے کا بنا ہوا مرد سوار تھا اس کے گلے میں بھی قیمتی ہار تھا۔ وہ اس اونٹنی اور مرد کو لائے اور خزانے میں جمع کرا دیا[5]۔ محمد، طلحہ اور مہلب سے روایت یہ ہے کہ جلولا کے معرکے میں ہر سوار کو ۹ ہزار نقد اور ۹ مویشی ملے۔ شعبی کے مطابق اللہ نے مسلمانوں کو اہل عجم کے تمام مال غنیمت اور مویشی دلائے، وہ بہت کم مال لے کر بھاگے۔ اس جنگ میں ہر سوار کو اسی قدر حصہ ملا جس قدر مدائن میں ملا تھا۔ مال تقسیم کیا گیا تو تین کروڑ تھا، اس کا خمس ساٹھ لاکھ تھا[1]۔ حضرت سعدؓ نے خمس میں سے سونے چاندی کے برتن اور کپڑے قضاعی ابن عمرو کے ہاتھ اور جنگی قیدی ابو مفزر کے ہاتھ روانہ کئے۔ جب آپ کے پاس یہ مال پہنچا تو آپ نے فرمایا "اس کو کوئی چھت پوشیدہ نہیں کرے گی، بلکہ بہت جلد تقسیم کر دوں گا۔" حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عبداللہ بن ارقم مسجد کے صحن میں اس مال کی رات بھر حفاظت کرتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت عمرؓ لوگوں کے ساتھ مسجد میں آئے، مال غنیمت پر سے چادریں اٹھائی گئیں، تو آپ نے یاقوت، زبرجد اور جواہرات دیکھے، انہیں دیکھ کر رونے لگے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پوچھا "اے امیر المومنینؓ! آپ کیوں روتے ہیں یہ تو شکر کا مقام ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم! مجھے اس بات پر رونا آ رہا ہے کہ اللہ جس قوم کو یہ مال عطا کرتا ہے، تو ان میں باہمی بغض و حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ جب بغض و حسد پیدا ہو جاتا ہے تو خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔" آپ کو قادسیہ کے خمس کے بارے میں دقت پیش آئی تھی، اس مال کو اس کے باشندوں میں تقسیم کیا۔ اسی طرح آپ نے جلولا کا خمس بھی قادسیہ کے خمس کی طرح مسلمانوں کے مشورے اور اتفاق رائے سے تقسیم کیا۔ آپ نے بعض اہل مدینہ کو بھی عطیات دیے[7]۔

اسی طرح مہمات کا سلسلہ بڑھتا گیا، ۱۶ھ ہی میں جلولا کے بعد تکریت فتح ہوا۔ اس میں ہر سوار کو تین ہزار اور پیادہ کو ایک ہزار ملا۔ خمس فرات بن حیان کے ہاتھ حضرت

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible] (۷) [illegible]

عمرؓ کی طرف بھیجا گیا۔ پانچ ہزار مجاہدین اس میں شریک ہوئے تقریباً سارے ہی سوار تھے۔ اس طرح تقریباً تیس لاکھ درہم سے زیادہ ہوگا[۱]۔ اسی طرح تستر کی فتح پر بھی ہر سوار کو تین ہزار اور پیادہ کو ایک ہزار ملے۔ اس تناسب سے خمس مدینہ روانہ کیا گیا۔ عراق و فارس کی طرح شام' الجزیرہ' ارمینیہ' مصر' افریقہ کے دیگر علاقے فتح ہوتے رہے۔ ان سب میں مسلمانوں کو بہت زیادہ مال غنیمت حاصل ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بادشاہوں اور جاگیرداروں کے علاقے تھے' جنہوں نے عوام کے مال و اسباب پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا۔ ان پر بھاری بھرکم ناجائز ٹیکس لگا کر سالہا سال سے اپنے خزانے بھر رکھے تھے' ان پر عوام کا کوئی حق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے وہ فلاح و بہبود پر لگنے کے بجائے بادشاہوں' جاگیرداروں اور ان کے کارندوں اور خاندانوں کی عیش و عشرت اور نمود و نمائش پر خرچ ہوتے تھے اور باقی رقموں میں ہر سال کئی گنا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یہ خزانے ارتکاز دولت کی خوفناک علامت تھے۔ ان جنگوں میں آخری بڑا معرکہ نہاوند کا تھا' جو قومی روایت کے مطابق ۲۱ھ میں پیش آیا' اس کا نام "فتح الفتوح" رکھ دیا گیا[۲]۔ اس کے بعد ایرانیوں کے قدم کہیں نہ جم سکے' بلکہ مسلمانوں نے ان کو گھروں میں گھس کر مارا۔ تمام ایرانی صوبوں میں ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا' پھر ایرانیوں کا اتحاد بھی مسلمانوں کے اس تیز دھارے کو نہ روک سکا' جو ان کے ملک میں امنڈا چلا آ رہا تھا۔ انجام کار کسریٰ کو اپنے ملک سے بھاگ کر غیروں سے مدد کی بھیک مانگنی پڑی۔ اس نے دوسرے کے ملک میں سر چھپایا اور اس کے بعد اپنے وطن سے دور اس طرح بے کسی کی موت مر گیا گویا وہ کبھی ایران میں رہا ہی نہ تھا گویا اس ملک میں کبھی اس کی حکومت ہی نہ تھی[۳]۔

نہاوند ایک بہت بڑا شہر تھا' جو عراق عجم میں حلوان اور ہمدان کے درمیان' حلوان سے نوے میل جانب مشرق اور ہمدان سے تیس میل جانب غرب واقع تھا۔ اس میں کشادہ سبزہ زار' دلکش نہریں اور نظر فریب باغات تھے' جو اس کے باشندوں کی راحت و فارغ البالی کے ضامن تھے۔ وسط شہر میں ایک مستحکم قلعہ تھا' جس کی مضبوط دیواریں اور بلند فصیلیں گویا اس کی محافظ تھیں[۴]۔ ڈیڑھ لاکھ ایرانیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار تھی' جو حضرت نعمانؓ بن مقرن کی زیر قیادت فیروزان کے مد مقابل سینہ سپر ہو گئے۔ فیروزان قتل ہو گیا اور حضرت نعمانؓ کی بھی شہادت کی دعا پوری ہوئی بعد میں حضرت حذیفہؓ سالار بنے۔ بالآخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ شہر اور اس کے ارد گرد کا سارا ساز و سامان مسلمانوں کے قبضے میں آیا' جسے حضرت سائبؓ بن اقرع کے پاس جمع کرایا گیا۔ آتش کدہ کے منتظم نے جان بخشی کی شرط پر کسریٰ کا خزانہ جو اس کے پاس چھپا ہوا تھا' حضرت حذیفہؓ کے حوالے کر دیا' جو جواہرات پر مشتمل تھا اور حوادث زمانہ کے موقع کیلئے جمع کر کے رکھا گیا تھا۔ دو صندوقچوں میں بند تھا۔ دیگر مال غنیمت کے پانچویں حصے کے علاوہ مجاہدین کی اجازت سے انہیں الگ طور پر حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں فوراً واپس بھجوا دیا اور حکم دیا کہ دیگر مال غنیمت کی طرح انہیں تقسیم کیا جائے۔ انہیں فروخت کیا گیا' تو چالیس لاکھ ملے۔ اس لڑائی میں ہر سوار کو چھ ہزار اور پیادے کو دو ہزار ملے[۵]۔ تقریباً دیگر معرکوں کی طرح سب ہی سوار تھے' اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اٹھارہ کروڑ روپے لوگوں میں تقسیم ہوئے' جو خمس نکال کر تھے۔ سرکاری خزانے میں ساڑھے تین کروڑ درہم کے لگ بھگ جمع ہوئے ہوں گے۔

غنیمت کے طور پر حاصل ہونے والی ان آمدنیوں نے یقیناً معاشی ترقی کے دروازے کھول دیے۔ حقیقی قومی آمدنی میں بے پناہ اضافہ ہوا کیونکہ ان کا بیشتر حصہ وہ تھا جو کنوز کی شکل میں تھا۔ وہ معاشرے میں گردش ہی نہیں کر رہا تھا' اس سے استفادے سے ممالک و عوام محروم تھے۔ فاروق اعظمؓ نے ان خزائن کو اکٹھا کر کے ایک اور بڑا خزانہ نہیں بنایا' بلکہ انہیں فوراً ہی عوام میں تقسیم کر دیا۔ آپ کی پالیسی یہی رہی کہ انہیں چھت نہ ڈھانکنے پائے' اس سے فائدہ یہ ہوا کہ فی کس آمدنی میں اضافہ ہوا' صرف اور بچتیں بڑھیں' سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا' گردش دولت تیز ہوئی۔ ان جنگوں میں ہزاروں مجاہدین بھی شہید ہوئے' ان کے چھوٹے چھوٹے بچے

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible]

تھے جنہیں مال غنیمت میں سے حصے ملے' لیکن وہ کاروبار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بالغ ہونے تک وہ سرمایہ منجمد رہے' چنانچہ آپ نے یہ حکم دیا "تجروا فی اموال الیتامی' لا تاکلها الزکوۃ"[1]۔ "(کہ یتیموں کے مال سے تجارت کرو تاکہ اسے زکوٰۃ نہ ختم کردے۔) اس کا نہایت تیر اثر ہوا' روایت کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یتیموں کی پرورش کرتی تھیں اور ان کا مال تاجروں کو دیتی تھیں' تاکہ وہ اسے کاروبار میں لگائیں۔ اسی طرح یحییٰ بن سعید کا بھی یہی معمول تھا۔ انہوں نے اپنے بھائی کے یتیم لڑکوں کے واسطے کچھ مال خریدا' پھر وہ بھاری قیمت پر بکا[2]۔ اس طرح کی روایات ان رجحانات کی نشاندہی کرتی ہیں' جنہیں فاروق اعظمؓ نے تحریک دی' تاکہ معاشی ترقی کا عمل مستقل طور پر جاری رہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ غنائم ہی پر عہد فاروقیؓ کی معاشی ترقی کا انحصار تھا کیونکہ یہ آمدنی عارضی اور ہنگامی نوعیت کی تھی' جبکہ ترقی کیلئے ٹھوس اور مستقل اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ بصیرت عمرؓ اس حقیقت سے آشنا تھی' چنانچہ آپ نے ایسی ہی پالیسی وضع کی' اور اجتہادی فیصلے کئے' جو بدلتے ہوئے حالات کیلئے انتہائی ضروری تھے۔ چنانچہ آپ نے مفتوحہ زمینوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ انہیں مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بجائے ریاست کی ملکیت قرار دیا جائے اور حسب حالت و مصلحت خراج مقاسمہ یا وظیفہ مقرر کرکے سابقہ مالکان کے پاس آبادکاری کیلئے رہنے دیا جائے۔ یہ ایک ایسا انقلابی قدم تھا' جس نے ریاست کو بڑے پیمانے پر مستقل آمدنی کا ایک ایسا ذریعہ فراہم کیا' جس پر انتظامی اخراجات بہت معمولی تھے اور غیر مسلم کسانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ محرومی اور بیروزگاری کی اذیتوں سے محفوظ ہو گیا اور شرائط اس قدر نرم اور حقیقت پسندانہ تھیں کہ وہ جلد ہی خوشحال ہو گیا۔ اس طرح معاشی ترقی کی ایک لازمی شرط پوری ہوئی کہ اس سے معاشرے کے تمام طبقوں اور پیشوں کو استفادے کا موقع مل رہا ہو۔

آپ کا یہ فیصلہ فوری وقتی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تابع نہیں تھا' بلکہ طویل المیعاد منصوبہ بندی کے تحت تھا' چنانچہ آپ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر اس کا خطرہ نہ ہوتا کہ بعد والی نسلیں بے جائیداد رہ جائیں گی اور ان کے پاس کچھ نہ ہوگا' تو جو بھی بستی میرے زمانہ خلافت میں فتح ہوتی' میں اسے اسی طرح تقسیم کر دیتا جس طرح نبی کریمؐ نے خیبر کی تقسیم کی تھی۔ میں ان مفتوحہ اراضی کو بعد میں آنے والے مسلمانوں کیلئے محفوظ چھوڑے جا رہا ہوں' تاکہ وہ تقسیم کرتے رہیں[3]۔" آپ نے حسن انتظام کے ذریعے آمدنی کے اس مستقل ذریعے کو ترقی دے کر بام عروج تک پہنچایا۔ آغاز ہی میں زمین کی پیمائش اور انتظام کیلئے دجلہ کی جانب حضرت حذیفہؓ اور دوسری جانب حضرت عثمانؓ بن حنیف کو مقرر کیا[4]۔ جو اس کام کے سب سے زیادہ ماہر تھے۔ کل رقبہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب بنا' ابتداء میں فی جریب ایک درہم اور ایک قفیز خراج عائد کیا۔ اس سے آمدنی تین کروڑ بیس لاکھ درہم سالانہ وصول ہونا شروع ہوئی[5]۔ سواد کی زمین ایرانی بادشاہ قباذ کے تبدیل کئے ہوئے طریقے کو برقرار رکھتے ہوئے جس سے لوگ اچھی طرح مانوس تھے خراج وظیفہ کے اصول پر دی گئی[6]۔ پھر اس کی پیداوار اور استعداد کو بڑھانے کے طریقے اختیار کئے گئے' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست کی آمدنی میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور اسی رفتار سے کسانوں کی فی کس آمدنی میں بھی اضافہ ہوا اور وہ خوشحال ہوتے گئے۔ آپ کی وفات سے ایک سال قبل سواد کا لگان دس کروڑ درہم تک پہنچ گیا[7]۔

امام ابو یوسف کے بقول عدل و انصاف کرنے اور ظلم و جور سے پرہیز کرنے میں جو اخروی اجر ہے اس کے سوا اس سے علاقوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے اور خراج کی آمدنی بڑھتی ہے' برکت عدل سے وابستہ ہے' ظلم و جور سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔ جو خراج ظلم و جور سے وصول کیا جاتا ہے' اس سے ملک میں بدحالی اور تباہی مچتی ہے۔ عمرؓ بن الخطاب کا عہد مبارک ملاحظہ ہو کہ باوجود اس کے کہ آپ اہل خراج سے کامل عدل و انصاف کا معاملہ کرتے تھے اور ان پر سے ہر طرح کے ظلم

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (٤) [illegible] (۵) [illegible] (٦) [illegible] (۷) [illegible]

کا ازالہ کرتے رہتے تھے۔ آپ کے زمانہ میں سواد سے دس کروڑ درہم کی آمدنی ہوتی تھی جبکہ اس زمانے میں درہم کا وزن ایک مثقال ہوتا تھا[1]۔ ماوردی نے لکھا ہے کہ یہ آمدنی ۱۲ کروڑ درہم تک پہنچ گئی تھی[2]۔ علاوہ ازیں صرف عراق ہی کے علاقے میں زمینوں کی دس قسمیں اور بھی تھیں جنہیں بحق سرکار ضبط کیا گیا ان میں جنگلات' تالاب' اراضی کسریٰ' مقتولین جنگ کی زمینیں اور بھگوڑوں کی زمینیں وغیرہ[3]۔ ان سے ابتدائی طور پر سات لاکھ درہم ملنا شروع ہوئے[4]۔ بڑھتے بڑھتے ان کی آمدنی چالیس لاکھ درہم تک پہنچ گئی[5]۔ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا اور آخر کار یہ بروایت امام ابو عبیدؒ مجموعی طور پر یہ ستر لاکھ درہم سالانہ تک پہنچ گئی[6]۔ عراق سے مجموعی طور پر دس کروڑ اوقیہ (چاندی) وصول کرتے تھے[7]۔

۲۰ھ میں مصر جب فتح ہوا تو ان سے جو معاہدہ ہوا اس میں یہ طے پایا کہ حسب گنجائش زیادہ سے زیادہ پانچ کروڑ درہم جزیہ ادا کریں گے۔ اگر ان کی گنجائش ٹیکس کی غایت سے کم رہی تو ٹیکس معاف کر دیا جائے گا[8]۔ یزید بن ابی حبیب کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مصر کا خراج و جزیہ بیس لاکھ دینار وصول ہوتا تھا[9]۔ ارض مصر پر جو خراج عائد کیا گیا اس کی تفصیل کچھ اس طرح تھی کہ ہر جریب پر ایک دینار اور تین اردب گیہوں اور ہر بالغ پر دو دینار جزیہ[10]۔ قبل ازیں اہل دمشق سے جو مصالحت ہوئی وہ بھی مستقل ادائیگی کی شرط پر تھی' تاکہ مسلسل آمدنی آتی رہے۔ وہ زر نقد زمین کی تقسیم اور فی کس سالانہ ایک دینار پر منعقد ہوئی۔ زمین پر فی جریب ایک جریب پیداوار کا محصول لگایا گیا۔ سارا ملک اس صلح میں شامل تھا' صرف مقتولوں یا شاہی خاندان اور ان کے ساتھ چلے جانے والوں کے مال کو غنیمت قرار دیا گیا[11]۔ اہل فلسطین سے صلح میں قرار پایا کہ قلعہ کے اندر تمام اموال پر خراج ادا کریں گے اور قلعہ کے باہر جو کچھ ہے وہ کلیۃً مسلمانوں کا ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی اجازت دے دی اور واپس مدینے آ گئے[12]۔ رے کی فتح کے موقع پر مسلمانوں کے سپہ سالار نعیم بن مقرن نے جو انہیں تحریر لکھ کر دی اس میں تھا "میں تمہیں اور جو تمہارے ساتھ اس معاہدے میں شریک ہوں پناہ دیتا ہوں بشرطیکہ تم لڑائی سے اپنے لوگوں کو باز رکھو اور جو سرحد کے حاکم ہوں تمہیں دو لاکھ درہم سالانہ ادا کرو[13]۔

علی ہذا القیاس یہ چند روایات یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ مال غنیمت سے زیادہ اہم چیز جس نے معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کیا وہ نظام محاصل تھا' جو مستقل طور پر آمدنی کا ذریعہ تھا۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو لوگوں کی امداد اور فی کس آمدنی بڑھانے کے ساتھ ساتھ مشترک رفاہی وفلاحی منصوبوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے سواد کی زمینوں کو وقف قرار دیا تھا۔ اسی کے مطابق دیگر مفتوحہ علاقوں کا بھی فیصلہ کیا گیا اس لئے فقہا کا یہ مسلک ہے کہ آمدنی کو عامۃ المسلمین کے مشترک مصالح پر خرچ کیا جائے۔ ماوردی نے ابو سعید اصطخری کا نقطہ نظر بیان کیا ہے کہ "یہ عام مسلمانوں کا حق ہے اس لئے ان کی آمدنی کو لشکر کے اخراجات' چھاؤنیوں کے استحکام' جمعہ کی مساجد' نہروں کی کھدائی' قاضیوں' گواہوں' فقہاء' قراء' اماموں اور موذنوں پر خرچ کیا جائے' اس وجہ سے اس کی فروخت ممنوع ہے[14]۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کی ان پالیسیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اختیار کی گئی ہے جو آپ نے مفتوحہ علاقوں سے حاصل ہونے والی مستقل آمدنیوں کے بارے میں اختیار فرمائی تھی۔

معاشی ترقی کی پیمائش کیلئے فی کس آمدنی کو معیار بنایا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس میں کئی گنا اضافہ ہوا اور آپ کے مختلف اقدامات سے مسلسل بڑھتا رہا جس کی بے شمار مثالیں گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں۔ چند اہم جنگوں میں مجاہدین کے حصے میں جو مال غنیمت آیا اس کی نوعیت و مقدار کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ شاید

(۱) یوسف:۱۱۱ (۲) ماوردی:۱۷۳ (۳) یوسف:۱۰۹ [illegible]:۱۷۲ (۴) ایضا (۵) یوسف:۱۰۹ (۶) عبید:۲۶۱ (۷) یوسف:۱۱۵ (۸) طبری:۴/۱۰۸، خطط:۱/[illegible] (۹) بلاذری:۲۱۷ (۱۰) یعقوبی:۲۱۶ (۱۱) طبری:۳/۲۸۸ (۱۲) بلاذری:۱۴۵ (۱۳) طبری:۴/۲۸ (۱۴) ماوردی:۱۷۳۔

ہی کوئی ایسا گھرانا ہوگا جس کے لوگ پورے جوش و خروش سے ان جنگوں میں حصہ نہ لیتے ہوں۔ حکومت کے حصے میں جو غنیمت کا خمس آتا تھا وہ بھی پیچھے رہ جانے والوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ زکوٰۃ کا بالکل الگ حساب رکھا جاتا تھا۔ آمدنیاں بڑھنے سے کثرت کی سطح نصاب کی حدود سے اوپر جانے لگی جیسا کہ یمن کے بارے میں آتا ہے کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ رہا ساری آمدنی مرکز کو بھیج دی گئی۔ دیگر علاقوں میں بھی خوشحالی و ترقی اسی رفتار سے بڑھی تو اس مد میں آمدنی میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا جسے غریبوں، مسکینوں، یتیموں، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں میں کھلے ہاتھ سے تقسیم کیا گیا یہاں تک کہ غیر مسلموں کو بھی امدادیں دی گئیں۔ اس طرح غریب طبقات کی فی کس آمدنی میں بھی اضافہ ہوا۔ علاوہ ازیں مستقل طور پر حاصل ہونے والے خراج، جزیہ اور دیگر شرعی محاصل سے بیت المال میں جو وسعت آئی سے نظام وظائف کے ذریعے تمام رعایا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس کی تفصیل اس باب میں الگ طور پر موجود ہے۔ امن و استحکام کے حالات، نقل و حمل کے ذرائع میں بہتری اور صرف میں اضافے سے سرمایہ کاری میں جو اضافہ ہوا اس نے تجارت اور تاجر پیشہ لوگوں کے منافع اور آمدنیوں کو بڑھا دیا۔ نہری نظام کے قیام، زرعی ترقی کیلئے اقدامات اور خراج میں عدل و انصاف سے کسان طبقہ خوشحال ہوا جو ہمیشہ سے جاگیردارانہ نظام کے تسلط میں پستا چلا آ رہا تھا۔ مثلاً سواد کے علاقے سے محصول تین کروڑ بیس لاکھ سے بڑھ کر بارہ کروڑ درہم ہو جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسانوں کی آمدنیوں میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوا۔ دیگر زمینوں کے محاصل کا سات لاکھ سے ستر لاکھ ہو جانا فی کس آمدنیوں میں دس گنا اضافے کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ نے فی کس آمدنیوں کو تحفظ دینے کی خاطر یہ اصول بنایا کہ اگر کسی سال کی وجہ سے پیداوار کم ہوگی تو خراج کی مقدار بھی گھٹا دی جائے گی یہاں تک کہ ختم بھی کی جا سکتی تھی۔

آپ نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا "لوگو! مجھ پر تمہارے سلسلے میں کچھ ذمہ داریاں ہیں جن کو میں تمہارے سامنے گناتا ہوں تمہیں چاہیے کہ ان کے بارے میں میرا احتساب کرتے رہو، میری ذمہ داری ہے کہ تمہارے خراج اور فئے کی رقمیں مقررہ طریقوں سے ہی وصول کروں اور جب یہ مال میرے ہاتھ میں آجائیں تو مناسب مصارف میں صرف کروں۔ تمہارے سلسلے میں میری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ تمہارے وظائف و عطیات میں اضافہ کروں ان شاء اللہ میں پوری کروں گا[1]"۔

۳۔ معاشی ترقی...... فاروقیؓ اقدامات:

Dr. Monzer Kahf کے بقول

"The Islamic government assumes the responsibility of development for three reasons: first, it is required to guarantee a minimum standard of living to all atis citizens, second, it is obliged to expend a part of its available resources for the worldwide propagation of the message of Islam,and third, it is also bound to build a strong country and a strong society which is capable of sustaining an effective ideological stand in the international arena."

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا کہنا ہے کہ "اسلامی ریاست کی (خاص) معاشی ذمہ داریوں میں کفالت عامہ، معاشی ترقی کا اہتمام اور تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا شامل ہے[2]"۔ "مذکورہ مصنفین نے ابتدائی اسلامی ریاست کی جن ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے، دور جدید میں ان خطوط پر زیادہ وسیع پیمانے پر منظم اور مستحکم اداروں کے ذریعے، جدید معاشی اور عالمی حالات کے تناظر میں نہایت سمجھداری سے ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر خورشید احمد نے جدید

---

(۱) یوسف، ۱۲۷ (۲) [illegible]

دور میں ترقیاتی پالیسی کے عمومی اہداف کو ایک مسلم معاشرے کے ترقیاتی پلان کے خصوصی مقاصد میں سموتے ہوئے انسانی وسائل کی ترقی' نفع بخش پیداوار میں اضافہ' معیار زندگی میں بہتری متوازن (ہمہ پہلو) ترقی' نئی ٹیکنالوجی کے استعمال اور بیرونی دنیا پر انحصار کم کر کے مسلم دنیا سے رابطہ پر زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں متبادل اقتصادی بلاک کے وجود کو لازمی قرار دیا ہے۔ فاضل مصنف نے اسلامی ترقیاتی ماڈل دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے[۱]۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ مغربی تہذیب اور اس کے سرمایہ دارانہ چلن کو خود داخلی طور پر بھی چیلنجوں کا سامنا ہے اور ایک طرح کا ثقافتی رد عمل شروع ہو چکا ہے' نیز اس حقیقت کے پیش نظر کہ کمیونزم کے ۷۰ سالہ تجربے کا انجام تباہی کی صورت میں سامنے آیا۔ ایک عالمی طلب اور تڑپ سامنے آ رہی ہے کہ ترقی کی ایک نئی اسٹریٹیجی اور حکمت عملی آزمائی جائے' جو مادی خوشحالی اور روحانی قدروں کا ایک عادلانہ امتزاج ہو اور اقتصادی اور سماجی نظام میں ربط اور وحدت کی آئینہ دار ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ دنیا کا مستقبل یقینی طور پر اسلام پر منحصر ہے۔ یہ جائزہ مسلمانوں کیلئے باعث فخر بھی ہے' لیکن اس کے ساتھ یہ بہت بڑا چیلنج بھی ہے۔ اس کا زیادہ تر انحصار اس بات پر ہے کہ امت مسلمہ اس چیلنج کو کس انداز اور حوصلے سے قبول کرتی ہے؟ اس چیلنج کا مطالبہ تو یہ ہے کہ مسلم امت آگے بڑھ کر زمین پر اللہ کی نیابت (Vicegerency) کا فرض ادا کرتے ہوئے اور امت وسط کے طور پر انسانیت کو عادلانہ نظام فراہم کرے' جس کا نتیجہ سارے انسانوں کیلئے سراسر خیر و برکت ہو[۲]۔ حقیقت یہ ہے کہ دور جدید میں حکومتوں کیلئے ترقیاتی ماڈل کی تشکیل اپنی شرعی معاشی ذمہ داریوں کی ادائیگی' اور ترقیاتی پالیسیوں اور منصوبوں کے اہداف کے تعین اور نفاذ کے طریق کار کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے اور حکمت عملی کو اسلامی مزاج و روح میں ڈھالنے کیلئے فاروق اعظم کے رول ماڈل کو دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے' اس سلسلے میں حسب ذیل اقدامات کئے۔ تکرار سے بچنے کیلئے پہلے ان اقدامات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے' جن کی تفصیل کسی نہ کسی انداز میں گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

(الف) سیاسی استحکام:

معاشی مفکرین اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ معاشی ترقی کیلئے سیاسی استحکام کلیدی حیثیت رکھتا ہے' جس سے امن وامان کی فضا پیدا ہوتی ہے اور ترقی کا عمل شروع ہوتا ہے۔ معاشی ترقی ایسے سیاسی نظام کی متقاضی ہے جو پانچ بنیادی خصوصیات' سیاسی استحکام' تغیر پذیری' باہمی مشاورت' تنقید واحتساب اور ایک اعلیٰ درجہ کی نظامیہ کا حامل ہو۔ سیاسی استحکام کی ضرورت دو وجوہ کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ اول معاشی ترقی ایک طویل المیعاد عمل ہے' جو اس امر کا متقاضی ہے کہ حکومت کی ترقیاتی پالیسیوں میں تسلسل اور دوام پیدا کیا جائے اور دوم معاشی ترقی کیلئے ضروری ہے کہ ملک میں اعتماد و یقین کی فضا پائی جائے' تاکہ نجی بچتوں اور سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور فرد پوری دلجمعی اور اطمینان قلب کے ساتھ ملک کی تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں' چنانچہ سیاسی نظام کے اندر چند بنیادی نوعیت کے ایسے عناصر پائے جانے چاہئیں جو زمان و مکان کی دسترس سے محفوظ ہوں اور جن میں کسی طرح کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ فاروق اعظمؓ نے اس مقصد کیلئے جو اقدامات کئے' وہ ایک الگ باب "بصیرت عمر اور عصر حاضر کے سیاسی معاملات" میں گزر چکے ہیں' جس میں امن وامان کا قیام' عدل وانصاف' مساوات' باخبری' آزادی تنقید ورائے' مشاورت' قوت نافذہ' قومی سیاست کی اصلاح' سیاسی گروہوں سے بہتر تعلقات کا قیام' یہود ونصاریٰ کے معاملات اور بیرونی مدخلتوں کا انسداد اور ذاتی سیرت و کردار کو بطور نمونہ پیش کرنے پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے' جس نے پوری سلطنت کو امن کا گہوارہ بنا دیا اور معاشی ترقی کے دروازے کھل گئے۔

---

(۱) تفصیل [illegible] ۳۱ (۲) ایضاً

(ب) انتظامی آلات کا استعمال:

معاشی ترقی کے حصول کیلئے سب سے اہم کردار نظمیہ عامہ کا ہوتا ہے' جو اس مقصد کیلئے مختلف انتظامی آلات استعمال کرتی ہے' چنانچہ آپ نے ترقیاتی نظمیہ کا تصور پیش کیا اور اپنی ساری انتظامی مشینری کو اس کام پر لگا دیا[1]۔ اس موضوع پر "ترقیاتی نظمیہ" کے عنوان سے جو مواد پیش کیا گیا ہے اس میں زندگی کے ہر شعبے کو ترقی دینا' معیشت سمیت تمام شعبوں میں نئے نئے طریقے اختیار کرنا' خود کو اور اپنے ساتھ تمام عمال کو فلاح و بہبود کے منصوبوں کا ذمہ دار قرار دینا' جدید ترین سہولتوں سے مزین نئے شہر بسانا' زرعی ترقی کیلئے نہریں' تالاب' بند تعمیر کرنا' روزگار کے نئے مواقع پیدا کرنا' تجارتی ترقی کے فروغ کیلئے انتظامی اقدامات کرنا' سڑکیں' پل' سرائے' مہمان خانے تعمیر کرانا اور راستوں کو محفوظ بنانا' مالیاتی پالیسی کو بہتر بنانا' مستقبل کو سامنے رکھ کر ٹھوس اقدامات کرنا' آمدنیوں میں اضافے کرنا اور انہیں ترقیاتی کاموں میں لگانا اور ترقی و خوشحالی کے ثمرات کو تمام علاقوں اور طبقوں تک پہنچانا شامل ہے۔

(ج) فتوحات میں وسعت اور دفاع کی مضبوطی:

اس موضوع پر اسی باب میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔

(د) کفالت عامہ:

اس پر بھی اس باب میں تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

(ر) نظام وظائف:

اس کی تفصیلات پر بھی الگ بحث موجود ہے۔

(س) اسلامی تصور ترقی کی آبیاری:

جیسا کہ اس باب کے آغاز میں واضح کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے ترقی کا ایک منفرد تصور دیا ہے' جو ملحدانہ اور مادہ پرستانہ تصورات سے بالکل مختلف ہے۔ مادی ترقی کے پہلو بہ پہلو روحانی' اخلاقی' فکری' علمی اور تہذیبی ترقی بھی لازمی ہے' بلکہ ان ترقیوں کو مادی ترقی پر فوقیت حاصل ہے۔ اسلام سب سے پہلے انہی کی طرف توجہ دیتا ہے۔ ان کے لازمی ثمرات کو نتائج جو انسانی تہذیب اور معاشروں کو حاصل ہوتے ہیں' ان میں ایک معاشی ترقی بھی ہے۔ مادی وسائل' لذات اور ترقی کے سلسلے میں انسانوں نے ہمیشہ انتہا پسندانہ تصورات اختیار کئے ہیں' ان کا عملی رویہ افراط و تفریط پر مبنی رہا ہے۔ عصر حاضر کی طرح بھاری اکثریت ملاحدہ اور اباحیت پسندوں کی رہی ہے' جو مادی و دنیوی لذات ہی کو زندگی کا مقصود اور کامیابی کا معیار سمجھتے رہے ہیں۔ جنہوں نے ہمیشہ اس راہ میں مذہب' روحانیت اور اخلاقی اقدار کی نفی کی ہے۔ دوسری انتہا پر رہبانیت کے قائلین کی رہی ہے' جنہوں نے روحانی ترقی کو مقصود قرار دے کر تمام مادی و جسمانی خواہشات کو ترک کر دینا ضروری قرار دیا۔ یہاں تک کہ بنیادی ضروریات کو پورا کرنے سے بھی اجتناب کیا۔ یہ دونوں نظریات دراصل دین و دنیا' دنیا و آخرت' مادیت و روحانیت اور معیشت و اخلاق کی تفریق و دوئی اور تضاد و تصادم کے فلسفے پر مبنی ہیں۔ اسلام نے ان کے درمیان جو بہترین امتزاج و توازن قائم کیا تھا عہد فاروقی میں اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اس کو برقرار رکھا جائے اور اس کی آبیاری کی جائے' تاکہ اسلام کا صحیح تصور اور تصویر لوگوں کے سامنے رہے۔ آپ کے عہد میں مفلوک الحال لوگ معاشی ترقی کے عروج کی طرف گامزن تھے' بوریا نشیں قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کے مالک بن چکے تھے۔ اب فقر و فاقہ کے فتنے کی جگہ مال و دولت کا فتنہ ایک چیلنج کی شکل میں آپ کے سامنے تھا۔ آپ اس کے منفی اثرات و نتائج سے اچھی طرح آگاہ تھے اور پی

---

(۱) [illegible]

منصبی ذمہ داریوں سے بھی۔ یہی چیز آپ کو رلا دیتی تھی اور یہ اکثر ہوتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ مجھے عمر بن الخطابؓ نے بلایا۔ میں پہنچا تو دیکھا کہ آپ کے سامنے چمڑے کے فرش پر سونا پھیلا ہوا تھا۔ فرمایا ''آؤ اور اسے اپنی قوم میں تقسیم کر دو۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے اسے اپنی نبی علیہ السلام اور ابو بکرؓ سے کیوں علیحدہ رکھا اور مجھے دیا معلوم نہیں خیر کی وجہ سے یا شر کی وجہ۔'' ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں جھک کر تقسیم کرنے اور ہٹانے لگا۔ اتنی دیر میں رونے کی آواز آئی دیکھا کہ عمرؓ رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ''اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اس نے اس مال کو اپنے نبی علیہ السلام اور ابو بکرؓ سے ان کے ساتھ شر کے ارادے سے نہیں روکا اور عمرؓ کو اس کے ساتھ خیر کے ارادے کے ساتھ نہیں دیا[1]۔'' ابن عباسؓ ہی کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ کے سامنے مال غنیمت پڑا ہوا تھا۔ دفعتہً آپ پر اس شدت سے گریہ طاری ہوا کہ پسلیاں ہلنے لگیں' پھر فرمایا ''میری خواہش ہے کہ اپنی ذمہ داریوں سے اس طرح سبکدوش ہو جاؤں کہ اگر میں اجر کا مستحق قرار نہ پاؤں تو ملامت سے بھی محفوظ رہوں[2]۔''

قادسیہ کے معرکے میں کسریٰ کا لباس اور تاج وزیورات جب آپ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے سراقہ کو پہنا کر لوگوں کو نظارہ کروایا پھر اتروا کر فرمایا ''اے اللہ! تو نے یہ لعل وزر اور تاج و نگیں نبی علیہ السلام اور ابو بکرؓ کے دور میں امت کو عطا نہیں فرمایا' بلکہ میرے دور میں عنایت فرمایا۔ اگرچہ نبی کریم ﷺ اور ابو بکرؓ تیری نگاہ میں مجھ سے زیادہ مکرم اور محبوب تھے۔ اب میں تیری پناہ کا طالب ہوں میں جانتا ہوں کہ تو نے مجھے یہ سب کچھ اس لئے عطا کیا ہے کہ میری آزمائش کرے[3]۔'' سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ جب فارس کا خمس حضرت عمرؓ کی خدمت میں لایا گیا' تو آپ نے فرمایا' ''خدا کی قسم! جب تک میں اسے تقسیم نہ کر دوں آسمان کے سوا کوئی دوسری چھت اس کو نہیں ڈھانکے گی۔ پھر آپ کے حکم سے یہ مسجد کی دو صفوں کے درمیان رکھ دیا گیا۔ آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت عبداللہ بن ارقم کو حکم دیا اور انہوں نے رات بھر اس کی نگرانی کی۔ صبح آپ لوگوں کے ہمراہ وہاں تشریف لائے آپ کے حکم سے اوپر کی چادریں ہٹائی گئیں۔ آپ نے جواہرات' موتیوں اور سونے چاندی کے ڈھیر کا ایک ایسا منظر دیکھا جسے آپ کی آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا تو آپ رونے لگے۔ عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا ''یہ شکر کا موقع ہے' آپ کو رونا کس بات پر آ رہا ہے؟'' فرمایا ''بجا کہتے ہو' لیکن جب بھی اللہ نے کسی قوم کو یہ سب دیا' اس سے قوم میں آپس کے بغض و عناد کی تخم ریزی ہو گئی[4]۔'' ''جب بغض و حسد پیدا ہو جاتا ہے تو ان میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے[5]۔'' پھر آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ ہم ہاتھوں سے اٹھا اٹھا کر دیں یا صاع سے ناپ کر تقسیم کریں؟ راوی کے بقول پھر آپ نے یہ طے کیا کہ ہاتھوں ہی سے تقسیم کریں' چنانچہ آپ نے ہاتھوں سے اٹھا اٹھا کر یہ دولت تقسیم کی۔ راوی کا کہنا ہے یہ رجسٹروں کی ترتیب سے پہلے کی بات ہے[6]۔ نہاوند یا جلولا سے آنے والے مال کے موقع پر بھی یہی ہوا۔ آپ کا گریہ دیکھ کر کسی نے کہا 'یا امیر المومنینؓ! یہ دن حزن و ملال کا نہیں یہ تو خوشی کا مقام ہے۔'' آپ نے جواب دیا ''یہ بھی میں سمجھتا ہوں' لیکن جب بھی کسی قوم میں دولت آتی ہے تو اس کے ساتھ عداوت بھی آتی ہے[7]۔''

ابو سنان سے روایت ہے کہ ایک موقع پر میں امیر المومنینؓ سے ملنے گیا' مجلس میں مہاجرین کرام بھی موجود تھے۔ آپ نے وہ عطر دان منگوایا جو آپ کی خدمت میں عراق کے ایک مفتوحہ قلعہ سے بطور مال غنیمت آیا تھا۔ اس میں ایک انگوٹھی بھی تھی۔ آپ کے خاندان کے کسی لڑکے نے اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لی۔ آپ نے اسے لڑکے سے چھین لیا اور رونے لگے۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا ''آپ کیوں روتے ہیں؟ اللہ نے آپ کے عہد میں فتوحات کا دروازہ کھول دیا

(۱) [illegible] (۲) جوزی [illegible] (۳) جوزی [illegible] (۴) یوسف [illegible] (۵) صرفی [illegible] (۶) یوسف [illegible] جوزی [illegible]
[illegible] (۷) [illegible]

ہے اور آپ کو دشمن پر غلبہ عنایت فرمایا ہے اور آپ کی آنکھوں کو اس منظر سے شاد کیا ہے۔" آپ نے جواب دیا "میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے یہ بات سن رکھی ہے کہ جس وقت دنیا (اپنی فتنہ انگیز نعمتوں کے ساتھ) کسی گروہ میں آجاتی ہے تو وہ اپنے ساتھ بغض و عناد اور عداوت و رقابت بھی لاتی ہے اور یہ رقابت تاقیامت برقرار رہتی ہے' مجھے سارا دھڑکا اسی کا ہے"[1]۔" یہ سب روایات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ آپ مال و دولت اور خوشحالی و ترقی کو حکمرانوں کیلئے بھی آزمائش سمجھتے تھے اور لوگوں کیلئے بھی۔ حکمرانوں کیلئے اس طرح کہ ان سے قیامت کے دن اس کے حصول' صرف' انتظام اور تقسیم کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا کہ انہوں نے کہاں تک حق و انصاف کا خیال رکھا اور لوگوں کیلئے اس طرح کہ کہیں وہ اس کی وجہ سے گھمنڈ' تکبر' اسراف' بغض و عداوت کا شکار تو نہیں ہو گئے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ بات ان کی دنیا کو بھی برباد کردے گی اور آخرت کو بھی' آپ کا یہ ردعمل اس احساس کا مظہر تھا۔ آپ لوگوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے تھے' تاکہ وہ اس خوشحالی کو مقصد زندگی نہ بنا لیں۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھیں' فتوحات و خوشحالی کے دور کو اس کی طرف سے دی گئی نعمت سمجھ کر اس کا شکر ادا کریں اور آزمائش سمجھ کر اس کے احکامات کی پیروی کریں۔ اپنے اعلیٰ اخلاقی و روحانی اوصاف کو برقرار رکھیں' تاکہ اللہ کی تائید و نصرت ان کے ساتھ رہے اور دنیوی و اخروی دونوں اعتبار سے تباہی و بربادی سے بچ سکیں۔ اس مقصد کیلئے آپ ہر اہم موقع پر نہایت مدلل اور پراثر انداز میں پند و نصائح فرماتے رہتے تھے' جس کا لوگوں پر بڑا گہرا اثر ہوتا تھا۔

قادسیہ سے حاصل ہونے والے مال میں سے شاہی لباس و ہتھیار اور سامان آرائش و زیبائش قوی الجثہ شخص "محلم" کو پہنانے کے بعد مجمع عام میں آپ نے عبرت انگیز خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا "وہ مرد مسلمان کس قدر احمق ہوگا' جسے دنیا فریفتہ کرے۔ کیا وہ فریب خوردہ اس میں (حصول دنیا میں) اس جتنا یا اس سے آگے بڑھ سکتا ہے؟ کسریٰ نے جو کچھ دیکھا ایک مسلمان شخص کیلئے اس میں بھلائی نہیں' بلکہ برائی ہے۔ کسریٰ دنیا کی نعمتوں میں مشغول رہا اور آخرت کو بھول گیا۔ اس نے اپنے رشتہ داروں' دامادوں اور بہو وغیرہ کیلئے مال جمع کیا' لیکن اپنے آگے کیلئے کچھ نہیں بھیج سکا۔ اگر وہ اپنے لئے آگے بھیجتا اور زائد اموال کو اپنی اپنی جگہ پر رکھتا' تو اس کا فائدہ اسے پہنچتا۔ اس شخص سے بڑھ کر احمق اور کون ہوگا' جس نے دوسروں کیلئے مال جمع کیا ہو یا اس سے اپنے دشمن کو فائدہ پہنچایا ہو[2]۔"

اسی طرح جب ایران مکمل طور پر فتح ہو گیا اور شاہ یزدگرد اپنے خاندان اور خاقان کے ساتھ فرغانہ کی طرف فرار ہو گیا اور حضرت احنف بن قیس کا بھیجا ہوا قاصد اور وفد فتح کی بشارت اور مال غنیمت کا خمس لے کر آپ کے پاس پہنچا' تو آپ نے مسلمانوں کو جمع فرمایا' ان کے سامنے فتح نامہ پڑھنے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا "اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کا ذکر کیا ہے کہ اس نے انہیں ہدایت کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے پیروکاروں کو فوری حاصل ہونے والے دنیوی معاوضہ (مال و دولت) اور بعد میں حاصل ہونے والی آخرت کی بھلائی دونوں عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے "ھوالذی ارسل رسوله بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کله ولو کرہ المشرکون"[3]۔" (اللہ ہی تمام تعریفوں اور حمد و ثناء کا سزاوار ہے جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے لشکر کو فتح و نصرت عطا فرمائی۔) آگے فرمایا "آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ نے مجوسیت کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا ہے اور ان کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے' اب وہ اپنے ملک کی ایک بالشت بھر زمین پر بھی قابض نہیں ہو سکیں گے' جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ دیکھو! اللہ نے تمہیں ان کی سرزمین' ان کے ملک' ان کے مال و دولت اور ان کے فرزندوں کا مالک بنا دیا ہے' تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ تم کیا کارنامے انجام دو گے؟ آگاہ ہو جاؤ کہ تمہاری طرح بہت سے شہری و فوجی طاقت کے مالک تھے اور گزشتہ زمانے کی بہت سی مہذب قومیں دور دراز کے ممالک پر قابض ہو گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اپنا حکم نافذ کر کے رہے گا اور اپنا وعدہ پورا کرے گا اور ایک قوم کے بعد

---

(۱) ایضاً (۲) طبری ۴ :۲۲۳ کثیر ۷ :۶۸ (۳) التوبہ ۹ :۳۳

دوسری قوم کو نمودار کرے گا۔ تم اس کے حکام کو نافذ کرانے کیلئے ہر اس شخص کی پیروی کرو جو اس کے معاہدہ کی پابندی کرے اور تمہارے خدائی وعدہ پورا کر دکھائے۔ دیکھو! تم اپنی حالت میں تغیر و تبدل نہ کرنا ورنہ اللہ دوسری قوم کو تم پر مسلط کر دے گا۔ مجھے اس امت مسلمہ کی تباہی و بربادی کا صرف تمہی سے اندیشہ ہے (۱)۔" ایک اور خطبے میں آپ نے ارشاد فرمایا "اے اللہ کے بندو! تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور اس کی نعمتوں کی تکمیل کرو تم خواہ اپنی محفلوں میں باتیں کرتے ہو۔ اس کی نعمتوں کو یاد کرتے رہا کرو کیونکہ اللہ بزرگ و برتر نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا "تم اپنی قوم کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال کر لے آؤ اور تم انہیں اللہ کے (گزشتہ) کو یاد دلاؤ۔" اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا تھا "تم یاد کرو جبکہ تم (تعداد میں) تھوڑے تھے اور اس سر زمین میں کمزور تھے۔" جب تم کمزور ہونے اور دنیا کی خیر و منفعت سے محرومی کے باوجود حق و صداقت پر تھے اور خدا شناسی اور دینداری کے ساتھ حق پر تمہارا ایمان تھا اور موت کے بعد بھلائی کے امیدوار تھے' تو یہ بہت کافی تھا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ تمہاری معاشی حالت بہت تنگ تھی اور تم اللہ سے بہت ناآشنا تھے' لہٰذا اگر تمہیں اس دینداری کے علاوہ اس دنیا کی مال و دولت کا کوئی حصہ نہ ملتا' تو یہ بھی تمہارے لئے کافی تھا کہ آخرت میں تمہاری نجات ہو گی اور وہیں تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔ مگر اب اللہ نے تمہیں دنیا و آخرت دونوں مقامات کی نعمتیں عطا کی ہیں اور اگر تم چاہتے ہو کہ یہ (دونوں نعمتیں) برقرار رہیں' تو تم اللہ کے حق کو پہچانو اور اس کیلئے نیک عمل کرو اور اپنے نفس کو اطاعت پر آمادہ کرو اور ان (دنیاوی) نعمتوں کی خوشی کے ساتھ ساتھ ان کے زائل ہو جانے کا خوف بھی رکھنا چاہئے کیونکہ اگر نعمت کی ناشکری کی جائے گی تو نعمت بہت جلد چھن جائے گی' مگر نعمت کا شکر ادا کرنے پر نعمت میں اضافہ ہو گا (۲)۔"

یہ چند خطبات ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ آپ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی فکری' اخلاقی اور روحانی ترقی کیلئے بھی فکرمند رہتے تھے اور لوگوں کی اصلاح و تربیت کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ لوگوں پر تقاریر کا اثر اس وقت تک نہیں ہو سکتا' جب تک کہنے والے کی اپنی زندگی اور سارا طرز عمل اس کی عملی تفسیر نہ ہو۔ آپ نے جو کچھ کہا' اس سے بڑھ کر عمل کر کے دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا ہر پہلو ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے خوشحالی و ترقی کے باوجود اپنا معیار زندگی رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کی طرح رکھا۔ مصعب بن سعدؓ سے مروی ہے کہ آپ کی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ نے آپ سے عرض کی "اے امیر المومنینؓ! اے والد محترم اللہ نے آپ کو خوب رزق دیا ہے۔ زمین کو آپ پر فتح کر دیا ہے اور مال میں اضافہ کر دیا ہے۔ اگر آپ اپنے کھانے میں باریک اناج کھائیں اور لباس میں نفیس کپڑا پہنیں تو اچھا ہو۔" فرمایا "میں تمہارا فیصلہ تم ہی سے کراتا ہوں' کیا تمہیں یاد نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کیسی مصیبت کی زندگی گزارتے تھے۔" وہ برابر انہیں یاد دلاتے رہے یہاں تک کہ وہ رو دیں۔ پھر فرمایا "واللہ! اگر مجھ سے ہو سکے گا تو میں ضرور ضرور ان دونوں کی مصیبت کی زندگی میں شرکت کروں گا کہ شاید میں ان دونوں کے ساتھ راحت کی زندگی (آخرت) میں بھی شریک ہو جاؤں (۳)۔" عکرمہ بن خالد کہتے ہیں کہ حضرت حفصہؓ و حضرت عبداللہؓ وغیرہ لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ "اگر آنجناب اچھا کھانا کھایا کریں تو حق تعالیٰ کے کام پر اور زیادہ قوی ہو جائیں۔" آپ نے فرمایا "کیا سب کی یہی رائے ہے؟" لوگوں نے عرض کیا کہ سب کی یہی رائے ہے۔ آپ نے فرمایا "تمہاری خیر خواہی کا میں شکر گزار ہوں لیکن میں نے اپنے دونوں دوستوں کو ایک شاہراہ پر چھوڑا ہے' اگر خدانخواستہ میں ان کی شاہراہ کو چھوڑ دوں تو ان دونوں کا مرتبہ میں نہیں پا سکتا۔" کہتے ہیں کہ ایک سال ذرا تنگ سالی ہوئی تو آپ نے اس سال گھی اور روغن دار کھانا چھوڑ دیا (۴)۔" تمام لوگوں نے مل کر یہی بات کہلوائی تو جواب دیا "اے حفصہؓ تم نے اپنی قوم کی خیر خواہی کی' مگر اپنے باپ کے ساتھ بے وفائی کی۔ میرے خاندان والوں کا صرف میری جان و مال پر حق ہے' لیکن میرے دین و امانت میں کسی کا حق نہیں (۵)۔"

---

(۱) طبری [illegible] (۲) طبری [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible]

آپ نے دوسرے لوگوں کو بطور پالیسی اس بات پر مجبور نہیں کیا کہ وسائل میں ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے معیار زندگی میں اضافہ نہ کریں کیونکہ اس میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن اپنی عملی مثال سے انہیں عزیمت کی راہ دکھائی اور یہ پیغام دیا مسلمان کا کام سٹینس کے پیچھے مارا مارا پھرنا اور اسی کی دھن ذہن پر سوار رکھنا نہیں ہے' بلکہ آخرت کی فکر کرنا ہے جو حقیقی اور ابدی زندگی ہے۔ ایک مرتبہ ارشاد ہوا "اے برادران قوم میں اپنے کھانے سے متعلق آپ لوگوں کی ناگواری و ناپسندیدگی محسوس کرتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو تم سب سے اچھا کھانے والا' تم سب سے اچھی زندگی بسر کرنے والا ہو جاؤں۔ میں بھی سینے اور کوہان کے گوشت کے مزے' بھونے ہوئے گوشت اور رائی و زیتون کے سالن اور باریک روٹیوں کے لطف سے ناواقف نہیں ہوں' لیکن میں نے اللہ جل وشانہ کا ارشاد سنا جس نے ایک قوم کو اس کے کسی کام پر[1] جو انہوں نے کیا عار دلائی ہے اور فرمایا ہے "اذهبتم طيباتكم في حياتكم الدنيا واستمتعتم بها[2]۔" (تم اپنی بہترین چیزیں حیات دنیا ہی میں لے چکے ہو اور ان سے فائدہ بھی اٹھا چکے ہو (اس لئے آخرت میں تمہارے لئے حصہ نہیں بچتا۔)

آپ کے طرز زندگی کا جامع نقشہ علامہ ابن کثیر نے مستند روایت کو یکجا کر کے بہت خوب کھینچا ہے' جو حسب ذیل ہے۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے نہ دنیا کو چاہا اور نہ دنیا نے آپ کو چاہا اور حضرت عمرؓ کو دنیا نے چاہا اور آپ نے دنیا کو نہ چاہا اور ہم دنیا میں پیٹ کی پشت تک لوٹ پوٹ ہوئے اور حضرت عمرؓ کو عتابانہ رنگ میں کہا گیا کہ اگر آپ اچھا کھانا کھاتے تو وہ آپ کیلئے حق پر زیادہ قوت بخش ہوتا۔ آپ نے فرمایا "میں نے اپنے دو ساتھیوں کو ایک طریق پر چھوڑا ہے اگر میں ان کے طریق کو پاؤں تو مقام میں ان کو نہیں پا سکتا" اور آپ خلیفہ ہوتے ہوئے پیوند شدہ اونی جبہ پہنتے تھے جن میں سے بعض پیوند چمڑے کے ہوتے تھے اور کندھے پر درہ رکھ کر بازاروں میں چکر لگاتے تھے اور درے سے لوگوں کی تادیب کرتے تھے اور جب گٹھلی وغیرہ کے پاس سے گزرتے تو اسے اٹھا کر لوگوں کے گھروں میں پھینک دیتے تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے دونوں کندھوں کے درمیان چار پیوند تھے اور آپ کے تہبند کو چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ آپ نے منبر پر خطبہ دیا تو آپ کی چادر میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے اور آپ نے اپنے حج میں سولہ دینار خرچ کئے اور اپنے بیٹے سے فرمایا "ہم نے فضول خرچی کی ہے" اور آپ کسی چیز کا سایہ نہ لیتے تھے' ہاں آپ اپنی چادر کو درخت پر ڈال کر اس کے نیچے سایہ لیتے تھے اور آپ کیلئے کوئی خیمہ نہ تھا اور جب آپ بیت المقدس کی فتح کیلئے شام آئے تو آپ ایک خاکستری رنگ کے اونٹ پر سوار تھے اور آپ کے سر کا گنجا حصہ دھوپ میں چمک رہا تھا اور آپ کے سر پر عمامہ یا ٹوپی نہ تھی اور آپ نے پالان کے اگلے پچھلے حصے کے درمیان رکاب کے بغیر اپنی ٹانگوں کو جوڑا ہوا تھا اور آپ کا فرش مینڈھے کی اون کا تھا اور جب اترتے تھے تو وہی آپ کا بچھونا ہوتا تھا اور آپ کا تھیلا چھال سے بھرا ہوا ہوتا تھا اور جب آپ سوتے تھے تو وہی آپ کا تکیہ ہوتا تھا اور آپ کی قمیص کھردرے کپڑے کی تھی جو بوسیدہ ہو چکی تھی اور اس کا گریبان پھٹ چکا تھا۔ آپ جب اترتے تو فرماتے بستی کے نمبردار کو میرے پاس بلا لاؤ' وہ اسے بلاتے تو آپ فرماتے میری قمیص کو دھو کر سی دو اور مجھے عاریتاً ایک قمیص دے دو۔ آپ کے پاس کتان کی قمیص لائی گئی تو آپ نے فرمایا "یہ کیا ہے؟" آپ کو بتایا گیا کہ یہ کتان ہے۔ آپ نے فرمایا "کتان کیا ہوتا ہے؟" تو انہوں نے آپ کو بتایا' پس آپ نے اپنی قمیص اتاری تو انہوں نے اس کو دھویا اور سیا پھر آپ نے اسے پہن لیا۔ ایک شخص نے آپ سے کہا آپ عرب کے بادشاہ ہیں اور ان ممالک میں اونٹوں کی سواری مناسب نہیں۔ آپ کے پاس ایک ترکی گھوڑا لایا گیا تو آپ نے کجاوے اور زین کے بغیر اس پر چادر ڈال دی اور جب آپ چلے تو ترکی گھوڑا تیز رفتاری کرنے لگا تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا "اسے روک دو میں خیال نہیں کرتا تھا کہ لوگ شیاطین پر سوار ہوتے ہیں۔ میرا اونٹ لاؤ' پھر آپ اس سے اتر کر اونٹ پر سوار ہو گئے۔"

---

(١) سعد،٣/٢٧٩ (٢) الاحقاف،٤٦/٢٠۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں 'میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھا' آپ کسی حاجت کیلئے ایک باغ میں چلے گئے اور میں نے آپ کو کہتے سنا 'میرے اور آپ کے درمیان باغ کی دیوار حائل تھی "عمر بن الخطابؓ امیر المومنینؓ! آفرین ہے خطاب کے بیٹے 'خدا کی قسم تو ضرور بچنے کیلئے اللہ کی آڑ لے گا یا وہ تجھے عذاب دے گا۔" آپ نے اپنے کندھے پر مشکیزہ اٹھایا ہوا تھا تو آپ سے اس بارے میں پوچھا گیا 'تو آپ نے فرمایا "میرا نفس خود پسند ہو گیا تھا میں نے چاہا کہ اسے ذلیل کروں۔" آپ لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھاتے پھر اپنے گھر میں داخل ہو جاتے اور فجر تک مسلسل نماز پڑھتے رہتے اور آپ لگاتار روزے رکھے بغیر فوت نہیں ہوئے اور عام الرمادہ میں آپ صرف روٹی اور تیل کھاتے تھے یہاں تک کہ آپ کی جلد سیاہ ہو گئی اور آپ فرماتے تھے "اگر میں سیر ہو جاؤں اور لوگ بھوکے رہیں تو میں بہت برا والی ہوں" اور رونے کی وجہ سے آپ کے چہرے پر دو سیاہ لکیریں پڑی ہوئی تھیں اور آپ قرآن کی آیت سن کر غش کھا جایا کرتے تھے اور آپ کو لیٹے لیٹے اٹھا کر آپ کے گھر لے جایا جاتا تھا اور کئی روز تک آپ کی عیادت کی جاتی[1]۔ یہ ہے اس شخص کا حال جس کے رعب و دبدبے سے دنیا کانپتی تھی 'جس کے سامنے قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں سرنگوں ہو گئیں 'ان کے بیش بہا خزانے اس کے قدموں کے نیچے ڈھیر ہو گئے۔ اس نے اپنے طرز عمل سے جہاں اسلامی تصور ترقی کی آبیاری کی وہاں بادشاہت و خلافت کا عظیم فرق بھی واضح کر دیا۔ بادشاہت لوگوں کے خون پسینے کی کمائیوں سے اپنا تخت و تاج اور ایوان و محل سجاتی ہے اور خلافت سارے خزانے کو عوام الناس میں تقسیم کر کے انہیں خوشحال بنا دیتی ہے اور خود سادگی و بوریا نشینی کو ترجیح دیتی ہے۔

---

(1) کنز ۷/۱۱، ص ۱۲۴۔

○ .. نظام ٹیکس:

دور جدید میں ایک اور اہم معاشی مسئلہ جس کے منصفانہ حل کیلئے فاروق اعظمؓ کی اجتہادی بصیرت سے بھرپور استفادے کی ضرورت ہے' وہ نظام ٹیکس ہے۔ یہ ہر دور میں قومی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ رہا ہے۔ ریاست و معاشرے کی اجتماعی ضروریات کیلئے جن میں تعلیم' دفاع' صحت' نظم و نسق' فلاح و بہبود وغیرہ شامل ہیں۔ حکومت جو بھی اقدامات کرتی ہے' ان کیلئے حسب ضرورت رقوم کی فراہمی کے بغیر انہیں پورا کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ دور جدید میں مواصلات' توانائی' اطلاعات و نشریات' معاشی ترقی' آبپاشی' امور داخلہ و خارجہ میں بے پناہ وسعت پیدا ہو گئی ہے' جن کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے متعدد' متفرق اور متنوع دارے معرض وجود میں آ گئے ہیں' جو ہر وقت سرگرم عمل رہتے ہوئے قومی و ملی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ جنہیں انفرادی سطح پر نہیں سنبھالا جا سکتا' ان کے اخراجات حکومتی خزانے ہی سے پورے کئے جا سکتے ہیں' جن کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ٹیکس ہوتا ہے۔ اس لئے ٹیکس ہر شہری کیلئے واجب الادا سمجھا جاتا ہے۔ وہ اسے اپنے مشترکہ فوائد کیلئے ادا کرتے ہیں اور بالواسطہ طور پر عوام ہی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یہ ملکی معیشت کے استحکام' خود کفالت اور تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نظام ٹیکس وہی کامیاب ہو سکتا ہے جس کے مقاصد اعلیٰ و ارفع ہوں' جو اجتماعیت کے مفادات کا محافظ ہو' جو معاشی اونچ نیچ اور ظلم و استحصال کا ازالہ کرے' قومی آمدنی میں بتدریج اضافہ کرے' معاشی ترقی کی رفتار کو تیز کرے' جو معقول' معتدل اور منصفانہ ہو' جس میں عوام کے مسائل و مجبوریوں کا لحاظ رکھا گیا ہو' ان کی خواہشات و امنگوں کا آئینہ دار ہو' مضبوط اور لچکدار ہو' عوام کو خوشدلی و فراخی سے اپنا حصہ ڈالنے پر تیار کرے اور عوام کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو سکے کہ وہ جو کچھ ادا کر رہے ہیں' وہ ان پر ہی صرف ہو رہا ہے۔ اسلام کا نظام ٹیکس ان سب خصوصیت سے متصف ہے۔ فاروق اعظمؓ نے اپنی پالیسیوں اور اقدامات کے ذریعے اسے ثابت کیا اور زیادہ کھول کر دنیا کے سامنے رکھا۔ دور جدید میں نظام محصولات کو اسلام کے سانچوں میں ڈھالنے کیلئے اس سے رہنمائی لے سکتے ہیں اور یہ بھی جائزہ لے سکتے ہیں کہ ہمارا فلسفہ ٹیکس' طریق و اسلوب اور نظام کار کس حد تک اسلامی روح و مقاصد سے ہم آہنگ ہے۔

فاروق اعظمؓ ٹیکسوں کی بھرمار اور وصولی کو اسلامی ریاست کا مقصد نہیں سمجھتے تھے' بلکہ آپ کے نزدیک اس کا اصل کام دین کی تبلیغ و اشاعت ہے' اس لئے اس کی ساری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ اسلام کے دائرہ امن و فلاح میں داخل ہو جائیں اور اسلامی حقوق کی ذمہ داریوں سے مستفیض ہوں۔ اس سلسلے میں آپ نے رسول اکرم ﷺ کی سنت پر سختی سے عمل کیا۔ سلمان بن بریدہ سے روایت ہے حضرت عمرؓ کا یہ طریقہ تھا کہ جب آپ کے پاس مسلمانوں کا کوئی لشکر تیار ہو جاتا' تو ان پر کسی عالم اور فقیہ فرد کو امیر مقرر کر دیتے۔ ایک بار لشکر تیار ہوا تو آپ نے سلمہ بن قیس کو ان کا امیر مقرر کیا اور فرمایا "اللہ کا نام لے کر' اللہ کی راہ میں' اللہ سے کفر کرنے والوں کے ساتھ جنگ کیلئے روانہ ہو جاؤ۔ جب مشرک دشمنوں سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان کو دعوت دو کہ تین شکلوں میں سے کوئی ایک شکل اختیار کریں۔ ان کو اسلام کی دعوت دو' اگر وہ اسلام لے آئیں اور اپنے ہی علاقہ میں مقیم رہنا پسند کریں تو ان کے اموال میں سے زکوٰۃ لی جائے گی اور انہیں مسلمانوں کی فے میں سے حصہ نہیں ملے گا۔ اگر وہ تمہارے ساتھ (جنگ کیلئے) نکلنا پسند کریں' تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو تمہارے لئے ہیں اور وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی' جو تم پر عائد ہیں۔ اگر وہ یہ شکل منظور نہ کریں تو ان سے کہو کہ جزیہ ادا کریں' اگر وہ جزیہ ادا کرنے پر آمادہ ہو جائیں' تو ان کے دشمنوں سے لڑ کر ان کا دفاع کرو اور خود انہیں خراج کی ادائیگی کیلئے فارغ چھوڑ دو اور ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ اگر وہ یہ شکل بھی منظور نہ کریں تو ان سے جنگ کرو'

اللہ ان کے مقابلے میں ضرور تمہاری مدد کرے گا[۱]۔" آپ کے عہد میں تمام فتوحات میں اسی اصول کو سامنے رکھا گیا۔ عالم و فقیہہ کو سالار مقرر کرنے میں حکمت یہی تھی کہ وہ مال و اسباب کے بجائے اسلام کو ہی مقصود بنائے گا اور اسلامی اصولوں کی پوری طرح پاسداری کرے گا۔ آپ نے اسلام کی ہی تبلیغ کی خاطر تقریر میں اعلان کیا کہ "ہم کسی شخص سے جو اسلام قبول کر چکا ہو اس کی ملکیت سے کوئی چیز نہیں چھینیں گے[۲]۔" آپ کا یہ طریقہ تھا کہ آپ مفتوح و مغلوب قوموں کو غلام بنانے اور ان کے اموال کو بطور غنیمت تقسیم کرنے سے زیادہ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ وہ جسمانی اور مذہبی اعتبار سے اسلامی ریاست کے آزاد شہری بنیں اور اس کے بدلے میں ٹیکس (جزیہ) ادا کریں' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آپ کو یہ مطلوب تھا کہ وہ اسلام قبول کر کے غیر مسلموں پر عائد تمام ٹیکسوں سے نجات حاصل کر لیں کیونکہ آپ مال کے بجائے اسلام میں وسعت کے خواہاں تھے۔ ۲۰ھ میں فتوحات مصر کے دوران سکندریہ کے حاکم نے جنگی قیدیوں کے بدلے حضرت عمرو بن العاصؓ کو جزیہ دینے کی درخواست کی' تو انہوں نے اس بارے میں آپ کو خط کے ذریعے آگاہ کیا' تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا "مجھے تمہارا خط موصول ہوا' جس میں تم نے تحریر کیا ہے کہ حاکم سکندریہ نے جزیہ ادا کرنا قبول کر لیا ہے بشرطیکہ تم اس کے علاقے کے جنگی قیدیوں کو لوٹا دو' حقیقت یہ ہے کہ جزیہ وہ مستقل آمدنی ہے جو ہمارے لئے اور ہمارے بعد کے آنے والے مسلمانوں کے کام آسکتی ہے۔ یہ چیز مجھے اس مال غنیمت سے زیادہ پسند ہے جو تقسیم کر دیا جاتا ہے' پھر وہ مال ختم ہو جاتا ہے۔ تم حاکم سکندریہ کے سامنے یہ تجویز رکھو کہ وہ جزیہ ادا کرے' مگر جو جنگی قیدی تمہارے قبضے میں ہیں انہیں اختیار دیا جائے گا کہ وہ اسلام قبول کریں یا اپنی قوم کے مذہب کو برقرار رکھیں۔ جو مسلمان ہو جائے گا وہ مسلمانوں میں شامل ہو گا' اس کے حقوق و فرائض انہیں جیسے ہوں گے۔ مگر جو اپنی قوم کے مذہب پر برقرار ہو گا' اس پر وہی جزیہ مقرر کیا جائے گا' جو اس کے ہم مذہبوں پر مقرر ہو گا۔ راوی کے بقول جب کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا تو ہم یہ نعرۂ تکبیر بلند کرتے' جو اس نعرے سے زیادہ زوردار ہوتا جب کہ ہم کوئی گاؤں فتح کرتے[۳]۔"

آپ حکومت کی طرف سے ٹیکسوں کے حصول کو مال بٹورنے اور خزانے بھرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی وصولیابی کے بعد عوام کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور وہ بے یار و مددگار ہو کر اپنی جان' مال' عزت و آبرو کے تحفظ کیلئے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہوں۔ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے' بلکہ اس کے ذریعے حکومت پر عوام کے حقوق و مفادات کے تحفظ کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری ہر شہری کے سلسلے میں ہوتی ہے' وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کی جان کی آپ کے نزدیک قدر و قیمت کیا تھی' اس کا اندازہ آپ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے' جو حمید بن عبدالرحمن سے مروی ہے۔ "قال عمرؓ لان استنقذ رجلا من المسلمين من ايدي الكفار احب الي من جزيرة العرب[٤]۔" (ایک مسلمان کو کفار کے ہاتھوں چھڑا لینا مجھے پورے جزیرۂ عرب سے زیادہ محبوب ہے۔) نیز آپ نے یہ اعلان کیا کہ مسلمان فرد مشرکین کی قید میں ہو تو اس کو چھڑانے کا بار مسلمانوں کے بیت المال پر ہے[۵]۔ جہاں تک غیر مسلموں اور ذمیوں کا معاملہ ہے' اس بارے میں آپ نے ایک تقریر میں فرمایا "تم ان پر جزیہ عائد کرو' انہیں غلام نہ بناؤ' مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے' ان کو کسی طرح کا نقصان پہنچانے اور حلال طریقے اور حق کے علاوہ کسی اور طریقے سے مال کھانے سے روک دو اور تم نے جن شرائط پر ان سے صلح کی ہے ان کو پورا کرو[٦]۔" ہر طرح کے حقوق کو انشور کرنے اور ہر طرح کے تحفظات فراہم کرنے کے بدلے میں جزیہ و خراج کی حیثیت و مقدار انتہائی کم تھی۔ معاہدات کی پابندی کے سلسلے میں آپ نے اپنے اہلکاروں کو جن امور کا پابند و عادی بنایا' وہ بھی ہمارے لئے عہد حاضر میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اہل جرجستان سے مصالحت کے وقت وہاں کے لوگوں نے ایک شرط یہ منظور کرائی کہ ان کے جنگل بھی محفوظ چراگاہوں کی طرح سمجھے جائیں گے۔ اس لئے جب مسلمان وہاں سے گزرتے

---

(۱) یوسف، ۱۹۳ (۲) عبید، ۱۳٤ (۳) طبری، II، ٥/۱۰۰۹ (٤) یوسف، ۱۹٦ (۵) ایضاً (٦) ایضاً ۱٤۱۔

تھے تو ان جنگلوں سے بچ کر نکلتے تھے کہ کہیں ان کو نقصان پہنچا کر عہد شکنی کے مرتکب نہ ہو جائیں[۱]۔ آپ صلح کی شرائط طے کرنے کے بعد یہ ضمانت دیتے تھے کہ ان کی پابندی کرنے پر ان کو ان کے جان و مال اور بیوی بچوں کے تحفظ کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ حفاظت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ذمہ داری قرار پا جاتی ہے[۲]۔ ٹیکس ایک معاہدہ ہے جو ریاست اور اس کے شہریوں کے درمیان ہوتا ہے کہ اس کے بدلے میں وہ انہیں ہر طرح کے تحفظات فراہم کرے گی۔ ان کے اجتماعی حقوق و مفادات کی نگرانی و دفاع کرے گی اور ان کی خاطر ایسے رفاہی و فلاحی انتظامات کرتی رہے گی' جو انفرادی طور پر وہ نہیں کر سکتے۔ جو حکومت اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کرے اسے ٹیکس لینے کا کوئی حق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے عہد میں فتوحات شام کے دوران جب مسلمانوں کے سالار لشکر حضرت ابو عبیدہؓ کو یہ محسوس ہوا کہ وہ ذمیوں کے مکمل دفاع کی ذمہ داری پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں' تو ان تمام والیوں کو جنہیں آپ نے صلح کے ذریعے فتح کئے ہوئے شہروں پر مامور کیا تھا' یہ لکھا کہ وہاں کے باشندوں سے جزیہ اور خراج کی جو رقمیں وصول کی گئی ہوں' وہ انہیں واپس کر دی جائیں اور یہ بات واضح کر دی جائے کہ ہم نے یہ رقوم اس لئے واپس کی ہیں کہ تم نے ہم سے یہ عہد لیا تھا کہ ہم تمہارا دفاع کریں گے' لیکن ہمارے خلاف جتنے زبردست لشکر جمع کرنے گئے ہیں' ان کی خبر ہمیں مل گئی ہے اور ہم اتنے طاقتور نہیں ان کا مقابلہ کر کے تمہارا دفاع کر سکیں۔ اس لئے ہم نے (ازراہ احتیاط) تم سے وصول کردہ رقوم تمہیں واپس دے دی ہیں۔ اگر اللہ نے ہمیں ان پر فتح عطا کی' تو ہم ان شرائط کی پوری پابندی کریں گے جو ہمارے اور تمہارے درمیان طے پا چکی ہیں۔ جب ان والیوں نے ان سے یہ بات کہی اور وصول کیا ہوا مال انہیں واپس کر دیا تو وہ لوگ کہنے لگے "خدا تمہیں فتح عطا کرے اور دوبارہ ہم پر (حکمران بنا کر) واپس لائے۔ آج اگر تمہاری جگہ یہ رومی ہوتے تو ہمیں کچھ بھی واپس نہ دیتے' بلکہ الٹے ہر وہ چیز چھین لیتے جو ہمارے پاس باقی رہ گئی ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہ بچتا[۳]"۔

حکمران و رعایا اور حاکم و محکوم کے مابین اعتماد و ہم آہنگی اور ذہنی و جذباتی قرب کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے' جو فلسفہ ٹیکس کے عادلانہ تصور سے نمودار ہوئی۔ معاہدین سے معاملہ تو حسب معاہدہ ہی ہوتا ہے' لیکن ذمیوں کا اس سے بھی آگے بڑھ کر ہے۔ اس میں تو یہ صورتحال تھی کہ بنیادی انسانی حقوق تو سب کو فراہم کئے جاتے تھے' لیکن جزیہ صرف قابل کار لوگوں سے لیا جاتا تھا' وہ بھی ایسے جو ادا کرنے کی پوزیشن میں ہوں اور اگر قحط سالی کا شکار ہوں گے' تو معاف کر دیا جائے گا۔ اہل آذربائیجان سے حسب ذیل معاہدہ ہوا' یہ معاہدہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کے حاکم عتبہ بن فرقد نے اہل آذربائیجان کے ساتھ ان کے تمام میدانوں' پہاڑوں' مضافات اور تمام اقوام کیلئے کیا ہے۔ ان کے جان و مال' مذہب و ملت اور رسوم و قوانین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے' بشرطیکہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق جزیہ ادا کریں۔ یہ جزیہ بچے' عورت اور ایسے مفلس و اپاہج پر عائد نہیں ہے جس کے پاس دنیاوی مال و متاع کی کوئی چیز نہ ہو اور نہ ایسے عابد و راہب پر ہے جس کے پاس دنیاوی مال و متاع نہ ہو اور جو ان کے ساتھ رہتے ہیں' ان کے بارے میں بھی یہی حکم ہے۔ مگر عوام کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اسلامی لشکر کے کسی شخص کی دن اور ایک رات مہمانداری کریں اور اسے راستہ بتائیں۔ جو قحط سالی کا شکار ہو گا تو اس سے اس سال کا جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ جو کوئی یہاں سکونت رہے گا تو اس کو بھی وہی حق حاصل ہوں گے' جو اس سے پہلے کے باشندوں کو حاصل ہیں اور جو یہاں سے نکلنا چاہے' تو اسے پناہ دی جائے گی' تا آنکہ وہ محفوظ مقام پر پہنچ جائے[۴]۔ بلکہ اگر وہ محتاج و ضرورتمند ہوں گے' تو ان سے کچھ لینے کے بجائے ان کی کفالت کی جائے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گزر کسی کے دروازے کے سامنے سے ہوا جہاں ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ ایک بوڑھا آدمی تھا جس کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ آپ نے پیچھے سے اس کے بدن کو ٹھوکا اور پوچھا "تم کس مذہب کے اہل کتاب ہو؟" اس نے جواب دیا "میں بڑھاپے' حاجت مندی اور جزیہ کے باعث بھیک مانگ رہا ہوں۔" راوی کہتا ہے کہ عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے

---

(۱) طبری ۲/۱۸۱ (۲) یوسف: ۳۸ (۳) یوسف: ۱۳۹ (٤) طبری ۲: ۵۰۵

گئے اور گھر میں سے لا کر اسے کچھ دیا۔ پھر آپ نے بیت المال کے خازن کو بلوایا اور ان سے کہا "اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو کیونکہ یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ان کی جوانی میں ہم ان سے (جزیہ وصول کر کے) کھائیں اور بڑھاپا آئے تو انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔" "انما الصدقات للفقراء والمساکین"[۱] "(اس آیت میں مذکور) فقراء سے مراد مسلمان فقراء ہیں اور یہ آدمی اہل کتاب کے مسکینوں میں سے ہے۔" آپ نے اس آدمی اور اس جیسے دوسرے افراد کے سر سے جزیہ بھی ساقط کر دیا۔ راوی کا کہنا ہے کہ میں نے یہ واقعہ خود دیکھا ہے اور اس بوڑھے کو بھی دیکھا ہے[۲]۔ اس سے ٹیکس کے ضمن میں اسلام کا یہ فلسفہ سامنے آتا ہے کہ اسلام سارے انسانوں کی بنیادی ضرورتوں اور دیگر تمام انسانی حقوق کی فراہمی کا علمبردار ہے' خواہ بچے ہوں یا بوڑھے' مرد ہوں یا عورتیں' مسلم ہوں یا غیر مسلم' امیر ہوں یا غریب' اس کی منصفانہ اور عملی شکل یہ ہے کہ ٹیکس کا بار تو صرف ان لوگوں پر ڈالا جائے' جو صاحب حیثیت ہوں لیکن حقوق ان سب کو فراہم کئے جائیں' جو ریاست کے شہری ہوں' یہی بات ہمیں فلسفہ زکوۃ میں بھی نظر آتی ہے۔ اس طرح اسلام پسے ہوئے طبقوں اور غریبوں اور مفلسوں کو بھی عزت و وقار اور امن و اعتماد عطا کرتا ہے۔

آپ نے زیادہ تر متناسب (Proportional) و متزائد (Progressive) ٹیکس لگائے' تاکہ وہ اپنی آمدنی و وسائل کے مطابق ادا کریں۔ انہیں زیادہ بوجھ نہ محسوس ہو اور معاشی و معاشرتی تفاوت کا خاتمہ ہو سکے۔ نسبتاً کم آمدنی والے لوگوں کی خیر خواہی کے ساتھ ریاست کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ آپ نے سواد میں خوشحال لوگوں پر ۴۸ درہم' متوسط لوگوں پر ۲۴ درہم اور عام لوگوں پر ۱۲ درہم فی کس عائد کیا۔ اس نظام کی ایک خوبی یہ بھی سمجھی جاتی ہے کہ اس میں لچکداری پائی جاتی ہے اور بوقت ضرورت اس کی شرح میں بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے حکومت کی آمدنی میں جو اضافہ ہوتا ہے' اس کا منفی اثر مسلمانوں کی معیشت پر نہیں پڑتا۔ چنانچہ آپ کے سامنے یہ معاملہ لایا گیا کہ (خوشحالی بڑھ جانے کی وجہ سے) وہ زیادہ ادا کر سکتے ہیں تو آپ نے ان پر نظر ثانی کی[۳]۔" آپ ٹیکسوں کے معاملے کو اجتہادی مسئلہ سمجھتے تھے۔ زکوۃ و عشر کے علاوہ جن کی شرحیں متعین ہیں' دیگر ٹیکسوں کی شرح کے تعین' نفاذ کے طریق کار اور اس کے انتظامی معاملات کو بحسن و خوبی چلانے کیلئے حالات و وقت کی ضروریات کے مطابق حکومت کے صوابدیدی اختیارات کے زمرے میں رکھتے تھے۔ آپ نے پہلی مرتبہ عشور کے نام سے بالواسطہ ٹیکس کا آغاز کیا' جو دراصل محصول چونگی کی طرح کا تجارتی ٹیکس تھا۔ بقول امام شعبی "سب سے پہلے اسلام میں جس نے عشور کو رائج کیا وہ حضرت عمرؓ ہیں[۴]۔"

امام ابو عبید القاسم اس کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عشور کے سلسلے میں جو کارروائیاں کیں' ان کی بنیاد ان صلح ناموں پر تھیں' جو ان کے عہد کے ساتھ طے پائے تھے۔ یہ کچھ رسول اکرم ﷺ کے عہد میں نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ آپ نے جن سے صلح کی تھی ان سے اس قسم کی کوئی شرط ان کے ساتھ نہیں رکھی تھی۔ اسی طرح حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں بھی جہاں تک غیر عربی ممالک کی فتوحات کا تعلق ہے' یہ سلسلہ حضرت عمرؓ کے دور میں جاری ہوا' لہٰذا اس قسم کے مسائل انہیں کے دور میں رونما ہوئے[۵]۔ محصول چونگی کی ابتداء کے بارے میں کہ کس طرح ہوئی۔ دو مختلف روایات ہیں ایک یہ کہ باشندگان منبج نے جو سمندر پار ایک حربی قوم تھے حضرت عمر فاروقؓ کو لکھا کہ ہمیں اپنے ملک سے تجارت کیلئے آنے کی اجازت دیں' آپ ہم سے عشر وصول کر لیا کیجئے۔ آپ نے اصحاب رسول ﷺ سے اس بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے اس کے حق میں مشورہ دیا' چنانچہ یہ پہلی حربی قوم تھی جس سے عشر وصول کیا گیا[۶]۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابو موسی اشعریؓ نے حضرت عمر بن الخطابؓ کو لکھا "ہمارے ملک کے مسلمان تاجر جب حربی علاقوں میں جاتے ہیں تو وہ لوگ ان سے

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible]

دسواں حصہ وصول کرتے ہیں۔ "حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا "تم بھی ان سے اسی طرح وصول کرو جس طرح وہ مسلمان تاجروں سے وصول کرتے ہیں۔ ذمیوں سے بیسواں حصہ لیا کرو اور مسلمان تاجروں سے چالیس درہم میں سے ایک درہم وصول کرو' دو سو درہم سے کم پر کچھ نہ لو' ہاں دو سو کا ہو تو اس میں سے پانچ درہم ہو اس سے زیادہ ہو تو اسی حساب سے وصول کرو۔"[1] اس طرح آپ نے کم از کم مالیت دو سو درہم کے برابر مقرر کی۔ اس کی تفصیل متعدد روایات سے بھی ہوتی ہے[2]۔ آپ کے عمال محصولات کی وصولی کیلئے اموال کی مالیت کا نہایت عادلانہ اندازہ لگاتے تھے اور دیگر لوگوں کو بھی مشاورت میں شامل کرتے تھے' تاکہ کسی قسم کی زیادتی نہ ہو۔ ایک مرتبہ بنو تغلب کا ایک عیسائی گزرا جس کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ موقع پر موجود لوگوں نے اس کی قیمت بیس ہزار درہم لگائی۔ زیاد بن حریر جو عامل تھے انہوں نے اس شخص سے کہا "یا تو تم مجھے گھوڑا دے دو اور انیس ہزار لے لو یا گھوڑا اپنے پاس رکھو اور مجھے ایک ہزار (بطور چونگی) دے دو۔" اس شخص نے گھوڑا خود رکھا اور انہیں ہزار دے دیا[3]۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے عہد میں ٹیکس گزار کو پوری طرح مطمئن کیا جاتا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں کی جا رہی۔ علاوہ ازیں آپ نے اصول مقرر کیا ایک مال پر صرف ایک ہی مرتبہ وصول کیا جائے۔ اگر محصولات میں زیادتی کی کوئی شکایت آپ تک پہنچتی تھی تو فوری کارروائی کرتے تھے۔ مذکورہ تغلبی عیسائی اسی سال دوبارہ زیاد بن حریر کے پاس سے گزرا تو انہوں نے اس سے کہا کہ ایک ہزار ادا کرو' اس نے ان سے پوچھا کہ "کیا میں جتنی بار تمہارے یہاں سے گزروں گا' تو تم مجھ سے ایک ہزار وصول کرو گے؟" انہوں نے کہا "ہاں!" راوی کا کہنا ہے کہ یہ سن کر تغلبی حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور مکہ میں جا کر ان سے ملا' وہ ایک گھر کے اندر تھے' اس نے حاضر ہونے کی اجازت حاصل کی۔ آپ نے پوچھا "تم کون ہو؟" اس نے جواب دیا "میں ایک عرب عیسائی ہوں اور ان سے اپنا قصہ کہہ سنایا۔ "حضرت عمرؓ نے اس سے صرف اتنا کہا بہت اچھا' بات صاف ہو گئی۔ وہ شخص لوٹ کر پھر زیاد بن حریر کے پاس آیا' اس کا خیال تھا کہ اسے اب ایک ہزار اور دینا پڑے گا' لیکن وہاں اس نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ کا خط اس سے پہلے پہنچ چکا تھا' جس میں لکھا تھا "جس گزرنے والے سے تم ایک بار صدقہ لے چکے ہو' اس سے آئندہ سال اسی تاریخ تک دوبارہ وصول نہ کرو' الا یہ کہ وہ مزید مال لے کر آئے۔" راوی کہتا ہے کہ یہ دیکھ کر وہ عیسائی بول اٹھا "اللہ کی قسم میں تو یہ سوچ چکا تھا کہ ایک ہزار اور دے دوں' میں خدا کو گواہ بناتا ہوں کہ اب میرا عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں اور میں اسی شخص کے دین پر ہوں' جس نے تم کو یہ خط لکھا ہے"[4]۔

ٹیکسوں کا بے جواز ہونا اور نارو طور پر حاصل کرنا حکومت و رعایا کے بارے میں دوریاں پیدا کرتا ہے' لیکن اگر ان میں حق و انصاف کا لحاظ رکھا جائے' تو بات صرف تعلقات کی اصلاح کا باعث نہیں بنتی' بلکہ لوگوں کو اپنے دین تک کو تبدیل کرنے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ دور جدید میں اسی پہلو پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آج فاروق اعظمؓ کی اجتہادی بصیرت کے اس فیصلے سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی دور میں کسی علاقے یا ملک یا قوم کے لوگ جزیہ کے نام پر ٹیکس دینے میں توہین محسوس کرتے ہوں' تو اس کا نام تبدیل کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ ایک روایت ہے جبلہ بن ایہم حضرت عمرؓ بن الخطاب کے پاس بحالت نصرانیت آیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو اسلام اور ادائے صدقہ کی دعوت دی' اس نے انکار کیا اور کہا "میں اپنے دین پر قائم رہوں گا اور صدقہ دوں گا۔" حضرت عمرؓ نے کہا "اگر تو اپنے دین پر قائم رہتا ہے' تو جزیہ دے۔" اس پر اس نے ناک چڑھائی' حضرت عمرؓ نے کہا "ہمارے پاس تیرے لئے تین (باتوں) میں سے ایک کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اسلام یا جزیہ اور یا یہ کہ جہاں تیرا جی چاہے تو چلا جائے۔" چنانچہ وہ تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ بلاد روم چلا گیا۔ حضرت عمرؓ کو جب یہ خبر ہوئی تو نادم ہوئے۔ عبادہ بن الصامت نے انہیں ملامت کی اور کہا "اگر آپ اس سے صدقہ لینا قبول

---

(۱) یوسف ۱۳۵ یحییٰ ۶۷۳ عبدالرزاق ۲۳۴/۱۰ (۲) یحییٰ ۳-۱۷۲ عبید ۴۷۵ (۳) یوسف ۱۳۶ (۴) ایضاً

کر لیتے اور پھر اس کی تالیف (قلب) کرتے تو وہ ضرور مسلمان ہو جاتا (۱)۔ "پھر جب ۱۲ھ میں حضرت عمرؓ نے عمیرؓ بن سعد الانصاری کو بلاد الروم کی طرف جیش عظیم کے ساتھ بھیجا اور انہیں صائفہ کا والی کیا اور یہ اولین الصائفہ تھی' تو انہیں حکم دیا کہ "جبلہ بن الایہم سے بہ تلطف پیش آنا اور سے باہمی قرابت کا پاس دلا کر بلاد اسلام کی طرف آنے کی دعوت دینا اور کہنا کہ جو صدقہ تم نے دینے کو کہا تھا وہی دو اور اپنے دین پر قائم رہو۔" عمیرؓ روانہ ہو کر بلاد الروم میں داخل ہوئے اور حضرت عمرؓ نے جبلہ سے جو کچھ کہنے کا حکم دیا تھا اس سے کہا۔ اس نے ان کی بات رد کر دی اور اسی پر قائم رہا کہ بلاد الروم ہی میں رہے گا (۲)۔ یہی اصول آپ نے بنو تغلب کے سلسلے میں اختیار فرمایا۔ ان سے حاصل ہونے والے جزیہ کو دوگنی زکوٰۃ و صدقہ کا نام دیا۔

داؤد بن کردوس کہتے ہیں "میں نے بنی تغلب کی طرف سے حضرت عمرؓ ابن الخطابؓ سے صلح کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ (بنی تغلب) دریائے فرات پار کر چکے تھے اور رومیوں سے جا کر ملنا چاہتے تھے۔ اس صلح نامہ کی شرائط یہ تھیں "یہ (بنی تغلب) کسی بچہ کو بپتسمہ نہیں دیں گے اور نہیں اپنے دین کے سوا کسی دین کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ ان سے عشر دگنا وصول کیا جائے گا یعنی ہر بیس درہم پر ایک درہم (۳)۔" زرعہ بن نعمان (یا نعمان بن زرعہ) کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ بن الخطاب نے بنی تغلب جزیہ وصول کرنا چاہا اور وہ دیگر علاقوں میں نکل کر منتشر ہونے لگے' تو میں نے ان کے بارے میں حضرت عمرؓ سے گفتگو کرنا چاہی۔ میں نے حضرت عمرؓ سے کہا "اے امیر المومنینؓ! بنی تغلب عرب ہیں اور جزیہ کے نام سے گھبراتے ہیں۔ یہ لوگ کھیتی باڑیاں اور مویشیوں کے علاوہ کچھ مال نہیں رکھتے' البتہ یہ اپنے دشمنوں کو زک پہنچانے والے لوگ ہیں لہٰذا آپ ان (کو اپنے علاقہ) سے (دور کر کے) اپنے دشمنوں کو تقویت نہ پہنچایئے۔" چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس شرط پر ان سے صلح کر لی کہ میں ان سے صدقہ (زکوٰۃ) کا دوگنا وصول کروں گا اور ساتھ ہی ان سے یہ شرط بھی کی کہ وہ اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں (۴)۔" امام ابو عبید کے بقول ہمارے خیال میں انہوں نے جزیہ کا نام اڑا کر یہ صورت اس لئے جائز رکھی کہ انہیں بنی تغلب کی طرف سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ جزیہ کے نام سے بیزاری و ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں اور وہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ اگر انہیں (اسی نام پر) مجبور کیا گیا تو وہ رومیوں سے جا ملیں گے اور اسلام کے خلاف ان کے مددگار بن جائیں گے۔ پھر ان پر یہ حقیقت بھی منکشف تھی کہ اگر ان سے وہی جزیہ لینے کے ساتھ ہی اتنی رعایت کر دی جائے کہ اس کا نام (جزیہ) باقی نہ رکھا جائے' تو اس سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ بناء بریں انہوں نے ان کیلئے جزیہ کا لفظ اڑا دیا اور اس کی واجب الادا رقم "صدقہ" کے نام سے لینے لگے' جو مسلمانوں سے وصول کی جانے والی زکوٰۃ کی دگنی ہوتی تھی۔ اس طرح ایک طرف تو ان کے مخالفین سے جا ملنے کے اندیشہ کا سدباب ہو گیا اور دوسری طرف ان کے ذمہ مسلمانوں کے جو واجب الادا حقوق تھے' وہ بھی پورے پورے وصول ہو گئے اور اس فیصلہ میں حضرت عمرؓ صائب الرائے اور اپنی جگہ بالکل حق بجانب تھے (۵)۔

امام بلاذری کے بقول اس پر سب کا اجماع ہے کہ بنی تغلب کے مال کی وہی حیثیت ہے جو مال خراج کی ہے کیونکہ وہ جزیہ کا بدل ہے (۶)۔ آپ کے نزدیک ریاست کی اصل ذمہ داری لوگوں کی فلاح و بہبود کیلئے کوشش کرنا' انہیں معاشی طور پر زیادہ سے زیادہ خود کفیل بنانا' انہیں ناروا دست اندازیوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس کیلئے ان سے ٹیکس وصول کرنے کے بجائے انہیں چھوٹ دینے کی ضرورت ہو' تو اس پر عمل کرنا زیادہ مناسب ہے تاکہ وہ مستقبل میں اس قابل ہو سکیں۔ انہیں جو سہولیات میسر ہیں ان کے بدلے میں ٹیکس ادا کریں' یہاں تک کہ جن شہریوں کا رویہ اور ٹیکس گزاروں کا انداز اجتماعی مصالح کے خلاف ہو' انہیں بوقت ضرورت علاقہ بدر تو کر سکتے ہیں' لیکن ان کے انسانی حقوق کی نفی نہیں کر سکتے۔ اس کی دلیل اہل نجران کے بارے میں آپ کا فیصلہ ہے۔ جب عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو

---

(۱) [illegible] (۲) بلاذری [illegible] (۳) عبید ۴۸۱ (۴) عبید ۴۸۲ بلاذری ۱۸۶ (۵) عبید ۴۸۳ (۶) بلاذری ۱۸۷۔

یہ لوگ ان کے پاس آئے۔ عمرؓ نے ان لوگوں کو نجران یمن سے جلا وطن کر کے نجران عراق میں بسا دیا تھا کیونکہ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ آپ نے ان کیلئے یہ تحریر فرمایا ''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ "یہ ہے وہ تحریر جو مومنین کے امیر عمرؓ نے باشندگان نجران کیلئے لکھی ہے۔ ان میں سے جو لوگ بھی (نجران یمن سے) روانہ ہو رہے ہیں ان کو اللہ کی اماں حاصل ہے۔ مسلمانوں میں سے کوئی بھی انہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہ اس (عہد نامہ) کے طور پر لکھا گیا ہے جو محمد نبی ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کیلئے تحریر فرمایا تھا۔ ما بعد ایہ لوگ شام اور عراق کے جس امیر کے پاس سے بھی گزریں اسے چاہئے کہ زمین کی کھیتی کرنے میں ان کی مدد کرے اور یہ لوگ جو کچھ (زمینیں) خود کاشت کر لیں، وہ ان کیلئے راہ خدا میں صدقہ اور ان زمینوں کا بدل ہیں، جنھیں یہ چھوڑ کر آ رہے ہیں۔ کسی کو اس بارے میں ان پر اعتراض کا کوئی حق نہیں، نہ ان سے کسی طرح کا تاوان لیا جا سکتا ہے۔ مابعد اجو مسلمان فرواں کے یہاں آئے اسے ان پر ظلم کرنے والوں کے خلاف ان کی مدد کرنی چاہئے کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں ذمہ حاصل ہے اور ان کے سر جو جزیہ ہے وہ ان کے آنے کے بعد سے چوبیں مہینوں تک کیلئے معاف کیا جاتا ہے اور ان پر کوئی بار نہ ڈالا جائے۔ الا یہ کہ کوئی ان کے ساتھ بھلائی کر دے، ان پر نہ کوئی زیادتی کی جائے نہ ان کو کسی دست درازی کا ہدف بنایا جائے۔" اس پر گواہ ہیں عثمانؓ بن عفان اور معیقیب اور انہوں نے اسے لکھا بھی ہے (1)۔

بصیرت عمرؓ کا ایک اجتہاد یہ بھی تھا کہ ٹیکس گزاروں سے صرف مال و متاع کی شکل میں ہی لینے کے بجائے ان سے رفاہی و فلاحی خدمات لی جائیں، جنھیں حکومت اپنے وسائل سے یا تو پورا نہیں کر سکتی تھی یا پھر حکومت کیلئے زیادہ مہنگا اور مشکل ہوتا۔ اس کے برعکس علاقے کے لوگ زیادہ بوجھ محسوس کئے بغیر خوشدلی سے ادا کرتے تھے۔ اس میں دوسروں کے علاوہ خود ان کی اپنی بھی بھلائی ہوتی تھی۔ اس کے بدلے میں انہیں ٹیکسوں میں رعایت دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ آپ غیر مسلموں سے معاہدات میں جزیہ کے علاوہ ایک دن کی بعض اوقات تین دن کی میزبانی فرض کر دیتے تھے۔ علاوہ ازیں بعض رفاہی ذمہ داریاں مثلاً پلوں کی مرمت وغیرہ بھی شامل ہوتی تھیں۔ اسلم کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے چاندی رکھنے والوں پر چالیس درہم اور سونا رکھنے والوں پر چار دینار جزیہ مقرر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ذمہ مسلمانوں کی خوراک اور تین دن کی مہمانی کا فرض بھی عائد کیا۔ حارثہ بن مضرب کہتے ہیں کہ عمرؓ نے اہل سواد کے ذمہ ایک روز و شب کی مہمانی فرض کی تھی اور یہ قانون مقرر کیا تھا کہ ذمیوں کے پاس جو غلہ اور چارہ ہو اس میں دست اندازی نہ کی جائے۔ حارثہ بن مضرب کہتے ہیں کہ ہماری موجودگی میں حضرت عمرؓ کا خط پڑھا گیا، جس میں لکھا تھا "ہم نے اہل سواد پر ایک روز و شب کی مہمانی فرض کی ہے۔ اگر کسی (مسلمان) کو بارش یا بیماری اس مدت سے زائد قیام کرنے پر مجبور کر دے تو پھر وہ اپنا مال خرچ کرے۔" احنف بن قیس کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے صلح کی شرائط میں ذمیوں پر ایک روز و شب کی ضیافت فرض کی، نیز ان کے ذمہ پلوں کی مرمت رکھی اور یہ کہ اگر ان کے علاقہ میں کوئی مسلمان قتل ہو جائے، تو وہ سب مل کر اس کی دیت ادا کریں۔ حکیم بن عمیر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے لکھا تھا "مسلمان مسافروں کا کوئی قافلہ اگر معاہدہ کئے ہوئے ذمیوں کے پاس رات میں پناہ لیتے ہوئے پہنچے اور وہ ان کے بسیرے کا انتظام نہ کریں تو اسلامی حکومت کی ذمہ داری ان ذمیوں سے ختم ہو جاتی ہے۔" عبدالملک بن عمیر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے شامی نبطیوں سے یہ شرط طے کی تھی کہ ان کے پھلوں اور چارہ کے استعمال کا مسلمانوں کو حق حاصل ہوگا لیکن مسلمان یہ چیزیں لاد کر نہیں لے جائیں گے (2)۔"

ابو عبیدہ بن الجراح نے باشندگان شام سے صلح کی اور وہاں فاتحانہ داخل ہوتے وقت یہ شرط طے کی کہ موجودہ گرجا اور بیعے باقی رہنے دیئے جائیں گے اور لوگ کوئی نیا گرجا یا بیعہ نہ تعمیر کریں گے۔ جو لوگ راستہ بھول جائیں ان کی رہنمائی کرنا اور اپنے دریاؤں اور نہروں پر اپنے صرفہ سے پل تعمیر کرنا ان لوگوں کی

(۱) یو، صفحہ ۷۳ (۲) عبید، ۱۴۵

ذمہ داری قرار پائی۔ یہ بھی طے ہوا کہ جو مسلمان ان کے یہاں آئیں ان کی یہ تین دن میزبانی کریں گے۔ کسی مسلمان کو نہ گالی دیں گے نہ ماریں گے۔ مسلمانوں کی بستیوں میں صلیب نہیں بلند کریں گے۔ سوروں کو اپنے گھروں سے ہنکا کر مسلمانوں کے صحن یا میدان میں نہیں چھوڑیں گے۔ راہ خدا میں جنگ کرنے والوں کیلئے آگ روشن کریں گے۔ مسلمانوں کی کسی کمزوری کی خبر دوسروں کو نہیں پہنچائیں گے۔ مسلمانوں کی اذان سے پہلے ان کی اذان کے وقت اپنے ناقوس نہیں بجائیں گے اور اپنے تہواروں میں اپنے جھنڈے نہیں بلند کریں گے اور تہواروں میں ہتھیار بند ہو کر نہیں نکلیں گے نہ گھروں میں ہتھیار رکھیں گے۔ طے پایا کہ اگر وہ ان میں سے کسی شرط کی بھی خلاف ورزی کریں گے تو ان کو سزا دی جائے گی۔ انہیں شرائط پر صلح ہو گئی [1]۔ "بسا اوقات ان معاہدوں میں دفاعی معاملات میں ان سے تعاون لینا اور حربی سرگرمیوں کے خاتمے کیلئے انہیں شریک کرنا بھی شامل ہوتا تھا۔

بیان کیا گیا ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کسی قوم سے صلح کرتے تھے تو یہ شرط طے فرما لیتے تھے کہ "وہ لوگ اتنا خراج ادا کریں، تین دن میزبانی کیا کریں گے، راستہ دکھایا کریں گے، ہمارے خلاف ہمارے دشمنوں سے سازباز نہ کریں گے اور ہمارے کسی مجرم کو پناہ نہ دیں گے۔ ان شرائط کی پابندی کرنے پر ان کو ان کے جان و مال اور بیوی بچوں کے تحفظ کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ (حفاظت) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ذمہ داری قرار پا جاتی ہے، لیکن اگر لشکر ان کی فصل سے ہمارے علم کے بغیر کچھ لے لے تو اس کے سلسلہ میں ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے [2]۔ "بسا اوقات کسی بھی علاقے کے مسلمانوں کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اجناس کی شکل میں ٹیکس وصول کر لیا جاتا تھا۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے الشام اور الجزیرہ میں مسلمانوں کی خوراک کیلئے دو مدی گیہوں اور تین قسط تیل مقرر کیا اور ان پر ان مسلمانوں کی جو وہاں آئیں تین دن کی ضیافت مقرر ہوئی [3]۔ آپ کے نزدیک ٹیکس گزاروں کی عزت و تکریم کرنا لازم تھا۔ آپ لوگوں کو بھی اس چیز کا احساس دلاتے تھے کہ ان کی قدر و قیمت کو پہچانیں اور ان کا خیال رکھیں۔ جویریہ بن قدامہ تمیمی سے روایت ہے کہ میں نے عمرؓ بن الخطاب سے سنا تھا، آپ سے ہم نے عرض کیا تھا کہ "اے امیر المومنینؓ! ہمیں کوئی نصیحت کیجئے۔" تو آپ نے فرمایا "اوصیکم بذمۃ اللہ فانہ ذمۃ نبیکم و رزق عیالکم [4]۔"

آپ کے نزدیک اس لحاظ سے عزت کی دو بنیادیں ہیں، ایک یہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی ذمہ داری ہیں، ان کے نام پر ان سے عہد و پیمان کیا گیا ہے اور دوسرا یہ کہ سب کے اہل و عیال کیلئے رزق کا ایک وسیلہ و ذریعہ ہیں کہ ان کے ٹیکسوں کی وجہ سے وظائف اجراء، فلاح و بہبود کے اقدامات اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ آپ ٹیکس کی وصولی کو ظلم و جبر کے بجائے نرمی، خوشدلی اور سہولت و رعایت کے ساتھ وصول کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور عمال کی طرف سے ایسی ہی رویہ پسند کرتے تھے۔ جبیر بن نفیر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب کے پاس کثیر مال آیا تو انہوں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ اتنا کثیر مال حاصل کرنے میں تم نے لوگوں پر بے جا دباؤ ڈال کر انہیں تباہ کر دیا ہو گا۔" اس پر وہ (مال لانے والے) بولے "نہیں اللہ کی قسم ہم نے ان کی سہولت اور خوشدلی کے ساتھ یہ کچھ ان سے وصول کیا ہے۔" حضرت عمرؓ نے دریافت کیا "بغیر کوڑے مارے اور بغیر لٹکائے؟" انہوں نے کہا "جی ہاں!" اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "الحمد للہ! جس نے مجھے اور میرے دور حکومت کو رعایا پر مظالم و تشدد سے محفوظ رکھا [5]۔" سعید بن عبد العزیز کہتے ہیں کہ سعید بن عامر بن حذیمؓ حضرت عمر بن الخطابؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے ان پر کوڑا اٹھایا۔ اس پر سعیدؓ نے کہا "آپ تو وقت سے پہلے ہی سزا دینے لگے۔ بہر حال اگر آپ سزا دیں گے تو ہم صبر کریں گے، اگر آپ معاف کر دیں گے تو ہم شکر گزار ہوں گے اور اگر آپ کو ہم سے کوئی شکایت ہو جائے تو ہم اس شکایت کے ازالہ کی کوشش کریں گے۔" اس پر حضرت عمرؓ نے

---

(۱) یوسف، ۱۳۸ (۲) یوسف ۳۹ (۳) بلاذری، ۱۵۷ (۴) بخاری ۴: ۶۴ (۵) عبید ۴۶

فرمایا "بس یہی مسلمان کا فریضہ ہے۔ اب بتاؤ تم نے خراج کی رقم داخل کرنے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟" انہوں نے جواب دیا "آپ نے ہمیں حکم دے رکھا ہے کہ کاشتکاروں سے چار دینار سے زائد وصول نہ کریں' چنانچہ ہم بھی اس سے زیادہ کا ان سے مطالبہ نہیں کرتے۔ البتہ ہم نے انہیں فصلیں کٹنے تک مہلت دے دی ہے۔" اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "جب تک میں زندہ ہوں تمہیں اس عہدہ سے معزول نہیں کروں گا"[1]۔ بسا اوقات مقامی لوگوں کے مفادات کے تحفظ اور ریونیو آمدنی میں اضافے کیلئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کوئی روایتی ٹیکس نافذ کر دیا جائے۔ دوبارہ نافذ کر دیا جائے جیسا کہ فاروق اعظمؓ نے نبطیوں کے سلسلے میں کیا' جو مدینے کی منڈی میں سامان تجارت لایا کرتے تھے۔ امام مالک کا کہنا ہے کہ میں نے ابن شہاب سے پوچھا کہ "حضرت عمرؓ نبطیوں سے عشر کیوں وصول کرتے تھے۔" انہوں نے جواب دیا کہ عہد جاہلیت میں ان سے یہ ٹیکس لیا جاتا تھا حضرت عمرؓ نے بھی اسے لازم کر دیا[2]۔" اسے دوبارہ نافذ کرنے کی مذکورہ دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اس کے برعکس بعض بنیادی اشیاء کی فراوانی سے دستیابی' ان کی سرمایہ کاری کے فروغ اور قیمتوں کے استحکام کا تقاضا ہو تو ٹیکسوں میں کمی کر دینی چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے نبطیوں کے ٹیکس میں کمی کر دی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نبط کے کافروں سے گیہوں اور تیل وغیرہ پر نصف عشر وصول کرتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مدینے میں زیادہ مقدار میں لائی جائیں البتہ آپ قطنیہ کے لوگوں سے پورا عشر ہی لیتے تھے[3]۔ یقیناً یہ امتیازی رویہ کسی اعلیٰ تر مقصد کے تحت ہو گا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دور جدید میں بھی مختلف قوموں سے وسیع تر قومی و ملی مصالح کی بنا پر درآمدات و برآمدات کے سلسلے میں مختلف ٹیکس کی مختلف شرحوں کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ٹیکسوں کے سلسلے میں آپ کا ایک اور نقطہ نظر یہ سامنے آتا ہے کہ حکومت کو ان کے تعین' نفاذ اور طریق کار میں وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ وہ عوامی فلاح و بہبود' حالات و وقت کی ضروریات' شرعی تقاضوں اور دیگر بے شمار اجتماعی مصالح کی بنیاد پر اجتہادات کر سکتی ہے' اس کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

عشور کے نفاذ' بنو تغلب سے دوگنا جزیہ کی وصولی کے فیصلے' ٹیکس گزاروں سے دیگر فلاحی و سماجی کام لینے کے ساتھ ساتھ آپ نے گھوڑوں اور غلاموں پر ٹیکس وصول کرنا شروع کیا اور اس کا نام صدقہ رکھا۔ سلیمان بن یسار سے روایت ہے کہ اہل شام نے حضرت ابو عبیدہؓ سے کہا کہ ہمارے گھوڑوں اور غلاموں پر زکوٰۃ لیجئے۔ انہوں نے انکار کیا اور حضرت عمر فاروقؓ کو اس کی اطلاع دی' انہوں نے بھی انکار کیا۔ شامیوں نے پھر اس کا تقاضا کیا' تو ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا' انہوں نے جواب میں لکھا کہ "اگر وہ دینا چاہتے ہیں تو لے کر انہی کی طرف لوٹا دو' اسے ان کے خادموں اور لونڈیوں کی خورد و نوش پر صرف کرو"[4]۔ "عہد نبویؐ اور عہد صدیق اکبرؓ میں گھوڑے اور غلام پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے دور اول میں بھی ان پر زکوٰۃ نہیں تھی' پھر یہ واقعہ پیش آیا کہ جب حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح شام کے والی تھے' ان کے پاس کچھ اہل تعلق آئے اور ان سے کہا کہ ہمارے گھوڑوں اور غلاموں پر زکوٰۃ لے لیا کریں۔ انہوں نے انکار کیا' پھر حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو تحریر کیا۔ حضرت عمرؓ نے بھی گریز کیا' چنانچہ وہ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمارا مال گھوڑے اور غلام ہیں' آپ ان پر ہم سے زکوٰۃ لیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "کسی ایسی شے پر زکوٰۃ نہیں لوں گا جس پر مجھ سے پہلے نہیں لی گئی۔" ازاں بعد آپ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا جس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "جب یہ لوگ خوش دلی سے دینا چاہتے ہیں تو اچھا ہے آپ ان سے قبول فرمالیں لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ یہ آپ کے بعد جزیہ نہ بن جائے۔" چنانچہ آپؓ نے گھوڑوں پر دس درہم اور غلاموں پر دس درہم سالانہ مقرر فرمادئے اور گھوڑے کے مالک کیلئے فی گھوڑا دس جریب ماہانہ اور غلام کے مالک کیلئے فی غلام دو جریب ماہانہ روزینہ مقرر فرمایا۔ پھر جب حضرت معاویہ کا عہد آیا تو انہوں نے حساب کیا جس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو جو دیا جا رہا ہے وہ اس سے

---

(1) عبید ٤٦ (2) مالک ١٨٠ (3) ایضاً (4) مالک ٢٧٧' حنبل ٤٩/١' ٢٢٩/٥ III۔

زائد ہے جو ان سے لیا جا رہا ہے تو انہوں نے اس سلسلے کو ختم کر دیا اور دینا بھی بند کر دیا۔ اصل صورتحال یہ ہے کہ یہ حضرت جو کچھ دیتے تھے وہ زکوٰۃ نہیں تھی' بلکہ تبرع تھا اور حضرت عمرؓ نے ان کے خلوص اور ان کے پاکیزہ جذبات کی قدر افزائی فرمائی اور اس کے صلہ میں ان کے گھوڑوں اور غلاموں کا روزینہ مقرر فرمایا اور جو آپ نے لیا تھا اس سے زیادہ ان کو دیا۔ اسی طرح آپ نے پہلی مرتبہ دریائی و سمندری پیداوار سے بھی خمس کو وصول کیا' تو انہوں نے ایک دنبل مچھلی کے بارے میں' جسے ایک آدمی نے ساحل پر پایا تھا لکھ کر دریافت کیا کہ اس میں کیا (واجب) ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں لکھا "یہ اللہ کے عطا کردہ اموال میں سے ایک مال ہے' اس میں اور سمندر میں سے اللہ جل شانہ جو کچھ بھی نکالے' خمس واجب ہے۔ راوی کے بقول حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا "یہی میری رائے ہے"[1]۔ "امام ابو یوسف نے اسی روایت پر استدلال کرتے ہوئے سمندر سے نکالے جانے والے عنبر اور زیور بنانے کی اشیاء پر خمس (۵/۱) واجب ہونے کا مشورہ دیا اور لکھا کہ باقی ۵/۴ حصہ اس کیلئے ہے جس نے اسے نکالا ہو[2]۔"

حضرت عمرؓ کے نزدیک سامان تجارت پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ عائد ہو جاتی ہے' چنانچہ آپ نے حماس ؒ کو حکم دیا کہ اپنے سامان تجارت کی قیمت لگا لیں اور اس کی زکوٰۃ دیں۔ حماس سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ تشریف لائے اور کہا کہ "اے حماس اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو۔" میں نے کہا کہ میرے پاس ترکش اور چمڑ ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ "اس کی قیمت لگاؤ اور زکوٰۃ ادا کرو[3]۔" رحمن بن عبدالقاری بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے عہد میں بیت المال پر مقرر تھا کہ حضرت عمرؓ جب تاجروں کے وظائف نکالتے تو تمام موجود اور غیر موجود مال تجارت کو جمع کر کے اس کا حساب کرتے اور تمام موجود اور غائب مال کی جانب سے موجود مال میں زکوٰۃ لے لیتے[4]۔ اور جب کوئی تاجر زکوٰۃ وصول کرنے والے کے پاس سے گزرتا تو وہ اس کے تمام نقود اور تجارت کے سامان کا حساب کر کے اس میں سے چالیس حصہ زکوٰۃ وصول کرتا[5]۔

ٹیکس کے پورے نظام کو کامیابی سے چلانے اور سے نتیجہ خیز بنانے کا دارومدار اس کے عاملین پر ہوتا ہے۔ ان میں سب سے پہلی صفت جو ہمیں اسوۂ فاروقؓ سے پہنچتی ہے وہ یہ ہے کہ اس اہم شعبے میں نہایت امانتدار و دیانتدار لوگوں کا تقرر کیا جائے ورنہ تقرر کرنے والے پر اس کی ذمہ داری عائد ہوگی۔ آپ کا ارشاد ہے "من استعمل فاجرو هو يعلم انه اجر فهو مثله"[6]۔ "(کہ جس نے جانتے بوجھتے ہوئے کسی فاجر کا تقرر کیا تو وہ خود بھی اسی جیسا ہے۔) آپ ان کو معقول معاوضہ دیتے تھے تاکہ وہ کسی مجبوری کی وجہ سے خیانت کا ارتکاب نہ کریں۔ ایک مرتبہ حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ سے کہا کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کو (کاموں میں) آلودہ کر دیا ہے۔ آپ نے جواب دیا "ابو عبیدہؓ میں اگر اپنے دین کی سلامتی کیلئے دینداروں سے مدد نہ لوں تو اور کس سے مدد لوں؟" انہوں نے کہا "اگر آپ کو ایسا کرنا ہی ہے تو اتنا معاوضہ دیں کہ وہ خیانت سے بے نیاز ہو جائیں[7]۔" مقرر کرنے کے بعد آپ مسلسل انہیں دیانتداری کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ نہاوند میں حضرت نعمان بن مقرن کو لکھا "جب مال غنیمت حاصل ہو جائے تو خیانت نہ کرنا[8]۔" آپ نے اس جنگ میں حاصل ہونے والے اموال کی ذمہ داری حضرت سائبؓ کو سونپی اور فرمایا "جو مال غنیمت اس لشکر کے ہاتھ لگے اس کی نگرانی تمہارے ذمے ہے' خبردار کوئی ناحق چیز مجھ تک نہ پہنچانا اور حقدار کو اس کے حق سے محروم نہ کرنا[9]۔"

دوسرا آپ کا اہم اصول یہ تھا کہ اس نازک ذمہ داری پر اہلیت و صلاحیت رکھنے والے اصحاب کا تقرر فرماتے۔ اس سلسلے میں لوگوں سے مشورہ بھی کر لیتے تھے' تاکہ صحیح آدمی کا انتخاب ہو سکے۔ چنانچہ سواد کی زمینوں کے بارے میں جب یہ طے ہو گیا کہ انہیں تقسیم نہیں کیا جائے گا' تو آپ نے فرمایا "معاملہ مجھ پر واضح ہو

(۱) یوسف ۷ (۲) ایضاً (۳) عبدالرزاق ۴: ۹۶ مسند ۳۷ عبید ۳۸۳ (۴) عبید ۳۸۳ (۵) رواس ۳۵۶ (۶) جوزی ۷۶ (۷) یوسف ۱۳ (۸) ایضاً ۸۴

(۹) عبید ۲۳۸

گیا ہے' اب بتاؤ کہ کون ایسا ماہر اور دانشمند ہے جو ان زمینوں کا مناسب طور پر بندوبست کردے اور کاشتکاروں پر ان کی برداشت کے مطابق (ٹیکس خراج) تجویز کردے؟" لوگوں نے بالاتفاق عثمان حنیف کا نام پیش کیا اور کہا "آپ ان کو اس کام کا ذمہ دار بنا سکتے ہیں کیونکہ یہ صاحب فہم و فراست اور تجربہ کار ہیں[1]۔" آپ اسی وجہ سے بہت سے عالی مقام صحابہ کرامؓ جو عشرہ مبشرہ میں شامل تھے چھوڑ کر ان لوگوں کا انتخاب کرتے جو مقام میں تو اگرچہ کم ہوں لیکن تفویض کردہ کام کی اہلیت و صلاحیت رکھتے ہوں۔

روایت میں ہے کہ آپ عام طور پر عامل صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو بناتے تھے جیسے حضرت عمرو بن العاصؓ' حضرت معاویہؓ' حضرت مغیرہؓ بن شعبہ وغیرہ' لیکن جو ان لوگوں سے افضل تھے انہیں چھوڑ دیتے تھے جیسے حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ' حضرت طلحہؓ' حضرت زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور ان کے مساوی لوگ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں میں عامل بننے کی صلاحیت بھی تھی اور حضرت عمرؓ کی نگرانی و ہیبت کا بھی ان پر زیادہ اثر رہتا تھا۔ حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ آپ اکابر صحابہ کرامؓ کو کیوں والی نہیں بناتے؟ فرمایا "مجھے یہ ناپسند ہے کہ انہیں عہدداری میں آلودہ کروں[2]۔" آپ منصب کی فراہمی میں محض تعلق و قرابت کو بد دیانتی سمجھتے تھے اور اس سے سختی سے اجتناب کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے پورے عہد خلافت میں بنو عدی کے کسی شخص کا تقرر نہیں کیا تھا۔ ایک چھوٹا سا عہدہ ایک فرد کو دیا لیکن وہ بھی واپس لے لیا' تاکہ بعد والوں کیلئے ایک درخشندہ مثال قائم ہو۔ آپ کا ارشاد ہے "ذاتی پسند اور قرابت کو بنیاد بنا کر منصب سونپنے والا گویا اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین سے خیانت کرتا ہے[3]۔"

عاملین کے سلسلے میں تیسرا آپ کا اصول یہ تھا کہ ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتے تھے کہ یہ کام بھی اگر صحیح شرائط و دیانت سے ادا کیا جائے' تو جہاد ہی کی طرح کا اجر و ثواب رکھتا ہے' تاکہ وہ پوری جانفشانی اور کمٹمنٹ سے یہ کام کریں' یہی بات رسول اکرم ﷺ کے ارشاد سے بھی واضح ہوتی ہے۔ حدیث نبویؐ ہے "العامل علی الصدقة بالحق کالغازی فی سبیل الله[4]۔" (حق کے ساتھ صدقہ وصول کرنے والا عامل راہ خدا میں جنگ کرنے والے کی طرح ہے۔) آپ نے اسی سوچ اور جذبے کو آگے منتقل کیا۔ ایک صحابیؓ کا کہنا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے مجھے محصل زکوٰۃ بنا کر بھیجا' پھر میری ملاقات مدینے میں آپ سے ہوئی تو انہوں نے پوچھا "کیا تمہیں یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ جہاد کی طرح کام میں لگے رہو؟" میں نے کہا "کیسے اچھی لگے جبکہ لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ میں ان پر ظلم کرتا ہوں۔" آپ نے پوچھا "وہ کیسے؟" میں نے عرض کی کہ 'لوگ کہتے ہیں کہ تو ہم سے بھیڑ بکریوں کے بچے کی بھی زکوٰۃ وصول کرتا ہے۔" آپ نے فرمایا "ٹھیک کہتے ہو' چرواہا اسے اپنے کندھوں پر اٹھالے تو بھی اسے بھی زکوٰۃ کے حساب میں شمار کرو۔ ان کو یہ جتلا دو کہ تم گھروں میں (دودھ کی خاطر) پالی ہوئی بھیڑ یا بکری' کھانے کے لائق تیار بھیڑ' بکرے اور بچہ جننے کے قریب بھیڑوں اور بکریوں کو اس لئے تو چھوڑ دیتے ہو[5]۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیکس وصول کرنے والوں پر اعتراضات تو ہوتے ہی رہتے ہیں' ان کو صبر و تحمل سے برداشت کرنا بھی جہاد ہی کی طرح ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کی پوری پابندی کر رہے ہوں اور حکومت کی وضع کردہ پالیسی کو پوری دانشمندی اور خلوص سے نافذ کریں۔ آپ نے جو ہدایت کی' اس میں یہ تھا کہ عوام کو پیار و محبت سے دلائل کے ذریعے قائل کرنے کی پوری کوشش کریں' تاکہ وہ خوش دلی سے ادا کرتے رہیں۔ آپ نے سفیان بن مالک کو بصرہ میں تحصیل صدقہ پر مامور کیا۔ وہ کچھ دنوں تک وہاں رہے' پھر آپ سے جہاد پر چلے جانے کی اجازت طلب کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا "او لست فی جہاد؟" (کیا تم جہاد پر نہیں ہو[6]۔)

---

(۱) یوسف:۲۶۱ (۲) سعد:۲۸۳ (۳) جوزی:۷۶:٤ (٤) یوسف:۸۱ (۵) یوسف:۸۲ (٦) ایضاً۔

آخری بات یہ ہے کہ ٹیکس پر ایسے لوگوں کو مامور کیا جائے جو نہایت رحم دل اور حلیم الطبع ہوں۔ لوگوں کی شبانہ روز کی محنت کی کمائیوں سے مال لینا آسان کام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں انہیں تیار کرنا اور نرمی سے وصول کرنا ضروری ہے۔ ناروا سختیاں عوام میں بے چینی، بد اعتمادی اور بغض و عناد پیدا کرتی ہیں اور حکومت و عوام کے درمیان تعلقات کو خراب کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔ آپ ایک مرتبہ جب سفر شام پر جا رہے تھے تو راستے میں آپ کا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا، جو دھوپ میں کھڑے کر دیے گئے تھے اور ان کے سروں پر تیل ڈالا جا رہا تھا۔ آپ نے پوچھا "ان لوگوں نے کیا کیا ہے؟" لوگوں نے بتایا کہ ان کے ذمے جزیہ ہے جسے انہوں نے ادا نہیں کیا ہے لہٰذا انہیں عذاب دیا جا رہا ہے، تاکہ اسے ادا کریں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "یہ لوگ کیا کرتے ہیں اور جزیہ ادا نہ کر سکنے کے بارے میں کیا عذر پیش کرتے ہیں؟" جواب ملا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں، ہم جزیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ آپ نے فرمایا، "پھر تو ان لوگوں کو چھوڑ دو اور ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے "لاتعذبوا الناس فان الذین یعذبون الناس فی الدنیا یعذبھم اللہ یوم القیامۃ"[1]۔" (لوگوں کو عذاب نہ دو کیونکہ جو لوگ دنیا میں انسانوں کو عذاب دیتے ہیں ان کو قیامت کے دن اللہ عذاب دے گا۔)

جبیر بن نفیر کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس کثیر مال آیا تو فرمایا کہ "میں سمجھتا ہوں تم نے لوگوں پر بے جا دباؤ ڈال کر اور تباہ کر کے یہ ہوگا۔" مال دینے والے نے کہا "نہیں، اللہ کی قسم ہم نے ان کی سہولت اور خوشدلی کے ساتھ یہ کچھ وصول کیا ہے۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا "بغیر کوڑے مارے اور بغیر لٹکائے؟" انہوں نے جواب دیا "جی ہاں!" حضرت عمرؓ نے فرمایا "الحمد للہ! جس نے مجھے اور میری حکومت کو رعایا پر مظالم و تشدد سے محفوظ رکھا[2]۔" آپ کے ایک عامل سعید بن عامر بن حذیم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے کوڑا اٹھایا، اس پر سعید نے کہا "آپ تو بات سے پہلے ہی سزا دینے لگے، بہر حال اگر آپ سزا دیں گے تو ہم صبر کریں گے۔ اگر معاف کر دیں گے تو ہم شکر گزار ہوں گے اور اگر آپ کو ہم سے کوئی شکایت ہو جائے تو ہم اس کے ازالے کی کوشش کریں گے۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "بس یہی مسلمان کا فریضہ ہے۔ اب بتاؤ تم نے خراج کی رقم داخل کرنے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟" انہوں نے جواب دیا "آپ نے ہمیں حکم دے رکھا ہے کہ کاشتکاروں سے چار دینار سے زائد نہ وصول کریں چنانچہ ہم بھی اس سے زیادہ کا ان سے مطالبہ نہیں کرتے البتہ ہم نے انہیں فصلیں کٹنے تک مہلت دے دی ہے۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "جب تک میں زندہ ہوں تمہیں اس عہدہ سے معزول نہیں کروں گا[3]۔"

---

(۱) یوسف: ۱۲۵ (۲) عبید ٤٦ (۳) ایضاً۔

۵۔ نظام وظائف:

حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت کا شاہکار کارنامہ آپ کا نظام وظائف ہے۔ آپ کی معاشی پالیسیوں میں اسے اہم مقام حاصل ہے۔ آپ نے اس کے ذریعے معاشی ترقی کے اثرات و ثمرات کو عوام الناس میں پھیلا دیا۔ یہ آپ کی اولیات میں شامل ہے۔ اس کے آغاز پر آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا' وہ ہر دور کی اسلامی حکومت کی معاشی منصوبہ بندی کیلئے رہنما خطوط مہیا کرتے ہیں۔ مالک بن اوس بن حدثان سے مروی ہے کہ میں نے عمر بن الخطابؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا "روئے زمین پر ہر مسلمان جس کی گردن کا کوئی مالک نہ ہو' اس کا اس مال غنیمت میں حق ہے وہ دیا جائے یا اس سے روکا جائے۔ اگر میں زندہ رہا تو یمن کے چرواہے کے پاس اس کا حق پہنچ جائے گا۔ قبل اس کے کہ اس کی تلاش میں اس کا چہرہ سرخ ہو"[1]۔ "سائب بن یزید کے مطابق ایک مرتبہ فرمایا "اگر میں زندہ رہا تو کوہ صنعاء کے چرواہے کے پاس اسی مال میں سے اس کا حصہ ضرور ضرور پہنچ جائے گا حالانکہ وہ اپنے مقام پر ہو گا"[2]۔ "حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ عمر بن الخطابؓ نے فرمایا "اگر مجھے اس امر (خلافت) میں اپنا حصہ معلوم ہو جاتا' تو سرواتِ حمیر میں ایک چرواہے کے پاس اس کا حصہ اس طرح آجاتا کہ اس کی پیشانی پر پسینہ بھی نہ آنے پاتا"[3]۔ "ایک مرتبہ فرمایا "خدا کی قسم! میں اگر عراق کی بیواؤں کی خدمت کیلئے زندہ رہا تو انہیں اس حال میں چھوڑوں گا کہ وہ میرے بعد کسی امیر کی محتاج نہیں رہیں گی"[4]۔"

وظائف کے اس منفرد نظام کا آغاز جس کی تہہ میں ریاست کے ہر ہر فرد کی کفالت و خوشحالی کے جذبات و عزائم کار فرما تھے کب کیا گیا؟ اس بارے میں قوی تر روایت یہی ہے کہ ۲۰ھ میں کیا گیا"[5]۔ یہ پہلا سال تھا جس میں باقاعدہ رجسٹروں میں اندراج کے ذریعے جس کا نام دیوان تھا۔ تقسیم عمل میں آئی تاکہ اس کا باقاعدہ ریکارڈ ہو اور کوئی شخص بھی محروم نہ رہے۔ اس کی تصدیق اس روایت سے ہوتی ہے کہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ (جو بہت سخی تھیں) کی خدمت میں ان کے حصے کا مال پہنچا تو فرمانے لگیں "اللہ امیر المومنینؓ کی مغفرت فرمائے' میری سہیلیوں (ازواج مطہرات) اور ساتھیوں میں سے ایسی بھی ہیں' جو اس مال کی تقسیم مجھ سے زیادہ آسانی کے ساتھ کر سکتی ہیں۔" انہیں بتلایا گیا کہ یہ سارے کا سارا مال تنہا آپ ہی کا حصہ ہے۔ یہ سن کر انہوں نے اسے رکھنے کا حکم دیا' چنانچہ اسے وہیں انڈیل دیا گیا۔ آپ نے سے ایک کپڑے سے ڈھانک دیا اور اپنے پاس موجود ایک صاحبہ سے برزہ بنت نافع کے بقول مجھ سے فرمایا "اپنا ہاتھ اندر ڈالو اس میں سے ایک مٹھی لو اور اسے فلاں فلاں کی اولاد کے پاس لے جاؤ' جو ان کے قرابتدار اور یتیم تھے' ان کو انہوں نے تقسیم کیا۔ کپڑے کے نیچے کچھ بچ گیا' تو برزہ بنت نافع نے کہا "ام المومنینؓ! اس میں کچھ ہمارا بھی حق ہے۔' انہوں نے فرمایا "اچھا! اس کے نیچے جو کچھ ہے تم لوگوں کیلئے ہے۔ کپڑا کھولا گیا تو اس میں سے پچاسی درہم نکلے۔ "پھر انہوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہا "اے اللہ! اس سال کے بعد مجھ عمرؓ کو کوئی عطیہ نہ ملے ایسا ہی ہوا اور ان کی وفات ہو گئی"[6]۔ "روایت میں آتا ہے کہ آپ کی وفات ۲۰ھ میں ہی ہوئی"[7]۔

مال غنیمت کے خمس کے سلسلے میں تو آپ کی پالیسی یہی رہی کہ اسے فوری طور پر لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے' البتہ فئے کے مال میں سے آپ نے وظائف کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں زکوٰۃ اور مال غنیمت کے علاوہ دیگر آمدنیاں شامل ہوتی تھیں۔ فئے کی تعریف میں متعدد حوالوں سے رواس قلعہ جی نے بالکل صحیح لکھا ہے "فئے ہر وہ مال ہے جو کافروں سے جنگ کئے بغیر حق کے مطابق لیا جائے' مثلاً جزیہ' خراج' عشور (محصول چونگی) اور وہ مال جو سفراء امام کی خدمت میں حاضر ہوتے وقت ساتھ لائیں اور وہ مال کو کفار اسلامی لشکر کے خوف سے بھاگتے وقت جنگ سے پہلے ہی چھوڑ جائیں اور وہ مال جو لاوارث میت اپنے ترکے میں چھوڑ جائے

---

(۱) سعد ۳/۲۹۹' یوسف ۲۴' طبری ۴/۲۱۰ (۲) سعد ۳/۲۹۹' یوسف ۴۶' حسن ۱/۱۰۰' طبری ۴/۲۱۱ (۳) عبید ۲۹۱' سعد ۳/۳۰۲ (۴) یوسف ۳۷

(۵) ... ۳' سعد ۳/۲۹۶ (۶) سعد ۸/۱۰۹' یوسف ۴۵ (۷) کثیر ۸/۱۰

اور وہ مال جو دفینوں سے نکالا گیا ہو' وہ گمشدہ جانور جو از خود زندہ رہ سکیں اور ان کا مالک معلوم نہ ہو' جیسے اونٹ وغیرہ اور ہر وہ گری پڑی چیز جس کے مالک کا پتہ نہ ہو اور اس کو اٹھانے والا اسے نہ رکھنا چاہتا ہو[1]۔ "فاروق اعظمؓ نے تمام شرعی محاصل سے حاصل ہونے والی آمدنی کو بیت المال میں یکجا کر کے اس سے وظائف کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے مفتوحہ علاقوں کی تمام زمینوں کو بھی فے قرار دے کر مستقل آمدنی کا ذریعہ بنایا' تاکہ اس سے وظائف کے علاوہ مختلف قسم کے دائمی مصارف و ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام ہو سکے' چنانچہ آپ نے آئندہ پالیسی کے حتمی فیصلے کے بارے میں بلائے گئے مشاورتی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا "غنیمت میں جو مال ملا تھا اسے تو میں نے مستحقین زکوٰۃ میں تقسیم کر دیا اور پانچواں حصہ نکال کر اسے اس کے متعینہ مصارف میں تقسیم کر دیا ہے' بلکہ ابھی اس کی تقسیم میں مصروف ہوں۔ میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ زمینوں کو مع کاشتکاروں کے سرکاری ملکیت قرار دے دوں اور اس کے کاشتکاروں پر خراج عائد کر دوں اور ان پر فی کس جزیہ مقرر کر دوں جسے وہ ادا کرتے رہیں۔ اس طرح یہ جزیہ اور خراج مسلمانوں کیلئے (ایک مستقل) فئے کا کام کرے گا' جس کی آمدنی میں فوجی' کمسن افراد' آنے والی نسلیں حصہ دار ہوں گی۔ دیکھئے ان سرحدوں کی حفاظت کیلئے بہر حال کچھ آدمی تعینات کرنے ہوں گے' جو مستقلاً وہاں رہیں' یہ بڑے بڑے شہر جیسے شام' الجزیرہ' کوفہ' بصرہ' مصر ان میں فوجی چھاؤنیاں قائم رکھنا اور ان کو وظائف دیتے رہنا ناگزیر ہے۔ اب اگر یہ زمینیں اور ان پر محنت کرنے والے کاشتکار تقسیم کر دیے جائیں' تو ان لوگوں کو کہاں سے دیا جائے گا؟" یہ سن کر سب نے کہا "آپ کی رائے صحیح ہے[2]"۔

اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فئے میں سے ریاست کے تمام انتظامی مصارف کئے جاتے تھے۔ ان میں ملازمین کی تنخواہیں' مستقل فوج کی عطایا' فلاح و بہبود کے اقدامات اور کفالت عامہ کے انتظامات اور عوام الناس کے وظائف شامل تھے۔ وظائف کیلئے باقاعدہ دیوان کا خیال کیسے پیدا ہوا' اس بارے میں مختلف روایات موجود ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس دس لاکھ لے کر آئے تو آپ نے پوچھا "کتنا لائے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "دس لاکھ۔" راوی کے بقول یہ رقم آپ کو زیادہ معلوم ہوئی' چنانچہ پوچھا "جو کچھ بتا رہے ہو اسے سمجھتے ہو؟" وہ بولے "ہاں! سو ہزار' سو ہزار دس مرتبہ کہہ کر بتا دیا کہ اتنا لایا ہوں۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا "اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اس مال میں سے اس چرواہے کو بھی اس کا حصہ ملے گا جو یمن میں ہو اور اس کا خون اس کے چہرہ ہی میں ہو[3]۔ "معلوم یہ ہوتا ہے کہ آپ ریاست کے ہر فرد تک بیت المال میں اس کا حق پہنچانے کیلئے کوئی مربوط اور جامع نظام سوچتے رہتے تھے۔ مختلف مدات سے حاصل ہونے والی آمدنیوں کو تقسیم کر دینے کے باوجود کوئی مستقل ضابطہ اور طریقہ وضع کرنا چاہتے تھے۔ ایک اور موقع پر اس سلسلے میں مناسب تجویز آئی تو فوراً آپ نے قبول کر لی۔

روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ بحرین کا مال لے کر آئے' تو آپ نے ان سے پوچھا "کتنا مال لائے ہو؟" انہوں نے عرض کی "پانچ لاکھ درہم۔" حضرت عمرؓ نے اس رقم کو زیادہ محسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ "تم سمجھ رہے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟" حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں' میرا مطلب ہے ایک لاکھ کی تعداد پانچ مرتبہ۔" آپ نے پوچھا کہ "کیا یہ مال طیب (پاکیزہ) ہے؟" انہوں نے فرمایا "مجھے نہیں معلوم۔" اس پر حضرت عمرؓ نے خطاب فرمایا اور حمد و ثناء کے بعد کہا "لوگو! ہمارے پاس کثیر مال آیا ہے اگر آپ لوگ چاہیں تو ہم اس (سرمایہ) کو آپ کے سامنے وزن کرا دیں اور آپ چاہیں تو اس کی آپ کے سامنے گنتی کرا دیں۔" اس پر حاضرین میں سے کسی نے عرض کی "امیر المومنین! آپ بھی عجمیوں کی طرح رجسٹر قائم کر دیجئے[4]۔" اور ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بڑا لشکر تیار کر کے روانہ کیا اور اہل لشکر اور ان کے اہل خاندان کو مصارف بھی تقسیم فرما دیئے۔ اس وقت آپ کے پاس ہرمزان موجود تھا اس نے عرض کی کہ اگر کوئی

---

(۱) رواس ۵۳۱ (۲) یوسف ۲۵ (۳) یوسف ۴۶ (۴) یوسف ۴۵، سعد ۳/ ۳۰۰، شبہ ۲/ ۶۰۹، ماوردی ۱۹۹، جوزی ۱۰۲۔

فوج سے نکل کر گھر بیٹھ جائے تو سپہ سالار کو کیسے معلوم ہوگا؟ آپ اس کیلئے دیوان بنائیں اور پھر اس نے دیوان کے بارے میں تفصیلات بتائیں[۱]۔ آپ کو یہ تجویز پسند آئی اور آپ نے حسب عادت مسلمانوں سے مشورہ فرمایا۔ مختلف اہل رائے نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں سے رجسٹر کے قیام کے بارے میں مشورہ فرمایا۔ دوران مشورہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "ہر سال کی آمدنی اسی وقت صرف کر دی جائے' بچا کر نہ رکھی جائے (کہ اس کے حساب کا اور اس کے رکھنے کے انتظام کا مسئلہ پیدا ہو۔)" اس پر حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ "اب مال کی کثرت ہوگی اگر بالفرض کسی وقت یہ پتہ نہ چلے کہ کس کو حصہ ملا ہے اور کس نہیں ملا تو خاصی دشواری ہوگی۔" حضرت خالد بن ولیدؓ نے مشورہ دیا کہ "میں نے شام میں دیکھا ہے کہ وہاں کے بادشاہوں نے دفاتر قائم کر رکھے ہیں اور فوج کی بھی وہاں باقاعدہ تنظیم ہوتی ہے' آپ بھی اگر دفاتر قائم کر دیں تو مناسب ہوگا۔" حضرت عمرؓ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور قریش کے نوجوانوں میں سے عقیل بن ابی طالبؓ' مخرمہ بن نوفل اور جبیرؓ بن مطعم کو یہ کام سپرد کیا کہ وہ لوگوں کے نام ان کے مراتب کے لحاظ سے لکھیں' چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے بنو ہاشم کے نام لکھے' اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور ان کے خاندان کے نام لکھے' پھر حضرت عمرؓ اور ان کے اہل خاندان کے نام لکھے' گویا خلافت کی ترتیب ملحوظ رکھی اور یہ رجسٹر مرتب کر کے حضرت عمرؓ کے پاس لے گئے۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا "یہ ترتیب درست نہیں ہے' بلکہ اس کی ترتیب رسول اللہ ﷺ کی قرابت کے لحاظ سے رکھو' جو جس قدر مقدم ہو اس کو اسی مرتبہ پر لکھو[۲]۔"

اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ماوردی کا کہنا ہے کہ حکومت کے سرمائے کی حفاظت اور تمام امور کی نگرانی اور فوجیوں اور دیگر عہدیداروں کے انتظامات کیلئے دیوان (دفاتر) قائم کئے جاتے ہیں۔ لفظ دیوان کے استعمال کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ کسریٰ نے اپنے منشیوں کو حساب کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے ان کو "دیوانہ" یعنی مجنوں کہا' اس کے بعد ان لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ دیوان کہلائی جانے لگی آخری "ہاء" کثرت استعمال سے گر گئی اور اس طرح یہ لفظ "دیوان" باقی رہ گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ دیوان ہے' بمعنی شیاطین (اور جن) چونکہ حساب کتاب کرنے والے لوگ بڑے باریک بین' جزرس اور تیز ہوتے ہیں' اس لئے ان کو دیوان کہا گیا (جو استعمال سے دیوان بن گیا) اور بعد ازاں ان لوگوں کی نشست کے مقامات کو دیوان کہا جانے لگا۔ عہد اسلامی میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے باقاعدہ رجسٹر قائم کئے[۳]۔

ا۔ ناموں کی ترتیب:

رجسٹروں میں ناموں کی ترتیب نسب کے اعتبار سے اور وظائف کی مقدار اسلام کیلئے خدمات اور سبقت اسلام کے لحاظ سے مقرر کی گئی' مگر جب سابقین اسلام باقی نہ رہے تو پھر وظائف کی مقدار میں شجاعت اور حسن عمل کو مدنظر رکھا جانے لگا[۴]۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب دفتر (رجسٹر) تیار کرنے کا ارادہ فرمایا' تو آپؓ نے پوچھا کہ "کن لوگوں کے ناموں سے ابتداء کی جائے۔" حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ نے فرمایا کہ خود سے شروع کیجئے' اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "مجھے یاد ہے کہ آپؐ نے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب سے ابتداء فرمائی تھی[۵]۔" آپ کے معاشی عدل وانصاف کی ایک بڑی دلیل یہی ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو یا اپنے خاندان اور قبیلے کو رعایت' فوائد یا اضافی مراعات وحقوق حاصل نہیں کرنے دیئے۔ ناموں کی ترتیب کا بھی یہی معاملہ تھا۔ رجسٹر تیار کرنے والی کمیٹی نے خلافت کی ترتیب سے بنو ہاشم' بنو تیم اور بنو عدی کے نام لکھے' تو آپ نے فہرست دیکھ کر مسترد کر دی کہ رسول اکرم ﷺ سے قرابت کے لحاظ سے مرتب کرو' جو جس قدر مقدم ہو اس کو اسی مرتبے پر رکھو اور عمرؓ کو اس مرتبے پر لکھو جس پر اسے اللہ نے رکھا ہے۔ اس پر حضرت عباسؓ نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا "اللہ

---

(۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible]

آپ کو اپنی رحمت کا صلہ دے[1]۔" آپ سے کہا گیا اپنے آپ سے ابتداء کیجئے' آپ نے فرمایا "نہیں' رسول اللہ ﷺ ہمارے امام ہیں' لہٰذا آپ کے خاندانوں والوں سے ابتداء کریں گے اور جو آپ سے جتنا قریب ہو گا اسی اعتبار سے مقدم رکھا جائے گا[2]۔" زید بن سلم سے روایت ہے کہ بنو عدی حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے خلیفہ ہیں کاش آپ اور کاتبین آپ کو اسی مرتبے پر رکھتے جس پر اللہ نے آپ کو رکھا ہے۔" آپ نے فرمایا "توبہ توبہ! کیا تم چاہتے ہو کہ بعد میں میری برائی کی جائے اور میری نیکیاں بھی تمہیں مل جائیں' نہیں بلکہ تمہیں بار یا جائے گا اور تمہارے ناموں کا اندراج ہو گا خواہ سب کے آخر میں ہو۔" دو حضرت مجھ سے قبل ایک طریقہ قائم کر چکے ہیں' میں نے ان کی مخالفت کی تو میری مخالفت کی جائے گی اور ظاہر ہے ہمیں ساری فضیلت دنیا ہی میں نہیں مل جائے گی (بلکہ آخرت میں بھی ملے گی) اور آخرت کا بھی معاملہ یہ ہے کہ وہاں بھی جو ثواب ملے گا وہ رسول اللہ ﷺ کے طفیل ہی ملے گا' آپؐ ہی کی وجہ سے ہماری عزت ہے اور آپؐ کے بعد ان کا درجہ ہے جو آپؐ سے قریب ہوں' قسم بخدا! روز قیامت اگر اہل عجم کے اعمال زیادہ ہوئے اور ہمارے اعمال کم ہوئے تو ہماری بہ نسبت رسول اللہ ﷺ سے ان کا تعلق زیادہ ہو گا کیونکہ اگر اعمال نہ ہوں تو نسب سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا[3]۔" قبائل کی ترتیب کے سلسلے میں روایت ہے' حضرت عمرؓ نے دیوان کا آغاز آل رسول ﷺ کے ناموں سے کیا اور ان میں بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کو مقدم رکھا۔ اگر کوئی ہاشمی شخص عمر میں مطلبی سے بڑا تھا تو اسے مقدم رکھا اور اگر کوئی مطلبی شخص ہاشمی سے بڑا تھا تو اس کو مقدم رکھا۔ پھر بنی عبد شمس کے نام لکھے گئے' پھر بنی نوفل کے' پھر بنی عبدالعزیٰ کے پھر بنی عبدالدار کے' پھر بنی زہرہ کے' پھر بنی تیم کے' پھر بنی مخزوم کے' پھر بنی جمح کے' پھر بنی عدی کے' پھر بنی سہم کے[4]۔ آپ کا اصول یہ تھا کہ اگر کوئی قوم رسول اکرم ﷺ سے قربت داری میں مساوی ہوتی تو اسلام میں سبقت کو مقدم کرتے۔ اسی طرح انصار تک پہنچے' تو فرمایا "سعد بن معاذ اشہلی کی قوم سے آغاز کرو پھر جو سعد بن معاذ سے قریب تر ہو[5]۔"

۲۔ وظائف میں درجہ بندی:

(i) بارہ ہزار درہم:

آپ نے عورتوں میں سے سب سے زیادہ وظیفہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا مقرر فرمایا' جو بارہ ہزار درہم تھا۔ مردوں میں سے حضرت عباسؓ کا بھی اتنا ہی مقرر فرمایا اس کی ایک وجہ رسول اکرم ﷺ کا ان دونوں سے خصوصی تعلق تھا[6]۔

(ii) دس ہزار

آپ نے دیگر امہات المومنینؓ میں سے ہر کسی کا وظیفہ دس ہزار مقرر فرمایا سوائے حضرت صفیہؓ اور جویریہؓ کے کہ جن کا وظیفہ چھ چھ ہزار مقرر کیا[7]۔ ایک روایت میں ہے کہ دونوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ دوسری بیویوں کا حصہ مقرر کرنے میں' میں نے ان کی ہجرت کا لحاظ کیا ہے۔ ان دونوں نے جواب دیا "آپ نے تو اس مقام کا لحاظ کرتے ہوئے حصے مقرر کئے ہیں' جو رسول اللہ ﷺ کے نزدیک نہیں حاصل تھا بعینہ وہی مقام ہمیں بھی حاصل تھا۔" حضرت عمرؓ نے یہ بات تسلیم کر لی اور ان کے حصے بھی بارہ' بارہ ہزار مقرر کر دیئے[8]۔

---

(۱) ... ۲۰۰' طبری ۴/۲۰۹ (۲) عبید ۲۱۱ (۳) سعد ۳/۲۹۵' ماوردی ۲۰۰' طبری ۴/۲۱۰ (۴) بیہقی ۶/۳۶۴ (۵) سعد ۳/۲۹۶' ماوردی ۲۰۰

(۶) سعد ۳/۲۹۷' عبید ۲۱۳' یوسف ۴۳' بلاذری ۴۳۱ (۷) ایضا (۸) یوسف ۴۳

(iii) چھ ہزار:

حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب آپ کی پھوپھی تھیں انہوں نے ہجرت بھی کی تھی لہٰذا اس قربت و ہجرت کی وجہ سے ان کا وظیفہ چھ ہزار مقرر کیا[1]۔ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت عمار بن یاسرؓ کو ان کے مساوی وظیفہ دینے کا فیصلہ فرمایا[2]۔

(iv) پانچ ہزار:

تمام بدری صحابہ کرامؓ جنہوں نے ہجرت کی سعادت بھی حاصل کی تھی خواہ وہ حلیف تھے یا موالی' عرب تھے یا غیر عرب سب کو پانچ ہزار کا مستحق قرار دیا گیا[3]۔ ایک روایت کے مطابق ان کیلئے چھ ہزار مقرر کئے گئے[4]۔ حضرت امام حسنؓ اور حسینؓ نے چھوٹے بچے ہونے کی وجہ سے جنگ بدر میں شرکت نہیں کی تھی' لیکن رسول اکرم ﷺ سے قربت اور آپ کا ان سے خصوصی پیار وہ بنیاد تھی کہ جس کی وجہ سے انہیں بھی اہل بدر کے برابر پانچ ہزار وظیفہ دیا گیا[5]۔ آپ نے اصحاب بدرؓ کے بارے میں فرمایا: "میں ان کو ضرور ترجیح دوں گا[6]۔"

(v) چار ہزار:

آپ نے ایسے تمام مہاجر صحابہ کرامؓ جنہوں نے جنگ بدر میں تو کسی وجہ سے شرکت نہیں کی تھی' لیکن بعد کے غزوات میں شریک رہے[7] یا پھر ایسے انصاری جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی تھی[8] یا حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے[9] یا وہ لوگ جنہوں نے جنگ احد میں شرکت کی سعادت حاصل کی تھی' سب کیلئے چار ہزار وظیفہ مقرر فرمایا[10]۔

حضرت عمرؓ نے حضرت عمرؓ بن ابی سلمہ مخزومی کا وظیفہ چار ہزار درہم مقرر کیا کیونکہ ان کی والدہ ام سلمیٰؓ رسول اللہ ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں۔ اس پر محمد بن عبداللہ بن جحش نے استفسار کیا کہ آپ نے عمرؓ کو ہم پر کیوں ترجیح دی ہے' جبکہ ہمارے والدین نے بھی ہجرت کی اور جنگ بدر میں شریک ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "رسول اللہ ﷺ سے تعلق ہونے کی وجہ سے اگر کوئی ماں کے وسیلے سے فائدہ اٹھانا چاہے تو ام سلمیٰؓ جیسی ماں لائے میں اسے خوش کردوں گا[11]۔" آپ نے ذاتی مقام کی بنیاد پر حضرت اسامہ بن زیدؓ کا وظیفہ بھی چار ہزار مقرر کیا جو ان کے اپنے جلیل القدر بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ تھا کیونکہ انہیں تین یا ساڑھے تین ہزار دیئے گئے تھے اس میں انہیں رنج تھا[12]۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت اسامہؓ کو اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ پر فضیلت دی تھی اور یہ بات لوگوں کے سامنے واضح تھی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ پر بھی ظاہر ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آئے اور ان سے اصرار کرتے رہے کہ آپ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ سے بات کریں۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عمرؓ سے گفتگو پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ "آپ نے مجھ پر ایسے شخص کو ترجیح دی ہے جو نہ مجھ سے افضل ہے اور نہ انہیں مجھ پر کوئی اور سبقت حاصل ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "زید بن حارثہؓ رسول اللہ ﷺ کو عمرؓ سے زیادہ محبوب تھے اور اسامہؓ رسول اللہ ﷺ کو عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ محبوب تھے[13]۔" آپ نے اسلام کی خاطر قربانیوں کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت سلمان فارسیؓ کا وظیفہ بھی چار ہزار مقرر فرمایا[14]۔

(۱) سعد ۳ ۱۰۲ (۲) عبید ۲۱۵ (۳) عبید ۲۱۵ سعد ۳ ۲۹۶ یوسف ۴۲ (٤) عبید ۲۱۳ (۵) یوسف ۴۳ سعد ۳ ۲۹۷ (٦) عبید ۲۱۳ (۷) سعد ۳ ۲۹٦ (۸) عبید ۲۱۵ (۹) یوسف ٤٤ سعد ۳ ۲۹٦ (۱۰) سعد ۳ ۲۹٦ (۱۱) ماوردی ۲۰۱ (۱۲) سعد ۳ ۲۹۷ بلاذری ٤٧٤ (۱۳) عبید ۲۱٤ یوسف ٤۳ (١٤) عبید ۲۱۵۔

(vi) تین ہزار

فتح سے قبل ہجرت کرنے والے سب لوگوں کیلئے تین ہزار وظیفہ مقرر فرمایا۔ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اسی درجے میں رکھا[1]۔ ابو سلمہؓ کیلئے پہلے دو ہزار مقرر فرمائے بعد میں ایک ہزار کا اضافہ کر دیا حالانکہ مہاجرینؓ و انصارؓ کے بیٹوں کیلئے دو ہزار مقرر ہوئے تھے۔ اس پر محمد بن عبداللہ بن جحش نے آپ سے کہا "ان کے باپ کو کوئی ایسا شرف تو حاصل نہیں تھا جو ہمارے باپوں کو حاصل نہ رہا ہو۔ نہ ان میں کوئی ایسی خوبی ہے جو ہم میں نہ ہو۔" اس پر آپؓ نے جواب دیا "میں نے ان کے باپ ابو سلمہؓ کے لحاظ سے صرف دو ہزار دیا ہے لیکن ان کی ماں ام سلمیٰ کا لحاظ کرتے ہوئے ایک ہزار کا اضافہ کر دیا ہے۔ اگر تیری ماں ان کی ہم پلہ ہوتی تو اضافہ کر دیتا[2]۔"

(vii) دو ہزار۔

زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی تھی جنہیں دو ہزار درہم وظیفہ ملنا شروع ہوا۔ ان میں اہل بدر کے لڑکے، مہاجرینؓ و انصارؓ کی تو مولود اولاد، فتح مکہ میں شریک سارے مسلمان، بیعت رضوان میں شریک سارے لوگ، جن کا اس سے بہتر وظیفہ کسی وجہ سے مقرر نہ ہو سکا، کچھ اہل یمن، اہل شام اور عراق اور ایرانیوں کے خلاف عظیم معرکہ قادسیہ میں شریک ہونے والے مجاہدین سب کو اسی درجے میں رکھا گیا[3]۔ علاوہ ازیں دو ہزار انفرادی طور پر بعض شخصیات کو ان کے کسی فضل کی وجہ سے بھی دیئے۔ ان میں نضر بن انس، حضرت عمروؓ بن العاص، عمیرؓ بن وہب، عبداللہ بن ارطاط اور ہرمزان شامل ہیں[4]۔ روایت ہے کہ مکہ والوں اور عام لوگوں کا حصہ آپ نے فی کس آٹھ سو رکھا۔ طلحہ بن عبیداللہ اپنے بھائی عثمان کو آپ کے پاس لائے تو آپ نے ان کا حصہ آٹھ سو مقرر کر دیا پھر نضر بن انس آئے تو آپ نے فرمایا "ان کا حصہ دو ہزار لکھو۔" اس پر طلحہ نے آپ سے کہا "میں بھی ان ہی کی طرح کے ایک آدمی (عثمان) کو آپ کے پاس لایا تو آپ نے اس کا حصہ تو آٹھ سو رکھا اور نضر کیلئے آپ نے دو ہزار مقرر کر دیئے؟" اس پر آپؓ نے فرمایا "ان کے باپ احد کے دن مجھے ملے تو انہوں نے پوچھا رسول اللہ ﷺ کا کیا ہوا؟ میں نے جواب دیا میرے خیال میں تو آپ شہید ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے اپنی تلوار کھینچ لی اور میان توڑ دی اور بولے اگر رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے ہوں تو اللہ زندہ ہے وہ کبھی نہیں مرے گا۔" اس کے بعد وہ لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے اس وقت ان (عثمان) کے باپ فلاں جگہ پر بکریاں چرا رہے تھے۔ امام ابو یوسف کے بقول حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے دور میں اسی پالیسی پر عمل کیا[5]۔

(viii) ایک ہزار:

آپ نے ایک ہزار کے لگ بھگ وظائف زیادہ تر خواتین کو ان کی خدمات اور حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے مقرر فرمائے۔ ان میں پہلی ہجرت کرنے والی محترمات شامل تھیں مثلاً اسماءؓ بنت عمیس، کلثومؓ بنت عقبہ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی والدہ، اسماء بنت ابی بکرؓ قابل ذکر ہیں[6]۔

(ix) متفرق:

عوام الناس کیلئے آپ نے حسب مصلحت و ضرورت مختلف مقداریں مقرر فرمائیں۔ یمن، شام اور عراق کے لوگوں کیلئے دو ہزار، ایک ہزار، نو سو، پانچ سو اور تین سو مقرر فرمائے۔ تین سو سے کم کسی کا بھی مقرر نہ کیا[7]۔ مدینے کے اردگرد کے لوگوں (عوالی) کی فہرست بنوائی ان کیلئے خوراک جاری کر دی۔ مضافات میں خود ہی جا کر تقسیم کرتے تھے۔ ہشام الکلبی کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن الخطابؓ کو خود دیکھا، وہ خزاعہ کا دفتر (رجسٹر) لئے ہوئے آتے تھے۔ قدید میں ہر عورت ان کے پاس اس طرح آتی تھی کہ کوئی عورت خواہ وہ باکرہ ہو یا ثیبہ ان سے نہ چھپتی۔ تھی کہ وہ خود ان کے ہاتھ میں نہ دے دیتے ہوں۔ پھر وہاں سے وہ عسفان جا کر ٹھہرتے تھے وہاں بھی ایسا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی[8]۔

---

(۱) سعد ۳: ۲۹۰ (۲) یوسف ۲۹ (۳) سعد ۳: ۲۹۱ (۴) یوسف ۲۶، عبید ۲۲۵ (۵) یوسف ۲۶ (۶) سعد ۳: ۲۹۸ (۷) سعد ۳: ۲۹۷ (۸) سعد ۳: ۲۹۸۔

۳۔ قابل لحاظ خوبیاں:

حضرت عمرؓ نے بعض لوگوں کی قابل لحاظ خوبیوں کے پیش نظر ان کے خاص وظائف بھی مقرر کئے۔ مثلاً آپ نے حضرت علیؓ کے دونوں صاحبزادوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کیلئے پانچ پانچ ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا باوجودیکہ وہ شرکاء بدر نہیں تھے۔ آپ نے ان کے یہ وظائف اس بناء پر مقرر کئے کہ وہ اہل جنت کے سردار اور گلشن قلب رسول اللہ ﷺ کے پھول تھے[1] اور عمیر بن وہب جمحی اور عثمان بن قیس سہمی کیلئے دو دو سو دینار مقرر کئے (جو تقریباً دو ہزار درہم بنتے تھے) کیونکہ یہ دونوں حضرات مہمان دار اور مہمان نواز تھے[2] اور بسر بن ابی ارطاۃ کے دو سو دینار مقرر کئے کیونکہ یہ صاحب تلوار کے دھنی تھے۔ ان کے بارے میں فرمایا "اللہ نے ان کے ہاتھ سے کتنی فتوحات کرائی ہیں اور خارجہ بن حذافہ کیلئے بہادری اور شرف کی بناء پر ان کا بھی وظیفہ مقرر کیا اور اسی طرح چار لوگوں کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ اسماءؓ بنت عمیسؓ اور ام عبداللہ بن مسعودؓ میں سے ہر ایک کیلئے ایک ایک ہزار درہم مقرر کئے اس لئے کہ یہ مہاجرین اولین میں سے تھیں[3]۔ ہرمزان کیلئے دو ہزار درہم مقرر کئے کیونکہ وہ صاحب الرائے تھا[4]۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کو بیعت رضوان میں شرکت کی وجہ سے گورنری کی تنخواہ کے علاوہ ایک ہزار زائد مقرر فرمائے ان کا وظیفہ دو سو دینار تھا[5]۔

۴۔ متفرق عطیات:

حضرت عمرؓ نے ان وظائف کے علاوہ اور بھی عطیات مقرر کئے تھے۔

(الف) مجاہدین کے اہل و عیال:

ابوعبید نے الاموال میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جنگ میں لڑنے والوں کی اولاد اور ان کے اہل و عیال کیلئے دس دس درہم کا وظیفہ مقرر کیا تھا' چنانچہ حضرت عمرؓ نے جابیہ میں مال تقسیم کی' تو ہر ایک کو اگر وہ تنہا تھا نصف دینار ملا اور اگر اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی تو اسے ایک دینار ملا[6]۔

(ب) بچوں کیلئے:

حضرت عمرؓ ابتداء میں بچے کا وظیفہ اس وقت تک مقرر نہیں کرتے تھے جب تک اس کا دودھ نہ چھڑا دیا جاتا۔ پھر ہوا یہ کہ ایک مرتبہ آپ رات کے وقت مصلی کے قریب گشت فرما رہے تھے کہ ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ آپ نے اس کی ماں سے کہا کہ اسے دودھ پلاؤ تو اس نے کہا کہ چونکہ امیر المؤمنینؓ بچے کا وظیفہ اس وقت تک مقرر نہیں کرتے جب تک اس کا دودھ نہ چھڑا دیا جاتا لہٰذا میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "میں تو اس کی جان ہی لینے کا سبب بن گیا تھا۔ تم اسے دودھ پلاؤ عنقریب امیر المومنینؓ اس کا وظیفہ مقرر کر دیں گے۔" چنانچہ اس کے بعد آپ نے ہر بچے کا وظیفہ اس کے پیدا ہوتے ہی مقرر کرنا شروع کر دیا[7]۔ پیدا ہوتے ہی سو درہم مقرر کر دیے جاتے' جب بڑا ہوتا دو سو درہم ہو جاتے' جب بالغ ہو جاتا تو اس میں اور اضافہ کر دیتے[8]۔

(ج) اشیائے ضرورت کی فراہمی:

حضرت عمرؓ وظائف کے مستحق افراد کو ان کے وظائف اور ان کے بیوی بچوں کے وظائف کے علاوہ بعض ضروری اشیاء بھی فراہم کرتے تھے' جو ان کیلئے اور ان کے زیر کفالت غلام' لونڈیوں اور گھوڑوں وغیرہ کیلئے کفالت کریں۔ چنانچہ عیاض الاشعری سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ غلاموں' باندیوں اور گھوڑوں کو بھی کھانے کا سامان دیا کرتے تھے[9] اور آپ ہر ماہ کھانے کا سامان تقسیم کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ غلہ کی جو مقدار دیتے تھے اس کے بارے میں آپ نے ابن قاطورا سے

---

(۱) یوسف،٤٤' سعد ۲۹۷ (۲) عبید،۲۹۳ (۳) ایضا (٤) بیہقی ۳٤ (۵) عبید،۲۹۳ (٦) عبید،۲۲٦ (۷) عبید ۲۲۳' عبدالرزاق ٥/۳۱۱' بیہقی ٦/۳٤۷' سعد ۳/۲۹۸ (۸) سعد ۳/۲۹۸ (۹) ایضاً

مشورہ کیا تھا۔ اس سے آپ نے دریافت کیا تھا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ انسان کو ماہانہ اور روزانہ کس قدر غذا درکار ہوتی ہے؟ تو وہ مدی اور قسط لایا اور اس نے کہا کہ دو مدی گندم پورے مہینہ کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا اور دو مدی گندم کو پیس کر گوندھا گیا اور اس کی روٹیاں پکائی گئیں۔ اس کے ساتھ دو قسط زیتون کے تیل کو سالن کے طور پر رکھا گیا۔ پھر تیس افراد بلائے گئے اور یہ کھانا ان کو صبح و شام کے دونوں وقت پیٹ بھرنے کیلئے کافی ہوا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ "اے اللہ! میں کسی کو اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ میرے بعد ان میں کمی کرے۔ جو ان میں کمی کرے اے اللہ تو اس کی عمر کم کر دیجیو[۱]" اور آپ نے فرمایا کہ "میں نے ہر مسلمان کیلئے دو مدی گندم، دو قسط سرکہ اور دو قسط زیتون کا تیل مقرر کیا ہے۔" ایک شخص نے کہا کہ اور غلاموں کیلئے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "جی ہاں اور غلاموں کیلئے بھی یہی مقدار ہے[۲]۔" چنانچہ ہر عورت، غلام اور بچہ کو ہر ماہ یہی مقدار ملتی تھی اور چونکہ یہ مقدار بڑوں کیلئے کافی تھی اور بچوں اور بڑوں سب کو یہی مقدار ملتی تھی تو ظاہر ہے کہ بچوں والے گھر میں اس کی کچھ مقدار بچ رہتی ہوگی کیونکہ بچہ بڑے سے کم کھاتا ہے اور عملاً ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ خالد بن عرفطہ عذری حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور حضرت عمرؓ نے ان سے ان کے علاقے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں اپنے پیچھے وہ لوگ چھوڑ کر آرہا ہوں جو دعا کرتے ہیں کہ ان کی عمر بھی آپ کو مل جائے۔ قادسیہ کی مہم میں جس نے بھی شرکت کی اس کا وظیفہ دو ہزار یا پندرہ سو درہم مقرر ہوا ہے اور جو بچہ پیدا ہوتا لڑکا ہو یا لڑکی اسے سو درہم اور دو جریب ماہوار ملتے ہیں اور جو لڑکا بالغ ہو تا اسے پانچ سو یا چھ سو ملنے لگتے ہیں اور جب یہ تمام عطیا گھروں میں پہنچنے لگی ہیں تو گھر میں بعض افراد کھانے والے ہوتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہیں کھاتے تو آپ کا ان کے بارے میں کیا خیال ہے کیونکہ اس صورت میں یہ لوگ اس مال کو وہاں بھی خرچ کریں گے جہاں اسے خرچ ہونا چاہئے اور وہاں بھی خرچ کریں گے جہاں اسے خرچ نہیں ہونا چاہئے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "اللہ مدد کرنے والا ہے، یہ ان کا حق ہے جو ان کو دے دو۔ میں اس میں سے کچھ لینے کے مقابلہ میں یہی بہتر خیال کرتا ہوں کہ ان کو دے دوں[۳]۔"

۵۔ درجہ بندی کے اصول:

حضرت عمرؓ نے تنخواہوں اور وظائف کی مقدار کے تعین میں جن اصولوں کو مد نظر رکھا وہ یہ ہیں

(i) سبقت فی الاسلام:

کیونکہ جو صحابہ کرامؓ پہلے اسلام لائے، انہیں مشرکوں کی ایسی سختیاں برداشت کرنی پڑیں جو دوسروں کو برداشت نہیں کرنی پڑیں۔ قرآن کریم نے ان کا ذکر فرمایا اور ان کے مقربین بارگاہ الٰہی ہونے کا اعلان فرمایا ہے "والسابقون السابقون اولئک المقربون[۴]۔" (اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں۔ وہی تو مقرب لوگ ہیں۔) اسی بناء پر حضرت عمرؓ نے عطا میں مہاجرینؓ کو انصارؓ پر مقدم رکھا۔

(ii) میدان جہاد میں آزمائش:

یعنی جس نے اسلام کی کوئی حربی خدمت انجام دی اسے دوسرے لوگوں پر مقدم رکھا۔ حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ کی عورتوں میں ریشمی چادریں تقسیم کیں ان میں سے ایک عمدہ چادر بچ رہی۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ یہ چادر رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی کو دے دیجئے جو آپ کے پاس ہیں۔ ان کی مراد یہ تھی کہ ام کلثوم بنت علیؓ کو دے دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ "ام سلیط اس کی زیادہ حقدار ہیں کیونکہ وہ جنگ احد میں مشکیزے بھر بھر کے لاتی تھیں[۵]۔" حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن حنظلہ کا وظیفہ دو ہزار درہم مقرر کیا تو حضرت طلحہؓ اپنے بھتیجے کو لے کر آئے اور حضرت عمرؓ نے ان کا وظیفہ کم مقرر کیا تو طلحہؓ نے کہا کہ اے امیر المومنینؓ! آپ نے اس انصاری کو میرے بھتیجے پر ترجیح دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "جی ہاں! کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ جنگ احد کے موقع پر ان کے والد اپنی تلوار سے اس طرح راستہ بناتے ہوئے تھے جیسے اونٹ سے اونٹ بن جاتی ہے[۶]۔"

(۱) [illegible] (۲) [illegible] ۳۴۶ (۳) [illegible] ۲۳۲ (۴) [illegible] ۲۹۸ (۵) [illegible] (۶) [illegible] ۲۲۰ [illegible] ۵۴۴

(iii) ضرورت:

ی بناء پر حضرت عمرؓ نے امراء کے وظائف میں ان کی ضرورتوں کے لحاظ سے فرق کیا۔ امیر عراق حضرت عمار بن یاسرؓ کیلئے آپ نے روزانہ نصف بکری مقرر کی اور عبداللہ بن مسعودؓ کیلئے روزانہ چوتھائی بکری مقرر کی۔ حضرت عمارؓ کو آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر اس لئے ترجیح دی کہ حضرت عمارؓ امیر تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ قاضی تھے۔ ظاہر ہے کہ امیر کے یہاں مہمانوں کی آمد قاضی کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے۔

(iv) کثرت عیال:

کثرت عیال انسان کی حقیقی ضرورت کی تعریف میں آتی ہے' اسی لئے حضرت عمرؓ نے بیوی کیلئے علیحدہ وظیفہ مقرر کیا اور ہر بچہ کا وظیفہ مقرر کیا' تاکہ وہ والدین پر بوجھ نہ بنیں۔ مالک بن اوس سے مروی ہے کہ ایک روز حضرت عمرؓ نے فئے کا ذکر کیا اور فرمایا کہ "میں اس فئے کا تم سے زیادہ مستحق نہیں ہوں اور ہم میں سے کوئی بھی اس کا زیادہ حقدار نہیں ہے' البتہ ہم ان امور کے پابند ہیں جو کتاب اللہ نے مقرر کئے ہیں اور اس تقسیم کے پابند ہیں' جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔ علاوہ بریں ہم آدمی کی سبقت' اس کی کارکردگی' اس کی عیالداری اور اسکی ضروریات کو بھی ملحوظ رکھیں گے[۱]۔

(v) تعلیم و شرافت:

سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے کسی گورنر کو لکھا تھا: "لوگوں کو قرآن مجید سیکھنے پر وظیفے دو۔" اس (گورنر) نے جواب میں انہیں لکھا: "آپ نے مجھے لکھا ہے کہ لوگوں کو قرآن مجید سیکھنے پر وظیفے دو چنانچہ یہاں اب ایسے لوگوں نے بھی قرآن مجید سیکھنا شروع کر دیا ہے جنہیں سوائے وظیفہ کے اور کوئی کشش اس تعلیم کے حاصل کرنے میں نہیں ہے۔" اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت عمرؓ نے انہیں لکھا: "لوگوں کو شرافت و مروت اور صحبت کی بناء پر وظائف دو[۲]۔"

(vi) غیر مساوی مقدار:

فاروق اعظمؓ سرکاری وظائف کے معاملے میں حق مساوات کے قائل تھے' چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا "کوئی مسلمان ہی ایسا نہیں جس کا اس مال (فئے) میں حق نہ ہو' یہ الگ بات ہے کہ وہ دیا جائے یا نہ دیا جائے[۳]۔" چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ نے فئے ہی میں اپنے حق کے بارے میں مقدمہ پیش کیا تو آپ نے سورۃ الحشر کی آیات نمبر ۷ تا ۱۰ تلاوت فرمانے کے بعد فرمایا "اس آیت کریمہ نے تمام لوگوں کو اپنے اندر شامل کر لیا ہے اور کوئی مسلمان ایسا باقی نہیں رہتا' جس کا اس مال میں حصہ باقی نہ ہو' البتہ تمہارے مملوکہ غلاموں میں سے بعض اس میں نہیں آتے۔ اگر میں زندہ رہا تو انشاء اللہ ہر مسلمان کو اس کا حق ملے گا' حتیٰ کہ حمیر (یمن میں مقیم قبیلہ) کے نشیبی اور بالائی علاقہ میں بسنے والے چرواہے کو بھی' جس نے اسے حاصل کرنے میں کوئی تگ و دو نہیں کی ہوگی' اس کا حق پہنچے گا[۴]۔" لیکن درجات معیشت میں مساوات کے قائل نہیں تھے۔ وہ اسلامی کارناموں' سبقت اور ضرورت مندی کو بھی درجہ بندی کی معقول بنیاد سمجھتے تھے۔ چنانچہ سائب بن یزید سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن الخطابؓ کو یہ فرماتے سنا "اس اللہ کی قسم' جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے (تین مرتبہ یہ الفاظ کہے) ہر ایک کا اس بیت مال میں حق ہے اور اس معاملے میں کسی کو دوسرے پر ترجیح حاصل نہیں ہے' بلکہ میں بھی عوام کا ایک معمولی فرد ہوں' البتہ ہمیں کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی تقسیم کے مطابق چلنا ہوگا' نیز ہر ایک کے اسلامی کارناموں' اس کی دولت مندی اور ضرورت اور قدیم اسلام لانے کے تعلقات کا لحاظ کرنا ہوگا۔ خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صنعہ کے ایک چرواہے کو اس کا حصہ وہیں بیٹھے بیٹھے ملے گا[۵]۔" ماوردی کے بقول جب رسول اللہ ﷺ کی قرابت کے لحاظ سے

(۱) حنبل ۲۰۱: ۴ (۲) عبید ۲۴۳ (۳) ایضاً (۴) یوسف ۶ ... (۵) ماوردی ۲۰۰۔

رجسٹر مکمل ہو گیا تو سبقت اسلام اور قرابت رسول ﷺ کو مد نظر رکھتے ہوئے لوگوں کے وظائف مقرر کئے گئے' جبکہ حضرت ابو بکرؓ نے سبقت اسلام کو مد نظر نہیں رکھی تھا' بلکہ سب کے مساوی وظائف مقرر فرمائے تھے۔ حضرت علیؓ نے بھی اپنے زمانہ خلافت میں ایسا ہی کیا (یعنی سبقت اسلام کو مد نظر نہیں رکھا) امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے اسی طریقہ کو موزوں خیال فرمایا ہے' جبکہ حضرت عثمانؓ نے سبقت اسلام کے اصولوں کو حضرت عمرؓ کی طرح اختیار کیا تھا اور امام ابو حنیفہؒ اور فقہائے عراق نے اس اصول کو موزوں قرار دیا ہے [(۱)]۔ آپ کا یہ نظریہ عہد خلافت میں پروان نہیں چڑھا' بلکہ شروع سے ہی یہی خیال رکھتے۔ عہد صدیقیؓ میں بھی آپ نے اس پر اصرار کیا' لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپ کی بات نہیں مانی تھی چنانچہ جب زمام کار آپ کے ہاتھ میں آئی تو آپ نے متعدد دیگر فیصلوں کی طرح یہ بھی قدم اٹھایا اور اپنے نظریے کو عملی جامہ پہنایا۔ یہ کرنا آپ کیلئے لازم بھی تھا اس لئے کہ آپ مجتہد تھے۔ آپ کی بصیرت و فراست اور دین کی سمجھ پوری دیانتداری اور نیک نیتی سے جس قدم کا تقاضا کر رہی تھی' یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ اس سے اجتناب کریں۔

روایت ہے کہ جب حضرت ابو بکرؓ نے تمام صحابہ کرامؓ کو مساوی وظائف جاری فرمائے' تو حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ "کیا آپ کے نزدیک وہ شخص جس نے دو ہجرتیں کی ہیں (ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ) اور جس نے دو قبلوں کی جانب نماز پڑھی ہے (یعنی مسجد اقصیٰ اور مسجد حرام کی جانب) اور وہ شخص جو فتح مکہ کے سال تلوار کے خوف سے اسلام لے آیا دونوں برابر ہیں۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ "اعمال کا اجر دینے والا تو اللہ ہے' دنیا تو ایک دار سفر ہے۔" حضرت عمرؓ بولے "بہر حال میرے نزدیک وہ شخص جس نے رسول خدا ﷺ سے جنگ کی اور وہ شخص جس نے آپ کی معیت میں جہاد کیا دونوں برابر نہیں ہو سکتے [(۲)]۔" امام ابو عبید نے روایات میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کے کئی درجے بنا دیئے اور ان میں سے بعض کو دوسروں پر ترجیح دی' جبکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے ان کے درمیان وظائف کی تقسیم میں مساوات رکھی تھی [(۳)]۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ پر اس مساوات رکھنے پر اعتراض بھی کیا تھا' لیکن حضرت ابو بکرؓ نے اس اعتراض پر توجہ نہیں دی۔ بیہقی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے جب اولاً فئے تقسیم کی تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ ان میں سے مہاجرین اولین کو اور سابقین اسلام کو دوسرے لوگوں پر ترجیح دیجئے۔" اس پر حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ "کیا میں ان کی سبقت اسلام کی قیمت ادا کر رہا ہوں؟" غرض حضرت ابو بکرؓ نے تقسیم میں سب کو برابر رکھا [(۴)]۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا یہ خیال تھا کہ مالی معاملہ اور اجر و ثواب دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ انہیں اکٹھا نہیں کرنا چاہئے' تاکہ لوگ نیک اعمال کو خالصتاً اللہ کیلئے کریں' جبکہ حضرت عمر فاروقؓ کا یہ موقف تھا کہ جن لوگوں نے اسلام کے فروغ اور غلبے میں ابتدائی اور بھرپور کردار ادا کیا ہے عدل کا تقاضا ہے کہ ان کے حق کو فائق مانا جائے۔ اس کا آئندہ بھی یہ فائدہ ہو گا کہ ایسے معاملات میں لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ حضرت ابو بکرؓ کا نقطہ نظر اس روایت سے واضح ہوتا ہے۔ یزید بن ابی حبیب کہتے ہیں کہ جب حضرت ابو بکرؓ کے پاس مال آیا تو انہوں نے اس میں سے سب لوگوں کو برابر برابر حصے دیئے اور کہا "مجھے یہ منظور ہے کہ میں اس تقسیم کی ذمہ داری بجا لانے میں برابر برابر رہوں (نہ مجھے ثواب ملے نہ عذاب) اور وہ جہاد جو میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہے' وہ میرے لئے (بعد کے اعمال کے اثر سے) پاک صاف رہے [(۵)]۔" روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کا نقطہ نظر انفرادی نہیں تھا' بلکہ دیگر لوگوں کی بھی انہیں تائید حاصل تھی۔ غالباً سابقون الاولون یہی چاہتے تھے جیسا کہ اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے۔ یزید ابن ابی حبیب وغیرہ کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ سے تقسیم مال کے بارے میں لوگوں نے تبادلہ خیال کیا اور چاہا کہ وہ حسب مراتب لوگوں کے عطیوں میں (کمی بیشی کرکے) ترجیحی سلوک کریں' لیکن انہوں نے کہا "ان (لوگوں) کے فضائل

(۱) موزوں [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] ۲۴۴ (۴) [illegible] (۵) [illegible] ۳۴۴

کا تعلق تو اللہ سے ہے۔ رہا یہ روزی کا معاملہ سو اس میں مساوات ہی بہتر ہے[1]۔ "جب تک فے کے مال میں وسعت پیدا نہیں ہوئی تھی فاروق اعظمؓ نے بھی دلائل کی بنا پر مساوات ہی کا طریقہ اختیار کیا۔ سفیان بن وہب خولانی کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کی جابیہ والی تقریر میں موجود تھا۔ اس خطبہ میں انہوں نے اول اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کے شایان شان ثناء کی' پھر فرمایا "اما بعد' یہ فے ایک ایسی دولت ہے' جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف پلٹائی ہے اس میں اعلیٰ اور ادنیٰ یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی فرد کسی دوسرے سے زیادہ استحقاق نہیں رکھتا۔ سوائے لخم اور جذام کے دو قبیلوں کے کہ انہیں میں کچھ تقسیم نہیں کروں گا۔" اس پر ایک لخمی کا ایک فرد کھڑا ہوا اور اس نے کہا "اے ابن خطابؓ میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر درخواست کرتا ہوں کہ عدل و مساوات کو ملحوظ رکھیں۔" حضرت عمرؓ نے کہا "ابن خطابؓ کی اس عمل سے عدل و مساوات کے سوا کوئی اور غرض نہیں ہے واللہ میں جانتا ہوں کہ اگر ہجرت صنعاء میں ہوتی تو لخم و جذام (قبائل) میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا وہاں کوئی نہ جاتا۔ تم ہی بتاؤ کیا میں ان لوگوں کو جنہوں نے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور سواریاں خریدیں' ان لوگوں کے برابر کر دوں جنہوں نے اپنے گھروں میں رہ کر جنگیں کیں؟" تب ابو حدیر اٹھے اور انہوں نے کہا "یا امیر المومنینؓ کیا اس بناء پر کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے علاقہ کو ہجرت گاہ بنایا اور ہم نے ہجرت کو برحق مانتے ہوئے مہاجرین کی مدد کی' ہمارا حق ختم کر دیا جائے گا؟" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا "ایسا نہیں ہوگا' واللہ! میں تم لوگوں کو بھی اس (فے) میں سے حصے دوں گا۔ پھر سب لوگوں کے درمیان (فے مساوی) تقسیم کر دی۔ اس طرح ہر تنہا فرد کو نصف دینار ملا اور جس کے ساتھ اس کی بیوی تھی اسے ایک دینار دیا[2]۔" روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے آخری سفر شام ۱۷ھ میں کیا' جس کے دوران جابیہ میں یہ تقریر فرمائی[3]۔ یہ وہ دور تھا کہ جب فتوحات کی وجہ سے مال غنیمت تو کافی مقدار میں حاصل ہو رہا تھا' دیگر آمدنیوں میں ابھی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا تھا۔ بعد میں جب فے کی آمدنیاں شروع ہوئیں اور سرکاری زمینیں آباد ہونے سے وسائل کی بہتات ہوئی اور مستقل اضافہ ہونے لگا' تو نظام وظائف قائم کیا گیا' تو آپ نے ترجیحی تقسیم کا فیصلہ کیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی مساویانہ تقسیم اور فاروق اعظمؓ کی ترجیحانہ تقسیم کی بہترین فقہی توجیہہ وہ ہے' جو سفیان بن عیینہ کی ہے۔ ان سے منقول ہے حضرت ابو بکرؓ مسلمانوں میں فے کی مساویانہ تقسیم کے اس لئے قائل تھے کہ وہ تمام مسلمانوں کو اسلام کے فرزند تصور کرتے تھے' بالکل اسی طرح جیسے بہت سے بھائی اپنے باپ کے وارث ہوتے ہیں اور ان سب کو میراث سے مساویانہ حصے ملتے ہیں۔ اگرچہ باعتبار فضائل اور بلحاظ مراتب دین وغیرہ ان کے مدارج ایک دوسرے سے بلند تر ہی کیوں نہ ہوں؟ حضرت عمرؓ کے سامنے اس مسئلہ کا یہ پہلو تھا کہ چونکہ خود "السابقین" میں ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے اور ان کے مدارج جدا جدا ہیں' لہٰذا اندریں صورت تمام مسلمان ایک باپ اور مختلف ماؤں کی ایسی اولاد ٹھہریں گے' جو اپنے بھائی یا اپنے باپ کے رشتہ داروں میں سے کسی مرد کے وارث بننے میں نسبی طور پر باہم مساوی نہیں ہوتے۔ ان میں اس (بھائی) کی میراث کا زیادہ مستحق وہ ہوگا' جو مادری رشتہ داری میں زیادہ قریب اور پشتوں کے نسبی سلسلہ میں اپنے (جداعلیٰ یا) باپ سے قریب تر ہو۔

امام ابو عبیدؒ کے بقول "مادری رشتہ داری میں زیادہ قریب" کے معنی یہ ہیں کہ وہ بھائی جو ایک ماں اور ایک باپ سے ہوگا۔ اس بھائی کو جو صرف اس کے باپ کی طرف سے بھائی ہوگا محروم کر کے تمام میراث لے لے گا' حالانکہ محروم ہونے والا بھی اس کا بھائی ہی ہے۔ "پشتوں کے نسبی سلسلہ میں اپنے (جداعلیٰ یا) باپ سے قریب تر" ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بیٹا پوتے کے مقابلہ میں قریب تر ہوگا اور بھائی بھتیجے کے مقابلہ میں۔ ہر ایک جانتا ہے کہ قریب تر بعید کو محروم کر کے خود وارث ہو جاتا ہے' حالانکہ رشتہ داری میں سب ہی منسلک ہوتے ہیں۔ اس مثال سے سفیان بن عیینہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام سے میراث پانے والوں میں بھی قریبی تعلق کام کرے گا' یعنی جس نے جس قدر زیادہ اسلام کی مدد' اس کے احکام کی پابندی اور اس کی مدافعت کی ہوگی' اسی قدر وہ زیادہ ترجیح کا مستحق ہوگا۔ سفیان بن

(۱) عبید: ۲۶۵ (۲) عبید: ۲۶۵ (۳) طبری ۵۹/۴:۱۱

عیینہ کی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کے مختلف اقوال کی یہ توجیہ و تاویل مجھے بلفظہ نہیں پہنچی۔ البتہ اس کا مفہوم یہی ہے اور اس بارے میں مجھے اس سے بہتر تاویل نہیں مل سکی (١)۔ وسائل جو بھی تھے خلافت فاروقیؓ کے آخری چار سال تک ترجیحی وظائف ہی دیئے جاتے رہے' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ سال سے آپ بھی مساویانہ تقسیم کریں گے۔ آپ کے خادم اسلم سے روایت ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ مال بہت زیادہ ہو گیا ہے تو فرمایا "اگر میں آئندہ سال اس شب تک زندہ رہا' تو بعد والے لوگوں کو پہلے والے لوگوں سے ملا دوں گا' تاکہ تمام افراد وظائف میں برابر ہو جائیں۔" راوی کہتے ہیں کہ آپ اس سے قبل ہی انتقال کر گئے' اللہ آپ پر اپنی رحمت کا نزول فرمائے (٢)۔ یا پھر آپ نے فرمایا "واللہ اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو آخری آدمی کو پہلے آدمی سے ملا دوں گا اور سب کو مثل ایک آدمی کے کر دوں گا" (٣)۔ یا پھر فرمایا "اگر میں سال بھر تک زندہ رہا تو سب سے کم مرتبے والے کو سب سے اعلیٰ مرتبے والے سے ملا دوں گا" (٤)۔ "بقول امام ابو عبیدؒ (تقسیم فے کے متعلق) حضرت عمرؓ کی پہلی رائے یہ تھی کہ جن لوگوں نے اسلام لانے میں سبقت کی اور اسلام کو بلند کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیں' ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے اور ان کی یہی رائے معروف عوام ہے' لیکن حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ تمام مسلمانوں کو اس میں سے برابر برابر کا حصہ دیا جائے۔ بعد میں حضرت عمرؓ سے بھی ایسی روایات پہنچی ہیں جن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی رائے سے رجوع کر کے حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق کر لیا تھا (٥)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس رجوع کی کیا وجہ تھی؟ کیا آپ کو تجربات کی روشنی میں اپنے سابقہ موقف کے غلط ہونے کا احساس ہو گیا تھا یا پھر صورتحال کی تبدیلی کی وجہ سے اب اس کی ضرورت نہ تھی؟ میری رائے میں یہ دوسری وجہ زیادہ صحیح ہے' اگر پہلی کا بھی امکان ہے۔ آپ نے جن مقاصد کے تحت ترجیحی وظائف کا فیصلہ فرمایا تھا' وہ کافی حد تک پورے ہو چکے تھے۔ ان میں سب سے اہم چیز سابقون اولون کی قدر و منزلت اور حوصلہ افزائی تھی۔ اب مستقل طور پر ایک پالیسی بنانے کی ضرورت تھی جو آئندہ کیلئے جاری و ساری رہے۔ اب عدل کا تقاضہ یہی تھا کہ سب کو مساوی قرار دیا جائے البتہ شجاعت اور حسن عمل کی ترغیبات قائم رہیں۔ ماوردی کے بقول وظائف کی مقدار اسلام کیلئے خدمات اور سبقت اسلام کے لحاظ سے مقرر کی گئی' مگر جب سابقین اسلام باقی نہ رہے تو پھر وظائف کی مقدار میں شجاعت اور حسنِ عمل کو مد نظر رکھا جانے لگا (٦)۔ پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت آپ نے اس وجہ سے بھی محسوس کی کہ آپ نے دیکھا کہ اگر اس کو مزید جاری رکھا گیا تو طبقاتی تفاوت پیدا ہو جائے گا اور اس میں اضافہ ہوتا رہے گا' آگے چل کر نہ جانے کیا صورت اختیار کرے اور اس کے تحفظ کیلئے کیا کیا جواز پیدا کئے جائیں؟ اس لئے اسے یہاں پر ہی ختم کرنا بہتر ہے۔ اس کا ثبوت امام ابو یوسف کی روایت کا پہلا جملہ ہے جو اوپر مذکور ہو چکا ہے "جب آپ نے دیکھا کہ مال بہت زیادہ ہو گیا تو فرمایا "اگر میں زندہ رہا تو (٧)۔" ہمارے نزدیک اس سے مراد مالی تفاوت ہے کیونکہ وظائف کا فرق زیادہ مال ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ ہونے لگا تھا جو آپ کو سخت ناپسند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے زمینوں کی سرکاری الاٹمنٹ بند کر دی' جنہیں پہلے زمینیں الاٹ کی جا چکی تھیں' انہیں فرمایا "صرف اتنا اپنے پاس رکھیں جتنا آباد کر سکتے ہوں باقی واپس کر دیں۔" آپ نے بعد والے خلیفہ کو جو وصیتیں کیں' ان میں بطور خاص مساوات کا حکم دیا' تاکہ خرابیاں پیدا نہ ہوں۔ حافظ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم مسلمانوں کی جماعت پر شفقت سے کام لیتے ہوئے ان کے بڑوں کی عزت افزائی کرنا اور ان کے چھوٹوں پر رحم کرنا' ان کے اہل علم کی قدر افزائی کرنا' ان کو مارنا نہیں اس سے وہ ذلیل ہو جائیں گے۔ مال فے کے معاملے میں ان پر کسی کو ترجیح نہ دینا یہ بات ان کی ناراضی کا باعث ہو گی۔ ان کو عطاؤں سے محروم نہ کرنا وہ فقر کا شکار ہو جائیں گے۔ ان سب کو معرکوں کے حوالے نہ کر دینا کہیں ان کی نسل فنا نہ ہو جائے۔

---

(١) عبید ٢٤٦ (٢) یوسف ٤٦ (٣) سعد ٣: ٢٠٣٠ عبید ٢٤٥ (٤) سعد ٣/٢٠٢ (٥) عبید ٢٤٥ (٦) ماوردی ٢٠٢ (٧) یوسف ٤٦۔

خلاصۂ بحث

مقالے کے صفحات سے ثابت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو اللہ تعالیٰ نے زبردست اجتہادی بصیرت سے نوازا تھا' جو عملی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں تھی۔ آپ اسلام کی روح' مزاج اور مقاصد و مصالح کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔ آپ کو مسائل کے ادراک اور معاملہ فہمی میں کمال حاصل تھا۔ ہر انفرادی و اجتماعی مسئلے کی تہہ تک بہت جلد پہنچ کر اس کا کوئی حل تلاش کر لیتے تھے' لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی ہر رائے اور فکر کو عوام الناس کے سامنے پیش کرتے۔ حق و مخالفت میں دلائل سنتے اور دلائل دیتے' پھر کسی حتمی فیصلے تک پہنچتے یہ سلسلہ عہد خلافت میں بھی جاری رہا۔ آپ نے کبھی اپنی منفرد رائے کو حرف آخر سمجھ کر عوام پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی' ہمیشہ سے تنقید کی چھلنیوں سے گزارتے اور ہر مناسب دائرے میں مشاورت کرتے اور ہر وقت حق کو پانے اور اس کی طرف رجوع کرنے کیلئے تیار رہتے۔ آپ نے شورائی اجتہاد کو رواج دیا اور اسی کے مطابق اپنی پالیسیاں وضع کیں۔ اس لئے آپ کے عہد میں کئے گئے اہم فیصلوں اور اٹھائے گئے تمام اقدامات کو اجماعی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ آپ کی اجتہادی بصیرت آپ کے دور کے مسلمانوں کی اجتماعی بصیرت کی علامت ہے۔ بحیثیت مجموعی آپ کو ساری امت مسلمہ کا اعتماد و تعاون حاصل رہا۔ عہد نبویؐ کے بعد امت مسلمہ کی نظر میں آپ کے دور سعادت کو ایک معیار کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

آپ کا کردار اور طرز عمل علم کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی روح و مزاج کی نمائندگی کرتا ہے اور ہر زمانے کے لوگوں کیلئے نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بجا فرمایا ہے "تمام اصحاب فہم (آپ کی پیروی کرنے پر) مجبور ہیں کیونکہ حضرت عمرؓ میں باعتبار شریعت ہر اوصاف موجود تھے' جس میں سے کچھ تھوڑے سے متقدمین اور آئمہ مسلمین نے ہم تک پہنچائے اور عامۃ المسلمین انہی کے ذکر سے رطب اللسان ہیں۔ تاریخ میں ان کے حالات اس طرح ثبت ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی طبقہ ان سے استفادہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

وہ ایک عادل بادشاہ بھی ہیں کہ جنہوں نے اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد کیا' جزیہ اور ٹیکس بھی بے انتہا وصول کیا' فتوحات بھی کیں' ان کے ہاتھ پر ایمان کی ترویج بھی ہوئی۔ مسلمانوں نے ان کے سایہ میں امان بھی پائی' حدود بھی قائم ہوئیں اور علوم کا احیاء بھی انہی کے زمانے میں ہوا حتیٰ کہ محققین فقہاء جو کہ احکام و فتاویٰ کی مشکلات کو حل کرتے ہیں اور جن کے فتووں سے آج تک ساری دنیا مستفید ہے۔ حضرت عمرؓ کی تقلید پر مجبور ہیں' جیسا کہ فقہائے اربعہ۔ ایسے ہی ثقات محدثین جنہوں نے احادیث رسول کا حفظ کیا اور صحیح کو غیر صحیح سے علیحدہ کیا جیسا کہ بخاریؒ و مسلمؒ آپ کی تقلید پر مجبور ہیں' اسی طرح مفسرین کہ جنہوں نے قرآن مجید کے غرائب' اس کی توجیہات اور اس کے اسباب نزول بیان کئے یہاں تک کہ اس فن کے امام' واحدی' بغوی اور بیضاوی بھی آپ کی تقلید پر مجبور ہیں۔

اسی طرح قراء کہ جنہوں نے الفاظ قرآن پاک کو یاد کیا اور تمام زندگی اس کی مشق میں گزار دی جیسے نافع اور عاصم ایسے ہی مشائخ و صوفیہ جنہوں نے اپنی صحبت کے ذریعے گمراہوں کو راہ نجات دکھائی اور جن سے عجیب عجیب کرامات ظاہر ہوئیں' جیسے شیخ عبدالقادرؒ اور خواجہ نقشبندؒ وغیرہ۔ اسی طرح وہ حکماء کہ جنہوں نے حکمت عملی کی تعبیر کی اور لوگوں کے کانوں تک سے پہنچایا جیسے جلال الدین رومیؒ' مصلح الدین شیرازیؒ۔ اسی طرح وہ شعراء بھی جو شریعت کے حامل نہیں اور جن کی زندگی مدح سرائی میں گزری جیسا کہ عرفی وغیرہ (یہ سب حضرات حضرت عمرؓ کی تقلید پر مجبور ہیں)[1]

---

(۱) شاہ [illegible] ٤٢٨

الغرض عصر حاضر میں اجتماعی مسائل کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں جسے ہم بصیرت عمر کی روشنی میں حل نہ کر سکتے ہوں۔ آپ کی اس بے پناہ اجتہادی بصیرت کا اصل راز قرآن حکیم سے گہرے تعلق اور حامل قرآن محمد ﷺ سے والہانہ محبت میں پنہاں ہے۔ آپ نے اسوۂ حسنہ کی حقیقی روح کو سمجھنے اور پانے کی کوشش کی اور صرف اپنی فکر و سوچ ہی نہیں' بلکہ ذوق و مزاج اور کردار و عمل کو بھی مکمل طور پر اطاعت و اتباع کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ عصر حاضر میں اگر ہم اپنی اور اپنی نسلوں کی سیرت و شخصیت کی تعمیر' فاروقی نمونے پر کرنا چاہتے ہیں' تو کتاب و سنت سے اپنا تعلق اسی طرح قائم کرنا ہو گا جیسا کہ آپ نے قائم کیا تھا' اس کیلئے اپنے تعلیمی' تربیتی اور ابلاغی ذرائع کو طریق نبویؐ پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں خود آپ نے روشنی کے ان دونوں سرچشموں سے عوام الناس کو سیراب کرنے کیلئے جو بھرپور جدوجہد کی ویسی ہی جدوجہد حکومتی سطح پر مختلف اداروں کے ذریعے وسیع پیمانے پر کرنا ہمارا فرض بھی ہے اور ضرورت بھی۔

عصر حاضر میں ہمیں آپ کی اجتہادی بصیرت کے ان مرکزی اوصاف کو رہنما بنانا چاہئے جو آپ کے طرز عمل سے ہمارے سامنے واضح ہوتے ہیں۔

ان میں سب سے **پہلا وصف** جدت پسندی ہے۔ آپ کے اندر ایک جذبہ و ولولہ اور ایک تحرک تھا۔ اسلام کی اصل بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے حالات و وقت کے تقاضوں کے مطابق اسے نئے انداز میں پیش کرنا اور عملی مسائل کو اسلام کی روشنی میں ترقی یافتہ اور جدید ترین طریقوں کے مطابق حل کرنا ان کا اپنا ایک طریقہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی اولیات سب سے زیادہ ہیں اور ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔

دوسرا وصف مستقبل بینی ہے۔ آپ اپنی اجتہادی بصیرت سے مستقبل بعید تک دیکھنے کے عادی تھے۔ آپ اپنے اقوال' خطبات' احکامات اور فیصلوں میں اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ مستقبل میں ان کے کیا اثرات رونما ہو سکتے ہیں۔ اس لئے بڑی احتیاط اور سمجھداری سے کام لیتے تھے۔ مسائل کو مستقل اور دیرپا بنیادوں پر حل کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ مفتوحہ زمینوں کے بارے میں پالیسی تبدیل کرتے وقت آپ نے فرمایا تھا کہ "اگر مجاہدین میں بطور غنیمت تقسیم کی جاتی رہیں' تو آئندہ نسلوں کا کیا بنے گا؟" آپ وقتی و عارضی نوعیت کے فیصلوں سے کام چلانے کے بجائے پیش بینی' پیش بندی اور پیش قدمی سے کام لیتے تھے۔

آپ کی اجتہادی بصیرت کا **تیسرا وصف** فلاح عامہ کا لحاظ ہے۔ اسلام انسانوں کی فلاح و بہبود کیلئے آیا ہے اور اس نے فلاح کا ہمہ گیر تصور دیا ہے' فاروق اعظمؓ نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا۔ آپ کی تمام پالیسیاں عوامی فلاح و بہبود اور رفاہ عامہ کا شاہکار تھیں۔ آپ ایسے نئے نئے ذرائع اور طریقے تلاش کرتے رہتے تھے' جن سے یہ عظیم مقصد حاصل ہو سکے۔ آپ کا نظام وظائف' نظام ٹیکس' نظام کفالت عامہ اور دیگر سماجی' رفاہی اور فلاحی اقدامات اس کی نمایاں مثال ہیں۔ فقہاء نے استحسان اور مصالح مرسلہ کے دلائل میں آپ کے بہت سے فیصلوں اور اقدامات کو بنیاد بنایا ہے۔

آپ کی اجتہادی بصیرت کا **چوتھا وصف** شرعی مصالح اور حکمتوں کا تحفظ ہے۔ آپ اپنی الہامی فراست کی وجہ سے شریعت کی روح' اس کے مقاصد اور اس کے وسیع تر مصالح کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ آپ کے اجتہادات پر نظر ڈالیں' تو ہر معاملے میں شرعی مصالح ہی کا تحفظ دکھائی دیتا ہے۔

آخری وصف شورائی اجتہاد ہے جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ اس کی کئی مثالیں مقالے کے اندر موجود ہیں۔ آپ کے ہاں ماہرین' متقدمین' اہل علم و دانش' مہاجرین و انصار اور ریاست کے طول و عرض سے آنے والے صاحب علم و فقہ کی مجلسیں سجی رہتی تھیں جہاں علمی و عملی معاملات پر کھل کر بحثیں ہوتی تھیں اور دلائل کی بنیاد پر اجتہادی فیصلے ہوتے تھے۔ آپ بیشتر کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سابقون الاولون کو عموماً مدینے ہی میں رکھتے تھے۔ اس میں ایک بڑی حکمت یہی تھی کہ ان سب کو اپنے مشورے اور فیصلوں میں شامل رکھا جائے۔

عصر حاضر کے سارے مسائل کو حل کرنے کیلئے جہاں ان اوصاف کو اپنانا ضروری ہے وہاں ایک ایسا نظام کار وضع کرنے کی ضرورت ہے جو ان خطوط پر استوار ہو جنہیں اس مقالے میں مختلف مباحث کے تحت اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کام صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہم اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کرلیں کہ ہم نے پہلے اپنے ملکوں کو پھر پوری دنیا کو اسلام کے نظام امن و سلامتی سے ہمکنار کرنا ہے جس پر سارے انسانوں کی دنیوی اور اخروی بھلائی کا دارومدار ہے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق وہمت دے..... آمین ثم آمین!

☆☆☆ ☆☆☆ ☆☆☆

فہارس

آیاتِ قرآنیہ

آیات | صفحات

باب اول:

باب دوم:

نوٹ: صفحات نمبر ۴۷۲ اور ۴۷۳ ملاحظہ ہوں صفحہ ۴۷۱ کے بعد۔

يايها الذين امنوا انما الخمر والميسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشيطن فاجتنبوه لعلكم تفلحون ١٦٢

انما يريد الشيطن ان يوقع بينكم العداوة والبغضاء في الخمر والميسر ويصدكم عن ذكر الله و عن الصلوة فهل انتم منتهون

ليس على الذين امنوا وعملوا الصالحات جناح فيما طعموا اذا مااتقوا و امنوا و عملوا الصلحت ثم اتقوا وامنوا ثم اتقوا واحسنوا والله يحب المحسنين ١٦٣

علم الله انكم كنتم تختانون فتاب عليكم و عفا عنكم ١٦٤

احل لكم ليلة الصيام الرفث الى نساء كم هن لباس لكم وانتم لباس لهن علم الله انكم كنتم تختانون انفسكم فتاب عليكم و عفا عنكم فالئن باشروهن وابتغوا ما كتب الله لكم وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الابيض من الخيط الاسود من الفجر ١٦٤

نساء كم حرث لكم فاتوا حرثكم انى شئتم وقدموا لانفسكم واتقوا الله واعلموا انكم ملقوه و بشر المؤمنين ١٦٥

فلا وربّك لايؤمنون حتى يحكمّوك فيما شجر بينهم ثم لايجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلّموا تسليما ١٦٧

ولو انا كتبنا... الخ ١٦٧

الم تر الى الذين يزعمون انهم امنوا بما انزل اليك وما انزل من قبلك يريدون ان يتحاكموا الى الطاغوت وقد امروا ان يكفروا ويريد الشيطان ان يضلّهم ضلالا بعيدا ١٦٧

يايها النبي لم تحرم ما احل الله لك تبتغي مرضات ازواجك والله غفور رحيم قد فرض الله لكم تحلة ايمانكم والله مولكم وهو العليم الحكيم واذ اسر النبي الى بعض ازواجه حديثاً فلما نبات به واظهره الله عليه عرف بعضه و اعرض عن بعض فلما نبأها به قالت من انبأك هذا قال نبأني العليم الخبير ان تتوبا الى الله فقد صغت قلوبكما و ان تظاهرا عليه فان الله هو مولٰه و جبريل و صالح المؤمنين والملئكة بعد ذالك ظهير عسى ربه ان طلقكن ان يبدله ازواجا خيرا منكن مسلمات مؤمنات قانتات تائبات عابدات سٰئحات ثيبات و ابكارا ١٦٨

ان تتوبا الى الله فقد صغت قلوبكما ١٧٠

واذا جاء هم امر من الامن او الخوف اذاعوا به ولو ردوه الى الرسول والى اولي الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم ولولا فضل الله عليكم و رحمته لا تبعتم الشيطن الا قليلا ١٧٣

ولو لا اذا سمعتموه قلتم مايكون لنا ان نتكلم بهذا سبحانك هذا بهتان عظيم ١٧٤

ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين ثم جعلنه نطفه في قرار مكين ثم خلقنا النطفة علقه فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاما فكسونا العظام لحما ثم انشاناه خلقا آخر ١٧٤

فتبارك الله احسن الخالقين ١٧٤

قل من كان عدوا لجبريل فانه نزله على قلبك باذن الله مصدقا لما بين يديه وهدى و بشرى للمومنين من كان عدوا لله وملئكته ورسله و جبريل و ميكال فان الله عدو للكفرين ١٧٤

من كان عدوا لله و ملائكته و رسله و جبريل و ميكائيل فان الله عدو للكافرين ١٧٦

والسبقون السبقون اولئك المقربون في جنت النعيم ثلة من الاولين و قليل من الاخرين ١٧٦

ثلة من الاولين و ثلة من الاخرين ١٧٦

شهر رمضان الذى انزل فيه القرآن هدى للناس و بينت من الهدى والفرقان ١٧٨

تبرك الذى نزل الفرقان على عبده ليكون للعلمين نذيرا ١٧٨

وما انزلنا على عبدنا يوم الفرقان ١٧٨

انه لقول رسول كريم وما هو بقول شاعر قليلا ما تومنون. ولا بقول كاهن قليلا ماتذكرون تنزيل من رب العلمين ولو تقول علينا بعض الاقاويل لاخذنا منه باليمين ثم لقطعنا منه الوتين فما منكم من احد عنه حجزين وانه لتذكرة للمتقين وانا لنعلم ان منكم مكذبين وانه لحسرة على الكفرين. وانه لحق اليقين. فسبح باسم ربك العظيم ١٧٩

سبح لله مافى السموات والارض وهو العزيز الحكيم له ملك السموات والارض يحيى و يميت وهو على كل شئ قدير هو الاول و الآخر والظاهر والباطن وهو بكل شئ عليم هو الذى خلق السموات والارض فى ستة ايام ثم استوى على العرش يعلم مايلج فى الارض وما يخرج منها وما ينزل من السماء وما يعرج فيها وهو معكم اينما كنتم والله بما تعملون بصير له ملك السموات والارض و الى الله ترجع الامور ويولج النهار فى اليل و هو عليم بذات الصدور امنوا بالله و رسوله وانفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه فالذين آمنوا منكم وانفقوا لهم اجر كبير وما لكم لاتؤمنون بالله والرسول يدعوكم لتؤمنوا بربكم وقد اخذ ميثاقكم ان كنتم مؤمنين ١٨٠

طه ماانزلنا عليك القران لتشقى الا تذكرة لمن يخشى تنزيلا ممن خلق الارض والسموات العلى الرحمن على العرش استوى له مافى السموات وما فى الارض وما بينهما وما تحت الثرى وان تجهر بالقول فانه يعلم السر واخفى. الله لا اله الا هو له الاسماء الحسنٰى ١٨٠

انى انا الله لا اله الا انا فاعبدنى واقم الصلوة لذكرى ان الساعة اتية اكاد اخفيها لتجزى كل نفس بما تسعى فلا يصدنك عنها من لا يومن بها واتبع هواه فتردى ١٨٠

وانما اشكوا بثى و حزنى الى الله ١٨١

وجوه يومئذ خاشعة عاملة ناصبة تصلى نارا حامية ١٨١

ماكان لنبی ان یکون له اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا والله یرید الاخرة والله عزیز حکیم لولا کتب من الله سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم	۱۵۰
فإما منًا بعد وإما فداء	۱۵۰
لولا کتاب من الله سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم	۱۵۱
واذا سألتموهن متاعا فسئلوا من وراء حجاب	۱۵۱
لولا کتاب من الله	۱۵۱
واذ یقول المنافقون والذین فی قلوبهم مرض ما وعدنا الله و رسوله الا غرورا	۱۵۲
وقالوا لاتنفروا فی الحر قل نار جهنم اشد حرا لو کانوا یفقهون فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا جزاء بما کانوا یکسبون	۱۵۲
استغفرلهم اولا تستغفر لهم سبعین مرة فلن یغفر الله لهم	۱۵۳
ولا تصل علی احد منهم مات ابدا ولا تقم علی قبره انهم کفروا بالله و رسوله وماتوا وهم فسقون	۱۵۳
وممن حولکم من الاعراب منفقون ومن اهل المدینة مردوا علی النفاق لا تعلمهم نحن نعلمهم سنعذبهم مرتین ثم یردون الی عذاب عظیم	۱۵٤
واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی	۱۵۵
واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی	۱۵۵
واذا یرفع ابراهیم القواعد من البیت واسمعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم	۱۵٦
واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی	۱۵۷
ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبرکا وهدی للعلمین فیه آیت بینت مقام ابراهیم و من دخله کان امنا	۱۵۷
واذا سالتموهن متاعاً فسئلوهن من وراء حجاب ذالکم اطهر لقلوبکم وقلوبهن	۱۵۸
یاایهاالذین امنوا لیستئذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات من قبل صلوة الفجر و حین تضعون ثیابکم من الظهیرة ومن بعد صلوة العشاء	۱٦۰
ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منه سکرا و رزقا حسنا	۱٦۱
یسئلونك عن الخمر والمیسر قل فیهما اثم کبیر و منافع للناس واثمهما اکبر من نفعهما	۱٦۱
قل یاایهاالکافرون لا اعبد ماتعبدون ولاانتم عبدون مااعبد ولاانا عابدما عبدتم لکم دینکم ولی دین	۱٦۱
یاایهاالذین آمنوا لا تقربوا الصلوة وانتم سکاری حتی تعلموا ماتقولون	۱٦۱

باب سوم:

باب چهارم:

باب پنجم:

باب ششم:

باب ہفتم:

باب ہشتم:

احادیث نبویہ

"جن کا عربی متن استعمال ہوا ہے"

احادیث — صفحات

باب اول:

باب دوم:

باب سوم:

باب چہارم:

باب پنجم:

باب ششم:

باب ہفتم:

باب ہشتم:

شخصیات

مقامات

مآخذ و مراجع

☆۔ عربی

☆۔ اردو

☆۔ انگریزی

مآخذ و مراجع

القرآن الحکیم

آلوسی، شہاب الدین السید محمود	روح المعانی	ادارہ الطباعۃ المنیریۃ بیروت
ابن اثیر، عزالدین محمد بن عبدالکریم الجزری	الکامل فی التاریخ	ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، ۱۳۵۶ھ
ایضاً	اسد الغابہ	المکتبہ الاسلامیہ بطہران، ۱۳۷۷ھ
ابن اثیر، مبارک بن محمد	جامع الاصول	احیاء التراث الاسلامی، مصر
ابن ابی شیبہ	المصنف	
ابن اسد، ابی محمد عبداللہ	اللباب فی تہذیب الانساب	مکتبہ المثنی بغداد
ابن اعثم، ابی محمد احمد	الفتوح	دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۹۸۶ء
ابن تیمیہ، احمد بن عبدالحلیم	سیاست الہیہ	دارالکتاب العربی مصر، ۱۹۵۰ء
ایضاً	سیاست شرعیہ	ایضاً ، ۱۹۵۵ء
ایضاً	منہاج السنہ	مطبعۃ امیریہ مصر، ۱۳۲۲ھ
ایضاً	الصارم المسلول علی شاتم الرسولؐ	ایضاً
ایضاً	مجموعۃ الرسائل الکبریٰ	مصر، ۱۳۲۳ھ
ایضاً	الفتاویٰ	
ابن جزی	القوانین الفقہیہ	
ابن جوزی، ابی الفرج عبدالرحمن بن علی	سیرت عمرؓ	مطبعۃ التوفیق الادبیۃ مصر
ابن حجر العسقلانی، احمد بن علی بن محمد	الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ	مطبعۃ مصطفیٰ محمد مصر، ۱۹۳۹ء
ایضاً	فتح الباری	المطبعۃ البہیۃ المصریۃ، ۱۳۴۸ھ
ایضاً	الدرر الکامنہ	دائرہ المعارف حیدرآباد دکن، ۱۳۴۸ھ
ایضاً	تہذیب التہذیب	مجلس دائرہ المعارف النظامیہ ہند، ۱۳۲۵ھ
ایضاً	لسان المیزان	دارالفکر بیروت، ۱۹۸۷ء
ابن حزم، علی بن احمد بن سعید	المحلیٰ	ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر، ۱۳۴۹ھ
ایضاً	الاحکام فی اصول الاحکام	ایضاً، ۱۳۴۸ھ

ایضاً	الفصل فی الملل والاھوا النحل	مطبعہ الادبیہ سوق الخضار مصر، ١٣١٧ھ
ابن حنبل، احمد بن محمد	المسند	دار المعارف بمصر، ١٩٥٠ء
ابن حوقل، ابی القاسم بن حوقل النصیبی	صورۃ الارض	منشورات دار المکتبۃ الحیاۃ بیروت
ابن خزیمہ، محمد بن اسحاق	الصحیح	بیروت، ١٩٧١ء
ابن خلدون، عبدالرحمن بن خلدون	مقدمہ ابن خلدون	دار الکتاب اللبنانی بیروت، ١٩٥٦ء
ایضاً	تاریخ ابن خلدون	ایضاً
ابن خلکان، شمس الدین احمد بن محمد	وفیات الاعیان	مکتبہ النہضۃ المصریہ، ١٩٤٨ء
ابن رجب، ابوالفرج عبدالرحمن	القواعد فی الفقہ الاسلامی	مطبعۃ الصدق الخیریہ مصر، ١٩٣١ء
ابن رشد، ابو ولید محمد بن احمد	بدایۃ المجتہد و النہایۃ المقتصد	مکتبہ العلمیۃ لاہور پاکستان، ١٩٧٦ء
ابن سعد	الطبقات الکبریٰ	الطباعۃ والنشر، دار بیروت، ١٩٥٧ء
ابن سہل، احمد بن سہیل البلخی	کتاب البدء والتاریخ	پارستان طہران
ابن سید الناس	عیون الاثر	
ابن طبا طبا، محمد بن علی	تاریخ الدول الاسلامیہ	دار الصادر بیروت، ١٩٦٠ء
ابن عابدین	ردالمحتار	
ابن عاصم	تحفۃ الاحکام	دار الکتب العلمیۃ بیروت، ١٩٨٦ء
ابن عبدالبر، ابو عمر یوسف بن عبداللہ	الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب	مکتبہ نہضۃ مصر
ایضاً	الدرر فی اختصار المغازی والسیر	دار المعارف قاہرہ مصر، ١٩٨٣ء
ابن عربی، محمد بن عبداللہ	احکام القرآن	عیسیٰ البابی الحلبی والشرکاہ، ١٩٥٧ء
ابن عساکر	تہذیب تاریخ دمشق الکبیر	
ابن عبد ربہ، احمد بن محمد	العقد الفرید	قاہرہ
ابن العماد، عبدالحئی	شذرات الذہب فی اخبار من ذہب	مکتبہ المثنیٰ بغداد، ١٣٠٣ھ
ابن الفقیہ، احمد بن محمد الہمدانی	کتاب البلدان	
ابن قتیبہ	عیون الاخبار	
ایضاً	الامامۃ والسیاسۃ	مطبعۃ مصطفیٰ محمد مصر
ایضاً	المعارف	مطبعۃ اسلامیہ مصر

ابن قدامہ، موافق الدین	المغنی	مکتبہ الامام مصر
ایضاً	الشرح الکبیر	ایضاً
ابن قیم الجوزیہ، ابی عبداللہ محمد	زادالمعادفی ہدی خیر العباد	مطبعہ المصطفیٰ البابی، ۱۹۵۰ء
ابن قیم، محمد بن ابی بکر	اعلام الموقعین عن رب العالمین	دارالکتب العلمیہ بیروت
ابن کثیر، ابوالفدا الحافظ	البدایہ والنہایہ	مکتبہ المعارف بیروت
ایضاً	تفسیر القرآن العظیم	مکتبہ المعارف بیروت، ۱۹۶۳ء
ابن ماجہ، الحافظ ابی عبداللہ محمد بن یزید	السنن	البابی الحلبی مصر
ابن مسعود، علاؤ الدین ابی بکر	بدائع الصنائع	
ابن منظور، جمال الدین محمد	لسان العرب	دار الصادر بیروت، ۱۹۵۶ء
ابن المقفعابن قدامہ، موافق الدین	رسالۃ الصحابہ	مطبعۃ الجمالیہ بمصر، ۱۹۱۰ء
ایضاً	الاشباہ والنظائر	
ابن نجیم، زین العابدین	بحر الرائق	دارلکتب العلمیہ بیروت
ابن ندیم	الفہرست	مطبعۃ رحمانیہ مصر، ۱۳۴۸ھ
ابو حنیفہ،نعمان بن ثابت	مسند امام ابی حنیفہ	مکتبہ ربیع حلب، ۱۹۸۱ء
ابو داؤد، ابی بکر عبداللہ	السنن	المطبعہ رحمانیہ مصر، ۱۹۳۲ء
ابو عبید،القاسم بن سلام	کتاب الاموال	مکتبہ الکلیات الازہریہ، دارالفکر القاہرہ، ۱۹۸۱ء
ابو یعلی	الاحکام السلطانیہ	مطبعہ الحلبی مصر
ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم	کتاب الخراج	ادارہ القرآن دارالعلوم الاسلامیہ پاکستان ۱۹۸۷ء
اصفہانی، حسین بن محمد راغب	المفردات فی غرائب القرآن	المطبعہ المیمنیہ بالقاہرہ، ۱۳۲۴ھ
تقی امینی، مولانا	اسلام کا زرعی نظام	مکتبہ امدادیہ ملتان
ایضاً	فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر	اسلامک پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۷۵ء
ایضا	احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت	سندھ ساگر اکادمی لاہور، ۱۹۸۲ء
بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل	الجامع الصحیح	دار الفکر بیروت
بدر عالم، مولانا	ترجمان السنہ	سعید کمپنی کراچی
البغوی،حسین بن مسعود	مصابیح السنہ	

بلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر	فتوح البلدان	مکتبہ النھضۃ المصریہ القاھرہ
ایضاً	انساب الاشراف	دار المعارف بمصر، ۱۹۵۹ء
بیضاوی، ناصر الدین	انوار التنزیل	دار فراس للنشر والتوزیع
ترمذی، محمد بن عیسیٰ	السنن	دار الفکر بیروت، ۱۹۸۳ء
تقی الدین، محمد بن احمد الحسینی	العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین	مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۹۸۶ء
تقی عثمانی	علوم القرآن	مکتبہ دار العلوم کراچی
تلمسانی، سید عمر تلمسانی	شہید المحراب عمر بن خطاب (اردو ترجمہ)	البدر پبلی کیشنز اردو بازار لاہور، ۱۹۹۸ء
ٹائن بی، آرنلڈ جے	مطالعہ تاریخ	مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء
ثروت صولت	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	اسلامک پبلی کیشنز لاہور
الجاحظ، ابو عثمان عمرو بن بحر	البیان والتبیین	المطبعۃ الکاثولیکیۃ بیروت، ۱۹۵۹ء
ایضاً	کتاب الحیوان	مطبعہ التقدم مصر، ۱۹۰۶ء
جصاص، ابوبکر احمد بن علی	احکام القرآن	دار احیاء
جوزی ابن الجوزی عبدالرحمٰن بن علی	(i) سیرت عمرؓ	
	(ii) صفۃ الصفوۃ	بیروت، ۱۹۷۹ء
	(iii) الوفا	
الحاکم، محمد بن عبداللہ	المستدرک	مکتبۃ النصر الحدیثۃ الریاض
حامد الانصاری، مولانا	اسلام کا نظام حکومت	مکتبہ الحسن لاہور
حریری، غلام احمد	تاریخ تفسیر و مفسرین	ملک سنز پبلشرز فیصل آباد، ۱۹۸۳ء
حسن، ابراہیم حسن ڈاکٹر	النظم الاسلامیہ (اردو ترجمہ)	دار الاشاعت کراچی، ۱۹۷۵ء
الحموی، یاقوت بن عبداللہ	معجم البلدان (اردو ترجمہ)	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
مولانا حنیف ندوی	مسئلۂ اجتہاد	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
خالد محمد خالد	خلفاء الرسول	دار الفکر بیروت، ۱۹۸۱ء
خالد علوی، ڈاکٹر	حفاظت حدیث	الفیصل ناشران اردو بازار لاہور
الخراسانی، سعید بن منصور	کتاب السنن	مطبعۃ الاستقامۃ بالقاھرۃ، ۱۹۶۰ء
خضری، محمد خضری بک	اتمام الوفا فی سیرت الخلفاء	

ایضاً	تاریخ التشریع الاسلامی	مکتبہ التجاریہ الکبریٰ بمصر ۱۹۶۳ء
پروفیسر خورشید احمد	اسلامی نظریۂ حیات	شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۱ء
ایضاً	ترقیاتی پالیسی کی اسلامی تشکیل	انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد، ۱۹۹۶ء
خورشید فاروق	حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط	ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۹ء
الدارمی، عبداللہ بن عبدالرحمن	السنن	دار احیاء السنۃ النبویۃ
الذہبی، محمد بن احمد بن عثمان	تذکرۃ الحفاظ	مطبعۃ مجلس دائرہ المعارف النظامیہ ہند
ایضاً	میزان الاعتدال فی نقد الرجال	دار المعرفۃ بیروت
رازی، محمد بن عمر فخر الدین	التفسیر الکبیر	المطبعۃ المصریۃ، ۱۹۳۵ء
راغب الطباخ	تاریخ افکار وعلوم اسلامی (اردو ترجمہ)	اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۳ء
رشید رضا	تفسیر المنار	مطبعۃ المنار مصر، ۱۹۲۸ء
رویعی بن راجح الدکتور	فقہ عمر بن الخطابؓ موازناً بفقہ اشہر المجتہدین	دار الغرب الاسلامی بیروت ۱۴۰۳ء
الزرکلی، خیر الدین الزرکلی	الاعلام	دار العلم للملایین بیروت ۱۹۸۰ء
زرکشی، بدر الدین محمد بن عبداللہ	البرہان فی علوم القرآن	دار الاحیاء الکتب العربیہ مصر ۱۹۵۸ء
زرقانی، محمد عبدالعظیم الازہری	مناہل العرفان فی علوم القرآن	دار الاحیاء الکتب العربیہ مصر
زمخشری، محمود بن عمر	الکشاف	مطبعۃ الاستقامہ بالقاہرہ ۱۹۳۶ء
السبکی، عبدالوہاب بن علی	طبقات الشافعیۃ الکبریٰ	المطبعۃ الحسینیہ مصر ۱۹۸۰ء
السرخسی، شمس الدین	المبسوط	مطبعۃ السعادۃ مصر
سہیلی، عبدالرحمن بن عبداللہ	الروض الانف	القاہرہ ۱۹۷۳ء
السیوطی، جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر	تاریخ الخلفاء	مکتبۃ مدنیہ لاہور
ایضاً	تدریب الراوی	مطبعۃ السعادۃ بمصر ۱۹۶۶ء
ایضاً	الاتقان فی علوم القرآن	مطبعہ معاہدہ المصر

ایضاً	الاشباہ والنظائر	مطبعہ مصطفیٰ محمد مصر
الشاطبی، ابی اسحٰق ابراہیم بن موسیٰ،	الموافقات فی اصول الشریعہ	المطبعۃ الرحمانیہ المصر
الشافعی، محمد بن ادریس	کتاب الام	بولاق مصر
شاہ ولی اللہ، دھلوی	ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء	قرآن محل کراچی
ایضاً	حجۃ اللہ البالغہ	دارالاشاعت کراچی، ۱۹۸۱ء
ایضاً	البلاغ المبین	ایضاً
ایضاً	عقدالجید فی الاحکام الاجتہاد والتقلید	
شبلی نعمانی، علامہ	سیرۃ النبیؐ	مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، ۱۹۷۵ء
ایضاً	الفاروق	مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
الشوکانی، محمد بن علی	القول المفید فی ادلۃ الاجتہاد والتقلید	مطبعہ حلبی مصر
ایضاً	فتح القدیر	مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۳۵۰ھ
ایضاً	نیل الاوطار	
شیبانی، محمد بن حسن	الجامع الصغیر	مطبعہ بولاق مصر
ایضاً	الجامع الکبیر	مطبعہ الاستقامہ مصر، ۱۳۵۶ء
ایضاً	کتاب الآثار (اردو ترجمہ)	قرآن محل کراچی
الشہرستانی، محمد بن عبدالکریم	الملل والنحل	مطبعۃ مصطفیٰ البابی حلبی مصر، ۱۹۶۱ء
صارم، عبدالصمد الازھری	تاریخ القرآن	ادارہ علمیہ لاہور، ۱۹۶۳ء
صالح، ڈاکٹر صبحی	مباحث فی علوم القرآن	دارالعلم للملایین بیروت، ۱۹۶۵ء
مبارک پوری، صفی الرحمٰن مولانا	الرحیق المختوم	المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور، ۱۹۸۹ء
ضیف، محمد حسن ضیف اللہ	فیض القدیر لترتیب و شرح الجامع	مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ بمصر، ۱۹۶۲ء
طبرانی، ابوالقاسم سلیمان بن احمد	الصغیر	دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۹۸۳ء
طبرسی، ابوالعلی الفضل بن الحسن	المعجم الصغیر	دارالمکتبۃ الحیات بیروت، ۱۹۶۱ء
	مجمع البیان فی تفسیر القرآن	
طبری، محمد بن جریر	جامع البیان عن تاویل ای القرآن	البابی الحلبی مصر، ۱۹۶۸ء
ایضاً	تاریخ الرسل والملوک	دارالمعارف مصر، ۱۹۶۳ء

طحاوی، ابی جعفر احمد بن محمد	شرح معانی الآثار	المکتبہ الرحیمیہ دیوبند
طنطاوی	عمر بن خطابؓ (اردو ترجمہ)	البیان چوک الترکلی لاہور، ۱۹۷۱ء
عبدالرزاق، ابی بکر عبدالرزاق بن ہمام	مصنف المصنف	منشورات مجلس العالمی
عروہ بن زبیر	مغازی رسول اللہ (اردو ترجمہ)	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۷ء
العقاد محمود	العبقریات الاسلامیہ	دارالادب بیروت، ۱۹۶۶ء
العینی	عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری	مطبعۃ المنیریہ مصر، ۱۳۳۸ء
الغزالی، الامام ابی حامد محمد	احیاء علوم الدین	مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی بمصر، ۱۹۳۹ء مرکزی تحقیق دیال سنگھ لائبریری
غفاری، نور محمد	اسلام کا قانون محاصل	ایضاً
ایضاً	نبی کریم کی معاشی زندگی	ایضاً
ایضاً	اسلام کا معاشی نظام	ایضاً
ایضاً	اسلام کا نظام تکافل اجتماعی	
المراغی، احمد مصطفیٰ	تفسیر المراغی	مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی بمصر، ۱۹۳۶ء
المرغینانی، برہان الدین	الہدایۃ شرح بدایۃ المبتدی	مطبعہ خیریہ، ۱۳۲۶ء
مصطفیٰ سباعی، ڈاکٹر سید معروف شاہ	اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو	اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۶ء
القرطبی، ابی عبداللہ محمد بن احمد	الجامع لاحکام القرآن	دارالکتب العربیۃ للطباعۃ والنشر المصریۃ، ۱۹۶۸ء
قرافی	الاحکام فی تمیز الفتاویٰ الاحکام	
قرضاوی، ڈاکٹر یوسف	فقہ الزکوٰۃ	دارالارشاد بیروت
ایضاً	الحلال والحرام فی الاسلام	
قسطلانی، احمد بن محمد	ارشاد الساری فی شرح البخاری	بولاق قاہرہ
قلعہ جی، محمد رواس	موسوعۃ فقہ عمرؓ بن الخطاب	مکتبہ الفلاح کویت، ۱۹۸۱ء
کاسانی، ابوبکر علاء الدین	بدائع الصنائع	دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری
کحالہ، عمر بن رضا	معجم المؤلفین	المکتبۃ العربیہ بدمشق، ۱۹۵۷ء
کلینی	الاصول من الکافی	
الکتبی، ابن شاکر	فوات الوفیات	بیروت ۱۹۷۳ء
الکردی، محمد طاہر الکردی	خلقہ کعبہ (اردو ترجمہ)	مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۶۲ء

مصنف	کتاب	ناشر
مالک بن انس	الموطا	دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹۵۱ء
ماوردی، ابوالحسن علی بن محمد	الاحکام السلطانیہ	مطبعة المحمودیہ مصر، ۱۳۵۲ء
المتقی، علی بن عبدالمالک الھندی	کنز العمال فی سنن الأقوال والافعال	موسؤتہ الرسالہ بیروت، ۱۹۵۵ء
محمد حمیداللہ	سیاسی وثیقہ جات	مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۰ء
ایضاً	عہد نبوی کا نظام حکمرانی	اردو اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۷ء
ایضاً	خطبات بہاولپور	اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور
محمصانی، صبحی ڈاکٹر	فلسفہ شریعت اسلام	مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۵ء
المسعودی، علی بن الحسین	مروج الذھب و معادن الجوھر	مکتبہ السعادۃ بمصر، ۱۹۵۸ء
مسلم بن الحجاج القشیری	الجامع الصحیح	دار الفکر بیروت لبنان، ۱۹۸۰ء
مقدسی، احمد بن سہیلی	البدء والتاریخ	مکتبہ الاسدی میلان بہارستان بطہران، ۱۹۶۲ء
مناظر احسن گیلانی	تدوین حدیث	مکتبہ اسحاقیہ کراچی، ۱۳۰۷ء
مناوی	کنوز الحقائق	
المنذری، عبدالعظیم بن عبدالقوی	الترغیب والترھیب من الحدیث الشریف	دار الکتب الملکیۃ المصریۃ، ۱۹۳۳ء
مودودی، سید ابوالاعلیٰ	تفہیم القرآن	ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ۱۹۸۳ء
ایضاً	سیرت سرور عالم	ایضاً، ۱۹۸۳ء
ایضاً	سنت کی آئینی حیثیت	اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور
ایضاً	خلافت و ملوکیت	ایضاً
ایضاً	اسلامی ریاست	ایضاً
ایضاً	معاشیات اسلام	ایضاً
ایضاً	رسائل و مسائل	ایضاً
ایضاً	تفہیمات	ایضاً
موصلی	المختار	
النسائی	سنن النسائی بشرح جلال الدین السیوطی	احیاء التراث العربی بیروت لبنان
نجات اللہ صدیقی ڈاکٹر	اسلام کا نظریۂ ملکیت (دو اجزاء)	اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۸۸ء
ایضاً	شرکت و مضاربت کے شرعی اصول	ایضاً ،
النووی، یحیٰی بن شرف	شرح صحیح مسلم	مطبعہ حجازی قاہرہ، ۱۳۴۹ء

ندوی، رشید اختر — مسلمان حکمران — احسن برادرز لاہور، ۱۹۵۵ء

ایضاً — تاریخ اسلام — قومی کتب خانہ لاہور، ۱۹۵۹ء

ندوی، شاہ معین الدین ندوی — خلفائے راشدین — ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

ایضاً — تاریخ اسلام — ایضاً

نعمانی، مولانا محمد منظور — معارف الحدیث — دارالاشاعت کراچی

واقدی، محمد بن عمر بن واقد — کتاب المغازی — مؤسسۃ الاعلیٰ المطبوعات بیروت

ہاشمی، مولانا محمد متین — اسلامی حدود — مکہ بکس لاہور، ۱۹۷۹ء

ہیکل، محمد حسین — الفاروق عمر — مطبعۃ مصر شرکۃ مساھمۃ مصریۃ، ۱۳۶۳ھ

یحییٰ بن آدم القرشی — کتاب الخراج — المکتبۃ العلمیہ لاہور، ۱۳۹۵ھ

یعقوبی — تاریخ الیعقوبی — دار صادر للطباعۃ بیروت، ۱۹۶۰ء

Some English Books.

☆- Afzal-ur- Raham,

Economic Doctrines of Islam

Islamic Publication, Lahore. 1975

☆- Al-Buraey, Mohammad Ali

Administrative development an Islamic Perspective

KPI limited, London. 1985

☆- David & Rosenbloom,

Public Administration

The Ronald press company, New York. 1975

☆- Esposito, J.L,

Islam and Economic development

Syracuse University Press, 1980.

☆- Gladden,E.N,

An introduction to public admistration.

☆- Goel, S.L,

Advanced Public Administration,

Sterling Publishers, New Delhi. 1974

☆- Khurshid Ahmad,

Studies in Islamic Economics,

Islamic foundation, London.

☆- Laski, Harold-j,

Grammar of Politics

London. 1967

☆- Manzoor Mirza,

Economic Devlopment in theory and practics,

Ilmi Kitab Khana, Lahore.

☆- Meier,G.M & Robert,

Economic Development,

John wiley & sons, New York. 1920

☆- Monzer Kahf, Dr.

The Islamic Economy,

The muslim students association, Canada. 1978

☆- Nigro, E.A,

Modern Public Administration.

Horper Publisher, New York. 1984

☆- Pfiffner, & Robert Presthus,

Public Administration

The Ronald Press Company, New York. 1967

☆- Presthus, Robert,

Public Administration.

The Ronald Press company, New York. 1975

☆- Tyagi, A.R,

Public Administration, Principles & Practice

Naeem Publishers, Urdu Bazar, Lahore. 1989-90

☆- Umer Chapra,

Islam and Economic Development,

Islamic Riserch Institute and iiit, Islamabad.

☆- Viswanathan, V.N

Comparative Public Administration,

☆- Volkov. M. T,

A Dictionary of Political Economy,

Progress Publication, Moscow. 1985

☆- White, L.D,

Introduction to Study of Public Administration.